أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝

مجموعہ

خلاصۂ مضامینِ قرآنی



مرتب

مولانا ذاکر آدم پارکھیتی

(استاذ دار العلوم ماٹلی والا)

حسب حکم وزیر نگرانی

(حضرت مولانا) مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی (دامت برکاتہم)

مہتمم وشیخ الحدیث دار العلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ، گجرات، الہند

تفصیلات

نام کتاب	:	مجموعہ خلاصۂ مضامین قرآنی
مرتب	:	مولانا ذاکر آدم پارکھیتی (استاذ دارالعلوم ماٹلی والا)
حسب حکم وزیر نگرانی	:	مولانا مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی صاحب (شیخ الحدیث و مہتمم دارالعلوم ماٹلی والا)
صفحات	:	۱۰۰۷
سن طباعت	:	۱۴۴۳ھ = مطابق ۲۰۲۲ء
قیمت	:	

ملنے کا پتہ

مکتبہ: ابوبکر ربیع بن صبیح بصری

دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، عیدگاہ روڈ، بھروچ

گجرات، انڈیا۔ ۳۹۲۰۰۱

اجمالی فہرست

مذکورہ اجمالی فہرست میں یہ سہولت دے رکھی ہے کہ جس پارہ پر آپ کلک کریں وہ پارہ تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے ہوگا، اور اگر دو بارہ اجمالی فہرست پر جانا چاہیں تو اسی پارہ پر کلک کریں -- شکریہ ---

مقدمہ

باسمہ تعالیٰ

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین ، وعلی آلہ وصحبہ اجمعین۔ اما بعد!

قرآن کریم کا چیلنج اور انسانی عجز (لبید بن ربیعہ وابن المقفع):

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دعوی کیا کہ قرآن کریم ایک آسمانی کتاب ہے، جو خدا تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لئے اتری ہے، تو بہت سے لوگوں نے اس کو نہیں مانا، انہوں نے کہا کہ یہ ایک انسانی تصنیف ہے نہ کہ خدائی تصنیف، اس کے جواب میں قرآن کریم میں کہا گیا کہ اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو قرآن کریم کے مانند ایک کلام بنا کر لاؤ۔ (طور: ۳۴)

اسی کے ساتھ قرآن کریم نے مطلق لفظوں میں یہ اعلان کر دیا کہ اگر تمام انسان اور جن اس بات پر اکھٹا ہو جائیں کہ وہ قرآن جیسی کتاب لے آئیں تو وہ ہرگز نہ لاسکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں۔ **قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یأتوا بمثل ھذا القرآن لایأتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا.** (الاسراء: ۸۸) بلکہ اس کے جیسی ایک سورہ ہی بنا کر دکھادیں۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فأتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھدائکم من دون اللہ ان کنتم صادقین۔ (بقرہ: ۲۳)

اپنے بندے پر اپنا جو کلام ہم نے اتارا ہے، اگر اس کے (کلام الٰہی ہونے کے) بارے میں تمہیں شبہ ہے تو اس کے جیسی ایک سورہ لکھ کر لے آؤ، اور خدا تعالیٰ کے سوا اپنے تمام شہداء کو بھی بلالو، اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو۔

یہ حیرت انگیز دعوی ہے، جو ساری انسانی تاریخ میں کسی بھی مصنف نے نہیں کیا اور نہ بقید ہوش وحواس کوئی مصنف ایسا دعوی کرنے کی جرأت کرسکتا ہے؛ کیوں کہ کسی بھی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب لکھ دے جس کے ہم پایہ کتاب دوسرے انسان نہ لکھ سکتے ہوں، ہر انسانی تصنیف کے جواب میں اسی درجہ کی دوسری انسانی تصنیف تیار کی جاسکتی ہے، قرآن کریم کا یہ کہنا کہ وہ ایک ایسا کلام ہے کہ اس جیسا کلام انسانی ذہن تخلیق نہیں کرسکتا، اور ڈیڑھ ہزار برس تک کسی انسان کا اس پر قادر نہ ہونا، قطعی طور پر ثابت کر دیتا ہے کہ یہ ایک غیر انسانی کلام ہے، یہ خدائی منبع (Divine

Origin) سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں، اور جو چیز خدائی منبع سے نکلی ہو اس کا جواب کون دے سکتا ہے۔

تاریخ میں چند مثالیں ملتی ہیں جب کہ اس چیلنج کو قبول کیا گیا، سب سے پہلا واقعہ لبید بن ربیعہ کا ہے جو عربوں میں اپنے قوت کلام اور تیزئ طبع کے لئے مشہور تھا، اس نے جواب میں ایک نظم لکھی جو کعبہ کے پھاٹک پر آویزاں کی گئی، اور یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو صرف کسی اعلیٰ ترین شخص ہی کو ملتا تھا، اس واقعہ کے جلد ہی بعد کسی مسلمان نے قرآن کی ایک سورہ لکھ کر اس کے قریب آویزاں کردی، لبید (جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے) جب اگلے روز کعبہ کے دروازہ پر آئے اور سورہ کو پڑھا تو ابتدائی فقروں کے بعد ہی وہ غیر معمولی طور پر متأثر ہوئے اور اعلان کیا کہ بلاشبہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے، اور اس پر میں ایمان لاتا ہوں، (Mohammad the Holy Prophet, by H.G. Sarwar, p.448) حتی کہ عرب کا مشہور شاعر قرآن کریم کے ادب سے اس قدر متأثر ہوا کہ اس کی شاعری چھوٹ گئی، بعد میں ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے اشعار کی فرمائش کی تو انہوں نے جواب دیا:

''جب خدا تعالیٰ نے مجھے بقرہ اور آل عمران جیسا کلام دیا ہے تو اب شعر کہنا میرے لئے زیبا نہیں۔''

دوسرا واقعہ اس سے زیادہ عجیب جو ابن المقفع کا ہے، وہ یہ ہے کہ منکرین مذہب کی ایک جماعت نے یہ دیکھ کر کہ قرآن کریم لوگوں کو بڑی شدت سے متأثر کر رہا ہے، یہ طے کیا کہ اس کے جواب میں ایک کتاب تیار کی جائے، انہوں نے اس مقصد کے لئے ابن المقفع (م: ۷۲۷ء) سے رجوع کیا، جو اس زمانہ کا ایک زبردست عالم، بے مثال ادیب اور غیر معمولی ذہین وطباع آدمی تھا، ابن مقفع کو اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا کہ وہ راضی ہوگیا، اس نے کہا کہ میں ایک سال میں یہ کام کردوں گا، البتہ اس نے یہ شرط لگائی کہ اس پوری مدت میں اس کی تمام ضروریات کا مکمل انتظام ہونا چاہئے؛ تاکہ وہ کامل یکسوئی کے ساتھ اپنے ذہن کو اپنے کام میں مرکوز رکھے۔

نصف مدت گذر گئی تو اس کے ساتھیوں نے یہ جاننا چاہا کہ اب تک کیا کام ہوا ہے، وہ جب اس کے پاس گئے تو انہوں نے اس کو اس حال میں پایا کہ وہ بیٹھا ہوا ہے، قلم اس کے ہاتھ میں ہے، گہرے مطالعہ میں مستغرق ہے، اس مشہور ایرانی ادیب کے سامنے ایک سادہ کاغذ پڑا ہوا ہے، اس کی نشست کے پاس لکھ کر پھاڑے ہوئے کاغذات کا ایک انبار ہے اور اسی طرح سارے کمرہ میں کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا ہے، اس انتہائی قابل اور فصیح اللسان شخص نے اپنی بہترین قوت صرف کرکے قرآن مجید کا جواب لکھنے کی کوشش کی؛ مگر وہ بری طرح ناکام رہا، اس نے پریشانی کے عالم میں اعتراف کیا کہ صرف ایک فقرہ لکھنے کی جدوجہد میں اس کے چھ مہینے گذر گئے؛ مگر وہ نہ لکھ سکا، چنانچہ ناامید وشرمندہ ہوکر وہ اس خدمت سے دست بردار ہوگیا۔

اس طرح قران کریم کا چیلنج بدستور آج تک قائم ہے اور صدیاں گذر گئیں؛ مگر کوئی اس کا جواب نہ دے سکا، قرآن کریم کی یہ ایک حیرت انگیز خصوصیت ہے جو بلاشبہ یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ مافوق ہستی کا کلام ہے، اگر آدمی کے اندر فی

الواقع سوچنے کی صلاحیت ہوتو یہی واقعہ ایمان لانے کے لئے کافی ہے۔

قرآن کریم کے اس معجزانہ کلام کا نتیجہ تھا کہ عرب کے لوگ جوفصاحت وبلاغت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، اورجن کواپنے کلام کی برتری کا اتنا احساس تھا کہ عرب کے سوا بقیہ دنیا کو عجم (گونگا) کہتے تھے، وہ قرآن کریم کے کلام کے آگے جھکنے پر مجبور ہو گئے، تمام لوگوں کواس کے شاندار ادب کا اعتراف کرنا پڑا، ضماد ازدی نام کے ایک عرب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے ، وہ ابھی اسلام نہیں لائے تھے، آپ نے انہیں قرآن کریم کا کچھ حصہ پڑھ کر سنایا، وہ سن کر حیران رہ گئے، ان کی زبان سے بے اختیار یہ فقرہ نکلا۔

’’خدا کی قسم میں نے کاہنوں کی بولی، جادوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصائد سنے ہیں، مگر تمہارا کلام کچھ اور ہی ہے، یہ سمندر تک میں اثر کر جائے گا۔(مسلم: باب تخفیف الصلاۃ)

اس طرح کے بےشمار اعترافات ہیں جو قدیم تاریخ میں بھی موجود ہیں، اور حال کے واقعات میں بھی۔

قرآن کریم ایک ابدی کتاب ہے، اس لحاظ سے یہ ایک ابدی چیلنج ہے، قیامت تک کے تمام انسان اس کے مخاطب ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن کی وہ کون سی خصوصیت ہے جو انسان کے لئے ناقابل تقلید ہے، اس کے مختلف پہلو ہیں، یہاں ہم اس کے صرف ایک پہلو کا ذکر کریں گے ، جو قرآن کریم میں ان لفظوں میں بیان ہوا ہے:

أفلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا.(کیا لوگ قران میں غور وفکر نہیں کرتے اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس کے اندر بڑا اختلاف پاتے۔)

اس آیت میں ’’اختلاف‘‘ کی تفسیر تفاوت، تعارض، تناقض، تضاد وغیرہ الفاظ سے کی گئی ہے۔

کلام میں تناقض نہ ہونا صرف خداوند قدوس کی ہی نادر صفت ہے:

کلام میں تناقض نہ ہونا ایک انتہائی نادر صفت ہے، جو صرف خدائے ذوالجلال کے یہاں پائی جاسکتی ہے، کسی انسان کے لئے ایسا کلام تخلیق کرنا ممکن نہیں، تناقض سے پاک کلام وجود میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ صاحب کلام کا علم ماضی سے مستقبل تک کے امور کا احاطہ کئے ہوئے ہو، وہ تمام موجودات کا کلی علم رکھتا ہو، وہ چیزوں کی اصل ماہیت سے بلا اشتباہ پوری طرح باخبر ہو، اس کا علم براہ راست واقفیت پر مبنی ہو نہ کہ بالواسطہ معلومات پر، اسی کے ساتھ اس کے اندر یہ انوکھی خصوصیت ہو کہ وہ اشیاء کو غیر متأثر ذہن سے ٹھیک ویسا ہی دیکھ سکتا ہو جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔

خدائی خاصہ:

کلام میں تضاد کا معاملہ کوئی اتفاقی معاملہ نہیں، یہ انسانی فکر کا لازمی خاصہ ہے، یہ دنیا اس طرح بنی ہے کہ وہ صرف خدائی فکر کو قبول کرتی ہے، خدا تعالیٰ کے سوا دوسری بنیاد پر جو نظریہ بھی بنایا جائے گا، وہ فوراً تضاد کا شکار ہو جائے گا، وہ کائنات کے مجموعی ڈھانچہ سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتا۔

اس دنیا میں کسی انسانی نظریہ کے لئے ممکن نہیں کہ وہ فکری تضاد سے خالی ہوسکے، اس بات کو ہم یہاں مثال کے ذریعہ واضح کریں گے۔

نظریۂ ارتقاء کے جواز کے لئے مختلف حیلے پھر بھی ناکامی:

اس کی ایک مثال حیاتیاتی ارتقاء کا نظریہ ہے، ڈارون (۱۸۸۲-۱۸۰۹) اور دوسرے سائنس دانوں نے دیکھا کہ زمین پر جو مختلف انواع حیات موجود ہیں، ان میں ظاہری اختلافات کے باوجود حیاتیاتی نظام کے اعتبار سے کافی مشابہت پائی جاتی ہے، مثلاً گھوڑے کا ڈھانچہ اگر کھڑا کیا جائے تو وہ انسان کے ڈھانچہ سے ملتا جلتا نظر آئے گا۔

اس قسم کے مختلف مشاہدات سے انہوں نے یہ نظریہ قائم کرلیا کہ انسان کوئی علیحدہ نوع نہیں، انسان اور حیوان دونوں ایک ہی مشترک نسل سے تعلق رکھتے ہیں، رینگنے والے جانور، چوپائے اور بندر سب حیاتیات کے سفر ارتقاء کی پچھلی کڑیاں ہیں، اور انسان اس سفر ارتقاء کی اگلی کڑی ہے۔

یہ نظریہ ایک سوسال تک انسانی ذہن پر حکمران رہا، مگر بعد کو مزید مطالعہ نے بتایا کہ وہ کائنات کے مجموعی نظام سے ٹکراتا رہا ہے۔

مثال کے طور پر سائنسی طریقوں کے استعمال سے اب یہ معلوم ہوگیا ہے کہ زمین کی عمر کیا ہے، چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً دو ہزار ملین سال پہلے زمین وجود میں آئی، یہ مدت ڈارون کے مفروضہ ارتقاء کو ظہور میں لانے کے لئے انتہائی حد تک ناکافی ہے، سائنس دانوں نے حساب لگا کر اندازہ کیا ہے کہ صرف ایک پروٹینی سالمہ کے مرکب کو ارتقائی طور پر وجود میں لانے کے لئے لاکھوں ملین سال سے بھی زیادہ لمبی مدت درکار ہے، پھر صرف دو ہزار ملین سال میں زمین کی سطح پر مکمل اجسام رکھنے والے حیوانات کی دس لاکھ سے زیادہ قسمیں کیسے بن گئیں اور نباتات کی دو لاکھ سے زیادہ تکمیل یافتہ قسمیں کیوں کر وجود میں آ گئیں، اس قلیل مدت میں تو ایک معمولی حیوان بھی نہیں بن سکتا، تو پھر مفروضہ ارتقاء کے مطابق لاتعداد مراحل سے گذر کر انسان جیسی اعلیٰ مخلوق کیسے ظہور میں آجائے۔

نظریہ ارتقاء حیاتیاتی عمل میں جن نوعی تبدیلیوں کو فرض کرتا ہے، ان کے متعلق ریاضیات کے ایک عالم پاچو (Patau) نے حساب لگایا ہے، اس کے مطابق کسی نوع میں ایک چھوٹی سی تبدیلی کو مکمل ہونے کے لئے دس لاکھ پشتوں کی مدت درکار ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر مفروضہ ارتقائی عمل کے ذریعہ کتے جیسی نسل میں ان گنت تبدیلیوں کے جمع ہونے سے گھوڑے جیسا بالکل مختلف جانور بنے تو اس کے بننے میں کس قدر زیادہ لمبا عرصہ درکار ہوگا۔

اس مشکل کو حل کرنے کے لئے وہ نظریہ وضع کیا گیا، جس کو پین سپرمیا (Panspermia) کا نظریہ کہا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ تھا کہ زندگی ابتداءً زمین کے باہر بالائی خلا میں کسی مقام پر پیدا ہوئی اور وہاں سے سفر کر کے زمین پر آگئی، مگر تحقیق نے بتایا کہ اس کو ماننے میں اور بھی زیادہ بڑی بڑی مشکلیں حائل ہیں، زمین کے علاوہ وسیع کائنات کے کسی بھی ستارہ

یا سیارہ پر وہ اسباب موجود نہیں ہیں، جہاں زندگی جیسی چیز نشو ونما پا سکے، مثلاً پانی جو زندگی کے ظہور اور بقاء کے لئے لازمی طور پر ضروری ہے وہ اب تک کی معلومات کے مطابق زمین کے سوا کہیں اور موجود نہیں۔

پھر کچھ ذہین افراد نے فجائی ارتقاء (Emergent Evolytion) کا نظریہ وضع کیا، اس کے مطابق فرض کیا گیا کہ زندگی یا اس کی انواع بالکل اچانک پیدا ہو جاتی ہیں، مگر ظاہر ہے کہ یہ محض ایک لفظ ہے نہ کہ کوئی علمی نظریہ، اچانک پیدائش کبھی اندھے مادی قوانین کے ذریعہ ممکن نہیں، اچانک پیدائش کا نظریہ لازمی طور پر ایک مداخلت کرنے والے کا تقاضہ کرتا ہے، یعنی اس خارجی عامل (حق سبحانہ وتعالیٰ) کا جس کو نہ ماننے کے لئے یہ تمام نظریات گھڑے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی توجیہ ایک خالق کو مانے بغیر ممکن ہی نہیں، خالق کو چھوڑ کر دوسری جو بنیاد بھی تلاش کی جائے گی وہ کائنات کے نقشہ سے ٹکرا جائے گی، وہ اس کے ڈھانچے میں جگہ نہیں پا سکتی۔

سائنسدانوں کی لاعلمی کا اعتراف (قاموس جہالت):

لندن سے ایک کتاب چھپی ہے، جس کا نام ہے ''قاموس جہالت''، اس قاموس کی ترتیب میں مختلف شعبوں کے ممتاز اہل علم نے حصہ لیا ہے، اس کے تعارف نامہ میں بتایا گیا ہے کہ قاموس جہالت میں ساٹھ نہایت معروف سائنس دانوں نے مختلف تحقیقی شعبوں کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ دنیا کے متعلق ہمارے علم میں کون سے بامعنی خلا پائے جاتے ہیں؟

یہ کتاب درحقیقت اس واقعہ کا علمی اعتراف ہے کہ دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ کسی بھی میکانیکل توجیہ کو قبول نہیں کرتی، مثال کے طور پر پروفیسر جان مینارڈ اسمتھ نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ نظریہ ارتقاء ناقابل حل اندرونی مسائل (Built-in problems) سے دوچار ہے، کیوں کہ ہمارے پاس نظریات ہیں، مگر ہمارے پاس وہ ذرائع نہیں ہے کہ ہم حقیقی واقعات سے اپنے نظریات کی تصدیق کر سکیں۔

قرآن کریم کے مطابق انسان اور دوسری تمام انواع خدا کی تخلیق ہیں، اس کے برعکس نظریہ ارتقاء زندگی کی تمام قسموں کو اندھے مادی عمل کا نتیجہ قرار دیتا ہے، قرآن کریم کا جواب اپنی توجیہ آپ ہے، کیوں کہ خدا تعالیٰ ایک صاحب ارادہ ہستی ہے، وہ اسباب کا محتاج نہیں ہے، وہ اپنی مرضی کے تحت کسی بھی واقعہ کو ظہور میں لا سکتا ہے، اس کے برعکس ارتقائی عمل کے لئے ضروری ہے کہ ہر واقعہ کے پیچھے اس کا کوئی سبب پایا جائے، چوں کہ ایسے اسباب کی دریافت ممکن نہیں اس لئے نظریہ ارتقاء اس دنیا میں بے توجیہ ہو کر رہ جاتا ہے، ارتقاء کا نظریہ لازمی منطقی خلا سے دوچار ہے، جب کہ قرآن مجید کے نظریہ میں کوئی منطقی خلا نہیں پایا جاتا۔

فلسفۂ سیاست (جمہوریت کی حقیقت):

یہی معاملہ فلسفۂ سیاست کا ہے، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار کے الفاظ میں: سیاسی فلسفہ اور سیاسی اختلافات بنیادی طور پر ایک ہی سوال کے گرد گھومتے ہیں، وہ یہ کہ کس کو کس کے اوپر اقتدار حاصل ہو؟

اس میدان فکر میں پچھلے پانچ ہزار سال سے اعلی ترین انسانی دماغ اپنی کوششیں صرف کررہے ہیں، اس کے باوجود علم سیاسیات کا مربوط نظام بنانے کے لئے وہ چیز دریافت نہ ہوسکی جس کو اسپنوزا نے علمی بنیاد (Scientific base) کہا ہے۔

علم سیاست میں ایک درجن سے زیادہ مدارس فکر پائے جاتے ہیں، تاہم وسیع تقسیم میں وہ صرف دو ہیں، ایک وہ جو شخصی اقتدار کی وکالت کرتے ہیں، دوسرے وہ جو جمہوری اقتدار کے حامی ہیں، ان دونوں ہی پر سخت ترین اعتراضات کئے جاتے ہیں، شخصی اقتدار کے نظریہ پر یہ اعتراض واقع ہوتا ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے اوپر کیوں حاکمانہ اقتدار حاصل ہو، چنانچہ وہ کبھی قبولیت عام حاصل نہ کرسکا، دوسرا نظریہ وہ ہے جس کو جمہوری اقتدار کا نظریہ کہا جاتا ہے، عملاً اگرچہ یہ ایک مقبول نظریہ ہے مگر نظری اور فکری اعتبار سے اس پر سخت ترین شبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔

جمہوریت (ڈیموکریسی) کا نظریہ، اس عقیدہ پر قائم ہے کہ تمام انسان آزاد ہیں اور برابر کے حقوق رکھتے ہیں، روسو کی کتاب معاہدہ عمرانی (Social Contract) کا پہلا فقرہ یہ ہے: انسان آزاد پیدا ہوا ہے، مگر میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھ رہا ہوں۔

ڈیموکریسی ایک یونانی لفظ ہے، اس کے معنی ہیں حکومت بذریعہ عوام (Rule by the people) مگر عملاً ناممکن ہے کہ تمام عوام کی حکومت قائم ہوسکے، سارے لوگوں پر سارے لوگ آخر کس طرح حکومت کریں گے، مزید یہ ہے کہ انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سماجی حیوان (Social animal) ہے، انسان اس دنیا میں اکیلا نہیں ہے کہ وہ جس طرح چاہے رہے، بلکہ وہ سماجی مجموعہ کے ساتھ وابستہ ہے، ایک مفکر کے الفاظ میں، انسان آزاد نہیں پیدا ہوا ہے، انسان ایک سماج کے اندر پیدا ہوتا ہے، جو کہ اس کے اوپر پابندیاں عائد کرتا ہے۔

جب سارے عوام بیک وقت حکومت نہیں کرسکتے تو عوامی حکومت کا نظام کس طرح بنایا جائے، اس سلسلہ میں مختلف نظریئے پیش کئے گئے، سب سے زیادہ مقبول نظریہ روسو کا نظریہ ہے، جس کو اس نے رائے عامہ (General will) کی بنیاد پر قائم کیا ہے، یہ رائے عامہ حکمران افراد کے انتخاب میں ظاہر ہوتی ہے، اس طرح عوام کی حکومت عملاً منتخب افراد کی حکومت بن جاتی ہے، عوام کو انتخاب میں ووٹ دینے کی کسی قدر آزادی ہوتی ہے، مگر ووٹ دینے کے بعد وہ دوبارہ اپنے جیسے کچھ افراد کے محکوم بن جاتے ہیں، روسو نے اس کا جواب یہ دیا کہ ایک شخص کی خواہش کی پیروی غلامی ہے، مگر خود اپنے مقرر کردہ قانون کی پیروی کرنا آزادی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ جواب ناکافی تھا، چنانچہ اس نظریہ کو دوبارہ سخت اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا، کیوں کہ لوگ دیکھ رہے تھے کہ خوب صورت الفاظ کے باوجود منتخب جمہوریت عملاً منتخب بادشاہت (Elective monarchy) کا دوسرا نام ہے، انتخاب کے بعد جمہوری افراد وہی کچھ بن جاتے ہیں، جو اس سے پہلے شاہی افراد بنے ہوئے تھے۔

اس طرح تمام سیاسی مفکرین تضاد فکری کا شکار ہیں، جس سے نکلنے کا کوئی راستہ انہیں نظر نہیں آتا، اعتقادی طور پر

سب کے سب مساوات انسانی کو اعلی ترین قدر مانتے ہیں، مگر انسانی مساوات حقیقی معنوں میں نہ شاہی نظام میں حاصل ہوتی ہے اور نہ جمہوری نظام میں، شاہی نظام اگر خاندانی بادشاہت ہے تو جمہوری نظام انتخابی بادشاہت، اٹھارویں اور انیسویں صدی میں شاہی نظام کے خلاف زبردست بغاوت ہوئی، مگر جب شاہی افراد کی محکومی ختم ہوگئی تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان کے لئے دوسرا بدل صرف یہ ہے کہ نمائندہ افراد کی محکومی پر اپنے آپ کو راضی کرلیں، دونوں نظاموں میں جو فرق تھا وہ صرف یہ کہ نئے حکمران اپنے کو زمین پر عوام کا نمائندہ کہتے تھے، جب کہ پرانے حکمرانوں کا کہنا تھا کہ وہ زمین پر خدا کے نمائندہ (Representative of God on earth) ہیں۔

برٹانیکا کے مقالہ نگار نے اس معاملہ میں انسان کی ناکامی کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

The history of political philosophy from Plato until the present day makes plain modern political philosophy is still faced with th basic problems.(14/695)

سیاسی فلسفہ کی تاریخ، افلاطون سے لے کر اب تک ظاہر کرتی ہے کہ جدید سیاسی فلسفہ ابھی تک بنیادی مسائل سے دوچار ہے۔

بادشاہت یا جمہوریت میں اقتدار اعلی کا حق انسانوں میں سے کچھ انسان کو دینا پڑتا ہے، اس طرح دونوں نظام مساواتِ انسانی کی تردید بن جاتے ہیں، جمہوریت عین مساوات انسانی ہی کے نام پر پیش کی گئی، مگر وہ اپنے اندرونی تضاد کی وجہ سے برعکس نتیجہ کی حامل ثابت ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی سیاسی فلسفہ ہے، جو اس دنیا میں فکری تضاد سے خالی ہوسکتا ہے اور وہ قرآن کا فلسفہ ہے، قرآن کریم خدائی حاکمیت کا نظریہ پیش کرتا ہے:

یقولون ھل لنامن الامر من شیٔ، قل ان الامر کلہ للہ۔ (آل عمران: ۱۵۴) یعنی وہ کہتے ہیں کہ کیا حکم میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے، کہو کہ حکم سب اللہ تعالیٰ کا ہی ہے۔

یہ نظریہ فکری تضاد سے پوری طرح خالی ہے، جب خدا حاکم اور تمام لوگ محکوم ہوں تو سارے انسان برابر ہوجاتے ہیں، ایک انسان اور دوسرے انسان کا تمام فرق مٹ جاتا ہے، اب فرق صرف خالق اور مخلوق کے درمیان رہتا ہے نہ کہ مخلوق اور مخلوق کے درمیان۔

خدا کی حاکمیت میں تمام انسان برابر کا درجہ پالیتے ہیں، کیوں کہ اقتدار انسانوں سے باہر ایک بالاتر ہستی میں تفویض کردیا جاتا ہے، اس کے برعکس بادشاہت یا جمہوریت میں مساوات کی قدر باقی نہیں رہتی، کیوں کہ ان میں ایک انسان کے مقابلہ میں دوسرے انسان کو صاحب اقتدار ماننا پڑتا ہے۔

خدا کی حاکمیت کا نظریہ ایک مربوط نظام فکر بناتا ہے، جو ہر قسم کے تضادات سے خالی ہے، جب کہ انسانی حاکمیت کا کوئی

نظریہ بھی ایسا نہیں بنایا جا سکتا، جو تضاد اور تناقض سے پاک ہو۔

تمام سیاسی نظریات کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان حاکم اور محکوم کی تقسیم ختم کریں، مگر انسانی نظام میں یہ تقسیم کبھی ختم نہیں ہوسکتی، خواہ جو بھی سیاسی نظام بنایا جائے، یہ صورت ہمیشہ باقی رہے گی کہ کچھ لوگ ایک یا دوسرے نام پر حاکم بن جائیں گے اور بقیہ لوگ محکوم کی حیثیت اختیار کرلیں گے، مگر جب خدا کو حاکم مان لیا جائے تو یہ تقسیم اپنے آپ ختم ہوجاتی ہے، اب ایک طرف خدا ہوتا ہے اور دوسری طرف انسان، حاکم اور محکوم کی تقسیم صرف خدا اور انسان کے درمیان رہتی ہے، باقی جہاں تک انسان اور انسان کے درمیان کا معاملہ ہے، سب انسان مساوی طور پر یکساں حیثیت کے مالک ہوجاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان حاکم اور محکوم کی تقسیم ختم کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ خدا کو بادشاہ حقیقی مان کر سب انسان اپنے آپ کو اس کی ماتحتی میں دے دیں، یہی واحد سیاسی نظریہ ہے جو فکری تضاد سے پاک ہے، دوسرا کوئی بھی نظریہ فکری تضاد سے خالی نہیں ہوسکتا۔

تضاد کی قسمیں:

قرآن کریم کی مذکورہ آیت (النساء: ۸۲) میں جس تضاد یا نامطابقت کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے دو خاص پہلو ہیں، ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔

داخلی غیر مطابقت یہ ہے کہ کتاب کا ایک بیان کتاب کے دوسرے بیان سے ٹکرا رہا ہو، خارجی غیر مطابقت یہ ہے کہ کتاب کا بیان خارجی دنیا کے حقائق سے ٹکرا جائے، قرآن کریم کا دعوی ہے کہ وہ ان دونوں قسم کے تضادات سے خالی ہے، جب کہ کوئی بھی انسانی تصنیف ان سے خالی نہیں ہوسکتی، یہی واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن کریم غیر انسانی ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے، اگر وہ ایک انسانی کلام ہوتا تو یقیناً اس کے اندر بھی وہی کمی پائی جاتی جو تمام انسانی کلام میں غیر استثنائی طور پر پائی جاتی ہے۔

داخلی تضاد:

کلام میں داخلی تضاد حقیقۃً متکلم کی شخصیت میں داخلی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے، داخلی تضاد سے بچنے کے لئے دو چیزیں لازمی طور پر ضروری ہیں، ایک کامل علم اور دوسرے کامل موضوعیت (Objectivity) کوئی انسان ان دونوں کمیوں سے خالی نہیں ہوتا، اس لئے انسان کا کلام داخلی تضاد سے پاک بھی نہیں ہوتا، یہ صرف خداوند قدوس ہے جو تمام کمیوں سے پاک ہے، اس لئے صرف خدا کا کلام ہی وہ کلام ہے، جو داخلی تضاد سے پوری طرح خالی ہے۔

انسان اپنی محدودیت کی وجہ سے بہت سی باتوں کو اپنی عقل کی گرفت میں نہیں لاسکتا، اس لئے قیاسی طور پر کبھی وہ ایک بات کہتا ہے اور کبھی دوسری، ہر انسان کا حال ہے کہ وہ ناپختہ عمر سے پختہ عمر کی طرف سفر کرتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے

کہ وہ نا پختہ عمر میں جو بات کہتا ہے پختہ عمر کو پہونچ کر وہ خود اس کے خلاف بولنے لگتا ہے، ہر آدمی کا علم اور تجربہ بڑھتا رہتا ہے، اس بناء پر اس کا ابتدائی کلام کچھ ہوتا ہے اور آخری کلام کچھ اور، انسان کی عمر بہت تھوڑی ہے، اس کی واقفیت ابھی مکمل نہیں ہوتی کہ اس کی موت آجاتی ہے، وہ اپنی نامکمل واقفیت کی بناء پر ایسی بات کہتا ہے جو اس کے بعد درست ثابت نہیں ہوتی۔

اسی طرح آدمی کو کسی سے دوستی ہوتی ہے اور کسی سے دشمنی، وہ کسی سے محبت کرتا ہے اور کسی سے نفرت، وہ کسی کے بارے میں سادہ ذہن کے تحت سوچتا ہے اور کسی کے بارے میں ردعمل کی نفسیات کا شکار ہو جاتا ہے، انسان پر کبھی غم کا لمحہ گذرتا ہے اور کبھی خوشی کا، وہ کبھی ایک ترنگ میں ہوتا ہے اور کبھی دوسری ترنگ میں، اس بنا پر انسان کے کلام میں یکسانیت نہیں ہوتی، وہ کبھی ایک طرح کی بات کہتا ہے اور کبھی دوسری طرح کی بات بولنے لگتا ہے۔

خدا تعالیٰ ان تمام کمیوں سے پاک ہے، اس لئے اس کا کلام ہمیشہ یکساں ہوتا ہے اور ہر قسم کے تناقض سے خالی بھی۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا نسب نامہ (بائبل کا تضاد):

مثال کے طور پر بائبل کو لیجئے، بائبل اپنی ابتدائی حالت میں خدا کا کلام تھی، مگر بعد کو اس میں انسانی ملاوٹ ہوئی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں کثرت سے داخلی تضادات پیدا ہو گئے، بائبل کا وہ حصہ جس کو انجیل یا نیا عہد نامہ کہا جاتا ہے اس میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نسب نامہ دیا گیا ہے، یہ نسب نامہ متیٰ کی انجیل میں اس طرح شروع ہوتا ہے:

یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابراہام کا نسب نامہ

یہ مختصر نسب نامہ ہے، اس کے بعد انجیل میں مفصل نسب نامہ ہے جو حضرت ابراہیم سے شروع ہوتا ہے، اور آخر میں ''یوسف'' پر ختم ہوتا ہے، جو اس کے بیان کے مطابق مریم کے شوہر تھے جن سے حضرت مسیح پیدا ہوئے۔

اس کے بعد قاری مرقس کی انجیل تک پہونچتا ہے تو وہاں کتاب کے آغاز میں حضرت مسیح کا نسب نامہ ان لفظوں میں ملتا ہے: یسوع مسیح ابن خدا۔

گویا انجیل کے ایک باب کے مطابق حضرت مسیح یوسف نامی ایک شخص کے فرزند تھے، اور اسی انجیل کے دوسرے باب کے مطابق حضرت مسیح ابن خدا (خدا کے بیٹے) تھے۔

انجیل اپنی ابتدائی صورت میں یقینا خدائی کلام تھی اور تضادات سے پاک تھی، مگر بعد کو اس میں انسانی کلام شامل ہو گیا۔

انجیل کے اس تضاد کی تاویل کلیسا نے ایک اور عجیب وغریب تضاد سے کی ہے، چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مطابق وہ مذکور یوسف کے لئے حسب ذیل الفاظ استعمال کرتے ہیں:

Christs earthly fathar, the Virgin Mary's husband

مسیح کا ارضی باپ، کنواری مریم کا شوہر۔

یہ مذہبی کلام میں داخلی تضاد کی مثال تھی، اب غیر مذہبی کلام میں داخلی تضاد کی مثال لیجئے!

کارل مارکس کا فکری تضاد:

مثال کے طور پر مارکس نے دنیا کی تمام خرابیوں کا سبب سماج میں طبقات کا ہونا بتایا ہے، یہ طبقات اس کے نزدیک انفرادی ملکیت کے نظام کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، ایک طبقہ (سرمایہ دار) ذرائع پیداوار پر قابض ہوکر دوسرے طبقہ (محنت کش طبقہ) کو لوٹتا ہے۔

اس کا حل مارکس نے یہ تجویز کیا کہ سرمایہ دار طبقہ سے اس کی ملکیتیں چھین لی جائے اور ان کو مزدور طبقہ کے زیر انتظام دے دیا جائے، اس کارروائی کو وہ بے طبقاتی سماج (Classless Socitey) قائم کرنے کا نام دیتا ہے، مگر یہ کھلی ہوئی تضاد فکری ہے، کیوں کہ مذکورہ کارروائی سے جو چیز وقوع میں آئے گی، وہ طبقاتی سماج نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ معاشی ذرائع پر ایک طبقہ کا قبضہ ختم ہوکر دوسرے طبقہ کا قبضہ شروع ہوجائے، یہ طبقات کا خاتمہ نہیں؛ بلکہ صرف طبقات کی تبدیلی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ پہلے یہ قبضہ ملکیت کے نام پر تھا اور اب یہ قبضہ انتظام کے نام پر ہوگا، وہ چیز جس کو مارکس بے طبقاتی سماج کہتا ہے، وہ عملاً سرمایہ دار طبقہ کی ملکیت کو ختم کرکے کمیونسٹ طبقہ کی ملکیت قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

مارکس ایک ہی چیز کو ایک جگہ برائی کہتا ہے اور دوسری جگہ بھلائی، مگر سرمایہ داروں کے خلاف شدید نفرت اور تعصب کی وجہ سے اس کو اپنا یہ فکری تضاد دکھائی نہیں دیا، وہ ذرائع معاش کو سرمایہ داروں کے بجائے عہدہ داروں کے قبضہ میں دے رہا تھا، مگر اپنے متعصّبانہ اندھے پن کی وجہ سے وہ اپنے تضاد کو محسوس نہ کرسکا، ایک نوعیت کے دو واقعات میں سے ایک واقعہ کو اس نے انفرادی لوٹ کہا اور دوسرے کو اجتماعی تنظیم۔

قرآن کریم اس قسم کے داخلی تضاد سے مکمل طور پر خالی ہے، اس کا کوئی بیان اس کے دوسرے بیان سے نہیں ٹکراتا، قرآن کریم کے تمام بیانات میں کامل قسم کی داخلی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

خارجی نامطابقت:

اس معاملہ کا دوسرا پہلو خارجی نامطابقت ہے، یعنی کسی امر میں کتاب کے اندر جو بات کہی گئی ہے وہ کتاب کے باہر پائی جانے والی حقیقت کے مطابق نہ ہو، یہ ایک ایسی کمی ہے جو تمام انسانی تصنیفات میں پائی جاتی ہے، انسان اپنی معلومات کے دائرہ میں بولتا ہے، اور انسان کی معلومات کا دائرہ چونکہ محدود ہے، اس لئے اس کی زبان یا قلم سے ایسی باتیں نکلتی ہیں جو خارجی صورت حال سے مطابقت نہ رکھتی ہوں، یہاں ہم چند تقابلی مثالیں بیان کریں گے۔

ضبط ولادت کا فلسفہ (رابرٹ مالتھس کا غلط اندازہ):

قدیم عرب میں ایک رواج یہ تھا کہ بعض اوقات کوئی شخص اپنی اولاد کو اس اندیشے سے قتل کردیتا تھا کہ افراد

خاندان زیادہ ہوجائیں گےتو ان کے لئے کھانے پینے کا انتظام نہ ہو سکے گا، اس سلسلہ میں قرآن میں یہ حکم اترا:

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق، نحن نرزقھم وایاکم، ان قتلھم کان خطأً کبیراً. (الاسراء:۳۱)

اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے قتل نہ کرو، ہم ان کو بھی روزی دیں گے اور تم کو بھی، بے شک ان کو مار ڈالنا ایک بڑی غلطی ہے۔

یہ اعلان گویا ایک قسم کا دعوی تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ مستقبل میں آبادی کا کوئی بھی اضافہ زمین پر رزق کی تنگی کا مسئلہ پیدا نہیں کرے گا، انسانی تعداد کے مقابلے میں غذائی اشیاء کا تناسب ہمیشہ موافق طور پر برقرار رہے گا، جس طرح آج سب کو ان کی روزی مل رہی ہے، اسی طرح آئندہ بھی سب کو ان کی روزی ملتی رہے گی۔

مسلمان ہر دور میں اعتقادی طور پر اس اعلان کی صداقت کو مانتے رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں کبھی بھی وہ ذہن پیدا نہیں ہوا جس کو موجودہ زمانہ میں تحدید نسل یا برتھ کنٹرول کہتے ہیں، وہ خدا کی رزاقی پر بھروسہ کرتے ہوئے رزق کے معاملہ کو خدا پر چھوڑ دیتے ہیں، مگر اس اعلان کے ایک ہزار سال بعد انگریز ماہر معاشیات رابرٹ مالتھس (۱۸۳۴-۱۷۶۶) پیدا ہوا، ۱۷۹۸ میں ''اصول آبادی'' اس کی مشہور کتاب چھپی۔

مالتھس نے اس کتاب میں وہ مشہور نظریہ پیش کیا، جس کا خلاصہ اس کے الفاظ میں یہ تھا:

Population. When unchecked, increases in a geometrical ratio. Subsistence only increases in an arithmetical ratio.

آبادی، جب کہ وہ بے قید طور پر چھوڑ دی جائے، جیومیٹری کے تناسب سے بڑھتی ہے، اشیاء خوراک صرف ارتھمیٹک کے تناسب سے بڑھتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا اضافہ اور غذائی اشیاء کا اضافہ قدرتی طور پر یکساں نہیں ہے، انسانی آبادی کا اضافہ ۱-۲-۴-۸-۱۶-۳۲-۶۴ کے تناسب سے ہوتا ہے، اس کے برعکس غذائی اشیاء میں اضافہ کا تناسب ۱-۲-۳-۴-۵-۶-۷-۸-رہتا ہے، یعنی انسانی آبادی میں اضافہ نہایت تیز رفتار ہوتا ہے اور غذائی اشیاء میں اضافہ نہایت سست رفتار، اس بنا پر مالتھس نے کہا کہ زمین پر انسانی نسل کو بچانے کے لئے ضروری ہے کہ پیدائش پر کنٹرول قائم کیا جائے، انسان کی تعداد کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے نہ دیا جائے ورنہ بہت جلد ایسا ہوگا کہ آبادی اور غذائی اشیاء میں غیر متناسب اضافہ کی وجہ سے فاقہ کا دور شروع ہوجائے گا اور بے شمار انسان بھوک سے مرنے لگیں گے۔

مالتھس کی اس کتاب نے دنیا کی فکر پر زبردست اثر ڈالا، اس کی تائید میں بے شمار لکھنے اور بولنے والے پیدا ہوگئے، یہاں تک کہ ساری دنیا میں برتھ کنٹرول اور فیملی پلاننگ کی کوششیں شروع ہوگئیں، مگر اب محققین اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اس کا اندازہ سراسر غلط تھا، مسٹر گوائن ڈائر (Gwhnne Dyer) نے ان تحقیقات کا خلاصہ ایک مقالہ کی

صورت میں شائع کیا ہے، اس مقالہ کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے: مالتھس جھوٹا پیغمبر۔

(Malthus: The False Prophet)

مقالہ نگار جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مالتھس کی موت کو اب ۱۵۰/سال سے زیادہ سال گذر چکے ہیں اور اس کی سنگین پیشین گوئیاں ابھی تک پوری نہیں ہوئیں، دنیا کی آبادی جیومیٹری کے حساب سے دگنی اور چوگنی ہوگئی، جیسا کہ اس نے کہا تھا، اس میں جنگوں اور حوادث کی وجہ سے بس تھوڑا سا فرق پڑا ہے، جب مالتھس نے اپنی کتاب لکھی تھی اس وقت کی آبادی کے مقابلہ میں آج دنیا کی آبادی تقریباً آٹھ گنا ہو چکی ہے، مگر غذائی پیداوار بھی کچھ اضافہ کے ساتھ قدم بقدم چلتی رہی ہے، اور انسان کی موجودہ نسل کو اوسط طور پر تاریخ کی سب سے بہتر غذا مل رہی ہے''۔ (ہندوستان ٹائمس: ۲۸/دسمبر ۱۹۸۴)

رابرٹ مالتھس ''روایتی زراعت'' کے دوران پیدا ہوا، وہ اس کا اندازہ نہ کرسکا کہ جلد ہی ''سائنٹفک زراعت'' کا دور آنے والا ہے، جس کے بعد پیداوار میں غیر معمولی اضافہ کرنا ممکن ہو جائے گا، پچھلے ڈیڑھ سو سال میں زراعت کے طریقوں میں انقلابی تبدیلیاں ہوئی ہیں، اب ایسے منتخب بیج بوئے جاتے ہیں جو زیادہ فصل دینے والے ہوں، یہی معاملہ مویشیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، کھیتوں کو زرخیز کرنے کے مزید طریقے دریافت ہوگئے ہیں، نئی نئی کھادیں بڑے پیمانے پر استعمال ہونے لگی ہیں، مشین کی مدد سے ان مقامات پر کھیتی ہونے لگی ہے جہاں پہلے کھیتی کرنا ناممکن نظر آتا تھا، آج ترقی یافتہ ملکوں میں کسانوں کی تعداد میں ۹۰/ فیصد تک کمی کرنے کے باوجود زرعی پیداوار کو دس گنا تک بڑھا لیا گیا ہے، وغیرہ۔

تیسری دنیا (غیر ترقی یافتہ ممالک) کا جو رقبہ ہے، اس کے لحاظ سے اس میں ۳۳ بلین انسانوں کی آبادکاری کی گنجائش ہے، جب کہ اس کی موجودہ آبادی صرف ۲/بلین ہے، تیسری دنیا امکانی طور پر اپنی موجودہ آبادی کی پانچ گنا تعداد کو خوراک مہیا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، ایف، اے، او، (F.A.O.) نے اندازہ لگایا ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کی آبادی اگر بے قید طور پر بڑھتی رہے اور ۲۰۰۰ء میں چار ملین سے زیادہ ہو جائیں تب بھی کوئی خطرہ کی بات نہیں، کیوں کہ اندازہ کے مطابق اس وقت جو آبادی ہوگی اس سے ڈیڑھ گنا آبادی کو خوراک مہیا کرنے کے ذرائع پھر بھی تیسری دنیا کے علاقہ میں موجود ہوں گے۔

خوراک میں یہ اضافہ جنگلوں کو کاٹے بغیر ممکن ہو سکے گا، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ نہ تو عالمی سطح پر کسی غذائی بحران کا کوئی حقیقی اندیشہ ہے اور نہ علاقائی سطح پر، مسٹر گوائن ڈائر نے اپنی رپورٹ ان الفاظ پر ختم کی ہے:

Malthus was wrong. We are not doomed to breed ourselves into famine.

مالتھس غلطی پر تھا، ہمارے لئے یہ مقدر نہیں کہ ہماری اگلی نسلیں قحط میں پیدا ہوں۔

یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ مالتھس کی کتاب ''اصول آبادی'' انسانی ذہن کی پیداوار تھی، جو زمان ومکان کے اندر رہ کر سوچتا ہے، اس کے برعکس قرآن کریم ایک ایسے مقدس وبلند ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے جو زمان ومکان سے بلند ہوکر سوچنے کی طاقت رکھتا ہے، یہی فرق اس بات کا سبب ہے کہ مالتھس کا کلام خارجی حقیقت سے ٹکرا گیا اور قرآن کریم آخری حد تک خارجی حقیقتوں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، قرآن کے بیان اور خارجی واقعہ میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔

بائبل میں حضرت یوسف وحضرت موسیٰ علیہما السلام کے زمانہ کے بادشاہ کو فرعون تحریر کرنا

بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں ۲۰ ویں صدی قبل مسیح میں مصر میں داخل ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تیرہویں صدی قبل مسیح میں مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں گئے، یہ دونوں واقعات بائبل میں بھی مذکور ہیں اور قرآن کریم میں بھی، مگر قرآن مجید کے بیانات خارجی تاریخ سے کامل مطابقت رکھتے ہیں، چنانچہ بائبل کے معتقدین کے لئے یہ مسئلہ پیدا ہوگیا کہ وہ بائبل کے بیان کو لیں یا تاریخ کے بیان کو، کیوں کہ دونوں کو بیک وقت لینا ممکن نہیں۔

حضرت یوسف جس زمانہ میں مصر میں داخل ہوئے ہیں، اس زمانہ میں وہاں ان لوگوں کی حکومت تھی، جن کو تاریخ میں چرواہے بادشاہ (Hyksos Kings) کہا جاتا ہے، یہ لوگ عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے اور باہر سے آکر مصر پر قابض ہوگئے تھے، یہ خاندان دو ہزار سال قبل مسیح سے لے کر پندرہویں صدی قبل مسیح کے آخر تک مصر میں حکمران رہا، اس کے بعد مصر میں غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بغاوت ہوئی اور ہکسوس کی حکومت ختم کردی گئی۔

اس کے بعد مصر میں ملک والوں کی حکومت قائم ہوئی، اس وقت جس خاندان کو مصر کی بادشاہی ملی اس نے اپنے حکمرانوں کے لئے فرعون کا لقب پسند کیا، فرعون کے لفظی معنی سورج، دیوتا کی اولاد کے ہیں، اس زمانہ میں مصر کے لوگ سورج کو پوجتے تھے، چنانچہ حکمرانوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ سورج دیوتا کا مظہر ہیں، تاکہ مصریوں کے اوپر اپنا حق حکومت ثابت کیا جاسکے۔

بائبل حضرت یوسف کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کو بھی فرعون کہتی ہے، اور حضرت موسیٰ کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کو بھی فرعون کہتی ہے۔

مگر قرآن شریف اس قسم کے اختلاف بیانی سے خالی ہے، اس لئے حاملین قرآن کریم کے لئے یہ مسئلہ نہیں کہ قرآن کریم کو لینے کے لئے انہیں تاریخی حقیقت کو چھوڑنا پڑے، قرآن کریم کے زمانۂ نزول میں یہ تاریخی واقعات لوگوں کو معلوم نہ تھے، یہ تاریخ ابھی تک قدیم آثار کی صورت میں زمین کے نیچے دفن تھی جن کو بہت بعد میں زمین کی کھدائی سے برآمد کیا گیا، اور ان کی بنیاد پر مصر کی تاریخ مرتب کی گئی۔

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں حضرت یوسف کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کا ذکر آتا ہے تو قرآن اس

کے لئے ملک مصر (مصر کا بادشاہ) کا لفظ استعمال کرتا ہے، اور حضرت موسیٰ کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کا ذکر آتا ہے تو وہ اس کو بار بار فرعون کہتا ہے، اس طرح قرآن کریم کا بیان خارجی تاریخی حقیقت کے عین مطابق ٹھہرتا ہے، جب کہ بائبل کا بیان خارجی تاریخی حقیقت سے ٹکراتا ہے، یہ واقعہ بتاتا ہے کہ قرآن کریم کا مصنف ایک ایسا مصنف ہے جو انسانی معلومات کے ماوراتمام کو براہ راست دیکھ رہا ہے۔

نظریۂ ارتقاء کے ثبوت کے لئے دھوکا دہی سے کام لینا (پلٹ ڈاون):

نظریۂ ارتقاء کے مطابق انسان اور حیوان دونوں ایک مشترک مورث اعلی سے تعلق رکھتے ہیں، حیوانات کی ایک نسل ترقی کرتے کرتے بندر (چمپنزی) تک پہونچی، اور بندر کی یہ نسل مزید ترقی کرتے کرتے انسان بن گئی۔

اس سلسلہ میں ایک سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ ہے تو حیوان اور انسان کی درمیانی کڑیاں کہاں ہیں، یعنی وہ انواع کون سی ہیں جو ابھی ارتقاء کے درمیانی سفر میں تھیں اور اس بناء پر ان کے اندر کچھ حیوانی پہلو تھے اور کچھ انسانی پہلو، اگر چہ حقیقی طور پر ابھی ایسی کوئی درمیانی نوع دریافت نہیں ہوئی ہے، تاہم علماء ارتقاء کو یقین ہے کہ ایسی انواع گذری ہیں، البتہ ان کا سراغ انہیں ابھی تک نہیں ملا ہے، ان مفروضہ کڑیوں کو غلط طور پر گم شدہ کڑیوں (Missing Links) کا نام دیا گیا ہے۔

۱۹۱۲ میں لندن کے اخبارات نے پر جوش طور پر یہ خبر دی کہ بندر اور انسان کے درمیان کی ایک گم شدہ کڑی دریافت ہوگئی ہے، یہ وہی کڑی ہے جس کو ارتقاء کی تاریخ میں پلٹ ڈاؤن انسان (Piltdwon man) کہا جاتا ہے، اس کی حقیقت یہ تھی کہ لندن کے برٹش میوزیم کو قدیم زمانہ کا ایک جبڑا ملا جس کا ڈھانچہ بندر جیسا تھا، مگر اس کا دانت انسان کے دانت سے مشابہ تھا، اس ہڈی کے ٹکڑے کی بنیاد پر ایک پوری تصویر بنائی گئی، جو دیکھنے والوں کو بندر نما انسان یا انسان نما بندر دکھائی دیتی تھی، اس کو پلٹ ڈاون انسان کا نام دیا گیا، کیوں کہ وہ پلٹ ڈاؤن نامی مقام سے حاصل ہوا تھا۔

پلٹ ڈاؤن انسان کو تیزی سے مقبولیت حاصل ہوئی، وہ باقاعدہ طور پر نصاب کی کتابوں میں شامل کرلیا گیا، مثال کے طور پر آر ایس لل (R.S.Lull) کی کتاب عضویاتی ارتقاء (Organic evolution) میں، بڑے بڑے علماء ومفکرین نے اس کو جدید انسان کی علمی فتوحات میں شمار کیا، مثلاً ایچ جی ویلز (۱۹۴۶-۱۸۶۶) نے اپنی کتاب تاریخ کا خاکہ (The Outline of History) میں، اور برٹرینڈ رسل (۱۹۷۰-۱۸۷۲) نے اپنی کتاب مغربی فلسفہ کی تاریخ (A History of Western Philosophy) میں، اور تاریخ وحیاتیات کی کتابوں میں پلٹ ڈاون انسان کا ذکر اس طرح کیا جانے لگا، جیسے کہ وہ ایک مسلمہ حقیقت ہو۔

تقریباً نصف صدی تک جدید علماء اس ''عظیم دریافت'' سے مسحور رہے، یہاں تک کہ ۱۹۵۳ میں بعض علماء کو شبہہ ہوا، انہوں نے برٹش میوزیم کے آہنی فائر پروف بکس سے مذکورہ جبڑا نکالا، اس کو سائنسی طریقے سے جانچا، تمام متعلق پہلوؤں سے اس کی تحقیق کی، آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ یہ مکمل طور پر ایک فریب تھا جس کو حقیقت سمجھ لیا گیا۔

پلٹ ڈاؤن انسان کی اصل حقیقت یہ تھی کہ ایک شخص نے بندر کا ایک جبڑا لیا، اس کو مہوگنی رنگ میں رنگا، اور پھر اس کے دانت کو ریتی سے گھس کر آدمی کے دانت کی طرح بنایا، اس کے بعد اس نے یہ جبڑا یہ کہہ کر برٹش میوزیم کے حوالے کر دیا کہ یہ اس کو پلٹ ڈاؤن (انگلینڈ) میں ملا ہے۔

فرعون کی نعش کے بارے میں قرآن کریم اور بائبل کے الفاظ کا فرق:

اس کے مقابلہ میں اب قرآن کریم سے اسی نوعیت کی ایک مثال لیجئے، یہ فرعون کی مثال ہے، اس کے بارے میں قرآن کریم میں جو الفاظ آئے تھے، بعد کی تاریخ حیرت انگیز طور پر اس کی تصدیق بن گئی۔

تاریخ کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مصر کا جو بادشاہ غرق ہوا، وہ رعمسیس دوم کا فرزند تھا، اس کا خاندانی لقب فرعون اور ذاتی نام مرنفتاح (merneptah) تھا، نزول قرآن مجید کے وقت اس فرعون کا ذکر صرف بائبل کے مخطوطات میں تھا، اس میں بھی صرف یہ لکھا ہوا تھا کہ ''خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہہ و بالا کر دیا اور فرعون کے سارے لشکر کو سمندر میں غرق کر دیا۔ (خروج ۱۴: ۲۸) اس وقت قرآن کریم نے حیرت انگیز طور پر یہ اعلان کیا کہ فرعون کا جسم محفوظ ہے اور وہ دنیا والوں کے لئے سبق بنے گا۔

فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک آیة. (یونس: ۹۲) ترجمہ: آج ہم تیرے بدن کو بچالیں گے تا کہ تو اپنے بعد والوں کے لئے نشانی ہو۔

قرآن کریم میں جب یہ آیت نازل ہوئی تو وہ نہایت عجیب تھی، اس وقت کسی کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ فرعون کا جسم کہیں محفوظ حالت میں موجود ہے، اس آیت کے نزول پر اسی حالت میں تقریباً تیرہ سو سال گذر گئے، پروفیسر لاریٹ (Loret) پہلا شخص ہے جس نے ۱۸۹۸ میں مصر کے ایک قدیم مقبرہ میں داخل ہو کر دریافت کیا کہ یہاں مذکورہ فرعون کی لاش ممی کی ہوئی موجود ہے، ۸ر جولائی ۱۹۰۷ کو الیٹ اسمتھ (Elliot Smith) نے اس لاش کے اوپر لپٹی ہوئی چادر کو ہٹایا، اس نے اس کی باقاعدہ سائنسی تحقیق کی اور پھر ۱۹۱۲ میں ایک کتاب شائع کی جس کا نام شاہی ممیاں (The Royal Mummies) رکھا، اس سے ثابت ہو گیا کہ یہ ممی کی ہوئی لاش اسی فرعون کی ہے جو تین ہزار سال پہلے حضرت موسیٰ کے زمانہ میں غرق کیا گیا تھا، ایک مغربی مفکر کے الفاظ میں:

His eathly remains were saved by the will of God from destruction to become a sign to man. as it is written in the Qur'an Karim.

ترجمہ: فرعون کا مادی جسم خدا کی مرضی کے تحت برباد ہونے سے بچالیا گیا؛ تا کہ وہ انسان کے لئے ایک نشانی ہو، جیسا کہ وہ قرآن کریم میں لکھا ہوا ہے۔

قرآن کریم، بائبل اور سائنس (The Bible, the Quran (Karim) & Science) کے مصنف ڈاکٹر

موریس بوکائی (Maurice Bucaille) نے ۱۹۷۵ میں فرعون کی اس لاش کا معائنہ کیا، اس کے بعد انہوں نے اپنی کتاب میں اس پر جو باب لکھا ہے، اس کا خاتمہ درج ذیل شاندار سطروں پر ہوا ہے:

''وہ لوگ جو مقدس کتابوں کی سچائی کے لئے جدید ثبوت چاہتے ہیں، وہ قاہرہ کے مصری میوزیم میں شاہی ممیوں کے کمرہ کو دیکھیں، وہاں وہ قرآن کریم کی ان آیتوں کی شاندار تصدیق پالیں گے جو کہ فرعون کے جسم سے بحث کرتی ہیں''۔

قرآن کریم نے ساتویں صدی میں کہا کہ فرعون کا جسم لوگوں کی نشانی کے لئے محفوظ ہے اور وہ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں نہایت صحت کے ساتھ برآمد ہوگیا، دوسری طرف موجودہ زمانہ کے علماء سائنس نے اعلان کیا کہ پلٹ ڈاون کے مقام پر انہوں نے ایک ڈھانچہ دریافت کیا ہے، جو قدیم انسان کے جسم کا ایک حصہ ہے اور اگلی معلومات کے تحت وہ بالکل بے بنیاد ثابت ہوگیا۔

کیا اس کے بعد بھی اس میں کوئی شبہہ باقی رہتا ہے کہ قرآن کریم ایک خدائی کتاب ہے، وہ عام انسانی تصنیفات کی طرح کوئی انسانی تصنیف نہیں۔

اجسام فلکی کی گردش (کل فی فلک یسبحون):

قرآن کریم (الانبیاء ۳۳، یٰسین: ۴۰) میں سورج اور چاند کا ذکر کرکے ارشاد ہوا کہ سب ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں، **کل فی فلک یسبحون** ڈاکٹر موریس بوکائی نے ان آیات پر تفصیلی کلام کیا ہے اور دکھایا ہے کہ یہاں فلک سے وہی چیز مراد ہے جس کو موجودہ زمانہ میں مدار (Orbit) کہا جاتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ آیات میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سورج ایک مدار میں گھومتا ہے، مگر اس بات کا کوئی اشارہ نہیں دیا گیا ہے کہ زمین کی نسبت سے اس کا مدار کیا ہے، قرآن کریم کے نزول کے زمانہ میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سورج (زمین کے گرد) گھوم رہا ہے، جب کہ زمین ٹھہری ہوئی ہے، یہ مرکزیت ارضی کا نظریہ تھا جو دوسری صدی قبل مسیح میں ٹالمی کے زمانہ سے چھا گیا تھا، وہ سولہویں صدی عیسوی میں کوپرنیکس تک باقی رہا، اگر چہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگ اس نظریہ کی تائید کرتے تھے، مگر قرآن کریم میں وہ کہیں ظاہر نہیں ہوا، نہ ان دونوں آیتوں میں اور نہ کسی اور آیت میں۔

نطفہ، علقہ اور مضغہ کی جدید تحقیق اور قرآن کریم

اس سلسلہ میں ایک دل چسپ مثال وہ ہے جو ۱۹۸۴ کے آخر میں مختلف اخبارات میں شائع ہوئی تھی، کناڈا کے اخبار دی سٹی زن (۲۲ رنومبر ۱۹۸۴) نے اس کی سرخی ان الفاظ میں کی:

Ancient Holy Book 1300 Years Ahead of its Time.

قدیم مقدس کتاب اپنے وقت سے ۱۳ سو سال آگے۔

اسی طرح نئی دہلی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۰ ردسمبر ۱۹۸۴) میں یہ خبر ذیل کی سرخی کے ساتھ چھپی:

Qur'an (Karim) Scores Over Modern Science.

قرآن کریم جدید سائنس پر بازی لے جاتا ہے۔

ڈاکٹر کیتھ مورجنینیات کے ماہر ہیں اور کناڈا کی ٹورنٹو یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، انہوں نے قرآن کریم کی چند آیات (المؤمنون: ۱۴، الزمر: ۶) اور جدید تحقیقات کا مطالعہ کیا ہے، اس سلسلہ میں وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کئی بار کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی (جدہ) بھی گئے، انہوں نے پایا کہ قرآن کریم کا بیان حیرت انگیز طور پر جدید دریافتوں کے عین مطابق ہے، یہ دیکھ کر انہیں سخت تعجب ہوا کہ قرآن کریم میں کیوں کر وہ حقیقتیں موجود ہیں جن کو مغربی دنیا نے پہلی بار صرف ۱۹۴۰ میں معلوم کیا، اس سلسلہ میں انہوں نے ایک مقالہ لکھا ہے جس میں وہ مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

The 1300 year old Quran (Karim) contains passagesso accurate about embryonic development that Muslims can reasonably believe them to be revelations from God.

ترجمہ: ۱۳۰۰ سو سال قدیم قرآن کریم میں جینی ارتقاء کے بارہ میں اس قدر درست بیانات موجود ہیں کہ مسلمان معقول طور پر یقین کر سکتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے اتاری ہوئی آیتیں ہیں۔

روشنی کی تحقیق میں نیوٹن کی غلطی (نظریۂ نور):

انسان جب بھی کسی مسئلہ پر کلام کرتا ہے تو فوراً ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ ''حال'' میں بول رہا ہے، اسے ''مستقبل'' کی کوئی خبر نہیں، کوئی انسان آئندہ ظاہر ہونے والی حقیقتوں کو نہیں جانتا، اس لئے وہ اپنے کلام میں ان کی رعایت بھی نہیں کر سکتا، یہ ایسا معیار ہے جس پر آدمی ہمیشہ ناکام ثابت ہوتا ہے، اس کے برعکس قرآن کریم کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا مصنف ایک ایسی ہستی ہے جس کی نظر ماضی سے مستقبل تک یکساں طور پر پھیلی ہوئی ہے، وہ آج کے معلوم واقعات کو بھی جانتا ہے اور ان واقعات کو بھی جو کل انسان کے علم میں آئیں گے۔

مثال کے طور پر نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) نے روشنی کے بارے میں یہ نظریہ قائم کیا کہ یہ چھوٹے چھوٹے روشن ذرات ہیں، جو اپنے منبع سے نکل کر فضا میں اڑتے ہیں، اس نظریہ کو سائنس کی تاریخ میں روشنی کا ذراتی نظریہ (Corpuscular theory of light) کہا جاتا ہے:

نیوٹن کے غیر معمولی اثرات کے تحت یہ نظریہ ۱۸۲۰ تک علمی دنیا پر چھایا رہا، اس کے بعد اس کو زوال شروع ہوا، مختلف سائنس دانوں کی تحقیقات، خاص طور پر فوٹان (Photons) کے عمل کی دریافت نے روشنی کے ذراتی نظریہ کو ختم کر دیا، پروفیسر ینگ (اور دوسرے سائنس دانوں) کی تحقیق نے علماء کو مطمئن کر دیا کہ روشنی بنیادی طور پر موج کی سی

خصوصیات رکھتی ہے، جو بظاہر نیوٹن کے ذراتی نظریہ کے برعکس ہے:

Young's work convinced scientists that has essential wave characteristics in apparent contradiction to Newton's corpuscular (particle) theory.

Encyclopaedia Britanica, 1984. Vol,19, p.665

نیوٹن نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں اپنا نظریہ پیش کیا اور صرف دوسو سال کے اندر وہ غلط ثابت ہوگیا، اس کے برعکس قرآن کریم نے ساتویں صدی عیسوی میں اپنا پیغام دنیا کے سامنے رکھا اور چودہ سو سال گذرنے کے باوجود اس کی صداقت آج تک مشتبہ نہیں ہوئی، کیا اس کے بعد بھی اس یقین کے لئے کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہے کہ نیوٹن جیسے لوگوں کا کلام محدود انسانی کلام ہوتا ہے اور قرآن کریم لامحدود ذہن سے نکلا ہوا خدائی کلام ہے، قرآن کریم کے بیانات کا ابدی طور پر درست ثابت ہونا ایک انتہائی غیر معمولی صفت ہے جو کسی بھی دوسرے کلام کو حاصل نہیں، یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ قرآن مجید خدائی کلام ہے اور بقیہ تمام کلام انسانی کلام۔

ایک مثال:

یوری گگارن (۱۹۶۸ - ۱۹۳۴) ایک روسی خلاباز تھا، وہ پہلا انسان ہے جس نے خلا میں سفر کیا، اس کا یہ سفر روس کے بنائے ہوئے پہلے خلائی جہاز (Vostok 1) کے ذریعہ ہوا تھا، ۱۲/اپریل ۱۹۶۱ کو خلائی جہاز زمین سے ۱۸۷ میل کی بلندی پر چلا گیا، خلا میں اس کی رفتار ۱۸/ ہزار میل فی گھنٹہ تھی، وہ ڈیڑھ گھنٹہ میں زمین کا ایک چکر لگا تا تھا، یوری گگارن جب اپنے تقریباً چارٹن کے خلائی جہاز سے کامیاب خلائی سفر کر کے دوبارہ زمین پر اترا تو اچانک وہ عالمی شہرت کا مالک بن چکا تھا۔

His spaceflight brought him immediate worldwide fame. (IV/376)

یوری گگارن (Yori Gagarin) کا کم عمری میں انتقال ہوگیا، تاہم اس کی بہت سی یادداشتیں اب بھی چھپی ہوئی موجود ہیں، اور مطالعہ کرنے والوں کے لئے دل چسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں، گگارن نے اپنے تاریخی سفر سے واپس آکر جو باتیں بتائی تھیں، ان میں سے ایک بات یہ تھی کہ میں نے خلا میں سے جب زمین کو دیکھا تو میں نے پایا کہ زمین کے اوپر اندھیرے اور اجالے کا ایک تیز تسلسل (rapid succession) جاری ہے، یعنی زمین کی سطح پر اندھیرا اور اجالا اس طرح آگے پیچھے چل رہے ہیں جیسے کہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے ہوں۔

عجیب بات ہے کہ زمین پر رات اور دن کے بارہ میں عین یہی تعبیر خود قرآن کریم میں موجود ہے، جو انسان کے خلائی سفر سے چودہ سو برس پہلے نازل ہوا تھا، قرآن کریم کے الفاظ یہ ہیں: **يغشى الليل النهار يطلبه حثيثا**. (الاعراف: ۵۴) اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے: اللہ تعالیٰ اوڑھاتا ہے رات پر دن کو، وہ اس کے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا۔

زمین ایک گول کرہ ہے، وہ خلا میں ہے، وہ اپنے محور (axis) پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کے سامنے گھوم رہی ہے، یہی وہ صورت حال ہے جس کی بنا پر زمین کی سطح پر وہ منظر پیدا ہوتا ہے جس کو گگارن نے اپنے خلائی مشاہدہ میں ان الفاظ میں بیان کیا کہ زمین کے اوپر میں نے روشنی اور تاریکی کو تیزی سے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے دیکھا۔

بطور واقعہ گگارن کا بیان صد فی صد درست ہے، مگر زمین پر رہ کر کوئی شخص ایسا بیان نہیں دے سکتا، زمینی مشاہدہ کسی آدمی کو یہ منظر نہیں دکھاتا، اس لئے زمین پر رہتے ہوئے کوئی شخص یہ الفاظ بھی نہیں بول سکتا، یہ منظر کسی آدمی کو صرف اس وقت دکھائی دیتا ہے جب کہ وہ زمین کی سطح سے ۲۰/ ہزار میل اوپر اٹھے اور خلا میں پہنچ کر دوربین کے ذریعہ زمین کا مشاہدہ کرے، یہ زمین کو خلا سے دیکھنے والے شخص کے الفاظ ہیں نہ کہ زمین کو زمین سے دیکھنے والے شخص کے الفاظ۔

گگارن سے پہلے کوئی انسان خلا میں نہیں گیا، اور نہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں خلائی سواریاں وجود میں آئی تھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ذریعہ خلا میں پہنچ کر زمین کے بارے میں ایسا بیان دے سکیں، پھر قرآن کریم میں اس سلسلہ میں اتنا واضح اور مکمل بیان کیسے موجود ہے، اس کی کوئی بھی توجیہ اس کے سوا ممکن نہیں کہ یہ مانا جائے کہ قرآن کریم کو اتارنے والا ایک ایسا برتر وجود ہے، جو اس وقت بھی زمین کو زمین کے اوپر سے دیکھ رہا تھا، جب ابھی کوئی گگارن وجود میں نہیں آیا تھا۔

یہ اور اس طرح کی دوسری آیتیں اس بات کا واضح اور یقینی ثبوت ہیں کہ قرآن کریم خدا کی کتاب ہے، جو دانائے کل ہے، وہ کسی انسان کی تیار کی ہوئی کتاب نہیں۔

عربی زبان کا استثنائی معجزہ (قرآن کریم کی برتری):

عربی زبان تمام زبانوں کے درمیان ایک حیران کن استثناء ہے، تاریخ بتاتی ہے کہ ایک زبان کی عمر پانچ سوسال سے زیادہ نہیں ہوتی، تقریباً پانچ سوسال میں ایک زبان اتنی زیادہ بدل جاتی ہے کہ اگلی نسل کے لوگوں کے لئے پچھلے لوگوں کا کلام سمجھنا سخت مشکل ہوجاتا ہے، مثال کے طور پر جافرے چاسر (۱۴۰۰-۱۳۴۲) اور ولیم شیکسپیئر (۱۶۱۶-۱۵۶۴) انگریزی زبان کے شاعر اور ادیب تھے، مگر آج کا ایک عام انگریزی داں ان کو پڑھنا چاہے تو اس کو انہیں ترجمہ کرکے پڑھنا پڑے گا، چاسر اور شیکسپیئر کا کلام جدید انگریزی نصاب میں ترجمہ کرکے پڑھایا جاتا ہے، تقریبا ویسے ہی جیسے غیر زبان کی کتابیں ترجمہ کرکے پڑھائی جاتی ہیں۔

مگر عربی زبان کا معاملہ استثنائی طور پر اس سے مختلف ہے، عربی زبان پچھلے ڈیڑھ ہزار سال سے یکساں حالت پر باقی ہے، اس کے الفاظ اور اسلوب میں یقیناً ارتقاء ہوا ہے، مگر یہ ارتقاء اس طرح ہوا ہے کہ الفاظ اپنے ابتدائی معنی کو بدستور باقی رکھے ہوئے ہیں، قدیم عرب کا کوئی شخص اگر آج دوبارہ زندہ ہو تو آج کے عربوں میں بھی وہ اسی طرح بولا اور سمجھا

جائے گا، جس طرح چھٹی صدی اور ساتویں صدی عیسوی کے عربوں میں وہ بولا اور سمجھا جاتا تھا۔

یہ سراسر قرآن مجید کا معجزہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے عربی زبان کو پکڑ رکھا ہے، تاکہ جس طرح قرآن کریم کو قیامت تک باقی رہنا ہے، اسی طرح عربی زبان بھی زندہ اور قابل فہم حالت میں قیامت تک باقی رہے، یہ کتاب کبھی ''کلاسیکل لٹریچر'' کی الماری میں نہ جانے پائے، وہ ہمیشہ لوگوں کے درمیان پڑھی اور سمجھی جاتی رہے۔

یہی معاملہ علوم کا بھی ہے، یہاں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے علوم کو پکڑ رکھا ہے، وہ علوم کو پکڑ کر بیٹھ گیا ہے؛ تاکہ قرآن مجید نے کسی معاملہ میں جو کچھ کہہ دیا ہے وہی ہمیشہ حرف آخر کی حیثیت سے باقی رہے، چنانچہ بے شمار علمی ترقیوں کے باوجود علوم بالآخر وہیں باقی رہتے ہیں، یا وہیں لوٹ آتے ہیں، جہاں قرآن کریم نے اول دن ان کو رکھ دیا تھا۔

ایک طرف انسانی کلام کی مثال ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اس معیار پر پورا نہیں اترتا، جب کہ قرآن کریم انتہائی بڑے اور گہرے معاملات میں بھی اپنی برتر صداقت کو قائم کئے ہوئے ہے۔

شہد کی طبی اہمیت

قرآن مجید میں شہد کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس کے اندر شفاء ہے **فیه شفاء للناس** (النحل) مسلمانوں نے اس آیت کی روشنی میں شہد کے طبی پہلو پر بہت زور دیا، مسلمانوں کے یہاں دواسازی کے فن میں شہد کو خصوصی درجہ حاصل رہا ہے، مگر مغربی دنیا صدیوں تک اس کی طبی اہمیت سے بے خبر رہی، یورپ میں ابھی انیسویں صدی تک شہد کو بس ایک رقیق غذا (Liquid Food) کی حیثیت حاصل تھی، یہ صرف بیسویں صدی کی بات ہے کہ یورپ کے علماء نے یہ دریافت کیا کہ شہد کے اندر دافع عفونت خصوصیات (Antiseptic properties) موجود ہیں۔

شہد جراثیم کو مار دینے والی چیز ہے، جو کہ انسانی بیماریاں پیدا کرتے ہیں، تاہم بیسویں صدی سے پہلے تک اس کو علمی طور پر دیکھا نہیں جا سکتا تھا، ڈاکٹر ساکٹ جو اس سے پہلے فورٹ کولنس کے ایگریکلچر کالج سے وابستہ تھے، انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شہد کے اندر بیماری کے جراثیم پرورش پاتے ہیں، جس طرح وہ دودھ میں پرورش پاتے ہیں، مگر ان کو سخت تعجب ہوا جب تجربات کے دوران انہوں نے پایا کہ بیماری پیدا کرنے والے جراثیم جو انہوں نے خالص شہد کے اندر ڈالے تھے وہ سب کے سب بہت جلد مر گئے، میعادی بخار کے جراثیم صرف ۴۸ گھنٹے کے اندر ہلاک ہو گئے، بعض سخت جاں جراثیم چار دن یا پانچ دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے، ڈاکٹر بوڈوگ بک نے بتایا کہ شہد کے اندر جراثیم کو مارنے کی اس خصوصیت کی سادہ سی وجہ ہے، وہ یہ کہ شہد رطوبت کو چوس لینے کی صلاحیت رکھتی ہے، شہد جراثیم کی رطوبت کا ہر جزء کھینچ لیتی ہے، جراثیم دوسرے حیوانات کی طرح پانی کے بغیر ہلاک ہو جاتے ہیں، شہد کے اندر پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت لامحدود مقدار میں ہے، وہ دھات، شیشہ اور پتھر تک کی رطوبت کو کھینچ لیتی ہے۔

غذائیات:

کتاب الٰہی میں انسان کے لئے خون کو حرام قرار دیا ہے، نزول کتاب کے وقت تک انسان اس قانون کی غذائی اہمیت سے بے خبر تھا، لیکن بعد کو جب سائنسی طور پر خون کے اجزاء کی تحلیل کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ قانون نہایت اہم مصلحت پر مبنی تھا، سائنسی تجزیہ نے اس کو رد نہیں کیا بلکہ اس کی معنویت ہم پر واضح کی۔

یہ تجزیہ بتاتا ہے کہ خون میں کثرت سے یُورِک ایسڈ (Uric acid) موجود ہے جو ایک تیزابی مادہ ہونے کی وجہ سے خطرناک زہریلی تاثیر اپنے اندر رکھتا ہے، اور غذا کے طور پر اس کا استعمال سخت مضر ہے، ذبیحہ کا مخصوص طریقہ جو اسلام میں بتایا گیا ہے، اس کی مصلحت بھی یہی ہے، اسلامی اصطلاح میں ذبیحہ سے مراد جانور کو خدا کے نام پر ایسے طریقہ سے ذبح کرنا ہے جس سے اس کے جسم کا سارا خون نکل جائے، اور یہ اس طرح ممکن ہے کہ جانور کی صرف شہ رگ کو کاٹا جائے، لیکن گردن کی رگوں کو قائم رکھا جائے تاکہ مذبوحہ کے دل اور دماغ کے درمیان موت تک تعلق قائم رہے، اور جانور کی موت کا باعث صرف کامل اخراج خون ہو، نہ کہ کسی اعضائے رئیسہ پر صدمہ کا پہنچنا، کیونکہ کسی اعضائے رئیسہ مثلاً دماغ، دل یا جگر کے صدمہ رسیدہ ہونے سے فی الفور موت تو وارد ہو جاتی ہے لیکن ایسی صورت میں خون آناً فاناً جسم میں منجمد ہو کر تمام گوشت میں سرایت کر جاتا ہے اور سارا گوشت یورک ایسڈ کی آمیزش کی وجہ سے زہریلا ہو جاتا ہے۔

سوّر کی حرمت کی وجہ:

اسی طرح سور کو بھی حرام کیا گیا ہے، زمانۂ قدیم میں انسان کو اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ تھا، مگر جدید طبی تحقیقات نے بتایا ہے کہ اس کے اندر بہت سے نقصانات ہیں، مثلاً مذکورہ بالا یورک ایسڈ جو ایک زہریلا مادہ ہے اور ہر جاندار کے خون میں موجود رہتا ہے، وہ اور جانداروں کے جسم سے تو خارج ہو جاتا ہے مگر سور کے اندر سے خارج نہیں ہوتا، گردے جو ہر انسانی جسم میں ہوتے ہیں، وہ اس زہریلے مادے کو پیشاب کے ذریعہ خارج کرتے رہتے ہیں، انسانی جسم اس مادے کو نوّے فیصد خارج کر دیتے ہیں، مگر سور کے جسم کے عضلات کی ساخت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اس کے خون کا یورک ایسڈ صرف دو فیصد ہی خارج ہو پاتا ہے، اور بقیہ حصہ اس کے جسم کا جزو بنتا رہتا ہے، چنانچہ سور خود بھی جوڑوں کے درد میں مبتلا رہتا ہے، اور اس کا گوشت کھانے والے بھی وضع المفاصل جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ کوئی غذا خواہ وہ مفید ہو یا مضر؛ جب اس کی تاثیرات بتائی جاتی ہیں تو یہ صرف اس کی انفرادی تاثیر کا بیان ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب وہ کھائی جائے تو لازمی طور پر فوراً ہر شخص میں وہی اثر بھی ظاہر کرے جو انفرادی مطالعہ میں ہم نے اس کے اندر پایا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی عموماً کسی چیز کو تنہا شکل میں اس طرح نہیں کھاتا کہ صرف اسی کو اکیلے عمل کرنے کا موقع ملے بلکہ مختلف چیزوں کے ساتھ ایک چیز کو پیٹ میں داخل کرتا ہے، اسی طرح اور بھی اسباب ہیں جن کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ مختلف چیزوں کے عمل اور رد عمل سے اکثر ایک چیز کی انفرادی

تاثیر گھٹ جاتی ہے، اور بعض اوقات ختم بھی ہو جاتی ہے، تاہم جب کسی چیز کی ذاتی خصوصیات کا تجزیہ کیا جائے تو وہی بات کہی جائے گی جو انفرادی طور پر اس کے اندر ثابت ہو رہی ہو۔

اس طرح کی مثالیں کثرت سے قرآن وحدیث میں موجود ہیں اور یہ مثالیں اس بات کا قطعی ثبوت ہیں کہ یہ غیر انسانی ذہن سے نکلا ہوا ہے، بعد کی معلومات نے حیرت انگیز طور پر اس پیشین گوئی کی تصدیق کی ہے جس کو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔

''عنقریب ہم آفاق وانفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے گا یہ حق ہے''۔ (قرآن)

مرد عورت کا دائرہ کار:

الٰہی قانون کی رو سے مرد اور عورت کا دائرہ کار الگ الگ ہے اور عملی زندگی میں مرد کو عورت پر فوقیت دی گئی ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ. (نساء: ۳۴)

ترجمہ: مرد قوام ہیں عورتوں کے اوپر۔

وضعی قوانین نے اس اصول کو مکمل طور پر غلط قرار دیا۔ مگر سو برس کے تجربہ نے بتایا کہ الٰہی قانون ہی اس معاملہ میں حقیقت سے قریب تر ہے، آزادئ نسواں کی تحریک کی تمام تر کامیابیوں کے باوجود آج بھی ''مہذب'' دنیا میں مرد ہی جنس برتر (dominant sex) کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزادئ نسواں کے علم بردار یہ کہتے تھے کہ عورت اور مرد کا فرق محض سماجی حالات کی پیداوار ہے، مگر موجودہ زمانہ میں مختلف متعلقہ شعبوں میں اس مسئلہ کا جو گہرا مطالعہ کیا گیا ہے، اس سے ثابت ہوا ہے کہ صنفی فرق کے پیچھے حیاتیاتی عوامل (biological factors) کارفرما ہیں، ہاورڈ یونیورسٹی میں نفسیات کے پروفیسر جیروم کاگن (۱۹۲۹-) کے مطالعہ نے اسے بتایا ہے:

کہ مرد اور عورتوں میں بعض نفسیاتی فرق محض معاشرتی تجربات کی وجہ سے نہیں ہو سکتے بلکہ وہ لطیف قسم کے حیاتیاتی فرق کی پیداوار ہیں۔

ایک امریکی سرجن Edgar Berman کا فیصلہ ہے کہ ''عورتیں اپنی ہارمون کیمسٹری کی وجہ سے اقتدار کے منصب کے لئے جذباتی ثابت ہو سکتی ہیں''۔

Time Magazine , March 20 , 1972 . p. 28

امریکہ میں آزادئ نسواں تحریک کافی طاقت ور ہے۔ مگر اب اس کے حامی محسوس کرنے لگے ہیں کہ ان کی راہ کی اصل رکاوٹ سماج یا قانون نہیں بلکہ خود فطرت ہے۔ فطری طور پر ہی ایسا ہے کہ عورت بعض حیاتیاتی محدودیت (limitations of biology) کا شکار ہے۔ میل ہارمون اور فیمیل ہارمون کا فرق دونوں میں زندگی کے آغاز ہی سے موجود ہوتا ہے، چنانچہ تحریک نسواں کے پرجوش حامی کہنے لگے ہیں کہ فطرت ظالم ہے، ہمیں چاہئے کہ پیدائشی سائنس

(science of eugenics) کے ذریعہ جنیٹک کوڈ کو بدل دیں اور نئے قسم کے مرد اور نئی قسم کی عورتیں پیدا کریں، یہ ہے وہ آخری انجام جو امریکی عورت کے نعرہ ''پالیسی بناؤ کافی نہ بناؤ'' (make policy not coffee) کا دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک میں ہوا ہے۔

عورت کو گھر کے باہر کے امور سپرد کرنے کے نتیجہ میں مغرب میں جو بے شمار مسائل پیدا ہوئے ہیں، ان کی تفصیل پیش کرنے کا موقع نہیں، یہاں میں اس کے صرف دو پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔ ایک بچوں کا اپنے سرپرستوں کی تربیت سے محروم ہونے کا مسئلہ، مغربی سماج میں یہ صورت عام ہے کہ باپ اور ماں دونوں کے بیرونی کام پر چلے جانے کی وجہ سے بچوں کو اپنے فطری مربیوں کے درمیان رہنے کا موقع نہیں ملتا، مزید یہ کہ عورت مرد کے آزادانہ اختلاط کے نتیجہ میں بار بار نئی صنفی دلچسپیاں وجود میں آتی ہیں، اور طلاقوں کی کثرت سے وہ چیز پیدا ہوتی ہے جس کو اجڑے گھروں (Broken Homes) کا مسئلہ کہا جاتا ہے، اس طرح جو بچے اپنے سرپرستوں سے محروم ہوکر پرورش پاتے ہیں ان کی شخصیت کا فطری ارتقاء نہیں ہو پاتا، چنانچہ بچوں میں کثرت سے ایک نئی قسم کی نفسیاتی بیماری پیدا ہو رہی ہے جس کو امریکی ڈاکٹروں نے آٹزم (Autism) کا نام دیا ہے، جسمانی طور پر بظاہر تندرست بچے ذہنی اعتبار سے عجیب وغریب قسم کے امراض کا شکار ہوتے ہیں، مثلاً وحشت زدگی، ساتھیوں سے لڑنا، اسکول کا کام نہ کرنا، تشدد پسندی وغیرہ، ان کے علاج کی ہر تدبیر اب تک ناکام ثابت ہوئی ہے۔

دوسرا مسئلہ بڑوں سے متعلق ہے، بچے اپنے سرپرستوں سے محروم ہو رہے ہیں، بڑے اپنے عزیزوں اور مخلصوں سے۔ فرانس کی ایک رپورٹ کے مطابق فرانس میں انسانوں کی ۵۲ ملین آبادی میں سات ملین کتے ہیں، یہ کتے اپنے مالکوں کے ساتھ اس طرح رہتے ہیں جیسے وہ ان کے قریبی عزیز ہوں، پیرس کے نہایت مہنگے ہوٹلوں میں یہ منظر اب عجیب نہیں رہا کہ ایک مرد یا عورت اپنے کتے کے ساتھ ایک ہی میز پر کھانا کھا رہے ہیں۔ ''فرانسیسی لوگ اپنے کتوں سے کیوں اپنوں جیسا معاملہ کرتے ہیں''، جمعیۃ رعایۃ الحیوان (پیرس) کے ایک مسئول سے جب یہ پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا: ''وہ چاہتے ہیں کہ محبت کریں، مگر وہ انسانوں میں ایسے لوگ نہیں پاتے جن سے وہ محبت کرسکیں''۔ عورت مرد کے درمیان فطری توازن توڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے انسان منتشر ہو گئے، ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے، یہ سب انسان کی فطری ضرورتیں ہیں، جب لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنے لئے اس قسم کے افراد نہیں پاسکتے تو انہوں نے کتے سے محبت شروع کردی، کیونکہ کتے میں کم از کم اتنی خصوصیت یقینی ہے کہ وہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑتا، اور کبھی بے وفائی نہیں کرتا''۔

انسانی تجربات انسان کو سچائی کے دروازے تک پہنچا چکے ہیں، اب حاملین قرآن کو یہ کرنا ہے کہ وہ اٹھیں اور سچائی کے بند دروازہ کو کھول دیں، تاکہ انسانی قافلہ خدا کی رحمتوں کی دنیا میں داخل ہوجائے جہاں ان کا رب ان کا انتظار کر رہا ہے۔

تمدن: قتل عمد کی سزا اور موجودہ قانون جرم کا تجربہ:

اسلام میں قتلِ عمد کی سزا موت ہے، الا یہ کہ مقتول کے ورثاء خون بہا لینے پر راضی ہوجائیں، لیکن جدید دورِ ترقی میں جہاں مذہب کی اور تعلیمات کے خلاف ذہن پیدا ہوا اسی طرح سزائے قتل کے بارے میں بھی سخت تنقیدیں کی جانے لگیں، ان حضرات کا خاص استدلال یہ ہے کہ اس قسم کی سزا کا مطلب یہ ہے کہ ایک انسانی جان کے ضائع ہونے کے بعد وہ دوسری انسانی جان کو بھی کھودیا جائے، پچھلے برسوں میں اکثر ملکوں میں اس رجحان نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے، اور پھانسی کے بجائے قید کی سزائیں تجویز کی جارہی ہیں۔

اسلام نے قاتل کی جو سزا مقرر کی ہے، اس میں دو اہم ترین فائدے ہیں، ایک یہ کہ ایک شخص نے سوسائٹی کے ایک فرد کو قتل کرکے جس برائی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی جڑ آئندہ کے لئے کٹ جائے، مجرم کا یہ عبرتناک انجام دیکھ کر دوسرے لوگ آئندہ اس قسم کی ہمت نہ کرسکیں، اسی کے ساتھ دیت کی جو صورت ہے، اس میں گویا اسلام نے نتائج کا لحاظ کیا ہے، مثلاً اگر کسی کے والدین بوڑھے ہوں اور ان کا اکلوتا بیٹا قتل ہوجائے تو وہ بے سہارا رہ جاتے ہیں، ایسی حالت میں قاتل کو سزائے موت بھی مل جائے تو انہیں کیا فائدہ؟ اسلام نے ایسے والدین کی تلافی کے لئے یہ طریقہ رکھا ہے کہ قاتل کے ورثاء مقتول کے والدین کو ایک خاص رقم بطور خون بہا دے کر انہیں راضی کرلیں، اور وہ قتل کو معاف کردیں، اس صورت میں مقتول کے بوڑھے والدین کو مثلاً دس ہزار روپے کی رقم مل جائے گی اور وہ اس رقم سے اپنی گزر بسر کا انتظام کرسکیں گے۔ مخصوص حالات میں ریاست کو بھی یہ حق ہے کہ وہ دیت کی رقم میں اضافہ کردے تا کہ بے سہارا ورثاء خسارے میں نہ رہیں۔

یہ ایک نہایت حکیمانہ قانون ہے، اور اس کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ جہاں رائج ہوا قتل کا خاتمہ ہوگیا، اس کے برعکس جن ممالک میں سزائے موت کو منسوخ کیا گیا ہے، وہاں جرائم گھٹنے کے بجائے اور بڑھ گئے ہیں، اعداد وشمار سے معلوم ہوا ہے کہ ایسے ممالک میں قتل کی وارداتوں میں بارہ فی صدی تک اضافہ ہوگیا ہے، چنانچہ اس کی بھی مثالیں موجود ہیں کہ پہلے سزائے موت کو منسوخ کیا گیا اور اس کے بعد نتائج دیکھ کر دوبارہ اسے بدل دیا گیا، سیلون اسمبلی نے ۱۹۵۶ء میں ایک قانون پاس کیا، جس کے مطابق سیلون کی حدود میں موت کی سزا کو ختم کردیا گیا، اس قانون کے نفاذ کے بعد سیلون میں جرائم تیزی سے بڑھنا شروع ہوگئے، ابتداءً لوگوں کو ہوش نہیں آیا مگر ۲۶ / ستمبر ۱۹۵۹ء کو جب ایک شخص نے سیلون کے وزیر اعظم بندرانائک کے مکان میں گھس کر نہایت بے دردی کے ساتھ ان کو قتل کردیا تو سیلون کے قانون سازوں کی آنکھ کھلی اور وزیر اعظم کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے فوراً بعد سیلون اسمبلی کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا جس میں چار گھنٹے کے بحث ومباحثہ کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ سیلون کی حکومت ۱۹۵۶ء کے قانون کو منسوخ کرکے ملک میں سزائے موت کو دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

الٰہی قانون میں سزا کا خاص مقصد نکال (دوسروں کے لئے عبرت) بتایا گیا ہے۔ اسی لئے الٰہی قانون نے بعض بڑے جرائم کی نہایت سخت سزائیں مقرر کی ہیں تاکہ ایک کا انجام دیکھ کر دوسرے اس سے رک جائیں، مگر جدید دور میں اس کو رد کر دیا گیا، پہلا نمایاں شخص جس نے مجرمین کی سزامیں تخفیف کی وکالت کی وہ اٹلی کا ماہر جُرمیات کیساری بیکریا (۱۷۳۸-۱۷۹۴) تھا، اس کے بعد سے اب تک جرمیات (criminalogy) کے موضوع پر بہت کام ہوا ہے، ماہرین کا عام طور پر یہ خیال ہو گیا تھا کہ جرم کوئی ''ارادی واقعہ'' نہیں، اس کے اسباب حیاتیاتی ساخت، ذہنی بیماری، معاشی تنگی، سماجی حالات وغیرہ میں ہوتے ہیں، اس لئے مجرم کو سزا دینے کے بجائے اس کا ''علاج'' کرنا چاہئے، حتی کہ تین درجن سے زیادہ ایسے ملک ہیں، جنہوں نے موت کی سزا کو اپنے یہاں سے ختم کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ خاتمہ بھی صرف اخلاقی جرائم کی حد تک ہوا ہے۔ سیاسی اور فوجی جرائم کے سلسلہ میں اب بھی ہر ملک ضروری سمجھتا ہے کہ مجرم کو سخت ترین سزا دی جائے۔

اس نظریہ نے جدید دنیا میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی، اکثر ملکوں میں جیل خانوں کے بجائے اصلاح خانے بنائے گئے اور اخلاقی جرائم کی حد تک سنگین سزاؤں کو ختم کر دیا گیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی ہر ملک میں دفاعی اہمیت کے جرائم کے لئے سنگین سزائیں بدستور جاری رہیں اور یہ واقعہ اس نظریہ کے علم برداروں کی بے یقینی ثابت کرنے کے لئے کافی تھا، تاہم انسانی فطرت کے بارے میں بعد کی تحقیقات اور عملی تجربوں نے مزید اس نظریہ کی غلطی واضح کر دی ہے۔ خوش حال اور صحت مند معاشروں میں لوگوں کے اندر جرائم کا رجحان اس سے بھی زیادہ پایا گیا جو نسبتاً غریب اور غیر صحت مند معاشروں میں نظر آتا ہے۔ ''معالجاتی'' تدبیریں جرائم کو روکنے میں ناکام ثابت ہوئیں، جن ملکوں میں سزاؤں میں تخفیف کے اصول کو جاری کیا گیا، وہاں اس کے بعد جرائم کی رفتار بہت بڑھ گئی، کئی ملکوں مثلاً سری لنکا اور ڈیلاویر (Delaware) میں سزائے موت کو ختم کرنے کے بعد دوبارہ اس کو بحال کرنا پڑا، چنانچہ ماہرین قانون اب اپنے سابقہ نظریہ پر نظر ثانی کے لئے مجبور ہو رہے ہیں، ایک ماہر قانون نے کہا ہے: ''لوگوں میں یہ عام تاثر ہونا کہ کسی بھی شخص کو قتل کرنا ملزم کو موت کی سزا کا مستحق بناتا ہے، اپنے اندر بہت بڑی مانع قدر (Detterant Value) رکھتا ہے''۔

اس کے برعکس شرعی قانون کی افادیت کا زندہ ثبوت وہ ممالک ہیں جہاں آج بھی شرعی سزا نافذ ہے، مثال کے طور پر سعودی عرب۔ یہ ایک معلوم واقعہ ہے کہ یہاں مہذب ممالک کے مقابلہ میں جرائم کی تعداد انتہائی حد تک کم ہے۔

سود: موجودہ اقتصادی بحران کا واحد سبب:

شرعی قانون میں سود کو حرام قرار دیا گیا ہے، جب کہ وضعی قانون میں اس کو تجارتی سودے پر قیاس کرتے ہوئے جائز سمجھا گیا ہے، اگر بے لاگ طور پر دیکھا جائے تو تجربہ پوری طرح شرعی قانون کی برتری ثابت کرتا ہے، سود کی حرمت کی بنا پر دنیا پر مسلم ملکوں میں ایک ہزار سال تک اقتصادی نظام چلتا رہا، مگر کبھی یہ نوبت نہ آئی کہ ایک طرف دولت کا انبار ہو اور دوسری طرف افلاس کا انبار، جدید اقتصادی نظام جو سود کی بنیاد پر قائم ہے اس نے انسانی سماج میں پہلی بار یہ غیر

متوازن صورت حال پیدا کی ہے، اور موجودہ نظام کے اندر اس کا کوئی حل نہیں۔

لین دین کی تمام شکلوں میں سود واحد طریقہ ہے جو دولت کی گردش کے عمل کو یک طرفہ بنا دیتا ہے، سود کی یہی وہ خصوصیت ہے جس سے مل کر جدید صنعتی نظام ایک استحصالی نظام میں تبدیل ہو گیا، اور نتیجۃً موجودہ صدی کی وہ دو سب سے بڑی برائیاں وجود میں آئیں جن میں سے ایک کا نام اشتراکی جبر اور دوسرے کا نام دوسری عالم جنگ ہے، مارکس اور انیسویں صدی کے دوسرے معاشی مفکرین جنہوں نے انفرادی ملکیت کی تنسیخ میں اقتصادی عدل کا راز تلاش کیا وہ اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے کہ صنعتی نظام کو جس چیز نے استحصال کا نظام بنایا ہے، اس کے ساتھ سودی سرمایہ کاری کا جوڑ ہے نہ کہ انفرادی ملکیت کا جوڑ۔ اگر وہ اس راز کو پا لیتے تو وہ سود کی منسوخی کی وکالت کرتے، اس کے بجائے انہوں نے ملکیت کی منسوخی کا طریقہ اختیار کر کے کوئی مسئلہ حل نہیں کیا، البتہ انسانیت کے ایک بڑے حصہ کو تاریخ کے سب سے بڑے اجتماعی عذاب میں اس طرح قید کر دیا کہ وہ اس سے نکلنا چاہے بھی تو نہ نکل سکے۔

تاہم ہٹلر نے سود کی اس شناعت کو محسوس کر لیا تھا، یہودی سرمایہ دار، دوسری عالمی جنگ سے پہلے، جرمنی اور دوسرے یورپی ملکوں کی معاشیات پر پوری طرح قابض ہو گئے تھے، ہٹلر نے اس مسئلہ کا بغور مطالعہ کیا تو اس کی سمجھ میں آیا کہ یہودیوں کے اقتصادی غلبہ کی وجہ سود ہے، اگر سود کو قانونی طور پر ناجائز قرار دے دیا جائے تو یہودی سرمایہ داری اسی طرح ختم ہو جائے گی جس طرح کسی ذی حیات کے جسم سے اس کا خون نکال لیا جائے، مگر اس کا بڑھا ہوا انتقامی جنون بعد کو اسے اقتصادی حل کے بجائے فوجی حل کی طرف لے گیا اور اس نے نہ صرف جرمنی بلکہ سارے یورپ سے یہودیوں کے استیصال کے لئے تاریخ کی ہولناک ترین جنگ چھیڑ دی۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد یورپ کے بچے کھچے یہودی امریکہ پہنچ گئے، پچھلے تیس برس میں اس قوم نے امریکہ کے سودی اداروں کو اپنے ہاتھ میں لے کر امریکہ کی اقتصادیات پر دوبارہ اسی طرح قبضہ کر لیا ہے جس طرح انہوں نے اس سے پہلے یورپ کی اقتصادیات پر قبضہ کیا تھا، چنانچہ نازی جرمنی کی طرح امریکہ میں بھی ان کے خلاف نفرت کا آغاز ہو چکا ہے حتی کہ مبصرین پیشین گوئی کر رہے ہیں کہ عجیب نہیں کہ مستقبل میں امریکہ میں بھی ان کے خلاف کوئی ''ہٹلر'' پیدا ہو جائے۔

یہی صورت حال ایک اور شکل میں ''زیر ترقی ممالک'' میں پیش آ رہی ہے، یہ ممالک اپنی ترقیاتی اسکیموں کے لئے ترقی یافتہ ممالک سے قرضہ لینے پر مجبور تھے، یہ قرضہ موجودہ اقتصادی نظام کے تحت، انہیں سودی شرائط پر ملا۔

سود کی اقتصادی کرامت کے نتیجہ میں قرضوں کی یہ رقم بڑھتے بڑھتے اب اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ کئی مدیون ملک اپنی سالانہ قسطوں کی ادائیگی کے لئے خود دائن ملکوں سے دوبارہ قرض لینے پر مجبور ہو گئے ہیں، اکثر ملکوں کا یہ حال ہے کہ اگر انہیں یہ سارے قرضے مع سود ادا کرنے پڑیں تو مکمل طور پر دیوالیہ ہو جائیں۔ (عقلیات اسلام، عظمت قرآن)

مضامین قرآن مجید:

قرآن مجید میں جو مضامین آئے ہیں، بنیادی طور پر وہ چھ ہیں:

(۱)احکام۔ (۲)جدل۔ (۳) تذکیر بآلاء اللہ۔

(۴) تذکیر بایام اللہ۔ (۵) تذکیر بالموت۔ (۶)امثال۔

جدل:

''جدل'' سے مراد کسی فکر کی مدلل تردید کرنا ہے، قرآن مجید میں اس کے زمانۂ نزول کے پس منظر میں خاص طور پر پانچ گروہوں پر رد کیا گیا ہے:

ا-مشرکین:

مشرکین پر رد کرتے ہوئے ان کی اصل بیماریوں کو خاص طور پر ہدف بنایا گیا ہے، شرک کا عمومی سبب دو باتیں تھیں، تشبیہ اور آباء واجداد کی اندھی تقلید-تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ وہ صفات واختیارات میں بعض مخلوقات کو خدا کے مشابہ قرار دیتے تھے اور خدا کی طاقت میں شریک مانتے تھے؛ اس لئے وہ ان کو معبود کے درجہ میں رکھتے تھے، قرآن مجید نے بار بار اس بات کو واضح کیا ہے کہ اللہ تعالی اپنی صفات اور قدرت میں یکتا ہیں، کوئی ان کا ہمسر اور مشابہ نہیں ہے؛ اس لئے اللہ تعالی کی شان ربوبیت کا بار بار ذکر فرمایا گیا ہے کہ کائنات کا پورا نظام اللہ تعالی براہ راست چلا رہے ہیں اور اس میں کسی مخلوق کے محتاج نہیں ہیں، جیسا کہ انسان مملکت کے نظام کو چلانے میں مددگاروں کا محتاج ہوتا ہے۔

مشرکین مکہ شرک کے حق ہونے پر ایک دلیل یہ پیش کرتے تھے کہ ان کے آباء واجداد سے ہی ہوتا آیا ہے اور پھر اپنی نسبت حضرت ابراہیمؑ کی طرف بھی کیا کرتے تھے، قرآن کریم میں ان کی تردید کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اولا تو حضرت ابراہیمؑ توحید خالص پر قائم تھے، دوسرے اگر آباء واجداد خود ناواقف ہوں تو ان کی تقلید کرنا عقل کی رو سے بھی غلط ہے؛ کیوں کہ ناواقف کی تقلید انسان کو گمراہی کی طرف ہی لے جاتی ہے۔

اگر چہ مشرکین مکہ حضرت ابراہیمؑ وحضرت اسماعیلؑ کو اللہ کا پیغمبر تسلیم کرتے تھے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایمان نہیں لاتے تھے، اس سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ آپ ﷺ بھی ہماری طرح انسان ہیں اور انسانی ضرورتوں سے دوچار ہیں، پھر آپ کیسے اللہ کے پیغمبر ہو سکتے ہیں؟ قرآن نے اس کی تردید کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ جو پیغمبر پہلے گذر چکے ہیں، وہ بھی انسان ہی تھے، انسانوں کے درمیان کسی انسان ہی کو نبی بنانا مصلحت کا تقاضہ ہے؛ تاکہ وہ اپنے متبعین کے لئے نمونہ بن سکیں؛ کیوں کہ کوئی فرشتہ یا جنات انسان کے لئے نمونہ نہیں بن سکتا، پھر یہ کہ جب اللہ تعالی تمام انسانوں کے مالک ہیں تو اللہ کے اختیار میں ہے کہ وہ جسے چاہیں اپنی رسالت کے لئے منتخب فرمائیں۔

مشرکین مکہ کو ’’بعث بعد الموت‘‘ سے بھی انکار تھا، قرآن مجید نے اس پر رد کیا ہے اور اس کو عقل اور فطرت کے ذریعہ سمجھایا ہے کہ جیسے زمین مردہ ہو جاتی ہے اور پھر اللہ بارش کے ذریعہ اس کو زندہ کرتے ہیں، اسی طرح اللہ انسانوں کو بھی دوبارہ زندہ کریں گے۔

۲-یہود:

یہود اگرچہ توحید پر ایمان رکھتے تھے اور تورات کو مانتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ مختلف برائیوں میں مبتلا تھے، ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صرف اس لئے ایمان نہیں لاتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنو اسماعیل میں سے ہیں نہ کہ بنو اسحاق میں سے، اس کے علاوہ وہ تورات کے احکام میں لفظی اور معنوی تحریف کے بھی مرتکب تھے، وہ تورات کے بعض احکام غریبوں اور کمزوروں پر نافذ کرتے تھے اور دولت مندوں اور طاقتوروں کو چھوڑ دیتے تھے۔ قرآن مجید نے یہ اور اس طرح کی دوسری اخلاقی برائیوں پر تنقید کی ہے اور خود حضرت ابراہیمؑ اور انبیاء بنی اسرائیل کے قصص و واقعات کے حوالہ سے ان پر رد کیا ہے۔

۳-نصاریٰ:

عیسائیوں کے تین بنیادی عقائد ہیں، ان پر قرآن مجید نے تنقید کی ہے:

اول: عقیدۂ تثلیث یعنی عیسائیوں کے نزدیک تین خدا ہیں، باپ یعنی خالق کائنات، بیٹا یعنی حضرت عیسیٰؑ ہے اور روح القدس، یہ تین مل کر ایک بنتے ہیں۔

دوسرے: حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھائے جانے کا عقیدہ، یعنی ان کے خیال کے مطابق حضرت آدمؑ نے جنت میں گناہ کیا تھا، ان کا گناہ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا، اس کے کفارہ کے طور پر اللہ تعالی نے نعوذ باللہ اپنے بیٹے کو پیدا کیا، جو سولی پر چڑھائے گئے اور وہ پوری نسل انسانی کے گناہوں کے لئے کفارہ بن گئے۔

تیسرے: حضرت عیسیٰؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارت دی تھی، یہ بشارت ’’احمد‘‘ کے نام سے تھی، عبرانی زبان میں ’’احمد‘‘ کا ترجمہ اس کے ہم معنی لفظ ’فارقلیط‘‘ سے کر دیا گیا؛ حالاں کہ ناموں کا ترجمہ نہیں کیا جاتا، پھر معنوی تحریف بھی کی کہ ’’فارقلیط‘‘ کا ترجمہ قابل تعریف کے بجائے ’’مددگار‘‘ کرنے لگے۔

قرآن مجید نے موقع بہ موقع عیسائیوں کی ان تینوں گمراہیوں پر گذشتہ آسمانی کتابوں اور انسانی عقل وفطرت کی دلیلوں سے رد گیا ہے۔

۴-منافقین:

منافقین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے آپ کو بظاہر مسلمان کہتے تھے اور کلمہ طیبہ پڑھتے تھے، لیکن اپنے دل میں کفر کو چھپائے رہتے تھے، ان کا اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنا یا تو مسلمانوں کے خوف سے ہوتا تھا یا کچھ مادی فائدے جیسے مال

غنیمت اور مال زکوۃ حاصل کرنے کے لئے۔

بظاہر یہ چاروں طبقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں تھے، لیکن درحقیقت قرآن مجید میں ان تمام طبقوں کا ذکر موجود ہے، جو قیامت تک باقی رہنے والی آسمانی کتاب ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ مختلف گروہ ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

تذکیر بالاء اللہ:

اس سے مراد اللہ کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینا ہے، اس سلسلہ میں قرآن مجید نے جا بجا آسمان و زمین کی تخلیق، بارش و پانی کے نظام، پھلوں اور کھیتیوں کی پیداوار وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور ان نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے نعمت عطا فرمانے والے خدا کی بندگی کی دعوت دی ہے۔

تذکیر بایام اللہ:

ایام اللہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے اپنی فرمانبرداری کرنے والوں کے ساتھ کیا سلوک فرمایا اور اپنی نافرمانی کرنے والوں کو کیا سزائیں دیں؟ قرآن مجید نے اس کے لئے مختلف انبیاء اور ان کے احوال و واقعات کو بیان کیا ہے، جن کو ''قصص'' کہا جاتا ہے، قرآن نے بعض قصص کو مخاطب کی ضرورت اور واقعات کی مناسبت سے بار بار ذکر فرمایا ہے، جیسے: حضرت آدمؑ کی تخلیق، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ علیہم السلام اور فرعون وغیرہ کے واقعات، اور بعض کا ایک دو جگہ ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے، جیسے: حضرت یوسفؑ کا واقعہ، یا حضرت موسیٰؑ ہے اور حضرت خضر کی ملاقات، اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے قصے۔

تذکیر بالموت:

انسان کو سب سے زیادہ خوف دلانے والا اور صحیح راستہ پر قائم رکھنے والا عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسان کو مرنا اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، اس لئے قرآن مجید میں اس مضمون کو بکثرت بیان کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں جنت کے انعامات اور دوزخ کی سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔

احکام:

قرآن مجید نے زندگی کے تمام مسائل کے بارے میں ہدایات دی ہیں؛ چنانچہ اہل علم کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں تقریباً پانچ سو آیات وہ ہیں جن میں عملی زندگی کے احکام بیان کئے گئے ہیں، شیخ عبد الوہاب الخلاف نے عبادات کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق آنے والے صریح احکام کے اعداد و شمار اس طرح ذکر کئے ہیں:

◇ احوال شخصیہ　:　۷۰
◇ عدالتی قوانین　:　۱۳

◇ قانون شہریت	:	۷۰
◇ دستوری قوانین	:	۱۰
◇ جرم وسزا	:	۳۰۱
◇ اقتصادی قوانین	:	۱۰
◇ قومی وبین قومی تعلقات	:	۲۵

امثال:

مثالوں سے کسی بات کا سمجھنا آسان ہوتا ہے؛اس لئے قرآن نے توحید، رسالت، بعث بعدالموت، ہدایت یافتہ اور گمراہ لوگوں کو مثالوں سے سمجھایا ہے، ان امثال کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو آسانی کے ساتھ بات سمجھ میں آجائے اور نصیحت حاصل کرنے کا ذریعہ بنے:

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴿۲۷﴾ (الزمر:۲۷)

اور ہم نے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں بیان کی ہیں؛ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔قرآن مجید میں امثال کی تعداد ۱۶۶ ہے۔

جمع قرآن:

قرآن مجید موجودہ ترتیب کے مطابق نازل نہیں ہوا، اس کی موجودہ ترتیب اللہ تعالی کی ہدایت کے مطابق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر نگرانی صحابہ کرام کے ذریعہ انجام پائی، عہد نبوی میں اس کی حفاظت دو پہلوؤں سے کی گئی:

(۱) حفظ کے ذریعہ۔ (۲) کتابت کے ذریعہ۔

۱-بصورت حفظ:

عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جب کہ قرآن نازل ہورہا تھا، اہل عرب پڑھنا لکھنا بہت کم جانتے تھے، اس وقت پڑھنے لکھنے کے وسائل یعنی کاغذ وغیرہ بھی آسانی سے میسر نہیں تھے اور لوگ کسی بھی چیز کو محفوظ رکھنے کے لئے اسے یاد کرلیتے تھے، اس دور کے حالات کے پیش نظر یہی طریقہ زیادہ محفوظ اور قابل اعتماد تھا، یوں بھی اہل عرب اپنی حیرت انگیز قوت حافظہ کی وجہ سے دنیا بھر میں ممتاز تھے، وہ طویل قصائد، مشہور جنگوں کے واقعات، نسب نامے حتی کہ اپنے جانوروں تک کے پشتہا پشت کے نسب نامے زبانی یادرکھتے تھے؛ چنانچہ قرآن نازل ہوا تو انہوں نے پورے ذوق وشوق سے اسے یاد کرنا شروع کردیا، صحابہ کرام کو قرآن سیکھنے اور اسے یادرکھنے کا اتنا شوق تھا کہ ہر شخص اس معاملہ میں دوسرے سے آگے بڑھنے کی فکر میں رہتا تھا، اسی محنت اور کوشش کا نتیجہ تھا کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہی حفاظ صحابہ کی ایک بڑی تعدادوجود میں آگئی تھی، روایات میں تقریباً چالیس صحابہؓ کا ذکر ملتا ہے، جنہوں نے پورا قرآن یاد کرلیا تھا۔ان میں سے چند اہم نام یہ ہیں:

خلفاء اربعہ، حضرت طلحہ، حضرت سعد، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ، حضرت سالم مولی ابی حذیفہ، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت عمرو بن العاص اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ، حضرت عبد اللہ ابن زبیر، حضرت عبداللہ ابن سائب، حضرت ابی بن کعب، حضرت معاذ بن جبل، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابودرداء، حضرت مجمع بن حارثہ، حضرت انس بن مالک اور ان کے چچا ابوزید، امہات المومنین حضرت عائشہ، حضرت حفصہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہم۔ (مناہل العرفان: ۱/ ۱۷۴)

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کل صحابہ جنہیں پورا قرآن یاد تھا، چالیس ہی تھے، یہ تو وہ اصحاب ہیں جن کا نام روایات میں محفوظ رہ گیا ہے، ورنہ صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات ہی میں مکمل قرآن مجید حفظ کرلیا تھا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ غزوۂ بئر معونہ جو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں پیش آیا، صرف اس غزوہ میں ستر حفاظ صحابہؓ کے شہید ہونے کا ذکر ملتا ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے کچھ ہی دنوں بعد ہونے والی جنگ یمامہ میں بھی اتنے ہی حفاظ شہید ہو گئے تھے، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ ہی میں صحابہؓ کی ایک بڑی تعداد نے پورا قرآن حفظ کرلیا تھا، پھر ایسے صحابہ کا تو کوئی شمار نہیں جنہوں نے قرآن کریم کے متفرق حصے یاد کر رکھے تھے؛ کیوں کہ نماز میں قراءت فرض ہونے کی وجہ سے کسی مسلمان کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ اسے قرآن سرے سے یاد ہی نہ ہو، پھر حفاظ کی یہ تعداد عہد بہ عہد بڑھتی ہی رہی اور اس طرح ایک بڑی تعداد کے ذریعہ سینہ بہ سینہ قرآن مجید منتقل ہوتا رہا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

۲- بصورت کتابت:

قرآن کی حفاظت کا خصوصی اور نہایت اعلی انتظام ہوا کہ اسے حفظ کے ساتھ ساتھ کتابت کے ذریعہ بھی محفوظ کیا گیا، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کی کتابت کا خاص اہتمام فرماتے تھے، جب بھی کوئی وحی نازل ہوتی، سب سے پہلے اسے لکھواتے، پھر پڑھوا کر سنتے اور اس کی اصلاح فرماتے؛ تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے اور تب جا کر اس کی عام اشاعت کا حکم دیا کرتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف آیات کو لکھوایا کرتے؛ بلکہ سورتوں کے اندر آیات کا مقام اور سورتوں کی ترتیب کی بھی نشاندہی فرماتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کاتب وحی کو یہ ہدایت بھی فرمادیتے تھے کہ اسے فلاں سورۃ میں فلاں فلاں آیت کے بعد لکھا جائے، عرب میں اس زمانہ میں کاغذ کمیاب تھا؛ اس لئے یہ قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں اور جانوروں کی ہڈیوں وغیرہ پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی میسر آنے پر کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے جاتے تھے اور پھر یہ کتابت شدہ صفحات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دولت خانہ میں محفوظ کردیئے جاتے۔ (ترمذی، مناہل العرفان)

اس کام کے لئے آپ ﷺ نے بہت سے صحابہؓ کو مقرر فرمایا تھا، ان کاتبین وحی کی تعداد چالیس تک پہنچتی ہے، یعنی چالیس صحابہ تھے، جو نبی کریم ﷺ کے لئے کتابت وحی کا فریضہ انجام دیتے تھے، ان میں سے چند مشہور صحابہ کے نام یہ ہیں:

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ثابت بن قیسؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت ابان بن سعیدؓ، حضرت عبداللہ بن ابی سرحؓ۔

اس طرح عہد نبوی ﷺ ہی میں قرآن مجید پورا کا پورا لکھا ہوا موجود تھا اور نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالی کی ہدایت کے مطابق اس کی ترتیب متعین فرمادی تھی، بہت سے صحابہ کرامؓ کے پاس بھی قرآن کے لکھے ہوئے نسخے موجود تھے، گرچہ وہ مختلف ٹکڑوں، ہڈیوں اور پارچوں پر لکھے ہوئے تھے، خود حضرت زید بن ثابتؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھ کر قرآن کو کاغذ کے مختلف ٹکڑوں سے اکٹھا کیا کرتے تھے: "**كنا عند رسول الله صلى الله عليه وسلم نؤلف القرآن من الرقاع**" (ترمذی) اس کا اندازہ ان روایات سے بھی ہوتا ہے جن میں نبی کریم ﷺ نے قرآن کو دیکھ کر پڑھنے کی فضیلت بیان کی ہے اور دشمن کے علاقہ میں قرآن کے نسخے لے جانے سے منع فرمایا ہے، تاکہ دشمن اس کی بے حرمتی نہ کریں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن نبی کریم ﷺ کی حیات ہی میں مکمل طور سے لکھا ہوا تھا اور مختلف صحابہؓ کے پاس بھی اس کے نسخے موجود تھے۔

عہد صدیقی میں:

حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں ایک واقعہ پیش آیا کہ جنگ یمامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی تعداد شہید ہوگئی، حضرت عمرؓ نے خدشہ محسوس کیا کہ کہیں اس طرح کی مزید جنگوں میں حفاظ کی بڑی تعداد شہید نہ ہو جائے؛ چنانچہ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ وہ امت کی اجتماعی تصدیق سے ایک نسخہ تیار کرائیں، حضرت ابوبکرؓ کو ابتداءً ایک ایسے کام کو انجام دینے میں تامل ہوا، جس کو خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا تھا مگر حضرت عمرؓ کے بار بار توجہ دلانے پر ان کو بھی اطمینان ہو گیا، اب اس اہم کام کے لئے کسی غیر معمولی صلاحیت کے حامل فرد کی ضرورت تھی؛ چنانچہ ان کی نظر انتخاب حضرت زید بن ثابتؓ پر پڑی؛ کیوں کہ وہ نوجوان سمجھدار، بااعتماد شخص تھے، حافظ قرآن بھی تھے اور رسول اللہ ﷺ کے لئے وحی کی کتابت کا فریضہ بھی انجام دے چکے تھے، یہ کام اس قدر ذمہ داری کا متقاضی اور اتنی اہمیت کا حامل تھا کہ حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں: "خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا، جتنا جمع قرآن کے کام کا ہوا" "**فوالله لو كلفوني نقل جبل من الجبال الخ**"۔ (بخاری)

اس مرحلہ میں جمع قرآن کی اہمیت اور اس سلسلے میں کئے جانے والے غیر معمولی اہتمام کا اندازہ اس طریق کار سے لگایا جاسکتا ہے، جو حضرت زید بن ثابتؓ نے اس موقع پر اختیار کیا، انہوں نے قرآن کا یہ نسخہ محض اپنے حفظ یا دیگر حفاظ

صحابہ کی یادداشت کی بنیاد پر تیار نہیں کیا؛ بلکہ اس کے لئے ایک نہایت مشکل اور پیچیدہ؛ لیکن انتہائی باوثوق اور محفوظ طریقہ کا انتخاب کیا، ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اس وقت تک اپنے نسخے میں کوئی آیت درج نہیں کرتے تھے، جب تک اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی دونوں شہادتیں نہ مل جاتیں، پھر وہ لکھی ہوئی آیات تب ہی قبول فرماتے تھے، جب اس تحریر کے سلسلے میں دو لوگ گواہی دے دیتے کہ یہ آیات آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگرانی میں لکھی گئی تھیں، پھر ان طریقوں سے اکٹھا کی ہوئی آیات کا مقابلہ ان مجموعوں سے کیا جاتا تھا، جو مختلف صحابہؓ نے تیار کر رکھے تھے؛ چنانچہ تحقیق کے ان اعلیٰ اصولوں کے تحت امت کی اجتماعی تصدیق سے قرآن مجید کا ایک نسخہ وجود میں آیا، اگر ہم اس نسخے کی تیاری کے سلسلہ میں برتی جانے والی غیر معمولی احتیاط اور محفوظ طریق کار کو پیش نظر رکھیں تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آتی ہے کہ عہد صدیقی میں جمع قرآن کا مقصد صرف قرآنی آیات کو ایک جگہ اکٹھا کرنا نہیں تھا، کیوں کہ اس طرح کے تو بہت سے نسخے صحابہ کرامؓ کے پاس موجود تھے؛ بلکہ اس کا مقصد ایک ایسا نسخہ تیار کرنا تھا، جو امت کی اجتماعی تصدیق کے ذریعہ تیار شدہ ہو اور جس کی موجودگی میں آگے چل کر کسی فتنہ واختلاف کا اندیشہ باقی نہ رہے۔

جمع عہد صدیقی کی خصوصیات:

عہد صدیقی میں مذکورہ بالا طریق کار کے مطابق قرآن کا جو نسخہ تیار ہوا، وہ درج ذیل خصوصیات کا حامل تھا:

◇ قرآن کا یہ نسخہ نہایت اعلیٰ تحقیقی اصولوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا تھا اور اس میں امت کی اجتماعی تصدیق شامل تھی۔

◇ اس نسخہ میں تمام آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق جمع کی گئی تھیں؛ البتہ ہر سورہ علاحدہ علاحدہ لکھی گئی تھی۔

◇ یہ نسخہ خط حیری میں لکھا گیا تھا۔

◇ اس میں صرف وہی آیتیں شامل تھیں، جو حضرت جبرئیل نے آپ کی حیات مبارکہ کے آخری رمضان المبارک میں آپ کو پورا قرآن سناتے وقت پڑھی تھیں اور اسی ترتیب کے مطابق تھیں، اگر کوئی منسوخ التلاوۃ آیت رہی ہو تو وہ اس میں شامل نہیں تھی۔

آپ کی حیات میں یہ نسخہ آپ کے پاس رہا، پھر حضرت عمرؓ کے پاس رہا، حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد ان کی وصیت کے مطابق حضرت حفصہ کے حوالہ ہو گیا اور حضرت حفصہ کے انتقال کے بعد مروان نے اپنے عہد حکومت میں اسے اس خیال سے نذر آتش کر دیا کہ اب حضرت عثمانؓ کے دور میں جمع کردہ مصاحف کے رسم الخط پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا تھا؛ چنانچہ مناسب نہ تھا کہ کوئی ایسا نسخہ باقی رہے، جو رسم الخط میں عثمانی مصاحف سے مختلف ہو۔

عہد عثمانی میں:

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع قرآن کی نوعیت جاننے سے قبل ایک بنیادی نکتہ سے واقف ہونا ضروری ہے، وہ یہ

ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قرآن کریم مختلف طریقوں سے پڑھا ہے، ان مختلف طریقوں کو قرآن کی قراءتیں کہا جاتا ہے اور قرآن میں ان تمام قراءتوں کی گنجائش ہے، جو نبی کریم ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہیں، نبی کریم ﷺ نے مختلف صحابہ ؓ کو مختلف قراءتوں کے مطابق قرآن کی تعلیم دی تھی۔

جب حضرت عثمان ؓ خلیفہ بنے تو اس وقت تک اسلام کی سرحدیں بہت وسیع ہو چکی تھیں اور اسلام دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا، ہر نئے علاقہ کے لوگ ان صحابہ سے قرآن سیکھتے، جو ان کے علاقہ میں موجود تھے، اس طرح مختلف صحابہ سے قرآن سیکھنے کی وجہ سے مختلف علاقوں میں مختلف قراءتیں رائج ہو گئیں، اب جب وہ لوگ بھی آپس میں ملتے تو اپنی قراءت کو درست اور دوسرے کی قراءت کو غلط سمجھتے، اس طرح ان میں اختلاف پیدا ہوتا اور بعض مرتبہ نوبت ایک دوسرے کو کافر قرار دینے تک پہنچ جاتی، ظاہر ہے کہ حضرت عثمان ؓ جیسا دور اندیش خلیفہ اس اہم معاملہ کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا، انہیں متعدد ذرائع سے اس طرح کے واقعات کی اطلاع مل چکی تھی اور خود مدینہ میں بھی اس قسم کے بعض واقعات پیش آئے تھے؛ چنانچہ انہوں نے جلیل القدر صحابہ کرام ؓ سے مشورہ کیا اور بالآخر وہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام امت کو ایک مصحف پر جمع کر دیا جائے؛ تاکہ پھر کوئی اختلاف وافتراق پیش نہ آئے۔

جمع عہد عثمانی کی خصوصیات:

حضرت عثمان ؓ نے اس اہم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی، جو حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت سعید بن العاص اور حضرت عبدالرحمن بن حارث بن ہشام ؓ پر مشتمل تھی، بعد میں چند اور صحابہ ؓ کو بھی اس میں شامل کیا گیا، یہاں تک کہ ان کی تعداد بارہ تک پہنچ گئی، اس کمیٹی نے اس کام کے لئے درج ذیل طریقہ کار اختیار کیا:

(۱) اس مصحف کی تیاری کے لئے انہوں نے بنیادی طور پر حضرت ابوبکر ؓ کے زمانہ میں تیار کردہ صحیفہ کو سامنے رکھا، یہ صحیفہ اس وقت حضرت حفصہ ؓ کی تحویل میں تھا اور حضرت عثمان ؓ نے اس کام کے لئے ان سے حاصل کیا تھا۔

(۲) حضرت ابوبکر ؓ کے زمانہ میں جو صحیفہ تیار ہوا تھا، اس میں سورتیں مرتب شکل میں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ جزء میں لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے ایک نسخہ میں آنحضرت ﷺ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق سورتوں کو مرتب شکل میں تحریر کیا۔

(۳) اس مرحلہ کا سب سے اہم کام یہ تھا کہ ان حضرات نے قرآن کریم کو لکھنے کے لئے ایسا رسم الخط منتخب کیا، جس میں قرآن کی تمام متواتر قراءتیں سما جائیں، اسی غرض سے نہ تو ان پر نقطے لگائے گئے اور نہ ہی اعراب؛ تاکہ اسے تمام متواتر قراءتوں کے مطابق پڑھا جا سکے، یہی وہ اصل کام تھا جس کے لئے عہد عثمانی ؓ میں جمع قرآن کی ضرورت پیش آئی تھی۔

(۴) اگر قرآن مجید کے کسی لفظ کی قراءت میں اختلاف ہوتا تو اس کو قریش کی لغت کے مطابق لکھا جاتا؛ کیوں کہ

قرآن مجید اصل میں قریش ہی کی لغت میں نازل کیا گیا تھا۔اس طریق کار کے مطابق قرآن کریم کا جونسخہ تیار ہوا، اس کی موجودگی میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ تھی؛ کیوں کہ اس نسخہ میں تمام قراءتیں شامل تھیں اور ہر شخص اپنی قراءت کے مطابق ان سے تلاوت کرسکتا تھا۔

اس کمیٹی نے اس نئے مرتب کردہ مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں، عام طور سے مشہور ہے کہ حضرت عثمانؓ نے کل پانچ مصحف تیار کرائے تھے، لیکن معروف عالم ابوحاتم سجستانیؒ کی رائے ہے کہ سات مصاحف تیار کرائے گئے تھے، ان میں سے ایک مصحف مکہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا اور ایک مدینہ میں محفوظ رکھا گیا، اس طرح پوری اسلامی سلطنت میں ایک ہی نسخہ کو رائج کر دیا گیا۔

قرآن کریم کے یہ معیاری نسخے تیار کرانے اور انہیں پوری اسلامی مملکت میں پھیلا دینے کے بعد حضرت عثمانؓ نے وہ تمام ذاتی نسخے جلا دینے کا حکم دیا، جو مختلف صحابہ کے پاس موجود تھے؛ تاکہ مصحف تیار کرانے کا ان کا مقصد حاصل ہو سکے اور ساری امت ایک ہی مصحف پر جمع ہوجائے اور پھر کسی اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہے؛ چنانچہ اس وقت سے لے کر آج تک قرآن مجید کی کتابت کے لئے وہی خط رائج ہے، جو حضرت عثمانؓ نے اختیار کیا، اسی لئے اسے ''رسم عثمانی'' کہا جاتا ہے اور مصاحف کو اسی رسم الخط میں لکھنا ضروری ہے۔

سورتوں اور آیتوں کی ترتیب:

اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ قرآن مجید کے کلمات کی ترتیب توقیفی ہے اور آیات بھی توقیفی ہیں، اس میں اجتہاد کو دخل نہیں؛ بلکہ جس ترتیب سے حضرت جبرئیلؑ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا، اس ترتیب سے آپ نے اس کی کتابت کرائی اور اسی طرح مصحف صدیقی اور مصحف عثمانی میں اسے تحریر کیا گیا؛ اسی طرح قرآن مجید کی سورتیں بھی توقیفی ہیں، یعنی اس میں اجتہاد کو دخل نہیں، جیسا کہ حضرت عثمان غنیؓ سے روایت ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کوئی آیت نازل ہوئی تو آپ کاتبین وحی میں سے کسی کو طلب فرماتے اور فرماتے کہ ان آیات کو فلاں سورت میں لکھو جس میں یہ اور یہ بات ذکر کی گئی ہے۔ (سنن ترمذی) جمہور کی رائے یہ ہے کہ سورتوں کے جو نام ہیں وہ بھی توقیفی ہیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورتوں کو ان ناموں سے موسوم فرمایا ہے؛ اسی لئے حدیث میں بہت سی سورتوں کے نام وارد ہوئے ہیں، جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اقرؤا الزهراوين: البقرة وآل عمران''۔ (مسلم)

مقدار کے اعتبار سے سورتوں کی قسمیں:

آیات کی مقدار کے اعتبار سے قرآن کی سورتوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا:

(۱) طوال: یہ سورۂ بقرہ سے سورہ توبہ تک کی سات طویل سورتیں ہیں۔

(۲) مئین: وہ سورتیں جن میں سو یا اس سے کچھ زیادہ یا کچھ کم آیتیں ہیں، یہ انفال سے لے کر غافر تک تیرہ سورتیں ہیں۔

(۳) مثانی: جن میں سو سے کم اور عموماً مفصلات سے زیادہ آیتیں ہیں، یہ سورۂ رعد سے سورۂ فتح تک اٹھائیس سورتیں ہیں۔

(۴) مفصلات: جو سورۂ ق سے شروع ہوکر سورۂ ناس پر ختم ہوتی ہیں، پھر ان میں حجرات سے بروج تک ''طوال مفصل'' اور بروج سے بینہ تک ''اوساط مفصل'' اور اس کے بعد کی سورتیں ''قصار مفصل'' کہلاتی ہیں۔

کچھ اہم اعداد و شمار:

◇ قرآن مجید کی کل سورتیں: ۱۱۴۔

◇ مکی دور میں نازل ہونے والی سورتیں: ۸۶۔

◇ مدنی دور میں نازل ہونے والی سورتیں: ۲۸۔

◇ قرآن مجید کی کل آیات: ۶۲۳۶۔

◇ قرآن مجید کے کل کلمات: ۷۷۹۳۲۔

◇ قرآن مجید کے کل حروف: ۳۳۲۰۱۵۔

◇ قرآن مجید کے کل اجزاء (پارے): ۳۰۔

◇ قرآن مجید کے کل احزاب: ۷۔

◇ قرآن مجید میں سجدوں کی تعداد: ۱۵۔

(جن میں سے ایک کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہاں سجدہ کیا جائے گا یا نہیں؟)

◇ قرآن مجید کی سب سے بڑی سورۃ: سورہ بقرہ۔

◇ قرآن مجید کی سب سے بڑی آیت: بقرہ: ۲۸۲ (آیت مداینت)۔

◇ قرآن مجید کی سب سے چھوٹی سورۃ: سورہ کوثر۔

◇ قرآن مجید کتنے سال کی مدت میں نازل ہوا؟: تقریباً ۲۲ سال ۵ ماہ چودہ دن۔

◇ پہلی وحی: سور علق کی ابتدائی پانچ آیات۔

◇ آخری وحی: سورہ توبہ کی آخری دو آیات۔

◇ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قرآن مجید کے ان حفاظ کی تعداد، جن کے ناموں کی صراحت ملتی ہے: ۴۱۔

◇ کاتبین وحی کی تعداد: ۴۰۔

مکی و مدنی سورتیں:

قرآن کریم کی بعض سورتیں مکی ہیں اور بعض مدنی، تقسیم زمانۂ نزول کے اعتبار سے ہے، مدینہ ہجرت کرنے سے پہلے جو

سورتیں نازل ہوئیں، وہ مکی ہیں، خواہ وہ کسی بھی جگہ نازل ہوئی ہوں، اور ہجرت کر کے مدینہ پہنچنے کے بعد جو سورتیں نازل ہوئیں، وہ مدنی ہیں خواہ کسی مقام پر نازل ہوئی ہوں، آیات اور سورتوں کے درمیان مکی اور مدنی کی تقسیم اگر چہ نبی کریم ﷺ سے مروی نہیں ہے لیکن بعد میں صحابہ اور تابعین نے آیات اور سورتوں کے بارے میں وضاحت کی کہ فلاں سورہ یا آیت مکی ہے اور فلاں مدنی، اس کے علاوہ بعض دیگر شواہد کی بنیاد پر بھی یہ فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ کوئی سورہ یا آیت مکی ہے یا مدنی؟

مکی اور مدنی سورتیں چوں کہ مختلف حالات اور ماحول میں نازل ہوئیں اور ان کے مخاطب بھی مختلف تھے؛ اس لئے ان کے انداز اور اسلوب میں فرق پایا جاتا ہے مکی زندگی میں مسلمانوں کا واسطہ چوں کہ زیادہ تر عرب کے بت پرستوں سے تھا اور کوئی اسلامی ریاست وجود میں نہیں آئی تھی؛ اس لئے اس دور میں زیادہ زور عقائد کی درستی، اخلاق کی اصلاح، بت پرستوں کی مدلل تردید، مظاہر فطرت پر غور وفکر کی دعوت اور قرآن کریم کی شان اعجاز کے اظہار پر دیا گیا۔

مکی سورتوں کی خصوصیات:

مکی سورتوں کی بعض خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) مکی سورتوں میں عام طور سے مشرکین اور بت پرستوں کو خطاب کیا گیا ہے اور اہل کتاب اور منافقین کو مخاطب نہیں بنایا گیا ہے۔

(۲) مکی سورتیں زیادہ تر توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات، حشر ونشر کی منظر کشی، آنحضرت ﷺ کو صبر وتسلی کی تلقین اور پچھلی امتوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، ان سورتوں میں احکام وقوانین بہت کم بیان ہوئے ہیں۔

(۳) مکی آیتیں اور سورتیں عموماً چھوٹی چھوٹی اور مختصر ہیں، اور ان کا اسلوب بیان زیادہ پرشکوہ ہے، ان میں استعارات، تشبیہات اور تمثیلیں زیادہ ہیں اور ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع ہے۔

اس کے علاوہ مکی سورتوں کی پہچان کے لئے بعض علماء کے نزدیک چند مخصوص علامات بھی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

(۱) مکی سورتوں میں عموماً ''یاایھاالناس'' (اے لوگو!) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے۔

(۲) ہر وہ سورہ جس میں لفظ ''کلا'' (ہرگز نہیں) آیا ہے، وہ مکی ہے، یہ لفظ پندرہ سورتوں میں ۳۳ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

(۳) ہر وہ سورہ جس میں آیت سجدہ آئی ہے، مکی ہے۔

(۴) سورۂ بقرہ کے سوا ہر وہ سورہ جس میں آدم وابلیس کا واقعہ آیا ہے، مکی ہے۔

مدنی سورتوں کی خصوصیات:

مدینہ طیبہ میں چوں کہ ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی اور لوگ جوق درجوق اسلام میں داخل ہو رہے تھے، بت پرستی کا ابطال ہو چکا تھا اور تمام تر نظریاتی مقابلہ اہل کتاب سے تھا، اس لئے یہاں احکام وقوانین اور حدود وفرائض کی تعلیم اور اہل کتاب کی تردید پر زیادہ توجہ دی گئی اور اس کے مناسب اسلوب بیان اختیار کیا گیا۔

مدنی آیات اور سورتوں کی چند خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) مدنی سورتوں میں زیادہ تر خطاب اہل کتاب اور منافقین سے ہے۔

(۲) مدنی سورتوں میں خاندانی اور تمدنی قوانین، جہاد وقتال کے احکام اور حدود وفرائض بیان کئے گئے ہیں۔

(۳) مدنی آیات اور سورتیں طویل اور مفصل ہیں اور ان کا اسلوب بیان مکی سورتوں کی بہ نسبت سادہ ہے۔

اس کے علاوہ مدنی سورتوں کی بعض علامات درج ذیل ہیں:

(۱) مدنی سورتوں میں عموماً ''یاایھاالذین آمنوا'' (اے ایمان والو!) کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے۔

(۲) ہر وہ سورہ جس میں جہاد کے احکام مذکور ہیں، مدنی ہے۔

(۳) ہر وہ سورہ جس میں منافقین کا ذکر آیا ہے، مدنی ہے۔

فطرت سے ہم آہنگ قانون:

قرآن کے اعجاز کا ایک دوسرا پہلو وہ ''قوانین'' ہیں، جن کو قرآن نے پیش کیا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق قرآن کی تعلیمات پوری طرح انسانی فطرت اور ضرورت و مصلحت سے ہم آہنگ ہیں اور آج پوری دنیا قرآن کے پیش کئے ہوئے دستور حیات سے خوشہ چینی پر مجبور ہے، یوں تو تجربہ سے زندگی کے تمام ہی شعبوں میں اسلامی قانون کی افادیت واضح ہو چکی ہے لیکن یہاں چند مثالوں کے تذکرہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

◇ دنیا کے اکثر مذاہب اور قوانین میں طلاق کی گنجائش نہیں تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ میاں بیوی کے درمیان کتنی ہی نفرت کیوں نہ ہو، مگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور تھے، اس کے نتیجہ میں اخلاقی قدریں بھی پامال ہوتی تھیں اور بعض اوقات عورتوں کی جان کے لالے بھی پڑ جاتے تھے، قرآن نے نہ صرف طلاق کی اجازت دی؛ بلکہ اس کے لئے منصفانہ طریقہ کار کی بھی رہنمائی کی، ہندومت اور عیسائیت دنیا کے دو بڑے مذاہب ہیں، ان کے یہاں طلاق کا کوئی تصور نہیں تھا، لیکن ان مذاہب کے بہ شمول آج دنیا کے تمام نظام ہائے قوانین میں طلاق کی گنجائش فراہم کی گئی ہے۔

◇ اکثر مذاہب میں بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کی گنجائش نہیں تھی، قرآن نے نہ صرف اس کی اجازت دی ہے؛ بلکہ اس کی تلقین کی ہے، آج اس قانون کی معقولیت سے اور اس کے مبنی بر انصاف ہونے سے کوئی سمجھدار آدمی انکار کر سکتا ہے؟

◇ بیشتر قوانین میں خواتین کے لئے حق میراث نہیں تھا، یا تو بڑے بیٹے کو میراث ملتی تھی، یا بالغ بیٹے کو، یا زیادہ سے زیادہ سب بیٹیوں کو؛ لیکن اسلام نے عورتوں کو بھی میراث کا مستحق قرار دیا اور آج پوری دنیا میں عورتوں کے لئے میراث کے استحقاق کو تسلیم کیا جا رہا ہے۔

◇ قرآن مجید نے سخت جرائم پر جسمانی سزائیں مقرر کی ہیں، آج ماہر نفسیات اس بات پر متفق ہیں اور جرائم کے اعداد وشمار اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ جسمانی سزائیں ہی مجرم کو جرم سے روکنے میں مؤثر ہوتی ہیں۔

◇ قرآن نے قتل اور جسمانی زیادتی کی سزا میں مجرم کے قتل کے مقابل قتل اور جسمانی نقصان کے مقابلہ اس قدر نقصان کا حکم دیا ہے، جس کو ''قصاص'' سے تعبیر کیا گیا ہے ''وَلَكُمۡ فِي الۡقِصَاصِ حَيٰوةٌ'' (البقرۃ:۱۷۹)- یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ قاتل کے لئے قتل کی سزا ہی مؤثر ہوتی ہے؛ چنانچہ کئی ملکوں میں سزائے موت کو ختم کرنے کے بعد دوبارہ اسے جاری کیا گیا ہے۔

◇ قرآن نے مالیاتی قوانین کے ضمن میں اس بات کی تلقین کی ہے کہ مالیاتی معاملات تحریری شکل میں ہونے چاہئیں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا تَدَايَنۡتُمۡ بِدَيۡنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكۡتُبُوۡهُ ؕ وَلۡيَكۡتُبْ بَّيۡنَكُمۡ كَاتِبٌۢ بِالۡعَدۡلِ (بقرہ:۲۸۲)

جب تم کسی مقررہ مدت کے لئے ادھار کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو اور اس کو تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔

آج پوری دنیا میں اکاؤنٹ کے تحریری ریکارڈ کو ضروری سمجھا جاتا ہے اور خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔

غرض کہ آپ قانون کے جس شعبہ کو بھی دیکھیں، قرآن مجید کا پیش کیا ہوا قانون انسانی فطرت اور ضرورت سے حد درجہ مربوط ہے، صحراء عرب کے ایک امی شخص کے لئے یہ بات کیوں کر ممکن ہوسکتی ہے کہ وہ ایک ایسا قانون وضع کرے، جو قیامت تک متمدن دنیا کی رہنمائی کرتا ہے اور جس میں تمام مفاسد کا علاج موجود ہو؟ یہ یقیناً اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کتاب انسانی تصنیف نہیں؛ بلکہ خود خالق کائنات کا برحق کلام ہے۔

قصص وواقعات

قرآن مجید نے ماضی کے ان قصص وواقعات کو بھی بیان کیا ہے، جن سے عالم عرب میں کوئی شخص واقف نہیں تھا، نہ ان کے اشعار میں کہیں اس کا ذکر آتا تھا اور نہ ان کے یہاں مروج کہانیوں میں اس کا کوئی سراغ تھا، مکی زندگی میں یہود ونصاریٰ کے علماء سے آپ کی کوئی ایسی طویل ملاقات نہیں ہوئی، جس میں انسان ایک دوسرے کی معلومات سے واقف ہوتا ہے۔ مدینہ جانے کے بعد اگر چہ کہ یہودیوں سے آپ کا سابقہ رہا لیکن آپ ﷺ کے ساتھ ان کا رویہ نہایت مخاصمانہ تھا اور زیادہ تر وہ آپ ﷺ کی نبوت کا امتحان لینے کے لئے الٹے سیدھے سوالات کیا کرتے تھے، اس کے باوجود آپ نے انبیاء بنی اسرائیل اور ان سے پہلے کے واقعات کو قرآن مجید میں بڑے خوبصورت پیرایہ میں پند وموعظت کے ساتھ نقل کیا ہے، ان میں بعض قصص تو ایسے ہیں کہ جن کا خود تورات یا انجیل میں بھی ذکر نہیں ہے، یا وہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد کے ہیں، جیسے: اصحاب کہف کا واقعہ، ذوالقرنین کا واقعہ، اصحاب اخدود کا قصہ وغیرہ۔

پھر بعض واقعات کے بیان میں قرآن نے گذشتہ آسمانی کتابوں کی تحریفات کو سامنے رکھ کر گفتگو کی ہے، جیسے تورات

کے بیان کے مطابق خدا نے چھ دنوں میں کائنات کی تخلیق کی اور چوں کہ اس تخلیقی عمل نے اسے تھکا دیا تھا؛ اس لئے ساتویں دن اس نے آرام کیا، (پیدائش:۲:۲)

قرآن مجید نے چھ دن میں کائنات کی تخلیق کا ذکر کیا ہے، لیکن اس کے بعد کہا ہے کہ اللہ تھکتے نہیں ہیں، (ق:۳۸) مقصد یہ ہے کہ ساتویں دن اللہ کے آرام کرنے کا ذکر درست نہیں ہے؛ کیوں کہ تھک جانا خالق کی شان نہیں ہے۔

یا جیسے تورات میں حضرت سلیمانؑ کی طرف کفر کی نسبت کی گئی ہے، قرآن نے حضرت سلیمانؑ کے بارے میں کہا ہے: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا (بقرہ:۱۰۲) اس طرح ایک پیغمبر کی زندگی پر جو غبار ڈالا گیا تھا، قرآن نے اسے صاف کردیا ہے۔ حضرت یوسفؑ کی طرف بھی تورات نے گناہ کی نسبت کی ہے، قرآن نے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ گناہ تک پہنچے نہیں تھے: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ ۔ (یوسف:۲۴)

غرض کہ ان واقعات کو براہ راست یا کسی خاص شخص سے معلوم کرنے کا آپ ﷺ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا، آپ ﷺ اُمی تھے، لکھی ہوئی باتیں پڑھ نہیں سکتے تھے، کسی یہودی یا عیسائی عالم سے آپ سلام کا تعلق نہیں تھا، پھر اگر ہوتا بھی تو آپ صرف سنے سنائے واقعات بیان کرسکتے تھے، اس سلسلہ میں گذشتہ تحریف شدہ کتابوں میں جو غلط بیانی کی گئی تھی۔ اس پر کیسے تعبیر فرما سکتے تھے؟

پیشین گوئیاں

قرآن کریم نے مختلف امور کی پیشین گوئی بھی کی، یہ پیشین گوئی بہ ظاہر ناموافق حالات میں کی گئی لیکن وہ غیر معمولی طور پر پوری ہوئی، اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

◇ نزول قرآن کے وقت جزیرۃ العرب کے دو طرف دو بڑی طاقتیں تھیں، مشرق کی طرف ایرانی بادشاہت اور مغرب کی طرف رومی بادشاہت، ایرانی مشرک اور آتش پرست تھے؛ اس لئے ان کی فتح مشرکین مکہ کے لئے باعث مسرت ہوتی تھی، رومی عیسائی تھے اور کسی نہ کسی درجہ توحید کے قائل تھے؛ اس لئے رومیوں کی کامیابی مسلمانوں کے لئے اطمینان کا باعث ہوتی تھی اور وہ اسے عقیدۂ توحید کے غلبہ کے سلسلہ میں فال نیک تصور کرتے تھے، جس وقت رسول اللہ ﷺ نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا، اس وقت ایرانی فوج پے بہ پے رومیوں کو شکست دے رہی تھی، اس نے رومیوں کے اکثر شہر فتح کر لئے تھے، یہاں تک کہ وہ روم کے دارالحکومت قسطنطنیہ تک پہنچ گئے تھے، اس وقت بہ ظاہر اس بات کی کوئی امید نہیں تھی کہ رومی دوبارہ ایران کے مقابلہ کھڑے ہوسکیں گے، ان حالات میں سورۂ روم کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں:

الٓمّٓ ۟ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۟ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۟ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ڛ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۟ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ

مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ۙ﴿۵﴾ وَعۡدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخۡلِفُ اللّٰهُ وَعۡدَهٗ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶﴾ (الروم:۱-۲)

رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے، اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی، اور وہ دن وہ ہوگا کہ جب اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے، اللہ نصرت عطا فرماتا ہے، جسے چاہتا ہے، اور وہ زبردست اور رحیم ہے، یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے، اللہ بھی اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا، اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

اس آیت میں نہ صرف رومیوں کی فتح کی پیشین گوئی کی گئی؛ بلکہ یہ بھی فرمایا گیا کہ یہ فتح صرف ''بضع سنین'' یعنی تین سے نو سال کے اندر رومیوں کو حاصل ہو جائے گی، یہ خبر اس وقت اتنی خلاف توقع تھی کہ ابی بن خلف نے حضرت ابوبکرؓ سے شرط باندھ لی، مگر ظاہری حالات کے خلاف رومیوں نے ہجرت کے دوسرے سال ۶۲۲ء میں ایرانیوں کو شکست فاش دے کر اپنے سارے علاقے واپس لے لئے، یہی وہ وقت تھا، جب غزوہ بدر میں مسلمانوں کو مشرکین مکہ کے مقابلہ اپنی تمام تر بے سروسامانی کے باوجود فتح و کامرانی حاصل ہو رہی تھی، قرآن نے ''وَيَوۡمَئِذٍ يَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۴﴾ بِنَصۡرِ اللّٰهِ ؕ'' (جس دن کہ ایمان والے اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے) کا وعدہ بھی کیا تھا، گویا کہ سورۂ روم کی ان آیات میں بیک وقت دو پیشین گوئیاں تھیں، دونوں ظاہری حالات کے خلاف تھیں اور دونوں ہی پوری ہوئیں۔

◇ اس وقت کا تصور کیجئے! جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت فرمائی اور مسلمان بے سروسامانی کی حالت میں مدینہ پہنچے، جب ہجرت کے دوران آپ مقام جحفہ پر پہنچے، جہاں سے مکہ کی طرف راستہ نکلتا تھا تو فطری طور پر وطن اور مکہ جیسے مقدس وطن کی جدائی پر آپ کو ملال ہوا۔ اس موقع پر قرآن مجید کی آیت نازل ہوئی:

اِنَّ الَّذِىۡ فَرَضَ عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ (قصص:۸۵)

اے نبی یقین جانو کہ جس نے یہ قرآن تم پر فرض کیا ہے، وہ تمہیں تمہاری مانوس جگہ (یعنی مکہ مکرمہ) کو واپس لے جانے والا ہے۔

غور کیجئے کہ کیا اس وقت دوبارہ مسلمانوں کے مکہ پہنچنے کا کوئی تصور بھی کیا جا سکتا تھا؛ لیکن ٹھیک اس آیت کے نازل ہونے کے آٹھ سال بعد مسلمان مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے۔

◇ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ عمرہ کر رہے ہیں، نبی کا خواب چوں کہ وحی کے درجہ میں ہوتا ہے؛ اس لئے آپ نے عمرہ کے لئے سفر کا اعلان فرما دیا لیکن اہل مکہ نے رکاوٹ پیدا کی، صلح حدیبیہ کے بعد آپ واپس ہو گئے اور اگلے سال عمرۃ القضا فرمایا، اس خواب کو دیکھنے کے بعد قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئیں:

لَقَدۡ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوۡلَهُ الرُّءۡيَا بِالۡحَقِّ‌ ۚ لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَـرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَۙ مُحَلِّقِيۡنَ رُءُوۡسَكُمۡ وَمُقَصِّرِيۡنَۙ لَا تَخَافُوۡنَ‌ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمۡ تَعۡلَمُوۡا فَجَعَلَ مِنۡ دُوۡنِ ذٰلِكَ فَتۡحًا قَرِيۡبًا ﴿۲۷﴾ (فتح:۲۷)

فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا، جو ٹھیک حق کے مطابق تھا، ان شاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہوں گے، اپنے سر منڈاؤ گے، بال ترشواؤ گے اور تمہیں کوئی خوف نہیں ہوگا اور وہ اس بات کو جانتا تھا، جسے تم نہیں جانتے تھے اس لئے وہ خوب پورا ہونے سے پہلے اس نے یہ قریبی تم کو عطا فرمادی۔

بہ ظاہر اس وقت اس بات کی توقع نہیں تھی کہ جو مسلمان مکہ سے بے یار و مددگار نکال دیئے گئے ہیں، وہ پھر دوبارہ اس شہر میں داخل ہوں گے، مامون رہیں گے اور عمرہ کا فریضہ انجام دیں گے؛ لیکن اگر چہ پہلے سال مسلمان عمرہ نہیں کر سکے لیکن اگلے ہی سال یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

◇ اسی طرح قرآن نے پیشین گوئی کی کہ من جانب اللہ یہ کتاب ہمیش محفوظ رہے گی:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ ﴿۹﴾ (حجر)

اس نصیحت نامہ کو ہم نے اتارا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

کون خیال کر سکتا تھا کہ جس طرح دوسری مذہبی کتابیں تہہ و بالا کر دی گئیں اور انسانی آمیزشوں اور ملاوٹوں نے ان کی اصل شکل بدل کر رکھ دی، قرآن مجید اس سے محفوظ رہ سکے گا؛ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح کتنی ہی بار مسلمانوں نے شکست کا سامنا کیا، آبادی کی آبادی نذر آتش کر دی گئی، کتب خانے جلا دیئے گئے اور بستی کی بستی قتل عام میں تہہ تیغ کر دی گئی؛ لیکن اس کے باوجود ایک حرف کے فرق کے بغیر قرآن مجید آج تک محفوظ ہے، نہ صرف کتابوں میں محفوظ ہے؛ بلکہ لاکھوں انسانوں کے سینوں نے اسے محفوظ کر رکھا ہے اور صرف قرآن کے الفاظ ہی محفوظ نہیں رہے؛ بلکہ قرآن کا رسم الخط، قرآن کی صحیح تشریحات، عربی زبان اور نزول قرآن کے زمانے کے اسلوب بیان کی بھی من جانب اللہ حفاظت کی گئی۔

اس کے علاوہ بھی قرآن کی متعدد پیشین گوئیاں ہیں، جو بہ ظاہر ناموافق حالات میں دی گئیں؛ لیکن غیر معمولی طور پر اللہ نے ان کو پورا فرمایا۔

سائنسی حقائق:

قرآن مجید کے معجزہ ہونے کا ایک اہم پہلو وہ سائنسی اور کائناتی حقائق ہیں، جن سے قرآن نے پردہ اٹھایا ہے اور جن کا نزول قرآن کے زمانے میں کوئی تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا، قرآن مجید میں اس طرح کی بہت سی آیات ہیں، یہاں چند

کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

◇ سائنس اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ پوری کائنات کا ایک ہی وجود تھا، ایک دھماکہ کے ذریعہ اس کے حصے بکھرے ہوئے اور اس طرح وہ نظامِ شمسی وجود میں آیا، جس کا حصہ یہ عالم ارض ہے، قرآن مجید نے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ط (الانبیاء:۳۰)

کیا جو لوگ کفر اختیار کئے ہوئے ہیں، انہیں علم نہیں کہ آسمان وزمین جڑے ہوئے تھے، پھر ہم نے دونوں کو توڑ کر الگ کر دیا۔

◇ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ط اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ﴿۳۰﴾ (الانبیاء:۳۰)

اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا ہے، سو کیا پھر بھی یہ لوگ ایمان نہیں لاتے؟

آج یہ بات تجربہ ومشاہدہ میں آچکی ہے کہ زمین پر موجود تمام حیوانات اور نباتات کی زندگی پانی پر موقوف ہے، اسی طرح جب پانی کا درجۂ حرارت کم ہوتا ہے تو وہ کثیر مقدار میں آکسیجن کو محفوظ کر لیتا ہے اور جب منجمد ہوتا ہے تو آکسیجن خارج کرتا ہے، جس سے سمندری جانوروں کو اپنی زندگی کے بچانے میں مدد ملتی ہے۔

◇ ایک عرصہ تک سائنس دانوں کی رائے تھی کہ ذرہ (Atom) ناقابل تقسیم ہے، گذشتہ صدی میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ''ایٹم'' بھی تقسیم ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ وہ بھی پروٹون، نائیٹرون اور الیکٹرون پر مشتمل ہوتا ہے، سائنس کی دنیا میں اس سے ایک انقلاب آگیا، یہی تحقیق نیوکلیر بم کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنی، اب قرآن مجید کی اس آیت کو ملاحظہ کیجئے جو بتاتی ہے کہ ذرہ بھی تقسیم ہوسکتا ہے، کیوں کہ ذرہ سے چھوٹی شئے بھی کائنات میں موجود ہے:

وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّکَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْبَرَ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ﴿۶۱﴾ (یونس:۶۱)

اور آپ کے پروردگار سے ذرہ برابر (بھی کوئی چیز) غائب نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں، نہ اس سے چھوٹی نہ بڑی، مگر یہ سب کتاب مبین میں ہے۔

◇ موجودہ دور کے سائنسی اکتشافات میں یہ بھی ہے کہ جب انسان فضاء میں بلندی کی طرف چڑھتا ہے تو آکسیجن کم ہونے لگتی ہے، جہازوں اور راکٹوں کے سفر میں مسافر اس کا تجربہ کرتے ہیں، نزول قرآن مجید کے زمانہ میں نہ فضائی سواریاں تھیں، نہ انسان نے چاند اور مریخ تک رسائی حاصل کی تھی؛ لیکن اسی وقت قرآن مجید میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا:

وَمَنۡ يُّرِدۡ اَنۡ يُّضِلَّهٗ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ ؕ (الانعام:۱۲۵)

اور جس کے لئے وہ ارادہ کرلیتا ہے کہ اسے گمراہ رکھے تو اس کے سینہ کو بالکل تنگ کردیتا ہے، جیسے اس کو آسمان پر چڑھنا پڑ رہا ہو۔

◇ قدیم ترین عہد سے انسان یہ تصور کرتا رہا ہے کہ مذکر و مؤنث کا نظام صرف جانداروں میں ہے؛ لیکن سائنس کی موجود تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ یہ نظام نباتات میں بھی ہے اور جمادات میں بھی، یہاں تک کہ الیکٹرک کی پیدائش میں بھی مثبت اور منفی پہلوؤں کا دخل ہوتا ہے، قرآن مجید نے اس حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا ہے:

وَمِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَيۡنِ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ ۝۴۹ (ذاریات)

اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں، شاید کہ تم اس سے سبق لو۔

اس سے معلوم ہوا کہ تمام مخلوقات میں نر و مادہ کا، یا کم سے کم جوڑے کا وجود پایا جاتا ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِىۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَمِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَمِمَّا لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝۳۶ (یٰسین)

وہ ذات جس نے سب چیز کے جوڑے بنائے، خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس یعنی نوع انسانی میں سے، یا ان اشیاء میں سے جن کو وہ نہیں جانتے۔

یہ دوسری آیت صراحت کرتی ہے کہ نر و مادہ کا نظام نباتات میں بھی ہے، انسانوں میں بھی، اور ایسی چیزوں میں بھی جن کے بارے میں انسان کو کوئی علم نہیں تھا۔

◇ سائنس نے ثابت کیا ہے کہ جنین جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو بہ ظاہر وہ ایک غلاف میں نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ تین باریک جلدوں میں ہوتا ہے، ان جھلیوں کے الگ الگ نام ''Meso Derm, Endo Derm, Ecto Derm'' بھی دیئے گئے ہیں۔ قرآن نے غالباً اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

يَخۡلُقُكُمۡ فِىۡ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِكُمۡ خَلۡقًا مِّنۡۢ بَعۡدِ خَلۡقٍ فِىۡ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ (زمر:۶)

وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔

''ظلمت'' کے اصل معنی تاریکی کے ہیں، یہ یہاں حجاب کے ہم معنی ہے؛ کیوں کہ یہ جھلی روشنی کو اندر پہنچنے سے روکتی ہے۔

◇ پودوں میں ہوا کے ذریعہ نر پودے کے مذکر اعضاء مادہ پودے میں منتقل ہوتے ہیں اور اس طرح وہ بارآور ہوتے ہیں، عربی زبان میں بارآور کرنے کو ''تلقیح'' کہتے ہیں، غالباً قرآن مجید کی اس آیت میں ''لواقح'' کی تعبیر سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ ﴿۲۲﴾ (حجر:۲۲)

◇ جدید میڈیکل سائنس نے ثابت کیا ہے کہ جاندار کا مادہ منویہ بہت سے زندہ جراثیم پر مشتمل ہوتا ہے، جن کو مائیکر واسکوپ کی مدد سے ہی دیکھا جاسکتا ہے، ان جراثیم کا سر بھی ہوتا ہے، گردن بھی ہوتی ہے اور دم بھی ہوتی ہے، یہ اپنی شکل میں جونک کے مشابہ ہوتا ہے، جس کو عربی زبان میں ''علقہ'' کہتے ہیں، قرآن مجید نے اب سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے کس طرح اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ (علق:۱،۲)

پڑھو (اے نبی!) اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے (جو جونک کی شکل کا ہوتا ہے) انسان کی تخلیق کی۔

صرف یہی نہیں؛ بلکہ انسان جن تخلیقی مراحل سے گذرتا ہے اور جن کو موجودہ سائنس نے واضح کیا ہے، قرآن مجید نے ٹھیک اسی طرح انسان کے تخلیقی مراحل کا ذکر فرمایا ہے۔ (المومنون:۱۴)

◇ اللہ تعالی نے انسان کے وجود میں مختلف ایسی چیزیں رکھی ہیں، جن سے اس کی شناخت متعلق ہے، جیسے: شکل وصورت، آواز، رنگ، جسم پر پائی جانے والی بعض علامات، انسان ابتداء آفرینش سے ہی اس سے واقف ہے؛ لیکن انیسویں صدی میں اس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ انسان کی انگلیوں پر جو نشانات ہیں، وہ ہر انسان کا دوسرے انسان سے الگ ہے، قرآن مجید اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ﴿۳﴾ بَلٰى قٰدِرِیْنَ عَلٰۤى اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ﴿۴﴾ (قیامہ:۳،۴)

کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کرسکیں گے؟ کیوں نہیں! ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنادینے پر قادر ہیں۔

خاص طور پر انگلیوں کے پور کا ذکر اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اس سے بھی ایک انسان کی شناخت متعلق ہوتی ہے۔

غرض کہ قرآن مجید آپ اپنے کتاب الٰہی ہونے کی دلیل ہے اور ابدی معجزہ ہے:

◇ زبان وبیان کے اسلوب کے لحاظ سے۔

◇ حکیمانہ قانون کے لحاظ سے۔

◇ گزشتہ قصص وواقعات کے بیان کے اعتبار سے۔

◇ مستقبل کی پیشین گوئیوں کے اعتبار سے۔

◇ سائنسی حقائق سے پردہ اٹھانے کی جہت سے۔

اصولی باتیں

درس قرآن کے مقصد کا تعین کر لیجیے:

درس قرآن کی تیاری کے سلسلے میں پہلا اصول یہ ہے کہ درس قرآن کا مقصد متعین اور واضح ہونا چاہیے۔ درس قرآن کا مقصد

◇ اللہ کے بندوں کو، اللہ کے کلام کے ذریعے، اللہ سے جوڑنا ہے۔ اللہ کا بندہ بناتا ہے۔

◇ قرآن، انبیاء اور بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دعوت لوگوں تک پہنچاتا ہے۔

◇ درس قرآن کا مقصد، کلی تصور دین کو اجاگر کرنا ہے۔ (ادخلوا في السلم کافة) جزوی تصور دین نہ دیا جائے۔

◇ درس قرآن کا مقصد، نفوس کا تزکیہ، معاشرے کا تزکیہ اور مختلف اداروں کا تزکیہ ہے۔

◇ درس قرآن کا مقصد، لوگوں کو نیک کاموں کی طرف راغب کرنا ہے۔

◇ درس قرآن کا مقصد، صالح افراد کو مجتمع کرتا ہے۔

◇ درس قرآن کا مقصد، لوگوں میں جرأت، عزم، حوصلہ، صبر اور ثابت قدمی کے جذبات کو ابھارنا اور انہیں مستحکم کرنا ہے۔

◇ درس قرآن کا مقصد، لوگوں میں اللہ کی صفات اور آخرت کی جزا و سزا کے تصور کو راسخ کرتا ہے۔ (مکی سورتوں میں صفات الٰہی اور تذکرۂ جنت و دوزخ سے عقیدہ توحید کو جوڑا گیا ہے۔ جبکہ مدنی سورتوں میں تمام اجتماعی احکام کے ساتھ صفات الٰہی اور ثواب جنت و عذاب دوزخ کو مربوط کیا گیا ہے۔)

تیاری کے بغیر درس بھی نہ دیجیے:

بھرپور تیاری کیجیے۔ بغیر تیاری کے کوئی درس نہ دیجیے۔ آپ کی محنت اتنی اچھی ہو کہ لوگ تازگی اور فرحت محسوس کریں۔ سامعین یہ خیال کریں کہ یہ بات تو ہم نے پہلی بار سنی ہے۔ یا یہ آیت تو ہم نے بار بار پڑھی، لیکن اس پہلو سے اس پر بھی غور نہیں کیا۔ یا اس درس سے ہم میں عمل کا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ کوئی بات غیر مستند اور بلا حوالہ نہ ہو۔ لیکن درس میں جدت اور انفرادیت ہو۔

ناقص محدود اور نا تمام مطالعے کی روشنی میں اختلافی مسائل پر ذاتی رائے کے اظہار سے پرہیز کیجیے۔

اپنے مخصوص سیاسی، فقہی، کلامی نظریات کو ''زبردستی'' قرآن سے برآمد کرنے کی ہرگز کوشش نہ کیجیے۔

مستند واقعات بیان کیجیے:

جھوٹے واقعات، گھڑی ہوئی حدیثیں (موضوعات)، مذہبی داستانیں، اخباری مضامین اور بلا سند باتوں سے پرہیز کیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیں خبردار کیا ہے!

كفى بالمرء كذبا أن يحدث بكل ما سمع . (مسلم، کتاب المقدمۃ، باب ۳،حدیث ۷)

" آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات، بیان کرڈالے۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کی یہ تنبیہ بھی ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے۔

من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار . (بخاری، کتاب العلم، باب ۳۸،حدیث ۱۱۰)

"جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

آج کل موبائل فون عام ہیں۔ ایس ایم ایس (sms) کے ذریعے روزانہ ہمیں جھوٹی اور من گھڑت باتیں حدیث رسول کے نام پر پہنچائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالی اس شر سے محفوظ رکھے۔

اہم بات کو تین مرتبہ دہرائیے:

اہم بات کو تین مرتبہ دہرانا سنت رسول ہے۔ درس کے آغاز میں خلاصہ مضمون پہلے بیان کیجیے۔ پھر اس کی تشریح کیجیے۔ اور آخر میں خلاصہ مضمون کا اعادہ کیجیے۔ اس طرح بات تین مرتبہ سامعین تک پہنچ جائے گی اور سامعین کے ذہن پر نقش ہو جائے گی۔ حدیث انس میں ہے:

انه كان إذا تكلم بكلمة أعادها ثلاثا، حتى تفهم عنه. (بخاری، کتاب العلم، باب ۳۰،حدیث ۹۵)

نبی کریم ﷺ جب گفتگو فرماتے تو بات کو تین مرتبہ دہراتے یہاں تک کہ ان کی بات (ہم پر) پوری طرح واضح ہوجاتی۔"

اپنے باطن کو ظاہر سے بہتر کیجیے:

ہمارا باطن، ہمارے ظاہر سے بہتر ہونا چاہیے۔ اگر ظاہر اچھا ہے اور باطن خراب تو پھر اس کا شمار "ریا کاری" میں ہوگا۔ اس کے برعکس، اچھے باطن کے ساتھ اچھا ظاہر ریا کاری نہیں، بلکہ شہادت کہلائے گا۔ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے یہ خوبصورت دعا سکھائی ہے۔

اللهم اجعل سريرتي خيراً من علانيتي ، و اجعل علانيتي صالحة. (ترمذی، کتاب الدعوات، باب ۱۴۰، حدیث ۳۵۹۳)

"اے اللہ! میرے باطن کو میرے ظاہر سے بہتر بنادے۔ اور میرے ظاہر کو پاک کردے"۔

درس قرآن محض توسیع دعوت، حصول جنت اور خوشنودی پروردگار کی نیت سے دیا جائے۔ نیت کی درستگی ہر عمل کی قبولیت کے لئے ایک بنیادی ضرورت ہے۔ مدرس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ریا کاری سے بچے اور ریا کاری سے بچنے کے لئے اللہ کی مدد طلب کرے۔ نہ شہرت کی خواہش ہو اور نہ مال و دولت کی۔ ہوس کا شکار ہو اور نہ جاہ و منصب کا طالب۔ اسے نہ ستائش کی تمنا ہو اور نہ صلے کی پروا۔ اسے اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ

یوں چھپ چھپ کے سینے میں، بنالیتی ہے تصویریں

مدرس کی ہمیشہ یہ دعا ہونی چاہیے۔

اللھم طھر قلبي من النفاق وعملي من الرياء ولساني من الكذب۔ (الدعوات الکبیر للبیھقی، ۲۲۷، ۲۵۸)

"اے اللہ! میرے دل کو نفاق سے پاک کردے۔ میرے عمل کو دکھاوے سے پاک کردے۔ میری زبان کو جھوٹ سے پاک کردے"۔

حالات حاضرہ پر تبصرہ کیجیے:

درس قرآن کے مضمون کو، حالات حاضرہ سے جوڑیے۔ لوگوں کو بتائیے کہ قرآن کیا کہتا ہے اور اس وقت دنیا میں کیا ہورہا ہے؟ اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ پرانے دور کے کافروں کی سازشیں کیسی تھیں؟ اور آج کے کافروں کی سازشیں کیسی ہیں؟ پرانے زمانے کے منافق کیسے تھے؟ موجودہ دور کے منافق کیسے ہیں؟ پرانے دور کے مسلمان کیسے تھے؟ اور ہم کیسے ہیں؟ ماضی کے طاغوت کون تھے؟ اور اس دور کے طاغوت کون ہیں؟ لوگوں کو بتائیے کہ قرآن ان مشکل حالات میں ہمارے لیے کیا لائحۂ عمل تجویز کرتا ہے؟ درس قرآن لوگوں کو جگانے والا ہو، خواب غفلت میں مبتلا کرنے والا نہ ہو، عمل کے لیے آمادہ کرنے والا ہو، محض ثواب کی محفل نہ ہو۔

قرآن کے "انذار و تبشیر" پر ہمیشہ نظر رکھیے:

قرآن کتاب انذار بھی ہے اور کتاب تبشیر بھی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا گیا۔ قرآن دنیاوی کامیابیوں اور اخروی اور ابدی فلاح وفوز کی بشارت بار بار دیتا ہے اور دنیاوی اور اخروی عذاب جہنم سے بار بار ڈراتا ہے، تاکہ لوگ صحیح عقیدہ، صحیح طرز عمل، صحیح رویے اور اعمال صالحہ اختیار کرلیں۔ یہ بات مدرس قرآن ہمیشہ پیش نظر رکھے۔ قرآن ترہیب سے بھی کام لیتا ہے اور ترغیب سے بھی۔ انسانی نفوس کو توازن پر قائم رکھنے کے لیے انسانوں کے خالق نے انسانی فطرت کے عین مطابق یہ انداز اختیار کیا ہے۔

سورۃ الانعام کی آخری آیت میں بتایا گیا کہ انسانوں کو زمین پر خلیفہ بنا کر بعض کو بعض پر درجات عطا کیے گئے ہیں۔ اس تفاوت کا مقصد دیے گئے وسائل **فی ما اتاکم** میں یعنی جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے" میں امتحان اور آزمائش ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا:

إن ربك سريع العقاب و انه لغفور رحيم سزا اور مغفرت دونوں کا تذکرہ ہوا۔

مقصد پر نگاہ رکھیے، غیر ضروری تفصیلات سے بچیے:

مدرس قرآن کو چاہیے کہ وہ مقصد پر نگاہ رکھے اور غیر ضروری تفصیلات سے بچے۔ قرآن شروع سے آخر تک، اپنی ہر بات کو زیادہ تر اخروی جزا و سزا کے ساتھ جوڑتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ، تاریخ سے استدلال کرتے ہوئے قوموں کے

عروج وزوال کے اسباب کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ یہ بات ہمیشہ نظر میں رکھیے۔قرآن کی نگاہ، غیر ضروری تفصیلات سے زیادہ، مقاصد اور تزکیے پر ہوتی ہے۔اصحاب کہف کی تعداد اور ان کے غار میں قیام کی مدت وغیرہ کی معلومات سے ہمیں آخر کیا حاصل ہوسکتا ہے؟

جن چیزوں کو قرآن نے مجمل بیان کیا ہے، وہاں زیادہ تفصیل کی ضرورت ہی نہیں ہے، الا یہ کہ احادیث صحیحہ میں اس کی تفصیل آئی ہو۔

قرآن کریم میں تدبر نہ کرنے کی وجوہات وعلاج

وجوہات	علاج
عدم اہمیت:	
فہم قرآن کے اجروثواب کا عدم استحضار	فضائل کا مذاکرہ اور وعیدوں کا تذکرہ
معصیت:	
گناہوں پر اصرار، سینے کے داغ	قلبی ندامت، سچی توبہ، اجتناب کا عزم
غفلت:	
دل کی مردنی یا عدم حضوری	یکسوئی وارتکاز، مراقبہ واحتساب
کثرت تلاوت پر توجہ اور فہم معنی سے بے توجہی:	
معیار کے بجائے مقدار، رسوخ کے بجائے سطحیت	تفکیر وتفہیم اور تدبر وتذکیر کی عادت
عدم تطبیق:	
قرآن کریم کو دیگر اقوام کے لیے سمجھنا اور اپنے آپ کو نصائح قرآن کا مخاطب نہ سمجھنا	قرآن کریم کو ہر ایک کے لیے کتاب ہدایت اور رہنمائی کامل سمجھنا اور اس کا یقین دل میں بٹھانا

درس قرآن کی مقبولیت ونافعیت، کامیابی کے اصول اور ناکامی کے اسباب، کامیاب درس کے پانچ اصول

(۱) خلوص اور درد دل پیدا کیجیے: دعا اور اہل دل کی صحبت اور ان کے حالات کے مطالعہ سے۔

(۲) کثرت تلاوت کے ساتھ کثرت تدبر کی عادت بنائیے: فہم کے بغیر افہام اور تدبر وتذکر کے بغیر تذکیر کیسے ممکن ہے؟

(۳) افادے سے پہلے استفادے کی نیت کیجیے: لہذا صرف ایک سامع ہو تو بھی اپنے آپ کو سنانے کی نیت سے پورے اہتمام کے ساتھ درس دیجیے۔

(۴) بھرپور تیاری کیجیے: آپ کی تیاری قدیم وجدید تفاسیر، زبان و بیان کسی پہلو سے، اور سامعین کی نفسیات و ضروریات کسی حوالے سے، ادھوری نہ ہو۔

(۵) قرآنیات اور تفاسیر کا مطالعہ صرف درس کی تیاری کے وقت نہ کیجئے، بلکہ ان سے مسلسل استفادہ کرتے رہئے۔ ان کے مطالعے کی عادت بنالیجیے۔

درس کامیاب نہ ہونے کے پانچ اسباب

(۱) صلاۃ الحاجت اور دعا کا اہتمام نہ کرنا: اللہ تعالی کومخلوق کی طرف متوجہ کیے بغیر مخلوق کو اس کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش۔

(۲) اپنی اصلاح سے پہلے دوسروں کی اصلاح کی فکر کرنا: عمل بالقرآن پر دعوت قرآن کومقدم رکھنا۔

(۳) ادھوری تیاری کر کے مکمل نتیجے کا انتظار کرنا: جگر سوز محنت کے بغیر نتیجہ خیز انجام کی توقع رکھنا۔

(۴) آسان زبان اور جدید اسلوب کا اہتمام نہ کرنا: فنی اصطلاحات یا مشکل الفاظ وتراکیب استعمال کرنا۔

(۵) سامعین کی ذہنی سطح، فطری نفسیات و دینی ضروریات کا خیال نہ رکھنا: دعوت وتذکیر کے بجائے ردوقدح، اور تعمیر کے بجائے تنقیص کا انداز اپنانا۔

(٦) قرآنی مضامین کو ان اقوام تک محدود کردینا جو گذر چکیں: آج کی دنیا میں آج کے انسان سے قرآن کے خطاب اور وعظ ونصیحت کو اجاگر نہ کرنا اور ربط وشان نزول پر غیر ضروری زور دینا۔ روز بروز بدلتی عالمی صورتحال اور تازہ ترین زمینی حقائق سے بے خبر رہتے ہوئے قرآن کریم کے عصر حاضر پر اطلاقی اور تطبیقی پہلو کو نظر انداز کرنا یا اس میں افراط وتفریط سے کام لینا اور تفسیر مقبول وتاویل مردود کا فرق ملحوظ نہ رکھنا۔

درس قرآن کی تیاری کیسے؟

جامع اور مکمل تیاری کے لیے قدیم وجدید، عربی واردو، تفاسیر ودروس ہر طرح کے مراجع اور ان سے استفادہ کا طریقہ

(۱) قدیم عربی تفاسیر:

محققین نے فرمایا: ''پانچ تفاسیر'' ایسی ہیں جن کا مطالعہ بقیہ تفاسیر سے مستغنی کرسکتا ہے اور ''مشکلات القرآن'' کا حل ان میں سے کسی نہ کسی تفسیر میں مل جاتا ہے۔

(۱) تفسیر ابن کثیر: تفسیر بالروایۃ کا مستند ترین اور نافع ترین ذخیرہ ہے۔

(۲) تفسیر کبیر: تفسیر بالدرایۃ کا شاہکار اور علم کلام وفقہ، تردید باطل کے علاوہ اور بہت سے فوائد ونکات کا بحر ذخار ہے۔

(۳) تفسیر قرطبی: فقہی احکام ومسائل کے علاوہ فہم قرآن کے لوازمات کا بہترین مجموعہ ہے۔

(۴) تفسیر ابوسعود: قرآن کی بلاغت واعجاز، اور نکات القرآن کے بیان میں بے نظیر ہے۔

(۵) روح المعانی: ان تمام تفاسیر کا بہترین خلاصہ ہے جو اس سے پہلے لکھی گئیں۔

جو ان پانچوں کا مطالعہ نہ کر سکے تو ''بیان القرآن'' اس کی قلت استعداد کا مداوا ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ فرمایا: ''میری تفسیر کی قدر وہ پہچانے گا جو پچاس تفاسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے دیکھے'' درج بالا پانچ تفاسیر، پچاس تفاسیر کا خلاصہ ہیں اور ''بیان القرآن'' کسی حد تک ان پانچ کا نچوڑ ونعم البدل ہے۔

(۲) جدید عربی تفاسیر:

تفسیر القاسمی	علامہ جمال الدین قاسمی
التفسیر المنیر	علامہ وہبہ زحیلی
ایسر التفاسیر	امام ابوبکر جابر جزائری

ان تفاسیر میں قرآن کریم کے وعظ ونصیحت، انسان کے لیے عملی پیغام اور تربیتی واصلاحی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔

سامعین کی توجہ کیسے حاصل کی جائے؟

ظاہری، معنوی اور حقیقی آداب اپنایئے

ظاہری آداب:

(۱) مسنون حلیہ، باوقار انداز

(۲) معیاری زبان وبیان، لب ولہجہ کی شائستگی

(۳) تکلم کے آداب ثلاثہ کا لحاظ:

مفاہیم وجذبات کی مناسبت سے آواز کا اتار چڑھاؤ (اسپیچ تھراپی کی مشق)

فطری حرکات وسکنات کی الفاظ ومعانی سے موافقت ومناسبت (باڈی لینگویج)

چہرے کے اثر انگیز تاثرات اور تمام سامعین کی طرف یکساں توجہ (فیس ایکسپریشن)

معنوی آداب:

◇ بھرپور تیاری: روزمرہ مطالعے کی عادت سے۔

◇ سامعین کی ذہنی سطح اور نفسیات کا لحاظ: فراست وقیافے سے۔

◇ سوالات جوابات کا وقفہ: علمیت اور انصاف پسندی سے۔

حقیقی آداب:

◇ **خلوص ودرددل:** اپنی اور سامعین کی ہدایت واصلاح کی فکر۔

◇ **دعااور صلاۃ الحاجت:** دل کی گہرائیوں سے رجوع الی اللہ اور عاجزی وزاری۔

◇ **مخلوق سے استغناء اور بے لوث خیر خواہی:** نوازنے اور لٹانے کا جذبہ پیدا کریں، بٹورنے یا ہتھیانے کا نہیں۔

(درس قرآن کی تیاری کیسے؟)

وجہ تالیف:

چند سال قبل گجراتی میں قرآن کریم کے مضامین کا خلاصہ مختلف تفاسیر کی روشنی میں لکھا تو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم حضرات نے بھی اس کو بہت پسند کیا، اور اس کے دو ایڈیشن ختم ہوئے، تیسرے ایڈیشن کے موقع پر اس کو تراویح کے اسباق کی شکل میں مزید اضافہ کے ساتھ مرتب کیا، گزشتہ چند سالوں سے رمضان المبارک میں روزانہ کی تراویح کے مطابق اس کے تفسیری اسباق واٹس اپ کی شکل میں لوگوں کو پہنچائے گئے، لوگوں کی طرف سے اس کی طلب بڑھتی گئی، اس کے ساتھ رمضان المبارک کے گارڈن مسجد (بھروچ) میں دئے گئے تفسیری دروس بھی آڈیوں کی شکل میں لوگوں تک پہونچانے کا اہتمام کیا گیا، ان سب کا مقصد لوگوں میں قرآن کریم سے تعلق اور مناسبت پیدا کرنا تھا۔

اس دوران بہت سے نوجوان علمائے کرام کی طرف سے یہ تقاضہ ہوا کہ مساجد میں تفسیر کے موقع پر ہم مختصر وقت میں زیادہ تفاسیر نہیں دیکھ سکتے، لہذا اگر گجراتی مضامین کو اردو میں ڈھال دیا جاوے تو ہمارے لئے آسانی ہوگی، اور بہت سے علمائے کرام کی طرف سے یہ بات بھی آئی کہ یہ خلاصہ کتابی شکل میں آجائے تو ہمارے لئے تفسیر کا موضوع بھی متعین ہو جاوے اور کسی ایک سورت کی تفسیر کے بجائے مکمل قرآن کریم کی تفسیر کے مضامین لوگوں کے سامنے بیان کر سکے۔

خلاصۃ القرآن اور مضامین قرآن کریم کے عنوان سے برصغیر میں بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن ان میں بہت کچھ رطب و یابس چیزیں یا مسلکی باتیں داخل ہوگئی ہیں، جس کا ادراک کرنا مشکل ہوتا ہے، تو بندہ نے یہ سوچا کہ معتبر خلاصوں کے مضامین جمع کئے جاوے اور ساتھ میں اکابرین کی تفاسیر سے بھی چیدہ چیدہ تفسیری مضامین ونکات شامل کر لئے جائے اور اس طرح ''مجموعۂ خلاصۃ القرآن'' کی شکل میں ایک معتبر مجموعہ علمائے کرام کے پاس آجائے تاکہ مختصر وقت میں وہ لوگوں کو قرآن کریم سے روشناس کرا سکے۔

چنانچہ مختلف خلاصۂ مضامین قرآنی جمع کئے گئے اور گجراتی خلاصۂ قرآن کریم کو بنیادی طور پر ساتھ میں رکھا گیا، جن خلاصۂ مضامین سے استفادہ کرنا مناسب سمجھا گیا وہ مولانا ذاکر صاحب کے حوالے کیا گیا۔

عزیزم مولانا ذاکر صاحب پارکھیتی دارالعلوم ماٹلی والا کے ہونہار فارغین میں سے ہیں اور تفسیر قرآن کریم سے آپ کو خوب مناسبت بھی ہے، جمعہ کے خطبات کے علاوہ آپ کے رمضان المبارک کے تفسیری دروس بھی مقبول ہیں، اور گجراتی

خلاصۃ القرآن کے تیسرے ایڈیشن کے موقع پر جو ۲۵۰ صفحات کا اضافہ کیا گیا وہ بھی آپ کا ہی مرتب کیا ہوا ہے، مولانا ذاکر صاحب نے ان تمام مجموعے کے علاوہ اکابرین کی تفاسیر سے بھی استفادہ کرکے اس کو بہترین شکل میں تیار کیا، اس کا ایک ایک پارہ کرکے کمپیوٹر سے کتابت کرکے میرے حوالے کرتے رہے، اور میری چاہت وسوچ سے بھی بہت اچھی شکل میں حسن ترتیب ملحوظ رکھ کر مجموعہ مکمل کیا، فجز اہ اللہ خیر الجزاء۔۔

اسی طرح عزیزم مولانا عبدالرشید صاحب منوبری کا بے حد ممنون ومشکور ہوں جو میری تمام عربی، اردو تحریرات کے مسودات کی تبییض اور حوالہ جات کی تلاش وتحقیق میں خندہ پیشانی وقلبی انشراح کے ساتھ بڑا تعاون فرماتے ہیں۔

اس مسودہ کی تبییض میں بھی آپ نے بہت دلچسپی لے کر محنت شاقہ برداشت کی ہے۔

حق تعالی شانہ ان دونوں حضرات کے علمی، عملی وروحانی درجات میں ترقی نصیب فرمائے۔آمین بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

(حضرت مولانا) **مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی** (دامت برکاتہم)
مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ، گجرات، الہند
۷ / شعبان المعظم ۱۴۴۳ھ = مطابق ۱۱ / مارچ ۲۰۲۲ء

پیش لفظ

باسمہ تعالیٰ

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین، وعلی آلہ وصحبہ اجمعین.

امابعد!

قرآن مجید قیامت تک آنے والی انسانیت کے لیے کتاب ہدایت ہے،قرآن مجید میں فکری غذا بھی ہے،احکامات و تشریعات بھی ہیں، احسان اور سلوک بھی ہے، دعوت وجہاد بھی ہے، قصص وواقعات بھی ہیں، امثال وحکم بھی ہیں،عبادات کی تاکید بھی ہے،سرکش قوموں پرعذاب کی تفصیلات بھی ہیں، انبیاء کی دعوتی سرگزشتیں بھی ہیں، احوال قیامت بھی ہیں، فصاحت وبلاغت کا اعلی ترین نمونہ بھی ہے، معجزات کا تذکرہ بھی ہے اورحق و باطل کے درمیان جاری کشمکش کا ذکر بھی ہے، اہل ایمان کی صفات امتیازی کا بیان بھی ہے اورمنافقین کے کردار کی نقاب کشائی بھی ہے، نظام حیات کی تصویر کشی بھی ہے اورراہ دعوت کی مشکلات کا ذکر بھی ہے، جنت کی بشارت بھی ہے اورجہنم کی وعید بھی ہے، اگراللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا ذکر ہےتو اس کے غضب کا تذکرہ بھی۔

غرض یہ کہ قرآن مجید؛ **تبیانا لکل شیئ** ہے، اس کے معانی سمندر کی طرح ناپید کنارہیں،قرآن سراسرایک عملی کتاب ہے، جو ہرقدم پرعمل کے لئے ابھارتی ہےاورانسان کواپنے سانچے میں ڈھالتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کوچلتا پھرتا قرآن بنا دیا تھا۔حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سےآپ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیاتوانہوں نے کہا کہ؛ **کان خلقه القرآن**؛ جواپنے اعتدال،توازن اورمعقولیت ومعنویت کے باعث ہردور کے لیے دائمی اورناقابل تغییر قانون ہے۔

اس عظیم الشان دستورحیات میں زیادہ تر مسائل کواجمالی طور پر بیان کیا گیاہے،جس کی وجہ سے کم علم،کوتاہ فہم اور مصروفیت کی چکی میں پسنے والے افراد کومضامین قرآن کے سمجھنے میں دشواریوں کا سامنا رہتاہے۔وہ قرآن پرلکھی جانے والی مفصل ومدلل کتب سے استفادے کی استطاعت نہیں رکھتے۔تاریخ اسلام اس بات پرشاہدعدل ہے کہ علماء اسلام نے ہردور میں تفہیم قرآن کریم کواپنی زندگیوں کامشن بنایا۔ مادہ پرستی کے اس پرفتن دور میں امت کےتعلق کوقرآن سے جوڑنے کے لیےانہوں نے مال ودولت،عہدہ اورمنصب کونظرانداز کرتے ہوئےتفہیم قرآن کے لیےتفاصیل کے بجائے خلاصۃ القرآن کی کتب لکھ کرانسانی راہنمائی کافریضہ ادا کیا تاکہ امت عقائد اسلامیہ، مکارم اخلاق، معاشرتی اورتمدنی زندگی کے راہنمااصولوں سے آگاہی اورواقفیت حاصل کرسکے۔

خلاصۂ قرآن کے عنوان سے بیان کیے جانے والے مضامین اپنی معنویت کی وجہ سے عوام وخواص کے لیے یکساں طور پر مفید اور ہر فرد کی دلچسپی کا موجب ہوتے ہیں۔ تفہیم قرآن کریم کا مقصد نفس کا تزکیہ، اخلاق و عادات کی تطہیر، دل و دماغ کی پاکیزگی، معاشرتی فساد سے نجات، قلبی سکون کا حصول، روحانی اضطراب سے چھٹکارہ حاصل کر کے امت مسلمہ کے عوام وخواص، مردوزن، شاہ وگدا الغرض ہر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کو چشمہ صافی سے مستفید کرنا ہے۔ دور نبوت سے دوری کے باعث ایک طرف مسلمانوں میں اعتقادی اور عملی کمزوریاں واقع ہو رہی ہیں تو دوسری جانب قیامت تک کے انسانوں کو گمراہ کرنے کی مہلت لے کر آنے والا شیطان اور اس کے حواری بھی مصروف عمل ہیں۔ ان شیطانی جراثیم سے بچنے کی شکل کامل یہ ہے کہ امت قرآن سے دامن جوڑ لے اور یہ اس وقت ممکن ہوگا جب قرآن کریم کی قراءت، مفہوم اور معنی کو سمجھا جائے اور منشأ خداوندی سے آگاہی حاصل کی جائے۔

اسلام کی طویل تاریخ شاہد ہے کہ علمائے کرام نے منشأ خداوندی سے آگاہی کے لیے کبھی تفسیر کی صورت میں کتب مرتب کی تو کبھی علوم القرآن کی صورت میں۔ دور حاضر میں ''خلاصۂ قرآن'' کے نام سے متعدد کتب تصنیف کی جا چکی ہیں جو اسی تقسیم کی ایک کڑی ہے۔ ان خلاصہ جات میں موضوعات قرآنی کو مختصر، آسان، عام فہم زبان میں بیان کیا جاتا ہے۔

خلاصہ قرآن کا مفہوم:

''خلاصۃ القرآن'' مرکب اضافی ہے، جس میں لفظ خلاصہ مضاف اور لفظ القرآن مضاف الیہ ہے، جس کا مطلب ہے قرآن کریم کا لب لباب اور نچوڑ۔

خلاصۃ القرآن کا اصطلاحی مفہوم:

عرف میں خلاصۃ القرآن سے مراد قرآن مجید کی آیات اور سورتوں سے مستنبط ہونے والے احکام اور پیغامات خداوندی کو انتہائی مختصر انداز میں بیان کرنا - کہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ استفادہ ممکن ہو- خلاصہ کہلاتا ہے۔ قرآن مجید کے متعدد پاروں اور سورتوں میں بکھرے ہوئے مضامین کو عامۃ الناس کی آسانی کے لیے جمع کرنے کا نام خلاصہ ہوگا۔

زین الدین المنادي تلخیص کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

التلخيص: استيفاء المقاصد بكلام أو جز.

کسی آدمی کا مختصر گفتگو سے (متکلم کے) مقاصد گفتگو کو پورا کرنا تلخیص کہلاتا ہے۔

خلاصہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ متکلم کے مقاصد گفتگو میں سے کوئی بھی مقصد فوت نہ ہو، جسے وہ کہنا چاہتا ہو، اسے مختصر الفاظ میں پیش کر دیا جائے لیکن اس میں متکلم کا مفہوم پوری طرح ادا ہوتا ہو۔

خلاصہ: استفادہ کا بہترین طریقہ:

اگر ہم قدیم وجدید زمانہ میں لکھی جانی والی مطولات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ان کتب سے استفادہ ہر خاص وعام

کے بس میں نہیں۔ یہ کتب علمی موشگافیوں، فنی پیچیدگیوں، عالمانہ انداز گفتگو، ٹھوس علمی اور بلیغ طرز تحریر کے ساتھ ساتھ قدیم لمبی چوڑی مباحث پر مشتمل ہیں اوران مباحث کو پڑھنے، سمجھنے اور سمجھ کر منطقی نتیجہ نکال کر راہ عمل بنانا ایک عام آدمی کے لیے آسان نہیں۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں علمی استعداد کمزوراور علمی رسوخ کم ہوتا جارہا ہے۔ ایسے وقت میں استفادہ کا بہترین طریقہ خلاصہ جات سے بڑھ کراور کوئی نہیں۔

عبدالعزیز بن مرزوق الطریفی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولكن الاختصار أقرب للاستفادة من الإطالة.

لیکن اختصار/خلاصہ جات مطولات کے مقابلہ میں استفادہ کے زیادہ قریب ہیں۔

ایسے حالات میں خلاصہ جات کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے جب ایک آدمی اپنی مصروف زندگی میں خلاصہ جات پڑھ کر مسائل کے نتائج سے آگاہ ہوجاتا ہےاوراپنی زندگی کے لیے راہ عمل متعین کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے علماء کرام نے لوگوں کے لیے کتب مرتب کیں۔ انہوں نے پڑھے لکھے افراد کے لیے مفصل، عام عوام کے لیے نہایت مختصر جبکہ درمیانے درجے کےلوگوں کے لیے متوسط کتابیں مرتب کیں۔

قرآن فہمی کی اس فکر پر چلنے والے عظیم مفسر ڈاکٹر وھبہ الزحیلی بھی ہیں جنہوں نے لوگوں کے علمی پیمانے کے مطابق تین الگ الگ تفاسیر مرتب کیں۔

مفسر خود لکھتے ہیں:

همم الناس تتفاوت، ومستويات العلم تختلف، فقد يسر الله الكريم لي أن أفسر القرآن الكريم ثلاث مرات متعاقبة، ليأخذ كل إنسان بأي مستوى يتفق مع رغباته وإمكاناته، وكانت ولله الحمد التفاسير الثلاثة، وأصبحت لأول مرة هذه التفاسير في متناول الناس في كل مكان:

(١) التفسير المنير في العقيدة والشريعة والمنهج (١٦ مجلد) لأهل الاختصاص.

(٢) التفسير الوجيز، للعامة وأكثرية الناس.

(٣) التفسير الوسيط، لمتوسطي الثقافة (٣مجلدات)

يقتصر (التفسير الوجيز) على بيان المقصود بكل آية، بعبارة شاملة غير مخلة بالمعنى المراد.

(التفسیر الوسیط للزحیلی)

ابلاغ کا بہترین ذریعہ: خلاصہ جات:

قرآن مجید انسانی ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ بنی نوع انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالی نے حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک انبیاء کرام بھیجے۔ ان تمام انبیاء نے اپنے اپنے ادوار میں ذات خداوندی سے منحرف ہونے والی

انسانیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا۔ انہیں گمراہی اور ضلالت کے راستے سے ہٹا کر ایک خدا کے در پر پہنچایا۔ مختلف معبودوں کے سامنے جھکنے والی پیشانیوں کو ایک خدا کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی تعلیم دی۔ الغرض صحف، سابقہ آسمانی کتب اور قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانی ہدایت کے لیے نازل ہوئے۔ ہر زمانہ کے نبی کا کام اس آسمانی پیغام کو عوام کے سامنے واضح کرنے کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا تا کہ پیغام خداوندی سے عامۃ الناس میں تفکیر اور خوف خدا پیدا ہو سکے اور غافل اقوام کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑا جا سکے۔ انبیاء کا مقصد پیغام خداوندی کو مخلوق خدا تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے فریضۂ تبلیغ کو یوں بیان کرتے ہیں:

وانزلنا إليك الذكر لتبين الناس ما نزل إليهم ولعلهم يتفكرون.

اور ہم نے آپ کی جانب ذکر (قرآن) نازل کیا، تا کہ جو ان کے لیے نازل ہوا، آپ اسے لوگوں کے لیے کھول کر بیان کریں تا کہ وہ غور و فکر کریں۔

قرآن کریم حضرت محمد ﷺ کی طرف اس لیے نازل کیا گیا کہ آپ اسے لوگوں کے سامنے بیان کریں اور اس سے لوگوں کی راہنمائی ہو، عامۃ الناس قرآن کریم میں بیان ہونے والے اصول ہدایت کو سمجھ کر ان پر عمل کریں اور دنیا اور آخرت کی فلاح حاصل کریں؛ کیونکہ مسلمان کی فلاح کتاب وسنت پر عمل کرنے میں ہے اور ہر اس کام سے اجتناب میں ہے جس کام سے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہو۔

اہل علم کو اختصار کی وصیت:

علمائے کرام نے ارباب علم وفضل کو یہ وصیت کی کہ وہ لوگوں کو لمبی گفتگو میں الجھانے کے بجائے مختصر انداز میں بات سمجھائیں تا کہ کم وقت میں متکلم کی مراد کو سامع جان سکے۔

علی ابن الجعد بن عبید الجوہری البغدادی اختصار کی ترغیب دیتے ہوئے حضرت ابن المبارکؒ کا قول نقل کرتے ہیں:

حدثني محمد قال: سمعت ابن عائشة يقول: قال ابن المبارك: علمنا سفيان اختصار الحديث .

ابن المبارک نے فرمایا: حضرت سفیان الثوریؒ نے ہمیں گفتگو میں اختصار سکھایا۔

محمد امین بن محمود البخاری نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا:

وقال الحسن بن علي رضي الله عنهما: خير الكلام ما قل ودل.

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بہترین کلام وہ ہے جو مختصر اور معنی پر دلالت کرنے والا ہو۔

دنیا کا دستور یہ ہے کہ ہر متکلم اپنے بیان میں تلخیص کا خواہش مند رہتا ہے۔ وہ گفتگو میں طوالت اور اسہاب سے دور رہتا ہے بلکہ اصحاب رسول تو نہ صرف گفتگو میں اختصار خود کرتے تھے بلکہ گفتگو میں اختصار پر لوگوں کو ابھارا کرتے اور طوالت سے پناہ بھی مانگا کرتے تھے۔

خلاصہ قرآن کی ضرورت بلحاظ زمانہ:

عصر حاضر میں مذہب کو بے شمار چیلنجز کا سامنا ہے۔ ایک طرف مذہب کے خلاف مستشرقین کی یلغار ہے تو دوسری طرف مذہب پرستوں کے باہمی جھگڑے۔ ایسی حالت میں اہل اسلام ہر دو طبقات سے مرعوب و متاثر ہو کر یا تو مذہبی تعلیمات کی جامعیت، کاملیت اور آفاقیت کا انکار کر رہے ہیں یا مذہب کا مطالعہ اپنے لیے نقصان دہ اور سبب نزاع جانتے ہوئے اسے قابل اعتناء نہیں سمجھتے۔ ایک طرف مذہب کو مسجد اور چند مخصوص عبادات تک محدود کرنے کی سعی کی جارہی ہے تو دوسری طرف وقت کے دامن میں تنگی کا شکوہ کرنے والے وہ مسلمان بھی ہیں جو صدق دل سے مذہب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں مگر ان کی نجی مصروفیات، کاروباری مشاغل، ملازمتیں اور اولاد کے روشن مستقبل کی فکری اور نظری کوششیں مذہب کا مطالعہ کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہر بعد میں آنے والی نسل پہلی نسل کے مقابلے میں اسلام سے نابلد ہوتی جارہی ہے۔ مسلمانوں میں مذہبی بیزاری، دین سے دوری اور ایمان کی کمزوری بڑھتی جارہی ہے۔

عصر حاضر میں خلاصۃ القرآن کی افادیت:

قرآن مجید کی خدمت دنیا کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ قرآن کے ساتھ تعلق سے بڑھ کر دنیا کی کوئی چیز مسلمان کے لیے فائدہ مند نہیں۔ اس کتاب لاریب کے ساتھ تعلق کی مضبوطی سے قوموں کو عروج ملتا ہے اور تعلق کی کمزوری سے قومیں زوال کا شکار ہوتی ہیں۔ عصر حاضر میں ہر شخص مادیت کی گہری وادیوں میں سرگرداں ہے۔ وہ اپنی گوناگومصروفیات کے باعث قرآن کریم کی تعظیم اور بڑی بڑی تفاسیر سے کیسے راہنمائی حاصل کرسکتا ہے؟

پس ایسے وقت میں اس کے پاس ایک راستہ موجود ہے کہ وہ کسی خلاصہ قرآنی سے استفادہ کرے اور اپنی ہدایت کے لیے اتارے گئے پیغام خداوندی کو معلوم کرتے ہوئے اس پر عمل کرے اور اپنے اہل وعیال کو اس پر عمل کی ترغیب دیتے ہوئے انہیں جہنم کا ایندھن بننے سے محفوظ رکھے اور یوں اس کا تعلق قرآن مجید سے باقی رہے۔ علماء اسلام چودہ سو سالوں سے اپنی استطاعت کے مطابق قرآنی خدمت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

''مجموعہ خلاصۂ مضامین قرآنی'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس کی وجہ تالیف یہ بنی کہ حضرت الاستاذ **مولانا مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی** اطال اللہ عمرہ نے مجھے بلا کر یہ بات ارشاد فرمائی کہ بہت سے نوجوان علمائے کرام کی طرف سے یہ تقاضہ ہو رہا ہے کہ مساجد میں تفسیر کے موقع پر ہم مختصر وقت میں زیادہ تفاسیر نہیں دیکھ سکتے ،لہذا اگر گجراتی مضامین کو اردو میں ڈھال دیا جاوے تو ہمارے لئے آسانی ہوگی، اور بہت سے علمائے کرام کی طرف سے یہ بات بھی آئی کہ یہ خلاصہ کتابی شکل میں آجائے تو ہمارے لئے تفسیر کا موضوع بھی متعین ہو جاوے اور کسی ایک سورت کی تفسیر کے بجائے مکمل قرآن کریم کی تفسیر کے مضامین لوگوں کے سامنے بیان کر سکے اور جو تقاضہ حضرت الاستاذ سے کیا گیا وہی تقاضہ مجھ سے بھی کیا گیا کہ آپ حضرت کو اس طرف توجہ دلائیں؛ چونکہ حضرت الاستاذ نے گجراتی میں قرآن کریم کا خلاصہ لکھا ہے اسی کو اردو

قالب میں ڈھالنے کا تقاضہ تھا، لیکن میں یہ بات کہہ نہیں پایا۔

مجھ سے فرمایا: کیوں نہ آپ یہ ذمہ داری قبول فرمالیں، اور یہ آپ کے لیے آسان ہے، وجہ اس کی یہ ہے بندہ بھی الحمدللہ رمضان المبارک میں بعد العصر مختلف جگہوں پر تقریباً ۵ سال سے درس قرآن کے عنوان سے مجلس قائم کرتے آرہا تھا؛ لیکن اس میں پورے قرآن میں سے کوئی سورت طے کر لیتا تھا، اس کی پورے رمضان میں ترجمہ وتشریح کرتا، ایک دن حضرت الاستاذ سے ملاقات کے دوران میں نے پوچھ لیا کہ حضرت کون سے پارے یا سورت کا اس سال رمضان میں درس دوں، تو حضرت الاستاذ نے رہنمائی فرمائی کہ رمضان المبارک میں کوئی سورت متعین کرنے کے بجائے تراویح میں جو قرآن کا حصہ پڑھا جاتا ہے اس کا خلاصہ عوام کے سامنے پیش کر دیا جائے تو بہتر رہے گا اور حضرت نے اپنا ذاتی مشغلہ بھی بتلایا کہ میں بھی رمضان میں وہی طریقہ اپناتا ہوں، یہ واقعہ تقریباً آج سے ۵ سال قبل کا ہے، اس کے بعد سے میرا معمول رہا ہے کہ رمضان میں بعد العصر رات تراویح میں جو پڑھا گیا اس کا خلاصہ کرتے آیا ہوں، تو میں نے خدا کے بھروسہ پر اور استاذ محترم کی توجہ ودعاؤں کے بھروسے پر اس مشکل ترین ذمہ داری کے لیے ہاں بھر لی، اور یہ میری سعادت مندی ہے۔

نیز حضرت الاستاذ نے خطہ عمل سمجھا دیا اور جس علمی سرمایہ کی ضرورت تھی وہ عطا فرمایا، جس میں خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصہ مضامین قرآنی، ہدایت الاجزاء، خواطر قرآنیہ، خلاصہ مضامین قرآن، توضیح القرآن، آسان تفسیر وغیرہ ان جیسی دوسری کتابیں پیش کی کہ اس میں سے مجموعہ کو ترتیب دے دیا جائے، مزید یہ فرمادیا کہ ان مذکورہ کتب کو چھوڑ کر آپ کے مطالعہ میں آئی ہوئی باتیں بھی شامل کر سکتے ہیں۔ یہ کام میرے لیے مشکل تھا کیونکہ اس سے پہلے اس طرز کا کوئی کام کیا نہ تھا، لیکن توکلا علی اللہ کام شروع کیا اور ایک ایک پارہ کر کے حضرت الاستاذ کو دکھلاتا گیا اور حضرت اپنے مفید مشوروں سے نوازتے گئے اور ہمت افزائی کرتے رہے، تو الحمدللہ اب یہ ''مجموعہ خلاصۂ مضامین قرآنی'' کے نام سے مرتب ہو گیا۔

ہاں! اس مجموعہ میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ جس کتاب سے مواد لیا گیا ہے وہ بغیر کسی تغیر وتبدل سے جوں کا توں رکھا گیا ہے، اپنی طرف سے حتی الامکان کوئی ہیرا پھیری نہیں کی گئی تا کہ بات بھی صاحب کتاب کی ہو اور الفاظ بھی۔

اظہار تشکر:

اس موقع پر میں حضرت الاستاذ مولانا مفتی اقبال صاحب ٹنکاروی (مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم ماٹلی والا) کا ممنون ومشکور ہوں کہ آں محترم نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے یہ علمی کام سپرد فرمایا اور شروع سے اخیر تک کتاب پر مکمل نظر فرمائی اور کتاب کے شروع میں ایک وقیع علمی وتحقیقی مقدمہ بھی تحریر فرمایا، اللہ تعالیٰ آپ کے علم وعمل میں برکت عطا فرمائے اور آپ کے سایہ کو تادیر قائم رکھے اور ہمیں آپ سے استفادہ کی توفیق بخشے۔ آمین

اسی طرح رفیق محترم مولانا مفتی عبدالرشید صاحب منوبری دامت برکاتہم (استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم ماٹلی والا) کا بھی ممنون ومشکور ہوں کہ اس پورے مسودہ پر نظر دقیق فرما کر اصلاح فرمائی اور جہاں ضرورت پڑی مفید مشوروں وآراء سے رہنمائی فرمائی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی کاوشوں کو قبول فرمائیں اور دارین میں بہترین بدلہ نصیب فرمائے۔آمین۔

نیز اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اس کتاب کو خاص وعام کے لیے نفع بخش بنائے، اور اس خدمت کو راقم اور اس کے والدین واساتذہ کے لیے صدقۂ جاریہ اور نجات اخروی کا ذریعہ بنائے۔

مولانا ذاکر آدم پارکھیتی
استاذ دارالعلوم ماٹلی والا، بھروچ،
گجرات، الہند
۲۶/شعبان المعظم ۱۴۴۳ھ=مطابق ۳۰/مارچ ۲۰۲۲ء

پارہ:(۱)
سورۃ الفاتحہ

قرآن کریم کی ہر سورت کی ابتداء بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کی گئی ہے اور حدیث شریف میں ہر اچھے اور مفید کام کو بسم اللہ پڑھ کر شروع کرنے کی تلقین کی گئی ہے جس میں نہایت لطیف پیرائے میں تعلیم دی گئی ہے کہ کائنات کی ہر چیز کا وجود اللہ کی رحمتوں کا مظہر ہے، لہٰذا احسان شناسی کا یہ تقاضا ہے کہ منعم ومحسن کے انعامات واحسانات سے فائدہ اٹھاتے وقت اس کے نام سے اپنی زبان کو تر وتازہ رکھا جائے۔

سورہ فاتحہ سات آیات پر مشتمل مکی سورت ہے۔ مفسرین کرام نے اس کے بہت سے نام شمار کرائے ہیں۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر روح المعانی میں سورہ فاتحہ کے بائیس نام شمار کرائے ہیں۔ عربی کا مقولہ ہے **کثرۃ الاسماء تدل علی عظمۃ المسمی** کسی چیز کے زیادہ نام اس کی عظمت پر دلالت کرتے ہیں۔ سورہ فاتحہ کے بہت سارے نام بھی اس مبارک سورت کی عظمتوں کے غماز ہیں۔ اہمیت کے پیش نظر اس سورت کے چند نام ہم ذکر کرتے ہیں۔ اس کا مشہور نام سورۃ الفاتحہ ہے کیونکہ مصحف عثمانی کی ابتداء اس سورت سے ہوئی ہے۔ نیز نماز کی ابتداء بھی اس سورت سے ہوتی ہے۔ اس کا نام ام الکتاب بھی ہے، جس کا مطلب ہے قرآن کریم کی اساس اور بنیاد۔ قرآن کریم میں بیان کئے جانے والے مضامین ومقاصد کا خلاصہ اس چھوٹی سی سورت میں ذکر کر کے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔ توحید ورسالت، آخرت، احکام شریعت اور قرآنی نظام کے وفاداروں کا قابل رشک انجام اور اس کے باغیوں کا عبرتناک انجام؛ یہ وہ پانچ مضامین ہیں جنہیں پورے شرح وبسط کے ساتھ قرآن کریم کی باقی ۱۱۳ سورتوں میں بیان کیا گیا ہے اور یہی مضامین معجزانہ انداز میں انتہائی اختصار کے ساتھ اس سورت میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اس لئے اس سورت کو ام الکتاب اور اساس القرآن کہا گیا ہے۔ مفسرین کرام نے سورت الفاتحہ کو قرآن کریم کا مقدمہ یا پیش لفظ بھی کہا ہے۔ اس کے مضامین کی اہمیت کے پیش نظر اللہ تعالی نے ہر نماز میں اس کی تلاوت کا حکم دیا تاکہ شب وروز میں کم از کم پانچ مرتبہ پورے قرآن کا خلاصہ ہر مسلمان کے ذہن میں تازہ ہوتا رہے۔ (خلاصۂ قرآن از مفتی عتیق الرحمٰن: ۴)

فضائل:

احادیث شریفہ میں سورۂ فاتحہ کے بہت سے فضائل وارد ہوئے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورہ فاتحہ کو قرآن کریم کی عظیم ترین سورۃ فرمایا۔

(۲) سنن ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی قسم سورۂ فاتحہ کی مثل نہ توریت میں اتاری گئی، نہ انجیل میں، نہ زبور میں اور نہ ہی قرآن کریم میں اتاری گئی۔

(۳) درمنثور میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: چار چیزیں اس خزانے سے اتاری گئی ہیں جو عرش کے نیچے ہے (۱) سورہ فاتحہ (۲) آیۃ الکرسی (۳) سورہ بقرہ کی آخری آیات (۴) سورۂ کوثر۔

(۴) درمنثور میں ہی ہے کہ ابلیس کو چار مرتبہ رونا آیا (۱) جب وہ ملعون قرار دیا گیا (۲) جب زمین پر اتارا گیا (۳) جب نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی (۴) جب سورہ فاتحہ نازل ہوئی۔ (خلاصۂ مضامین قرآن کریم، ص:۱۷)

یہ قرآن پاک کی سب سے افضل اور پسندیدہ سورت ہے کیونکہ اس میں قرآن پاک کے تمام مقاصد کا خلاصہ آ گیا ہے۔ ہر کتاب کی ابتداء میں اس کتاب کا اجمالی تعارف دیباچہ کی صورت میں ہوتا ہے، چنانچہ قرآن پاک کا دیباچہ سورۃ الفاتحہ ہے، کیونکہ یہ سورۃ قرآن پاک کے تمام معانی کی جامع ہے۔ اس کی مثال اس طرح بیان کی گئی ہے **کمرأۃ صغیرۃ تریک شیئا عظیما**. جس طرح ایک چھوٹا سا آئینہ بہت بڑی چیز کو دکھا دیتا ہے، اسی طرح یہ مختصر سورۃ قرآن کریم کے تمام بڑے بڑے مضامین کی جھلک دکھاتی ہے۔

اسرار مجموعۂ سورۂ فاتحہ:

اس سورۃ مبارکہ میں پانچ صفات ربوبیت کی اور پانچ صفات عبدیت کی بیان کی گئی ہیں۔ ربوبیت کی پہلی صفت اسم ذات **اللہ** ہے، اس کا ذکر سب سے پہلے ہوا ہے۔ دوسرے نمبر پر صفت **رب** ہے، جس کا معنی پرورش کر کے کسی چیز کو حد کمال تک پہنچانا ہے۔ خود انسان کی پرورش اور ہر چیز کا ارتقاء اسی صفت رب کا مرہون منت ہے۔ تیسری صفت **رحمان** ہے کہ اللہ تعالی کی مہربانی ہر ایک کو ہمیشہ شامل حال رہتی ہے۔ چوتھی صفت **رحیم** یعنی خاص مہربانی ہے، جو آخرت میں اس کے فرمابردار بندوں کو نصیب ہوگی۔ اس کے بعد پانچویں صفت **مالک** بیان ہوئی ہے کہ ہر چیز کا مالک خداوند کریم ہی ہے۔

اس سورۃ مبارکہ میں عبودیت کی پانچ صفات بھی بیان ہوئی ہیں، پہلی صفت **عبادت** ہے۔ ہر انسان کا اولین فریضہ ہے کہ وہ اپنے خالق اور مالک کے سامنے سر نیاز خم کر دے۔ دوسری صفت **استعانت** بیان ہوئی ہے، مخلوق کے لیے ہر دینی یا دنیاوی کام میں استعانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالی کی مدد کے بغیر کوئی کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا، لہذا انسان اللہ تعالی کی استعانت کے محتاج ہیں۔ عبودیت کی تیسری صفت **طلب ہدایت** ہے، یہ بھی ہر انسان کی بنیادی ضرورت ہے وگرنہ وہ کامیابی کی منازل طے نہیں کر سکتا۔ ہر اہل ایمان ہر نماز میں یہی دعا کرتا ہے اهدنا الصراط المستقیم اے اللہ میری سیدھے راستے کی طرف راہنمائی فرما۔ پھر عبودیت کی چوتھی صفت **طلب استقامت** ہے۔ راہ راست میسر آجانے کے باوجود جب تک اس پر استقامت نصیب نہ ہو، انسان منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہر انسان کے لیے ایمان، توحید، صحیح عمل اور اخلاق پر قائم رہنا بھی ضروری ہے، لہذا اس سورۃ مبارک میں استقامت کو طلب کیا گیا جو کہ بہت

بلند چیز ہے۔اس کے بعد عبودیت کی پانچویں صفت **نعمت کا طلب** کرنا اور خدا تعالی کے غضب و ناراضگی سے پناہ چاہنا ہے۔ یہ تمام پانچوں صفات عبودیت بھی سورۂ فاتحہ میں بیان ہوگئی ہیں۔(معالم العرفان، ج:۱،ص:۸۶،۸۷)

بندہ جب مقام مناجات میں کھڑا ہوا اور خدا کی صفات کمال بیان کرتا ہوا **مالك يوم الدين** تک پہنچا تو بے اختیار سیر الی اللہ کا شوق دامنگیر ہوا۔ ارادہ سفر کا مصمم کیا تو سفر کے لیے عبادت کا توشہ لیا۔ اور استعانت اور امداد خداوندی کی سواری پر سوار ہوا۔ زاد اور راحلہ کے مکمل ہو جانے کے بعد راستہ معلوم کیا۔ جب سیدھا راستہ معلوم ہو گیا تو رفقاء طریق کی فکر ہوئی کہ جن کی رفاقت اور معیت سے راستہ سہولت سے قطع ہو اور راہزنوں یعنی اہل غضب اور اہل ضلال کا کوئی خدشہ اور دغدغہ باقی نہ رہے۔(تفسیر عزیزی ۴۸)

ہدایات سورۂ فاتحہ:

حمد کے سزاوار صرف اللہ رب العزت ہیں۔

عبادت میں اخلاص ہو اور استعانت اللہ رب العزت سے ہو۔

بندہ روزانہ نماز میں صراط مستقیم کی ہدایت مانگتا ہے، اس لئے مناسب نہیں ہے کہ مومن مرد اور مومنہ عورت کفار کے ساتھ مشابہت رکھے۔

یہ سورہ آسمانی معجزات کا ایک لعل بے بہا، اور قرآن مجید کی آیات بینات کا ایک بے مثال شہ پارہ ہے، اگر ساری دنیا کے ذہین اور ساری قوموں کے ادیب وانشاء پرداز، ماہرین نفسیات، مضامین اخلاق اور روحانی پیشوا یکجا ہو کر کوئی ایسا مضمون تیار کرنا چاہیں جو تمام انسانی طبقات کے لئے ان کی ضرورتوں اور خواہشات کے اختلاف کے باوجود کافی ہو، اور وہ اس کے ذریعہ اپنی عبادتوں میں اپنے مافی الضمیر کو مکمل طور پر ادا کر سکیں تو وہ سورۂ فاتحہ جیسا مضمون تیار نہیں کر سکتے جو ہر انسانی گروہ اور فرد کی تسکین کیلئے کافی ہے۔اس سورہ کے متعلق ارشاد ربانی ہے:

لقد آتينك سبعاً من المثاني و القرآن العظيم. (حجر:۸۷) اور بالیقین ہم نے آپ کو (وہ) سات آیتیں دیں (جو) مکرر (پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم (دیا)۔

''حمد'' بہترین وسیلہ ہے:

والحمد لله رب العلمين جو شکر و تعریف کا جامع کلمہ ہے، اور ان معجزانہ اور بلیغ کلمات میں سے ہے، جن کا کسی اور زبان میں صحیح ترجمہ بے حد مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

حمد ہی وہ بہترین وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ایک وفا شعار اور محسن شناس بندہ اپنی دعا و مناجات کا آغاز اور اس مقام محمود اور قیام و سجود (نماز) کا افتتاح کر سکتا ہے۔

پھر نمازی یہ محسوس کرتا ہے کہ جس رب کی وہ حمد و ثنا بیان کر رہا ہے اور جس کی عبادت میں مشغول ہے، وہ صرف کسی

قبیلہ اور قوم، کسی خاندان اور برادری، اور کسی ملک و وطن کا رب نہیں، بلکہ ''رب العلمین'' ہے۔(قرآنی افادات:ص ١٦٥)

نمازی اللہ تعالی کی ان بہترین صفات کریمہ میں سے-جن پر وہ پہلے ہی ایمان لا چکا ہے-سب سے پہلے اس کی صفت رحمت کا استحضار کرتا ہے۔(الرحمن الرحیم) اس لئے کہ اس موقع اور محل کے لئے اس سے بہتر صفت کوئی اور نہیں ہوسکتی، یہ وہ موقعہ ہے جب مسلمان خشوع وعبادت، دعاو ابتہال، توبہ وانابت اور احتیاج وفقر کا استحضار کرتے ہوئے خدا کے حضور سر بسجود ہوتا ہے۔ یہ امید اور خوش گمانی کا موقع ہے، نہ کہ ناامیدی و بدگمانی کا۔

یہ سورت دراصل ایک دعا ہے جو خدا تعالی نے قرآن کا مطالعہ شروع کرنے والوں کو سکھائی ہے۔ اس کے ساتھ تعلیم بھی دی ہے کہ اللہ سے دعا کا طریقہ کیا ہونا چاہئے؟

چنانچہ اس کی ابتدائی تین آیتوں میں اس حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے کہ انسان اگر غور کرے تو اس پر یہ بات پوشیدہ نہ رہے گی کہ انسان کے جسم و روح کے قیام و بقا کے سارے لوازم اور سارے تقاضوں کا نظم اگر اللہ نہ کرتا تو پھر انسان ایک سیکنڈ بھی اس زمین پر سانس نہیں لے سکتا تھا۔ یہ اس کا رحم اور اس کی پرورش ہے جس کی وجہ سے انسان اس زمین پر قائم اور باقی ہے۔لہذا انسان کی قدرشناسی اور احسان شناسی دونوں کا تقاضا یہ ہونا چاہئے کہ اس کا دل اللہ کے احسانات اور اس کی نعمتوں کے اعتراف کے جذبے سے سرشار ہو اور وہ ہر گھڑی اس کی حمد وستائش کرتا رہے۔

اس کے بعد اس درخواست کا تذکرہ ہے اور وہ طریقہ بتایا گیا ہے جو بندے کو اپنے خدا کے حضور پیش کرنا چاہئے۔ یعنی اس راہ راست کی ہدایت کی استدعا جس پر چل کر انسان فلاح وسعادت حاصل کر سکے۔یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس سورۃ اور قرآن کا تعلق دعا اور جواب دعا کا ہے۔ بندے نے اپنے رب سے صراط مستقیم (سیدھی راہ) کی ہدایت کے لئے دعا کی اور اس کے بعد اللہ کی جانب سے پورا قرآن رکھ دیا گیا کہ یہ ہے وہ ہدایت و رہنمائی جس کی درخواست تونے کی ہے۔

درحقیقت اللہ تعالی نے اس سورت کو اپنے بندے کی زبان میں نازل فرمایا کہ یوں درخواست کرو اور ساتھ ہی ساتھ ہدایت ربانی کا خلاصہ بھی بتلا دیا۔(خلاصۂ مضامین قرآنی:٣٨)

اور ابتداء کے لیے ان تین ناموں کو یعنی اللہ، رحمن اور رحیم کو اس لیے خاص فرمایا کہ انسان پر تین حالتیں گزرتی ہیں۔

اول: اس کا عدم سے نکل کر وجود میں آنا۔

دوم: اس کا باقی رہنا اور جس قدر خلاق علیم نے اس کے لیے مدت بقا مقرر فرمائی ہے اس کو کرنا، جس کو عرف میں حیات دنیا اور زندگی کہتے ہیں۔

سوم: اس نشأت دنیا کے ختم ہونے کے بعد حیات دنیویہ پر ثمرات کا مرتب ہونا عمل نیک پر جزا اور عمل بد پر سزا پانا۔

پس ابتداء میں تین نام ذکر فرمائے تا کہ تینوں حالتوں کی جانب اشارہ ہو جائے، لفظ اللہ میں پہلی حالت کی جانب

اشارہ ہے، اس لیے کہ تخلیق وتکوین بارگاہ الوہیت سے متعلق ہے اور لفظ رحمن سے دوسری حالت کی طرف اشارہ ہے۔ اس لیے کہ دنیا دار ابتلاء اور دار امتحان ہے جو اس جگہ ٹھیک راستہ پر چلا اس کے لیے آخرت کی تمام منزلیں آسان ہیں، شیطان اور نفس امارہ ہر وقت اس کی تاک میں ہے، اس لیے بندہ ایسی حالت میں بے پایاں اور بے انتہا رحمت کا محتاج ہے۔ اور لفظ رحیم کو تیسری حالت یعنی نشأت آخرت کے یاد دلانے کے لیے ذکر فرمایا۔ دار دنیا چونکہ مومن و کافر سب کے لیے باعث رحمت ہے، مومن کے لیے تو ظاہر ہے، کافر کے حق میں دنیا اس لیے رحمت ہے کہ وہ اپنے کفر سے توبہ کر سکتا ہے اور اگر سوئے اختیار سے توبہ بھی نہ کرلے تو فی الحال اس کا عذاب جہنم سے رہا رہنا ہی بہت بڑی رحمت ہے۔ بعثت انبیاء اور ارسال رسل اور انزال کتب ایک ایسی عظیم رحمت ہے کہ جو مومن اور کافر سب کے لیے ہے، یہ امر آخر ہے کہ کوئی اس رحمت سے متمتع اور منتفع ہوا اور کوئی نہ ہوا۔ الحاصل دار دنیا مومن اور کافر سب کے لیے باعث رحمت ہے اور دار آخرت صرف مومنوں کے لئے باعث رحمت ہے اور کافروں کے واسطے باعث عذاب ونقمت۔ (معارف القرآن ادریسی: جلد: ۱/ ۱۰)

اس کے بعد وہ آخرت اور جزاء وسزا کا دن (**ملك يوم الدين**) یاد کرتا ہے۔ وہ دن جس میں اللہ تعالی کی حکومت مطلقہ اور اقتدار اعلی اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہوگا، اور کسی بادشاہ، امیر اور وزیر کو اس کے حضور میں دم مارنے کا یارانہ ہوگا۔ "**لمن الملك اليوم، لله الواحد القهار**" آج کے روز کس کی حکومت ہے؟ بس اللہ واحد وغالب ہی کی ہے۔ (سورہ مؤمن: ۱۶)

اس وقت وہ اپنے دل میں آخرت کے ایمان کو از سر نو تازہ کرتا ہے، جو ہر خوف، باز پرس کے ڈر اور نفس اور ضمیر کی نگرانی کا سر چشمہ ہے، ایک مسلمان کو جو تر غیبات سے بھری ہوئی دنیا میں رہتا ہے اس ایمان اور یقین کی جو شدید ضرورت ہے، اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر وہ عربی زبان کے (جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا اور جس کو نماز کی عالمی اور سرکاری زبان قرار دیا گیا) بلیغ انداز میں کہتا ہے کہ "وہ نہیں عبادت کرتا کسی کی سوائے اللہ کے، اور نہیں مدد چاہتا کسی سے سوا اس کے" **إياك نعبد و إياك نستعين**".

عبادت واستعانت:

زندگی دراصل عبادت واستعانت کا دوسرا نام ہے، اس سے ایک انسان دوسرے انسان سے، کمزور کا طاقتور سے، غریب کا امیر سے، محکوم کا حاکم سے، اور عابد کا معبود سے رشتہ قائم ہوتا ہے، اگر یہ دونوں صرف اللہ تعالی کے لئے مخصوص کر دی جائیں تو زندگی کے سارے بندھن اور آہنی زنجیریں خود بخود پاش پاش ہو جائیں گی، اور شرک اور دوسرے تمام فتنے ختم ہو جائیں گے، یہ سب سے بڑا معاہدہ اور اعلان ہے جو مسلمان اپنے خدا سے دن رات میں بار بار کرتا ہے، اس کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، نماز سے باہر زندگی کا سارا نظام اس کو دو چیزوں پر ہمہ وقت مجبور کرتا ہے، ایک خضوع پر،

دوسرے سوال واستعانت پر، اوریہی وہ دو چیزیں ہیں جن کے خلاف وہ پہلے ہی بغاوت کر چکا ہے۔

ہدایت کی دعاء:

پھر وہ اللہ تعالی سے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کی دعا کرتا ہے **"اھدنا الصراط المستقیم"** یہ وہ ہدایت ہے جو اس کی سب سے بڑی ضرورت ہے، اورجس کے دم سے جنت کی رونق قائم ہے، وہ ہدایت جس سے محروم ہوجانے کے بعد کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں، اوراس سے بہرہ اندوز ہونے کے بعد کسی چیز کے چھوٹنے کا کوئی غم نہیں، اس کی طلب وجستجو انسان کی فطرت میں داخل اوراس کی آرزو قلب وروح میں پیوست ہے۔

لیکن یہ ہدایت خلا میں قائم نہیں ہوسکتی، یہ اسی وقت قابل فہم اور قابل عمل ہوسکتی ہے، جب اس کے زندہ اور عملی نمونے ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں، یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم تاریخ انسانیت میں انبیاء وصدیقین، شہداء وصالحین کے نام سے یاد کرتے ہیں، **و أولئك الذين أنعم الله عليهم من النبيين و الصديقين و الشهداء و الصالحين.** قرآن مجید اور تمام گذشتہ آسمانی صحیفوں نے دنیا کے عام انسانوں کو ان کی پیروی وتقلید، ان کی محبت و اطاعت، ان کی جماعت میں شمولیت اوران کی طرف اپنا انتساب کرنے کی دعوت دی ہے۔ **أولئك الذين هدى الله فبهداهم اقتده.** یہی لوگ ہیں جن کواللہ نے ہدایت کی تھی، سوآپ بھی ان کے طریقہ پر چلئے۔ (سورہ انعام:۹۰)

اوراسی کے ساتھ ان لوگوں سے برأت اور بے تعلقی کا مطالبہ کیا ہے جو ہدایت کی راہ سے ہٹ کر ناشکری، ہوا پرستی اورتباہی وخودکشی کے راستہ پر پڑ گئے، جنھوں نے سرکشی اورانتہا پسندی کی حد کردی، اورغضب الٰہی کے مورد قرار پائے، یا دین میں تحریف، تفریط اورترمیم وتنسیخ کے مرتکب ہوئے، اور کھلی ہوئی گمراہی کے شکار ہوئے۔ **إهدنا الصراط المستقيم صراط الذين أنعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين.** چلا ہم کوسیدھا راستہ، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے، نہ ان لوگوں کا (راستہ) جو زیرغضب آ چکے ہیں، اور نہ بھٹکے ہوؤں کا۔ (ارکان اربعہ: ۵۷-۶۱)

قرآن مجید کا کھلا اعجاز:

یہاں پر قرآن مجید کا کھلا اعجاز معلوم ہوتا ہے، تاریخ ومذاہب وادیان کا ایک انصاف پسند طالب علم اگر صرف اس ایک جملہ پر ایمان لے آئے کہ صحرا میں پیدا ہونے والے اورصحرا میں زندگی گزارنے والے ایک امی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان سے کتنی بڑی تاریخی حقیقت ادا کی گئی ہے کہ مسیحیت کے پیروؤں کو "ضآلین" کے وصف ولقب سے مخصوص کیا گیا ہے، یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس پر خود تاریخ ادب سے اپنا سرخم اور پورا تاریخی ذخیرہ سرافگندہ ہوکر اس کی تصدیق کرتا ہے اورمورخین حیران ہوکر رہ جاتے ہیں۔

میں آپ کی توجہ اس لسانی تجربہ پر مبذول کرتا ہوں کہ جو الفاظ دوسری زبانوں میں منتقل ہوئے ہیں، بعض اوقات ان کی طاقت اوران کے اپنے مفہوم کے ادا کرنے میں فرق واقع ہوگیا ہے، الفاظ کا بھی تاریخی سفر ہوتا ہے، جیسے انسانی

قافلوں، تہذیبوں اور افکار انسانی کا تاریخی سفر ہے، جب وہ سفر طے کرتے ہیں تو اپنی بہت سی تازگی کھو دیتے اور بہت سے خارجی و مقامی اثرات قبول کر لیتے ہیں، اردو میں بھی عربی کے بہت سے الفاظ ہیں جن کو اپنے صحیح مفہوم و معنی میں سمجھنا مشکل ہو گیا ہے، اور ان میں وہ زور و قوت باقی نہیں رہی جو اصل زبان میں تھی۔

ان میں ایک لفظ ''ضلالت'' بھی ہے۔ ضلالت'' کو ہر طرح کے فساد عقیدہ، ہر درجہ کے فساد عمل، معمولی انحراف، اور چھوٹی بڑی غلط فہمی کے معنی میں لیا جاتا ہے، لیکن لسانیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جیسے اشیاء اور خارجی موجودات کا درجہ حرارت (Temperature) ہوتا ہے، ویسے ہی الفاظ کا بھی ایک ٹمپریچر ہوتا ہے، اور جیسے اجسام کا ایک سائز ہوتا ہے، الفاظ کا بھی ایک سائز ہوتا ہے۔

حیرت انگیز بات ہے کہ جس برگزیدہ ہستی نے مسیحیت کی تاریخ نہیں پڑھی تھی، اس کے لئے کوئی ذرائع معلومات نہیں تھے، اور جس کا ایک مسیحی ملک میں جانا صرف چند دن کے لئے، اور کسی مسیحی سے ملنا چند منٹوں کے لئے ثابت ہے اس کی زبان سے اللہ تعالی نے یہ حقیقت ادا کی ہے، کہ یہودیوں کے لئے ''**المغضوب علیھم**'' کا لفظ استعمال کیا ہے، اور عیسائیوں کے لئے ''**ولا الضالین**'' کا لفظ آیا ہے۔

تنہا یہ لفظ قرآن مجید کے منزل من اللہ اور وحی الہی ہونے کے لئے کافی ہے، مسیحیوں کے لئے دس الفاظ استعمال کئے جاسکتے تھے، عربی جیسی وسیع زبان میں پچاس لفظ ہو سکتے تھے اور سب منطبق ہوتے، لیکن اس میں ایک کھلا ہوا فرق رکھا گیا ہے، یہود کے لئے ''**المغضوب علیھم**'' کا لفظ آیا ہے۔

یہود کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ ''**المغضوب علیھم**'' (غضب الہی کے مورد و مستحق) ہیں، انہوں نے انسانی اخلاقیات و رجحانات، انسانی کردار و عمل اور معاشرۂ انسانی پر جو سلبی اور انتشار انگیز اثرات ڈالے ہیں، اور صدیوں تک تاریخ انسانی میں تخریبی و سازشی کردار ادا کیا ہے، ان کے ساتھ خدا کا جو معاملہ رہا ہے، اور ان میں ہر دور میں جس طرح کی بغاوت اور جس طرح کی سرکشی پیدا ہوئی ہے، انہوں نے جس طرح اپنے آپ کو خدا کی برکتوں اور نصرتوں سے محروم کیا ہے، ان کے لئے ''**المغضوب علیھم**'' سے زیادہ کوئی اور لفظ موزون نہیں۔ (نبی خاتم و دین کامل: ۱۵-۱۸)

اور یہ بھی قرآن کریم کا معجزہ ہے کہ اس نے عیسائیوں کے لئے ''**الضآلین**'' کا لفظ استعمال کیا ہے! ''ضآلین'' کے کیا معنی ہیں؟ آپ کلکتہ جانا چاہتے ہوں اور دہلی جانے والی گاڑی پر بیٹھ جائیں، اس کو کہتے ہیں راستہ بدل دینا اور پھر اسی راستہ پر چلتے رہنا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی جتنا زیادہ چلتا ہے، منزل مقصود سے اتنا ہی دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

عیسائیت تیز چلی اور اب تو ہوائی جہاز پر جا رہی ہے (ہوائی جہاز بھی اس کے پیرووں کی دین ہے) تو یہ عیسائیت صرف زمین کے رقبہ میں نہیں، اپنے مذہبی اور دینی سفر میں بھی ہوائی جہاز کی رفتار سے چلی، یعنی چل کر منزل مقصود سے دور نہیں بلکہ اڑ کر دور ہوئی۔ آج کی موجود مسیحیت بالکل دوسری مسیحیت ہے، جس کو سینٹ پال کا تحفہ اور اس کی دین کہنا

چاہئے۔(خلفائے اربعہ کی ترتیب خلافت میں قدرت وحکمت الٰہی کی کارفرمائی: ۱۷-۱۸۔قرآنی افادات :ص ۱۶۸- ۱۷۳)

قرآن شریف کے بنیادی مضامین تین ہیں: (۱)عقائد (۲)عبادات (۳)زندگی گذارنے کے احکام۔

الحمدللہ سے عقیدۂ توحید اللہ پاک کا تمام جہانوں کا مالک ہونا، رحیم وکریم ہونا اور یوم حساب (قیامت) کا مالک ہونا ثابت ہوتا ہے۔

ایاک نعبد......... عبادت صرف اللہ پاک کے لیے خاص ہو اور مدد بھی اللہ تعالیٰ سے مانگی جائے، اور اھدنا الصراط .... یہودی اور عیسائیوں کے طرز زندگی کے اصولوں کو اپنانے کو ترک کرنے اور انبیاء کی طرز زندگی کے اصولوں کو اپنانے کی ہدایت مانگی گئی، اب اگر ہم پورے قرآن شریف پر نظر ڈالیں تو یہ تین مضامین کا تذکرہ پائیں گے۔

الحمد سے اللہ پاک کی نعمتوں کو یاد کیا جائے، ایاک نعبد سے توحید اور اخلاص کی تعلیم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور ایاک نستعین سے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے مدد مانگنے کا انکار کیا گیا، اھدنا الصراط سے راہ حق میں استقامت نیز نیک لوگوں کی صحبت کی دعا اور غیر المغضوب سے برے لوگوں کی صحبت ودوستی سے پناہ مانگنے کا سکھلایا گیا، الرحمن الرحیم سے اللہ پاک کی صفت رحمت کے خاص ہونے کا ذکر ہے، مالک یوم الدین سے آخرت کی تیاری کی طرف اشارہ ہے، سورۂ فاتحہ ہر شخص نماز میں خود پڑھتا ہے لیکن اس میں جمع کے صیغے سے پڑھے گا، ایک واحد کے صیغے سے نماز درست نہیں ہوگی، اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دعا اور اس عقیدے میں تو اکیلا نہیں، پوری امت تیرے ساتھ اس دعا میں شریک ہے، اور جب سب کی شرکت کے خیال کے ساتھ عبادت کرے گا تو لذت کچھ اور ہوتی ہے۔

ایک حدیث قدسی ہے، اللہ تعالی فرماتے ہیں: میں نے سورہ فاتحہ کو اپنے اور بندوں کے درمیان تقسیم کرلیا ہے۔ آدھی سورہ فاتحہ میرے لئے ہے اور آدھی میرے بندے کے لئے ہے۔ **الحمدللہ رب العالمین** کہتا ہے، تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: **حمدنی عبدی** میرے بندے نے میری حمد بیان کی، جب الرحمن الرحیم کہتا ہے، تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: **اثنی علی عبدی** میرے بندے نے میری ثنا بیان کی، جب **مالک یوم الدین** کہتا ہے، تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری عظمت وبزرگی کا اعتراف کیا۔ جب **ایاک نعبد و ایاک نستعین** کہتا ہے، تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: **ھذا بینی و بین عبدی** یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے۔ جب بندہ **اھدنا الصراط المستقیم** سے آخر تک کہتا ہے، تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: **ھذا لعبدی و لعبدي ماسأل** یہ میرے بندہ کے لئے ہے اور میرے بندے نے جو مانگا ہے میں نے اسے عطاء کردیا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بندہ جب سورۂ فاتحہ کی ایک آیت پڑھتا ہے تو اللہ پاک اس کا الگ الگ جواب دیتا ہے، اس سے مزید بندے کے لیے اللہ پاک کی نزدیکی کا کون سا لمحہ ہوگا کہ بار بار جواب مل رہا ہے اور سوال بھی اللہ پاک کا ہی سکھایا ہوا، اسی لیے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سورۂ فاتحہ کی ایک آیت پڑھ کر ٹھہر جاتے تھے، ان سے رک جانے کی

وجہ پوچھی گئی، تو آپ نے فرمایا کہ میں اپنے رب کے جواب سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں، اس لیے جب کوئی مسلمان سورۂ فاتحہ پڑھتے وقت اس احساس کے ساتھ ٹھہرے گا کہ اس کا پروردگار ہر آیت پر جواب دے رہا ہے تو وہ خوشی سے جھومنے لگے گا اور نماز میں اس کو عجیب قسم کا سکون وطمانینت نصیب ہوگی۔

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے ۱۰۴ کتابیں اتاری، اس کا خلاصہ تین کتابوں (تورات، انجیل اور زبور) میں جمع کیا اور ان تینوں کا خلاصہ قرآن شریف میں جمع کیا، اور پورے قرآن شریف کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں کیا، اور سورۂ فاتحہ کا خلاصہ **ایاک نعبد و ایاک نستعین** میں کردیا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ سے ہی عبادت اور مدد مانگنے کا ذکر ہے، مسلمانوں نے اپنے پہلے دور میں عبادت اور مدد دونوں اللہ پاک سے مانگ کر دین اور دنیا میں ترقی کی تھی، آج کے مسلمان عبادت میں بھی پیچھے ہے اور مدد مانگنے میں بھی۔

صراط الذین۔۔۔ یہ آیتیں پڑھتے وقت انبیاء کرام اور نیک بندوں کا خیال کر کے ان کے جیسے بننے کی کوشش کرے اور **مغضوب علیھم و لا الضالین** پڑھتے وقت فرعون، قارون وغیرہ کا تصور کر کے ان کے جیسے بننے سے پناہ مانگے، نیز ان کے جیسی برائیوں سے پرہیز کرے۔ (خواطر)

نکتہ:

قرآن مجید کا آغاز الحمد للہ رب العالمین سے ہوا اور اختتام قل اعوذ برب الناس پر ہوا، اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ قرآن مجید صرف مسلمان کے لیے خاص نہیں ہے، بلکہ یہ بنی نوع آدم کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے۔ (خواطر قرآنیہ)

***

سورۂ بقرہ

یہ قرآن مجید کی دوسری سورت ہے، جو سب سے طویل سورت بھی ہے اور بہت سے احکام وہدایات کا مجموعہ بھی، اس سورہ میں گائے کے متعلق بنی اسرائیل کا واقعہ آیا ہے، ''بقرۃ'' کے معنی گائے اور بیل کے ہیں، اسی مناسبت سے اس سورہ کا نام ''بقرۃ'' ہے، اس سورہ کی زیادہ تر آیات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہیں، لیکن بعض آیات بالکل آخر دور کی بھی ہیں، جیسے حرمت سود سے متعلق آیات، بہرحال یہ سورت مدنی ہے، یہ سورت ۲۸۶ یا ۲۸۷ آیات پر مشتمل ہے، اور یہ اختلاف اس لئے ہے کہ علماء قراءت کے نزدیک ایک مقام پر وقف اور آیت کے ختم ہونے کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۵) یہ مضامین کی وسعت اور جامعیت کے اعتبار سے قرآن مجید کی عظیم سورتوں میں سے ایک ہے، بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ اس سورت میں ایک ہزار خبریں، ایک ہزار امر اور ایک ہزار نہی ہیں، (تفسیر ابن کثیر) اس میں مسلمانوں، کفر پر جمے ہوئے لوگوں اور منافقین تینوں سے خطاب کرنے کے علاوہ اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے خاص طور پر خطاب کیا گیا ہے، نماز وزکوۃ کی فرضیت، جادو کرنے کی

حرمت، قانون قصاص، احکام وصیت، روزہ کے احکام، چاند کی تاریخ کا معتبر ہونا، جہاد اور حج وعمرہ کے مسائل، شراب اور جوے کی مذمت، یتیموں سے متعلق تنبیہات، نکاح اور میاں بیوی کے تعلق سے متعلق بعض قوانین، طلاق، رضاعت، عدت اور مہر سے متعلق ہدایات، ایلاء اور قسم کے احکام بیان کئے گئے ہیں، اور قرآن کی سب سے طویل آیت (بقرہ: ۲۸۲) - جو دین کی دستاویز سے متعلق ہے- بھی اسی سورت میں ہے، جس کو آیت ''مداینت'' کہتے ہیں، نیز آیت الکرسی اور وہ آخری دو آیتیں جن کی خصوصی فضیلت ہے، اس سورت میں شامل ہیں، احادیث میں اس سورہ کے فضائل بہ کثرت وارد ہیں، حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سورۂ بقرہ کو سیکھو کہ اس کا حاصل کرنا برکت ہے اور اس کو چھوڑ دینا حسرت ومحرومی۔'' (مسند أحمد: ۵/ ۳۵۲) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے گھروں کو قبرستان نہ بنالو، شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے، جس میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے۔'' (ترمذی، فضائل قرآن، حدیث: ۲۸۷۷) اس سے معلوم ہوا کہ خاص طور پر گھروں میں اس سورہ کے پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔ (آسان تفسیر: ج:۱/ ۱۰۸)

ترتیب تلاوت کی حکمت:

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ترتیب نزول کا تقاضا تو یہ تھا کہ پہلے مکی سورتیں آتیں اور اس کے بعد مدنی سورتوں کا بیان ہوتا مگر ایسا نہیں ہے، اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن حکیم تمام نوع انسانی کے لیے نازل ہوا ہے۔ اور مختلف انسانوں کے مزاج مختلف ہوتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے انسانی مزاج کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلے وہ سورتیں رکھی ہیں جو جامع اور مانع ہیں اور ان میں ہر قسم کے احکام پائے جاتے ہیں اور یہ عام طور پر مدنی سورتیں ہیں، مکی سورتوں میں زیادہ تر بنیادی عقائد کا ذکر ہے۔ ان میں ہر قسم کے احکام نہیں پائے جاتے تو گویا پہلے مدنی اور لمبی سورتوں کو لانے میں حکمت یہ ہے کہ لوگ ہر قسم کے احکام سے مانوس ہوجائیں۔ (معالم العرفان: ۲/ ۲۸)

زمانہ نزول سورۂ بقرہ:

یہ سورۃ ۲ھ میں نازل ہوئی، جس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت والی آیت اسی سورۃ میں ہے: ''یا ایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام.'' (اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے) یہ فرضیت غزوہ بدر کے موقع پر ہوئی اور شعبان المعظم ۲ھ میں تحویل قبلہ کا حکم ہوا، تحویل قبلہ کی آیت بھی اس سورۃ میں ہے۔

شان نزول سورہ بقرۃ:

مکی زندگی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف دو طرح کے لوگوں سے واسطہ رہا، پورے موافق یا پورے مخالف، یعنی ظاہراً و باطناً اطاعت کرنے والے یا پھر کھلے بندوں مخالف اور دشمن، لیکن جب آپ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو ایک نئ اور بدترین جماعت یعنی منافقین سے سابقہ پڑا جو اکثر یہودی تھے، اس جماعت کا سرکردہ لیڈر عبداللہ بن ابی ابن سلول تھا جو پہلے سے اپنے اقتدار اور سرداری کے خواب دیکھ رہا تھا، آپ کی تشریف آوری سے جب اس کی

امیدوں پر پانی پھر گیا تو نہایت برہم ہوا، آخر کار مقابلہ کی طاقت نہ پا کر در پردہ جوشِ مخالفت میں اندھا ہو گیا۔ اس سورۃ میں جہاں مؤمنین اور کافرین کا ذکر کیا گیا ہے وہاں اس بد باطن دشمن اسلام فرقہ کی سازشوں کا پردہ بھی خوب چاک کیا گیا ہے، اول رکوع میں دونوں جماعتوں کا بالا جمال تذکرہ ہے اور دوسرے رکوع کی تیرہ آیات میں منافقین کا ذکر ہے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

قرآن پاک کے الفاظ وحروف کے اعداد وشمار جمع کرنے والے لوگوں کے مطابق اس سورۃ کی دوسو چھیاسی یا دوسو ستاسی آیتیں اور چالیس رکوع ہیں۔ اس میں چھ ہزار دوسو اکیس کلمات اور پچیس ہزار پچیس حروف ہیں۔

سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ میں ربط:

سورۃ فاتحہ کے پہلے حصے میں اللہ تعالی کی حمد وثنا ہے۔ دوسرے حصے میں بندے کی طرف سے اس بات کا اقرار ہے، کہ وہ صرف اسی کا عبادت گذار ہے، اور اسی کی اعانت کا طالب ہے۔ تیسرے حصے میں اللہ تعالی سے دعا ہے کہ **اھدنا الصراط المستقیم** اے پروردگار! ہمیں سیدھے راستے کی طرف راہنمائی فرما۔ چنانچہ اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ جس ہدایت اور راہنمائی کی تمہیں ضرورت ہے **ذلک الکتب لا ریب فیہ** یہ کتاب ہے جو مرکز ومنبع ہدایت ہے۔ اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو۔ سورۂ فاتحہ اور سورہ بقرہ میں یہ ربط ہے۔ (معالم العرفان: ج:۲/۱/۳)

بنی اسرائیل کے ایک مالدار شخص کو اس کے بھتیجے نے مال وراثت ہتھیانے کی غرض سے قتل کر دیا، پھر رات کی تاریکی میں نعش اٹھا کر کسی دوسرے کے دروازے پر ڈال دی اور اس پر قتل کا دعوی کر دیا۔ قریب تھا کہ مدعی اور مدعی علیہ کے خاندان ایک دوسرے پر ہتھیار اٹھا لیتے کہ اللہ تعالی نے حضرت موسی علیہ السلام کے ذریعے انہیں گائے ذبح کرنے اور اس کے گوشت کا کچھ حصہ اس مقتول کے جسم کے ساتھ لگانے کا حکم دیا۔ ایسا کرنے سے مقتول زندہ ہو کر اٹھ بیٹھا اور اس نے اپنے قاتل کی نشاندہی کر دی۔

اتفاق سے انہی دنوں بنی اسرائیل کا ایک گروہ مرنے کے بعد کی زندگی کا انکار بھی کر رہا تھا، مقتول کے زندہ ہونے سے نہ صرف یہ کہ قاتل کی نشاندہی ہوگئی بلکہ بعث بعد الموت پر ایک حجت بھی قائم ہوگئی۔ علاوہ ازیں مصریوں کے ساتھ طویل عرصہ تک رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل کے دل میں گائے کی جو عقیدت ومحبت رچ بس گئی تھی، گائے ذبح کرنے کا حکم دے کر اس کی تردید اور توہین بھی کر دی گئی۔

اس واقعہ کے علاوہ پہلے پارہ میں جو اہم مضامین بیان ہوئے ہیں وہ درج ذیل ہیں......

اس سورت کی ابتداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائمی معجزہ ''قرآن کریم'' کے ذکر سے ہوئی ہے، یوں تو آپ کو متعدد حسی اور مادی معجزات بھی عطاء کیے گئے، لیکن آپ کا سب سے بڑا معجزہ علمی تھا۔

اس سورۃ کی ابتداء حروف مقطعات میں سے 'الم' کے ساتھ ہوئی ہے، ابتداء کا یہ انداز عربوں کے لیے غیر مانوس تھا،

اس انداز نے ان کی توجہات اپنی طرف مبذول کرلیں اور وہ توجہ سے بات سننے پر مجبور ہو گئے۔

قرآن کریم کی جن سورتوں کا آغاز حروف مقطعات سے ہوا ہے، وہاں قرآن کریم کی عظمت وصداقت اور اعجاز و حقانیت کا تذکرہ بھی ہوا ہے۔جس کی وجہ سے علماء کی ایک بڑی جماعت کی رائے یہ ہے کہ یہ حروف لا کر حقیقت میں قرآن کو انسانی کاوش قرار دینے والوں کو چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر واقعی قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ساختہ کلام ہے، تو تم بھی ان حروف سے۔جنہیں تم شب وروز استعمال کرتے ہو-ایسا ہی کلام بنالو، تمہیں اپنی فصاحت و بلاغت اور زبان دانی پر بڑا ناز ہے، جس کی وجہ سے تم اپنے مقابلے میں سارے انسانوں کو عجم (گونگے) کہتے ہو لیکن تاریخ گواہ ہے کہ نہ کل کے کافروں نے اس چیلنج کو قبول کیا، نہ آج کوئی قبول کرنے والا ہے اور نہ ہی قیامت تک کوئی اسے قبول کر سکے گا۔

ایمان، کفر اور نفاق:

انسانوں کی تین قسمیں ہیں:

مومن، کافر اور منافق۔

مومنوں کی نمایاں صفات پانچ ہیں:

ایمان بالغیب: یعنی ان حقائق پر ایمان جن کا حواس سے ادراک نہیں کیا جا سکتا جیسے جنت، دوزخ، حشر اور حساب و جزاء وغیرہ۔

اقامت صلوۃ یعنی نماز کو شروط وآداب کا لحاظ رکھتے ہوئے مستقل اداء کرتے رہنا۔

ادائے زکوۃ: قرآن کریم میں عام طور پر نماز اور زکوۃ کا اکٹھے ہی ذکر آیا ہے۔نماز اللہ کا حق ہے اور زکوۃ بندوں کا حق ہے اور انسان کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوسکتا جب تک وہ دونوں قسم کے حقوق اداء نہ کرے۔

آسمانی کتابوں پر ایمان: ان تمام آسمانی کتابوں پر ایمان جو مختلف زمانوں میں انبیاء ورسل پر نازل کی گئیں۔

آخرت کی تصدیق: آخرت کی ایسی تصدیق جس میں شک کی کوئی ملاوٹ نہ ہو۔

اہل ایمان کا تذکرہ: یہاں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اہل ایمان کا تذکرہ چار آیات میں فرمایا ہے، کفار کا دو آیات میں اور منافقوں کا تیرہ آیات میں فرمایا ہے، ان تیرہ آیات میں منافقوں کے بارہ اوصاف بیان کیے گئے ہیں، مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ان اوصاف بد سے اپنا دامن بچا کر رکھیں، یہ اوصاف اور علامات درج ذیل ہیں: جھوٹ، دھوکا، عدم شعور، قلبی بیماریاں (حسد، تکبر اور حرص وغیرہ) مکر وفریب، سفاہت، احکام الہی کا استہزاء، زمین میں فتنہ وفساد، جہالت، ضلالت، تذبذب اور اہل ایمان کا تمسخر۔

منافق کی تعریف:

منافق کہتے ہیں جو ایمان کو ظاہر کرتا ہے اور کفر کو چھپاتا ہے۔اس کی تین قسمیں ہیں:

(۱) جو ایمان کو ظاہر کرتا ہے مگر باطن میں کفر بھرا ہوا ہے اور وہ اس پر مطمئن ہے۔

(۲) جو باطنی اور ظاہری ہر لحاظ سے متذبذب ہوتا ہے اور ظاہراً و باطناً شک میں ہوتا ہے۔

ان دونوں قسموں کے منافقین کا نفاق شدید ہوتا ہے اور ان کا اعتقاد فاسد ہوتا ہے، ان آیات میں ان ہی دونوں قسموں کا تذکرہ ہے۔

(۳) جو اخلاقی اور عملی منافق ہوتا ہے۔ ایسا شخص اپنے گناہوں کی وجہ سے آخرت کے نقصان کو دنیا کے نقصان پر ترجیح دیتا ہے اور دنیا کے نفع کو آخرت کے نفع پر ترجیح دیتا ہے، یہ ایسے منافق ہوتے ہیں کہ اگرچہ ان میں ایمان ہوتا ہے مگر یہ لوگ آخرت کو دنیا پر ترجیح نہیں دیتے، اس کی مثال آج کے اکثر مسلمان ہیں کہ ایمان تو ہے؛ مگر دنیا میں ایسے مگن ہیں کہ آخرت کی فکر ہی نہیں۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم:۲۱)

قرآن کریم نے دو مثالوں کے ذریعہ منافقت کی دو قسموں کو واضح کیا ہے۔

(۱) کسی شخص نے ٹھٹھرتی، اندھیری رات میں سردی سے بچنے اور روشنی حاصل کرنے کے لئے آگ جلائی اور جیسے ہی چاروں طرف روشنی پھیلی تو وہ آگ ایک دم بجھ گئی اور وہ گھپ اندھیرے میں کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہ رہا۔

(۲) رات کے وقت اندھیرے کے اندر کھلے میدان میں موسلا دھار بارش میں کچھ لوگ پھنس کر رہ گئے، بجلی کی کڑک ان کے کانوں کو بہرہ کئے دے رہی ہو اور چمک سے ان کی آنکھیں خیرہ ہو رہی ہوں اور اس ناگہانی آفت سے وہ موت کے ڈر سے کانوں میں انگلیاں ٹھوسے ہوئے ہوں۔ بجلی کی چمک سے انہیں راستہ دکھائی دینے لگے مگر جیسے ہی وہ چلنے کا ارادہ کریں تو اندھیرا چھا جائے اور انہیں کچھ بھی دکھائی نہ دے۔ یہ لوگ اندھے اور بہرے ہیں کیونکہ آیات خداوندی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ (خلاصۂ قرآن از: مفتی عتیق الرحمٰن:۸)

آدم و ابلیس کا قصہ:

حضرت آدم اور حضرت حوا علیہا السلام کا قصہ جو ابلیس لعین کے ساتھ پیش آیا، حقیقت میں یہ ساری انسانیت اور اس دنیا کی ابتداء سے انتہاء تک کا قصہ ہے۔ یہ قصہ حق اور باطل، خیر اور شر کے درمیان دائمی تلاش کی نشاندہی کرتا ہے۔

آدمؑ کی خلافت: یہ قصہ حضرت آدم علیہ السلام کی عظمت شان بتاتا ہے، انہیں ارضی خلافت عطا کی گئی، ایسے علم سے نوازا گیا جو فرشتوں کے پاس نہیں تھا۔ ملائکہ کو ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا گیا۔ منصب خلافت پر فائز ہونے کی وجہ سے بنو آدم اس امر کے پابند ہیں کہ وہ زمین پر اللہ کے حکموں کو نافذ کریں اور دنیا کا نظام ویسے چلائیں جیسے اللہ چاہتا ہے۔

تذکرۂ یہود:

یوں تو قرآن کریم میں متعدد مقامات پر بنی اسرائیل کا تذکرہ ہے۔ لیکن ان کے بارے میں سب سے زیادہ تفصیلی بحث سورۂ بقرہ کرتی ہے، پہلا پارہ تقریباً پورا ہی ان کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔

اس تذکرہ میں سب سے پہلے تو یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کو بے شمار ظاہری اور باطنی ، دنیوی اور دنیاوی نعمتیں عطا فرمائیں ۔ مثلاً ان کے اندر کثرت سے انبیاء پیدا فرمائے ۔ انہیں دنیاوی خوشحالی عطا کی، عقیدۂ توحید اور ایمان کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ فرعون کے مظالم سے نجات دی، انہوں نے حضرت موسی علیہ السلام کی قیادت میں مصر سے ہجرت کی اور فرعون نے ان کا تعاقب کیا تو سمندر میں ان کے لیے راستے بنا دیئے اور ان پر ظلم ستم ڈھانے والے کو ان کی نظروں کے سامنے مع لاؤ لشکر غرق آب کر دیا، صحرائے سینا میں وہ بے سروسامانی کے عالم میں تھے، ان کے کھانے کے لیے من وسلوی آسمان سے اتارا اور سایہ کے لیے ٹھنڈے بادلوں کا انتظام فرما دیا۔ پینے کے لیے پانی کی تلاش ہوئی تو پتھر سے بارہ چشمے جاری فرما دیئے۔

کفران نعمت :

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ انہوں نے ان نعمتوں کا شکرا دانہ کیا اور بتدریج کفران نعمت کی بیماری میں مبتلا ہو گئے ۔ چنانچہ انہوں نے حق کو چھپایا، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کیا، بچھڑے کو معبود بنالیا، دشت سینا میں بے صبری اور حرص وطمع کا مظاہرہ کیا، اریحاء شہر میں متکبرانہ انداز میں داخل ہوئے ، جبکہ انہیں عاجزی کے ساتھ داخل ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ انہوں نے انبیاء کو ناحق قتل کیا، بار بار بدعہدی کے مرتکب ہوئے ۔ ان کے دل سخت ہو گئے تھے، انہوں نے کلام اللہ میں لفظی اور معنوی تحریف کی، شریعت کے بعض احکام پر وہ ایمان لائے اور بعض کا انکار کرتے رہے، وہ بغض اور حسد کی بیماری میں مبتلا ہو گئے، انہیں مادی زندگی سے مبالغے کی حد تک محبت تھی، مقرب فرشتوں سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے، سحر وکہانت میں بے حد دلچسپی رکھتے تھے ۔ ان کے ہاں ایسے عملیات کو قبول عام حاصل تھا جن کے ذریعے میاں بیوی کے درمیان جدائی پیدا کر کے عشق پُر از فسق کی راہ ہموار کی جائے ، بدعملی کے باوجود جنت کے واحد ٹھیکیدار ہونے کا دعوی کرتے تھے ۔ وہ بڑے وثوق سے کہتے تھے کہ جنت میں صرف وہی جا سکتا ہے جو یہودی ہو اور یہی دعوی نصاریٰ بھی کرتے تھے، اس کے ساتھ دونوں یہ دعوی بھی کرتے تھے کہ صرف ہم ہی حق پر ہیں اور ہمارے مخالف فرقہ کے پاس کوئی دلیل نہیں ۔

عبرت: سوچنے اور عبرت ونصیحت کی بات یہ ہے کہ کہیں ان خرابیوں میں سے کوئی خرابی ہم مسلمانوں میں تو نہیں پائی جاتی ۔

یہود پر انعامات اور ان کے کفران نعمت اور جرائم کی تفصیل کے بعد تذکرہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا، جن کی عظمت شان کو یہود اور نصاری دونوں تسلیم کرتے تھے اور فخر یہ طور پر ان کی طرف اپنی نسبت کرتے تھے، حالانکہ اگر وہ اپنے دعویٰ میں سچے ہوتے تو ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ضرور کرتے ۔ کیونکہ آپ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی دعاؤں ہی کا ثمرہ تھے۔

آزمائشوں پر ثابت قدمی:

یہاں یہ بھی بتلایا کہ اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو مختلف ابتلاؤں اور آزمائشوں میں ڈالا لیکن وہ ہر آزمائش سے سرخ رو ہو کر نکلے، مثلاً: والد کی بت پرستی سے بیزاری کا معاملہ ہو، یا قوم سے ٹکراؤ کا، نمرود سے بحث ومباحثہ کا مرحلہ ہو، یا آگ میں ڈالے جانے اور وطن سے ہجرت کا، بیوی اور بچے کو بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑنے کا حکم ہو یا لختِ جگر کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کرنے کا، اللہ کے خلیل ہر مقام پر ثابت قدم رہے اور ان کے قدموں میں ذرہ برابر لغزش نہ آئی۔ اسی ثابت قدمی کی برکت تھی کہ ان کی دعائیں قبول ہوئیں۔ مکہ پر امن شہر بنا، وہاں کے رہنے والوں کو پھلوں کا رزق میسر آیا اور سب سے بڑی دعا جو قبول ہوئی وہ یہ کہ اللہ نے قریش کی نسل سے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا فرمایا۔

ملت ابراہیمی سے اعراض:

حضرت خلیل کے مآثر اور مفاخر بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ملت ابراہیمی سے وہی شخص اعراض کر سکتا ہے جو شقی، احمق اور خواہشات کا غلام ہو، یہود ونصاریٰ واقعی ایسے تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اپنی نسبت تو کرتے تھے۔ مگر ان کا زعم باطل یہ تھا کہ نجات حنفیت کی اتباع میں نہیں ہے بلکہ یہودیت اور نصرانیت کی اتباع میں ہے، اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ آپ انہیں حنفیت یعنی دین اسلام کی طرف دعوت دیں جو کہ تمام انبیاء کا دین ہے، اگر وہ آپ کی دعوت قبول کر لیں تو ہدایت پا جائیں گے اور اگر قبول نہ کریں تو ان کا انکار اور گمراہی کسی دلیل کی بنا پر نہیں ہوگی بلکہ ضد اور عناد کی بنا پر ہوگی۔ تو آپ انہیں عناد کی گندگی میں پڑا رہنے دیں، اللہ ان سے نمٹ لے گا، ارشاد ہوتا ہے:

''اگر یہ یہود ونصاریٰ بھی اس طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو یہ ہدایت پا جائیں گے اور اگر وہ منہ موڑے رہیں تو اس پر تعجب نہ کرو، کیونکہ ضد اور مخالفت ان کی عادت ہے، اگر انہوں نے شرارت کرنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ ان سے عنقریب نمٹ لے گا۔ وہ بڑا سننے والا اور بڑا جاننے والا ہے۔'' (بقرہ: ۱۳۷) (خلاصۃ القرآن، اش)

ہدایات سورۂ بقرہ:

گائے کے واقعہ سے مومنین کو خدا کے احکامات اور ممانعتوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی تعلیم دی، چاہے وہ بے شمار کیوں نہ ہوں، اور ان یہودیوں کی تقلید کے خلاف تنبیہ جو گائے ذبح کرنے کے امتحان میں ناکام ہوئے، جب یہ سورت اپنے بہت سے فرائض کے ساتھ نازل ہوئی، اور اللہ تعالیٰ نے سورت کے اخیر میں یہ کہہ کر امر کو بجالانے والوں کی تعریف کی۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

منافقین کے بارے میں لمبی بحث کی؛ تا کہ ان کے مومنوں اور کافروں کے درمیان مخفی رجحانات اور خلفشار کی وجہ سے قوم لاحق خطرے سے آگاہ ہو جائے۔

قرآنی ترتیب میں سب سے پہلا قصہ آدمؑ کا آیا جس سے مسلمان اپنے بڑے دشمن کو جان لے۔

گائے کے واقعہ سے ایک پیغام ہے کہ خدا کے احکام کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ یہ دل کی سختی کا سبب ہے۔

اولاد کی تربیت اور نیکی کا حکم کسی حد پر نہیں رکتا، بلکہ موت کے لمحات تک جاری رہتا ہے۔ اَمۡ كُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ يَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ ۙ اِذۡ قَالَ لِبَنِيۡهِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِىۡ ؕ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۳﴾

تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ۚ وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۱﴾ ان لوگوں کے لیے واضح جواب ہے جو نیک نسب پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں، کسی شخص کے لیے اس کا کوئی فائدہ نہیں خواہ وہ خلیل سے متعلق ہی کیوں نہ ہو، بلکہ اس سے اہم آپ کا عمل ہے۔ (ہدایۃ الاجزاء: ۵-۷)

نسبت ابراہیمی سے خالی خولی نسب کچھ کام نہ آئے گی اور تمہارے عقیدے اور اعمال کے مطابق ہی تمہیں بدلہ دیا جائے گا، امام غزالیؒ نے بڑی عمدہ مثال دی ہے، کہتے ہیں کہ اگر بیٹا بھوکا یا پیاسا ہو اور باپ کھا پی لے تو بیٹے کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اس کی بھوک اور پیاس رفع نہیں ہوگی، جب تک وہ خود نہیں کھائے گا اسی طرح یہود و نصاریٰ کے آباء و اجداد کا دین اسلام پر قائم ہونا انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا، جب تک یہ خود ہٹ دھرمی چھوڑ کر ملت ابراہیمی کو نہ اپنالیں۔ فرمایا: تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے آباء و اجداد کا دین کیا تھا، وہ کیا کرتے تھے، بلکہ تمہیں خود ان کی صحیح معنوں میں پیروی کرنا ہوگی، تمہارے اعمال کی باز برس تمہیں سے ہوگی۔ (معالم العرفان: ۲/۴۸۶)

خلاصہ سورۃ البقرۃ:

رکوع: ۱ تا ۱۸، اصلاح الیہود فی ضمن علم المخاصمہ۔ رکوع: ۱۹ تہذیب اخلاق۔ رکوع: ۲۰ تا ۲۳ تدبیر منزل۔ رکوع: ۲۴ تا ۳۰ سیاست مدنیہ کے دو شعبے ملک گیری، ملک داری۔ رکوع: ۳۳ تا ۴۰ خلافت کبری۔

توضیح الخلاصہ:

قرآن کریم میں چار قسم کے علوم بیان کئے گئے ہیں: (۱) علم الاصول (۲) علم العبادات (۳) علم السلوک (۴) علم القصص۔

اس سورت میں علم الاصول یعنی توحید و رسالت اور معاد۔ تذکیرات ثلاثہ یعنی تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بایام اللہ اور تذکیر بما بعد الموت، قرآن کریم سے فائدہ حاصل کرنے والے اور نہ حاصل کرنے والوں کے نتائج۔ منکرین قرآن کے شبہات اور اس کے جوابات۔ حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ۔ بنی اسرائیل پر خصوصی انعامات اور ان کے آباء و اجداد کی خباثتیں اور اس کے نتائج۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ اور ملت ابراہیمی کی تشریح۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اور آپ کے تعلیمی اسباق کا ذکر یعنی تہذیب اخلاق، تدبیر منزل، سیاست مدنیہ اور اس کے دو شعبے ہیں۔ ملک گیری کے قوانین اور ملک داری کے قوانین۔ اصلاحی معاشرہ، خلافت کبری کا بیان، خلیفہ کے اوصاف، جہاد کی ترغیب اور اس

کے نتائج۔سخاوت کی فضیلت اورانفاق فی سبیل اللہ۔بخل کی مذمت اور بخیلوں کے نتائج۔سود کی حرمت اورسودخوروں کے نتائج۔ تجارت اوراس کے مشروع طریقے۔الغرض اس سورت کوتعلق باللہ اوراہل ایمان کی کامیابی کے اعلان پرختم کیا گیا ہے۔

خلاصہ رکوع:۱:...... یہود کودعوت الی الکتاب (القرآن) واوصاف متقین۔ماخذ: آیت:۲، ۳، ۴۔

خلاصہ رکوع:۲:...... امراض المنافقین واقسامہم یعنی نا قابل اصلاح اور قابل اصلاح ۔ ماخذ: آیت:۹، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۷، ۱۹۔پہلی قسم کے منافقین کا ذکر ہے جونا قابل اصلاح ہو چکے ہیں۔آیت:۲۰ میں قابل اصلاح منافقین کا ذکر۔

خلاصہ رکوع:۳:...... تذکیر بآلاء اللہ سے منافقین نمبر:(۲) یعنی جن کی حالت قابل اصلاح ہے اس کے قانون کا ذکر ہے۔ماخذ: آیت:۲۱، ۲۲۔

خلاصہ رکوع:۴:......ضرورت الہام یعنی جب آدم علیہ السلام کے تعلق باللہ کی درستی بغیر الہام کے نہیں ہوئی تونسل آدم کے لئے یہ چیز بطریق اولی ضروری ہوگی۔ماخذ: آیت:۳۷۔

خلاصہ رکوع:۵:......نئی ملہم من اللہ جماعت کی ضرورت، (اور وہ مسلمانوں کی جماعت ہے) کیونکہ یہود بیکار ہو چکے ہیں، حالانکہ ان کوتذکیر بآلاء اللہ سے دعوت الی الکتاب دی گئی۔ماخذ: آیت:۴۱، ۴۲،لوگوں کونیکی کی رغبت دلاتے ہیں اورخود نیکی پرعمل کرنے سے جی چراتے ہیں ورنہ اتباع قرآن سے اورکون سی چیز مانع ہے۔ماخذ آیت:۴۴۔

خلاصہ رکوع:۶:......(۱) تذکیر بآلاء اللہ وبما بعد الموت سے یہود کودعوت الی الکتاب۔(۲) اوران کا بدوی قروی زندگی میں فیل وناکام ہونا۔ماخذ:(۱) آیت:۴۷ تا۵۶۔(۲) آیت:۵۷، ۵۸۔

خلاصہ رکوع:۷:...... یہود کا مصری زندگی میں ناکام ہونا یعنی مادی اور کثیف چیزوں کا مطالبہ کرنا وغیرہ۔ ماخذ: آیت:۶۱۔

خلاصہ رکوع:۸:...... یہود کے امراض ثلاثہ تولی، حیلہ سازی اورتعمق یعنی معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ماخذ: آیت:۶۴، ۶۵، ۶۷۔

خلاصہ رکوع:۹:......(۱) یہود مسلمانوں کے مساوی رہ کر بھی کام نہیں کر سکتے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ دو جماعتوں کے مل کرکام کرنے کی عقلاً تین صورتیں ہوسکتی ہیں مثلاً۔دوقومیں ہیں۔پہلی کومتبوع اور دوسری کوتابع مانا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں قومیں برابر ہوں۔تیسری صورت یہ ہے کہ دوسری قوم متبوع اورپہلی قوم تابع ہو۔اس سے پہلے گزر چکا کہ یہود میں متبوع بننے کی قابلیت نہیں رہی، کہ ان کی اتباع کی جائے۔اس آیت (۷۵) میں بتلایا جاتا ہے، کہ ہمیں اس کی طمع نہیں رکھنی چاہئے کہ یہود ہماری بات مان جائیں گے اور ہمارے ساتھ مساوی رہ کر کام کریں گے۔ اورآگے قالوا قلوبنا غلف:(۸۸) یہ بتلایا جائے گا کہ وہ یہود ہمارے ماتحت رہ کر بھی کام نہیں دے سکتے لہذا وہ ہرلحاظ سے بیکار رہیں۔(واللہ اعلم)(۲) اوران کی علمی کمزوریاں۔ماخذ:(۱) آیت:۷۵۔(۲) آیت:۷۸، ۷۹۔

خلاصہ رکوع: ۱۰:...... یہود کی عملی کمزوریاں۔ ماخذ: آیت: ۸۴، ۸۵۔

خلاصہ رکوع: ۱۱:...... یہود کے امراض مستمرہ ہیں، اور وہ مسلمانوں کے ماتحت رہ کر بھی کام نہیں کر سکتے۔ ماخذ: آیت: ۸۷، ۸۸۔

خلاصہ رکوع: ۱۲:......حالت انحطاط میں یہود کا مشغلہ یعنی خدائی تعلیم (تورات) کو چھوڑ کر شیطانی تعلیم کے پیچھے لگ گئے، اور ہاروت وماروت کی تعلیم کے درپے رہتے تھے۔ ماخذ: آیت: ۱۰۲۔

خلاصہ رکوع: ۱۳:......(۱) اہل کتاب سے مقاطعہ اور (۲) بحث نسخ فی الشرائع - ماخذ: (۱) آیت: ۱۰۴۔ (۲) آیت: ۱۰۶۔

خلاصہ رکوع: ۱۴:...... یہود بحث نسخ فی الشرائع چھیڑ کر مساجد الہیہ کو غیر آباد کرنا چاہتے ہیں۔ ماخذ: آیت: ۱۱۴۔

خلاصہ رکوع: ۱۵:......مسلمات یہود پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بیت اللہ الحرام ہونا چاہئے۔ ماخذ: آیت: ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۹۔

خلاصہ رکوع: ۱۶:...... دین میں ہمارا مسلک یہود کے مسلم التعظیم بزرگوں والا ہے، یعنی ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد اور جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دیا گیا ہے۔ ماخذ: آیت: ۱۳۶۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

* * *

پہلے پارے کے چند اہم فوائد

(۱) کلام اللہ کی تلاوت سے پہلے ''اعوذ باللہ'' پڑھنا مسنون ہے، خواہ تلاوت نماز کے اندر ہو یا نماز سے باہر ہو۔ اس میں ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ انسان جب قرآن پڑھتا ہے تو شیطان سرتوڑ کوشش کرتا ہے کہ وہ اس کے معانی کی طرف متوجہ نہ ہو، وسوسہ اندازی کے ذریعے وہ اس کی توجہ ادھرادھر مبذول کر دیتا ہے۔ تعوذ کے علاوہ اعتدال کے ساتھ جہر کا حکم بھی اس لئے ہے کہ قاریٔ قرآن شیطانی وساوس سے محفوظ رہے۔

(۲) نماز کی پہلی رکعت کے شروع میں ''اعوذ باللہ'' کے بعد ''بسم اللہ'' پڑھنا مسنون ہے، یونہی دوسری رکعتوں کے شروع میں بھی ''بسم اللہ'' پڑھنا چاہئے، البتہ فاتحہ کے بعد تلاوت شروع کرنے سے پہلے ''بسم اللہ'' نہیں پڑھنا چاہئے۔

(۳) اللہ تعالیٰ تعریف کو پسند کرتا ہے اس لئے اس نے خود بھی اپنی تعریف کی ہے اور اپنے بندوں کو بھی اس کا حکم دیا ہے۔

(۴) اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی بات سمجھ میں آئے یا نہ آئے، مؤمن کی شان میں ہے کہ وہ اس کے حق ہونے پر یقین رکھے۔

(۵) متقین کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے دو نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، دنیا میں راہ حق اور آخرت میں حقیقی اور دائمی کامیابی۔

(۶) جھوٹ، نفاق اور فریب سے احتراز لازم ہے کیونکہ جھوٹ کی آگ جلانے والا بالآخر خود ہی اس کا ایندھن بنتا ہے۔

(۷) اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی معرفت اور اس کی نعمتوں اور مظاہر قدرت میں غور وفکر کرنا واجب ہے؛ کیونکہ اس سے دل میں اللہ تعالیٰ کی خشیت اور محبت پیدا ہوتی ہے۔

(۸) ایمان اور عمل صالح ہی وہ دو بنیادیں ہیں، جن پر اللہ کے فضل وکرم سے جنت کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

(۹) ان شاء اللہ کہنے سے عمل کرنا آسان ہوجاتا ہے۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ کافروں سے دشمنی رکھتا ہے، اس لئے اہل ایمان پر بھی لازم ہے کہ وہ کفار کو اپنا دشمن سمجھیں۔

(خلاصہ مضامین قرآن کریم: ۲۷)

***

پارہ نمبر:(۲)

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

ہجرت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے، پھر رجب یا شعبان دو ہجری میں کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آیا۔ اس پر اہل کتاب نے بہت ناک بھوں چڑھائی اور اعتراضات کئے تھے۔ اس رکوع میں ان کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے دماغ تنگ ہوتے ہیں، نظر محدود ہوتی ہے اور سمت اور مقام کے بندے ہوتے ہیں، وہی یہ گمان کر سکتے ہیں کہ خدا کسی خاص سمت میں مقید ہے، حالانکہ مشرق و مغرب سب اللہ کے لئے ہیں، کسی سمت کو قبلہ بنانے کے معنی یہ نہیں کہ اللہ اسی طرح ہے، دوسرے یہ کہ ان سارے گروہوں کا کوئی ایک قبلہ نہیں بلکہ مختلف گروہوں کے مختلف قبیلے ہیں، ایک کا قبلہ اختیار کر کے بس ایک ہی کو راضی کیا جا سکتا ہے۔ دوسروں کا جھگڑا بدستور باقی رہے گا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ کام نہیں کہ لوگوں کی خوشنودی کی خاطر لین دین کے اصول پر مصالحت کیا کریں۔ بلکہ اللہ نے جو حکم دیا ہے اس پر جم جانا ہے۔ نیز گذشتہ رکوعوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی تعمیر کعبہ کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ اس طرح کعبہ کو قبلہ بنانے کی وجہ با آسانی سمجھی جا سکتی ہے کہ یہ کعبہ تعمیر ہی اس لئے ہوا تھا کہ امت مسلمہ کا قبلہ ہے۔ نیز اس رکوع میں امت مسلمہ کی امامت کا اعلان ہے کہ یہ امت وسط برپا ہی اس لئے کی گئی ہے تاکہ دنیا کے سامنے حق کی شہادت دے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ لہٰذا اب دنیا کی امامت و قیادت اس امت کے لئے ہوگی (بشرطیکہ یہ اپنی ان ذمہ داریوں کو انجام دیتی رہی جن کی خاطر یہ برپا کی گئی ہے)۔ (خلاصۂ مضامین قرآنی:۵۱)

دوسرے پارہ کی ابتدا ہوتی ہے تحویل قبلہ کے ذکر سے، اصل میں مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً سولہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ لیکن آپ کی دلی آرزو یہ تھی کہ کعبہ کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا جائے جو کہ ملت ابراہیمی کا ایک حسی اور ظاہری شعار تھا، آپ کی قدیمی آرزو کی تکمیل یوں ہوئی کہ اللہ تعالی نے تحویل قبلہ کا حکم نازل فرما دیا۔

تحویل قبلہ کا حکم نازل ہونے کے بعد یوں تو مشرکوں اور منافقوں نے بھی بے بنیاد اعتراضات اٹھائے، لیکن اس معاملے میں یہود پیش پیش تھے وہ بظاہر بڑے تعجب سے لیکن حقیقت میں عناد کی بنا پر کہتے تھے:

''انہیں کس چیز نے اس قبلہ سے پھیر دیا جس کی طرف رخ کر کے یہ پہلے عبادت کیا کرتے تھے۔'' اللہ نے اپنے

نبی کو حکم دیا:

”آپ فرما دیجئے کہ ساری سمتیں خواہ مشرق ہو یا مغرب اللہ ہی کی ہیں۔“

پس اسے اختیار ہے جس سمت کو چاہے قبلہ مقرر فرما دے، گویا یوں کہا گیا کہ ساری جہات اللہ تعالی کی ملکیت ہیں، کسی بھی جہت کو دوسری جہت پر اپنی ذات کے اعتبار سے کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے اور نہ ہی کوئی جہت خود قبلہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، بلکہ وہ اللہ کے حکم سے قبلہ بنتی ہے، لہذا تحویل قبلہ کے بارے میں ان کے اعتراضات کی کوئی حقیقت نہیں۔

یوں بھی اصلاً اہمیت کسی جہت کی طرف توجہ کو نہیں؛ بلکہ اصل اہمیت اللہ کی طرف توجہ کو حاصل ہے۔

ان آیات کے مطالعہ سے اللہ تعالی کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن ادب بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ شدت اشتیاق اور انتظار وحی میں بار بار آسمان کی طرف اپنی مبارک نگاہیں اٹھاتے تو تھے، مگر تحویل قبلہ کا سوال نہیں کرتے تھے کہ شاید اللہ کا فیصلہ اور اس کی رضا عدم تحویل ہی میں ہو، شاید اسی مناسبت سے اللہ تعالی نے تحویل قبلہ کا حکم دینے کے فوراً بعد اہل ایمان پر اس نعمت عظمی کا ذکر فرمایا ہے جو انہیں سراج منیر اور بشیر و نذیر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں عطا ہوئی۔

مستقل قبلہ کا تعین بھی اللہ تعالی کا بہت بڑا احسان ہے اور ہدایت کے لیے عظیم الشان رسول کی بعثت بھی بے مثال احسان ہے۔(۱۵۱)

تہذیب نفس کے دو اصول:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾

فاذکرونی: مجھے یاد کرو گویا یہاں سے تہذیب کا باب شروع ہوتا ہے۔ پہلے اللہ تعالی نے بنی اسرئیل کی قباحتیں بیان کیں، پھر ملت ابراہیمی کی بنیاد کا ذکر کیا۔ خانہ کعبہ کے مرکز ہدایت ہونے کا بیان ہوا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہوا۔ کتاب کا بیان آیا اور اب یہاں سے تہذیب اخلاق یا تہذیب نفس کے احکام شروع ہوتے ہیں۔ جن کی بدولت انسان میں تہذیب اور شائستگی پیدا ہوتی ہے۔ اس ضمن میں اس مقام پر دو اصول بیان ہوئے ہیں۔ اور باقی تین اصول آئندہ رکوع میں بیان ہوں گے۔

تہذیب نفس کا پہلا اصول جو یہاں بیان ہوا، وہ ذکر الہی ہے۔ گویا ہمارا نصاب تعلیم اللہ تعالی کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ذکر زبان، عمل، قلب اور روح کے ذریعے ہوتا ہے۔ ذکر کا عام فہم طریقہ زبان کے ذریعہ سے ہے۔ انسان زبان کے ساتھ خدا تعالی کی حمد و ثنا بیان کرتا ہے۔ اس کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔ تلاوت کلام پاک کرتا ہے۔ یہ سب ذکر کی زبانی صورتیں ہیں۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالی کو اس قدر کثرت سے یاد کرو، ذکر الہی میں اتنے محو ہو کہ لوگ دیوانہ کہنے لگیں۔ اور پھر ذکر الہی کا صلہ یہ ملے گا کہ **لعلکم تفلحون** تا کہ تم فلاح پا جاؤ، الغرض ذکر الہی کثرت سے کرو، کیونکہ اس کی کوئی حد

مقرر نہیں۔

تہذیب نفس کا دوسرا اصول یہاں پر یہ بیان فرمایا: واشکروا لی اور میرا شکریہ ادا کرو، ولا تکفرون اور میرے ناشکر گزار نہ بنو، اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، شکریہ زبان سے بھی ادا ہوتا ہے، اور عمل سے بھی ادا ہوتا ہے، مثلاً جب کوئی انسان کا کھانا کھاتا ہے تو زبان سے الحمد للہ کہتا ہے، گویا اللہ کا شکریہ ادا کرتا ہے، اس سے اللہ راضی ہوتا ہے۔ (۱۵۲) (معالم العرفان: ج ۳/ ۶۶، ۶۷، ۶۸)

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ﴿۱۵۲﴾ سے ایک نیا باب شروع ہوا، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اسے اپنی حکمت میں تہذیب الاخلاق سے تعبیر کرتے ہیں، اس باب میں تہذیب الاخلاق کے بڑے بڑے اصول بیان ہوئے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حکمت کے مطابق کوئی بھی قوم ترقی کی پانچ منازل طے کیے بغیر برسرعروج نہیں پہنچ سکتی، ترقی یافتہ قوم کی پہلی منزل تہذیب الاخلاق ہے، اور دوسری تدبیر منزل، تدبیر منزل کے آگے چار قانون ہوتے ہیں، پہلا قانون شادی بیاہ سے متعلق ہے، جس میں میاں بیوی کے حقوق وفرائض آتے ہیں دوسرا قانون والدین اور اولاد کی اصلاح سے متعلق ہے، تیسرا قانون مالک اور مملوک کے تعلقات پر مبنی ہوتا ہے، اور چوتھے قانون میں اقربا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلقات اور ان کی اصلاح کی تدبیر ہوتی ہے۔

تہذیب الاخلاق اور تدبیر منزل کے بعد ترقی یافتہ قوم کی تیسری منزل تدبیر مدینہ ہوتی ہے، جس کے ذریعہ شہر، بستی یا محلہ کی اصلاح مطلوب ہوتی ہے، اس کے بعد چوتھی منزل اصلاح ملک سے متعلق ہوتی ہے، اور پانچویں منزل خلافت کبریٰ کی ہے جس کے ذریعہ تمام جہاں کی اصلاح مطلوب ہوتی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارتفاق رابع کے اصول کے مطابق مبعوث فرمایا اور اس سے مراد بین الاقوامی یعنی تمام عالم کی اصلاح ہے، الغرض جو قوم ترقی کے بام پر پہنچتی ہے، اسے بہر حال یہ پانچ منازل طے کرنا پڑتے ہیں، ترقی کے آخری زینہ پر پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں اس قدر صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ حظیرۃ القدس یا بہشت بریں کا ممبر بن جائے، یہ انسان کی انتہائی ترقی کا مقام ہے، اگر وہ حظیرۃ القدس کی منزل تک نہیں پہنچ سکا تو وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ (معالم العرفان: ج: ۳/ ۶۹-۷۰)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴿۱۵۳﴾

حق جل شانہ نے قرآن کریم میں صبر کو ستر یا پچھتر جگہ ذکر فرمایا ہے، آیات قرآنیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عمل صالح کا اجر مقرر ہے مگر صبر کا اجر بے حساب ہے، پس اگر نفس پر احکام شرعیہ شاق اور گراں ہوں تو ان کے آسان ہونے کا ایک علاج تو صبر ہے، اور دوسرا علاج نماز ہے، اس لیے کہ نماز ایک تریاق مجرب ہے جو ذکر، شکر، خشوع وخضوع اور اس قسم کے مختلف اجزاء سے مرکب ہے جو ہر بیماری کی دوا اور ہر مشکل کا علاج ہے، جیسے بارش کے لیے صلوٰۃ استسقاء ہے اور ہر دینی اور دنیوی

مطلب کے لیے صلوٰۃ الحاجت ہے، حضرات انبیاء کرام کو جب مشکل پیش آتی تو نماز میں مشغول ہوتے۔(۱۵۳)(معارف القرآن ادریسی: ج:۱/۳۲۱)

قرآن وحدیث کی تعلیمات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صبر کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی کسی تکلیف یا صدمے پر روئے نہیں۔صدمے کی بات پر رنج کا اظہار انسان کی فطرت میں داخل ہے، اس لئے شریعت نے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی اور جو رونا بے اختیار آجائے وہ بھی بےصبری میں داخل نہیں؛ البتہ صبر کا مطلب یہ ہے کہ صدمے کے باوجود اللہ تعالی سے کوئی شکوہ نہ ہو بلکہ اللہ تعالی کے فیصلے پر انسان عقلی طور پر راضی رہے۔اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی ڈاکٹر آپریشن کرے تو انسان کو تکلیف تو ہوتی ہے اور بعض اوقات اس تکلیف کی وجہ سے انسان بے ساختہ چیخ بھی پڑتا ہے لیکن اسے ڈاکٹر سے شکایت نہیں ہوتی کیونکہ اسے یقین ہے کہ ڈاکٹر جو کچھ کر رہا ہے اس کی ہمدردی اور مصلحت میں ہی کر رہا ہے۔

قرآن وحدیث کی تعلیمات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مؤمن پر مصیبت یا پریشانی کئی وجوہات کی وجہ سے آتی ہے، مثلا:

کبھی گناہوں کی سزا کے طور پر، کبھی کفارہ سیئات کے لئے (گناہوں کو مٹانے کیلئے)، کبھی رفع درجات کے لئے اور بھی امتحان کیلئے آتی ہے۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالی جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اسے تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ (بخاری)

ایک حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالی نے مؤمن کیلئے جنت میں ایک مقام بنایا ہوا ہے، اگر وہ عبادات کے ذریعے وہ مقام حاصل نہیں کر پاتا تو اس کو مصائب دیتے ہیں اور جب وہ اس پر صبر کرتا ہے تو وہ اس مقام کو حاصل کر لیتا ہے۔(مشکوۃ، ریاض الصالحین)

ایک حدیث شریف میں ہے کہ مسلمان کو تھکان، بیماری، غم، تکلیف اور کانٹا لگنے سے جو پریشانی ہوتی ہے، اس کے بدلے میں اللہ تعالی اس کے گناہوں کا کفارہ فرما دیتے ہیں۔(متفق علیہ)

ایک حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: میرے پاس مؤمن انسان کے لئے جب میں اس کی دنیاوی محبوب چیز کو چھین لوں اور وہ صبر کرے، سوائے جنت کے کوئی بدل نہیں۔(بخاری)

اس لئے صدمہ اور رنج وغم کے وقت واویلا اور شور نہیں کرنا چاہئے اور نہ شکوہ وشکایت کرنا چاہئے بلکہ اللہ تعالی کی رضا پر راضی رہنا چاہئے اور کثرت سے انا للہ وانا الیہ راجعون کا ورد کرنا چاہئے۔حدیث شریف میں ہے کہ جب کسی مسلمان کو کسی نوع کی مصیبت پہنچتی ہے اور وہ انا للہ وانا الیہ راجعون بار بار پڑھتا ہے تو اسے اس مصیبت کے عوض نیکی ملتی ہے۔(درس قرآن)۔(خلاصۂ مضامین قرآن کریم: ۲۵)

الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

آیت نمبر ۱۵۶ میں حق تعالیٰ نے مصیبت کے وقت تسلی کے دو طریقے ارشاد فرمائے؛ ایک عقلی اور ایک طبعی، عقلی تو یہ ہے کہ ”انا للہ“ ہم سب اللہ کی ملک ہیں، جس کو چاہے دنیا میں رہنے دے اور جس کو چاہے آخرت میں بلائے، عقل سلیم تسلیم کرتی ہے کہ مالک کو اختیار ہے کہ اپنی ملک میں جو چاہے تصرف کرے، لہٰذا کسی عزیز کے مرنے پر شکایت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی کی ملک میں دو گھوڑے ہوں، ایک کو یہاں باندھ دے اور دوسرے کو دوسری جگہ باندھ دے، تو کسی کو اعتراض کا حق نہیں، یا مالک کسی چیز کو اوپر کی منزل میں رکھ دے اور کسی چیز کو نیچے کی منزل میں رکھ دے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے جس کو چاہے دنیا میں رکھے اور جس کو چاہے آخرت میں رکھے۔

اور طبعی یہ ہے کہ وانا الیہ راجعون یعنی ہم سب کو وہیں جانا ہے اور وہی ہمارا وطن اصلی ہے اور یہ دنیا تو ایک جیل خانہ ہے، اب اگر کسی کو جیل خانہ اور چاہ زندان سے نکال کر گلستان اور بوستان میں لے جا کر ٹھہرا دیں تو حقیقت میں خوشی کا مقام ہے کہ بجائے غم کدہ کے عشرت کدہ مل گیا، غرض یہ کہ ایک جملہ یعنی انا للہ میں عقل کی تسلی ہے اور دوسرے جملہ وانا الیہ راجعون میں طبیعت کی تسلی ہے، یہ تو تسلی ہوئی، مگر بایں ہمہ شریعت نے حزن وملال اور رونے اور آنسو بہانے کی ممانعت نہیں کی کہ وہ غیر اختیاری امر ہے، بلکہ اس میں ایک قسم کی فضیلت بھی رکھ دی اور یہ فرمایا ھو رحمة یعنی آنسو بہانا بھی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے، سبحان اللہ شریعت کی خوبی کو دیکھئے کہ عقل کی اور طبیعت اور جذبات کی سب ہی کی رعایت ہے۔ (۱۵۶) (معارف القرآن ادریسی: ج:۱/ ۳۲۶)

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ

جب مسلمانوں کو صفا اور مروہ کی سعی کے حکم سے بت پرستوں کی مشابہت کا خیال ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی جس کا حاصل یہ ہے کہ صفا اور مروہ اصل میں اللہ کی یادگاریں ہیں، اور کافروں کی مشابہت امر عارضی ہے، وہ اس میں موثر نہ ہوگی، جب کہ نیت خالص اللہ کی ہو، جیسے خانہ کعبہ چندروز غلبۂ کفار کی وجہ سے بیت الاصنام یعنی بت خانہ بن گیا لیکن اس کا قبلہ اور مطاف ہونا ساقط نہ ہوا، اس لیے کہ جو شئ بالذات ہوتی ہے وہ عوارض کی وجہ سے زائل اور ساقط نہیں ہوتی، اس لیے مسلمانوں کو صفا اور مروہ کی سعی میں کوئی تردد اور تامل نہ ہونا چاہیے، مشابہت کفار اس وقت موجب حرمت ہوتی ہے کہ جب کسی شئ کا شعائر اللہ میں سے ہونا کسی دلیل سے ثابت نہ ہو جیسے تعظیم نوروز اور ہولی اور دیوالی اور دسہرا اور نصاریٰ کی کرسمس اور جو افعال اللہ کے نزدیک مشروع اور پسندیدہ ہیں ان میں کفار کی مشابہت موثر نہیں، جیسے حج، عمرہ، ختنہ، عقیقہ، قربانی اور کسوف کے وقت صدقہ اور غلاموں کا آزاد کرنا مشرکین عرب میں رائج تھا۔ (۱۵۸) (معارف القرآن ادریسی: ج:۱/ ۳۲۹)

◇ صفا، مروہ: چونکہ زمانہ جاہلیت میں صفا مروہ پر دو بت رکھے ہوئے تھے، جن کی مشرکین عبادت کرتے تھے اس لیے قبول اسلام کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین صفا مروہ کا طواف کرنے سے بچتے تھے، اس لیے فرمایا گیا کہ ان

کا طواف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔(۱۵۸)

مشہور روایت کے مطابق صفا اور مروہ پر جو بت رکھے ہوئے تھے ان میں سے اساف مرد کا بت تھا اور وہ صفا پہاڑی پر تھا اور نائلہ عورت کا بت تھا اور وہ مروہ پر رکھا ہوا تھا، یہ مرد و زن مشرک تھے، انہوں نے خانہ کعبہ میں برائی کا ارتکاب کیا تھا جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے پتھر کی صورت میں مسخ کر دیا، لوگوں نے ان پتھروں کو اٹھا کر باہر رکھ دیا تا کہ لوگ عبرت حاصل کریں، کہ برائی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ان بتوں کی پوجا ہونے لگی اور یہ لوگوں کے معبود بن گئے، پھر لوگوں نے ان میں سے ایک کو صفا پر رکھ دیا اور دوسرے کو مروہ پر۔

جب اسلام کا دور آیا تو مسلمانوں کو صفا اور مروہ کی سعی کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوئی، ان کا خیال تھا کہ یہ سعی شاید ان بتوں کی وجہ سے ہو، اس دور میں اس سے ملتی جلتی اور بھی مثالیں موجود تھیں، مثلاً اوس اور خزرج قبیلہ کے لوگ جب حج کے لیے آتے تھے تو منات نامی بت کے نام پر احرام مدینہ سے باندھتے تھے، یہ بت کسی بزرگ کے نام سے موسوم تھا، اور سمندر کے کنارے مشلل کے مقام پر رکھا ہوا تھا، یہ لوگ خانہ کعبہ کا طواف تو کرتے تھے مگر صفا و مروہ کی سعی نہیں کرتے تھے، اس قسم کے نظریات اس وقت موجود تھے۔

مسلمانوں کے اس شک کو دور کرنے کے لیے قرآن پاک نے فرمایا: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ، صفا اور مروہ تو اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں اور یہ قدیم سلسلہ سے منسلک ہیں، ان کے درمیان دوڑنا ان بتوں کی تعظیم کے لیے نہیں ہے؛ بلکہ یہ تو محض اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اس کی رضا جوئی کے لیے ہے۔(۱۵۸)(معالم العرفان: ج:۳/ ۹۲)

تحویل قبلہ کی بحث کو سمیٹتے ہوئے آخری اور فیصلہ کن بات جو ارشاد فرمائی گئی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ حقیقی نیکی کا معیار مشرق و مغرب کی طرف رخ کرنا نہیں بلکہ حقیقی نیکی کا معیار یہ ہے کہ عقائد، اعمال، معاملات اور اخلاق سب کا رخ صحیح ہو، اللہ کو راضی کرنے کے لیے صرف چہرے کا رخ ہی نہیں بلکہ دل اور پوری زندگی کا رخ بھی بدلنا ہوگا، ارشاد ہوتا ہے: ”مشرق و مغرب کی طرف منہ کر لینا ہی نیکی نہیں بلکہ حقیقی نیکی تو یہ ہے کہ الخ“ (۱۷۷)

اصل نیکی:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ.......الی..........وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴿۱۷۷﴾

جو اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، آسمانی کتابوں پر، اور انبیاءؑ پر ایمان رکھتے ہیں، اپنے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، اور سوال کرنے والوں کی مالی مدد کرتے ہیں، قیدیوں، اور غلاموں کو آزاد کرواتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جب وعدہ کرتے ہیں تو پورا کرتے ہیں، تنگی اور تکلیف میں صبر کرتے ہیں، پوری زندگی کا رخ صحیح کرتے ہیں۔

دین اسلام مذہبی رسوم کا نام نہیں:

اس آیت کریمہ کو علماء کرام نے بڑی اہمیت دی ہے اور اس سے کم و بیش سولہ قواعد اخذ کیے ہیں۔اس آیت کریمہ

سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دین اسلام محض چند ایسی مذہبی رسوم کا نام نہیں ہے جنہیں عبادت خانے اور خانقاہ میں ادا کیا جاتا ہے؛ بلکہ اس دین کا تعلق زندگی کے ہر شعبے سے ہے، یہ ہر جگہ انسان کے ساتھ رہتا ہے۔

گھر میں بھی اور بازار میں بھی، مسجد میں بھی اور مدرسہ میں بھی، سیاست وحکومت میں بھی اور تجارت ومعاشرت میں بھی، یہ مسلمان کی ہر جگہ نگرانی کرتا ہے اور مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ہر قدم اسے دیکھ کر اٹھائے۔ اس آیت کریمہ کو ''آیت برّ'' کہا جاتا ہے اور اس کے بعد جو احکام ومسائل بیان کیے گئے ہیں انہیں ''ابواب برّ'' کہا گیا ہے۔

گویا پہلے اجمالی طور پر نیکی کے اصول بتانے کے بعد آگے ان کی جزوی تفصیلات اور احکام ذکر کیے گئے ہیں، یہ احکام مسلمان کی معاشی معاشرتی، تجارتی، ازدواجی اور جہادی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، یہ احکام ہم اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ (خلاصۃ القرآن)

یہاں پہنچ کر سورۂ بقرہ نصف ہوجاتی ہے، ابتداء سورت سے یہاں تک کے نصف میں امت دعوت کو خطاب تھا، یعنی ان لوگوں کو خطاب اور عتاب تھا جو آں حضرت ﷺ کے منکر تھے اور اس میں بھی زیادہ تر خطاب بنی اسرائیل کو رہا، جو نبی ﷺ کی نبوت کو خوب جانتے اور پہچانتے تھے مگر چھپاتے تھے اور اقرار نہیں کرتے تھے اور اس اخیر نصف میں امت اجابت کو خطاب ہے اور مختلف قسم کے احکام کی تعلیم اور تلقین ہے جو عبادات اور معاملات اور معاشرات وغیرہ وغیرہ سب کو شامل ہے، اس طرح سے یہ تفصیل اخیر سورت تک چلی گئی ہے۔

نیز سورت کے نصف اول میں زیادہ تر اصول دین اور ایمانیات کا بیان تھا اور اس اخیر نصف میں زیادہ تر احکام عملیہ کا بیان ہے۔ (۱۷۷) (معارف القرآن ادریسی: ج:۱/۲۵۱)

◇ کتمان حق کے متعلق یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ دیکھو جس قوم کے پاس بام عروج تک پہنچانے والی تعلیم موجود ہو، وہ اسے لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے بجائے اسے چھپائے تو ایسا شخص لعنت کا مستحق نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا!

اس وقت دنیا جہنم کدہ بنی ہوئی ہے، جرائم کی بھرمار ہورہی ہے، اور ہم خاموش بیٹھے ہیں، حالانکہ ہمارے پاس وہ تعلیم اور وہ پروگرام موجود ہے جس سے جرائم کی بیخ کنی ہوسکتی ہے۔ جس سے انسان کی ذہنی ترقی ہوسکتی ہے، اور جس سے تہذیب الاخلاق پیدا ہوسکتا ہے مگر ہم اس تعلیم کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے تیار نہیں، ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا کہ سخت ضرورت کے باوجود جب اس تعلیم کو عام نہیں کیا جائے گا تو اس کا وبال لعنت کی صورت میں ظاہر ہوگا، اسی لیے مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے فرمایا تھا کہ ضروریات دین میں سے سب سے پہلا نمبر تعلیم کا ہے، اسے جبری طور پر نافذ کرنا چاہیے۔

اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں یعنی بینات اور ہدایت کا ذکر کرکے فرمایا کہ جو لوگ ان دو چیزوں کو چھپاتے ہیں وہ اللہ اور لوگوں کی لعنت کے سزاوار ہیں، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بینات سے مراد وہ واضح باتیں ہیں جو معمولی توجہ سے سمجھ میں آجاتی ہے، ان میں اللہ تعالیٰ کا ذکر، اس کی نعمتوں کا شکر اور صبر وغیرہ شامل ہیں، اور ہدایت سے مراد ایسی

باتیں ہیں جن کو سمجھنے کے لیے استاد کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، ایسی چیزیں آسانی سے سمجھ میں نہیں آتیں، ان میں شعائر اللہ کی تعظیم بھی شامل ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان تمام چیزوں کو ہم نے کتاب میں بیان کر دیا ہے، اس کے بعد اگر کوئی شخص انہیں چھپانے کی کوشش کرے گا، تو وہ لعنت کا مستحق ٹھہرے گا۔

کتمان حق کی بیماری مسلمانوں کے لیے بھی ایسی ہی خطرناک ہے جس طرح یہود و نصاریٰ کے لیے مہلک ہے، اہل کتاب نے کتاب اللہ سے اعراض کیا اور دیگر خرافات میں لگ گیے لہذا ناکام ہوئے، ادھر بھی یہی حال ہے، مسلمانوں نے قرآن پاک کو پس پشت ڈال دیا اور ٹونے ٹوٹکوں، بدعات اور شرک پر گزارہ ہے، ظاہر ہے کہ ہمارا انجام بھی اہل کتاب سے مختلف نہیں ہوسکتا۔ (۱۵۹) (معالم العرفان: ج: ۳/ ۹۸)

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ .... الی........ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ﴿۱۶۴﴾

◇ تہذیب اخلاق کے بعد سوسائٹی کا دوسرا اہم مسئلہ کسب معاش ہے، یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ ہر شخص کو اس سے واسطہ پڑتا ہے، گزر اوقات کے لیے معاش کا کوئی نہ کوئی ذریعہ اختیار کرنا ہی پڑتا ہے، اس سے کوئی انسان لاتعلق نہیں رہ سکتا، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جگہ جگہ اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ ہم نے تمہیں زمین میں اپنا نائب مقرر کیا، اور تمہارے لیے معیشت کے مختلف سامان پیدا کیے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث پاک میں بھی آیا ہے کہ رزق حلال کی طلب فریضة من بعد الفرائض. اللہ کے مقرر کردہ فرائض کے بعد یہ بھی ایک فریضہ ہے اور چونکہ وسائل معاش اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں، اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ رزق حلال کی تلاش کے ساتھ ساتھ عبادت بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی کرے، آیت نمبر ۱۶۴ میں اللہ تعالیٰ نے ان انعامات کا ذکر کیا ہے جنہیں اللہ نے وسائل معاش بنایا ہے، اور انسان کو غور وفکر کی دعوت دی ہے کہ جب اللہ جل جلالہ نے تم پر اتنے بڑے بڑے انعامات کیے ہیں کہ جن کے بغیر تمہاری گذر اوقات ہی ممکن نہیں، بلکہ زندگی کا دارومدار ہی ان چیزوں پر ہے، تو پھر تم اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو کیسے معبود بنا لیتے ہو؟ وسائل معاش کے ان انعامات میں تمہارے لیے توحید الٰہی کے واضح دلائل موجود ہیں۔

آیت میں مذکور احسانات اس ترتیب سے ہیں: (۱) تخلیق آسمان (۲) تخلیق زمین (۳) دن رات کا تغیر (۴) بحری جہاز (۵) پانی کا نزول (۶) جانوروں کی نسل کا پھیلانا (۷) ہواؤں کی گردش (۸) اور مسخر بادل۔ (معالم العرفان: ج: ۳/ ۱۰۳)

محبت کی مختلف وجوہات:

کسی کے ساتھ محبت کرنے کی کئی ایک وجوہات ہیں، مثلاً اگر کوئی جمال کی وجہ سے محبت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ جمیل بالذات ہے، لہٰذا اصلی اور ذاتی محبت اسی کے ساتھ ہونی چاہیے، حسن و جمال خود خدا کی صفات میں سے ہے اس لیے اس کا تقاضا یہی ہے کہ اصلی محبت اسی سے ہو، محبت کی ایک وجہ کمال بھی ہے، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کمال بالذات ہے اور باقی چیزوں میں کمال اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے، لہٰذا مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے محسن کے ساتھ محبت رکھے۔

بعض اوقات محبت کا معیار نفع اور نقصان ہوتا ہے کہ کسی نے نفع پہنچایا یا نفع کی توقع ہے تو اس سے محبت پیدا ہوگئی، کسی سے اس لیے بھی محبت کی جاتی ہے کہ اس کے بغیر نقصان کا خطرہ ہے، حقیقی نافع اور ضار تو اللہ تعالیٰ ہے، لہٰذا اس وجہ سے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہونی چاہیئے۔

محبت کا ایک اور معیار ضروریات زندگی کی تکمیل بھی ہے، انسان کا مال ومتاع، گھر بار، زن واولاد سب ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، لہٰذا ان سے بھی محبت کی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ محبت بھی محبت بالذات نہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ نے محض ذرائع پیدا کیے ہیں، امیر ہو یا حاکم، رفیق ہو یا دوست، برادری ہو یا کوئی ادارہ، یہ تو محض اسباب ہیں، ورنہ ضروریات کا حقیقی بہم پہنچانے والا اللہ وحدہ لاشریک لہ ہے، لہٰذا محبت بالذات اسی کو سزاوار ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی محبت اور اغیار کی محبت کو ایک سطح پر لے آئے گا تو شرک کا مرتکب قرار پائے گا۔

یہ بات تو واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ ہی محبوب حقیقی ہے، اس کے ساتھ محبت باقی تمام مخلوق کی محبت سے زیادہ ہونی چاہیئے، غیر اللہ کی محبت کو اللہ کی محبت کے مساوی بھی درجہ نہیں دیا جا سکتا؛ ورنہ ''یُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ'' کی زد میں آجائے گا۔(۱۶۵)(معالم العرفان: ج:۳/۱۱۴)

قانون کی پابندی:

قرآن پاک کا یہ اسلوب ہے کہ موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے کبھی خطاب عام ہوتا ہے، جیسے ''يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ'' یعنی اے لوگو! اے بنی نوع انسان، اور کبھی خطاب خاص ہوتا ہے، جیسے '' يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا '' ''یآھل الکتاب'' وغیرہ وغیرہ، آیت میں خطاب عام ہے اور تمام بنی نوع انسان کے لیے حکم دیا جارہا ہے، يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اے لوگو! زمین کی حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ، اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو، وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔

دراصل یہاں پر حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو قانون کی پابندی کا درس دیا ہے، اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حلال قرار دی ہیں، صرف انہیں استعمال کرو اور حرام خوری سے بچ جاؤ، اگر تم اللہ کے قائم کردہ اس قانون کی پابندی نہیں کروگے تو اصل راستے سے بہک کر شیطان کے نقش قدم پر چلنے لگو گے، نتیجہ ظاہر ہے کہ ترقی کے مقام حظیرۃ القدس میں پہنچنے کی بجائے ظلمت کی اتھاہ گہرائیوں میں پہنچ جاؤ گے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس موضوع پر باب باندھ کر بات سمجھائی ہے، فرماتے ہیں کہ انسان مکلف ہے اور مکلف سے مراد قانون کی پابندی کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کی ساخت میں ملکیت اور بہیمیت دونوں مادے رکھے ہیں اور ان دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ انسان قانون کی پابندی کرے اور اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اس کے حصے میں ناکامی اور محرومی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔(۱۶۸)(معالم العرفان: ج:۳/۱۲۲)

مستجاب الدعوات بننے کا نسخہ :

حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ مجھے مستجاب الدعوات بنا دے یعنی اللہ میری ہر دعا کو قبول فرمالے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے سعد! **اطب مطعمك** اپنی خوراک کو پاک بنالو، یعنی طیب غذا استعمال کرو، **تكن مستجاب الدعوات** ۔ مستجاب الدعوات بن جاؤ گے، فرمایا: اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب کوئی شخص حرام کا ایک لقمہ اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے تو چالیس دن تک اس کی نیکی قبول نہیں ہوتی، الغرض اللہ تعالیٰ کے حلال وحرام کے قانون کی پابندی لازم ہے، اس کے برخلاف کرنا شیطان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔

◇ حرام اشیاء: مشرکین ازخود بعض چیزوں کو حلال اور بعض کو حرام ٹھہرا لیتے تھے، ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ (حرام وہ چیزیں نہیں جنہیں تم حرام کہتے ہو) بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو صرف ان چیزوں کو حرام کیا ہے:

مردار، بہتا ہوا خون، خنزیر کا گوشت اور ہر ایسا جانور جس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو، البتہ جو شخص بھوک سے مجبور ہوکر ان میں سے کوئی چیز کھالے تو اسے کچھ بھی گناہ نہیں ہوگا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ کھانے سے مقصد حصول لذت نہ ہو اور نہ ہی قدر ضرورت سے تجاوز کرے، واقعی اللہ تعالیٰ بڑا غفور ورحیم ہے۔ (۱۷۳)

◇ قصاص میں زندگی: شریعت اسلامیہ کی بنیاد عدل پر ہے، اس لیے مسلمانوں پر قصاص فرض کیا گیا ہے، یعنی مقتول کے بدلے قاتل کو بھی قتل کیا جائے گا، چاہے مقتول اور قاتل کے درمیان سماجی، خاندانی، مالی اور جسمانی اعتبار سے کتنا ہی تفاوت کیوں نہ ہو، قصاص میں زندگی ہے، قاتل کی بھی اور مقتول کی بھی، جب قاتل کو اپنے جرم کی سزا ملنے کا یقین ہوگا تو وہ شدت غضب کے باوجود اپنا ہاتھ قتل وقتال سے روک لے گا، اس کے رک جانے سے مقتول اور قاتل بلکہ ان کا خاندان بھی قتل وقتال سے بچ جائے گا، اسلام نے قتل کی سزا میں رحمت اور عدل دونوں چیزوں کو جمع کردیا ہے، مقتول کے اولیاء اور ورثاء اگر قصاص کا مطالبہ کریں تو یہ عدل ہوگا اور اگر وہ معاف کردیں یا دیت لینے پر راضی ہوجائیں تو فضل و احسان اور رحمت ہوگی۔ (۱۷۸-۱۷۹)

قصاص میں مساوات اور شریعت کا اعتدال :

جاننا چاہیے کہ مقتولین میں فقط قصاص یعنی فقط جان لینے کے اعتبار سے برابری اور مساوات ہے، قتل کی کیفیت میں مساوات اور برابری نہیں، مثلاً یہ جائز نہیں کہ آگ سے جلانے والے کو آگ میں جلایا جائے اور پانی میں غرق کرنے والے کو پانی میں غرق کرکے مارا جائے اور اگر کسی نے کسی کو جادو سے مارا ہے تو اس کو جادو سے مارا جائے، اس لیے فی القتلیٰ فرمایا فی القتل نہیں فرمایا، مقتولین میں برابری ہے کیفیت قتل میں برابری نہیں، خوب سمجھ لو۔ (معارف القرآن ادریسی: ج:۱/۲۵۶)

◇ ایسا صاحب مال جسے اپنی موت قریب آجانے کا احساس ہوجائے اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے مال کے بارے

میں وصیت کر جائے۔(۱۸۰)

اسلام کا فوجداری قانون:

اللہ تعالیٰ نے اسلام کا فوجداری قانون جاری فرمایا ہے، جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ انسانی جان ایک محترم چیز ہے اور اس کی حفاظت ضروری ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی جان تلف ہو جائے تو اس کے لیے قصاص کا قانون بتلایا گیا ہے جس کا اجراء اور پھر اس کی پابندی لازم ہے، اگر قصاص نہ ہو سکے تو پھر خون بہا کا مسئلہ آئے گا جسے دیت کہا جاتا ہے، اس مالی معاوضہ کی ادائیگی بھی ضروری ہے۔

زمانہ جاہلیت میں قصاص کے معاملہ میں عدم مساوات اور ناانصافی پائی جاتی تھی، ادنیٰ اور اعلیٰ خاندان کے مقتول کا قصاص بھی مختلف تھا، اگر کوئی کمزور اور ادنیٰ خاندان کا آدمی اعلیٰ خاندان کے کسی فرد کو قتل کر دیتا تو مقتول کے ورثاء دوہرا قصاص طلب کرتے، ایک مقتول کے بدلے میں دو افراد قتل کرتے یا عورت کے بدلے میں مرد کا قصاص لیتے، یا غلام کے بدلے آزاد کو قتل کرتے، حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے اس مقام پر بڑی اچھی تقریر لکھی ہے، فرماتے ہیں: زمانۂ جاہلیت میں یہود اور اہل عرب کا دستور تھا کہ عورت کے بدلے میں مرد کو، غلام کے بدلے میں آزاد کو اور ایک آزاد کے قصاص میں دو کو قتل کیا جاتا، یہ زیادتی اور ظلم تھا، جو زبردست زیردستوں پر روا رکھتے تھے، جب اسلام آیا تو اس نے اونچ نیچ، شریف اور رذیل، غلام اور آزاد اور عورت اور مرد کو قصاص کے معاملہ میں برابر قرار دیا، اسلام نے امیر اور غریب کے درمیان حائل دیوار کو گرا دیا اور قصاص کے معاملہ میں مساوات کا درس دیا، اسلام نے عالم اور جاہل، بچے، جوان اور بوڑھے، تندرست اور بیمار، صحیح الاعضاء اور لنگڑے، اپاہج اور اندھے کے امتیاز کو یکسر ختم کر دیا اور سب میں مساوات قائم کر دی، اسلام نے انہیں بتلایا کہ قصاص کا معنیٰ ہی برابری ہے، لہٰذا قصاص کے معاملہ میں کسی انسان سے امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا، بلکہ سب کے ساتھ یکساں سلوک ہوگا، یہ قانون قانون قصاص ہے۔(۱۷۸)(معالم العرفان: ج:۳/۱۶۰، ۱۶۱)

اسلامی قانون حکمت پر مبنی ہے:

امام شاطبیؒ کا تعلق اندلس سے ہے، آپ مالکی مسلک کے بہت بڑے امام گزرے ہیں، آپ نے ''موافقات'' نامی کتاب بھی لکھی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ اسلام کا سارا قانون حکمت پر مبنی ہے، اس کی کوئی شک حکمت سے خالی نہیں، اللہ تعالیٰ نے اس قانون میں بڑی بڑی باریکیاں اور حکیمانہ مصلحتیں رکھی ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کی ایک ایک آیت میں اس قدر حکمتیں، مصلحتیں اور باریکیاں موجود ہیں کہ دنیا کے تمام انسان مل کر سوچیں تو اس کے برابر نہیں سوچ سکتے، آپ ''فیوض الحرمین'' میں لکھتے ہیں کہ بعض اوقات جب میں بعض آیات پر غور کرتا ہوں تو ان کی تہ میں مجھ پر بحر بیکراں جیسے وسیع انکشافات ہوتے ہیں، جو عام انسانوں کی سوچ و بچار سے باہر ہوتے ہیں۔(۱۸۲)

(معالم العرفان: ج:۳/۱۶۸)

◇ ہر عاقل بالغ مسلمان پر روزے فرض ہیں، روزے اگر واقعی تمام آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے رکھے جائیں تو انسان میں تقوی پیدا کرنے کے ساتھ انسانی احساسات کو بھی بیدار کرتے ہیں۔

فضیلت رمضان:

جس مہینے میں روزے فرض کیے گئے ہیں، اسے یہ خصوصیت اور فضیلت بھی حاصل ہے کہ اس میں قرآن جیسی عظیم الشان کتاب نازل ہوئی۔ مسافروں اور بیماروں کو روزہ چھوڑنے اور قضا کرنے کی اجازت ہے۔(۱۸۳-۱۸۵)

◇ رمضان کی راتوں میں بیوی کے ساتھ جماع جائز ہے لیکن اعتکاف کی حالت میں جائز نہیں اور نہ دن میں۔ (۱۸۶،۱۸۷)

◇ کسی بھی باطل اور ناجائز طریقے سے مال کمانا جائز نہیں خواہ وہ جوا ہو یا چوری، غصب اور رشوت ہو یا خرید وفروخت کے ناجائز طریقے۔(۱۸۸)

◇ قمری تاریخوں کا استعمال فرض کفایہ بھی ہے اور اسلامی شعار بھی، کئی عبادات کا مدار ان کی معرفت پر ہے۔ (۱۸۹)

روزہ:

روزہ اصطلاح شریعت میں اسے کہتے ہیں کہ انسان طلوع فجر سے غروب آفتاب تک اپنے کو کھانے پینے اور عمل زوجیت سے روکے رہے، جو روزے فرض ہیں وہ ماہ رمضان کے ہیں، فحش، غیبت، بدزبانی وغیرہ زبان کے تمام گناہوں سے روزہ میں بچے رہنے کی سخت تاکیدیں حدیث میں آئی ہیں، جدید وقدیم سب طبیں اس پر متفق ہیں کہ روزہ جسمانی بیماریوں کے دور کرنے کا بہترین علاج اور جسم انسانی کے لیے ایک بہترین مصلح ہے، پھر اس سے سپاہیانہ ہمت اور ضبط نفس کی روح جو ساری امت میں تازہ ہوجاتی ہے، اس کے لحاظ سے بھی مہینہ بھر کی یہ سالانہ مشق ایک بہترین نسخہ ہے۔

روزہ کسی نہ کسی صورت میں تو دنیا کے تقریباً ہر مذہب اور ہر قوم میں پایا جاتا ہے، جیسا کہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع چہارم کی جلد ۹/ ۱۰۶ اور جلد: ۱۰/ ۱۹۳ سے ظاہر ہے، لیکن قرآن مشرکانہ مذہبوں سے بحث نہیں کرتا۔(تفسیر ماجدی: ۱/ ۳۴۷)

اسلامی روزہ کی اصل غرض وغایت تقویٰ کی عادت ڈالنا اور امت وافراد کو متقی بنانا ہے، تقویٰ نفس کی ایک مستقل کیفیت کا نام ہے، جس طرح مضر غذاؤں اور مضر عادتوں سے احتیاط رکھنے سے جسمانی صحت درست ہوجاتی ہے اور مادی لذتوں سے لطف وانبساط کی صلاحیت زیادہ پیدا ہوجاتی ہے، بھوک خوب کھل کر لگنے لگتی ہے، خون صالح پیدا ہونے لگتا ہے، اسی طرح اس عالم میں تقویٰ اختیار کرلینے سے عالم آخرت کی لذتوں اور نعمتوں سے لطف اٹھانے کی صلاحیت و استعداد انسان میں پوری طرح پیدا ہوکر رہتی ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں اسلامی روزہ کی افضلیت تمام دوسری قوموں کے گرے پڑے روزوں پر علانیہ ثابت ہوتی ہے۔(تفسیر ماجدی: ۱/ ۳۴۸)

روزہ کے مقاصد اور زندگی پر اس کے اثرات:

امام غزالیؒ نے اپنے مخصوص انداز بیان میں اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی اخلاق الٰہیہ میں سے ایک اخلاق کا پرتو اپنے اندر پیدا کرے، جس کو صمدیت کہتے ہیں، وہ امکانی حد تک فرشتوں کی تقلید کرتے ہوئے خواہشات سے دست کش ہو جائے، اس لیے کہ فرشتے بھی خواہشات سے پاک ہیں، اور انسان کا مرتبہ بھی بہائم سے بلند ہے، نیز خواہشات کے مقابلہ کے لیے اس کو عقل وتمیز کی روشنی عطا کی گئی ہے، البتہ وہ فرشتوں سے اس لحاظ سے کم تر ہے کہ خواہشات اکثر اس پر غلبہ پا لیتی ہے اور اس کو اس سے آزاد ہونے کے لیے سخت مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔

علامہ ابن القیمؒ اسی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

روزہ سے مقصود یہ ہے کہ نفس انسانی خواہشات اور عادتوں کے شکنجہ سے آزاد ہو سکے، اس کی شہوانی قوتوں میں اعتدال اور توازن پیدا ہو اور اس ذریعہ سے وہ سعادت ابدی کے گوہر مقصود تک رسائی حاصل کر سکے اور حیات ابدی کے حصول کے لیے اپنے نفس کا تزکیہ کر سکے، بھوک اور پیاس سے اس کی ہوس کی تیزی اور شہوت کی حدت میں تخفیف پیدا ہو اور یہ بات یاد آئے کہ کتنے مسکین ہیں جو نان شبینہ کے محتاج ہیں، وہ شیطان کے راستوں کو اس پر تنگ کر دے، اور اعضاء وجوارح کو ان چیزوں کی طرف مائل ہونے سے روک دے جن میں اس کی دنیا وآخرت دونوں کا نقصان ہے اس لحاظ سے یہ اہل تقویٰ کی لگام مجاہدین کی ڈھال اور ابرار ومقربین کی ریاضت ہے۔

علامہ موصوف روزہ کے اسرار ومقاصد پر نہایت بلاغت کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

روزہ جوارح ظاہری اور قوائے باطنی کی حفاظت میں بڑی تاثیر رکھتا ہے، فاسد مادہ کے جمع ہو جانے سے انسان میں جو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اس سے وہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

اگر اس مہینہ میں کسی آدمی کو اعمال صالحہ کی توفیق مل جائے تو پورے سال یہ توفیق اس کے شامل حال رہے گی، اور اگر یہ مہینہ بے دلی، فکر وتردد اور انتشار کے ساتھ گزرے تو پورا سال اسی حال میں گزرنے کا اندیشہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین کو پابہ زنجیر کر دیا جاتا ہے۔

شریعت اسلامی نے روزہ کی ہیئت اور ظاہری شکل پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی حقیقت اور اس کی روح کی طرف بھی پوری توجہ دی ہے، اس نے صرف کھانے پینے اور جنسی تعلقات ہی کو حرام نہیں کیا بلکہ ہر اس چیز کو حرام اور ممنوع قرار دیا ہے جو روزہ کے مقاصد کے منافی اور اس کی حکمتوں اور روحانی واخلاقی فوائد کے لیے مضر ہے، اس نے روزہ کو ادب وتقویٰ،

دل اور زبان کی عفت وطہارت کے حصار میں گھیر دیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے کوئی روزہ سے ہو تو نہ بدکلامی اور فضول گوئی کرے، نہ شور وشر کرے، اگر کوئی اس کو گالی دے اور لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہو تو یہ کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں، یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جس نے جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑے، وہ روزہ جو تقویٰ اور عفاف کی روح سے خالی اور محروم ہو وہ ایک ایسی صورت ہے جس کی حقیقت نہیں، ایسا جسم ہے جس کی روح نہیں، حدیث میں آتا ہے، آپ نے فرمایا کہ کتنے روزہ دار ہیں جن کو ان کے روزہ سے سوائے پیاس کے کچھ ہاتھ نہیں لگتا، اور کتنے ایسے عبادت گزار ہیں جن کو اپنے قیام میں شب بیداری کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

حضرت ابوعبیدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ روزہ ڈھال ہے، جب تک اس کو پھاڑ نہ ڈالا جائے۔(ارکان اربعہ)

روزہ باطنی عبادت ہے:

امام طحاویؒ ''مشکل الآثار'' میں فرماتے ہیں کہ ہر عبادت میں ریا کا امکان ہے، صرف روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جس میں ریا کاری کا کوئی مسئلہ نہیں، یہ باطنی عبادت ہے، اور اس کا تعلق ایک طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور دوسری طرف بندہ کے ساتھ، نماز، زکوٰۃ، حج وغیرہ ایسی عبادات ہیں جنہیں دوسرے لوگ دیکھ سکتے ہیں، انہیں محسوس کر سکتے ہیں، اور زکوٰۃ سے مستفید بھی ہو سکتے ہیں، مگر روزہ کے ساتھ ایسا معاملہ پیش نہیں آ سکتا، اس کا تعلق صرف روزہ دار کی ذات سے ہوتا ہے، دوسرا شخص نہ اسے دیکھ سکتا ہے اور نہ محسوس کر سکتا ہے، اگر کوئی شخص عام لوگوں کے سامنے تو نہیں کھاتا پیتا مگر در پردہ ایسا کر لیتا ہے، تو اس کا روزہ کہاں ہوگا، وہ لاکھ اعلان کرتا پھرے کہ میں روزہ دار ہوں مگر اس کی حقیقت کو وہ خود جانتا ہے۔(۱۸۳)(معالم العرفان: ج:۳/ ۱۸۰)

حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ ''لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴿۱۸۳﴾'' میں یہ اشارہ بھی پایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ روزوں میں تبدیلی نہ کرنا بلکہ ہر سال ماہ رمضان المبارک کے روزے رکھنا، خواہ وہ گرمی میں آئیں، یا سردی میں، بہار میں آئیں یا خزاں میں، چنانچہ قمری سال کے مطابق رمضان المبارک مختلف موسموں میں آتا رہتا ہے، متقی بننے کا مقصد یہ ہے کہ انسانی نفس اس کے تابع ہو جائے اور احکام شریعت پر عمل آسان ہو جائے، فرمایا ''اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ'' یہ گنتی کے دن ہیں یعنی پورے سال میں انتیس یا تیس دن کے روزے ہیں، ان کو احکام الٰہی جانتے ہوئے خوشی خوشی سے پورا کرو اور اپنے اندر تقویٰ جیسی عظیم خصلت پیدا کرو۔(۱۸۵)(معالم العرفان: ج:۳/ ۱۸۲)

انسان کے متقی بننے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت سے اصول بیان فرمائے ہیں، پہلا قانون قصاص کی پابندی ہے اور دوسرا اصول مال کے معاملہ میں عدم زیادتی ہے، تاکہ کسی شخص کی حق تلفی نہ ہو، تقویٰ کا تیسرا اصول مقررہ اوقات میں روزہ رکھنا ہے، یہ سب ایسے افعال ہیں جن کی ادائیگی سے ایک مسلمان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوتی ہے۔(۱۸۵)(معالم

العرفان: ج: ۳/ ۱۸۶)

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ سے شروع کر کے مناسک حج کی ترتیب بیان کی گئی ہے، اس کے بعد جہاد کا مسئلہ ہے، مفسرین کرام کے لیے اشکال پیدا ہوا ہے کہ درمیان میں مال کا تذکرہ کیونکر آ گیا ہے، جب کہ ایک طرف روزے کا بیان ہے اور دوسری طرف جہاد کا مسئلہ ہے، بظاہر مضامین آپس میں غیر مربوط معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں سابقہ مضمون کے ساتھ اس کا گہرا ربط ہے۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے اس کی تشریح یوں بیان کی ہے کہ روزہ سے مقصود طہارت نفس اور طہارت بدن ہے، اب اس آیت میں مالی تذکرے سے مراد مال کی طہارت ہے، اس وقت تک مسلمان کا تزکیہ نہیں ہوسکتا جب تک روح وجسم کے علاوہ اس کا مال بھی پاک نہ ہو، اس آیت میں حرام مال کھانے سے منع کیا گیا ہے، اور اس میں یہ لطیف نکتہ پوشیدہ ہے کہ روزہ کی حالت میں تو حلال چیز بھی اتنے وقت کے لیے حرام ہوجاتی ہے مگر حرام مال تو مدت العمر یعنی ہمیشہ کے لیے حرام ہے، گویا ایک مسلمان حرام مال کی طرف سے ساری عمر کے لیے روزے دار ہے، وہ اس کے قریب کیسے جاسکتا ہے۔(۱۸۹)(معالم العرفان: ج: ۳/ ۲۱۲)

◇ مسلمانوں پر جہاد وقتال فرض ہے۔ جہاد کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہے چونکہ حق اور باطل، خیر اور شر کے درمیان ٹکراؤ ازل سے ہے، اور ابد تک رہے گا، اس لیے جہاد بھی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ جہاد کے لیے ہمیشہ مستعد رہیں اور دشمن کے سامنے کمزوری ظاہر نہ کریں ورنہ جرم ضعیفی کی سزا، مرگ مفاجات کے سوا کچھ نہیں۔ (۱۹۰۔۱۹۵)

اقدامی اور دفاعی جہاد:

جہاد دو قسم کا ہے اقدامی یعنی جارحانہ اور دفاعی یعنی مدافعانہ، مسلمان کے لیے عام حکم یہی ہے کہ وہ جنگ میں پہل نہ کرے، بلکہ اگر دشمن حملہ آور ہوجائے تو اپنا دفاع کرے، مگر بعض اوقات اقدامی جہاد بھی ضروری ہوجاتا ہے۔

اسلام کی تیرہ سالہ ابتدائی مکی دور میں اہل ایمان نے کفار کے ہاتھوں بڑی سے بڑی تکلیف برداشت کی، مگر ہاتھ نہیں اٹھایا؛ کیونکہ اللہ کا حکم تھا کفوا ایدیکم اپنے ہاتھ روکے رکھو، نماز قائم کرو اور جماعتی تنظیم کرو، پھر جب مدنی دور میں اسلام طاقتور ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے جہاد کی اجازت دے دی، کہ وہ بھی دشمن کے سامنے ڈٹ جائیں، اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے، چنانچہ اس کے بعد جہاد بالسیف کی ابتداء ہوئی اور اللہ نے واضح حکم دے دیا، ''وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ '' اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ دفاعی جنگ کا حکم ہے، ان کی طرف سے پہل ہوگی تو ان کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم ہوا اور ابتداء میں ایسا ہی ہوا، پہل کفار کی طرف سے ہی ہوئی، مشرکین نے تیرہ سال تک اہل ایمان کو مکہ میں ستایا، پھر ہجرت پر مجبور کیا، بہت سی جانوں کو تلف کیا حتی کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کے درپے ہوئے، ہجرت کے بعد بھی کفار نے مسلمانوں کا پیچھا

کیا، جنگ بدر، جنگ احداور جنگ احزاب وغیرہ اس بات کے واضح شواہد ہیں۔

لارڈ ہیڈلے پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں لنڈن میں ہوا ہے،عیسائی مذہب رکھتا تھا، بعد میں اسلام کی دولت سے مشرف ہوا، بنیادی طور پر بیرسٹر تھا، پھر دین کا علم بھی حاصل کیا،اس نے کہا تھا کہ غیر مسلم اقوام مسلمانوں کے مسئلہ جہاد کی وجہ سے انہیں بدنام کررہی ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جنگ کی ابتداء مسلمان نہیں کرتے بلکہ وہ تو اپنا دفاع کرتے ہیں، وہ اپنے دعویٰ کو جغرافیائی طور پر ثابت کرتا ہے کہ دیکھو! مسلمانوں کے ساتھ پہلی تین جنگیں جہاں لڑی گئیں، پہلی جنگ بدر کے مقام پر ہوئی جو مکہ سے سینکڑوں میل دور ہے، جب کہ مدینہ سے قریب ہے، پھر دوسری جنگ احد کے میدان میں ہوئی، وہ بالکل ہی مدینہ کے مضافات کا واقعہ ہے، کفار نے اتنی دور سے مدینہ پر چڑھائی کی، اور تیسری بڑی لڑائی جنگ خندق ہے، اس میں بھی کفار تین سومیل کا سفر طے کر کے حملہ آور ہوئے مگر اہل اسلام نے مدینہ کے اندر رہ کر اپنا دفاع کیا،لہٰذا مسلمانوں پر یہ الزام لگانا قطعاً ناروا ہے، کہ ان کا دین تلوار کے ذریعہ پھیلا۔(۱۹۰)(معالم العرفان: ج:۳ر ۲۳۲-۲۳۴)

◇ اسلام کے ارکان میں سے ایک اہم رکن حج بھی ہے، اللہ تعالی چاہتے ہیں کہ پوری دنیا سے مسلمان سال میں ایک بار مساوات کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے بلد حرام میں جمع ہوں اور وہاں کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق حج کے مناسک اور اعمال ادا کریں، حج کا احرام چند مخصوص مہینوں میں باندھا جاتا ہے۔البتہ عمرہ پورے سال میں کسی بھی وقت کیا جاسکتا ہے، حج کے دنوں میں تجارت اور خرید وفروخت جائز ہے، زمانہ جاہلیت میں مشرکوں نے بہت ساری رسوم اور بدعات کا اضافہ کرلیا تھا، جن میں سے ایک یہ تھی کہ قریش مزدلفہ میں ہی ٹھہر جاتے اور میدان عرفات میں جانا اپنی توہین سمجھتے تھے، انہیں حکم دیا گیا کہ وہ بھی عام لوگوں کی طرح عرفات جا کر واپس آئیں اور اپنے لیے کوئی الگ تشخص ثابت نہ کریں۔ یونہی مشرکین منی میں جمع ہوکر آباء واجداد کے مفاخر بیان کیا کرتے تھے انہیں کہا گیا کہ وہ آباء کی بجائے اللہ کا ذکر کریں۔(۱۹۶-۲۰۰)

حج کی اقسام:

حج کی تین قسمیں ہیں یعنی افراد، قران اور تمتع۔

افراد حج یہ ہے کہ میقات سے صرف حج کا احرام باندھے اور حج کر کے احرام کھول دے، اس میں عمرہ شامل نہیں ہوتا۔

دوسری صورت قران ہے کہ کوئی شخص میقات سے عمرہ اور حج کا مشترکہ احرام باندھے، عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام نہ کھولے بلکہ اسی احرام سے ایام حج میں حج کرنے کے بعد یعنی دس تاریخ کو احرام کھول دے۔

حج کی تیسری قسم تمتع ہے اور عام طور پر یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، یعنی حج کے مہینوں میں ایک ہی سفر میں عمرہ اور حج کا علیحدہ علیحدہ احرام باندھا جاتا ہے۔(۱۹۶)

حج اسلامی وانسانی اخوت، اور عالمی برادری کا مظاہرہ:

حج ان وطنی، نسلی اور علاقائی قومیتوں کے خلاف، اسلامی قومیت کی جیت ہے جن کے بہت سے اسلامی

ممالک (مختلف عوامل اور دباؤ کے ماتحت) شکار ہیں، وہ اسلامی قومیت کا مظہر اور اعلان ہے، یہاں پہونچ کر تمام اسلامی قومیں اپنے ان قومی وملکی لباسوں سے آزاد ہو کر-جوان کی پہچان بن گئے تھے، اور جن سے بہت سی قومیں تعصب کی حد تک وابستہ ہیں- اسلام کا ایک قومی لباس اختیار کر لیتی ہیں، جس کو دین وفقہ اور حج وعمرہ کی اصطلاح میں ''احرام'' کہا جاتا ہے، سب عاجزی و انکساری، احتیاج ولاچاری اور گریہ وزاری کے ساتھ ایک زبان میں ایک ترانہ اور ایک ہی نعرہ لگاتے ہیں:

لبیک اللھم لبیک، لبیک لاشریک لک لبیک، ان الحمد والنعمة لک والملک لاشریک لک.

اے میرے اللہ میں حاضر ہوں، حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، ساری تعریفیں اور نعمتیں تیرے ہی لیے زیبا ہیں، اور حکومت وبادشاہت بھی، تیرا کوئی شریک نہیں۔

ان میں حاکم ومحکوم، آقا ونوکر، امیر وفقیر اور چھوٹے بڑے کی کوئی تفریق نہیں ہوتی، ان کے لباس اور صدا دونوں میں اسلامی قومیت جلوہ گر نظر آتی ہے، یہی حال حج کے دوسرے اعمال، عبادات، مناسک اور شعائر ومقامات کا ہے، جہاں ہر قوم وملک کے لوگ دوش بدوش نظر آتے ہیں، اور قریب وبعید اور عرب وعجم کے سارے فرق مٹ جاتے ہیں، صفا ومروہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان سب ساتھ دوڑتے ہیں، منیٰ ساتھ سفر کرتے ہیں، عرفات ساتھ جاتے ہیں، اور جبل رحمت پر ایک ساتھ حاضر ہو کر دعا کرتے ہیں اور سب ایک ہی جگہ رات گزارتے ہیں:

فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَٰتٍ فَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ عِندَ ٱلْمَشْعَرِ ٱلْحَرَامِ ۖ وَٱذْكُرُوهُ كَمَا هَدَىٰكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِۦ لَمِنَ ٱلضَّآلِّينَ ﴿۱۹۸﴾

پھر جب تم جوق در جوق عرفات سے واپس ہونے لگو تو اللہ کا ذکر مشعر حرام کے پاس کر لیا کرو، اور اس کا ذکر اس طرح جیسا اس نے تمہیں بتایا ہے اور اس سے قبل تم یقیناً محض ناواقفوں میں تھے۔

سب ایک ساتھ واپس آتے ہیں، ایک ساتھ متحرک ہوتے ہیں اور ایک ساتھ ساکن ہوتے ہیں۔

ثُمَّ أَفِيضُوا۟ مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ ٱلنَّاسُ وَٱسْتَغْفِرُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۹۹﴾

ہاں تو تم وہاں جا کر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں، اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بیشک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

منیٰ میں بھی قیام ایک ساتھ کرتے ہیں اور نحر (قربانی) حلق (سر منڈانا) اور رمی (شیطان کو پتھر مارنا) کے سارے کام ایک ساتھ انجام دیتے ہیں۔

جب تک حج باقی ہے، (اور وہ ان شاءاللہ قیامت تک باقی رہے گا) اس وقت تک مسلمانوں کو یہ قومیتیں اور

غیر اسلامی دعوتیں نگل لینے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ (ارکان اربعہ:۳۲۶)

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ

◇ حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ قرآن میں کافۃ کا معنیٰ یہ لکھا ہے کہ اسلام میں اس طرح داخل ہوجاؤ کہ تمہارا کوئی عمل احکام اسلام کے خلاف نہ ہو۔ اپنی عقل یا دوسرے کے کہنے سے دین میں کوئی چیز داخل نہ کرو کہ یہ بدعت ہے۔ (۲۰۸)

اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ ایک جامع آیت ہے، اسلام میں مکمل داخلہ صرف ظاہری اعمال تک ہی موقوف نہیں بلکہ باطنی طور پر بھی اسلام کے احکام پر پورا پورا یقین ہونا چاہئے، ظاہراً تمام اعضاء مثلاً ہاتھ، پاؤں، کان اور آنکھ احکام اسلام پر کاربند ہوں، جس طرح بعض روایات میں آتا ہے کہ روزہ صرف بھوک اور پیاس برداشت کرنے کا نام نہیں بلکہ آنکھ، کان، زبان اور دیگر تمام اعضاء و جوارح کا روزہ ہونا چاہئے، اسی طرح باطناً دل میں بھی پورا ایمان و یقین ہو کہ ان احکام کو پورے خلوص نیت کے ساتھ انجام دینا ہے، اگر ایسی کیفیت پیدا ہوجائے تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے کافۃ کا مفہوم پالیا ہے، اور اگر ایسا نہیں ہے، ظاہر و باطن میں تضاد پایا جاتا ہے۔ کچھ حصہ اسلام کا لے لیا، اور کچھ بدعات کو بھی اپنا لیا یا کوئی عبادت اسلام سے لے لی اور کچھ چیزیں کسی اور شریعت یا مقامی رسم و رواج سے حاصل کرلیں تو اسلام میں مکمل داخلہ متصور نہیں ہوگا۔ (معالم العرفان: ج:۳/۲۹۶)

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ سب لوگ ایک ہی ملت پر تھے، ملت اس جماعت کو کہتے ہیں، جس کے افراد کے افکار و خیالات ایک جیسے ہوں، ملت حق بھی ہوتی ہے اور ملت باطل بھی، مگر اس آیت میں جس ملت کا ذکر ہو رہا ہے اس سے مراد ملت حق ہے۔ (۲۱۳) (معالم العرفان: ج:۳/ ۳۱۲)

◇ انفاق فی سبیل اللہ کے ضمن میں بتایا گیا ہے کہ اہمیت، اس بات کو حاصل نہیں کہ کیا خرچ کیا جاتا ہے، اصل اہمیت اس امر کو حاصل ہے کہ کہاں خرچ کیا جاتا ہے اور کس نیت سے خرچ کیا جاتا ہے، لہذا اللہ کے دیئے ہوئے جان و مال کو صحیح مصرف پر خرچ کرنا ضروری ہے۔ (۲۱۵)

◇ جو شخص مرتد ہوجائے (یعنی دین اسلام سے پھر جائے) اس کے سارے اعمال باطل ہوجاتے ہیں اور وہ جہنم کا حق دار ہوجاتا ہے (اور دنیا میں اس کی سزا یہ ہے کہ اگر وہ سمجھانے کے باوجود باز نہ آئے تو اسے قتل کردیا جائے)۔ (۲۱۷)

◇ شراب اور جوا میں اگرچہ ظاہری اور مادی منافع ہیں لیکن ان میں جسمانی، عقلی، مالی، اخلاقی اور معاشرتی اعتبار سے جو نقصانات ہیں وہ منافع کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کو ام الخبائث یعنی خباثتوں اور گناہوں کی جڑ قرار دیا ہے۔ (۲۱۹)

شرک کی تعریف میں شاہ عبدالقادر دہلویؒ اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ فرماتے ہیں، شرک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت یا اس کی کسی خاص صفت میں کسی دوسرے کو شریک کیا جائے، مثلاً اللہ تعالیٰ علم محیط کا مالک ہے، وكان الله بكل

شیئ محیطا یعنی اس کا علم ہر چیز کو گھیر نے والا ہے، اب اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی ہستی کا علم بھی ہر شئ پر محیط ہے اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے، تو ایسا عقیدہ رکھنے والا مشرک ہو گیا، کیوں کہ کائنات کے ذرہ ذرہ کا عالم ہونا اللہ کی صفت مختصہ ہے اور اس میں غیر اللہ کی شرکت شرک ہے۔(۲۲۱)(معالم العرفان: ج:۳/ ۳۶۰)

◇ بعض اجتماعی بیماریوں کی نشاندہی کے بعد خاندانی مسائل بیان کیے جا رہے ہیں کیونکہ خاندان ہی ایک اچھے معاشرہ کی بنیاد ہے، ان مسائل کی ابتدا ازدواجی تعلقات سے کی جا رہی ہے، اس سلسلہ میں پہلا حکم یہ دیا گیا ہے کہ مشرک مردوں اور عورتوں سے کسی صورت بھی نکاح جائز نہیں۔(۲۲۱) البتہ کتابی عورت کے ساتھ مسلمان مرد کا نکاح ہوسکتا ہے مگر بہتر یہی ہے کہ کتابیہ کے ساتھ نکاح کے بجائے کسی مسلمان عورت کے ساتھ نکاح کیا جائے۔ اس حکم قرآنی سے یہ نکتہ سمجھ میں آتا ہے کہ اسلام میں ازدواجی رشتہ کی بنیاد خلق اور دین پر ہے، حسب نسب یا غناء اور حسن و جمال پر نہیں؛ کیونکہ یہ عارضی چیزیں ہیں نہ ہی یہ حقیقی سکون اور راحت کی ضامن ہیں اور نہ ہی سعادت کا سبب بنتی ہیں۔ البتہ ازدواجی زندگی کے سفر میں نیک اور خوف خدا رکھنے والا ساتھی، سفر کے بہت سارے مراحل کو آسان کر دیتا ہے، اس لیے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک خاتون کو قیمتی خزانہ سے تعبیر کیا ہے۔(ترمذی)

وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴿۲۲۲﴾ اور اللہ تعالیٰ پاکیزگی اور طہارت حاصل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے، یہاں پاکیزگی سے مراد ہر قسم کی پاکیزگی ہے، جس میں جسم، خوراک، مکان حتی کہ عقیدہ و نظریات کی پاکیزگی بھی مقصود ہے، طہارت کا اصول اتنا اہم اصول ہے کہ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ چار چیزیں تمام ادیان میں اٹل رہی ہیں، اور ہمارے دین میں بھی ہیں، نمبر ایک طہارت جس کا بیان آچکا ہے، دوسرے نمبر پر اخبات ہے جس کا مطلب خدا کے سامنے عاجزی کا اظہار ہے، نماز، روزہ، حج اور ذکر واذکار سب اخبات کا حصہ ہیں، تیسری چیز سماحت ہے یعنی خسیس اور حقیر چیزوں سے بچ جانا، منجملہ ان کے ہر قسم کا گناہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ اشیاء، کفر و شرک، حسد، بغض، لالچ وغیرہ ان چیزوں سے اعراض کرنا سماحت کہلاتا ہے، اور آخری چیز ہے عدالت، پوری زندگی کے ہر مرحلہ پر عدل و انصاف کا دامن تھامے رہنا اور کسی سے ظلم و زیادتی نہ کرنا یہ تمام امتوں کے مشترکہ اصول ہیں۔(۲۲۲)(معالم العرفان: ج:۳/ ۳۶۹، ۳۷۰)

◇ حالت حیض میں بیوی کے ساتھ جماع (مباشرت) جائز نہیں؛ کیونکہ حیض کے خون میں ایسی نجاست اور ایسے جراثیم پوشیدہ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے میاں اور بیوی دونوں کی صحت خطرہ میں پڑ سکتی ہے، البتہ آپس میں بوس و کنار، اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے کی اجازت ہے۔ جبکہ یہودی اس کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے اور نصاریٰ جماع کرنا بھی برا نہیں سمجھتے تھے۔

گویا کہ اسلام نے دوسرے بہت سارے معاملات کی طرح حیض کے معاملہ میں بھی افراط و تفریط کی بجائے اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔(۲۲۲، ۲۲۳)

مسئلہ: حیض و نفاس کے دوران عورتوں کو نماز روزے کی چھوٹ ہوتی ہے لیکن روزوں کی قضاء بعد میں کرنی پڑتی ہے جس

میں عورتیں عموماً بہت کوتاہی کرتی ہیں اوران پر کئی کئی سالوں کے روزوں کی قضاء ہوجاتی ہے۔عورتوں کو چاہئے کہ سال بھر میں جتنے نفلی روزے رکھتی ہیں مثلاً شوال کے چھ روزے،شب برات کا روزہ،محرم کے روزے وغیرہ ان کو فرائض کی نیت سے رکھ لیا جائے،توان شاء اللہ اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ قضاء بھی ادا ہوجائے گی اور نفل روزے کا ثواب بھی مل جائے گا۔

مسئلہ: اسی طرح ان ایام میں مسجد میں داخل ہونا، بیت اللہ میں داخل ہونا،طواف کرنا،قرآن کریم کو چھونا اور پڑھنا جائز نہیں،البتہ تسبیحات اور دعائیں پڑھ سکتی ہیں۔

◇ اگر کسی نے قسم کھالی کہ وہ چار ماہ تک اپنی بیوی کے قریب نہیں جائے گا تو چار ماہ گزرنے پر خود بخود طلاق واقع ہوجائے گی۔البتہ اگراس نے رجوع کرلیا تو نکاح باقی رہے گا؛لیکن قسم کا کفارہ اس پر لازم ہوگا۔

◇ سورۂ بقرہ میں جتنی تفصیل کے ساتھ طلاق، عدت اور رضاعت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں اتنی تفصیل کے ساتھ کسی دوسری سورت میں بیان نہیں کیے گئے۔اس سلسلہ میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ اللہ کی نظر میں طلاق کے قابل نفرت ہونے کے باوجود خصوصی حالات اور مجبوریوں کی بنا پر طلاق کی اجازت دی گئی ہے؛ کیونکہ بعض اوقات میاں بیوی میں سے کوئی ایک ایسا ہوتا ہے جو اپنی بد اخلاقی، بدکرداری اور باغیانہ رویہ کی وجہ سے گھر کو جہنم بنا دیتا ہے، جہاں سکون نام کو نہیں ہوتا، ایسی صورت میں طلاق کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا، اسلام نے طلاق کی اجازت دینے کے ساتھ اس میں درج ذیل بہت ساری اصلاحات بھی کی ہیں:

زمانہ جاہلیت میں طلاق کی کوئی حد مقرر نہیں تھی،سو سو طلاقیں دے کر بھی رجوع کرلیا کرتے تھے۔اسلام تین سے زائد طلاق کی اجازت نہیں دیتا، دو طلاقوں کے بعد تو رجوع کیا جا سکتا ہے مگر تیسری طلاق کے بعد رجوع کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔(۲۲۹)

◇ شوہر نے مہر کی صورت میں بیوی کو جو کچھ دیا ہوا سے واپس لینے کی اجازت نہیں، البتہ خلع کی صورت میں اجازت ہے، خلع یہ ہے کہ عورت اس شرط پر پورا مہر یا اس کا کچھ حصہ دینے کے لیے آمادہ ہو کہ اسے طلاق دے دی جائے، خلع کے لیے زوجین کی رضامندی ضروری ہے۔(۲۳۰)

◇ اگر طلاق یافتہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کرلے مگر کسی وجہ سے اس کے ساتھ بھی نباہ نہ ہو سکے تو وہ اس سے طلاق لینے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے، اسے حلالہ کہا جاتا ہے۔آج کل حلالہ کے نام پر جو ڈرامہ کیا جاتا ہے اس کے کرنے والے اور کرانے والے دونوں پر حدیث میں لعنت کی گئی ہے۔(۲۳۰)

◇ طلاق کے بعد عورت کو محض اذیت سے دوچار کرنے کے لیے رجوع کرنا جائز نہیں۔(۲۳۱)

(۲۱) چونکہ اسلام،عدل اور احسان کا دین ہے جو کسی پر بھی ظلم کی اجازت نہیں دیتا۔خواہ بچہ ہو یا بڑا،مرد ہو یا عورت، اس لیے اسلام نے دودھ پیتے بچوں کے حقوق بھی بیان کیے ہیں، آج تو پوری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے کہ ماں کے

دودھ کا کوئی نعم البدل نہیں؛ مگر اسلام نے اس وقت ماؤں کو اپنے بچوں کو دودھ پلانے کا حکم دیا تھا جب پوری دنیا جہالت کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور ماں کے دودھ کی افادیت کسی کو معلوم نہ تھی، اگر بالفرض میاں بیوی میں جدائی واقع ہوجائے تو بھی دودھ پیتے بچے کی پرورش اور اسے دودھ پلانے کا زیادہ حق ماں ہی کو حاصل ہے۔طلاق اور جدائی کی سزا اس معصوم کو دینا جائز نہیں۔(۲۳۳)

طلاق میں اعتدال:

طلاق اچھی بات نہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس کو تمام جائز چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ قرار دیا ہے، (مستدرک حاکم، کتاب الطلاق، حدیث نمبر: ۲۷۹۴) لیکن یہ ایک سماجی ضرورت بھی ہے، اگر زوجین میں ناچاقی اس درجہ تک پہنچ گئی کہ نباہ دشوار ہوجائے، تو اب نکاح کو باقی رکھنا طرفین کے لئے ایک مصیبت ہے، اسلام سے پہلے طلاق کے معاملہ میں بھی افراط وتفریط تھی، یہودی شریعت میں مرد جب چاہتا طلاق نامہ لکھ کر بیوی کے حوالہ کرسکتا تھا اور بیوی بھی اسی وقت دوسرا نکاح کرسکتی تھی (استثناء: ۲۴/۱-۲) اور عیسائیوں کے یہاں طلاق بالکل ہی ممنوع تھی اور عقد ثانی زنا (مرقس: ۱/۷-۱۲)، اسلام نے ان دونوں کے بیچ کی راہ اختیار کی، طلاق کی گنجائش رکھی گئی؛ لیکن اس کے بعد عدت ضروری قرار دی گئی؛ تاکہ انسانی نسب کی حفاظت ہو، آیت کے اس ٹکڑے میں دو باتیں بتائی گئی ہیں: اول یہ کہ اگر طلاق دینا ہی ہو تو ابتداءً ایک یا دو طلاق دینی چاہئے؛ تاکہ غور وفکر کا موقع باقی رہے اور پشیمانی ہو تو رُجوع کی گنجائش رہے، دوسرے: ایک یا دو طلاق دینے کی صورت میں عدت گذرنے تک بیوی کو لوٹانے کی گنجائش ہے، اب اگر بھلے طریقہ پر عورت کے ساتھ زندگی گذارنے کا ارادہ ہو تو اس کو لوٹالے، یہ 'امساک بالمعروف' ہے، یا خوشگوار طریقہ پر اس کو چھوڑ دے یعنی عدت گذر جانے دے، وہ خود بخود علاحدہ ہوجائے گی اور رخصت کرتے ہوئے کچھ حسن سلوک بھی کردے، یہ 'تسریح بالاحسان' ہے۔

◇ طلاق ہوجائے یا شوہر کی وفات کا سانحہ پیش آجائے دونوں صورتوں میں عورت پر عدت لازم ہے۔

عدت طلاق: طلاق کی صورت میں عدت کی مدت تین حیض ہے۔

عدت وفات: جبکہ شوہر کی وفات کی صورت میں عدت کی مدت چار ماہ دس دن ہے۔(۲۲۸۔۲۳۴)

◇ جو عورت زمانہ عدت میں ہو، اس سے نکاح کے بارے میں عہد وپیمان لینا منع ہے۔البتہ دل میں خواہش رکھنے اور اشارہ کنایہ میں اپنی خواہش کے اظہار کی اجازت ہے۔(۲۳۵)

◇ خاندان اور معاشرہ کی اصلاح اپنی جگہ بے حد اہمیت رکھتی ہے لیکن اس کے لیے حق اور حق کے انصار واعوان کی بقا ضروری ہے، جہاد کا مقصد حق اور حق کے علمبرداروں کی بقا ہے، اس لیے قرآن کریم میں جہاد پر بڑا زور دیا گیا اور موت کے ڈر سے جہاد سے راہ فرار اختیار کرنے والوں کی شدید مذمت کی گئی ہے، بعض مقامات پر اس حوالے سے امم سابقہ کے قصے بھی بیان کیے گئے ہیں۔ یہاں دوسرے پارہ کے اختتام پر بھی دو قصے مذکور ہیں۔

پہلا قصہ ایسی قوم کا ہے جو طاعون کی بیماری پھیل جانے کے بعد موت کے ڈر سے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی تھی لیکن یہ فرار انہیں موت سے نہ بچا سکا، اس قصہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ کوئی تدبیر انسان کو تقدیر سے نہیں بچا سکتی۔

دوسرا قصہ بنی اسرائیل اور حضرت طالوت کا ہے جن کی قیادت میں جہادی صفات سے مالا مال تھوڑے سے لشکر نے اپنے سے کئی گنا بڑے لشکر کو شکست دے دی۔

یہ قصہ ایسا تھا کہ خود بنی اسرائیل کے بھی صرف خواص ہی کے علم میں تھا، عوام اس سے بے خبر تھے۔ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس سے تاریخ کی اس بھولی بسری داستان کا بیان ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا رابطہ اس ذات سے ہے، جس کی نظر سے تاریخ کی کوئی کڑی بھی اوجھل نہیں اور یہ کہ آپ واقعی سچے رسول ہیں، اس لیے اس قصہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

یہ اللہ تعالی کی آیتیں ہیں جو ہم آپ کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں اور بلاشبہ آپ ہمارے رسولوں میں سے ہیں۔

ہمیں خدا کے اس بیان فرمودہ اصول سے یہ بات سمجھ میں آجانی چاہیے کہ مسلمان جب بھی کامیاب ہوتے ہیں، تو وہ مادیت اور دنیاوی طاقت وقوت کے بل بوتے پر غالب نہیں آتے بلکہ اللہ تعالی پر ایمان، بھروسہ رکھنے اور نیک اعمال کی بنیاد پر غالب آتے ہیں۔ (خلاصۃ القرآن: م،اش)

حضرت طالوت والے قصہ ہی کا سلسلہ ہے کہ جب وہ فوج لے کر بڑھے تو فوجیوں سے کہا کہ ایک نہر پر اللہ کی جانب سے تمہاری آزمائش ہونے والی ہے (وہ یہ کہ نہر کا پانی نہ پینا سوائے ایک دو گھونٹ کے) جو پانی پی لے گا اس کا رشتہ اللہ سے کٹ جائے گا اور جو مطلقا نہ چکھے گا وہ اللہ کا فرمانبردار ہے سوائے ایک دو گھونٹ کے؛ لیکن تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ سب نے پانی پی ڈالا۔ پھر حضرت طالوت اور ان کے ایماندار ساتھی آگے بڑھے تو لوگ کہنے لگے کہ آج ہم جالوت اور اس کی فوج سے مقابلہ کی طاقت نہیں پاتے، اس پر ان لوگوں نے جو آخرت پر یقین رکھتے تھے کہا کہ بسا اوقات یہ ہوا ہے کہ اللہ کی مدد سے چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر غالب آ گئی ہے، شرط صبر وثبات کی ہے۔ غرض مقابلہ کے لئے دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا، تو طالوت اور ان کی فوج کے مومنین نے سب سے پہلے اللہ سے صبر وثبات کی دعا مانگی، اور یہ کہ کافروں کے مقابلہ میں اللہ ان کی مدد کرے، جنگ ہوئی اور یہی مختصر سی جماعت اللہ کی مدد سے جالوت اور اس کی طاقتور فوج پر غالب رہی۔ اسی طرح اگر مسلمان متحد رہے اور اللہ کی طرف رجوع کرتے رہے اور اللہ ہی پر بھروسہ رکھا تو دشمنوں پر غالب آتے رہیں گے۔ (خلاصۂ مضامین قرآنی:۵۸)

بعض لوگوں کو قسمیں کھانے کی بہت عادت ہوتی ہے، بات بے بات، موقعہ بے موقعہ جھوٹی سچی قسمیں کھاتے رہتے ہیں، بعض کی تو ایسی عادت ہوتی ہے کہ تکیہ کلام ہی بن جاتا ہے اور بعض کے نزدیک اس کی اہمیت ہی نہیں ہوتی، اللہ تعالی نے آیت نمبر ۲۲۴ تا ۲۲۷ تک ان ہی قسموں کے احکام بیان فرمائے ہیں کہ وہ قسم جو نیکی کے کام سے روکنے والی ہو نہیں کھانی

چاہئے اور اگر کھالی ہے تو اس کو توڑ کر کفارہ ادا کر دینا چاہئے ،جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے۔(آسان ترجمہ قرآن)

اور وہ قسم جو عادت کے اعتبار سے کھائی گئی ہو جیسا کہ عرب میں دستور ہے کہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں ،اسی طرح بعض اوقات انسان ماضی کے کسی واقعے پر قسم کے ارادے ہی سے قسم کھاتا ہے؛لیکن اس کے اپنے خیال کے مطابق وہ قسم صحیح ہوتی ہے جھوٹ بولنے کا ارادہ نہیں ہوتا،لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ جو بات قسم کھا کر کہی گئی ہے وہ حقیقت میں صحیح نہیں تھی ،ان قسموں کو لغو کہا گیا ہے، اس آیت نے بتایا کہ اس پر گناہ تو نہیں ؛لیکن انسان کو چاہئے کہ وہ قسم کھانے میں احتیاط سے کام لے اور ایسی قسم سے بھی پرہیز کرے۔

اور ایک قسم وہ ہے جو عربوں میں ظالمانہ طور پر رائج تھی کہ وہ یہ قسم کھا بیٹھتے تھے کہ اپنی بیوی کے پاس نہیں جائیں گے۔نتیجہ یہ کہ بیوی غیر معین مدت تک لٹکی رہتی تھی ۔نہ اسے بیویوں جیسے حقوق ملتے تھے اور نہ وہ کہیں اور شادی کر سکتی تھی ، ایسی قسم کو ’’ایلا‘‘ کہا جاتا ہے،اس آیت نے یہ قانون بنا دیا کہ جو شخص ایلا کرے وہ یا تو چار مہینوں کے اندر اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کردے اور اپنی بیوی سے معمول کے مطابق ازدواجی تعلقات بحال کرلے، ورنہ چار مہینے تک اگر اس نے قسم نہ توڑی تو بیوی اس کے نکاح سے نکل جائے گی۔(خلاصۂ مضامین قرآن کریم:۳۲)

سورہ بقرہ کے پانچویں رکوع اور چالیسویں آیت سے بنی اسرائیل سے متعلق جو سلسلہ کلام شروع ہوا تھا وہ اٹھارویں رکوع پر پورا ہو گیا اور آخر میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کردی گئی ہے کہ وہ فضول بحثوں میں پڑنے کے بجائے اپنے دین پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنے کی طرف متوجہ ہوں ۔اور انیسویں رکوع سے اسلامی عقائد اور احکام کا بیان شروع ہورہا ہے جس کی ابتداء میں مسلمانوں کو صبر اور نماز پر ثابت قدم رہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

خلاصہ رکوع:۱۷......(۱)تحویل قبلہ کا تحقیقی جواب (۲) اور اہل کتاب کی خوشنودی بیت المقدس کو قبلہ بنانے سے حاصل نہیں ہوسکتی؛ بلکہ ان کی خواہشات کے اتباع سے حاصل ہوسکتی ہے اور وہ بدترین جرم ہے۔ ماخذ: آیت:(۱)۱۴۳،(۲)۱۴۵۔

خلاصہ رکوع:۱۸......تلقین استقامت علی القبلہ ،یعنی دنیا کے کسی حصہ میں جاؤ قبلہ تمہارا یہی رہے گا۔(۲) اور باب تہذیب اخلاق کے دو مسائل، ذکر،شکر۔ماخذ:(۱) آیت:۱۴۹۔(۲) آیت:۱۵۲۔

خلاصہ رکوع:۱۹......باب تہذیب اخلاق کے بقیہ مسائل ثلاثۃ:صبر،دعا،تعظیم شعائر اللہ۔ماخذ: آیت:۱۵۲،۱۵۸۔

خلاصہ رکوع:۲۰......تدبیر منزل کے پانچ مسئلوں میں سے پہلا مسئلہ کسب رزق ،یعنی اللہ نے عقل دے دی ہے لہذا عقل کے ذریعے ترکیب و تحلیل اشیاء سے رزق کماؤ۔ماخذ: آیت:۱۶۴۔

خلاصہ رکوع:۲۱......مسئلہ دوم:صرف کرنے کے اصول،یعنی جب انسان کو کوئی خصلت پیدا کرنا منظور ہو تو وہ اپنے طرز کو ایسے رنگ میں بدل لیتا ہے جس کے پیش نظر مقصد پورا ہو جائے۔مثلا پہلوان بننے کے لئے دودھ، گوشت، انڈے

اور دوسری مقوی غذاؤں کو لازم کرلیا جاتا ہے، اسی طرح جس شخص کو دنیا میں بڑا کام کرنا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے روحانی مربی یعنی نبی کے مشورہ سے چیزیں صرف کرے، تاکہ اس کا مطلب اور ارادہ جلد پورا ہوجائے۔ نبی کی تعلیم کا یہ اثر ہوتا ہے کہ انسان کی عقل میں ایسے علوم اور خیالات بھر دیئے جاتے ہیں جن سے اس کے ارادہ میں پختگی پیدا ہوا اور وہ جلد منزل مقصود پر پہنچ سکے، اس کے برعکس القاء شیطانی اور اتباع شیطان کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کی ہمت پست ہوجاتی ہے اور نہ منزل مقصود پر پہنچنا نصیب ہوتا ہے، لہٰذا اے لوگو! اللہ تعالی کی ہر چیز کو اجازت لے کر حلال پھر ستھری اور پسندیدہ چیزوں کا استعمال کیا کرو، واللہ اعلم۔ ماخذ: آیت: ۱۶۸۔

خلاصہ رکوع: ۲۲......مسئلہ سوم: نظام فوجداری، ومسئلہ چہارم: نظام دیوانی، یعنی نظام حکومت میں دو صیغے ہیں۔ فوجداری اور دیوانی۔ ان دو آیتوں (۱۷۸، ۱۷۹) میں نظام فوجداری سکھایا گیا ہے، ابتدائی سلسلہ اس کا گھر سے شروع ہوتا ہے، مثلاً اگر گھر میں لڑائی ہو تو کس طرح فیصلہ ہوگا۔ گھر کا بڑا آدمی اس قسم کے فیصلے کرے گا کہ گھر میں سیاست کا مادہ پیدا ہوسکے۔ نظام دیوانی جس طرح مالدار کے لئے وصیت میں انصاف کا خیال رکھنا لازمی ہے، اسی طرح مال کے ہر معاملہ میں عدل وانصاف کا ملحوظ رکھنا لوازم انسانیت میں سے ہے۔ ماخذ: آیت: ۱۷۸، ۱۸۰۔

خلاصہ رکوع: ۲۳......مسئلہ پنجم نمبر: (۱) اشاعت تعلیم۔ (۲) اور اصلاح معاملات۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۸۵۔ (۲) آیت: ۱۸۸۔

خلاصہ رکوع: ۲۴...... باب سوم ملک گیری یعنی قانون الٰہی کے لئے اگر کوئی شخص مانع ہو اور روک پیدا کرے اور وہ تم سے لڑنے کے لئے تیار رہتا ہو، تو تم بھی اس سے لڑنے کے لئے ہر وقت تیار رہو اور جو لوگ فطرۃً لڑنے سے عاجز ہیں ان پر زیادتی نہ کرو، اگر زیادتی کروگے تو برکات الٰہی بند ہوجائیں گی۔ ماخذ: آیت: ۱۹۰۔

خلاصہ رکوع: ۲۵......اقسام الحجاج۔ ماخذ: آیت: ۲۰۰، ۲۰۱۔

خلاصہ رکوع: ۲۶......تمہید قتال کے بعد اعادہ حکم قتال یعنی سوال پیدا ہوا تھا کہ جہاد کا حکم کب تک رہے گا؟ اس کا جواب ہے۔ ماخذ: آیت: ۲۱۲۔

خلاصہ رکوع: ۲۷......مسائل متفرقہ متعلقہ قتال۔ یعنی حیلہ ساز آدمی اگر جہاد سے بچنے کا حیلہ سوچنا چاہیں تو ان کے لئے جواب ہے کہ قتال سب کے لئے اور ہمیشہ کے لئے لازم ہے، اگر امن پھیلانا ضروری ہے، لیکن اگر جہاد کے لئے ہمیشہ کے لئے تیار نہیں رہو گے تو بدنظمی پھیلے گی (**لا یزالون یقاتلونکم**) کفار چونکہ ہمیشہ کوشاں رہیں گے کہ تمہیں اپنے دین سے پھسلائیں، اس لئے تمہیں بھی ہمیشہ لڑنے کے لئے تیار رہنا ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (**الجهاد ماض الی یوم القیامة**) اگر جہاد کے لئے ہر وقت تیار نہ رہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم خدانخواستہ مرتد ہونے کے لئے تیار ہوگئے (حبطت) مثلاً ساری عمر ایک شخص بادشاہ کا وفادار رہ کر اخیر میں بغاوت شروع کردے تو

اس کے سارے گزشتہ اعمال غیر معتبر ہو جائیں گے۔

شروع باب پنجم ملک داری۔ ماخذ: آیت: ۲۱۷، ۲۲۱۔

خلاصہ رکوع: ۲۸......مسائل ملک داری۔ ماخذ: آیت: ۲۲۲ تا ۲۲۸۔

خلاصہ رکوع: ۲۹......مسائل ملک داری۔ ماخذ: آیت: ۲۲۹ تا ۲۳۱۔

خلاصہ رکوع: ۳۰......مسائل ملک داری۔ ماخذ: آیت: ۲۳۲ تا ۲۳۵۔

خلاصہ رکوع: ۳۱......مسائل ملک داری۔ ماخذ: آیت: ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۴۰، ۲۴۱۔

خلاصہ رکوع: ۳۲......قانون ملک گیری اور ملک داری کے بعد اقدام عمل، یعنی اللہ تعالی کے نام پر جان دینے کے لئے کمر بستہ ہو جاؤ۔ ماخذ: آیت: ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸۔

خلاصہ رکوع: ۳۳......انتخاب امیر کے بعد خود امیر لوگوں کا امتحان لے گا، نالائق اور لائق کو الگ الگ کرے گا، پھر خدا پرست لائق آدمیوں کی برکت سے کامیابی ہوگی، ضرورت خلافت۔ ماخذ: آیت: ۲۴۹ تا ۲۵۳۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

دوسرے پارے کے چند اہم فوائد

(۱) نماز ہر جگہ ادا ہوسکتی ہے، مسلمان کے لئے بحر و بر اور فضا ہر جگہ ''عبادت گاہ'' ہے۔

(۲) ہدایت کی نعمت صرف انہی کو حاصل ہوتی ہے جن کے دلوں میں خوف خدا ہوتا ہے۔

(۳) جس علم کے اظہار اور پھیلانے کی ضرورت ہو اس کا چھپانا حرام ہے۔

(۴) کسب حلال واجب ہے اور حلال پر ہی اکتفاء کرنا چاہئے اگرچہ تھوڑا ہو۔

(۵) دین فروش قیامت کے دن چار سزاؤں کے مستحق ہوں گے:

(۱) احکام الٰہیہ کے بدلے جو کچھ لے کر اپنے پیٹ بھرتے رہے وہ انگارے بن جائیں گے۔ (۲) اللہ تعالیٰ انہیں اپنے کلام محبت سے محروم کر دے گا۔ (۳) انہیں گناہوں کی غلاظت ہی میں پڑا رہنے دیا جائے گا۔ (۴) ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

(۶) ایمانی دعوے میں سچا صرف اسی شخص کو کہا جاسکتا ہے جس کا عمل اس کی زبان کی تائید کرے۔

(۷) جب قبولیت کی شرائط پائی جائیں تو دعا یقینا قبول ہوتی ہے۔

(۸) صاحب تقوی ہونا صاحب عقل ہونے کی علامت ہے۔

(۹) جس حرام کو حلال سمجھے یا واجب کو ترک کرے وہ شیطان کا پیروکار ہے۔

***

پارہ (۳)

سورۃ البقرہ میں تشریعی احکام کے ساتھ نبوت ورسالت کا موضوع بھی بیان ہوا، دوسرے پارہ کے آخر میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ خودرب کریم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی گواہی دی۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ

یہاں، تیسرے پارہ کے آغاز میں ان خصائص کا ذکر ہے جو بعض انبیاء علیہم السلام کو عطا کیے گئے :

(۱) کسی کو سیادت و قیادت عطا ہوئی۔ (۲) کسی کو بلا واسطہ ہم کلامی کا شرف عطا کیا گیا۔ (۳) کسی کی تائید واضح معجزات سے کی گئی۔

یہ تمام انبیاء علومرتبہ کے باوجود فضل و شرف میں ایک جیسے نہ تھے؛ بلکہ بعض کو بعض پر فضیلت حاصل تھی، جیسے بعض انبیاء کو دوسرے بعض پر فضیلت حاصل ہے، اسی طرح ان کی امتوں کو ایک دوسرے پر فضیلت حاصل ہے، چونکہ بہت ساری خصوصیات اور امتیازات کی بناء پر ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء پر فضیلت حاصل ہے، لہذا آپ کی امت کو بھی دوسری تمام امتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

فضل کے لفظی معنی بزرگی کے ہیں۔یعنی ایسی صفت جس سے انسان دنیا میں مدح وثنا کا مستحق ہو اور آخرت میں اجر سے سرفراز۔

"فضلنا"، میں ضمیر متکلم کا لحاظ رہے۔ یہ تفضیل یا باہمی فضیلت وافضلیت جو کچھ ہے محض عند اللہ ہے۔ خالق کے ہاں درجات و مراتب قربت کے لحاظ سے ہے، خلق کے لیے بہ حیثیت مطاع سب یکساں ہیں، عام خلقت کے لیے رسول سب برابر ہیں۔ اطاعت و تعظیم سب کی یکساں واجب ہے۔ اور اسی معنی میں قرآن مجید کی دوسری آیت اسی سورت کے آخر میں اسی پارہ میں آرہی ہے (آیت) "لا نفرق بین احد من رسلہ۔

لیس مقام التفضیل الیکم انما ھو الی اللہ عز وجل وعلیکم الانقیاد والتسلیم لہ والایمان بہ (ابن کثیر)

اہل لطائف نے آیت سے یہ حکم نکالا ہے کہ انبیاء کے نائبین یعنی اولیاء کاملین کے بھی فرق مدارج کے باب میں عوام کو بحث و گفتگو جائز نہیں، ان کا تقابل وتفاضل عوام کے منصب سے باہر ہے، ہاں بجائے خود ان کے مقامات واحوال، واقعات وفضائل ذکر کرنے کا مضائقہ نہیں جیسا کہ یہاں بھی آگے ہو رہا ہے۔

ابن مریم یعنی مریم نامی ایک خاتون کے فرزند نہ کہ خدازادہ یا ابن اللہ۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بایں شرف وسروری بہرحال ایک انسانی شکل وصورت اور بشری گوشت و پوست رکھنے والی عورت ہی کی اولاد تھے نہ خدا تھے نہ خدازادے،

الوہیت کا کوئی سا بھی جز وان میں نہ تھا، انہیں خدا کا بیٹا ٹھہرالینا نری جہالت تھی، اوراس کی وضاحت کے لیے ضرورت تھی انہیں صراحت کے ساتھ ابن مریم (علیہ السلام) کہنے کی کہ محض اس نشان دہی اور پتہ ہی سے نصرانیت پر ضرب لگ جائے۔ ورنہ نام تو اور بھی پیغمبروں کے لیے گئے ہیں، کہیں ابن فلاں کر کے تعارف نہیں کرایا گیا ہے! نہ ابن داود، نہ ابن ابراہیم، نہ ابن اسحق، نہ ابن یعقوب، نہ ابن زکریا، نہ ابن عمران (علیہ السلام) اس طرح کا تعارف صرف ابن مریم (علیہ السلام) ہی کے لیے مخصوص ہے کہ انہیں کے لیے ابن اللّٰہیت کی تردید کی ضرورت تھی۔ (تفسیر ماجدی: ج:۱/ ۴۸۴، ۴۸۵)

کتاب اللہ کی افضل ترین آیت:

انبیاء کے فضائل اور فرق مراتب کو بیان کرتے ہوئے یہ سورت ہمارے سامنے اس آیت کو پیش کرتی ہے جو کتاب اللہ کی افضل ترین آیت ہے، میری مراد آیت الکرسی ہے جو پچاس کلمات اور دس جملوں پر مشتمل ہے، اس میں ستر بار اللہ تعالی کا ذکر آیا ہے، کہیں صراحۃً اور کہیں اشارۃً۔

سورہ بقرہ کے آخر میں دو آیتیں ایسی ہیں جن کی فضیلت احادیث مبارکہ میں بہت آئی ہے ان میں پہلی آیت ''آیت الکرسی'' ہے جو پچاس کلمات اور دس جملوں پر مشتمل ہے اور اس میں سترہ بار اللہ تعالی کا ذکر صراحۃ اور اشارۃ آیا ہے۔اس کی فضیلت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ہر نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرے،تو جنت میں داخل ہونے کے لئے صرف موت ہی اس کی آڑ بنتی ہے۔اور جس نے آیۃ الکرسی سوتے وقت پڑھ لی تو اللہ تعالی اس کے گھر، اس کے پڑوس،اور آس پاس کے گھروں میں امن رکھے گا۔(مشکوۃ)

اور دوسری آیت سورہ بقرہ کی آخری آیت ہے،اس کی فضیلت کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے،اسی دوران اوپر سے ایک آواز سنی گئی،توانھوں نے سر او پر اٹھا کر دیکھا اور فرمایا: یہ آسمان کا دروازہ آج کھلا ہے جو آج سے پہلے کبھی نہیں کھلا تھا،اس دروازے سے ایک فرشتہ نازل ہوا ہے جو اس سے پہلے کبھی نازل نہیں ہوا۔اس فرشتے نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کیا اور عرض کیا کہ آپ دونوروں کی خوشخبری سن لیجئے جو آپ کو عطا کئے گئے ہیں اور آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے (۱) سورۃ فاتحہ (۲) سورۃ البقرہ کی آخری آیات۔ان میں سے جو بھی حصہ تلاوت کیا جائے گا اللہ تعالی ضرور آپ کو سوال کے مطابق عطا فرمائیں گے۔

آیت الکرسی کی فضیلت:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ

یہ آیت ایک لمبی آیت ہے اور آیت الکرسی کہلاتی ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی کرسی کا ذکر ہے۔ وسع کرسیه السموت والارض حدیث شریف میں اس آیت پاک کی بڑی فضیلت آئی ہے۔حضرت ابی ابن کعبؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ان سے پوچھا کہ قرآن پاک میں سب سے بڑی آیت کون سی ہے۔تو

حضرت ابی ابن کعبؓ نے نہایت ادب سے عرض کیا: اللہ و رسولہ اعلم یعنی اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پوچھا: اچھا یہ بتاؤ، قرآن پاک میں بہتر آیت کون سی ہے؟ انہوں نے پھر عرض کیا۔ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر نبی کریم نے حضرت ابیؓ سے سینہ پر ہاتھ مار کر وہی سوال کیا۔ تو انہوں نے جواب دیا حضور! **اعظم اٰیة فی القراٰن اللہ لا الٰہ ھو الحی القیوم** یعنی قرآن پاک کی سب سے بڑی آیت یہ آیت الکرسی ہے؛ تاہم اس آیت کا یہ اعزاز الفاظ یا کلمات کے اعتبار سے نہیں بلکہ فضیلت کے اعتبار سے اسے سب سے بڑی آیت ہونے کا شرف حاصل ہے۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے: جو شخص فرض نماز کے بعد اخلاص کے ساتھ آیت الکرسی پڑھے گا۔ وہ اگلی نماز تک اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوگا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔ جو کوئی فرض نماز کے بعد اخلاص کے ساتھ آیت الکرسی پڑھے گا۔ موت کے سوا اس کے دخول جنت میں کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔ یعنی جنت میں داخلے کے لیے صرف موت ہی درمیان میں رکاوٹ ہے، جونہی اس کی موت واقع ہوگی، وہ شخص جنت میں داخل ہوجائے گا، گویا یہ آیت کریمہ تلاوت کرنے والا جنت کا مستحق ہوگیا۔

ایک اور حدیث میں اس آیت اور سورہ مومن کی چند ابتدائی آیات کی مزید فضیلت آئی ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی آیتیں ہیں مگر فضیلت کے لحاظ سے ان کو کمال درجہ حاصل ہے۔ **حم تنزیل الکتب من اللہ العزیز العلیم غافر الذنب و قابل التوب شدید العقاب ذی الطول لا الٰہ الا ھو الیہ المصیر**. حضور نے فرمایا: جو شخص آیت الکرسی اور سورہ مومن یا غافر کی یہ تین آیتیں رات کے وقت تلاوت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے صبح تک اس کی حفاظت ہوتی رہے گی۔ اور جو کوئی صبح کے وقت یہ آیتیں تلاوت کرے گا، وہ رات تک اللہ کی امان میں ہوگا۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ سورہ بقرہ میں ایک ایسی آیت ہے جو فضیلت کے لحاظ سے سب سے بڑی آیت ہے، جس گھر میں یہ آیت پڑھی جاتی ہے، وہاں شیطان نہیں ٹھہر سکتا، بلکہ وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔ اس آیت کا اتنا عظیم اثر ہے، صحیحین میں اناج کی حفاظت والی حدیث آتی ہے کہ اس اناج کی حفاظت حضرت ابوہریرہؓ کے ذمہ تھی، آپ رات کو پہرہ پر تھے کہ شیطان نے اس اناج میں سے کچھ لینا چاہا مگر صحابی رسول نے اسے پکڑ لیا، مگر اس کی منت خوشامد کرنے پر چھوڑ دیا۔ پھر دوسری رات آئی، تو یہی واقعہ پیش آیا، آپ نے شیطان کو دبوچ لیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ اس دفعہ چھوڑ دیا جائے پھر نہیں آئے گا، آپ نے پھر اس کو چھوڑ دیا، مگر وہ کم بخت تیسری رات پھر آ گیا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے پھر اس کو پکڑ لیا اور فرمایا: میں آج تجھے ہرگز نہیں چھوڑوں گا بلکہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس لے چلوں گا۔ شیطان نے پھر منت سماجت کی اور کہا کہ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو، کہنے لگا کہ اگر تم آیت الکرسی پڑھ لیا کرو تو شیطان تمہارے قریب نہیں آسکے گا، تمہاری حفاظت ہوگی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے تیسری رات بھی شیطان کو چھوڑ دیا اور

صبح کو سارا معاملہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں عرض کر دیا۔ آپ نے فرمایا اے ابوہریرہؓ شیطان ہے تو جھوٹا، مگر بات اس نے ٹھیک کہی ہے۔ (بخاری) اگر کوئی شخص ایمان کے ساتھ اس آیت کی تلاوت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا محافظ و نگہبان ہوگا۔ (تفسیر ابن کثیر)

الغرض! اس آیت پاک کو بہت بڑی فضلیت حاصل ہے، لہٰذا ہر مسلمان کو اسے ورد زبان بنالینا چاہیے، ہر نماز کے بعد اس کی تلاوت کی جائے، صبح و شام اسے پڑھا جائے، تو اللہ تعالیٰ ہر مصیبت سے مامون فرمائے گا اور آخرت میں جنت میں داخلے کی ضمانت ہوگی، تاہم مفسرین اور محدثین کرام فرماتے ہیں کہ ہر دعا اور ذکر کی قبولیت کے لیے بعض شرائط ہیں، ہر دعا اور ہر ذکر محض پڑھ لینے سے درجہ قبولیت تک نہیں پہنچ جاتی، قبولیت دعا کے لیے ضروری ہے کہ دعا گو فرائض سے خالی نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے اس پر نماز، روزہ فرض کیا ہے۔ تو ان کا تارک نہ ہو، بلکہ انہیں پورا کرتا ہو اور پھر اس کا رزق بھی حلال ہو، اس کا کھانا، پینا اور پہننا حرام سے پاک ہو اور یہ بھی قبولیت کی شرط ہے کہ انسان حتیٰ الامکان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرتا ہو۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت الکرسی سورہ بقرہ کا قلب ہے اور الحی القیوم بمنزلہ روح اور جان کے ہے اور باقی آیات بمنزلہ اعضاء اور جوارح کے ہیں اور اس سورت کے تمام مطالب اسی آیت کے گرد گھومتے ہیں، جس طرح اعضاء اور جوارح جان کے شؤن اور مظاہر ہوتے ہیں، اسی طرح اس سورت کی تمام آیتیں الحی القیوم کے شؤن اور مظاہر ہیں، سورہ بقرہ کے کل چالیس رکوع ہیں، کوئی ایسا نہیں کہ جس میں حیات اور قیومیت اور ہمیشہ کی زندگانی کا مضمون مذکور نہ ہو۔ گویا کہ یہ تمام سورت الحی القیوم کی شرح اور بسط اور حیات اور قیومیت ہی کی توضیح اور تلویح ہے، ابتداء سورت میں ذالك الكتاب لاريب فيه سے قرآن کریم کا آب حیات ہونا بیان فرمایا اور یہ بتلایا کہ ایمان اور تقوی سے حیات ابدی حاصل ہوتی ہے اور کفر اور نفاق سے دائمی ہلاکت، پھر تیسرے رکوع میں افراد انسانی کی فرداً فرداً حیات کا ذکر فرمایا: و کنتم امواتا فاحیاکم۔ آیت۔ اور زمین و آسمان کی پیدائش اور دنیا کی نعمتوں کی پیدائش کا ذکر فرمایا جو دنیوی حیات کا ذریعہ ہیں، اور پھر اپنی عبادت کا حکم دیا جو انسان کی حیات اخروی اور قیام ابدی کا ذریعہ ہے بعد ازاں ابوالبشر کی حیات اور منصب خلافت اور ملائکہ پر ان کی فضیلت کو ذکر فرمایا و اذ قال ربك للملائكة انی جاعل فی الارض خلیفه۔ آیت۔ بعد ازاں پانچویں رکوع سے ایک خاص خاندان کی حیات کا ذکر شروع کیا، یعنی بنی اسرائیل کی حیات اور ان پر اپنے ظاہری اور باطنی انعامات کا بیان شروع کیا جو تقریباً اخیر پارے تک چلا گیا، جس میں ان کو جہانوں پر فضیلت دینا اور من وسلوی کا ان کے لیے نازل کرنا اور ان کی ہدایت کے لیے توریت کا عطا کرنا اور اس خاندان میں ہزاروں پیغمبروں کو ہدایت کے لیے مبعوث کرنا بیان فرمایا چودھویں رکوع تک جب اس خاندان کی حیات کا قصہ تمام ہوا تو پندرہویں رکوع سے ایک دوسرے خاندان کی حیات کا ذکر شروع فرمایا، یعنی حضرت اسماعیل کا ان کی

اقامت اور توطن کے لیے خانہ کعبہ کی تعمیر ہوئی، یہ جگہ نبی آخرالزمان کی پیدائش کی جگہ اور یہ قبلہ آخری قبلہ ہے، دور تک یہ سلسلہ کلام چلا گیا، جب ان دونوں خاندانوں کی حیات اور قائمی سے فارغ ہوئے تو پھر اس کے بعد چند اقسام حیات کو ذکر فرمایا کہ جو بظاہر حیات کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، من جملہ ان کے شہادت فی سبیل اللہ اور مصائب پر صبر کرنا اور قصاص کو جاری کرنا اور وصیت کو بغیر تغیر و تبدل کے جاری کرنا اور روح کو زندہ رکھنے کے لیے روزہ رکھنا اور دین کی بقاء کے لیے جہاد کرنا اور شعائر اسلام کو زندہ اور قائم رکھنے کے لیے حج اور عمرہ کرنا اور مال اور آبرو کی حیات کو قائم رکھنے کے لیے شراب اور جوئے سے پرہیز کرنا اور حقوق نکاح اور زوجیت کے زندہ اور قائم رکھنے کے لیے ایلاء اور خلع اور طلاق اور عدت اور حالت حیض میں مباشرت اور اجرت رضاعت وغیرہ کی حدود کی پوری پوری رعایت رکھنا تا کہ خاندانی اور معاشرتی حیات قائم رہے اور اس کا شیرازہ منتشر نہ ہو۔

پھر جب ان اقسام حیات کے بیان سے فراغت ہوئی تو الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم وھم الوف حذر الموت۔ آیت۔ سے چند عجیب وغریب قصے بیان فرمائے، جن میں اللہ حی قیوم کی طرف سے بلا اسباب ظاہری حیات غیبیہ کا عطا ہونا بیان فرمایا تا کہ خوب واضح ہو جائے کہ اس کے سوا کوئی حی اور قیوم نہیں، جو بھی زندہ اور قائم ہے وہ اس کی دی ہوئی حیات سے قائم ہے، اللہ نے دو قصے اس کلمہ حی وقیوم سے پہلے ذکر فرمائے اور تین قصے اسی مدعا کے اثبات کے لیے آیت الکرسی کے بعد ذکر فرمائے۔

پہلا قصہ حیات بنی اسرائیل کی اس جماعت کا ذکر فرمایا کہ جو وبا سے ڈر کر بھاگے اور پھر ایک نبی کی دعا سے زندہ ہوئے۔

دوسرا قصہ طالوت اور جالوت اور تابوت سکینہ کا نازل فرمایا جس سے اس خاندان کی گم شدہ حیات پھر واپس آئی۔

اس کے بعد آیت الکرسی کو ذکر فرمایا جس میں اللہ کی حیات اور قیومیت، مالکیت، عظمت، ہیبت، قدرت کاملہ اور علم محیط کا ذکر فرمایا اور یہ بتلا دیا کہ اسلام اور سیدھا راستہ یہ ہے کہ خدا کو وحدہ لاشریک مانا جائے، حق واضح ہے، جس کا جی چاہے قبول کرے، کسی پر زبردستی نہیں۔

اس کے بعد پھر اپنی حیات اور قیومیت کے اثبات کے لیے تین قصے ذکر فرمائے، جس سے حیات اخروی کا نمونہ معلوم ہوا اور یہ واضح ہو جائے کہ وہ حی وقیوم مردوں کے زندہ کرنے پر قادر ہے تا کہ لوگ قیامت کے بارے میں شک نہ کریں، پھر اس کے بعد صدقات اور خیرات کے احکام بیان فرمائے جو انسان کی دینی اور دنیوی زندگی کے قیام کا سبب ہیں اور سود سے ممانعت فرمائی کہ جو انسان کی دینی اور دنیوی حیات کی تباہی اور بربادی کا سبب ہے، پھر اس سورت کو للہ ما فی السماوات وما فی الارض۔ آیت۔ سے ایمانیات اور اعتقادیات اور دعا اور استغفار کے مضمون پر ختم فرمایا، اس لیے کہ ایمان اور توبہ اور استغفار ہی سے مردہ دلوں کو حیات جاودانی حاصل ہوتی ہے، خلاصہ کلام یہ کہ تمام سورت حق تعالیٰ کے اسم حی وقیوم کی شرح اور تفصیل ہے اور آیت الکرسی اس سورت کے لیے بمنزلہ دل کے ہے اور یہ اسم حی وقیوم بمنزلہ جان کے

ہے، باقی آیتیں بمنزلہ اعضاء اور جوارح کے ہیں۔ واللہ اعلم۔ (معارف القرآن ادریسی: جلد:۱/ ۴۹۱-۴۹۲)

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں ”جبر نیست برائے دین“ یعنی دین اسلام میں داخلے کے لیے کسی شخص پر جبر روا نہیں ہے، تاہم اسلام میں فی الجملہ جبر موجود ہے اور اس سے مراد وہ تمام احکام ہیں جن کے ذریعے کسی پر سختی کی جاتی ہے۔ مثلاً جہاد کا تعلق جبر سے ہے، جبر کے بغیر جہاد نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح حدود کا قیام ہے، کوئی مجرم خوشی سے سزا قبول نہیں کرتا۔ اسے اس کے کردہ گناہ کی سزا جبراً دینا پڑتی ہے، زانی کو سنگ سار کیا جاتا ہے، چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ شرابی کو کوڑے مارے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ جبر کی اقسام سے ہیں اور یہ جبر بالکل جائز اور ضروری ہے۔ البتہ کسی غیر مسلم کو طاقت کے ذریعے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے، یہ اسلامی تعلیم کے منافی ہے۔ اسی لیے فرمایا: لاا کراہ فی الدین۔

امام ابوبکر جصاصؒ نے ”احکام القرآن“ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ازالۃ الخفاء میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کا وثیق نامی رومی غلام تھا۔ مدت تک آپ کی خدمت کرتا رہا، اس نے آخر عمر تک اسلام قبول نہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے غلام کو بلا کر کہا کہ تو بڑا قابل آدمی ہے۔ خاص طور پر حساب کتاب میں بڑا ماہر تھا۔ فرمایا: اگر اسلام میں جبر روا ہوتا تو میں تمہیں زبردستی مسلمان بنالیتا، مگر میں ایسا نہیں کرسکتا۔ اگر تم مسلمان ہوجاتے تو تمہاری قابلیت کی بناء پر کوئی اچھا عہدہ دیتا۔ اب میں یہی کرتا ہوں کہ تجھے آزاد کردیتا ہوں، تم جہاں چاہو جاسکتے ہو۔ (۲۵۶) (معالم العرفان: ج:۳/ ۵۱۰)

دین کا تعلق اصلاً عقیدۂ قلب سے ہے اور قلب پر جبر واکراہ کی گنجائش ہی نہیں، اس لیے گویا یہاں اس حقیقت کا اعلان ہے کہ ایمان کا تعلق اپنے ارادہ واختیار سے ہے، جبر واضطرار پر نہیں۔

آیت کے اس ٹکڑے سے ایک بہت بڑی اصل ہاتھ آگئی، اس کے بعد لوگوں کو جبریہ مسلمان بنانے کی گنجائش نہ رہی۔

جزیہ کم فہموں نے اسلام میں جبر کی اصل سمجھا ہے، حالانکہ اگر ذرا غور کریں تو معلوم ہوجائے کہ جزیہ کی مشروعیت عین اس کے برعکس خود اس بات کی دلیل ہے کہ مقصود اصلی قانون اسلام وحکومت اسلام کو غالب رکھنا ہے، نہ کہ فرداً فرداً ہر کافر کو بہ جبر مسلم بنانا، مفسر تھانویؒ نے کہا ہے کہ اکراہ کی نفی سے مقصود اکراہ فی نفسہ کی نفی ہے۔ اس لیے کہ اگر مرتد پر یا کافر حربی پر بوجہ خفائے دلیل کے اکراہ کیا جائے جیسا شریعت میں حکم ہے تو یہ نفی اکراہ فی نفسہ کے معارض نہیں اور یہ اکراہ بھی صورت دین پر ہوگا، نہ کہ حقیقت دین پر، کیونکہ قلب پر اطلاع کا کوئی یقینی طریق نہیں اور اس نفی اکراہ سے نہی عن الاکراہ بھی لازم آگئی۔ اس لیے بعض نے نہی کے ساتھ اس کی تفسیر کی ہے یعنی دین میں اکراہ مت کرو۔ (۲۵۶) (تفسیر ماجدی: ج:۱/ ۴۹۳)

ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

اس قسم کی آیات ان آیات کے معارض نہیں جن میں کافروں سے جہاد وقتال کا حکم آیا ہے، اس لیے کہ جہاد شر اور فساد کے رفع دفع کرنے کے لیے ہے، کفار چونکہ خدا کی زمین میں فساد مچاتے ہیں اور خدا کی نازل فرمودہ ہدایت اور

شریعت کے اجراء اور نفاذ میں حارج اور مزاحم ہوتے ہیں اور بندگان خدا کو عبادت سے روکتے ہیں، اس لیے جہاد کا حکم نازل ہوا، جہاد سے مقصود احکم الحاکمین کے دین متین کی حکومت قائم کرنا ہے بجز کسی کو مسلمان بنانا مقصود نہیں، کافر اگر اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہے تو جزیہ دے کر بھی اپنے مذہب پر رہ سکتا ہے اور چونکہ جہاد دفع فساد کے لیے ہے، اس لیے بچوں اور عورتوں، بوڑھوں اور راہبوں کو قتل کرنے سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے منع فرمایا، اس لیے کہ ان لوگوں سے فتنہ فساد کی امید نہیں اور جس طرح موذی جانوروں سانپ اور بچھو کا ایذا رسانی کے بعد قتل کرنا جائز ہے اسی طرح سانپ اور بچھو کو ڈنگ مارنے سے قبل ہی ختم کر دینا عقل اور دانائی ہے، اسی طرح اگر مسلمانوں کو کسی کافر حکومت سے کوئی خطرہ ہو تو تو پہلے ہی سے اس کا خاتمہ کر دینا عین تدبر اور عین سیاست ہے۔ اصطلاح شریعت میں اس کا نام جہاد اقدامی ہے۔

علاوہ ازیں جس طرح انسان ایمان اور کفر کے قبول کرنے میں مختار ہے مجبور نہیں، اسی طرح تمام اعمال خیر اور اعمال شر کرنے اور نہ کرنے میں بھی مختار ہے مجبور نہیں، لیکن اچھے اور برے افعال پر ان کے مناسب جزا اور سزا کا مرتب ہونا جبر و اکراہ کو مستلزم نہیں، مثلاً چور کا ہاتھ کاٹنا اور زانی محصن کا سنگسار کیا جانا اور خون ناحق کا قصاص لیا جانا یہ تمام تر اس کے افعال اختیاریہ کی سزا ہے، جبر اور اکراہ نہیں، اس شخص نے اپنے اختیار سے چوری اور زنا کا ارتکاب کیا اس لیے یہ سزا بھگتنی پڑی، پس اسی طرح جو مسلمان مرتد ہو جائے اور سزائے ارتداد میں قتل کر دیا جائے تو یہ جبر اور اکراہ نہیں، بلکہ اس کے فعل اختیاری (ارتداد) کی سزا ہے اور کافروں سے جہاد و قتال ان کے فعل اختیاری یعنی کفر کی جزاء ہے، حیرت کا مقام ہے کہ قانونی سزائیں تو عین مصلحت اور عین تدبر اور عین سیاست بن جائیں اور شرعی حدود، قتل مرتد اور رجم زانی وغیرہ یہ سزائیں جبر اور اکراہ قرار دی جائیں اور وحشیانہ سزائیں کہلائیں قتل مرتد کے مسئلہ میں اشکال ہے اور مارشل لاء میں کوئی اشکال نہیں، کیا قانون مارشل لا میں ووٹ کی قائم شدہ حکومت کے مرتدین کا قتل نہیں؟ کیا افسوس کا مقام نہیں کہ مجازی اور جعلی حاکم کے مرتدین کا قتل تو عین تہذیب اور عین تمدن ہو اور خدائے احکم الحاکمین کے مرتدین کے قتل پر ناک بھوں چڑھائیں اور اس کو وحشیانہ فعل قرار دیں، اس کا صاف مطلب تو یہ ہوا کہ ہماری بغاوت تو جرم ہے اور اللہ کی بغاوت جرم نہیں، اللہ ان لوگوں کو عقل دے جو بندوں پر اپنا حق اللہ سے زیادہ سمجھتے ہیں۔(۲۵۶) (معارف القرآن ادریسی: جلد: ۱/ ۴۹۵-۴۹۶)

حق ایک ہے اور باطل کے روپ کئی ہیں:

يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّوْرِ ۭ

یہاں آیت میں یہ بات قابل غور ہے کہ لفظ نور تو صیغہ واحد میں لائے ہیں اور ظلمات کو جمع کے صیغہ میں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ نور حق یعنی اسلام اور ایمان کا سچا راستہ ایک ہی ہے۔ اور کفر و شرک کی بہت سی شاخیں ہیں جو سب کی سب باطل اور ناحق ہیں اور ان سب کے لئے اصحاب النار یعنی جہنمی ہونا فرمایا گیا اور ساتھ ہی هم فیها خلدون بھی بتلایا گیا، یعنی ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، کبھی وہاں سے نکلنے کے قابل نہ ہوں گے۔(۲۵۶) (درس قرآن پارہ ۳، ص: ۱۱)

طاغوت کی تفسیر:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ

حضرت جعفر صادقؒ نے طاغوت کی تفسیر کی ہے۔ **کل ما یشغلک عن الحق فهو طاغوتک۔** جو کوئی چیز تمہیں حق سے مشغول کرنے والی ہے۔ وہ تمہارے لیے طاغوت ہے، گویا حق سے ہٹانے والا شیطان ہو یا انسان، مال ہو یا اولاد سب طاغوت کی تعریف میں آئیں گے۔ باطل راستے پر چلانے والے ماں باپ اور غلط طرف لے جانے والے پیر بھی اسی زمرہ میں آتے ہیں، غرضیکہ جو بھی کسی کو حق سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا، وہ اس کے لیے طاغوت ہے۔(۲۵۷)(معالم العرفان: ج:۳/ ۵۱۳)

نمرود کا شجرہ نسب:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ

مختلف تفاسیر اور تاریخ کی کتابوں میں آتا ہے کہ اس کا نام نمرود تھا۔ اس کے باپ کا نام کنعان بن کوش تھا، لہٰذا وہ نمرود ابن کنعان کہلاتا تھا، بعض اوقات اسے اپنے دادا کی طرف منسوب کر کے نمرود بن کوش بھی کہا جاتا ہے اور اس کا پایہ تخت عراق میں بابل کے مقام پر تھا۔ اس زمانے میں یہ بڑا مشہور و معروف شہر تھا۔ جو موجودہ بغداد سے ستر یا سو میل کے فاصلے پر تھا، اس شہر سے بہت سی تہذیبیں وابستہ ہیں۔ نمرود کلدانی خاندان کا بادشاہ تھا۔ اس خاندان نے چار سو سال تک حکومت کی تفسیری روایات میں آتا ہے کہ نسل کے اعتبار سے یہ شخص ٹھیک نہیں تھا، تاہم یہ وہ شخص ہے، جس نے سب سے پہلے سر پر تاجِ شاہی رکھا۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ چار شخص ایسے گزرے ہیں جن کی پوری دنیا پر حکمرانی تھی، ان میں سے دو مسلمان تھے اور دو کافر، مسلمان میں حضرت سلیمان (علیہ السلام) اور ذوالقرنین ہیں، جن کا واقعہ سورہ کہف میں ملتا ہے۔ کفار میں ایک نمرود اور دوسرا بخت نصر تھا۔ جس کا ذکر سورہ بنی اسرائیل میں آیا ہے۔ اس شخص نے بنی اسرائیل کو بالکل برباد اور ذلیل کر دیا تھا۔(۲۵۸)(تفسیر ابن کثیر، قرطبی)

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور نمرود کے واقعہ کے متعلق امام بغویؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے، جب کہ ملک میں قحط پڑ گیا اور لوگ بھوکے مرنے لگے، اس وقت نمرود کے پاس غلے کا ذخیرہ موجود تھا، لوگ اس کے پاس غلہ لینے کے لیے جاتے تھے، اور دربار میں پہنچنے والے سے سب سے پہلے پوچھتا: تیرا رب کون ہے؟ اگر وہ کہتا کہ آپ، تو وہ اسے غلہ دیتا، جب ابراہیمؑ اس کے پاس پہنچے تو وہی سوال اس نے حضرت سے بھی کیا، تو ابراہیم (علیہ السلام) نے جواب دیا: تم محض حاکم وقت ہو، رب نہیں ہو، رب وہ ذات ہے، جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، تمہارے اختیار میں یہ چیز نہیں ہے، لہٰذا تم رب نہیں ہو سکتے۔ اس آیت پاک میں یہی بات بیان کی گئی ہے۔ **اذقال ابراهيم ربی الذی یحی ویمیت** یعنی

میرا رب وہ ہے۔ جوزندگی بخشتا ہے اور مارتا ہے، نمرودفوراًبولا: قال انا احی و امیت میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں، چنانچہ اپنی طاقت کے مظاہرہ کے لیے اس نے دوقیدی منگوائے۔ جو بے گناہ تھا اس کو قتل کروا دیا اور جو مجرم تھا اسے آزاد کر دیا اور کہنے لگا: دیکھو میں نے جس کو چاہا زندگی دے دی اور جسے چاہا موت کے حوالے کر دیا۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے محسوس کیا کہ یہ شخص عقل کا ایسا اندھا ہے کہ موت وحیات کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکا۔ یہ گناہ گار کو چھوڑ دینے اور بے گناہ کو قتل کر دینے کو زندگی اور موت سمجھ رہا ہے، حالانکہ زندگی کا مالک تو وہ ہے جو بے جان چیز میں جان ڈال دے اور جاندار کی جان اپنے اختیار سے قبض کر لے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ ابراہیم (علیہ السلام) نے نمرود کو بے وقوف سمجھتے ہوئے اس نکتہ پر مزید بحث نہ کی، بلکہ ایک دوسری دلیل سے سمجھایا۔ قال ابراھیم فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ فات بھا من المغرب تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا۔ اب اس کے حواس درست ہوئے کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے ایسا سوال کیا ہے جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا فبھت الذی کفر نمرود حیران ہو گیا، گویا اللہ نے اس کی مت ماردی، وہ لا جواب ہو گیا۔ چنانچہ اس نے مزید بحث نہ کی، وہ سمجھ گیا کہ اگر ابراہیم (علیہ السلام) سے مزید مناظرہ کیا تو بات بالکل بگڑ جائے گی اور وہ جھوٹا ثابت ہو جائے گا لہٰذا وہ خاموش ہو گیا۔ (تفسیر بغوی)

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ

اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر کو چار نشانیاں دکھلائیں؛ دو ان کی ذات میں اور دو خارجی۔ (۱) سو سال مردہ کو رکھ کر ان کو دوبارہ زندہ کرنا۔ (۲) سو سال تک ان کے جسم کا صحیح سالم محفوظ رہنا، حدیث میں ہے، اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے بدن کا کھانا حرام کر دیا ہے۔

اور خارجی دو نشانیاں یہ تھیں کہ ایک طعام اور شراب کی کہ سو سال میں تغیر نہ آیا اور جس طرح حضرت عزیرؑ کے جسم مبارک پر کوئی تغیر نہ آیا اور دوسری نشانی حمار (گدھے) کی کہ مر کر ہڈیوں کا ڈھیر ہو گیا، اس کو دوبارہ زندہ کر کے دکھایا، تاکہ کیفیت احیاء موتی کی معلوم ہو جائے کہ راکب اور مرکوب دونوں سو سال کے بعد زندہ ہوئے اور حضرت عزیرؑ یہاں سے اٹھ کر اسی حمار پر سوار ہو کر بیت المقدس واپس ہوئے اور شہر کو آباد پایا اور اپنے محلہ اور گھر پہنچے تو کسی نے نہ پہچانا، اس لیے کہ بچے تو بوڑھے ہو چکے تھے اور حضرت عزیر (علیہ السلام) جوان رہے اور اللہ نے ان کی حیات اور جوانی کو محفوظ رکھا، پھر علامتیں دیکھ کر سب نے پہچانا اور یقین کیا کہ یہ عزیر ہمارے باپ ہیں۔ تفصیل کے لیے امام قرطبی کی تفسیر ص ۲۹۴ ج ۳ دیکھیے۔ (۲۵۹) (معارف القرآن ادریسی: ج:۱/ ۵۰۲)

انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلے میں شرائط:

دین اسلام، انسانیت، انفاق فی سبیل اللہ، اخوت ومحبت اور فضل واحسان کا دین ہے، انسانی فلاح کا کوئی پہلو

ایسا نہیں جس کی قرآن نے دعوت نہ دی ہو اور نیکی کا کوئی ایسا کام نہیں جس کی اسلام نے ترغیب نہ دی ہو، سورۃ البقرہ میں انداز بدل بدل کر انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے اور اس کے آداب بھی بتائے گئے ہیں۔ (خلاصۃ القرآن)

(۱) صدقہ وخیرات دیکر احسان نہ جتلاؤ، (۲) جس کو صدقہ دیا ہے اس کو ایذا نہ پہنچاؤ (۳) اس کام میں ریا کاری کو دخل نہ ہو (۴) پاکیزہ مال اور اعلیٰ چیز صدقہ میں دی جائے (۵) صدقہ کھلے طور پر بھی دیا جاسکتا ہے اور پوشیدہ طور پر بھی بشرطیکہ نیت درست ہو یعنی انفاق محض رضا الٰہی کے لیے ہو (۶) صدقہ غیر مسلم مستحق کو بھی دیا جاسکتا ہے۔ یہ صرف مسلمان تک محدود نہیں، کیونکہ ہدایت دینے کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے، وہ جسے چاہے ہدایت سے نوازے۔ ہاں حربی کافر صدقے کا مستحق نہیں، اس کا ذمی ہونا ضروری ہے۔ البتہ عشر اور زکوٰۃ جو فرائض میں سے ہے، وہ خالص مسلمانوں کے لیے وقف ہیں، لہٰذا کسی قسم کے غیر مسلم کو نہیں دیے جاسکتے۔

نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کی کھیتی سے لطیف تشبیہ دی گئی ہے۔ اس سے اہل لطائف نے دو نکتہ اور پیدا کیے ہیں:

(۱) ایک یہ کہ اپنے مصارف خیر کی حفاظت ونگہداشت بھی اہل زراعت ہی کی طرح کرتے رہنا چاہیے۔ ریا، نمائش، عجب وتکبر، ایذا اور احسان رکھنے سے انہیں برباد نہ کردینا چاہیے۔ (۲) جس طرح تخم ریزی، آبپاشی وغیرہ کے اختلاف سے پیداوار محنت، قیمت اور نفع میں مختلف ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح اجر گو مقدار میں برابر ہو، تاہم حسن قبول وقرب درجات وغیرہ کی کیفیات میں نیت واخلاص کے اعتبار سے کمی بیشی ہوتی رہے گی۔ (۲۶۱) (تفسیر ماجدی: ۱/۵۰۷)

کتنا خرچ کیا جائے:

تو سب سے پہلے جو کچھ قرض ہے، وہ ادا ہونا چاہیے، جس طرح تجارت وغیرہ کے مال میں کل مال کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ فرض ہے۔ اس طرح زرعی پیداوار سے عشر یعنی دسواں حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا فرض ہے۔ البتہ اس مد کے دو حصے ہیں۔ بارانی زمین یعنی جو زمین مالک کی مشقت کے بغیر سیراب ہوتی ہے۔ اس میں سے دسواں حصہ اور جو نہری یا چاہی زمین ہے۔ جسے مالک خود محنت کر کے پانی بہم پہنچاتا ہے، اس میں سے بیسواں حصہ نکالنا فرض ہے البتہ بعض خودرو چیزوں جیسے گھاس، لکڑیاں اور کانے، ان تین چیزوں پر عشر نہیں ہے۔ یہ معاف ہیں، اگر یہ چیزیں خود کاشت کی جائیں۔ چارے کے لیے گھاس وغیرہ خود بوئی جائے، لکڑی کے لیے درخت لگائیں، تو پھر ان پر عشر ادا کرنا ہوگا۔ (۲۶۸)

(معالم العرفان: ج: ۳/۵۵۹)

شیطان کا دھوکہ دینا:

شیطان انسان کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکنے کے لئے اسے اوہام ووساوس اور فاسد خیالات میں مبتلا کرتا ہے، مثلاً یہ کہ میں خرچ کردوں گا تو پھر ضروریات کہاں سے پوری ہوں گی۔ اس طرح گنجائش موجود ہونے پر قبل از مرگ اس واویلا کا اعتبار نہیں اور ایسے اوہام کے جال میں غلطان وپیچان رہنا شیطانی وسوسہ ہے۔ ہاں اگر گنجائش نہ ہو بلکہ

اسباب محتاجگی موجود ہوں تو شریعت خود ایسے شخص کو نفلی صدقات سے روکتی ہے اور نہ ایسی صورت میں خرچ نہ کرنے کو بخل کہا جا سکتا ہے اور یہی نہیں کہ شیطان صرف محتاجی کا خوف ووسوسہ دلاتا ہے بلکہ وہ فحش اور بری باتوں کا بھی حکم دیتا ہے، مثلاً سائلوں کو برا بھلا کہنا۔ نیک کاموں کی مذمت کرنا۔ شہوات ولذات اور نام ونمود وریاء کے کاموں میں روپیہ اڑانا وغیرہ جملہ فحش شیطانی الہام ہیں، جس کا بدیہی نتیجہ افلاس ورسوائی ہے۔ لیکن کتنا عجیب ہے کہ نیک کاموں میں اور اللہ کے راستوں میں مال خرچ کرنے سے تو افلاس اور تنگدستی سے خوف دلاتا ہے اور فحش کاموں میں بے دریغ روپیہ اڑانے سے افلاس سے نہیں ڈراتا، دن رات دیکھا جاتا ہے کہ شیطانی کاموں میں صرف کرنے سے افلاس آتا ہے اور فراخ دستی دیکھی جاتی ہے۔ مگر شیطانی الہام نے کیسا برعکس معاملہ سمجھایا ہے۔(۲۶۸)(درس قرآن: پارہ ۳،ص:۲۶)

وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ ؕ

یہاں پر نذر کو صدقہ کے مقابلہ میں ذکر کیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ صدقہ وخیرات تو بلا شبہ حسنات میں سے ہے۔ مگر نذر جائز ہونے کے باوجود خطرے سے خالی نہیں، چنانچہ حدیث شریف میں آیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا: نذر نہ مانا کرو، کیونکہ یہ آدمی کو تقدیر سے نہیں بچا سکتی۔ حدیث کے الفاظ ہیں **لا یغنی نذر عن قدر** جو کچھ تقدیر میں ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ نذر بخیل لوگ مانتے ہیں، وگرنہ فیاض آدمی شرط نہیں لگاتے۔ وہ تو غیر مشروط طور پر اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ گویا نذر ماننا مشروط عبادت ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں اتنے نوافل ادا کروں گا یا روزے رکھوں گا یا اتنا صدقہ خیرات کروں گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرط باندھنے والی بات ہے اور پھر یہ ہے کہ جب وہ کام ہو جائے تو نذر کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ نذر جائز ہو اور اگر نذر کو پورا نہ کیا تو انسان گناہ گار ہوتا ہے۔(۲۷۰)(معالم العرفان: ج:۳/۵۶۹)

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ؕ

ہر نیکی کی طرح صدقات وخیرات کے بھی مخفی ادا کرنے کی حقیقت تو ظاہر ہی ہے لیکن زندگی میں ایسے مواقع بھی برابر پیش آتے رہتے ہیں جہاں نیکی کا اعلان واظہار بھی ضروری ہو جاتا ہے، ایک شخص ہے کہ بھوک پیاس سے نڈھال یا بیماری میں مبتلا سڑک پر پڑا تڑپ رہا ہے، ہم قریب سے گزر رہے ہیں اور بالکل ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اسے کھلا کر یا دوا دے کر از سر نو اٹھا کر کھڑا کریں، لیکن اس اندیشہ سے کہ کہیں ہماری اس خدمت کا شمار ریاء ونمائش میں نہ ہو جائے اس کے پاس سے کتراتے اور خاموش گزرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تقویٰ نہیں، عین معصیت اور انتہائی وہم پرستی ہوئی۔ یہاں ضرورت فی الفور مدد رسانی کی تھی خواہ اس کے لیے اعلان بہ بانگ دہل ہی کرنا پڑے۔ نہ یہ کہ شبہ ریاء وشائبہ نمائش سے بچنے کے لیے تلاش پہلے گوشہ تنہائی کی شروع ہو جائے، جن مذہبی طبقوں نے نیکی کے اہتمام یا خفاء میں تاکید حد سے زیادہ کی ہے اور خدمت خلق کو مخفی رکھنے کے ساتھ محدود ومقید کر دیا ہے، ان کی تعلیم یقیناً ناقص، ناتمام، یکطرفہ ہے اور انہوں نے

زندگی میں شب وروز اس قسم کے پیش آنے والے بہ کثرت واقعات کو نظر انداز ہی کر دیا ہے۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ صحیح مسلک یہ ہے کہ عمل خیر کے اعلان واخفاء میں اختیار ہے اور ساتھ ہی افضلیت اخفاء کی ہے، جب اعلان میں کوئی خاص مصلحت نہ ہو۔(۲۷۱)(تفسیر ماجدی:۱/۵۱۶)

اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ؕ

صدقات ہی کے مقابلے میں سود کی مذمت ہے، صدقہ وخیرات کرنے سے انسان کے اندر فیاضی کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور بخل دور ہوتا ہے۔ اس کے سبب انسان کے اندر بنی نوع انسان کے لیے جذبہ ہمدردی پیدا ہوتا ہے، مکارم اخلاق کی تکمیل ہوتی ہے، اور پھر یہی خصائل انسان کی نجات کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے سودخور میں بخل کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اخلاق کا جنازہ نکلتا ہے اور لامحدود پیمانہ پر مال جمع کرنے کی حرص پیدا ہوتی ہے۔ انسانی ہمدردی اور فیاضی اٹھ جاتی ہے، سودخور سنگ دل اور ظالم بن جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا دین تباہ وبرباد ہوجاتا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت برستی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے: **لعن اللہ اکل الربو وموکلہ۔۔۔۔۔** الخ اللہ تعالیٰ نے سود لینے والے اور دینے والے پر، اس کی دستاویز کے کاتب اور گواہان سب پر لعنت کی ہے، ادھر صدقہ وخیرات کرنے والوں پر اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے تو ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے دونوں متضاد چیزوں کو اکٹھا بیان کیا ہے۔

سود کی حرمت کے نفاذ کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے دو طریقے بتائے ہیں۔ پہلا طریقہ **فمن جاءہ موعظۃ من ربہ** یعنی وعظ ونصیحت کے ذریعے سودخور کو سود سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے، اگر وہ اللہ کا حکم مان کر سود سے کنارہ کش ہوجائے تو بہتر وگرنہ ایسے لوگ اصحب النار ہیں۔ ان کا گناہ ناقابل معافی ہے۔ **ھم فیھا خلدون** یہ دائمی جہنمی ہے۔ سود کی لعنت سے نجات دلانے کا دوسرا طریقہ تعزیری عمل ہے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب کہ حکومت اسلامی ہو اور وہ اسلامی احکام کا نفاذ کرے اور پھر ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف تعزیری کاروائی کرے، کسی بھی ملک وقوم کے لیے معاشی مسائل بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، اگر یہ نظام درست ہوجائے، تو لوگوں کے بیشتر دنیوی مسائل حل ہوجاتے ہیں، اسلام کے اقتصادی نظام میں سود ایک بنیادی رخنہ ہے۔ جسے دور کیے بغیر لوگوں کی معاشی حالت درست نہیں ہوسکتی، لہٰذا ایک اسلامی حکومت کا اولین فریضہ ہے کہ ملک کو سود کی لعنت سے پاک کرے اور اس راستے میں آنے والے ہر روڑے کو ہٹا دے اور یہ چیز تعزیری قوانین کے ذریعے حاصل ہوگی۔(۲۷۳)(معالم العرفان:۳/۵۸۹،۵۹۸)

حرمت رباء:

سورۂ بقرہ میں جو شرعی مسائل بیان کیے گئے ہیں، ان میں ہمارے دور کا ایک اہم مسئلہ ''حرمت ربا'' بھی ہے۔

سودخور کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو جنات اور شیاطین کے اثرات کی وجہ سے خبطی اور دیوانہ ہوجاتا ہے، دنیا میں بھی سودخور کا حال خبطیوں اور پاگلوں جیسا ہوتا ہے، قیامت کے دن وہ قبر سے بھی یونہی کھڑا ہوگا، اس کے بعد سود

پر ایسی وعید سنائی گئی ہے کہ اس جیسی وعید کسی بڑے سے بڑے گناہ پر بھی قرآن میں نہیں آئی۔

ارشاد ہوتا ہے: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور لوگوں پر تمہارا جو سود باقی رہ گیا ہے، اگر تم واقعی مومن ہو تو اسے چھوڑ دو لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر تمہارے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔" (۲۷۸۔۲۷۹)

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ قرآن نے صدقہ کے فضائل وآداب بیان کرنے کے بعد ربا کے نقصانات اور تباہ کاریاں بیان کی ہیں، اصل میں صدقہ اور ربا دو متضاد نظام ہیں۔

صدقہ میں احسان، پاکیزگی اور تعاون کا جذبہ ہوتا ہے۔ جبکہ ربا میں بخل، گندگی اور خودغرضی پوشیدہ ہوتی ہے، صدقہ میں دیا ہوا مال واپس لینے کی نیت نہیں ہوتی جبکہ ربا میں اصل زر سے بھی زیادہ لینے کی شرط ہوتی ہے، صدقہ سے آپس کی محبت بڑھتی ہے جبکہ ربا سے باہمی نفرت میں اضافہ ہوتا ہے، صدقہ کرنے والے کے لیے اللہ کی محبت کا اعلان اور مغفرت کا وعدہ ہے جبکہ سودخور پر لعنت کی وعید اور اعلان جنگ ہے، سود کے نفسیاتی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی نقصانات اتنے واضح ہیں کہ اب سود کے حامی بھی دبی دبی زبان سے ان کا اعتراف کرنے لگے ہیں۔

اللہ کے عطا کردہ مال وجائیداد اور زمین سے حاصل شدہ غلوں اور فصلوں میں سے پاکیزہ چیزیں اللہ کے نام پر دینی چاہئے، گھٹیا اور بیکار چیزیں جب اپنے لئے پسند نہیں کرتے تو اللہ کے نام پر کیوں دیتے ہو؟ صدقہ وخیرات کرنے پر شیطان غربت اور پیسہ کی کمی سے ڈراتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ مال میں برکت اور گناہوں کی معافی کا وعدہ کرتے ہیں۔ حکمت ودانائی اللہ کی عطاء ہے جسے حکمت مل جائے اسے بہت بڑی خیر میسر آ گئی۔ کھلے عام اور چھپا کر موقع محل کے مطابق دونوں طرح صدقہ کرتے رہنا چاہیے۔ دین دار غرباء جو اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے مانگتے نہیں ہیں وہ آپ کے مالی تعاون کے زیادہ مستحق ہیں۔ عدل وانصاف پر مشتمل معاشی نظام کے لئے رہنما اصول، غریب اور چھوٹے تاجروں کے لئے زہر قاتل اور تجارت کے لئے "رِستا ہوا ناسور" یہودی ذہنیت کی بدترین پیداوار "سودی نظام" کے تباہ کن عواقب ونتائج سے آیت نمبر ۲۷۵ سے آیت نمبر ۲۸۰ تک خبردار کرتے ہوئے سختی کے ساتھ اس سے باز رہنے کا حکم دیا ہے اور سودخوری سے بچنے کو ایمان کا تقاضا قرار دیا اور سودی نظام کو جاری رکھنے کو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے مترادف قرار دیا ہے۔ یوم احتساب یعنی قیامت کی یاددہانی کراتے ہوئے آیت نمبر ۲۸۱ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس دن سے ڈرو جب تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور ہر شخص کو نیک وبد اعمال کا پورا پورا حساب دینا ہوگا۔ کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ یہ قرآن کریم کی نزول کے اعتبار سے آخری آیت ہے اور اس میں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اس دنیا سے ارتحال کا اشارہ بھی موجود ہے۔ آیت نمبر ۲۸۲ کمیت کے اعتبار سے قرآن کریم کی سب سے بڑی آیت ہے۔

(خلاصۂ قرآن از مفتی عتیق الرحمٰن: ۲۰، ۲۲، ۲۳)

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ سورہ بقرہ سب سے لمبی سورہ ہے۔اور اس میں مختلف الانواع مسائل ذکر ہوئے ہیں۔اس سورہ میں عبادات، معجزات اور معاملات کا بیان ہے۔خصوصاً معاملات کی بہت سی تفصیلات ہیں۔عائلی قوانین یعنی نکاح وطلاق کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ احکام کی تعمیل نفس پر شاق گزرتی ہے، انسان کا نفس اور اس کی سوچ بوجھل ہوجاتی ہے۔خصوصاً جان و مال کی قربانی پیش کرتے وقت بڑی دشواری پیش آتی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس قربانی کے لیے خاص تاکید فرمائی ہے اور اکثر لوگ جان و مال کی وجہ سے ہی معصیت میں مبتلا ہوتے ہیں۔محبت کسی نفس کی ہو یا مال کی، یہ انسان کو قانون کی خلاف ورزی پر ابھارتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر جان کو کھپانے کا حکم دیا ہے اور دوسری جگہ مال خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے۔بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جان کو لگا دینا نسبتاً آسان سمجھتے ہیں۔مگر مال کے خرچ کرنے میں بخیل واقع ہوتے ہیں، یہ ایک روحانی بیماری ہے۔حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد ہے: ایّ داء ادوٰ من البخل بخل سے بڑی بیماری کون سی ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کے متعلق خصوصی احکام دیے ہیں۔مال پر بہت سی عبادت موقوف ہیں، اگر مال خرچ نہیں کیا جائے گا تو جہاد بھی نہیں ہوسکتا۔زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، حج نہیں ہوسکتا۔

مالی معاملات:

ربا کی حرمت کا حکم بیان کرنے کے بعد دَین، تجارت، باہمی لین دین اور رہن کے احکام بیان کیے گئے ہیں، یہ احکام جس آیت کریمہ میں بیان کیے گئے ہیں وہ قرآن کریم میں سب سے طویل آیت ہے۔

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مالی معاملات کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اور یہ کہ اسلام دین اور دنیا، عبادت اور تجارت، جسم اور روح سب کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔اس آیت کریمہ میں جو احکام دیے گئے ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

ادھار کے تمام معاملات میں تحریری دستاویز تیار کرلینی چاہیے۔

جب ادھار کا معاملہ کیا جائے تو اس کی میعاد ضرور مقرر کرلی جائے اور میعاد بھی ایسی مقرر کی جائے جس میں کوئی ابہام نہ ہو۔

دوران سفر اگر دستاویز کی تیاری ممکن نہ ہو تو رہن رکھ کر بھی قرض لیا جاسکتا ہے۔

دست بدست تجارت کی صورت میں تحریر ضروری نہیں۔

(خلاصۃ القرآن: م اش)

’’ان تضل‘‘ بھول جائے شہادت کے کسی حصہ کو۔واقعہ کے کسی جزء کو، رہا یہ امر کہ عورت کی شہادت مرد کے مقابلہ میں ضعیف کیوں مانی گئی ہے۔اور نسیان کا احتمال مرد کی شہادت میں کیوں نہیں رکھا گیا؟ تو یہ سوالات ذہن واخلاق کی دنیا میں بالکل ایسے ہی ہیں جیسے جسم و مادیات کی دنیا میں دریافت یہ کیا جائے کہ حمل ورضاعت کا تعلق صرف عورت ہی سے کیوں رکھا گیا اور مرد کو باوجود اس کے قوت وجسامت کے اس بار کے برداشت کے کیوں نا قابل سمجھ لیا گیا؟ یہ فاطر

کائنات ظاہر ہے کہ جسمیات و مادیات کے ایک ایک دانہ سے واقف ہے۔اس کے پیش نظر ذہنیات واخلاقیات کی بھی باریک سی باریک حقیقتیں ہیں۔مغرب کے ماہر نسائیات ہیولاک ایلز Hoolock Ellis نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ عورت کے لیے دھوکہ اور فریب بہ منزلہ امر طبعی کے ہوتا ہے۔(۲۸۲)(تفسیر ماجدی:۱/ ۵۳۲)

امور معاشرت تمدن کی تکمیل:

یہ پوری آیت قرآن کریم کی تمام آیتوں سے بڑی آیت ہے۔اس پوری آیت میں دین یعنی ادھار کے لین دین کے احکام، اس کی کتابت اور اس پر شہادت وغیرہ کے احکام مذکور ہیں۔گویا اس آیت میں امور معاشرت اور تمدن کی تکمیل، باہمی صلح اور میل ملاپ، دیانت اور سچائی اور بندوں کی مصالحت کا ایک بے بہا خزانہ مضمر ہے جو دنیا کا کوئی قانون آج تک پیش نہ کرسکا، نہ پیش کرسکتا ہے۔یہ کمالات شریعت اسلامیہ ہی کے احکامات میں ہیں۔مگر اس بدنصیبی کو کیا کہئے کہ جو آج خود مسلمانی کا دعوی کرنے والوں کو اس کی قدر و منزلت نہیں اور اتباع شریعت سے جس کا نام از روئے حقارت ''ملا پن'' رکھ لیا ہے دور بھاگتے ہیں۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اُدھار لین دین کے اصول وضوابط:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ

آیت کے اس جزو سے ایک وقت مقررہ کے لئے ادھار کرنے کے معاملہ کا جواز بیان کیا گیا۔آیت میں ادھار کے معاملہ کے لکھنے کا جو حکم ہے تو جمہور علماء کے نزدیک یہ لکھنا مستحب ہے، فرض و واجب کے درجہ میں نہیں۔اس لئے اگر کوئی نہ لکھے لکھاوے تو گنہگار نہیں۔یہ حکم لکھنے کا استحبابی ہے۔

(۱) جب آپس میں ادھار کا کوئی معاملہ کسی معین مدت کے لئے کیا جائے تو اس کو لکھ لیا جائے۔(۲) جب ادھار کا معاملہ کیا جائے تو اس کی میعاد ضرور مقرر کی جائے۔غیر معین مدت کے لئے ادھار لینا دینا جائز نہیں کیونکہ اس سے جھگڑے فساد کا دروازہ کھلتا ہے۔(۳) کاتب یعنی ادھار کا معاملہ لکھنے والے کو ہدایت کی گئی کہ انصاف کے ساتھ غیر جانبدار ہوکر لکھے اور لکھنے سے انکار نہ کرے۔یہ کاتب کو لکھنے کا حکم اور انکار سے ممانعت بھی استحباب کے درجہ میں ہے۔اس واسطے گر کاتب لکھنے پر اجرت لے تو جائز ہے۔

(۴) دستاویز کی کتابت اس شخص کے ذمہ ہے کہ جس کے ذمہ ادھار ہے۔(۵) اگر ادھار کا معاملہ کسی خفیف العقل سے ہے یعنی ادھار لینے والا اگر مجنون ہے کہ جو نیم پاگل ہو یا نابالغ بچہ ہو یا بہت بوڑھا ہو جو سٹھیا گیا ہو تو ایسی صورت میں ان کی طرف سے ان کے ولی یا سرپرست یا وکیل ومختار کو انصاف کے ساتھ معاملہ لکھنے یا لکھا دینے کا حکم دیا گیا۔ان لوگوں کے لئے ایسے معاملات شرعاً صحیح ونافذ ہونے کے لئے ولی شرعی کی اجازت درکار ہے۔(۲۸۲)(درس قرآن، پارہ:۳،ص:۳۹)

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ کسی چیز کی تخصیص کی تین وجوہات ہوسکتی ہیں۔جن کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ فلاں چیز کو

فلاں کے ساتھ خصوصیت حاصل ہے۔ تخصیص کی پہلی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کا بنانے والا ہو، مثلاً اگر کوئی شخص کوئی برتن، مشینری اوزار بناتا ہے تو اس کے حق میں وہ چیز خاص ہوتی ہے۔ خصوصیت کی دوسری وجہ ملکیت ہوتی ہے، جس چیز کا کوئی مالک ہے، اسے اس کے ساتھ تخصیص حاصل ہے اور تیسری وجہ حق تصرف ہے، جس شخص کو کوئی چیز تصرف میں لانے کا حق ہے اس کو بھی خصوصیت حاصل ہے۔ (۲۸۴) (معالم العرفان: ۳/۶۲۷)

مدح صحابہ کرام:

یہاں جو طرز بیان مدح صحابہ میں اختیار کیا گیا کہ پہلے آن حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایمان کا ذکر فرمایا گیا، تو علماء نے لکھا ہے کہ مقصود تو اس مقام پر مدح مومنین کی تھی لیکن ان کی تقویت مدح کے لئے ان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی شامل کر دیا، جس میں اشارہ اس طرف ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایمان کا کامل ہونا تو بلاشبہ یقینی ہے۔ اسی طرح صحابہ کا ایمان بھی کامل ہونے کی وجہ سے اس قابل ہے کہ ایمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذکر میں اس کا ذکر کیا جاوے، گو دونوں کا کامل ہونا ایک مرتبہ میں نہ ہو۔ صحابہ کا کامل ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اکمل یعنی بہت ہی کامل۔

پھر دوسری بات جس پر صحابہ کرام کی مدح فرمائی گئی یہ بتلائی گئی کہ پچھلی امتوں کی طرح یہ ایسا نہ کریں گے کہ اللہ کے رسولوں میں باہمی تفرقہ ڈالیں کہ بعض کو نبی مانیں اور بعض کو نہ مانیں، جیسا یہود نے حضرت موسی علیہ السلام کو نبی مانا اور حضرت عیسی علیہ السلام کو نہ مانا یا جیسا نصاری نے حضرت عیسی علیہ السلام کے کو نبی مانا لیکن نبی آخرالزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا رسول نہ مانا، لیکن صحابہ کی یہ مدح فرمائی گئی کہ ہم اللہ کے کسی رسول کا انکار نہیں کرتے۔ پھر تیسری بات جس پر صحابہ کرام کی تعریف فرمائی گئی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے موافق ان کا بخوشی زبان سے سمعنا وأطعنا غفرانك ربنا وإليك المصير کہنا تھا، یعنی ہم نے حکم سنا اور خوشی سے مانا، ہم آپ کی بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار، اور آپ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

آیت سے واضح ہو گیا کہ ایمان کے ضروری ارکان چار ہیں (۱) ایمان باللہ (۲) ایمان بالملائکہ (۳) ایمان بالکتب (۴) ایمان بالرسل۔ (۲۸۵) (درس قرآن، پارہ: ۳، ص: ۴۹)

سورہ بقرہ کی خصوصیت حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سورہ بقرہ کو فسطاط القرآن فرمایا ہے۔ یعنی یہ سورہ قرآن پاک کا بڑا خیمہ ہے، جس طرح ایک بڑے خیمے میں بہت سے ساز وسامان رکھنے اور رہائش کی گنجائش ہوتی ہے۔ اسی طرح اس سورہ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے نظام خلافت کبریٰ کے تمام اصول وفوائد بیان کر دیے ہیں۔ اس سورہ میں دعوت الی التوحید والرسالت کا بیان ہے، قرآن کریم کی حقانیت اور صداقت بیان کی گئی ہے۔ فرائض خمسہ کے علاوہ جہاد، نظام سلطنت اور بے شمار مثالیں اور حکمت کی باتیں اس سورہ میں پائی جاتی ہیں، اس لیے اسے فسطاط القران کہا گیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں اس سورہ کو سنام القرآن یعنی قرآن کی کوہان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس طرح اونٹ کی کوہان

سب سے بلند ہوتی ہے۔اسی طرح قرآن پاک میں یہ سورہ بلند مرتبہ رکھتی ہے۔اس سورہ مبارکہ کی آخری دو آیتیں حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کومعراج کے موقع پر عطا ہوئی تھیں۔ امن الرسول سے لیکر قوم الکفرین تک کی آیتیں معراج کا خاص تحفہ ہے۔ پانچ نمازیں بھی معراج کا تحفہ ہے جو حضور امت کے لیے لائے اور تیسرا تحفہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ لائے کہ میری امت کا جو شخص خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائے گا اس کی غلطیوں کو معاف کردیا جائے گا۔ ان آیات کی اہمیت اسی امر سے واضح ہے کہ ان میں اسلام کے ارکان خمسہ کا بیان ہے جو سب سے اہم چیز ہیں اور پھر اس میں اللہ کی مناجات ہے اور اس سے دعا کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔فضائل آیات آخر سورہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص ان آیات کو رات کے وقت تلاوت کرے گا۔ یہ آیات اس کے لیے ساری رات کی عبادت کے قائم مقام ہو جائیں گی۔ یا فرمایا: تہجد کے قائم مقام ہوں گی بشرطیکہ انسان فرائض کا پابند ہو اور خلوص نیت کے ساتھ تلاوت کرے، یہ بڑی فضیلت والی آیتیں ہیں، انہیں ورد کے طور پر اختیار کر لینا چاہیے۔ایک روایت میں یوں آتا ہے کہ عرش معلیٰ کے نیچے اللہ تعالیٰ کا ایک خزانہ ہے،سوۃ بقرہ کی یہ آخری دو آیتیں اللہ تعالیٰ نے اس خزانہ میں سے نازل فرمائی ہیں۔ان آیات کی اس قدر فضیلت ہے۔**سبحانک اللھم و بحمدک**۔(۲۸۴)(معالم العرفان:۳/۷۶۴)

اخیر میں بتایا کہ اللہ کسی کو اس کی طاقت برداشت سے زائد کا حکم نہیں دیتا (لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اپنی طاقت برداشت کا اندازہ خود انسان نہیں کرسکتا کیونکہ وہ اولاتو جسمانی مشین کا بنانے والا نہیں کہ جان سکے کہ کتنا بار اٹھانے کی اس میں صلاحیت و طاقت ہے اور پھر نفس کے بہکاوے میں آکر یہ حیلہ و بہانہ کرسکتا ہے کہ یہ ہماری طاقت برداشت سے زائد ہے،اس کا اندازہ اور علم خدا ہی کو ہے، کیونکہ وہی خالق ہے اور کسی مشین کا بنانے والا ہی جان سکتا ہے کہ اس مشین میں کتنے وزن اٹھانے کی پاور ہے)۔

پھر ان مومنین کا یہ طرز عمل بتایا ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ کی جانب رجوع کرتے رہتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ انسان خطا ونسیان سے مرکب ہے، اس لئے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو معاف فرما، ہم پر ہماری طاقت برداشت سے زیادہ بوجھ نہ ڈال، ہم سے درگذر کر، ہماری مغفرت فرما، ہم پر رحم فرما، کیونکہ تو ہی ہمارا آقا و مالک ہے اور دین کو سربلند کرنے میں ہماری مدد فرما۔اسی طرح رسول ﷺ اور ان مومنین کے طرز عمل کا گویا ایک نقشہ کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے، تا کہ ہر زمانے کے مسلمان اس کے مطابق اپنے عقیدہ و مسلک اور اپنے عمل کو بنائیں اور استوار کریں۔

چونکہ سورۂ بقرہ میں نماز، زکوۃ، حج، روزہ، جہاد،صدقہ، ربا،طلاق اور عدت جیسے متعدد شرعی احکام بیان ہوئے ہیں، اس لیے سورت کے اختتام پر یہ وضاحت کردی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی انسان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

یونہی سورت کا اختتام جامع ترین دعا پر کیا گیا ہے، جس میں مسلمانوں کو سکھایا گیا ہے بارگاہ الٰہی میں یوں درخواست کیا کریں کہ اے اللہ! اگر احکام کی تعمیل میں ہم سے کوئی غلطی ہو جائے تو معاف کردینا۔

جب تک مسلمان، احکام الہیہ پر اپنی استطاعت کے مطابق عمل کرنے کے ساتھ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر استغفار کرتے رہیں گے، نیز وہ اللہ تعالی سے دعا اور التجا کرتے رہیں گے تو ان شاء اللہ یہود جیسے انجام بد سے بچے رہیں گے۔

(خلاصۃ القرآن)

خلاصہ رکوع (۳۴)......فرائض خلیفہ، خلیفہ کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ حفاظت توحید میں اپنی اور اپنے متبعین کی جان اور مال خرچ کردے۔ ماخذ: آیت: ۲۵۴، ۲۵۵۔

خلاصہ رکوع: (۳۵)......واقعات مؤید و توحید کی نشر و اشاعت بھی خلیفہ ہی کے ذمہ ہے، یعنی مسلمانوں کے خلیفہ کو چاہئے اس قسم کے واقعات کی (یعنی جو اس رکوع میں مذکور ہیں) نشر و اشاعت کرتے تا کہ مؤمنوں کو مزید اطمینان حاصل ہو اور شاید مخالفین کو بھی اس سے کچھ فائدہ پہنچ جائے۔ ماخذ: ۲۵۸،، ۲۵۹، ۲۶۰۔

خلاصہ رکوع : (۳۶)......فرض معاونین خلافت اور شرائط، انفاق فی سبیل اللہ کی شرائط اربع من الخمسہ ، یعنی معاونین خلافت دو قسم کے ہوں گے، اہل دولت اور اہل علم۔ اس رکوع میں اہل دولت کے فرائض مذکور ہیں اور دولت خرچ کرنے کی چار شرطیں مذکور ہیں۔ ماخذ: آیت: ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۴، ۲۶۵۔

خلاصہ رکوع: (۳۷)......انفاقِ مال کی پانچویں شرط یعنی عمدہ چیزیں اللہ کے نام دو۔ اور اہل علم کے فرض کی طرف اشارہ۔ ماخذ: آیت: ۲۶۷، ۲۶۹۔

خلاصہ رکوع: (۳۸)......انفاق فی سبیل اللہ کی ضد یعنی سود خوری کی ممانعت۔ ماخذ: آیت: ۲۷۸۔

خلاصہ رکوع: (۳۹)......قانون دین۔ ماخذ: آیت: ۲۸۲۔

خلاصہ رکوع: (۴۰)......شوری خلافت کا تعلق باللہ۔ ماخذ: آیت: ۲۸۴۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ آل عمران

تیسرے پارہ کے آٹھ رکوع تو سورۂ بقرہ پر مشتمل تھے، اب نویں رکوع سے سورۂ آل عمران کا آغاز ہوتا ہے، یہ سورت بالاتفاق مدنی ہے، اس میں بیس رکوع اور دوسو آیات ہیں، چونکہ اس سورت میں حضرت عمران علیہ السلام کے خاندان کا قصہ بیان کیا گیا ہے، اس لیے اس کا نام "آل عمران" رکھ دیا گیا، اس سورت کی فضیلت کے بارے میں صحیح مسلم میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ دو روشن سورتیں یعنی بقرہ اور آل عمران پڑھا کرو"۔

خود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان دونوں سورتوں کو "زہراوین" (دو روشن چیزیں یا شمس وقمر) قرار دینا بھی ان کے درمیان مناسبت کو ظاہر کرتا ہے، علاوہ ازیں ان دونوں سورتوں میں اہل کتاب سے خطاب ہے، مگر سورہ بقرہ میں زیادہ تر روئے

سخن یہود کی طرف تھا، جبکہ آل عمران میں اصل خطاب نصاریٰ سے ہے، پھر یہ کہ دونوں سورتوں کا آغاز حروف مقطعات میں سے ''الم'' کے ساتھ ہوا ہے۔ اور دونوں ہی سورتوں کی ابتداء میں قرآن کریم کی حقانیت کو بیان کیا گیا ہے، اور دونوں سورتوں کے اختتام پر جامع قسم کی دعائیں منقول ہیں۔ (خلاصۃ القرآن)

یہ قرآن مجید کی تیسری سورت ہے اور پوری سورت مدنی ہے، بالاتفاق اس میں دوسو آیتیں ہیں اگر چہ ترتیب کے اعتبار سے یہ سورت پہلے ہے، لیکن کہا جاتا ہے کہ نازل ہونے کے اعتبار سے یہ سورہ انفال کے بعد ہے، اس کی ابتدائی ۸۳ آیتیں نجران کے عیسائی وفد کے سلسلہ میں نازل ہوئیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بعض حصہ مدنی زندگی کے اخیر میں نازل ہوا ہے؛ کیوں کہ یہ وفد آپ ﷺ کی خدمت میں ۹ ہجری میں آیا تھا، اس سورت میں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کا واقعہ تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، حضرت مریمؓ عمران کی بیٹی تھیں، اسی مناسبت سے اس سورت کا نام آل عمران ہے، اس سے قرآن مجید کی بے تعصبی بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہود و نصاری کے قرآن سے بغض رکھنے کے باوجود قرآن کی متعدد سورتیں بنی اسرائیل کی شخصیتوں سے منسوب ہیں، جن میں ایک یہ بھی ہے۔

سورۂ بقرہ اور اس سورہ کے درمیان کئی مناسبتیں ہیں، جیسے سورۂ بقرہ میں حضرت آدمؑ کی غیر معمولی طریقہ پر تخلیق کا ذکر ہے، اس سورت میں حضرت عیسیٰؑ کی تخلیق کا تذکرہ ہے، سورۂ بقرہ میں یہود کی فکری اور عملی کمزوریوں پر گفتگو کی گئی ہے اور سورہ آل عمران میں عیسائیوں سے مباحثہ ہے، غالباً اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں سورتوں کی فضیلت ایک ساتھ بیان فرمائی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا ''زہراوین'' یعنی بقرہ و آل عمران کو پڑھا کرو، یہ دونوں قیامت کے دن بادل کے ٹکڑوں یا صف بستہ پرندوں کے گروہوں کی شکل میں اپنے قاریوں پر سایہ فگن ہوں گی (**مسلم، باب فضل قراءۃ القرآن وسورۃ البقرۃ، حدیث نمبر : ۱۸۷۴**) ''زہراوین'' کے معنی دو روشن چیزوں کے ہیں، یعنی ان دونوں سورتوں میں ہدایت کی بھرپور روشنی موجود ہے۔

اس سورت میں زیادہ تر اعتقادات یعنی اللہ تعالی کی توحید، نبوت، قرآن مجید کی صداقت، محمد رسول اللہ کی رسالت اور حضرت مسیح کی عبدیت و بندگی وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان حقیقتوں کو سمجھنے کے لئے کائنات میں غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اس کے علاوہ حج و جہاد کی فرضیت اور سود کی حرمت وغیرہ کے احکام بھی آئے ہیں، اس سورت کے اور نام بھی مفسرین نے ذکر کئے جن میں زہرا، استغفار اور طیبہ بھی ہے۔ (البحر المحیط: ۲/ ۳۷۳) (آسان تفسیر: ۲۲۸)

سورہ آل عمران مدنی سورۃ ہے اور اس میں ۲۰ رکوع اور ۲۰۰ آیات ہیں، کیونکہ اس میں حضرت عمران (عمران حضرت موسی علیہ السلام کے والد کا نام بھی تھا اور حضرت مریم کے بھی والد کا نام تھا، لیکن دونوں میں ۱۸۰۰ سال کا فرق ہے، یہاں دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں) کے خاندان کا تذکرہ ہے، اس لئے اس کا نام ''آل عمران'' ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن قرآن پاک کو لایا جائے گا اور قرآن والوں کو بھی لایا جائے گا

جواس پر عمل کرتے تھے۔ان کے آگے آگے سورہ بقرہ اورسورہ آل عمران ہوں گی جودو بادلوں کی طرح یا دوسائبانوں کی طرح ہوں گی جن کا سایہ خوب گھنا ہوگا اوران کے درمیان خوب روشنی چمک رہی ہوگی۔(مسلم)

چوتھے رکوع میں اللہ تعالی نے فوز وکامیابی کواللہ ورسول کی اطاعت کے ساتھ لازم قرار دینے کے بعد حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم اورآل عمران کا تذکرہ فرمایا کہ اللہ تعالی نے ان سب کو بزرگی اور فضیلت عطا فرمائی۔(خلاصہ مضامین قرآن کریم:۳۵،۳۶،۳۹)

سابق سورت سے ربط:

اس سورۃ کا ربط پہلی سورۃ کے ساتھ یہ ہے کہ پہلی سورۃ کو "**فانصرنا علی القوم الکافرین.**" پرختم کیا گیا ہے جس کا حاصل محاجہ لسانی وسنانی میں غلبہ کا سوال ہے، اس پوری سورۃ کا حاصل بھی یہی مضمون ہے، اہل کتاب کے ساتھ محاجہ کا اس سورۃ میں ذکر ہے جس کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ ان کواسلام کے بنیادی مسئلہ توحید میں اختلاف تھا ،یہی وجہ ہے کہ اس سورۃ کوتوحید کے مضمون سے شروع فرمایا گیا۔

شان نزول:

ابن جریرؒ اور محمد ابن اسحقؒ وغیرہ محدثین نے روایت بیان کی ہے کہ نجران جو مدینہ طیبہ سے چند منزل کے فاصلہ پر ایک جگہ ہے، وہاں سے ساٹھ افراد پر مشتمل نصاری کی ایک جماعت (جن کا لاٹ پادری عبدالمسیح اوراس کا وزیراعظم اور پوپ اعظم ابوحارثہ ابن علقمہ تھا،اس کی شاہ روم کے یہاں بڑی عزت وتوقیر تھی اور کلیسائے عرب کی سیادت بھی اس کو حاصل تھی) مدینہ طیبہ میں آئی۔راستہ میں ابوحارثہ کے خچر نے ایک ٹھوکر کھائی جس پر اس کا بھائی کرز کہنے لگا کہ جس آدمی کے پاس ہم جارہے ہیں وہ (العیاذ باللہ) بے برکت ہے؛لیکن ابوحارثہ نے اس پر خفگی کا اظہار کیا اور کہا: واللہ وہ شخص جس کے پاس ہم جارہے ہیں وہ نبی ہے،جس کی بشارت حضرت موسی علیہ السلام نے توریت میں دی ہے اور حضرت مسیح بھی مصلوب ہونے کے وقت اس کی بشارت دے گئے، حضرت مسیح اور یوحنا کے وقت سے اب تک ان کا انتظار تھا، اس پر کرز نے کہا کہ پھر آپ اس کے دین کو کیوں نہیں قبول کر لیتے ؟ابوحارثہ نے کہا کہ پھر بادشاہ کا تقرب اورعزت ودولت سب ختم ہوجائے گا،غرضیکہ یہ سب مناظرہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کوان کے مرتبہ سے بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔کبھی کہتے کہ وہ "اللہ" ہیں، کبھی کہتے کہ وہ "ابن اللہ" ہیں اور کبھی کہتے کہ الوہیت کے مثلث (باپ، ماں اور بیٹا) کا ایک حصہ ہیں۔حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے انہیں مسکت جواب دیتے ہوئے فرمایا: اللہ تعالیٰ زندہ جاوید ہیں، ان پر موت طاری نہیں ہوسکتی، جبکہ عیسیٰ (علیہ السلام) پرموت طاری ہوکر رہے گی۔ بیٹا اپنے باپ کے مشابہ ہوتا ہے جبکہ عیسیٰ (علیہ السلام) میں اللہ تعالیٰ کی مشابہت نہیں، اللہ تعالیٰ کھاتے پیتے نہیں جبکہ عیسیٰ (علیہ السلام) کھاتے پیتے ہیں۔اللہ تعالیٰ سے آسمان کی بلندیوں اور زمین کی پنہائیوں میں کوئی چیز مخفی نہیں

جبکہ عیسیٰ (علیہ السلام) سے بے شمار چیزیں مخفی ہیں۔ اس پر وہ لاجواب ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تائید میں یہ سورت نازل فرمائی۔ ابتداء میں اللہ کی وحدانیت اور قرآن کریم، تورات اور انجیل کی حقانیت کو بیان کیا اور اللہ کی آیات کے منکروں کو عذاب شدید سے ڈرایا۔ علم الٰہی کی وسعتوں کو بیان کیا۔ قدرت کے تخلیقی شاہکار انسان کے رحم مادر میں تیاری کے مرحلہ کو بیان کیا اور بتایا کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ ہی نے نازل فرمایا ہے، جس میں محکم اور واضح معنی ومفہوم رکھنے والی آیات بھی ہیں اور متشابہات بھی ہیں، جن کے معنی ومفہوم ہر شخص پر واضح نہیں ہوتے، لیکن اگر متشابہہ آیات پر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بیان کردہ ضوابط کی روشنی میں غور کریں تو ان کے معنی واضح ہو سکتے ہیں، مگر جو لوگ ضلالت وگمراہی کے مریض ہیں وہ ان آیات کو من مانے معنی پہنا کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسی آیات کو اللہ کی طرف سے یقین کر کے ان پر مکمل ایمان رکھنا چاہیے۔

فائدہ:

نبی ﷺ نے دلائل واضحہ کے بعد فرمایا: اگر اب بھی دل میں کچھ کھٹک ہو تو میں مباہلہ کے لئے تیار ہوں، غرضیکہ جب لاجواب ہو کر انہوں نے مہلت مانگی اور دل میں کہنے لگے کہ یہ شخص بلاشبہ اللہ کا رسول ہے اور مباہلہ کا انجام ہمارے حق میں تباہ کن ہوگا، چنانچہ انہوں نے آپ سے ایک معتدبہ مقدار جزیہ پر صلح کر لی، اس سلسلہ میں سورۃ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں، جن میں توحید خداوندی کا اثبات ہے۔

مباہلہ کا بیان قرآن کریم کی آیت: ''قل تعالوا ندع ابناءنا وابناء کم'' میں ہے، جس کا طریق یہ ہے کہ فریقین کسی جگہ پر اپنی اولاد اور ازواج کے ساتھ جمع ہو جائیں اور یوں دعا کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو، یہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کا ایک معجزانہ طریق تھا، اگر وہ لوگ مباہلہ کرتے تو سب کے سب ہلاک ہو جاتے۔

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن، خلاصۂ قرآن از مفتی عتیق الرحمٰن: ۲۰، ۲۲، ۲۳)

مورخین کے اقوال، سیرت کی کتابوں اور ذخیرہ احادیث سے وفدِ نجران کی آمد کے دو مقاصد سمجھ میں آتے ہیں۔ پہلا مقصد تو سیاسی تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب مکہ فتح ہو کر عرب کی پوری سرزمین اور یمن کے کچھ علاقے بھی مسلمانوں کے تسلط میں آچکے تھے اور نجران کے یہ عیسائی بھی مسلمانوں سے خائف تھے۔ ادھر مدینہ طیبہ کے گرد یہودیوں کی اکثریت تھی۔ جن میں تین خاندان بنو قریظہ، بنو نضیر اور بنو قینقاع خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ بڑے متعصب یہودی تھے۔ سود خور اور سازشی ذہن کے حامل تھے۔ ان کی اسی خباثت کی وجہ سے ان میں سے دو قبیلوں یعنی بنو نضیر اور بنو قینقاع کو جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ تیسرے قبیلہ؛ بنو قریظہ کا فیصلہ جنگ خندق کے بعد کیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے اس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ غداری کی تھی۔ چنانچہ جنگ کے بعد ان کا مسئلہ پیش ہوا کہ وہ اپنی سزا خود ہی تجویز کریں۔ انہوں نے حضرت سعد بن معاذ کو اس سلسلے میں حکم تسلیم کیا، جنہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ ان کے تمام مردوں کو ۔جن کی تعداد چار سو یا چھ سو تھی۔ قتل کر دیا جائے

،ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے ،اور ان کے اموال مسلمانوں میں تقسیم کردیے جائیں۔ چنانچہ اس فیصلے پر عمل کر کے ان کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردیا گیا۔اس موقع پر حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا تھا کہ سعد کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق ہے۔ان تاریخی واقعات سے نجران کے عیسائی سخت خائف تھے کہ کہیں مسلمان ان کے ساتھ بھی یہودیوں جیسا سلوک نہ کریں۔لہذا انہوں نے اس وفد کے ذریعے مسلمانوں سے صلح کرنے اور ان سے امان حاصل کرنے کی کوشش کی۔اور جزیہ ادا کر کے مسلمانوں کے زیر تسلط اپنے ہی علاقے میں آباد رہنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

وفد نجران کی آمد کا دوسرا بڑا مقصد عیسائیت کی تبلیغ تھا۔مسیح (علیہ السلام) کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں یا تین خداؤں میں سے تیسرے ہیں یا وہ خود خدا ہیں۔اس عقیدے پر وہ حضور ختم المرسلین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے بحث مباحثہ کرنا چاہتے تھے۔(معالم العرفان: ۴/ ۲۷)

خطاب : سورۃ کا خطاب خصوصیت کے ساتھ دو گروہوں کی طرف ہے ۔ایک اہل کتاب یعنی یہود و نصاری ، دوسرے مومنین پہلے گروہ کو اس طرز پر تبلیغ کی گئی ہے جس کا سلسلہ سورہ بقرہ سے شروع کیا گیا تھا، دوسرے گروہ کو اس سلسلے میں مزید ہدایات دی گئی تھیں جو سورہ بقرہ میں شروع ہوا تھا، ساتھ ہی اس سورۃ میں غزوہ احد کی سرگذشت پر ایک مفصل تبصرہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ فتح کو شکست میں تبدیل کردینے والی کونسی خامیاں تھیں اور ان خامیوں کا علاج کیا ہے۔

زمانہ نزول: مدنی سورت ہے،سورۃ کی مختلف تقریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے چار حصے ہیں:

(۱) آغاز سورۃ سے چوتھے رکوع کی ابتدائی دو آیات تک ، یہ غالباً غزوہ بدر کے بعد قریبی زمانے میں نازل ہوئی۔

(۲) چھٹے رکوع کی تیسری آیت سے چھٹے رکوع کے اختتام تک ، یہ ۹ ھ میں وفد نجران کی آمد کے موقع پر نازل ہوئی۔

(۳) ساتویں رکوع سے بارہویں رکوع کے اختتام تک ،اس کا زمانہ بھی پہلی تقریر سے متصل معلوم ہوتا ہے۔

(۴) تیرہویں رکوع سے ختم سورۃ تک غزوہ احد کے بعد نازل ہوئی۔(خلاصۂ مضامین قرآنی: ۶۳، ۶۴)

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ

چونکہ انسان کو اس زمین پر اللہ کا خلیفہ بننا تھا اور نہایت نازک منصب پر فائز ہونا تھا اس لیے اس میں خواہش بھی رکھی گئی اور کچھ ضرورتیں بھی اس کے ساتھ وابستہ کردی گئی ہیں، اس میں جذبات بھی ہیں اور سوز محبت بھی ،احساس الم بھی اور شعور مسرت بھی ، ذوق جستجو اور شوق علم بھی ،وہ زمین کے خزینوں اور دفینوں سے فائدہ اٹھانے اور ان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی پوری صلاحیت وقابلیت رکھتا ہے،تعلیم اسماء کی جو خصوصیت و امتیاز اس کو حاصل ہے وہ دراصل اس کی فطری استعداد کا رمز اور خلافت ارضی کا مظہر ہے۔(ارکان اربعہ: ۳۱)

اس اہم اور نازک منصب کی ذمہ داریوں کو نباہنے اور اس خاص مقصد کی تکمیل کے لئے جس کے لئے اس کی تخلیق کی گئی اس کو اجرام فلکی پہاڑوں ، نباتات ، جمادات کی طرح مسلسل قیام، مسلسل رکوع، مسلسل سجود اور مسلسل تسبیح و ذکر کا پابند

نہیں کیا گیا اور اگر وہ کبھی اس کی کوشش کرے گا تو اس زمین پر اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی حیثیت سے اپنی ناکامی کا ثبوت فراہم کرے گا اوران فرشتوں کے اعتراض کو حق بجانب ثابت کرے گا، جنہوں نے اس کے بجائے اس بنا پر اپنی خدمات پیش کی تھی اور اپنے کو خلافت کا مستحق سمجھا تھا کہ وہ ہمیشہ تسبیح وتحمید اور ذکر وعبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ (ارکان اربعہ: ۳۲)

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جمادات وحیوانات کے برعکس ذوق جمال، حسن ونفاست، قوت نمو اور تنوع وترقی کا ایک ایسا جذبہ رکھا ہے جس کے دم سے زندگی کی یہ رونق قائم اور اس کا خون رواں اور گرم ہے اور اس دنیا کی ساری تعمیر وترقی، تنوع وجدت پسندی اور ایجادات وانکشافات دراصل اسی جذبہ کے مرہون منت ہیں۔

اس کے اندر ایک دوسرے سے تعاون کرنے کا، حقوق کا خیال رکھنے، ملک کے امن وسلامتی کو برقرار رکھنے، اکل حلال اور مشترکہ منافع کے حصول کے لیے مہم جوئی وخطر پسندی کا جذبہ اور شوق پیدا کیا، انسانیت کا کوئی طبقہ اور تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں جو اس جذبہ سے خالی اور اس صلاحیت سے محروم رہا ہو۔

اس حقیقت کے پیش نظر (جو سارے حقائق پر محیط اور دنیا کے تمام دینی، اخلاقی اور معاشی نظاموں میں جاری وساری ہے) قرآن مجید نے تمام انسانی معاملات کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دیا ہے، اور انسان کو صرف ایک چیز کا ذمہ دار بنایا ہے اور وہ چیز ہے منصب خلافت۔

وہ مسلمانوں سے کبھی اس انداز سے مخاطب ہوتا ہے:

وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ؕ (نور: ۳۳) وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ (حدید: ۷)

آیت بالا میں اس کا اعلان صاف طریقہ پر موجود ہے کہ ان تمام اشیاء کا حقیقی مالک اور حقیقی وارث اللہ تعالیٰ ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت وحکمت نے انسان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا اور ان اموال واملاک اور انسانی جد وجہد کے ثمرات ونتائج کو صرف خدا کی طرف منسوب کر کے انسان کو اس سے محروم نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو اس میں تعجب یا چوں وچرا کی کوئی بات نہ تھی لیکن اس سے انسان خود اعتمادی، ولولۂ کار، قوت نمو، جذبۂ مسابقت، ذوق جستجو اور مختصر الفاظ میں زندگی کے اس کیف اور سرور سے محروم ہو جاتا جو اپنی کوشش کے نتائج اور اپنی محنت کا ثمرہ دیکھ کر اس کو حاصل ہوتا ہے۔

یہ وہ فطری لذت ہے جو بچوں کو اپنے گھر اور اپنے والدین کی چیزوں کو اپنی طرف منسوب کرنے سے حاصل ہوتی ہے، اگر انسان اس جذبہ سے محروم ہو جائے تو وہ اخلاص ومحبت، خیر خواہی، ان اموال واملاک کی حفاظت اور ان کی ترقی دینے کی فکر وامنگ سے محروم ہو جائے گا۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مال کا انتساب بار بار انسان کی طرف کیا ہے، اس کے خالق ورازق کی طرف نہیں۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴿۱۸۹﴾

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴿۲۶۲﴾

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ (بقرہ)

غرض قرآن مجید میں اس طرح کی بکثرت آیات موجود ہیں، جن میں نہ صرف مال کی اضافت انسان کی طرف کی گئی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اور وسعت دے کر قرض حسنہ قرار دے دیا ہے، اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اور اس کے بندوں کی بھلائی کے لیے انسان جو کچھ بھی خرچ کرتا ہے، اس کے نزدیک وہ قرض حسن ہے، ارشاد ہے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ (بقرہ)

ہاں البتہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ اور خبر دار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں سخاوت وعالی ہمتی کے ساتھ خرچ کرنے سے پرہیز، اس کے لیے جان ومال کی قربانی سے دریغ اور اس کے دین کی نصرت وحمایت سے (جس کے ساتھ ان کی زندگی وبقا وابستہ ہے) کنارہ کشی اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کے مرادف اور آج کل کی تعبیر میں خودکشی کے ہم معنیٰ ہے۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَاَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴿۱۹۵﴾(بقرہ)

اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو، بیشک اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنے والوں کو۔ (ارکان اربعہ: ۱۳۰-۱۳۷)

آیات محکمات ومتشابہات:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ﴿۱۸﴾

نجران کے عیسائیوں نے ان آیات سے جن میں حضرت عیسیٰؑ کو کلمۃ اللہ یا روح اللہ کہا گیا ہے اس سے اللہ کا بیٹا ثابت کرنے کی کوشش کی تو ان کے اس غلط استدلال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا کہ اللہ کے کلام میں دو قسم کی آیات ہیں، بعض آیات وہ ہیں جو اپنی مراد پر دلالت کرنے میں بالکل واضح ہیں، ایسی آیات کو محکمات کہا جاتا ہے، اور قرآن کریم کا غالب حصہ محکمات پر ہی مشتمل ہے، اور دوسری قسم کی آیات وہ ہیں جن کی حقیقی اور یقینی مراد اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں یا جن میں کسی بھی وجہ سے اشتباہ پایا جاتا ہے، ایسی آیات متشابہات کہا جاتا ہے، جو حق کے متلاشی ہوتے ہیں وہ ہمیشہ محکمات کی پیری کرتے ہیں۔

جو حق کے متلاشی ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ محکمات کی پیروی کرتے ہیں اور جن کے دل میں کجی اور دماغ میں فتور ہوتا ہے وہ متشابہات کی غلط سلط تاویل کرنے اور ان کی مراد تک پہنچنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

کلمۃ اللہ اور روح اللہ:

کلمۃ اللہ اور روح اللہ جیسے الفاظ متشابہات کی قسم میں سے ہیں، ان متشابہات کی بنیاد پر شرکیہ عقائد کی عمارت کھڑی کرنا، پانی پر نقش بنانے کے سوا کچھ نہیں۔

توحید اور ایمان کے دلائل بالکل واضح ہیں، ان کا انکار وہی شخص کرسکتا ہے جو بصیرت سے بالکل کورا ہو، اس کائنات کی ہر چیز یہاں تک کہ خود باری تعالی، اس کے پاک فرشتے اور نیک علماء توحید کی گواہی دیتے ہیں۔ (۱۸)

نکتہ: عجب نہیں کہ لفظ قائما بالقسط میں عیسائیوں کے مسئلہ کفارہ کے ابطال کی طرف اشارہ ہو کہ یہ کون سا عدل اور انصاف ہے کہ ساری دنیا کے جرائم تنہا ایک شخص پر لاد دیے جائیں اور پھر اس ایک شخص کو بے قصور پھانسی پر لٹکا دیا جائے، تاکہ وہ معصوم شخص سارے گناہ گاروں کے لیے کفارہ بن جائے، خدائے عادل قدوس اس قسم کی گستاخیوں سے پاک اور منزہ ہے۔ سبحانہ وتعالی عما یصفون۔ آیت۔ (۱۸) (معارف القرآن ادریسی: ج:۱/ ۵۸۲)

وحدت دین یا وحدت ادیان؟

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۣ

اللہ تعالیٰ کے یہاں جو دین مقبول ہے، وہ صرف اسلام ہے، کوئی اور دین خدا کے یہاں مقبول نہیں، بعض حضرات جو کہتے ہیں کہ تمام مذاہب حق ہیں، راستے الگ الگ ہیں اور منزل سب کی ایک ہے، یہ صحیح نہیں ہے، یہ نہ صرف قرآن کا دعویٰ ہے؛ بلکہ عقل کا تقاضہ بھی ہے، وہ مذہب جو کامل توحید کی دعوت دیتا ہو اور بال برابر بھی شرک کی آمیزش کو گوارا نہیں کرتا ہو اور وہ مذاہب جن کے یہاں شرک ہی اصل طریقۂ حیات ہو، ان دونوں کی منزل ایک کیوں کر ہوسکتی ہے، جیسے روشنی اور تاریکی کا مقصد ایک نہیں ہوسکتا، اسی طرح متضاد فکر ونظر کے حامل مذاہب بھی ایک نہیں ہوسکتے، پس اسلام وحدتِ دین کا قائل ہے نہ کہ وحدتِ ادیان کا۔ پھر ایک ہی خدا ہے جو پوری انسانیت کا خالق ہے، ایک ہی باپ کے نطفہ اور ایک ہی ماں کی کوکھ سے تمام انسان پیدا کئے گئے ہیں، ایک ہی سورج ہے جو تمام انسانوں کو حرارت پہنچاتا ہے، ایک ہی چاند ہے جو اپنی خنکی سے ہر شخص کو سرشار کرتا ہے، ایک ہی نظام تولید ہے جس سے ہر آدمی کی پیدائش ہوتی ہے، غذا اور اس کے ہضم کا نظام بھی ایک ہے، تو ضرور ہے کہ خدا نے اس پوری مخلوق کے لئے قانون اور نظام حیات بھی ایک ہی رکھا ہو؛ اس لئے 'دین' ایک ہی حق ہوسکتا ہے نہ کہ کئی۔ (۱۹) (آسان تفسیر: ج:۱/ ۲۳۳)

اللہ کا پسندیدہ دین:

جیسے اللہ توحید کی گواہی دیتا ہے، اسی طرح وہ اس بات کی بھی گواہی دیتا ہے کہ اس کے نزدیک پسندیدہ دین صرف اسلام ہے، یہود ونصاری کا اس کی حقانیت کے بارے میں جھگڑا کرنا سوائے کفر وعناد کے اور کچھ نہیں۔ (خلاصۃ القرآن)

جو شخص دلائل اور براہن کو نہ مانے اور صریح عناد پر اتر آئے تو ایسے شخص کے سامنے بحث کرنا فضول ہے اور ناحق اپنے

وقت کا ضائع کرنا ہے، اس لیے اتمام حجت کے لیے یہ بات کہہ کر کلام ختم کر دینا مناسب ہے کہ ہم تو خالص اللہ کے فرماں بردار بندے بن چکے ہیں، اب تم اپنی جانو، ہم کسی پر زبردستی نہیں کرتے۔(۲۰)(معارف القرآن ادریسی: ج:۱/ ۵۸۵)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ دعوتِ دین کا کام ایک سرکاری ڈیوٹی کی طرح ہے کہ بے دلی اور نیم دلی کے ساتھ اسلام کی طرف دعوت دے دی اور کافی ہو گیا، مزید سعی و کاوش کی ضرورت نہیں؛ بلکہ مقصد یہ ہے کہ داعی پوری دردمندی اور جذبۂ دروں کے ساتھ دعوت دیتا رہے اور بار بار راہِ حق کی طرف بلاتا رہے؛ لیکن مدعو اتنا سخت دل ہے کہ اس پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تو تنگ دل نہ ہونا چاہئے؛ کیوں کہ اس نے اپنی ذمہ داری ادا کر دی ہے۔(۲۰) آسان تفسیر: ج:۱/ ۲۳۳)

اہل کتاب کے جرائم:

اگلی آیات میں مسلسل اہل کتاب کی مذمت کی گئی ہے اور ان کے جرائم بیان کیے گئے ہیں:

یہی ہیں جنہوں نے انبیاء کو قتل کیا، خون ریزی کی، اللہ کے نیک بندوں پر مظالم ڈھائے۔(۲۱)

اسلام ہی حق ہے:

دین کا مبنیٰ، جڑ اور بنیاد مسئلہ توحید اور اللہ کی صفات کو قرار دیا گیا تھا۔ اب اس آیت میں اللہ نے اسلام کی حقانیت بیان فرمائی ہے، مشرکین عرب اور ایران کے مجوسی دعویٰ کرتے تھے کہ ان کے ادیان سچے ہیں۔ اہل کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ اس معاملے میں زیادہ ہی غلو کرتے تھے، وہ اپنے علاوہ ہر دوسرے مذہب کو غلط بتاتے تھے اور نجات کو صرف اپنے ہی دین میں بند سمجھتے تھے۔ حالانکہ یہود و نصاریٰ کے پاس کوئی حقیقت اس وقت نہ تھی اور نہ آج ہے۔ انہوں نے انبیاء کے اصل دین کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور کفر و شرک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اس سے قبل گمراہی کے اسباب بھی بیان ہو چکے ہیں۔ حق و صداقت کی مخالفت کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی، کہ ان کے مال و اولاد ان کے کچھ کام نہیں آئیں گے۔ اور وہ اس دنیا میں بھی مغلوب ہوں گے۔ اور آخرت میں جہنم کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اللہ نے یاد دلایا کہ تم نے جنگ بدر میں اللہ کی نصرت کا نمونہ دیکھ لیا ہے۔ اس سے عبرت حاصل کرو۔ دنیا میں گمراہی عام طور پر عورتوں اور بیٹوں کی محبت، سونے چاندی کے جمع کردہ مال، عمدہ گھوڑے، مویشی اور کھیتی باڑی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ان تمام چیزوں سے بہتر اللہ کی طرف سے ملنے والا وہ اجر و ثواب ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والا ہے، مگر وہ متقیوں کے لیے ہے۔ ان نعمتوں میں پاکیزہ بیویاں اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ جو اہل جنت کو حاصل ہوگی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی صفت بیان کیں کہ وہ ایمان کا اقرار کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے اپنی لغزشوں کی معافی مانگتے ہیں، دوزخ سے پناہ چاہتے ہیں، صبر و استقلال کو اختیار کرتے ہیں اور سچائی پر ڈٹ جاتے ہیں، ہمیشہ اطاعت کا دامن تھامے رکھتے ہیں، اپنی نیک کمائی میں سے خرچ کرتے ہیں، محتاجوں کی اعانت کرتے ہیں اور سحری کے وقت استغفار کرتے ہیں۔ یہ تمام باتیں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے توحید کا مسئلہ بیان فرمایا کہ دین کی جڑ اور بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتے اور تمام

اہل علم گواہی دیتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ اللہ تعالیٰ انصاف کے ساتھ قائم ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ عزیز اور حکیم ہے۔

دنیا کی بہت سی قوموں میں بادشاہ پرستی کا طریقہ مروج رہا ہے، لوگ بادشاہ کو خدا یا خدا کے کنبہ کا ایک فرد تصور کرتے تھے، مصر میں فرعون اور عراق میں نمرود کی پرستش ہوا کرتی تھی، اسلام کی آمد کے وقت ایرانی بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ بادشاہ خدا کے کنبہ کا ایک فرد ہوتا ہے، جاپان و ہندوستان میں بھی اس قسم کے عقیدے پائے جاتے تھے، قرآن مجید نے اسی کی تردید کے لئے غالباً یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ حکومت واقتدار کی کنجی اصل میں خدا کے ہاتھ میں ہے، جن بادشاہوں اور حکمرانوں کو تم خدا سمجھتے ہو، وہ حکومت واقتدار اور عزت وذلت کے سلسلے میں عاجزِ محض ہیں ۔(۲۶)(آسان تفسیر: ج:۱/ ۲۳۴)

مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے کہ وہ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں ۔(۲۸)

کیونکہ اسلام اور کفر کے درمیان کوئی رشتہ اور ناتا نہیں ہے اور کافر کبھی بھی مسلمان کے ساتھ مخلص نہیں ہوسکتا۔

فوائد:

۱۔کافروں سے موالات یعنی محبت کی تین صورتیں ہیں؛ ایک یہ کہ ان کو دینی حیثیت سے محبوب رکھا جائے، یہ قطعا کفر ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دل سے ان کے مذہب اور دین کو برا سمجھے مگر معاملات دنیویہ میں ان سے خوش اسلوبی کے ساتھ پیش آئے، یہ بالا جماع جائز بلکہ ایک درجہ میں مستحسن ہے۔ تیسری صورت ان دونوں صورتوں کے بین بین ہے، وہ یہ کہ دل سے تو ان کے مذہب کو برا سمجھے مگر کسی قرابت یا دوستی یا دنیوی غرض کی وجہ سے ان سے دوستانہ تعلقات رکھے اور ان کی اعانت اور امداد کرے یا کسی وقت مسلمانوں کی جاسوسی کرے، یہ صورت کفر تو نہیں مگر سخت گناہ ہے، حاطب بن ابی بلتعہ کے قصہ میں یہی صورت پیش آئی کہ انہوں نے اپنی قرابت کی وجہ سے کفار کی مدد کی اور ان کے ساتھ ایک قسم کا سلوک اور احسان کیا، سورہ ممتحنہ کا نزول اسی قسم کی موالات کی ممانعت کے لیے ہوا ہے۔(تفسیر کبیر)

۲۔کافروں کی سی وضع قطع اختیار کرنا یہ علامت ہے کہ اس شخص کو کافروں کی وضع پسند ہے اور اسلام کی وضع اس کو ناپسند ہے، اس لیے کہ تمام عقلاء کے نزدیک ظاہری حرکات وسکنات، قلبی کیفیات کی ترجمان ہوتی ہیں۔

۳۔تقیہ سے آیت میں کافروں اور دشمنوں کے شر سے بچنے کی تدبیر مراد ہے۔(۲۹)(تفسیر ادریسی: ج:۱/ ۵۹۵)

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ......الی......فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ۝۳۲

ان دونوں آیتوں میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت وفرماں برداری ایک اکائی ہے، جن میں سے ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا، نہ رسول کی نافرمانی اور ان کے احکام کا انکار کر کے اللہ کی اطاعت کی جاسکتی ہے اور نہ اللہ کی نافرمانی کر کے رسول کی اطاعت؛ کیوں کہ اصل مقصود اللہ کی اطاعت ہے، رسول بھی منشائے ربانی اور حکم خداوندی ہی کا ترجمان ہوتا ہے؛ اس لئے اس کی اطاعت بھی اللہ ہی کی اطاعت ہے اور اس کی نافرمانی بھی اللہ ہی کی

نافرمانی، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی طرح حدیث نبوی بھی حجت ہے اور جو شخص قرآن مجید کو تسلیم کرتا ہو اس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ حدیث کے دلیل و حجت ہونے کا انکار کر جائے، پہلی آیت میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع و پیروی کا حکم فرمایا گیا ہے اور دوسری آیت میں اطاعت کا، ''اتباع'' افعال کی نقل کرنے کا نام ہے اور ''اطاعت'' جس بات کا حکم دیا جائے اس کی تعمیل کا، گویا پہلی آیت میں آپ ﷺ کے افعال یعنی فعلی احادیث کا حجت ہونا بیان کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں آپ ﷺ کے ارشادات یعنی قولی احادیث کا حجت ہونا۔ (۳۱-۳۲) (آسان تفسیر: ج:۱/۲۳۶)

تین عبرت آموز قصے

اگلی آیات میں سورۂ آل عمران تین عبرت آموز قصے بیان کرتی ہے، یہ تینوں قصے خوارق عادت کے قبیل سے ہیں اور تینوں اللہ کی عظیم قدرت پر دلالت کرتے ہیں۔

پہلا قصہ حضرت مریم کی ولادت کا ہے، جنہیں عیسائیوں نے اللہ تعالی کی زوجہ اور ان کے بیٹے کو اللہ تعالی کا بیٹا قرار دیا اور یوں بدترین گمراہی کا شکار ہوگئے۔

حضرت مریم کے والد حضرت عمران، اللہ کے نیک بندے تھے اور آپ کی والدہ ''حنہ بنت فاقوذ'' صاحب کردار اور پاک خاتون تھیں، عرصہ تک ان کے ہاں بچہ پیدا نہ ہوا، ایک دن پرندے کو دیکھا کہ وہ اپنے بچے کو دانہ کھلا رہا تھا، دیکھ کر دل مچل گیا، اولاد کی آرزو پیدا ہوگئی، اللہ کے حضور دامن پھیلا کر درخواست کی اور نذر مانی کہ اگر تو مجھے اولاد عطا فرمادے، تو میں اسے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کردوں گی، اللہ نے دعا قبول فرمالی، ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوگئی۔

دستور یہ تھا کہ بیت المقدس کی خدمت کے لیے لڑکوں کو قبول کیا جاتا تھا، لڑکیوں کو قبول نہیں کیا جاتا تھا۔

ایک سانحہ یہ بھی پیش آگیا کہ نومولود بچی کے والد انتقال فرماگئے، اللہ تعالی نے سابق دستور کے خلاف زوجہ عمران کی نذر قبول فرمالی اور اپنے زمانے کے بہترین انسان حضرت زکریا علیہ السلام کو بچی کی کفالت اور تربیت کے لیے منتخب فرمالیا۔

(آیت) ''اذیلقون'' اس فعل کے فاعل کون تھے؟ یروشلم کے ہیکل مقدس کے خدام اور کاہن (بہ اصطلاح یہود) (آیت) ''اقلامھم'' ہیکل سلیمانی کی خدمت ونگہداشت کے لیے خادموں کی ایک بڑی جماعت رہا کرتی تھی، جیسے کہ بڑی مسجدوں کی خدمت کے لئے جاروب کشوں، فراشوں، دربانوں، مؤذنوں وغیرہ کا پورا عملہ رہتا ہے، حضرت مریم (علیہ السلام) کے والد حضرت عمران اپنے زمانہ میں ان خادمان حرم کے سردار تھے۔ ان کی وفات پر سوال یہ پیدا ہوا کہ اب مریم (علیہ السلام) کا سرپرست کون ہو، رشتہ ان خادموں میں سب سے قریب حضرت زکریا (علیہ السلام) کا تھا کہ آپ مریم (علیہ السلام) کے خالو تھے۔ طے یہ پایا کہ سوال کا حل فال کے ذریعہ سے کیا جائے، فال اشارۂ غیبی کی قائم مقام تھی، فال کا طریقہ یہ رائج تھا کہ جو قلم توریت لکھنے کے ہوتے تھے، ان پر توریت شریف ہی کے کچھ کلمات لکھ کر انہیں دریائے اردن میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اور قلم عموما دریا ہی کے رخ بہنے لگتے لیکن بعض قلم مخالف رخ کو بہتے اور یہی مخالف

بہاؤ کامیابی کی علامت سمجھی جاتی، جیت ایسے ہی قلم کے مالک کی سمجھی جاتی، گویا غیب سے ڈگری اس کے حق میں ہوگئی۔ یہی صورت یہاں ہوئی اور قرعہ حضرت زکریا (علیہ السلام) کے نام نکلا۔ (آیت) ''وما کنت لدیھم''۔ خطاب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ہے۔ یعنی جب یہ مریم (علیہ السلام) کی کفالت وسرپرستی کا قضیہ طے ہورہا تھا تو آپ خود تو وہاں موجود نہ تھے اور نہ کوئی معتبر وچشم دید شہادت ہی آپ تک پہنچی، پھر جو آپ اتنی صحیح اور سچی خبریں اپنی زبان سے ادا کررہے ہیں۔ ان کا ذریعہ بجز وحی الٰہی کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ (۴۴) (تفسیر ماجدی: ج:۱/ ۵۸۸)

حضرت زکریا علیہ السلام نے بچی کی کرامتیں اور بے موسم کا پھل دیکھا، تو ایک دن پوچھا:

اے مریم! یہ رزق تمہارے پاس کہاں سے آتا ہے، انہوں نے جواب دیا کہ اللہ کے ہاں سے آتا ہے، بے شک اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ (۳۷)

حضرت زکریاؑ کی آرزو:

معصوم بچی کا ایمانی جواب سن کر حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں بھی اولاد کی آرزو جاگ اٹھی۔ حالانکہ ان کی عمر سو سال سے تجاوز کرچکی تھی اور بیوی بھی بوڑھی ہوچکی تھی، بانجھ تو تھی ہی لیکن ظاہری اسباب کی مخالفت کے باوجود انتہائی عجز وانکساری کے ساتھ اپنے رب سے دعا کی کہ اے میرے رب! مجھے اپنی خصوصی عنایت سے نیک اولاد عطا فرما بے شک تو ہی دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے (۳۸)

اللہ تعالی نے شکستہ دلی سے کی گئی دعا قبول فرمالی اور ایسے بیٹے کی بشارت سنائی جو چار صفات کا حامل ہوگا۔

وہ کلمۃ اللہ یعنی حضرت عیسی علیہ السلام کی تصدیق کرے گا اور آپ پر ایمان لائے گا، وہ علم وتقوی اور زہد وعبادت میں سیادت کے مقام پر فائز ہوگا۔ وہ انتہائی عفیف ہوگا، قدرت اور قوت کے باوجود عورتوں کے قریب نہیں جائے گا۔ اور وہ انبیاء اور صلحاء کی جماعت کا ایک فرد ہوگا۔

قدرت الٰہیہ کا نمونہ:

تیسرا عبرت آموز قصہ حضرت عیسی علیہ السلام کی ولادت کا ہے، اگر حضرت مریم اور حضرت یحیٰ علیہم السلام کا قصہ اس اعتبار سے عجیب اور قدرت الہیہ کا نمونہ تھا کہ ان کے والدین بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے، تو حضرت عیسی علیہ السلام کا واقعہ عجیب ترین ہے کیونکہ آپ کی ولادت والد کے بغیر سراسر معجزانہ طریقے پر ہوئی، جب فرشتوں نے حضرت مریم کو بیٹے کی خبر دی، تو انہوں نے بڑے تعجب سے کہا:

''میرے ہاں بچہ کیسے پیدا ہوگا؟ حالانکہ مجھے کسی انسان نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔''

اللہ کی طرف سے جواب دیا گیا کہ: اسی طرح ہوجائے گا کیونکہ اللہ تعالی جو چاہتا ہے پیدا کردیتا ہے، جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کرلیتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہوجا پس وہ ہوجاتا ہے۔'' (۴۷)

امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کوکلمۃ اللہ کہنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بغیر باپ کے توسط کے پیدا کیا۔ گویا آپ اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے حکم سے پیدا ہوئے۔ اس لقب کی دوسری وجہ یہ ہے کہ پہلی کتابوں میں مسیح (علیہ السلام) کے متعلق پیش گوئی موجود تھی کہ آپ اپنے مقررہ دور میں آ کر ہدایت کا ذریعہ بنیں گے، تو یہ وہی کلمۃ اللہ ہیں، جن کا ذکر پہلی کتابوں میں موجود ہے۔ کلمۃ اللہ کی تیسری توضیح یوں بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو کلمت ربک، یعنی اللہ کے کلمے کہا ہے۔ اور یہ لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے۔ اسی طرح چونکہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کو بھی مخلوق کے لیے ذریعہ ہدایت بنایا، لہٰذا ان کا نام بھی کلمۃ اللہ رکھ دیا۔ (۴۵) (معالم العرفان: ج: ۴/ ۱۵۴)

جب حضرت مریمؑ کو لوگوں نے تہمت لگائی تو دودھ پیتے ہونے کے باوجود اللہ کے حکم سے آپ نے گفتگو فرمائی، بچپن میں اور بھی متعدد لوگوں نے گفتگو کی ہے، احادیث میں ان کا ذکر آیا ہے، ان میں سے حضرت عیسیٰؑ کا ذکر تو خود قرآن میں ہے، علامہ قرطبیؒ نے سات بچوں کا تذکرہ کیا ہے، حضرت عیسیٰؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت یوسفؑ کی پاک بازی کی گواہی دینے والا بچہ، جریج راہب کی پاک بازی کی گواہی دینے والا بچہ، جس کا ذکر بخاری میں بھی آیا ہے، (بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث نمبر: ۳۴۳۶) ایک بچہ جو اپنی ماں کا دودھ پی رہا تھا، ایک ظالم صاحبِ اثر شخص کا گذر ہوا، اس نے کہا: اے اللہ! میرے بچے کو اسی طرح بنادے، بچہ بول اٹھا: اے اللہ! مجھے اس طرح نہ بنانا، مسلم میں یہ روایت آئی ہے، اور اصحابِ اخدود کے واقعہ میں مسلم ہی نے روایت نقل کی ہے کہ جب ایک خاتون کو آگ میں ڈالا جانے لگا، تو بچہ نے اس کا حوصلہ بڑھایا کہ وہ گھبرائے نہیں کہ وہ حق پر ہے، (مسلم باب قصة أصحاب الأخدود الخ، حدیث نمبر: ۷۵۱۱) اس کے علاوہ بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے دختر فرعون کی مشاطہ کی بیٹی کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ماں کے ہاتھ سے کنگھی گر پڑی، اس نے کہا: بسم اللہ، شیرخوار بیٹی نے کہا: اس اللہ کے نام سے جو میرا بھی رب ہے، تیرا بھی اور تیرے باپ کا بھی، بالآخر فرعون نے ماں بیٹی دونوں ہی کو نذرِ آتش کر دیا۔ (تفسیر قرطبی: ۴/ ۹۱-۹۲)

یہود کا ایمان قبول کرنے سے انکار:

سیدنا مسیح علیہ السلام کو باری تعالی نے مختلف معجزات عطا فرمائے لیکن ان معجزات کو دیکھ لینے کے باوجود یہود کو ایمان قبول کرنے کی سعادت حاصل نہ ہوئی اور انہوں نے آپ کو قتل کرنے کا عزم کرلیا، دوسری طرف اللہ تعالی نے آپ کو بچانے کی تدبیر کرلی، پھر سب نے دیکھ لیا کہ اللہ ہی کی تدبیر غالب رہی، ارشاد باری تعالی ہے:

"انہوں نے بھی تدبیر کی اور اللہ نے بھی تدبیر کی اور اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے اچھا ہے۔ (۵۴)

یہودیوں کا دعوی:

یہودیوں کا دعوی ہے کہ ہم نے حضرت عیسی علیہ السلام کو معاذ اللہ سولی دے کر قتل کر دیا۔

نصاریٰ کا دعوی:

قبر میں دفن کر دیا تھا، تین دن تک وہیں رہے، پھر قبر پھٹی اور آسمانوں پر چلے گئے اور وہاں رب کے عرش پر تشریف فرما ہو گئے۔

متحدہ ہندوستان میں ایک مدعی نبوت کی اقتداء کرنے والے فرقے کا دعوی ہے کہ آپ سولی پر زخمی ہو گئے تھے، آپ کو مردہ سمجھ کر قبر میں دفن کر دیا گیا، شاگردوں نے آپ کا علاج کیا جس سے آپ تندرست ہو گئے، پھر آپ ہجرت کر کے کشمیر گئے، وہیں آپ کا انتقال ہوا۔

قرآن کا دعوی:

ان تمام دعوؤں کے برعکس قرآن کا دعوی اور اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ یہ ہے کہ آپ کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا تھا، آپ قیامت کے قریب آسمان سے اتریں گے، اور پھر اپنی زندگی پوری فرما کر طبعی موت مریں گے۔ سورۂ آل عمران میں ہے:

جس وقت اللہ نے فرمایا: میں تجھے اس وقت موت دوں گا جو وقت موت کے لیے مقرر ہے اور فی الحال میں آپ کو اپنی طرف اٹھالیتا ہوں اور میں تجھے کافروں کے الزامات سے پاک کیے دیتا ہوں اور تیری اتباع کرنے والوں کو قیامت کے دن کافروں پر غالب کر دوں گا''۔ (۵۵)

مباہلہ کی دعوت:

نجران کے وہ عیسائی جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بحث ومناظرہ کے لیے مدینہ منورہ آئے تھے، جب وہ تمام دلائل سننے کے باوجود حق کا اعتراف کرنے پر تیار نہ ہوئے، تو اللہ کے حکم سے آپ نے انہیں مباہلہ کی دعوت دی۔

یعنی یہ کہ تم اپنے اہل وعیال کو لے آؤ میں اپنے اہل وعیال کو لے آتا ہوں، پھر ہم مل کر خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ تعالی سے دعا کرتے ہیں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہے اس پر اللہ تعالی کی لعنت ہو۔ (۶۱)

عیسائیوں کا یہ وفد جو ساٹھ افراد پر مشتمل تھا اور اس میں ان کے چودہ انتہائی سربرآوردہ مذہبی رہنما بھی شامل تھے، ان میں کوئی بھی مباہلہ کے لیے تیار نہ ہوا بلکہ آپ کو جزیہ دینے پر راضی ہو گئے۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد سورۃ آل عمران تمام اہل کتاب کو- خواہ وہ یہود ہوں یا نصاری- ایک ایسے کلمہ پر متفق ہو جانے کی دعوت دیتی ہے جس کی تلقین تمام انبیاء نے کی ہے اور جس کی تعلیم چاروں کتابوں سمیت تمام آسمانی صحیفوں میں دی گئی ہے اور وہ ہے:

کلمہ توحید: لا الہ الا اللہ یعنی ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے۔ (۶۴)

انبیاء سے عہد:

یہود ونصاری کی بدعملیوں، بددیانتیوں اور ان کے جھوٹ اور افتراء کو بیان کرنے کے بعد سورۂ آل عمران بتاتی ہے

کہ اللہ تعالی نے تمام انبیاء سے عہد لیا تھا کہ اگر ان کی موجودگی میں خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے تو تم سب آپ پر ایمان لاؤ گے اور اگر تمہاری موجودگی میں وہ نہ آئے تو پھر تمہارے امتی ان کی اتباع کرنے اور ان پر ایمان لانے کے پابند ہوں گے۔(۸۱)

انبیاء سے عہد، حقیقت میں ان کی امتوں سے عہد تھا، مگر افسوس کہ ان انبیاء کی امتوں نے اس عہد کی پاسداری نہ کی اور تصدیق اور مدد کے بجائے وہ تکذیب اور مخالفت پر تل گئے۔

سید الانبیاء:

یہ آیت کریمہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو سید الانبیاء ثابت کرتی ہے۔

تیسرے پارہ کے اختتام پر اس بات کی وضاحت کردی گئی ہے کہ ایمان اور کفر دو ایسی ضدیں ہیں جو جمع نہیں ہوسکتیں، اس لیے ان لوگوں کی سخت مذمت بیان کی گئی ہے جو ایمان سے مرتد ہو جاتے ہیں، ضلالت کو ہدایت پر ترجیح دیتے ہیں اور جن کا حالت کفر میں انتقال ہوجاتا ہے۔(خلاصۃ القرآن: م، اش)

اعتقاد اور عمل:

یہاں پر دو باتیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہیں۔ پہلی بات ہے: ان اللہ ربی و ربکم۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ عیسیٰ (علیہ السلام) اس بیان کے ذریعے سمجھانا یہ چاہتے ہیں کہ دیکھو بھائی! ہم سب مخلوق ہیں۔ میرا اور تمہارا سب کا رب ایک ہی ہے، ہماری سب کی منزل بھی ایک ہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور الوہیت پر ایمان لانا۔ اور یاد رکھو! جب تک کسی شخص کا اعتقاد برحق نہ ہو، اس کی قوت عقلی اور علمی کامل نہیں ہوسکتی، لہذا اس قوت کو کامل بنانے کے لیے اعتقاد کی سچائی اور اس کی پختگی ضروری ہے۔ اور پھر اعتقاد برحق کی آخری منزل اللہ تعالیٰ کی الوہیت پر کامل ایمان لانا ہے، اگر عقیدے میں شرک شامل ہوگیا، تو عقیدہ فاسد ہوجائے گا اور قوت علمیہ ضائع ہوجائے گی۔ اور انسان کو مطلوبہ کمال کبھی حاصل نہیں ہوسکے گا۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں دوسری بات فاعبدوہ ہے۔ اور یہ چیز قوت عملیہ کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کرے اس کے اوامر ونواہی پر عمل کرے۔ اس طرح اس کی قوت عملی بھی کمال کو پہنچ جائے گی۔ پھر جب قوت علمی اور قوت عملی دونوں اپنے معایر کو پہنچ جائیں گی تو فرمایا **ھذا صراط مستقیم** یہی وہ سیدھا راستہ ہے جس کی طلب ہر مسلمان ہر نماز میں کرتا ہے اور کہتا ہے **اھدنا الصراط المستقیم**۔ یہی وہ راستہ ہے جس کی تعلیم تمام انبیاء کرام دیتے آئے ہیں۔ **ھذا صراط علی مستقیم**۔ یہ اساسی اعتقاد ہے۔ جس کو چھوڑ کر یہودی گمراہ ہوگئے۔ انہوں نے عیسیٰ (علیہ السلام) کی توہین کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہ و برباد کردیا۔ برخلاف اس کے عیسائیوں نے اللہ کے بندے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو الوہیت کے درجے تک پہنچایا۔ وہ بھی صراط مستقیم سے بھٹک گئے، اور ناکام ہوئے۔ جب تک یہ اساسی عقیدہ درست نہیں ہوگا، کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔

قولہ تعالیٰ (وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ) (اور نہ بنائیں ہم آپس میں ایک دوسرے کو رب، اللہ کو چھوڑ کر) تفسیر روح المعانی میں ہے کہ حضرت عدی بن حاتم (صحابیؓ) نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم غیر اللہ کی عبادت تو نہیں کرتے تھے (پھر یہ کیوں فرمایا کہ آپس میں ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں) آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ تمہارے لیے کچھ چیزوں کو حلال اور کچھ چیزوں کو حرام قرار نہیں دیتے تھے اور تم ان کی بات پر عمل نہیں کرتے تھے، تو عرض کیا: ہاں ایسا تو تھا، آپ نے فرمایا: یہ رب بنانے میں داخل ہے۔ (کیونکہ چیزوں کو حلال یا حرام قرار دینا صرف اللہ تعالیٰ کی شان عالی کے لائق ہے، وہ خالق و مالک ہے، اپنی مخلوق میں جسے چاہے جس کے لیے حلال یا حرام قرار دے، یہ مرتبہ کسی کو حاصل نہیں) واضح رہے کہ عدی بن حاتم پہلے نصرانی مذہب رکھتے تھے۔ (روح المعانی)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانا اللہ تعالیٰ کی صفات مختصہ میں سے ہے۔ البتہ جب اس کی نسبت نبی کی طرف ہوتی ہے تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کی حلت یا حرمت کی قطعی علامت ہے۔ نبی خود حلال و حرام نہیں کرتا بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کرتا ہے۔ جس چیز کو مجتہد حلال یا حرام ٹھہراتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ فیصلہ قرآن وسنت کی روشنی میں دیا ہے۔ انہیں خود ایسا کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کا نبی کو اختیار نہیں، مجتہد کو کیسے ہوسکتا ہے۔

احکام کی دو قسمیں ہیں؛ ایک تشریعی جیسے نماز و روزہ، جن میں بندے کے اختیار کو دخل ہے اور دوسرے تکوینی جیسے جلانا اور مارنا اور بیمار کرنا۔ احکام تکوینیہ کے تو سب مسخر ہیں، کوئی اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتا۔ کرھاً سے یہی تسخیری اطاعت مراد ہے اور طوعاً سے احکام تشریعیہ کی اختیاری اطاعت مراد ہے اور خوشی سے اطاعت کرنے والے فرشتے ہیں اور جن اور انس میں ایماندار لوگ ہیں، کہہ دیجئے اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس دین کی میں تم کو دعوت دے رہا ہوں وہی تمام انبیاء کا دین ہے۔ (۸۳) (معارف القرآن ادریسی: ۶۶۸)

سورہ آل عمران:

خلاصہ رکوع: (۱)...... نصاری کو دعوت الی الکتاب اور تعلیم کتاب میں صحیح اور غلط کی تمیز۔ ماخذ: آیت: ۳، ۷۔

خلاصہ رکوع: (۲)...... مخالفین مسلک کی بربادی اور موافقین کی سرفرازی کا اعلان۔ ماند: آیت: ۱۲، ۱۵۔

خلاصہ رکوع: (۳)...... مسلک صحیح کے معاندین کا راہ راست پر آنا مشکل ہے، لہذا مسلمانوں کو اپنی کامیابی کے لئے گامزن ہونا چاہئے۔

خلاصہ رکوع: (۴)...... اللہ تعالی کے دربار سے عزت پانے کے لئے (المصطفین الاخیار) خدا تعالی کے برگزیدہ اور چیدہ بندوں کے نقش قدم پر چلنا ہوگا۔ ماخذ: آیت: ۳۳، ۳۱۔

خلاصہ رکوع: (۵)...... بشارت پیدائش عیسی علیہ السلام اور خلاصہ تعلیم عیسی علیہ السلام۔ ماخذ: آیت: ۴۵، ۵۱۔

خلاصہ رکوع: (٦)......مواعید اربعہ عیسی علیہ السلام کا ذکر۔ ماخذ: آیت: ۵۵۔

خلاصہ رکوع: (٧)......اہل کتاب کو مسلک صحیح کی طرف دعوت اور ان کا انحراف بلکہ وہ مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ ماخذ: آیت: ۶۴، ۶۹۔

خلاصہ رکوع: (٨)......اہل کتاب کا مسلمانوں کے خلاف سعی کرنا۔ ماخذ: آیت: ۲۷۔

خلاصہ رکوع: (٩)......تمہارے مقتداؤں (یعنی انبیاء علیہم السلام) نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کا اقرار کیا تھا، تو تمہیں بطریق اولی آپ کے اتباع کو فخر خیال کرنا چاہئے۔ ماخذ: آیت: ۸۱۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

تیسرے پارے کے چند اہم فوائد

(١) ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس لئے بندے کو ہمیشہ اللہ تعالی سے ہدایت کی دعا کرتے رہنا چاہئے۔

(٢) اللہ تعالی ہدایت کی راہ تو دکھاتا ہے مگر کسی کو قبول ہدایت پر مجبور نہیں کرتا۔

(٣) ہر فرض نماز کے بعد اور سونے سے پہلے اور گھر کو شیطانی اثرات سے پاک کرنے کے لئے آیت الکرسی کا پڑھنا مستحب ہے۔

(۴) احسان جتلانے سے اخلاص کے ساتھ کیا ہوا عمل بھی ریاکاری بن جاتا ہے۔

(۵) صدقہ میں اہمیت قلت اور کثرت کو حاصل نہیں بلکہ اصل اہمیت اخلاص کو حاصل ہے۔

(٦) جن لوگوں کے اندر چار صفات پائی جائیں، انہیں دنیا اور آخرت میں حقیقی امن اور سکون حاصل ہوتا ہے:

(١) ایمان (٢) عمل صالح (٣) اقامت صلوۃ (۴) اور ایتاء زکوۃ۔

(٧) ہر نعمت کا شکر ادا کرنا ضروری ہے، جس کی ایک صورت یہ ہے کہ انسان بوقت ضرورت دوسروں کے کام آئے۔

(٨) تمام آسمانی کتابوں کے نزول کا بنیادی مقصد ہدایت ہے۔

(٩) جو لوگ حقیقتاً عقلمند ہوتے ہیں وہ ہر وقت اپنے ایمان کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں، بالخصوص فتنوں کے دور میں وہ ہدایت پر استقامت کی دعا خاص طور پر کرتے رہتے ہیں۔

(١٠) عقلمند وہ ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے اور جو عقل اور بصیرت سے محروم ہو، اسے کبھی بھی عبرت حاصل نہیں ہوتی۔

(١١) تہجد کا وقت، قبولیت دعا کے مخصوص اوقات میں سے ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت کی بڑی فضیلت

بیان فرمائی ہے۔(خلاصۂ مضامین قرآنی)

(۱۲) اللہ رب العزت اپنے خلیل (ابراہیمؑ) کی بات ثابت کرنے کے لیے قیامت کے قریب سورج کو مغرب کی جانب سے نکال کر اپنی قدرت کاملہ کا اظہار فرمائیں گے۔

(۱۳) انسان کو فرشتوں کے اوپر علم کی بدولت فضیلت ملی، لہٰذا اس کو دنیوی ٹکنالوجی میں بھی حصہ لے کر فائدہ اٹھانا چاہیے، اسی لیے دنیا کی نعمتوں کا ذکر کیا، لیکن ان اسباب سے فائدہ اٹھا کر اللہ رب العزت کا شکر گذار ہونا چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ مادیت کا ایسا رسیہ بن جائے کہ اپنے رب کو بھول جائے اور بڑا نقصان اٹھانا پڑے، جیسا کہ آج کل یورپین قوم کا حال ہے۔

(۱۴) کوئی بھی تدبیر انسان کو تقدیر سے نہیں بچا سکتی۔ (خواطر)

(۱۵) شیطان صدقہ کرنے میں فقر سے ڈراتا ہے اور اللہ رب العزت رزق میں وسعت کا وعدہ کرتا ہے۔

(۱۶) ربا یہ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ ہے۔

(۱۷) نیک اولاد کی دعا و تمنا کرنا جائز ہے اور اس کے اچھے مستقبل (دین داری والا) کی فکر کرنا صحیح ہے۔

* * *

پارہ : ۴

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَىۡءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ ﴿۹۲﴾

تم نیکی کے مقام تک اس وقت تک ہرگز نہیں پہنچو گے، جب تک ان چیزوں میں سے (اللہ کے لیے) خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہیں۔اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو، اللہ اسے خوب جانتا ہے۔

چوتھے پارے کا آغاز انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ ہو رہا ہے کہ نیکی کا درجہ کمال اس وقت تک تم لوگ حاصل نہیں کر سکتے، جب تک اللہ تعالیٰ کی راہ میں وہ چیز نہ خرچ کرو جو تم کو سب سے زیادہ پسند ہے۔(مطلوب تک پہنچنے کے لیے محبوب کی قربانی اور ایثار ضروری ہے۔(آیت: ۹۲) جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے اپنی سب سے زیادہ پسندیدہ چیزیں صدقہ کرنی شروع کر دیں، جس کے بہت سے واقعات حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں مذکور ہیں۔مثلاً حضرت ابوطلحہؓ کے واقعہ کو تو امام بخاری اور مسلم نے بھی نقل کیا ہے کہ ان کی ایک قیمتی زمین ''بیرحاء'' تھی، جسے انہوں نے یہ کہہ کر صدقہ کر دیا کہ میرا سب سے محبوب مال یہی ہے۔(بخاری: کتاب الانبیاء، حدیث نمبر: ۳۳۳۴، مسلم، حدیث نمبر: ۳۸۰۵) مگر آج ہمارا حال یہ ہے کہ وہ چیز اللہ کی راہ میں دی جاتی ہے جو خود کو پسند نہ آئے، قرآن کریم کی اس آیت شریفہ سے پتا چلتا ہے کہ اس سے نیکی کا کمال حاصل نہیں ہوتا۔

انفاق یہاں بہت وسیع معنی میں ہے، اس میں خیر یا نیکی کے تمام ابواب آ گئے۔محبوب چیز کے ماتحت ہر وہ چیز آ جاتی ہے جسے انسان عزیز رکھتا ہے، مال، دولت، عزت، حکومت، قوت، وقت وغیرہ تنہا مال و دولت ہی مقصود نہیں، بعض اوقات جاہ کی قربانی مال کی قربانی سے کہیں زیادہ سخت و دشوار ہوتی ہے۔اس لیے کہ ابرار کا درجہ محبوب چیز کے خرچ کرنے سے حاصل ہوتا ہے، نیز بخل کی عادت کے زائل ہونے کا طریقہ یہی ہے کہ محبوب اور پسندیدہ چیز خدا کی راہ میں خرچ کی جائے، معمولی چیز کے خرچ کرنے سے نفس سے بخل کا ازالہ نہیں ہوتا، اس لیے **مما تحبون** کی قید لگائی۔

(تفسیر ماجدی: ۱/ ۶۲۴، معارف القرآن ادریسی: ۲/ ۱)

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰٮةُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِالتَّوۡرٰٮةِ فَاتۡلُوۡهَاۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۹۳﴾

تورات کے نازل ہونے سے پہلے کھانے کی تمام چیزیں (جو مسلمانوں کے لیے حلال ہیں) بنی اسرائیل کے لیے (بھی) حلال تھیں، سوائے اس چیز کے جو اسرائیل (یعنی یعقوب علیہ السلام) نے اپنے اوپر حرام کر لی تھی۔(اے پیغمبر! یہودیوں سے) کہہ دو کہ: اگر تم سچے ہو تو تورات لے کر آؤ اور اس کی تلاوت کرو۔

ان یہودیوں کو جواب دیا گیا جنہوں نے مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا تھا کہ آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آپ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پیروکار ہیں، حالانکہ آپ اونٹ کا گوشت کھاتے ہیں جو تورات کی رو سے حرام ہے، ان آیات میں اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اونٹ کا گوشت حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دین میں حرام نہیں تھا؛ بلکہ تورات نازل ہونے سے پہلے بنی اسرائیل کے لئے بھی وہ سب چیزیں حلال تھیں جو آج مسلمانوں کے لئے حلال ہیں؛ البتہ ہوا یہ تھا کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے اونٹ کا گوشت اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ان کو عرق النساء کی بیماری تھی اور انہوں نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر مجھے اس بیماری سے شفا ہوگئی تو میں اپنے کھانے کی سب سے پسندیدہ چیز چھوڑ دوں گا، انہیں اونٹ کا گوشت سب سے زیادہ پسند تھا، اس لئے شفا حاصل ہونے پر انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔ (روح المعانی بحوالہ مستدرک حاکم صحیح)۔

خلاصہ یہ کہ اونٹ کا گوشت اصلاً حلال ہے مگر حضرت یعقوب (علیہ السلام) کے لئے نذر کی وجہ سے اور بنی اسرائیل کے لئے ان کی نافرمانیوں کی بنا پر حرام کیا گیا تھا، اب امت محمدیہ (علی صاحبہا السلام) میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے زمانے کا اصل حکم لوٹ آیا ہے۔ (آسان ترجمہ بحوالہ خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

بعض جاہل صوفیہ کا یہ سمجھنا کہ ترک حیوانات یا بعض دوسری غذاؤں کے ترک کو قرب الٰہی میں کوئی دخل ہے تمام تر نادانی ہے۔ عاملوں کی مشقتیں اور ریاضتیں بالکل دوسری چیز ہیں؛ ورنہ جو غذائیں انسان کی روحانی ترقی میں مانع ہیں وہ خود ہی حرام کردی گئی ہیں۔ کسی غذا کے حلال ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ اس راہ میں مانع نہیں۔ (تفسیر ماجدی: ۱/۶۲۶)

جو اہم مضامین چوتھے پارہ میں بیان کیے گئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

تحویل قبلہ:

جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہونے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کے بجائے کعبہ کو اپنا قبلہ ٹھہرالیا تو اس پر اہل کتاب نے بڑا شور وغوغا کیا۔ وہ کہنے لگے کہ بیت المقدس کعبہ سے افضل ہے اور اسے زمین پر اللہ تعالیٰ کا پہلا گھر ہونے کا شرف حاصل ہے، اللہ تعالیٰ ان کی تردید فرماتے ہوئے بیت الحرام کی تین خصوصیات بیان فرماتے ہیں۔

(۱) یہ کہ اس روئے زمین پر کعبہ سب سے پہلی عبادت گاہ ہے۔ (۲) یہ کہ اس میں ایسی واضح نشانیاں پائی جاتی ہیں جو اس کے شرف اور فضیلت پر دلالت کرتی ہیں، جن میں مقام ابراہیم، زمزم اور حطیم شامل ہیں۔ (۳) یہ کہ جو شخص حرم میں داخل ہوجائے اسے امن حاصل ہوجاتا ہے۔

شرف والی عمارت:

بعض اللہ والوں کا قول ہے کہ پورے عالم میں کعبہ سے زیادہ شرف والی کوئی عمارت نہیں ہے۔ اس کی تعمیر کا حکم رب جلیل نے دیا، اس کا نقشہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے بنایا، اس کے معمار حضرت خلیل علیہ السلام تھے اور معاون اور

مزدور کے طور پر حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کام کیا۔ دنیا بھر میں یہی وہ عبادت گاہ ہے، جس کی زیارت کے لیے سفر کرنے کا مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے۔

جو شخص سفر وغیرہ کے اخراجات برداشت کرسکتا ہو اور وجوب حج کی دوسری شرائط بھی پائی جائیں تو اس پر فوراً حج کرنا فرض ہو جاتا ہے، بلا عذر تاخیر کرنے سے وہ گناہ گار ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ جس شخص پر حج فرض ہے۔ اور وہ اس کے لیے کوشش نہیں کرتا، درخواست نہیں دیتا، تو ہماری طرف سے ایسا شخص یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر، ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ ایسے شخص کو کوئی حادثہ پیش آجائے، مال میں کمی ہو جائے یا کسی اور تکلیف میں مبتلا ہو جائے ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۰۳)

سب سے پہلی عبادت گاہ:

کعبہ سے پہلے دنیا میں کوئی عبادت گاہ نہیں تھی، صحیحین میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! زمین پر سب سے پہلی مسجد کون سی تعمیر کی گئی تھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مسجد حرام۔ (خلاصۃ القرآن)

تاریخ تعمیر کعبہ:

سب سے پہلے حضرت آدم (علیہ السلام) نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کی۔ اور اس کی تجدید حضرت ابراہیم کے ذریعے سے ہوئی، اس کے بعد قبیلۂ جرہم نے تعمیر کی۔ یہ حضرت اسماعیلؑ کے سسرال کا خاندان ہے۔ پھر قوم عمالقہ کا ذکر ملتا ہے۔ اور اس کے بعد قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلان نبوت سے پانچ سال قبل بیت اللہ شریف کی تعمیر کی جب اس کی چھت کمزور ہو چکی تھی۔ یہ وہی تعمیر ہے جس کے دوران حطیم کا حصہ خانہ کعبہ سے باہر نکالا گیا تھا، جو آج بھی اسی حالت میں ہے۔ اس کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی۔ پھر عبدالملک بن مروان کے زمانے میں حجاج بن یوسف نے بیت اللہ کو گرا کر نئے سرے سے تعمیر کیا۔ اور پھر یہ آخری تعمیر ترکی عہد حکومت میں سلطان مراد کے زمانے میں ہوئی، جو اب تک قائم ہے۔ البتہ موجودہ سعودی حکومت نے حرم شریف کی تعمیر میں گراں قدر خدمات انجام دیں ہیں۔

(معالم العرفان: ۴/ ۳۱۸، سیرت حلبیہ)

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

کہہ دو کہ: اے اہل کتاب! اللہ کے راستے میں ٹیڑھ پیدا کرنے کی کوشش کر کے ایک مومن کے لیے اس میں کیوں رکاوٹ ڈالتے ہو جبکہ تم خود حقیقت حال کے گواہ ہو؟ جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔

اوس اور خزرج کے قبائل مدینے میں سینکڑوں سال سے آباد تھے، کافی بڑی تعداد والے قبیلے تھے۔ ان کا اصل تعلق یمنی خاندانوں سے تھا، مگر مدینے میں آکر آباد ہو گئے۔ مشہور ہے کہ یہ دونوں قبیلے ایک معمولی سی بات پر لڑائی میں ملوث

ہوئے اور یہ لڑائی ایک سوبیس (۱۲۰) سال تک چلتی رہی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ورود مدینہ کے بعد یہ لوگ مسلمان ہو گئے اور اپنی تمام پرانی رنجش ترک کر کے آپس میں شیر وشکر ہو گئے۔ یہودی مسلمانوں کو کسی صورت پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے تھے، کسی مجلس میں ان دونوں قبائل کے لوگ موجود تھے۔ وہاں شماس ابن قیس یہودی نے یہ اشعار پڑھے یا پڑھوائے جس سے ان دونوں قبیلوں کی پرانی حمیت جاہلیہ پھر بیدار ہوگئی، قریب تھا کہ ان میں پھر فساد کی آگ بھڑک اٹھتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں تشریف لے آئے اور فرمایا، بڑے افسوس کی بات ہے کہ میں اللہ کا پیغمبر تمہارے درمیان موجود ہوں، مگر تم پھر پرانی عصبیت کی باتیں کرنے لگے ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لوگوں کو سخت تنبیہ فرمائی، تو وہ تائب ہو کر لڑائی سے باز آ گئے۔ تاہم یہودیوں نے ان مسلمان قبیلوں کو لڑانے کی پوری کوشش کی، تاکہ یہ اسلام سے بدظن ہو کر دوبارہ کفر کا راستہ اختیار کریں۔ اللہ نے فرمایا: تم ایسا برا کام کیوں کرتے ہو۔

موجودہ زمانے کے یہودی بھی اسلام کے خلاف سازش کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے کہ انہوں نے مصر سے تحریف شدہ قرآن پاک شائع کر کے پوری دنیا میں تقسیم کیا۔ آیت کریمہ ''ومن یبتغ غیر الاسلام دینا'' میں لفظ غیر کو اڑا کر اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی، کبھی الفاظ بدلے، کبھی معنی بدلے اور کبھی قرآن پاک میں موجود پیش گوئیوں کو جھٹلانے کی کوشش کی؛ تاکہ مسلمانوں میں اشتباہ پیدا ہو جائے اور وہ اسلام سے بدظن ہو جائیں، ان کا مقصد یہی ہے کہ اسلام میں کجی تلاش کی جائے اور پھر اسے خوب مشتہر کیا جائے۔ مستشرقین نے اس ضمن میں بڑی کوششیں کی ہیں۔ وہ علوم شرقیہ پر عبور حاصل کر کے قرآن وحدیث کی تفسیر وتشریح کرتے ہیں اور پھر ان میں نہایت ہوشیاری کے ساتھ باطل نظریات داخل کر دیتے ہیں، تاکہ لوگ اسلام سے بیزار ہو جائیں۔ (معارف القرآن ادریسی: ۲/۲۱، ماجدی: ۱/۶۳۰، معالم العرفان: ۴/۳۲۵، ۳۲۶)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

اے ایمان والو! دل میں اللہ کا ویسا ہی خوف رکھو جیسا خوف رکھنا اس کا حق ہے، اور خبردار! تمہیں کسی اور حالت میں موت نہ آئے، بلکہ اسی حالت میں آئے کہ تم مسلمان ہو۔

حق تقوی:

مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے: کہ وہ اللہ سے ڈرتے رہیں جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھیں اور گروہ در گروہ تقسیم نہ ہو جائیں۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ڈرنے کا حق یہ ہے کہ اللہ تعالی کی اطاعت کی جائے، نافرمانی نہ کی جائے، اسے یاد رکھا جائے، بھلایا نہ جائے، اس کا شکر یہ ادا کیا جائے اور کفران نعمت نہ کیا جائے۔ (ابن کثیر: ۱/۳۰۴)

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص

اور اللہ کی رسی کو سب ملکر مضبوطی سے تھامے رکھو، اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔

عبداللہ بن مسعود کی روایت میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **القرآن ھو حبل اللہ المتین** یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے۔ **والنور المبین** یہ روشنی دینے والا نور ہے۔ مسلم شریف کی حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **ان اللہ یرضی لکم ثلاثا**. اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تین چیزوں کو پسند فرماتا اور تین چیزوں کو ناپسند کرتا ہے۔ فرمایا: اللہ کی پسندیدہ چیزیں یہ ہیں۔ **ان تعبدہ** کہ تم اس کی عبادت کرو **و لا تشر کوا بہ شیئا** اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ تیسری پسندیدہ چیز فرمایا **تعتصموا بحبل اللہ جمیعا و لا تفرقوا** اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو۔ اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ پھر فرمایا: تین ناپسندیدہ چیزوں میں **قیل قال** یعنی بیہودہ اور بلا مقصد بات چیت، **کثرت سوال** اور **اضاعۃ المال** ہیں، کثرت سوال سے مراد یہ ہے کہ لوگ مسائل دریافت کرنے میں تو بال کی کھال اتارتے ہیں، مگر عمل صفر ہے۔ اور مال کا ضیاع یہ ہے کہ فضول رسومات، بدعات اور حرام جگہوں پر خرچ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو ہرگز یہ پسند نہیں کہ اس کے دیے ہوئے مال کو اس کی رضا کے خلاف خرچ کیا جائے۔ الغرض! حبل اللہ سے مراد قرآن پاک ہے جسے مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کی نصیحت کی گئی ہے۔ (ابن کثیر: ۱/۳۰۵)

تفریق بین المسلمین:

ارشاد ہوتا ہے، سب کے سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔ **و لا تفرقوا**. تفرقہ اور اختلاف نہ کرو۔ امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ اس مقام پر جس اختلاف سے منع کیا گیا ہے۔ وہ اصول کا اختلاف ہے، کیونکہ فروعات میں اختلاف کرنا مباح ہے، فروعی اختلافات کے ذریعے انسان کی عبادت درست ہوتی ہے۔ مختلف حالات میں احکام مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً حائضہ عورت اور جنبی کے لیے نماز حرام ہے، لیکن ایک عام مکلف کے لیے فرض ہے۔ مسافر اور مریض کے لیے روزہ میں کھانا حلال ہے مگر مقیم اور تندرست کے لیے حرام ہے، یہ فروعی اختلافات ہیں۔ ائمہ دین جیسے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ رحمہم کا بعض فروعات میں آپس میں اختلاف ہے یہ روا ہے، بشرطیکہ تعصب سے پرہیز کیا جائے۔ اکثر لوگ تعصب سے کام لیتے ہوئے اپنے مسئلہ پر اڑ جاتے ہیں۔ اسی کو درست سمجھتے ہوئے دوسرے مسلک والوں کو جہنمی قرار دے دیتے ہیں، یہ جہالت اور نادانی ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے، البتہ اگر دین کے کسی اصول میں اختلاف کرے گا تو گمراہ ہو جائے گا۔ (تفسیر مظہری)

وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِؕ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴿۱۰۴﴾

اور تمہارے درمیان ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جس کے افراد (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائیں، نیکی کی تلقین کریں، اور برائی سے روکیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔

مفسر قرآن امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ **ولتکن منکم امۃ** کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تبلیغ دین کا کام فرض کفایہ ہے؛ کیونکہ یہ کام ایک گروہ یا جماعت کے سپرد کیا گیا ہے، سب کے سب مسلمانوں کو یہ حکم نہیں ہے۔ اگر یہ کام تمام اہل اسلام کے لیے ضروری ہوتا تو نماز، روزہ وغیرہ کی طرح فرض عین ہوتا، فرض کفایہ کا حکم یہ ہے کہ اگر عامۃ المسلمین میں سے کچھ لوگ بھی اس کو ادا کرلیں تو سب کی طرف سے ادا ہو جائے گی اور اگر کوئی شخص بھی اس فرض کو پورا نہ کرے، تو سب کے سب گنہگار رہوں گے۔

بعض مفسرین اور علمائے کرام فرماتے ہیں کہ برائی کو طاقت سے روکنے کے لئے حکومت کے علاوہ بعض دوسرے لوگ بھی مکلف ہیں، انسان اپنے گھر میں یا اپنے ماحول میں جہاں بھی برائی کو بزور طاقت روک سکتا ہے، وہاں وہ ایسا کرنے کا پابند ہو جاتا ہے؛ کیونکہ ایسے شخص کو اپنے گھر میں یا حلقہ اثر میں اختیار حاصل ہوتا ہے۔ بخاری شریف کی روایت میں موجود ہے **کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته**. تم میں سے ہر شخص اپنے حلقہ اثر میں حاکم ہے اور تم سے اپنی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی۔ لہذا ہر شخص کے لیے لازم ہے کہ جہاں بھی طاقت پاتا ہے، برائی کو روکنے کی کوشش کرے۔ اگر اس ضمن میں غفلت کا مظاہرہ کرے گا تو مجرم ٹھہرے گا۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ کسی مسئلہ میں قدرت ہونے میں یہ شرط بھی داخل ہے کہ وہ مسائل دین سے واقف بھی ہو، اگر کوئی شخص دینی مسائل کو جانتا ہی نہیں تو عمل کیسے کرائے گا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ جاہل لوگوں کا وعظ سننا بھی درست نہیں۔ ایسا شخص جھوٹی روایتیں بیان کر کے غلط مسئلے پیش کرے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی عالم نہیں جاہل ہے، لہذا اس کے وعظ سے بھی اجتناب کرنا چاہیۓ۔

یعنی تقویٰ، اعتصام بحبل اللہ، اتحاد و اتفاق، قومی زندگی، اسلامی مواخات، یہ سب چیزیں اس وقت باقی رہ سکتی ہیں جبکہ مسلمانوں میں ایک جماعت خاص دعوت و ارشاد کے لئے قائم رہے۔ اس کا وظیفہ یہ ہی ہو کہ اپنے قول و عمل سے دنیا کو قرآن وسنت کی طرف بلائے اور جب لوگوں کو اچھے کاموں میں سست یا برائیوں میں مبتلا دیکھے، اس وقت بھلائی کی طرف متوجہ کرنے اور برائی سے روکنے میں اپنے مقدور کے موافق کوتاہی نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام وہ ہی حضرات کر سکتے ہیں جو معروف و منکر کا علم رکھنے اور قرآن وسنت سے باخبر ہونے کے ساتھ ذی ہوش اور موقع شناس ہوں، ورنہ بہت ممکن ہے کہ ایک جاہل آدمی معروف کو منکر یا منکر کو معروف خیال کر کے بجائے اصلاح کے سارا نظام ہی مختل کر دے، یا ایک منکر کی اصلاح کا ایسا طریقہ اختیار کرے جو اس سے بھی زیادہ منکرات کے حدوث کا موجب ہو جائے، یا نرمی کی جگہ سختی اور سختی کے موقع میں نرمی برتنے لگے۔ شاید اسی لئے مسلمانوں میں سے ایک مخصوص جماعت کو اس منصب پر مامور کیا گیا جو ہر طرح دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہل ہو۔

حدیث میں ہے: جب لوگ منکرات میں پھنس جائیں اور کوئی روکنے والا نہ ہو تو عام عذاب آنے کا اندیشہ ہے۔

باقی یہ کہ کن احوال واوقات میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ترک میں آدمی معذور سمجھا جاسکتا ہے اور کن مواقع میں واجب یا مستحب ہے، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، ابوبکر رازی نے احکام القرآن میں اس پر نہایت مبسوط کلام کیا ہے۔ فلیراجع۔ (تفسیر عثمانی:۸۱)

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

(مسلمانو) تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لیے وجود میں لائی گئی ہے، تم نیکی کی تلقین کرتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو یہ ان کے حق میں کہیں بہتر ہوتا، ان میں سے کچھ تو مومن ہیں، مگر ان کی اکثریت نافرمان ہے۔

آیت کے اس جزء میں امت اسلامی کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی زندگی کے کامل ومکمل ہونے کا پورا نقشہ آگیا۔ مطلب یہ ہوا کہ اے مسلمانو! تم اپنی ذمہ داری پوری طرح محسوس کرو، تم توحید کے امانت دار ہو، زمین پر اللہ کے نائب وخلیفہ ہو، بہ طور اس کی پولیس کے ہو۔ الٰہی قانون کے نفاذ وتحفظ کے لیے، دنیا کے نظام عدل کو برقرار رکھنے کے لیے بھیجے گئے ہو۔

کیا تماشہ ہے کہ انگریز ہندوستان میں ستی کی رسم کو جرم قرار دے دیں تو وہ ملک کے محسن، ہندوؤں میں بچپن کی شادیوں کے دستور کو روک دیں تو ان کا شکریہ واجب؛ لیکن اللہ کے سپاہی اور مالک الملک کے پیارے اگر یہ حق حاصل کرنا چاہیں کہ قانون الٰہی سے بغاوت کرنے والوں اور امن عالم کو غارت کر کے رکھ دینے والوں کی دار وگیر کریں تو ''روشن خیالی'' کے جبین تحمل پر شکن آجائے اور ''تہذیب'' کا پروپیگنڈسٹ اسے رواداری کے خلاف قرار دینے لگے۔

''تنھون عن المنکر''۔ منکر کے تحت میں آج کے شراب خانہ اور تھیٹر، سینما اور کنسرٹ ہال، ناچ گھر اور میوزک کالج، اسکول آف آرٹ اور تصویر خانے سب آجاتے ہیں، آیت سے ظاہر ہے کہ اس امت کی خیریت وافضلیت اسی وقت تک ہے جب تک وہ ان صفات کی حامل ہے۔ یعنی ایمان باللہ میں مضبوط ہے، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (ایجابی وسلبی دونوں قسم کی اخلاقی خوبیوں) پر قائم ہے۔

امت مسلمہ تمام امتوں سے افضل اور بہترین امت ہے اور اس کے افضل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دوسری امتوں کے برعکس یہ ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتی ہے جن پر ایمان رکھنے کا اللہ تعالی نے حکم دیا ہے، علاوہ ازیں یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتی ہے جو دینی ذمہ داری اور مذہبی فریضہ بھی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: جس کا دل چاہتا ہے کہ اس کا شمار اس امت مسلمہ میں سے ہو، اسے چاہیے کہ وہ اس بارے میں اللہ کی شرط کو پورا کرے۔ آپ کا ارشاد اسی آیت کریمہ کی طرف ہے جس میں ملت اسلامیہ کی مذکورہ بالا تین صفات بیان کی گئی ہیں۔

جب تک امت میں یہ تین خصوصیات موجود رہیں گی وہ فضیلت اور اللہ کی خصوصی عنایت کا حقدار رہے گی اور اگر خدانخواستہ امت کا کوئی گروہ یا فرد ان تین اوصاف سے محروم ہوگیا تو وہ فضیلت کا حقدار نہیں رہے گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے تم نیکی کا حکم دیتے رہو اور برائی سے روکتے رہو ورنہ ممکن ہے کہ اللہ تعالی تمہارے اوپر اپنا عذاب مسلط کر دے پھر تم اس سے دعائیں مانگو گے مگر تمہاری دعائیں قبول نہیں ہوں گی۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

وہ جہاں کہیں پائے جائیں، ان پر ذلت کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہے، الا یہ کہ اللہ کی طرف سے کوئی سبب پیدا ہو جائے یا انسانوں کی طرف سے کوئی ذریعہ نکل آئے جو ان کو سہارا دے دے، انجام کار وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے ہیں اور ان پر محتاجی مسلط کر دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے، اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ (نیز) اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے، اور ساری حدیں پھلانگ جایا کرتے تھے۔

قرآن میں یہودیوں کی ذلت کا ذکر بہت سے دوسرے مقامات پر بھی موجود ہے، ان کی رسوائی کے متعلق پہلی بات تو یہ ہے کہ یہودی سیاسی عروج اور اقتدار سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ گذشتہ اڑھائی ہزار سالہ تاریخ سے ظاہر ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں ان کو اقتدار حاصل نہیں ہوا۔ اس سے پہلے ان کی عظیم الشان سلطنتیں تھیں، مگر اب اس سے محروم ہیں۔ اور محکومی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

این ما ثقفوا کا یہی مطلب ہے کہ یہ لوگ جہاں کہیں بھی ہیں ذلیل و خوار ہو کر ہی گزر اوقات کر رہے ہیں۔ یہودیوں کی ذلت کی دوسری بات یہ ہے کہ یہ لوگ عزت نفس سے محروم رہے ہیں۔ کروڑ پتی ہونے کے باوجود بھکاریوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مال سے محبت، ہر کام میں سازش اور ہر قوم سے مکاری اور چالاکی ان کی خصوصیت رہی ہے۔ ان کو کہیں بھی آرام سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا۔ ایک جگہ شرارت کی تو دوسری جگہ چلے گئے، وہاں سازش کی تو وہاں سے نکالے گئے۔

اب موجودہ زمانے میں صورت حال مختلف ہے۔ تقریباً ستر سال قبل اسرائیل کی حکومت قائم ہوئی اور یہودیوں کو ٹھکانا نصیب ہوا۔ اس پر چہ میگوئیاں ہونے لگی ہیں کہ کیا قرآن پاک کا دعوی معاذ اللہ غلط ثابت ہوا ہے کہ یہودیوں پر ذلت مسلط کر دی گئی اور وہ اقتدار سے محروم ہیں۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ یہودیوں کی موجودہ حکومت کی کوئی بنیاد نہیں، ان کا موجودہ اقتدار محض حبل من الناس کی بدولت ہے۔ ناس سے مراد غیر ملکی طاقتیں ہیں۔ جن میں کچھ عیسائی ہیں اور

کچھ دہریہ ہیں۔ اسرائیل ان کی مشترکہ چھاؤنی ہے۔ جسے اردگرد کے مسلمان ملکوں کو تنگ کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اسرائیل کا قیام ان چاروں عالمی طاقتوں کی مسلمانوں کے خلاف سازش کا نتیجہ ہے۔ اگر آج یہ قوتیں اسرائیل سے اپنا سایہ اٹھالیں، تو یہودی ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ امریکہ اس سازش میں مرکزی کردار ادا کررہا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوا۟ بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا ۙ وَدُّوا۟ مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ ٱلْبَغْضَآءُ مِنْ أَفْوَٰهِهِمْ ۖ وَمَا تُخْفِى صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ ٱلْءَايَٰتِ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۱۱۸﴾

اے ایمان والو! اپنے سے باہر کے کسی شخص کو راز دار نہ بناؤ، یہ لوگ تمہاری بدخواہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم تکلیف اٹھاؤ، بغض ان کے منہ سے ظاہر ہو چکا ہے اور جو کچھ (عداوت) ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں وہ کہیں زیادہ ہے۔ ہم نے پتے کی باتیں تمہیں کھول کھول کر بتادی ہیں، بشرطیکہ تم سمجھ سے کام لو۔

تنبیہ:

شریعت اسلامی کا یہ حکم کہ غیر مسلم کو اپنا دوست اور رازدار نہ بنایا جائے اور امور مملکت میں اس کو دخیل نہ بنایا جائے عین حق اور عین حقیقت ہے، یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ غیر مذہب والا اپنے مذہب اور اپنے اہل مذہب ہی کی خیر خواہی کرتا ہے اور دوسرے اہل مذہب کی خیر خواہی نہیں کرتا، تمام مغربی ممالک کو دیکھ لیجئے کہ وہ کبھی بھی کسی مسلمان کو وزارت اور سفارت کا منصب سپرد نہیں کرتے، مگر افسوس کہ آج کل کے نام نہاد مسلمان جب اس قسم کا حکم سنتے ہیں تو اس کو تعصب اور تنگ نظری سمجھتے ہیں حالانکہ اگر ان کو اپنے حقیقی بھائی کی خیر خواہی پر اطمینان نہ ہو تو اس کو بھی اپنا بِطانہ بنانا گوارا نہیں کرتے، مگر جب اللہ یہ فرماتا ہے کہ اے مسلمانو! جو شخص اسلام کا اور مسلمانوں کا خیر خواہ نہ ہو بلکہ ان کا دشمن اور حاسد ہو اس کو اسلامی حکومت میں کوئی عہدہ اور منصب نہ دو تو یہی لوگ اللہ کے اس قانون پر نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں۔

(معارف القرآن ادریسی: ۲/۴۱)

منافقین اور کفار سے قلبی دوستی لگانے سے منع کیا گیا ہے اور اس کے چار اسباب بتائے گئے ہیں۔

پہلا: یہ کہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔

دوسرا: یہ کہ وہ دل سے چاہتے ہیں کہ تمہیں دین اور دنیا کے اعتبار سے مصیبت اور پریشانی لاحق ہو۔

تیسرا: یہ کہ ان کے چہرے اور ان کی باتوں سے تمہارے لیے بغض وعداوت ظاہر ہوتا ہے۔

چوتھا: یہ کہ ان کے دلوں میں جو بغض اور حسد پوشیدہ ہے وہ ان کی علانیہ باتوں سے کہیں زیادہ سخت ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ ٱللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ ۖ فَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۲۳﴾

اللہ نے تو (جنگ) بدر کے موقع پر ایسی حالت میں تمہاری مدد کی تھی جب تم بالکل بے سروسامان تھے۔ لہذا (صرف) اللہ کا خوف دل میں رکھو، تاکہ تم شکر گزار بن سکو۔

غزوۂ بدر:

بدر ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان مدینہ سے ستر یا اسی میل کے فاصلے پر ہے۔ دراصل جاہلیت کے زمانے میں بدر بن قیس یا امام ابن کثیر کے مطابق بدر ابن نارین نامی ایک شخص نے اس مقام پر کنواں کھودا تھا، جس کے نام پر، اس کنویں کا نام بدر مشہور ہو گیا، اور اسی نسبت سے اس جگہ کا نام بھی بدر ہی پڑ گیا۔ چار پانچ میل کا یہ ایک میدانی علاقہ ہے جس کے اردگرد پہاڑیاں ہیں، تاہم ساحل سمندر سے قریب ہی ہے۔ اس مقام پر بروز جمعہ سترہ ماہ رمضان/ ۲ھ میں اہل حق اور اہل باطل کے درمیان ایک عظیم واقعہ پیش آیا، جو مسلمانوں کے لیے ہجرت کے بعد سب سے اہم لڑائی تھی۔ اس سے پہلے چھوٹی چھوٹی دو تین جھڑپیں ہو چکی تھیں، تاہم یہ سب سے بڑا معرکہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ انفال میں جنگ بدر کو یوم الفرقان سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ حق و باطل کے درمیان عظیم فیصلے کا دن تھا۔

منافقوں کو راز دار اور دلی دوست بنانے سے منع کرنے کے بعد غزوۂ بدر کا ذکر ہے جسے تمام اسلامی غزوات کا تاج ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس غزوہ کے شرکاء نے جہاں خود جرأت اور بہادری کی انوکھی مثالیں قائم کی، وہیں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور غیبی مدد کے مظاہر اپنی آنکھوں سے دیکھے، مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی، اسلحہ بھی نہ ہونے کے برابر تھا، اس غزوہ سے دو بڑے سبق مسلمانوں کو حاصل ہوئے۔

پہلا: یہ کہ جنگ میں فتح صرف اسلحہ کی کثرت اور افرادی قوت کی بنا پر حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی بنیادی شرط ایمان و یقین، اتباع اور استقامت ہے۔

دوسرا: یہ کہ جب تک مسلمان حق پر ثابت قدم رہیں گے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہیں گے، انہیں اللہ کی مدد حاصل رہے گی اور وہ غالب رہیں گے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿١٣٠﴾

اے ایمان والو! کئی گنا بڑھا چڑھا کر سود مت کھاؤ، اور اللہ سے ڈرو تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔

غزوہ احد میں مسلمانوں کی طرف سے کمزوری واقع ہو گئی تھی لہذا اس میں نقصان اٹھانا پڑا۔ پھر احد کی جنگ میں شریک ہونے والے مشرکین کے حق میں بددعا کرنے سے اللہ نے منع فرما دیا۔ بدر میں کامیابی کا راز بتایا کہ مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات پر مکمل بھروسہ کیا، اور صبر اور تقوی کو اختیار کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت تامہ اور حکمت بالغہ کے ساتھ کامیابی عطا فرمائی۔ ان غزوات کے تذکرہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے درمیان میں سود کی حرمت کا حکم نازل فرمایا ہے۔ اور ساتھ ہی انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دی ہے۔ سود اور انفاق فی سبیل اللہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ اول الذکر سے اخلاق بگڑتا ہے اور ثانی الذکر سے اخلاق میں عمدگی آتی ہے، لہذا دونوں چیزوں کو اکٹھا بیان فرما کر ترہیب و ترغیب کا سامان پیدا فرمایا ہے۔

جنگ احد کے تذکرہ میں سود کی ممانعت کا ذکر بظاہر بے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ مگر شاید یہ مناسبت ہو کہ اوپر اِذْ هَمَّتْ

طَّآىِٕفَتٰنِ مِنۡكُمۡ اَنۡ تَفۡشَلَا (آل عمران: ۱۲۲) میں ''جہاد'' کے موقع پر نامردی دکھلانے کا ذکر ہوا تھا۔ اور سود کھانے سے نامردی پیدا ہوتی ہے، دو سبب سے۔ ایک یہ کہ مال حرام کھانے سے توفیق طاعت کم ہوتی ہے اور بڑی طاعت جہاد ہے، دوسرے یہ کہ سود لینا انتہائی بخل پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ سود خوار چاہتا ہے کہ اپنا مال جتنا دیا تھا لے لے اور بیچ میں کسی کا کام نکلا، یہ بھی مفت نہ چھوڑے۔ اس کا علیٰحدہ معاوضہ وصول کرے۔ تو جس کو مال میں اتنا بخل ہو کہ خدا کے لئے کسی کی ذرہ بھر ہمدردی نہ کر سکے وہ خدا کی راہ میں جان کب دے سکے گا۔

ابو حیان نے لکھا ہے کہ اس وقت یہود وغیرہ سے مسلمانوں کے سودی معاملات اکثر ہوتے رہتے تھے۔ اسی لئے ان سے تعلقات قطع کرنا مشکل تھا چونکہ پہلے لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً کا حکم ہو چکا ہے، اور احد کے قصہ میں بھی منافقین یہود کی حرکات کو بہت دخل تھا، اس لئے متنبہ فرمایا کہ سودی لین دین ترک کرو ورنہ اس کی وجہ سے خواہی نہ خواہی ان ملعونوں کے ساتھ تعلقات قائم رہیں گے جو آیندہ نقصان اٹھانے کا موجب ہوں گے۔ (تفسیر عثمانی: ۸۶)

سود کم بخت کی خاصیت ہی یہ ہے کہ جو مفلس ہیں وہ مفلس تر اور جو امیر ہیں وہ امیر تر ہوتے جاتے ہیں۔ آیت میں سود کے اسی دوگنے چوگنے ہو جانے والے وصف کی طرف اشارہ ہے، یہ مراد نہیں کہ سود مرکب نہ لو اور سود مفرد لے سکتے ہو۔ (ماجدی: ۶۵۰)

غزوۂ احد:

غزوہ بدر کا ذکر سورہ آل عمران میں محض حوالے کے طور پر آیا ہے، ورنہ اصل میں یہاں غزوۂ احد کا ذکر مقصود ہے جو کہ پچپن آیات میں مکمل ہوا۔ ان آیات میں شکست کے اسباب اور حکمتیں بیان کی گئی ہیں، تنبیہ بھی ہے، فہمائش بھی ہے، تنقید بھی ہے، تعریف بھی ہے، جیسا کہ تاریخ اسلام سے معمولی شد بد رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ غزوہ بدر میں قریش ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوئے تھے، انہوں نے اس شکست کا انتقام لینے کے لیے بھرپور تیاری کے بعد شوال ۳ھ میں ابوسفیان کی قیادت میں مدینہ منورہ پر چڑھائی کر دی۔

قریش کا لشکر تین ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھا، جس میں دو سو گھڑ سوار، سات سو زرہ پوش اور تین ہزار اونٹ تھے، پانچ سو عورتیں بھی ساتھ تھیں۔

قریش کے تین ہزار کے لشکر کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد صرف سات سو تھی۔

جبل الرماۃ:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کی قیادت میں پچاس سواروں کا ایک دستہ اپنے عقب کی پہاڑی پر متعین فرما دیا، اس پہاڑی کو ''جبل الرماۃ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، آپ نے اس دستے کو تاکید فرمادی کہ فتح ہو یا شکست کسی صورت بھی یہاں سے نہ ہٹیں، یہاں تک کہ اگر تم دیکھو کہ پرندے ہماری لاشیں نوچ رہے ہیں تو بھی یہاں سے نہ ہلنا۔

سپہ سالار اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی مجاہدین کو میدان میں اس طرح پھیلا دیا تھا کہ قریشی لشکر دو بدو مقابلہ کر نے پر مجبور ہو گیا اور اس کے لیے اپنے سواروں کو استعمال کرنا ممکن نہ رہا، انفرادی مقابلوں میں قریش کے آٹھ علمبردار قتل ہو گئے جس سے قریشی لشکر کی ہمتیں پست ہوئیں، حضرت علی، حضرت حمزہ اور حضرت ابو دجانہ رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے اسلامی شیروں کے حملے اس قدر شدید تھے کہ مشرکوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

قریشی لشکر کی شکست دیکھ کر ''جبل رماۃ'' کے تیر اندازوں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور دس مجاہدین کے سوا سب مال غنیمت جمع کرنے میں مصروف ہو گئے۔

خالد بن ولیدؓ نے اس وقت ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا جو کہ اب تک عقب سے حملہ کرنے میں نا کام رہا تھا اسے سنہری موقع ہاتھ آ گیا اور اس نے ''جبل رماۃ'' پر موجود چند تیر اندازوں کو روندتے ہوئے زوردار حملہ کر دیا۔ اسلامی فوج اس شدید حملے سے غافل تھی، ادھر جب بھاگتے ہوئے قریشی پیادے کے سپاہیوں کو اس حملے کی خبر ملی تو وہ بھی پلٹ پڑے، اب اسلامی لشکر دوطرفہ حملے کا شکار ہو گیا، یوں بظاہر ایک چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے مسلمانوں کی فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔

جنگ میں جانی نقصان:

اس لڑائی میں بائیس مشرک قتل ہوئے جبکہ دوسری طرف ستر صحابہ شہید ہوئے، سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی اس میں شامل تھے، قریشی لشکر اس پوزیشن میں تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کے دلوں کو پھیر نہ دیتا تو وہ اسلامی لشکر کا مکمل خاتمہ کر سکتا تھا؛ لیکن موقع ملنے کے باوجود وہ ادھوری فتح پر ہی اکتفاء کرتے ہوئے مکہ لوٹتا ہوا نظر آیا۔

منافقین نے اپنی فطرت کے مطابق وسوسہ اندازی شروع کی کہ اگر مسلمان حق پر ہوتے تو انہیں ہرگز شکست نہ ہوتی، اس لیے پچپن آیات میں غزوہ احد پر تبصرہ کرنے کے بعد منافقین کا تذکرہ ہے جو فتنہ فساد کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

احد کے شہداء کی تدفین سے فارغ ہونے کے بعد ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ ابوسفیان کو ''روحاء'' کے مقام پر پہنچ کر اپنی اس غلطی کا احساس ہوا ہے کہ میں جنگ کے اہداف پوری طرح حاصل کیے بغیر لوٹ آیا ہوں اور اپنے ساتھیوں کی ملامت کی وجہ سے وہ دوبارہ مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کر رہا ہے۔

آپ اس کے ارادے کی خبر سن کر خود ہی قریشی لشکر کے تعاقب میں چل پڑے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ تعاقب میں صرف انہی مجاہدین کو جانے کی اجازت ہے جو کل کی جنگ میں شریک تھے۔

آپ اندازہ کیجئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ایمان ویقین اور عزمِ وفا کا کہ ابھی ابھی ستر شہداء کو دفن کر کے فارغ ہوئے ہیں، زخموں اور تھکاوٹ سے نڈھال ہیں لیکن انہوں نے اپنے محبوب آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر

لبیک کہا اور انتہائی سرعت سے سفر کرتے ہوئے مدینہ سے آٹھ میل دور ''حمراء الاسد'' کے مقام تک جا پہنچے، اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے دل میں رعب ڈال دیا اور وہ تیزی سے مکہ کی جانب کوچ کر گئے۔

غزوہ حمراء الاسد:

مذکورہ مقام کی مناسبت سے اسے ''غزوہ حمراء الاسد'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس غزوہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

جن لوگوں نے جنگ میں زخمی ہونے کے باوجود اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر لبیک کہا ان میں سے جو نیک اور پرہیزگار رہیں ان کے لیے اجر عظیم ہے۔'' (۱۷۲)

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾

تم سے پہلے بہت سے واقعات گزر چکے ہیں، اب تم زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جنہوں نے (پیغمبروں کو) جھٹلایا تھا ان کا انجام کیسا ہوا؟

''سیروا۔ فانظروا'' دونوں صیغہ امر کے ہیں۔ لیکن مقصود سیاحت نہیں بلکہ سرکش جاہلی قوموں سے عبرت حاصل کرنا ہے۔ خواہ جس ذریعہ سے بھی حاصل ہو، سیاحت سے، تاریخ سے، وقس علی ہذا۔ **ليس المراد الامر بذالك لا محالة بل المقصود تعرف احوالهم فان حصلت هذه المعرفة بغير السير في الارض كان المقصود حاصلا.** (کبیر)

تاریخ اثریات وغیرہ کا مطالعہ اگر صحیح نقطہ نظر اور ایمان و معرفت کے پہلو سے کیا جائے تو یہ بجائے خود ایک جہاد ہے۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾

اور اللہ نے یقیناً اس وقت اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا جب تم دشمنوں کو اسی کے حکم سے قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم نے کمزوری دکھائی اور حکم کے بارے میں باہم اختلاف کیا اور جب اللہ نے تمہاری پسندیدہ چیز تمہیں دکھائی، تو تم نے (اپنے امیر کا) کہنا نہیں مانا، تم میں سے کچھ لوگ وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے، اور کچھ وہ تھے جو آخرت چاہتے تھے۔ پھر اللہ نے ان سے تمہارا رخ پھیر دیا تاکہ تمہیں آزمائے۔ البتہ اب وہ تمہیں معاف کر چکا ہے، اور اللہ مومنوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ اس مقام پر بعض حضرات نے غلطی کھائی ہے کہ کیا بعض صحابہ کرام واقعی دنیا کے طالب تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ تمام صحابہ سچے اور مخلص اہل ایمان تھے ان میں محض دنیا کا طالب کوئی بھی نہیں تھا۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے۔ وہ اپنے مقربین کی معمولی سی لغزش کا بھی نوٹس لیتا ہے، صحابہ کرام بڑے پائے کے ربی لوگ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس معمولی سی غلطی پر بھی انہیں

آزمائش میں ڈال دیا۔ اس موقع پر ان کا مال غنیمت کا تعاقب بھی محض دنیا کے لیے نہیں بلکہ آخرت ہی کے لیے تھا۔ شرعی قانون کے مطابق مال غنیمت میں سے ہر مجاہد کو حصہ ملتا ہے، خواہ وہ خود اسے جمع کرے یا کوئی دوسرا یہ فرض انجام دیتا رہے، لہذا ان صحابہ کا مورچہ چھوڑ کر مال غنیمت جمع کرنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو حصہ سے محروم ہو جائیں گے۔ بلکہ یہ فریضہ بھی وہ تمام مسلمانوں کے مشترکہ مقصد کی خاطر ہی ادا کر رہے تھے۔ لہذا مال غنیمت کے تعاقب کو طلب دنیا سے تعبیر کرنا درست نہیں ہے۔ ان کے دوسرے ساتھی جو مورچے پر قائم رہے اور غنیمت کا کچھ خیال نہ کیا، وہ دنیا کی طلب کے بغیر محض آخرت کے طالب تھے۔ گویا دونوں گروہ درحقیقت آخرت ہی کے طلبگار تھے۔ ایک گروہ دنیا کے راستے آخرت کا طالب تھا اور دوسرا براہ راست آخرت چاہتا تھا۔ دنیا سے رغبت کسی کو نہ تھی چونکہ اس وقت مال غنیمت سامنے موجود تھا، اس لیے اسے طلب دنیا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بایں ہمہ صحابہ کرام کی دنیا داری سے مراد وہ دنیا طلبی نہیں ہے جو ہماری اور بعد میں آنے والے لوگوں کی ہے۔ ہم لوگ دنیا کے خواہشمند بالذات ہیں جب کہ صحابہ کرام طالب دنیا بالذات نہیں تھے، بلکہ طالب بالعرض تھے یعنی آخرت کی خاطر دنیا کے طالب تھے، تاہم اللہ تعالیٰ نے اس پر بھی تنبیہ فرما دی۔ یہ ایک آزمائش تھی۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ
وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

ان واقعات کے بعد اللہ کی رحمت ہی تھی جس کی بنا پر (اے پیغمبر) تم نے ان لوگوں سے نرمی کا برتاؤ کیا۔ اگر تم سخت مزاج اور سخت دل والے ہوتے تو یہ تمہارے آس پاس سے ہٹ کر تتر بتر ہو جاتے۔ لہذا ان کو معاف کر دو، ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو، اور ان سے (اہم) معاملات میں مشورہ لیتے رہو۔ پھر جب تم رائے پختہ کر کے کسی بات کا عزم کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ اللہ یقیناً توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلم وتحمل، نرمی وخوش خوئی، شفقت وملاطفت کے واقعات سے تو حدیث اور سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ کوئی کہاں تک گنائے اور یہ حقیقت تو خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اپنی ذات کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کسی سے انتقام نہیں لیا، غیروں (اور غیر ہی کیسے، بعض معاند تک) کے دو ایک قول سننے کے قابل ہیں۔ لین پول نے کہا ہے: ''ظلم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سرشت ہی میں نہ تھا''۔ اور باسورتھ اسمتھ کا بیان ہے: ''انہوں نے عمر بھر کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، کوئی مصافحہ کرتا تو نہ وہ اپنا ہاتھ الگ کرنے میں سبقت کرتے نہ از خود اس سے الگ ہوتے، گفتگو بہت نرم وشیریں کرتے''۔ اور ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ میں ہے: ''پیغمبر کا میلان طبع ہمیشہ نرمی ہی کی جانب رہتا''۔ لیکن نرمی وملاطفت کے بھی شریعت میں حدود مقرر ہیں۔ جہاں دین کی توہین ہو رہی ہو یا احکام دین کے اجراء کی ضرورت ہو وہاں سختی اور سزا لازمی ہو جاتی ہے۔ **اللین والرفق انما یجوز اذا لم یفض الی**

امهال حق من حقوق الله فاما اذا ادى الى ذلک لم يجز. (کبیر)

آیت سے ایک بڑی اصل بھی ہاتھ آ گئی، معلوم ہوا کہ غلظت قلب یا درشت خوئی میں طبعی خاصیت لوگوں کو بھگانے، دور کرنے، متنفر کرنے کی ہے، اور قضیۂ بالعکس یہ ہے کہ دین کے داعی و مبلغ کو خصوصیت کے ساتھ خوش خلق وخندہ رو ہونا چاہیے، دین کی طرف خلقت اگر کھنچے گی تو اسی راہ سے، داعی و مبلغ کی طرف سے خشونت یا تنگ دلی کا اظہار، خود مقصد تبلیغ کے حق میں ایک مانع قوی ثابث ہوگا۔ (ماجدی: ۲/ ۶۷۲، ۶۷۳)

مشورہ کا فائدہ یہ ہے کہ مسئلہ کے تمام پہلو روشن ہو جائیں گے اور اطراف و جوانب کی چھوٹی اور بڑی چیزیں نمودار ہو جائیں گی، مجلس مشاورت میں کوئی ذی الرائے اور ہوشیار زیادہ ہوگا اور کوئی صاحب تدبیر اور تجربہ کار زیادہ ہوگا۔

اہلیت مشورہ:

یعنی کون لوگ مشورہ کے اہل ہیں جن سے مشورہ لیا جائے۔ قاضی ابوالحسن بصری ماوردیؒ ادب الدنیا والدین ص ۲۰۷ میں فرماتے ہیں: مشورہ کا اہل وہی شخص ہوسکتا ہے جس میں یہ پانچ خصلتیں اور پانچ صفتیں موجود ہوں۔

(۱) عقل کامل کے ساتھ تجربہ بھی رکھتا ہو، کثرت تجارب سے عقل اور فکر درست ہو جاتا ہے۔

حدیث میں ہے: رشد اور ہدایت اگر مطلوب ہے تو عاقل کامل سے مشورہ کرو، صواب کو پہنچو گے اور عاقل کی نافرمانی نہ کرنا کہ پچھتاؤ گے۔

(۲) دوسری خصلت جس کا مشیر میں ہونا ضروری ہے وہ یہ کہ مشیر دین دار، متقی اور پرہیزگار ہو اس لیے کہ جو شخص دین دار اور پرہیزگار نہ ہو اس کے مشورہ کا کیا اعتبار۔ حدیث میں ہے: جو کسی کام کا ارادہ کرے اور پھر وہ کسی سچے اور پکے مسلمان یعنی متقی اور پرہیزگار سے مشورہ کرے تو توفیق خداوندی اس کو بہترین امور کی طرف لے جائے گی۔

(۳) تیسری خصلت جو مشیر میں ہونی چاہیے وہ یہ کہ مشورہ دینے والا محب ناصح ہو یعنی خیر خواہ اور ہمدرد ہو اور اس کا دل حسد، کینہ، بغض اور عداوت سے پاک ہو، محبت اور ہمدردی اور خیر خواہی ہی صحیح مشورہ کا باعث بن سکتی ہیں بخلاف حاسد اور کینہ ور کے، اس کا مشورہ تو سم قاتل ہوگا، اسی بنا پر بعض حکماء کا قول ہے: مت مشورہ کرنا مگر ایسے ذی رائے اور محتاط سے جو حاسد نہ ہو اور ایسے عاقل اور دانش مند سے جو کینہ ور نہ ہو اور عورتوں کے مشورہ سے پرہیز کرنا کیونکہ ان کی رائے کا میلان فساد کی طرف ہوتا ہے اور ان کا عزم سستی اور کمزوری کی جانب ہوتا ہے۔ اور علی ہذا اگر مشیر متعدد ہوں (جیسا کہ آج کل کی اسمبلی) تو ان میں یہ ضروری ہوگا کہ اسمبلی کے افراد باہمی حسد اور تنافس سے خالی ہوں، ورنہ اسمبلی مجلس مشاورت نہ ہوگی، بلکہ مجلس منازعت اور مخاصمت ہوگی، لوگ تماشہ دیکھ کر واپس ہو جائیں گے۔

چوتھی خصلت یہ ہے کہ مشورہ دینے والا کسی فکر اور پریشانی میں مبتلا نہ ہو، اس لیے کہ جو شخص ہموم وغموم کا شکار ہو اور پریشانیوں میں مبتلا ہو اس کا قلب اور دماغ صحیح نہ ہوگا اس لیے وہ صحیح مشورہ نہیں دے سکتا۔

(۴) پانچویں خصلت یہ ہے کہ جس امر میں مشورہ لیا جا رہا ہے اس سے مشیر کی کوئی نفسانی خواہش اور غرض مضمر متعلق نہ ہو، خود غرض کا کوئی مشورہ قابل اعتبار نہیں، چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں ماں باپ کی شہادت اولاد کے حق میں اور زوجین کی شہادت ایک دوسرے کے حق میں اور غلام کی شہادت آقا کے حق میں معتبر نہیں مانی گئی، کیونکہ اغراض اور منافع باہم مشترک ہیں، یہ شہادت خود غرضی کے شائبہ سے خالی نہیں، اس لیے معتبر نہیں۔

(معارف القرآن ادریسی: ۱/۸۱، ۸۳)

توکل کے معنیٰ یہ نہیں کہ انسان اسباب ظاہری کی رعایت چھوڑ دے، ورنہ پھر توکل مشورے کے ساتھ جمع کیونکر ہو سکتا تھا بلکہ توکل کے لیے بھی رعایت اسباب ظاہری ضروری ہے، البتہ اصل اعتماد و تکیہ صرف حق تعالیٰ پر رکھنا چاہیے، توکل کے معنیٰ ترک اسباب کے نہیں، بلکہ حدود و قیود کے ساتھ اختیار اسباب کے ہیں۔ (تفسیر ماجدی: ۱/۶۷۴)

اہل ایمان کا تذکرہ:

سورہ آل عمران کے آخری رکوع میں ان اہل ایمان کا ذکر ہے جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، ارض وسماء کی تخلیق کے بارے میں غور و فکر کرتے اور اپنے پروردگار سے دعائیں کرتے ہیں۔ (۱۹۰۔ ۱۹۵)

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

چنانچہ ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کی (اور کہا) کہ: میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع نہیں کروں گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ تم سب آپس میں ایک جیسے ہو۔ لہٰذا جن لوگوں نے ہجرت کی، اور انہیں ان کے گھروں سے نکالا گیا، اور میرے راستے میں تکلیفیں دی گئیں، اور جنہوں نے (دین کی خاطر) لڑائی لڑی اور قتل ہوئے، میں ان سب کی برائیوں کا ضرور کفارہ کردوں گا، اور انہیں ضرور بالضرور ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے انعام ہوگا، اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بہترین انعام ہے۔

جاہلی مذہبوں میں یہاں تک کہ مسیحیت میں بھی عورت ہونا بجائے خود ایک جرم و نقص تھا، عورت غریب محض اس لیے کہ عورت تھی، بہت سے درجات سے، بہت سے ثوابوں سے محروم تھی، اس گمراہی کو مٹانے کے لیے صراحت کے ساتھ یہ بیان کرنے کی ضرورت تھی کہ جنس مذکر و مونث سے عمل و اجر عمل پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا، عمل کے لحاظ سے ہر عامل یکساں ہے۔ نماز اس کی بھی قبول اس کی بھی، روزہ اس کا بھی مقبول اس کا بھی، عصمت اس کی بھی قابل غور اس کی بھی و قس علی ھذہ۔

''لا اضیع'' لا کر یہ بھی بتا دیا کہ عمل پر ثمرات کا ترتب تمام تر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ''بعضکم من بعض''۔ یہ تصریح ہے اس کی کہ انسانیت دونوں جنسوں میں مشترک ہے، اس لیے حکم بھی دونوں کا مشترک ہی رہے گا۔

لانهما من اصل واحد (بيضاوی) لا تفاوة فی الاجابة ولا فی الثواب بين الذكر والانثی (كبير) بينت فيهاشركةالنساءمع الرجال فی ماوعدالله عبادهالصالحين (مدارک)

ذرا اسے یاد کرلیا جائے کہ دونوں جنسوں کی درمیان اشتراک انسانیت کی یہ تعلیم بیسویں صدی عیسوی میں نہیں، ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں مل رہی ہے، جبکہ فرنگستان اور ہندوستان دونوں میں عورت ہونا خود ایک جرم تھا اور عورت کا وجود مرادف تھا گندگی اور ناپاکی کے۔ (تفسیر ماجدی: ۱/ ۶۹۵-۶۹۶)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾

اے ایمان والو! صبر اختیار کرو، مقابلے کے وقت ثابت قدمی دکھاؤ، اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے جمے رہو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، تاکہ تمہیں فلاح نصیب ہو۔

فلاح کے چار اصول:

سورۃ کے اختتام پر فلاح کے چار اصول بیان ہوئے ہیں:

(۱) صبر؛ دین پر جمے رہنا، مشکلات اور مصائب کی وجہ سے دل چھوٹا نہ کرنا۔ (۲) مصابرہ: دشمن سے زیادہ استقامت اور شجاعت کا مظاہرہ کرنا۔ (۳) مرابطہ؛ دشمنان دین سے مقابلہ کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھنا۔ (۴) تقوی؛ ہر حال میں اور ہر جگہ اللہ سے ڈرتے رہنا۔ (۲۰۰)

خلاصہ رکوع: ۱۰......(۱) یہود کے شبہ کا جواب (۲) درس گاہ ابراہیمی کی طرف دعوت (۳) مقاطعہ عن اہل الکتاب۔ ماخذ: آیت: ۹۳، ۹۶، ۱۰۰۔

خلاصہ رکوع: ۱۱......تم میں سے ہمیشہ مسلک صحیح کی طرف ایک جماعت کو داعی ہونا چاہئے، اور اس کی طرف دعوت دینے والی جماعت کے نتائج اخروی۔ ماخذ: آیت: ۱۰۴، ۱۰۷۔

خلاصہ رکوع: ۱۲......امت مسلمہ کا فرض یعنی بحیثیت امت کے یہ فرض ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، لہذا جو شخص بھی اس امت کا فرد کہلائے گا اس کے ذمہ یہ فرض عائد ہو جائے گا۔ اور منافقین سے مقاطعہ۔ ماخذ: آیت: ۱۱۰، ۱۱۸۔

خلاصہ رکوع: ۱۳......غزوۂ بدر کی کامیابی کا راز کفار اور منافقین سے علیحدگی ہی تھا، اس لئے کہ طبائع میں استقامت تھی۔ ماخذ: آیت: ۱۲۳۔

خلاصہ رکوع: ۱۴......اصلاح لغزش واقعہ احد۔ ماخذ: آیت: ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳۔

خلاصہ رکوع: ۱۵......کام فقط اللہ تعالی کے بھروسہ پر ہونا چاہئے، نہ کہ کسی خاص مقتدا کے اعتماد پر۔ ماخذ: آیت: ۱۴۴۔

خلاصہ رکوع:۱۶......احد کی شکست تمہاری فشل یعنی تمہاری اپنی غلطیوں کی وجہ سے فتح ہوتے ہوتے شکست ہوگئی۔ تنازع اورعصیان الرسول کا نتیجہ ہے۔ ماخذ: آیت: ۱۵۲۔

خلاصہ رکوع: ۱۷......آپ نے شیرازہ منتشرہ کو کن خوبیوں سے جمع فرمایا، ہزیمت احد فتح بدر کا تتمہ ہے۔ ماخذ: آیت: ۱۵۹، ۱۶۵۔

خلاصہ رکوع:۱۸......بدرصغری کی کامیابی کا باعث۔ماخذ: آیت: ۱۷۳۔

خلاصہ رکوع:۱۹......(۱) تذکرہ امراض یہود جن سے مسلمانوں کو احتراز لازمی ہے،(۱) بخل،(۲) کتمان حق۔ ماخذ:(۱) آیت:۱۸۱۔(۲) آیت: ۱۸۷۔

خلاصہ رکوع:۲۰......نصاریٰ کی پاکیزہ خصائل کی تعمیم۔ماخذ: آیت:۱۹۹۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن:۱۲۰)

***

سورۃ النساء

زمانہ نزول:

یہ سورہ متعدد خطبوں پر مشتمل ہے، جو غالباً دو ہجری کے اواخر سے لے کر چار ہجری کے اواخر یا پانچ ہجری کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئے ہیں، مدنی سورت ہے۔

سورۃ النساء کا تعارف:

یہ سورت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مدینہ منورہ ہجرت فرمانے کے بعد ابتدائی سالوں میں نازل ہوئی، اوراس کا اکثر حصہ جنگ بدر کے بعد نازل ہوا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب مدینہ منورہ کی نوزائیدہ مسلمان ریاست مختلف مسائل سے دو چار تھی۔ زندگی کا ایک نیا ڈھانچہ ابھر رہا تھا جس کے لیے مسلمانوں کو اپنی عبادت کے طریقوں اور اخلاق و معاشرت سے متعلق تفصیلی ہدایات کی ضرورت تھی، دشمن طاقتیں اسلام کی پیش قدمی کا راستہ روکنے کے لیے سرتوڑ کوششیں کر رہی تھیں، اور مسلمانوں کو اپنی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے نت نئے مسائل کا سامنا تھا۔ سورۂ نساء نے ان تمام معاملات میں تفصیلی ہدایات فراہم کی ہیں۔ چونکہ ایک مستحکم خاندانی ڈھانچہ کسی بھی معاشرے کی بنیاد ہوتا ہے، اس لیے یہ سورت خاندانی معاملات کے بارے میں مفصل احکام سے شروع ہوئی ہے۔ چونکہ خاندانی نظام میں عورتوں کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے، اس لیے عورتوں کے بارے میں اس سورت نے تفصیلی احکام عطا فرمائے ہیں، اوراسی لیے اس کا نام سورۂ نساء ہے۔ جنگ احد کے بعد بہت سی خواتین بیوہ اور بہت سے بچے یتیم ہو گئے تھے، اس لیے سورت نے شروع ہی میں یتیموں کے حقوق کے تحفظ کا انتظام فرمایا ہے، اور آیت نمبر ۱۴ تک میراث کے احکام تفصیل سے بیان فرمائے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں عورتوں کے ساتھ طرح طرح کے ظلم ہوتے تھے، ان مظالم کی ایک ایک کر کے نشاندہی کی

گئی ہے، اور معاشرے سے ان کا خاتمہ کرنے کی ہدایات دی گئی ہیں۔ نکاح وطلاق کے مفصل احکام بیان کیے گئے ہیں، اور میاں بیوی کے حقوق متعین فرمائے گئے ہیں۔ یہ مضمون آیت نمبر ۳۵ تک چلا ہے جس کے بعد انسان کی باطنی اور معاشرتی اصلاح کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مسلمانوں کو عرب کے صحراؤں میں سفر کے دوران پانی کی قلت پیش آتی تھی، لہذا آیت ۴۵ میں تیمم کا طریقہ اور آیت ۱۰۱ میں سفر میں نماز قصر کرنے کی سہولت عطا فرمائی گئی ہے۔ نیز جہاد کے دوران نماز خوف کا طریقہ آیت ۱۰۲ اور ۱۰۳ میں بتایا گیا ہے۔ مدینہ منورہ میں بسنے والے یہودیوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے معاہدہ کرنے کے باوجود مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر رکھا تھا، آیات ۴۴ تا ۵۷ اور ۱۵۳ تا ۱۷۵ میں ان کے ساتھ عیسائیوں کو بھی خطاب میں شامل کرلیا گیا ہے، اور انہیں تثلیث کے عقیدے کے بجائے خالص توحید اختیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ آیات ۵۸، ۵۹ میں سیاست اور حکمرانی سے متعلق ہدایات آئی ہیں۔ منافقین کی بداعمالیاں آیات ۶۰ تا ۷۰ اور پھر آیات ۱۳۷ تا ۱۵۲ میں واضح کی گئی ہیں۔ آیات ۷۱ تا ۹۲ نے جہاد کے احکام بیان کر کے منافقین کی ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ اسی سیاق میں آیات ۹۲، ۹۳ میں قتل کی سزائیں مقرر فرمائی گئی ہیں۔ جو مسلمان مکہ مکرمہ میں رہ گئے تھے اور کفار کے ہاتھوں مظالم جھیل رہے تھے، ان کی ہجرت کے مسائل آیات ۹۷ تا ۱۰۰ میں زیر بحث آئے ہیں، اسی دوران بہت سے تنازعات آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے فیصلے کے لیے لائے گئے۔ آیات ۱۰۵ تا ۱۱۵ میں ان کے فیصلے کا طریقہ آپ کو بتایا گیا ہے، اور مسلمانوں کو آپ کا فیصلہ دل و جان سے قبول کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ آیات ۱۱۶ تا ۱۲۶ میں توحید کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ خاندانی نظام اور میراث کے بارے میں صحابہ کرام نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے متعدد سوالات پوچھے تھے، آیات ۱۲۷ تا ۱۲۹ اور پھر ۱۷۶ میں ان سوالات کا جواب دیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ پوری سورت احکام اور تعلیمات سے بھری ہوئی ہے، اور شروع میں تقوی کا جو حکم دیا گیا تھا، کہا جاسکتا ہے کہ پوری سورت اس کی تفصیلات بیان کرتی ہے۔ (توضیح القرآن: ۱/ ۲۴۴، ۲۴۵)

یہ قرآن کریم کی چوتھی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۹۲ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں کل رکوع ۲۴، آیات ۱۷۶، کلمات ۳۰۲۰، اور حروف ۱۶۶۶۷ ہیں یہ سورۃ مدنی ہے۔

ربط اول:

سورۂ نساء کا سورۂ آل عمران کے ساتھ ربط یہ ہے کہ سورۂ آل عمران کو مضمون تقوی پر ختم کیا گیا تھا اور اس سورۃ کو مضمون تقوی سے شروع کیا جارہا ہے لیکن پہلی سورۃ میں تقوی کا محمل مخالفین کے معاملات تھے، اس سورۃ میں ان کے علاوہ باہمی معاملات بھی ہیں۔

وجہ تسمیہ:

اس سورہ میں چونکہ عورتوں کے احکام نکاح وتوریث وغیرہ زیادہ مذکور ہیں، اس لئے اسی مناسبت سے اس کا نام سورہ

نساء مشہور ہو گیا۔

ربط ثانی:

سورۂ آل عمران میں زیادہ تر جہاد فی سبیل اللہ کے احکام، مسائل فضائل اور مخالفین ملت اسلامیہ کے مبدأ و معاد ذات وصفات کی بابت شکوک وشبہات کا جواب اور عالم آخرت کے دلائل وغیرہ ذکر فرمائے گئے، جن سے قوام ملت آسانی اور تقویت مذہب رحمانی ہو جائے، اس کے بعد فیض الہام کا جوجوش اس بات کا مقتضی ہوا کہ مکلفین کے لئے وہ احکام بھی بیان ہو جاویں جو ان کے معاملات کا پورا دستور العمل رہیں اور ان باتوں کا معین کرنا بھی قوت بشریہ سے باہر تھا، اس لئے اس سورۃ میں بہت سے احکام بیان ہوئے، خصوصاً سب سے اول یتیموں کی پرورش اور ان کے مال کی حفاظت اور ان کے حقوق کی رعایت اور ان پر رحم کے مسائل بیان ہوئے، پھر وراثت وغیرہ کے متعلق جن کا سلسلہ موت سے متعلق ہے چونکہ عرب کی جہالت اور وحشت ابھی ابھی دور ہوئی تھی اور ان کا درندہ پن تھوڑے ہی دن سے رخصت ہوا تھا، اس لئے ان احکام پر برداشت کرنے کے لئے سب سے پہلے آیت ''یا ایھا الناس اتقوا ربکم '' (الآیۃ) نازل فرما کر اللہ سے ڈرنے کی دوبار تاکید فرمائی، ایک مرتبہ یوں فرمایا: تم اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک شخص سے پیدا کر دیا پھر اس سے اس کی بیوی پیدا کر کے ان سے بہت سے مرد وعورت زمین پر پھیلا دیئے۔ دوسری جگہ فرمایا: اللہ سے ڈرو جس کا نام لے کر اور اس کا واسطہ دے کر لوگوں سے سوال کیا کرتے ہو جب تم اس کے واسطہ سے کام لیتے ہو تو اس کا کہنا مانو۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورہ بقرہ میں کلام کا زیادہ تر رخ تقویٰ کے حصول اور یہود کی اصلاح کی طرف تھا۔ پھر سورہ آل عمران میں اہل ایمان کے لیے ضروری مسائل بیان ہوئے اور روئے سخن زیادہ تر نصاریٰ کی اصلاح کی طرف رہا۔ تاہم ضمناً یہودیوں کا تذکرہ بھی تھا۔ اور اب اس سورہ میں اور اگلی سورہ مائدہ میں اہل عرب کی اصلاح کا پہلو اجاگر ہے۔ اس سے آگے سورہ انعام میں مجوسیوں کی طرف اشارہ موجود ہے اور شرک کی مختلف قباحتوں کا تذکرہ ہے۔

سورۃ النساء کا تقریباً ایک پاؤ چوتھے پارہ میں آیا ہے، اسے سورۃ النساء کبری (بڑی سورۃ النساء) بھی کہا جاتا ہے، اس کے مقابلے میں اٹھائیسویں پارہ کی سورۂ طلاق کو سورۃ النساء قصری (چھوٹی سورۃ النساء) کہا جاتا ہے، چونکہ اس سورت میں ایسے احکام کثرت سے بیان ہوئے ہیں جو کہ خواتین (نساء) سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے اسے ''سورۃ النساء'' کا نام دیا گیا ہے۔

اس سورت کا جو حصہ چوتھے پارہ میں ہے اس میں جو اہم مضامین اور احکام مذکور ہیں وہ درج ذیل ہیں:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ① وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ②

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کی بیوی پیدا کی، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیلا دیئے۔ اور اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق مانگتے ہو، اور رشتہ داریوں (کی حق تلفی سے) ڈرو۔ یقین رکھو کہ اللہ تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔ اور یتیموں کو ان کے مال دے دو، اور اچھے مال کو خراب مال سے تبدیل نہ کرو، اور ان (یتیموں) کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر مت کھاؤ، بیشک یہ بڑا گناہ ہے۔

یہ اسلام کا ایک انقلابی نظریہ ہے کہ جیسے خدا ایک ہے، ویسے ہی پوری انسانیت ایک ہی باپ سے پیدا ہوئی ہے، یہ وہ عقیدہ ہے جو انسانیت کی طبقاتی تقسیم اور رنگ و نسل کی بنیاد پر اونچ نیچ کے تصور کا قلع قمع کرتی ہے، ہندو مذہب میں یہ تصور تھا کہ کچھ لوگ خدا کے منہ سے، کچھ لوگ اس کے بازوؤں سے، کچھ لوگ اس کی رانوں سے اور کچھ لوگ اس کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں؛ اس لئے پیدائشی طور پر انسانیت کا ایک طبقہ معزز اور دوسرا ذلیل ہے، اس طرح کی طبقاتی تقسیم کم وبیش اکثر مذاہب اور نظام ہائے حیات میں موجود رہی ہے؛ لیکن قرآن کہتا ہے کہ تمام انسان کی پیدائش انسان اول سے ہوئی ہے؛ اس لئے وہ سب بحیثیت انسان برابر ہیں، محض رنگ و نسل اور علاقہ و زبان کی بنیاد پر ان میں تفریق کی گنجائش نہیں۔

(آسان تفسیر قرآن مجید)

آغاز سورت اس بنیادی حقیقت سے ہوتا ہے کہ مرد و عورت سب کا خالق اللہ ہے، اس نے سب کو ایک آدم حوا سے وجود بخشا ہے۔ اسی بناء پر خدا اور رشتۂ رحم سب انسانوں کے درمیان مشترک ہے اور اس اشتراک کا بدیہی اور عقلی تقاضا یہ ہے کہ سب خدا سے ڈرتے رہیں اور رشتہ رحم کا احترام ملحوظ رکھیں۔

معاشرے میں دو عناصر سب سے زیادہ کمزور ہوتے ہیں، ایک عورت اور دوسرے یتیم۔ ان کے حقوق معین کر کے ان کے سرپرستوں اور رشتہ داروں پر یہ زور دیا کہ وہ انہیں پورا کریں۔

تقسیم دراثت کے اصول اور ضابطے مقرر کئے تاکہ قوی اور ضعیف سب کے حقوق معین ہو جائیں اور معاشرے میں ظلم، حق تلفی اور باہمی نزاع کا امکانی حد تک سد باب ہو جائے۔ شریعت نے مرد و عورت کے جو حقوق اور حدود معین کر دیئے ہیں ہر ایک صنف کو ان کے اندر رہنے کی ہدایت۔ (قرآن ایک نظر میں: ۵۰)

یتامیٰ کے اموال:

یتیموں کے اموال ان کے حوالے کر دیے جائیں اور انہیں ہتھیانے یا عمدہ مال کو ردی مال سے بدلنے کی کوشش نہ کی جائے، یہ حکم یتیم بچوں کے بارے میں بھی ہے اور یتیم بچیوں کے بارے میں بھی ہے، لیکن عام طور پر یتیم بچیوں کی میراث میں ناجائز تصرف زیادہ کیا جاتا تھا۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ

خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝۳

اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف سے کام نہیں لے سکو گے، تو (ان سے نکاح کرنے کے بجائے) دوسری عورتوں میں سے کسی سے نکاح کرلو جو تمہیں پسند آئیں، دو دو سے، تین تین سے، اور چار چار سے، ہاں! اگر تمہیں یہ خطرہ ہو کہ تم (ان بیویوں) کے درمیان انصاف نہ کرسکو گے، تو پھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرو، یا ان کنیزوں پر جو تمہاری ملکیت میں ہیں، اس طریقے میں اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ تم بے انصافی میں مبتلا نہیں ہو گے۔

نکاح:

چار عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت ہے، مگر شرط یہ ہے کہ شوہر ان کے حقوق ادا کرنے کی سکت رکھتا ہو اور ان کے درمیان عدل وانصاف بھی ملحوظ رکھ سکے اگر شوہر ایسا نہیں کرسکتا تو اسے ایک بیوی پر ہی اکتفاء کرنا چاہیے۔

تعدد ازواج کا رواج تو اسلام سے پہلے بھی تھا مگر وہ رواج کسی قید اور ضابطے کا پابند نہیں تھا، نہ تعداد متعین تھی اور نہ ہی بیویوں کے درمیان عدل ومساوات کی کوئی شرط تھی، ایک شخص دس دس بلکہ اس سے بھی زیادہ عورتوں سے نکاح کرسکتا تھا، پھر ان میں سے جس کے حقوق چاہتا ادا کرتا اور جسے چاہتا معلق رکھتا، اسے نہ تو طلاق دی جاتی اور نہ ہی اس کے ازدواجی اور معاشی حقوق ادا کیے جاتے، اسے آپ زندہ شوہر والی ''بیوہ'' کہہ سکتے ہیں۔

اسلام ہی محافظ:

اسلام نے تعداد بھی متعین کردی اور حقوق کی ادائیگی کو بھی فرض کردیا، یورپ کی لعنتی تہذیب جو پوری دنیا کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتی ہے، وہ قانونی اعتبار سے تو ایک سے زیادہ عورتوں سے تعلق رکھنے کو جائز قرار نہیں دیتی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں جہاں کہیں قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایک سے زیادہ نکاح کی ممانعت کی گئی ہے وہاں غیر قانونی تعدد ازواج کا ایسا طوفان اٹھا ہے کہ شاید شیطان بھی ان کو دیکھ کر شرماتا ہوگا، موجودہ دور کا مغربی سماج اس کی کھلی ہوئی مثال ہے؛ اس لئے اسلام نے مردانہ فطرت کی رعایت کرتے ہوئے اس کی گنجائش رکھی ہے؛ لیکن اس کو نہ واجب وضروری قرار دیا ہے، نہ مستحب ومرغوب، اور اس میں بھی یہ شرط عائد کی ہے کہ ایک سے زیادہ نکاح سنجیدہ جذبہ کے تحت کیا جائے، پہلی بیوی کو ضرر پہنچانا مقصود نہ ہو۔

عدل وانصاف کی مثال:

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کے پاس دو عورتیں ہوں اور ان کے درمیان عدل وانصاف قائم نہ کرے تو قیامت کے دن اس حال میں لایا جائے گا کہ اس کا ایک پہلو گرا ہوا ہوگا۔ (مشکوۃ ۲۷۹)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہ کی دو بیویاں تھیں اور آپ ان کے درمیان بہت عدل فرماتے تھے جو کہ مشہور تھا، ایک مرتبہ ایک صاحب دو تربوز لائے کہ میں یہ دو تربوز لایا ہوں جو کہ وزن

میں بالکل برابر ہیں تا کہ آپ اپنی بیویوں کو ایک ایک تربوز بھجوادیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ بات تو آپ کی صحیح ہے لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ایک میٹھا ہو اور دوسرا نہ ہو یا ایک کم میٹھا ہو اور دوسرا زیادہ؛ اس لئے اس طرح عدل قائم نہیں ہوسکتا، پھر آپ نے چھری منگوائی اور برابر دونوں کے دوٹکڑے کر کے آدھا آدھا دونوں بیویوں کے پاس بھیجا تا کہ دونوں کے پاس دونوں طرح کے ذائقے پہنچ سکیں۔

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ⑨

اور وہ لوگ (یتیموں کے مال میں خرد برد کرنے سے) ڈریں جو اگر اپنے پیچھے کمزور بچے چھوڑ کر جائیں، تو ان کی طرف سے فکرمند رہیں گے؛ لہذا وہ اللہ سے ڈریں اور سیدھی سیدھی بات کہا کریں۔

بچوں کے ساتھ خیر خواہی:

یتیم بچوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے ساتھ خیر خواہی کے سلسلہ میں ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ذرا غور کرو اگر تمہارے بچے یتیم ہوجائیں تو تم ان کی خاطر جس قدر فکرمند ہوگے، اسی قدر دیگر یتیم بچوں کے ساتھ حسن سلوک، وہ بھی تمہاری ہمدردی کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ یہ بات سمجھا رہے ہیں کہ جو چیز تم اپنے لیے پسند کرتے ہو، وہی دوسروں کے لیے پسند کرو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے بعد تمہارے چھوٹے بچوں کے ساتھ بہتر سلوک ہو، تو تم خود بھی یتیموں اور ضعیفوں کے ساتھ ہمدردانہ اور خیر خواہانہ سلوک کرو۔ یہ اہل اسلام کا اخلاق ہے جس کی تعلیم دی جارہی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے، بخاری، مسلم میں ہے: **ان تحب لاخیک ماتحب لنفسک** یعنی تم اس وقت تک کامل الایمان نہیں ہوسکتے جب تک تم اپنے بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند نہ کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ اگر تم اپنے لیے آرام و راحت کے خواہش مند ہو، اپنے بچوں کے ساتھ ہمدردی چاہتے ہو تو دوسروں کے ساتھ تم خود ایسا کر کے اپنے ایمان کی تکمیل کرو۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ⑪

اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تم کو حکم دیتا ہے کہ: مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اور اگر (صرف) عورتیں ہی ہوں، دو یا دو سے زیادہ، تو مرنے والے نے جو کچھ چھوڑا ہو، انہیں اس کا دو تہائی حصہ ملے گا۔ اور اگر صرف ایک عورت ہو تو

اسے (ترکے کا) آدھا حصہ ملے گا۔ اور مرنے والے کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملے گا، بشرطیکہ مرنے والے کی کوئی اولاد ہو، اور اگر اس کی کوئی اولاد نہ ہو اور اس کے والدین ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں تہائی حصے کی حق دار ہے۔ ہاں اگر اس کے کئی بھائی ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ دیا جائے گا (اور یہ ساری تقسیم) اس وصیت پر عمل کرنے کے بعد ہوگی جو مرنے والے نے کی ہو، یا اگر اس کے ذمے کوئی قرض ہے تو اس کی ادائیگی کے بعد تمہیں اس بات کا ٹھیک ٹھیک علم نہیں ہے کہ تمہارے باپ بیٹوں میں سے کون فائدہ پہنچانے کے لحاظ سے تم سے زیادہ قریب ہے؟ یہ تو اللہ کے مقرر کیے ہوئے حصے ہیں، یقین رکھو کہ اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔

ترکہ کی تقسیم اجتماعی و معاشرتی زندگی کے اہم ترین مسائل میں سے ہے اور اس کی عادلانہ تقسیم پر معاشرہ کی فلاح و بہبود کا بہت کچھ مدار ہے۔ اور وہ نام نہاد آسمانی کتابیں دنیا کے ہدایت نامہ کی حیثیت سے کامل نہیں ناقص ہیں، جو ایسے اہم مسئلہ کی تفصیلات سے خالی ہوں۔

'یوصیکم اللہ''۔ اب تصریح سے یہ یاد دلا دیا کہ یہ احکام کسی بندہ کے تجویز کیے ہوئے نہیں۔ حکیم مطلق اور عالم الغیب حاکم برحق کے ارشاد کیے ہوئے ہیں۔

یہ ایک عام اصل بیان کردی کہ ہر لڑکے کو دہرا اور ہر لڑکی کو اکہرا حصہ ملے گا، خواہ لڑکا اور لڑکی ایک ایک ہوں یا کئی۔ ''حظ الانثیین''۔ دنیا کی بہت سی مذہبی اور غیر مذہبی شریعتیں ایسی ہیں جن میں لڑکی کا سرے سے کوئی حصہ ہی نہیں اور عرب جاہلیت میں بھی ترکہ کے حصہ دار صرف مرد (اور مردوں میں بھی بالغ اور قابل حرب مرد) تھے۔ ایسے قانون کا ظالمانہ اور خلاف فطرت ہونا بالکل ظاہر ہے، لیکن اب اس کے ردعمل کے طور پر بعض حلقوں سے جو یہ صدا اٹھی ہے کہ مرد و عورت کا حصہ مساوی ہونا چاہیے، یہ دوسری بے اعتدالی اور افراط کی جگہ تفریط ہے۔ عورت کی فطری ساخت، جسمانی ترکیب اور عضویاتی فرائض نے اسے اس قابل ہی نہیں رکھا ہے کہ تربیت نسل کے ساتھ ساتھ اس پر فکر معاش کی ذمہ داریاں بھی ڈال دی جائیں، قدرت نے اور صحیح اور سچی شریعت نے اس کا ذمہ دار مرد کو ٹھہرایا ہے۔ گھر اور خاندان کا خرچ چلانا اس کے سر رکھا ہے، اس لیے یہ ظلم نہیں عین عدل ہے کہ ترکہ میں سے حصہ اس صوری اور ظاہری اعتبار سے بھی عورت گھاٹے میں نہیں رہتی۔

افسوسناک حقیقت:

اس افسوسناک حقیقت کا اعتراف کیسے کیا جائے کہ بہت سے نام نہاد مسلمان بھی ذہنی اور عملی طور پر اسی لعنتی تہذیب کے ہم نوا دکھائی دیتے ہیں، اسلام کا سورج طلوع ہونے سے پہلے عورت کو میراث میں سے کچھ بھی نہیں دیا جاتا تھا۔

جاہلی اصول:

اہل عرب کا مقولہ تھا: ''ہم اسے کیسے مال دیں جو نہ گھوڑے پر سوار ہو سکے، نہ تلوار اٹھا سکے اور نہ ہی دشمن کا مقابلہ کر

سکے۔ اپنے اس جاہلانہ اصول کی بنیاد پر بچوں اور خواتین کو میراث سے محروم رکھا جاتا تھا، اسلام نے اس ظلم کا خاتمہ کیا اور بچوں اور خواتین کو بھی وراثت کا حق دار قرار دیا، عورت کو حصہ دینا اس پر کسی کا احسان نہیں ہے بلکہ اس کا حق اور اس کا فریضہ ہے جو اسے دیا جاتا ہے۔ (۱۱۔ ۱۴)

مرنے والے کے ورثاء پر چار حق ہیں:

(۱) اس کے مال میں اس کی تجہیز و تکفین کی جائے۔ (۲) اگر اس کے اوپر قرض ہو تو اس کے مال میں سے اس کو ادا کیا جائے (۳) اگر اس نے کوئی وصیت کی ہے تو ایک تہائی مال میں اس کی وصیت کے مطابق عمل کیا جائے۔ (۴) شریعت کے مطابق بقیہ مال میں وراثت تقسیم کی جائے۔ آج کل بھی لوگ وراثت کی تقسیم صحیح نہیں کرتے ہیں۔ اولاً تو کرتے ہی نہیں یا کرتے بھی ہیں تو سالوں کے بعد جب جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ دارالافتاء میں سب سے زیادہ مسائل میراث کے ہی آتے ہیں۔

میراث شریعت کا حکم ہے، اس لئے اس کو آدمی کے انتقال کے فوراً بعد کرنا چاہیئے۔ عام طور پر لوگ اس میں عار محسوس کرتے ہیں کہ مرتے ہی روپوں پیسوں کی تقسیم میں لگ گئے۔ حالانکہ سوئم اور چالیسویں جیسی خرافات میں پڑنے سے بہتر ہے کہ میراث کی تقسیم کرلی جائے؛ تاکہ اللہ کا حکم بھی پورا ہو جائے اور بعد میں جھگڑوں کی نوبت بھی نہ آئے؛ کیونکہ اس وقت میت کا غم تازہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے روپے پیسے کی محبت وقتی طور پر دبی ہوئی ہوتی ہے، اس لئے اس وقت میں عادلانہ اور منصفانہ تقسیم ہو جائے گی اور ہر وارث کو اس کا صحیح حق مل جائے گا۔

شریعت مطہرہ میں عورتوں اور لڑکیوں کے حصہ پر بڑا زور دیا گیا ہے کہ عام طور پر عورتوں اور لڑکیوں کے حصہ کو لوگ دبا لیتے ہیں۔ آج کل بھی لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی بیٹی کی شادی پر جہیز دے دیا ہے اور اتنا خرچ کر دیا ہے، اس لئے اب میراث میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ حالانکہ جتنا خرچہ اس کی شادی میں کیا گیا ہے اس کا حکم اللہ اور اس کے رسول نے نہیں دیا، بلکہ یہ ایک طور پر ماں باپ کی طرف سے بیٹی کو ہدیہ ہوتا ہے، میراث کا حکم کیونکہ شریعت مطہرہ نے دیا ہے اس لئے وہ تو دینا ہی پڑے گا۔ (آیت نمبر ۱ تا ۱۴) (خلاصہ مضامین قرآن کریم: ۴۷، ۴۹)

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾

تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کا ارتکاب کریں، ان پر اپنے میں سے چار گواہ بنا لو۔ چنانچہ اگر وہ (ان کی بدکاری کی) گواہی دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں روک کر رکھو یہاں تک کہ انہیں موت اٹھا کر لے جائے، یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راستہ پیدا کر دے۔

پہلے رکوع سے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ مرد و زن کے درمیان جائز جنسی تعلق کی صرف اور صرف ایک شکل ہے، اور وہ

ہے نکاح۔اب اس رکوع (۳) میں بدکاری کی مذمت کرتے ہوئے دوخاص قسم کی بدکاریوں سے متعلق احکام بتائے۔

انسانی سوسائٹی کی بنیاد:

انسانی سوسائٹی کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ایک چیز مال ہے اور دوسری ربط۔ مال کے متعلق بہت سے احکام پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ایک دوسرے کا مال ناحق کھانے کے متعلق وعید آ چکی ہے۔ وراثت کا مسئلہ بھی مال ہی سے تعلق رکھتا ہے۔اس کے قوانین بھی بالتفصیل بیان ہو چکے ہیں، کسی کا مال غصب کرنے سے یا کسی کی وراثت کو ناجائز طریقے سے حاصل کرنے کی وجہ سے انسانی سوسائٹی تباہ ہو جاتی ہے۔

انسانی سوسائٹی کی دوسری بنیاد ربط ہے۔معاشرہ اسی ربط سے ہی قائم ہوتا ہے اور سوسائٹی کا اولین ربط ارتباط بین الرجال والنساء ہے۔مردوں اور عورتوں کے درمیان ربط ہی معاشرے کی بنیاد بنتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس ابتدائی ربط کو قانون کا پابند فرمادیا ہے۔اگر مرد وزن کا یہ ربط قانون کے تابع عقد نکاح کے ذریعے قائم ہوگا تو آگے نسل بھی ٹھیک ہوگی۔ انسانی اخلاق درست ہوگا، انسانی سوسائٹی پاکیزہ ہوگی اور سوسائٹی کے تمام افراد اپنی اپنی ذمہ داریاں پوری کریں گے اور اگر یہ اولین ربط ہی لاقانونیت کا شکار ہو گیا، ربط کی ابتداء نکاح کے بجائے فحاشی سے شروع ہوئی، تو پھر انسانی سوسائٹی تباہ وبرباد ہو جائے گی۔نسل بگڑ جائے گی، انسان کا اخلاق تباہ ہو جائے گا۔ دنیا میں ذلت کا منہ دیکھنا پڑے گا اور آخرت میں سخت رسوائی ہوگی۔ چنانچہ اس ربط کو خراب کرنے والا عمل قابل تعزیر ہے۔اللہ تعالیٰ نے سوسایٹی سے عیاشی اور زنا جیسے قبیح فعل کے خاتمے کے لیے ابتدائی طور پر یہ تعزیر لگائی۔(معالم العرفان:۵ / ۱۱۳)

(۱) مرد اور عورت اپنے شہوانی جذبات کی تسکین کے لئے بدکاری میں ملوث ہوں، جس کی شہادت چار آدمی دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں مقید کر دو، تا آنکہ انہیں موت آجائے۔ یا اللہ ان کے لئے کوئی راستہ نکال دے۔

(فائدہ) چار گواہ لانے کا حکم اس لیے دیا کہ معاملہ سنگین اور نازک ہے اور اس میں پردہ پوشی بھی ملحوظ ہے، نیز زنا ایک مرد اور ایک عورت سے مل کر پایا جاتا ہے اور شہادت کے لیے کم از کم دو گواہ چاہئے، پس دو گواہ بلحاظ مرد کے اور دو گواہ بلحاظ عورت کے؛ اس طرح چار گواہ ہو گئے۔

(۲) لواطت کی سزا یہ ہے کہ ایسے دونوں مردوں کو جسمانی سزا (مارنا پیٹنا) دی جائے، پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کرلیں تو انہیں چھوڑ دیا جائے۔

پھر توبہ کا ذکر آگے آ گیا تھا، اس لیے اصولی طور پر یہ بتادیا کہ توبہ ایسے ہی لوگوں کی قبول ہوگی جو نادانی کی وجہ سے کوئی برا فعل کر گذریں اور پھر جلد ہی توبہ کریں، نہ یہ کہ گناہ کرتے رہیں اور یہ سوچیں کہ توبہ کر لیں گے، دوسرے یہ کہ جو لوگ ٹھیک مرتے وقت توبہ کرتے ہیں ان کی توبہ قابل قبول نہیں۔((تفسیر ادریسی: ۱۶۳، خلاصۂ مضامین قرآنی: ۷۷)

توبہ کے تین شرائط: (۱) ندامت (۲) ترک گناہ (۳) تلافی۔

محرمات:

حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمۡ اُمَّهٰتُكُمۡ وَبَنٰتُكُمۡ وَاَخَوٰتُكُمۡ وَعَمّٰتُكُمۡ وَخٰلٰتُكُمۡ وَبَنٰتُ الۡاَخِ وَبَنٰتُ الۡاُخۡتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىۡۤ اَرۡضَعۡنَكُمۡ وَاَخَوٰتُكُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآٮِٕكُمۡ وَرَبَآٮِٕبُكُمُ الّٰتِىۡ فِىۡ حُجُوۡرِكُمۡ مِّنۡ نِّسَآٮِٕكُمُ الّٰتِىۡ دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَاِنۡ لَّمۡ تَكُوۡنُوۡا دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ وَحَلَاۤٮِٕلُ اَبۡنَآٮِٕكُمُ الَّذِيۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِكُمۡ وَاَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَيۡنَ الۡاُخۡتَيۡنِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ‌ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۲۳﴾

عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دینے کے بعد آیت نمبر ۲۳، ۲۴ میں ان خواتین کا تذکرہ ہے جن سے نکاح حرام ہے۔ وہ تین قسم کی عورتیں ہیں۔

(۱) محرمات نسبیہ: یعنی وہ عورتیں جو نسب کے رشتے کی وجہ سے حرام ہیں، جیسے ماں، بہن، بیٹی، خالہ، پھوپھی وغیرہ۔

(۲) محرمات رضاعیہ: یعنی وہ عورتیں جنہوں نے کسی بچے کو اس کے بچپن میں دودھ پلایا ہو، تو وہ دودھ کے رشتے کی وجہ سے حرام ہوجاتی ہے۔ جیسے دودھ پلانے والی عورت، دودھ پلانے والی عورت کی بیٹی۔

(۳) محرمات مصاہرت: یعنی سسرالی رشتے کی وجہ سے جو عورتیں حرام ہوجاتی ہیں، جیسے ساس کے ساتھ کبھی بھی نکاح نہیں ہوسکتا اور داماد کے لئے وہ مثل ماں کے ہے اور اسی لئے ساس، سسر سے پردہ نہیں۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم: ۴۹)

سورۂ نساء کا خاص موضوع کمزوروں کے ساتھ عدل، شفقت اور مہربانی کا ہے۔ سورۂ بقرہ میں خلیفہ بننے کا طریقہ بتلایا، سورۂ آل عمران میں اس کو مزید مضبوط کیا، اس سورت میں کمزوروں کا خیال، یتیموں، غلاموں، وارثوں اور خاص کر عورتوں اور غیر مسلم ذمی کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے۔

سورت کا نام نساء رکھ کر پہلے اپنی بیوی کے ساتھ عدل وانصاف کی تاکید کی اور اس کو معیار بنایا کہ اس کے ساتھ کا عدل وانصاف یہ دوسروں کے ساتھ بھی انصاف کرائے گا، اس سے پہلے سورۂ آل عمران میں بھی حضرت مریم اور ان کی والدہ کا ذکر تھا۔

پہلی آیت نے انسان کی ابتداء کی طرف اشارہ کیا، عورت کو مرد کے واسطے سے وجود ملا۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے :النساء شقائق الرجال. سورت کا آغاز الناس سے ہوا جو ظاہر کرتا ہے کہ مذہب کی تفریق کے بغیر انصاف کرنا ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ عدل کے ساتھ کافر کی حکومت باقی رہے گی؛ لیکن ظلم کے ساتھ اسلامی حکومت بھی باقی نہیں رہے گی۔ سورت کا آغاز تقویٰ سے ہوا اور اختتام بھی تقویٰ پر ہوا۔ (۲۰۰)

زمانۂ جاہلیت میں یتیم کے ساتھ ناانصافی ہوتی تھی، یتیم بچی کے ساتھ زیادہ ہوتی تھی، اس کی مہر کم رکھی جاتی یا شادی جلدی نہیں ہوتی تھی، ایک سے زائد کی اجازت انصاف کی بنیاد پر دی گئی، مہر بھی محبت اور عدل کی علامت ہے، عورت اگر

برضا ورغبت معاف کردے تو جائز ہے، کم عقل کو مال سپرد نہ کرو، وہ فضول خرچ کردے گا، اور بعد میں محتاج ہوجائے گا، یتیم کو اس کا مال بلوغت کی عمر میں حوالے کرو، عورتوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیا جاتا تھا، صرف طاقتور کو دیا جاتا تھا۔

جب انسان انصاف سے ہٹ جائے تو سورۂ نساء کو پڑھے اور اس میں غور وفکر کرے۔

وراثت میں نظام عدل کو اپنانا جنت میں لے جائے گا، اور ظلم جہنم کی دہلیز پر لے جائے گا، عورتوں کے ساتھ انصاف، عورت کی جانب سے ہونے والے مظالم کو بھی برداشت کیا جائے، شاید ایک عادت دوسری سے بہتر ہو، طلاق کے بعد مہر واپس نہ مانگی جائے، مہر واپسی کے لیے عورت پر زنا وغیرہ کی تہمت نہ لگائی جائے، مہر کس طرح واپس مانگ سکتے ہو، جب کہ محبت میں رات دن ساتھ بتائے ہیں۔

قرآن شریف میں میثاقاغلیظا تین مقامات پر آیا ہے: انبیاء کے لیے (سورۂ احزاب میں) (۲) یہودیوں کے لیے (نساء میں) (۳) میاں بیوی کے لیے (نساء میں)۔

زمانۂ جاہلیت میں باپ کی بیوی کے ساتھ نکاح کا رواج تھا، انسان کی کمزوری کا خیال کیا گیا۔ (خواطر قرآنیہ)

خلاصہ سورۃ النساء:......سورۃ النساء میں اصلاح عرب ہوگی، اس میں دو باب آئیں گے۔ (۱) تدبیر منزل۔ (۲) سیاست مدنیہ۔

اور تدبیر منزل کا باب دو فصلوں پر مشتمل ہے: (۱) قانون اصلاح مال۔ (۲) قانون اصلاح ازواج۔

اصلاح ازواج میں اصلاح اولاد خود بخود ہوجائے گی، اور اگر مال کی درآمد صحیح ہوجائے یعنی مال کو صحیح اور مشروع طریقہ سے حاصل کیا جائے، تو خیر کا سنگ بنیاد قائم ہوجائے گا، ورنہ سنگ بنیاد ہی میں کجی اور خرابی آجائے گی، کیونکہ جس کا لقمہ حرام ہے نہ اس کے قلم میں نور ہوگا، نہ اس کے کام میں برکت ہوگی، نہ اس کی عبادت درجہ قبول پائے گی، اور نہ دعا مستجاب ہوگی، سب نحوستیں جمع ہوں گی اور قلب مسخ ہوتا جائے گا، پھر اولاد بھی اسی طرح ہوگی۔ غرض ان خرابیوں کا اختتام مشکل ہوگا۔

خلاصہ رکوع: ۱......درآمد مال ناجائز کی روک تھام۔ ماخذ: آیت: ۲، ۶۔

خلاصہ رکوع: ۲......درآمد مال کا صحیح قانون۔ ماخذ: آیت: ۱۱، ۱۲۔

خلاصہ رکوع: ۳......قانون صلاح معائب ازواج اور مدارج معائب۔ ماخذ: آیت: ۱۵ تا ۲۱۔

خلاصہ رکوع: ۴......ایسا طرز معاشرت جس سے اخلاقی خرابیاں پیدا ہی نہ ہوں۔ ماخذ: آیت: ۲۳، ۲۴۔

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن: ۱۲۰)

***

چوتھے پارے کے چند اہم فوائد

(۱) ہر وقت موت کے لئے تیار رہنا چاہئے اور زندگی اس طرح گزارنی چاہئے کہ جب بھی موت آئے اسلام اور ایمان کی حالت میں آئے۔

(۲) سب سے بہتر انسان وہ ہے جو دوسروں کی بھلائی اور فائدہ سوچے۔

(۳) نماز اللہ کے قرب کا ذریعہ ہے اور انسان اللہ کے قریب سب سے زیادہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہوتا ہے۔

(۴) توکل کا مطلب ترک اسباب نہیں بلکہ حسب قدرت اسباب مہیا کرنے کے بعد نتائج اللہ پر چھوڑنے کا نام توکل ہے۔

(۵) اچھا عمل کرنے والے کو دنیا اور آخرت میں اجر بھی اچھا ملتا ہے۔

(۶) آزمائشیں مسلمان کو نکھار دیتی ہیں اور کافر کو مٹا دیتی ہیں۔

(۷) اگر مسلمان اللہ کو چھوڑ کر غیروں سے مدد کے طلب گار ہوں گے تو اللہ انہیں ذلیل کر دے گا۔

(۸) انسان کی اصل کامیابی جہنم سے بچنا اور جنت میں داخل ہونا ہے۔

(۹) کائنات میں غور وفکر کرنے سے ایمان اور یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۱۰) جب تک عورت کسی مرد کے نکاح میں ہو، اس سے دوسرے کا نکاح نہیں ہوسکتا۔

(۱۱) بعض عارفین فرماتے ہیں کہ گناہ کے چھوٹے ہونے کو مت دیکھو بلکہ یہ دیکھو کہ کس کی نافرمانی کر رہے ہو۔

(۱۲) وہ صدقہ اور وہ نیکی جو محض رضاء الٰہی کے حصول کے لئے کی جائے وہ ضائع نہیں جاتی، خواہ تھوڑی ہو یا زیادہ۔

***

پارہ:۵

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

نیز وہ عورتیں (تم پر حرام ہیں) جو دوسرے شوہروں کے نکاح میں ہوں، البتہ جو کنیزیں تمہاری ملکیت میں آجائیں (وہ مستثنیٰ ہیں) اللہ نے یہ احکام تم پر فرض کر دیئے ہیں۔ ان عورتوں کو چھوڑ کر تمام عورتوں کے بارے میں یہ حلال کر دیا گیا ہے کہ تم اپنا مال (بطور مہر) خرچ کر کے انہیں (اپنے نکاح میں لانا) چاہو، بشرطیکہ تم ان سے باقاعدہ نکاح کا رشتہ قائم کر کے عفت حاصل کرو، صرف شہوت نکالنا مقصود نہ ہو۔ چنانچہ جن عورتوں سے (نکاح کر کے) تم نے لطف اٹھایا ہو، ان کو ان کا وہ مہر ادا کرو جو مقرر کیا گیا ہو۔ البتہ مہر مقرر کرنے کے بعد بھی جس (کمی بیشی) پر تم آپس میں راضی ہو جاؤ، اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔ یقین رکھو کہ اللہ ہر بات کا علم بھی رکھتا ہے، حکمت کا بھی مالک ہے۔

چوتھے پارے کے آخر میں ان عورتوں کا ذکر تھا جن سے نکاح حرام ہے، اب پانچویں پارے کے شروع میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ ان عورتوں کے علاوہ جو عورتیں ہیں ان کے ساتھ مہر مقرر کر کے نکاح کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ نکاح سے مقصود عفت قائم رکھنا ہو نہ کہ شہوت رانی، تو جن عورتوں سے تم فائدہ حاصل کرو؛ ان کا مہر مقرر کیا ہوا ادا کر دو۔ یہ جو آخری الفاظ ہیں کہ جن عورتوں سے تم فائدہ حاصل کرو ان الفاظ سے بعض حضرات متعہ کے جواز پر استدلال کرتے ہیں مگر یہ استدلال بالکل باطل ہے، اس آیت میں نکاح شرعی کا ذکر ہے متعہ کا ذکر نہیں ہے، اس میں شک نہیں کہ زمانہ جاہلیت میں متعہ کا رواج تھا چونکہ اسلام کے احکام بتدریج نازل ہوئے ہیں، اس لیے ابتداء اسلام میں یہ رواج باقی رہا؛ لیکن بعد میں واضح طور پر اس کی حرمت کا اعلان کر دیا گیا۔

ابن ماجہ میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! میں نے تمہیں متعہ کی اجازت دی تھی لیکن اب اللہ نے اسے قیامت تک کے لیے حرام کر دیا ہے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

محرمات کی چوتھی اور آخری قسم کا بیان ہے اور اس میں منکوحہ عورتیں آتی ہیں۔ ارشاد ہے وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اور خاوند والی یعنی منکوحہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جو عورت کسی شخص کے نکاح میں ہے، اس کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نکاح نہیں کر سکتا۔ نکاح ثانی کے لیے پہلے نکاح کا فسخ ہونا ضروری ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ یا اس منکوحہ عورت کا خاوند خود طلاق دے دے یا وہ فوت ہو جائے تو عدت گزارنے کے بعد وہ عورت کسی دوسرے شخص کے ساتھ

نکاح کرسکتی ہے۔ان دوصورتوں کے علاوہ تیسری کوئی صورت نہیں جس کی رو سے کسی ایسی عورت سے نکاح کیا جاسکے جس کا نکاح پہلے کسی کے ساتھ ہو چکا ہے۔

اب تک جتنی عورتوں کا ذکر آیا ہے یہ **حرمت علیکم** پر عطف آرہا ہے یعنی فلاں فلاں عورت تم پر حرام ہے۔اب آگے استثناء کے طور پر فرمایا: اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ سوائے ان عورتوں کے کہ جن کے مالک ہوجائیں تمہارے ہاتھ، یعنی جو عورتیں لونڈی بن کر تمہاری ملکیت میں آجائیں وہ تمہارے لیے حلال ہیں، اگرچہ وہ پہلے سے منکوحہ ہوں۔ جب کوئی عورت جنگی قیدی بن کر لونڈی میں تبدیل ہوجائے تو اس کا پہلا نکاح ختم ہوجاتا ہے اور وہ مسلمان مرد کے لیے حلال ہوجاتی ہے۔

غلام اور لونڈی بنانے کا ذکر بیشک قرآن پاک میں موجود ہے مگر اس کی حیثیت محض اباحت کی ہے، یہ نہ فرض ہے، نہ واجب اور نہ سنت بلکہ جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک کا ایک ذریعہ ہے جس پر پرانے زمانہ میں ساری دنیا میں عمل ہوتا رہا ہے۔ اسلام نے بھی اسے کسی حد تک قبول کیا، مگر اس نظام کی برائی قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہے۔ اسی لیے قرآن پاک نے غلاموں کی آزادی کی بار بار ترغیب دی ہے۔ اور بعض جنایات میں غلام کی آزادی بطور تعزیر نافذ کی ہے۔لونڈی سے فائدہ اٹھانے سے پہلے عدت گزارنا بھی ضروری ہے۔ اسے عدت استبراء کہتے ہیں اور ایک حیض پر مشتمل ہے۔

(معالم العرفان: ۵/۱۵۱، ۱۵۲، معارف القرآن مفتی شفیع صاحبؒ)

شرائط نکاح:

(۱) اول یہ کہ دونوں طرف سے طلب لسانی ہو یعنی ایجاب وقبول ہو۔

(۲) دوم یہ کہ مال دینا یعنی مہر دینا قبول کرو۔

(۳) تیسرے یہ کہ ان عورتوں کو اپنی قید نکاح میں لانا اور ہمیشہ ہمیشہ اپنے قبضہ میں رکھنا مقصود ہو، صرف مستی نکالنا اور شہوت رانی مقصود نہ ہو یعنی ہمیشہ کے لیے وہ اس کی زوجہ ہوجائے بغیر اس کے چھوڑے نہ چھوٹے، مطلب یہ کہ کوئی مدت مقرر نہ ہو، مہینہ یا برس دن تک اس کے متعہ کا حرام ہونا معلوم ہو گیا جس پر تمام اہل حق کا اجماع ہے۔

(۴) چوتھی شرط سورۂ مائدہ وغیرہ میں ذکر فرمائی کہ مخفی طور پر دوستانہ اور یارانہ نہ ہو یعنی کم از کم دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں اس معاملہ کے شاہد اور گواہ ہوں اور اگر بدون گواہوں کے ایجاب وقبول ہوا تو وہ نکاح نہیں ہوگا بلکہ زنا سمجھا جائے گا۔ (معارف القرآن ادریسی: ۲/۱۷۹)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک کم از کم مہر کی مقدار دس درہم ہے۔ جس کی مالیت دو تولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی بنتی ہے۔ اگر نکاح کے وقت مقرر نہ بھی کیا جائے تو بھی دینا پڑے گا۔ (آج کل اس کا وزن ۳۱ گرام ہے۔)

آج کل ہمارے معاشرے میں رواج بن گیا ہے کہ مہر مؤجل رکھواتے ہیں اور فوری ادائیگی کی فکر نہیں کرتے ، حالانکہ یہ بھی اور قرضوں کی طرح ایک قرض ہے۔ شادی بیاہ کے فضول خرچوں سے بہتر ہے کہ مہر کی ادائیگی کی جائے؛ بلکہ

سب سے بہتر یہ ہے کہ لڑکے والوں کی طرف سے جو زیور شادی کے موقعے پر لڑکی کو دیا جاتا ہے، اسی کو مہر مقرر کر دیا جائے تو قرض کی ادائیگی بھی ہو جائے گی، رسم بھی ادا ہو جائے گی اور دولہا والوں کی طرف سے دیا گیا زیور کس کی ملکیت ہے؟ اس کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ (خلاصۂ مضامین قرآن کریم: ۵۰)

یہ دو صفات باری تعالیٰ قانونی احکام کے موقع پر اکثر بیان ہوئی ہیں، یہاں بھی انہیں لا کر یہ یاد دلایا کہ اللہ کا علم کامل بھی ہے اور بندوں کی ضرورتوں اور مصلحتوں پر محیط بھی اور اسی علم کامل و محیط کے لحاظ سے اس نے قانون اور ضابطے بھی حکیمانہ مقرر کئے ہیں، کوئی انسان تمدن کے کسی دور میں اپنی حماقت سے یہ عزم نہ کر بیٹھے کہ میں شریعت الٰہی کے کسی جزئیہ میں کوئی مناسب ترمیم اپنی رائے سے کر سکتا ہوں۔

حضرت ابن عباسؓ سے تفسیر یہ منقول ہے کہ وہ علیم ایسا ہے کہ ہمارے اضطرار پر نظر کر کے اس نے متعہ کو حلال کر دیا تھا اور حکیم ایسا کہ اپنی حکمت کاملہ کے تقاضہ سے اسے حرام بھی قرار دے دیا۔ (تفسیر ماجدی: ۱/۷۳۹)

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦﴾

اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے (احکام کی) وضاحت کر دے، اور جو (نیک) لوگ تم سے پہلے گزرے ہیں، تم کو ان کے طور طریقوں پر لے آئے، اور تم پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمائے، اور اللہ ہر بات کا جاننے والا بھی ہے، حکمت والا بھی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا خاص احسان اور اس کی مہربانی ہے کہ وہ ہمارے فائدے کی باتیں بیان کرتا ہے؛ تاکہ ہم انہیں اختیار کر لیں اور نقصان دہ امور سے بچ جائیں۔

مفسر قرآن امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ بیان دو قسم کا ہوتا ہے۔ بیان کی پہلی قسم نص ہے اور اس سے مراد وہ احکام و فرامین ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بالکل صراحت کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں، ان میں حلال و حرام بالکل واضح الفاظ میں بتلا دیئے ہیں۔ یا دوسری صورت میں یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے صریح الفاظ میں وضاحت فرما دی گئی ہے، یہ بھی نص ہے۔

بیان کی دوسری قسم وہ ہے جو دلالت کے ساتھ اخذ ہو۔ یہ احکام صراحتاً تو بیان نہیں کیے گئے مگر ایسے اشارات پائے جاتے ہیں، جن سے اہل علم، مفکر، مجتہدین اور علماء غور و فکر کر کے ایسے احکام کو اخذ کرتے ہیں۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ دنیا میں جو چھوٹا بڑا حادثہ ہوتا ہے یا کوئی نئی چیز پیدا ہوتی ہے اس میں اللہ کا حکم ضرور ہوتا ہے اور یہ حکم صراحتاً ہوگا یا دلالتاً ایسے حکم کو معلوم کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے **فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون** اگر تم کسی بات کو نہیں سمجھ پائے تو اسے اس کے جاننے والوں، یاد رکھنے والوں سے دریافت کر لو، وہ تم کو بتائیں گے کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہے، بیان کی دوسری قسم یہی ہے۔

إِن تَجْتَنِبُوا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّـَٔاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا ﴿٣١﴾

اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرو جن سے تمہیں روکا گیا ہے تو تمہاری چھوٹی برائیوں کا ہم خود کفارہ کر دیں گے اور تم کو ایک باعزت جگہ داخل کریں گے۔

اوپر کی آیت میں قتل نفس پر غیر مباح طریقوں سے مال کھانے پر اور نیز دوسرے جرائم پر دوزخ کی وعید فرمائی تھی۔ اس آیت سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ممنوعات شرعیہ کی دو قسمیں ہیں: ایک کبیرہ اور ایک صغیرہ، یا یوں کہا جائے کہ منہیات کی دو قسمیں ہیں: ایک کبیرہ اور ایک صغیرہ، جس کو سیئات کہا گیا ہے۔ بہرحال جہاں تک حضرت حق تعالیٰ کی بزرگی اور برتری کا معاملہ ہے اس کے مقابلہ میں تو ہر نافرمانی کو کبیرہ کہا جاسکتا ہے؛ کیونکہ ان کی عظمت وجلال کے لحاظ سے چھوٹی سی تقصیر اور نافرمانی بھی کبیرہ اور بڑی ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ شریعت میں اس قسم کی تقسیم موجود ہے، بعض گناہوں پر وعید کا ذکر آیا ہے۔ بعض گناہوں پر حد جاری کرنے کا حکم۔ اور بعض پر اس قدر سختی اور تغلیظ نہیں ہے۔ سورۂ والنجم میں فرمایا اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ط اس آیت سے معلوم ہوا کہ فواحش اور لمم دو چیزیں ہیں۔

اسی طرح اس آیت میں بھی ماتنھون عنه کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبائر الاثم ایک قسم ہے اور سیئات دوسری قسم ہے۔ گویا مقسم تو منہی عنہ ہے اور اس مقسم کی دو قسمیں ہیں اور دونوں کا مصداق الگ الگ ہے، اس لئے بعض اہل تحقیق نے فرمایا ہے کہ اس تقسیم کا مبنی گناہ کی کیفیت ہے جو گناہ زیادہ ضرر رساں اور بہت قبیح ہے وہ کبیرہ کہا جاتا ہے اور جس گناہ میں یہ بات نہیں ہے اس کو صغیرہ کہتے ہیں۔ اس تقسیم کا مبنی یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے اعتبار سے ایک کم ہے اور ایک زیادہ ہے۔

بہرحال! مبنی کچھ بھی ہو یہ تقسیم مسلم ہے کہ ایک کبیرہ ہے اور دوسرا سیئہ یا لمم یا صغیرہ ہے۔ اسی سلسلے میں ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ بندوں کی حالت چونکہ مختلف ہے، اس لئے کبھی کبھی بڑے لوگوں کو معمولی سے گناہ پر سخت تنبیہ ہو جاتی ہے، بلکہ معمولی درجے کے لوگ جس کو حسنات سمجھتے ہیں۔ مقربین بارگاہ کی نظر میں ان ہی کو سیئات سمجھا جاتا ہے، حتیٰ کہ بعض اہل سلوک کا قول مشہور ہے، وجودک ذنب لا یقاس به ذنب آخر یعنی خود تیرا وجود ہی ایک ایسا گناہ ہے جس سے بڑا کوئی دوسرا گناہ نہیں۔ مقربین بارگاہ کی معمولی لغزش کو بھی گناہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس تمام گزارش کو ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے۔

بہرحال! جب گناہوں کی دو قسمیں معلوم ہوگئیں، تو اب یہ زیر بحث ہے کہ کبیرہ گناہ کون کون سے ہیں اور صغیرہ کون کون سے ہیں؟ اس میں بھی سلف کے مختلف اقوال ہیں اور صحیح بات یہ ہے کہ کبائر کا حصر مشکل ہے۔ ان تمام اقوال میں حضرت ابوطالب مکیؒ کا وہ قول زیادہ واضح ہے جو صاحب روح المعانی نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابوطالب مکیؒ فرماتے ہیں کہ کبائر کی صحیح تعداد سترہ ہے، ان سترہ میں سے چار گناہ تو قلب کے ہیں۔

(۱) شرک (۲) اصرار علی المعصیۃ (۳) قنوط یعنی اللہ کی رحمت سے ناامیدی (۴) اللہ کی گرفت سے بےخوف ہوجانا۔

پھر فرماتے ہیں: ان سترہ میں سے چار زبان کے ہیں۔(۱) کسی پاک دامن پر تہمت لگانا۔(۲) جھوٹی گواہی (۳) جادو کرنا (۴) جھوٹی قسم کھانا۔ پھر فرماتے ہیں: ان سترہ میں سے تین پیٹ کے ہیں۔(۱) یتیم کا ظلماً مال کھانا (۲) سود کھانا (۳) نشے کی چیز کا پینا۔ پھر فرماتے ہیں: ان سترہ میں سے دو شرمگاہ کے ہیں۔(۱) زنا (۲) لواطت، پھر فرماتے ہیں: ان سترہ میں سے دو گناہ ہاتھ کے ہیں۔(۱) چوری کرنا (۲) کسی کو بے گناہ قتل کرنا۔ پھر فرماتے ہیں: ان سترہ میں سے ایک گناہ پاؤں کا ہے۔(۱) میدان جہاد سے بھاگنا، پھر فرماتے ہیں: ایک کا تعلق پورے جسم سے ہے۔(۱) ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ ان سترہ کے علاوہ باقی تمام گناہ صغیرہ ہیں۔(واللہ اعلم)

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: کبیرہ گناہ وہ ہیں جن پر قرآن وحدیث میں صاف وعید یا دوزخ کا یا اللہ کا غصہ یا حد مقرر فرمائی اور تقصیر (صغیرہ) وہ کہ منع فرمایا اور کچھ زیادہ نہیں۔(موضح القرآن)

آیت زیر بحث کا بعض معتزلہ اور اہل باطل نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کبیرہ گناہ سے بالکل بچتا رہے یہاں تک کہ ایک کبیرہ گناہ بھی اس سے سرزد نہ ہو، خواہ وہ صغیرہ گناہ کتنے ہی کرتا رہے تو وہ سب صغیرہ معاف کردیئے جائیں گے اور اگر کسی نے ایک کبیرہ کا بھی ارتکاب کرلیا تو اب معافی نہیں ہوگی۔ یعنی بالکل کبیرہ نہ ہو تو صغیرہ کی معافی ضروری اور اگر صغیرہ کے ساتھ ایک یا دو کبیرہ بھی ہوگئے تو معافی ناممکن اور سب پر عذاب ضروری۔ لیکن اہل سنت کے نزدیک اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے، بلکہ آیت کا مطلب قواعد شرعیہ کی بنا پر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بہرحال-خواہ کوئی صورت ہو-مواخذہ کرنے اور معاف کرنے کا اختیار موجود ہے، کوئی شخص تمام عمر کبیرہ گناہ نہ کرے اور صغیرہ برابر کرتا رہے تب بھی ان کو اختیار ہے اور اگر کوئی کبیرہ صغیرہ ملا کر کرتا رہے تب بھی ان کو اختیار ہے، خواہ وہ سب معاف فرمادے اور خواہ سب پر عذاب فرمائے۔ اسی بنا پر تیسیر میں اپنے قاعدہ کے مطابق کا لفظ بڑھایا ہے تاکہ حضرت حق تعالیٰ کا قاعدہ پیش نظر رہے اور وہ یہ ہے کہ کبیرہ گناہ سے اجتناب کرے اور نیک اعمال بجالاتا رہے، تب صغائر کی معافی اور ازالہ کی توقع ہے۔ اس آیت میں ایک چیز کا ذکر ہے اور دوسری جگہ دوسری بات کا ذکر ہے۔ جیسا کہ فرمایا: **ان الحسنات یذھبن السیئات**۔ اور جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں اس کی تفصیل موجود ہے کہ ایک وقت کی نماز دوسرے وقت کی نماز تک اور ایک جمعہ کی نماز دوسرے جمعہ کی نماز تک اور ایک رمضان کے روزے دوسرے رمضان کے روزوں تک کے درمیانی اوقات کے تمام گناہوں کا کفارہ ہیں بشرطیکہ کبائر سے اجتناب کرتا رہے، یعنی یہ نمازیں اور روزے صغائر کا کفارہ ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صغائر کی معافی کا وعدہ دو باتوں پر ہے، ایک کبائر سے اجتناب، دوسرے طاعات کی بجاآوری۔ جب تک یہ دونوں باتیں جمع نہیں ہوں گی صغائر کی مغفرت کی توقع نہیں۔

معلوم ہوا کہ جن کبائر سے اجتناب ضروری ہے ان سے بچتا رہے اور جن کا ترک کبیرہ گناہ ہے ان کو بجالاتا رہے، تب ہم صغائر کو درگزر فرمادیں گے۔ غرض! آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کبائر بچے اور اعمال صالحہ اور حسنات بجالاتا رہے تو اس کا یہ اثر ہوگا کہ اس سے صغائر دور کردیئے جائیں گے اور اگر کوئی کبائر سے اجتناب کرے اور اعمال صالحہ کو ترک کردے تو اس سے یہ وعدہ نہ ہوگا۔ یہ ہم نے آیت کی تفسیر کے طور پر عرض کیا ہے، ورنہ حضرت حق تعالیٰ کے فضل کا معاملہ بالکل دوسرا ہے، کیونکہ اس کے فضل کا کبیرہ کے ساتھ بھی تعلق ہوسکتا ہے اور صغیرہ کے ساتھ بھی؛ لہٰذا جس طرح کبیرہ پر فضل کا احتمال ہے اسی طرح صغیرہ پر عذاب کا احتمال ہے۔

آیت زیر بحث کا اہل سنت کے مسلک کے موافق یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اگر تم لوگ کبیرہ گناہ سے اجتناب کروگے اور کبیرہ گناہ سے بچ نکلوگے تو وہ ذرائع اور وسائل اور وہ افعال جو تم نے اس کبیرہ کے لیے کئے تھے ان پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں مرفوعاً آیا ہے کہ ابن آدم کے ذمہ پر جو زنا کا حصہ مقرر فرمادیا ہے وہ ضرور اس کو مل کررہے گا، لہٰذا زنا میں آنکھوں کا حصہ دیکھنا ہے اور زبان کا حصہ اس اجنبی عورت سے باتیں کرنا ہے اور نفس کا حصہ اس کی خواہش کرنا ہے، پاؤں کا حصہ اس کی طرف چلنا ہے، لیکن ان سب باتوں کا تحقق اور عدم تحقق شرم گاہ پر موقوف ہے، اگر شرم گاہ نے زنا کی تصدیق کردی تو سب گناہ گار ٹھہرے اور اگر شرمگاہ نے تکذیب کردی یعنی زنا سے بچ گیا، تو یہ سب ذرائع اور وسائل خود بخود معاف ہوگئے، جو فی نفسہٖ مباح یا زیادہ سے زیادہ صغیرہ گناہ تھے۔ اسی طرح ایک شخص نے چاقو خریدا اور دل میں یہ خیال کیا کہ چاقو سے فلاں شخص کو قتل کروں گا؛ لیکن مباشرت قتل سے پہلے تائب ہوگیا تو یہ چاقو کا خریدنا معاف ہوگیا، یہ مطلب زیادہ واضح اور صاف ہے۔ اب معنی یہ ہیں کہ اگر تم کبائر سے اجتناب کروگے تو ہم ان ذرائع اور وسائل کو معاف فرمادیں گے جو تم نے ان کبائر کے حصول کی غرض سے اختیار کئے ہوں گے۔ اگر آیت کی یہ توجیہ کی جائے جو آخر میں ہم نے بعض اکابر سے نقل کی ہے تو تیسیر میں ''اپنے قاعدے کے مطابق کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ (واللہ اعلم بالصواب) (کشف الرحمٰن: ۱/۱۳۱ ضمیمہ: ۳)

وَلَا تَتَمَنَّوۡا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا اكۡتَسَبُوۡا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيۡبٌ مِّمَّا اكۡتَسَبۡنَ ؕ وَسۡـئَلُوا اللّٰهَ مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمًا ۝۳۲

اور جن چیزوں میں ہم نے تم کو ایک دوسرے پر فوقیت دی ہے، ان کی تمنا نہ کرو، مرد جو کچھ کمائی کریں گے ان کو اس میں سے حصہ ملے گا، اور عورتیں جو کچھ کمائی کریں گے ان کو اس میں سے حصہ ملے گا۔ اور اللہ سے اس کا فضل مانگا کرو، بیشک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ پورا ملتا ہے اس میں ہرگز کمی نہیں کی جاتی جو کسی کو شکایت کا موقع ملے، ہاں یہ بات دوسری ہے کہ وہ اپنی حکمت اور رحمت کے مطابق کسی کو خاص بڑائی اور فضیلت عنایت کرے، اس کی حرص اور

شکایت کرنی بیجا ہوس ہے۔البتہ اپنے عمل کے معاوضہ سے اور زیادہ ثواب و انعام مانگو تو بہتر اور مناسب ہے، اس میں کچھ خرابی نہیں، تو اب جو فضل کا طالب ہو اس کو لازم ہے کہ عمل کے ذریعہ سے طلب کرے، حسد اور تمنی سے فضل کا طالب نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کو ہر ایک چیز کا پورا علم ہے، ہر ایک کے درجے اور اس کے استحقاق کو خوب جانتا ہے اور ہر ایک کے مناسب شان اس سے معاملہ کرتا ہے، تو اب جس کو فضیلت عطا کرتا ہے سراسر علم اور حکمت کے مطابق ہے۔کوئی اپنی لاعلمی کی وجہ سے کیوں اس میں خلجان کرے۔(تفسیر عثمانی:۱۰۸)

فرمایا ان اللہ کان علی کل شی شھیداً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگران اور محافظ ہے۔تمام چیزیں اس کے سامنے ہیں اس لیے وہ سب پر گواہ ہے۔وہ جانتا ہے کہ کون کس استعداد کا حامل ہے اور کس کو کس مقام پر رکھا ہے، لہٰذا وہ اپنی حکمت اور مشیت کے مطابق ہر ایک کا دائرہ کار مقرر کرتا ہے۔اس لیے اہل ایمان کا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کریں اور غیر فطری امور سے گریز کریں، حتی الامکان نیکی کریں تاکہ انہیں فلاح حاصل ہو سکے۔(معالم العرفان:۵/۱۹۵)

گھر کا نظام:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

مرد عورتوں کے نگراں ہیں، کیونکہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور کیونکہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔چنانچہ نیک عورتیں فرمانبردار ہوتی ہیں، مرد کی غیر موجودگی میں اللہ کی دی ہوئی حفاظت سے (اس کے حقوق کی) حفاظت کرتی ہیں۔اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو تو (پہلے) انہیں سمجھاؤ، اور (اگر اس سے کام نہ چلے تو) انہیں خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو، (اور اس سے بھی اصلاح نہ ہو تو) انہیں (ہلکی مار) مار سکتے ہو۔پھر اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو ان کے خلاف کارروائی کا کوئی راستہ تلاش نہ کرو۔یقین رکھو کہ اللہ سب کے اوپر، سب سے بڑا ہے۔اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہو تو (ان کے درمیان فیصلہ کرانے کے لیے) ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے بھیج دو، اگر وہ دونوں اصلاح کرانا چاہیں گے تو اللہ دونوں کے درمیان اتفاق پیدا فرمادے گا۔بیشک اللہ کو ہر بات کا علم اور ہر بات کی خبر ہے۔

(طبعی اور تکوینی طور پر) مرد کی یہ افضلیت اس کے قوائے جسمانی کی مضبوطی اور دل و دماغ کی برتری دونوں سے عیاں ہے۔(آیت) ”**بعضھم علی بعض**“۔یعنی صنف ذکور کو صنف اناث پر۔**بعضھم و ھم الرجال علی بعض**

وھم النساء (کشاف) (آیت) ''بما فضل اللہ''۔میں ب سببیہ ہے اور اس کا تعلق قوامون سے ہے۔ الباء للسببیہ وھی متعلق بقوامون ای قوامون علیھن بسبب تفضیل اللہ تعالیٰ ایاھم علیھن. (روح)

مرد کی افضلیت عورت پر دوہری حیثیت رکھتی ہے۔ ایک تو طبعی یعنی جسمانی و دماغی قوی میں خلقی برتری۔ دوسری قانونی یا معاشرتی کہ عورت خرچ میں مرد کے دست نگر رہتی ہے۔ یہیں سے یہ بات بھی نکل آئی کہ قرآنی نظام کی رو سے کمانا یا کسب معاش کرنا اور بیوی کے خرچ اٹھانا مردوں کے ذمہ ہے۔ **دلت علی وجوب نفقتھا علیہ (جصاص)** (تفسیر ماجدی:۱/۷۴۹)

گھر کے نظام کو درست رکھنے کے لیے چند بنیادی ہدایات دی گئی ہیں، پہلی ہدایت تو یہ دی گئی ہے کہ گھر میں قوامیت (حاکمیت) اور ذمہ دار ہونے کا درجہ مرد کو حاصل ہوگا، کیونکہ جس جماعت اور جس گھر کا کوئی سربراہ نہ ہو اسے انتشار اور افتراق سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

اس سربراہی کا یہ مطلب نہیں کہ مرد کو آقا اور عورت کو لونڈی کا درجہ دے دیا جائے؛ بلکہ ان کا باہمی تعلق ایسے ہوگا جیسے راعی اور رعیت کا ہوتا ہے۔

دوسری ہدایت یہ دی گئی ہے کہ اگر عورت اکھڑ مزاج، نافرمان اور سرکش ہو تو اسے راہ راست پر لانے کے لیے تین تدبیریں اختیار کی جاسکتی ہیں:

(۱) پہلی تدبیر یہ ہے کہ اسے سمجھایا جائے اور سرکشی کے برے نتائج سے خبردار کیا جائے۔

(۲) اگر وعظ و نصیحت اس پر اثر نہ کرے تو دوسری تدبیر یہ ہے کہ اس کا بستر الگ کر دیا جائے اور اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔

(۳) اگر پھر بھی وہ نہ سمجھے تو آخری اقدام کے طور پر اور واقعی سرکشی اور بے راہ روی کی صورت میں حد کے اندر رہتے ہوئے اس کی پٹائی بھی لگائی جاسکتی ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینا مناسب ہوگا کہ قرآن کے مخاطب ہر قسم کے لوگ ہیں، شہری بھی، دیہاتی بھی، جنگلی بھی، صحرائی بھی، شریف الطبع بھی اور اکھڑ مزاج بھی، باکردار بھی اور بدکردار بھی۔

اسلام نے ہر عورت کی پٹائی کی اجازت نہیں دی؛ بلکہ صرف اسی عورت کی پٹائی کی اجازت دی ہے جو اس کے علاوہ دوسری کوئی زبان سمجھتی ہو اور ظاہر ہے پسماندہ معاشروں میں ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو پٹائی کے بغیر راہ راست پر نہیں آتیں؛ لیکن وہ ظالم مرد جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر وحشیانہ انداز میں عورتوں کی پٹائی لگاتے ہیں ان کے اس ظلم اور زیادتی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

حدیث میں ہے کہ عورت کے منہ پر نہ مارے، ایسا مارے کہ چوٹ زیادہ نہ لگے اور ہڈی بھی نہ ٹوٹے۔ بعض تفسیروں میں ہے کہ مسواک وغیرہ سے مارے مگر چہرہ پر نہ مارے اور ایسا بھی نہ مارے کہ بدن پر نشان پڑ جائے، امام

شافعی فرماتے ہیں کہ مارنا مباح اور جائز ہے مگر نہ مارنا افضل ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۲۰۸)

لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ نافرمانی وہ کہلاتی ہے جس میں شریعت کا حکم ٹوٹتا ہو۔ ایسا حکم جس میں اللہ اور اللہ کے رسول کی نافرمانی ہو اور شوہر بیوی کو وہ کام کرنے کو کہے اور بیوی نہ کرے تو یہ نافرمانی نہیں، مثلاً شوہر بے پردگی کیلئے کہے تو اس کا حکم ماننا جائز نہیں بلکہ شوہر خود ایسا حکم دینے پر گناہ گار ہوگا، کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ جس کام میں خالق کی نافرمانی ہو اس میں مخلوق کی اطاعت نہیں۔" (مشکوۃ) (خلاصۂ مضامین قرآن کریم: ۵۱)

اجتماعی زندگی:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَۨا ۝۳۶

اور اللہ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو، نیز رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قریب والے پڑوسی، دور والے پڑوسی، ساتھ بیٹھے (یا ساتھ کھڑے) ہوئے شخص اور راہ گیر کے ساتھ اور اپنے غلام باندیوں کے ساتھ بھی (اچھا برتاؤ رکھو) بیشک اللہ کسی اترانے والے شیخی باز کو پسند نہیں کرتا۔

خدا کی عبادت کا مطلب یہ ہے کہ اس کو وحدہٗ لاشریک سمجھو اور صرف اسی کی عبادت کرو، شریک نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات میں یا اس کی صفات میں کسی کو شریک نہ کرو، عبادت کے معنی ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، شرک کو بھی چند مرتبہ بیان کیا جا چکا ہے، کوئی انسان ہو یا غیر انسان ہو، سب خدا کی مخلوق ہیں اور واجب الوجود کے مقابلہ میں ہر ممکن حقیر اور کم درجے کا ہے، اس لئے اس کی مخلوق میں کوئی بھی اس کا مستحق نہیں کہ حضرت حق جل مجدہ کے ساتھ اس کو شریک کیا جائے اور جو شخص ایسا کرتا ہے وہ بڑا ہی ظالم اور ناسپاس ہے۔ اپنی عبادت کا حکم دینے اور شرک سے منع کرنے کے بعد والدین کا ذکر فرمایا کہ ان کے ساتھ احسان اور نیکی کرو۔ ماں باپ کے ساتھ احسان کرنے کی قرآن وحدیث میں بار بار تاکید فرمائی ہے اور ان میں سے کسی ایک کی نافرمانی کو بھی کبیرہ گناہوں میں سے شمار کیا ہے۔ ماں باپ کے بعد دوسرے اہل قرابت کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا، اگر خدا تعالیٰ مقدرت دے تو ماں باپ کے بعد دوسرے اہل قرابت کا خیال رکھے، اگر پیسہ نہ ہو تو ہاتھ پاؤں سے ان کی خدمت کرے۔ (کشف الرحمٰن: ۱/ ۱۴۲، ضمیمہ: ۳)

گھر اور خاندان کے نظام کو درست رکھنے کی تدابیر بتانے کے بعد اجتماعی زندگی کی درستگی کے لیے ہر چیز اور ہر کام میں احسان کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ احسان کی بنیاد باہمی خیر خواہی، امانت، عدل اور رحم دلی پر ہے۔

قرآن وسنت نے پڑوسیوں کے حقوق کی رعایت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی بڑی تاکید فرمائی ہے، پھر پڑوسیوں کے تین درجے اس آیت میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ پہلے درجے کو "جار ذی القربی" (قریب والا پڑوسی)

اور دوسرے کو ''الجار الجنب'' کہا گیا ہے، جس کا ترجمہ اوپر دور والے پڑوسی سے کیا گیا ہے۔ پہلے سے مراد وہ پڑوسی ہے جس کا گھر اپنے گھر سے بالکل ملا ہوا ہو، اور دوسرے سے مراد وہ پڑوسی ہے جس کا گھر اتنا ملا ہوا نہ ہو۔ بعض حضرات نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ پہلے سے مراد وہ پڑوسی ہے جو رشتہ دار بھی ہو، اور دوسرے سے مراد وہ جو صرف پڑوسی ہو۔ نیز بعض مفسرین نے پہلے کا مطلب مسلمان پڑوسی اور دوسرے کا مطلب غیر مسلم پڑوسی بتایا ہے، قرآن کریم کے الفاظ میں ان سب معانی کی گنجائش ہے۔ خلاصہ یہ کہ پڑوسی چاہے رشتہ دار ہو یا اجنبی، مسلمان ہو یا غیر مسلم، اس کا گھر بالکل ملا ہوا ہو یا ایک دو گھر چھوڑ کر ہو، ان سب کے ساتھ اچھے برتاؤ کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

پڑوسی کی تیسری قسم جس کو قرآن کریم نے صاحب بالجنب سے تعبیر فرمایا ہے۔ **وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ**: اس سے مراد وہ شخص ہے جو عارضی طور پر تھوڑی دیر کے لئے ساتھی بن گیا ہو، مثلاً سفر کے دوران ساتھ بیٹھا یا کھڑا ہو، یا کسی مجلس یا کسی لائن میں لگے ہوئے اپنے پاس ہو، وہ بھی ایک طرح کا پڑوسی ہے اور اس کے ساتھ بھی اچھے برتاؤ کی تاکید فرمائی گئی ہے، بلکہ اس سے بھی آگے ہر راہ گیر اور مسافر کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، چاہے وہ اپنا ساتھی یا پڑوسی نہ ہو۔

(توضیح القرآن: ۱/ ۲۶۴، ۲۶۵)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو اس وقت تک نماز کے قریب بھی نہ جانا جب تک تم جو کچھ کہہ رہے ہو اسے سمجھنے نہ لگو۔ اور جنابت کی حالت میں بھی جب تک غسل نہ کرلو، (نماز جائز نہیں) الا یہ کہ تم مسافر ہو (اور پانی نہ ملے تو تیمم کر کے نماز پڑھ سکتے ہو) اور اگر تم بیمار ہو یا سفر پر ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت کی جگہ سے آیا ہو یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو، پھر تم کو پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کرلو، اور اپنے چہروں اور ہاتھوں کا (اس مٹی سے) مسح کرلو۔ بیشک اللہ بڑا معاف کرنے والا بڑا بخشنے والا ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب شراب کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا؛ لیکن اسی آیت کے ذریعے یہ اشارہ دے دیا گیا کہ وہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے؛ کیونکہ اس کو پینے کی حالت میں نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے، لہذا کسی وقت اس کو بالکل حرام بھی کیا جا سکتا ہے۔ (توضیح القرآن)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ نماز کے ذریعے انسان میں خشوع اور عاجزی پیدا ہوتی ہے، اعضاء کے ساتھ آدمی آداب بجالاتا ہے اور زبان سے اللہ تعالیٰ کی مناجات کرتا ہے۔ گویا نماز تکبر کے منافی ہے جس سے پہلے ہی منع

کیا جا چکا ہے۔ اور اگر انسان نشے کی حالت میں ہوگا تو اس کے اندر خشوع نہیں ہوگا، انسان کی عقل کا توازن ہی قائم نہیں رہ سکتا، بے ہنگم حرکات کرنے لگتا ہے۔ نشہ کی حالت میں انسان کے دل میں عاجزی کا پیدا ہونا ممکن نہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ایسی حالت میں نماز سے روک دیا ہے۔

شانِ نزول کے متعلق ترمذی شریف اور مستدرک حاکم میں روایت موجود ہے کہ صحابی رسول حضرت عبدالرحمن بن عوف ؓ نے بعض دوسرے صحابہ ؓ کو کھانے کی دعوت دی۔ ان میں حضرت علی ؓ بھی شامل تھے۔ کھانا کھانے کے بعد شراب کا دور بھی ہوا، جس سے بعض کو نشہ چڑھ گیا۔ اُدھر نماز کا وقت بھی ہو گیا۔ حضرت علی ؓ کو امامت کے لیے آگے کھڑا کیا گیا، انہوں نے نشہ کی حالت میں قرآن پاک پڑھنے میں یہ غلطی کی کہ **لا اعبد ما تعبدون** میں لا حذف کر گئے، جس کی وجہ سے معنی بالکل ہی الٹ ہو گیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اے ایمان والو! نماز کے قریب نہ جاؤ اس حالت میں کہ تم نشہ میں ہو۔ **حتی تعلموا ما تقولون** یہاں تک کہ تم سمجھ نہ لو جو کچھ تم کہتے ہو۔ گویا شراب کی خرابی کے متعلق یہ دوسرا حکم تھا جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا۔ اور اس کے بعد سورۂ مائدہ میں وہ قطعی حکم آ گیا جس کے مطابق شراب ہمیشہ کے لیے حرام قرار دے دی گئی۔

و لا جنبا اور جنبی آدمی بھی نماز کے قریب نہ جائے **الا عابری سبیل** سوائے اس کے کہ وہ راستہ گزرنے والا ہو۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ کوئی شخص مسافر ہے، غسل کی ضرورت پڑ گئی ہے مگر پانی میسر نہیں یا اس پر قادر نہیں تو اس کے لیے اجازت ہے کہ وہ اس وقت تک بغیر غسل کیے نماز پڑھ لے جب تک اسے غسل کے لیے پانی میسر نہیں آتا۔ عابری سبیل کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ نماز کے محل یعنی مسجد میں داخل بھی نہ ہو۔ البتہ اگر وہاں سے بطور راستہ گزرنا ہو تو مسجد سے گزر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر مسجد میں بدخوابی ہو گئی ہے تو مسجد سے گزر کر باہر چلے جانا جائز ہے۔

بہر حال فرمایا: دو حالتوں میں نماز کے قریب نہ جاؤ، اولاً یہ کہ تم نشے کی حالت میں ہو اور اس وقت تک نماز نہ پڑھو جب تک کہ تمہارا نشہ زائل ہو کر تم سمجھنے نہ لگو کہ کیا کر رہے ہو۔ اور ثانیاً یہ کہ اگر جنبی ہو جاؤ تو اس وقت تک نماز کے قریب نہ جاؤ **حتی تغتسلوا** یہاں تک تم غسل کر لو۔ (معالم العرفان: ۵/ ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۴۵ تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۹۴)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا
هٰۤؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾

جن لوگوں کو کتاب (یعنی تورات کے علم) میں سے ایک حصہ دیا گیا تھا، کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا کہ وہ (کس طرح) بتوں اور شیطان کی تصدیق کر رہے ہیں اور کافروں (یعنی بت پرستوں) کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ مومنوں سے زیادہ سیدھے راستے پر ہیں۔

اس رکوع میں بت پرستی سے منع کرتے ہوئے بخل اور حسد سے بچے رہنے کی ہدایت کی گئی ہے، پھر امانت داری کا

سبق دیا گیا ہے کہ جوجس بات اور جس چیز کا اہل ہواس کو وہ چیز دینا امانت داری کا تقاضا ہے، پھر خدا اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، اس طرح امانت سے متعلق حکم وتاکید کے بعد ہی اللہ اور رسول کی اطاعت کا تذکرہ کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ انسان اگر اپنے اور اس کائنات کی پیدائش پر غور کرے تو باآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ خدا کا حق ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور اس کی اطاعت کی جائے، اور اس کا حق ادا کرنا، امانت کا ادا کرنا ہے، کیونکہ انسان کی پیدائش کا مقصد خلافت ارضی ہے اور خلافت کی ذمہ داریاں امانت ہیں۔ان میں خیانت نہ کرنا چاہئے، یعنی خدا کی بتائی ہوئی راہ سے ہٹ کر زندگی نہ گذارنی چاہئے اور رسول کو رسول مان لینے کے بعد رسالت کا یہ حق ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت واتباع کی جائے، ورنہ یہ رسول کے ساتھ خیانت ہوگی، خدا اور رسول کی اطاعت تو اصل ہے۔

اس کے بعد اپنے حاکموں کی اطاعت کا حکم ہے اور بتایا ہے کہ حاکموں سے اگر کسی معاملہ میں نزاع ہو تو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (قرآن وسنت) کو حکم بناؤ، اور اس میں جو ہدایت ملے اس پر بے چوں وچرا عمل کرو، فرمایا ہے کہ اس طریقہ پر جو لوگ گامزن ہوں وہ ہیں دراصل اللہ اور آخرت پر ایمان لانے والے۔(خلاصۂ مضامین قرآنی:۸۱، ۸۲)

حق؛ عدل ومساوات کا دین:

حقیقت یہ ہے کہ اسلام، حق، عدل اور مساوات کا دین ہے اور وہ ساری مخلوق کے درمیان عدل کا حکم دیتا ہے، یہاں تک کہ کافر کے حقوق بھی غصب کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۵۸

(مسلمانو) یقینا اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ یقین جانو اللہ تم کو جس بات کی نصیحت کرتا ہے وہ بہت اچھی ہوتی ہے۔ بیشک اللہ ہر بات کو سنتا اور ہر چیز کو دیکھتا ہے۔

عثمان بن طلحہ کا مشہور واقعہ ہے- جو کعبہ کے کلید بردار تھے-ان سے فتح مکہ کے موقع پر چابی لی گئی تو بعض مسلمانوں نے کلید بردار ہونے کا شرف حاصل کرنے کی تمنا ظاہر کی، مگر اللہ تعالی نے انہیں کلید کعبہ واپس کرنے کا حکم دیا؛ چنانچہ یہی واقعہ ان کے ایمان لانے کا سبب بن گیا۔

اللہ تعالیٰ نے ادائے امانت اور عدل کرنے کا حکم دیا، یہی وہ اصول ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے مسلمانوں کے اجتماعی اور انفرادی نظام درست رہ سکتے ہیں۔ یہ حکم ہر اس شخص یا جماعت کے لیے ہے، جو کسی نہ کسی طرح اصلاح معاشرہ کا ذمہ دار ہے۔سب سے پہلے یہ ذمہ داری امیر یا حکام پر آتی ہے کیونکہ سوسائٹی میں نظم ونسق کے ذمہ دار وہی ہوتے ہیں، کسی فرد یا جماعت کا حق دلانا اور فریقین میں جھگڑے کی صورت میں عدل قائم کرنا حکومت وقت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

دوسرے نمبر پر ہر شخص فرداً فرداً بھی اپنے حلقہ اثر میں ذمہ دار ہے اور اس محدود حلقہ میں ادائے امانت اور قیام عدل کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: **کلکم راعٍ و کلکم مسئولٌ عن رعیته.** تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا اس سے ملکی اور علاقائی سطح پر حاکم وقت بھی مراد ہے اور گھریلو سطح پر گھر کا سربراہ بھی اسی زمرہ میں آتا ہے۔ گھریلو معاملات میں وہ بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔ علاقے کا حکم ہو یا کسی ادارے کا سربراہ، ہر شخص سے اس کی حیثیت کے مطابق بازپرس ہوگی کہ آیا اس کے ذمہ جو امانت تھی وہ اس نے اہل تک پہنچائی یا نہیں۔ اور تنازعے کی صورت میں اس نے کہاں تک عدل کیا۔ (خلاصۃ القرآن: م اش، معالم العرفان، کشف الرحمٰن)

لطائف و معارف:

(۱) امانت کی حقیقت یہ ہے کہ جس کسی کا جو حق تم پر واجب ہو اس کو طیب خاطر کے ساتھ ادا کرو۔

(۲) آیت کا نزول اگرچہ خاص واقعۂ مفتاح میں ہوا ہے لیکن بالاجماع یہ آیت مال ودیعت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ لفظ امانات میں جملہ اقسام کی امانتیں داخل ہیں، کیونکہ الامانات پر جو الف لام داخل کیا گیا ہے وہ استغراق کے لیے ہے اور مطلب یہ ہے کہ جملہ اقسام کی امانتوں کی رعایت واجب ہے، کسی امانت میں بھی خیانت روا نہیں۔

(۳) جاننا چاہیے کہ انسان کے معاملات کی کل تین قسمیں ہیں یا تو انسان کا معاملہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہے اور یا لوگوں کے ساتھ اور یا اپنے نفس کے ساتھ ہے، تینوں قسموں میں امانت کی رعایت ہر انسان پر فرض ہے۔

(۱) خدا تعالیٰ کے ساتھ امانت کی رعایت یہ ہے کہ جن باتوں کا خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے ان کو بجا لائے اور جن باتوں سے منع کیا ہے ان سے رکا رہے، احکام خداوندی کی بجا آوری میں خیانت نہ کرے۔

(۲) اور لوگوں کے ساتھ امانت کی رعایت یہ ہے کہ ان کی ودیعتیں اور ان کے قرض ادا کرے، ماپ تول کی کمی نہ کرے اور بادشاہوں کی امانت یہ ہے کہ رعایا کے حقوق ادا کریں، عہدہ اور منصب کسی نااہل کو نہ دیں، نااہل کو عہدہ اور منصب دینا رعایا کے ساتھ خیانت ہے اور علماء کی امانت یہ ہے کہ احکام خداوندی بلا کم و کاست شریعت کے مطابق لوگوں تک پہنچادیں۔

(۳) اور اپنے نفس کے ساتھ امانت کی رعایت یہ ہے کہ اپنے اعضاء و جوارح سے وہ کام نہ لے جو دنیا اور آخرت میں اس کے لیے مضر ہوں مثلاً زبان کو کلمات کفر اور بدعت اور کذب و غیبت سے محفوظ رکھے اور آنکھ کی امانت یہ ہے کہ اس کو حرام کی طرف دیکھنے سے محفوظ رکھے اور کان کی امانت یہ ہے کہ جھوٹ اور غیبت اور گانے بجانے کے سننے سے محفوظ رکھے اور شرمگاہ کی امانت یہ ہے کہ اس کو حرام سے بچائے۔ قرآن کریم میں جابجا امانت ادا کرنے کی تاکید آئی ہے اور حدیث میں ہے کہ جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس کو اپنے عہد کا پاس نہیں اس میں دین نہیں۔

(معارف القرآن ادریسی: ۲/ ۲۳۸، ۲۳۹)

اسلامی قانون کی اہمیت:

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يَزۡعُمُوۡنَ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّتَحَاكَمُوۡۤا اِلَى الطَّاغُوۡتِ وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ يَّكۡفُرُوۡا بِهٖ ؕ وَيُرِيۡدُ الشَّيۡطٰنُ اَنۡ يُّضِلَّهُمۡ ضَلٰلًاۢ بَعِيۡدًا ۝٦٠

(اے پیغمبر) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعوی یہ کرتے ہیں کہ وہ اس کلام پر بھی ایمان لے آئے ہیں جو تم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر بھی جو تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا، (لیکن) ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنا مقصد فیصلے کے لیے طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں، حالانکہ ان کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ اس کا کھل کر انکار کریں۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں بھٹکا کر پرلے درجے کی گمراہی میں مبتلا کردے۔

آیات کا شان نزول:

ان آیات کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ بشر نامی ایک منافق تھا، اس کا ایک یہودی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا، یہودی نے کہا کہ چل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس، ان سے فیصلہ کرائیں، مگر بشر منافق نے اس کو قبول نہ کیا، بلکہ کعب بن اشرف یہودی کے پاس جانے اور اس سے فیصلہ کرانے کی تجویز پیش کی، کعب بن اشرف یہودی کا ایک سردار اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کا سخت دشمن تھا، یہ عجیب بات تھی کہ یہودی تو اپنے سردار کو چھوڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ پسند کرے اور اپنے آپ کو مسلمان کہنے والا بشر آپ کی بجائے یہودی سردار کا فیصلہ اختیار کرے، مگر راز اس میں یہ تھا کہ ان دونوں کو اس پر یقین تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حق و انصاف کا فیصلہ کریں گے، اس میں کسی کی رورعایت یا غلط فہمی کا اندیشہ نہیں اور چونکہ اس جھگڑے میں یہودی حق پر تھا، اس لئے اس کو اپنے سردار کعب بن اشرف سے زیادہ اعتماد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تھا اور بشر منافق غلطی اور ناحق پر تھا، اس لئے جانتا تھا کہ آپ کا فیصلہ میرے خلاف ہوگا، اگرچہ میں مسلمان کہلاتا ہوں اور یہ یہودی ہے۔

ان دونوں میں باہمی گفتگو کے بعد یہ طے ہوا کہ دونوں اسی پر راضی ہو گئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر آپ ہی سے اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرائیں، مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچا، آپ نے معاملہ کی تحقیق فرمائی، تو حق یہودی کا ثابت ہوا، اسی کے حق میں فیصلہ دے دیا اور بشر کو جو بظاہر مسلمان تھا ناکام کر دیا، اس لئے وہ اس فیصلہ پر راضی نہ ہوا اور ایک نئی راہ نکالی کہ کس طرح یہودی کو اس بات پر راضی کرلیا جائے کہ ہم حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس فیصلہ کرانے چلیں، یہودی نے اس کو قبول کرلیا، راز اس میں یہ تھا کہ بشر نے یہ سمجھا ہوا تھا کہ حضرت عمر کفار کے معاملہ میں سخت ہیں، وہ یہودی کے حق میں فیصلہ دینے کے بجائے میرے حق میں فیصلہ دیں گے۔

بہرکیف، یہ دونوں اب حضرت فاروق اعظم کے پاس پہنچے، یہودی نے حضرت فاروق اعظم کے سامنے پورا واقعہ بیان کر دیا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما چکے ہیں، مگر یہ شخص اس پر مطمئن نہیں اور آپ کے پاس

مقدمہ لایا ہے۔

حضرت عمر نے بشر سے پوچھا کہ کیا یہی واقعہ ہے؟ اس نے اقرار کیا، حضرت فاروق اعظم نے فرمایا: اچھا ذرا ٹھہرو! میں آتا ہوں، گھر میں تشریف لے گئے اور ایک تلوار لے کر آئے اور اس منافق کا کام تمام کر دیا اور فرمایا: "جو شخص رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فیصلہ پر راضی نہ ہو اس کا یہی فیصلہ ہے۔" (یہ واقعہ روح المعانی میں بروایت ثعلبی وابن ابی حاتم حضرت عبداللہ بن عباس سے منقول ہے۔) (معارف القرآن مفتی شفیع: ۲/ ۱۰۷)

تو اللہ تعالی نے مسلمانوں کے سامنے اس حقیقت کو خوب اچھی طرح واضح کر دیا کہ کسی بھی شخص کا ایمان اس وقت کامل نہیں جب تک کہ وہ اللہ اور رسول کے فیصلوں پر راضی نہ ہو۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ اپنے ترجمہ قرآن پاک کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ جو اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم سے بھاگے گا وہ مسلمان نہیں، اس لئے اگر دو مسلمان آپس میں جھگڑیں، ایک نے کہا: چلو شرع کی طرف رجوع کریں، دوسرے نے کہا: میں شرع کو نہیں سمجھتا یا مجھ کو شرع سے کام نہیں، تو اس کو بیشک کافر کہیں گے۔ (تفسیر عثمانی: ۱۱۴)

اللہ اور رسول کی اطاعت ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو انسان کو انعام الٰہی کا مستحق بناتا ہے، ایسے لوگ بڑے اجر کے مستحق ہیں اور ایسے لوگوں کا آخرت میں انبیاء، صدیقین اور شہداء اور صالحین کا ساتھ ہوگا، کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو کسی کو میسر آجائیں۔ (خلاصۂ مضامین قرآنی: ۸۲)

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے:

اور یہ بھی بتادیا گیا کہ رسول کی بعثت کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، رسول کی اطاعت حقیقت میں اللہ کی اطاعت ہے؛ لیکن ظاہر ہے منافقوں کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت بڑی گراں محسوس ہوتی ہے۔ (۶۰-۶۵) (خلاصۃ القرآن: م اش)

اس کے بعد ساتویں رکوع میں پہلے تو مسلمانوں کو جہاد اور قتال کی تیاری کا حکم دیا گیا ہے اور یہ کہ اپنی نیت خالص رکھیں اور صرف اللہ کی رضا اور دین کی سربلندی کے لیے جنگ کریں۔

پھر بڑے جذباتی انداز میں انہیں جہاد کی ترغیب دی گئی ہے کہ آخر تم جہاد کیوں نہیں کرتے، جبکہ صورت یہ ہے کہ ظلم و ستم کی چکی میں پسنے والے کمزور مرد، خواتین اور بچے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو ہمیں اس بستی سے نکال دے جہاں کے لوگ بڑے ظالم ہیں اور اے اللہ! تو کسی کو ہمارا مددگار بنا کر بھیج دے۔ (۷۵)

موت کا خوف:

چونکہ عام طور پر موت کا خوف جہاد کے میدان میں نکلنے سے ایک بڑی رکاوٹ بنا ہے؛ اس لیے فرمایا گیا کہ موت تو

کہیں بھی آ سکتی ہے، گھر میں بھی اور مضبوط قلعوں میں بھی ، نہ جہاد میں نکلنا موت کو یقینی بناتا ہے اور نہ ہی گھر میں رہنا زندگی کے تحفظ کی ضمانت ہے۔(۷۸)

منافقوں کی سازشیں:

جہاد وقتال کی ترغیب کے بعد مسلمانوں کو منافقین کی تدبیروں اور سازشوں سے چوکنا رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ وہ سنگدل گروہ ہے جس نے اسلام کا جامہ زیب تن کر کے ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ مدینہ منورہ میں جو پہلی اسلامی ریاست قائم ہوئی اس کے خلاف سازشوں کا تانا بانا بننے میں بھی یہی گروہ پیش پیش تھا۔

خفیہ منصوبہ بندیاں:

مسلمان ان حرماں نصیبوں کے بارے میں فیصلہ کرنے میں متردد تھے کہ سورۂ نساء کا وہ حصہ نازل ہو گیا جس میں ان کی ذلت آمیز حرکتوں، خفیہ منصوبہ بندیوں اور بغض وحسد پر مبنی کارروائیوں کا پول کھول دیا گیا اور ان کے بارے میں واضح فیصلہ سنا دیا گیا کہ ان کا اسلام اور مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں تاکہ اہل ایمان اور اہل نفاق کے درمیان حد فاصل قائم ہو جائے اور مسلمان منافقوں کے بارے میں یک آواز ہو جائیں اور ان کے درمیان کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔(خلاصۃ القرآن: م اش)

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾

کیا یہ لوگ قرآن میں غور وفکر سے کام نہیں لیتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بکثرت اختلافات پاتے۔ اور جب ان کو کوئی بھی خبر پہنچتی ہے، چاہے وہ امن کی ہو یا خوف پیدا کرنے والی، تو یہ لوگ اسے (تحقیق کے بغیر) پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اگر یہ اس (خبر) کو رسول کے پاس یا اصحاب اختیار کے پاس لے جاتے تو ان میں سے جو لوگ اس کی کھوج نکالنے والے ہیں وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے۔ اور (مسلمانو) اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔

قرآن پاک میں غور وفکر ہر انسان کے لیے اپنے اپنے درجے میں ضروری ہے، مجتہدین اور علمائے کرام بھی اس میں تدبر کرتے ہیں۔ مجتہدین ایک ایک آیت سے ہزاروں مسائل کا استنباط کرتے ہیں اور علماء ان کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کے فہم میں بھی اضافہ ہوتا ہے، البتہ عوام کا تدبر اتنا ہی ہے کہ وہ قرآن پاک کے معانی ہی سمجھ لیں۔ اس سے ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت پیدا ہوگی۔ جو ایمان کی جڑ ہے تو گویا ہر ایک کے لیے قرآن میں غور وفکر کرنا ضروری ہے۔ اس کو سمجھے گا تو علم حاصل ہوگا اور پھر اس پر عمل کی نوبت بھی آئے گی۔ علم کے بغیر عمل کا درست ہونا ممکن نہیں اور نہ ہی اعتقاد

صحیح ہوسکتا ہے۔لہٰذا قرآن پاک کا کم از کم تدبر یہ ہے کہ اس کے معانی سمجھ لیے جائیں۔یہی دانائی کی بات ہے۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ یعنی ان منافقوں اور کم سمجھ مسلمانوں کی ایک خرابی یہ ہے کہ جب کوئی بات امن کی پیش آتی ،مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کسی سے صلح کا قصد فرمانا یا لشکر اسلام کی فتح کی خبر سننا یا کوئی خبر خوفناک سن لیتے ہیں جیسے دشمنوں کا کہیں جمع ہونا یا مسلمانوں کی شکست کی خبر آنا تو ان کو بلا تحقیق کئے مشہور کرنے لگتے ہیں اور اس میں اکثر فساد و نقصان مسلمانوں کو پیش آجاتا ہے۔منافق ضرر رسانی کی غرض سے اور کم سمجھ مسلمان کم فہمی کی وجہ سے ایسا کرتے تھے۔

مطلب یہ کہ کہیں سے کچھ خبر آئے تو چاہیے کہ اول پہنچائیں سردار تک اور اس کے نائبوں تک، جب وہ اس خبر کی تحقیق اور تسلیم کرلیویں تو ان کے کہنے کے موافق اس کو کہیں نقل کریں اور اس پر عمل کریں۔

فائدہ:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو ایک قوم کے یہاں زکوٰۃ لینے کو بھیجا، وہ قوم اس کے استقبال کو باہر نکلی ،اس نے خیال کیا کہ میرے مارنے کو آئے ہیں ،لوٹ کر مدینہ میں آگیا اور مشہور کردیا کہ فلاں قوم مرتد ہوگئی ،تمام شہر میں شہرت ہوگئی آخر وہ بات غلط نکلی۔(تفسیر عثمانی:۱۱۹)

امام رازیؒ نے لکھاہے کہ آیت ۸۳ سے چار امور ثابت ہوتے ہیں:

(۱) ایک یہ کہ نئے نئے مسائل جو پیش آئیں گے ان کی بابت احکام نص سے نہیں، استنباط سے حاصل ہوں گے۔

(۲) دوسرے یہ کہ استنباط بھی ایک حجت شرعی ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ احکام میں عامیوں پر اہل علم کی تقلید واجب ہے۔

(۴) چوتھے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مامور تھے کہ استنباط احکام کرتے رہیں۔

آیت سے عقیدۂ امامت کا بھی رد نکل رہا ہے۔اگر کسی امام معصوم کا وجود امت ہوتا۔ **هذه الاية تدل على بطلان قول القائلين بالامامة لانه لو كان كل شيء من احكام الدين نصوصا عليه لعرفه الامام و لزال موقع الاستنباط** (جصاص) (تفسیر ماجدی: ۲/۷۸۸)

سلام مکارم اخلاق کا حصہ:

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ﴿۸۶﴾

اور جب تمہیں کوئی شخص سلام کرے تو تم اسے اس سے بھی بہتر طریقے پر سلام کرو، یا (کم از کم) انہی الفاظ میں اس کا جواب دے دو۔بیشک اللہ ہر چیز کا حساب رکھنے والا ہے۔

سلام بھی چونکہ اللہ تعالیٰ کے حضور ایک سفارش ہے،اس لیے سفارش کا حکم بیان کرنے کے ساتھ سلام کا حکم بھی بیان فرمادیا گیاہے۔(توضیح القرآن)

اور جب تم کو کوئی دعا دے یعنی السلام علیکم کرے تو تم اس کے سلام سے اچھے اور بہتر الفاظ میں اس کو سلام کرو، یعنی اس کے سلام کا جواب دو یا کم از کم ویسے ہی الفاظ کہہ دو اور انہی الفاظ میں اس کو جواب دے دے جو پہلے شخص نے کہے تھے، یقین جانو! اللہ تعالیٰ ہر چیز پر محاسب اور ہر بات کا حساب لینے والا ہے۔ (تیسیر) تحیہ اصل میں زندگی کی دعا دینے کو کہتے ہیں، اہل عرب جب آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے کو ''حیاک اللہ'' کہتے تھے پھر تحیہ مطلقاً دعا میں استعمال ہونے لگا۔ یہاں اس کے معنی ملاقات کے وقت السلام علیکم کرنے کے ہیں۔ آسمانی تہذیب میں ہمیشہ ملاقات کا تحیۃ سلام رہا ہے۔

جو قومیں آسمانی تہذیب سے محروم ہیں ان کے ہاں مختلف طریقے ہیں کفار عرب کا طریقہ ہم نے عرض کر دیا۔ نصاریٰ کا سلام منہ پر ہاتھ رکھ لینا تھا، یہود کا سلام انگلی اٹھا لینا تھا، مجوسیوں کا سلام ذرا جھک جانا تھا؛ لیکن اسلام نے پھر آسمانی تہذیب کو زندہ کیا اور فرمایا: **فسلموا علی انفسکم تحیۃ من عند اللہ** اس کہنے کی ضرورت نہیں کہ السلام علیکم یعنی سلامتی کی دعا کفار عرب کے حیاک اللہ سے بہت جامع ہے کیونکہ یہ دین و دنیا کی سلامتی کو شامل ہے۔

حدیث میں سلمان فارسی سے روایت ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کی مجلس میں آیا، اس نے کہا: السلام علیک یا رسول اللہ ﷺ، آپ ﷺ نے فرمایا: وعلیک السلام ورحمۃ اللہ، پھر دوسرا شخص آیا، اس نے کہا: السلام علیک یا رسول اللہ ورحمۃ اللہ، آپ ﷺ نے جواب دیا: وعلیک السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، پھر ایک تیسرا شخص آیا، اس نے کہا: السلام علیک یا رسول اللہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ ﷺ نے فرمایا: وعلیک، اس نے کہا یا رسول اللہ ﷺ مجھ سے پہلے آنے والوں کے جواب میں آپ نے زیادہ جواب دیا اور بڑھا کر جواب عنایت کیا، مگر مجھ کو صرف وعلیک فرمایا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تو نے ہمارے لئے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: بہتر جواب دو یا ویسا ہی جواب دے دو، ہم نے ویسا ہی جواب دے دیا۔

عمران بن حصین کی روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا، حضور ﷺ نے فرمایا دس ہیں، پھر دوسرا آیا، اس نے کہا، السلام علیکم ورحمۃ اللہ اور بیٹھ گیا، آپ ﷺ نے فرمایا: بیس ہیں، پھر تیسرا آیا اور وہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہہ کر بیٹھ گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تیس ہیں۔ یعنی الفاظ کی زیادتی کے ساتھ نیکیاں زیادہ ہوتی گئیں۔

سلام کے آداب کی تفصیل تو فقہ کی کتابوں سے معلوم ہوسکتی ہے یہاں چند باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

(۱) سلام کا جواب دینا واجب علی الکفایہ ہے، اگر حاضرین میں سے ایک شخص نے بھی جواب دے دیا تو سب سبکدوش ہو گئے اور اگر کسی نے بھی جواب نہیں دیا تو سب واجب کے تارک ہوئے۔

(۲) جو سلام شرعی آداب کا لحاظ رکھ کر کیا جائے اسی کا جواب دینا واجب ہوگا، مثلاً کوئی بول و براز میں مشغول ہو یا

نماز پڑھتا ہو یا قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہو یا خطبہ سن رہا ہو وغیرہ، ایسی حالت میں کوئی سلام کرے تو اس کا جواب دینا واجب نہیں بلکہ ایسے مواقع پر سلام کرنا ہی خود مکروہ ہے۔

(۳) سلام کے جواب میں وعلیکم السلام کہنا واجب ہے، باقی سلام کرنے والے سے بہتر کلمات کہنا یا انہی کو لوٹا کر کہہ دینا یہ باتیں اختیار میں ہیں، یعنی فقط جواب تو واجب ہے، باقی زیادہ جواب دینا یا کم دینا یا انہی کلمات کو لوٹا دینا ان سب کا اختیار ہے۔

(۴) احادیث میں جو کلمات مروی ہیں وہ سلام کے ساتھ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ہیں، ان سے زیادہ اور الفاظ ثابت نہیں۔ (کشف الرحمٰن: ۱ / ۱۴۴)

اللہ تعالیٰ کے حاکمانہ بیان کا انداز:

باری تعالیٰ کے حاکمانہ بیان کا انداز ملاحظہ فرمائیے، ارشاد ہوتا ہے:

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم منافقوں کے بارے میں دو گروہ ہو رہے ہو اور اللہ نے ان کو ان کی حرکتوں کی وجہ سے الٹ دیا ہے۔ (۸۸)

یعنی اے مسلمانو! تم منافقوں کے بارے میں دو گروہوں میں کیوں تقسیم ہو گئے ہو، ایک گروہ کہتا ہے کہ انہیں قتل کرنا چاہیے کیونکہ وہ ہمارے دشمن ہیں، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کے بارے میں نرم پہلو اختیار کرنا چاہیے کیونکہ وہ ہمارے دینی بھائی ہیں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان معصیت کی وجہ سے کفر کی طرف واپس لوٹا دیا ہے۔

حقیقت سے پردہ چاک:

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

اس کے بعد ان کی حقیقت سے پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا گیا:

وہ (منافق) یہ چاہتے ہیں کہ جیسے وہ خود کافر ہیں تم بھی کافر بن جاؤ۔ پھر دونوں برابر ہو جاؤ۔ پس ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔ پس اگر وہ اعراض کریں تو انہیں پکڑو اور جہاں بھی پاؤ انہیں قتل کرو اور کسی کو رفیق اور مددگار نہ ٹھہراؤ۔'' (۸۹)

قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ منافق کی سزا اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت زیادہ ہے۔ مثلاً: ایک حدیث شریف میں ہے کہ جہنم کے سات طبقات ہیں اور ایک حدیث شریف میں ہے کہ منافقین کو ایک صندوق میں بند کر کے آگ میں ڈال

دیا جائے گا۔سب سے آخری درجہ منافقین کیلئے ہوگا۔ایک حدیث شریف میں ہے کہ سب سے زیادہ سخت عذاب منافقین کو ہوگا۔ان آیات کے ذریعے اللہ تعالی نے مقدمات کے فیصلے کرنے کیلئے چند اہم اصول بتائے ہیں۔مثلا:

(۱) تمام فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہونے چاہئیں ۔(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت مبارکہ حجت ہیں، فیصلوں میں ان سے بھی مدد لی جائے ۔ (۳) جس شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ یہ غلطی پر ہے اس کی وکالت کرنا جائز نہیں۔اللہ تعالی ہم سب کی نفاق سے حفاظت فرمائے اور ہر کام اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔(خلاصۂ مضامین قرآن کریم: ۵۴، ۵۵)

قتل عمد کی سزا:

وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيۡهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا﴿۹۳﴾

دسویں رکوع میں مومن کے قتل عمد کی سزا بتائی گئی ہے اور اس کے لیے انتہائی سخت لہجہ اختیار کیا گیا ہے، فرمایا گیا:

’’جو کوئی کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے، اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اس پر اللہ کا غضب ہوا اور اس پر لعنت کی اور اس کے لیے اللہ نے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔‘‘ (۹۳)

اس آیت سے بظاہر یہ ثابت ہوتا ہے کہ مومن کو قتل کرنے والا اگرچہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو وہ دائمی عذاب کا مستحق ہے، لیکن بالاتفاق یہ ظاہری معنی مراد نہیں ہے، دائمی عذاب کا مستحق صرف وہ شخص ہوگا جو مسلمان کے قتل کو حلال سمجھے گا؛ کیونکہ ایسا سمجھنے والا کافر ہو جاتا ہے اور کافر کے لیے ہمیشہ کا عذاب ہے۔

قتل عمد کی سزا بیان کرنے کے بعد دوبارہ جہاد کی اہمیت اور مجاہدین کی فضیلت بتائی گئی ہے اور واضح طور پر بتادیا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنے والے برابر نہیں ہو سکتے ۔یہ جو بار بار جہاد کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد امت اسلامیہ کی عزت اور سعادت کا راستہ ہے، اگر امت جہاد سے کنارہ کشی کرلے گی تو اسے ذلت اور رسوائی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ تَوَفّٰٮهُمُ الۡمَلٰۤـئِكَةُ ظَالِمِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَالُوۡا فِيۡمَ كُنۡتُمۡ‌ ؕ قَالُوۡا كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ‌ ؕ قَالُوۡۤا اَلَمۡ تَكُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوۡا فِيۡهَا‌ ؕ فَاُولٰۤـئِكَ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُ‌ ؕ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا ۙ﴿۹۷﴾

جہاد کے ساتھ ساتھ ہجرت کا بھی ذکر ہے کیونکہ ہجرت بھی جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک قسم ہے، چنانچہ گیارہویں رکوع میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص قدرت کے باوجود دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت نہیں کرے گا اور اس حالت میں اسے موت آجائے گی تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔(۹۷)

یقیناً جب فرشتے ایسے لوگوں کی جان قبض کرتے ہیں جو باوجود استطاعت کے ہجرت نہ کر کے اپنے حق میں برا کر رہے ہیں تو اس وقت وہ فرشتے ان سے دریافت کرتے ہیں کہ تم لوگ کس حالت میں تھے اور کیا کام کیا کرتے تھے، وہ جواب دیتے ہیں: ہم اس سرزمین میں محض عاجز و بے بس تھے، فرشتے کہتے ہیں، کیا اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع اور کشادہ نہ تھی کہ تم اس زمین میں ترک وطن کر کے چلے جاؤ اور یہاں سے نکل جاؤ؛ لہٰذا ایسے لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ دوزخ بہت بری بازگشت اور پھر جانے کی بری جگہ ہے۔ مگر ہاں جو مرد اور عورتیں اور بچے واقعی ایسے بے بس ہوں کہ نہ تو وہ کوئی تدبیر کر سکتے ہوں اور نہ راستے سے واقف ہوں۔ (تیسیر) مسلمان مدینہ میں جس قدر ترقی کرتے جاتے تھے اور ملک میں ان کا اقتدار بڑھتا جاتا تھا اسی قدر نئی نئی ضروریات پیش آتی جاتی تھیں اور ان ضروریات کے متعلق احکام نازل ہوتے رہتے تھے، مکہ کی زندگی میں مجبوریاں ہی مجبوریاں تھیں، ہجرت کے بعد ایک ایسی سرزمین نصیب ہوئی جہاں مسلمان بے خوف وخطر احکام اسلامی پر عمل کرنے کے قابل ہوئے، لہٰذا جو لوگ مکہ میں باقی رہ گئے تھے وہ بے بسی کی زندگی بسر کر رہے تھے، ان کے لئے ضروری ہوا کہ وہ آزاد سرزمین پر چلے جائیں، اسی طرح اگر آس پاس کی بستی میں کوئی مسلمان ہو گیا اور وہاں کفار کے غلبہ کی وجہ سے آزادانہ احکام اسلامی پر عمل نہ کر سکتا ہو تو اس کو بھی حکم ہوا کہ وہ آزاد سرزمین کی طرف ہجرت کر کے نکل آئے۔

یہاں تک کہ ہجرت کلمہ توحید کے قائم مقام قرار دی گئی، ہجرت کر کے دارالاسلام میں چلا آنا توحید و رسالت کا اقرار شمار ہوتا تھا اور جو شخص ہجرت کر کے نہ آئے اس کی ولایت اور نصرت کی ممانعت کی گئی اور جس طرح جہاد عام مفاد انسان کے لئے فرض کیا گیا اسی ہجرت خاص مفاد کے لحاظ سے فرض کی گئی۔ جہاد سے عام انسانوں کو امن دینا اور امن کی زندگی بسر کرنے کا موقع دینا ہوتا ہے کہ اصل اشاعت اسلامی یہی ہے تو ہجرت میں شخصی امن اور شخصی عافیت اور آزادی کے ساتھ احکام اسلامی پر عمل مقصود ہوتا ہے اور چونکہ ترک وطن ایک مشکل اور سخت کام ہے، اس لئے لوگ وطن کے لالچ میں بے بسی کی زندگی پر قناعت کرتے تھے، ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے وعید نازل کی، کیونکہ ہجرت کی قدرت اور استطاعت کے ہوتے ہوئے ہجرت نہ کرنا اس کا مطلب یہ ہے کہ پورے دین پر عمل نہ کرنے اور تمام احکام کے بجا نہ لانے پر رضامند ہو، اس لئے تارکین ہجرت پر وعید فرمائی اور یہاں اس وعید کا ایک مخصوص طریقہ اختیار کیا۔ (کشف الرحمٰن: ۱/۱۴۸)

وَمَنۡ يُّهَاجِرۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ يَجِدۡ فِى الۡاَرۡضِ مُرٰغَمًا كَثِيۡرًا وَّسَعَةً ‌ؕ وَمَنۡ يَّخۡرُجۡ مِنۡۢ بَيۡتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ثُمَّ يُدۡرِكۡهُ الۡمَوۡتُ فَقَدۡ وَقَعَ اَجۡرُهٗ عَلَى اللّٰهِ‌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ۝۱۰۰

بعض روایات میں ہے کہ جب آیات ہجرت نازل ہوئیں تو حضرت حمزہ بن قیس رضی اللہ عنہ جو کہ سخت علیل تھے وہ پریشان ہو گئے، چلنے پھرنے کے قابل تو تھے نہیں، اپنے بیٹوں سے کہا کہ مجھے چارپائی پر ڈال کر مدینہ منورہ لے چلو، میں مکہ میں ایک رات بھی نہیں گزاروں گا۔ انہیں چارپائی پر ڈال کر مدینہ لے جانے لگے، لیکن مکہ سے نکلتے ہی ان کا انتقال ہو گیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

’’اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے گھر سے نکل جائے، پھر اس کو موت آ پڑے، تو اس کا ثواب اللہ کے ذمے ہو چکا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔‘‘ (۱۰۰)

صلوٰۃ خوف، صلوٰۃ مسافر:

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا ﴿۱۰۱﴾

اور جب تم زمین میں سفر کرو اور تمہیں اس بات کا خوف ہو کہ کافر لوگ تمہیں پریشان کریں گے، تو تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم نماز میں قصر کر لو۔ یقینا کفر لوگ تمہارے کھلے دشمن ہیں۔

چونکہ ہجرت وجہاد میں خوف وخطر کا سامنا بھی ہوتا ہے، اس لیے بارہویں رکوع میں صلوۃ خوف اور صلوۃ مسافر کا ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سفر کی وجہ سے کچھ سہولتیں اور رعایتیں رکھی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر مسافت شرعی کا سفر ہو تو چار رکعت والی نمازیں دو رکعت پڑھی جائیں گی، مسافت شرعی سے مراد قدیم پیمائش میں ’چار برید‘ ہے، جیسا کہ روایات میں آیا ہے، (**بخاری تعلیقاً، باب کم یقصر الصلوٰۃ؟**) یہ چار برید ۴۸ میل شرعی اور موجودہ مروجہ پیمائش میں مشہور قول کے مطابق تقریباً ۷۷ کیلومیٹر سے کچھ زیادہ ہوتا ہے، یہ اکثر فقہاء کی رائے ہے، حنفیہ کے یہاں کوئی مخصوص مقدار متعین نہیں، اوسط رفتار سے استراحت کرتے ہوئے تین دن ورات میں طے کی جانے والی مسافت ’’سفر شرعی‘‘ کی مقدار ہے؛ (بدائع الصنائع: ۱/۲۶۱) لیکن ہمارے زمانہ میں علماء احناف کا فتویٰ بھی وہی چار برید والے قول پر ہے، پھر حنفیہ کے نزدیک سفر میں قصر واجب ہے نہ کہ محض جائز؛ کیوں کہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ نماز دو دو رکعت فرض کی گئی تھی، پھر سفر میں یہی برقرار رہی اور حضر یعنی وطن میں رہنے کی حالت میں اس میں اضافہ کر دیا گیا، (بخاری) گویا سفر میں نماز فرض ہی ہوئی ہے دو رکعت، نیز حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے قصر کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ یہ تم پر اللہ کا صدقہ ہے، پس اللہ کے صدقہ کو قبول کرو، (ابوداؤد، باب صلوٰۃ المسافر، حدیث نمبر: ۱۱۹۹) اس سے بھی قصر کا واجب ہونا معلوم ہوتا ہے۔

اور اس کے ساتھ ساتھ آیت ۱۰۲ میں صلوٰۃ خوف کا ذکر ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

اور (اے پیغمبر) جب تم ان کے درمیان موجود ہو اور انہیں نماز پڑھاؤ تو (دشمن سے مقابلے کے وقت اس کا طریقہ یہ ہے کہ) مسلمانوں کا ایک گروہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو جائے اور اپنے ہتھیار ساتھ لے لے۔ پھر جب یہ لوگ سجدہ کر چکیں تو تمہارے پیچھے ہو جائیں، اور دوسرا گروہ جس نے ابھی تک نماز نہ پڑھی ہو آگے آ جائے، اور وہ تمہارے ساتھ نماز پڑھے، اور وہ اپنے ساتھ اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار لے لے۔ کافر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے غافل ہو جاؤ تو وہ ایک دم تم پر ٹوٹ پڑیں۔ اور اگر تمہیں بارش کی وجہ سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو اس میں بھی تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے ہتھیار اتار کر رکھ دو، ہاں اپنے بچاؤ کا سامان ساتھ لے لو۔ بیشک اللہ نے کافروں

کے لیے ذلت والا عذاب تیار کررکھا ہے۔

نماز کی اس کیفیت کو ''صلوٰۃ خوف'' کہتے ہیں، حدیث میں اس نماز کی مختلف کیفیتیں منقول ہیں، امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں نماز خوف سے متعلق روایات کا نسبتاً زیادہ احاطہ کیا ہے، (دیکھئے : باب صلوٰۃ الخوف ، حدیث نمبر : ۱۲۳۶-۳۹) فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیلات موجود ہیں، اس سے نماز کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ میدان جنگ میں کھڑے ہیں، دشمن مقابلہ پر ہے اور خطرات کی گھٹائیں ہرسو چھائی ہوئی ہیں، اس وقت شمشیر کے سایہ میں بھی مومن کو نماز ادا کرنی ہے! (آسان تفسیر: ۱/۱ ۳۳۲،۳۳)

عدل وانصاف کی تاریخ میں :

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ۝۱۰۵ۙ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۰۶ۚ

شان نزول:

نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں ایک منافق طعمہ بن ابیرق نامی نے ایک انصاری کے گھر میں نقب لگائی اور آٹے کا تھیلا جس میں زرہ وہتھیار رکھے ہوئے تھے چرا کرلے گیا، اتفاق سے اس تھیلہ میں ایک سوراخ تھا، چور کے گھر تک راستہ میں آٹا گرتا گیا، جس سے لوگوں کو پتہ چل گیا کہ طعمہ بن ابیرق کی یہ کارسازی ہے، طعمہ کو جب ڈر ہوا کہ پکڑا جاؤں گا تو اس نے یہ تدبیر کی، رات ہی کو وہ مال لے جاکر زید بن سمین یہودی کے پاس رکھ دیا جو اس کا ہمسایہ تھا، صبح کو جب تحقیق وتفتیش شروع ہوئی تو آٹے کے سراغ سے طعمہ کو جا پکڑا، مگر تلاشی کے بعد اس کے گھر میں سے کچھ نہ نکلا اور چور نے قسم کھائی کہ بخدا مجھے اس کا کچھ علم نہیں، لوگوں نے چھوڑ دیا اور یہودی کے گھر کی تلاشی لی، جہاں سے وہ زرہ برآمد ہوئی، جب اس یہودی سے پوچھا گیا تو اس نے کہا: میں چور نہیں، میرے پاس تو طعمہ بن ابیرق امانت رکھ گیا ہے، طعمہ نے اس سے صاف انکار کردیا اور اپنے عزیزوں سے خفیہ مشورہ کرکے اپنی قوم کے لوگوں کو لے کر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مال فلاں شخص کے گھر سے برآمد ہوا ہے، وہ لوگ مجھ پر چوری کی تہمت لگاتے ہیں، آپ سب کے سامنے میری صفائی اور برائت کردیں اور یہودی کو چور ٹھہرائیں، مگر نفس الامر میں یہودی اپنے قول میں سچا تھا اور طعمہ اپنے قول میں جھوٹا تھا، اور واقع میں وہی چور تھا قتادہ بن النعمان وغیرہ جو طعمہ کو چور بتلارہے تھے نبی نے ان سے یہ فرمایا کہ تم بغیر کسی ثبوت اور کسی شہادت کے کسی پر کیسے چوری کی تہمت لگاتے ہو، اس پر اللہ نے پورے دورکوع نازل فرمائے، جن میں طعمہ کی خیانت اور یہودی کی برائت کی طرف اشارہ فرمایا اور اشارہ فرمایا کہ خیانت کرنے والوں کی حمایت کا تصور بھی نہ کیجئے اور اللہ سے اس بے جا حمایت کے تصور کی بھی معافی مانگئے، ظاہر حال اور لاعلمی کی بناء پر آپ نے جو فرمایا اگرچہ وہ فی حد ذاتہ گناہ نہ ہو مگر آپ کی شان عالی کے لیے مناسب نہیں کہ لسان نبوت سے کوئی ایسا کلمہ نکل جائے جو نفس الامر کے

خلاف ہو، اگر چہ اس کلمہ کا صدور لاعلمی کی بناء پر ہو، چنانچہ فرماتے ہیں: اے نبی تحقیق یہ مقدس کتاب ہم نے آپ کی طرف حق اور راستی کے ساتھ اتاری ہے، تاکہ آپ لوگوں کے درمیان خواہ مسلمان ہو یا کافر اس چیز کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ آپ کو سمجھائے یا دکھلائے یا صراحۃ یا اشارۃً آپ کو بتلائے یا سمجھائے، امام قرطبی فرماتے ہیں کہ بما اراک اللہ سے دل کی آنکھ سے دکھلانا مراد ہے کیونکہ حکم اور فیصلہ سر کی آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ (تفسیر ادریسی)

ارشاد باری ہے: ''آپ دغابازوں کی طرف سے جھگڑا کرنے والے نہ بنیں اور اللہ سے معافی مانگیں، بے شک اللہ تعالی بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔ (۱۰۵، ۱۰۶)

یہ آیات اور یہ واقعہ عدل وانصاف کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے کہ ایک یہودی اور مسلمان (منافق) کے تنازع میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان مسلمان کی طرف ہوا تو اس پر اللہ تعالی کی طرف سے آپ کو نہ صرف تنبیہ کی گئی، بلکہ اس تنبیہ کا قیامت تک کے لیے قرآن میں بھی ذکر کر دیا گیا۔

ان آیات کے نزول کے بعد یہ شخص جس نے چوری کی تھی مکہ بھاگ گیا اور مرتد ہو گیا، اس لیے پندرہویں رکوع میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا جرم کفر وشرک ہے اور جس کا کفر وشرک پر انتقال ہو جائے اس کی مغفرت کی کوئی صورت نہیں۔ (۱۱۶) (خلاصۃ القرآن م اش)

شرک جرم عظیم:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾

بیشک اللہ اس بات کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے، اور اس سے کمتر ہر گناہ کی جس کے لیے چاہتا ہے بخشش کر دیتا ہے۔ اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے، وہ راہ راست سے بھٹک کر بہت دور جا گرتا ہے۔

یہی مضمون آیت نمبر ۴۸ میں بھی آیا ہے، اس پر مولانا ادریس کاندھلویؒ نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ملفوظ نقل کیا ہے:

امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ کفر اور شرک کا عذاب دائمی اور ابدی ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا، جیسا کہ نصوص قطعیہ اور موکدہ اس پر دلالت کرتی ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ کفر اور کافروں کے ساتھ اللہ کی عداوت ذاتیہ ثابت ہو چکی ہے، تو ناچار رحمت ورأفت جو صفات جمال میں سے ہے اس سے آخرت میں کافروں کو کوئی حصہ نہیں ملے گا اور صفت رحمت اللہ کی عداوت ذاتی کو دور نہ کرے گی، کیونکہ جو چیز ذات سے تعلق رکھتی ہے وہ بہ نسبت اس چیز کے جو صفت سے تعلق رکھتی ہے کہیں زیادہ اقوی اور ارفع ہوتی ہے، پس مقتضائے ذات کو نہیں بدل سکتا اور یہ جو حدیث قدسی میں ہے کہ **سبقت رحمتي علی غضبي**۔ سو اس غضب سے غضب صفاتی سمجھنا چاہیے جو کہ گناہ گاروں کے ساتھ مخصوص ہے، نہ کہ غضب ذاتی جو مشرکوں کے ساتھ مخصوص ہے اور اللہ شانہ کا یہ ارشاد **و رحمتي وسعت كل شئي** میری رحمت ہر چیز کو

گھیرے ہوئے ہے، سو جاننا چاہیے کہ مومنوں اور کافروں کے حق میں رحمت کا وسیع ہونا صرف دنیا ہی میں مخصوص ہے اور آخرت میں تو کافروں کو رحمت کی بو بھی نہ پہنچے گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **انہ لاییئس من روح اللہ الاالقوم الکافرون** اللہ کی رحمت سے سوائے کافروں کے کوئی ناامید نہ ہوگا۔

وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾

اور میں انہیں راہ راست سے بھٹکا کر رہوں گا، اور انہیں خوب آرزوئیں دلاؤں گا، اور انہیں حکم دوں گا تو وہ چوپایوں کے کان چیر ڈالیں گے، اور انہیں حکم دوں گا تو وہ اللہ کی تخلیق میں تبدیلی پیدا کریں گے۔ اور جو شخص اللہ کے بجائے شیطان کو دوست بنائے اس نے کھلے کھلے خسارے کا سودا کیا۔

جب شیطان سجدہ نہ کرنے پر ملعون اور مردود کیا گیا تو اس نے تو اسی وقت کہا تھا کہ میں تو غارت ہو ہی چکا، مگر میں بھی تیرے بندوں اور اولاد آدم میں سے اپنے لئے ایک مقدار معلوم اور بڑا حصہ لوں گا، یعنی ان کو گمراہ کر کے اپنے ساتھ جہنم میں لے جاؤں گا، جیسا کہ سورہ حجر اور بنی اسرائیل وغیرہ میں مذکور ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ متمرد اور ملعون ہونے کے علاوہ شیطان تو جملہ بنی آدم کا اول روز سے سخت دشمن اور بدخواہ ہے اور اس دشمنی کو صاف ظاہر کر چکا ہے، تو اب یہ احتمال بھی نہ رہا کہ گو شیطان ہر طرح سے خبیث و گمراہ ہے مگر شاید کسی کو خیر خواہانہ کوئی نفع کی بات بتلا دے، بلکہ یہ معلوم ہو گیا کہ وہ دشمن ازلی تو بنی آدم کو جو کچھ بتلائے گا ان کی گمراہی اور بربادی ہی کی بات بتلائے گا، پھر ایسے گمراہ اور بدخواہ کی اطاعت کرنی کس قدر جہالت اور نادانی ہے۔ (تفسیر عثمانی: ۱۲۷)

ان کے عقائد اور بنیادی خیالات کو بھی ڈگمگا دوں گا۔ اور ان کے نفسانی جذبات اور خواہشات کو بھی ابھار دوں گا۔ گمراہیاں دو ہی طریقوں سے آسکتی ہیں اور انسان شیطانی اثر دو ہی شکلوں سے قبول کر سکتا ہے؛ ایک عقل و فکر کی راہ سے، دوسرے جذبات اور احساسات کا راستہ ہے۔ قرآن مجید کے دو لفظوں نے ان سب کا احاطہ کر لیا۔ ضلال کے تحت میں ہر قسم کی عقلی، فکری، نظری گمراہیاں آگئیں۔ اور تمنی کے تحت میں معاصی، فواحش کی جانب میلان اور نظر سے ان کی مضرتوں کا غائب ہو جانا آ گیا۔

تغییر خلق اللہ کی دو بڑی تقسیمیں ہو سکتی ہیں، ایک خلق تکوینی میں تغییر، دوسرے خلق تشریعی میں تغییر، قدیم مفسرین نے تغییر خلق تکوینی کی مثال میں داڑھی منڈانے اور جسم گدانے کو پیش کیا ہے؛ لیکن جاہلیت جدید کی ترقیوں نے ان سے کہیں بڑھ بڑھ کر مثالیں نہ صرف ایجاد کر لی ہیں بلکہ انہیں فیشن میں داخل کر دیا ہے۔ مثلاً مردوں کا چہرہ کے بال بالکل صاف کر کے اور طرح طرح کی نزاکتیں اختیار کر کے زیادہ حد تک عورت بن جانا، عورتوں کا سر کے بال کٹا کر اور مردانہ وضع ولباس اختیار کر کے زیادہ سے زیادہ حد تک مرد بن جانا، ایسے آپریشن کرانا جس سے جنس تبدیل ہو جائے یعنی عورت

مرد بن جائے اور مرد عورت ہو جائے۔ وقس علی ہذا۔

خلق تشریعی میں تغییر کے معنی دین اور احکام دین تحریف کر دینا ہے۔

ابن جریر نے خلق اللہ کے معنی دین اللہ کے ابن عباس رضی اللہ عنہ صحابی اور مجاہد تابعی اور عکرمہ تابعی سے نقل کئے ہیں اور دوسروں نے بھی یہی معنی لئے ہیں۔

ای دینه بالکفر و احلال ما حرم و تحریم ما احل (جلالین) قال معناه ابن عباس وعن عکرمة و ابو صالح، و ذلک کله تعذیب للحیوان و تحریم و تحلیل بالطغیان و قوله بغیر هجة و لا برهان. (قرطبی)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ آفتاب پرستی، شجر پرستی، حیوان پرستی وغیرہ سب اس تغییر خلق اللہ کی صورتیں ہیں کہ مشرک ان سے وہ کام لے رہا ہے جس کے لئے ان کی خلقت ہوئی ہی نہ تھی۔ (قرطبی) (تفسیر ماجدی: ۱/ ۸۱۵، ۸۱۶)

انسان کی سرکشی:

اس کے بعد متعدد آیات میں انسان کی سرکشی کا سبب بتلایا گیا ہے، وہ یہ کہ اللہ کے مقابلے میں شیطان کی اطاعت کرتا ہے اور وہ اس کو ہدایت کے راستے سے بہت دور لے جاتا ہے۔

پھر ابوالانبیاء حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کا تذکرہ ہے اور یہ ہدایت اس کو ملے گی جو ان کے راستے کی اتباع کرے گا۔

یتیم بچیوں کے حقوق:

سولہویں رکوع میں دوبارہ عورتوں کا تذکرہ ہے، جس میں ان پر ظلم کرنے اور ان کے حقوق غصب کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ کہ اگر میاں بیوی کے درمیان اختلاف ہو جائے تو انہیں آپس میں صلح کر لینی چاہیے کہ صلح ہی سب سے اچھا راستہ ہے۔

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

اور (اے پیغمبر) لوگ تم سے عورتوں کے بارے میں شریعت کا حکم پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ اللہ تم کو ان کے بارے میں حکم بتاتا ہے، اور اس کتاب (یعنی قرآن) کی جو آیتیں جو تم کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں وہ بھی ان یتیم عورتوں کے بارے میں (شرعی حکم بتاتی ہیں) جن کو تم ان کا مقرر شدہ حق نہیں دیتے، اور ان سے نکاح کرنا بھی چاہتے ہو، نیز کمزور بچوں کے بارے میں بھی (حکم بتاتی ہیں) اور یہ تاکید کرتی ہیں کہ تم یتیموں کی خاطر انصاف قائم کرو۔ اور تم جو بھلائی کا کام کرو گے، اللہ کو اس کا پورا پورا علم ہے۔

اسلام سے پہلے عورتوں کو معاشرے میں ایک کمتر مخلوق سمجھا جاتا تھا اور ان کے معاشرتی اور معاشی حقوق نہ ہونے کے برابر تھے، جب اسلام نے عورتوں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید کی اور عورتوں کو بھی میراث میں حصہ دار قرار دیا تو یہ بات عربوں کے معاشرے میں اتنی اچنبھی تھی کہ بعض لوگ یہ سمجھتے رہے کہ عورتوں کو جو حقوق دئے گئے ہیں وہ شاید عارضی نوعیت کے ہیں اور کسی وقت منسوخ ہو جائیں گے، جب ان کی منسوخی کا حکم نہیں آیا تو ایسے حضرات نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں یہ واضح کر دیا گیا کہ یہ احکام عارضی نہیں ہمیشہ کے لئے ہیں، اللہ تعالی نے ان کا حکم دیا ہے اور قرآن کریم کی جو آیات پہلے نازل ہوئی ہیں ان میں بہت سے احکام آچکے ہیں، اس کے ساتھ مرد وعورت کے باہمی تعلقات کے بارے میں کچھ مزید احکام بھی بیان فرمائے گئے ہیں۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں حضرت عائشہؓ نے اس ہدایت کا پس منظر یہ بتایا ہے کہ بعض اوقات ایک یتیم لڑکی اپنے چچا کے بیٹے کی سرپرستی میں ہوتی تھی، وہ خوبصورت بھی ہوتی اور اس کے باپ کا چھوڑا ہوا مال بھی اچھا خاصا ہوتا تھا، اس صورت میں اس کا چچازاد یہ چاہتا تھا کہ اس کے بالغ ہونے پر وہ خود اس سے نکاح کرلے؛ تاکہ اس کا مال اسی کے تصرف میں رہے؛ لیکن نکاح میں وہ اس کو اتنا مہر نہیں دیتا تھا، جتنا اس جیسی لڑکی کو دینا چاہئے، دوسری طرف اگر لڑکی زیادہ خوبصورت نہ ہوتی تو اس کے مال کے لالچ میں اس سے نکاح تو کرلیتا تھا؛ لیکن نہ صرف یہ کہ اس کا مہر کم رکھتا تھا؛ بلکہ اس کے ساتھ ایک محبوب بیوی جیسا سلوک بھی نہیں کرتا تھا۔ (توضیح القرآن: ۱/۳۰۰، ۳۰۱)

میاں بیوی کے درمیان امن سے رہنے کا سمجھوتہ:

وَاِنِ امۡرَاَةٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِهَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا .... الی .... وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيۡمًا۝۱۳۰

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے زیادتی یا بیزاری کا اندیشہ ہو تو ان میاں بیوی کے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ آپس کے اتفاق سے کسی قسم کی صلح کرلیں۔ اور صلح کر لینا بہتر ہے اور انسانوں کے دل میں (کچھ نہ کچھ) لالچ کا مادہ تو رکھ ہی دیا گیا ہے۔ اور اگر احسان اور تقوی سے کام لو تو جو کچھ تم کرو گے اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ (۱۲۸) اور عورتوں کے درمیان مکمل برابری رکھنا تو تمہارے بس میں نہیں، چاہے تم ایسا چاہتے بھی ہو۔ البتہ کسی ایک طرف پورے پورے نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ایسا بنا کر چھوڑ دو جیسے کوئی بیچ میں لٹکی ہوئی چیز، اور اگر تم اصلاح اور تقوی سے کام لو گے تو یقین رکھو کہ اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (۱۲۹) اور اگر دونوں جدا ہو ہی جائیں تو اللہ اپنی (قدرت اور رحمت کی) وسعت سے دونوں کو (ایک دوسرے کی حاجت سے) بے نیاز کر دے گا۔ اللہ بڑی وسعتوں والا، بڑی حکمت والا ہے۔ (۱۳۰)

عدل کی طرف خاص توجہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ اَوِ الۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ ۚ اِنۡ يَّكُنۡ غَنِيًّا اَوۡ فَقِيۡرًا فَاللّٰهُ اَوۡلٰى بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰٓى اَنۡ تَعۡدِلُوۡا ۚ وَاِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ

كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ﴿۱۳۵﴾

اے ایمان والو! انصاف قائم کرنے والے بنو، اللہ کی خاطر گواہی دینے والے، چاہے وہ گواہی تمہارے اپنے خلاف پڑتی ہو، یا والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف۔ وہ شخص (جس کے خلاف گواہی دینے کا حکم دیا جارہا ہے) چاہے امیر ہو یا غریب، اللہ دونوں قسم کے لوگوں کا (تم سے) زیادہ خیر خواہ ہے، لہذا ایسی نفسانی خواہش کے پیچھے نہ چلنا جو تمہیں انصاف کرنے سے روکتی ہو۔ اور اگر تم توڑ مروڑ کرو گے (یعنی غلط گواہی دو گے) یا (سچی گواہی دینے سے) پہلو بچاؤ گے تو (یاد رکھنا کہ) اللہ تمہارے کاموں سے پوری طرح باخبر ہے۔

اسلام میں قانون شہادت کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اسی پر فیصلے کا دارومدار ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ولا تکتموا الشھادۃ" گواہی کو مت چھپاؤ۔ شہادت کو چھپانے والا سخت گنہگار ہے۔ کسی شخص پر ظلم ہوتا دیکھ کر دوسرا شخص خاموش رہے تو وہ خود مجرم بن جائے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بہترین گواہ وہ ہے جو بغیر مطالبہ کے ٹھیک گواہی دے دے، اور بدترین گواہ وہ ہے جس سے شہادت دینے کا مطالبہ کیا جائے تو وہ جھوٹی گواہی دے دے۔ اسی لیے سچی شہادت دینے کی ترغیب دی گئی ہے اور جھوٹی گواہی کی مذمت بیان کی گئی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی مشہور زمانہ کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ انبیاءؑ کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد رفع التظالم من بین الناس بھی ہے۔ یعنی لوگوں کے درمیان سے ظلم کو مٹانا سارے نبیوں کا دستور العمل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو لوگوں کی اصلاح کے لیے مبعوث فرمایا اور سب سے اولین اصلاح عقیدے کی اصلاح ہے۔ چنانچہ تمام انبیائے کرام اصلاح عقیدہ کو اولیت دیتے رہے۔ لوگوں کو کفر، شرک اور معاصی سے پاک کر کے انہیں توحید، ایمان اور اخلاص کی دعوت دیتے رہے۔ اس کے بعد انبیاء کے مشن میں یہ بات رہی کہ ظلم مٹا کر عدل و انصاف کی فضا قائم کریں، حضور خاتم النبیین (علیہ السلام) کے زمانہ میں مشرق و مغرب میں ظلم کا دور دورہ تھا، اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی وساطت سے اسے ختم کیا اور انصاف کا بول بالا ہونے لگا۔ ایک مومن کے دوسرے مومن پر کچھ حقوق و فرائض ہیں **لا ظلمه و لا یخذله** ایک مومن دوسرے مومن پر نہ خود ظلم کرتا ہے اور نہ اس پر ظلم کو برداشت کرتا ہے بخاری شریف میں حدیث قدسی میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے بنی آدم! **انی حرمت الظلم علی نفسی** میں نے اپنی ذات پر ظلم کرنا حرام قرار دے دیا ہے۔ (معالم العرفان: ۵/۵۸۶، ۵۸۷)

ایمان کے بنیادی ستون:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ الَّذِىۡ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِاللّٰهِ وَمَلٰۤـئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيۡدًا ﴿۱۳۶﴾

اے ایمان والو! اللہ پر ایمان رکھو، اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر اتاری ہے اور ہر

اس کتاب پر جواس نے پہلے اتاری تھی اور جو شخص اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے رسولوں کا اور یوم آخرت کا انکار کرے وہ بھٹک کر گمراہی میں بہت دور جا پڑا ہے۔

پانچویں پارہ کے آخری رکوع میں دوبارہ منافقین کی مذمت ہے اور انہیں سخت ترین وعید سنائی گئی ہے۔(خلاصۃ القرآن: م اش)

خلاصۂ رکوع:۵......قانون اصلاح معاملات۔ماخذ: آیت:۲۹۔

خلاصۂ رکوع:۶......تقسیم مراتب زوجین اور فرض مشترک۔ماخذ: آیت:۳۶، ۳۴۔

خلاصۂ رکوع:۷...... استحصال قانون الٰہی کے لئے تیقظ کی ضرورت۔(۲) ترک تیقظ سے مسخ فطرت کا خطرہ۔ (۳) قانون الٰہی کو چھوڑ کر غیر اللہ کے قانون کو وہ درجہ دینا اس میں بھی ایک طرح کی شرک کی بو ہے۔ ماخذ: (۱) آیت:۴۳۔(۲) آیت:۴۷۔(۳) آیت:۴۸۔

خلاصۂ رکوع:۸......ترک تمسک (۱) بکتاب اللہ سے اتباع جبت وطاغوت کرنا پڑے گا۔(۲) اور اتباع جبت و طاغوت کا نتیجہ نزول لعنت الٰہی ہے۔ماخذ: (۱) آیت:۵۱۔(۲) آیت:۵۲

خلاصۂ رکوع:۹......(۱) مسلک صحیح کے ترک کرنے پر محاکمہ الی الطاغوت کرنا پڑے گا۔(۲) تعمیل محاکمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحدید۔ماخذ: (۱) آیت:۶۰۔(۲) آیت:۶۵،۶۶۔

خلاصۂ رکوع:۱۰......اشاعت قانون عدل میں قتال کی ضرورت بالخصوص مستضعفین کی حمایت کے لئے۔ماخذ: آیت:۷۴، ۷۵

خلاصۂ رکوع:۱۱......(۱) موت کا خیال دل سے نکال کر مکمل تیاری کر کے نکلنا پڑے گا۔(۲) اس سفر قتال میں ہر عسر ویسر کو تقدیر الٰہی پر محمول کر کے اطاعت امیر سے گریز نہ کی جائے۔(۳) اور جہاں تک ہو سکے جمعیۃ غزاۃ کو بڑھانے کی سعی کی جائے۔ماخذ: (۱) آیت:۷۷،۷۸۔(۲) آیت:۷۹۔(۳) آیت:۸۴،۸۵۔

خلاصۂ رکوع:۱۲......اقسام الکفار اقسام ثلاثہ سے قتال ممنوع ہے، اور قسم رابع سے مصالحت ممنوع ہے۔ وہ جن سے قتال ممنوع ہے۔ماخذ: آیت:۹۰۔وہ جن سے مصالحت ممنوع ہے۔آیت:۹۱۔

خلاصۂ رکوع:۱۳......مسلمانوں میں قتال کا انسداد، میدان قتال میں مؤمن کی تمیز، اعلان جنگ کے بعد مسلمانوں کی اقسام اربعہ میں سے اقسام ثلاثہ کا ذکر۔ماخذ: آیت:۹۳، ۹۴، ۹۵۔

خلاصۂ رکوع:۱۴......حکم قتال کے بعد مسلمانوں کی قسم رابع کا ذکر۔ماخذ: آیت:۹۷۔

خلاصۂ رکوع:۱۵......اہمیت قتال۔ماخذ: آیت:۱۰۱، ۱۰۲۔

خلاصۂ رکوع:۱۶......اہل حل وعقد کو خوّان (خیانت کرنے والے) اور اثیم (گناہگار مجرم) کی طرف داری نہیں

کرنی چاہئے۔ ماخذ: آیت: ۱۰۵۔

خلاصۂ رکوع: ۱۷......مؤمنین کو اپنے مسلک صحیح سے ہرگز نہیں ہٹنا چاہئے۔ ماخذ: آیت: ۱۱۵۔

خلاصۂ رکوع: ۱۸......رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مسلک سے ہٹنے والے مرض شرک میں مبتلا ہوکر شیطان لعین کے متبع ہوں گے۔ ماخذ: آیت: ۱۱۷، ۱۱۸۔

خلاصۂ رکوع: ۱۹......مسائل ملک داری۔ ماخذ: آیت: ۱۲۷ تا ۱۳۰۔ مسائل ملک داری کی جو تمہید سورۂ بقرہ میں ذکر ہو چکی ہے، اس کو ضرور ملاحظہ فرمالیا جائے۔

اشارات ضروریہ:

سورہ النساء میں دو باب تھے۔ تدبیر منزل، سیاست مدنیہ۔ سیاست کے پھر دو باب تھے: ملک گیری، ملک داری۔ ملک گیری ختم ہو چکی، اب ملک داری شروع ہوتی ہے۔

خلاصۂ رکوع: ۲۰......(۱) تلقین استقلال۔ (۲) بے استقلالی کے آثار۔ (۳) اور اس کے نتائج۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۳۵۔ (۲) آیت: ۱۳۷۔ (۳) آیت: ۱۳۸، ۱۳۹۔

خلاصۂ رکوع: ۲۱......(۱) نقائض منافقین۔ (۲) مقاطعہ عن الکفار۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۴۲، ۱۴۳۔ (۲) آیت: ۱۴۴۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مال تجارت کر کے کھائے۔ ظلم سے نہیں، کسی کو قتل نہ کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی خادم یا عورت کو نہیں مارا، اس سے نفرت بڑھتی ہے۔ شرک اپنے آپ پر ظلم ہے۔ (۳۶) بخل انصاف میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اس لیے اس سے روکا۔ (۳۸) ریا کاری سے بچایا اور ہر قسم کے ظلم سے بھی روکا۔ (۴۰) امانت سپرد کرنا۔ (۵۸) انصاف کا محور اللہ پاک اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی ہے۔ (۵۹-۶۵) جہاد کمزور لوگوں کی حفاظت کے لیے ہے۔ (۷۵) عورتیں روزانہ جہاد کرتی ہے، اس لیے سورۂ نساء میں جہاد کے زیادہ احکام ہے کہ تو بھی اپنے شوہر کے ساتھ جہاد میں ہے۔ (خواطر)

***

پانچویں پارہ کے چند فوائد

(۱) جس شخص کے اندر فخر اور غرور کا مرض وہ حسنہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے بھی محروم رہتا ہے، بلکہ یہ بری صفت اسے اللہ کی عبادت اور ایمان سے بھی محروم کر سکتی ہے۔

(۲) جو سچے مؤمن ہیں ان کے لئے اللہ کی مدد کافی ہے، انہیں کسی اور سے مانگنے کی ضرورت نہیں۔

(۳) ایمان اور اعمال صالحہ، اخروی نعمتوں کے حصول کا سبب ہیں۔

(۴) اسلام میں امانت کی بے حد اہمیت ہے۔ حضرت انس ﷺ سے روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس میں امانت نہ ہو اس میں ایمان (کامل) نہیں اور جس میں عہد کی پاسداری نہ ہو اس میں دین مکمل نہیں۔

(۵) کتاب وسنت کے ہر فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور دل وجان سے ان پر راضی ہونا واجب ہے۔

(۶) علم پر عمل کی برکت سے دنیوی اور اخروی سعادتیں حاصل ہوتی ہیں۔

(۷) مجاہد ہر حالت میں نفع میں رہتا ہے، زندہ رہے تو بھی اور شہید ہو جائے تو بھی۔

(۸) زبان سے محبت اور اطاعت کے دعوے اور عملی طور پر مخالفت منافقوں کا شیوہ ہے۔

***

پارہ:٦

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾

اللہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی کی برائی علانیہ زبان پر لائی جائے، الا یہ کہ کسی پر ظلم ہوا ہو اور اللہ سب کچھ سنتا، ہر بات جانتا ہے۔

ظالم کی مذمت:

پانچویں پارے کے آخر میں منافقین کا تذکرہ تھا، اب چھٹے پارے کے شروع میں اس کا تذکرہ ہے کہ منافقین مسلمانوں کو ایذاء اور تکلیف پہنچایا کرتے تھے، جس کی وجہ سے بعض دفعہ مسلمانوں کی زبان پر شکوہ وشکایت جاری ہوجاتی۔ اللہ تعالی نے ان آیات میں شکوہ وشکایت کی حدود کو بیان فرمایا ہے اور اس میں ایسا قانون بیان فرمایا ہے کہ ایک طرف تو مظلوم کو اجازت دی کہ بدلہ لے سکتے ہو۔ شکایت بھی کر سکتے ہو۔ عدالتی چارہ جوئی بھی کر سکتے ہو، جو مظلوم کو اس کا حق دلانے میں عین تقاضاء انصاف اور انسداد جرائم کا ایک ذریعہ ہے اور دوسری طرف مظلوم کو اعلی اخلاق اپنانے کی ترغیب بھی دی جارہی ہے کہ وہ اپنے حق میں ایثار سے کام لے اور ظلم کا انتقام نہ لے بلکہ عفوودرگزر کر کے نیکی کا کام کرے۔

قرآن پاک میں ایک اور جگہ اللہ تعالی نے بدلہ لینے کی اجازت دینے کے ساتھ عفوودرگزر کی اور معاف کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: ''وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲۶﴾'' (ترجمہ) اور اگر بدلہ لینے لگو تو اتنا ہی لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا ہے اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھی بات ہے۔ (سورۃ نحل آیت نمبر ۱۲۶)

ایک اور جگہ فرمایا: وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ (ترجمہ) اور برائی کا بدلہ برائی ہے ویسی ہی پھر جو شخص معاف کرے اور اصلاح کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔ (سورۃ الشوری آیت نمبر ۴۰) (خلاصۂ مضامین قرآن کریم: ۵۷)

ان آیات میں یہ نصیحت فرماتے ہیں کہ اللہ بڑا حلیم وکریم اور ستار العیوب ہے، کسی کا عیب ظاہر کرنا اور کسی کی برائی کرنا اور کسی کا پردہ فاش کرنا پسند نہیں کرتا، اسی طرح ہم کو بھی حلم اور پردہ پوشی سے کام لینا چاہیے، ہاں! مگر جس کسی پر ظلم ہوا ہو، سو وہ مظلوم اگر ظالم کی برائی یا زیادتی کا افشا کرے تو کچھ مضائقہ نہیں؛ لیکن اگر معاف کردے تو وہ اور بہتر ہے؛ اس لیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عادت باوجود قدرت کے خطا کاروں سے معاف کرنے اور درگذر کرنے کی ہے، مگر اللہ نے منافقین کے معایب اس لیے بیان فرمائے کہ یہ بڑے ہی ظالم ہیں، ان کا کید اور مکر عظیم ہے اور ان کا ضرر شدید ہے، اللہ

کے رسول کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں اور ہر وقت مسلمانوں کی ایذاء رسانی کے درپے رہتے ہیں؛ اس لیے اللہ نے مسلمانوں کو منافقین کے شر اور فتنہ سے آگاہ کرنے کے لیے ان کے معایب اور مثالیب بیان کیے، پس اللہ جل شانہ نے ان ظالموں کے پوشیدہ عیوب اور برائیوں کو علی الاعلان بیان کیا؛ تا کہ مسلمان ان کے شر اور ان کے ظلم وستم سے محفوظ رہیں اور ان جیسے اخلاق واعمال سے بھی اجتناب اور پرہیز کریں **کما قال تعالیٰ**، وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُونَ﴿۱٦﴾ لہذا مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ ان ظالموں کے مظالم اور معایب کو بیان کریں، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ فاسق اور بدکار کے عیوب کو ظاہر کرو؛ تا کہ لوگ اس سے احتیاط اور پرہیز کریں، مطلب یہ ہوا کہ جس ظالم کا ضرر شدید ہو اور اس کا کید اور مکر عظیم ہو تو اس کے فضائح اور قبائح کے اعلان اور اظہار میں کوئی حرج نہیں، خلاصہ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان ظالم منافقوں کی برائیاں اس لیے بیان فرمائیں تا کہ لوگ ان کی شرارتوں سے آگاہ اور باخبر ہو جائیں اور ان کے شر اور ضرر سے محفوظ ہو جائیں اور اپنے آپ کو ان جیسے اخلاق اور اعمال سے بچائیں اور ان ظالموں نے مسلمانوں پر حد سے زیادہ ظلم وستم کیا ہے اور ظلم کی کوئی حد باقی نہیں چھوڑی؛ لہذا مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ ان ظالموں کے مظالم اور معایب کو ظاہر کریں حاصل یہ ہے کہ ہم کو ظالم کے ظلم کی پردہ دری اور شکایت کا جواز بیان کرنا مقصود تھا، اس لیے ہم نے ان منافقوں کی برائیاں بیان کیں۔ (تفسیر کبیر: ۳/ ۴۹۵، اور تفسیر البحر المحیط: ۳/ ۳۸۲) (تفسیر ادریسی: ۲/ ۳۴۳، ۳۴۴)

غرض کہ بری بات کا زبان پر لانا بھی برا ہے؛ البتہ مظلوم کو سچائی کے دائرہ میں رہتے ہوئے ظالم کے خلاف زبان کھولنے کی اجازت ہے؛ چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ مظلوم کے لئے ظالم کی غیبت کرنا جائز ہے؛ کیوں کہ اس کا مقصد اپنے آپ کو ظلم سے بچانا ہے، (دیکھئے: **احیاء علوم الدین للغزالی: ۳/ ۲۰۴، شرح نووی علی مسلم: ۲/ ۳۲۲، باب تحریم الغیبۃ**) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بری بات کہنے سے بددُعاء مراد لی ہے، یعنی کسی مسلمان کے لئے بددُعاء جائز نہیں، البتہ مظلوم ظالم کے خلاف بددُعاء کرسکتا ہے۔ (طبری: ٦/ ۳) (آسان تفسیر: ۱/ ۳۴۵)

''**سمیعا**''۔ اس میں ایک طرف تو ظالم کو تنبیہ ہے کہ مظلوم کہیں فریاد لے کر جائے نہ جائے، اللہ تو بہرصورت اس کی سن ہی رہا ہے۔ اور دوسری طرف مظلوم کو بھی ترغیب دی ہے کہ خلق کے آگے خواہ مخواہ زیادہ روتا گا تا نہ پھرے، یہ یقین رکھے کہ اللہ تو سننے والا ہے ہی۔

''**علیما**''۔ یہ صفت لا کر بھی ظالم ومظلوم دونوں کو یاد دلا دیا ہے کہ کوئی زبان سے نکالے یا نہ نکالے، اللہ پر تو ہر ظلم کی نوعیت وحقیقت عیاں ہی ہے۔ مرشد تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آیت سے انتقام کی اجازت نکل رہی ہے، جس کی ایک فرد شکایت بھی ہے۔ اور ضعفاء کی اس میں بڑی رعایت ہے کہ اس سے دل کا کینہ دور ہو جاتا ہے۔ (تفسیر ماجدی ۱/ ۸۳۵، ۸۳٦)

اللہ جل شانہ نے اس آیت میں تین مرتبے بیان فرمائے ہیں:

اول: یہ کہ انتقام جائز ہے، کما قال تعالیٰ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾............وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۱﴾، یہ ضعفاء کی شان ہے۔

دوم: عفو یعنی معاف کر دینا، یہ اہل ہمت کی شان ہے۔

سوم: برائی کرنے والے کے ساتھ سلوک اور احسان، یہ اہل عزم اور کاملین کا مقام ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۲/۳۴۶)

ابن عمر کی روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی نے دریافت کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اپنے خادم کی غلطیوں کو کتنی مرتبہ معاف کیا کروں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر دن میں ستر مرتبہ درگذر کیا کر، اس روایت کو ترمذی، ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ موسیٰؑ نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا کہ اے رب تیرے نزدیک بندوں میں سب سے بڑا عزت والا کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مَنْ اِذَا قَدَرَ غَفَرَ یعنی جو شخص قدرت ہوتے معاف کر دے وہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا ہے۔ اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنی زبان کو محفوظ رکھے اللہ اس کی پوشیدہ چیزوں کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ اور جو شخص اپنے غصہ کو روک لے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے اپنے عذاب کو روک لے گا اور جو شخص اللہ کی بارگاہ میں عذر پیش کرے اللہ تعالیٰ اس کے عذر کو قبول فرمالیتا ہے۔ (ذکر الروایتین صاحب المشکوٰۃ عن شعب الایمان) (انوار البیان)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾..........الی......................وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کچھ (رسولوں) پر تو ہم ایمان لاتے ہیں اور کچھ کا انکار کرتے ہیں، اور (اس طرح) وہ چاہتے ہیں کہ (کفر اور ایمان کے درمیان) ایک بیچ کی راہ نکال لیں۔ ایسے لوگ صحیح معنی میں کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائیں، اور ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہ کریں تو اللہ ایسے لوگوں کو ان کے اجر عطا کرے گا، اور اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔

منافقین کے بعد اب اہل کتاب کی قباحتوں کا اور شرارتوں کا ذکر فرماتے ہیں، کیونکہ منافقین زیادہ تر یہود میں سے تھے یا یہودیوں سے ربط وضبط رکھتے تھے، اس لیے قرآن کریم میں اکثر منافقین اور یہود کا ذکر اکٹھا ہی فرماتے ہیں، دور تک اہل کتاب کی قباحتوں اور شناعتوں اور ان کی جہالتوں اور شرارتوں کا ذکر چلا گیا ہے، اس سلسلہ میں اللہ نے سب سے پہلے ان کی ایک عظیم قباحت کو بیان فرمایا وہ یہ کہ یہ لوگ تفریق فی الایمان کے قائل ہیں۔

تفریق فی الایمان:

اس آیت میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ یہود کے عقائد کفریہ ہیں، ان کا سب سے بڑا کفر تفریق فی الایمان ہے یعنی خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان ایمان لانے میں تفریق کرتے ہیں اور تفریق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کو ماننے اور رسول کو نہ ماننے، جیسے یہود حضرت موسیٰؑ وغیرہ کو مانتے ہیں، مگر حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں مانتے اور نصاری حضرت عیسیٰؑ کو مانتے ہیں مگر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں مانتے، تمام نصاری تمام انبیاء کو مانتے ہیں مگر خاتم الانبیاء اور اشرف الرسل کے منکر ہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ ایمان اور کفر کے درمیان کوئی دوسرا طریقہ نکالنا چاہتے ہیں حالانکہ ایمان اور کفر کے درمیان کوئی دوسری چیز نہیں نکل سکتی، مقصود یہ ہے کہ اگر مومن بننا چاہتے ہیں تو سب نبیوں پر ایمان لائیں، جس نے ایک نبی کا انکار کیا اس نے سارے نبیوں کا انکار کیا کیونکہ ہر نبی پر ایمان لانا فرض ہے، پس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا انکار تمام انبیاء کی نبوتوں کا انکار ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کا ارادہ رکھتے ہیں تو خوب سمجھ لو کہ وہ اللہ کے نزدیک پکے کافر ہیں جن کے کفر میں کوئی شبہ نہیں۔ (تفسیر ادریسی: ۲/۷۳۴، خلاصۂ مضامین قرآنی: ۸۸)

حضرت عیسیٰؑ کے قتل کے بارے میں یہودیوں اور عیسائیوں کی غلط فہمی کی تردید:

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ.........مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا﴿۱۵۳﴾..............

الی.........بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا﴿۱۵۸﴾

(اے پیغمبر) اہل کتاب تم سے (جو) مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم ان پر آسمان سے کوئی کتاب نازل کرواؤ، تو (یہ کوئی نئی بات نہیں، کیونکہ) یہ لوگ تو موسیٰؑ سے اس سے بھی بڑا مطالبہ کر چکے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے (موسیٰؑ سے) کہا تھا کہ ہمیں اللہ کھلی آنکھوں دکھاؤ، چنانچہ ان کی سرکشی کی وجہ سے ان کو بجلی کے کڑکے نے آ پکڑا تھا، پھر ان کے پاس جو کھلی کھلی نشانیاں آئیں، ان کے بعد بھی انہوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا تھا۔ اس پر بھی ہم نے انہیں معاف کر دیا، اور ہم نے موسیٰ کو واضح اقتدار عطا کیا۔ (۱۵۳) اور ہم نے کوہ طور کو ان پر بلند کر کے ان سے عہد لیا تھا، اور ہم نے ان سے کہا تھا کہ (شہر کے) دروازے میں جھکے ہوئے سروں کے ساتھ داخل ہونا، اور ان سے کہا تھا کہ تم سنیچر کے دن کے بارے میں حد سے نہ گزرنا اور ہم نے ان سے بہت پکا عہد لیا تھا۔ (۱۵۴) پھر ان کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ اس لیے کہ انہوں نے اپنا عہد توڑا، اللہ کی آیتوں کا انکار کیا، انبیاء کو ناحق قتل کیا، اور یہ کہا کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھا ہوا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، اس لیے وہ تھوڑی سی باتوں کے سوا کسی بات پر ایمان نہیں لاتے۔ (۱۵۵) اور اس لیے کہ انہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، اور مریم پر بڑے بھاری بہتان کی بات کہی۔ (۱۵٦) اور یہ کہا کہ: ہم نے اللہ کے رسول مسیح ابن مریم کو قتل کر دیا تھا، حالانکہ نہ انہوں نے عیسیٰؑ کو قتل کیا تھا، نہ انہیں سولی دے پائے تھے، بلکہ انہیں اشتباہ ہو گیا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے وہ اس سلسلے میں شک کا شکار

ہیں، انہیں گمان کے پیچھے چلنے کے سوا اس بات کا کوئی علم حاصل نہیں ہے، اور یہ بالکل یقینی بات ہے کہ وہ عیسیٰؑ کو قتل نہیں کر پائے۔(۱۵۷) بلکہ اللہ نے انہیں اپنے پاس اٹھالیا تھا، اور اللہ بڑا صاحب اقتدار، بڑا حکمت والا ہے۔(۱۵۸)

ہمارے مفسرین میں سے عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد امام ضحاکؒ کا بیان تفسیروں میں موجود ہے جسے آپ حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ یہودی حضرت مسیحؑ کے دشمن تھے، کیونکہ وہ ان کے تعصب، ضد اور ہٹ دھرمی کا رد کرتے تھے۔ ان کے علماء نے شریعت کو بگاڑ دیا تھا اور اخلاقی لحاظ سے نہایت پست ہو چکے تھے۔ جوں جوں حضرت مسیحؑ اللہ کے حکم سے صحیح دین کی تبلیغ کرتے توں توں یہودی آپ کے جانی دشمن بنتے چلے گئے۔ انجیل میں موجود ہے کہ عیسیٰؑ یہودیوں کی غلط باتیں دیکھ کر برداشت نہ کرتے اور سخت الفاظ میں ان کی تردید کرتے، یہودیوں کے علماء اور پیر غلط ملط تاویلوں کے ذریعے اپنے غلط عقائد کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتے، مگر اللہ کا نبی عیسیٰؑ ان کی تمام کرتوتوں کو ظاہر کر دیتا، چنانچہ یہودیوں نے فیصلہ کیا کہ مسیحؑ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے اور اس کام کے لیے حکومت کی امداد حاصل کریں گے۔

اس زمانے میں شام و فلسطین رومیوں کے زیر نگیں تھے اور رومیوں کا گورنر اس علاقے میں تعینات تھا، جو وہاں کے معاملات نمٹاتا تھا۔ یہ بالکل اسی طرح کا انتظام تھا جس طرح انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں ہندوستان میں انگریزوں کا وائسرائے یا نائب رہتا تھا۔ تو یہودی حضرت مسیحؑ کو حکومت وقت کی معرفت قتل کروانا چاہتے تھے، اس واقعہ سے کچھ عرصہ پہلے یہ لوگ حضرت یحییٰؑ کو بھی قتل کر چکے تھے۔ اور اب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے پیچھے پڑے ہوئے تھے، چنانچہ منصوبہ کے تحت چار ہزار یہودیوں نے اس مکان کا محاصرہ کر لیا جس میں مسیحؑ اپنے حواریوں سمیت مقیم تھے، جب عیسیٰؑ کو اس محاصرہ کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے حواریوں سے فرمایا کہ یہ لوگ میری جان کے درپے ہیں، تم میں سے کون آدمی ہے جو میری جگہ باہر نکل کر قتل ہو جائے، ایسا شخص جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ اس پر ایک حواری نے لبیک کہا۔ مسیح (علیہ السلام) نے اپنی پگڑی اور کرتہ اسے پہنایا، اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر مسیحؑ کی شبیہ بھی ڈال دی، وہ شخص باہر نکلا تو یہودیوں نے اسے مسیح سمجھ کر سولی پر چڑھا دیا اور ادھر اللہ تعالیٰ نے مسیحؑ کو اس مکان کے روزن (روشندان) سے فرشتوں کے ذریعے آسمان پر اٹھا لیا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ محاصرین نے اپنے میں سے ایک آدمی کو اس مکان کے اندر بھیجا جس میں مسیحؑ مقیم تھے تاکہ آپ کو گرفتار کیا جا سکے۔ جب یہ شخص مکان میں پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر مسیحؑ کی شبیہ ڈال دی اور اس کی شکل و صورت بالکل عیسیٰؑ جیسی ہو گئی۔ اللہ نے مسیحؑ کو تو آسمان کی طرف اٹھا لیا، مگر جب وہ جاسوس باہر نکلا تو محاصرین نے اسے مسیح سمجھ کر پکڑ لیا اور سولی پر چڑھا دیا۔ اس کے باوجود لوگوں کو تسلی نہ ہوئی۔ اور **ولکن شبہ لھم** کے مطابق وہ اس شبہ میں مبتلا ہو گئے کہ مسیحؑ کو تو ہم نے قتل کر دیا، مگر ہمارا وہ آدمی کہاں گیا جسے پتہ کرنے کے لیے ہم نے مکان کے اندر بھیجا

تھا۔اور اگر ہم نے اپنے ہی آدمی کو مسیح کے شبہ میں قتل کر دیا تو پھر مسیحؑ کہاں گئے۔بہر حال وہ تر دد میں پڑ گئے اور آج تک پڑے ہوئے ہیں۔بعض کو اس قدر شبہ ہو گیا کہ وہ کہتے کہ جس شخص کو ہم نے سولی پر چڑھایا ہے،اس کی شکل وصورت تو مسیح جیسی تھی اور باقی جسم ان کے مشابہ نہیں تھا۔

مسلم شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ فرمان بھی موجود ہے کہ وہ وقت بھی آئے گا جب عیسیٰؑ فج روحاء کے مقام سے حج یا عمرہ کا احرام باندھیں گے،زمین پر حکومت کریں گے۔انصاف قائم کریں گے اور پھر ان کے زندہ رکھنے کی خاص مصلحت دجال کا مقابلہ ہے،اس کو اپنے ہاتھ سے قتل کریں گے،یاجوج ماجوج کا فتنہ برپا ہوگا،اس کے لیے دعا کریں گے تو وہ فتنہ بھی ختم ہو جائے گا۔آپ شادی بھی کریں گے،زمین پر چالیس یا ساٹھ سال کا عرصہ گزار کر وفات پائیں گے اور پھر دفن ہوں گے۔یہ سب باتیں نزول کے بعد وارد ہونے والی ہیں اور آپ کے آسمان پر زندہ اٹھائے جانے کی طرف دلالت کرتی ہیں۔عیسیٰ (علیہ السلام) کے دوبارہ نزول کا عقیدہ بنیادی عقیدہ ہے۔اہل حق میں سے اس بارے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔متواتر اور صحیح احادیث اس کثرت سے ہیں کہ ان کا انکار کفر ہے،ایسا شخص اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔(معالم العرفان:۵/۶۴۱-۶۴۷)

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾

البتہ ان (بنی اسرائیل) میں سے جو لوگ علم میں پکے ہیں اور مومن ہیں وہ اس (کلام) پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو (اے پیغمبر) تم پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا اور قابل تعریف ہیں وہ لوگ جو نماز قائم کرنے والے ہیں،زکوٰۃ دینے والے ہیں اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں۔یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔

جو لوگ یہود میں سے مسلمان ہو گئے تھے جیسے عبداللہ بن سلام اور ثعلبہ بن سعید اور زید بن سعید اور اسید بن عبیدہ وغیرہ ان کی تعریف کی گئی ہے اور اجر عظیم کا وعدہ اعمال صالحہ کے ساتھ مشروط رکھا گیا ہے،ورنہ نفس نجات کے لئے تو وہی عام قاعدہ ہے کہ توحید و رسالت پر ایمان رکھنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔(کشف الرحمٰن:۱/۱۶۴)

نماز کے ساتھ تعلق باللہ قائم ہوتا ہے تو زکوٰۃ کے ذریعے مخلوق کے ساتھ تعلق اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔اللہ کے بندوں کی خیر خواہی کے لیے زکوٰۃ کی ادائیگی فرائض میں سے ہے۔

وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾

اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی تھی۔

رسول اور کتابیں:

اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء کو مکمل کتابیں دیں اور بعض کو چھوٹے چھوٹے صحیفے، چنانچہ حضرت ابوذر غفاری ؓ کی روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ اللہ نے کل کتنے نبی اور رسول مبعوث فرمائے ہیں۔آپ نے فرمایا کہ کل انبیاء اور رسل کی تعداد کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ پھر عرض کیا کہ ان میں رسول کتنے تھے۔فرمایا: تین سو پندرہ رسول تھے اور باقی وحی تمام انبیاء ورسل پر نازل ہوئی، مگر کتاب اور شریعت صرف رسولوں کو ملی۔اسی روایت میں کتابوں کا ذکر بھی آتا ہے۔حضرت ابوذر غفاری ؓ نے عرض کیا۔حضور! اللہ نے کتنی کتابیں نازل فرمائیں۔آپ نے فرمایا کل ایک سو چار، جن میں چار بڑی کتابیں اور ایک سو چھوٹے چھوٹے صحیفے تھے۔حضرت نوح ؑ سے پہلے انبیاء پر بھی اللہ نے بعض صحیفے نازل فرمائے۔ اسی حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے پہلے نبی حضرت آدم ؑ تھے اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ، پھر عرض کیا: کیا آدم ؑ نبی تھے؟ فرمایا، ہاں! وہ نبی تھے **کلمۃ اللہ**، اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام کیا، لہٰذا وہ نبی اور مکلم تھے۔(معالم العرفان:۵/۶۵۹)

عیسائیوں کے باطل عقائد کی تردید:

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ.........الی...........وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾

اے اہل کتاب اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو، اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا کوئی بات نہ کہو۔مسیح عیسیٰ ابن مریم تو محض اللہ کے رسول تھے اور اللہ کا ایک کلمہ تھا جو اس نے مریم تک پہنچایا، اور ایک روح تھی جو اسی کی طرف سے (پیدا ہوئی) تھی۔لہذا اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور یہ مت کہو کہ (خدا) تین ہیں۔اس بات سے باز آجاؤ، کہ اسی میں تمہاری بہتری ہے، اللہ تو ایک ہی معبود ہے وہ اس بات سے بالکل پاک ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔(۱۷۱) مسیح کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھ سکتے کہ وہ اللہ کے بندے ہوں، اور نہ مقرب فرشتے (اس میں کوئی عار سمجھتے ہیں) اور جو شخص اپنے پروردگار کی بندگی میں عار سمجھے، اور تکبر کا مظاہرہ کرے تو (وہ اچھی طرح سمجھ لے کہ) اللہ ان سب کو اپنے پاس جمع کرے گا۔(۱۷۲)

اہل کتاب اپنے انبیاء کی تعریف میں غلو سے کام لیتے اور حد سے نکل جاتے، خدا اور خدا کا بیٹا کہنے لگتے۔سو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ دین کی بات میں مبالغہ مت کرو اور جس سے اعتقاد ہو اس کی تعریف میں حد سے نہ بڑھنا چاہیے۔جتنی بات تحقیق سے ہو اس سے زیادہ نہ کہے اور حق تعالیٰ کی شان مقدس میں بھی وہی بات کہو جو سچی اور محقق ہو اپنی طرف سے کچھ مت کہو۔تم نے یہ کیا غضب کیا کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو جو کہ رسول اللہ ہیں اور اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے تھے ان کو وحی کے خلاف خدا کا بیٹا کہنے لگے اور تین خدا کے معتقد ہو گئے۔ایک خدا، دوسرے عیسیٰ، تیسرے حضرت مریم۔ان باتوں سے باز آؤ، اللہ تعالیٰ واحد اور یکتا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں اور نہ کوئی اس کا بیٹا ہوسکتا ہے۔اس کی ذات پاک اور اس سے منزہ اور مقدس ہے۔یہ تمام خرابی اس کی ہے کہ تم نے وحی کی اطاعت اور پابندی نہ کی۔وحی کی متابعت کرتے تو خدا

کے لئے بیٹا نہ مانتے اور تین خدا کے قائل ہو کر صریح مشرک نہ ہوتے اور محمد رسول اللہ سید الرسل اور قرآن مجید افضل الکتب کی تکذیب کر کے آج دو ہرے کافر نہ بنتے۔

فائدہ: اہل کتاب کے ایک فریق نے تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو رسول بھی نہ مانا اور قتل کرنا پسند کیا، جن کا ذکر پہلے گزرا۔ دوسرے فریق نے ان کو خدا کا بیٹا کہا، دونوں کافر ہو گئے، دونوں فریق کی گمراہی کا سبب یہی ہوا کہ وحی کے خلاف کیا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ نجات وحی کی متابعت میں منحصر ہے۔

وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا ﴿۱۷۱﴾ یعنی آسمانوں اور زمین میں نیچے سے اوپر تک جو کچھ ہے سب اس کی مخلوق اور اس کی مملوک اور اس کے بندے ہیں، پھر کہیے اس کا شریک یا اس کا بیٹا کون اور کیونکر ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کام بنانے والا ہے اور سب کی کارسازی کے لئے وہی کافی ہے اور کسی دوسرے کی حاجت نہیں، پھر بتلایئے اس کو شریک یا بیٹے کی حاجت کیسے ہو سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ نہ کسی مخلوق میں اس کے شریک بننے کی قابلیت اور لیاقت اور نہ اس کی ذات پاک میں اس کی گنجائش اور نہ اس کو اس کی حاجت، جس سے معلوم ہو گیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو خدا تعالیٰ کا شریک یا بیٹا کہنا اس کا کام ہے جو ایمان اور عقل دونوں سے محروم ہو۔

فائدہ: مضمون بالا سے یہ سمجھ میں آ گیا کہ جو کوئی حق تعالیٰ کے لئے بیٹا یا کسی کو اس کا شریک مانتا ہے وہ حقیقت میں جمیع موجودات کو مخلوق باری اور باری تعالیٰ کو خالق جملہ موجودات نہیں مانتا اور نیز اللہ تعالیٰ کو سب کی حاجت براری اور کارسازی کے لئے کافی نہیں جانتا۔ گویا خدا کو خدائی سے نکال کر مخلوقات اور ممکنات میں داخل کر دیا، تو اب ارشاد (**سبحانہ ان یکون لہ ولد**) میں جس ناپاکی کی طرف اشارہ خفی تھا اس کا پتہ چل گیا اور فرزند حقیقی اور فرزند مجازی اور ظاہری دونوں میں وہ ناپاکی چونکہ برابر موجود ہے، تو خوب سمجھ میں آ گیا کہ اس کی ذات مقدس جیسے اس سے پاک ہے کہ اس کے بیٹا پیدا ہوا ایسا ہی اس سے بھی پاک اور برتر ہے کہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو بیٹا بنائے۔ (تفسیر عثمانی: ۱۳۷)

نصاریٰ کو سمجھایا گیا کہ تم اپنے دین میں غلو نہ کرو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے اصل مقام سے نہ بڑھاؤ اور یہ مت کہو کہ خدا تین ہیں (۱۷۱)

پھر جبکہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی اور عبودیت میں اپنی کوئی ہتک محسوس نہیں کرتے بلکہ عزت محسوس کرتے ہیں تو تم کون ہو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ٹھہرانے والے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

قریبی ورثاء کے حقوق:

سورہ نساء کے اختتام پر دوبارہ اس مضمون کا اعادہ ہے جو اس سورت کے شروع میں بیان ہوا تھا، یعنی عورتوں کے معاملے کی رعایت اور قریبی ورثاء کے حقوق کا خیال۔ (۱۷٦)

یَسْتَفْتُوْنَکَ ؕ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَۃِ .... وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۷٦﴾

(اے پیغمبر) لوگ تم سے (کلالہ کا حکم) پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں حکم بتاتا ہے، اگر کوئی شخص اس حال میں مرجائے کہ اس کی اولاد نہ ہو، اواس کی ایک بہن ہوتو وہ اس کے ترکے میں سے آدھے کی حق دار ہوگی۔ اور اگر اس بہن کی اولاد نہ ہو (اور وہ مرجائے، اواس کا بھائی زندہ ہوتو وہ اس بہن کا وارث ہوگا۔ اور اگر بہنیں دو ہوں تو بھائی کے ترکے سے وہ دو تہائی کی حق دار ہوں گی۔ اور اگر (مرنے والے کے) بھائی بھی ہوں اور بہنیں بھی تو ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔ اللہ تمہارے سامنے وضاحت کرتا ہے تا کہ تم گمراہ نہ ہو، اور اللہ ہر چیز کا پورا علم رکھتا ہے۔

کلالہ سے مراد وہ شخص ہے جس کا انتقال اس حال میں ہو کہ نہ اس کے والدین ہوں اور نہ اولاد، ان کے ترکہ کی تقسیم کس طرح عمل میں آئے گی؟ اس سلسلہ میں درج ذیل احکام بیان کئے گئے ہیں:

(الف) اگر صرف ایک حقیقی یعنی ماں باپ شریک یا علاتی یعنی باپ شریک بہن ہو، تو وہ ایسے شخص کے ترکہ سے نصف کی حقدار ہوگی، ---اگر ماں شریک بہن ہوتو اس کے حصہ کا ذکر اسی سورہ کی آیت: ۱۲ میں آچکا ہے، باقی نصف عصبہ رشتہ داروں--- چچا، چچازاد بھائی ---وغیرہ کو ملے گا، اگر یہ بھی نہ ہوں تو باقی آدھا بھی بہن ہی کے حصہ میں آئے گا۔

(ب) اگر عورت کلالہ ہو، اس کے والدین اور اولاد نہ ہوں، صرف بھائی ہو، خواہ ایک ہو یا زیادہ، تو وہ اس کے پورے ترکہ کا وارث ہوگا۔

(ج) اگر کلالہ مرد کی دو بہنیں ہوں، تو یہ دونوں دو تہائی ترکہ کی حقدار ہیں، دو سے زیادہ ہوں تب بھی یہی حکم ہے، باقی ایک تہائی عصبہ رشتہ دار (چچا، چچازاد بھائی وغیرہ) کا ہوگا، اگر کوئی عصبہ موجود نہ ہوتو یہ باقی ایک تہائی بھی بہنوں ہی کو ملے گا۔

(د) اگر کلالہ مرد یا عورت کے بھائی بھی ہوں اور بہن بھی، تو ترکہ اس طرح تقسیم ہوگا کہ مرد کا حصہ بہ مقابلہ عورت کے دہرا ہوگا۔ (آسان تفسیر: ۱/ ۳۵۲)

سورہ ہذا کے ابتدائی حصے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت کا تذکرہ فرمایا تھا۔ **یایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفسٍ واحدةٍ** یعنی اس اللہ سے ڈرجاؤ جو کمال قدرت کا مالک ہے۔ یہ اس قدرت کا شاہکار ہے کہ اس نے ایک جان سے تم کو پیدا کیا اور پھر کروڑوں بلکہ اربوں مرد وزن دنیا میں پھیلا دیے۔ اور اب سورۃ کے آخری حصے میں **و اللہ بکل شیء علیم**. فرما کر اپنے علیم کل ہونے پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔ کمال قدرت کا مالک بھی وہی ہے اور کمال علم کا مالک بھی وہی خداوند قدوس ہے، اس نے انسان کو گمراہی سے بچنے کے لیے تمام سامان مہیا کردیے ہیں۔ وہ ہر شخص کے خیر وشر سے واقف ہے۔ وہ کسی نیکوکار کے اچھے اجر میں کوئی کمی نہیں کرے گا اور نہ اپنے سرکش کے محاسبے میں کوئی کسر چھوڑے گا۔ محاسبے کا عمل شروع ہونے والا ہے، اسی لیے فرمایا "**و اتقوا اللہ** "اللہ سے ڈرجاؤ۔" **الذی تسائلون بہ و الارحام** " کہ تم اس کے واسطے سے سوال کرتے ہو۔ اور قرابتداروں سے خبردار رہو۔ ان کے حقوق کا خیال رکھو، اگر کسی کے حقوق کو

پامال کیا تو اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ جاؤ گے۔ (معالم العرفان: ۵/۶۹۶)

خلاصۂ رکوع: ۲۲......نقائص اہل کتاب۔ ماخذ: آیت: ۱۵۳، ۱۵۵۔

خلاصۂ رکوع: ۲۳......رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ادیان سابقہ سے اصولاً متحد ہے۔ ماخذ: آیت: ۱۶۳۔

خلاصۂ رکوع: ۲۴......اہل کتاب کے انبیاء علیہم السلام تو غالی نہیں تھے، لہذا وہ تو اس تعلیم کے حامی تھے جس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم حامی ہیں۔ ماخذ: آیت: ۱۷۲۔

***

سورہ مائدہ

سورہ مائدہ یہ سورۃ قرآن کریم کی پانچویں سورۃ ہے، ترتیب نزول کے اعتبار سے یہ ۱۱۲ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں کل رکوع ۱٦، آیت ۱۲۰، کلمات ۲۸۴۲، اور حروف ۱۲۴۶۴ ہیں۔ یہ سورت ہجرت مدینہ کے بعد نازل ہوئی۔

یہ سورت حضور نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کے بالکل آخری دور میں نازل ہوئی ہے۔ علامہ ابوحیان فرماتے ہیں کہ اس کے کچھ حصے صلح حدیبیہ، کچھ فتح مکہ اور کچھ حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئے تھے۔ اس زمانے میں اسلام کی دعوت جزیرہ عرب کے طول وعرض میں اچھی طرح پھیل چکی تھی، دشمنان اسلام بڑی حد تک شکست کھا چکے تھے، اور مدینہ منورہ میں آنحضرت ﷺ کی قائم کی ہوئی اسلامی ریاست مستحکم ہو چکی تھی۔ لہذا اس سورت میں مسلمانوں کے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل سے متعلق بہت سی ہدایات دی گئی ہیں۔ سورت کا آغاز اس بنیادی حکم سے ہوا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے عہد و پیمان پورے کرنے چاہئے۔ اس بنیادی حکم میں اجمالی طور پر شریعت کے تمام احکام آ گئے ہیں، چاہے وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق سے متعلق ہوں یا بندوں کے حقوق سے متعلق۔ اس ضمن میں یہ اصول بڑی تاکید کے ساتھ سمجھایا گیا ہے کہ دشمنوں کے ساتھ بھی ہر معاملہ انصاف کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ دشمنان اسلام کو اب اسلام کی پیش قدمی روکنے سے مایوسی ہو چکی ہے اور اللہ نے اپنا دین مکمل فرما دیا ہے۔ اسی سورت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کس قسم کی غذائیں حلال ہیں اور کس قسم کی حرام؟ اسی سلسلے میں شکار کے احکام بھی وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اہل کتاب کے ذبیحے اور ان کی عورتوں سے نکاح کے احکام کا بیان آیا ہے، چوری اور ڈاکے کی شرعی سزائیں مقرر فرمائی گئی ہیں، کسی انسان کو ناحق قتل کرنا کتنا بڑا گناہ ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت آدم (علیہ السلام) کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے، شراب اور جوے کو صریح الفاظ میں حرام قرار دیا گیا ہے، وضو اور تیمم کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے کس طرح اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو توڑا؟ اس کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے۔ مائدہ عربی میں دسترخوان کو کہتے ہیں۔ اس سورت کی آیت نمبر ۱۱۴ میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے ان کے

متبعین نے یہ دعا کرنے کی فرمائش کی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے آسمانی غذاؤں کے ساتھ ایک دسترخوان نازل فرمائے۔ اس واقعے کی مناسبت سے اس سورت کا نام مائدہ یعنی دسترخوان رکھا گیا ہے۔ (توضیح القرآن)

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کا نام مائدہ حضرت عیسی علیہ السلام پر مائدہ یعنی دسترخوان یا نعمت نازل ہونے کے بیان کی مناسبت سے رکھا گیا۔

ربط:

سورۂ نساء کے ختم پر فرمایا گیا تھا کہ اللہ جل شانہ تم سے احکام بیان کرتے ہیں، تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور اللہ ہر شئے سے واقف ہے، اس سورۃ میں اس وعدہ کا ایفاء ہے، نیز سورہ نساء میں زیادہ تر ان معاملات کے احکام کا بیان تھا جن کی زیادہ ضرورت تھی، اس سورۃ میں کھانے پینے اور حلال وحرام چیزوں کے متعلق احکام بیان کرنا بھی عین حکمت تھا اور حلال و حرام چیزوں کا بیان کرنا گویا تعریض کرنا ہے کہ انہوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کے بعد سب ناپاک چیزوں کو حلال بتا کر انبیاء علیہم السلام کی شریعت کو درہم برہم کیا ہے اور فطرت الٰہی کو محرف کر دیا ہے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

الغرض! گذشتہ سورہ میں اللہ تعالیٰ نے نکاح اور محرمات نکاح کا قانون بتلا کر بقائے نوع انسانی کا سامان مہیا کیا اور اب اس سورہ میں انسانی خوراک کے متعلق حلت وحرمت کا اصول بتا کر بقائے شخصی کا انتظام فرمایا ہے۔ ان دوسورتوں میں یہ خصوصی ربط پایا جاتا ہے جس طرح انسان کھانے پینے کا محتاج ہے۔ اسی طرح نکاح بھی اس کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔ پہلی سورہ میں اللہ نے محرمات نکاح کا ذکر کیا اور اب اس سورہ میں محرمات اکل وشرب کا خصوصی بیان ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ ایک انسانی جسم میں دو چیزیں بڑی خطرناک ہیں یعنی منہ اور شرمگاہ۔ سابقہ سورہ میں شرمگاہ کی حفاظت کا قانون تھا اور اب اس سورہ میں اشیائے خوردنوش کی حفاظت کا قانون ہے۔ اس طرح ان دوملحقہ سورتوں میں حفاظت فرج اور حفاظت بطن کے اصول وقوانین بتائے گئے ہیں۔ اس سورہ کا ربط اگلی سورہ انعام کے ساتھ بھی ہے جیسا کہ اس سورہ کے نام سے ظاہر ہے، وہاں بھی مویشیوں اور ان کی حلت وحرمت کا تذکرہ ہے۔ حرام جانوروں کا گوشت اور دودھ وغیرہ استعمال کرنے سے ان کا منفی اثر انسانی کی روحانیت پر پڑتا ہے۔ اس لیے شریعت نے ہر ایسی غذا پر پابندی لگائی ہے جو جسمانی، اخلاقی یا روحانی طور پر مضر ہو۔ اس طرح اس سورہ کا ربط اگلی سورہ کے ساتھ بھی ہے۔

(معالم العرفان: ٦/٢٦، ٢٨، ٢٩)

سورہ المائدہ کے مضامین:

بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ نزول کے اعتبار سے سورہ مائدہ آخری سورت ہے، اس سورت میں حلال وحرام کے متعدد احکام اور تین قصے بیان کیے گئے ہیں۔

تکمیل دین کا اعلان :

اس سورت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں وہ آیت کریمہ بھی ہے جو حجۃ الوداع کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی، اس آیت میں تکمیل دین کا اعلان کیا گیا ہے، یہ وہ آیت ہے جس کے بارے میں ایک یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: اے امیر المومنین! اگر یہ آیت ہمارے اوپر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو یوم عید قرار دے دیتے۔ آپ نے جواب میں فرمایا میں اس دن کو بھی جانتا ہوں اور اس گھڑی کو بھی جانتا ہوں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی، وہ عرفہ کی شام اور جمعہ کا دن تھا، گویا ہماری اس دن دو عیدیں تھیں۔

اس سورت کا جو حصہ چھٹے پارے میں آیا ہے اس میں جو اہم مضامین بیان ہوئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

سورت کی ابتدا میں اہل ایمان کو ہر جائز عہد اور عقد کے پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، خواہ وہ عہد وعقد انسان اور رب کے درمیان ہو یا انسان اور دوسرے انسان کے درمیان ہو۔

گویا یہ آیت ان احکام کو بھی شامل ہے جو اللہ نے بندوں پر فرض کیے ہیں اور بیع وشراء، شرکت، اجارہ، نکاح اور قسم جیسے تمام عقود کو بھی شامل ہے، اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے عقد اور عہد کو کتنی اہمیت دی ہے۔

اعلان حرمت :

کھانے پینے کی بہت ساری ایسی چیزوں کی حرمت کا اعلان کیا گیا ہے جنہیں زمانہ جاہلیت میں حلال سمجھا جاتا تھا، کیونکہ ان چیزوں کے کھانے میں صحت وجسم کا بھی نقصان ہے اور فکر ونظر اور دین واخلاق کا بھی نقصان ہے۔ مثلاً مردار، بہنے والا خون، خنزیر کا گوشت اور وہ جانور جسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے؛ البتہ اضطرار کی صورت میں- جبکہ جان کو خطرہ لاحق ہو- ان کا کھانا جائز ہے۔

ان نجس چیزوں کے علاوہ باقی طیبات اور پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

صلح حدیبیہ (معاہدہ) کفار مکہ کے ساتھ کیا گیا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو صحابہ کے ساتھ عمرہ کرنے کے لیے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے؛ لیکن کفار مکہ نے عمرہ کرنے سے روک دیا اور کافی بحث ومباحثہ کے بعد یہ معاہدہ ہوا، جس میں آئندہ سال عمرہ پر آنے کا فیصلہ کیا گیا۔

موقع کی مناسبت سے مسلمانوں کو کعبہ شریف اور عمرہ کے احکام بیان کیے گئے، اس کے ساتھ ساتھ یہ بتلایا گیا کہ اگرچہ دشمنوں نے آپ کو عمرہ سے روک دیا تھا لیکن آپ ان کے ساتھ نرمی، صبر اور محبت سے پیش آئیں گے۔

یہ تفصیلات دکھا کر مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ تم بھی یہود ونصاریٰ کی طرح اللہ کے احکام کو بجالانے میں ان کی روش مت اپنانا اور مسلمانوں کو ان انتہائی خطرناک طریقوں اور نفسانی خواہشات اور شیطان کے بہکاوے کے چور دروازوں سے آگاہ کیا، جس میں پچھلی امتیں گمراہ ہوئی اور سمجھایا کہ اس راہ میں سنبھال کر قدم آگے بڑھائیں۔

اوراسی لیے یہود ونصاریٰ نے وعدہ خلافی کی ،اس کی ایک طویل داستان بیان کی ہے اوراس کے اسباب وعلل ؛تا کہ مسلمانوں کے لیےعبرت بن جائے۔ اس کے ساتھ ہی ذاتی اوراجتماعی زندگی کے ان باریک گوشوں کی طرف بھی رہنمائی کی گئی جہاں سے شیطان اوراس کے پیروکاروں کو داخل ہونے کا موقع ملتا ہےاوراس سے خطرناک فتنے وجود میں آتے ہیں اوراس کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ بگاڑ کا شکار ہوسکتا ہے۔

اب تک مسلمان ظالموں کے چنگل میں رہے ہیں اور مدینہ منورہ کی ہجرت کے بعد بھی دشمنوں کے حملوں اور سازشوں کا شکار ہوتے تھے، اب صلح کے بعد مکہ والوں سے راحت ملی۔ ان کی طاقت روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔اور طاقت اوردولت کا نشہ قوموں کے اخلاق اورمزاج میں بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔

اس لیے مسلمانوں کوخصوصی تاکید کی گئی کہ وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ انصاف کریں اورسابقہ اقوام کی طرح اقتدار کے نشہ میں دوسرے لوگوں پرظلم نہ کریں،جس طرح یہود ونصاریٰ نے طاقت کے نشہ میں ایک دوسرے اوردوسری قوموں کوستایا؛تاکہ مسلمان اس سے بچ جائیں اوراپنے تمام معاملات میں اللہ کی کتاب کوفیصل بنائے ،منافقوں کی باتوں پر یقین نہ کریں۔

اب یہودی کمزور ہوچکے تھے،اب پھران کواسلام کی دعوت دی گئی اورعیسائیوں کوبھی مزید تفصیل کے ساتھ دعوت دی گئی کہ وہ اپنی غلط فہمیوں کوترک کرکے اسلام قبول کریں۔

سورت کے آخر میں دکھایا گیا ہے کہ قیامت کے دن تمام انبیاءاپنی امت کی گواہی دیں گے۔خاص طور پرحضرت عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے کہ انہوں نے اللہ کے تمام احکام اپنی امت تک پہنچائے اورقول وقراربھی کیا؛تاکہ دلیل ہمیشہ قائم ہوسکے،اب انبیاءامت کی کسی برائی کے ذمہ دارنہیں ہوں گے۔انبیاءصرف اللہ کا پیغام پہنچانے کے ذمہ دار تھے،جو انہوں نے پہنچادیا۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا :

یہ قرآن شریف کی صرف ایک ہی سورت ہےجس کا آغاز''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا '' سے ہوتا ہے۔یہ لفظ قرآن شریف میں کل ۸۸ مرتبہ آیا ہے،ان میں سے ١٦ مرتبہ مائدہ میں آیا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تم''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا ''سنو،توپوری توجہ اس طرف کر دو، کیونکہ کوئی اچھاحکم ہوگا جس کا حکم دیا گیا ہوگا یا کوئی برائی ہوگی جس سے روک دیا گیا ہو،یعنی آپ کومؤمن کہہ کرمخاطب کیا۔ (سورۂ بقرہ میں آمنوا سے ۱۰ مرتبہ اورسورہ مائدہ میں ١٦ مرتبہ مخاطب کیا۔)

سب سے پہلے وعدہ وعہد کی پاسداری کا حکم دیا، چاہے وہ قرار اللہ پاک کے ساتھ ہو یا بندہ کے ساتھ،عبادت کا ہو یا تجارت کا یا کھانے پینے کا۔

یہ سورت آخری نازل ہوئی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھو، اسی سورت میں دین کی تکمیل کو بھی واضح کیا گیا، تو اب کوئی تبدیلی نہیں ہوگی ؛ اسی لیے حدیث شریف میں ہے کہ اپنے مردوں کو سورۃ مائدہ اور عورتوں کو سورۃ نور سکھاؤ۔

ہر ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا '' میں موضوع مختلف ہوتا ہے۔ خاص طور پر حلال وحرام کے احکام کی تفصیل ہوتی ہے۔ (۱) کھانا پینا، شکار کرنا، ذبح کرنا۔ (۲) خاندان اور نکاح وغیرہ (۳) قسم کا کفارہ (۴) عبادات (۵) عدل وانصاف کی رعایت (٦) غیر مسلم یہود و نصاریٰ سے تعلقات کا ذکر۔

لفظ مائدہ کو کھانے پینے کے احکام کے ساتھ جوڑ ہے، مائدہ دسترخوان کو کہا جاتا ہے، کھانا بنیادی ضروریات میں سے ایک ہے، جب اس میں حلال حرام کا حکم ہے تو زندگی کے دوسرے کاموں میں اس کی زیادہ تاکید ہونی چاہیے۔ شریعت اصل ہے، اللہ کے احکامات کی اطاعت ضروری ہے؛ اس لیے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے کافرون، فاسقون، ظالمون (۴۴، ۴۵، ۴۷، ۵۰) کے الفاظ آئے ہیں۔

سورہ بقرہ میں صرف یہودیوں کو مرحلہ وار خطاب کیا گیا۔

سورہ آل عمران میں ان کو غلطیوں کو سدھارنے کی دعوت دی۔

سورہ نساء میں اس کی جنونیت (عصبیت)، غلو (کسی بھی معاملے میں مبالغہ آرائی) پر پکڑ کی گئی۔

سورہ مائدہ میں سخت طریقے سے غلط عقائد سے روکا گیا اور جس سے اسلامی احکام اور دوسرے مذاہب کے ساتھ مرحلہ وار مکالمے کی تعلیم دی گئی۔

(۱) ''اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ '' سے سخت حکم کا اندازہ تھا، لیکن لفظ ''اُحِلَّتۡ لَكُمۡ '' (حلال) کا لفظ لاکر اظہار رحمت کا پتہ چلا۔ دین کے داعی کو شروع میں نرمی سے کام لینا سکھایا۔ مثبت دلائل سے سمجھاؤ۔ حلال اشیاء زیادہ ہوں گی، یہودیوں کی طرح ان کے گناہوں کی وجہ سے حرام کی فہرست لمبی نہیں ہوگی۔ (۱۴٦-۱٦۰) اس لیے مسلمان گناہ سے پرہیز کریں؛ کیونکہ جرم حلال میں کمی لاتا ہے۔

(۲) شعائر کی حفاظت (آیت ۲)، عدل، نیک کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کی ترغیب اور برائی میں مدد کرنے سے منع کیا۔ سورت کی زیادہ آیات سخت الفاظ پر ختم ہوتی ہیں؛ لیکن مجبوری میں حرام کھانے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

(۳) کھانا، شادی دنیاوی لذتیں ہیں؛ اس لیے اب باطنی روح کی لذت کا بیان وضو سے کیا، اس طرح عبادت کے ساتھ معاملات کو بیان کیا گیا۔

(۴) نعمتیں (۱۱) یہودیوں نے اللہ کے حکم کے تحت زندگی گزارنے کے عہد کی پاسداری نہیں کی۔ (۱۲) پھر دلوں کو

سخت کر دیا، غضب ولعنت کے مستحق ہوئے، عمالقہ سے لڑائی میں بے تکا جواب دیا۔ (۲۲) چنانچہ ان پر بیت المقدس میں ۴۰ سال تک داخل ہونا حرام ہو گیا۔ ایفائے عہد سکون لاتا ہے اور توڑنے سے تنگی پیدا ہوتی ہے، یہودیوں نے بزدلی سے کام لیا اور جنگ سے دور رہے اور قابیل نے بھائی کو قتل کر دیا، اس کے بعد اس نے فساد (قابیل کا کام) اور دہشت گردی کی سزائیں بیان کیں۔ ایک قتل کو سب کا قتل دکھایا اور ایک کی جان کو سب کی زندگی ظاہر کی۔ آج فسادات کی وجہ یہ ہے کہ کوئی سزا نہیں ہے۔ جرم صرف ایک فرد کی غلطی نہیں ہے، یہ پورے معاشرے کے لیے خطرہ ہے۔ لوگوں میں خوف و ہراس کا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔

(۵) جہاد کے احکامات کے ساتھ اسباب بھی بتاتے ہیں۔ (سورہ نساء، آیت ۵۷) مائدہ میں بھی فساد ختم کرنے کا حکم جاری ہوا۔

(٦، ۷، ۸) امت یہود اور مشرکوں کے راستے پر آنکھیں بند کر کے نہ بھاگے، مرتدین کو خبردار کیا کہ تمہارے دین کو چھوڑنے سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا؛ بلکہ میں تمہاری جگہ دوسروں کو ایمان کی توفیق دوں گا، وہ دین پر عمل کرنے کی وجہ سے لوگوں کے طعن کی پرواہ نہیں کریں گے۔ یہودیوں کے ساتھ برا سلوک کرنے کا حکم نہیں دیا، اپنی شناخت برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے۔

(۹) حلال کو حرام نہ بنائیں۔ (۸۹) حلال وحرام کا حق صرف اللہ پاک کو ہے، جس طرح حرام کو حلال کرنا جرم ہے اسی طرح حلال کو حرام کرنا بھی جرم ہے۔

(۱۰) شراب وغیرہ کی ممانعت۔ (۹۰) پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دینے کے بعد گندگی (معاشی، سماجی، ذاتی) کو حرام قرار دینے سے معلوم ہوا کہ جو چیزیں دشمنی کے بیج بوتی ہیں وہ ہیں شراب، جوا اور طاقت۔

(۱۱) حلال اشیاء کے بارے میں مزید پوچھ گچھ سے تنگی پیدا ہوتی ہے۔ صحابہ کرام نے حج کے متعلق پوچھا: کیا ہر سال فرض ہوتا ہے؟ جواب دیا کہ اگر میں ہاں کہتا تو ہر سال فرض ہو جاتا۔

(۱۲) ۱۰۵ سے ''امر بالمعروف'' سے نہیں روکا، ہاں! خود اس پر جمے رہو، اگر دوسرے نہیں مانتے تو چھوڑ دیں۔ ایفائے عہد کے متعلق قیامت میں پوچھ ہوگی۔ نصاریٰ کو مائدہ (آسمانی کھانے) کی ناشکری پر عذاب کی دھمکی دی گئی۔ امت محمدیہ کو دین اور کمال اسلام کی نعمت کی ناقدری سے ڈرایا۔ تمام معاہدے اس میں آ گئے جن پر عمل کرنا ضروری ہے۔ (خواطر قرآن سارانس گجراتی)

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۬ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ①

اے ایمان والو! معاہدوں کو پورا کرو۔ تمہارے لیے وہ چوپائے حلال کر دیے گئے ہیں جو مویشیوں میں داخل (یا

ان کے مشابہ) ہوں۔ سوائے ان کے جن کے بارے میں تمہیں پڑھ کر سنایا جائے گا بشرطیکہ جب تم احرام کی حالت میں ہو اس وقت شکار کو حلال نہ سمجھو۔ اللہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اس کا حکم دیتا ہے۔

ایمان شرعی دو چیزوں کا نام ہے؛ صحیح معرفت اور تسلیم وانقیاد۔ یعنی خدا اور رسول کے جملہ ارشادات کو صحیح وصادق سمجھ کر تسلیم وقبول کے لئے اخلاص سے گردن جھکا دینا، اس تسلیمی جزء کے لحاظ سے ایمان فی الحقیقت تمام قوانین واحکام الٰہیہ کے ماننے اور جملہ حقوق ادا کرنے کا ایک مضبوط عہد واقرار ہے، گویا حق تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ کا وہ اقرار جو عہد الست کے سلسلہ میں لیا گیا تھا، جس کا نمایاں اثر انسان کی فطرت اور سرشت میں آج تک موجود ہے، اسی کی تجدید وتشریح ایمان شرعی سے ہوتی ہے۔ پھر ایمان شرعی میں جو کچھ اجمالی عہد وپیمان تھا اسی کی تفصیل پورے قرآن وسنت میں دکھلائی گئی ہے۔ اس صورت میں دعویٰ ایمان کا مطلب یہ ہوا کہ بندہ تمام احکام الٰہیہ میں خواہ ان کا تعلق براہ راست خدا سے ہو یا بندوں سے، جسمانی تربیت سے ہو یا روحانی اصلاح سے، دنیاوی مفاد سے ہو یا اخروی فلاح سے، شخصی زندگی سے ہو یا حیات اجتماعی سے، صلح سے ہو یا جنگ سے، اس کا عہد کرتا ہے کہ ہر نہج سے اپنے مالک کا وفادار رہے گا۔ نبی کریم ﷺ جو عہد وپیمان اسلام، جہاد، سمع وطاعت، یا دوسرے عمدہ خصال اور امور خیر کے متعلق صحابہ سے بشکل بیعت لیتے تھے وہ اسی عہد ایمانی کی ایک مخصوص صورت تھی اور چونکہ ایمان کے ضمن میں بندہ کو حق تعالیٰ کے جلال وجبروت کی صحیح معرفت اور اس کی شان انصاف وانتقام اور وعدوں کی سچائی کا پورا پورا یقین بھی حاصل ہو چکا ہے، اس کا مقتضا یہ ہے کہ وہ بدعہدی اور غداری کے مہلک عواقب سے ڈر کر اپنے تمام عہدوں کو جو خدا سے یا بندوں سے یا خود اپنے نفس سے کئے ہوں اس طرح پورا کرے کہ مالک حقیقی کی وفاداری میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ اس تقریر کے موافق عقود (عہدوں) کی تفسیر میں جو مختلف چیزیں سلف سے منقول ہیں ان سب میں تطبیق ہو جاتی ہے اور آیت میں ''ایمان والو'' کے لفظ سے خطاب فرمانے کا لطف مزید حاصل ہوتا ہے۔ (تفسیر عثمانی:۱۳۹)

چوپایہ تو ہر اس جانور کو کہتے ہیں جو چار ہاتھ پاؤں پر چلتا ہے، لیکن ان میں سے صرف وہ جانور حلال ہیں جو مویشیوں میں شمار ہوتے ہیں، یعنی گائے اونٹ، اور بھیڑ بکری یا پھر ان مویشیوں کے مشابہ ہوں جیسے ہرن، نیل گائے وغیرہ۔

مویشیوں کے مشابہ جانور مثلاً ہرن وغیرہ اگرچہ حلال ہیں اور ان کا شکار بھی حلال ہے، لیکن جب حج یا عمرے کے لئے کسی نے احرام باندھ لیا ہو تو ان جانوروں کا شکار حرام ہو جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۞ اس جملے نے ان تمام سوالات اور اعتراضات کی جڑ کاٹ دی ہے جو لوگ محض اپنی محدود عقل کے سہارے شرعی احکام پر عائد کرتے ہیں، مثلاً یہ سوال کہ جانور بھی تو آخر جان رکھتے ہیں، ان کو ذبح کر کے کھانا کیوں جائز کیا گیا، جبکہ یہ ایک جاندار کو تکلیف پہنچانا ہے یا مثلاً یہ سوال کہ فلاں جانور کو کیوں حلال کیا گیا اور فلاں جانور کو کیوں حرام قرار دیا گیا ہے؟ آیت کے اس حصے نے اس کا مختصر اور جامع جواب یہ دے دیا ہے کہ اللہ تعالی پوری کائنات کا

خالق ہے، وہی اپنی حکمت سے جس بات کا ارادہ فرماتا ہے اس کا حکم دے دیتا ہے، اس کا ہر حکم یقیناً حکمت پر مبنی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ اس کے ہر حکم کی حکمت بندوں کو سمجھ میں بھی آئے، لہذا بندوں کا کام یہ ہے کہ اس کے ہر حکم کو چون وچرا کے بغیر تسلیم کر کے اس پر عمل کریں۔ (توضیح القرآن: ۱/ ۳۲۲)

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۝۲

اور نیکی اور تقوی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو، اور گناہ اور ظلم میں تعاون نہ کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بیشک اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔

کیسے زریں اصول کی تعلیم مل رہی ہے! نیکی میں سب کے شریک رہو، بدی اور فسق میں کسی کا ساتھ نہ دو! ''مہذب'' قوموں کا سا شیوہ نہ رکھو کہ اپنی قوم سب پر مقدم، اور اپنی پارٹی، بہرحال اپنی پارٹی! ادھر قاعدے اور اصول غیروں سے معاملت کے بتائے تھے، اب یہاں ارشاد آپس کی معاملت سے متعلق ہو گیا۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہیں سے معلوم ہوا کہ حسن وقبح میں مقدمات کو مقاصد کا حکم دیا جاتا ہے، اور مشائخ اہل تربیت کے ہاں اسی قاعدہ پر عمل ہے، یہیں سے وجوب ان مجلسوں میں شرکت کا نکل آیا جن کا مقصد اشاعت دین ونصرت دین ہے، اور حرمت ان اجتماعی اداروں میں شرکت کی نکل آئی جن سے بے دینی یا بدعملی کی تائید ہوتی ہو۔

(تفسیر ماجدی: ۲/ ۱۲)

نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو، **ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان** نیز گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون نہ کرو۔ اچھائی سے تعاون اور برائی سے عدم تعاون ایک اہم اصول ہے جو اللہ تعالیٰ نے یہاں پر بیان فرمایا ہے۔ یہ قرآن اور اسلام کا موضوع ہے کہ اقوام عالم میں جہاں بھی کوئی مسلمان موجود ہے، نیکی میں اس کے لیے دست تعاون بڑھایا جائے۔ مگر اس زمانے میں اس چیز کا فقدان ہے۔ اب نیکی کے بجائے برائی کے کام میں تعاون کیا جاتا ہے، اب موضوع ہی بدل گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے نتائج بھی ایسے ہی نکلیں گے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ عدل وانصاف تقویٰ کی روح ہے اور مومنوں کا عالمی پروگرام ہے، اللہ نے یہی حکم دیا ہے **ان اللہ یامر بالعدل والاحسان** یعنی عدل وانصاف پر قائم رہو اور احسان کرو۔ مگر اب انصاف کی جگہ ظلم نے لے لی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک نے اس مقام پر یاد دلایا ہے کہ نیکی اور تقویٰ کے معاملات میں تعاون کرو، اور برائی خواہ عقیدے میں ہو یا عمل میں، اس کے ساتھ ہرگز تعاون نہ کرو۔ (معالم العرفان: ٦/ ۴۴)

حرام جانور اور تکمیل دین واسلام کا اعلان:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ.........الی.............فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝۳

تم پر مردار جانور اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جانور حرام کر دیا گیا ہے جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو اور وہ جو گلا گھٹنے سے مرا ہو، اور جسے چوٹ مار کر ہلاک کیا گیا ہو، اور جو اوپر سے گر کر مرا ہو اور جسے کسی جانور نے سینگ مار کر ہلاک کیا ہو، اور جسے کسی درندے نے کھا لیا ہو، الا یہ کہ تم (اس کے مرنے سے پہلے) اس کو ذبح کر چکے ہو، اور وہ (جانور بھی حرام ہے) جسے بتوں کی قربان گاہ پر ذبح کیا گیا ہو۔ اور یہ بات بھی (تمہارے لیے حرام ہے) کہ تم جوے کے تیروں سے (گوشت وغیرہ) تقسیم کرو۔ یہ ساری باتیں سخت گناہ کی ہیں۔ آج کافر لوگ تمہارے دین (کے مغلوب ہونے) سے ناامید ہو گئے ہیں، لہٰذا ان سے مت ڈرو، اور میرا ڈر دل میں رکھو۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی، اور تمہارے لیے اسلام کو دین کے طور پر (ہمیشہ کے لیے) پسند کر لیا (لہٰذا اس دین کے احکام کی پوری پابندی کرو) ہاں جو شخص شدید بھوک کے عالم میں بالکل مجبور ہو جائے (اور اس مجبوری میں ان حرام چیزوں میں سے کچھ کھا لے) بشرطیکہ گناہ کی رغبت کی بنا پر ایسا نہ کیا ہو، تو بیشک اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔

امام ابن کثیرؒ اور دوسرے مفسرین بیان فرماتے ہیں کہ جن جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، ان میں کوئی نہ کوئی خرابی ضرور موجود ہے، وہ یا تو انسانی جسم کے لیے مضر ہیں یا روح کے لیے نقصان دہ ہیں اور جو چیزیں حلال قرار دی گئی ہیں وہ یقیناً انسان کے لیے جسمانی یا روحانی لحاظ سے سودمند ہیں۔

سور کا گوشت:

اسلام میں سور کو بھی حرام کیا گیا ہے، زمانہ قدیم میں انسان کو اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہ تھا، مگر جدید طبی تحقیقات نے بتایا ہے کہ اس کے اندر بہت سے نقصانات ہیں، مثلاً یورک ایسڈ جو ایک زہریلا مادہ ہے اور ہر جاندار کے خون میں موجود رہتا ہے، وہ اور جانداروں کے جسم سے تو خارج ہو جاتا ہے مگر سور کے اندر سے خارج نہیں ہوتا، گردے جو ہر انسانی جسم میں ہوتے ہیں، وہ اس زہریلے مادے کو پیشاب کے ذریعہ خارج کرتے رہتے ہیں، انسانی جسم اس مادے کو نوے فیصد خارج کر دیتے ہیں، مگر سور کے جسم کے عضلات کی ساخت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اس کے خون کا یورک ایسڈ صرف دو فیصد ہی خارج ہو پاتا ہے، اور بقیہ حصہ اس کے جسم کا جزو بنتا رہتا ہے، چنانچہ سور خود بھی جوڑوں کے درد میں مبتلا رہتا ہے، اور اس کا گوشت کھانے والے بھی وضع المفاصل جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ (جدید فلسفہ اور علم کلام: ۳۶۳)

کیا اسلام مانع ترقی ہے؟

اسلام حقیقی ترقی کا ہرگز ہرگز مانع نہیں بلکہ حقیقی ترقی کا حکم دیتا ہے، اس سے بڑھ کر کیا ترقی ہوسکتی ہے کہ صحابہ کرام نے چند ہی روز میں قیصر و کسریٰ کی سلطنت پر قبضہ کر لیا اور روئے زمین پر اپنی سیادت اور اقتدار کو قائم کر دیا اور شریعت اسلامیہ کا دستور اور قانون دنیا میں رائج کر دیا اور جس سرزمین پر قدم رکھا بغیر کسی کالج اور یونیورسٹی کے وہاں کی زبان عربی بن گئی اور وہاں کا تمدن اسلامی تمدن بن گیا اور آج سے دو سو سال پیشتر تک تمام سلاطین اسلام کا یہی حال رہا اور اللہ نے

ان کو وہ عزت دی، جو اب خواب وخیال میں بھی نہیں آسکتی ،البتہ اسلام اس خیالی ترقی کا مانع اور مخالف ہے،جس کی حقیقت سوائے حرص اور طول امل کے کچھ نہیں شیخ چلی کی سی پلاؤ پکا لینے کا نام ترقی نہیں۔

عالم کی اصل ترقی کا دارومدار چار چیزیں ہیں: زراعت اور تجارت اور صنعت وحرفت اور ملازمت جس کو اصلاح شریعت میں اجارہ کہتے ہیں، شریعت کی بے شمار نصوص سے ان تمام امور کی تاکید اور ترغیب ثابت ہے اور اللہ نے ان امور کے متعلق احکام صادر کیے ہیں، جو چیزیں حقیقتا مفید اور نافع تھیں ان کو جائز قرار دیا اور جو چیزیں مضر تھیں ان کو ناجائز قرار دیا گیا، اگرچہ کوئی خودغرض بعض چیزوں کو اپنے لیے مفید اور نافع سمجھتا ہے، ہر حکومت نے اپنے قانون میں رشوت اور چوری، ڈاکہ زنی کو جرم اور ممنوع قرار دیا حالانکہ چوری اور ڈاکہ زنی شخصی منافع سے خالی نہیں، چوری سے اور رشوت سے مال میں بڑی ترقی ہوتی ہے، مگر کوئی شخص بھی حکومت اور قانون پر یہ اعتراض نہیں کرتا کہ یہ قانون ہماری ترقی میں حارج اور مزاحم ہے، لہذا اس کو منسوخ کیا جائے، اسی طرح شریعت نے سود اور قمار اور رشوت کو حرام قرار دیا جو مضرت میں چوری اور ڈاکہ سے کہیں بڑھ کر ہیں لیکن افسوس کہ شریعت کے احکام کو مانع ترقی سمجھتے ہیں اور قوانین حکومت کو مانع ترقی نہیں سمجھتے ،معترضین یہ بتلائیں کہ شریعت کے کون سے احکام ایسے ہیں جو حقیقتا دنیاوی ترقی میں حارج اور مزاحم ہیں بتلائیں تو سہی کیا شراب اور زنا اور بے پردگی کی اجازت سے ملک کو مادی ترقی حاصل ہوجائے گی شریعت پروپیگنڈے کو ممنوع قرار دیتی ہے حیرت کا مقام ہے کہ جھوٹ سے تو ملک کو ترقی ہوئی اور سچائی سے ملک کو تنزلی ہوئی، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان نجاست خوروں (جھوٹا پروپیگنڈا) کرنے والوں کو صدق اور سچائی کی حلاوت اور لذت کس طرح سمجھائی جائے، بلکہ حق بات یہ ہے کہ شریعت نے جس چیز سے منع کیا وہی چیز تنزل کا سبب ہے اور جس چیز کا حکم دیا ہے وہی ترقی کا ذریعہ ہے۔

(تفسیر ادریسی: ۲/ ۴۳۸، ۴۳۹)

یہ اکمال دین بہ لحاظ قوت بھی ہے اور بہ لحاظ احکام وقواعد بھی۔ ''**اتممت علیکم نعمتی**''۔ یہ اتمام نعمت اسی دین کی تکمیل سے ہوا۔ اس اکمال دین واتمام نعمت کے بعد ظاہر ہے کہ اب دین میں کسی ترمیم، اضافہ، تصرف کی گنجائش نہ رہی، نہ کسی اور نبی کی بعثت کی حاجت، ختم نبوت پر اگر دلائل صریحہ مستقل موجود نہ ہوتے تو خود یہی آیت بھی کافی ہوسکتی تھی، عقیدۂ امامت کا۔ جو درحقیقت اجزاء نبوت ہی کی ایک شکل ہے۔ رد بھی یہیں سے نکل آتا ہے۔

البتہ ہر دور میں نئے نئے مسائل کا انکشاف اہل علم واجتہاد اپنی بصیرت سے کتاب وسنت کے اصول وقواعد کے مطابق وماتحت قیامت تک کرتے رہیں گے۔

اشیاء کی حلت وحرمت کا ذکر اوپر سے چلا آرہا تھا، تو یہ مسئلہ بھی اسی کتاب واضح کے اندر آ گیا اور اس میں بھی اب کسی تغیر وتصرف کی گنجائش نہ رہی۔ (تفسیر ماجدی: ۲/ ۱۵)

تکمیل دین فرمایا **الیوم اکملت لکم دینکم** آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کردیا ہے۔ دین کی تحریک

حضرت آدم (علیہ السلام) سے شروع ہوئی تھی۔تمام انبیاء پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی رہی، مگر کسی نبی پر تکمیل دین کا اعلان نہیں ہوا۔اب اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی پر تمام احکام قطعی طور پر نازل فرما دیے ہیں اور تکمیل دین کا اعلان کر دیا ہے۔دین کے تمام اصول اور فرائض مکمل ہو چکے ہیں۔اب قیامت تک کوئی نیا اصول یا فرض نہیں آئے گا۔

تکمیل دین کا یہی معنی ہے، البتہ فروعات میں بعض چیزیں قرآن پاک میں آئی ہیں اور بعض چیزیں پیغمبر (علیہ السلام) کے سپرد کر دیں کہ آپ ان کی وضاحت فرما دیں۔چنانچہ حضرت مولانا گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ جو چیز صحیح صحیح حدیث سے صحیح سند کے ساتھ صحیح طریقے سے ثابت ہے، وہ قرآن پاک کی شرح ہے۔امام ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے: **والسنة تفسير القران و تعبيره**، یعنی سنت رسول قرآن پاک کی تفسیر اور تعبیر ہے اور بعض مقامات پر صرف اصول بیان کر دیے گئے ہیں جن کی جزئیات غیر محصور ہوتی ہیں۔نئے نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔جن کے حل مجتہدین کرام اصولوں کی روشنی میں پیش کرتے ہیں، سورہ نساء میں **يستنبطونه** کا لفظ آ چکا ہے۔مسائل کا استنباط کرنا مجتہدین کا کام ہے، لہٰذا مجتہدین کا اتباع قرآن پاک ہی کا اتباع ہے کیونکہ مجتہد اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرتا، بلکہ وہ قرآن وسنت کے احکام کو ظاہر کرتا ہے، اسی لیے مجتہدین کے اجتہاد کو مظہر کہتے ہیں اور یہ چیز بھی تکمیل دین میں شامل ہے۔

اتمام نعمت فرمایا، ایک تو دین کو مکمل کر دیا اور دوسرے **واتممت عليكم نعمتي**. میں نے اپنی نعمت تم پر پوری کر دی، یعنی دین کے تمام احکام، ضوابط اور فرائض وغیرہ بیان کر دیئے ہیں، اب کسی چیز کی کمی باقی نہیں رہی۔اور نعمت کا معنی غلبہ بھی ہے یعنی اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ بھی عطا کر دیا ہے۔**ليظهره على الدين كله** تاکہ یہ دین تمام ادیان عالم پر غالب آ جائے، چنانچہ نزول قرآن سے لے کر واقعہ صفین تک پچاس سال کے عرصہ میں اسلام آدھی دنیا پر چھا چکا تھا اور باقی نصف دنیا میں کوئی قوم سیاسی طور پر مسلمان کے مدمقابل نہ رہی تھی۔یہی اتمام نعمت ہے۔(معالم العرفان:٦/٦٠)

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ.............الیٰ............وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝۵

آج تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں، اور جن لوگوں کو (تم سے پہلے) کتاب دی گئی تھی، ان کا کھانا بھی تمہارے لیے حلال ہے، اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے نیز مومنوں میں سے پاک دامن عورتیں بھی اور ان لوگوں میں سے پاک دامن عورتیں بھی تمہارے لیے حلال ہیں، جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی، جبکہ تم نے ان کو نکاح کی حفاظت میں لانے کے لیے ان کے مہر دے دیے ہوں، نہ تو (بغیر نکاح کے) صرف ہوس نکالنا مقصود ہو اور نہ خفیہ آشنائی پیدا کرنا اور جو شخص ایمان سے انکار کرے اس کا سارا کیا دھرا غارت ہو جائے گا اور آخرت میں اس کا شمار خسارہ اٹھانے والوں میں ہوگا۔

قرآن نے حلال وحرام کے سلسلہ میں ایک اُصول مقرر کر دیا ہے کہ جو چیز پاکیزہ ہو، انسان کی فطرتِ سلیم جس کی طرف مائل ہو، وہ حلال ہے، اور جو چیز گندی اور خبیث ہو اور فطرتِ سلیمہ اس سے گریز کرتی ہو، وہ حرام ہے؛ لیکن کیا کیا

جائے کہ انسان بعض اوقات گندی چیزوں کا اپنے آپ کو خوگر بنالیتا ہے، اور اس کی مسخ شدہ فطرت اسی کی طرف پروانہ وار گرنے لگتی ہے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے حلال وحرام کے تفصیلی احکام اُتارے، اب نباتات ہوں یا حیوانات، شریعت نے جن کو حلال قرار دیا ہو، وہ 'طیبات' ہیں، اور جن کو منع کیا ہو، وہ 'خبائث' ہیں۔

شکاری جانور کے ذریعہ شکار کئے جانے والے جانور کے حلال ہونے کے لئے چار شرطیں بتائی گئیں، اول: یہ کہ ان کو شکار کی تربیت دی گئی ہو، دوسرے: ان کو شکار پر چھوڑا گیا ہو، نہ یہ کہ وہ از خود شکار پر جھپٹ پڑے ہوں، تیسرے: انہوں نے شکار کو بھیجنے والے کے لئے روک رکھا ہو، نہ یہ کہ خود کھانے لگیں، چوتھے: ان کو بھیجتے ہوئے ان پر بسم اللہ بھی کہا گیا ہو، یہ چاروں شرطیں اس آیت میں مذکور ہیں، حضرت عدی بن حاتمؓ کی حدیث میں بھی یہ چاروں شرطیں آ گئی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: 'جب تم اپنے تربیت یافتہ کتے کو چھوڑو، اور اس پر اللہ کا نام لو، پھر وہ تمہارے لئے شکار کو روک رکھے تو کھاؤ، اگر خود کھانے لگے تو نہ کھاؤ کہ مجھے اندیشہ ہے کہ اس نے اس کو اپنے لئے روکا ہو' (بخاری، حدیث نمبر: ۵۴۸۳، مسند احمد: ۳۷۹/۴) جانور کو سدھانے کا طریقہ کیا ہو؟ قرآن نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی ہے، کتے کے بارے میں تو مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تربیت یافتہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ شکار کو خود نہ کھائے، بھیجنے والے کے لئے روک رکھے، پرندوں کے بارے میں فقہاء نے لکھا ہے کہ اسے شکار پر چھوڑا جائے تو جھپٹ پڑے اور بیچ راستہ سے بھی واپس بلالیا جائے تو واپس آجائے، (ہدایہ آخرین، کتاب الصید: ۵۰۶) 'جوارح' شکار کرنے والے جانور کو کہتے ہیں، کتا ہو یا کوئی اور جانور۔ (آسان تفسیر: ۳۶۱/۱، ۳۶۲)

نکاح اسلام میں کوئی ضمنی اور ثانوی حیثیت کی چیز نہیں، ایک اہم اور زبردست اخلاقی، اجتماعی، روحانی ادارہ ہے، اس کے منافع ومصالح فرد کے لئے، خاندان کے لئے، معاشرہ کے لئے، سب کے لیے بے شمار ہیں، اور اسی رعایت سے نکاح یا شادی کے لیے اردو میں بھی دوسرا لفظ ''خانہ آبادی'' کا ہے، اجڑئے ہوئے سنسار اور ویران گھر گھرانے اسی ذریعہ سے آباد ہوتے ہیں، مرد وزن کے باہمی تعلق کو اسلام نے صرف اسی صورت میں جائز رکھا ہے کہ زوجین کا اس سے اصل مقصود ایک خاندان کی بنیاد رکھنا، ایک مستقل معاشرہ قائم کرنا ہو، اپنے کو مہذب ومتمدن کہلانے والی، لیکن حقیقۃً جاہلی قوموں میں اس صورت مناکحت کے علاوہ دو اور صورتیں بھی مرد وزن کے تعلق کی پہلے بھی جاری رہی ہیں، اور اب بھی جاری ہیں۔

ایک شکل تو کھلم کھلا بدکاری کی ہے۔ عورت زنا کے لیے آزاد رہے، اس کو باقاعدہ اپنا پیشہ بنالے، نہ سوسائٹی اسے اس سے روک سکے نہ حکومت، جو مرد جب چاہے، اس کے ہاں جا کر ایک خاص کرایہ دے کر اپنے جسم کا پانی بہا آئے، اور منہ کالا کر کے چلا آئے۔

دوسری صورت چوری چھپے آشنائی کی ہے یعنی عصمت کے معنی ہی مٹ جائیں اور شریف وبیسوا میں کوئی فرق نہ رہ جائے، البتہ اس سے پبلک فضیحتا (Scandal) نہ پھیلتا ہو، یعنی جانتے اپنی جگہ سب ہوں، لیکن عام زبانوں پر چرچے

نہ پھیلیں۔

اسلام نے ان دونوں مہذب جرموں کو ایک لعنت قرار دیا اور جائز صورت مرد وعورت کو جنسی شہوانی تعلق کی صرف نکاح بتائی، نکاح چوری چھپے نہیں، اعلان کے ساتھ ہوتا ہے، اس میں خدا کا نام درمیان میں لاکر، خالق کائنات کا واسطہ ڈال کر، مرد عورت کی راحت، آسائش کا ذمہ لیتا ہے اور عورت مرد کی خدمت کی ذمہ داریاں قبول کر لیتی ہے۔ دونوں پر ایک دوسرے کے حقوق قائم ہوتے ہیں، فرائض عائد ہوتے ہیں، دونوں اپنے کو مستقل نباہ کے لیے عمر کے ہر دور، مال واقبال کے ہر اتار چڑھاؤ کے لیے حتی الامکان تیار کرتے ہیں، اور یہ سب کچھ گواہوں کی موجودگی میں بزرگوں اور خوردوں کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ (آیت) ''محصنین غیر مسفحین ولا متخذی اخدان''۔ لاکر قرآن مجید نے ازدواجی وخانگی زندگی کا وہ بلند ترین معیار پیش کر دیا، جہاں کوئی مادی تہذیب آج تک نہیں پہنچ سکی ہے، اسلام نے نکاحی تعلق میں ایک تقدیس پیدا کر دی ہے۔ (تفسیر ماجدی: ۲/ ۲۲)

اسلامی احکام میں سہولت یہ اللہ پاک کا بہت بڑا احسان:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوةِ فَاغۡسِلُوۡا ....الیٰ..............لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ۝

اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے چہرے، اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھو لو، اور اپنے سروں کا مسح کرو، اور اپنے پاؤں (بھی) ٹخنوں تک (دھولیا کرو) اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو سارے جسم کو (غسل کے ذریعے) خوب اچھی طرح پاک کرو۔ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر پر ہو یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت کر کے آیا ہو یا تم نے عورتوں سے جسمانی ملاپ کیا ہو اور تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کرو اور اپنے چہروں اور ہاتھوں کا اس (مٹی) سے مسح کر لو۔ اللہ تم پر کوئی تنگی مسلط کرنا نہیں چاہتا، لیکن یہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک صاف کرے، اور یہ کہ تم پر اپنی نعمت تمام کر دے، تاکہ تم شکر گزار بنو۔

ابتداء سورت میں اجمالی طور پر عقود اور عہود کے ایفاء کا حکم دیا پھر اس کی تفصیل شروع فرمائی تو سب سے پہلے کھانے کی چیزوں کی اباحت اور حلت کو بیان فرمایا، پھر حلال عورتوں کا ذکر کیا جن سے نکاح کی اجازت دی گئی اور چونکہ انسانی حاجتیں اور کھانے پینے کی ضرورتیں بہ نسبت نکاح کے زیادہ ہیں اس لیے ان کو مقدم فرمایا اور نکاح کو ان کے بعد بیان کیا، ان عقود کا تعلق دنیا سے تھا، اب ان عقود اور عہود کو بیان کرتے ہیں جو دین اور عبودیت سے متعلق ہیں اور چونکہ اکل حلال اور وطی حلال خداوند ذوالجلال کی عبادت میں بہت معین ہے اس لیے اس کو مقدم فرمایا اب ان سب کے بعد عہد عبودیت کے ایفاء کا مطالبہ فرماتے ہیں کہ اعلیٰ ترین عبودیت نماز ہے، جس کے لیے طہارت نہایت ضروری ہے، اس لیے ان آیات میں وضو اور غسل اور تیمم کے حکم کی تفصیل فرمائی۔ (تفسیر کبیر: ۳/ ۴۷۳ بحوالہ تفسیر ادریسی)

حلال اور حرام کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنے اس فضل وانعام کا ذکر کیا ہے کہ اللہ نے انہیں وضو اور غسل کے ذریعے ظاہر و باطن کے اعتبار سے پاک کیا ہے تاکہ وہ روحانی طور پر اللہ کے ساتھ مناجات کے لیے تیار

ہوسکیں۔

بندوں پر اللہ کے فضل واحسان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ پانی کے استعمال کی قدرت نہ ہونے کی صورت میں تیمم کی اجازت دی گئی ہے، کیونکہ اسلامی شریعت آسان شریعت ہے۔اس میں قدم قدم پر بندوں کی مجبوریوں کا لحاظ رکھا گیا ہے، چنانچہ اس پارہ کے چھٹے رکوع میں فرمایا گیا:

اللہ تم پر تنگی نہیں کرنا چاہتا؛ بل کہ تمہیں پاک کردے اور تمہارے اوپر اپنا احسان پورا کردے، تاکہ تم شکر کرنے والے بن جاؤ۔ (خلاصۃ القرآن م اش)

دشمنوں کے ساتھ عدل کا حکم:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۸

اے ایمان والو! ایسے بن جاؤ کہ اللہ (کے احکام کی پابندی) کے لیے ہر وقت تیار رہو (اور) انصاف کی گواہی دینے والے ہو، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ناانصافی کرو، انصاف سے کام لو، یہی طریقہ تقوی سے قریب تر ہے۔اور اللہ سے ڈرتے رہو۔اللہ یقینا تمہارے تمام کاموں سے پوری طرح باخبر ہے۔

اس پارہ کے ساتویں رکوع میں یہود کی بزدلی، ان کے فتنہ وفساد، سرکشی اور تکبر کا بیان ہے۔ان اوصاف کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو ان خرابیوں میں مبتلا ہونے سے بچا کر رکھیں۔

یہود کے ساتھ ساتھ نصاری کے احوال بھی بتلائے گئے ہیں، ان سے بھی اللہ کے حکموں پر قائم رہنے کا وعدہ لیا گیا تھا۔لیکن انہوں نے اللہ کے عہد کو توڑ دیا جس کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں میں بغض وعداوت ڈال دی۔باوجودیکہ یہ دونوں گروہ بہت ساری اعتقادی عملی اور اخلاقی خرابیوں میں مبتلا تھے، پھر بھی یہ دعوی کرتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، اس دعوے کی تردید کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اگر واقعی تم اللہ کے محبوب ہو تو وہ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے، (۱۸)

اس مذمت اور تردید کے بعد انہیں دین حق اور خاتم الانبیاء علیہ السلام پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔

فترت کا زمانہ:

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۡ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۹

اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارے پیغمبر ایسے وقت دین کی وضاحت کرنے آئے ہیں جب پیغمبروں کی آمد رکی ہوئی تھی، تاکہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس نہ کوئی (جنت کی) خوشخبری دینے والا آیا، نہ کوئی (جہنم سے) ڈرانے والا۔

لو اب تمہارے پاس خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا آ گیا ہے۔اور اللہ ہر بات پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے درمیان جو زمانہ ہے وہ زمانہ فترت کہلاتا ہے جو تقریباً چھ سو برس کا زمانہ ہے، جیسا کہ حضرت سلمان فارسی ؓ سے صحیح بخاری میں مروی ہے، اس درمیان میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث میں ہے: **انا اولی الناس بعیسی بن مریم لیس بینی و بینہ نبی** ۔

اور سورہ یسین کی اس آیت **اذ ارسلنا الیھم اثنین فکذبو ھما فعزز نا بثالث ۔** میں جن تین رسولوں کا ذکر ہے وہ حضرت عیسیٰ کے قاصد اور مبلغ تھے اور حواریین میں سے تھے، جن کو آپ نے اہل قریہ کی تبلیغ اور دعوت کے لیے بھیجا تھا اور وہ خدا کے رسول اور پیغمبر نہ تھے، بلکہ حضرت عیسیٰ کے فرستادہ اور حواری تھے اور بعض لوگوں نے جو ایک ضعیف روایت کی بناء پر خالد بن سنان عربی کو نبی بتایا ہے صحیح یہ ہے کہ وہ عیسیٰ (علیہ السلام) سے پہلے گذرے ہیں اور تواریخ میں جو آیا ہے کہ خالد بن سنان کی بیٹی نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوگی، سو اس سے صلبی بیٹی مراد نہیں بلکہ بنت بالواسطہ مراد ہے، کیوں کہ احادیث صحیحہ اور صریحہ سے یہ امر صراحۃً ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ اور حضرت عیسیٰ کے درمیان کوئی نبی نہیں (روح المعانی)۔

فلسطین میں داخلہ کا حکم:

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾

وہ کہنے لگے: اے موسی! جب تک وہ لوگ اس (ملک) میں موجود ہیں، ہم ہرگز ہرگز اس میں قدم نہیں رکھیں گے (اگر ان سے لڑنا ہے تو) تو بس تم اور تمہارا رب چلے جاؤ، اور ان سے لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

آٹھویں رکوع میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت موسی علیہ الصلوۃ والسلام نے پہلے یہود کو اللہ کے احسانات یاد کرنے کا حکم دیا، پھر انہیں ارض مقدس (فلسطین) میں داخل ہونے کی ترغیب دی لیکن ان بدبختوں نے اس ترغیب کے جواب میں موسی علیہ السلام کا مذاق اڑانا شروع کر دیا اور کہا: ''اے موسی! ہم تو اس ملک میں ہرگز داخل نہیں ہوں گے۔ جب تک کہ وہاں سے عمالقہ نہیں نکل جاتے لہذا تم اور تمہارا رب جا کر لڑو! ہم تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔'' (خلاصۃ القرآن م اش)

یہ بنی اسرائیل کی عہد شکنیوں میں سے ایک عہد شکنی اور بزدلی ہے، اس آیت میں اس کے انجام کا بیان ہے کہ اللہ کا کلیم تمہارے درمیان موجود تھا اس نے تم کو جہاد کی دعوت دی اور فتح کی بشارت بھی سنا دی کہ اللہ نے یہ زمین تمہارے لیے لکھ دی ہے یعنی رجسٹری کر دی ہے، مگر تم جہاد سے جان چرا گئے اور کلیم اللہ سے مجادلہ کرنے لگے، حالت تو تمہاری یہ اور دعوی یہ ہے کہ ہم ابناء اللہ اور احباء اللہ ہیں، اس قصہ میں ان کے دعوائے **نحن ابناء اللہ و احباءہ** کی تکذیب اور تردید ہے اور **فلم یعذبکم بذنوبکم** کی تصدیق اور تائید ہے اور اشارہ اس طرف ہے کہ محض انتساب بلا اطاعت خداوندی موجب مقبولیت و محبوبیت نہیں۔ حضرت شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم اپنا وطن چھوڑ کر نکلے اللہ کی راہ میں اور ملک

شام میں آ کر ٹھہرے، موت تک ان کے اولاد نہ ہوئی، تب اللہ نے ان کو بشارت دی کہ تیری اولاد کو بہت پھیلاؤں گا اور زمین شام ان کو دوں گا اور نور نبوت اور دین اور کتاب اور سلطنت ان میں رکھوں گا، پھر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے وقت میں وہ وعدہ پورا کیا، بنی اسرائیل کو فرعون کی بیگار سے خلاص کیا اور اس کو غرق کیا اور ان سے فرمایا کہ تم عمالقہ سے جہاد کر کے ان سے ملک شام چھین لو پھر ہمیشہ وہ ملک شام تمہارا ہے، حضرت موسیٰ نے بارہ شخص بارہ قبائل بنی اسرائیل پر سردار مقرر کیے تھے ان کو بھیجا کہ اس ملک کی خبر لاویں، وہ خبر لائے تو ملک شام کی بہت خوبیاں بیان کیں اور وہاں جو عمالقہ مسلط تھے ان کی قوت اور طاقت بھی بیان کی، حضرت موسیٰ نے یہ کہا تھا کہ تم قوم کے سامنے ملک کی خوبی تو بیان کرنا مگر دشمن کی قوت کا ذکر نہ کرنا، ان بارہ میں سے دو شخص تو اس حکم پر قائم رہے اور دس نے خلاف کیا، قوم نے عمالقہ کی قوت اور طاقت کو سنا تو نامردی کرنے لگے اور چاہا کہ پھر الٹے مصر واپس چلے جائیں، اس تقصیر کی وجہ سے چالیس سال فتح شام میں دیر لگی کہ اتنی مدت جنگلوں میں بھٹکتے اور حیران پھرتے رہے، جب اس قرن کے لوگ مر چکے، مگر وہ دو شخص کہ وہی حضرت موسیٰ کے بعد خلیفہ ہوئے اور ملک شام ان کے ہاتھ پر فتح ہوا، اہل کتاب کو یہ قصہ سنایا گیا کہ اگر تم پیغمبر آخر الزمان کی رفاقت نہ کرو گے تو یہ نعمت اوروں کے نصیب ہوگی اور آگے چل کر اسی پر قصہ سنایا ہابیل وقابیل کا کہ حسد مت کرو حسد والا مردود ہے۔

(کذافی موضح القرآن با یضاح یسیر بحوالہ تفسیر ادریسی: ۲/۷۷۴)۔

اسلام میں دہشت گردی اور آتنک پھیلانا سب سے بڑا گناہ:

بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کے تذکرہ کے بعد نویں رکوع میں آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کا قصہ ذکر کیا گیا ہے، جس کے مطابق قابیل نے حسد کی بنا پر اپنے بھائی کو قتل کر دیا، یہی حسد یہودیوں کے اندر بھی پایا جاتا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے خاتم الانبیاء علیہ السلام کی رسالت کا انکار کیا۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ .... الیٰ......... ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ۝۳۲

اور (اے پیغمبر) ان کے سامنے آدم کے دو بیٹوں کا واقعہ ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناؤ۔ جب دونوں نے ایک ایک قربانی پیش کی تھی، اور ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوگئی، اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔ اس (دوسرے نے پہلے سے) کہا کہ: میں تجھے قتل کر ڈالوں گا۔ پہلے نے کہا کہ اللہ تو ان لوگوں سے (قربانی) قبول کرتا ہے جو متقی ہوں۔ (۲۷) اگر تم نے مجھے قتل کرنے کو اپنا ہاتھ بڑھایا تب بھی میں تمہیں قتل کرنے کو اپنا ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا۔ میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ (۲۸) میں تو یہ چاہتا ہوں کہ انجام کار تم اپنے اور میرے دونوں کے گناہ میں پکڑے جاؤ،) اور دوزخیوں میں شامل ہو۔ اور یہی ظالموں کی سزا ہے۔ (۲۹) آخر کار اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر لیا، چنانچہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کر ڈالا، اور نامرادوں میں شامل ہوگیا۔ (۳۰) پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا، تاکہ اسے دکھائے

کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے (یہ دیکھ کر) وہ بولا: ہائے افسوس! کیا میں اس کوے جیسا بھی نہ ہوسکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا۔ اس طرح بعد میں وہ بڑا شرمندہ ہوا۔ (۳۱) اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کو یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ جو کوئی کسی کو قتل کرے، جبکہ یہ قتل نہ کسی اور جان کا بدلہ لینے کے لیے ہو اور نہ کسی کے زمین میں فساد پھیلانے کی وجہ سے ہو، تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جو شخص کسی کی جان بچالے تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کی جان بچالی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارے پیغمبران کے پاس کھلی کھلی ہدایات لے کر آئے، مگر اس کے بعد بھی ان میں سے بہت سے لوگ زمین میں زیادتیاں ہی کرتے رہے ہیں۔ (۳۲)

دونوں بیٹوں سے مراد ہابیل وقابیل ہیں، قابیل بڑے تھے اور ہابیل چھوٹے، بائبل میں ان کا نام قائن اور ہال آیا ہے، جب حضرت آدم و حوا علیہما السلام اس دنیا میں آباد کئے گئے تو اس وقت سب سے بڑی ضرورت نسل انسانی کی افزائش تھی؛ چنانچہ حضرت حوا علیہا السلام کو مسلسل جڑواں اولاد ہوتی، جن میں سے ایک لڑکا ہوتا اور ایک لڑکی، حضرت آدمؑ کی شریعت میں حکم یہ تھا کہ ایک ہی بطن سے پیدا ہونے والے بھائی بہن ایک دوسرے کے لئے حرام ہیں، دوسرے بطن کی اولاد سے ان کا نکاح ہوتا؛ چنانچہ قابیل و ہابیل کا ایک دوسرے کی جڑواں بہن سے نکاح ہوا، قابیل کی بہن کا نام 'اقلیماء' تھا اور وہ زیادہ خوبصورت تھی، ہابیل کی بہن کا نام 'لیوذا' تھا اور وہ اتنی خوبصورت نہیں تھی، قابیل اپنی ہی جڑواں بہن سے نکاح کرنے پر مصر تھا، حضرت آدمؑ نے اسے سمجھایا؛ لیکن اس نے مان کر نہیں دیا، پھر آپ نے دونوں کو خدا کے حضور اپنی نذر پیش کرنے کی تلقین کی؛ کہ جس کی نذر قبول ہوجائے، اس کا نکاح اس خوبصورت لڑکی سے ہو، ہابیل کے پاس مویشی تھے، اس نے مینڈھا پیش کیا، قابیل کے پاس کھیتی تھی، اس نے پیداوار کا ناقص حصہ پیش کیا، ہابیل کی قربانی پر آسمانی آگ اُتری، جو قبولیت کی علامت تھی، قابیل کی قربانی پر آگ نہیں اُتری؛ مگر اس کے باوجود قابیل نے نہ مانا اور قتل کی دھمکی دینے لگا، پھر اس دھمکی کے جواب میں جب ہابیل نے واضح کر دیا کہ وہ پھر بھی ہاتھ نہیں اُٹھائے گا تو اب اس کی ہمت اور بڑھ گئی اور آخر اس نے بھائی کا قتل کر کے ہی چھوڑا۔ (ابن کثیر، آسان تفسیر: ۱/۱۷۳)

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ﴿٢٧﴾

محقق رازیؒ نے لکھا ہے کہ تقوی میں ان تین امور کی رعایت لازمی ہے۔ ایک یہ کہ قبول طاعت میں غایت خشیت کا استحضار ہو، اور اپنی طرف سے کوئی بات تکمیل طاعت میں اٹھا نہ رکھی جائے، دوسرے یہ کہ امکانی کوشش اس امر کی رہے گی، طاعت سے رضاء الٰہی کے سوا اور کچھ مقصود نہ ہو، تیسرے یہ کہ غیر اللہ کی شرکت وآمیزش ذرا بھی اس طاعت میں نہ ہو۔ **وحقيقة التقوى امور، احدها ان يكون على خوف و وجل من تقصير نفسه في تلك الطاعة فيتقي باقصى مايقدر عليه عن جهات التقصير وثانيها ان يكون في غاية الاتقاء من ان ياتي بتلك الطاعة لغرض سوى طلب مرضاة الله تعالىٰ وثالثا ان يتقي ان يكون لغير الله تعالىٰ فيه شركة.** (کبیر)

محققین اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ تقوی سے اس سیاق میں مراد تقوی شرک ہے، تو جو شرک سے محفوظ اور توحید پر قائم رہا، تو جن اعمال میں اس نے صدق نیت سے کام لیا، وہ مقبول ٹھہریں گے اور جو شرک ومعصیت دونوں سے بچا، وہ قبول ورحمت دونوں کا حقدار ٹھہرا۔ (تفسیر ماجدی: ۵٦/۲)

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ کسی مردہ جانور کے دفن کرنے کا واقعہ پیش نہیں آیا تھا بلکہ کوئی بھی ایسی چیز جسے فوری استعمال کرنا مطلوب نہ ہوا سے آئندہ استعمال کے لیے زمین میں دبا دیا جاتا ہے تو ایسا ہی کوئی واقعہ قابیل کے سامنے پیش آیا تھا۔

اس سلسلہ میں اللہ کی طرف سے کوے کا انتخاب بڑا معنی خیز ہے، کوے کی فطرت میں یہ چیز پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے ہم جنس کی لاش پر بڑا شور مچاتے ہیں اور سب کوے اکٹھے ہوجاتے ہیں۔ پھر جب تک وہ لاش کسی ٹھکانے نہ لگ جائے کووں کی بے چینی اور شور وغل جاری رہتا ہے۔ چنانچہ ہابیل کی لاش کی تدفین کے لیے بھی اللہ نے کوے سے کام لیا، اس نے اپنی چونچ اور پنجوں سے زمین کو کریدا اور مردہ کوے یا کسی دوسری چیز کو اس گڑھے میں دفن کیا۔ مقصد یہ تھا لیریه کیف یواری سوءة اخیه کہ قابیل کو دکھا دیا جائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو کیسے چھپائے۔ سوءة لاش پر بھی بولا جاتا ہے اور اعضائے مستورہ پر بھی اور اس کا اطلاق مطلق جسم پر بھی ہوتا ہے۔ بہر حال اس پہلی میت کے تدفین کا طریقہ اللہ نے ایک کوے کے ذریعے سمجھا دیا۔

میت کی تدفین ایک فطری عمل ہے' اس سے جسم انسانی کی حفاظت بھی ہوجاتی ہے اور اس کی توہین وتذلیل بھی نہیں ہوتی' اس کے علاوہ میت کو ٹھکانے لگانے کے سارے طریقے غیر فطری ہیں۔ (انوار البیان، معالم العرفان)

ڈاکوؤں، باغیوں اور فسادیوں کی سزا:

اسی قصہ کی مناسبت سے ڈاکوؤں، باغیوں اور زمین میں فساد پھیلانے والوں کی سزا ذکر کی گئی ہے یعنی کسی کو سولی دی جائے، کسی کو قتل کیا جائے اور کسی کے ہاتھ پاؤں الٹی جانب سے کاٹ دیئے جائیں، (۳۳)

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ....الیٰ..........وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کرتے اور زمین میں فساد مچاتے پھرتے ہیں، ان کی سزا یہی ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے، یا سولی پر چڑھا دیا جائے، یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا انہیں زمین سے دور کر دیا جائے یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے، اور آخرت میں ان کے لیے زبردست عذاب ہے۔

مفسرین اور فقہاء کا اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ اس آیت میں ان لوگوں سے مراد وہ ڈاکو ہیں جو اسلحے کے زور پر لوگوں کو لوٹتے ہیں، ان کے بارے میں یہ جو کہا گیا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان قوانین کی بے حرمتی کرتے ہیں اور ان کا لوگوں سے لڑنا گویا اللہ اور اس کے رسول سے لڑنا ہے، ان لوگوں کے

لئے اس آیت میں چار سزائیں بیان کی گئی ہیں، ان سزاؤں کی تشریح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمائی ہے کہ اگر ان لوگوں نے کسی کو قتل کیا ہو مگر مال لوٹنے کی نوبت نہ آئی ہو تو انہیں قتل کیا جائے گا، مگر یہ قتل کرنا حد شرعی کے طور پر ہوگا، قصاص کے طور پر نہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر مقتول کو وارث معاف بھی کرنا چاہیں تو ان کی معافی نہیں ہوگی، اور اگر ڈاکوؤں نے کسی کو قتل بھی کیا ہو اور مال بھی لوٹا ہو تو انہیں سولی پر لٹکا کر ہلاک کیا جائے گا، اور اگر مال لوٹا ہو اور کسی کو قتل نہ کیا ہو تو ان کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹا جائے گا، اور اگر انہوں نے لوگوں کو صرف ڈرایا دھمکایا ہو، نہ مال لوٹنے کی نوبت آئی ہو، نہ کسی کو قتل کرنے کی، تو امام ابوحنیفہؒ نے أَوْ يُنفَوْا مِنَ الْأَرْضِ، کی تشریح یہ کی ہے کہ انہیں قید خانے میں بند کردیا جائے گا، یہ تشریح: حضرت عمرؓ کی طرف بھی منسوب ہے، دوسرے فقہاء نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ انہیں جلاوطن کردیا جائے گا۔
یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کریم نے ان جرائم کی سزائیں اصولی طور پر بیان فرمائی ہیں، نبی کریم ﷺ نے احادیث میں تفصیل بیان فرمائی ہے کہ ان سخت سزاؤں پر عمل درآمد کے لئے کیا شرائط ہیں، فقہ کی کتابوں میں یہ ساری تفصیل آئی ہے، یہ شرائط اتنی کڑی ہیں کہ کسی مقدمے میں ان کا پورا ہونا آسان نہیں؛ کیونکہ مقصد ہی یہ ہے کہ یہ سزائیں کم سے کم جاری ہوں، مگر جب جاری ہوں تو دوسرے مجرموں کے لئے سامان عبرت بن جائیں۔

چور کی سزا:

پھر دسویں رکوع میں چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ملک کے امن وتحفظ کے لیے خطرہ بنتے ہیں، لہذا ان کو ایسی سزا دینا ضروری ہے جس سے دوسرے عبرت حاصل کریں۔
یہاں یہ حقیقت پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلام انسان کی جان، عزت اور مال کی حفاظت کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور ان کے لیے خطرہ بننے والوں کے لیے ایسی عبرت ناک سزائیں تجویز کرتا ہے کہ ان کا تصور ہی انسان کو جرم کے ارتکاب سے روک لے اور ایسے لوگوں کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملے جو اجتماعی امن کے لیے خطرہ ثابت ہوں۔ چند ہاتھ کٹنے سے لاکھوں انسانوں کو اگر امن اور سکون میسر آجاتا ہے تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔
آج کی دنیا جو کہ جرائم کی کثرت کی وجہ سے جہنم کا نمونہ بن چکی ہے، چیخ چیخ کر اسلامی قوانین اور حدود کے نفاذ کی دعوت دے رہی ہے۔

فسادیوں کا تذکرہ:

ڈاکہ زنی چوری اور فساد کے احکام بیان کرنے کے بعد فسادیوں کے دو بڑے گروہوں کا تذکرہ ہے یعنی منافقین اور یہود۔
پہلے گروہ کا ذکر اختصار کے ساتھ ہے، اور دوسرے گروہ کا تفصیلی تذکرہ ہے۔
فرمایا گیا: اے رسول! آپ کو وہ لوگ غم میں نہ ڈالیں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں، وہ جو اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور ان کے دل مسلمان نہیں اور وہ جو یہودی ہیں، یہ جھوٹ بولنے کے لیے جاسوسی کرتے ہیں اور ایک دوسری

جماعت کے جاسوس ہیں جو آپ کے پاس نہیں آئی۔" (۴۱)

یہود کے ساتھ ساتھ نصاریٰ کی گمراہی کا بھی بیان ہے اور بتلایا گیا ہے کہ ان کو تورات اور انجیل دی گئی تھی لیکن انہوں نے ان کتابوں کے مطابق اپنے فیصلے نہ کیے۔

قرآن کا تذکرہ:

تورات اور انجیل کے ذکر کے بعد قرآن کا تذکرہ ہے جو کہ ہدایت اور گمراہی میں فرق کرنے والا ہے اور یہی کتابوں کا محافظ ہے۔

عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق سے تعلق رکھنے والی کوئی ایسی نصیحت اور کوئی ایسا کام نہیں جو انسانیت کی فلاح کے لیے ضروری ہو اور کتب سابقہ میں تو ہو مگر قرآن میں نہ ہو۔

اس کے بعد مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کے ساتھ قلبی دوستی لگانے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ وہ امت اسلامیہ کے سخت ترین دشمن ہیں۔ فرمایا گیا:

یہود و نصاریٰ سے قلبی دوستی:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾

اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو ان سے دوستی رکھے گا وہ انہیں میں سے ہوگا، بیشک اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ (۵۱)

عالم اسلام کے حکمرانوں کے لیے لمحۂ فکریہ:

قرآن کریم کی صداقت کا زندہ معجزہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ آپس کے شدید مذہبی اور سیاسی اختلافات کے باوجود یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے مقابلے میں متحد ہیں۔ تعجب تو اس بات پر ہے کہ عالم اسلام کے حکمران قرآن حکیم کی واضح ہدایات کے باوجود یہود و نصاریٰ سے پینگیں بڑھاتے ہیں اور ان کے اشاروں پر بنیاد پرست مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھاتے ہیں۔

کفار کی دوستی میں ارتداد کا خطرہ:

کفار کے ساتھ جب قلبی دوستی لگائی جائے گی تو ارتداد کا بھی خطرہ رہے گا۔ اس لیے اگلی آیات میں مسلمانوں کو ارتداد سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے کیونکہ ارتداد سے سارے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور انسان پر ہمیشہ کے لیے دوزخ واجب ہو جاتی ہے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

ان آیات میں مسلمانوں کو حکم ہوتا ہے کہ تم ان سے محبت نہ کرنا جو ان سے محبت کرے گا وہ انہیں میں شمار ہوگا، کیونکہ

محبت اور صحبت کا بڑا اثر انسان کے دل پر پڑتا ہے، محبت کا یہ اثر ہے کہ محبوب کی ہر چیز محب کی نظر میں محبوب ہوجاتی ہے، جذام اور سرطان کی طرح کفر اور شرک ایک روحانی مرض ہے، دلی میل جول سے اس کے جراثیم متعدی ہوتے ہیں، خدا تعالیٰ کے باغیوں کی دلی محبت اور میل جول سے رفتہ رفتہ انہیں کا مذہب اختیار کرلیتا ہے، فی الحال اگرچہ باعتبار باطن کے ان میں سے نہیں لیکن ان کی محبت اور صحبت سے اندیشہ ہے کہ آئندہ چل کر انہیں میں سے نہ ہوجائے یعنی اسلام سے مرتد نہ ہوجائے جیسا کہ آئندہ آیت میں اسی فتنہ ارتداد کی خبر دی گئی ہے، جس طرح کسی حکومت کی رعایا بن جانے کے بعد قانون حکمت پر نکتہ چینی اور تبصرہ کرنا حکومت سے ارتداد ہے اسی طرح اسلام میں داخل ہونے کے بعد قانون شریعت پر نکتہ چینی اور تبصرہ کرنا اسلام سے ارتداد ہے اور کافروں سے دلی تعلق ارتداد کی علامت ہے اور اس کا پیش خیمہ ہے اور اگر وہ اس کو چھپائیں اور اسلام کو ظاہر کریں تو وہ نفاق ہے جو شخص حکومت کے دشمنوں اور باغیوں سے میل جیل اور دوستانہ تعلقات رکھے تو حکومت کی نظر میں اس کی وفاداری مشکوک ہوجاتی ہے اور اسی طرح کافروں سے دوستانہ تعلقات سے اللہ کی نظر میں اسلام کی وفاداری مشکوک ہوجاتی ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۲/ ۵۱۷)

اللہ کا دین تمہارا محتاج نہیں:

ساتھ ہی یہ بھی وضاحت کردی گئی ہے کہ اللہ کا دین تمہارا محتاج نہیں، اگر تم مرتد ہوجاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تم سے بہتر لوگوں کو دین کی خدمت کے لیے کھڑا کردے گا، فرمایا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ ......الیٰ ....ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾

اے ایمان والو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ ایسے لوگ پیدا کردے گا جن سے وہ محبت کرتا ہوگا، اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے جو مومنوں کے لیے نرم اور کافروں کے لیے سخت ہوں گے۔ اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے، اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے جو وہ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت والا، بڑے علم والا ہے۔

کفار کی دوستی کی قباحت:

یہود ونصاریٰ کی دوستی سے منع کرنے کے ساتھ ساتھ سچے اہل ایمان سے دوستی لگانے کا حکم دیا گیا ہے، کفار کی دوستی کی قباحت کو واضح کرنے کے لیے مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے کہ وہ اسلام کے شعائر کا مذاق اڑاتے ہیں، اس لیے ان کے ساتھ دوستی کسی طور پر بھی جائز نہیں۔

یہودیوں کو رشوت، ظلم اور حرام کو چھوڑ کر اسلام کی دعوت:

قُلْ يَآاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ .....الیٰ ....لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾

تم (ان سے) کہو کہ: اے اہل کتاب! تمہیں اس کے سوا ہماری کون سی بات بری لگتی ہے کہ ہم اللہ پر اور جو کلام ہم پر اتارا گیا اس پر اور جو پہلے اتارا گیا تھا اس پر ایمان لے آئے ہیں، جبکہ تم میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں؟ (۵۹) (اے پیغمبر ان سے) کہو کہ: کیا میں تمہیں بتاؤں کہ (جس بات کو تم برا سمجھ رہے ہو) اس سے زیادہ برے انجام والے کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے پھٹکار ڈالی، جن پر اپنا غضب نازل کیا، جن میں سے لوگوں کو بندر اور سور بنایا، اور جنہوں نے شیطان کی پرستش کی، وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا بھی بدترین ہے اور وہ سیدھے راستے سے بھی بہت بھٹکے ہوئے ہیں۔ (۶۰) اور جب یہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، حالانکہ یہ کفر لے کر ہی آئے تھے، اور اسی کفر کو لے کر باہر نکلے ہیں، اور اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ کیا کچھ چھپاتے رہے ہیں۔ (۶۱) اور ان میں سے بہت سوں کو تم دیکھو گے کہ وہ گناہ، ظلم اور حرام خوری میں لپک لپک کر آگے بڑھتے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ جو حرکتیں یہ کرتے ہیں وہ نہایت بری ہیں۔ (۶۲) ان کے مشائخ اور علماء ان کو گناہ کی باتیں کہنے اور حرام کھانے سے آخر کیوں منع نہیں کرتے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ طرز عمل نہایت برا ہے۔ (۶۳)

عیسائیوں کو غلط عقائد چھوڑ کر اسلام کی دعوت:

لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ ؕ......الیٰ..........وَّضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ۝

وہ لوگ یقینا کافر ہو چکے ہیں جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے۔ حالانکہ مسیح نے تو یہ کہا تھا کہ: اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار۔ یقین جانو کہ جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے، اللہ نے اس کے لیے جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے، اور جو لوگ (یہ) ظلم کرتے ہیں ان کو کسی قسم کے یار و مددگار میسر نہیں آئیں گے۔ (۷۲) وہ لوگ (بھی) یقینا کافر ہو چکے ہیں جنہوں نے یہ کہا ہے کہ: اللہ تین میں کا تیسرا ہے، حالانکہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، اور اگر یہ لوگ اپنی اس بات سے باز نہ آئے تو ان میں سے جن لوگوں نے (ایسے) کفر کا ارتکاب کیا ہے، ان کو دردناک عذاب پکڑ کر رہے گا۔ (۷۳) کیا پھر بھی یہ لوگ معافی کے لیے اللہ کی طرف رجوع نہیں کریں گے، اور اس سے مغفرت نہیں مانگیں گے؟ حالانکہ اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (۷۴) مسیح ابن مریم تو ایک رسول تھے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، ان سے پہلے (بھی) بہت سے رسول گزر چکے ہیں، اور ان کی ماں صدیقہ تھیں۔ یہ دونوں کھانا کھاتے تھے، دیکھو! ہم ان کے سامنے کس طرح کھول کھول کر نشانیاں واضح کر رہے ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھو کہ ان کو اوندھے منہ کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ (۷۵) (اے پیغمبر! ان سے) کہو کہ: کیا تم اللہ کے سوا ایسی مخلوق کی عبادت کرتے ہو جو تمہیں نہ کوئی نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتی ہے اور نہ فائدہ پہنچانے کی، جبکہ اللہ ہر بات کو سننے والا، ہر چیز کو جاننے والا ہے؟ (۷۶) (اور ان سے یہ بھی کہو کہ) اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلو جو پہلے خود بھی گمراہ ہوئے، بہت سے دوسروں کو بھی گمراہ کیا، اور سیدھے راستے سے

بھٹک گئے۔(۷۷)

کسی ذات میں صفت الوہیت ماننے سے پہلے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ آیا وہ ہستی ان صفات پر پورا اترتی ہے جو سابقہ کتب اور اہل خرد کے نزد مسلم ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ الہ وہ ہوتا ہے جو واجب الوجود ہو یعنی جس کا وجود خود بخود ہو، کسی دوسری ذات کا پیدا کردہ نہ ہو۔ مگر مسیح (علیہ السلام) میں یہ صفت نہیں پائی جاتی۔ ان کا وجود تو پیدا شدہ اور مربوب ہے، وہ نہ خالق ہیں اور نہ رب، لہٰذا وہ الہ نہیں ہو سکتے۔

الہ کی ایک صفت قادر مطلق ہونا بھی ہے۔ الہ وہ ہو سکتا ہے جسے ہر چیز پر تصرف حاصل ہو، مگر مسیح (علیہ السلام) میں یہ صفت بھی مفقود ہے، وہ تو اللہ کے عاجز بندے ہیں .... انجیل میں موجود ہے کہ مسیح علیہ السلام اپنی عاجزی کی وجہ سے تختہ دار پر چڑھے اور جو عاجز ہو وہ الہ نہیں ہو سکتا۔ انجیل میں مسیح (علیہ السلام) کا یہ قول بھی موجود ہے کہ بیٹا یعنی مسیح اپنے آپ کچھ نہیں کر سکتا، یہ بھی آپ کے عجز پر دلالت کرتا ہے اور صفت الوہیت کے منافی ہے، حقیقی معبود کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ علیم کل ہو، کوئی چیز اس سے مخفی نہ ہو۔ قیامت کے وقت کے متعلق انجیل میں مسیح (علیہ السلام) کا فرمان موجود ہے کہ قیامت کی گھڑی کے متعلق نہ فرشتے جانتے ہیں اور نہ بیٹا یعنی خود مسیح، اس کا علم صرف باپ یعنی خدا تعالیٰ کو ہے اور کسی کو نہیں، اس طرح مسیح (علیہ السلام) کے علیم کل ہونے کی بھی نفی ہوگئی۔ الہٰ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ غیر محدود اور غیر مرئی ہوگا۔ نہ تو اس کا احاطہ ہو سکتا ہے اور نہ وہ ان آنکھوں سے نظر آتا ہے مگر، مسیح (علیہ السلام) چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے اور درمیانے قد کے محدود انسان تھے، لہٰذا وہ ان صفات کے حامل بھی نہ تھے، اس لئے بھی انہیں الوہیت سے متصف نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ الہ وہ ہے جس میں معبودیت کی صفت پائی جائے، مگر مسیح (علیہ السلام) تو عابد ہیں معبود نہیں۔ (معالم العرفان: ٦/ ۳۴۷)

دین میں ناحق غلو:

قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِیۡ دِیۡنِکُمۡ غَیۡرَ الۡحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوۡۤا اَهۡوَآءَ قَوۡمٍ قَدۡ ضَلُّوۡا مِنۡ قَبۡلُ وَاَضَلُّوۡا کَثِیۡرًا وَّضَلُّوۡا عَنۡ سَوَآءِ السَّبِیۡلِ ﴿۷۷﴾

(اور ان سے یہ بھی کہو کہ) اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلو جو پہلے خود بھی گمراہ ہوئے، بہت سے دوسروں کو بھی گمراہ کیا، اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔

یہود و نصاریٰ دونوں کو دین میں ناحق غلو کرنے اور خواہشات کی اتباع کرنے سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ یہ غلو اکثر گمراہی کا سبب بنتا ہے۔

''غلو'' کا مطلب ہے کسی کام میں اس کی معقول حدود سے آگے بڑھ جانا۔ عیسائیوں کا غلو یہ تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعظیم میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ انہیں خدا قرار دے دیا، اور یہودیوں کا غلو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے محبت کا

جو اظہار کیا تھا اس کی بنا پر یہ سمجھ بیٹھے کہ دنیا کے دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر بس وہی اللہ کے چہیتے ہیں اور اس وجہ سے وہ جو چاہیں کریں، اللہ تعالیٰ ان سے ناراض نہیں ہوگا، نیز ان میں سے بعض نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے لیا تھا۔ (توضیح القرآن: ۱/۳۵۹)

یہود پر اللہ کی لعنت:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۞

بنو اسرائیل کے جو لوگ کافر ہوئے ان پر داود اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت بھیجی گئی تھی، یہ سب اس لیے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی تھی، اور وہ حد سے گزر جایا کرتے تھے۔

یہود پر اللہ کی لعنت کا سبب بتلایا ہے، وہ یہ کہ وہ اللہ کی نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کر جاتے تھے اور ایک دوسرے کو برے کاموں سے منع نہیں کرتے تھے۔

بنی اسرائیل پر لعنت کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ نافرمانی کا ارتکاب کرتے تھے۔ ابتداء میں جب کوئی شخص برائی کا ارتکاب کرتا تو دوسرا کہتا: اتق اللہ یعنی اللہ سے ڈر جاؤ اور یہ فعل قبیح انجام نہ دو۔ پھر جب دوسرے دن وہی شخص برائی پر اصرار کرتا تو منع کرنے والا بھی اس کے ساتھ شریک ہو جاتا، وہ اکٹھے اٹھتے بیٹھتے اور اکٹھے کھاتے پیتے۔ چنانچہ برائی کرنے والا اور نہ کرنے والا ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو جاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا غضب آیا اور ان کی شکلیں مسخ ہو کر بندروں اور خنزیروں کی بن گئیں اور وہ اس دنیا سے نیست و نابود ہو گئے۔

ایک حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں جسے امام ابن کثیر نے بھی نقل کیا ہے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس امت کا خاصہ ہے اور یہ ترک ہو جائے اور برائی کرنے والوں کے ساتھ شرکت ہو جائے تو معتوب اور مغضوب ہونے والی بات ہے۔ صحابہ نے عرض کیا: حضور! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کب چھوڑ دی جائے گی؟ فرمایا: جب تم میں وہی برائیاں پیدا ہو جائیں جو پہلی امتوں میں تھیں۔ صحابہ نے پھر عرض کیا: وہ پہلی امتوں والی باتیں کب پیدا ہوں گی؟ فرمایا: جب تمہاری بادشاہی اور حکومت رذیل لوگوں کے پاس چلی جائے گی اور بڑے لوگ فحاشی کا شکار ہو جائیں گے اور علم فاسق لوگوں کے پاس چلا جائے گا۔ فرمایا: جب یہ حالات پیدا ہو جائیں گے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک ہو جائے گا۔ (معالم العرفان، ابن کثیر)

یہود اور امر و نواہی:

یہ سبب ذکر کر کے اصل میں امت اسلامیہ کو سمجھایا گیا ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہیں؛ وگرنہ ان پر بھی ویسے ہی اللہ کی لعنت ہو سکتی ہے جیسا کہ بنی اسرائیل پر لعنت ہوئی۔

اور یہ بات خود نبی کریم ﷺ نے ایک روایت میں ارشاد فرمائی ہے، ترمذی میں ہے کہ

آپ نے فرمایا: جب بنی اسرائیل معاصی میں مبتلا ہوئے تو ان کے علماء نے انہیں منع کیا مگر وہ باز نہ آئے، ان کے علماء ان کی مجلسوں میں بیٹھتے رہے اور ان کے ساتھ کھاتے پیتے بھی رہے؛ چنانچہ اللہ نے ان سب کے دلوں کو ایک جیسا کر دیا۔

اور داؤد اور عیسی بن مریم علیہما السلام کی زبان سے ان پر لعنت فرمائی، یہ اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔

نہ ایمان کامل، نہ عذاب سے نجات:

رسول اکرم ﷺ پہلے ٹیک لگائے ہوئے تھے مگر یہ فرماتے ہوئے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور آپ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، نہ تمہارا ایمان کامل ہوسکتا ہے اور نہ ہی تم اللہ کے عذاب سے نجات پا سکتے ہو، جب تک کہ تم لوگوں کو (حق کی دعوت نہ دو اور) حق قبول کرنے پر آمادہ نہ کرو (اور انہیں ظلم اور معاصی سے منع نہ کرو) (ترمذی)

مسلمانوں کے سخت دشمن:

آخری آیت میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے سب سے سخت دشمن یہود اور مشرکین ہیں اور قرآن کے اس دعوی پر یہود کی پوری تاریخ گواہ ہے،

البتہ جو واقعی اور حقیقی نصاری ہیں وہ مسلمانوں کے لیے اپنے دلوں میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ آج ہمیں جن نصاری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، وہ حقیقت میں وہ نصاری نہیں ہیں جو حضرت عیسی علیہ السلام کی تعلیمات پر عمل کرنے والے ہیں، ان کی اکثریت تو فکر و عمل کے اعتبار سے یہود کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے، بے شمار ایسے ہیں جو ملحد اور بے دین ہیں۔ صرف نام کے عیسائی ہیں۔ باقی جو بچتے ہیں وہ مسخ شدہ عیسائیت پر عمل پیرا ہیں "نصرانیت" کہیں بھی نہیں ہے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

موضوع سورہ:......اصلاح عرب۔

خلاصہ رکوع: ۱......ایفائے عہد الہی کی تشکیل۔ ماخذ: آیت: ۱ تا ۳۔

خلاصہ رکوع: ۲......طریقۂ تمیز طیبات اور تاکید ایفائے میثاق۔ ماخذ: آیت: ٦، ۷۔

خلاصۂ رکوع ۳:......نقض میثاق کے نتائج۔ ماخذ: آیت: ۱۳۔

خلاصہ رکوع: ۴......نقض عہد کے باعث لعنت (جس کا ذکر پہلے رکوع میں آیا ہے) لعنت سے بزدلی پیدا ہوئی۔ ماخذ: آیت: ۲۲۔

خلاصہ رکوع: ۵......لعنت الہی کا دوسرا اثر سلب عقل ہے، عقل پر ایسا پردہ پڑ جائے کہ حیوانوں سے بھی کم عقل ہو جائے۔ ماخذ: آیت: ۳۰، ۳۱۔

خلاصۂ رکوع: ٦......ایسا طرز عمل جس سے نقض عہد کی نوبت نہ آئے۔ ماخذ: آیت: ۳۵۔

خلاصۂ رکوع:۷......قرب الی اللہ کے لئے اتباع کتاب اللہ ضروری ہے۔ماخذ: آیت:۴۹۔

خلاصہ رکوع:۸......اعدائے الٰہی سے مقاطعہ،تاکہ اتباع کتاب اللہ ہو سکے۔ماخذ: آیت:۵۱۔

خلاصۂ رکوع:۹......دشمنان خدا سے مقاطعہ کا سبب استہزاء علی الدین ہے۔ماخذ: آیت:۵۷،۵۸۔

خلاصہ رکوع:۱۰......امت مقتصدہ کی تبلیغ اور مسائل تبلیغیہ۔ماخذ: آیت:٦۷۔

خلاصۂ رکوع:۱۱......اہل کتاب کی تبلیغ میں نصاری مقدم اور یہود مؤخر ہیں۔ماخذ: آیت: ۸۲۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

چھٹے پارے کے چند اہم فوائد

(۱) دوسروں کے عیوب کی تشہیر اور ہتک عزت حرام ہے۔

(۲) سارے گناہ دو قسموں میں منحصر ہیں،مخلوق پر ظلم اور اللہ کے حکموں سے اعراض۔یونہی ساری نیکیوں کو دو قسموں میں جمع کیا جاسکتا ہے ''اللہ کے حکم کی تعظیم اور اللہ کی مخلوق پر شفقت''۔

(۳) نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت سارے مکانوں،سارے زمانوں اور سارے انسانوں کے لئے ہے۔

(۴) ساری اخروی سعادتیں انہی لوگوں کے لئے ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اپنا مضبوط تعلق قائم کریں۔

(۵) قرآن کریم میں جہاں کہیں ''یایھا الذین امنوا'' کہہ کر خطاب کیا گیا ہے اسے خوب توجہ سے پڑھنا اور سننا چاہئے،کیونکہ یہ انتہائی اپنائیت والا خطاب ہے،قرآن کریم میں ۸۸/بار یہ خطاب آیا ہے۔

(٦) اہل ایمان پر نیکی اور تقوی کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا واجب ہے اور گناہ اور زیادتی میں تعاون کرنا حرام ہے۔

(۷) مردار اور ہر وہ جانور جسے شرعی طریقے سے ذبح نہ کیا جائے اس کا کھانا حرام ہے۔

(۸) تربیت یافتہ کتا بھوک اور خواہش کے باوجود محض مالک کی رضا کے لئے اپنے ہاتھوں کئے ہوئے شکار کی ایک بوٹی بھی نہیں کھاتا۔کیا انسان بھی اپنے مالک کی رضا اور عدم رضا کا اتنا ہی خیال رکھتا ہے؟

(۹) اللہ تعالی کی نعمتوں کو یاد کرتے رہنا واجب ہے،خصوصاً ایسی نعمتیں جو اللہ کے سوا کسی اور سے حاصل ہی نہیں ہوسکتیں۔

(۱۰) کمینے شخص کی زیادتی اور اپنی قدرت کے باوجود معاف کر دینا نیک لوگوں کی صفت ہے۔نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تو اس صفت کا بڑا ہی غلبہ تھا۔

پارہ: ۷

چھٹے پارہ کی آخری آیت میں بتایا گیا تھا کہ جو حقیقی نصاری ہیں وہ اپنے دلوں میں مسلمانوں کے لیے قدرے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٨٣﴾

اور جب یہ لوگ وہ کلام سنتے ہیں جو رسول پر نازل ہوا ہے تو چونکہ انہوں نے حق کو پہچان لیا ہوتا ہے، اس لیے تم ان کی آنکھوں کو دیکھو گے کہ وہ آنسوؤں سے بہہ رہی ہیں۔ (اور) وہ کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں، لہذا گواہی دینے والوں کے ساتھ ہمارا نام بھی لکھ لیجیے۔

حبشہ کے نصاریٰ:

اب ساتویں پارہ کے شروع میں بھی بعض نصاری ہی کا ذکر ہے جو قرآن سن کر اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ پاتے اور بے اختیار ان کی آنکھیں چھلکنے لگتی ہیں۔ (۸۳۔۸۵)

یہ آیات حبشہ کے ان نصاری کے بارے میں نازل ہوئی تھیں جن کے ملک میں مسلمان ہجرت کر کے گئے تھے، حضرت جعفر نے سورہ مریم پڑھ کر سنائی تو جو علماء اور زہاد وہاں بیٹھے ہوئے تھے سب رونے لگے اور نجاشی بھی برابر روتا رہا اور مسلمانوں سے پوچھا کہ تمہارے پیغمبر عیسیٰ (علیہ السلام) کی نسبت کیا کہتے ہیں، صحابہ نے جواب دیا کہ وہ انہیں خدا کا بندہ اور اس کا رسول کہتے ہیں اور ان کی والدہ ماجدہ مریم کو صدیقہ اور ولیہ اور تارک الدنیا کہتے ہیں کہ ان سے بغیر باپ کے جبرائیل امین کی پھونک مارنے سے عیسیٰ (علیہ السلام) پیدا ہوئے، نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کر کہا: خدا کی قسم عیسیٰ تمہارے پیغمبر کے قول سے تنکا برابر بھی زائد نہیں، تمہارے نبی نے عیسیٰ کے متعلق جو کچھ کہا وہ بالکل حق ہے، قرآن کریم سن کر نجاشی شاہ حبشہ اور اس کے رفقاء نے اسلام قبول کیا اور اس بات کی شہادت دی کہ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کی عیسیٰ بن مریم نے بشارت دی ہے، اسی جماعت کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ (معارف القرآن ادریسی: ۲/ ۵۷۵)

اصل میں اللہ کے کلام میں تاثیر ہی ایسی ہے کہ اگر ایسے دل اسے سنیں جو بغض اور کینہ سے خالی اور خوف وخشیت سے معمور ہوں تو جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور آنکھوں سے آنسو چھلک ہی پڑتے ہیں۔ حقیقی نصاری کے کلام اللہ سے متاثر ہونے اور رونے دھونے کا حال بتانے کے بعد شرعی مسائل ذکر کیے گئے ہیں۔ کیونکہ سورہ مائدہ مدنی سورت ہے۔

(خلاصۃ القرآن: م اش)

حدیث شریف میں حضور (علیہ الصلوۃ والسلام) کا ارشاد مبارک ہے کہ دو قسم کی آنکھیں ایسی ہیں جن پر دوزخ کی آگ حرام ہے، ایک وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روتی ہے اور دوسری وہ جو اللہ کے راستے میں حفاظت کے لئے پہرہ دیتی ہے۔ فرمایا: ایسی آنکھوں والے کبھی دوزخ میں نہیں جائیں گے حتی کہ اونٹنی کا دودھ اس کے تھنوں میں واپس آجائے۔ جس طرح دوہے ہوئے دودھ کا تھنوں میں واپس جانا ناممکن ہے۔ اسی طرح چشم تر کا دوزخ میں جانا محال ہے۔ خدا کے خوف سے آبدیدہ ہوجانا اللہ نے نبیوں کی صفت بیان کی ہے۔ (ترمذی)

عقائد سے بحث:

جیسے مکی سورتوں میں عام طور پر عقائد ہے، بحث ہوتی سے یونہی مدنی سورتوں میں تفصیل کے ساتھ اور کہیں اختصار کے ساتھ تشریعی امور سے بحث ہوتی ہے، یہاں جو مسائل و احکام ذکر کیے گئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

حلال و حرام کا اختیار:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾

اے ایمان والو! اللہ نے تمہارے لیے جو پاکیزہ چیزیں حلال کی ہیں ان کو حرام قرار نہ دو، اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ یقین جانو کہ اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۸۷)

کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے، اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جن پاکیزہ چیزوں کو اللہ تعالی نے حلال قرار دیا ہے تم نہ تو انہیں حرام سمجھو اور نہ ہی ان کے استعمال سے احتراز کرو۔

اعتدال کا دین:

اصل میں اسلام اعتدال کا دین ہے جس میں نہ افراط ہے نہ تفریط، نہ غلو اور نہ ہی کمی کوتاہی، اس لیے اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ پاکیزہ چیزوں سے اجتناب کو تقوی اور کمال کا سبب سمجھا جائے اور نہ ہی اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ حرام اور حلال کے فرق ہی کو اٹھا دیا جائے اور بے دریغ ایسی چیزوں کا استعمال شروع کر دیا جائے جنہیں اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

فائدہ: کسی حلال چیز کو اس نیت سے ترک کر دینا کہ اس ترک سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا یہ رہبانیت ہے، جس کو اسلام نے بدعت اور ممنوع قرار دیا ہے اور اگر کسی حلال چیز کو بعض اوقات کسی جسمانی یا نفسانی علاج کی خاطر ترک کر دیا جائے تو یہ مباح ہے داخل بدعت نہیں، جیسے کسی طبیب جسمانی یا روحانی کے کہنے سے بغرض علاج اگر گوشت وغیرہ سے پرہیز کر لیا جائے تو یہ جائز ہے۔ (معارف القرآن ادریسی: ۲/۵۷۸)

تحریم حلال کی ایک عام اور چلی ہوئی صورت یہ ہے کہ کسی جائز لذت سے بہ قصد قربت حق اپنے کو ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا جائے۔ غیر مذہب والے اس عادت کا شکار بہ کثرت ہو چکے ہیں، کسی مسلمان کا ایسی جسارت کرنا گویا اس کا

اقرار کرنا ہے کہ شریعت سے فلاں فلاں پرہیز کے مقرر نہ کرنے میں کمی ہوئی ہے اور اب میں اپنی عقل وتجربہ سے اس فروگذاشت کی تلافی کرر ہا ہوں، کسی جائز چیز سے کسی طبی یا انتظامی مصلحت کی بنا پر دست بردار ہوجانا اور چیز ہے اور بعض بزرگوں سے جو ترک لذات کے سلسلہ میں جو مجاہدے منقول ہیں، سمجھنا چاہیے کہ وہ اسی قبیل سے ہوں گے، کم از کم حسن ظن کا تقاضا تو یہی ہے۔(آیت)''لا تحرموا''، تحریم اعتقادی، تحریم قولی، تحریم عملی کی تینوں صورتوں پر شامل ہے۔(ماجدی:۲/ ۱۲۳)

قسم کے اقسام:

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ .... الی .... كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴿۸۹﴾

اللہ تمہاری لغو قسموں پر تمہاری پکڑ نہیں کرے گا؛ لیکن جو قسمیں تم نے پختگی کے ساتھ کھائی ہوں، ان پر تمہاری پکڑ کرے گا۔ چنانچہ اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے گھر والوں کو کھلایا کرتے ہو، یا ان کو کپڑے دو، یا ایک غلام آزاد کرو۔ ہاں اگر کسی کے پاس (ان چیزوں میں سے) کچھ نہ ہو تو وہ تین دن روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم نے کوئی قسم کھالی ہو (اور اسے توڑ دیا ہو) اور اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو، اسی طرح اللہ اپنی آیتیں کھول کھول کر تمہارے سامنے واضح کرتا ہے، تاکہ تم شکر ادا کرو۔(۸۹)

انسان اپنی بات کو مؤکد کرنے اور قوت پہنچانے کے لئے مختلف الفاظ کا استعمال کرتا ہے، انہیں میں سے ایک قسم بھی ہے، مختلف مذہب کے ماننے والے لوگ قسمیں کھایا کرتے ہیں اور عام طور پر اس میں اپنے عقیدہ کے مطابق مقدس ہستیوں کا حوالہ دیتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے عرب کے لوگ ان دیویوں اور دیوتاؤں کی قسم کھاتے تھے، جن کی وہ پوجا کیا کرتے تھے، اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ ایسے مواقع کو شرک کے بجائے توحید کا مظہر بنا دیتا ہے؛ چوں کہ قسم کھانا انسان کے اندر ایک فطری داعیہ ہے: اس لئے گو اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی؛ لیکن بالکل منع بھی نہیں کیا گیا؛ البتہ اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھانے سے روک دیا گیا؛ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی کو قسم کھانا ہو تو اللہ کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے **من کان حالفاً فلیحلف باللہ أو لیصمت**. (بخاری، باب لا تحلفوا بأباء کم، حدیث:۶۶۱۸) اللہ کی قسم میں لفظ اللہ تو شامل ہے ہی، اللہ کے صفاتی نام جیسے رحمن ورحیم وغیرہ بھی شامل ہیں، قرآن کی قسم کھائی جائے تو قسم ہوگی یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے؛ کیوں کہ ''کلام'' اللہ کی صفت ہے اور قرآن بھی اللہ کا کلام ہے؛ اس لئے بعض فقہاء نے اس سے بھی قسم کھانے کو درست قرار دیا ہے، امام ابوحنیفہؒ کی رائے اگرچہ اس سے مختلف ہے؛ لیکن قسم کے الفاظ میں عرف ورواج کی بڑی اہمیت ہے، اس لئے بعد کے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی قرآن کی قسم کھائے یا قرآن اُٹھا کر کوئی بات کہے تب بھی قسم ہوجائے گی؛ (مجمع الانہر:۱/ ۵۵۴) البتہ اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھائی جائے، جیسے ماں باپ کی، اولاد کی، بزرگوں کی، تو اس کا اعتبار نہیں؛ یہاں تک کہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اگر غیر اللہ کی قسم کھائی جائے تو اس کا اعتبار ہی

نہیں ہے، اور جان بوجھ کر اللہ کے ماسوا کی قسم کھائی ہو تو گنہگار بھی ہوگا، قرآن مجید میں اس بات کا ذکر صراحتاً بھی آیا ہے کہ قسم اللہ ہی کی کھائی جائے؛ (المائدہ: ۵۳) لیکن چوں کہ اسلام کی نظر میں 'یمین' (قسم) نام ہی اللہ کی قسم کھانے کا ہے، اس لئے اس آیت میں اگرچہ صراحتاً اس کا ذکر نہیں، مگر گویا ضمنی طور پر اس کا ذکر موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قسم سے متعلق چار احکام بیان کئے ہیں: پہلا یہ کہ یمین لغو کا کوئی اعتبار نہیں یعنی قسم منعقد نہیں ہوگی اور اس کی وجہ سے کفارہ واجب نہیں ہوگا، یمین لغو سے مراد یہ ہے کہ قسم کھانے کا ارادہ نہیں تھا؛ لیکن بلا ارادہ زبان سے قسم کے الفاظ نکل گئے، اس میں نہ قسم ہوگی اور نہ کفارہ واجب ہوگا، بعض لوگوں کے نزدیک یمین لغو سے مراد یہ ہے کہ گذری ہوئی کسی بات کو سچ جانتے ہوئے قسم کھالے؛ حالاں کہ وہ بات خلافِ واقعہ تھی، اس صورت میں بھی کوئی کفارہ واجب نہیں ہوگا، دوسرا حکم یہ ہے کہ آئندہ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھالے تو اس سے قسم منعقد ہو جاتی ہے (جس کو فقہ کی اصطلاح میں 'یمین منعقدہ' کہتے ہیں)، اگر آئندہ اس قسم پر قائم نہ رہ پائے، یعنی جس بات کے کرنے کی قسم کھائی تھی، اسے نہیں کیا، یا جس سے بچنے کی قسم کھائی تھی اسے کر گذرا تو اس پر کفارہ واجب ہوگا، اس کو فقہ کی اصطلاح میں 'یمین منعقدہ' کہا جاتا ہے، (بدائع الصنائع: ۹/۳) تیسرے: اِس قسم کا کفارہ بیان کیا گیا ہے کہ کفارہ کے طور پر چار عمل کئے جاسکتے ہیں، پہلے تین عمل میں اختیار ہے اور وہ ہے دس مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلانا جو اوسط درجہ کا ہو اور عام طور پر کھایا جاتا ہو اور اتنی مقدار میں ہو کہ وہ آسودہ ہو جائیں، یا دس محتاج شخص کے کپڑے بنانا، یا ایک غلام کو آزاد کرنا، اگر ان تینوں میں سے کسی پر قدرت نہ ہو تو چوتھی صورت یہ ہے کہ تین روزے رکھ لے؛ البتہ یہ تین روزے امام ابوحنیفہؒ کے قول پر مسلسل ہونے چاہئیں، (فتح القدیر: ۷/۶۵) چوتھا حکم قسم کی حفاظت کا دیا گیا کہ آدمی کسی بہتر یا جائز بات کی قسم کھائے، تو اپنی قسم پر قائم رہنے کی کوشش کرنی چاہئے؛ البتہ اگر کسی ناجائز بات کی قسم کھائے تو قسم کا توڑنا واجب ہے، یا وہ شرعاً تو ناجائز نہ ہو؛ لیکن اس کے حالات کے موافق نہ ہو تو قسم کو توڑنے کی گنجائش ہے؛ البتہ دونوں صورتوں میں قسم کو توڑنے کے بعد کفارہ ادا کرنا واجب ہوگا۔ (آسان تفسیر: ۱/۳۹۵)

شراب، جوا اور سٹہ بازی کا حرام ہونا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ ....الی..............فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ ﴿٩١﴾

اے ایمان والو! شراب، جوا، بتوں کے تھان اور جوے کے تیر؛ یہ سب ناپاک شیطانی کام ہیں، لہٰذا ان سے بچو، تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔ (۹۰) شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض کے بیج ڈال دے، اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے۔ اب بتاؤ کہ کیا تم (ان چیزوں سے) باز آجاؤ گے؟ (۹۱)

شراب، جوا، بت اور پانسے قطعی حرام اور شیطانی عمل ہیں، ان کے ذریعے شیطان مومنوں کے دلوں میں بغض وعداوت کے بیج بوتا ہے اور انہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دیتا ہے۔

محرم کے احکام:

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ط ....الی..........وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْٓ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ﴿۹۶﴾

اے ایمان والو! جب تم احرام کی حالت میں ہو تو کسی شکار کو قتل نہ کرو۔ اور اگر تم میں سے کوئی اسے جان بوجھ کر قتل کردے تو اس کا بدلہ دینا واجب ہوگا (جس کا طریقہ یہ ہوگا کہ) جو جانور اس نے قتل کیا ہے، اس جانور کے برابر چوپایوں میں سے کسی جانور کو- جس کا فیصلہ تم میں سے دو دیانت دار تجربہ کار آدمی کریں گے- کعبہ پہنچا کر قربان کیا جائے، یا (اس کی قیمت کا) کفارہ مسکینوں کا کھانا کھلا کر ادا کیا جائے، یا اس کے برابر روزے رکھے جائیں؛ تا کہ وہ شخص اپنے کیے کا بدلہ چکھے۔ پہلے جو کچھ ہو چکا اللہ نے اسے معاف کر دیا، اور جو شخص دوبارہ ایسا کرے گا تو اللہ اس سے بدلہ لے گا، اور اللہ اقتدار اور انتظام کا مالک ہے۔ (۹۵) تمہارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا ہے، تا کہ وہ تمہارے لیے اور قافلوں کے لیے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بنے، لیکن جب تک تم حالت احرام میں ہو تم پر خشکی کا شکار حرام کر دیا گیا ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کی طرف تم سب کو جمع کر کے لے جایا جائے گا۔ (۹۶)

احرام کی حالت میں خشکی کا شکار جائز نہیں، البتہ سمندر اور دریا میں رہنے والے جانوروں کا شکار حالت احرام میں بھی جائز ہے۔

نکتہ: احرام کی حالت میں سمندر کا سفر ہو تو اس دوران شکار کی کتنی اہمیت ہے، خشکی کے سفر کے دوران اگر خوراک کا ذخیرہ ختم ہی ہو جائے تو انسان کسی نہ کسی طرح سے جان بچا سکتا ہے۔ اگر شکار نہ بھی کرے تو درختوں کے پتے اور جڑی بوٹیاں کھا کر بھی کچھ عرصہ تک جسم وروح کا تعلق قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہی صورت آخری سفر کے دوران پیش آجائے تو وہاں سوائے دریائی جانوروں کے خوراک کا کوئی اور ذریعہ میسر نہیں ہوتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے احرام کے دوران دریائی شکار کی اجازت دے دی ہے مگر خشکی کے شکار سے منع فرما دیا ہے۔ (معالم العرفان: ۶/ ۴۱۴)

احرام کی مناسبت سے اللہ تعالی نے بیت الحرام یعنی کعبہ اور شہر حرام کا بھی تذکرہ کیا ہے، یہ کعبہ کی خصوصیت ہے کہ اللہ تعالی نے اسے اور اس کے گرد وپیش کے علاقے کو حرم قرار دیا ہے۔ اس کی حرمت اور امن کا اندازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ہوتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ:

اگر میں اپنے والد خطاب کے قاتل کو بھی حرم میں دیکھ لوں تو اس وقت تک اس پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا جب تک کہ وہ حرم کی حدود سے باہر نہ نکل جائے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

کثرت سوال سے ممانعت:

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ ج وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْھَا حِیْنَ یُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ

تُبۡدَ لَكُمۡ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنۡهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ﴿۱۰۱﴾

اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوالات نہ کیا کرو جو اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں، اور اگر تم ان کے بارے میں ایسے وقت سوالات کرو گے جب قرآن نازل کیا جارہا ہو تو وہ تم پر ظاہر کردی جائیں گی۔ (البتہ) اللہ نے پچھلی باتیں معاف کردی ہیں۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا بردبار ہے۔ (۱۰۱)

ممانعت ایسے سوالات سے ہورہی ہے جو سرتاسر فضول اور لایعنی ہوں، مثلاً لوگوں کے جزئیات زندگی کی بابت سوالات کرتے رہنا۔ سوال دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی معاشی یا معادی ضرورت واقعی پیش آجائے یا اس کے پیش آجانے کا احتمال قوی ہو اور صاحب شریعت سے ادب واحترام کے ساتھ اس کی بابت پوچھ لیا جائے، دوسرے یہ کہ غرض ومقصد صحیح کچھ بھی نہ ہو اور دور دور کے احتمالات پیدا کر کے سوال محض سوال کرنے کی نیت سے کیا جائے تشقیقات اپنے دل سے گڑھے جائیں اور گویا رسول کا امتحان لینے کے لئے سوالات اس کے سامنے پیش کئے جائیں۔ یہاں ذکر اسی آخری قسم کا ہے اور اسی سوال بازی کو ممنوع قرار دیا جارہا ہے۔

(آیت) ان تبدلکم تسؤ کم ناگوار ہونے کی صورتیں مثلاً یہ کہ تمہارے کسی چھپانے والے واقعہ کی پردہ دری ہوجائے اور تمہیں تفضیح ورسوائی کا سامنا کرنا پڑے یا ایسے احکام نازل ہوجائیں جن کی تعمیل تم پر شاق گزرے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت انسؓ صحابی سے روایت آئی ہے کہ ایک شخص نے آکر رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ اچھا یہ بتائیے کہ میرا باپ کون تھا؟ آپ نے فرمایا کہ فلاں شخص، اسی طرح ترمذی وغیرہ میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ جب فرضیت حج کی آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کرنا شروع کردیا کہ یہ ہر سال فرض ہے؟ یہ دو نمونہ ہیں، اس قسم کے بیجا سوالات کے خلاف یہاں تنبیہ کی جارہی ہے۔

”احکام میں جیسا یہ سوال بوجہ افراط ممنوع ہے، واقعات میں یہ سوال موجب تفریط فی الاطاعت والادب بھی ہے؛ چنانچہ بخاری میں یہ بھی ہے کہ استہزاءً پوچھتے تھے، پس آیت سب اقسام سوال کو اور سب اقسام جواب کو شامل ہے۔ گو علت نہی کی کہیں افراط ہوگی، اور ناگواری جواب کا احتمال کہیں تحریم سے ہوگا، کہیں رسوائی سے، کہیں زجر سے اور بعد نزول وحی کے ایسے سوالات سے نہی کی علت اضاعت وقت اور مجیب کو ضیق میں ڈالنا ہے۔“ (تھانویؒ)

(ماجدی: ۲/۱۴۰، ۱۴۱)

مشرکین کے حرام کردہ جانور:

زمانہ جاہلیت میں مشرکین نے بہت سارے جانور بزعم خویش حرام قرار دے رکھے تھے، اور ان کے لیے مخصوص نام بھی تجویز کر رکھے تھے، مثال کے طور پر سائبہ، بحیرہ، وصیلہ اور حام۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنۡۢ بَحِيۡرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيۡلَةٍ وَّلَا حَامٍ ......الی......اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ

شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ۝۱۰۴

اللہ نے کسی جانور کو نہ بحیرہ بنانا طے کیا ہے، نہ سائبہ، نہ وصیلہ اور نہ حامی لیکن جن لوگوں نے کفر اپنایا ہوا ہے وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، اور ان میں سے اکثر لوگوں کو صحیح سمجھ نہیں ہے۔ (۱۰۳) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کلام نازل کیا ہے، اس کی طرف اور رسول کی طرف آؤ، تو وہ کہتے ہیں کہ: ہم نے جس (دین پر) اپنے باپ دادوں کو پایا ہے، ہمارے لیے وہی کافی ہے۔ بھلا اگر ان کے باپ دادے ایسے ہوں کہ نہ ان کے پاس کوئی علم ہو، اور نہ کوئی ہدایت تو کیا پھر بھی (یہ انہی کے پیچھے چلتے رہیں گے؟) (۱۰۴)

بحیرہ، صائبہ، وسیلہ، حامی یہ سب زمانہ جاہلیت کے رسوم وشعائر سے متعلق ہیں۔ مفسرین نے ان کی تفسیر میں بہت اختلاف کیا ہے ممکن ہے ان میں سے ہر ایک لفظ کا اطلاق مختلف صورتوں پر ہوتا ہو، ہم صرف سعید بن المسیب کی تفسیر صحیح بخاری سے نقل کرتے ہیں۔ ''بحیرہ'' جس جانور کا دودھ بتوں کے نام کر دیتے تھے، کوئی اپنے کام میں نہ لاتا تھا۔ ''سائبہ'' جو جانور بتوں کے نام پر ہمارے زمانے کے سانڈھ کی طرح چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ''وصیلہ'' جو اونٹنی مسلسل مادہ بچہ جنے، درمیان میں نر بچہ پیدا نہ ہوا سے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ ''حامی'' نر اونٹ جو ایک خاص عدد سے جفتی کر چکا ہو، اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے۔ علاوہ اس کے کہ یہ چیزیں شعائر شرک میں سے تھیں، جس جانور کے گوشت یا دودھ یا سواری وغیرہ سے منتفع ہونے کو حق تعالیٰ نے جائز رکھا اس کی حلت وحرمت پر اپنی طرف سے قیود لگانا، گویا اپنے لئے منصب تشریع کو تجویز کرنا تھا اور بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ اپنی ان مشرکانہ رسوم کو حق تعالیٰ کی خوشنودی اور قربت کا ذریعہ تصور کرتے تھے، اس کا جواب دیا گیا کہ اللہ نے ہرگز یہ رسوم مقرر نہیں کیں۔ ان کے بڑوں نے خدا پر یہ بہتان باندھا اور اکثر بے عقل عوام نے اسے قبول کرلیا۔ الغرض یہاں تنبیہ کی گئی کہ جس طرح فضول وبے کار سوالات کر کے احکام شرعیہ میں تنگی اور سختی کرانا جرم ہے، اس سے کہیں بڑھ کر یہ جرم ہے کہ بدون حکم شارع کے محض اپنی آراء واہواء سے حلال وحرام تجویز کر لئے جائیں۔ (تفسیر عثمانی: ۱۶۵)

تقلید جامد جاہلوں کا سہارا ہر ملک اور ہر دور میں رہا ہے، کسی صاحب علم کی تقلید اگر اس اعتماد پر کی جائے کہ وہ احکام شریعت کا ماہر ہے۔ تو یہ ممنوع نہیں بلکہ عین مطلوب ہے۔ لیکن آنکھ بند کر کے باپ دادا کی راہ پر اس لئے چلتے رہنا کہ وہ باپ دادا تھے۔ یہ اندھی تقلید محض معصیت ہی نہیں بلکہ بعض اوقات شرک تک پہنچا دیتی ہے۔ اور اسی کا نام رسم پرستی ہے۔ آج ہندوستان کی بڑی آبادی کے پاس نہ کوئی ''کتاب'' ہے نہ کسی ''رسول'' کی تعلیم محفوظ۔ بس رسوم کا ایک مجموعہ ہے۔ جو سینکڑوں، ہزاروں برس ہوئے ہاتھ آ گیا تھا۔ اور اسی طرح اندھا دھند اس کی پوجا ہوتی چلی آ رہی ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں ابطال ہے جاہل صوفیہ کے اس طریقہ کا کہ جب ان کے سامنے شریعت پیش کی جاتی ہے تو اس کے بجائے وہ اپنے مشائخ کے معمولات سے تمسک کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ (ماجدی: ۲/ ۱۴۳)

امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ انسان اکثر تین قسم کے حجابات میں مبتلا ہوتے ہیں۔یعنی حجاب طبع، حجاب رسم اور حجاب سوء معرفت، فرماتے ہیں کہ حجاب طبع سے مراد یہ ہے کہ انسان خواہشات نفسانیہ کے پیچھے لگ جائے اور وہی کرے جو اس کا دل چاہے۔ نیز کھانے پینے اور آرام طلبی میں مصروف رہے۔حجاب رسم یہ ہے کہ انسان اپنے آباواجداد، برادری اور قبیلہ کے رسم و رواج میں مبتلا رہے۔ایسا شخص اپنی زندگی جیسی قیمتی پونجی انہی رسومات باطلہ کی نذر کر دیتا ہے اور حق کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ پھر جب اس دنیا سے جاتا ہے تو آنکھ کھلتی ہے۔اس وقت وہ اپنے آپ کو بالکل خالی دامن پاتا ہے۔ پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ جس چیز پر دارومدار تھا، اس کی طرف تو اس نے اپنی زندگی میں توجہ نہ دی۔شاہ صاحب فرماتے ہیں: حجاب سوء معرفت یہ ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کو مانے مگر غلط طریقے سے۔ یہود و نصاریٰ، بدھ، ہندو وغیرہ سب خدا تعالیٰ کو کسی نہ کسی طریقے پر مانتے ہیں، مگر ماننے کا وہ طریقہ غلط ہے جس کی وجہ سے ان کا ماننا بھی انکار کے مترادف ہے۔(معالم العرفان: ۶/۴۴۱)

انبیاء کی گواہی:

قرآن مجید میں اللہ کی یہ عادت ہے کہ شرائع اور احکام بیان کرنے کے بعد یا تو اپنی ذات وصفات یا انبیاء کرام کے احوال یا قیامت کے احوال بیان فرماتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال اور آخرت کا تذکرہ اور استحضار امتثال احکام میں مدد اور معاون ہو، اس لیے ختم سورت پر قیامت کا حال ذکر فرمایا کہ اس دن تمام انبیاء مجتمع ہوں گے اور ان کی قوموں اور امتوں کی زجر اور توبیخ کے لیے انہی کے سامنے علی روس الاشہاد سوال و جواب ہوں گے، تاکہ امتیں سن لیں اور ڈر جائیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے و اذاالموؤدۃ سئلت بای ذنب قتلت۔ جولڑکی زندہ گاڑی گئی تھی اس سے سوال ہوگا کہ کس گناہ پر ماری گئی، تو سوال تو موؤدہ سے ہوگا مگر اس سوال سے مقصود وائد (یعنی گاڑنے والے) کی توبیخ اور سرزنش ہوگی، اس طرح قیامت کے دن جو انبیاء کرام سے سوال ہوگا تو اس سے مقصود امتوں اور قوموں کی توبیخ اور سرزنش ہوگی، اللہ جل شانہ نے ان آیات میں بالاجمال تمام انبیاء سے سوال کا ذکر فرمایا اور اس کے بعد خاص طور پر عیسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر فرمایا جن کو عیسائیوں نے خدا ٹھہرا رکھا ہے، کیونکہ اوپر سے سلسلہ کلام اہل کتاب کے غلو اور افراط اور تفریط کے متعلق چلا آرہا ہے، اس لیے اللہ نے ان آیات میں عیسیٰ (علیہ السلام) پر اپنے انعامات اور احسانات کا ذکر فرمایا، اس تذکرہ سے اصلی مقصود تو نصاری کے عقائد کی تردید ہے جو انہیں خدا اور خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں، اس لیے کہ دوسری امتوں کا کفر انبیاء کرام کی ذات تک محدود تھا اور نصاری کا کفر حق نبوت سے تجاوز کر کے خدا تعالیٰ کی حد تک پہنچ چکا تھا، اس لیے کہ خداوند قدوس کے لیے بیٹا تجویز کرنا بارگاہ خداوندی میں ایسی عظیم گستاخی ہے کہ جس سے آسمان و زمین کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہے، اس لیے ان آیات میں اصل مقصود تو نصاری کی تردید ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہود کی بھی تردید ہے کہ جو حضرت عیسیٰ کی نبوت و رسالت کے منکر ہیں، اللہ نے ان آیات میں حضرت عیسیٰ پر اپنے انعامات واحسانات کا ذکر فرمایا جس سے ایک

طرف تو ان کا بندہ اور محتاج خدا ہونا ثابت ہوا، اس لیے کہ انعام واحسان اور تائید روح القدس اور حفاظت جبرئیلی اور نزول مائدہ کی ضرورت بندہ کو ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کو اور دوسری طرف ان کا برگزیدہ خدا ہونا ظاہر ہوگیا، اس طرح سے یہود اور نصاریٰ کے غلو اور افراط اور تفریط دونوں کی تردید ہوگئی اور اس کا تذکرہ اور حکایت سے مقصود یہ ہے کہ یہ سن کر نصاریٰ اور یہود دونوں اپنے اپنے کفر اور عناد سے باز آجائیں۔ (تفسیر ادریسی: ۲/ ۶۰۲)

چنانچہ فرماتے ہیں:

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾

وہ دن یاد کرو جب اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا، اور کہے گا کہ تمہیں کیا جواب دیا گیا تھا؟ وہ کہیں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں، پوشیدہ باتوں کا تمام تر علم تو آپ ہی کے پاس ہے۔ (۱۰۹)

حلال وحرام کے ان مسائل کے بعد قیامت کے دن کی منظر کشی کی گئی ہے، جب تمام رسولوں کو جمع کر کے ان سے سوال کیا جائے گا کہ جب تم نے میرا پیغام میرے بندوں تک پہنچایا تو تمہیں کیا جواب دیا گیا۔

حضرت مسیح پر اللہ کے احسانات:

انبیاءؑ کے ساتھ سوال وجواب کے تناظر میں حضرت مسیح علیہ السلام کا خاص طور پر تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سیدنا مسیح علیہ السلام کو اپنے احسانات یاد دلائے گا۔

ان احسانات میں مائدہ والا قصہ بھی مذکور ہے کہ جب حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی تھی کہ آپ اللہ سے درخواست کریں کہ وہ ہمارے لیے آسمان سے مائدہ نازل فرمائے، یعنی ایسا دسترخوان جس میں کھانے پینے کی مختلف آسمانی نعمتیں سجی ہوئی ہوں۔ (خلاصۃ القرآن م اش)

قیامت کے دن حضرت عیسیٰؑ کی گواہی:

اپنے چند احسانات گنوانے کے بعد اللہ تعالیٰ سوال کرے گا ”اے عیسیٰ! مریم کے بیٹے! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو اللہ کے سوا معبود ٹھہراؤ۔“

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ .... الیٰ .... اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

اور (اس وقت کا بھی ذکر سنو) جب اللہ کہے گا کہ: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ دو معبود بناؤ؟ وہ کہیں گے: ہم تو آپ کی ذات کو (شرک سے) پاک سمجھتے ہیں۔ میری مجال نہیں تھی کہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو آپ کو یقینا معلوم ہو جاتا۔ آپ وہ باتیں جانتے ہیں جو میرے دل میں پوشیدہ ہیں اور میں آپ کی پوشیدہ باتوں کو نہیں جانتا۔ یقینا آپ کو تمام چھپی ہوئی باتوں کا پورا پورا علم

ہے۔(۱۱۶) میں نے ان لوگوں سے اس کے سوا کوئی بات نہیں کہی جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا، اور وہ یہ کہ: اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار۔ اور جب تک میں ان کے درمیان موجود رہا، میں ان کے حالات سے واقف رہا۔ پھر جب آپ نے مجھے اٹھالیا تو آپ خود ان کے نگراں تھے، اور آپ ہر چیز کے گواہ ہیں۔(۱۱۷) اگر آپ ان کو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں ہی، اور اگر آپ انہیں معاف فرمادیں تو یقینا آپ کا اقتدار بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل۔(۱۱۸)

حضرت عیسی علیہ السلام بارگاہ جلال میں عرض کریں گے ''تو پاک ہے، میرے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق ہی نہیں تھا۔ پھر عرض کریں گے کہ میں نے تو انہیں ایک اللہ کی عبادت کا حکم دیا تھا، اگر انہوں نے میرے حکم کی نافرمانی کی ہے تو آپ کو اختیار ہے، چاہیں تو انہیں سزا دیں اور چاہیں تو معاف کردیں۔'' (۱۱۶۔۱۱۸) قیامت کے دن کی منظر کشی اور اللہ کی ہمہ گیر سلطنت کے تذکرہ پر سورہ مائدہ اختتام پذیر ہوجاتی ہے۔(خلاصۃ القرآن م اش)

خلاصہ رکوع: ۱۲......دورہ تبلیغ میں افراط و تفریط سے احتراز رہے۔ ماخذ: آیت: ۸۷۔

خلاصہ رکوع: ۱۳......مسلمان جہاں جائیں مرکز اصلی (بیت الحرام) سے تعلق منقطع نہ ہونے پائے۔ ماخذ: آیت: ۹۴، ۹۵، ۹۷۔

خلاصہ رکوع: ۱۴......سوالات لایعنی اور رسوم جاہلیت سے مسلمانوں کو احتراز لازمی ہے۔ ماخذ: آیت: ۱۰۳، ۱۰۱۔

خلاصہ رکوع: ۱۵......قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام بطور شاہد عدل کے پیش ہوں گے۔ ماخذ: آیت: ۱۰۹۔

خلاصہ رکوع: ۱۶......تمنائے انبیاء علیہم السلام بوقت شہادت۔ ماخذ: آیت: ۱۱۸۔

***

سورۃ الانعام

تعارف: یہ سورت چونکہ مکہ مکرمہ کے اس دور میں نازل ہوئی تھی جب آنحضرت ﷺ کی دعوت اسلام اپنے ابتدائی دور میں تھی، اس لیے اس میں اسلام کے بنیادی عقائد یعنی توحید، رسالت اور آخرت کو مختلف دلائل کے ذریعے ثابت کیا گیا ہے اور ان عقائد پر جو اعتراضات کفار کی طرف سے اٹھائے جاتے تھے، ان کا جواب دیا گیا ہے۔ اس دور میں مسلمانوں پر کفار مکہ کی طرف سے طرح طرح کے ظلم توڑے جارہے تھے، اس لیے ان کو تسلی بھی دی گئی ہے۔ کفار مکہ اپنے مشرکانہ عقائد کے نتیجے میں جن بے ہودہ رسموں اور بے بنیاد خیالات میں مبتلا تھے، ان کی تردید فرمائی گئی ہے۔ عربی زبان میں انعام چوپایوں کو کہتے ہیں۔ عرب کے مشرکین مویشیوں کے بارے میں بہت سے غلط عقیدے رکھتے تھے، مثلا ان کو بتوں کے نام پر وقف کرکے ان کا کھانا حرام سمجھتے تھے؛ چونکہ اس سورت میں ان بے بنیاد عقائد کی تردید کی گئی ہے۔

(دیکھیے آیات ۱۳۶ تا ۱۴۶) اس لیے اس کا نام سورۃ الانعام رکھا گیا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چند آیتوں کو چھوڑ کر یہ پوری سورت ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی تھی، لیکن علامہ آلوسیؒ نے اپنی تفسیر روح المعانی میں ان روایتوں پر تنقید کی ہے۔ واللہ سبحانہ اعلم۔ (توضیح القرآن)

سورہ انعام یہ قرآن کریم کی چھٹی سورۃ ہے، ترتیب نزول میں ۵۵ نمبر پر ہے جس میں ۱۲۰ رکوع ۱۶۵ آیات، ۳۱۰۰ کلمات اور کل ۱۲۹۳۵ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے، یہ وہ سورہ ہے جو سب کی سب یک بار نازل ہوئی، سورۂ بقرہ، سورۂ نساء اور مائدہ تو مدینہ آنے کے بعد اور یہ سورۃ ان سے پہلے مکہ میں نازل ہو چکی تھی۔

روابط و خلاصۂ سورۃ:

اس سورۃ کا پہلی سورۃ کے ساتھ ربط یہ ہے کہ سورہ مائدہ کے ختم پر شرک کا ابطال، توحید کا اثبات مع دلائل ذکر کیا گیا تھا، اس سورۃ کے شروع میں بھی یہی مضامین مذکور ہیں، مکہ میں مشرکین عرب کے مقابلہ میں خدا کا وجود ان صفات قاہرہ کے ساتھ بیان ہوتا تھا جن سے تمام عالم میں اس کا قبضہ و تصرف ثابت ہو، نیز مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے جو منکر تھے ان کے مقابلہ میں حشر و نشر کا اثبات کیا جاتا تھا، اور جو لوگ خدا تعالیٰ کے وجود کے منکر تھے صرف دہر کو پیدا کرنے والا اور فنا کرنے والا جانتے تھے، ان کے مقابلہ میں خدا کا وجود اس کے آثار قدرت و حیرت کو نشانیوں سے ثابت کیا جاتا ہے اور نیز عرب یا مکہ کے مشرکین کو جو اپنی دولت و راحت پر گھمنڈ تھا اور باوجود اس کذب و بدکاری کے خدا کے عذاب سے کچھ ڈر نہ تھا، ان کے لئے پہلی قوموں کی ثروت و قدرت اور پھر آیات الٰہی کے انکار کی وجہ سے ان کی ہلاکت بیان کی جاتی تھی، چنانچہ اس سورۃ میں انہیں مضامین کی رعایت ہے اور یہی منصب الہام کا فرض ہے کہ جس خرابی کو دیکھے اس کی اصلاح کی تدبیر کرے چنانچہ **الحمد لله الذي** سے **والنور** تک امر اول کا اثبات ہے اور مشرکوں پر طعن کیا جاتا ہے کہ باوجودیکہ زمین و آسمان اور نور و ظلمت کا خالق خدا کو جانتے ہیں مگر پھر بھی اس کے ساتھ بتوں اور خیالی معبودوں کو اس کے برابر کر دیتے ہیں، **ھو الذی** سے اپنا حشر پر قادر ہونا بیان فرمایا کہ جس نے اول بار تم کو مٹی سے پیدا کیا، کیا وہ دوبارہ زندہ نہیں کر سکتا، پھر شک کیسا؟ **وھو اللہ** سے تیسری بات کا ثبوت ہے کہ دہر اور افلاک خود اس کے حکم کے مسخر ہیں، تم ان میں شب و روز اس کے تصرف دیکھتے ہو، اگر یہ اللہ کا فعل نہیں تو اور کس کا ہے؟ ''**وما یاتیھم**'' سے چوتھی بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان سے پہلے لوگ بھی ایسا کر چکے ہیں پھر ان کی تو ہستی کیا ہے، ہم نے ان کو غارت کر دیا اور ان کی جگہ اور قومیں پیدا کر دیں، ان امور کے بعد دوسرے مضامین تفصیل کے ساتھ ذکر فرمائے گئے ہیں۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

امام قرطبی نے لکھا ہے کہ یہ سورت اصول دین کا ماخذ ہے، علماء نے عقائد کے مسائل اکثر اسی سورت سے مرتب کیے ہیں، امام ابو اسحاق اسفراینی فرماتے ہیں کہ یہ سورت توحید کے اصول اور قواعد پر مشتمل ہے اور چونکہ گذشتہ سورت کا اختتام الوہیت مسیح کے ابطال اور نصاریٰ کی توبیخ پر ہوا تو اس سورت کا افتتاح اور آغاز اثبات توحید سے ہوا اور درمیان میں اثبات

رسالت اور حشر ونشر اور جنت وجہنم کے دلائل بیان فرمائے اور حسب عادت کریمہ درمیان میں انبیاء کرام کے قصے ذکر کیے۔ مثلاً حضرت ابراہیم کا قصہ بیان فرمایا پھر اخیر سورت میں شرک اور رسوم جاہلیت کا ابطال فرمایا اور اس کے مقابلہ میں بعض مکارم اخلاق کو بیان فرمایا اور چونکہ اس سورت میں انعام (جانوروں) کے متعلق مشرکین کی جہالتوں اور رسموں کا بیان ہے اس لیے اس سورت کا نام سورۃ الانعام ہے۔

یا یوں کہو کہ سورہ مائدہ کا زیادہ حصہ اہل کتاب کے محاجہ میں تھا اور اس سورت یعنی سورۃ انعام کا اکثر حصہ مشرکین اور ملحدین کے محاجہ میں ہے جو توحید اور رسالت اور قیامت کے منکر تھے، اس لیے اس سورت میں زیادہ تر توحید اور عدل اور نبوت ورسالت اور مبداء ومعاد اور قیامت کے دلائل بیان کیے گئے اور چونکہ یہ ساری سورت ایک ہی دفعہ نازل ہوئی اور ستر ہزار فرشتوں نے اس کی مشایعت کی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم اصول دین کی شان سب سے بلند ہے اور سب سے پہلے بندہ پر اصول دین کا جاننا اور سیکھنا ضروری ہے۔ (تفسیر کبیر: ۲/۴)

اس سورت میں جن مضامین کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ان کو بنیادی طور پر سات مرکزی موضوعات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱- شرک کا ابطال اور لوگوں کو عقیدہ توحید کی طرف دعوت، توحید اور آخرت کے بعض دلائل کی طرف اشارہ، عقائد شرک سے براءت اور بیزاری۔

۲- عقیدۂ آخرت کی تبلیغ اور واضح دلائل سے اس غلط تصور کی تردید کہ جو کچھ ہے صرف یہی دنیا کی زندگی ہے، اس کے بعد اور کوئی زندگی نہیں۔

۳- اہل عرب جن جاہلانہ رسوم اور توہمات میں گرفتار تھے، ان کا رد اور اس امر کی وضاحتیں کہ ان کا عقل اور مذہب کسی سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے، مشرکین نے اپنے مشرکانہ عقائد کی بنا پر کھیتی اور چوپایوں میں سے جن چیزوں کو از خود حرام ٹھہرا لیا تھا ان کی مذمت۔

۴- ان مرکزی اور بنیادی اصول اخلاق کی تلقین جن پر اسلام ایک پاکیزہ اور متوازن معاشرے کی تعمیر کرنا چاہتا تھا۔

۵- نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی دعوت کے خلاف مشرکین کے اعتراضات کے جوابات، نیز آپ کو تسلی کہ کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی ان جھٹلانے والوں کو قائل نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ راہ راست پر آنے والے نہیں ہیں۔

۶- طویل جدوجہد کے باوجود حسب دل خواہ، دعوت حق کی پذیرائی اور نتیجہ خیز نہ ہونے سے حضور علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو جو اضطراب اور دل شکستگی ہو رہی تھی اس پر انہیں تسلی۔

۷- منکرین اور مخالفین کو ان کی غفلت اور قبول حق سے روگردانی پر نصیحت اور تنبیہ وتہدید، یہ وضاحت کہ ان جھٹلانے والوں کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب یہ دوزخ کے کنارے کھڑے ہوں گے، اس وقت اپنی بدبختی اور محرومی

کا ماتم کریں گے ؛لیکن کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔(قرآن ایک نظر میں:۶۵)

ایک ہی رات میں پوری سورت آپ ﷺ کے قلب پر اتری ؛ جبکہ دوسری سورتیں تھوڑی تھوڑی اتریں،اسی وقت ستر ہزار فرشتے بلند آواز سے تسبیح پڑھ رہے تھے،اس سورت کے مضمون کو دریافت کرنے کے لیے ہمارا تجسس بڑھتا ہے،سورت توحید سے شروع ہوتی ہے،غیر اللہ سے نفرت بڑھاتی ہے۔اثبات توحید اور ابطال شرک کے بارے میں آیات میں بار بار ذکر آتا ہے۔

یہ سورت بت پرستوں اور مادیت کے منکروں دونوں کو اللہ تعالیٰ کی قدرت، طاقت اور عظمت کو ظاہر کرتی ہے،مسلمانوں کا ایمان بڑھاتی ہے،اور اس میں ملحد سائنس دانوں کو سائنسی زبان میں جواب ہے اور نام نہاد مسلمانوں کو دل سے ایمان لانے کی ترغیب ہے،سورۂ مائدہ کی آخری آیت میں زمین وآسمان اور اس میں موجود ہر چیز کا اختیار اللہ پاک کو ہے اس کا ذکر تھا،سورہ انعام کی پہلی آیت کہ: تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے،اسی موضوع کو تمہید (دیباچہ) کے طور پر بیان کرتی ہے۔

اس سورت میں زیادہ تر آیات دو الفاظ ''قل'' اور ''ھو'' سے شروع ہوتی ہیں۔دونوں کے درمیان کیا رشتہ ہے؟لفظ ''ھو'' سے شروع ہونے والے آیتوں میں اللہ کی قدرت کا ذکر ایک طریقے سے نظر آئے گا،جبکہ لفظ ''قل'' کافروں کو مخاطب کرنے کے لیے آپ ﷺ کو کہا گیا ہے۔لفظ قل والی آیات کافروں کے شکوک کو دور کرنے اور ایمان وتوحید کی مٹھاس سے دل کو سرابور کرنے کے لیے بیان کی گئی ہیں۔

قدرت کا ذکر پہلی تین آیات میں ہے،پھر بھی کفار کا انکار، ان کی گمراہی اور آیت اللہ کا مقابلہ کرنے کی جرأت کو واضح کرتا ہے۔(خواطر)

یہ مکی سورت ہے،مکی سورتوں میں عام طور پر تین بنیادی عقائد سے بحث کی جاتی ہے یعنی توحید، رسالت اور آخرت۔

اللہ پاک کی وسیع قدرت:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ........ الیٰ ......يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ۝۳

تمام تعریفیں اللہ کی ہیں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا،اور اندھیریاں اور روشنی بنائی پھر بھی جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے وہ دوسروں کو (خدائی میں) اپنے پروردگار کے برابر قرار دے رہے ہیں۔(۱) وہی ذات ہے جس نے تم کو گیلی مٹی سے پیدا کیا، پھر (تمہاری زندگی کی) ایک میعاد مقرر کردی،اور (دوبارہ زندہ ہونے کی) ایک متعین میعاد اسی کے پاس ہے پھر بھی تم شک میں پڑے ہوئے ہو۔(۲) اور وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے، اور زمین میں بھی۔ وہ تمہارے چھپے ہوئے بھید بھی جانتا ہے اور کھلے ہوئے حالات بھی،اور جو کچھ کمائی تم کررہے ہو،اس سے بھی واقف ہے۔(۳)

فائدہ:

امام رازی فرماتے ہیں: کلمہ **الحمدللہ** پانچ سورتوں کے شروع میں مذکور ہے؛ اول سورۂ فاتحہ، دوم اس سورت کے شروع میں **الحمدللہ الذی خلق السماوات والارض** ۔سوم سورۂ کہف کے شروع میں **الحمدللہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب** ۔ چہارم سورۂ سباء کے شروع میں **الحمدللہ الذی لہ مافی السماوات ومافی الارض**، پنجم سورۂ فاطر **الحمدللہ فاطر السماوات والارض** ۔آیت۔

نکتہ اس میں یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کے شروع میں تحمید عام کا ذکر تھا اور اس کے بعد چار سورتوں میں تحمید خاص کا ذکر ہے جو اسی تحمید عام کا ایک فرد یا جزئی ہے اس لیے کہ **الحمدللہ رب العالمین** میں تمام عالمین کی ربوبیت کا ذکر ہے اور عالم سے مراد جمیع ماسوی اللہ ہے جس میں ہر موجود داخل ہے اور آسمان وزمین کا پیدا کرنا اور بندوں کی تربیت کے لیے آسمان سے کتاب نازل کرنا وغیرہ وغیرہ یہ سب اسی تحمید عام کے تحت میں مندرج ہیں۔ (تفسیر کبیر: ۳/ ۴ بحوالہ ادریسی)۔

قرآن کریم کی مذاق کرنے والوں کو تنبیہ:

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ.......الی.....وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ۝۶

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں، ان کو ہم نے زمین میں وہ اقتدار دیا تھا جو تمہیں نہیں دیا۔ ہم نے ان پر آسمان سے خوب بارشیں بھیجیں، اور ہم نے دریاؤں کو مقرر کر دیا کہ وہ ان کے نیچے بہتے رہیں؛ لیکن پھر ان کے گناہوں کی وجہ سے ہم نے ان کو ہلاک کر ڈالا اور ان کے بعد دوسری نسلیں پیدا کیں۔

اللہ پاک کی قدرت کی نشانیوں کے ذریعہ شرک سے روکنا اور تکلیف اور راحت کا اس کے قبضہ میں ہونا:

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ........الی......اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۝۲۰

اور رات اور دن میں جتنی مخلوقات آرام پاتی ہیں، سب اسی کے قبضے میں ہیں اور وہ ہر بات کو سنتا، ہر چیز کو جانتا ہے۔ (۱۳) کہہ دو کہ: کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو رکھوالا بناؤں؟ (اس اللہ کو چھوڑ کر) جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اور جو سب کو کھلاتا ہے، کسی سے کھاتا نہیں؟ کہہ دو کہ: مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ فرمانبرداری میں سب لوگوں سے پہل کرنے والا میں بنوں اور تم مشرکوں میں ہرگز شامل نہ ہونا۔ (۱۴) کہہ دو کہ: اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک زبردست دن کے عذاب کا خوف ہے۔ (۱۵) جس کسی شخص سے اس دن وہ عذاب ہٹا دیا گیا، اس پر اللہ نے بڑا رحم کیا، اور یہی واضح کامیابی ہے۔ (۱۶) اگر اللہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچائے تو خود اس کے سوا اسے دور کرنے والا کوئی نہیں، اور اگر وہ تمہیں کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہی ہے۔ (۱۷) اور وہ اپنے بندوں کے اوپر مکمل اقتدار رکھتا ہے، اور وہ حکیم بھی ہے، پوری طرح باخبر بھی (۱۸) کہو: کون سی چیز ایسی ہے جو (کسی بات کی) گواہی دینے کے لیے سب سے اعلی درجے کی ہو؟ کہو: اللہ (اور وہی) میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور مجھ پر یہ قرآن وحی کے طور پر اس لیے نازل کیا

گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے میں تمہیں ڈراؤں، اور ان سب کو بھی جنہیں یہ قرآن پہنچے، کیا سچ مچ تم یہ گواہی دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ اور بھی معبود ہیں؟ کہہ دو کہ: میں تو ایسی گواہی نہیں دوں گا۔ کہہ دو کہ: وہ تو صرف ایک خدا ہے اور جن جن چیزوں کو تم اس کی خدائی میں شریک ٹھہراتے ہو، میں ان سب سے بیزار ہوں۔(۱۹) جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ ان کو (یعنی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو) اس طرح پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں (پھر بھی) جن لوگوں نے اپنی جانوں کے لیے گھاٹے کا سودا کر رکھا ہے، وہ ایمان نہیں لاتے۔(۲۰)

مطلب یہ ہے کہ الوہیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ قدرت کاملہ اور قہر تام ہو کہ اس پر کسی کا زور نہ چل سکے اور علم عام اور محیط ہو اور ہر نفع اور ضرر کا مالک ہو اور ایسی ذات والا صفات کو چھوڑ کر کسی کو معبود اور کارساز بنانا حماقت نہیں تو کیا ہے۔(ادریسی: ۲/ ۶۳۸)

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور معاد کا تصور دو بنیادی چیزیں ہیں۔ اللہ کی وحدانیت کا انکار کرنا بہت بڑا جرم ہے، اسی طرح معاد کا انکار بھی کفر ہے، یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کا تصور پیش کرنے کے بعد معاد کا ذکر فرمایا ہے۔ **لیجمعنکم الی یوم القیمة لا ریب فیه.** وہ تمہیں ضرور قیامت کے دن اکٹھا کرے گا کہ جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ اگر معاد پر یقین آجائے اور انسان جان لے کہ حساب کتاب کی منزل آنے والی ہے تو پھر وہ بغاوت اور سرکشی پر نہیں اتر سکتا۔(معالم العرفان: ۷/ ۵۵)

تیسرے رکوع میں میدان حشر کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور عدالت الٰہی میں کفار و مشرکین کی حاضری اور سوال و جواب کی کیفیت بیان کی گئی ہے اور جب تمام خلائق کو جمع کیا جائے گا اور مشرکین سے پوچھا جائے گا کہ اب وہ تمہارے معبودان باطلہ کہاں ہیں؟

اور اعمال کی باز پرسی کا منظر مؤثر لفظوں میں کھینچا گیا ہے کہ کس طرح یہ مشرکین مجرمانہ حیثیت سے نادم و شرمندہ کھڑے ہوں گے اور ان کے حق میں یہ ہی فیصلہ ہوگا کہ اب اپنے انکار و تکذیب کی بدولت عذاب جہنم کا مزا چکھو۔

اس کے بعد دنیاوی زندگی کی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ دنیاوی زندگی تو ایک کھیل، تماشے کے سوا کچھ نہیں اور یقین جانو کہ جو لوگ تقوی اختیار کرتے ہیں ان کے لئے آخرت والا گھر کہیں زیادہ بہتر ہے (آیت نمبر ۳۲)

منکرین قیامت کو تنبیہ:

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ .... الیٰ....... وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

حقیقت یہ ہے کہ بڑے خسارے میں ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے جا ملنے کو جھٹلایا ہے، یہاں تک کہ جب قیامت اچانک ان کے سامنے آ کھڑی ہوگی تو وہ کہیں گے: ہائے افسوس! کہ ہم نے اس (قیامت) کے بارے میں بڑی

کوتاہی کی ۔اور وہ (اس وقت) اپنی پیٹھوں پر اپنے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے ہوں گے ۔(لہذا) خبر دار رہو کہ بہت برا بوجھ ہے جو یہ لوگ اٹھا رہے ہیں ۔(۳۱)اور دنیوی زندگی تو ایک کھیل تماشے کے سوا کچھ نہیں اور یقین جانو کہ جو لوگ تقوی اختیار کرتے ہیں ،ان کے لیے آخرت والا گھر کہیں زیادہ بہتر ہے۔تو کیا اتنی سی بات تمہاری عقل میں نہیں آتی ؟

مکذبین کی تکذیب پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رنجیدہ خاطر ہونا اور آپ کو تسلی :

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ........الی........وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ﴿۳۴﴾

(اے رسول) ہمیں خوب معلوم ہے کہ یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے، کیونکہ دراصل یہ تمہیں نہیں جھٹلاتے ، بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں (۳۳)اور حقیقت یہ ہے کہ تم سے پہلے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا گیا ہے۔ پھر جس طرح انہیں جھٹلایا گیا اور تکلیفیں دی گئیں، اس سب پر انہوں نے صبر کیا، یہاں تک کہ ہماری مدد ان کو پہنچ گئی اور کوئی نہیں ہے جو اللہ کی باتوں کو بدل سکے اور (پچھلے) رسولوں کے کچھ واقعات آپ تک پہنچ ہی چکے ہیں ۔(۳۴)

فانهم لا يكذبونك ’’بیشک یہ لوگ آپ کی تکذیب نہیں کرتے‘‘ کیونکہ جب مشرکین مکہ سے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات مبارکہ کے بارے میں پوچھا جاتا تو کہتے بڑا سچا ہے۔

معرکہ بدر کے دوران اخنس بن شریق نامی مشرک نے ابوجہل سے پوچھا تھا کہ خدارا یہ تو بتاؤ،کیا محمد واقعی جھوٹا ہے؟ تو ابوجہل کہنے لگا ’’نہیں‘‘ وہ سچا ہے۔اس نے کہا: پھر اس کی مخالفت پر کیوں تلے بیٹھے ہو؟ تو کہنے لگا ’’قصی ابن کلاب کے خاندان میں پہلے سے لواء بھی موجود ہے حجابت بھی ان کے پاس ہے اور سقایت بھی ہے اور اب اگر نبوت بھی انہی کے پاس چلی گئی تو باقی قریش کہاں جائیں گے؟ معلوم ہوا کہ ان کی مخالفت محض چودھراہٹ کے لئے تھی؛ وگرنہ دل سے وہ حضور کو بالکل سچا سمجھتے تھے قرآن پاک کے بیان کے مطابق بعض لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ ہم آپ کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ جو پروگرام آپ لائے ہیں وہ جھوٹا ہے ہم اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ دنیا میں حب مال اور حب جاہ ہی ساری خرابیوں کا باعث بنتی ہیں ۔حب مال سے حلال حرام کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور انسان ہر قسم کے ظلم وستم پر اتر آتا ہے۔اسی طرح حب جاہ کی خواہش دنیا میں بدامنی کا باعث بنتی ہے ہر ملک شہر اور گھر میں حب جاہ ہی کی جنگ لڑی جارہی ہے۔اور پھر بین الاقوامی سطح پر بھی ہر ملک دوسرے کو زیر کر کے دنیا پر تسلط جمانا چاہتا ہے۔فرعون ،نمرود ،قیصر وکسریٰ بھی اسی لعنت میں گرفتار تھے اور ابوجہل بھی اسی برائی کی خاطر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی کہ آپ دل برداشت نہ ہوں، درحقیقت ان لوگوں کی مخالفت آپ کی ذات سے نہیں بلکہ وحی الٰہی کے پروگرام کے ساتھ ہے۔

(معالم العرفان: ۷/ ۹۹-۱۰۱)

مصیبت میں کس کو پکارتے ہو؟

ابتداء سورت سے اثبات توحید اور ابطال شرک کا مضمون چلا آ رہا ہے، اب ایک خاص طریقہ پر اثبات توحید فرماتے ہیں، مشرکین عرب بتوں کو خدائی کا کارکن سمجھتے تھے مگر جب کوئی مصیبت آن پڑتی تو اللہ ہی کو پکارتے تھے اور اسی سے دعا مانگتے تھے، مقصود یہ ہے کہ جب یہ جانتے ہو کہ نفع ونقصان سب ہمارے ہی اختیار میں ہے اور تمہارے ان بتوں کا کوئی اختیار نہیں تو پھر کیوں ان کی عبادت کرتے ہو، صرف ہماری پرستش کیوں نہیں کرتے؟ (ادریسی: ۲/ ۶۵۲)

چنانچہ فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ...... الیٰ...... اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾

اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے وہ اندھیروں میں بھٹکتے بھٹکتے بہرے اور گونگے ہو چکے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے، (اس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے) گمراہی میں ڈال دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔ (۳۹) (ان کافروں) سے کہو: اگر تم سچے ہو تو ذرا یہ بتاؤ کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آ جائے، یا تم پر قیامت ٹوٹ پڑے، تو کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے؟ (۴۰) بلکہ اسی کو پکارو گے، پھر جس پریشانی کے لیے تم نے اسے پکارا ہے، اگر وہ چاہے گا تو اسے دور کر دے گا، اور جن (دیوتاؤں) کو تم اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو (اس وقت) ان کو بھول جاؤ گے۔ (۴۱)

آیت نمبر ۴۰، ۴۱ میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب فرمایا کہ آپ ان لوگوں سے جو خدا کا شریک بتاتے ہیں پوچھئے کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آئے یا قیامت ہی آ جائے تو اس وقت تم اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے؟ ایسے سخت وقت میں تو مشرکین بھی اللہ کو ہی پکارنے لگتے تھے اور جن کو شریک ٹھہراتے تھے ان سب کو بھول جاتے تھے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ جب مصیبت کے وقت اللہ کو پکارتے ہو تو خوشحالی اور راحت کے اوقات میں بھی اسی کو پکارنا چاہئے۔

اللہ تعالی نے پچھلی امتوں کے ساتھ یہ معاملہ فرمایا ہے کہ انہیں متنبہ کرنے کے لئے انہیں کچھ سختیوں میں بھی مبتلا فرمایا، تا کہ وہ لوگ جن کے دل سختی کی حالت میں بھی نرم پڑے ہیں سوچنے سمجھنے کی طرف مائل ہو سکیں، پھر ان کو خوب خوشحالی عطا فرمائی، تا کہ جو لوگ خوشحالی میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں وہ کچھ سبق لے سکیں، جب دونوں حالتوں میں لوگ گمراہی پر قائم رہے تب ان پر عذاب نازل کیا گیا۔

بدنی اعضاء میں غور وفکر کرو:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ .... الیٰ.......... هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

(اے پیغمبر! ان سے) کہو: ذرا مجھے بتاؤ کہ اگر اللہ تمہاری سننے کی طاقت اور تمہاری آنکھیں تم سے چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے، تو اللہ کے سوا کونسا معبود ہے جو یہ چیزیں تمہیں لا کر دیدے؟ دیکھو ہم کیسے کیسے مختلف طریقوں سے دلائل بیان کرتے ہیں، پھر بھی یہ لوگ منہ پھیر لیتے ہیں۔ (۴۶) کہو: ذرا یہ بتاؤ کہ اگر اللہ کا عذاب تمہارے

پاس اچانک آئے یا اعلان کر کے، دونوں صورتوں میں کیا ظالموں کے سوا کسی اور کو ہلاک کیا جائے گا؟ (۴۷)

قریش مکہ کا غرباء کو مجلس سے اٹھانے کی شرط:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ ...... الی .... فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴿۵۲﴾

اور ان لوگوں کو اپنی مجلس سے نہ نکالنا جو صبح وشام اپنے پروردگار کو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پکارتے رہتے ہیں۔ ان کے حساب میں جو اعمال ہیں ان میں سے کسی کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے، اور تمہارے حساب میں جو اعمال ہیں ان میں سے کسی کی ذمہ داری ان پر نہیں ہے جس کی وجہ سے تم انہیں نکال باہر کرو، اور ظالموں میں شامل ہو جاؤ۔

یہ آیت قریش کے بعض مغرور اور متکبر سرداروں کے بارے میں نازل ہوئی، ایک مرتبہ سرداران قریش نے نبی پاک (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ آپ کی مجلس میں ہمیشہ فقیر اور غلام ہوتے ہیں جیسے بلال اور صہیب اور عمار اور مقداد اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین، ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم آپ کے پاس آ کر بیٹھیں اور آپ کی باتیں سنیں لیکن آپ کے پاس رذیل لوگ بیٹھتے ہیں اور ہم اشراف قریش ہیں، ہمارا ان کے ساتھ مل کر بیٹھنا ہمارے لیے عیب اور عار ہے، اس لیے ہم جب آپ کے پاس آیا کریں تو آپ اپنی مجلس سے ان لوگوں کو اٹھا دیا کریں، نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خیال اس طرف ہوا کہ سرداران قریش کی یہ درخواست منظور کر لی جائے، شاید اس بہانہ سے یہ لوگ اسلام میں داخل ہو جائیں اور حضرت عمر نے بھی یہی مشورہ دیا کہ یا رسول اللہ ایسا کر کے دیکھیے تو سہی کہ سرداران قریش اس کے بعد کیا کرتے ہیں؟ یعنی امتحاناً ان کی یہ درخواست منظور کر لی جائے (معاذ اللہ) اس سے درویشان اسلام اور فقراء مسلمین کی تحقیر مقصود نہ تھی، بلکہ رؤساء قریش کی تالیف قلب بامید ہدایت مقصود تھی اور چونکہ خود صحابہ کو اس کا علم تھا، اس لیے اس سے ان کی دل شکنی بھی نہ ہوتی، یہ رائے ابھی خیال ہی کے درجہ میں تھی کہ عمل کی نوبت ہی نہیں آئی تھی ابھی اس بارے میں یہ آیتیں نازل ہوگئی اور اللہ کی طرف سے ممانعت آ گئی کہ آپ ہرگز ایسا نہ کریں۔ (تفسیر قرطبی: ۴۳۱/۶، وتفسیر کبیر: ۵۰/۴)

اور بذریعہ وحی آپ کو بتلا دیا گیا کہ یہ تدبیر نافع نہیں اور حکم آ گیا کہ آپ ان متکبرین کی تبلیغ کی خاطر اپنی مجلس سے درویشان اسلام کو جدا نہ کیجئے، بلکہ یہ درویش جب آپ کی مجلس میں حاضر ہوں تو ان کو سلام کیجئے اور اللہ کی رحمت کی بشارت ان کو سنا دیجئے، یہ لوگ اگرچہ غریب اور فقیر ہیں، مگر حق کے طالب صادق ہیں، ان کی خاطر داری اور تالیف قلوب روساء کفار کی تالیف پر ہزار ہا درجہ مقدم ہے، اس آیت سے مقصود یہ بتلانا ہے کہ نیکوں اور بزرگوں کا احترام اور ان کی ایذا رسانی اور تحقیر اور گرانی خاطر سے اجتناب غایت درجہ ضروری اور لازم ہے۔ (ادریسی: ۲۶۰/۲)

آسمان وزمین میں کوئی چیز اللہ پاک کی نگاہ سے اوجھل نہیں:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ .... الی لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴿۶۷﴾

اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور خشکی اور سمندر میں جو کچھ ہے وہ اس سے واقف

ہے، کسی درخت کا کوئی پتہ نہیں گرتا جس کا اسے علم نہ ہو، اور زمین کی اندھیریوں میں کوئی دانہ یا کوئی خشک یا تر چیز ایسی نہیں ہے جو ایک کھلی کتاب میں درج نہ ہو۔(۵۰) اور وہی ہے جو رات کے وقت (نیند میں) تمہاری روح (ایک حد تک) قبض کرلیتا ہے اور دن بھر میں تم نے جو کچھ کیا ہوتا ہے، اسے خوب جانتا ہے، پھر اس (نئے دن) میں تمہیں زندگی دیتا ہے، تاکہ (تمہاری عمر کی) مقررہ مدت پوری ہوجائے۔ پھر اسی کے پاس تم کو لوٹ کر جانا ہے۔ اس وقت وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا کیا کرتے تھے۔(۶۰) وہی اپنے بندوں پر مکمل اقتدار رکھتا ہے اور تمہارے لیے نگہبان (فرشتے) بھیجتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے اس کو پورا پورا وصول کرلیتے ہیں، اور وہ ذرا بھی کوتاہی نہیں کرتے۔(۶۱) پھر ان سب کو اللہ کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جو ان کا مولائے برحق ہے۔ یاد رکھو! حکم اسی کا چلتا ہے اور وہ سب سے زیادہ جلدی حساب لینے والا ہے۔(۶۲) کہو: خشکی اور سمندر کی تاریکیوں سے اس وقت کون تمہیں نجات دیتا ہے جب تم اسے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارتے ہو، (اور یہ کہتے ہو کہ) اگر اس نے ہمیں اس مصیبت سے بچالیا تو ہم ضرور بالضرور شکرگزار بندوں میں شامل ہوجائیں گے۔(۶۳) کہو: اللہ ہی تمہیں اس مصیبت سے بھی بچاتا ہے اور ہر دوسری تکلیف سے بھی، پھر بھی تم شرک کرتے ہو؟(۶۴) کہو کہ: وہ اس بات پر پوری طرح قدرت رکھتا ہے کہ تم پر کوئی عذاب تمہارے اوپر سے بھیج دے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے (نکال دے) یا تمہیں مختلف ٹولیوں میں بانٹ کر ایک دوسرے سے بھڑا دے، اور ایک دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھادے۔ دیکھو! ہم کس طرح مختلف طریقوں سے اپنی نشانیاں واضح کررہے ہیں تاکہ یہ کچھ سمجھ سے کام لے لیں۔(۶۵) اور (اے پیغمبر) تمہاری قوم نے اس (قرآن) کو جھٹلایا ہے، حالانکہ وہ بالکل حق ہے۔ تم کہہ دو کہ: مجھ کو تمہاری ذمہ داری نہیں سونپی گئی (۶۶) ہر واقعے کا ایک وقت مقرر ہے، اور جلد ہی تمہیں سب معلوم ہوجائے گا۔(۶۷)

یہاں دنیوی مصائب کی تین عام ومتعارف صورتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ایک (آیت) ''**عذابا من فوقکم**'۔ یعنی اوپر سے آنے والا عذاب۔ جیسے پتھر، آندھی، طوفان وغیرہ۔ ایک تفسیر ظالم حاکموں سے بھی آئی ہے۔

دوسرے (آیت) ''**من تحت ارجلکم**'' یعنی نیچے سے آنے والا عذاب، زلزلہ، سیلاب وغیرہ اس کی کھلی ہوئی مثالیں ہیں۔ مجازاً سرکش رعایا یا نافرمان غلام بھی مراد لئے گئے ہیں۔

(آیت) ''**یذیق بعضکم باس بعض**''۔ تیسری قسم عذاب الٰہی کی یہ بیان ہوئی ہے کہ گروہ کو گروہ سے بھڑا دیا جائے اور انسان کا ملک الموت انسان کو بنا دیا جائے۔ یہ عذاب دوسرے آسمانی اور زمینی عذابوں سے گھٹ کر نہیں، کچھ بڑھ ہی کر ہے۔ (ماجدی: ۲/ ۲۰۴)

قادر مطلق ذات کو چھوڑ کر بے جان کی عبادت کتنی بڑی بے وقوفی!

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا .... الی .... وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾

(اے پیغمبر) ان سے کہو: کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کو پکاریں جو ہمیں نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہیں، نہ نقصان اور

جب اللہ ہمیں ہدایت دے چکا ہے تو کیا اس کے بعد بھی ہم الٹے پاؤں پھر جائیں؟ (اور) اس شخص کی طرح (ہو جائیں) جسے شیطان بہکا کر صحرا میں لے گئے ہوں، اور وہ حیرانی کے عالم میں بھٹکتا پھرتا ہو، اس کے کچھ ساتھی ہوں جو اسے ٹھیک راستے کی طرف بلا رہے ہوں کہ ہمارے پاس آجاؤ، کہو کہ: اللہ کی دی ہوئی ہدایت ہی صحیح معنی میں ہدایت ہے، اور ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم رب العالمین کے آگے جھک جائیں۔ (۷۱)

خالص توحید کی طرف رہنمائی کرنے والا کا واقعہ:

ابتداء سورت سے اثبات توحید اور ابطال شرک کا سلسلہ چلا آرہا ہے، اب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا قصہ ذکر کرتے ہیں جو مشرکین اور اہل کتاب سب کے نزدیک مسلم بزرگ تھے، اس لیے ان کا مناظرہ ذکر کیا تا کہ سب پر حجت ہو جائے، حضرت ابراہیم کی قوم بت پرستی کے ساتھ کواکب پرست یعنی ستارہ پرست بھی تھی، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ موت اور حیات، سعادت اور نحوست، فتح وظفر اور شکست اور ہزیمت یہ تمام تغیرات عالم تاثیر کواکب کا نتیجہ ہیں اس لیے ان کی خوشنودی کے لیے ان کی پرستش ضروری ہے، غرض یہ کہ کوئی بتوں اور مورتیوں کو پوجتا تھا اور کوئی ستاروں کو اپنا رب ٹھہرائے ہوئے تھا، حضرت ابراہیم نے ان کے اس عقیدہ فاسدہ کی تردید کی اور جس طرح ان کے سفلی معبودوں کی تردید کی اسی طرح ان کی علوی معبودوں کا بھی رد فرمایا۔ (ادریسی: ۲/ ۶۷۹) چنانچہ فرماتے ہیں:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ ....الی.......... نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ۗ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿٨٣﴾

اور (اس وقت کا ذکر سنو) جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا کہ: کیا آپ بتوں کو خدا بنائے بیٹھے ہیں؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ اور آپ کی قوم کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ (۷۴) اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا نظارہ کراتے تھے، اور مقصد یہ تھا کہ وہ مکمل یقین رکھنے والوں میں شامل ہوں۔ (۷۵) چنانچہ جب ان پر رات چھائی تو انہوں نے ایک ستارا دیکھا۔ کہنے لگے: یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ ڈوب گیا، تو انہوں نے کہا: میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۷۶) پھر جب انہوں نے چاند کو چمکتے دیکھا تو کہا کہ: یہ میرا رب ہے۔ لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہنے لگے: اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ دیتا تو میں یقینا گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں۔ (۷۷) پھر جب انہوں نے سورج کو چمکتے دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے۔ یہ زیادہ بڑا ہے۔ پھر جب وہ غروب ہوا تو انہوں نے کہا: اے میری قوم! جن جن چیزوں کو تم اللہ کی خدائی میں شریک قرار دیتے ہو، میں ان سب سے بیزار ہوں۔ (۷۸) میں نے تو پوری طرح یکسو ہو کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ (۷۹) اور (پھر یہ ہوا کہ) ان کی قوم نے ان سے حجت شروع کر دی۔ ابراہیم نے (ان سے) کہا: کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں حجت کرتے ہو جبکہ اس نے مجھے ہدایت دے دی ہے؟ اور جن چیزوں کو تم اللہ کے ساتھ شریک مانتے ہو، میں ان سے نہیں ڈرتا

(کہ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچا دیں گی) الا یہ کہ میرا پروردگار (مجھے) کچھ (نقصان پہنچانا) چاہے (تو وہ ہر حال میں پہنچے گا) میرے پروردگار کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کیا تم پھر بھی کوئی نصیحت نہیں مانتے؟ (۸۰) اور جن چیزوں کو تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے، میں ان سے کیسے ڈر سکتا ہوں جبکہ تم ان چیزوں کو اللہ کا شریک ماننے سے نہیں ڈرتے جن کے بارے میں اس نے تم پر کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے؟ اب اگر تمہارے پاس کوئی علم ہے تو بتاؤ کہ ہم دو فریقوں میں سے کون بے خوف رہنے کا زیادہ مستحق ہے؟ (۸۱) (حقیقت تو یہ ہے کہ) جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے اپنے ایمان کے ساتھ کسی ظلم کا شائبہ بھی آنے نہیں دیا، امن اور چین تو بس انہی کا حق ہے، اور وہی ہیں جو صحیح راستے پر پہنچ چکے ہیں۔ (۸۲) یہ ہماری وہ کامیاب دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلے میں عطا کی تھی۔ ہم جس کے چاہتے ہیں درجے بلند کر دیتے ہیں۔ بیشک تمہارے رب کی حکمت بھی بڑی ہے، علم بھی کامل ہے۔ (۸۳)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں سبق:

جب انسان اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین کے ساتھ مطیع (فرمانبردار) بن جاتا ہے تو اس کے لیے تمام پریشانیوں اور مشکلات کا مقابلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے، وہ محبت اور عشق کے تمام امتحانوں میں کامیاب ہوتا ہے، پھر وہ آگ کا عذاب بھی بغیر کسی خطرے کے سہہ لیتا ہے، اس کے لیے سمندر میں چھلانگ لگانا بھی آسان ہو جاتا ہے اور پھانسی کے پھندے پر بھی بغیر کسی خوف کے چڑھ جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام اور نیک بندوں کی زندگیاں ہمارے سامنے زندہ مثال ہیں۔

حق کے حامی کو حق اس طرح دلیلوں کے ساتھ پیش کرنا چاہیے کہ فریق کے دل میں وہ بات اتر جائے اور خواہ وہ زبانی حق کو قبول نہ کرے لیکن اس کا دل پہلے ہی حق کو تسلیم کر چکا ہو، وہ حق کے خلاف نرم ہو جائے، بلکہ بعض حالات میں وہ اسے زبان سے بھی تسلیم کر لے۔

انبیاء کرام (علیہم السلام) کا یہی طریقہ تھا۔ انہوں نے گفتگو میں منطقی دلائل کو نہیں اپنایا بلکہ آسان، سہل اور شب و روز کے تجربے پر مبنی دلائل، مثالوں اور مقدمات کو نقل کر کے بیان کیا؛ کیونکہ اس کا مقصد لوگوں کو ہدایت کا راستہ دکھانا تھا۔ اسے منطقی دلیل سے لوگوں کو خاموش کر کے اپنے علم کا مظاہرہ کرنا نہیں تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم سے مکالمہ اور ستاروں، چاند، سورج کو دیکھ کر ان کے غروب ہونے پر خدا ہونے سے انکار اور نمرود بادشاہ کے ساتھ سورج کو مغرب سے نکالنے کا چیلنج اس کی کھلی مثالیں ہیں۔ پہلے ستاروں پھر چاند کا اور آخر میں سورج کے خدا ہونے کا انکار، وہ بھی محض ان کو سمجھانے کی ایک کوشش تھی، اسی لیے قوم اور نمرود دونوں اس پر حیران ہوئے۔

اسی طرح ماں باپ کا مشرک ہوتے ہوئے بھی ان کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آ کر اسے قائل کرنے کی آخری دم تک کوشش جاری رکھی؛ لیکن اس حقیقت کو قبول کرنے سے - کہ اس کا مذہب غلط تھا - عظیم محسن خدا پاک کو ناراض نہیں

کیا، جو پاک پروردگار اور مخلوق کے درمیان فرق کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

آیت نمبر ۸۳ سے ۸۶ اللہ نے اٹھارہ پیغمبروں کا ذکر فرمایا، حضرت ابراہیم اور حضرت نوح، اسحق، یعقوب، (علیہم السلام) پھر ان چاروں کے بعد چودہ پیغمبروں کا ذکر فرمایا۔ حضرت داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس، اور اسماعیل، الیسع، اور یونس، لوط علیہم السلام اجمعین۔ مطلب یہ ہے کہ توحید اور خدا پرستی حضرت ابراہیم پر موقوف نہیں، حضرت ابراہیم سے پہلے ان کے جد امجد حضرت نوح اور ان کی ذریت ناجیہ سب موحد اور خدا پرست تھے اور پھر حضرت ابراہیم کے بعد جتنے پیغمبر آئے جن کی بزرگی تمام بلاد عرب میں معروف ومشہور ہے وہ سب موحد تھے اور شک سے بری اور بے زار تھے، ان اٹھارہ پیغمبروں کے علاوہ جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے وہ سات ہیں۔ حضرت آدم، ادریس، اور شعیب اور صالح اور ہود اور ذوالکفل اور سیدنا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان سمیت سب پچیس ہوئے۔ حضرت آدم سے لے کر دس قرن تک تمام لوگ توحید پر متفق رہے، حضرت نوح کے زمانہ میں شرک کا آغاز ہوا اور بت پرستی شروع ہوئی اور نوح (علیہ السلام) نے توحید کی دعوت دی اور بت پرستی اور شرک کا رد کیا، اس لیے ان آیات میں حضرت ابراہیم سے پہلے نوح (علیہ السلام) کا ہدایت کا ذکر فرمایا۔ (ادریسی: ۲/ ۶۹۳)

قیامت میں انسان کی پیشی:

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ........الیٰ..........وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ﴿۹۴﴾

(پھر قیامت کے دن اللہ تعالی ان سے کہے گا کہ) تم ہمارے پاس اسی طرح تن تنہا آ گئے ہو جیسے ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا، اور جو کچھ ہم نے تمہیں بخشا تھا وہ سب اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو، اور ہمیں تو تمہارے وہ سفارشی کہیں نظر نہیں آ رہے جن کے بارے میں تمہارا دعویٰ تھا کہ وہ تمہارے معاملات طے کرنے میں (ہمارے ساتھ) شریک ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان کے ساتھ تمہارے سارے تعلقات ٹوٹ چکے ہیں اور جن (دیوتاؤں) کے بارے میں تمہیں بڑا زعم تھا وہ سب تم سے گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ (۹۴)

اللہ پاک کی جاندار اور بے جان چیزیں، سورج اور چاند اور کھیتی میں نشانیاں:

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ........الیٰ.......وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ﴿۱۰۲﴾

بیشک اللہ ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے، وہ جاندار چیزوں کو بے جان چیزوں سے نکال لاتا ہے، اور وہی بے جان چیزوں کو جاندار چیزوں سے نکالنے والا ہے۔ لوگو! وہ ہے اللہ پھر کوئی تمہیں بہکا کر کس اوندھی طرف لئے جا رہا ہے؟ (۹۵) وہی ہے جس کے حکم سے صبح کو پو پھٹتی ہے، اور اسی نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے، اور سورج اور چاند کو ایک حساب کا پابند! یہ سب کچھ اس ذات کی منصوبہ بندی ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، علم بھی کامل (۹۶) اور اسی نے تمہارے لیے ستارے بنائے ہیں، تا کہ تم ان کے ذریعے خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں راستے معلوم کر سکو۔ ہم نے ساری نشانیاں ایک ایک کر کے کھول دی ہیں

(مگر) ان لوگوں کے لیے جو علم سے کام لیں۔ (۹۷) وہی ہے جس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا، پھر ہر شخص کا ایک مستقر ہے، اور ایک امانت رکھنے کی جگہ، ہم نے ساری نشانیاں ایک ایک کر کے کھول دی ہیں، (مگر) ان لوگوں کے لیے جو سمجھ سے کام لیں۔ (۹۸) اور اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر ہم نے اس کے ذریعے ہر قسم کی کونپلیں اگائیں۔ ان (کونپلوں) سے ہم نے سبزیاں پیدا کیں جن سے ہم تہہ بر تہہ دانے نکالتے ہیں، اور کھجور کے گابھوں سے پھلوں کے وہ گچھے نکلتے ہیں جو (پھل کے بوجھ سے) جھکے جاتے ہیں، اور ہم نے انگوروں کے باغ اگائے، اور زیتون اور انار۔ جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں، اور ایک دوسرے سے مختلف بھی، جب یہ درخت پھل دیتے ہیں تو ان کے پھلوں اور ان کے پکنے کی کیفیت کو غور سے دیکھو۔ لوگو! ان سب چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں (مگر) ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ (۹۹) اور لوگوں نے جنات کو اللہ کے ساتھ خدائی میں شریک قرار دے لیا، حالانکہ اللہ نے ہی ان کو پیدا کیا ہے اور سمجھ بوجھ کے بغیر اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تراش لیں؛ حالانکہ اللہ کے بارے میں جو باتیں یہ بناتے ہیں وہ ان سب سے پاک اور بالا و برتر ہے۔ (۱۰۰) وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کا کوئی بیٹا کہاں ہو سکتا ہے، جبکہ اس کی کوئی بیوی نہیں؟ اسی نے ہر چیز پیدا کی ہے اور وہ ہر ہر چیز کا پورا پورا علم رکھتا ہے۔ (۱۰۱) لوگو! وہ ہے اللہ جو تمہارا پالنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ لہٰذا اس کی عبادت کرو۔ وہ ہر چیز کی نگرانی کرنے والا ہے۔ (۱۰۲)

اس سورت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مشرکین کے غلط عقائد کی تردید کے لئے تقریر اور تلقین دونوں اسلوب اختیار کیے گئے ہیں۔

اسلوب تقریر:

اسلوب تقریر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی کی توحید اور قدرت وعظمت کے دلائل کو ایسے مسلم اصولوں کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے کہ ان کا انکار ایسا انسان کر ہی نہیں سکتا جسے اللہ تعالی نے قلب سلیم اور عقل صحیح سے نوازا ہو۔

توحید اور قدرت کے دعوے:

آپ اس سورت کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو وقفے وقفے سے ایسی آیات ملیں گی جن میں ارض وسما میں اللہ کے موجود ہونے، بندوں پر اس کے غلبے اور ظاہر و باطن کا عالم ہونے کا یوں ذکر کیا گیا ہے کہ گویا ان دعوؤں کو مشرکین بھی تسلیم کرتے ہیں اور یہ دعوے ایسے ہرگز نہیں کہ ان کے ثبوت کے لیے دلائل دیئے جائیں یا زیادہ مغز ماری کی جائے بلکہ جب صاحب نظر انسان کائنات پر ایک نظر ڈالتا ہے تو وہ اللہ کے وجود، اس کی عظمت و کبریائی اور غلبے اور قدرت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہتا۔ درج ذیل آیات میں اس اسلوب کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

آیت نمبر: ۱

اور آسمان اور زمین میں وہی ایک اللہ ہے، تمہاری پوشیدہ اور ظاہری باتیں سب جانتا ہے اور تم جو عمل کرتے ہو سب

سے واقف ہے۔(۳)

آیت نمبر:۲

اور وہی تو ہے جو رات کو نیند کی حالت میں تمہاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس سے خبر رکھتا ہے۔(۶۰)

آیت نمبر:۳

اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے اور تم پر نگہبان مقرر کیے رکھتا ہے۔(۶۱)

اسلوب تلقین:

اسلوب تلقین کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالی اپنے رسول امی ﷺ کو ایسے دلائل سکھا تا ہے جن کا منکرین کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا اور وہ شرمندگی اور سرافلندگی پر مجبور ہو جاتے ہیں، یہ اسلوب عام طور پر سوال جواب کی شکل میں ہوتا ہے۔

مشرکین سے سوال:

مثال کے طور پر آیت ۱۲ میں ہے:

''آپ ان سے سوال کیجئے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے یہ کس کا ہے؟''

ظاہر ہے کہ دل سے تو مشرکین بھی تسلیم کرتے تھے کہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے؛ لیکن زبان سے اعتراف کرنے میں انہیں حجاب ہوتا تھا، اس لیے فرمایا گیا کہ آپ خود ہی جواب دیجئے کہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔(۱۲)

اور اسی طرح آیت ۱۹ میں ہے:

ان سے پوچھو کہ سب سے بڑھ کر کس کی شہادت ہے؟ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی میرے درمیان اور تمہارے درمیان گواہ ہے۔''(۱۹)

تقریر اور تلقین کے یہ دونوں اسلوب سورہ انعام میں پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔

توحید ورسالت:

اس سورت کی ابتداء اللہ کی حمد وثناء اور عظمت اور توحید سے ہوتی ہے، توحید کے ساتھ رسالت کا ذکر بھی ضروری ہے۔ چنانچہ بتایا گیا ہے کہ منکرین کی عادت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی دلائل و براہین ان کے سامنے پیش کرتے ہیں یہ ان سے اعراض کرتے ہیں اور جواب میں کٹ جحتی کہتے ہیں کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟

بعث وجزا:

توحید ورسالت کے بعد بعث و جزا کا ذکر ہے، فرمایا گیا کہ ''تمہیں اللہ قیامت کے دن ضرور جمع کرے گا، اس میں کوئی شک نہیں''(۱۶)

یہ تینوں مضامین سورہ انعام میں اول بدل کر تلقین اور تقریر کے اسلوب سے چلتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ بات ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام تک جا پہنچتی ہے۔

شرک میں ڈوبی ہوئی دنیا میں روشن مینار:

اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ حضرت خلیل علیہ السلام شرک میں ڈوبی ہوئی دنیا میں روشن مینار تھے، انہوں نے جب سورج، چاند، ستاروں اور ہاتھوں سے بنائے گئے اصنام کو معبود تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور رب واحد کی کبریائی پر ایمان کا اعلان کیا تو انہیں سب سے پہلے اپنے والد ہی کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر انہوں نے اس مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کی اور دعوت توحید کا سلسلہ جاری رکھا، (۷۴۔۸۱) (خلاصۃ القرآن م اش)

حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے جس علاقے میں پیدا ہوئے تھے وہاں کے لوگ بتوں اور ستاروں کو خدا مان کر ان کی عبادت کیا کرتے تھے ان کا باپ آزر بھی نہ صرف اس عقیدے کا تھا بلکہ خود بت تراشا کرتا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام شروع ہی سے توحید پر ایمان رکھتے تھے اور شرک سے بیزار تھے؛ لیکن انہوں نے اپنی قوم کو غور و فکر کی دعوت دینے کے لئے یہ لطیف طریقہ اختیار کیا کہ چاند، ستاروں اور سورج کو دیکھ کر پہلے اپنی قوم کی زبان میں بات کی۔ مقصد یہ تھا کہ یہ ستارے، یہ چاند، اور یہ سورج تمہارے خیال میں میرے پروردگار رہیں لیکن یہ تو ناپائدار اور تغیر پسند چیزیں ہیں۔ اور جو چیز خود ناپائدار ہو اور اس پر تغیرات طاری ہوتے رہتے ہوں۔ وہ خدا کیسے ہوسکتا ہے؟

اہل سنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ نبی ہمیشہ مسلمان ہوتا ہے، بچپن سے لے کر موت تک نبی پر کبھی کفر طاری نہیں ہوتا، نبی ہر دور میں ایمان والا ہوتا ہے؛ لہذا اس آیت شریفہ میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ذکر کیا ہے اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنا عقیدہ نہیں بیان فرما رہے بلکہ اپنی قوم کے عقیدے کی لغویت کو ظاہر فرما رہے ہیں۔

وحاجه قومه، آیت نمبر ۸۰ کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے حجت کرتے ہوئے ان سے دو باتیں کی تھیں۔

(۱) ہم نے اپنے باپ دادا کو بھی ایسا ہی کرتے ہوئے دیکھا ہے، اس لئے ان سب کو گمراہ کہنا ہمارے بس سے باہر ہے۔

(۲) اگر تم نے ہمارے بتوں اور ستاروں کی خدائی سے انکار کیا تو وہ تمہیں تباہ و برباد کر ڈالیں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلی بات کے جواب میں فرمایا کہ تمہارے باپ دادا کے پاس اللہ تعالی کی طرف سے کوئی وحی نہیں آئی تھی جب کہ میرے پاس عقلی دلائل بھی ہیں اور میرے پاس وحی بھی آئی ہے۔

اور دوسری بات کا جواب یہ دیا کہ میں ان بے بنیاد دیوتاؤں سے نہیں ڈرتا کیونکہ نقصان اگر کوئی پہنچا سکتا ہے تو وہ اللہ کی ذات ہے کوئی اور نہیں۔ اور جو لوگ اس کی توحید پر ایمان لاتے ہیں انہیں اللہ تعالی نے چین عطا کر رکھا ہے۔

(خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

اٹھارہ انبیاء:

یہی دعوت دوسرے انبیاء نے بھی اپنے اپنے زمانے میں دی۔ سورہ انعام میں ان انبیاء میں سے اٹھارہ کے نام مذکور ہیں، (۸۴۔۸۷)

ان سب کو وحی سے مشرف کیا گیا، ان کے علاوہ بھی بے شمار انبیاء دنیا میں آئے ہیں لیکن ان کے نام قرآن میں مذکور نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور افعال کی معرفت:

وحی اور نبوت کے بعد دوبارہ ایسے دلائل ذکر کیے گئے ہیں جو خالق کے وجود، اس کے علم، قدرت اور حکمت کے کمال پر دلالت کرتے ہیں، ان دلائل سے اس طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ مقصود اصلی اللہ کی ذات وصفات اور اس کے افعال کی معرفت ہے۔ لیکن مکہ کے کفار ان دلائل میں تو غور وفکر نہیں کرتے تھے، البتہ مختلف قسم کے معجزات کا مطالبہ کرتے رہتے تھے کہ اگر ہمیں فلاں معجزہ دکھا دیا جائے تو ہم ایمان قبول کرلیں گے حالانکہ ان کی یہ باتیں زبانی جمع خرچ اور دفع الوقتی کے سوا کچھ نہ تھیں۔

کافر اور مومن کی نظر میں فرق:

حقیقت یہ ہے کہ صاحب طلب معجزہ کا مطالبہ نہیں کرتا وہ جدھر نظر اٹھاتا ہے اسے اللہ کے وجود اور قدرت کی نشانیاں واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں، اس کائنات پر کافر بھی نظر ڈالتا ہے اور مومن بھی نظر ڈالتا ہے لیکن دونوں کے نظر ڈالنے میں زمین آسمان کا فرق ہے، کافر دیکھتا ہے تو اسے پوری کائنات مادی اسباب میں جکڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے؛ لیکن جب ایک مسلمان دیکھتا ہے تو اسے ہر چیز اور ہر مرحلے میں قدرت کی کارفرمائی نظر آتی ہے، مثال کے طور پر جب وہ پھل کو دیکھتا ہے کہ رنگ اور خوشبو، چھوٹا اور بڑا، کھٹا اور میٹھا ہونے کے اعتبار سے کیسے ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہوتا ہے، ابتداء میں کوئی کڑوا اور نمکین ہوتا ہے اور کوئی کھٹا یا پھیکا؛ لیکن جوں جوں وہ پکتا جاتا ہے، اس میں مٹھاس اور لذت آتی جاتی ہے۔

جب ایک مومن ایمانی نظر سے دیکھتا اور غور وتدبر کرتا ہے تو بے ساختہ پکار اٹھتا ہے ''سبحان اللہ''۔

نباتات کا خاص طور پر ذکر:

اس لیے یہاں زمین سے اگنے والی مختلف چیزوں اور پھلوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

''یہ چیزیں جب پھلتی ہیں تو ان کے پھلوں پر اور جب پکتی ہیں تو ان کے پکنے پر نظر کرو، ان میں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں، اللہ کی قدرت کی بہت ساری نشانیاں ہیں۔'' (۹۹) (خلاصۃ القرآن: م اش)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ زمین دار جب زمین میں دانہ ڈالتا ہے تو دانے کے دو حصے ہوتے ہیں، ایک حصہ جڑ والا اور دوسرا حصہ تنے والا، جڑ والا حصہ نیچے جائے گا اور تنے والا حصہ اوپر آئے گا مگر زمین دار کو یہ کہاں پتہ ہوتا ہے کہ کون سا حصہ جڑ والا ہے اور کونسا حصہ تنے والا۔ وہ تو ایسے ہی بیج ڈالتا چلا جاتا ہے، پھینکتا چلا جاتا

ہے، اب جڑ والے حصہ کو کون نیچے لاتا ہے اور تنے والے حصے کو کون اوپر لاتا ہے، اللہ کے نبی فرماتے ہیں کہ ہر دانے کے ساتھ ایک فرشتہ ہوتا ہے جو دانے کو صحیح کرتا ہے۔ (دروس القرآن ص ۲۰۴)

آیت نمبر ۱۰۸ میں اللہ تبارک وتعالی نے ارشاد فرمایا (مسلمانو!) جن (جھوٹے) معبودوں کو یہ لوگ اللہ کے بجائے پکارتے ہیں تم ان کو برا نہ کہو، جس کے نتیجے میں یہ لوگ جہالت کے عالم میں حد سے آگے بڑھ کر اللہ کو برا کہنے لگیں۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ اگرچہ جن دیوتاؤں کو کافر اور مشرک لوگ خدا مانتے ہیں ان کی حقیقت کچھ بھی ہو لیکن اس آیت میں مسلمانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ کافروں کے سامنے ان کے لئے بھی نازیبا الفاظ استعمال نہ کریں کہ کہیں اس کے جواب میں وہ اللہ تبارک وتعالی کی شان میں گستاخی نہ کر بیٹھیں، علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی کام بذات خود جائز یا مستحب ہو لیکن اندیشہ ہو کہ اس کے نتیجے میں کوئی دوسرا شخص گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے گا تو اس صورت میں اس جائز یا مستحب کام کو چھوڑ دینا چاہئے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے ماں باپ کو گالیاں نہ دیا کرو، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ اپنے والدین کو کون گالی دے گا؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کسی کے باپ کو گالی دو گے تو وہ تمہارے باپ کو گالی دے گا، گویا تم نے خود اپنے باپ کو گالی دی۔ (دروس القرآن في شهر رمضان ص ۲۰۲)

اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ آج کل جو کفار مسلمانوں کو اشتعال دلانے کے لئے اور ان کی توہین کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ کے خاکے بنارہے ہیں تو مسلمانوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ بھی اس کے جواب میں حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہم الصلوۃ والسلام کے خاکے بنائیں یا ان کی کسی بھی اعتبار سے توہین کریں، کیونکہ وہ تو ویسے بھی ہمارے ہیں اور ہمارے لئے ضروری ہے کہ جس طرح آنحضرت ﷺ کی نبوت کا اقرار کرتے ہیں اسی طرح تمام انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی نبوت کا بھی اقرار کریں اور ان کا احترام بھی کریں کہ یہ جزو ایمانی ہے۔ (خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ الانعام: اصلاح مجوس۔

خلاصہ رکوع: ۱...... (۱) توحید۔ (۲) کتاب اللہ۔ (۳) رسالت۔ ماخذ: (۱) آیت: ۳، ۲، ۱۔ (۲) آیت: ۷۔ (۳) آیت: ۸۔

خلاصہ رکوع: ۲...... حصول جذبہ توحید کے لئے تمسک بہ کتاب اللہ تعالی لازمی ہے۔ ماخذ: آیت: ۱۹۔

خلاصہ رکوع: ۳...... (۱) ترک اتباع کتاب اللہ سے ابتلاء فی الشرک۔ (۲) اور مشرکین کی ندامت۔ ماخذ: (۱) آیت: ۲۱، ۲۲۔ (۲) آیت: ۲۳۔

خلاصہ رکوع: ۴...... تکذیب رسل انسان کی عادت مستمرہ ہے، اور انبیاء علیہم السلام کا صبر اور صبر پر نزول نصرت الٰہی۔ ماخذ: آیت: ۳۴۔

خلاصہ رکوع:۵......تذکیر بایام اللہ سے دعوت الی التوحید۔ ماخذ: آیت:۴۲۔

خلاصہ رکوع:۶......توحید پرست ہی معیت محمدیہ کے مستحق ہیں۔ ماخذ: آیت:۵۲۔

خلاصہ رکوع:۷......مخالفین توحید سے مقاطعہ۔ ماخذ: آیت:۵۶۔

خلاصہ رکوع:۸......قدرت الٰہی کے سامنے تم سب مقہور و مغلوب ہو۔ ماخذ: آیت:۶۱۔

خلاصہ رکوع:۹......مسلک توحید میں اسوہ ابراہیمی۔ ماخذ: آیت:۷۴۔

خلاصہ رکوع:۱۰......مسئلہ توحید میں ہمارا مسلک وہی ہے جو ابراہیم علیہ السلام اور تمام انبیا علیہم السلام کا تھا۔ ماخذ: آیت:۸۳ تا۸۸-۹۰۔

خلاصہ رکوع:۱۱......قرآن حکیم متفق علیہ توحید کی طرف داعی ہے۔ ماخذ: آیت:۹۲۔

خلاصہ رکوع:۱۲......جس خدائے تعالیٰ کی طرف ہم نے تمہیں دعوت دی ہے اس کی قدرت کے کرشموں کی تفصیل کو دیکھ کر چاہیے تو یہ تھا کہ سبق توحید میں پختہ کار ہوتے، لیکن بجائے توحید کے اللہ تعالیٰ کے واسطے بیٹے اور بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔ ماخذ: آیت:۹۵،۹۷،۹۹،۱۰۰۔

خلاصہ رکوع:۱۳......اسباب بصائر ہم نے تمہیں دکھائے ہیں، اب بھی اندھے رہو تو تم جانو۔ ماخذ: آیت:۱۰۴۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

ساتویں سپارے کے چند اہم فوائد

(۱) شراب اور جوے سے اجتناب کو اللہ تعالی نے حصول فلاح کا ذریعہ بتایا ہے، گویا انہیں استعمال کرنے سے دنیا اور آخرت میں خسارہ ہوگا۔

(۲) کامل مؤمن وہ ہے جس کے دل میں اللہ کی رحمت کی امید بھی ہو اور عذاب کا خوف بھی۔

(۳) ایسے سوالات جن کے جواب سے دل میں ناگواری پیدا ہونے کا خطرہ ہو ان سے اعراض ہی بہتر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ سے ارشاد فرمایا: ”مجھے کوئی شخص کسی کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات نہ پہنچائے کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ میں دنیا سے اس حال میں جاؤں کہ میرا سینہ صاف ہو۔“

(۴) یہ ضروری نہیں کہ معجزات کسی کے ایمان لانے کا سبب بن جائیں، بعض اوقات وہ کفر وعناد کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔

(۵) اللہ کی طرف جھوٹی باتوں کی نسبت کرنا اور ثابت شدہ حقائق کو جھٹلانا سب سے بڑا ظلم ہے۔

(۶) ضد اور تعصب انسان کو اندھا بہرا کر دیتے ہیں، پھر وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا نہ سنتا ہے اور نہ ہی سمجھتا ہے۔

(۷) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان زندگی ہے اور کفر موت ہے۔

(۸) ہدایت صرف انہی کو ملتی ہے جو کان اور آنکھیں کھلی رکھتے ہیں اور جنہیں اللہ توفیق دیتا ہے۔

(۹) شدت اور مصیبت کے وقت مشرک اور کافر بھی صرف اللہ کو پکارتا ہے (مومن کی شان یہ ہے کہ وہ ہر حال میں صرف اللہ کو پکارے۔)

(۱۰) مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ ہر وقت اللہ کو یاد کرتا ہے۔

***

پارہ:۸

ساتویں پارہ کے آخر میں مشرکین کا یہ مطالبہ ذکر کیا گیا تھا کہ اگر ہمیں کوئی حسی معجزہ دکھایا جائے تو ہم ایمان لے آئیں گے،مگر منکرین اسلام کی شدت عناد وقساوت قلب کا یہ حال ہے کہ بالفرض ان کی ساری فرمائشیں پوری کردی جائیں اور دنیا بھر کے خوارق انہیں دکھلا دیئے جائیں، جب بھی چونکہ وہ اپنے میں طلب صادق پیدا ہی نہیں کرتے، اس لیے ہمیشہ کوئی نہ کوئی الٹی سیدھی تاویل کر ہی لیں گے۔ اور ایمان بہر حال نہ لائیں گے۔ چنانچہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى ....الیٰ..................وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ﴿۱۱۲﴾

اور اگر بالفرض ہم ان کے پاس فرشتے بھیج دیتے، اور مردے ان سے باتیں کرنے لگتے، اور (ان کی مانگی ہوئی) ہر چیز ہم کھلی آنکھوں ان کے سامنے لاکر کے رکھ دیتے، تب بھی یہ ایمان لانے والے نہیں تھے، الا یہ کہ اللہ ہی چاہتا (کہ انہیں زبردستی ایمان پر مجبور کردے تو بات دوسری تھی، مگر ایسا ایمان نہ مطلوب ہے نہ معتبر) لیکن ان میں سے اکثر لوگ جہالت کی باتیں کرتے ہیں۔ (۱۱۱) اور (جس طرح یہ لوگ ہمارے نبی سے دشمنی کر رہے ہیں) اسی طرح ہم نے ہر (پچھلے) نبی کے لیے کوئی نہ کوئی دشمن پیدا کیا تھا، یعنی انسانوں اور جنات میں سے شیطان قسم کے لوگ، جو دھوکا دینے کی خاطر ایک دوسرے کو بڑی چکنی چپڑی باتیں سکھاتے رہتے تھے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر سکتے؛ لہٰذا ان کو اپنی افترا پردازیوں میں پڑا رہنے دو۔ (۱۱۲)

امام المفسرین فخر رازیؒ نے لکھا ہے کہ کوئی ایک معجزہ تو پیغمبر کے لئے ضروری ہے کہ جس سے عوام صادق وکاذب کے درمیان فرق کر سکیں؛ لیکن ایک سے زیادہ کا مطالبہ کرتے رہنا محض ہٹ دھرمی ہے؛ ورنہ پھر ہر دوسرے کے بعد تیسرے اور تیسرے کے بعد چوتھے کی طلب برابر بڑھتی ہی رہے گی، اور سلسلہ کبھی ختم ہی نہ ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی:

آیت نمبر ۱۱۲ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ ان کی مخالفت، استہزاء اور انکار سے پریشان نہ ہوں، ہر نبی کے ساتھ انسی اور جنی شیاطین نے ہمیشہ یہی رویہ اختیار کیا ہے، باقی آپ کی نبوت کے اثبات کے لیے ان کے مطلوبہ معجزات کی کوئی ضرورت نہیں۔

قرآن نے جنہیں اپنی بولی میں شیاطین کہا ہے وہ ہمیشہ جنات ہی نہیں ہوتے، جو انسان بھی شیطان کی نیابت انجام دینے لگے، وہ گویا شیطان بہ قالب انسان ہے، شیطان کا لفظ قرآن مجید میں ہر سرکش یا نافرمان کے لئے ہے۔ خواہ وہ جن

ہو یا بشر۔

حضرت مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں کہ شیطان چونکہ انسانوں اور جنوں دونوں انواع سے ہیں اس لیے میں ہمیشہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھتا ہوں یا تعوذ کرتا ہوں، تو جنات کی نوع کے شیطان تو بھاگ جاتے ہیں، مگر انسانی شیطان ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں اور ہمیشہ آدمی کو گناہ کی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اور پھر یہ ہے کہ انسانی شیطان جناتی شیطان سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ جناتی شیطان تو نظروں سے اوجھل رہتے ہیں مگر انسانی شیطان ظاہراً شیطانی کام کرتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ آدمی کو معاصی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یوحی کا لفظی معنی اشارہ کرنا ہے اور اس کا دوسرا معنی تیزی سے بات کرنا بھی آتا ہے۔ چنانچہ وحی الٰہی میں مخفی اشارہ ہوتا ہے جو اللہ کی جانب سے فرشتے کے ذریعے پیغمبر کے قلب پر نازل ہوتا ہے۔ یہاں پر وحی سے مراد القاء کرنا ہے جو ایک دوسرے پر وسوسے وغیرہ ڈالتے ہیں اور لوگوں کو برائی کی طرف مائل کرتے ہیں۔

''**یوحی بعضهم الی بعض زخرف القول**''۔ اس میں اشارہ ہے کہ شیطانی تلبیسات ہمیشہ کوئی نہ کوئی پہلو ظاہری خوشنمائی کا رکھتی ہیں۔ اگر فوری لذت اور ظاہری آب وتاب ان میں نہ ہو تو کوئی ادھر کا رخ ہی کیوں کرے؟ (آیت) ''یوحی''۔ یعنی وحی کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ یہ وسوسہ اندازی بھی بالکل خفیہ ہوتی ہے:۔ **سمی وحیا لانه یکون خفیة.** (قرطبی) جتنے جاہلی مذہب دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، غور کر لیجئے سب میں ملمع سازی کے پہلو اچھے خاصے موجود ہوں گے، ہر باطل فرقہ کوئی نہ کوئی ظاہری کشش اپنے میں ضرور رکھتا ہے۔ آج اہل باطل کے جتنے مختلف نظریات، مغرب ومشرق سے آرہے ہیں، نئی نئی ازم کے ساتھ، ان سب کے دعوے کیسے کیسے خوشنما اور ظاہر فریب ہیں۔ کوئی کہتا ہے ہم روٹی کے سوال کو حل کیے دیتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ ہم دنیا سے مفلسی اور محتاجی کو مٹائے دیتے ہیں۔ وقس علی ہذا یہ سارے نمونے اسی (آیت) ''زخرف القول'' کے ہیں۔ (آیت) ''غرورا''۔ یہ سارے دعوے نرے ہی ہوتے ہیں۔ حقیقت اور اصلیت ان میں نام کو نہیں ہوتی۔ (تفسیر ادریسی، ماجدی، معالم العرفان)

سب سے بڑا معجزہ قرآن:

اللہ تعالی نے آپ ﷺ کو متعدد معجزات سے نوازا ہے جن میں سے سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے، لہذا یہ اس معجزہ کو دیکھنے اور سننے کے باوجود انکار کرتے ہیں تو آپ پریشان نہ ہوں، کیونکہ زمین پر بسنے والے اکثر لوگوں کا یہی حال ہے کہ وہ ہدایت کو چھوڑتے ہیں اور گمراہی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ (خلاصۃ القرآن: م ا ش)

شیاطین الانس والجن کی ملمع کاری:

گذشتہ آیات میں یہ بیان فرمایا تھا کہ شیاطین الانس والجن ملمع کاری کی باتیں (زخرف القول) دھوکہ دینے کے لیے کرتے ہیں، اب آگے یعنی و ان تطع اکثر من فی الارض میں ملمع کاری کی بعض باتیں ذکر کرتے ہیں کہ جو مشرکین مسلمانوں کو احکام خداوندی میں شبہ ڈالنے کے لیے کہا کرتے تھے، مشرکین آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں سے یہ مجادلہ

کرتے کہ جو جانور طبعی موت سے مرجائے (یعنی میتہ) مسلمان اسے تو حرام کہتے ہیں، حالانکہ وہ خدا کا مارا ہوا ہے اور جو جانور خود ان کے ہاتھ کا مارا ہوا ہے یعنی ان کے ہاتھ کا ذبیحہ ہے اسے حلال سمجھتے ہیں، یہ کیسا دین ہے کہ جس میں خدا کی ماری ہوئی چیز تو حرام ہے اور اپنے ہاتھ کی ماری ہوئی چیز حلال ہے، مسلمانوں کی یہ عجیب بات ہے کہ اپنے مارے ہوئے جانور کو تو کھا لیتے ہیں اور خدا کے مارے ہوئے جانور کو نہیں کھاتے، آئندہ آیتوں یعنی **فکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ الخ** میں ان کے اسی شبہ کا جواب دیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ سب کافروں کی ملمع کاری ہے جو انسانوں کو شبہ اور دھوکہ میں ڈالنے کے لیے شیطان ان کو سکھاتے ہیں، خوب سمجھ لو کہ حلال وحرام کے بارے میں اللہ ہی کا حکم چلتا ہے، محض عقلی ڈھکوسلوں کا کوئی اعتبار نہیں، مارنے والا سب کا اللہ ہی ہے، جان ڈالنا اور جان نکالنا یہ اللہ ہی کی قدرت اور اختیار میں ہے، ذبح کرتے وقت صرف چھری چلانا تو بندہ کا کام ہے، باقی جانور کی جان نکالنا یہ اللہ کا کام ہے، ذبح کرنا موت کا ایک سبب ظاہری ہے جیسے موت کے اور اسباب ہیں، مثلاً چھت سے گر کر مرجانا، یا کنویں اور دریا میں ڈوب کر مرجانا مارنے والا ہر حال میں خدا ہی ہے، سب اسی کے مارے ہوئے ہیں۔

البتہ اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت ہے کہ جو جانور اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے وہ حلال ہے اور جو جانور بغیر اس کا نام لیے مرگیا وہ مردار ہے، اس کا کھانا فسق اور خلاف حکم ہے ہاں شدید مجبوری کی حالت میں اس کے کھانے کی اجازت دی گئی ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۳/۷، ۸)

چنانچہ فرمایا:

وَاِنۡ تُطِعۡ اَكۡثَرَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ يُضِلُّوۡكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ ....الی...........وَاِنَّ كَثِيۡرًا لَّيُضِلُّوۡنَ بِاَهۡوَآئِهِمۡ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ‌ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُعۡتَدِيۡنَ ﴿۱۱۹﴾

اور اگر تم زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کے پیچھے چلو گے تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے گمراہ کر ڈالیں گے۔ وہ تو وہم و گمان کے سوا کسی چیز کے پیچھے نہیں چلتے، اور ان کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ خیالی اندازے لگاتے رہیں۔ (۱۱۶) یقین رکھو کہ تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون اپنے راستے سے بھٹک رہا ہے، اور وہی ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو صحیح راستے پر ہیں۔ (۱۱۷) چنانچہ ہر اس (حلال) جانور میں سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اگر تم واقعی اس کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو۔ (۱۱۸) اور تمہارے لیے کون سی رکاوٹ ہے جس کی بنا پر تم اس جانور میں سے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام لے لیا گیا ہو؟ حالانکہ اس نے وہ چیزیں تمہیں تفصیل سے بتا دی ہیں جو اس نے تمہارے لیے (عام حالات میں) حرام قرار دی ہیں، البتہ جن کو کھانے پر تم بالکل مجبور ہی ہو جاؤ (تو ان حرام چیزوں کی بھی بقدر ضرورت اجازت ہو جاتی ہے) اور بہت سے لوگ کسی علم کی بنیاد پر نہیں (بلکہ صرف) اپنی خواہشات کی بنیاد پر دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ بلا شبہ تمہارا رب حد سے گزرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ (۱۱۹)

مغربی جمہوریت رد کردی جائے گی:

مغربی جمہوریت کی نفی ہوتی ہے، کیونکہ مغربی جمہوریت میں اکثر کی رائے کا اعتبار ہے خواہ وہ کتاب وسنت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، جبکہ مسلمانوں کا یہ اجتماعی عقیدہ ہے کہ اگر پوری دنیا کے انسان کسی ایسی بات پر متفق ہوجائیں جو کتاب وسنت کے واضح حکم کے خلاف ہوتو ان کے اتفاق کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا اور اسے رد کردیا جائے گا۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حلال وحرام کا فیصلہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے، چنانچہ اس نے واضح طور پر ارشاد فرما دیا کہ جس جانور پر اللہ کا نام لیا جائے ذبح کرتے وقت وہ تو حلال ہے اور جو ذبح کئے بغیر مرجائے یا جس پر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہ لیا جائے وہ حرام ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ کفار کے مذکورہ اعتراض کے جواب میں مصلحت بھی بتائی جاسکتی تھی کہ جس جانور کو ذبح کیا جاتا ہے اس کا خون اچھی طرح بہہ جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ انسان کے لئے نقصان دہ نہیں رہتا اس کے برخلاف جو جانور خود مر جاتا ہے اس کا خون جسم میں ہی رہ جاتا ہے جس کی وجہ سے پورا گوشت خراب ہوجاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ مصلحت بیان کرنے کے بجائے یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ جو چیزیں حرام ہیں وہ اللہ نے خود بیان فرمادی ہیں۔ اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کا کام اللہ کا حکم ماننا ہے، چاہے اس حکم کی مصلحت اس کی سمجھ میں آئے یا نہیں، اگرچہ اللہ کے ہر حکم میں مصلحت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے۔

ظاہری اور باطنی گناہ پر تہدید:

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا نام گناہ ہے، اللہ تعالیٰ نے آیت نمبر ۱۲۰ میں ارشاد فرمایا:

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿١٢٠﴾

اور تم ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے گناہ چھوڑ دو۔ یہ یقینی بات ہے کہ جو لوگ گناہ کماتے ہیں، انہیں ان تمام جرائم کی جلد ہی سزا ملے گی جن کا وہ ارتکاب کیا کرتے تھے۔ (۱۲۰)

''ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے گناہ چھوڑ دو'' علماء نے لکھا ہے کہ ظاہری گناہوں میں وہ گناہ داخل ہیں جو انسان اپنے ظاہری اعضاء سے کرے مثلاً جھوٹ، غیبت، دھوکا، رشوت، شراب نوشی، زنا وغیرہ اور باطنی گناہوں سے وہ گناہ مراد ہیں جن کا تعلق دل سے ہوتا ہے مثلاً حسد، ریاکاری، تکبر، بغض اور دوسروں کی بدخواہی وغیرہ، پہلی قسم کے گناہوں کے بارے میں علماء سے معلوم کیا جاتا ہے اور دوسری قسم کے گناہوں کے بارے میں مشائخ سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے، افسوس آج مسلمان دونوں قسم کے گناہوں اور ان سے بچنے کی تدابیر سے ناواقف ہیں۔ حالانکہ مؤمن کی شان یہ ہے کہ اس کو ہر وقت اس بات کی فکر رہے کہ میرا یہ کام اللہ کے کسی حکم کے خلاف تو نہیں اور یہ فکر علماء ومشائخ کے ساتھ جڑنے سے ہی پیدا ہوسکتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک اور جگہ ارشاد فرمایا کہ اے ایمان والو، تقویٰ اختیار کرو اور

نیک لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ''۔ (سورۃ التوبہ، آیت ۱۱۹) (خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

''ظاھرالاثم'' سے وہ گناہ مراد لیے جائیں جو خلق کی نظر کے سامنے علانیہ کیے جائیں اور ''باطن الاثم'' سے مراد وہ گناہ سمجھے جائیں جو خلق کی نظر سے چھپا کر پوشیدہ کیے جاتے ہیں۔ جاہلی تہذیبوں میں فسق و معصیت کی بہت سی صورتیں ایسی ہیں کہ بجائے خود وہ ذرا بھی معیوب نہیں۔ صرف ان کا کھل جانا گناہ ہے۔ یونان قدیم میں چوری بجائے خود کوئی جرم نہ تھی، چوری کا کھل جانا جرم تھا۔ آج فرنگی تہذیب میں حرامکاری بجائے خود کوئی عیب نہیں، صرف اس کا منظر عام پر آجانا، عام رسوائی و تفضیح پیدا ہو جانا، اس کا Scandal بن جانا بس صرف یہ جرم ہے۔ عرب کی جاہلی تہذیب میں بھی حرامکاری بجائے خود جائز تھی، صرف اس کا افشاء جرم تھا، یہ خصوصیت اسلام ہی کی ہے کہ اس نے پوشیدہ وعلانیہ ہر حرام کاری کو جرم ہی قرار دیا۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ گناہ کی اس قرآنی تقسیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ گناہ جس طرح اعضاء و جوارح سے ہوتے ہیں، اسی طرح قلب سے بھی ہوتے ہیں۔ (ماجدی: ۲/ ۲۵۱)

مومن اور کافر کی مثال:

اوپر کی آیت میں اول مشرکین کے مجادلہ اور عناد کا ذکر فرمایا اور پھر مسلمانوں کو اہل جدال اور اہل ضلال کی اتباع سے منع فرمایا، اب ان آیات میں مسلمان اور کافر کی مثال بیان فرماتے ہیں تاکہ دونوں میں فرق ظاہر ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ کون لائق اتباع ہے اور کون لائق نفرت ہے۔

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢٢﴾

ذرا بتاؤ کہ جو شخص مردہ ہو، پھر ہم نے اسے زندگی دی ہو، اور اس کو ایک روشنی مہیا کر دی ہو، جس کے سہارے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہو، کیا وہ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جس کا حال یہ ہو کہ وہ اندھیروں میں گھرا ہوا ہو، جن سے کبھی نکل نہ پائے؟ اسی طرح کافروں کو یہ سُجھا دیا گیا ہے، وہ جو کچھ کرتے رہے ہیں، وہ بڑا خوشنما کام ہے۔ (۱۲۲)

مومن کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو زندہ ہے اور اسے ہم نے نور عطا کیا ہے اور کافر کی مثال اس شخص جیسی ہے جو مردہ ہے اور تاریکیوں میں پھنسا ہوا ہے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

لطائف و معارف:

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ ازالۃ الخفاء میں فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ میں مختلف جماعتیں تھیں (ایک جماعت تو وہ تھی کہ جو اپنے فہم و فراست کی بنا پر ابتداء بعثت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئی تھی، انہی میں عثمان غنیؓ بھی تھے اور اس جماعت کے سر دفتر صدیقؓ تھے اور آیۃ کریمہ **فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام** میں انہی لوگوں کا ذکر ہے جن کی فطرت میں توحید اور ایمان اور ترک اصنام اور ترک زنا اور ترک شراب وغیرہ وغیرہ اس قسم کے

محاسن اعمال ابتداءِ خلقت میں ودیعت رکھے گئے تھے اور اس بارے میں انہوں نے بہت سی خوابیں بھی دیکھی تھیں جو آں حضرت ﷺ کی نبوت ورسالت پر دلالت کرتی تھیں، اسی لیے یہ لوگ آنحضرت ﷺ پر بمجرد دعوت ایمان لے آئے اور تکریر دعوت کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

اور ایک جماعت وہ تھی کہ جو ایک مدت تک کفر اور اسلام کی عداوت میں رہی اور آپ ﷺ کی رسالت کے منکر رہے، انہیں لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مردوں سے تعبیر کیا ہے، مگر بعد میں توفیق الٰہی ان کے شامل حال ہوئی اور اسلام کے زمرہ میں داخل ہوئے اور حیات حقیقی حاصل کی اور بہترین مسلمان کہلائے، جیسے حمزہؓ اور حضرت عمرؓ وغیرہ وغیرہ، مگر حضرت عمرؓ اس گروہ کے سردفتر تھے اور آیۂ کریمہ **افمن کان میتا فاحییناہ** الایۃ میں اللہ تعالیٰ نے انہی لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے، **وجعلنا له نورا یمشی به فی الناس** میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ شخص ہادی اور مہدی ہوگا اور مسلمانوں کو اس سے نفع عظیم پہنچے گا، اس فریق میں سے یہ صفت فاروق اعظمؓ کی ذات میں منحصر تھی، اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کو حیات معنوی اور ہدایت کے ساتھ موصوف کیا، پس جب ان آیات کے سیاق وسباق میں غور کیا جاتا ہے تو ان آیات سے ذہن شیخینؓ کی طرف منتقل ہوجاتا ہے کیونکہ شرح صدر صدیقیت کی حقیقت ہے اور عطاءِ نور ہدایت محدَّثیت کی حقیقت ہے اور انہی کے طریقہ کو اللہ نے صراط مستقیم فرمایا ہے اور **کمن مثله فی الظلمات لیس بخارج منها** میں ظلمات سے کفر وضلالت کی ظلمتیں مراد ہیں، زید بن اسلمؓ سے مروی ہے کہ پہلی آیت یعنی **او من کان میتا** حضرت عمرؓ کے بارے میں ہے اور دوسری آیت یعنی **کمن مثله فی الظلمت لیس بخارج منها** ابوجہل کے بارے میں ہے، کیونکہ ابتداء میں دونوں کافر تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کو حیات حقیقی عطاء فرمائی اور ابوجہل کو کفر اور ضلالت کی تاریکی میں رکھا اس طرح ان آیات میں بطریق تعریض حضرت عمر فاروقؓ اور ابوجہل کا حال بیان کیا گیا ہے۔

اور ایک جماعت ضعفاء مسلمین اور فقراء مومنین کی تھی جن کو رؤساءِ قریش بنظر حقارت دیکھتے تھے اور ان کی مجالست کو اپنے لیے باعث عار سمجھتے تھے، انہیں لوگوں کی شان میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی **ولا تطرد الذین یدعون ربهم بالغدوۃ والعشی یریدون وجهه**.

اور آیۂ کریمہ **قل هو القادر علی ان یبعث علیکم عذابا من فوقکم او من تحت ارجلک۔۔۔ الی۔۔۔ ویذیق بعضکم بأس بعض** میں اس قتال مسلمین کی طرف اشارہ ہے جو چونتیس سال بعد واقع ہونے والا تھا ایک متواتر اور ظاہر حدیث میں وارد ہوا ہے کہ عذاب تو آنحضرت ﷺ کی دعا سے اٹھا دیا گیا مگر آپس میں ایک دوسرے کو اذیت دینا باقی رہا۔ (تفسیر ادریسی: ۳؍ ۱۴، ۱۵)

ایمان اللہ پاک کی عظیم نعمت ہے:

فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ ۚ ....الی..................... كَذٰلِكَ يَجۡعَلُ اللّٰهُ

الرِّجۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ﴿۱۲۵﴾

غرض جس شخص کو اللہ ہدایت تک پہنچانے کا ارادہ کرلے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے، اور جس کو (اس کی ضد کی وجہ سے) گمراہ کرنے کا ارادہ کرلے، اس کے سینے کو تنگ اور اتنا زیادہ تنگ کردیتا ہے کہ (اسے ایمان لانا ایسا مشکل معلوم ہوتا ہے) جیسے اسے زبردستی آسمان پر چڑھنا پڑ رہا ہو۔ اسی طرح اللہ (کفر کی) گندگی ان لوگوں پر مسلط کردیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔ (۱۲۵)

اسلام کے لیے کشادہ سینہ:

اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت سے نوازتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کشادہ کردیتا ہے، حدیث شریف میں ایسے دل کی تین علامات بیان کی گئی:

(۱)الانابۃ الی دار الخلود (۲)و التجافی عن دار الغرور

(۳)و الاستعداد للموت قبل ورود الموت.

یہ تین نشانیاں بیان فرمائیں کہ جس شخص کو شرح صدر حاصل ہوجائے وہ آخرت کی طرف رُخ کرتا ہے، ہر وقت متفکر رہتا ہے کہ اسے بارگاہ رب العزت میں پیش ہونا ہے اور دوسری نشانی کہ وہ دھوکے کے گھر یعنی اس دنیا سے حتی الامکان کنارہ کش رہتا ہے۔ دنیا میں زیادہ منہمک نہیں ہوتا۔ موت سے قبل موت کی تیاری کرنا۔

اعمال کی جزا یا سزا:

آیت نمبر ۱۲۹ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيۡ بَعۡضَ الظّٰلِمِيۡنَ بَعۡضًاۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ﴿۱۲۹﴾

اور اسی طرح ہم ظالموں کو ان کے کمائے ہوئے اعمال کی وجہ سے ایک دوسرے پر مسلط کردیتے ہیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ ان کافروں پر ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے شیاطین اور دوسرے ظالموں کو مسلط کردیتے ہیں جو انہیں بہکاتے رہتے ہیں، چنانچہ ایک حدیث شریف میں ہے کہ جب کسی ملک کے لوگ بداعمالیوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں تو ان پر ظالم حکمران مسلط کردیئے جاتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص کسی ظالم کے ظلم میں اس کی مدد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ خود اسی ظالم کو مدد کرنے والے پر مسلط کردیتے ہیں (ابن کثیر) اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے: یہ شیاطین بھی ظالم تھے اور ان کے پیچھے چلنے والے بھی، چنانچہ آخرت میں بھی ہم ان کو ایک دوسرے کا ساتھی بنادیں گے۔ (خلاصۂ مضامین قرآن کریم، توضیح القرآن)

مشرکین کی حماقتیں:

(۱) اللہ اور شرکاء کا حصہ

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ .... الی................وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ﴿۱۳۶﴾

اور اللہ نے جو کھیتیاں اور چوپائے پیدا کیے ہیں ان لوگوں نے ان میں سے اللہ کا بس ایک حصہ مقرر کیا ہے۔ چنانچہ بزعم خود یوں کہتے ہیں کہ یہ حصہ تو اللہ کا ہے، اور یہ ہمارے ان معبودوں کا ہے جن کو ہم خدائی میں اللہ کا شریک مانتے ہیں۔ پھر جو حصہ ان کے شریکوں کا ہوتا ہے، وہ تو (کبھی) اللہ کے پاس نہیں پہنچتا، اور جو حصہ اللہ کا ہوتا ہے، وہ ان کے گھڑے ہوئے معبودوں کو پہنچ جاتا ہے۔ ایسی بری بری باتیں ہیں جو انہوں نے طے کر رکھی ہیں۔(۱۳۶)

مشرکین کی مختلف حماقتوں میں سے ایک حماقت یہ ذکر کی گئی ہے کہ وہ زمین سے حاصل ہونے والے غلے اور چوپاؤں میں اللہ کا حصہ الگ کر لیتے تھے اور اپنے شرکاء کا حصہ الگ کر لیتے تھے، پھر جو ان کے شرکاء کا حصہ ہوتا تھا اسے تو اللہ کے حصے میں نہیں ملنے دیتے تھے؛ لیکن جو اللہ کا حصہ ہوتا تھا وہ اگر شرکاء کے حصے میں مل جاتا تو اسے برا نہیں سمجھتے تھے۔

(۲) بیٹیوں کا قتل

ان کی دوسری حماقت یہ تھی کہ وہ اپنی بیٹیوں کو فقر یا عار کی وجہ سے قتل کر دیتے تھے۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ

اور اسی طرح بہت سے مشرکین کو ان کے شریکوں نے سجھا رکھا ہے کہ اپنی اولاد کو قتل کرنا بڑا اچھا کام ہے، تاکہ وہ ان (مشرکین) کو بالکل تباہ کر ڈالیں، اور ان کے لیے ان کے دین کے معاملے میں مغالطے پیدا کر دیں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کر سکتے۔ لہٰذا ان کو اپنی افترا پردازیوں میں پڑا رہنے دو۔(۱۳۷)

بعض اس وجہ سے بھی لڑکیوں کو دفن کر دیتے تھے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، اس لیے انسانوں کے لیے مناسب نہیں کہ وہ لڑکیاں رکھیں۔ (خلاصۂ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن: م اش)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عورت پر احسان:

عورت پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات میں سے ایک بڑا احسان یہ ہے کہ حضور نے اپنی زبان عمل سے یہ سمجھایا کہ بیٹی کا وجود نہ تو باعث ننگ و عار ہے اور نہ ہی فقر و غربت میں اضافے کا سبب۔

(۳) چوپاؤں میں نام نہاد تقسیم:

مشرکین کی تیسری حماقت قرآن نے یہ بتلائی کہ انہوں نے چوپاؤں کو مختلف قسموں میں تقسیم کر رکھا تھا۔

بعض وہ تھے جو کاہنوں اور مذہبی پیشواؤں کے لیے مخصوص تھے۔

بعض وہ تھے کہ جن پر سوار ہونا اور ان سے کسی بھی طرح فائدہ اٹھانا جائز نہیں سمجھتے تھے۔

اور بعض وہ تھے جنہیں ذبح کرتے وقت اللہ کی بجائے بتوں کے نام ذکر کرتے تھے، چنانچہ اللہ پاک فرماتے ہیں:

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ ....الیٰ.........سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

اور یوں کہتے ہیں کہ: ان چوپایوں اور کھیتیوں پر پابندی لگی ہوئی ہے، ان کا زعم یہ ہے کہ: ان کو سوائے ان لوگوں کے کوئی نہیں کھا سکتا جنہیں ہم کھلانا چاہیں اور کچھ چوپائے ایسے ہیں جن کی پشت حرام قرار دی گئی ہے اور کچھ چوپائے وہ ہیں جن کے بارے میں اللہ پر یہ بہتان باندھتے ہیں کہ ان پر اللہ کا نام نہیں لیتے۔ جو افترا پردازی یہ لوگ کر رہے ہیں، اللہ انہیں عنقریب اس کا پورا پورا بدلہ دے گا۔(۱۳۸)

(۴) مرد و عورت کے لیے الگ الگ حلال و حرام:

ایک چوتھی حماقت یہ بتلائی گئی کہ چوپائے کے پیٹ سے جو بچہ پیدا ہوتا تو اسے مردوں کے لیے حلال سمجھتے تھے مگر عورتوں کے لیے حرام اور اگر وہ مردہ پیدا ہوتا تو اسے مرد اور عورتوں دونوں کے لیے حلال سمجھتے تھے۔

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا.......الیٰ.........اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾

نیز وہ کہتے ہیں کہ: ان خاص چوپایوں کے پیٹ میں جو بچے ہیں وہ صرف ہمارے مردوں کے لیے مخصوص ہیں، اور ہماری عورتوں کے لیے حرام ہیں۔ اور اگر وہ بچہ مردہ پیدا ہو تو اس سے فائدہ اٹھانے میں سب (مرد و عورت) شریک ہو جاتے ہیں، جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں، اللہ انہیں عنقریب ان کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ یقیناً وہ حکمت کا بھی مالک ہے، علم کا بھی مالک۔(۱۳۹)

سبزیاں، پھل اور جانور؛ اللہ کی بے پایاں نعمتیں:

مشرکین کی یہ حماقتیں بتانے کے بعد انہیں اللہ کی نعمتیں یاد دلائی گئیں کہ

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ.......الیٰ.....................وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۴۲﴾

اللہ وہ ہے جس نے باغات پیدا کیے جن میں سے کچھ (بیل دار ہیں جو) سہاروں سے اوپر چڑھائے جاتے ہیں، اور کچھ سہاروں کے بغیر بلند ہوتے ہیں، اور نخلستان اور کھیتیاں، جن کے ذائقے الگ الگ ہیں، اور زیتون اور انار، جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں، اور ایک دوسرے سے مختلف بھی۔ جب یہ درخت پھل دیں تو ان کے پھلوں کو کھانے میں استعمال کرو، اور جب ان کی کٹائی کا دن آئے تو اللہ کا حق ادا کرو، اور فضول خرچی نہ کرو۔ یاد رکھو، وہ فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔(۱۴۱) اور چوپایوں میں سے اللہ نے وہ جانور بھی پیدا کیے ہیں جو بوجھ اٹھاتے ہیں اور وہ بھی جو زمین سے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ اللہ نے جو رزق تمہیں دیا ہے، اس میں سے کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ یقین جانو، وہ

تمہارے لیے ایک کھلا دشمن ہے۔(۱۴۲)

مشرکین کی تحریمات خودساختہ ہیں:

مشرکین سے یہ کہا جارہا ہے کہ ہماری تحریمات منقولی (یعنی جن چیزوں کو ہم حلال یا حرام کہتے ہیں، تو وہ ہم اپنی طرف سے نہیں کہتے، بلکہ وہ چیزیں اللہ تعالی کی جانب سے حلال یا حرام کردہ ہیں اور شریعت میں ان کا بیان بھی موجود ہے) ہیں، اور تمہاری تحریمات منقول نہیں، بلکہ تمہاری خودساختہ ہیں، ہم جن چیزوں کو حلال، یا حرام قرار دے رہے ہیں، ان کا بیان شریعت میں موجود ہے اور ہم اس کی علت بھی بیان کرتے ہیں، مگر تمہارا حال ایسا نہیں، لہذا صرف انہی تحریمات کا اعتبار ہوگا، جن کا بیان شریعت اسلامیہ میں موجود ہوگا، مثلاً مردار، بہتا خون، خنزیر اپنے تمام اجزاء کے ساتھ اور اسی طرح غیر اللہ کے نام نامزد کیا ہوا مال اور جانور حرام ہے، چنانچہ اللہ پاک فرماتے ہیں:

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ....... الیٰ.........فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾

(اے پیغمبر! ان سے) کہو کہ: جو وحی مجھ پر نازل کی گئی ہے اس میں تو میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جس کا کھانا کسی کھانے والے کے لیے حرام ہو، الا یہ کہ وہ مردار ہو، یا بہتا ہوا خون ہو، یا سور کا گوشت ہو، کیونکہ وہ ناپاک ہے، یا جو ایسا گناہ کا جانور ہو جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو۔ ہاں جو شخص (ان چیزوں میں سے کسی کے کھانے پر) انتہائی مجبور ہو جائے، جبکہ وہ نہ لذت حاصل کرنے کی غرض سے ایسا کر رہا ہو، اور نہ ضرورت کی حد سے آگے بڑھے، تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔(۱۴۵)

مشرکین کے ایک اعتراض کے تین مسکت جوابات:

پھر ان مشرکوں کے ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے، ان کا اعتراض تھا کہ اگر اللہ کی مشیت (مرضی) نہ ہوتی، تو ہم اور ہمارے آباواجداد شرک نہ کرتے اور نہ ہی چیزوں کو حرام کرنے کے مرتکب بنتے۔

(۱) جواب یہ دیا گیا کہ تم اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہو، اگر اللہ کی مشیت اسی میں ہوتی تو اللہ تعالی تمہاری ہدایت کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث ہی کیوں فرماتا؟ انبیاء اور رسل تو تمہاری طرف تمہاری رشد اور رہنمائی کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے۔

(۲) دوسرا جواب یہ دیا کہ زبانی دعوے مت کرو، اگر کوئی عقلی، یا نقلی دلیل ہے تو پیش کرو۔

(۳) مشیت میں رضا کا ہونا ضروری نہیں، کیوں کہ اگر مشیت میں رضامندی بھی ہوتی تو ان مشرکوں کے آباواجداد کی بیخ کنی نہ ہوتی۔

اللہ کی مشیت اصل ہے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی کی مشیت اور ارادہ ہوتا ہے تو کام ہوتا ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ

بندے کی مشیت اور ارادہ بھی ضروری ہے، جیسا کہ آپ نے سوچا کہ آج فلاں جگہ جانا ہے، آپ سے کسی نے پوچھا کہ کہاں جانا ہے، آپ نے بتا دیا، اب اس سائل کا بھی جانے کا ارادہ ہے، مگر آپ کے ارادے کے تابع ہے، جو آپ کے دل میں ہے، وہی اس کے دل میں بھی ہے، مگر وہ بھی اپنے ارادے میں مجبور، اسی طرح بندے اور اللہ تعالی کا ارادہ ہے، بندہ اللہ کے ارادے کے ساتھ مجبور نہیں، بلکہ با اختیار ہے، لیکن جب سرکشی کرے گا تو پھر اللہ تعالی جو فیصلہ کرے گا، اس میں مجبور ہو جائے گا۔ چنانچہ اللہ پاک فرماتے ہیں:

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا ..... الی............. وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ۝۱۵۰

جن لوگوں نے شرک اپنایا ہوا ہے وہ یہ کہیں گے کہ: اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے، نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم کسی بھی چیز کو حرام قرار دیتے، ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی اسی طرح (رسولوں کو) جھٹلایا تھا، یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھ لیا۔ تم ان سے کہو کہ: کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جو ہمارے سامنے نکال کر پیش کر سکو؟ تم تو جس چیز کے پیچھے چل رہے ہو وہ گمان کے سوا کچھ نہیں، اور تمہارا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہمی اندازے لگاتے رہو۔ (۱۴۸) (اے پیغمبر! ان سے) کہو کہ: ایسی دلیل تو اللہ ہی کی ہے جو (دلوں تک) پہنچنے والی ہو۔ چنانچہ اگر وہ چاہتا تو تم سب کو (زبردستی) ہدایت پر لے آتا۔ (۱۴۹) ان سے کہو کہ: اپنے وہ گواہ ذرا سامنے لاؤ جو یہ گواہی دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ پھر اگر یہ خود گواہی دے بھی دیں تو تم ان کے ساتھ گواہی میں شریک نہ ہونا، اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے۔ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اور جو دوسروں کو (خدائی میں) اپنے پروردگار کے برابر مانتے ہیں۔ (۱۵۰)

انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے دس وصیتیں

مشرکین کے عقائد اور دعوؤں کی تردید کے بعد وہ مشہور آیات ہیں جن میں اللہ نے ایسی دس وصیتیں بیان فرمائی ہیں جن پر ساری آسمانی شریعتیں متفق ہیں اور تمام ادیان ان پر عمل کی دعوت دیتے ہیں، کیونکہ ان پر عمل کرنے سے انسانی سعادت کی حفاظت ہوتی ہے اور اسے دنیا و آخرت میں عزت و کرامت کی وہ زندگی حاصل ہوتی ہے جو اللہ تعالی انسان کو دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس کا ذکر آیت نمبر ۱۵۱ تا ۱۵۳ میں مذکور ہیں:

(۱) پہلی وصیت یہ ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

(۲) دوسری یہ کہ والدین کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے اور انہیں اپنی زبان و عمل سے تکلیف نہ دی جائے۔

(۳) تیسری یہ کہ اولاد کو فقر کے ڈر سے یا ننگ و عار کے خوف سے قتل نہ کیا جائے۔

(۴) چوتھی یہ کہ ہر قسم کے فواحش اور برائیوں سے بچا جائے، خواہ وہ خفیہ ہوں یا علانیہ۔

''فواحش'' کے معنی بہت وسیع ہیں۔تنہا زنا کاری کے نہیں، بدکاری، بے حیائی، فحاشی کی تمام صورتیں اس کے اندر آ گئیں، لہٰذا اس کے قریب نہ جاؤ۔''**ما ظهر منها و ما بطن**''۔نے تو تعمیم کی حد ہی کر دی۔بے حجابی، لباس میں بے ستری وغیرہ کی تمام خفی صورتیں خواہ پبلک میں ہوں یا پرائیویٹ ہوں، یکساں حرام قرار پا گئیں، چہرے پر پاؤڈر، لپ اسٹک وغیرہ لگا کر، بن سنور کر، نیم برہنہ لباس پہن کر، خوشبوئیں لگا کر، عورتوں کا آزادی کے ساتھ بے تکلف باہر نکلنا، مردوں کے مجمع میں چلنا پھرنا، سیمینار اور تھیٹر میں گندے نظاروں سے لطف اندوز ہونا، آرٹ گیلری میں برہنہ تصویریں دیکھنا، غرض تہذیب جدید کے سارے جاہلی عنصر اس آیت کی رو سے حرام ٹھہرائے جاتے ہیں۔اخلاق کی پاکیزگی، اور پاکیزہ خیالی جو فرد و جماعت دونوں کی حقیقی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔اس کی جو نظیر شریعت اسلام نے قائم کر دی ہے وہ کہیں اور تلاش سے بھی نہ ملے گی۔

(۵) پانچویں یہ کہ انسان کو ناحق قتل کرنا حرام ہے، یہ بدترین گناہ ہے۔

(۶) چھٹی یہ کہ یتیم کے مال میں ناجائز تصرف نہ کیا جائے۔

(۷) ساتویں یہ کہ ناپ تول کو پورا رکھا جائے۔

(۸) آٹھویں یہ کہ سارے انسانوں کے درمیان عدل کو ملحوظ رکھا جائے، خواہ کوئی اپنا قریبی ہو یا دشمن۔

(۹) نویں یہ کہ اللہ کے عہد کو پورا کیا جائے۔

(۱۰) دسویں یہ کہ صراط مستقیم ہی کی اتباع کی جائے اور مختلف راستوں پر چلنے سے احتراز کیا جائے۔(آیت : ۱۵۱، ۱۵۳) (خلاصۃ القرآن: م اش، ماجدی: ۲/ ۲۷۸)

تمام افعال و اعمال میں اخلاص:

یہ وصیتیں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ آپ علی الاعلان کہہ دیجیے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے دین حق کی ہدایت دی ہے، یہی ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین تھا اور میری نماز اور عبادات، سارے افعال و اعمال خالص اللہ کے لیے ہیں، میں ان اعمال سے صرف اللہ کی رضا چاہتا ہوں۔

سورت کا اختتام اس بات پر ہوا کہ یہ دنیا اور جو کچھ اس میں ہے یہ ابتلاء اور آزمائش کے لیے ہے تاکہ مومن، کافر اور نیک اور بد میں فرق ہو جائے۔(خلاصۃ القرآن: م اش)

خلاصہ رکوع: ۱۴......اس قسم کی مسخ شدہ ہستیاں انبیاء علیہم السلام کی معاند ہوتی آئی ہیں۔ماخذ: آیت: ۱۱۲۔

خلاصہ رکوع: ۱۵......توحید کے موافق و مخالف یکساں نہیں ہو سکتے، اور مخالفین کی رسوائی۔ماخذ: آیت: ۱۲۲، ۱۲۴۔

خلاصہ رکوع: ۱۶......مخالفین توحید کا احساس حق اور ان کا موجودہ مسلک خلاف عقل و نقل ہے۔ماخذ: آیت: ۱۳۰، ۱۳۸، ۱۴۰۔

خلاصہ رکوع: ۱۷...... (گزشتہ رکوع میں آچکا ہے کہ کفار کی حلت وحرمت خلاف عقل ونقل ہے) اب بتلایا جاتا ہے کہ ہماری حلت اشیاء منقول اور معقول ہے۔ ماخذ: آیت: ۱۴۱، ۱۴۲۔

خلاصہ رکوع: ۱۸...... مسلمانوں کی حرام کردہ اشیاء کی حرمت منقول ہے، اور علاوہ اس کے معقول بھی ہے۔ ماخذ: آیت: ۱۴۵۔

خلاصہ رکوع: ۱۹...... ماکولات کے سوابقیہ خلاصہ قانون اسلام۔ ماخذ: آیت: ۱۵۱۔

خلاصہ رکوع: ۲۰...... تم تو قرآن سے اعراض کرتے ہو اور ہم اس کتاب بابرکت کا اتباع کرا کے تمہیں مسلک ابراہیمی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ ماخذ: آیت: ۱۵۵، ۱۶۱۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الاعراف

تعارف:

یہ سورت بھی مکی ہے۔ اس کا بنیادی موضوع آنحضرت ﷺ کی رسالت اور آخرت کو ثابت کرنا ہے۔ اس کے ساتھ توحید کے دلائل بھی بیان ہوئے ہیں۔ اور متعدد انبیائے کرام علیہم السلام کے واقعات بھی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ خاص طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر تشریف لے جانے کا واقعہ سب سے زیادہ مفصل طریقے پر اسی سورت میں آیا ہے۔ اعراف کے لفظی معنی بلندیوں کے ہیں۔ اور اصطلاح میں یہ اس جگہ کا نام ہے جو جنت اور دوزخ کے درمیان واقع ہے، اور جن لوگوں کے اچھے اور برے اعمال برابر ہوں گے ان کو کچھ عرصے کے لیے یہاں رکھا جائے گا، پھر ان کے ایمان کی وجہ سے آخر کار وہ بھی جنت میں داخل ہو جائیں گے؛ چونکہ اسی سورت میں اعراف اور اس میں رکھے جانے والوں کا بیان تفصیل سے آیا ہے، اس لیے اس کا نام سورہ اعراف رکھا گیا ہے۔ (توضیح القرآن)

علامہ طبریؒ نے حضرت حذیفہؓ سے نقل کیا ہے کہ جن لوگوں کی نیکیاں اور گناہ برابر ہو جائیں گے، وہ اپنی نیکیوں کی وجہ سے دوزخ سے نجات پا جائیں گے اور برائیوں کے لحاظ سے جنت کے مستحق نہیں ہوں گے، انہیں اس جگہ رکھا جائے گا، پھر بعد میں اللہ تعالیٰ ان کے لئے فیصلہ فرمائیں گے، اور بظاہر یہ فیصلہ جنت کا ہی ہوگا؛ کیوں کہ اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے، ان کو ''اصحاب اعراف'' کہتے ہیں۔

یہ قرآن کریم کی ساتویں سورۃ ہے، نزول کے اعتبار سے ۳۹ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں کل رکوع ۲۴، آیات ۲۰۶، تعداد کلمات ۳۳۸۷ اور حروف ۱۴۶۳۵ ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

ربط:

سورہ انعام کے آخر میں آیت کریمہ: ''قل اننی ھدانی ربی الی صراط مستقیم'' سے دین حق کی تعیین فرمائی

گئی، اس سورۃ میں "کتاب انزل " سے آخرت کے معاملات کا بیان ہے، ایسے ہی پہلی سورۃ میں "**وھو الذي جعلكم خلٰئف الارض** " سے آخر آیت تک آخرت کے ثواب وعذاب کی ترغیب وترہیب تھی، اس سورۃ میں "**فلنسئلن** " سے آخرت کے ثواب کا ذکر فرمایا گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ عرب کی قوت روحانی جو عرصہ سے مردہ ہوگئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام سے حرکت میں آ رہی ہے، گھر گھر چرچے ہورہے ہیں، مکہ میں کھلبلی مچی ہوئی ہے، ایسی حالت میں لگاتار ہدایت افزا مضامین کا مینھ برسنا اور اس سورۃ کا نازل ہونا نفوس بشریہ کو حرکت دینا ہے۔

خلاصہ سورہ:

چنانچہ اس سورۃ میں مبداء ومعاد کی تشریح اور دنیا کی بے ثباتی اور عالم قدس کے ناز ونعم کی عکسی تصویر کھینچی گئی ہے اور "کتاب انزل " سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت عامہ کے لئے ابھارا جاتا ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا ہے، آپ اس بات سے دل تنگ نہ ہوں کہ آپ اس سے لوگوں کو متنبہ کریں اور بدکاروں کو ڈراویں اور ایمانداروں کے لئے اس سے نصیحت حاصل ہو یعنی آپ تبلیغ دعوت عامہ میں کچھ دل تنگی نہ پاویں، نبی پاک علیہ السلام کو تبلیغ کی تاکید فرما کر آگے "اتبعوا " سے لوگوں کو اس کی تعمیل پر مامور کیا۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

یہ مکی سورت ہے اور اس میں دوسو چھ آیات ہیں، اور دوسری مکی سورتوں کی طرح اس میں بھی تینوں بنیادی عقائد کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ اس سورت کی ابتداء میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دائمی معجزہ یعنی قرآن کا ذکر ہے جو کہ سارے انسانوں کے لیے اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

سورہ اعراف کے مضامین تین ہیں:

(۱) پیغام حق پہنچانے میں مصائب آئیں گے، مگر سب سے کٹ کر اللہ کے پیغام کو پہنچانا ہے۔
(۲) شرک فعلی (غیر اللہ کے نام کی نذر ونیاز ماننا) پر رد ہے اور حکم ہے کہ حلال وحرام میں اللہ تعالی کے قوانین پر عمل کرو۔
(۳) عالم الغیب صرف اللہ تعالی کی ذات ہے۔

سورہ اعراف دراصل اپنے سے پہلی سورت الانعام کی مثنی ہے، اس میں دعوت وتلقین تھی اس میں انذار کا پہلو غالب ہے اور واضح اور دوٹوک انداز میں قریش کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو عذاب الہی تم کو کسی وقت بھی آ دبوچے گا۔ قریش کے ساتھ یہود کو بھی شامل کیا ہے اور ان کو بھی آخری تنبیہ کی گئی ہے۔

دوران سورت خطاب کا رخ یہود کی طرف بھی پھر گیا ہے، یہود کو مخاطب کر کے اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اللہ کے پیغمبر پر ایمان لانے کے بعد اس کے ساتھ منافقانہ روش اختیار کرنا، اور سمع وطاعت کا عہد استوار کرنے کے بعد اسے توڑ دینا اور اس کا پاس نہ کرنا اور حق وباطل کا علم ہوجانے کے بعد پھر ان میں التباس پیدا کرنا یا باطل کو ترجیح دینا ایک برے انجام کی طرف لے جاتا ہے۔

سورت کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کے صحابہ کو دعوت وتبلیغ کے بارے میں چند اہم ہدایات دی گئی ہیں، اور خصوصیت کے ساتھ ان کو نصیحت کی گئی ہے کہ مخالفین کی اشتعال انگیزیوں اور ظلم وستم کے مقابلے میں صبر وتحمل سے کام لیں، اور جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی ایسا کام نہ کریں جو اصل مقصد کو ضعف پہنچانے والا ہو۔ (قرآن ایک نظر میں)

مکہ کی زندگی میں مسلمانوں اور کفار کے درمیان کافی کشمکش رہی، سخت تکلیفیں دینا شروع کر دیں، اسلام کی مخالفت شروع کر دی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت بھی اب گھر سے باہر ہونے لگی تھی، یہ اہم موڑ تھا، اس وقت یہ سورت اتری، جس کا بنیادی موضوع ''رسالت کی اہمیت'' اور حق و باطل کی جنگ کا تسلسل تھا اور آخر میں حق کا بول بالا ہوتا ہے اسے بھی ثابت کرنا ہے۔ یہ جنگ آدم علیہ السلام کی شیطان کے ساتھ شروع ہوئی تو اس کی ابتدا اس واقعہ سے ہوئی، جنت وجہنم کے راستے واضح ہو گئے، یہ سورت ایک مسلمان سے پوچھ رہی ہے تم کہاں ہو؟ اپنے مقام کا تعین کر۔ ایسی حالت ہر دور میں ہوگی۔ صحابہ سے قیامت تک، انسان اور اس کے نفس کے درمیان کشمکش ہوتی رہے گی، یہ بات انبیاء کے واقعات سے پیش کی گئی، حضرت نوح اور ان کی قوم آمنے سامنے تھی، نفاق کی کوئی راہ نہیں کیونکہ انسان کا ایک خاص ہدف ہونا ضروری ہے، جو اس کے عقائد کو واضح کرے۔ دو گروہ کا بیان ہے یعنی جنتی (مومن)، جہنمی (کافر)۔ سورت کا آغاز ہی ایک ہدف کی طرف اشارہ کرتا ہے، کسی سے شرمائے بغیر، باطل کے دباؤ میں آئے بغیر، کسی سے ڈرے بغیر ایمان کی دعوت قبول کرنا اور لوگوں کو مدعو کرنا ہے، تیسری آیت اسی موضوع سے متعلق ہے۔ ایک مسلمان کو اپنے مسلک پر ثابت قدم رہنا چاہیے، ورنہ وہ شیطان کے جال میں پھنس جائے گا، شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار برہنہ کرنا ہے، بے شرمی، عریانی۔ اسی لیے ستر عورت کو اہمیت دی گئی۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کو اس گناہ کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے، مسلمان خواتین اور نوجوان لڑکیاں سمجھ لیں کہ شیطان کی چال کا پہلا اثر عریانیت تھا، اس کا کام ہماری برائیوں کو بے نقاب کرنا ہے، پردے کی اہمیت، بنو آدم میں ستر عورت جنت سے شامل ہے، حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ نے پہلے ستر کو چھپانے کی کوشش کی، جنتی اور جہنمی یہ دو جماعتیں ہیں اور اصحاب اعراف ان کے درمیانی جماعت ہے، جنتی کو سلام کریں گے، جہنم سے پناہ مانگیں گے، دونوں کے حال دیکھیں گے، ہمیشہ حق اور باطل کے درمیان کشمکش رہی؛ لیکن حق کی فتح ہوئی اور باطل کی شکست کا سبب ان کے ایسے اعمال تھے جو اللہ کو ناراض کرتے تھے۔ پانچ انبیاء کے واقعات کی تفصیل اور ان کی دعوت اور انداز ایک جیسا تھا۔ (خواطر، قرآن سارانس گجراتی)

رسالت کا ذکر:

الٓمّٓصٓ ۝١ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝٢ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝٣

المص (ا) (اے پیغمبر) یہ کتاب ہے جو تم پر اس لیے اتاری گئی ہے کہ تم اس کے ذریعے لوگوں کو ہوشیار کرو، لہذا

اس کی وجہ سے تمہارے دل میں کوئی پریشانی نہ ہونی چاہئے ،اور مومنوں کے لیے یہ ایک نصیحت کا پیغام ہے۔(۲)(لوگو) جو کتاب تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے اتاری گئی ہے، اس کے پیچھے چلو، اور اپنے پروردگار کو چھوڑ کر دوسرے (من گھڑت) سرپرستوں کے پیچھے نہ چلو۔(مگر) تم لوگ نصیحت کم ہی مانتے ہو۔(۳)

قیامت میں اعمال کا وزن ہوگا

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝۸.......الی..........قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۝۱۰

اور اس دن (اعمال کا) وزن ہونا اٹل حقیقت ہے۔ چنانچہ جن کی ترازو کے پلے بھاری ہوں گے، وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔(۸) اور جن کی ترازو کے پلے ہلکے ہوں گے، وہی لوگ ہیں جنہوں نے ہماری آیتوں کے ساتھ زیادتیاں کر کر کے خود اپنی جانوں کو گھاٹے میں ڈالا ہے۔(۹) اور کھلی بات ہے کہ ہم نے تمہیں زمین میں رہنے کی جگہ دی، اور اس میں تمہارے لیے روزی کے اسباب پیدا کیے۔(پھر بھی) تم لوگ شکر کم ہی ادا کرتے ہو۔(۱۰)

حضرت آدمؑ اور شیطان کا واقعہ

گزشتہ آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تبلیغ و دعوت کا اور لوگوں کو آپ کے اتباع اور اطاعت کا حکم دیا اور نافرمانی کرنے پر دنیوی اور اخروی عذاب سے آگاہ کیا۔ اب ان آیات میں اپنے انعامات و احسانات کو بیان فرماتے ہیں، تاکہ ان احسانات کا خیال کر کے اللہ کی اطاعت اور اس کی شکر گزاری کی طرف متوجہ ہوں اور منعم حقیقی کے مقابلہ میں ابلیس کی طرح تمرد اور سرکشی نہ کریں، اس لیے حضرت آدم علیہ الصلوۃ والسلام کی پیدائش کا قصہ ذکر فرمایا تاکہ اس سے اس علیم وقدیر کی کمال قدرت اور کمال حکمت کا علم ہو اور حضرات انبیاء کرام کی بعثت کی ضرورت معلوم ہو کہ حضرات انبیاء کرام خداوند احکم الحاکمین کے سفراء اور خلفا اور نائبین ہیں، جس شخص نے ان کی اتباع کی وہ کامیاب ہوا اور جس نے ان کی مخالفت کی وہ تباہ اور برباد ہوا۔ بغیر انبیا ورسل کے اتباع کے بندہ خدا تک نہیں پہنچ سکتا، وہ بڑے بڑے انعامات جن کا خاص طور پر ان آیات میں حق تعالیٰ نے اظہار فرمایا وہ یہ ہیں۔

(۱) ہم نے تمہیں زمین پر قابض بنایا کہ جس طرح چاہو اس میں تصرف کرو۔

(۲) تمہاری زندگی کی چیزیں زمین میں پیدا کیں کہ ان سے ہمارے نازل کردہ قانون شریعت کے ماتحت نفع حاصل کرو۔

(۳) تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو یہ شرافت عطاء کی کہ زمین میں ان کو اپنا خلیفہ بنایا اور تمام فرشتوں سے ان کو سجدہ کرایا۔

(۴) شیطان کو صرف اس وجہ سے کہ اس نے خدا کے خلیفہ اور اس کے برگزیدہ رسول کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا

جنت سے نکال دیا۔شیطان تمہارا قدیمی دشمن ہے،اس سے ہوشیار رہنا، باپ کے طریقہ پر چلنا اور دشمن کے وسوسوں کی طرف التفات نہ کرنا۔

(۵) پھر اخیر میں آخرت یاد دلائی کہ یہ دنیا چند روزہ ہے، اس کی نعمتوں اور عشرتوں میں مست ہو کر آخرت سے غافل نہ ہو جانا۔ **ولكن في الأرض مستقر ومتاع إلى حين قال فيها تحيون وفيها تموتون ومنها تخرجون** غرض یہ کہ اس طرح حق تعالیٰ نے مبداء اور منتہیٰ دونوں کو بتلا دیا اور اس کو علم مبداء ومعاد کہتے ہیں۔(تفسیر ادریسی: ۳/ ۷۸)

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ...... الیٰ .... وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ﴿۲۵﴾

اور ہم نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہاری صورت بنائی، پھر فرشتوں سے کہا کہ: آدم کو سجدہ کرو۔ چنانچہ سب نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے۔ وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔(۱۱) اللہ نے کہا: جب میں نے تجھے حکم دے دیا تھا تو تجھے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا؟ وہ بولا: میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا، اور اس کو مٹی سے پیدا کیا۔(۱۲) اللہ نے کہا: اچھا تو یہاں سے نیچے اتر، کیونکہ تجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ یہاں تکبر کرے۔ اب نکل جا، یقیناً تو ذلیلوں میں سے ہے۔(۱۳) اس نے کہا: مجھے اس دن تک (زندہ رہنے کی) مہلت دیدے جس دن لوگوں کو قبروں سے زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔(۱۴) اللہ نے فرمایا تجھے مہلت دے دی گئی۔ (۱۵) کہنے لگا: اب چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، اس لیے میں (بھی) قسم کھاتا ہوں کہ ان (انسانوں) کی گھات لگا کر تیرے سیدھے راستے پر بیٹھ رہوں گا۔(۱۶) پھر میں ان پر (چاروں طرف سے) حملے کروں گا، ان کے سامنے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی، اور ان کی دائیں طرف سے بھی، اور ان کی بائیں طرف سے بھی۔ اور تو ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائے گا۔(۱۷) اللہ نے کہا: نکل جا یہاں سے، ذلیل اور مردار ہو کر، ان میں سے جو تیرے پیچھے چلے گا، (وہ بھی تیرا ساتھی ہوگا) اور میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔ (۱۸) اور اے آدم! تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو، اور جہاں سے جو چیز چاہو، کھاؤ۔ البتہ اس (خاص) درخت کے قریب بھی مت پھٹکنا، ورنہ تم زیادتی کرنے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔(۱۹) پھر ہوا یہ کہ شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا، تاکہ ان کی شرم کی جگہیں - جو ان سے چھپائی گئی تھیں - ایک دوسرے کے سامنے کھول دے، کہنے لگا کہ: تمہارے پروردگار نے تمہیں اس درخت سے کسی اور وجہ سے نہیں، بلکہ صرف اس وجہ سے روکا تھا کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ، یا تمہیں ہمیشہ کی زندگی نہ حاصل ہو جائے۔(۲۰) اور ان کے سامنے وہ قسمیں کھا گیا کہ یقین جانو، میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں۔(۲۱) اس طرح اس نے دونوں کو دھوکا دے کر نیچے اتار ہی لیا؛ چنانچہ جب دونوں نے اس درخت کا مزہ چکھا تو ان دونوں کی شرم کی جگہیں ایک دوسرے پر کھل گئیں، اور وہ جنت کے کچھ پتے جوڑ جوڑ کر اپنے بدن پر چپکانے لگے اور ان کے پروردگار نے انہیں آواز دی کہ: کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے روکا نہیں تھا، اور تم سے یہ نہیں کہا تھا

کہ شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے؟ (۲۲) دونوں بول اٹھے کہ: اے ہمارے پروردگار! ہم اپنی جانوں پر ظلم کر گزرے ہیں، اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم نامراد لوگوں میں شامل ہو جائیں گے۔ (۲۳) اللہ نے (آدم، ان کی بیوی اور ابلیس سے) فرمایا: اب تم سب یہاں سے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے لیے ایک مدت تک زمین میں ٹھہرنا اور کسی قدر فائدہ اٹھانا (طے کر دیا گیا) ہے۔ (۲۴) فرمایا کہ: اسی (زمین) میں تم جیو گے، اور اسی میں تمہیں موت آئے گی، اور اسی سے تمہیں دوبارہ زندہ کر کے نکالا جائے گا۔ (۲۵)

انسان کی تکریم:

اسی طرح اس سورت میں انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو تکریم بخشی اس کا بھی ذکر ہے، وہ یہ کہ

اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان کو اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا۔

اس میں اپنی روح پھونکی۔

اور فرشتوں کو اس کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔

شیطان کے مکر و فریب سے بچنے کی تلقین:

اس قصہ کے ضمن میں شیطان کے مکر و فریب سے بچنے کی بھی تلقین کی گئی ہے کیونکہ وہ ایسا مکار دشمن ہے جو انسان کی راہ کھوٹی کرنے کے لیے ہر راستے پر بیٹھا ہوا ہے اور انسان کے ساتھ ٹکراؤ کی جو ابتداء ابلیس کے انکار سجدہ سے ہوئی تھی یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور خیر و شر و باطل کے درمیان کشمکش کسی نہ کسی انداز میں باقی رہے گی۔

ابلیس کا غلط استدلال:

ابلیس کو اپنی عقل و ذہانت پر بہت ناز ہے۔ لیکن یہ استدلال تو مغالطوں کی ایک پوٹ ہے۔ اول تو یہ بنیادی دعوی ہی غلط ہے کہ آگ، خاک سے افضل ہے۔ آگ اور خاک دونوں کے الگ الگ خصوصیات ہیں، کسی لحاظ سے یہ افضل، کسی اعتبار سے وہ، پھر یہ دعوی بھی تمام تر باطل ہے کہ ہمیشہ غیر افضل ہی کو افضل کے آگے جھکنا چاہیے۔ بہت سے موقع اعلی کے لیے بھی ادنی کے آگے جھکنے کے ہوتے ہیں، اور پھر یہ مفروضہ تو اور بھی مہمل ہے کہ افضل کی فرع ہر حال میں غیر افضل کی فرع سے افضل ہی ہوتی ہے، ابلیس اب نافرمانی و کفر اختیار کر چکا تھا اور کافر و نافرمان کی عقل میں نورانیت کہاں؟ وہ تمام تر ظلمانیت سے بھر جاتی ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ ہر ایسا شخص شیطان کا وارث ہے جو اپنی رائے اور رویت کو چاہے وہ کشف پر مبنی ہو یا وجدان و ذوق پر، شریعت کے مقابلہ میں ترجیح دیتا ہے۔ (ماجدی: ۲/۲۹۶)

چار بار ''یا بنی آدم'' کے صیغہ سے خطاب:

سورہ اعراف کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس سورت میں اللہ تعالی نے مسلسل چار بار انسانوں کو ''یا بنی آدم''

کے صیغہ سے خطاب فرمایا ہے۔ یہ چار ندائیں سورہ اعراف کے علاوہ کسی اور سورت میں نہیں ہیں۔

(۱) پہلی ندا

دسویں رکوع میں ہے، جس میں اللہ نے لباس کی نعمت کا ذکر کیا ہے۔ آیت نمبر ۲۶ جس میں فرمایا گیا:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾

اے آدم کے بیٹو اور بیٹیو! ہم نے تمہارے لیے لباس نازل کیا ہے جو تمہارے جسم کے ان حصوں کو چھپا سکے جن کا کھولنا برا ہے، اور جو خوشنمائی کا ذریعہ بھی ہے اور تقوی کا جو لباس ہے وہ سب سے بہتر ہے، یہ سب اللہ کی نشانیوں کا حصہ ہے، جن کا مقصد یہ ہے کہ لوگ سبق حاصل کریں۔ (۲۶)

اہل عرب کی ایک عجیب وغریب رسم کے پس منظر میں نازل ہوئی ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کے قریب رہنے والے کچھ قبیلے مثلاً قریش حمس کہلاتے تھے، عرب کے دوسرے تمام قبیلے حرم کی پاسبانی کی وجہ سے ان لوگوں کی بڑی عزت کرتے تھے، اسی کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ عربوں کے عقیدے کے مطابق کپڑے پہن کر طواف کرنا صرف انہی کا حق تھا، دوسرے لوگ کہتے تھے کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کئے ہیں ان کے ساتھ ہم بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتے، چنانچہ یہ لوگ جب طواف کے لئے آتے تو حمس کے کسی آدمی سے کپڑے نہ ملتے تو وہ بالکل عریاں ہو کر طواف کرتے تھے، یہ آیتیں اس بے ہودہ رسم کی تردید کے لئے نازل ہوئی ہیں۔ (خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

شرم وحجاب انسان کے لیے بالکل فطری وطبعی ہے، اور بے ستری وبے حجابی کی جتنی کوششیں آج مختلف خوشنما ناموں سے کی جارہی ہیں۔ سب آدمی کو آدمیت کی بلندی سے ابلیسیت کی پستی ہی کی طرف لے جانے والی ہیں۔

لباس وحجاب مقاصد شرعی میں سے ہیں۔ اور برہنگی ونیم برہنگی کا فلسفہ خواہ اس کی تبلیغ یورپ اور امریکہ سے ہو رہی ہو یا اس کی ترویج ایشیا اور افریقہ کے وحشی وغیر مہذب قوموں میں ہو، بہر حال ایک شیطانی فلسفہ ہے۔ (ماجدی)

لباس ستر بھی چھپاتا ہے اور زینت کا بھی باعث ہے اور پھر ساتھ ہی فرمایا کہ تقویٰ کا لباس سب سے بہتر لباس ہے، کیونکہ ظاہری لباس عریانی سے بچاتا ہے اور تقویٰ کا لباس شیطانی حملوں سے بچاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ بنی آدم کو یہ بار بار خطاب انہیں شیطان کے وساوس اور مکاریوں سے بچانے کے لیے ہے، تاکہ انسان اس کی ملمع ساز باتیں سن کر دھوکہ نہ کھا جائے کیونکہ وہ ایسا چالاک دشمن ہے جو بظاہر دوست کا لباس پہن کر آتا ہے اور اسے خیر کو شر اور شر کو خیر بنانے کا طریقہ آتا ہے۔

آج جب ہم اپنے اردگرد نظر ڈالتے ہیں تو ہر طرف بے حیائی کا سیلاب امنڈتا ہوا نظر آتا ہے، عورت کو آزادی کا جھانسہ دے کر اس کا لباس اتروا دیا گیا ہے اور اسے ہر ایسی جگہ کی زینت بنا دیا گیا ہے جہاں مرد کی ہوس ناک نظروں کو شیطانی تسکین مل سکے۔ (خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

(۲) دوسری ندا:

دسویں رکوع کی آیت نمبر ۲۷ میں ہے، جس میں اللہ تعالی ابلیس کے فتنہ سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتا ہے:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ.......... الی........اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴿۲۷﴾

اے آدم کے بیٹو اور بیٹیو! شیطان کو ایسا موقع ہرگز ہرگز نہ دینا کہ وہ تمہیں اسی طرح فتنے میں ڈال دے جیسے اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکالا، جبکہ ان کا لباس ان کے جسم سے اتر والیا تھا، تا کہ ان کو ایک دوسرے کی شرم کی جگہیں دکھا دے۔ اور وہ اس کا جتھ تمہیں وہاں سے دیکھتا ہے جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ ان شیطانوں کو ہم نے انہی کا دوست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔ (۲۷)

(۳) تیسری ندا:

دسویں رکوع کی آیت نمبر ۳۱ میں فرمایا گیا:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴿۳۱﴾

اے آدم کے بیٹو اور بیٹیو! جب کبھی مسجد میں آؤ تو اپنی خوشنمائی کا سامان (یعنی لباس جسم پر) لے کر آؤ، اور کھاؤ اور پیو، اور فضول خرچی مت کرو۔ یاد رکھو کہ اللہ فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۳۱)

شرک اور بے حیائی کے کام حرام ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ .... الی............وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴿۳۳﴾

کہہ دو کہ: میرے پروردگار نے تو بے حیائی کے کاموں کو حرام قرار دیا ہے، چاہے وہ بے حیائی کھلی ہوئی ہو یا چھپی ہوئی۔ نیز ہر قسم کے گناہ کو اور ناحق کسی سے زیادتی کرنے کو، اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک مانو جس کے بارے میں اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے، نیز اس بات کو کہ تم اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جن کی حقیقت کا تمہیں ذرا بھی علم نہیں ہے۔

(۴) چوتھی ندا:

گیارہویں رکوع کی آیت نمبر ۳۵ میں فرمایا گیا:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴿۳۵﴾

(اور اللہ نے انسان کو پیدا کرتے وقت ہی یہ تنبیہ کر دی تھی کہ) اے آدم کے بیٹو اور بیٹیو! اگر تمہارے پاس تم ہی میں سے کچھ پیغمبر آئیں جو تمہیں میری آیتیں پڑھ کر سنائیں، تو جو لوگ تقوی اختیار کریں گے اور اپنی اصلاح کر لیں گے،

ان پر نہ کوئی خوف طاری ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔(۳۵)

شیطان چالاک دشمن ہی نہیں مکار لومڑی ہے:

اولادِ آدم کو یہ بار بار خطاب انہیں شیطان کے وساوس اور مکاریوں سے بچانے کے لیے ہے تاکہ انسان ملمع ساز باتیں سن کر دھوکہ نہ کھا جائے، کیونکہ وہ ایسا چالاک دشمن ہے جو بظاہر دوست کا لباس پہن کر آتا ہے اور ایسی مکار لومڑی ہے، جو اپنے آپ کو خیر خواہ کے روپ میں پیش کرتی ہے، اسے حق کو باطل اور باطل کو حق، شر کو خیر اور خیر کو شر بنا کر پیش کرنے کا فن آتا ہے۔ دنیا میں جو لوگ بھی یہ کام کر رہے ہیں وہ حقیقت میں شیطان کے ایجنٹ ہیں۔

ابلیس لعین کا سب سے بڑا ہدف:

یہاں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ پہلی تین ندائیں لباس کے بارے میں ہیں۔ ان میں سے دوسری ندا میں یہ بتادیا گیا کہ ابلیس لعین نے حضرت آدم اور حضرت حوا علیہا السلام کے لباس اتر وادیئے تھے اور ان کے ستر کھلوادیئے تھے، گویا ابلیس کا ایک بڑا ہدف یہ ہے کہ اولادِ آدم کو شرم وحیا کے لباس سے محروم کر دے اور انہیں فحاشی اور عریانیت کی راہ پر لگادے۔ ستر کے تقاضے پورے کرنے والا لباس انسان کو حیوان سے ممتاز کرتا ہے، حیوان ننگا پیدا ہوتا ہے اور زندگی بھر ننگا ہی رہتا ہے جبکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے لباس کے ساتھ عزت اور فضیلت بخشی ہے۔

آج جب ہم مغربی میڈیا کے ذریعہ بے حیائی کے اُمڈتے ہوئے سیلاب اور عورت کی آزادی کے نام پر حیا باختگی کی فضا دیکھتے ہیں تو پھر یہ بات سمجھ آجاتی ہے کہ قرآن نے لباس کے بارے میں تاکید اور تکرار کا اسلوب کیوں اختیار کیا ہے۔

ان نداؤں کے علاوہ سورۂ اعراف کے اہم مضامین درج ذیل ہیں:

مشرکین کا بیت اللہ کا ننگے طواف کرنا:

مشرکین بیت اللہ کا ننگے طواف کرتے تھے اور اپنے اس قبیح عمل اور اس جیسے دوسرے اعمال کے بارے میں حجت یہ پیش کرتے تھے کہ ہمارے آباء واجداد بھی یوں ہی کیا کرتے تھے اور بعض اوقات یہ بھی کہہ دیتے تھے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔

مشرکین کے دعویٰ کی تردید:

ان کے اس دعوی کی تردید کرتے ہوئے فرمایا:

''اللہ بے حیائی کے کاموں کا حکم نہیں دیتا''

لہٰذا تمہارا یہ دعوی جھوٹ اور افتراء کے سوا کچھ نہیں۔

جائز مطالبات کرنے والا دین:

اسلام زندگی کے تمام جائز مطالبات پورا کرنے والا دین ہے، لہٰذا ممکن ہی نہیں کہ وہ لباس پہننے سے اور پاکیزہ

چیزوں کے استعمال سے منع کرے۔

رہبانیت کے قائل:

اس سے ان لوگوں کی بھی تردید ہو جاتی ہے جو رہبانیت کے قائل ہیں اور حلال اور پاک چیزوں سے اجتناب کو اللہ کے قرب کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

کامل مسلمان:

جسم اور روح، دین اور دنیا دونوں کے جائز مطالبات اور تقاضے پورے کرنے والا ہی حقیقت میں کامل مسلمان ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو جب پتہ چلا کہ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ دن کو مسلسل روزے رکھتے ہیں اور رات کو قیام کرتے ہیں، عبادت میں یہ مشغولیت اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اہلیہ تک کے حقوق ادا نہیں کرتے۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی نصیحت:

تو آپ نے انہیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا:

تمہارے اوپر تمہارے رب کا بھی حق ہے، تمہارے نفس کا بھی حق ہے، تمہارے گھر والوں کا بھی حق ہے، لہذا ہر حق والے کو اس کا حق دو۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے ان کی اس نصیحت کا ذکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”سلمان نے سچ کہا ہے۔“

دو گروہوں کا ذکر:

آٹھویں پارہ کے گیارہویں اور بارہویں رکوع میں ایسے دو گروہوں کا ذکر ہے جو فکر و نظر اور عقیدہ و عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

(۱) ایک گروہ ضد اور عناد، کفر اور استکبار کی راہ اپنانے والوں کا ہے جن کا ٹھکانہ جہنم کے سوا کچھ نہیں۔

(۲) دوسرا گروہ تسلیم و انقیاد اور ایمان اور اطاعت کی راہ پر چلنے والوں کا ہے جو بفضلہٖ تعالیٰ جنت کے حقدار ہوں گے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا .... الیٰ ....فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

(لوگو) یقین رکھو کہ جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے، اور تکبر کے ساتھ ان سے منہ موڑا ہے، ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے، اور وہ جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہوں گے جب تک کوئی اونٹ ایک سوئی کے ناکے میں داخل نہیں ہو جاتا اور اسی طرح ہم مجرموں کو ان کے کیے کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ (۴۰) ان کے لیے تو

دوزخ ہی کا بچھونا ہے، اور او پر سے اسی کا اوڑھنا۔ اور اسی طرح ہم ظالموں کو ان کے کیے کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔(۴۱) اور جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہیں (یاد رہے کہ) ہم کسی بھی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتے۔ تو ایسے لوگ جنت کے باسی ہیں۔ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔(۴۲) اور ان کے سینوں میں (ایک دوسرے سے دنیا میں) جو کوئی رنجش رہی ہوگی، اسے ہم نکال باہر کریں گے، ان کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، اور وہ کہیں گے: تمام تر شکر اللہ کا ہے، جس نے ہمیں اس منزل تک پہنچایا، اگر اللہ ہمیں نہ پہنچاتا تو ہم کبھی منزل تک نہ پہنچتے۔ ہمارے پروردگار کے پیغمبر واقعی ہمارے پاس بالکل سچی بات لے کر آئے تھے۔ اور ان سے پکار کر کہا جائے گا کہ: لوگو! یہ ہے جنت! تم جو عمل کرتے رہے ہو ان کی بنا پر تمہیں اس کا وارث بنا دیا گیا ہے۔(۴۳) اور جنت کے لوگ دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے کہ: ہمارے پروردگار نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا، ہم نے اسے بالکل سچا پایا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارے پروردگار نے جو وعدہ کیا تھا، کیا تم نے بھی اسے سچا پایا؟ وہ جواب میں کہیں گے کہ: ہاں، اتنے میں ایک منادی ان کے درمیان پکارے گا کہ: اللہ کی لعنت ہے ان ظالموں پر۔(۴۴)

مطلب یہ دونوں گروہ جب اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے تو قرآن بتاتا ہے کہ ان کے درمیان مکالمہ ہوگا، اہل جنت دوزخیوں سے سوال کریں گے کہ کیا تمہیں آج اللہ کے وعدوں کے سچ ہونے کا یقین آیا یا نہیں؟ وہ جواب میں اقرار کرلیں گے کہ ہاں ہم نے وعدوں کو سچا اور برحق پایا۔

اصحاب اعراف:

ایک تیسرا گروہ بھی ہے جسے قرآن نے ''اصحاب اعراف'' کا نام دیا ہے، یہ وہ لوگ ہوں گے جو مومن تھے؛ لیکن اعمال صالحہ میں دوسرے جنتیوں سے پیچھے رہ گئے ہوں گے، انہیں نہ تو جنت میں داخل کیا جائے گا اور نہ ہی دوزخ میں؛ بلکہ ان کا فیصلہ موخر کردیا جائے گا؛ لیکن بالآخر اللہ تعالی ان کو بھی جنت میں داخل ہونے کی اجازت مرحمت فرمادیں گے۔

اصحاب اعراف کا مکالمہ:

دوزخ اور جنت کے درمیان ایک حجاب یعنی ایک بلند دیوار ہے جس کا خاصہ یہ ہوگا کہ جنت کا اثر دوزخ تک اور دوزخ کا اثر جنت تک نہیں پہنچنے دے گی، کیونکہ اگر اہل جنت کو نار کا کوئی اثر پہنچے تو ان کے لیے باعث ایذاء ہے اور اگر اہل جنت کا کوئی اثر اہل دوزخ تک پہنچے تو ان کے عذاب اور مصیبت میں کمی آجائے، اس لیے درمیان میں ایک پردہ قائم کردیا گیا کہ ادھر کا اثر ادھر نہ پہنچ سکے اور یہ وہی حجاب ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے سورۂ حدید میں ذکر فرمایا ہے۔ **فضرب بينهم بسور له باب۔ باطنه فيه الرحمة و ظاهره من قبله العذاب۔** چنانچہ فرماتے ہیں: اور ان دونوں کے درمیان یعنی جنت اور دوزخ کے درمیان ایک دیوار حائل ہے، جس کا نام اعراف ہے، اعراف کو اعراف کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اہل اعراف ہر شخص کو اوپر سے دیکھ کر پہچان لیں گے کہ یہ جنتی ہے اور یہ دوزخی ہے، اعراف: عرف کی جمع ہے جس کے معنی بلند

جگہ کے ہیں چونکہ وہ دیوار اونچی ہے اس لیے اس کا نام اعراف رکھا گیا جس کی بلندی پر سے جنتی اور دوزخی سب نظر آئیں گے اور اس دیوار اعراف پر کچھ مزدور ہوں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی اس لیے یہ لوگ نہ جنت کے مستحق ہیں اور نہ دوزخ کے، اس لیے فی الحال اور سردست اعراف میں رکھے جائیں گے، پھر آخر میں اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے بہشت میں داخل فرمائے گا۔ (ادریسی: ۳/ ۱۲۳)

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ ...... الیٰ...... اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿٤٩﴾

اور ان دونوں گروہوں (یعنی جنتیوں اور دوزخیوں) کے درمیان ایک آڑ ہوگی اور اعراف پر (یعنی اس آڑ کی بلندیوں پر) کچھ لوگ ہوں گے جو ہر گروہ کے لوگوں کو ان کی علامتوں سے پہچانتے ہوں گے اور وہ جنت والوں کو آواز دے کر کہیں گے کہ: سلام ہو تم پر۔ وہ (اعراف والے) خود تو اس میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے، البتہ اشتیاق کے ساتھ امید لگائے ہوئے ہوں گے۔ (۴۶) اور جب ان کی نگاہوں کو دوزخ والوں کی سمت موڑا جائے گا تو وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! ہمیں ان ظالم لوگوں کے ساتھ نہ رکھنا۔ (۴۷) اور اعراف والے ان لوگوں کو آواز دیں گے جن کو وہ ان کی علامتوں سے پہچانتے ہوں گے۔ کہیں گے کہ: نہ تمہاری جمع پونجی تمہارے کچھ کام آئی، اور نہ وہ جنہیں تم بڑا سمجھے بیٹھے تھے۔ (۴۸) (پھر جنتیوں کی طرف اشارہ کر کے کہیں گے کہ) کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں تم نے قسمیں کھائی تھیں کہ اللہ ان کو اپنی رحمت کا کوئی حصہ نہیں دے گا؟ (ان سے تو کہہ دیا گیا ہے کہ) جنت میں داخل ہو جاؤ، نہ تم کو کسی چیز کا ڈر ہوگا اور نہ تمہیں کبھی کوئی غم پیش آئے گا۔ (۴۹)

دست سوال:

دوزخی جب جہنم کی ہولناک گرمی اور بھوک پیاس سے پریشان ہو جائیں گے تو جنتیوں کے سامنے دست سوال دراز کریں گے کہ ہمیں کچھ کھانے اور پینے کو دو، لیکن ظاہر ہے کہ ان کا یہ سوال رائیگاں جائے گا، چنانچہ ارشاد ہے:

وَنَادَىٰ أَصْحَابُ النَّارِ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ...... الیٰ............ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٥٢﴾

اور دوزخ والے جنت والوں سے کہیں گے کہ: ہم پر تھوڑا سا پانی ہی ڈال دو، یا اللہ نے تمہیں جو نعمتیں دی ہیں، ان کا کوئی حصہ (ہم تک بھی پہنچا دو) وہ جواب دیں گے کہ: اللہ نے یہ دونوں چیزیں ان کافروں پر حرام کر دی ہیں۔ (۵۰) جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا تھا، اور جن کو دنیوی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا تھا۔ چنانچہ آج ہم بھی ان کو اسی طرح بھلا دیں گے جیسے وہ اس بات کو بھلائے بیٹھے تھے کہ انہیں اس دن کا سامنا کرنا ہے اور جیسے وہ ہماری آیتوں کا کھلم کھلا انکار کیا کرتے تھے۔ (۵۱) اور حقیقت یہ ہے کہ ہم ان کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس میں ہم نے

اپنے علم کی بنیاد پر ہر چیز کی تفصیل بتادی ہے اور جولوگ ایمان لائیں ان کے لیے وہ ہدایت اور رحمت ہے۔(۵۲)

اللہ کی قدرت اور توحید کے تین اہم دلائل

(۱) تہ بہ تہ سات آسمان جو کسی ستون کے بغیر کھڑے ہیں؛ اللہ کی قدرت کے واضح ثبوت ہیں۔

(۲) رحمن کا عرش جس کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ سارے آسمان وزمین اس کا احاطہ نہیں کر سکتے اور کسی کا خیال اس کی عظمت کا تصور نہیں کرسکتا، اللہ کا عرش ان متشابہات میں سے ہے کہ ہم اس کے ہونے اور اس کے عظیم الشان ہونے کا یقین تو رکھتے ہیں، مگر اس کی کیفیت کیا ہے؟ وہ کس طرح کا ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے بلکہ اس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ جیسی اللہ کی شان ہے، اس کی شان کے مطابق اس کا عرش ہے۔

(۳) وہ سورج چانداور ستاروں کی تخلیق جو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور غلبہ کے تحت ہے یہ سب چاند، سورج، اور ستارے ایسی فضاء میں تیر رہے ہیں جن کی وسعتوں کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، نہ تو یہ آپس میں ٹکراتے ہیں اور نہ ہی اپنے مدار سے باہر نکلتے ہیں۔

نعمت بارش سے حیات مابعدالموت کا ثبوت:

وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ .... الیٰ............ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴿۵۷﴾

اور وہی (اللہ) ہے جو اپنی رحمت (یعنی بارش) کے آگے آگے ہوائیں بھیجتا ہے جو (بارش کی) خوشخبری دیتی ہیں، یہاں تک کہ جب وہ بوجھ بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم انہیں کسی مردہ زمین کی طرف ہنکالے جاتے ہیں، پھر وہاں پانی برساتے ہیں، اور اس کے ذریعے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں۔ اسی طرح ہم مردوں کو بھی زندہ کر کے نکالیں گے۔ شاید (ان باتوں پر غور کر کے) تم سبق حاصل کرلو۔(۵۷)

یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ ایک مردہ زمین میں جان ڈال دیتا ہے، اسی طرح وہ مردہ انسانوں میں بھی جان ڈالنے پر قادر ہے، مردہ زمین کے زندہ ہونے کے واقعات تم روزمرہ دیکھتے ہو اور یہ بھی مانتے ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوتا ہے، اس سے تمہیں سبق لینا چاہئے کہ انسانوں کو دوبارہ زندگی دینے کو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر سمجھنا کتنی بڑی بے وقوفی ہے۔ (توضیح القرآن)

اس سورت کے شروع میں حق تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کا قصہ بیان فرمایا اور پھر اسی ذیل میں فتنۂ شیطان سے بچنے کی تاکید فرمائی اور بعدازاں اس عہد قدیم کو یاد دلایا کہ جو حق تعالیٰ نے اولاد آدم سے عالم ارواح میں لیا تھا، اب اس کے بعد چھ انبیاء علیہم السلام یعنی حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب، اور حضرت موسیٰ علیہم الصلوۃ والسلام کے قصے برعایت ترتیب ذکر کئے گئے ہیں۔ جن میں بطور اصول اور کلیہ کے یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جس

جگہ کسی نبی کی بعثت ہوئی اوران کی قوم نے ان کو جھٹلایا تو تنبیہ کے لئے اللہ نے پہلے ان کو معاشی تنگی، قحط سالی اور وباء وغیرہ میں مبتلاء کیا، پھر فراغت اور خوشحالی کے ذریعے ان کو آزمایا گیا، جب تمام آسائشوں کے باوجود انہوں نے حق کا راستہ اختیار نہ کیا تو پھر تباہی و بربادی کا عذاب ان پر مسلط کر دیا گیا۔

اس اصول کے ذریعے کئی باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) دنیاوی نعمتوں میں طاعت الٰہی کو اور دنیاوی مصائب میں اللہ کی نافرمانی ومعصیت کو بڑا دخل ہوتا ہے۔

(۲) جن بستیوں پر اللہ کا عذاب نازل ہوا تو وہ بغیر اتمام حجت کے نہیں آیا بلکہ ان کو مہلت بھی دی گئی تنبیہات بھی کی گئیں، اس کے بعد اللہ کے عذاب نے پکڑا ہے۔

(۳) کفار و مشرکین میں سے جن لوگوں کو خوشحالی دی جاتی ہے وہ ایک خاص حکمت کے تحت ہوتی ہے، کیونکہ اس میں برکت نہیں اور مسلمانوں کی خوشحالی میں برکت شامل ہوتی ہے؛ اس لئے کفار کی دولت کو دیکھ کر دل چھوٹا نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ دولت ان کے لئے وبال بننے والی ہے۔

(۴) عذاب الٰہی سے بے خوف ہوجانا اور مطمئن ہوکر بیٹھ جانا کفر ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایمان نام ہے امید اور خوف کی درمیانی حالت کا، اس لئے مسلمانوں کو اللہ سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہئے۔

سب سے پہلا قصہ حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کیا گیا ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نوسو سال تک اس قوم کو تبلیغ فرمائی اور سمجھانے کا کوئی طریقہ نہیں چھوڑا، کچھ نیک بخت لوگ جو زیادہ تر غریب طبقے سے تعلق رکھتے تھے ان پر ایمان لائے؛ لیکن قوم کی اکثریت نے کفر کا ہی راستہ اختیار کئے رکھا، حضرت نوح علیہ السلام ان کو اللہ کے عذاب سے ڈراتے رہے؛ لیکن جب وہ نہ مانے تو انہوں نے بددعا دی اور پھر ان کو ایک شدید طوفان میں غرق کر دیا گیا۔

دوسرا قصہ حضرت ہود علیہ السلام اور ان کی قوم کا ہے۔ قوم عاد عربوں کی ابتدائی نسل کی ایک قوم تھی، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کم از کم دو ہزار سال پہلے یمن کے علاقے حضر موت کے آس پاس آباد تھی، یہ لوگ اپنی جسمانی طاقت اور پتھروں کے تراشنے کے ہنر میں مشہور تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے بت بنا بنا کر ان کی پوجا شروع کر دی اور اپنی طاقت کے گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو بڑی دردمندی سے سمجھانے کی کوشش کی، مگر چند نیک طبع لوگوں کے سوا باقی لوگوں نے ان کا کہنا نہیں مانا، پہلے ان کو قحط میں مبتلا کیا گیا اور حضرت ہود علیہ السلام نے ان کو یاد دلایا کہ یہ اللہ کی طرف سے ایک تنبیہ ہے، اگر اب بھی تم اپنی بداعمالیوں سے باز آجاؤ تو اللہ تعالیٰ تم پر رحمت کی بارش برسادے گا لیکن اس قوم پر کچھ اثر نہ ہوا، آخر کار ان پر تیز وتند آندھی کا عذاب بھیجا گیا، جو آٹھ دن تک متواتر جاری رہا یہاں تک کہ یہ ساری قوم ہلاک ہوگئی۔

تیسرا واقعہ حضرت صالح علیہ السلام اور ان کی قوم ثمود کا ہے، ثمود بھی عاد ہی کی نسل سے تھے اور ظاہر یہ ہے کہ حضرت

ہود علیہ السلام کے جو ساتھی عذاب سے بچ گئے تھے یہ ان کی اولاد تھی اور ثمود ان کے دادا کا نام تھا، اس لئے ان کو عاد ثانیہ بھی کہا جاتا ہے، یہ قوم عرب اور شام کے درمیانی علاقے میں آباد تھی، ان کے راستوں میں آج بھی ان کے کھنڈرات باقی ہیں اس قوم میں بھی رفتہ رفتہ بت پرستی کی بیماری پیدا ہوگئی تھی اور اس کی وجہ سے بہت سی عملی خرابیاں پھیل گئی تھیں، حضرت صالح علیہ السلام نے جوانی سے بڑھاپے تک مسلسل ان کو تبلیغ کی، جس کے نتیجے میں ان لوگوں نے ان سے یہ مطالبہ کیا کہ آپ ہمارے سامنے کے پہاڑ سے کوئی اونٹنی نکال کر دکھا دیں تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے دعا کی اور اللہ تعالی نے پہاڑ سے اونٹنی نکال کر بھی دکھا دی اس پر کچھ لوگ تو ایمان لے آئے، مگر بڑے بڑے سردار اپنے عہد سے پھر گئے بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی روک دیا اور اونٹنی کو بھی نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا، حضرت صالح علیہ السلام نے ان کو منع کیا، مگر ایک شخص جس کا نام 'قدار' تھا اس نے اس کو قتل کر ڈالا، حضرت صالح علیہ السلام نے ان کو بتا دیا کہ تین دن میں ان پر عذاب آئے گا اور اس کی نشانی بھی بتادی کہ پہلے دن چہروں کا رنگ پیلا، دوسرے دن سرخ اور تیسرے دن کالا ہو جائے گا، اس ضدی قوم نے بجائے استغفار کے حضرت صالح علیہ السلام کو ہی قتل کرنے کا ارادہ کیا؛ لیکن اللہ نے ان کو ہی ہلاک کر ڈالا، پہلے شدید زلزلہ آیا اور پھر ایک ہیبت ناک چیخ کی آواز نے ان سب کو ہلاک کر ڈالا۔

چوتھا واقعہ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم کا ہے، یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور عراق میں پیدا ہوئے اور ان کو اللہ نے اردن کے شہر سدوم کی طرف نبی بنا کر بھیجا تھا، یہ مرکزی شہر تھا اور اس کے مضافات میں اور بستیاں بھی تھیں، کفر و شرک کے علاوہ ان لوگوں کی شرمناک بدعملی یہ تھی کہ وہ ہم جنس پرستی کی لعنت میں گرفتار تھے، جس کا ارتکاب قرآن کریم کے مطابق ان سے پہلے کسی نے بھی نہیں کیا تھا، حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو منع فرمایا مگر وہ بعض نہ آئے تو اللہ کی طرف سے ان پر پتھروں کی بارش کی گئی اور ان تمام بستیوں کو الٹ دیا گیا۔

پانچواں واقعہ حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا ہے، جس کا کچھ حصہ آٹھویں پارے میں اور کچھ حصہ نویں پارے میں ہے۔ ان شاء اللہ نویں پارے میں ہی اس کا خلاصہ ذکر کیا جائے گا۔

ان قصص میں حکمتیں اور عبرتیں:

ان قصوں میں جو مختلف حکمتیں اور عبرتیں پوشیدہ ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ سلم کو مخالفین کی ایذاؤں پر تسلی دینا۔

متکبروں کا انجام بد اور نیکوکاروں کا اچھا انجام بتانا۔

اس بات پر تنبیہ کرنا کہ اللہ کے ہاں کسی حکمت کی وجہ سے دیر تو ہے اندھیر نہیں، بالآخر ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا مل کر رہتی ہے۔

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی سچائی کی دلیل پیش کرنا کہ امی ہونے کے باوجود آپ ﷺ تاریخ کے

گمشدہ اوراق، حقائق کے مطابق پیش فرماتے تھے۔

انسانوں کے لیے عبرت ونصیحت کا سامان پیش کرنا۔ (خلاصۃ القرآن)

سورۃ البقرۃ میں یہود کو دعوت الی الکتاب دی گئی تھی، سورۃ آل عمران میں نصاریٰ کو دعوت الی التوحید دی گئی تھی، سورۃ النساء اور المائدہ میں اصلاح عرب پیش نظر تھی، سورۃ الانعام میں اصلاح مجوس مقصود تھی، سورۃ الاعراف میں بقیہ اقوام عالم کو دعوت الی القرآن دی جاتی ہے۔

خلاصہ رکوع:۱......تذکیر بایام اللہ بمابعد الموت و بآلاء اللہ سے دعوت الی کتاب اللہ۔ ماخذ: آیت: ۳، ۴، ۸، ۱۰۔

خلاصہ رکوع: ۲......ضرورت اتباع کتاب اللہ تعالی۔ ماخذ: آیت: ۲۳۔

خلاصہ رکوع: ۳......اتباع کتاب اللہ سے تمہیں لباس تقوی نصیب ہوگا اور لباس تقویٰ لباس جسمانی سے اچھا ہے۔ ماخذ: آیت: ۲۶۔

خلاصہ رکوع: ۴......لباس جسمانی ممنوع نہیں ہے، (ہاں لباس روحانی مرجح ہے) اور اگر لباس روحانی سے کوئی محروم رہا تو ملعونین کی فہرست میں داخل ہوگا۔ ماخذ: آیت: ۳۲، ۳۸۔

خلاصہ رکوع: ۵......لباس التقویٰ کے ملبوس اور اس سے اعراض کرنے والوں سے سلوک الٰہی۔ ماخذ: آیت: ۴۰، ۴۲۔ (یہ لباس التقویٰ سے اعراض کرنے والوں کی سزا ہے) اور آیت: ۴۲ و ۴۳ یہ لباس التقوی سے ملبوس جماعت کی جزاء ہے۔

خلاصہ رکوع: ۶......اس تیسری جماعت کا منکرین لباس تقوی کو سرزنش کرنا اور ان کی سزا کا ذکر۔ ماخذ: آیت: ۴۸، ۵۱۔

خلاصہ رکوع: ۷......تذکیر بالاء اللہ سے دعوت الی الکتاب۔ ماخذ: آیت: ۵۴۔

خلاصہ رکوع: ۸......تذکیر بایام اللہ سے دعوت الی الکتاب۔ ماخذ: آیت: ۵۹، ۶۴۔

خلاصہ رکوع: ۹............تذکیر بایام اللہ سے دعوت الی الکتاب۔ ماخذ: ۶۵، ۷۲

خلاصہ رکوع: ۱۰......تذکیر بایام اللہ سے دعوت الی الکتاب۔ ماخذ: آیت: ۷۳، ۷۹۔

خلاصہ رکوع: ۱۱......تذکیر بایام اللہ سے دعوت الی الکتاب۔ ماخذ: آیت: ۸۵، ۹۱، ۹۳۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

آٹھویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی، یونہی ہر پرکشش تقریر اور تحریر حق پر مبنی نہیں ہوتی، شیطان کا سب سے موثر حربہ ملمع سازی ہے، وہ بدی کو نیکی اور باطل کو حق کے روپ میں پیش کرتا ہے جس کی وجہ سے بے شمار لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

(۲) ہر قسم کے گناہوں سے توبہ کرنا واجب ہے، خواہ وہ خفیہ ہوں یا علانیہ، ظاہری اعضاء سے تعلق رکھتے ہوں یا کہ ان کا تعلق دل سے ہو جیسے کہ بغض وحسد، حب مال اور حب جاہ وغیرہ۔

(۳) ایمان، زندگی اور کفر موت ہے، صاحب بصیرت مومن، روشنی میں زندگی گزارتا ہے جبکہ کافر مختلف قسم کی تاریکیوں میں گھرا رہتا ہے۔ کفر کی تاریکی، راستے کی تاریکی اور اس مشکوک مستقبل کی تاریکی میں جس میں حیرت، اضطراب اور بے سکونی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

(۴) جس بندے کے دل میں ہدایت کی سچی طلب ہوتی ہے، اللہ تعالی اسے شرح صدر عطا فرما دیتا ہے۔

(۵) اللہ کی سنت یہ ہے کہ اعمال، انسانوں کے درمیان محبت اور دوستی کا معیار بن جاتے ہیں، نیک نیکوں سے اور برے بروں سے محبت رکھتے ہیں۔

(۶) قتل اولاد جسمانی بھی ہوتا ہے اور روحانی بھی۔ بچے کی اسلامی نہج پر تربیت نہ کرنا اور اسے شیطان کے ہاتھوں میں کھلونا بنا دینا اس کا روحانی قتل ہے۔ علوم جدیدہ کی تعلیم کے لئے قائم کی گئیں اکثر درسگاہیں قوم کے نونہالوں کو روحانی طور پر قتل کر رہی ہیں۔

(۷) اسراف جائز نہیں، اسراف کی ایک صورت تو یہ ہے کہ فضول کاموں میں مال اڑا دے اور دوسری صورت یہ ہے کہ خرچ تو جائز مصرف میں کرے مگر سب خرچ کر دے اور اپنے اہل وعیال کے لئے کچھ بھی نہ چھوڑے۔

(۸) وہی دلیل معتبر ہوگی جس کی بنیاد علم صحیح پر ہوگی، ورنہ فضول بحث کرنے والے تو اپنی گپ شپ کو بھی دلیل کا نام دے دیتے ہیں۔

(۹) ظلم شدید ترین گناہ ہے جو شہروں اور ملکوں کو چٹیل میدانوں میں تبدیل کر دیتا ہے لیکن سب سے بڑا ظلم آیات الٰہیہ کو جھٹلانا ہے۔

(۱۰) جاہلیت اور ضلالت کے اندھیروں میں قرآن کا یہ اعلان روشنی کی ایک کرن کی حیثیت رکھتا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ہی ذمہ دار ہے اور ایک کے گناہوں کا بوجھ دوسرے پر نہیں لادا جائے گا۔

****

پارہ:۹

آٹھویں پارے کے آخر میں حضرت شعیب علیہ السلام کا قصہ شروع ہوا تھا جس کا باقی حصہ نویں پارے میں بیان کیا گیا ہے۔حضرت شعیب علیہ السلام کو مدین کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا تھا جو ایک قبیلہ اور بستی دونوں کا نام ہے۔بعض روایات کے مطابق یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر تھے، مدین کے لوگوں میں کفر وشرک کے علاوہ بہت سی بدعنوانیاں بھی تھیں، مثلاً ناپ تول میں کمی کرتے تھے، زبردستی ٹیکس وصول کرتے تھے، کچھ لوگ ڈاکے بھی ڈالتے تھے، حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس جانے والوں کو روکتے اور انہیں تنگ کرتے، حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو سمجھایا، مگر قوم نے کچھ اثر نہ لیا حالانکہ حضرت شعیب علیہ السلام کو اللہ نے تقریر وخطابت کا ملکہ عطا فرمایا تھا جس کی وجہ سے آپ کو خطیب الانبیاء بھی کہا جاتا ہے۔آخر کار یہ قوم بھی اللہ کے عذاب کا نشانہ بنی، اس قوم پر جو عذاب آیا اس کے بارے میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ پہلے ان پر سخت گرمی پڑی جس سے یہ بلبلا اٹھے، پھر ایک ٹھنڈی ہوا کا بادل آیا، یہ اس کے نیچے جمع ہو گئے، اس وقت اس بادل سے آگ برسنے لگی، پھر زلزلہ آیا اور اس کے ساتھ عموماً آواز بھی ہوتی ہے جسے چنگھاڑ کہا گیا ہے۔(خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

متکبر سرداروں کی دھمکی اور حضرت شعیبؑ کا جواب:

گفتگو میں لاجواب ہو کر قوم شعیب (علیہ السلام) جبر وتشدد پر اتر آئی ہے۔اور پیغمبر اور ان کے رفیقوں کو شدید دھمکیاں دے رہی ہے، پیغمبروں سے رد وانکار کی تحریک عوام کی طرف سے نہیں بلکہ ہمیشہ رؤساء قوم کی طرف سے شروع ہوتی ہے، پیغمبروں کی تعلیم کی زد اصلاً اور براہ راست انہیں پر پڑتی ہے، اپنے کو بڑا نہ بناؤ، اپنے کو اللہ کے دوسرے بندوں کے برابر بنا کر رکھو، اپنی نفس پرستیوں پر پابندیاں عائد کرو، بھوک، نیند وغیرہ کی ضروری آزمائشوں سے ہو کر گزرو، ہر قسم کے دینی اور روحانی مطالبے سب سے زیادہ طبقۂ امراء ہی کو شاق گزرتے ہیں، عوام صرف ان کا ساتھ دینے لگتے ہیں، بعض طوعاً اور رغبت سے اور بعض کرہاً اور جبر ودباؤ سے، یہی راز ہے کہ قرآن ہر جگہ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا سے ان معاندین کا تعارف کراتا ہے۔(ماجدی: ۲/ ۳۴۸)

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ.......الی............فَكَیْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ﴿۹۳﴾

ان کی قوم کے سردار جو بڑائی کے گھمنڈ میں تھے، کہنے لگے: اے شعیب! ہم نے پکا ارادہ کر لیا ہے کہ ہم تمہیں اور

تمہارے ساتھ تمام ایمان والوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کریں گے، ورنہ تم سب کو ہمارے دین میں واپس آنا پڑے گا۔ شعیب نے کہا: اچھا؟ اگر ہم (تمہارے دین سے) نفرت کرتے ہوں، تب بھی؟ (۸۸) ہم اللہ پر جھوٹا بہتان باندھیں گے، اگر تمہارے دین کی طرف لوٹ آئیں گے، جبکہ اللہ نے ہمیں اس سے نجات دے دی ہے۔ ہمارے لیے تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کی طرف واپس جائیں۔ ہاں اللہ ہمارا پروردگار ہی کچھ چاہے تو اور بات ہے۔ ہمارے رب نے اپنے علم سے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ اللہ ہی پر ہم نے بھروسہ کر رکھا ہے۔ اے ہمارے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کا فیصلہ فرما دے۔ اور تو ہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ (۸۹) اور ان کی قوم کے وہ سردار جنہوں نے کفر اپنایا ہوا تھا (قوم کے لوگوں سے) کہنے لگے: اگر تم شعیب کے پیچھے چلے تو یاد رکھو اس صورت میں تمہیں سخت نقصان اٹھانا پڑے گا۔ (۹۰) پھر ہوا یہ کہ انہیں زلزلے نے آ پکڑا (۴۸) اور وہ اپنے گھر میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ (۹۱) جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا، وہ ایسے ہو گئے جیسے کبھی وہاں بسے ہی نہیں تھے۔ جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا، آخر کو نقصان اٹھانے والے وہی ہوئے۔ (۹۲) چنانچہ وہ (یعنی شعیب علیہ السلام) ان سے منہ موڑ کر چل دیے، اور کہنے لگے: اے قوم! میں نے تجھے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے تھے، اور تیرا بھلا چاہا تھا۔ (مگر) اب میں اس قوم پر کیا افسوس کروں جو ناشکری تھی۔ (۹۳)

تمسخر کرنے والوں کی تباہی لائق حزن وغم نہیں:

کافروں کی ظلم اور شرک پر ہٹ دھرمی کرنے والوں کی اور انبیاء کے ساتھ تمسخر کرنے والوں کی تباہی اور بربادی لائق حزن وغم نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے کہ زمین اللہ کے نافرمانوں سے پاک ہوئی اور اہل ایمان کی نگاہیں کفر وشرک کی نجاستیں دیکھنے سے محفوظ ہوگئیں **فقطع دابر القوم الذین ظلموا و الحمد للہ رب العلمین**۔ کافر خدا کی نظر میں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں؛ لہذا کسی مچھر کے مرنے پر غم کرنا اور کسی مچھر کے مرنے یا مارے جانے پر تار دینا، عاقل اور دانا کا تو کام نہیں۔ (ادریسی: ۳/ ۱۶۳)

کیا نعمتوں کا ملنا بھی عذاب کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے:

اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو اپنے عذاب سے ہلاک کیا انہیں (معاذ اللہ) جلدی سے غصے میں آکر ہلاک نہیں کر دیا، بلکہ انہیں سالہا سال تک راہ راست پر آنے کے بہت سے مواقع فراہم کئے، اول تو پیغمبر بھیجے جو انہیں برسوں تک ہوشیار کرتے رہے، پھر شروع میں انہیں کچھ معاشی بدحالی یا بیماریوں وغیرہ کی مصیبتوں سے دوچار کیا تاکہ ان کے دل کچھ نرم پڑیں، کیونکہ بہت سے لوگ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور تنگی ترشی میں بعض اوقات حق بات کو قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے، جب ایسے حالات میں پیغمبر ان کو متنبہ کرتے ہیں کہ ذرا سنبھل جاؤ ابھی اللہ تعالیٰ نے ایک اشارہ دیا ہے، جو کسی وقت باقاعدہ عذاب میں تبدیل ہو سکتا ہے تو بعض لوگوں کے دل پسیج جاتے ہیں،

دوسری طرف کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان پر خوش حالی آتی ہے تو ان کے دل میں اللہ تعالی کے احسانات کا احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ اس وقت حق بات کو قبول کرنے کے لئے نسبۃً زیادہ آمادہ ہوجاتے ہیں، چنانچہ ان لوگوں کو بدحالی کے بعد خوش حالی کی نعمت بھی عطا کی جاتی ہے؛ تاکہ وہ شکر گزار بن سکیں، حالات کی اس تبدیلی سے بعض لوگ بیشک سبق لے لیتے ہیں اور راہ راست پر آجاتے ہیں، لیکن کچھ ضدی طبیعت کے لوگ ان باتوں سے کوئی سبق نہیں سیکھتے اور یہ کہتے ہیں کہ یہ دکھ سکھ اور سرد گرم حالات تو ہمارے باپ داداؤں کو بھی پیش آچکے ہیں، انہیں خوامخواہ اللہ تعالی کی طرف سے کوئی اشارہ قرار دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اس طرح جب ان لوگوں پر ہر طرح کی حجت تمام ہوچکی ہوتی ہے تو پھر اللہ تعالی کی طرف سے عذاب آتا ہے اور اس طرح پکڑ لیتا ہے کہ ان کو پہلے سے اندازہ بھی نہیں ہوتا، عذاب اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ (توضیح القرآن: ۱/ ۴۷۵)

چنانچہ ارشاد باری ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَةٍ مِّنۡ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذۡنَاۤ اَهۡلَهَا......... الی......... وَنَطۡبَعُ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ فَهُمۡ لَا یَسۡمَعُوۡنَ﴿۱۰۰﴾

اور ہم نے جس کسی بستی میں کوئی پیغمبر بھیجا، اس میں رہنے والوں کو بدحالی اور تکلیفوں میں گرفتار ضرور کیا، تاکہ وہ عاجزی اختیار کریں۔ (۹۴) پھر ہم نے کیفیت بدلی، بدحالی کی جگہ خوشحالی عطا فرمائی، یہاں تک کہ وہ خوب پھلے پھولے، اور کہنے لگے کہ دکھ سکھ تو ہمارے باپ دادوں کو بھی پہنچتے رہے ہیں۔ پھر ہم نے انہیں اچانک اس طرح پکڑ لیا کہ انہیں (پہلے سے) پتہ بھی نہیں چل سکا۔ (۹۵) اور اگر یہ بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقوی اختیار کر لیتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین دونوں طرف سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے (حق کو) جھٹلایا، اس لیے ان کی مسلسل بدعملی کی پاداش میں ہم نے ان کو اپنی پکڑ میں لے لیا۔ (۹۶) اب بتاؤ کہ کیا (دوسری) بستیوں کے لوگ اس بات سے بالکل بےخوف ہوگئے ہیں کہ کسی رات ہمارا عذاب ان پر ایسے وقت آپڑے جب وہ سوئے ہوئے ہوں؟ (۹۷) اور کیا ان بستیوں کے لوگوں کو اس بات کا (بھی) کوئی ڈر نہیں ہے کہ ہمارا عذاب ان پر کبھی دن چڑھے آجائے جب وہ کھیل کود میں لگے ہوئے ہوں؟ (۹۸) بھلا کیا یہ لوگ اللہ کی دی ہوئی ڈھیل (کے انجام) سے بےفکر ہوچکے ہیں؟ (اگر ایسا ہے) تو (یہ یاد رکھیں کہ) اللہ کی دی ہوئی ڈھیل سے وہی لوگ بےفکر ہو بیٹھتے ہیں جو آخر کار نقصان اٹھانے والے ہوتے ہیں۔ (۹۹) جو لوگ کسی زمین (کے باشندوں کی ہلاکت) کے بعد اس کے وارث بن جاتے ہیں، بھلا کیا ان کو یہ سبق نہیں ملا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو (بھی) ان کے گناہوں کی وجہ سے کسی مصیبت میں مبتلا کر دیں؟ اور (جو لوگ اپنی ضد کی وجہ سے یہ سبق نہیں لیتے) ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ کوئی بات نہیں سنتے۔ (۱۰۰)

خلاصہ یہ نکلا کہ جرم کی حالت میں نعمتوں کا میسر ہونا یا مشقت میں مبتلا ہونا دونوں ہی عذاب کا پیش خیمہ ہوسکتے ہیں، کیونکہ بسا اوقات انسان پر اس کے گناہوں کی وجہ سے تکالیف آتی ہیں، تاکہ وہ ان گناہوں کو ترک کردے، لیکن اگر اس

کے باوجود وہ گناہوں کو ترک نہ کرے اور باز نہ آئے تو پھر فراخی اور کشادگی آتی ہے، تاکہ یہ شخص اپنی سرکشی میں اور بڑھ جائے اور کل بروز قیامت اس کے پاس جان کی خلاصی کے لئے کوئی عذر نہ رہے۔

اس سلسلے میں اہل مکہ کا گمان:

اہل مکہ کا حال یہ تھا کہ وہ اچھے اور برے حالات دونوں میں زمانے کے تغیر (تبدیل ہونے) کو معتبر سمجھتے تھے کہ یہ حالات کا تغیر (بدلنا) زمانے کے تغیر سے ہے، انسان کے اعمال کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ لوگ کفر اور شرک جیسے کبیرہ گناہ کرکے اس بات سے مطمئن نہ ہوں کہ ان پر اللہ کا عذاب نہیں اترے گا۔ (خلاصۂ مضامین قرآن: مولانا منظور یوسف)

حضرت شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں کہ اگر بندے کو دنیا میں گناہ کی سزا پہنچتی رہے تو امید ہے کہ وہ توبہ کرلے اور جب گناہ راس آگیا تو یہ اللہ کا بھلاوہ ہے پھر ڈر ہے ہلاکت کا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی زہر کھالے۔ پھر اگر وہ اسے اگل دے تو بچ جانے کی امید ہوتی ہے اور اگر زہر ہضم ہوجائے تو انسان کا کام تمام ہوگیا، انسان کا یہی حال ہے، اگر اللہ کی طرف سے تنبیہ آنے پر سنبھل گیا تو بچ گیا، تھوڑی سی سزا پر ہی سمجھ آگئی، توبہ کرلی اور دائمی سزا سے بچ گیا اور اگر وہ گناہ میں راسخ ہوگیا تو ہلاک ہوگیا پھر وہ مستقل عذاب کا مستحق بن گیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہی دستور ہے۔ (معالم العرفان: ۸/ ۳۱۸)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تسلی:

پھر ان قصوں کے آخر میں گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قوم کے انکار اور استکبار پر حزین وملول نہ ہونے کی تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ .... الی....... كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

یہ ہیں وہ بستیاں جن کے واقعات ہم تمہیں سنا رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان سب کے پاس ان کے پیغمبر کھلے کھلے دلائل لے کر آئے تھے، مگر جس بات کو وہ پہلے جھٹلا چکے تھے، اس پر کبھی ایمان لانے کو تیار نہیں ہوئے۔ جو لوگ کفر کو اپنا چکے ہوتے ہیں، ان کے دلوں پر اللہ اسی طرح مہر لگا دیتا ہے۔ (۱۰۱)

حضرت موسیٰؑ کا قصہ:

گزشتہ رکوعات میں پانچ پیغمبروں کے قصے بیان ہوئے اور ان کے بعد بطور نتیجہ اور خلاصہ یہ بتلایا کہ مکذبین کے متعلق سنت الٰہی کیا ہے، اب ان پانچ قصوں کے بعد چھٹا قصہ موسیٰ علیہ السلام کا بیان کرتے ہیں جو ان سب انبیاء کے بعد تشریف لائے، یہ قصہ بظاہر ایک قصہ ہے، مگر اپنے اندر بہت سے قصوں کو لیے ہوئے ہے یہ قصہ بہ نسبت اور قصوں کے زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، چنانچہ اس مقام پر یہ قصہ نصف پارہ تک چلا گیا ہے اور صرف اس مقام پر نہیں قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر اکثر وبیشتر آیا ہے اور یہ قصہ متعدد مطالب اور مختلف مقاصد کے بیان کرنے کے لیے قرآن کریم میں بہت جگہ آیا ہے اور تکرار اور تفصیل کی وجہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات انبیاء سابقین کے معجزات

سے زیادہ قوی ہیں اور نہایت عظیم اور عجیب ہیں جن سے سحر اور معجزہ کا فرق خوب واضح ہوجاتا ہے اور فرعون اور فرعونیوں کا ظلم اور عناد اور تکبر بھی شدید ہے جس سے ظلم کے انجام بد کا بخوبی علم ہوجاتا ہے اور بنی اسرائیل کی جہالتیں بھی عجیب ہیں جس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ نبی کے سامنے لب کشائی جہالت اور حماقت ہے، اس لیے یہ امور اس قصہ کی تکریر اور تفصیل کو مقتضی ہوئے۔

نیز موسی علیہ السلام کا قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قصہ سے بہت مشابہت رکھتا ہے، جس طرح موسی علیہ السلام کی برکت سے بنی اسرائیل کو دین و دنیا کی عزتیں ملیں اور آپ کے دشمن ذلیل وخوار ہوئے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے امت محمدیہ کو دین ودنیا کی عزتیں ملیں اور داؤد اور سلیمان علیہما السلام جیسی بادشاہت ملی۔

موسی علیہ السلام کا نسب نامہ چند واسطوں سے یعقوب علیہ السلام تک پہنچتا ہے، آپ کے والد کا نام عمران تھا، قبطی زبان میں مو کے معنی ماء یعنی پانی کے ہیں اور سا کے معنی شجر یعنی درخت کے ہیں، چونکہ موسی علیہ اسلام پانی اور درخت کے درمیان پائے گئے اس لیے ان کا نام موسی ہوگیا۔

موسی علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس سال کی ہوئی اور ان کے اور یوسف علیہ السلام کے درمیان چار سو سال کا فاصلہ تھا اور ابراہیم علیہ السلام سے سات سو سال بعد ہوئے اور فرعون اس بادشاہ کا نام نہ تھا اس زمانہ میں ہر شاہ مصر کا یہ لقب تھا، جیسا کہ بادشاہان فارس کا لقب کسری اور شاہان روم کا لقب قیصر تھا، اس طرح اس بادشاہ کا لقب تو فرعون تھا اور اصل نام قابوس تھا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کا نام ولید بن منصور بن ریان تھا یہ قوم قبط کا بادشاہ تھا جو مصر میں رہتی تھی، کہا جاتا ہے کہ یہ بادشاہ تین سو سال تک زندہ رہا۔ واللہ اعلم۔ فرعون مصر کا بادشاہ تھا، ربوبیت اور الوہیت کا مدعی تھا اور کہتا تھا کہ میں اپنے سوا کسی کو تمہارا اور معبود نہیں جانتا، جب اس نے خدائی کا دعوی کیا تو اہل مصر نے اس کو قبول کیا، مگر بنی اسرائیل نے اس کو قبول نہ کیا۔ فرعون بنی اسرائیل سے یہ کہتا کہ تمہارا باپ یوسف تھا جو میرے آباؤ اجداد کا زرخرید غلام تھا اور تم سب میرے غلام زادے ہو، یہ کہہ کر بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنالیا اور ان سے ذلت آمیز خدمتیں لینے لگا۔ فرعون اپنی ظاہری شان وشوکت پر مغرور تھا، حق تعالیٰ نے اس کی طرف ایک نبی کو مبعوث کیا جو بالکل درویش تھا اور ظاہری شان وشوکت سے بالکل خالی تھا، صوف کا عمامہ اور صوف کا جبہ اس کا لباس تھا جیسا کہ امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں کئی جگہ ذکر فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ ان کو ایک عصا عطا فرمایا جس سے فرعون جیسے سراپا عصیان وطغیان کی تنبیہ مقصود تھی اور تاکہ جب معجزۂ عصا ظاہر ہو تو متکبرین اور مغرورین سمجھ جائیں کہ یہ شخص خدا تعالیٰ کا فرستادہ ہے جس کے ہاتھ سے ایسے افعال کا ظہور ہوتا ہے جو طاقت بشریہ کی حدود سے باہر ہیں، یہ دنیا دار امتحان ہے اور حق اور باطل کے معرکہ کا میدان ہے اس لیے من جانب اللہ تعالیٰ اکثر وبیشتر نبوت ورسالت کا ظہور برنگ فقیری ودرویشی ہوتا ہے اور ظاہری اور مادی شان و شوکت باطل کی جانب ہوتی ہے، مقصود امتحان ہوتا ہے کہ کون ظاہری اور مادی شان وشوکت دیکھ کر باطل کی طرف جاتا ہے

اورکون حق کے حقیقی اور باطنی حسن و جمال کو دیکھ کر حق کو قبول کرتا ہے، اگر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دنیاوی شان وشوکت ہوتی تو پھر فرعون کو کون پوچھتا۔ یہاں موسیٰؑ کے واقعات میں سب سے پہلے ان کی بعثت کا واقعہ اور فرعون کے ساتھ ان کے مناظرہ اور مکالمہ کا ذکر فرماتے ہیں:

ثُمَّ بَعَثۡنَا مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ مُّوۡسٰی بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوۡا بِهَا ۚ ......الی......رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّتَوَفَّنَا مُسۡلِمِيۡنَ﴿۱۲۶﴾

پھر ہم نے ان سب کے بعد موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا، تو انہوں نے (بھی) ان (نشانیوں) کی ظالمانہ ناقدری کی، اب دیکھو کہ ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا۔ (۱۰۳) موسیٰ نے کہا تھا کہ: اے فرعون! یقین جانو کہ میں رب العالمین کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہوں۔ (۱۰۴) میرا فرض ہے کہ میں اللہ کی طرف منسوب کر کے حق کے سوا کوئی اور بات نہ کہوں۔ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک کھلی دلیل لے کر آیا ہوں، لہٰذا بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔ (۱۰۵) اس نے کہا کہ: اگر تم کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اسے پیش کرو، اگر تم ایک سچے آدمی ہو۔ (۱۰۶) اس پر موسیٰ نے اپنی لاٹھی پھینکی تو اچانک وہ ایک صاف صاف اژدہا بن گیا۔ (۱۰۷) اور اپنا ہاتھ (گریبان سے) کھینچا تو وہ سارے دیکھنے والوں کے سامنے یکا یک چمکنے لگا۔ (۱۰۸) فرعون کی قوم کے سردار (ایک دوسرے سے) کہنے لگے کہ: یہ تو یقینی طور پر بڑا ماہر جادوگر ہے۔ (۱۰۹) یہ چاہتا ہے کہ تمہیں تمہاری زمین سے نکال باہر کرے۔ اب بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ (۱۱۰) انہوں نے کہا کہ: ذرا اس کو اور اس کے بھائی کو کچھ مہلت دو، اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دو۔ (۱۱۱) تاکہ وہ تمام ماہر جادوگروں کو جمع کر کے تمہارے پاس لے آئیں۔ (۱۱۲) (چنانچہ ایسا ہی ہوا) اور جادوگر فرعون کے پاس آ گئے (اور) انہوں نے کہا کہ: اگر ہم (موسیٰ پر) غالب آ گئے تو ہمیں کوئی انعام تو ضرور ملے گا۔ (۱۱۳) فرعون نے کہا: ہاں، اور تمہارا شمار یقینا ہمارے مقرب لوگوں میں (بھی) ہوگا۔ (۱۱۴) انہوں نے (موسیٰ سے) کہا: چاہو تو (جو پھینکنا چاہتے ہو) تم پھینکو، ورنہ ہم (اپنے جادو کی چیز) پھینکیں؟ (۱۱۵) موسیٰ نے کہا: تم پھینکو! چنانچہ جب انہوں نے (اپنی لاٹھیاں اور رسیاں) پھینکیں تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا، ان پر دہشت طاری کر دی، اور زبردست جادو کا مظاہرہ کیا۔ (۱۱۶) اور ہم نے موسیٰ کو وحی کے ذریعے حکم دیا کہ تم اپنی لاٹھی ڈال دو۔ بس پھر کیا تھا، اس نے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ساری چیزیں نگلنی شروع کر دیں جو انہوں نے جھوٹ موٹ بنائی تھیں۔ (۱۱۷) اس طرح حق کھل کر سامنے آ گیا اور ان کا بنا بنایا کام ملیا میٹ ہو گیا۔ (۱۱۸) اس موقع پر وہ مغلوب ہوئے، اور شدید سبکی کی حالت میں (مقابلے سے) پلٹ کر آ گئے۔ (۱۱۹) اور اس واقعے نے سارے جادوگروں کو بے ساختہ سجدے میں گرا دیا۔ (۱۲۰) وہ پکار اٹھے کہ: ہم اس رب العالمین پر ایمان لے آئے۔ (۱۲۱) جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔ (۱۲۲) فرعون بولا: تم میرے اجازت دینے سے پہلے ہی اس شخص پر ایمان لے آئے؟ یہ ضرور کوئی

سازش ہے جوتم نے اس شہر میں ملی بھگت کر کے بنائی ہے، تا کہ تم یہاں کے رہنے والوں کو یہاں سے نکال باہر کرو۔ اچھا تو تمہیں ابھی پتہ چل جائے گا۔(۱۲۳) میں نے بھی پکا ارادہ کرلیا ہے کہ تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالوں گا، پھرتم سب کو اکٹھے سولی پر لٹکا کر رہوں گا۔(۱۲۴) انہوں نے کہا: یقین رکھ کہ ہم (مرکر) اپنے مالک ہی کے پاس واپس جائیں گے۔(۱۲۵) اورتو اس کے سوا ہماری کس بات سے ناراض ہے کہ جب ہمارے مالک کی نشانیاں ہمارے پاس آگئیں تو ہم ان پر ایمان لے آئے؟ اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر کے پیمانے انڈیل دے، اور ہمیں اس حالت میں موت دے کہ ہم تیرے تابع دار رہوں۔(۱۲۶)

معجزات:

آپ کو جو معجزات عطا کیے گئے وہ بھی سابقہ انبیاء کے معجزات کے مقابلے میں زیادہ واضح تھے، خاص طور پر عصا اور ید بیضا یہ دو ایسے معجزے تھے کہ جن کا انکار کرنے کے لیے دل کے اندھوں کو بھی خاصے تعصب اور ضد وعناد سے کام لینا پڑا ہوگا۔

بنی اسرائیل کی مصر آمد:

فرعون اور اس کی قوم یعنی قبطیوں نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا اور وہ ان پر جور و جفا کے نئے نئے طریقے آزماتے رہتے تھے۔ بنی اسرائیل اس زمانے میں مصر آئے تھے، جب ان کے شہر اور گاؤں شدید قحط کی لپیٹ میں آگئے تھے، پھر وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زیر سایہ یہیں آباد ہوگئے اور ان کی نسل میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا؛ یہاں تک کہ ان کا شمار مصر کی دوسری بڑی قوم میں ہونے لگا۔

فرعون سے مطالبہ:

پھر مختلف فرعونوں نے اپنے اپنے دور میں انہیں ظلم وستم کا نشانہ بنانا شروع کیا، حضرت موسی علیہ السلام بنی اسرائیل کو بدترین غلامی سے رہائی دلا کر ان کے اپنے وطن یعنی ارض مقدس میں لے جانا چاہتے تھے، اس لیے آپ نے فرعون سے مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔(۱۰۵/۷)

کوئی معجزہ دکھاؤ:

جب حضرت موسی علیہ السلام نے فرعون کے سامنے یہ دعوی کیا کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں تو فرعون نے مذاق کے طور پر کہا:

اچھا! اگر واقعی تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو کوئی معجزہ دکھاؤ''۔ آپ نے اپنی لاٹھی زمین پر ڈال دی جو دیکھتے ہی دیکھتے ایک خوفناک اژدہے کی شکل اختیار کرگئی، پھر آپ نے اپنا ہاتھ باہر نکالا، اس سے ایسا نور نکلا جس سے ارض وسما کے درمیان چکاچوند ہوگئی۔

تخت سے چھلانگ لگا دی:

بعض تفسیروں مثلاً طبری اور ابن کثیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب فرعون نے لاٹھی کو سانپ بنتے ہوئے دیکھا تو ڈر کے مارے تخت سے چھلانگ لگا دی اور بھاگ کھڑا ہوا۔

فرعون کا مشورہ:

پھر اسے یہ ڈر لاحق ہو گیا کہ کہیں لوگ حضرت موسی علیہ السلام پر ایمان نہ لے آئیں، اس لیے اس نے اپنے مشیران خاص سے کہا کہ یہ ایک جادوگر ہے جو تمہارے اس ملک پر قبضہ جمانا چاہتا ہے؛ لہٰذا تم مجھے مشورہ دو کہ کیا کرنا چاہیے۔ انہوں نے کہا:

"ہمارے ملک میں بڑے بڑے ماہر جادوگر ہیں، ان سب کو جمع کر لیا جائے تا کہ وہ ایک مجمع عام کے سامنے موسی کو شکست فاش دیں؛ چنانچہ یہی کیا گیا، ایک مخصوص میدان اور معین دن میں مصر کے ہزاروں لوگ جمع ہو گئے، ساحروں کے جادو کے جواب میں حضرت موسی علیہ السلام نے اپنا معجزہ دکھایا تو ساحران مصر بے اختیار سجدے میں گر گئے اور انہوں نے ایمان قبول کر لیا۔

سحر اور معجزے میں فرق:

سحر اور شعبدہ اور مسمریزم ایک فن ہے جو سیکھنے اور سکھانے سے حاصل ہو سکتا ہے اور معجزہ کوئی فن نہیں کہ جو تعلم و تعلیم سے حاصل ہو سکے حتی کہ معجزے میں نبی کا اختیار ہی نہیں اور بسا اوقات نبی کو پہلے سے اس کا علم نہیں ہوتا، جس طرح قلم بظاہر لکھتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن فی الحقیقت لکھنا قلم کا فعل اختیاری نہیں بلکہ کاتب کا فعل ہے، اسی طرح معجزہ درحقیقت فعل اللہ کا ہے مگر اس کا ظہور نبی کے ہاتھ سے ہوتا ہے۔

نقش باشد پیش نقاش و قلم
عاجز و بستہ چو کودک در شکم

نبی کے اختیار میں نہیں کہ جب چاہے اپنی انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری کر دے برخلاف فنون سحریہ کے کہ وہ جس وقت چاہیں قواعد مقررہ اور اعمال مخصوصہ کے ذریعے اس کے نتائج ظاہر کر سکتے ہیں، مگر آج تک معجزہ کے متعلق نہ کوئی کتاب لکھی گئی اور نہ کوئی قاعدہ اور ضابطہ مقرر ہوا اور نہ معجزے کی تعلیم کے لیے کوئی درسگاہ کھولی گئی، دیکھئے موسیٰ (علیہ السلام) کوہ طور پر آگ لینے کے لیے گئے یکا یک پیغمبری ملی اور اس کی تصدیق کے لیے عصا اور ید بیضاء کا معجزہ عطاء ہوا اور جب ساحران فرعون سے مقابلہ ہوا اور انہوں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں زمین پر ڈالیں اور وہ چلتے ہوئے سانپ نظر آنے لگے تو موسی (علیہ السلام) اپنے دل میں ڈرے۔ **کما قال تعالیٰ فاوجس فی نفسه خیفة**۔ پس اگر موسیٰ (علیہ السلام) خود ساحر ہوتے تو ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی، اس لیے کہ انسان اپنے اختیاری فعل سے نہیں ڈرتا اور یہی وجہ ہے کہ جادوگروں نے

موسیٰ (علیہ السلام) پر گھبراہٹ اور خوف کے آثار دیکھے تو سمجھ گئے کہ یہ شخص ہمارا ہم پیشہ نہیں اور جب موسیٰ (علیہ السلام) کے عصا نے ان کے سانپوں کو نگل لیا تو سمجھ گئے کہ یہ سحر نہیں بلکہ خدائی فعل اور کرشمۂ قدرت ہے۔ جس کے سامنے سحر کی کوئی حقیقت نہیں، اور بے اختیار سجدہ میں گر پڑے اور چلا اٹھے کہ ہم رب موسیٰ وہارون پر ایمان لاتے ہیں۔ (ادریسی: ۳/ ۱۸۴)

فرعون کی دھمکیاں:

ان کے قبول ایمان نے فرعون کو سیخ پا کر دیا اور وہ گالم گلوچ اور دھمکیوں پر اتر آیا؛ لیکن ان نومسلموں کے دل کی گہرائی میں ایمان کی جڑ چند ہی لمحوں میں اس قدر پیوست ہوگئی تھی کہ فرعون کی دھمکیاں ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہ کر سکیں۔

فرعون اور اس کی قوم پر اللہ کے مسلسل عذاب:

فرعون اور اس کی قوم کی جانب سے حضرت موسی علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں مسلسل تکبر، سرکشی، انکار اور ظلم وستم کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالی نے انہیں یکے بعد دیگرے مختلف عذابوں اور آزمائشوں میں مبتلا کر دیا۔

پہلا عذاب:

اللہ نے ایسا طوفان بھیجا جس سے ان کی کھیتیاں تباہ ہوگئیں۔

دوسرا عذاب:

ٹڈیوں کے دل کے دل جو درختوں کے پتے تک چٹ کر گئے۔

تیسرا عذاب:

اس قدر چیچڑیاں پیدا ہوگئیں کہ انہوں نے جمع شدہ غلے کو ناقابل استعمال کر دیا۔

چوتھا عذاب:

مینڈکوں کی کثرت ہوگئی کہ بات کرنے کے لیے منہ کھولتے تو مینڈک منہ کی طرف چھلانگ لگاتے۔

پانچواں عذاب:

ان کی نہروں، کنوؤں اور مٹکوں کا پانی خون میں تبدیل ہوگیا۔

آہ وزاری اور عہد وقرار:

جب کوئی عذاب آتا تو حضرت موسی علیہ السلام کے سامنے آہ وزاری اور عہد واقرار کرتے کہ اگر اللہ نے اس عذاب سے نجات دے دی تو ہم ایمان لے آئیں گے لیکن جب عذاب ٹل جاتا تو وہی کچھ کرنے لگتے جو پہلے کر رہے ہوتے تھے۔

فرعونیوں کے عذاب سے نجات:

پھر یوں ہوا کہ اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کو فرعونیوں کے عذاب سے نجات دے دی اور حضرت موسی علیہ السلام

انہیں رات کی تاریکی میں مصر سے لے کر نکل گئے۔

دستورزندگی (تورات):

آزادی نصیب ہوئی تو دستور زندگی کی ضرورت محسوس ہوئی، اللہ تعالی نے اپنے نبی کو کوہ طور پر بلایا، وہاں آپ نے چالیس روزے رکھے، پھر آپ کو باری تعالی سے ہم کلامی کا شرف بھی حاصل ہوا اور دستور زندگی کے طور پر تورات بھی عطا ہوئی۔

بچھڑے کی عبادت:

آپ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں سامری کے بہلانے پھسلانے پر اسرائیلیوں نے بچھڑے کی عبادت شروع کردی، آپ واپس تشریف لائے تو آپ کو ان کی اس مشرکانہ حرکت سے بے پناہ دکھ ہوا۔

یہود کی انوکھی عادت:

اسرائیلی عجیب قوم تھے، قدم قدم پر پھسل جاتے تھے، وعدے کرتے تھے اور بھلا دیتے تھے، احکام الہیہ کا مذاق اڑاتے تھے، ان میں تاویل اور تحریف تک سے باز نہیں آتے تھے، انہیں حکم دیا گیا کہ بیت المقدس میں سر جھکا کر داخل ہونا مگر وہ سر اٹھا کر اور گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے، انہیں کہا گیا کہ ہفتے کے دن اللہ کی عبادت کے سوا کچھ نہ کرو۔ مگر وہ حیلے بہانے سے مچھلی کا شکار کرنے لگے، ان کے سروں پر کوہ طور اٹھا کر تورات پر عمل کا وعدہ لیا گیا مگر وہ اپنے وعدے کو نبھانے میں ناکام رہے۔

بنی اسرائیل پر انعامات اور ان کی ناشکری:

بنی اسرائیل پر درج ذیل انعامات کئے گئے:

(۱) انہیں بارہ قبیلوں میں تقسیم کیا گیا۔

(۲) ہر قبیلہ کے لئے پانی کی الگ گھاٹی کا بندوبست کیا۔

(۳) ان پر من وسلوی کو نازل کیا۔

(۴) چونکہ یہ لوگ گرم علاقے میں تھے، جہاں سورج کی تپش ان کے لئے باعث اذیت تھی، تو ان پر اللہ تعالی نے ابر (بادل) کا سایہ مقرر کر دیا۔

(۵) انہیں حکم دیا گیا کہ شہر ''اریحا'' میں داخل ہو جاؤ اور اس میں سے جہاں سے جی چاہے، کھاؤ۔

بنی اسرائیل سے دو مطالبے:

ان انعامات کے بدلے ان لوگوں سے صرف دو مطالبے کئے گئے:

(۱) جب بھی شہر میں داخل ہو تو ''حطۃ'' یعنی ہمیں بخش دو، کہہ کر داخل ہوا کرو۔

(۲) سجدہ کرتے ہوئے داخل ہوا کرو۔

لیکن ان لوگوں نے تمام تر انعامات کی ناشکری کی، باوجود یکہ ان لوگوں کے لئے تمام پاک چیزیں حلال کردی گئی تھیں اوران کی زندگی کو پرسکون اور پرتعیش بنا دیا تھا مگر انہوں نے ذخیرہ اندوزی شروع کردی، جس کے نتیجے میں طاعون کی وبا پھیل گئی، جس سے لوگ مرنے لگے، اسی طرح یہ لوگ بجائے ''حطہ'' کہنے کے ''حنطة''، یعنی ہمیں گندم چاہیے، کہنے لگے اور بجائے سجدہ کرنے کے زمین پر گھسٹ گھسٹ کر داخل ہونے لگے، الغرض جب ان کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو اللہ نے ان پر آسمان سے عذاب کو نازل فرمادیا۔

عالم ارواح میں تمام انسانوں سے وعدہ:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ...... الیٰ........وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۝۱۷۴

اور (اے رسول! لوگوں کو وہ وقت یاد دلاؤ) جب تمہارے پروردگار نے آدم کے بیٹوں کی پشت سے ان کی ساری اولاد کو نکالا تھا، اوران کو خود اپنے اوپر گواہ بنایا تھا، (اور پوچھا تھا کہ) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا تھا کہ: کیوں نہیں؟ ہم سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔ (اور یہ اقرار ہم نے اس لیے لیا تھا) تا کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ: ہم تو اس بات سے بےخبر تھے۔ (۱۷۲) یا یہ نہ کہہ دو کہ: شرک (کا آغاز) تو بہت پہلے ہمارے باپ دادوں نے کیا تھا، اور ہم ان کے بعد انہی کی اولاد بنے۔ تو کیا آپ ہمیں ان کاموں کی وجہ سے ہلاک کردیں گے جو غلط کار لوگوں نے کیے تھے؟ (۱۷۳) اور اسی طرح ہم نشانیوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں تا کہ لوگ (حق کی طرف) پلٹ آئیں۔ (۱۷۴)

تمام عقائد حقہ اور ادیان سماویہ کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ انسان خدا کی ہستی اور ربوبیت عامہ پر اعتقاد رکھے۔ مذہب کی ساری عمارت اسی سنگ بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے۔ جب تک یہ اعتقاد نہ ہو، مذہبی میدان میں عقل وفکر کی راہنمائی اور انبیاء ومرسلین کی ہدایات کچھ نفع نہیں پہنچا سکتیں۔ اگر پورے غور وتامل سے دیکھا جائے تو آسمانی مذہب کے تمام اصول وفروع بالآخر خدا کی ''ربوبیت عامہ'' کے اسی عقیدہ پر منتہی ہوتے بلکہ اسی کی تہ میں لپٹے ہوئے ہیں۔ عقل سلیم اور وحی والہام اسی اجمال کی شرح کرتے ہیں، پس ضروری تھا کہ یہ تخم ہدایت جسے کل آسمانی تعلیمات کا مبداء ومنتہی اور تمام ہدایات ربانیہ کا وجود مجمل کہنا چاہیے، عام فیاضی کے ساتھ نوع انسانی کے تمام افراد میں بکھیر دیا جائے تا کہ ہر آدمی عقل وفہم اور وحی والہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجر ایمان وتوحید کے درجہ تک پہنچا سکے۔ اگر قدرت کی طرف سے قلوب بنی آدم میں ابتداء یہ تخم ریزی نہ ہوتی اور اس کی سب سے زیادہ اساسی وجوہری عقدہ کا حل ناخن عقل وفکر کے سپرد کردیا جاتا، تو یقیناً یہ مسئلہ بھی منطقی استدلال کی بھول بھلیاں میں پھنس کر ایک نظری مسئلہ بن کر رہ جاتا، جس پر سب تو کیا اکثر آدمی بھی متفق نہ ہوسکتے،

جیسا کہ تجربہ بتلاتا ہے کہ فکر واستدلال کی ہنگامہ آرائیاں اکثر اتفاق سے زیادہ اختلاف آراء پر منتج ہوتی ہیں۔اس لیے قدرت نے جہاں غور وفکر کی قوت اور نور وحی والہام کے قبول کرنے کی استعداد بنی آدم میں ودیعت فرمائی، وہیں اس اساسی عقیدہ کی تعلیم سے ان کو فطرۃً بہرہ ور کیا جس کے اجمال میں کل آسمانی ہدایات کی تفصیل منطوی ومندمج تھی اور جس کے بدون مذہب کی عمارت کا کوئی ستون کھڑا نہیں رہ سکتا۔ یہ اسی ازلی اور خدائی تعلیم کا اثر ہے کہ آدم کی اولاد ہر قرن اور ہر گوشہ میں حق تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کے عقیدہ پر کسی نہ کسی حد تک متفق رہی ہے۔اور جن معدود افراد نے کسی عقلی وروحی بیماری کی وجہ سے اس عام فطری احساس کے خلاف آواز بلند کی ہے وہ انجام کار دنیا کے سامنے بلکہ خود اپنی نظر میں بھی اسی طرح جھوٹے ثابت ہوئے جیسے ایک بخار وغیرہ کا مریض لذیذ اور خوشگوار غذاؤں کو تلخ اور بدمزہ بتلانے میں جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔ بہرحال ابتدائے آفرینش سے آج تک ہر درجہ اور طبقہ کے انسانوں کا خدا کی ربوبیت کبریٰ پر عام اتفاق و اجماع اس کی زبردست دلیل ہے کہ یہ عقیدہ عقول وافکار کی دوا دوش سے پہلے ہی فاطر حقیقی کی طرف سے اولاد آدم کو بلاواسطہ تلقین فرما دیا گیا، ورنہ فکر واستدلال کے راستہ سے ایسا اتفاق پیدا ہوجانا تقریباً ناممکن تھا۔قرآن کریم کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اس نے آیات حاضرہ میں عقیدہ کی اس فطری یکسانیت کے اصلی راز پر روشنی ڈالی۔ بلاشبہ ہم کو یادنہیں کہ اس بنیادی عقیدہ کی تعلیم کب اور کہاں اور کس ماحول میں دی گئی؟ تاہم جس طرح ایک لیکچرار اور انشاء پرداز کو یقین ہے کہ ضرور اس کو ابتدائے عمر میں کسی نے الفاظ بولنے سکھلائے ،جس سے ترقی کر کے آج اس رتبہ کو پہنچا۔گو پہلا لفظ سکھلانے والا اور سکھلانے کے وقت، مکان اور دیگر خصوصیات مقامی بلکہ نفس سکھلانا بھی یادنہیں۔تاہم اس کے موجودہ آثار سے یقین ہے کہ ایسا واقعہ ضرور ہوا ہے۔اسی طرح بنی نوع انسان کا علیٰ اختلاف الاقوام والاجیال ''عقیدہ ربوبیت الٰہی'' پر متفق ہونا اس کی کھلی شہادت ہے کہ یہ چیز بدءِ فطرت میں کسی معلم کے ذریعہ سے ان تک پہنچی ہے۔باقی تعلیمی خصوصیات واحوال کا محفوظ نہ رہ سکنا اس کی تسلیم میں خلل انداز نہیں ہوسکتا۔اسی ازلی وفطری تعلیم نے جس کا نمایاں اثر آج تک انسانی سرشت میں موجود چلا آتا ہے، ہر انسان کو خدا کی حجت کے سامنے ملزم کر دیا ہے۔ جو شخص اپنے الحاد وشرک کو حق بجانب قرار دینے کے لیے غفلت، بے خبری یا آباؤ اجداد کی کورانہ تقلید کا عذر کرتا ہے،اس کے مقابلہ پر خدا کی یہی حجت قاطعہ جس میں اصل فطرت انسانی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، بطور فیصلہ کن جواب کے پیش کی جاسکتی ہے۔حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت سے ان کی اولاد اور ان سے ان کی اولاد نکالی ،سب سے اقرار کروایا اپنی خدائی کا۔ پھر پشت میں داخل کیا۔اس سے مدعا یہ ہے کہ خدا کے رب مطلق ماننے میں ہر کوئی آپ کفایت کرتا ہے، باپ کی تقلید نہ چاہیے۔اگر باپ شرک کرے بیٹے کو چاہیے ایمان لاوے۔اگر کسی کو شبہ ہو کہ وہ عہد تو یادنہیں رہا پھر کیا حاصل؟ تو یوں سمجھے کہ اس کا نشان ہر کسی کے دل میں ہے اور ہر زبان پر مشہور ہو رہا ہے کہ سب کا خالق اللہ ہے،سارا جہان قائل ہے اور جو کوئی منکر ہے یا شرک کرتا ہے سو اپنی عقل ناقص کے دخل سے، پھر آپ ہی جھوٹا ہوتا ہے۔(تفسیر عثمانی:۲۲۹)

اس کے بعد سورت کے اختتام تک جو اہم مضامین مذکور ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

بلعم بن باعوراء کا قصہ:

سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۵ میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ﴿۱۷۵﴾

اور (اے رسول) ان کو اس شخص کا واقعہ پڑھ کر سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں عطا فرمائیں مگر وہ ان کو بالکل چھوڑ نکلا، پھر شیطان اس کے پیچھے لگا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا۔ (۱۷۵)

اس آیت میں بنی اسرائیل کے ایک شخص کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت عبد اللہ بن عباس ؓ کے بقول اس شخص کا نام بَلْعَم بن باعوراء تھا، اس کی زبان سینہ تک لٹک آئی تھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر یہ عذاب کیوں ہوا؟ اس سلسلہ میں کئی باتیں منقول ہیں، ایک یہ کہ حضرت موسیٰؑ نے اسے شاہِ مدیَن کی طرف ایمان کی دعوت دینے کو بھیجا تھا، شاہِ مدین نے دعوت تو قبول نہ کی؛ لیکن اس کے ساتھ خوب داد و دہش کا معاملہ کیا، اس سے متاثر ہو کر یہ شخص مرتد ہو گیا، دوسرا واقعہ یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ رشوت لے کر ان ظالم و جابر لوگوں کا حلیف بن گیا، جن سے حضرت موسیٰؑ برسر جنگ تھے، اور حضرت موسیٰؑ اور ان کے رفقاء کے خلاف بددُعاء کرنے لگا، وہ جتنی بددُعاء حضرت موسیٰؑ کے لئے کرتا، اس کی زبان پر اُلٹے الفاظ جاری ہوتے اور حضرت موسیٰؑ کے دشمنوں کے خلاف بددُعاء کے الفاظ نکلتے، اس کے بعد بطور عذاب سینہ تک اس کی زبان لٹک آئی، جب اس نے دیکھا کہ دنیا و آخرت دونوں برباد ہو چکی ہے تو حضرت موسیٰؑ کے دشمنوں کو ایک چال سکھائی کہ وہ بنی اسرائیل میں اپنی جوان لڑکیوں کو بھیجیں اور انہیں برائی کرنے کا موقع دیں؛ چوں کہ اللہ تعالیٰ کو زنا حد درجہ ناپسند ہے؛ اس لئے ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا اور وہ برباد کر دیئے جائیں گے؛ چنانچہ یہی ہوا اور عذاب کے طور پر بنی اسرائیل میں پلیگ کی بیماری پیدا ہوئی اور ایک ہی دن میں ستر ہزار لوگ ہلاک ہو گئے، اسی طرح کی بعض اور روایات بھی نقل کی گئی ہیں؛ (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۷/ ۳۰۹) لیکن ان سب میں مشترک یہ بات ہے کہ ایک شخص ہدایت کے اعلیٰ مقام پر پہنچنے کے بعد مرتد ہو گیا اور بطور عذاب اس کی زبان باہر آ گئی؛ تاکہ ہر شخص اسے عبرت کی نظر سے دیکھے، یقیناً اس میں سبق ہے کہ آدمی کو ہمیشہ فکر مند رہنا چاہئے اور اپنے بارے میں مطمئن نہ ہو جانا چاہئے کہ نہ معلوم انسان کب ہدایت سے محروم ہو جائے؟ ''رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا''۔ (آل عمران: ۸) چوں کہ اس شخص کی زبان باہر نکل آئی تھی؛ اس لئے اسے کتے سے تشبیہ دی گئی، انسان اور ہر جاندار کو سانس لینے اور سانس چھوڑنے کی ضرورت پیش آتی ہے، وہ ہر لمحہ اس عمل کو کسی مشقت اور تکلیف کے بغیر انجام دیتا ہے؛ لیکن کتا اسی کام کو زبان باہر نکال کر مشقت کے ساتھ انجام دیتا ہے، یہی کیفیت اس شخص کی تھی؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے کتے کی مثال دی۔ (آسان تفسیر: ۱/ ۵۲۳)

اس قصے سے یہ سبق ملتا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالی نے علم اور عبادت کے شرف سے نوازا ہو اس کو دوسروں کے

مقابلے میں زیادہ احتیاط اور تقوی سے کام لینا چاہئے، اگر ایسا شخص اللہ کی آیات کی خلاف ورزی کر کے ناجائز خواہشات کے پیچھے چل پڑے تو اس کا انجام دنیا اور آخرت دونوں میں برا ہوتا ہے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

علم؛ عمل اور اعلیٰ اخلاق کے بغیر بیکار ہے:

اس قصے سے ہمیں یہ عبرت حاصل ہوتی ہے کہ عمل اور اعلی اخلاق کے بغیر خالی خولی علم اللہ کے ہاں کسی کام کا نہیں؛ اس لیے عرب شاعر نے کہا ہے کہ

لو كان في العلم من دون التقى
شرف لكان اشرف خلق الله ابليس

(اگر تقوی کے بغیر علم میں کوئی شرف کمال ہوتا تو اللہ تعالی کی مخلوق میں سے ابلیس سب سے زیادہ معزز ہوتا)

کفار چوپاؤں کی طرح ہیں:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ ......الی.......اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴿۱۷۹﴾

اور ہم نے جنات اور انسانوں میں سے بہت سے لوگ جہنم کے لیے پیدا کیے، ان کے پاس دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، اور ان کے پاس کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ (۱۷۹)

یعنی ان کی تقدیر میں یہ لکھا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے ایسے کام کریں گے جو انہیں جہنم تک لے جائیں گے؛ لیکن یہ یاد رہے کہ تقدیر میں لکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ جہنم کے کام کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں، بلکہ بلاتشبیہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک استاد اپنے کسی شاگرد کے حالات کے پیش نظر یہ لکھ کر رکھ دے کہ یہ فیل ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ استاد نے اسے فیل ہونے پر مجبور کر دیا؛ بلکہ اس نے جو کچھ لکھا تھا، اس کا مطلب یہی تھا کہ یہ شاگرد محنت کرنے کے بجائے وقت ضائع کرے گا اور اس کے نتیجے میں فیل ہوگا۔ (توضیح القرآن)

یعنی دل، کان، آنکھ سب کچھ موجود ہیں لیکن نہ دل سے ''آیات اللہ'' میں غور کرتے ہیں، نہ قدرت کے نشانات کا بنظر تعمق و اعتبار مطالعہ کرتے ہیں۔ اور نہ خدائی باتوں کو بسمع قبول سنتے ہیں۔ جس طرح چوپائے جانوروں کے تمام ادراکات صرف کھانے پینے اور بہیمی جذبات کے دائرہ میں محدود رہتے ہیں۔ یہ ہی حال ان کا ہے کہ دل و دماغ، ہاتھ پاؤں، کان آنکھ غرض خدا کی دی ہوئی سب قوتیں محض دنیاوی لذائذ اور مادی خواہشات کی تحصیل و تکمیل کے لیے وقف ہیں۔ انسانی کمالات اور ملکوتی خصائل کے اکتساب سے کوئی سروکار نہیں بلکہ غور کیا جائے تو ان کا حال ایک طرح چوپائے جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ جانور مالک کے بلانے پر چلا آتا ہے، اس کے ڈانٹنے سے رک جاتا ہے۔ یہ کبھی مالک حقیقی کی

آواز پر کان نہیں دھرتے، پھر جانور اپنے فطری قویٰ سے وہ ہی کام لیتے ہیں جو قدرت نے ان کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ زیادہ کی ان میں استعداد ہی نہیں۔ لیکن ان لوگوں میں روحانی وعرفانی ترقیات کی جو فطری قوت واستعداد ودیعت کی گئی تھی، اسے مہلک غفلت اور بے راہ روی سے خود اپنے ہاتھوں ضائع ومعطل کر دیا گیا۔ (تفسیر عثمانی: ۲۳۰)

عذاب کے مؤخر ہونے سے دھوکہ نہ کھاؤ:

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٢﴾

اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے انہیں ہم اس طرح دھیرے دھیرے پکڑ میں لیں گے کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔

مہلت کے وقفہ کی وجہ سے بسا اوقات انسان دھوکہ کھا جاتا ہے اور گناہوں پر مزید جری ہو جاتا ہے۔

قیامت کا علم:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا .... الیٰ.........قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٧﴾

(اے رسول) لوگ تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب برپا ہوگی؟ کہہ دو کہ: اس کا علم تو صرف میرے رب کے پاس ہے۔ وہی اسے اپنے وقت پر کھول کر دکھائے گا، کوئی اور نہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین میں بڑی بھاری چیز ہے، جب آئے گی تو تمہارے پاس اچانک آجائے گی۔ یہ لوگ تم سے اس طرح پوچھتے ہیں جیسے تم نے اس کی پوری تحقیق کر رکھی ہے۔ کہہ دو کہ: اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے، لیکن اکثر لوگ (اس بات کو) نہیں جانتے۔ (۱۸۷)

نفع نقصان کا اختیار صرف اللہ پاک کو ہے:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ .... الیٰ................اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿١٨٨﴾

کہو کہ: جب تک اللہ نہ چاہے میں خود اپنے آپ کو بھی کوئی نفع یا نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں رکھتا، اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں اچھی اچھی چیزیں خوب جمع کرتا، اور مجھے کبھی کوئی تکلیف ہی نہ پہنچتی، میں تو بس ایک ہوشیار کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں، ان لوگوں کے لیے جو میری بات مانیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ مجھے غیب کی ساری باتوں کا علم نہیں دیا گیا، البتہ جو باتیں اللہ تعالی مجھے وحی کے ذریعے بتادیتے ہیں ان کا مجھے بھی علم ہو جاتا ہے، یہ ان کافروں کی بھی تردید ہے جو پیغمبر کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ اسے خدائی اختیارات ہوں اور ان لوگوں کے لئے بھی تنبیہ ہے جو اپنے پیغمبروں کی تعظیم میں حد سے نکل کر انہیں خدائی کا درجہ دے دیتے ہیں اور جس شرک کو مٹانے کے لئے انبیاء علیہم السلام تشریف لائے ان کی تعظیم کے نام پر اسی شرک کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔

بتوں کی کمزوری ولاچاری:

کفار مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈرایا کرتے تھے کہ آپ ہمارے دیوتاؤں کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہیں کہ ان میں کچھ بھی طاقت نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے دیوتا آپ کو (معاذ اللہ) سزا دیں گے۔ یہ آیت اس کا جواب دے رہی ہے۔

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ.....الیٰ........وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ﴿۱۹۸﴾

بھلا کیا ان کے پاس پاؤں ہیں جن سے وہ چلیں؟ یا ان کے پاس ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑیں؟ یا ان کے پاس آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھیں؟ یا ان کے پاس کان ہیں جن سے وہ سنیں؟ (ان سے کہہ دو کہ) تم ان سب دیوتاؤں کو بلا لاؤ جنہیں تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے، پھر میرے خلاف کوئی سازش کرو، اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ (۱۹۵) میرا رکھوالا تو اللہ ہے جس نے کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک لوگوں کی رکھوالی کرتا ہے۔ (۱۹۶) اور تم اس کو چھوڑ کر جن جن کو پکارتے ہو وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں نہ اپنی مدد کرتے ہیں۔ (۱۹۷) اور اگر تم انہیں صحیح راستے کی طرف بلاؤ تو وہ سنیں گے بھی نہیں۔ وہ تمہیں نظر تو اس طرح آتے ہیں جیسے تمہیں دیکھ رہے ہوں، لیکن حقیقت میں انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ (۱۹۸)

اخلاق کریمانہ:

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴿۱۹۹﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴿۲۰۰﴾

(اے پیغمبر) درگزر کا رویہ اپناؤ، اور (لوگوں کو) نیکی کا حکم دو، اور جاہلوں کی طرف دھیان نہ دو۔ (۱۹۹) اور اگر کبھی شیطان کی طرف سے تمہیں کوئی کچوکا لگ جائے تو اللہ کی پناہ مانگ لو۔ یقیناً وہ ہر بات سننے والا، ہر چیز جاننے والا ہے۔ (۲۰۰)

مفسرین نے لکھا ہے کہ کچوکا سے مراد وسوسہ ہے اور اس آیت شریفہ میں ہر مسلمان کو تعلیم دی گئی ہے کہ جب بھی شیطان دل میں کوئی برے خیال کا وسوسہ ڈالے تو فوراً اللہ تعالی کی پناہ مانگنی چاہئے اس بات کا ذکر خاص طور پر درگزر کا رویہ اپنانے کے سلسلے میں کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں درگزر کرنے کی فضیلت ہے وہاں بھی اگر شیطانی اثر سے بھی کسی کو غصہ آجائے تو اس کا علاج بھی اللہ تعالی سے پناہ مانگنا ہے۔ (خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

سورۂ اعراف کی ابتداء اور اختتام:

سورۂ اعراف کی ابتداء بھی قرآن کریم کی عظمت کے بیان سے ہوئی تھی اور اس کا اختتام بھی قرآن کریم کی تعظیم کے بیان پر ہوا ہے چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝۲۰۴

اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو کان لگا کر سنو، اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحمت ہو۔ (۲۰۴)

جب کوئی شخص قرآن کریم کی عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے پڑھتا ہے یا سنتا ہے اور غور و تدبر کرتا ہے تو اس کا دل متاثر ہوتا ہے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور آنکھوں سے آنسو رواں ہوجاتے ہیں۔

استماع اور انصات میں فرق

استماع:

استماع اس سننے اور کان لگانے کو کہتے ہیں کہ جو بالقصد والا رادہ ہو اور پوری توجہ کے ساتھ ہو اور جب استماع کا صلہ لام لایا جائے تو فائدہ اختصاص کا دیتا ہے، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے **فاستمع لما یوحی** (اے موسیٰ (علیہ السلام) اس وحی کو پوری توجہ کے ساتھ سنو جو تمہاری طرف بھیجی جارہی ہے) اور **لما یوحی** میں جو لام اختصاص لایا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی توجہ اور التفات کو ہماری وحی اور ہمارے کلام کے سننے کے لیے مخصوص کردو کہ جب تک وحی کا نزول ہوتا رہے اس وقت تک توجہ اور التفات کسی دوسری جانب مبذول نہ ہو۔

اسی طرح **واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ** کا مطلب یہ ہوگا کہ جب تک امام کلام خداوندی کی قراءت کرتا رہے تو مقتدی کو چاہیے کہ پوری توجہ اور التفات کے ساتھ کلام خداوندی کو سنے اور اپنی توجہ اور التفات کو قرآن کے سننے کے لیے مخصوص کردے۔

انصات:

اور انصات کے معنی سکوت اور خاموشی کے ہیں مگر انصات کے معنی مطلق سکوت اور خاموشی کے نہیں بلکہ کسی متکلم کے ادب اور احترام کی بناء پر خاموش رہنے کا نام انصات ہے خواہ وہ کلام سنائی دے یا نہ دے۔ مثلاً کوئی شخص اپنی خلوت اور تنہائی میں خاموش بیٹھا ہے تو لغت میں اس کو سکوت اور صموت کہیں گے، مگر انصات نہ کہیں گے۔ انصات لغت میں اس سکوت اور خاموشی کو کہتے ہیں کہ جو کسی متکلم کے کلام کے ادب اور احترام میں خاموشی اختیار کی جائے؛ عام اس سے کہ متکلم کا کلام سن رہا ہو یا نہ سن رہا۔

قرآن کریم کے ادب اور احترام کا ذکر تھا جو سب سے بڑا ذکر ہے اور اللہ کا کلام ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اس کا ادب یہ ہے کہ کانوں سے بغور توجہ اس کو سنا جائے اور زبان سے سکوت اور خاموشی رکھی جائے، اب ان آیات میں عام ذکر کر کے آداب کی تلقین فرماتے ہیں، قرآن کریم کی تلاوت اور سماعت کے بعد ذکر الٰہی کا درجہ ہے، اس کا ادب یہ ہے:

(۱) آہستہ ہو، بلند آواز سے نہ ہو (۲) تضرع اور زاری کے ساتھ ہو (۳) خوف وخشیت کے ساتھ ہو (۴) صبح وشام کے وقت میں خاص طور پر اس کا اہتمام ہو، یہ دو وقت عالم آخرت میں مقربین کے دیدار کے لیے ہیں کہ وہ روزانہ صبح وشام

دیدار خداوندی سے مشرف ہوتے ہیں (۵) کسی وقت یاد خداوندی سے غافل نہ ہو۔غفلت سے بڑھ کر کوئی خسارہ اور محرومی نہیں۔(ادریسی: ۲۷۶/۳،۲۹۰)

ملحوظہ: اس سورۃ کے آخر میں آیت سجدہ ہے، جو شخص عربی میں آیت سجدہ پڑھے گا یا سنے گا اس پر سجدہ کرنا واجب ہے،اس سورہ میں یہ پہلا سجدہ ہے اور قرآن کریم میں کل چودہ سجدے ہیں ۔علماء نے لکھا ہے جو شخص سجدے کی آیت پڑھے اور سجدہ کرے پھر دوسری آیت سجدہ پڑھے اور سجدہ کرے،اسی طرح تمام آیت سجدہ الگ الگ پڑھتا جائے اور ہر ایک کے ساتھ سجدہ کرتا جائے اور آخر میں اللہ سے دعا کرے تو اللہ تعالی اس کی تمام پریشانیوں کو دور فرمادیں گے۔(خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

خلاصہ رکوع: ۱۲......پہلی تباہ شدہ امتوں پر تنقیدی نگاہ اور مخالفین اسلام کے لئے تنبیہ۔ماخذ: آیت: ۹۴ تا ۹۶،۹۷۔

خلاصہ رکوع: ۱۳......امم سابقہ کی تباہی کا باعث تکذیب رسل ہی تھا، درقصہ حضرت موسی علیہ السلام وفرعون ۔ ماخذ: آیت: ۱۰۳،۱۰۱۔

خلاصہ رکوع: ۱۴......بقیہ قصہ موسی علیہ السلام وفرعون۔ماخذ: آیت: ۱۰۹۔

خلاصہ رکوع: ۱۵......بقیہ قصہ موسی علیہ السلام وفرعون۔ماخذ: آیت: ۱۲۷۔

خلاصہ رکوع: ۱۶......بقیہ قصہ موسی علیہ السلام وفرعون۔ماخذ: آیت: ۱۳۰۔

خلاصہ رکوع: ۱۷......موسی علیہ السلام اپنی امت اجابت کے لئے قانون لینے کے واسطے کوہ طور پر تشریف لے گئے۔ ماخذ: آیت: ۱۴۲۔

خلاصہ رکوع: ۱۸......موسی علیہ السلام کے کوہ طور پر جانے کے بعد امت نے بت پرستی شروع کر دی۔ماخذ: آیت: ۱۴۸۔

خلاصہ رکوع: ۱۹......(۱) گوسالہ پرستی پر نزول غضب وذلت،(۲) موسی علیہ السلام کی امت کی دائمی نصرت کے شرائط۔ماخذ: آیت: ۱۵۲،۱۵۶،۱۵۷۔

خلاصہ رکوع: ۲۰......(۱) دعوت امت موسی علیہ السلام اور (۲) اس کے نتائج ۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۵۸۔(۲) آیت: ۱۵۹۔

خلاصہ رکوع: ۲۱......دعوت الی الحق کے بعد داعی بری الذمہ ہے۔ماخذ: آیت: ۱۶۵۔

خلاصہ رکوع: ۲۲......(۱) کتاب اللہ کی طرف دعوت دینے کی ضرورت اس لئے محسوس ہو رہی ہے کہ تم میں سے ہر ایک براہ راست خدا تعالی کی غلامی کا عہد کر آیا ہے،لہذا اس کے ایفا کے لئے ہدایت کی ضرورت تھی، تاکہ تم قیامت کے دن عدم اطلاع کا عذر نہ کرنے پاؤ۔(۲) ایک دوسری وجہ بھی بڑی زبردست موجود ہے کہ شیطان تمہیں گمراہ کرنے کے

لئے کمر بستہ ہے، چنانچہ بلعم باعوراء کو اس نے بہکا ہی لیا۔ (۳) دعوت کتاب اللہ کو رد کرنے والے اَنعام سے بھی بدتر ہیں۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۷۲۔ (۲) آیت: ۱۷۵۔ (۳) آیت: ۱۷۹۔

خلاصہ رکوع: ۲۳...... مدعوین کو اعراض کی حالت میں استدراجاً مہلت کا ملنا سنت اللہ میں داخل ہے۔ ماخذ: آیت: ۱۸۲۔

خلاصہ رکوع: ۲۴...... کتاب اللہ کا اتباع چھوڑ کر احتراز عن الشرک مشکل بلکہ ناممکن ہے، لہذا اتباع کتاب اللہ اشد ضروری ہے۔ ماخذ: آیت: ۱۸۹ تا ۱۹۰، ۲۰۳۔

***

سورۃ الانفال

سورۂ انفال تلاوت کے اعتبار سے قرآن کریم کی آٹھویں سورۃ ہے، نزول کے اعتبار سے ۸۸ نمبر پر ہے، جس میں کل رکوع ۱۰، آیات ۷۵، تعداد کلمات ۱۲۵۳، اور حروف ۵۵۲۲ ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔ دوسری مدنی سورتوں کی طرح اس میں شرعی احکام کے بیان کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔

اس سورت میں اسلام اور کفر کے درمیان ہونے والی سب سے پہلی جنگ یعنی غزوہ بدر کے بارے میں مستقل تبصرہ کیا گیا ہے اور اس اخلاقی مقصد کو بھی بتایا گیا ہے جو حق و باطل کے اس معرکے میں تھا اور ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے پہلے غزوہ بدر کی وجہ اور معاندین کے اس پر اعتراضات کے جواب اور پھر مختصراً غزوہ بدر کا حال مندرجہ ذیل بیان کیا جارہا ہے۔

مکہ مکرمہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت کے بعد تیرہ سال قیام فرمایا، جس کے دوران آپ علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کو کفار نے ہر طرح کی تکالیف پہنچائیں، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے تک کا منصوبہ بھی بنایا گیا جس کا تذکرہ بھی اس سورہ میں موجود ہے، جب آپ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو یہ بات بھی کفار کو برداشت نہ ہوئی؛ چنانچہ انہوں نے عبداللہ بن ابی کو مدینہ منورہ میں خط لکھا کہ تم لوگوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کو پناہ دی ہے اس کو ختم کردو؛ ورنہ ہم تم پر حملہ کردیں گے۔ (ابوداؤد، کتاب الخراج باب ۲۳ حدیث نمبر ۳۰۰۴) اسی طرح ایک انصاری سردار صحابی حضرت سعد بن معاذؓ جب مکہ مکرمہ گئے تو طواف کے دوران ابوجہل نے ان سے کہا کہ تم نے ہمارے دشمنوں کو پناہ دے رکھی ہے اگر تم ہمارے ایک سردار کی پناہ میں نہ ہوتے تو یہاں سے زندہ واپس نہ جاتے، جس کا مطلب یہ تھا کہ آئندہ اگر مدینہ منورہ کا کوئی آدمی مکہ مکرمہ آئے گا تو قتل کردیا جائے گا، حضرت سعد رضی اللہ نے فرمایا کہ اگر تم ہمارے آدمیوں کو مکہ مکرمہ آنے سے روکو گے تو ہم تمہارے لئے اس سے بڑی رکاوٹ کھڑی کردیں گے۔ یعنی تمہارے تجارتی قافلے جو مدینہ منورہ کے راستے شام وغیرہ جاتے ہیں تو ہم ان کو روکنے اور حملہ کرنے میں آزاد ہوں گے۔ (صحیح البخاری کتاب المغازی باب ۲ حدیث نمبر ۳۹۵۰)

اس کے بعد کفار نے اپنی کچھ کاروائیاں بھی کیں کہ مسلمانوں کے مویشی وغیرہ مدینہ منورہ کے آس پاس سے لوٹ کر

لے گئے، حالات کے اس پس منظر میں کفار کا ایک قافلہ ابوسفیان کی قیادت میں شام سے تجارتی قافلہ لے کر واپس مدینہ منورہ کے راستے مکہ مکرمہ جا رہا تھا، یہ قافلہ ۱۰۰۰ اونٹوں پر مشتمل تھا اور پچاس ہزار دینار کا سامان لا رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ملی تو آپ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے چیلنج کے مطابق اس قافلے پر حملے کا ارادہ کیا اور صرف ۳۱۳ جانثاروں کے ساتھ (جن کے پاس صرف ستر اونٹ، دو گھوڑے اور ساٹھ زرہیں تھیں) مدینہ منورہ سے نکلے۔

معترضین نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ایک پرامن قافلے پر حملہ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا اور بعض روشن خیال مسلمانوں نے بھی مرعوب ہو کر یہ دعوی کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارداہ قافلے پر حملے کا نہیں تھا بلکہ ابوسفیان نے خود خطرہ محسوس کر کے ابوجہل کو حملہ کی دعوت دی تھی؛ لیکن یہ بات درست نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ:

(۱) جو واقعات ہم نے اوپر بیان کئے ہیں ان کی روشنی میں فریقین کے درمیان ایک مسلسل جنگ کی حالت موجود تھی، دونوں نے نہ صرف ایک دوسرے کو چیلنج دے رکھے تھے بلکہ کفار کی طرف سے عملی طور پر چھیڑ چھاڑ شروع بھی ہو چکی تھی۔

(۲) حضرت سعد بن معاذ انہیں پہلے سے متنبہ کر آئے تھے کہ وہ ان کے قافلوں پر حملہ کرنے میں آزاد ہوں گے۔

(۳) اس دور میں شہری اور فوجی افراد کی تفریق نہیں ہوتی تھی بلکہ ہر بالغ مرد "مقاتلہ" یعنی لڑنے والا کہلاتا تھا؛ چنانچہ قافلے کی سرکردگی ابوسفیان کے ہاتھ میں تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کا کھلا دشمن تھا اور اس کے ساتھ جو لوگ تھے وہ بھی مسلمانوں کو ستانے میں پیش پیش تھے اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاری کر رہے تھے اور یہ قافلہ بھی اگر مکہ مکرمہ پہنچ جاتا تو اس قافلے کا مال بھی مسلمانوں کے خلاف استعمال ہوتا۔

اس لئے اس قافلے کو ایک پرامن تجارتی قافلہ قرار دینا اس وقت کے حالات سے ناواقفیت یا محض عناد کا کرشمہ ہے اور اس کی وجہ سے ان واقعات کا انکار کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔

(آسان ترجمہ قرآن مع اختصار بحوالہ خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

ربط:

اس سے قبل سورۂ اعراف میں زیادہ تر مشرکین کے اور کسی قدر اہل کتاب کے کفر و فساد کا ذکر تھا، اس سورۃ میں ان پر غزوۂ بدر وغیرہ واقعات میں جو وہاں انعام نازل ہوا اس کی تفصیل ہے۔

وجہ تسمیہ:

انفال نفل کی جمع ہے، نفل اور نافلہ اس چیز کو کہتے ہیں جو اصل پر زائد چیز حاصل ہو، مال غنیمت کو اس لئے انفال کہتے ہیں کہ وہ برخلاف اور امتوں کے اس امت کے لئے ایک نفع کی بات ثواب جہاد سے زائد (جو اصل ہے) حلال ہے، جو اور امتوں کے لئے حلال نہ تھا۔ نماز نفل کو بھی اس لئے نفل کہتے ہیں کہ وہ فرض سے زائد بات ہے، اسی طرح جو مال جنگ میں سردار سپاہ اسلام کو بطور انعام ملتا ہے اس کو بھی نفل کہتے ہیں، اس جگہ مراد مال غنیمت ہے جو کفار سے مقابلہ کے بعد لیا

جاتا ہے۔

شان نزول:

(۱) جب جنگ بدر میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور مشرکین کا مال مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تو اس کی تقسیم میں لوگوں کا اختلاف ہوا، جوانوں نے کہا کہ ہمارا حق ہے، ہم ہی نے شکست دی ہے، بوڑھوں نے کہا ہمارا حق ہے ہم ہی تمہاری پشت پر تھے، لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ سے پوچھا تب یہ سورۃ نازل ہوئی، اس میں غنیمت اللہ اور رسول کے لئے قرار پائی، یعنی غنیمت اللہ کا مال ہے، جس طرح وہ رسول کو تعلیم کرے، تقسیم کرے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو برابر برابر تقسیم فرمادیا۔

(۲) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جنگ بدر میں میرا بھائی عمیر قتل کردیا گیا تھا، تو میں نے بھی سعید ابن العاص کو قتل کردیا اور اس کی تلوار لی جس کا نام ''ذوالکتیفہ'' تھا، اس کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مال مقبوضہ کے ذخیرہ میں ڈال آؤ، یہ سن کر میرے دل کی کیا حالت تھی اس کو خدا ہی جانتا ہے کہ ایک تو بھائی کا قتل، دوسرے جو کچھ میں نے چھینا تھا (تلوار) وہ بھی مجھ سے لے لیا گیا، لیکن میں تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ سورۂ انفال کی یہ آیتیں اتریں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلاکر فرمایا جاؤ اپنا چھینا ہوا مال لے لو۔

(۳) ابوداؤد، ترمذی، نسائی حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بدر کے روز ایک تلوار پیش کر کے عرض کیا کہ مجھے ہبہ کردیجئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ یہ تلوار نہ تیری ہے نہ میری، یہ سن کر مجھے رنج ہوا، پھر آپ نے مجھے بلاکر فرمایا کہ اس وقت تو وہ تلوار کسی کی نہیں تھی لیکن اب میری ہے، اس لئے میں تمہیں دیتا ہوں، چنانچہ اللہ جل شانہ نے فرمایا: اے رسول! یہ لوگ آپ سے مال غنیمت کا حکم دریافت کرتے ہیں، کہہ دیجئے کہ مال غنیمت تو اللہ اور رسول کا ہے، سو اللہ سے ڈرو، آپس میں سلوک رکھو، غنیمت پر جھگڑا نہ مچاؤ، ہر بات میں اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانو، اگر ایمان رکھتے ہو، پھر آگے حقیقی ایمان والوں کا وصف بیان فرمایا کہ ان میں یہ پانچ باتیں ہوتی ہیں۔

اول: جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو محبت اور خوف کے مارے ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔

دوم: جب اس کی آیتیں ان کو سنائی جاتی ہیں تو سن کر ان کا ایمان اور مستحکم ہوجاتا ہے۔

سوم: وہ ہر معاملہ میں اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں، یہ تینوں اوصاف قوت نظریہ سے متعلق ہیں۔

چہارم: نماز پڑھتے ہیں۔

پنجم: اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اگلی سورت میں بالخصوص مشرکین کی جہالت اور دشمنی اور بعض اہل کتاب کے کفر وفساد کا بیان تھا؛ اس سلسلے میں اب اس سورت میں ان کی ضد اور دشمنی اور کفر وفساد کے سبب دنیا میں ان کی سزا اور ان کے وبال کو بیان کیا گیا ہے، اس وقت

تک پوری دنیا میں اسلام کی تبلیغ ہو چکی تھی، بقرہ میں یہودیوں کو اسلام کی دعوت دی گئی، آل عمران میں عیسائیوں کو، سورہ نساء اور مائدہ میں عربوں کو، سورۂ اَنعام میں پارسیوں کو، نیز سورۂ اعراف میں اور دنیا کی باقی اقوام کو اسلام اور توحید کی دعوت دی گئی؛ لیکن مسلمان جس حکمت سے کام لیں اور بہترین طریقے سے تبلیغ کریں، پھر بھی ان کی باتوں سے کافروں کا مشتعل ہو کر حملہ کرنا یہ ایک فطری چیز تھی، تو ایسے حالات میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ اس حوالے سے قانون سازی کی بھی ضرورت تھی، تو اس سورت میں دکھایا گیا کہ دشمنوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے جنگ کے کچھ اصول ہونے چاہئے اور اس میں ایسی تیرہ قلموں (ایکٹ) کا بیان ہیں جو دنیا کی کوئی بھی قوم ان جنگی اصولوں سے آگے نہیں بڑھ سکتیں۔

''انفال''،نفل کی جمع ہے۔یعنی ایک اضافی چیز ہے، یہاں اس سے مراد مال غنیمت ہے، مال غنیمت کو اضافی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ پاک اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرتے ہیں، وہ خدائی دین کو کچلنے اور دبانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں، تو ان کی کوششوں کو ناکام بنا کر اللہ کا کلمہ بلند کرنا جہاد کا اصل مقصد ہے، اس مقصد کی کامیابی پر جو چیز حاصل ہو وہ اصل مقصد سے زیادہ ہوتی ہے۔

مکہ کا وہ دور بھی یاد رکھنے کے لائق ہے جب منکرین حق آپ کے خلاف سازشیں کر رہے تھے کہ آپ کو پکڑیں یا قتل کر دیں، وہ اپنا مکر کر رہے تھے اور اللہ پاک اپنی تدبیر کر رہے تھے اور اللہ پاک سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے، اس وقت وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اے اللہ! اگر یہ حقیقت ہے اور تمہاری طرف سے ہے تو ہم پر پتھر برساؤ یا کوئی اور عذاب لاؤ، اس وقت اللہ ان کو عذاب دینے والا نہیں تھا، کیونکہ آپ (رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان میں موجود تھے، اللہ تعالیٰ کا یہ قانون نہیں ہے کہ ایسے لوگ جو توبہ اور استغفار کرنے والوں کو عذاب دیں؛ لیکن اب کیوں یہ ان پر عذاب نہ بھیجے؟ جبکہ وہ مسجد الحرام کا راستہ روک رہے ہیں، تاہم وہ مسجد کا صحیح معنوں میں ذمہ دار نہیں ہے، کیونکہ اس کا حقیقی و صحیح معنوں میں ذمہ دار تقویٰ والے ہی ہو سکتے ہیں، اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑو؛ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین مکمل طور پر اللہ کے لیے ہو جائے، پھر اگر وہ فتنے سے باز آ جائیں تو اللہ ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر وہ باز نہ آئے تو جان لو کہ اللہ تمہارا کارساز اور بہترین مددگار ہے۔

اس موقع پر یہ بھی واضح کیا گیا کہ مال غنیمت دراصل غازیوں کا مال نہیں؛ بلکہ اللہ کا انعام ہے، تو من چاہے اس کا مالک نہ بنیں، پس اس کا پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے، باقی چار حصے شرکاء جہاد کے لیے ہیں، اے ایمان والو! جب آپ کا کسی گروہ سے سامنا ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور آپس میں لڑائی نہ کرو؛ ورنہ آپ کمزور ہو جائیں گے اور آپ کا رعب و دبدبہ ختم ہو جائے گا، صبر سے کام لو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، اللہ پاک کی سنت ہے کہ وہ کسی قوم کو جو نعمتیں عطا فرماتا ہے ان میں سے کسی کو بھی اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ

وہ قوم اپنا رویہ نہ بدلے۔

یہ سورت غزوہ بدر کے بعد نازل ہوئی، مسلمانوں کی تعداد اور ہتھیاروں کی کمی کے باوجود فتح ہوئی اور اس میں بھی اچانک تجارتی قافلے کی بجائے کفار کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ ہوئی، سورت میں ربانی (تقدیر) اور مادی مدد کا بیان ہے۔ اللہ پر کامل یقین کے ساتھ مادی سامان تیار کرنا، کچھ لوگ صرف مادیت کا سہارا لیتے ہیں، کچھ لوگ اپنا سب کچھ چھوڑ دیتے ہیں۔

صحابہ نے مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں پوچھا تو ۴۰ آیات کے بعد دسویں سپارہ کی پہلی آیت سے جواب آیا، جس سے معلوم ہوا کہ آپ جس جہاد کا بدلہ چاہتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہے؛ چنانچہ پہلی آیت میں تربیت کے عنوان پر فرمایا کہ وہ غنیمت کے بارے میں سوال کرتے ہیں، تو وہ مال اللہ اور اس کے رسول کا ہے، اللہ سے ڈرو اور ایک دوسرے سے اچھے تعلقات رکھو اگر تم ایمان رکھتے ہو، سورت کے ایک آدھے حصے میں خدائی مدد کا کثرت سے بیان ہے اور دوسرے نصف میں مادی اسباب کی طرف بھی اشارہ ہے۔

ربانی مدد کی تفصیل :

پہلی ۲۴ آیات میں ربانی مدد کا ذکر ہے: مثلاً (۱) مسلمانوں کا ایک گروہ لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ہم نے ایسا انتظام کیا کہ صحیح غلط سے ٹکرا کر اسے کھوکھلا کردے۔ جنگ سے پہلے سوجانا، بارش، دلوں کو مضبوط کرنا۔ جنگ کی روحانی تیاری، دونوں فوجیں ایک دوسرے کو کم تعداد میں سمجھتی ہیں؛ تاکہ لڑنے کے لیے تیار ہوجائیں، زیادہ دکھاتے تو مسلموں میں کم ہمتی پیدا ہوجاتی۔ فرشتوں کو اتارنا۔ مسلمانوں کی لڑائی کا مقام بھی ریت والا تھا جو بارش سے جم گئی؛ جب کہ کفار دلدل میں پھنس گئے، جنگ کی نسبت اپنی طرف کی اور مدد کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی، اس لیے اس کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔

مادی مدد کی تفصیل :

مادی تیاری کا حکم، ہتھیار کی تیاری، نقشہ کی تیاری، اس کی فضیلت، گھوڑے کی فضیلت کا بیان ہے، ہتھیار لڑنے کے بجائے دشمن کے دل میں ڈھاک بیٹھانے کے لیے ہے اور اسی لیے جنگ میں بھی صلح کی پیشکش قبول کرنے کا حکم دیا، دس گنا مادی (جسمانی) قوت سے لڑنے کا حکم، پھر دو گنا سے لڑنے کا حکم، اور اس میں صابرین کا بیان، اسباب کی طرف اشارہ ہے، دشمنوں کی شکست کی ایک وجہ جنگی سمجھ کی کمی بھی ہوسکتی ہے؛ کیونکہ جنگ میں جو چیز ثابت قدمی کی معین بنتی ہے وہ ہے آخرت کا یقین، وہ اس سے محروم ہیں، احکام کی بجا آوری اور بھائی چارے کا بیان، ریاکاری، تکبر نہ کرنا، ایمان کی صفت آیت نمبر ۴۵ تا ۵۷ میں دونوں (روحانی و مادی) اسباب کو جمع کیا، کفر ہی شکست کا سبب ہے، فرعون کی مثال، تو آیت نمبر ۵۴ ظلم کو ہار کا سبب بتلاتی ہے، سورت میں چھ بار یا ایھا الذین آمنوا سے خطاب کیا گیا ہے۔ اور آخیر میں انصار و مہاجرین کی تعریف پر سورت کا اختتام ہوا۔ (خواطر قرآنیہ، قرآن سارانس گجراتی)

جہاد فی سبیل اللہ:

خاص طور پر جہاد فی سبیل اللہ کا موضوع اس میں بہت نمایاں ہے، یہ سورت غزوہ بدر کے بعد نازل ہوئی جو کہ تاریخ اسلام میں ہونے والے غزوات کی بنیاد اور ابتدا تھا، اس غزوہ میں اللہ کی نصرت کا دیکھتی آنکھوں سے مشاہدہ کیا گیا اور ایک چھوٹے سے لشکر نے اپنے سے کئی گنا بڑے لشکر کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ①

(اے پیغمبر) لوگ تم سے مال غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ مال غنیمت (کے بارے میں فیصلے) کا اختیار اللہ اور رسول کو حاصل ہے۔ لہذا تم اللہ سے ڈرو، اور آپس کے تعلقات درست کرلو، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اگر تم واقعی مومن ہو۔

غنیمت کا حکم:

اس میں تردید آگئی اس خیال کی کہ مال غنیمت میں اصلی حق غازیوں، مجاہدوں، اور لشکر اسلامی کے سپاہیوں کا ہے۔ ان سے وعدہ تو اجر آخرت کا ہے، ان کا صلہ موعود تو صرف جنت اور وہاں کی نعمتیں ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں قتال ہرگز ہرگز اس نیت سے نہ کریں کہ مال غنیمت کے وہ مالک ومتصرف ہوں گے۔

دنیا میں ظہور اسلام سے قبل بھی بڑی بڑی متمدن ومہذب، پرقوت وشوکت سلطنتیں موجود تھیں، عظیم الشان جنگیں بھی آپس میں ہو چکی تھیں۔ اور ہوتی رہتی تھیں، مصر، ہند، ایران یونان، روما سب میں بڑے بڑے سیاسی ومعاشی مفکرین پیدا ہو چکے تھے، جنہوں نے غنائم جنگ سے متعلق بھی مختلف نظریے رواج دے رکھے تھے، قرآن مجید نے آکر دنیا میں پہلی بار ان سارے نظریات کو چیلنج دیا اور بتلایا کہ مال غنیمت نہ تو بادشاہ کی ملک ہے نہ فوج کے افسروں اور سپاہیوں کی، اور نہ ملک وقوم کی، بلکہ اصلاً وحقیقۃً صرف اللہ ہی کی ملک ہے،! سپاہیوں اور مجاہدوں میں اخلاص کامل پیدا کرنے کی کوئی صورت اس سے بڑھ کر نہیں۔

للہ، سوال کا جواب کتنا بلیغ وحکیمانہ ملا کہ وہی اس کا بھی مالک ہے جو جان ومال ہر چیز کا مالک ہے۔ گویا ارشاد یہ ہوا کہ جس طرح ربوبیت اس ذات پاک کی صفت خاصہ ہے، مالکیت بھی تمام تر اسی کا وصف مخصوص ہے۔ ہر جان کا مالک بھی وہی، ہر مال کا مالک بھی وہی، اسلامی نظام حکومت میں قانون اسی کا، اقتدار اعلیٰ اسی کا، زمین اسی کی، اور ٹھیک اسی طرح دشمن سے حاصل کیا ہوا مال بھی اسی کا۔ اسی کو اختیار ہے کہ تقسیم کا حکم جس طرح چاہے دے، یا جو کچھ چاہے کرے۔ (آیت) ''والرسول''۔ کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی کی معرفت اس حکم الہی کا اعلان اور بیان ہوگا کہ وہی اس دنیا میں اس مالک ومختاری کی مرضی واقتدار کے نمایندہ ہیں۔ (ماجدی: ۲/ ۴۲۴)

فائدہ:

انفال۔ نفل بالتحریک کی جمع ہے جس سے مراد مال غنیمت ہے۔ نفل دراصل بمعنی زیادت ہے اور نفل کو نفل اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اصل فرض سے زائد ہے اور غنیمت کو نفل اس لیے کہا گیا کہ وہ اللہ کی طرف سے فضل اور عطیہ ہے، مال غنیمت پہلی امتوں پر حلال نہ تھا، اس امت پر بطور فضل وزیادت حلال کر دیا گیا اور غنیمت اس مال کو کہتے ہیں جو جہاد میں کافروں سے حاصل ہوا اور فقہاء کی اصطلاح میں نفل کا اطلاق اس مال پر ہوتا ہے جو مسلمانوں کا امیر کسی غازی کو اس کافر مقتول کا گھوڑا یا ہتھیار دے دے جس کافر کو اس غازی نے قتل کیا ہے، چونکہ یہ مال غازی کو اس کے اصل حصہ سے زائد ملتا ہے، اس لیے اس زائد عطیہ کو نفل کہا جاتا ہے اور اس آیت میں انفال سے غنائم کے معنی مراد ہیں۔ (ادریسی: ۳/ ۲۹۲)

مومنوں کی صفات:

اس کے بعد سچے مومنوں کی پانچ صفات بیان کی گئی ہیں یعنی (۱) اللہ کی خشیت، (۲) تلاوت قرآن سے ایمان کی زیادتی، (۳) رحمٰن پر توکل (۴) نماز کی حفاظت (۵) اللہ کے بندوں کے ساتھ احسان۔

غزوہ بدر کی تفصیل:

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ...... الیٰ.......لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۸﴾

اور وہ وقت یاد کرو جب اللہ تم سے یہ وعدہ کر رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے کوئی ایک تمہارا ہوگا، اور تمہاری خواہش تھی کہ جس گروہ میں (خطرے کا) کوئی کانٹا نہیں تھا، وہ تمہیں ملے اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے احکام سے حق کو حق کر دکھائے، اور کافروں کی جڑ کاٹ ڈالے۔ (۷) تاکہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا ثابت کر دے، چاہے مجرم لوگوں کو یہ بات کتنی ناگوار ہو۔

صحابۂ کرام کے اوپر اللہ پاک کے انعامات کا ذکر:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ ...... الیٰ.......وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی دعوت قبول کرو، جب رسول تمہیں اس بات کی طرف بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور یہ بات جان رکھو کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان آڑ بن جاتا ہے اور یہ کہ تم سب کو اسی کی طرف اکٹھا کر کے لے جایا جائے گا۔ (۲۴) اور ڈرو اس وبال سے جو تم میں سے صرف ان لوگوں پر نہیں پڑے گا جنہوں نے ظلم کیا ہوگا اور جان رکھو کہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔ (۲۵) اور وہ وقت یاد کرو جب تم تعداد میں تھوڑے تھے، تمہیں لوگوں نے (تمہاری) سرزمین میں دبا کر رکھا ہوا تھا، تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک کر لے جائیں گے۔ پھر اللہ نے تمہیں ٹھکانا

دیا، اور اپنی مدد سے تمہیں مضبوط بنا دیا، اور تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق عطا کیا، تا کہ تم شکر کرو۔ (۲۶)

پہلا خطاب:

پہلا خطاب آیت ۱۵ میں ہے جس میں فرمایا گیا:

''اے ایمان والو! جب تم میدان جنگ میں کافروں سے ٹکراؤ تو ان سے پیٹھ مت کرو۔''

دوسرا خطاب:

دوسرا خطاب آیت ۲۰ میں ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرو اور اس سے سن کر اعراض نہ کرو۔

تیسرا خطاب:

تیسرا خطاب آیت ۲۴ میں ہے:

''اے ایمان والو! اللہ اور رسول کا حکم مانو، جب وہ تمہیں ایسے کام کی طرف بلائیں جس میں تمہاری زندگی ہے۔''

چوتھا خطاب:

چوتھا خطاب آیت ۲۷ میں ہے:

''اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو اور آپس کی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت نہ کرو۔''

پانچواں خطاب:

پانچواں خطاب آیت ۲۹ میں ہے:

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں فرقان عطا کر دے گا، تمہارے گناہ تم سے دور کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

چھٹا خطاب:

چھٹا خطاب آیت ۴۶ میں ہے اور یہ آیت دسویں پارہ میں ہے:

''اے ایمان والو! جب کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو، تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم پر چلو اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر سے کام لو کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے مزید احکام:

ان آیات میں جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے ان پر عمل پیرا ہو کر اور جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ان سے باز آ کر مسلمان یقیناً دنیا کی سب سے مضبوط اور طاقتور قوم بن سکتے ہیں۔

(۱) ایسی جماعت بھی شکست سے دو چار نہیں ہوسکتی جو دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہے۔(۲) جو اللہ اور رسول کے احکام کی اطاعت کرنے والی ہو۔(۳) جو ایسی دعوت پر لبیک کہنے والی ہو، جس میں دلوں کی زندگی اور عزت وسعادت کا راز پوشیدہ ہو۔(۴) جو نہ دین میں خیانت کرتی ہو اور نہ دنیوی حقوق کی ادائیگی میں خیانت کا ارتکاب کرتی ہو۔(۵) سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خوف خدا اور تقوی کی صفت سے متصف ہو۔(٦) اور آخری بات یہ کہ وہ گولہ بارود کی بارش میں بھی اللہ تعالی کا ذکر کرتی رہے۔(۷) اس کا کلمہ ایک ہو۔(۸) اس کی صفوں میں کامل اتحاد ہو۔(۹) وہ نفسانی اور گروہی تنازعات اور اختلافات میں مبتلا نہ ہو۔

ذرا غور کیجئے جس جماعت میں یہ صفات پائی جائیں وہ کبھی شکست کھا سکتی ہے؟ یقینا وہ فتح ہی سے ہمکنار ہوگی، اگر چہ اس کا مقابلہ پہاڑوں ہی سے کیوں نہ ہو۔(خلاصۃ القرآن: م اش)

مکہ واسیوں کا قتل کی سازش کرنا اور اللہ پاک کی طرف سے حفاظت:

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝۳۰

اور (اے پیغمبر) وہ وقت یاد کرو جب کافر لوگ تمہارے خلاف منصوبے بنا رہے تھے کہ تمہیں گرفتار کرلیں، یا تمہیں قتل کردیں، یا تمہیں (وطن سے) نکال دیں، وہ اپنے منصوبے بنا رہے تھے اور اللہ اپنا منصوبہ بنا رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر منصوبہ بنانے والا ہے۔(۳۰)

جنگ کے بعد بھی ایمان کی دعوت؛ جنگ کے اصل مقصد کی طرف مشیر ہے:

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ ......الی......نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝۴۰

(اے پیغمبر) جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے ان سے کہہ دو کہ: اگر وہ باز آجائیں تو پہلے ان سے جو کچھ ہوا ہے اسے معاف کردیا جائے گا۔ اور اگر وہ پھر وہی کام کریں گے تو پچھلے لوگوں کے ساتھ جو معاملہ ہوا، وہ (ان کے سامنے) گزر ہی چکا ہے۔(۳۸) اور (مسلمانو) ان کافروں سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور دین پورے کا پورا اللہ کا ہوجائے۔ پھر اگر یہ باز آجائیں تو ان کے اعمال کو اللہ خوب دیکھ رہا ہے۔(۳۹) اور اگر یہ منہ موڑے رکھیں تو یقین جانو کہ اللہ تمہارا رکھوالا ہے، بہترین رکھوالا اور بہترین مددگار۔(۴۰)

تمہید:......(تمام اقوام عالم کی تبلیغ) یہاں تک تمام اقوام عالم کو مسلمانوں نے تبلیغ کردی، سورۃ البقرۃ میں یہود کو، سورۃ آل عمران میں نصاری کو، سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ میں عرب کو، سورۃ الانعام میں مجوس کو، سورۃ الاعراف میں بقیہ اقوام عالم کو۔

جامعیت قانون:

قانون وہ جامع ہوتا ہے جو اپنے متبعین کو جلب نفع اور دفع ضرر کے راستے بتلائے، لہٰذا تبلیغ کے ذریعہ سے غیر مسلموں

کو مسلمان بنانے کا طریقہ بتلا دیا گیا ہے، مسلمان اگر چہ کتنی ہی حکمت عملی سے کام لے گا اور مواعظ حسنہ سے سمجھائے گا، بالآخر نتیجہ یہی ہوگا کہ غیر مسلم اپنے مذہب سے علیحدہ ہو کر اسلام میں داخل ہو جائے گا۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ مذہب خواہ کتنا ہی غلط اور غیر معقول ہو انسان اس پر جان دینا اپنی سعادت خیال کرتا ہے۔ اس لئے چنداں بعید نہیں کہ مسلمانوں کو ایسے واقعات پیش آئیں کہ غیر مسلم اپنے مذہب کی حفاظت کے لئے مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس وقت مسلمانوں کے سامنے تین صورتیں ہوں گی:

(۱)...... بھاگ کر جان بچائے۔

(۲)...... بعض ہندوؤں کے اصول کے مطابق ستیا گرہ کر دے یعنی خاموش ہو کر مار کھائے، یہاں تک کہ مارنے والا تھک جائے اور مارنا چھوڑ دے۔

(۳)...... یا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔

اگر باطل پرست اپنے جھوٹے مذہب پر جان دینے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں تو مسلمان کو اپنے سچے آسمانی یعنی خدائی مذہب پر بطریق اولی جان دینے کے لئے تیار سر بکف رہنا چاہئے۔ پہلی دو صورتیں حریت، غیرت اور شجاعت کے خلاف ہیں، لہذا مسلمانوں کے لئے فقط تیسری راہ عمل ہے، کیونکہ مذہب، جذبات حریت وغیرت کا مربی ہے، نہ کہ ان کا فنا کرنے والا۔

قانون جنگ کی دفعات:

سورۃ الانفال قانون جنگ کے اس حصہ پر مشتمل ہے جو دفع ضرر سے تعلق رکھتا ہے، یعنی اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ اگر دشمن مقابلہ کرنا چاہے تو مسلمانوں کے اصول جنگ کیا ہوں گے؟ ان اصول کو تیرہ دفعات میں بیان کیا گیا ہے، اور دنیا کا کوئی قانون جنگ ان تیرہ دفعات سے باہر نہیں جا سکتا۔

ابتداء دفعات:

دفعات قانون کی ابتداء دوسرے رکوع کی آیت: ''یا ایها الذین امنوا اذا لقیتم'' الآیہ سے ہوگی۔ اس سے پہلے ڈیڑھ رکوع میں تمہید ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ صحابہ کرام کو مال غنیمت میں اختلاف نہیں کرنا چاہئے، اس کی تقسیم اللہ تعالی کی مرضی کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے، جتنا مال ملے اسی پر قناعت کرو اور اپنے حقوق نہ جتلاؤ۔

خلاصہ رکوع: ۱...... رفع اختلاف متعلق غنیمت بدر۔ ماخذ: آیت: ۱ تا ۴۔

خلاصہ رکوع: ۲...... قانون جنگ کی دفعہ اول (صف قتال میں استقامت)۔ ماخذ: آیت: ۱۵۔

خلاصہ رکوع: ۳...... (۱) دفعہ دوم میدان جنگ میں اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطیع رہو۔ (۲) دفعہ سوم اس اطاعت کو زندگی سمجھو۔ (۳) دفعہ چہارم ادائے فرض میں خیانت نہ کرو۔ ماخذ: (۱) آیت: ۲۰۔ (۲)

آیت: ۲۴۔(۳) آیت ۲۷۔

خلاصہ رکوع: ۴...... دفعہ پنجم حصول فرقان کے لئے التزام تقوی۔ ماخذ: آیت: ۲۹۔

خلاصہ رکوع: ۵...... (۱) دفع ششم۔(۲) وہفتم غایۃ قتال قانون تقسیم غنائم۔ ماخذ: (۱) آیت ۳۹۔ (۲) آیت: ۴۰۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

نویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) حق اور باطل کی کشمکش میں اللہ تعالی سے اہل حق کی فتح اور غلبہ کی دعا کرنا انبیاء کی سنت ہے۔

(۲) اگر نعمت کے بعد شکر اور مصیبت کے بعد صبر کی توفیق ملے تو یہ حالت قابل تعریف ہے اور اگر نعمت کے بعد غفلت، غرور، اور مصیبت کے بعد شکوہ وشکایت اور انکار کی صورت ہو تو یہ حالت مذموم اور قابل اصلاح ہے۔

(۳) اسلام میں جادو سیکھنا اور سکھانا حرام ہے، ایسا کرنے والوں کو سزا دی جائے گی۔

(۴) مؤمنوں کا غالب اور کافروں کا مغلوب ہونا عظیم نعمت ہے، لہذا بلا عذر و مجبوری کافروں کے ماتحت رہنا مناسب نہیں۔

(۵) تکبر ایسا غلیظ ترین عمل ہے جو آیات الٰہیہ سے استفادہ سے محروم رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

(۶) ہدایت اور گمراہی بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور انسانوں کے دل بھی اللہ ہی کے قبضے میں ہیں، اس لئے بندے کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالی سے ہدایت دینے اور گمراہی سے بچانے کی دعا کرے۔

(۷) یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے، اللہ تعالی اپنے بندوں کو مختلف صورتوں سے آزماتے ہیں، عزت اور کامیابی کے مستحق وہی ہوتے ہیں جو آزمائش میں ثابت قدم رہتے ہیں۔

(۸) تدبر اور تفکر کی اللہ کے نزدیک خصوصی اہمیت ہے، اس لئے کہ صحیح نہج پر غور وفکر انسان کو حقیقی علم اور معرفت کا راستہ دکھاتا ہے، متعدد آیات میں اس کی ترغیب دی گئی ہے۔

(۹) انسان کو ہر وقت موت کے لئے تیار رہنا چاہئے، ممکن ہے اس کی زندگی کا چراغ گل ہونے والا ہو۔

(۱۰) اللہ تعالی جو حکم دیتے ہیں اس میں بھلائی ہی بھلائی ہوتی ہے جبکہ انسان بعض اوقات شر کو خیر اور خیر کو شر سمجھ لیتا ہے۔

***

پارہ:۱۰

سورۃ الانفال کا کچھ حصہ نویں پارہ میں بیان ہوا جس میں جہاد کی غایت بیان کی گئی کہ اس سے مقصود فتنہ وفساد کو مٹانا ہے، تاکہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہو اور زمین میں اس کے دین کو غلبہ حاصل ہو، اگر اہل ایمان اس نیت اور ارادے کے ساتھ خدا تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے دشمن کا مقابلہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کی مدد کرے گا اور انہیں کامیابی سے ہمکنار کرے گا، کیونکہ (آیت) "**نعم المولیٰ** "اللہ تعالیٰ بہت ہی اچھا آقا (آیت) "**ونعم النصیر** "اور بہت ہی اچھا مدد کرنے والا ہے۔

انفال غنیمت اور فیئے:

جہاد کے ضمن میں غنیمت کا مسئلہ بھی پیدا ہوا ہے۔اس سورۃ کی ابتدائی آیت "**یسئلونک عن الانفال**'' میں بھی مال غنیمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہاں پر صرف جماعتی نظم ونسق کے اعتبار سے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ تقسیم غنیمت کے معاملہ میں اہل ایمان کو جھگڑا نہیں کرنا چاہیے، یہ مال تو اللہ تعالیٰ کا ہے، وہ اپنی حکمت کے مطابق جس طرح چاہے اس کا فیصلہ کرے، جماعت المسلمین کو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل لازم ہے، اب آج کے درس میں مال غنیمت کی تقسیم کا قانون بیان کیا گیا ہے۔ یادرہے کہ قرآن پاک میں مال غنیمت کے متعلق تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اس سورۃ میں انفال اور غنیمت کے الفاظ ہیں جب کہ سورۂ حشر میں فے کا لفظ آیا ہے، جو مال دشمن کے ساتھ جنگ کر کے حاصل کیا جائے وہ غنیمت کہلاتا ہے اور جو مال صلح وصفائی کے ساتھ کسی معاہدہ کے تحت حاصل ہوا سے فیئے کہتے ہیں اور انفال کا اطلاق دونوں قسم کے اموال پر ہوتا ہے۔

سابقہ امتوں کے لیے مال غنیمت حلال نہیں تھا، صحیح احادیث میں آتا ہے کہ اس قسم کے جمع شدہ مال کو ٹھکانے لگانے کا طریق کار یہ تھا کہ اسے کسی خاص مقام پر ڈھیر کر دیا جاتا جسے غیبی آگ آ کر جلا ڈالتی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ ہماری امت میں ایسے مال کا حکم یہ ہے "**فلما رای ضعفنا وعجزنا**" پھر جب اللہ تعالیٰ نے ہماری کمزوری اور عاجزی کو دیکھا تو مال غنیمت کو ہمارے لیے حلال وطیب قرار دے دیا، لہٰذا یہ آخر امت اس مال سے استفادہ کرسکتی ہے البتہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تقسیم کا قانون بیان فرما دیا ہے، مال فے چونکہ بغیر جنگ کے حاصل ہوتا ہے اس لیے اس میں مجاہدین کا حصہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ سارے کا سارا اجتماعی امور میں استعمال کیا جاتا ہے، ایسے امور میں جہاد بھی شامل ہے، غرباء ومساکین کی امداد بھی معاشرے کی مجموعی ذمہ داری ہے۔اس کے علاوہ مساجد ومدارس کی تعمیر، ہسپتال، مسافر خانے اور پانی کی بہم رسائی وغیرہ پر بھی یہ رقم خرچ کی جاسکتی ہے۔

مالِ غنیمت کا سخت حکم:

مالِ غنیمت کی تقسیم کا قانون دسویں پارے میں بیان کیا گیا ہے، یہ حکم بڑا سخت ہے اور اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص اپنی مرضی سے ایک سوئی یا جوتے کا تسمہ بھی نہیں لے سکتا، یہ حرام ہے، مال غنیمت میں خیانت کرنے کو چوری سے بھی سخت جرم قرار دیا گیا ہے، مالِ غنیمت کی چوری کرنا جہنم کا نشانہ بننا ہے، فرمایا کہ مال غنیمت کا ایک دھاگہ یا سوئی بھی کسی کے پاس ہو تو وہ لا کر رکھ دے، کیونکہ ایسی معمولی سی خیانت بھی شرم کی بات ہوگی اور اس کا بڑا وبال پڑے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے "شراک من النار و شرا کان من النار" مال غنیمت میں سے جوتے کا ایک تسمہ یا دو تسمے بھی اٹھائے ہیں تو وہ جہنم میں لے جائیں گے، ایک موقع پر ایک شخص نے مال غنیمت میں سے کوئی معمولی سی چیز اٹھالی۔ اس کے بعد مال تقسیم ہو گیا۔ اس شخص کو بعد میں خیال آیا کہ اس سے غلطی سرزد ہوئی ہے، چنانچہ وہ چیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے آیا۔ اس پر آپ نے فرمایا: اب میں اس کا کیا کروں؟ یہ تو جہنم کا مال ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اونٹ کی اون کے ایک بال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس مال میں میرا تو اتنا بھی حق نہیں یعنی میرا ذاتی کوئی اختیار نہیں، یہ مال اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک غلام جہاد میں مارا گیا، لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خوشخبری دی کہ آپ کا غلام دشمن کے تیر سے ہلاک ہو گیا، آپ نے فرمایا: کلا وہ شہید نہیں ہے بلکہ وہ تو جہنم میں پڑا ہے، کیونکہ اس نے مال غنیمت سے ایک چادر چوری کر لی تھی۔ اب وہی چادر جہنم میں آگ کے شعلے بن کر اس کے جسم کے گرد لپٹ رہی ہے، یہ سن کر لوگ بڑے خوفزدہ ہوئے اور اس کے بعد کسی شخص نے مال غنیمت میں سے کوئی چیز بلا اجازت و تقسیم حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تقسیم مال سے پہلے کوئی چیز حاصل کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ چیز امیر لشکر یا حاکم وقت کی اجازت سے حاصل کی جائے۔ (معالم العرفان: ۹/۱۲۸)

چنانچہ ارشاد باری ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۱﴾

اور (مسلمانو) یہ بات اپنے علم میں لے آؤ کہ تم جو کچھ مال غنیمت حاصل کرو اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول اور ان کے قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے (جس کی ادائیگی تم پر واجب ہے) اگر تم اللہ پر اور اس چیز پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن نازل کی تھی، جس دن دو جماعتیں باہم ٹکرائی تھیں، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۴۱)

جو چیز محنت ومشقت کے ذریعہ حاصل کی جائے، اسے عربی زبان میں 'غنیمت' کہتے ہیں، جہاد سے بڑھ کر محنت و مشقت کیا ہوگی؟ اس لئے جنگ کی بنیاد پر دشمن کا جو مال ہاتھ آئے، اسے ''مالِ غنیمت'' کہا جاتا ہے اور اسلامی حکومت کو صلح کی بنا پر غیر مسلم علاقوں سے جو مال حاصل ہوا، وہ 'فئ' کہلاتا ہے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت غزوۂ بدر کے موقع سے نازل ہوئی؛ کیوں کہ پہلی بار مسلمانوں کو مالِ غنیمت حاصل ہور ہا تھا؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس مال کے سلسلے میں مہذب احکام مقرر فرمائے کہ لوٹ کھسوٹ کا طریقہ اختیار نہ کرو کہ جو چیز جس کے ہاتھ آئی، وہ اس کو لے کر چلتا بنا؛ بلکہ تہذیب وشائستگی سے کام لو کہ سارا مال پہلے جمع کیا جائے، پھر اس کا چار حصہ مجاہدین پر تقسیم کردیا جائے اور ایک حصہ سرکاری خزانہ میں جائے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں پھر اس حصہ کے پانچ حصے کئے جاتے تھے، جس میں ایک حصہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ہوتا تھا، اس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیادہ تر سرکاری ضروریات پر خرچ فرماتے تھے، ایک حصہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرابت داروں کا ہوتا تھا، جس میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک پانچ خاندان شامل تھے: علی بن ابی طالب، عقیل بن ابی طالب، جعفر ابن ابی طالب، حارثہ بن عبد المطلب، عباس بن عبد المطلب (بدائع الصنائع: ۲/ ۱۶۲) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حصہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت کا خصوصی حصہ باقی نہیں رہا، اب تین مصارف باقی رہ گئے: یتیم، مسکین اور مسافر، غور کیا جائے تو یہ تین مصارف تمام ضرورت مندوں کو شامل ہیں؛ البتہ اب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل قرابت کو فقر وحاجت مندی کی بنیاد پر دیا جائے گا؛ بلکہ انہیں اس میں ترجیح حاصل رہے گی، ان تینوں مصارف میں ایک ایک تہائی خرچ کرنا ضروری نہیں؛ بلکہ حکومت کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنی صواب دید سے ضرورت کو دیکھتے ہوئے خرچ کرے، چار حصے جو مجاہدین کے لئے ہیں، ان سے مراد وہ مجاہدین ہیں جو اللہ کے راستہ میں کسی اجرت اور تنخواہ کے بغیر شریک جہاد ہوں، اگر فوجی تنخواہ دار ہوں تو وہ مالِ غنیمت کے مستحق نہیں: 'لا حق في الغنائم للحشوة کالأجراء'' (تفسیر قرطبی: ۷/ ۱۶) اس لئے آج کل جو تنخواہ دار فوج ہوتی ہے، وہ مال غنیمت کی مستحق نہیں ہے۔ (آسان تفسیر: ۱/ ۵۴۵)

معرکہ بدر:

ابوسفیان کو جب یہ اطلاع ملی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ساتھی قافلے پر حملہ کرنے کیلئے آرہے ہیں۔ تو اس نے ایک آدمی مکہ کی طرف دوڑا دیا اور خود راستہ بدل دیا۔ اہل مکہ کو جب اس کی اطلاع ملی تو فوراً ایک ہزار کا لشکر۔ جس میں قریش کے بڑے بڑے سردار شامل تھے۔ پورے ساز وسامان کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوا، اس ۱۰۰۰ کے لشکر میں ۶۰۰ زرہ پوش اور ۱۰۰ اسوار بھی شامل تھے اور یہ لشکر صرف اپنے قافلے کو بچانے کیلئے نہیں نکلا تھا، بلکہ اس نیت سے نکلا تھا کہ اس معاملے کو آج ختم کر ہی دیا جائے۔ دوسری طرف مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ ان کے پاس پورا ساز وسامان بھی نہ تھا کیونکہ وہ جنگ کے ارادے سے نکلے ہی نہیں تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مقام صفراء میں اس کی اطلاع ملی کہ ایک لشکر جرار ابوجہل کی قیادت میں آرہا ہے، تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ دونوں میں سے کسی ایک جماعت کو اختیار کرلو، یا تو

تجارتی قافلے پر حملہ کردو یا پھر اس لشکر سے مقابلہ کرلو، اللہ تعالیٰ تمہیں دونوں میں سے کسی ایک پر غلبہ عطا فرما دیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: جو آپ کا رب حکم کرتا ہے اسی طرف چلئے، ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ نہیں کہیں گے کہ آپ اور آپ کا رب جا کر لڑیں، ہم یہاں ہی بیٹھے ہیں۔

ماہ رمضان المبارک کی ۱۷ تاریخ کو دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے اور گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک عجیب خشوع وخضوع کی کیفیت طاری تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی بارگاہ خداوندی میں سربسجود ہو کر آہ وزاری کرتے اور بھی سائلانہ ہاتھ پھیلا پھیلا کر فتح ونصرت کی دعائیں مانگتے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اس جنگ میں مسلمانوں کو عظیم فتح عطا فرمائی اور فرشتوں کے ذریعے ان کی مدد ونصرت فرمائی۔ اس غزوے میں کفار کے ۷۰ بڑے بڑے سردار مارے گئے ،۷۰ قید ہوئے اور مسلمانوں میں سے کل ۱۴ صحابہ شہید ہوئے جن میں سے ۶ مہاجرین اور ۸ انصاری صحابہ تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اس غزوے کو بڑی اہمیت اور فضیلت عطا فرمائی ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ غزوہ بدر میں شریک ہونے والے صحابہ کے نام پڑھ کر جو دعا کی جائے وہ اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

غزوۂ بدر کی منظر کشی:

مال غنیمت کی تقسیم کا حکم بتانے کے بعد دوبارہ غزوہ بدر کی تفصیل ہے، جس میں قرآن حکیم نے اپنے خاص اسلوب میں اس کی یوں منظر کشی کی ہے کہ گویا سامعین اپنی آنکھوں سے اس غزوہ کا حال دیکھ رہے ہیں۔ فرمایا:

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ط .... الیٰ .... وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾

وہ وقت یاد کرو جب تم لوگ وادی کے قریب والے کنارے پر تھے اور وہ لوگ دور والے کنارے پر، اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف۔ اور اگر تم پہلے سے (لڑائی کا) وقت آپس میں طے کرتے تو وقت طے کرنے میں تمہارے درمیان ضرور اختلاف ہو جاتا، لیکن یہ واقعہ (کہ پہلے سے طے کیے بغیر لشکر ٹکرا گئے) اس لیے ہوا کہ جو کام ہو کر رہنا تھا، اللہ اسے پورا کر دکھائے، تاکہ جسے برباد ہونا ہو، وہ واضح دلیل دیکھ کر برباد ہو، اور جسے زندہ رہنا ہو وہ واضح دلیل دیکھ کر زندہ رہے، اور اللہ ہر بات سننے والا، ہر چیز جاننے والا ہے۔ (۴۲)

"عدوۃ" کنارے کو کہتے ہیں اور "عدوۃ الدنیا" سے مراد قریب والا کنارہ یعنی میدان جنگ کا وہ حصہ جو مدینہ شریف سے قریب ہے اور اسی مقام پر اسلامی لشکر نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ "عدوۃ القصویٰ" کا معنی دور والا کنارہ ہے اور میدان کا یہ حصہ جس پر مشرکین قابض تھے نسبتاً مدینہ سے بھی دور تھا اور مکہ معظّمہ کا تو فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ اس زمانے میں اونٹوں کی سواری کے سفر کے لحاظ سے بدر کا مقام مدینہ سے چار منزل پر اور مکہ سے آٹھ منزل پر ہے، مقام بدر قدرے اونچی جگہ پر ہے، جب کہ اس سے پرلا حصہ جو کہ ساحل سمندر کی طرف واقع ہے نسبتاً نشیبی علاقہ ہے، چونکہ اس میدان میں

مشرکین پہلے پہنچے تھے۔ اس لیے انہوں نے نشیبی علاقہ کو پسند کیا کیونکہ وہاں پانی بھی تھا اور زمین بھی سخت تھی۔ اس کے برخلاف مسلمانوں نے جس حصہ میدان میں پڑاؤ کیا وہ نسبتا بلندی پر اور ریتلا علاقہ تھا، جس میں سواری کے پاؤں دھنس جاتے تھے اور نقل وحمل میں مشکلات پیش آتی تھیں۔ اس صورت حال کی بنا پر مسلمانوں میں قدرے تشویش بھی پائی جاتی تھی، تاہم اللہ نے اس موقع پر اپنا احسان فرمایا کہ جنگ کی رات کو بارش نازل فرمادی جس سے ریتلا علاقہ پختہ ہوگیا۔ مجاہدین کو پانی بھی میسر آگیا اور وہ تازہ دم ہوگئے۔ ادھر مشرکین کے حصہ میں بارش کی وجہ سے دلدل پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے انہیں نقل وحمل میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

غزوہ بدر کے حوالے سے جو باتیں یہاں ذکر کی گئی ہیں ان میں سے خاص خاص باتیں درج ذیل ہیں:

جنگ کا ہونا طے:

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ .... الی......... وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾

اور (اے پیغمبر) وہ وقت یاد کرو جب اللہ خواب میں تمہیں ان (دشمنوں) کی تعداد کم دکھا رہا تھا، اور اگر تمہیں ان کی تعداد زیادہ دکھا دیتا تو (اے مسلمانو) تم ہمت ہار جاتے، اور تمہارے درمیان اس معاملے میں اختلاف پیدا ہو جاتا، لیکن اللہ نے (تمہیں اس سے) بچا لیا۔ یقینا وہ سینوں میں چھپی باتیں خوب جانتا ہے۔ (۴۳) اور وہ وقت یاد کرو کہ جب تم ایک دوسرے کے مدمقابلہ آئے تھے تو اللہ تمہاری نگاہوں میں ان کی تعداد کم دکھا رہا تھا، اور ان کی نگاہوں میں تمہیں کم کرکے دکھا رہا تھا؛ تاکہ جو کام ہو کر رہنا تھا، اللہ اسے پورا کر دکھائے۔ اور تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ (۴۴)

اسلامی فوج کے اصول:

اسلامی فوج کے اصول وآداب کو بیان کیا گیا ہے، یعنی اسلامی فوج جب کافروں سے نبرد آزما ہو تو وہ ان امور کی پابندی کرے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور ظاہری کامیابی حاصل ہو۔

(۱) میدان جنگ میں ثابت قدمی اختیار کرنا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرنا۔

(۳) آپس میں اختلاف اور لڑائی جھگڑے سے بچ کر رہنا؛ ورنہ بزدلی پیدا ہوجائے گی اور دشمن کے دلوں سے تمہارا رعب نکل جائے گا۔

(۴) دشمن سے مقابلہ کے وقت ناموافق امور پر صبر کرنا۔

(۵) اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت۔

(۶) قوت وبہادری میں ریاکاری نہ کرنا۔ (خلاصۃ القرآن: م اش، خلاصہ مضامین قرآن از مولانا منظور یوسف)

خاموشی بہتر ہے:

طبرانی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تین مواقع پر خاموشی کو پسند کرتا ہے، پہلا موقع وہ ہے جب قرآن پاک کی تلاوت ہو رہی ہو تو خاموشی اختیار کرو۔ مسند احمد کی روایت میں بھی آتا ہے"**لا یجھر بعضکم علی بعض** "ایک دوسرے کے سامنے قرآن پاک بلند آواز سے نہ پڑھو۔ تو فرمایا: ایک تو تلاوت کے وقت خاموشی اختیار کرو اور دوسرے **عند الزحف** لڑائی کے وقت بھی خاموش رہو اور تیسرے جنازے کے موقع پر خاموشی سے چلو، شور وشرابا نہ کرو، اگر ذکر بھی کرو تو پست آواز سے ہونا چاہیے، نعرے لگانا پسندیدہ فعل نہیں ہے، شور شرابا کرنا دوسرے لوگوں کا کام ہے، ہمارا یہ دستور نہیں ہے۔

ذکر الٰہی کی کثرت:

اللہ کی یاد جس قدر خلوص کے ساتھ ہوگی، دل اسی قدر مضبوط ہوگا، پھر یہ ہے کہ ظاہری جسم کی مضبوطی دل کی مضبوطی پر موقوف ہے، دل مضبوط ہے تو جسم مضبوط ہے اطمینان قلب کا نسخہ سورۂ رعد میں یہی بیان فرمایا ہے:"**الذین امنو او تطمئن قلوبھم بذکر اللہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب** "اہل ایمان کے دل ذکر الٰہی سے ہی چین اور سکون پکڑتے ہیں، حدیث قدسی میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میرا کامل بندہ وہ ہے جو مجھے اس وقت بھی یاد کرتا ہے جب وہ اپنے دشمن کے ساتھ ٹکر لے رہا ہوتا ہے۔

ذکر الٰہی ایک ایسی عبادت ہے جس کی کوئی تحدید نہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوۃ تو محدود ہے مگر ذکر کے لیے کوئی تحدید نہیں، اس کے متعلق یہی حکم ہے کہ کثرت سے اللہ کو یاد کرو۔ ذکر کی عام صورت لسانی یعنی زبانی ذکر ہے، انسان تلاوت کرتا ہے، تسبیح تحمید یا استغفار کرتا ہے، درود شریف پڑھتا ہے، یہ سب زبانی ذکر ہے، تاہم ذکر بھی اللہ کے مقرر کردہ قواعد کے مطابق ہی ہونا چاہیے، عام قانون یہ ہے"**خیر الذکر الخفی و خیر الرزق مایکفی** "بہترین ذکر وہ ہے جو آہستہ ہو اور بہترین رزق وہ ہے جو کفایت کر جائے، اگر رزق زیادہ ہو مگر غفلت میں ڈالتا ہے تو وہ بہتر نہیں ہے۔ بہر حال یہ دو باتیں ہو گئیں، ایک ثابت قدمی اور دوسری اللہ کا ذکر۔ (معالم العرفان: ۹/ ۱۴۶، ۱۴۷)

خوب غور کیا جائے لشکر اسلام کو یہ حکم نہیں ہوتا کہ اپنے وطن کی یا اپنے قبیلے کی جے پکارو، یا اپنے لیڈروں کے نام کے نعرے لگاؤ، بلکہ اس نازک گھڑی میں جب موت سامنے کھڑی ہو اللہ ہی کو پکارے جاؤ، زمین کے ٹکڑوں کے واسطے، ملک و مال کے واسطے، رنگ و زبان کے واسطے، لڑنے والوں سے ان لوگوں کے طریقے بالکل دوسرے ہوتے ہیں جو محض اللہ کے دین کی خاطر اپنی جانیں دینے کو نکلتے ہیں، ان کو جغرافی، سیاسی بحثوں سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، یہ جان دیں گے تو اپنے ملک و وطن کا جھنڈا اڑاتے نہیں؛ بلکہ اللہ کے نام کی بلندی پکارتے اور اسی کا ذکر جلی اور خفی کرتے ہوئے۔

اللہ اور رسول کی اطاعت:

اللہ اور رسول کے احکام کی اطاعت تو ہمیشہ اور ہر حال میں واجب ہے۔ اس بیان میں اس کی تاکید سے مراد یہ ہے

کہ حالت جہاد میں بھی احکام شریعت کے دائرہ سے قدم ذرا بھی باہر نہ نکلے، یہ نہ ہو کہ جوش میں آ کر یا اور کسی جذبہ سے متاثر ہو کر خود رائی شروع کر دو، یا نفس کی یا اپنی محدود عقل کی پیروی شروع کر دو۔(ماجدی: ۲/ ۴۵۳، ۴۵۴)

خدا اور اس کے رسول کے ارشادات، فرامین اور احکام ہر اہل ایمان کے لیے قابل اتباع ہیں۔سورۂ حشر میں ہے "**ما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا**" یعنی جو بات اللہ کا رسول کہہ دے اس پر عمل کرو اور جس چیز سے منع کرے اس سے رک جاؤ۔سورۂ نور میں ہے "**وان تطیعوہ تھتدوا وما علی الرسول الا البلٰغ المبین**" اگر اللہ کے رسول کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے اور رسول کے ذمے تو احکام الٰہی کو پہنچا دینا ہے یہاں پر اللہ اور رسول کی اطاعت کا ذکر ہے۔

جھگڑے کی ممانعت:

"**ولا تنازعوا**" آپس میں جھگڑا تنازعہ نہ کرو، اتفاق و اتحاد قائم کرو کیونکہ اتحاد کامیابی کا ذریعہ ہے، البتہ اتفاق و اتحاد انہی اصولوں پر ہوگا جو پہلے بیان ہو چکے ہیں، کسی غلط بات پر اتحاد کا کچھ مطلب نہیں، کفار کا ساتھ اتحاد کیسے ہوسکتا ہے؟ وہاں تو معاملہ بالکل صاف "**لا اعبد ما تعبدون**" میں ان کی عبادت نہیں کرسکتا جن کی تم کرتے ہو ان کا تو نقطہ نگاہ ہی الگ ہے، آپس کے تنازعہ کے متعلق قرآن پاک میں یہ اصول بھی موجود ہے "**فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول**" (النساء) ایسے تنازعہ کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو۔ان کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دو۔اور باہمی جھگڑے کو ختم کر دو۔فرمایا اگر جھگڑا کرو گے "**فتفشلوا**" تو بزدل بن جاؤ گے، کمزور ہو جاؤ گے "**وتذھب ریحکم**" اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔اس میں یہ اشارہ ہے کہ تمہاری سلطنت ختم ہو جائے گی یعنی "**تذھب دولتکم**" حکومت چلی جائے گی اور تم اغیار سے مغلوب ہو جاؤ گے۔تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی سلطنتیں محض آپ کے جھگڑے کی وجہ سے ضائع ہوئیں۔(معالم العرفان: ۹/ ۱۴۹)

مشرکین کے لیے اعمال کا مزین ہونا اور مسلمانوں کے لیے فرشتوں کا اترنا:

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ ..... الی............وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۵۱﴾

اور وہ وقت (بھی قابل ذکر ہے) جب شیطان نے ان (کافروں) کو یہ سمجھایا تھا کہ ان کے اعمال بڑے خوشنما ہیں اور یہ کہا تھا کہ: آج انسانوں میں کوئی نہیں ہے جو تم پر غالب آ سکے، اور میں تمہاری کوئی ذمہ داری نہیں لے سکتا، مجھے جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ تمہیں نظر نہیں آ رہا۔ مجھے اللہ سے ڈر لگ رہا ہے اور اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔(۴۸) اور یاد کرو جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا، یہ کہہ رہے تھے کہ: ان (مسلمانوں) کو ان کے دین نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے، حالانکہ جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ سب پر غالب ہے، بڑی حکمت والا ہے۔(۴۹) اور اگر تم دیکھتے (تو وہ

عجیب منظر تھا) جب فرشتے ان کافروں کی روح قبض کررہے تھے، ان کے چہروں اور پشت پر مارتے جاتے تھے (اور کہتے جاتے تھے کہ) اب جلنے کے عذاب کا مزہ (بھی) چکھنا۔(۵۰) یہ سب کچھ ان اعمال کا بدلہ ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں آگے بھیج رکھے تھے، اور یہ بات طے ہے کہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔(۵۱)

قریش اپنی قوت و جمعیت پر مغرور تھے لیکن بنی کنانہ سے ان کی چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ خطرہ یہ ہوا کہ کہیں بنی کنانہ کامیابی کے راستے میں آڑے نہ آجائیں۔ فوراً شیطان ان کی پیٹھ ٹھونکنے اور ہمت بڑھانے کے لیے کنانہ کے سردار اعظم سراقہ بن مالک کی صورت میں اپنی ذریت کی فوج لے کر نمودار ہوا اور ابوجہل وغیرہ کو اطمینان دلایا کہ ہم سب تمہاری امداد وحمایت پر ہیں۔ کنانہ کی طرف سے بےفکر رہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جب بدر میں زور کا رن پڑا اور شیطان کو جبرائیل وغیرہ فرشتے نظر آئے تو ابوجہل کے ہاتھ میں سے ہاتھ چھڑا کر الٹے پاؤں بھاگا۔ ابوجہل نے کہا: سراقہ! عین وقت پر دغا دے کر کہاں جاتے ہو، کہنے لگا: میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ مجھے وہ چیزیں دکھائی دے رہی ہیں، جو تم کو نظر نہیں آتیں (یعنی فرشتے)، خدا کے (یعنی اس خدائی فوج کے) ڈر سے میرا دل بیٹھا جاتا ہے، اب ٹھہرنے کی ہمت نہیں۔ کہیں سخت عذاب آفت میں نہ پکڑا جاؤں۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ملعون نے جھوٹ بولا، اس کے دل میں خدا کا ڈر نہ تھا۔ ہاں وہ جانتا تھا کہ اب قریش کا لشکر ہلاکت میں گھر چکا ہے، کوئی قوت بچا نہیں سکتی۔ یہ اس کی قدیم عادت ہے کہ اپنے متبعین کو دھوکہ دے کر اور ہلاکت میں پھنسا کر عین وقت پر کھسک جایا کرتا ہے۔ (تفسیر عثمانی: ۲۴۲)

مطلب یہ کہ غزوہ بدر میں شیطان مشرکین کے سامنے ان کے اعمال کو مزین کر کے پیش کرتا رہا۔ دوسری جانب مسلمانوں کی مدد کے لیے آسمان سے فرشتے نازل ہوئے جو کافروں کے چہروں اور پٹھوں پر سخت ضربیں لگاتے تھے۔

مفسرین فرماتے ہیں کہ اگرچہ یہ آیات تو غزوہ بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، لیکن مفہوم کے اعتبار سے عام ہیں۔ چنانچہ موت کے وقت ہر کافر کی پٹائی لگتی ہے۔

اللہ اپنی سنت بدل لیتے ہیں:

قریش پر غزوہ بدر میں آفت آئی اور وہ ذلیل وخوار ہوئے تو اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالی کا دستور یہ ہے کہ جب کوئی قوم شکر کی بجائے کفر اور اطاعت کی بجائے معصیت شروع کر دیتی ہے، تو اللہ تعالی بھی اپنا معاملہ بدل دیتا ہے اور اسے نعمت کی جگہ نکبت اور راحت کی جگہ مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

مقابلہ کے لیے مادی، عسکری اور روحانی تیاری:

غزوہ بدر کے پس منظر میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ

◇ وہ دشمنوں سے مقابلہ کے لیے مادی، عسکری اور روحانی تینوں اعتبار سے تیاری مکمل رکھیں۔

◇ ظاہر ہے غزوہ بدر میں مادی تیاری مکمل نہ تھی، یہ تو اللہ کی خاص نصرت کا نتیجہ تھا کہ مادی اور عسکری اعتبار سے

کمزوری اور دونوں لشکروں میں بے پناہ تفاوت کے باوجود اللہ تعالی نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔

◇ لیکن آیندہ کے لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ

وہ حالات اور ضروریات کے مطابق بھرپور تیاری کریں، تا کہ ان کے اسلحہ اور ساز وسامان کو دیکھ کر دشمن پر رعب طاری ہو جائے اور وہ اسلامی لشکر کے سامنے آنے کی جرأت ہی نہ کرے۔

◇ ارشاد باری تعالی ہے:

''جہاں تک ہو سکے تم ان سے مقابلے کے لیے تیاری رکھو، قوت بھی اور گھوڑوں کا پالنا بھی کہ اس کے ذریعے تمہاری دھاک بیٹھی رہے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر اور ان کے سوا دوسرے لوگوں پر جنہیں تم نہیں جانتے اور اللہ انہیں جانتا ہے۔''

روحانی وایمانی قوت:

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مادی قوت وطاقت کی اہمیت کے باوجود روحانی قوت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ دشمن سے دو بدو ہونے کے لیے روحانی اور ایمانی قوت، تمام دوسری قوتوں اور وسائل کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے:

◇ یہی وہ قوت ہے جو کمزور کو طاقتور بناتی ہے۔

◇ جو چھوٹے کو بڑے لشکر کے ساتھ ٹکرانے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

◇ جو شہادت کی راہ پر چلنا آسان کرتی ہے۔

◇ ایمانی قوت رکھنے والوں کو ایسا رعب عطا کیا جاتا ہے جو بڑے بڑے سورماؤں کو لرزہ براندام کر دیتا ہے۔

◇ اپنی اس اجتماعی کمزوری کا کیسے اعتراف کیا جائے کہ آج کے مسلمان فکری، علمی، مادی اور روحانی ہر اعتبار سے ضعف اور کمزوری کا شکار ہیں۔

صلح:

جہاں مسلمانوں کو جنگ کے لیے ہمہ وقت مستعد رہنے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ اگر کسی وقت دشمن صلح کی طرف مائل اور تم سے صلح کی درخواست کرے تو حسب ضرورت ومصلحت ایک مدت معینہ کے لیے صلح کرنا جائز ہے مگر واجب نہیں، اس لیے کہ اصل فریضہ کفار سے جہاد وقتال کرنا ہے البتہ حسب ضرورت ومصلحت کفار سے صلح کی اجازت ہے حکم نہیں۔

شریعت نے کافروں سے اصل حکم جہاد کا دیا ہے اور بوقت ضرورت حسب مصلحت کافروں سے صلح کی اجازت دی ہے کہ اگر تم کافروں سے صلح کر لو تو جائز ہے مگر واجب نہیں۔ (معارف القرآن ادریسی: ۳/ ۳۵۵)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۶۱﴾ .... الیٰ .... يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ حَسۡبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۶۴﴾

اور اگر وہ لوگ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کی طرف جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو، یقین جانو وہی ہے جو ہر بات سنتا، سب کچھ جانتا ہے۔(۶۱) اور اگر وہ تمہیں دھوکا دینے کا ارادہ کریں گے تو اللہ تمہارے لیے کافی ہے۔ وہی تو ہے جس نے اپنی مدد کے ذریعے اور مومنوں کے ذریعے تمہارے ہاتھ مضبوط کیے۔(۶۲) اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت پیدا کردی۔ اگر تم زمین بھر کی ساری دولت بھی خرچ کر لیتے تو ان کے دلوں میں یہ الفت پیدا نہ کر سکتے، لیکن اللہ نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا، وہ یقیناً اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔(۶۳) اے نبی! تمہارے لیے تو بس اللہ اور وہ مومن لوگ کافی ہیں جنھوں نے تمہاری پیروی کی ہے۔(۶۴)

مصلحت:

اس آیت سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اگر صلح میں مسلمانوں کی مصلحت ہو تو صلح کر لینی چاہیے، جنگ کی تیاری اور جذبہ جہاد کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بہر صورت جنگ ہی کرنا ضروری ہے اور مصالحت سے دور رہنا ہی اللہ کا حکم ہے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر صلح کا راستہ اختیار فرمایا ہے۔(خلاصۃ القرآن: م اش)

مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ قوانین صلح کے سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مبارک اور بعد کے زمانہ میں فرق ہے، نبی کو تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے خصوصاً تائید حاصل ہوتی ہے، اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عصمت کی گارنٹی ملتی ہے، مگر آپ کے بعد عامۃ المسلمین کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ گرد و پیش کا بغور جائزہ لینے کے بعد صلح کا معاہدہ کریں۔(معالم العرفان: ۹/ ۱۸۸)

ایک حدیث میں ہے کہ ''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے لوگ محفوظ رہیں''۔ دین اسلام میں ملاقات کے وقت ''السلام علیکم'' کہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس کا مطلب ہے: ''آپ محفوظ رہیں''۔ سلام کرنے والا یہ کہتا ہے تم مجھ سے محفوظ ہو، اور دوسرا فریق اپنے جواب کے ساتھ وہی جذبہ دکھا رہا ہے، جو معاشرے میں امن کو فروغ دیتا ہے۔

ایک حدیث کے مطابق ''امن اسلام کا حصہ ہے''۔ فرمانبردار بندوں سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے، قرآن میں اس کا ایک نام ''دارالسلام'' ہے، (وہ حفاظت کا گھر ہے۔) جنت میں جس لفظ سے اہل جنت کا استقبال کیا جائے گا وہ لفظ ''سلام علیکم'' ہوگا، جس کا مطلب ہے آپ پر سلامتی ہو۔

قرآن شریف اور حدیث شریف میں اللہ کے بہت سے نام مذکور ہیں۔ اس کا ایک نام ہے، ''السلام'' جس کا مطلب ہے حقیقی سلامتی۔

نماز مکمل کرنے کے بعد دعا مانگی جاتی ہے، جس کا مطلب ہے: اے اللہ! تم ہی اصل سلامتی ہو، اور سلامتی (صرف)

تم سے ہے، آپ مبارک ہیں، اے ہمارے معزز نگہبان!

قرآن کے مطابق، سال کی سب سے قیمتی راتوں میں سے ایک لیلۃ القدر ہے۔قرآن شریف میں ارشاد ہے کہ ''ساری رات حفاظتی بارش ہورہی ہے۔قرآن میں اسلام کوسلامتی کا راستہ کہا گیا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے خطوط میں لکھا ہے کہ اگر تم اسلام قبول کرلوتو تمہیں سلامتی ملے گی۔

مندرجہ بالا تجربات کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام دراصل ایک ایسا مذہب ہے جو سلامتی کوفروغ دیتا ہے۔ایک صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ شریف کی حالت زار کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا جب ایک بوڑھیا ہوگی جو یمن سے مدینہ شریف تک سونا اٹھائے گی، اس کو خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام امن چاہتا ہے۔ برائیاں و بدامنی ختم کرنا چاہتا ہے، اسلام بدامنی کو برداشت نہیں کرتا، وہ دکھاوا نہیں کرتا، وہ امن کے لیے مخلصانہ کوششیں کرتا ہے۔

قرآن شریف کہتا ہے کہ ''ایک بے گناہ کو قتل کرنا پوری انسانیت کا قتل ہے اور ایک بے گناہ کی جان بچانا پوری انسانیت کو جان دینے کے مترادف ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں فساد نہ پھیلاؤ، یہ بھی فرمایا کہ اللہ فتنہ پھیلانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ایک اور آیت میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ حالت جنگ کو پسند نہیں کرتا، اس لیے لوگ جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اس کو بجھا دیتا ہے۔ (مائدہ:۸۵)

اس آیت سے یہ سبق ملتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ جنگ کو ناپسند کرتا ہے تو اس کے پیروکاروں کو بھی ناحق جنگ کو ناپسند کرنا چاہیے اور صلح کی کوشش کرنی چاہیے، اگر امن نہیں ہے تو اسے قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔امن کسی بھی حالت میں جنگ سے بہتر ہے، امن کے زمانے میں اسلام کی تبلیغ ممکن ہوجاتی ہے، قرآن میں ہے کہ جھگڑا چھوڑ دو اور دعوت دو۔ الفاظ یہ ہیں کہ'' وہ لوگ آپ سے فرقہ واریت کے معاملے پر جھگڑا نہ کریں (اس کا خیال رکھیں) اور تم اپنے پروردگار کی طرف دعوت دیتے رہو۔تم یقیناً سیدھے راستے پر ہو۔(حج:۶۷)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام عالمی امن وامان کے لیے کتنا حساس ہے، کاش کہ لوگ ہوش کے ناخن لیں۔

قیدیوں سے فدیہ:

جنگ بدر میں ستر (۷۰) مشرکین گرفتار ہوئے تھے، ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عادت کے موافق ان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے کئی صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی رائے تھی کہ انہیں قتل کر دیا جائے؛ جبکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے مشورہ دیا کہ انہیں فدیہ لے کر آزاد کر دیا جائے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا اور ان

قیدیوں کو رہا کر دیا، اس پر اللہ کی طرف سے عتاب نازل ہوا، فرمایا گیا:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ ....الیٰ..........لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۞۶۸

یہ بات کسی نبی کے شایانِ شان نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی رہیں جب تک کہ وہ زمین میں (دشمنوں کا) خون اچھی طرح نہ بہا چکا ہو (جس سے ان کا رعب پوری طرح ٹوٹ جائے) تم دنیا کا ساز و سامان چاہتے ہو اور اللہ (تمہارے لیے) آخرت (کی بھلائی) چاہتا ہے اور اللہ صاحب اقتدار بھی ہے، صاحب حکمت بھی۔(۶۷) اگر اللہ کی طرف سے ایک لکھا ہوا حکم پہلے نہ آچکا ہوتا تو جو راستہ تم نے اختیار کیا، اس کی وجہ سے تم پر کوئی بڑی سزا آجاتی۔(۶۸)

غزوۂ بدر مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان پہلی باضابطہ جنگ تھی، جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسی فتح عطا فرمائی، جو ظاہری حالات کے بالکل برعکس تھی، اس جنگ میں بڑے بڑے سرداران قریش مارے گئے، مارے جانے والوں کی تعداد ستر تھی، اسی طرح ستر افراد قید کئے گئے، ان میں بھی کئی معزز رؤساء تھے، باقی حضرات بھاگ نکلے، بہ ظاہر جنگی حکمتِ عملی کا تقاضہ یہ تھا کہ ابھی جنگ جاری رکھی جاتی اور اچھی طرح ان کی طاقت توڑ دی جاتی؛ تاکہ آئندہ انہیں مسلمانوں کی طرف نظر اٹھانے کی ہمت نہ ہو؛ لیکن دشمنوں کی شکست دیکھ کر صحابہؓ نے سمجھا کہ اب جنگ اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے؛ اس لئے دشمنوں کے مال اپنے قبضہ میں لینے لگے؛ کیوں کہ یہ مال بھی مسلمانوں کی معیشت کو بہتر بنانے اور آگے کی جنگی کاروائیوں کی تیاری کے لئے بہت اہم تھا، جب یہ ستر (۷۰) قیدی لائے گئے تو آپ ﷺ نے اپنے رفقاء سے مشورہ کیا، ان قیدیوں میں رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ، حضرت علیؓ کے بھائی عقیلؓ اور مختلف مہاجرین کے قریبی اعزہ موجود تھے؛ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے مشورہ دیا کہ یہ آپ ہی کی قوم اور خاندان کے لوگ ہیں، بہتر ہوگا کہ انہیں چھوڑ دیا جائے، ممکن ہے اللہ تعالیٰ انہیں کفر سے توبہ کی توفیق عطا فرمائیں؛ البتہ ان سے فدیہ لے لیا جائے؛ تاکہ مسلمانوں کو اس سے مدد ملے، حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ ان سب کو تہہ تیغ کر دیا جائے اور ہر مسلمان اپنے قریبی رشتہ دار کو قتل کر دے، رسول اللہ ﷺ سراپا رحمت تھے اور نرم خوئی وعفو و درگذر آپ ﷺ کا خاص مزاج تھا؛ اس لئے آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کو ترجیح دی اور ان قیدیوں سے فدیہ وصول کیا گیا، نیز جو لوگ لکھائی پڑھائی سے واقف تھے ان کو کہا گیا کہ وہ دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، (طبقات ابن سعد، ذکر غزوۂ بدر: ۲/ ۲۲) ان دونوں باتوں پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ہوا کہ موجودہ حالات کا تقاضہ یہ تھا کہ دشمن کی طاقت اچھی طرح توڑ دی جائے، مالِ غنیمت اکٹھا کرنے کی بجائے ان کو جانی نقصان پہنچانے پر توجہ دی جائے اور قیدیوں سے فدیہ لینے کی بجائے انہیں جانی نقصان پہنچایا جائے؛ تاکہ پھر کبھی وہ سر نہ اُٹھا سکیں، مگر تم لوگوں نے اس مصلحت کو پیش نظر نہیں رکھا۔

محمد بن اسحاق کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ اور سنت یہ ہے کہ جب تک کسی گروہ کو اپنے احکام سے مطلع نہیں

کر دیتے، اس حکم کی خلاف ورزی پر عذاب نہیں دیتے اور پہلے سے ان جنگی مصالح کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم نہیں آیا تھا؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے کوئی عذاب نازل نہیں فرمایا، (مفاتیح الغیب: ۷/ ۵۴۵) اور تنبیہ کرنے پر اکتفا فرمایا۔

(آسان تفسیر: ۱/ ۵۵۴)

دوسرے مفسرین نے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ ان قیدیوں میں سے بعض حضرات کا مسلمان ہوجانا اللہ تعالی نے مقدر میں لکھا تھا وہ نوشتۂ تقدیر مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس وجہ سے اللہ تعالی نے اس فیصلے پر مسلمانوں کو کوئی سزا نہیں دی کہ ان قیدیوں میں سے کچھ لوگ مسلمان ہونے والے تھے ورنہ فیصلہ اصولی طور پر ناپسندیدہ تھا۔ (توضیح القرآن)

قرآن کی حقانیت اور صداقت کی دلیل:

اس قسم کی آیات جن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب فرمایا گیا ہے، قرآن کی صداقت وحقانیت کی دلیل ہیں، اگر بالفرض قرآن اللہ کا کلام نہ ہوتا تو ایسی آیات کو قرآن میں ہرگز جگہ نہ ملتی ۔ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ عتاب کے باوجود اللہ تعالی نے مسلمانوں کو اس فدیہ کے کھانے کی نہ صرف اجازت دی؛ بلکہ اسے حلال اور پاکیزہ قرار دیا جو مشرک قیدیوں سے لیا گیا تھا۔

ایک دوسرے کا رفیق:

سورت کے اختتام پر ان لوگوں کو ایک دوسرے کا رفیق قرار دیا گیا ہے:

◇ جو اللہ کی رضا کے لیے ہجرت اور جہاد کرتے ہیں۔

◇ ایک دوسرے کو ٹھکانے فراہم کرتے ہیں۔

◇ اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

اس سورت کی ابتداء جہاد اور غنیمت کے ذکر سے ہوئی تھی اور اختتام نصرت اور ہجرت کے ذکر پر ہو رہا ہے، گویا کہ یہ سورت ابتدا سے اختتام تک جہاد ہی کے بیان پر مشتمل ہے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

خلاصہ رکوع: ۶...... دفعہ ہشتم ونہم۔ (۸) (۱) میدان جنگ میں ذکر الہی کا تحفظ رہے۔ (۹) (۲) تلقین ترک منازعہ۔ ماخذ: آیت: ۴۶، ۴۵۔

خلاصہ رکوع: ۷...... (۱) منافقین کو اس دین کی صداقت پر اعتماد نہیں۔ (۲) اور کفار کا تعلق باللہ درست نہیں، اس لئے تم ہی جیتو گے، وہ تم سے جیت نہیں سکے۔ ماخذ: آیت: ۴۹، ۵۱۔

خلاصہ رکوع: ۸...... دفعہ دہم ویازدہم (۱) آلات جنگ کی تیاری، اسلام مصالحت کے لئے ہر وقت تیار ہے۔ ماخذ: آیت: ۶۰، ۶۱۔

خلاصہ رکوع: ۹...... دفعہ دوازدہم حکم تحریص علی القتال۔ ماخذ: آیت: ۶۵۔

خلاصہ رکوع: ۱۰...... دفعہ سیزدہم مقاصد سیاسیہ میں مسلمانوں میں سے فقط ان قوموں اور جماعتوں کا خیال رکھا

جائے گا، مگر جو مرکز سے وابستہ ہیں۔ ماخذ: آیت: ۲۷۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ التوبۃ

تعارف: یہ بھی مدنی سورت ہے، اور حضور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات طیبہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ہے۔ اپنے مضامین کے اعتبار سے یہ پچھلی سورت یعنی سورہ انفال کا تکملہ ہے۔ غالباً اسی لیے عام سورتوں کے برخلاف اس سورت کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم نہ نازل ہوئی، نہ لکھی گئی۔ اور اس کی تلاوت کا بھی قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص پیچھے سورہ انفال سے تلاوت کرتا چلا آ رہا ہو، اسے یہاں بسم اللہ نہیں پڑھنی چاہیے، البتہ اگر کوئی شخص اسی سورت سے تلاوت شروع کر رہا ہو تو اس کو بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔ اور بعض لوگوں نے اس سورت کے شروع میں بسم اللہ کے بجائے کچھ اور جملے پڑھنے کے لیے بنا رکھے ہیں، وہ بے بنیاد ہیں۔ اوپر جو طریقہ لکھا گیا ہے، وہی سلف صالحین کا طریقہ رہا ہے۔

یہ سورت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی تھی۔ عرب کے بہت سے قبائل اس انتظار میں تھے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ کفار قریش کی جنگ کا انجام کیا ہوتا ہے۔ جب قریش نے حدیبیہ والا معاہدہ توڑ دیا تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مکہ مکرمہ پر حملہ کیا، اور کسی خاص خونریزی کے بغیر اسے فتح کر لیا۔ اس موقع پر کفار کی کمر ٹوٹ چکی تھی، البتہ آخری تدبیر کے طور پر قبیلہ ہوازن نے ایک بڑا لشکر مسلمانوں سے مقابلے کے لیے جمع کیا جس سے حنین کی وادی میں آخری بڑی جنگ ہوئی، اور شروع میں معمولی ہزیمت کے بعد مسلمانوں کو اس میں بھی فتح ہوئی۔ اس جنگ کے بعض واقعات بھی اس سورت میں بیان ہوئے ہیں۔ اب عرب کے جو قبائل قریش کی وجہ سے اسلام قبول کرنے سے ڈرتے تھے، یا ان کی جنگوں کے آخری انجام کے منتظر تھے، ان کے دل سے اسلام کے خلاف ہر رکاوٹ دور ہوگئی اور وہ جوق در جوق مدینہ منورہ آکر مسلمان ہوئے، اور اسی طرح جزیرہ عرب کے بیشتر علاقے پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزیرہ عرب کو اسلام اور مسلمانوں کا بنیادی مرکز قرار دے دیا گیا۔ اصل منشا تو یہی تھی کہ پورے جزیرہ عرب میں کوئی بھی غیر مسلم مستقل باشندے کی حیثیت میں باقی نہ رہے، جیسا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ جزیرہ عرب میں دو دین باقی نہ رہنے پائیں۔ (موطا امام مالک، کتاب الجامع ومسند احمد ۶: ۲۷۵) لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تدریج کا طریقہ اختیار فرمایا گیا۔ سب سے پہلا ہدف یہ مقرر فرمایا گیا کہ جزیرہ عرب کو بت پرستوں سے خالی کرایا جائے۔ چنانچہ جو بچے کھچے بت پرست عرب میں رہ گئے تھے، اور جنھوں نے بیس سال سے زیادہ مدت تک مسلمانوں کو وحشیانہ مظالم کا نشانہ بنایا تھا، ان کو اس سورت کے شروع میں مختلف مدتوں کی مہلت دی گئی، جس میں اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو انہیں جزیرہ عرب چھوڑنے، ورنہ جنگ کا سامنا کرنے کے احکام دیئے گئے ہیں، اور مسجد حرام کو بت پرستی کی ہر نشانی سے پاک کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس ہدف کے پورا ہونے کے

بعد جزیرہ عرب کی مکمل صفائی کا دوسرا مرحلہ یہود و نصاری کو وہاں سے نکالنے کا تھا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات طیبہ میں یہ مرحلہ مکمل نہیں ہوسکا تھا، لیکن آپ نے اس کی وصیت فرمادی تھی، جیسا کہ آیت نمبر ۲۹ کے تحت اس کی وضاحت آنے والی ہے۔

اس سے پہلے روم کے بادشاہ نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر ان پر حملہ کرنے کے لیے ایک بڑی فوج جمع کی۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پیش قدمی کر کے اس کے مقابلے کے لیے تبوک تک تشریف لے گئے۔ اس سورت کا بہت بڑا حصہ اس مہم کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ منافقین کی معاندانہ کاروائیاں مسلسل جاری تھی، اس سورت میں ان کی بدعنوانیوں کو بھی طشت از بام کیا گیا ہے۔

اس سورت کو سورہ توبہ بھی کہا جاتا ہے، اور سورہ براءت بھی۔ براءت اس لیے کہ اس کے شروع میں مشرکین سے براءت اور دستبرداری کا اعلان کیا گیا ہے، اور توبہ اس لیے کہ اس میں بعض ان صحابہ کرام کی توبہ قبول ہونے کا ذکر ہے جنہوں نے تبوک کی مہم میں حصہ نہیں لیا تھا، اور بعد میں اپنی اس غلطی پر توبہ کی تھی۔ (توضیح القرآن:۵۵۶)

یہ قرآن کریم کی نویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۱۱۳ نمبر پر ہے، کل رکوع ۱۶، آیات ۱۲۹، کل کلمات ۲۵۳۷، اور حروف کل ۱۱۳۶۰ ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

ربط:

اس سورۃ میں چند غزوات اور چند واقعات کا ذکر ہے، کیوں کہ حکماً وہ بھی غزوات میں مذکور ہیں۔

اعلان نقض عہد بقبائل عرب، فتح مکہ، غزوۂ حنین، اخراج کفار از حرم، غزوہ تبوک اور انہیں آیتوں کے ضمن میں تبعاً واقعہ ہجرت اور سورۃ سابقہ میں اکثر بدر کے اور کچھ قریظہ کے واقعات تھے، پس دونوں سورتوں میں رابط ظاہر ہے۔

سورۃ کے شروع میں بسم اللہ نہ ہونے کی وجہ:

اس میں پانچ قول ہیں:

(۱) اس سورۃ کے شروع میں بسم اللہ نازل نہیں ہوئی، جیسا کہ مفسر علام صاحب جلالین نے ذکر فرمایا ہے۔

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اس کا کیا باعث ہے کہ آپ حضرات نے انفال کو- جو کہ مثانی سے ہے- اور برأت کو- جو کہ مئین سے ہے- ترتیب قرآنی میں پاس پاس رکھا ہے اور دونوں کے بیچ میں بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں لکھی اور انفال کو سبع طوال میں رکھ دیا، اس کا کیا باعث ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک زمانہ میں کئی کئی سورتوں کا نزول ہوتا رہتا تھا، جب کوئی آیت نازل ہوتی، آپ کسی کاتب کو بلا کر فرماتے کہ اس آیت کو فلاں سورۃ میں رکھ دو، انفال ان سورتوں میں سے تھی جو مدینہ میں اول اول نازل ہوئیں اور برأت آخر قرآن سے تھی اور دونوں کا مضمون ملتا جلتا تھا، میں سمجھا کہ یہ اسی کا جز ہے اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی اور آپ نے اس کی تصریح نہ فرمائی، اس لئے میں نے دونوں کو پاس پاس رکھ دیا اور بیچ میں بسم اللہ نہیں لکھی اور انفال کو سبع طوال میں رکھ دیا۔

فائدہ:

قرآن کی ترتیب میں اس امر کی اکثر رعایت رکھی گئی ہے کہ بڑی بڑی سورتیں شروع میں ہیں اور ان سے چھوٹی ان کے بعد اور سب سے چھوٹی آخر میں اور مئین وہ سورتیں کہلاتی ہیں جن میں سو آیتوں سے زیادہ ہوں، سورۂ بقرہ سے سورۃ برأت کے بعد تک سوائے سورۂ انفال کے سب سورتوں میں سو آیتوں سے زائد ہیں اور سورۂ یوسف کے بعد کی اکثر سورتوں میں سو سے کم آیتیں ہیں، یہ سورتیں مثانی کہلاتی ہیں اور شروع کی سات سورتیں سورۂ بقرہ سے سورۂ انفال تک سبع طوال کہلاتی ہیں۔

(۳) چونکہ اس سورۃ میں کفار کے نقض عہد اور منافقین کی رسوائی کا بیان ہے، اس لئے گویا یہ سورۂ عذاب ہے جس کے ساتھ بسم اللہ کا جوڑ نہیں، چونکہ اس میں رحمت کا بیان ہے جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ بسم اللہ امان ہے اور یہ سورۃ رفع امان کے لئے آئی ہے، مگر اس کو علت نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ بطور نکتہ کے ایک حکمت ہے اور رحمت وعذاب میں مناسبت نہیں ہے، اس لئے اس سورۃ کو سورہ الناصحہ اور سورۃ العذاب اور سورۃ التوبہ وغیرہ ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔

(۴) اس امر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف تھا کہ سورۂ انفال اور سورۂ توبہ دونوں ایک ہیں یا الگ الگ دو سورتیں، ایک سورۃ ہونے کے خیال سے بسم اللہ نہیں لکھی گئی اور دو سورتوں کے خیال سے خالی جگہ چھوڑ دی گئی۔

(۵) اس وقت کے جنگی اصول اور رواج کے مطابق ایسا کیا گیا کہ اس سورۃ کے شروع میں بسم اللہ نہیں لکھی گئی کیونکہ نقض عہد کے وقت مراسلت کی صورت میں بسم اللہ نہیں لکھی جاتی تھی، یہاں بھی مشرکین کے عہد کو توڑنے کی وجہ سے ایسا کیا گیا۔

(۶) مشہور قول یہ ہے کہ اس سورۃ کا اول حصہ منسوخ التلاوت ہو گیا اس کے ساتھ بسم اللہ لکھی ہوئی تھی، جو ساقط ہو گئی، مگر اس قول کو صاحب تیسیر وغیرہ حضرات نے پسند نہیں فرمایا ہے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اور جو حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ بسم اللہ امان ہے اور یہ سورۃ رفع امان کے لئے آئی ہے، سو یہ علت نہیں، بہ طور نکتہ کے ایک حکمت ہے''۔ (تھانوی)

اس سورت کا نزول عہد نبوی کے بہت اہم وقت میں ہوا، یہ وہ وقت تھا جب عرب کا نظم ونسق کلیۃ مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گیا تھا، دشمن اور مزاحم طاقتیں نڈھال ہو چکی تھیں، اس لئے ضروری تھا کہ اب ایک ایسی واضح پالیسی سامنے آجائے جو عرب کو مکمل دارالاسلام بنانے میں بھرپور کردار ادا کر سکے، چنانچہ اس واضح پالیسی کا اعلان اس سورت میں کیا گیا جس کے بنیادی نکات یہ ہیں۔

الف- جزیرۃ العرب سے کفر وشرک کا کلی طور پر خاتمہ کر دیا جائے، تاکہ مرکز اسلام ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک ہو

جائے اور کسی موقع پر اندر سے کوئی فتنہ سر نہ اٹھا سکے۔
ب- کعبۃ اللہ کی نگرانی اور تولیت اہل توحید کے قبضہ میں رہے، کعبۃ اللہ کی حدود میں شرک و بدعت اور جاہلیت کی تمام رسوم بزور بند کر دی جائیں۔
ج-عرب کی تمدنی زندگی میں جاہلیت کے جو آثار باقی تھے ان کی بیخ کنی کی تاکید کی گئی، خاص طور پر نسیٰ کے قاعدے پر براہ راست ضرب لگائی گئی کیونکہ یہ سب سے زیادہ بدنما تھا۔(قرآن ایک نظر میں:۸۷)

سچے مومنوں کی صفت:

اللہ کا خوف، قرآن کی تلاوت سے ایمان میں اضافہ، رحمن پر توکل، نماز کی حفاظت اور اللہ کے بندوں کے ساتھ حسن سلوک۔

قوموں کے عروج وزوال کا قاعدہ ذکر کیا کہ اللہ پاک کسی بھی قوم کو اس وقت تک ختم نہیں کرتا جب تک وہ اپنی عملی زندگی میں استقامت پذیر ہوں۔

غزوۂ بدر میں ۷۰ کافر قتل ہوئے، ۷۰ قیدی ہوئے، ان کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسب عادت صحابہ سے مشورہ کیا۔مشورے میں دو قسم کی باتیں آئیں: (۱) قتل کر دیئے جائیں (۲) فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، دوسری بات پر عمل کیا گیا، اس پر اللہ پاک نے تنبیہ فرمائی، قرآن میں ایسی آیات کا ہونا قرآن کی حقانیت کی دلیل ہے۔

آیت نمبر ۷۲ سے ۷۵ تک میں مسلمانوں کے مختلف طبقات کا بیان ہیں۔

لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں، جو اللہ عزوجل کی خاطر ہجرت کرتے ہیں اور جہاد کرتے ہیں، ایک دوسرے کو اچھی جگہ دیتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

سب غیر مسلم ایک ہی راستے پر ہیں۔ جو غیر مسلم جنگ کے موڈ میں ہیں ان سے دوستی کرنا فتنے کا سبب ہے۔

غزوہ تبوک شدید گرمی کے موسم میں ہوا، ایک طویل سفر، پھلوں کے پکنے کا زمانہ، جو عربوں کی ضروریات زندگی کے لیے اہم سبب اور ایک ایسی حکومت کا سامنا کرنا جو اس وقت ایک سپر پاور تھی، مختصر یہ کہ یہ مومنین کے لیے ایمان اور اخلاص کا امتحان تھا، جس سے مومنوں اور منافقوں میں بھی فرق ہو گیا۔

اللہ پاک نے کفار کی نافرمانی پر آسمان سے عذاب نازل کرنے کے بجائے میدان جہاد میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل کرنا چاہا تا کہ انہیں سزا بھی دی جائے اور وہ ذلیل ہوں اور مسلمانوں کے دلوں کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے، اور بعض کا فر اس عبرت ناک واقعہ سے سبق لے کر اسلام کا تاج پہن لیں۔

منافقین کے حقیر اعمال کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ اگر آپ ان کے لیے ۷۰ مرتبہ بھی استغفار کریں گے تو میں انہیں معاف نہیں کروں گا، اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو نماز جنازہ بھی نہ

پڑھے۔

مخلص مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ بڑھاپے، بیماری اور مناسب نظام کی کمی کی وجہ سے جہاد میں حصہ نہ لے سکے ان پر کوئی گناہ نہیں۔

توبہ کے لیے تین شرائط:

(۱) گناہ پر ندامت، (۲) گناہ کو بالکلیہ چھوڑ دینا، (۳) آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم مصمم۔

سورۂ انفال غزوۂ بدر کے وقت، تو سورۂ توبہ غزوۂ تبوک کے وقت نازل ہوئی، بدر میں ۳۱۳ تو تبوک میں ۳۰ ہزار کا لشکر تھا، تبوک میں نفاق کھل گیا، کفار اور منافقین کی ۵۵ صفت بد کا ذکر ہے، اس سورت میں کفار اور منافقین کا ذکر ہونے کے باوجود اس کو توبہ کہا گیا، کیونکہ یہ آخری سورت ہے، اس لیے شان رحیمی سے ابھی بھی توبہ کا در کھلا رکھا، یہاں تک کہ اس میں ۱۷ مرتبہ توبہ کی وضاحت کی، جب کہ سورۂ بقرہ میں ۱۳، سورۂ آل عمران میں ۳، سورۂ نساء میں ۱۲، سورۂ مائدہ میں ۵، سورۂ ہود میں ٦، اور سورۂ انعام میں ایک مرتبہ ذکر کیا۔ اور سورۂ توبہ میں ہر مذہب کے ماننے والے کو یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی حکم ہوا۔ منافقوں کو توبہ کی دعوت دی اس وضاحت کے ساتھ کہ تمہاری پوری پول کھل گئی، نجات کے لیے صرف توبہ کا دروازہ ہے، سورت کے آغاز کی سختی بھی توبہ کے لیے ہی ہے، شروع کی آیت میں توبہ کی تلقین موجود ہے۔ توبہ کر کے اللہ کا فرمابردار ہو جائے تو وہ تمہارا دینی بھائی ہے کہہ کر ان کو اپنا بھائی کہا، تو پھر گنہگار مسلمان کے لیے کتنا رحیم ہوگا؟ جہاد سے محض لڑائی مقصود نہیں، بلکہ دین کی مدد و نصرت ہے، جہاد میں سستی کرنے والوں کے نام ایک نامہ بھیجا کہ اللہ اپنے دین کے لیے کسی کا محتاج نہیں، جہاد کفار کو توبہ کی طرف کھینچنے کے لیے ہے، غزوۂ حنین میں توکل کی کمی، ۸ ہجری میں غزوۂ حنین ہوا، تقریباً اس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ ۱۲ سے ۱٦ ہزار تک کا لشکر تھا، دیکھا جائے تو دوسری جنگوں کے مقابلہ میں لشکر کی زیادتی تھی، جس سے یہ خیال آیا کہ اس سے کم لشکر ہوتے ہوئے بھی جنگ جیتی ہے تو اس مرتبہ تو بہت زیادہ لشکر ہے، اس لیے جیت پکی ہے، لیکن اللہ پاک کو یہ ادا پسند نہ آئی، کہ میرے بندوں نے مجھ پر سے بھروسہ کم کر دیا، اس کے لیے توبہ کا ذکر۔

منافقوں سے ناراضگی کو لے کر جہاد سے محروم کیا تو مسلموں کو سوچنا چاہیے کہ کوئی نیکی سے محرومی کوئی گناہ کی وجہ سے تو نہیں ہوئی؟ (خواطر قرآنیہ)

اس سے پہلی سورۂ انفال اور اس سورۃ کا موضوع اسلام کا قانون صلح و جنگ ہے، ان سورتوں میں بارہ تیرہ اہم اصول اور ان کے تابع احکام بیان کیے گئے ہیں جن پر مسلمانوں کو عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ اس سورۃ کی ابتدائی آیات میں کفار و مشرکین کے خلاف اعلان جنگ ہے اور آگے اس کی مزید تشریح ہے، اس میں اسلام کے سیاسی نظام کا بھی ذکر ہے اور خاص طور پر مرکز اسلام کے بیرونی ممالک سے تعلقات کی نوعیت کا بیان ہے، دوسرے لفظوں میں سورۂ ہذا اسلام کی فارن

پالیسی کے خدوخال کو بھی واضح کرتی ہے، اس میں جزیہ کا مسئلہ بھی بیان ہوا ہے۔

جہاد کے سلسلے میں اس سورۃ میں غزوہ حنین اور غزوہ احد کا ذکر ہے اور غزوہ تبوک سے متعلق قدرے تفصیلات موجود ہیں، اس دوران منافقین نے اپنے منافقت کا اظہار مختلف طریقوں سے کر کے جہاد سے گریز کیا اور مسلمانوں کے مقابلے میں مسجد ضرار تعمیر کی، جس کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے، چنانچہ اس سورۃ میں منافقین کو دی گئی رعایات کو ختم کیا گیا ہے اور ان کی رسوائی کا تذکرہ ہے۔ (معالم العرفان: ۹/ ۲۳۲، ۲۳۳)

وجہ تسمیہ:

اس سورت کا دوسرا نام سورۂ برأۃ ہے اور برأت کا معنی بیزاری کے ہیں، چونکہ اس سورت میں عہد و پیمان سے بیزاری اور توڑنے کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے اس سورت کو سورۂ برأۃ اور سورۂ توبہ کہا جاتا ہے۔

شانِ نزول:

جس وقت سورۃ برأت نازل ہوئی ہے اس وقت کفار کی چار قسمیں تھیں۔ پہلی قسم کے تو وہ لوگ تھے جن سے مقام حدیبیہ میں ۶ ھ میں معاہدہ ہوا تھا، جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ اس موقعہ پر مشرکین نے آپ کو مکہ معظمہ میں داخل نہ ہونے دیا اور بڑی ردوکد کے بعد دس سال کے لیے صلح کرنے پر آمادہ ہو گئے، اس صلح میں یہ تھا کہ ایک فریق دوسرے فریق پر حملہ نہیں کرے گا اور نہ کوئی فریق کسی فریق کے حلیف پر حملہ آور ہوگا، پھر یہ واقعہ پیش آیا کہ قبیلہ بنی بکر نے (جو قریش کا حلیف تھا) رات کے وقت قبیلہ بنی خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش مکہ نے بنی بکر کو ہتھیار دیئے اور اپنے جوان ان کی امداد کے لیے بھیجے، اس طرح سے قریش نے عہد شکنی کی کیونکہ بنی خزاعہ پر حملہ کرنے والوں کے مددگار بن گئے جو مسلمانوں کے حلیف تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قریش کی عہد شکنی کی خبر ملی تو آپ نے جنگ کی تیاری کی اور ۸ ھ میں اپنے صحابہ کو لے کر مکہ معظمہ پہنچے اور مکہ معظمہ فتح ہو گیا۔ (انوار البیان)

یہ سورت ۹ ہجری میں اس وقت نازل ہوئی جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رومیوں کی سرکوبی کے لیے نکلے تھے۔

مشرکوں کی وعدہ خلافی کے باوجود صلح کی تاکید اور اسلام کی دعوت:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱ .... الیٰ .... وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۱۱

(مسلمانو) یہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے دستبرداری کا اعلان ہے ان تمام مشرکین کے خلاف جن سے تم نے معاہدہ کیا ہوا ہے۔ (۱) لہذا (اے مشرکو) تمہیں چار مہینے تک اجازت ہے کہ تم (عرب کی) سرزمین میں آزادی سے گھومو پھرو، اور یہ بات جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے، اور یہ بات بھی کہ اللہ اب کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔ (۲) اور حج اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمام انسانوں کے لیے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ بھی مشرکین سے دست

بردار ہو چکا ہے، اور اس کا رسول بھی ۔ اب (اے مشرکو) اگر تم توبہ کرلو تو یہ تمہارے حق میں بہت بہتر ہوگا، اور اگر تم نے (اب بھی) منہ موڑے رکھا تو یاد رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے، اور تمام کافروں کو ایک دکھ دینے والے عذاب کی خوشخبری سنا دو۔(۳) البتہ (مسلمانو) جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا، پھر ان لوگوں نے تمہارے ساتھ عہد میں کوئی کوتاہی نہیں کی، اور تمہارے خلاف کسی کی مدد بھی نہیں کی، تو ان کے ساتھ کئے ہوئے معاہدے کی مدت کو پورا کرو۔ بیشک اللہ احتیاط کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۔ (۴) چنانچہ جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو ان مشرکین کو (جنھوں نے تمہارے ساتھ بدعہدی کی تھی) جہاں بھی پاؤ قتل کر ڈالو، اور انہیں پکڑو، انہیں گھیرو، اور انہیں پکڑنے کے لیے ہر گھات کی جگہ تاک لگا کر بیٹھو۔ ہاں اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے ۔(۵) اور اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے پناہ مانگے تو اسے اس وقت تک پناہ دو جب تک وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر اسے اس کی امن کی جگہ پہنچا دو، یہ اس لئے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جنہیں علم نہیں ہے ۔(۶) ان مشرکین سے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کوئی معاہدہ کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ البتہ جن لوگوں سے تم نے مسجد حرام کے قریب معاہدہ کیا ہے، جب تک وہ تمہارے ساتھ سیدھے رہیں، تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو۔ بیشک اللہ متقی لوگوں کو پسند کرتا ہے ۔ (۷) (لیکن دوسرے مشرکین کے ساتھ) کیسے معاہدہ برقرار رہ سکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی تم پر غالب آجائیں تو تمہارے معاملے میں نہ کسی رشتہ داری کا خیال کریں، اور نہ کسی معاہدے کا؟ یہ تمہیں اپنی زبانی باتوں سے راضی کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ ان کے دل انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر لوگ نافرمان ہیں ۔(۸) انہوں نے اللہ کی آیتوں کے بدلے (دنیا کی) تھوڑی سی قیمت لے لینا پسند کرلیا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے کرتوت بہت برے ہیں ۔(۹) یہ کسی بھی مومن کے معاملے میں کسی رشتہ داری یا معاہدے کا پاس نہیں کرتے، اور یہی ہیں جو حدیں توڑنے والے ہیں ۔(۱۰) لہذا اگر یہ توبہ کرلیں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو یہ تمہارے دینی بھائی بن جائیں گے اور ہم احکام کی یہ تفصیل ان لوگوں کے لیے بیان کر رہے ہیں جو جاننا چاہیں ۔(۱۱)

غزوۂ حنین کے مختصر حالات:

جب آنحضرت ﷺ نے مکہ مکرمہ فتح کر لیا تو آپ کو یہ اطلاع ملی کہ عرب کا مشہور قبیلہ ''بنو ہوازن'' اپنے سردار ''مالک بن عوف'' کی قیادت میں مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے پر تول رہا ہے اور اس کی تعداد چوبیس سے اٹھائیس ہزار تک ہے ۔ چنانچہ آپ ﷺ چودہ ہزار صحابہ کا ایک لشکر لے کر روانہ ہوئے، یہ جنگ مکہ مکرمہ سے دس میل کے فاصلے پر وادی حنین میں لڑی گئی ۔ بعض مسلمانوں کی زبان سے پہلی دفعہ اپنا اتنا بڑا لشکر دیکھ کر یہ نکل گیا کہ '' آج تو ہماری تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ہم کسی سے مغلوب ہو ہی نہیں سکتے'' اللہ کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ مسلمان اللہ کے بجائے کسی اور چیز پر بھروسہ کریں چنانچہ جس وقت مسلمان ایک تنگ گھاٹی سے گذر رہے تھے قبیلہ ہوازن نے ایسی تیراندازی کی کہ مسلمانوں کے

قدم اکھڑ گئے اور وہ میدان جنگ سے پیچھے ہٹ گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے جانباز صحابہ کے ساتھ ثابت قدم رہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عباس صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ پیچھے ہٹنے والوں کو بلائیں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی آواز پر سب واپس پلٹ آئے اور ایک نئے ولولے سے حملہ کیا اور کچھ ہی دیر میں جنگ کا پانسہ پلٹ گیا، ہوازن کے ستر سردار مارے گئے، چھ ہزار افراد جنگی قیدی بنائے گئے اور بڑی تعداد میں مویشی اور چار ہزار اوقیہ چاندی مسلمانوں کو مال غنیمت کے طور پر ہاتھ لگی۔

اس کے بعد تو قبیلے کے قبیلے اسلام میں داخل ہونے لگے اور عرب کے بیشتر قبائل پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ جزیرہ عرب میں دو دین باقی نہ رہیں، اس لئے اس سورت کے شروع میں کفار کو مہلت دی گئی ہے کہ یا تو اسلام قبول کرلیں یا جزیرہ عرب چھوڑ دیں یا پھر جنگ کے لئے تیار ہوجائیں۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہود ونصاریٰ کو بھی وہاں سے نکالنے کا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں یہ مرحلہ تو مکمل نہ ہوسکا مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی وصیت فرمادی تھی۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِىْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ ......الی............مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری بہت سے مقامات پر مدد کی ہے، اور (خاص طور پر) حنین کے دن جب تمہاری تعداد کی کثرت نے تمہیں مگن کر دیا تھا، مگر وہ کثرت تعداد تمہارے کچھ کام نہ آئی، اور زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم نے پیٹھ دکھا کر میدان سے رخ موڑ لیا۔ (۲۵) پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل کی اور ایسے لشکر اتارے جو تمہیں نظر نہیں آئے، اور جن لوگوں نے کفر اپنا رکھا تھا، اللہ نے ان کو سزا دی، اور ایسے کافروں کا یہی بدلہ ہے۔ (۲۶) پھر اللہ جس کو چاہے اس کے بعد توبہ نصیب کردے، اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (۲۷)

تتمۂ اعلان براءت:

شروع سورت میں اعلان براءت کا ذکر تھا، اب اسی اعلان کا ایک تتمہ ذکر کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ ایک سال کے اندر مشرکین حدود حرم سے باہر نکل جائیں، تاکہ حرم کی پاک زمین مشرکین کے ناپاک وجود سے پاک ہوجائے، کیونکہ مشرک نجس ہیں، اس ایک سال گزر جانے کے بعد مشرکین کو حج اور خانہ کعبہ کے طواف کی اجازت نہیں۔ اعلان براءت میں چار ماہ کی مہلت دی تھی اور مسجد حرام کے داخلہ کے لیے ایک سال کی مہلت دی۔

اس حکم سے مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ جب حرم میں مشرکین کی آمدورفت بند ہوجائے گی تو اس سے تجارت کو نقصان پہنچے گا اور باہر سے جو لوگ سامان تجارت لاتے تھے وہ نہیں آئے گا اس لیے مسلمانوں کی تسلی کردی گئی کہ تم گھبراؤ نہیں، اللہ تم کو دوسرے طریقوں سے غنی اور مالداری عطا کرے گا۔ دولت وثروت سب اسی کی مشیت پر موقوف ہے۔ فقر سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، اگر حرم میں مشرک تاجروں کی آمدورفت موقوف ہوجائے تو عرب اور عجم سب اسلام کا باج گزار

بن جائے گا اور سب جگہ مسلمانوں کا کاروبار جاری ہوجائے گا۔ اور کافروں سے اتنا جزیہ اور خراج مل جائے گا جو تجارتی منافع سے ہزاروں بلکہ لاکھوں گونہ زیادہ ہوگا۔ (معارف القرآن ادریسی: ۳/۴۰۶)

چنانچہ فرماتے ہیں:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ ...... الی ...... اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۸﴾

اے ایمان والو! مشرک لوگ تو سراپا ناپاکی ہیں، لہٰذا وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب بھی نہ آنے پائیں، اور (مسلمانو) اگر تم کو مفلسی کا اندیشہ ہو تو اگر اللہ چاہے گا تو تمہیں اپنے فضل سے (مشرکین سے) بے نیاز کردے گا۔ بیشک اللہ کا علم بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل۔

حکماء نے لکھا ہے کہ نجاست کی طرف نظر کرنا ضعف بصر کا سبب ہے، اسی طرح یہ ناچیز کہتا ہے کہ کفر اور شرک کی نجاست کی طرف نظر کرنا ضعف بصیرت کا سبب ہے اور اسی پر تمام اولیاء و عارفین کا اجماع ہے اور کتاب وسنت کے نصوص میں جو کافر اور فاسق کی صحبت اور مجالست کی ممانعت آئی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ جمہور علماء اسلام اور ائمہ اربعہ یہ کہتے ہیں کہ آیت میں نجاست سے اعتقادی نجاست مراد ہے۔ (معارف القرآن ادریسی: ۳/۴۰۷)

مشرکین کے ناپاک ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کا جسم ناپاک ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین سے مصافحہ فرمایا ہے، ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا ہے، ان کے ساتھ کھانا تناول فرمایا ہے، ان کی دعوت قبول کی ہے، ان کا پانی استعمال کیا ہے، اسی طرح مشرکین کی ایک قسم اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کی ہے، قرآن مجید کے بیان کے مطابق یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے اور عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو، ظاہر ہے کہ یہ کھلا ہوا شرک تھا، اس کے باوجود اہل کتاب عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی اور ان کے ذبیحہ کو حلال قرار دیا گیا، اگر مشرکین جسمانی طور پر ناپاک ہوتے تو ان کے ساتھ کیسے اس طرح کے معاملات روا رکھے جاتے؟ پس یہاں ناپاک ہونے سے مراد عقیدہ کی ناپاکی ہے: "إن كفرهم الذي صفة لهم بمنزلة النجاسة" (مفاتیح الغیب: ۷/۶۱۹) (آسان تفسیر: ۱/۵۷۲)

غزوۂ تبوک:

اس غزوہ کو غزوہ تبوک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہ غزوہ سخت گرمی کے زمانے میں پیش آیا تھا، سفر بھی طویل تھا، پھل پکے ہوئے تھے جو کہ ان کا اہم ذریعہ معاش تھے اور مقابلہ ایک ایسی سلطنت سے تھا جسے اپنے وقت کی سپر پاور ہونے کا دعویٰ تھا، مختصر یہ کہ یہ غزوہ اہل ایمان کے لیے بڑی ابتلاء اور ان کے صدق و اخلاص کا امتحان تھا، اس کے ذریعے مومنوں اور منافقوں کے درمیان امتیاز بھی ہوگیا۔

سورۂ توبہ کے بنیادی ہدف:

حقیقت میں سورۂ توبہ کے بنیادی ہدف دو ہی ہیں:

◇ ایک مشرکین اور اہل کتاب کے ساتھ جہاد کے احکام بیان کرنا۔
◇ دوسرا غزوۂ تبوک کے پس منظر میں اہل ایمان اور اہل نفاق کے درمیان واضح فرق کر دینا۔

مشرکین کے ساتھ معاہدات سے براءت:

جہاں تک احکام جہاد کا تعلق ہے تو تمہید کے طور پر ان معاہدات سے براءت کا اعلان کیا گیا جو مسلمانوں نے مشرکین کے ساتھ کیے تھے، ان کے لیے انتہائی مدت چار ماہ مقرر کر دی گئی، یوں ہی مشرکوں کو بیت اللہ کا حج کرنے سے بھی منع کر دیا گیا۔ کیونکہ یہ لوگ کئی بار عہد شکنی کے مرتکب ہو چکے تھے اور اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے یہود کے ساتھ گٹھ جوڑ کرتے چلے آ رہے تھے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

مشرکین کی چار قسمیں:

(۱) پہلی قسم ان مشرکین کی تھی جن کے ساتھ مسلمانوں نے جنگ بندی کا کوئی معاہدہ نہیں کیا ہوا تھا ایسے مشرکین کو چار ماہ کی مہلت دی گئی کہ اگر وہ ان چار ماہ میں اسلام لانا چاہیں تو لے آئیں اور اگر جزیرہ عرب سے باہر کہیں جانا چاہیں تو چلے جائیں؛ ورنہ ابھی سے ان کے خلاف یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ ان کو جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ (ترمذی حدیث نمبر ۸۷۱)

(۲) دوسری قسم ان مشرکین کی تھی جن کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ تو تھا؛ لیکن اس کی کوئی مدت متعین نہیں تھی، ان کے لئے بھی یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب وہ معاہدہ چار مہینے تک جاری رہے گا، اس دوران ان کو بھی پہلی قسم کی طرح دونوں طرح کے اختیارات حاصل ہیں، بصورت دیگر ان کو بھی جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا۔

(۳) تیسری قسم ان مشرکین کی تھی جن کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاہدہ تو کیا تھا لیکن انہوں نے بدعہدی کی اور معاہدہ خود ہی توڑ دیا تھا، جس کی مثال صلح حدیبیہ ہے کہ مشرکین نے اس معاہدے کو توڑا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا۔ ان لوگوں کو کوئی مہلت نہیں دی گئی لیکن کیونکہ دست برداری کا یہ اعلان حج کے موقع پر کیا گیا تھا جو خود حرمت والے مہینے میں ہوتا ہے اور اس کے بعد محرم کا مہینہ بھی حرمت والا ہے، اس لئے ان کو محرم کے آخر تک مہلت مل گئی، انہی کے بارے میں سورہ توبہ کی آیت نمبر ۵ میں ارشاد فرمایا کہ حرمت والے مہینوں کے گذر جانے تک بھی اگر وہ ایمان نہ لائیں اور نہ جزیرہ عرب سے باہر جائیں تو ان کو قتل کر دیا جائے۔

(۴) چوتھی قسم ان مشرکین کی تھی جن کے ساتھ کسی خاص مدت تک کیلئے مسلمانوں نے جنگ بندی کا معاہدہ کر رکھا تھا اور انہوں نے کوئی بدعہدی بھی نہیں کی تھی، ایسے لوگوں کے بارے میں سورہ توبہ کی آیت نمبر ۴ میں یہ حکم نازل کیا گیا کہ ان کے ساتھ معاہدے کی جتنی مدت باقی ہے اس کو پورا کیا جائے اور اس دوران ان کے ساتھ کسی قسم کا تعارض نہ کیا جائے، مثلاً قبیلہ کنانہ کے دو چھوٹے قبیلوں بنو ضمرہ اور بنو مدلج کے ساتھ آپ کا ایسا ہی معاہدہ تھا اور اس کی نو ماہ کی مدت ابھی باقی تھی اور انہوں نے کوئی بدعہدی نہیں کی تھی، چنانچہ ان کو معاہدے کے ختم تک یعنی نو مہینوں کی مہلت دے دی گئی۔

ان چاروں قسموں کے اعلانات کو''براءت'یا''دست برداری'' کے اعلانات کہا جاتا ہے۔(خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

مشرکین سے قتال کے اسباب:

(۱)ان لوگوں نے عہد کو توڑا ہے۔

(۲)اللہ کے رسول ﷺ کو مکہ سے نکالا ہے۔

(۳)خود انہوں نے عہد کو توڑنے کی ابتداء کی ہے،لہذا ان امور کے بعد ضروری ہے کہ ان لوگوں سے خوب قتال کیا جائے۔

اور پھر قتال کی صورت میں اللہ تعالی نے چار چیزوں کا وعدہ فرمایا ہے:

(۱)اللہ ان کافروں کو مؤمنوں کے ہاتھوں عذاب چکھائے گا۔

(۲)انہی کے ہاتھوں رسوا کرے گا۔

(۳)مسلمانوں کو کافروں پر غلبہ عطا کرے گا۔

(۴)اور مسلمانوں کے دلوں کو ٹھنڈا کرے گا۔(آیت نمبر ۱۳-۱۵)

چونکہ اسلام امن پسندی چاہتا ہے،اس لئے اگر یہ لوگ مسلمان ہو جاتے ہیں اور اسلام اور شعائر اسلام نماز زکوۃ کی پابندی کرتے ہیں،تو ان سے تعرض نہ کیا جائے،بلکہ ان کو مسلمان تسلیم کرلیا جائے۔(خلاصہ مضامین قرآن: مولانا منظور یوسف)

اندھی تقلید:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ .... الی........لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾

انہوں نے اللہ کی بجائے اپنے احبار(یعنی یہودی علماء)اور راہبوں(یعنی عیسائی درویشوں)کو خدا بنالیا ہے۔اور مسیح ابن مریم کو بھی،حالانکہ ان کو ایک خدا کے سوا کسی کی عبادت کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔وہ ان کی مشرکانہ باتوں سے بالکل پاک ہے۔(۳۱)

علماء و مشائخ جو کچھ اپنی طرف سے مسئلہ بنا دیتے،خواہ حلال کو حرام یا حرام کو حلال کہہ دیتے،اسی کو سند سمجھتے کہ بس خدا کے ہاں ہم کو چھٹکارا ہو گیا۔کتب سماویہ سے کچھ سروکار نہ رکھا تھا،محض احبار و رہبان کے احکام پر چلتے تھے۔اور ان کا یہ حال تھا کہ جہاں تھوڑا سا مال یا جاہ ہی فائدہ دیکھا حکم شریعت کو بدل ڈالا،جیسا کہ دو تین آیتوں کے بعد مذکور ہے،پس جو منصب خدا کا تھا(یعنی حلال و حرام کی تشریع)وہ علماء و مشائخ کو دے دیا گیا تھا۔اس لحاظ سے فرمایا کہ انہوں نے عالموں اور درویشوں کو خدا ٹھہرالیا،نبی کریم ﷺ نے عدی بن حاتم کو اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اسی طرح کی تشریح فرمائی ہے اور حضرت حذیفہ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں عالم کا قول عوام کو سند ہے جب تک وہ شرع

سے سمجھ کر کہے۔ جب معلوم ہو کہ خود اپنی طرف سے کہا، یا طمع وغیرہ سے کہا پھر سند نہیں۔(تفسیر عثمانی: ۲۵۴)

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ مشہور تابعی ہیں۔آپ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد اور امام بخاریؒ کے استاد تھے۔ بڑے فقیہ، محدث، غازی، مجاہد اور مجتہد تھے، آپ کا یہ مصرعہ مشہور ہے۔" **وھل افسد الدین الا الملوک و احبار سوء و رھبانھا** "یعنی دین کو بگاڑنے والے یا تو بادشاہ ہیں جو اپنی طاقت اور مال و دولت کے بل بوتے پر دین کو اپنی مرضی کا بناتے ہیں۔ یا پھر برے عالم اور برے درویش ہیں جنہوں نے دین میں بگاڑ پیدا کیا ہے، اگر بادشاہ بگڑیں گے تو مسلمانوں کی معیشت تباہ ہوگی۔اگر عالم بگریں گے تو دین تباہ ہوگا اور اگر پیر صاحبان بگڑ جائیں گے تو اخلاق تباہ ہو جائے گا اگر یہ تینوں طبقے بگڑ جائیں تو پھر قوم تنزل کی گہرائیوں میں جا گرے گی؛ چنانچہ یہ بگاڑ ہماری امت میں بھی آ چکا ہے، مسلمانوں کے اکثر فتنے ان تینوں گروہوں کے پیدا کردہ ہیں۔حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ علمائے سوء دین کے چور ہیں، بلکہ ڈاکوؤں سے بھی بڑھ کر مضر ہیں، کیونکہ لوگ انہیں نیک اور بزرگ سمجھتے ہیں مگر یہ دین کی بجائے اپنی بات چلاتے ہیں۔انہوں نے اپنی شریعت بنا رکھی ہے۔(معالم العرفان:۹/۳۲۴)

اہل کتاب سے بھی قتال کی اجازت:

مشرکوں سے براءت کا اعلان کرنے کے بعد اہل کتاب کے ساتھ بھی قتال کی اجازت دی گئی ہے کہ مکروفریب، عہد شکنی، منافقت اور جھوٹ ان کی فطرت میں رچ بس چکا تھا۔ یہود کا قبیلہ بنو قریظہ ہو یا بنو نضیر اور بنو قینقاع انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا، تقریبا بیس آیات میں ان کے باطنی خباثت اور دسیسہ کاریوں کو طشت ازبام کیا گیا ہے۔

اہل کتاب سے متعلق مسلمانوں کو حکم:

اور مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ:اہل کتاب میں سے جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ ہی روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں، ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر جزیہ دیں۔"(۲۹)

جزیہ کی تعریف:

جزیہ کے لفظی معنی بدلہ اور جزا کے ہیں اور اصطلاح شرع میں اس سے مراد وہ رقم ہے جو کفار سے قتل کے بدلے میں لی جاتی ہے، یعنی ایسے مردوں سے جو لڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اسی لئے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور تارک الدنیا مذہبی پیشواؤں سے جزیہ نہیں لیا جاتا۔ وجہ یہ ہے کہ کفر و شرک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بغاوت ہے جس کی اصلی سزا صرف قتل ہے مگر اللہ تعالی نے اپنی رحمت کاملہ سے ان کی سزا میں تخفیف کر دی کہ اگر وہ اسلامی ریاست کی پر امن رعیت بن کر رہنا چاہیں تو ایک معمولی رقم ان سے بطور جزیہ لی جائے گی اور ان کے جان و مال کی حفاظت کی جائے گی۔

اس کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ غیر مسلموں سے مسلمانوں کی طرح زکوۃ وصول نہیں کی جاتی لیکن وہ ریاست کے تمام شہری حقوق میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، اس لئے بھی ان پر یہ خاص نوعیت کا ٹیکس عائد کیا گیا ہے اور احادیث میں مسلمان حکمرانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ غیر مسلموں کے حقوق کا پورا خیال کریں اور ان پر اتنا ٹیکس عائد نہ کریں جو ان کی طاقت سے زائد ہو۔ (خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

سورۃ الفاضحہ :

جہاں تک اس سورت کے ہدف کا تعلق ہے تو منافقوں کی علامات اور بدباطنیوں کو اس انداز میں بیان کیا گیا کہ وہ سب کے سامنے ذلیل اور رسوا ہو کر رہ گئے۔ اسی لیے اس سورت کا ایک نام ''سورۃ الفاضحہ'' بھی ہے یعنی رسوا کرنے والی سورت، اس سورت کے نزول سے قبل انہوں نے اپنے آپ کو اسلام کے زبانی دعوے کے پردے میں چھپا رکھا تھا؛ لیکن اس سورت نے ان کے باطن کو یوں ظاہر کیا کہ ہر کسی نے جان لیا کہ کون منافق ہے اور کون مخلص مومن ہے؟

زکوۃ نہ دینے والوں کی سزا:

يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ﴿۳۵﴾

جس دن اس دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور ان کی کروٹیں اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی، (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، اب چکھو اس خزانے کا مزہ جو تم جوڑ جوڑ کر رکھا کرتے تھے۔ (۳۵)

زکوۃ کے بنیادی مصالح:

بہت سے معاصر اہل علم اور اہل فکر جو جدید معاشی فلسفوں اور علم اقتصاد کی غیر معمولی اہمیت اور ہمہ گیری سے کم وبیش متاثر اور ذہنی طور پر مرعوب ہیں سارا زور زکوۃ کے اقتصادی اور اجتماعی مصالح ومنافع پر دیتے ہیں اور اس کو صرف ایک عادلانہ ٹیکس قرار دیتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ محتاط الفاظ میں یہ کہ ان کی تحریروں کو پڑھنے والا کم از کم ایسا محسوس کرتا ہے کہ ان کی رائے زکوٰۃ کے بارہ میں یہ ہے کہ دنیا کے معاشی نظاموں نے اب تک جتنے ٹیکس سوسائٹی پر عائد کئے ہیں؛ یہ اسلامی ٹیکس ان سب سے زیادہ منصفانہ، حکیمانہ اور متوازن ہے، اس لحاظ سے وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ زکوٰۃ اس اشتراکیت (سوشلزم) کی نہایت مستحکم بنیاد ثابت ہو سکتی ہے، جسے اسلام نے اپنی ترقی وعروج کے بہترین زمانہ میں دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، وہ (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) زکوٰۃ کی اس حقیقی روح کو فراموش کر دیتے ہیں، جو اس کے پورے نظام میں جاری وساری ہے، یہ روح ہے عبادت اور تقرب الی اللہ کی، اس طرح وہ اس کے بنیادی مقصد اور اصل مصلحت وحکمت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، یعنی نفس کو بخل، خودغرضی، انانیت، فقراء کی حق تلفی اور قلب کی قساوت سے پاک وصاف کرنا، اللہ

تعالیٰ کی قبولیت ورضا حاصل کرنا اور فقراء وضعفاء کی دلداری اور ہمدردی کے نتیجہ میں مال میں پاکی، نورانیت اور خیر وبرکت کا ظہور۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بہت اہتمام وتاکید کے ساتھ اس بنیادی مصلحت اور حقیقی فائدہ کا ذکر کیا ہے، اور سب سے زیادہ زور اسی مرکزی نقطہ پر دیا ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (اے پیغمبر) ان لوگوں کے اعمال میں سے صدقہ وصول کرلو جس کے ذریعے تم انہیں پاک کردو گے اور ان کے لیے باعث برکت بنو گے۔

زکوٰۃ اور سود کا موازنہ کرتے ہوئے ارشاد ہے:

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾

اور یہ جو تم سود دیتے ہوتا کہ وہ لوگوں کے مال میں شامل ہوکر بڑھ جائے تو وہ اللہ کے نزدیک بڑھتا نہیں ہے۔ اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ارادے سے دیتے ہو، تو جو لوگ بھی ایسا کرتے ہیں وہ ہیں جو (اپنے مال کو) کئی گنا بڑھا لیتے ہیں۔

ابوداود میں ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ نہیں فرض کی مگر اس لیے کہ اس کے ذریعہ تمہارا بقیہ مال ودولت پاک ہوجائے۔

اس اساسی مصلحت کے بعد جماعت اور معاشرہ کی مصلحت آتی ہے، جس میں معاشرہ کی خود کفالتی، غرباء کی اہم ضرورتوں کی تکمیل، سوسائٹی کے ہر ممبر کے لیے باعزت اور شریفانہ زندگی کے مواقع کی فراہمی تاکہ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرسکے اور مقصد حقیقی اور کمال اصلی تک پہونچ سکے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ زکوٰۃ کے بنیادی مصالح اور اس کے احکام کے اسرار اور حکمتوں کا ذکر کرتے ہوئے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں لکھتے ہیں:

جاننا چاہئے کہ زکوٰۃ میں سب سے اہم مصالح دو ہیں ''پہلی مصلحت تہذیب نفس ہے، اس لیے کہ نفس اور حرص وبخل کا چولی دامن کا ساتھ ہے، حرص بدترین اخلاق میں سے ہے، جو معاد میں انسان کو سخت ہلاکت میں ڈال سکتے ہیں، جو حریص ہوگا مرتے وقت بھی اس کا دل مال میں اٹکا رہے گا، اور اس کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا، اگر زکوٰۃ کی مشق اس کو ہوگی تو یہ حرص اس سے ختم ہوچکی ہوگی جو بالآخر اس کو نفع پہونچائے گی۔

دوسری مصلحت کا تعلق شہر سے ہے، اس لیے کہ ضعفاء واہل حاجت جمع ہوں گے، اگر ان کے ہمدردی واعانت کی یہ سنت نہ ہوتو وہ سب بھوک سے ہلاک ہوجائیں، اس کے علاوہ شہروں کا نظام مال پر قائم ہوتا ہے اور ان شہروں کی حفاظت

کے ذمہ دار اور وہاں کے بدترین منتظمین اپنی ان مشغولیات اور ذمہ داریوں کی وجہ سے کوئی باقاعدہ ذریعہ معاش اختیار نہیں کر سکتے، ان کی معیشت کا انحصار بھی اسی پر ہوتا ہے، مشترکہ اخراجات یا چندے نہ سب کے لیے آسان ہیں، نہ ممکن، اس لیے رعیت سے ان مصالح کے لیے مقررہ رقم وصول کرنا مناسب دستور رہے۔

اور چونکہ مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ یہ دو مصالح باہم لازم وملزوم رہیں، اس لیے شرع نے بھی اس کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ رکھا ہے۔

زکوۃ کی نمایاں خصوصیات:

زکوۃ کی بہت سی ایسی نمایاں خصوصیات ہیں جو انسان کے خودساختہ قوانین اور حکومت کے عائد کردہ ٹیکسوں سے بہت مختلف ہیں، ان مابہ الامتیاز خصوصیات نے زکوۃ کو ایک خاص رنگ اور مزاج بخشا ہے اس کو دینی تقدس اور پاکیزگی عطا کی ہے، اور اس کے اندر زندگی واخلاق پر اثر انداز ہونے اور خدا و بندہ کے تعلق کو استوار اور مستحکم کرنے کی ایسی قوت وصلاحیت پیدا کر دی ہے، جو کسی دوسرے دنیاوی ٹیکس میں (خواہ اس میں انصاف اور اعانت کو زیادہ سے زیادہ ملحوظ رکھا گیا ہو) نہیں ہے اور نہ ممکن ہے۔ (ارکان اربعہ: ۱۴۷-۱۵۱)

امیر وغریب کا فرق:

زکوۃ کا مقصد صرف وقتی طور پر غربت سے نجات دلانا نہیں ہے؛ بلکہ مالک بنانے (Owner ship) کے قاعدے کو بڑھا کر مال کے مالکان کی تعداد میں اضافہ کرنا بھی زکوۃ کا مقصد ہے، دوسرے لفظوں میں معاشرے میں سے غربت کو دور کر کے معاشرے کو مالدار بنانا ہے۔

اللہ پاک کی بے نیازی:

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... الٰی .... وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾

اگر تم ان کی (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی) مدد نہیں کرو گے تو (ان کو کچھ نقصان نہیں، کیونکہ) اللہ ان کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب ان کو کافر لوگوں نے ایسے وقت (مکہ سے) نکالا تھا جب وہ دو آدمیوں میں سے دوسرے تھے، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ: غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھی ہے؛ چنانچہ اللہ نے ان پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی، اور ان کی ایسے لشکروں سے مدد کی جو تمہیں نظر نہیں آئے، اور کافر لوگوں کا بول نیچا کر دکھایا، اور بول تو اللہ ہی کا بالا ہے، اور اللہ اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ (۴۰)

ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ - یہ غار غارِ ثور مضافات مکہ میں سے تھا، مکہ سے جنوب مشرق میں۔ آپ ﷺ اس کے اندر تین دن تک قیام پذیر رہے۔ دو سے مراد ایک ذات رسول ہے دوسرے آپ ﷺ کے مقرب ترین صحابی ابوبکر صدیق ؓ، صاحب رسول اللہ ﷺ یا رفیق رسول کے اس تعین میں کوئی اختلاف نہیں، اور اس سے حضرت صدیق ؓ کی

افضلیت و اشرفیت پر جو روشنی پڑتی ہے، محتاج بیان نہیں۔ بعض علماء نے آیت سے حضرت صدیقؓ کے خلیفہ اول ہونے کا بھی اشارہ سمجھا ہے۔ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو شخص ابوبکر الصدیقؓ کی صحابیت سے انکار کرتا ہے وہ قرآن سے انکار کرتا ہے اور اس سے اس کا کفر لازم آجاتا ہے اور یہ بات دوسرے صحابیوں کے لیے نہیں ہے۔

آپ دونوں صاحب غار ثور کے اندر چھپے ہوئے تھے کہ مشرکوں کی تلاش کرنے والی پارٹی نقش قدم کے نشانات کی مدد سے اس غار کے منہ تک پہنچ گئی، نشان شناس نے بتایا کہ نشان قدم یہیں تک ملتے ہیں، اسی غار کے اندر ہوں گے۔ کون انسان تھا جو ایسے موقع پر اپنے کو جان کے دشمنوں کے ہاتھ میں گرفتار دیکھتے پریشان و مضطر نہ ہوجاتا؟ حضرت ابوبکرؓ اس خیال پر سخت مضطرب تھے کہ اگر خدانخواستہ دشمنان دین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قابو پالیا تو اس کا کیا انجام ہوگا؟ لیکن آپ اللہ کے فضل سے اس وقت بھی بالکل مطمئن تھے، آپ نے فرمایا کہ ابوبکرؓ گھبرانے کی کیا بات ہے، ہم دو تنہا نہیں۔ ہمارے ساتھ تو اللہ کی تائید و نصرت ہے۔ ''ان اللہ معنا''۔ یعنی اس کی نصرت و حفاظت ہماری رفیق ہے۔ (قرطبی) (ماجدی: ۲/ ۵۱۳)

نکتہ:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ اپنے ایک وعظ میں فرماتے ہیں: صدیق اکبرؓ کو جب غار ثور میں کفار کے آنے سے پریشانی ہوئی تو آنحضرت نے ان کو تسلی کے لیے یہ فرمایا **لا تحزن ان اللہ معنا**۔ **معنا** میں ضمیر جمع لائے اور صدیق اکبر کو بھی اس معیت میں شریک فرمایا اور موسیٰ کے اصحاب کو جب فرعون اور اس کے لشکر کے آجانے سے پریشانی ہوئی، تو موسیٰؑ نے فرمایا: **کلا ان معی ربی سیھدین**۔ لفظ معی کو بصیغۂ مفرد فرمایا یعنی اللہ میرے ساتھ ہے اور معنا صیغہ جمع کا نہ فرمایا، جس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ ہم سب کے ساتھ ہے، غرض یہ کہ موسیٰؑ نے معیت خداوندی کو اپنے ساتھ مخصوص فرمایا اور قوم کو اس دولت میں شریک نہ کیا، وجہ فرق کی یہ ہے کہ صدیق اکبر کو اپنی کوئی پریشانی نہ تھی۔ پریشانی فقط حضور کی تھی کہ مبادا کوئی دشمن آپ کو دیکھ لے اور حضرت صدیق دولت توکل سے مالا مال تھے، ان کی تسلی کے لیے یہی کلام مناسب تھا جو حضور پرنور نے استعمال فرمایا اور معیت الٰہیہ میں ان کو شریک کیا اور موسیٰؑ کے ساتھ جو لوگ تھے وہ نہ تو حضرت صدیق کے برابر متوکل تھے اور نہ یار غار کی طرح حضرت موسیٰؑ کے عاشق زار اور جاں نثار تھے، ان کو تو اپنی جان کا خطرہ تھا، پھر خطرہ ہی نہیں بلکہ اس کا جزم اور یقین تھا کما قال تعالیٰ **قال اصحاب موسیٰ انا لمدرکون**۔ جس میں ان اور لام تاکید اور جملہ اسمیہ تین موکدات موجود ہیں یعنی بس ہم تو یقینا پکڑے گئے، حالانکہ بارہا اس کا مشاہدہ کر چکے تھے کہ فرعون کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کی کس طرح مدد فرمائی اور اس وقت بھی خدا کے حکم سے اور اس کے وعدۂ نصرت سن کر چلے تھے، ان تمام امور کے ہوتے اتنی پریشانی کہ اپنے پکڑے جانے کا یقین اور جزم کر بیٹھے جو ان کے غیر متوکل اور غیر کامل الیقین ہونے کی دلیل ہے، اس لیے موسیٰؑ نے ان کو دھمکا کر فرمایا: کلا ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا، جس تاکید سے انہوں نے اپنے پکڑے جانے کو ظاہر کیا تھا اس کا جواب بھی تاکید کے ساتھ دیا گیا اور لفظ معی کو مفرد لائے اور باوجود خبر ہونے کے اس کو مقدم کیا تاکہ فائدہ حصر کا حاصل ہو، اس لیے کہ تقدیم ماحقہ

التاخیر مفید حصر ہوتی ہے، مطلب یہ تھا کہ میرے ساتھ میرا پروردگار ہے اور تم لوگ بوجہ ضعیف الیقین ہونے کے معیت حق سے محروم ہو، ہر ایک کا کلام اپنے اپنے موقعہ پر نہایت بلیغ ہے، اگر حضرت موسیٰؑ کے مخاطب صدیق اکبر جیسے ہوتے تو وہ بھی وہی فرماتے جو حضور پرنور نے فرمایا اور اگر حضور کے مخاطب وہ لوگ ہوتے جو حضرت موسیٰ کے تھے تو حضور بھی وہی فرماتے جو حضرت موسیٰؑ نے فرمایا، بلاغت کے معنی مقتضائے حال کی رعایت کے ہیں۔

حکیم الامت تھانویؒ کے کلام کا خلاصہ ختم ہوا (دیکھو وعظ الرفع والوضع ص ۴۵ نمبر ۲ ۱۳ از سلسلہ تبلیغ)

نیز موسیٰ (علیہ السلام) کی معیت؛ معیت ربانیہ تھی، جس کو موسیٰؑ نے اسم رب کے ساتھ ذکر فرمایا۔ **ان معی ربی** میرے ساتھ میرا پروردگار ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوبکر صدیق کی معیت معیت الٰہیہ تھی۔ جس کو نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے اسم اللہ کے ساتھ ذکر فرمایا **ان اللہ معنا**، تحقیق اللہ ہمارے ساتھ ہے، اسی آیت میں حق جل شانہ کی معیت کو اسم اعظم (یعنی لفظ اللہ) کے ساتھ ذکر فرمایا، جو تمام صفات کمال کو جامع ہے اور موسیٰؑ نے خدا تعالیٰ کی معیت کو اسم رب کے ساتھ ذکر فرمایا یہ نکتہ عارف کامل شیخ ابن لبانؒ کی کلام کی تشریح ہے، جس کو علامہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں ذکر کیا ہے۔ (معارف القرآن ادریسی: ۳/ ۴۴۵، ۴۴۶)

منافقوں کے عیوب کو نمایاں کرنے کا سبب:

منافقوں کی کمزوریوں اور عیوب کو نمایاں کرنے کا ظاہری سبب غزوۂ تبوک بنا، جہاد تو ویسے بھی جان کو جوکھوں میں ڈالنے والی عبادت ہے؛ جبکہ غزوۂ تبوک میں مادی اعتبار سے اپنے وقت کی سب سے بڑی فوج کے ساتھ مقابلہ تھا اور وہ بھی شدید گرمی اور فقر و فاقہ کے دنوں میں۔

منافقوں کی حرکتوں کی چند جھلکیاں:

اس غزوہ کے پس منظر میں منافقوں سے جو حرکتیں سرزد ہوئیں ان کا اندازہ ذیل کی چند جھلکیوں سے لگایا جا سکتا ہے، یہ جھلکیاں سورۂ توبہ کی بعض آیات ہی سے ماخوذ ہیں:

(۱) اللہ نے پیشین گوئی فرمادی تھی کہ منافق قسمیں کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم طاقت رکھتے تو آپ کے ساتھ ضرور (تبوک کی طرف) نکل پڑتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس آئے تو منافقوں نے جھوٹے اعذار پیش کیے۔

(۲) سوائے چند کے باقی تمام مخلص مسلمان فوراً غزوۂ تبوک میں شرکت کے لیے تیار ہو گئے، جب کہ منافقوں نے مختلف حیلوں بہانوں سے مدینہ میں رہنے کی اجازت حاصل کر لی۔

(۳) اللہ نے فرمایا کہ ان منافقوں کا جہاد میں نہ نکلنا ہی بہتر تھا، اگر بالفرض وہ شرکت کرتے تو مسلمانوں کے درمیان فتنہ فساد پھیلانے کے سوا کچھ بھی نہ کرتے۔

(۴) ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے مضحکہ خیز عذر پیش کر کے اپنے لیے استثناء حاصل کرنے کی کوشش کی، مثال کے طور پر ''جد بن قیس'' نام کے ایک صاحب کہنے لگے ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں دل کا بڑا کمزور ہوں جبکہ رومیوں کی عورتیں گورے رنگ کی ہوتی ہیں، مجھے ڈر ہے کہ اگر میں جہاد میں گیا تو انہیں دیکھ کر فتنہ میں مبتلا ہو جاؤں گا۔''

(۵) ان کے دلوں میں مسلمانوں کے لیے بغض اور حسد کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر مسلمانوں کو فتح حاصل ہو یا مال غنیمت ہاتھ آئے تو پریشان ہو جاتے ہیں اور اگر اس کے برعکس کسی حادثے یا مصیبت کا سامنا کرنا پڑ جائے تو انہیں بے پناہ خوشی ہوتی ہے۔

(۶) وہ قسمیں کھا کر یقین دلاتے ہیں کہ اے مسلمانو! ہم تم میں سے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

(۷) ان کی نظریں صرف مال پر ہوتی ہیں، اگر مل جائے تو خوش ہوتے ہیں، اگر محروم رہیں تو اللہ کے نبی پر بھی طعنہ زنی سے باز نہیں آتے۔

(۸) چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر کسی کی بات سن لیا کرتے تھے، اس لیے وہ آپ ﷺ کے بارے میں کہتے تھے کہ آپ تو ''نرے کان'' ہیں۔

(۹) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں انہیں مستقل یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کہیں ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ان کا پول کھول دے اور ان کے قلبی راز فاش کر دے۔

(۱۰) ایک دوسرے کو برائی کا حکم دینا، نیکی سے روکنا اور بخل کرنا ان کی نمایاں صفات میں سے ہیں۔

(۱۱) ان منافقین کی صفات اور اعمال، ماضی کے کفار جیسے ہیں۔

(۱۲) ان کے دل اللہ کی محبت، اس کے ذکر و شکر اور اس کی عظمت سے یکسر خالی ہیں، ظاہر ہے جس کے دل میں اللہ کی عظمت نہیں ہو گی اس کے لیے معصیت اور نافرمانی بہت آسان ہو جائے گی۔

دیگر اقوام:

منافقوں کو کفار کے ساتھ تشبیہ دینے کے بعد قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیم، اصحاب مدین اور قوم لوط کا ذکر کیا ہے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

حلف کاذب:

منافقین اپنی خلوتوں میں آں حضرت ﷺ اور مومنین پر طعن کرتے اور پھر جب وہ بات آں حضرت ﷺ کو پہنچتی تو آ کر حلف کرتے کہ ہم نے یہ بات نہیں کہی، اپنے قول سے مکر جاتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اے مسلمانو! یہ منافق تمہارے آگے اللہ کی جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے فلاں بات نہیں کہی، تا کہ تم کو راضی کریں، حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ سزاوار ہیں کہ اس کو راضی کریں، اگر یہ لوگ واقع میں سچے ایماندار ہیں۔ جیسا کہ کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں۔

ان کو اتنی عقل نہیں کہ یہ دغا اور فریب اللہ اور اس کے رسول کے یہاں کام نہیں دیتی، اللہ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں، وہ اپنے نبی کو بذریعہ وحی کے مطلع کر دیتا ہے۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾

(مسلمانو) یہ لوگ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں اس لیے کھاتے ہیں تا کہ تمہیں راضی کریں، حالانکہ اگر یہ واقعی مومن ہوں تو اللہ اور اس کے رسول اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ یہ ان کو راضی کریں۔(۶۲)

نکتہ:

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اپنے ایک وعظ میں فرماتے ہیں: جاننا چاہیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دو شانیں تھیں ایک شان سلطنت اور دوسری شان نبوت اور محبوبیتِ حق۔ پس منافقین اپنی جھوٹی قسموں سے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور آپ کے صحابہؓ کو بحیثیت شان سلطنت راضی کرنا چاہتے تھے۔ بحیثیت شان نبوت و رسالت آپ کو راضی کرنے کی فکر نہ تھی اور اس حیثیت سے آپ کو راضی کرنا عین حق تعالیٰ کو راضی کرنا ہے اور بعثت کا اصل مقصد شان نبوت و رسالت تھی، شان سلطنت مقصود نہ تھی۔ بلکہ شان نبوت کے تابع تھی کہ احکام خداوندی کے اجراء میں سہولت ہو۔ منافقین حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہ حیثیت سلطنت راضی رکھنا چاہتے تھے تا کہ ان کے جان و مال محفوظ رہیں اور ان کے ساتھ کافروں جیسا معاملہ نہ کیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ غرض سلطنت کی حیثیت سے متعلق ہے، حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت و رسالت اور مظہر حق ہونے کی حیثیت سے راضی کرنے کی ان کو کوئی فکر اور پروا نہ تھی، حالانکہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا نائب حق ہونے کی حیثیت سے مطلوب ہے اور اس آیت میں اسی کا ذکر ہے اور جس حیثیت سے تم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو راضی کرنا چاہتے ہو وہ مطلوب نہیں اور جس حیثیت سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو راضی کرنا مطلوب ہے اس حیثیت سے تم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو راضی کرنا نہیں چاہتے اور نہ تمہیں اس کی پروا ہے۔ ابو طالب کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت محبت تھی مگر وہ صرف اس حیثیت سے تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے چہیتے تھے یا بعض کفار کو آپ سے اس لیے محبت تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بڑے عاقل کامل یا بڑے سخی اور مہمان نواز تھے اور اب بھی بعض مصنفین یورپ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عقل اور فہم و فراست کی اور ہمت اور شجاعت کی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قانون شریعت کی بڑی تعریف کرتے ہیں مگر ان تمام حیثیتوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور رضا شرعاً نجات کے لیے کافی نہیں بلکہ نجات کے لیے یہ ضروری ہے کہ نبی اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور نائب حق ہونے کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کی جائے اور اسی حیثیت سے آپ کو راضی کیا جائے۔ انتہی کلامہ (ماخوذ از رضاء الحق :۱/ ۲۰، ۲/ ۱۲ وعظ ششم و ہفتم از سلسلۂ البلاغ) (تفسیر ادریسی: ۳/ ۴۷۸)

مومنوں کی اچھی صفات پر تعریف:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ .... الی................وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ

هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝٧٢

اور مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ نیکی کی تلقین کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کو اللہ اپنی رحمت سے نوازے گا۔ یقیناً اللہ اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔(۷۱) اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے وعدہ کیا ہے ان باغات کا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور ان پاکیزہ مکانات کا جو سدا بہار باغات میں ہوں گے۔ اور اللہ کی طرف سے خوشنودی تو سب سے بڑی چیز ہے۔(جو جنت والوں کو نصیب ہوگی) یہی تو زبردست کامیابی ہے۔(۷۲)

منافقین کا مخلصین کے صدقات پر طعن وتمسخر کرنا:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو صدقات نکالنے کی ترغیب دی تو ہر مخلص مسلمان نے اپنی استطاعت کے مطابق صدقہ لاکر پیش کیا، منافقین خود تو اس کارخیر میں کیا حصہ لیتے، مسلمانوں کو طعنے دیتے رہتے تھے۔ اگر کوئی شخص زیادہ مال لے کر آتا تو کہتے کہ یہ تو دکھاوے کے لیے صدقہ کر رہا ہے اور اگر کوئی غریب مزدور اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے کچھ تھوڑا سا صدقہ لے کر آتا تو منافقین اس کا مذاق اڑاتے اور کہتے کہ یہ کیا چیز اٹھالایا ہے۔ اللہ اس سے بے نیاز ہے۔ صحیح بخاری اور حدیث وتفسیر کی دوسری کتابوں میں ایسے بہت سے واقعات مروی ہیں۔ لیکن اس جگہ غالباً وہ موقع مراد ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک کے لیے چندہ جمع کرنے کی ترغیب دی تھی۔ درمنثور (ج:۴ ص ۲۲۶) میں ایک روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔(توضیح القرآن)

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ .... الیٰ.........وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝٨٠

(یہ منافق وہی ہیں) جو خوشی سے صدقہ کرنے والے مومنوں کو بھی طعنے دیتے ہیں، اور ان لوگوں کو بھی جنہیں اپنی محنت (کی آمدنی) کے سوا کچھ میسر نہیں ہے، اس لیے وہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں، اللہ ان کا مذاق اڑاتا ہے، اور ان کے لیے دردناک عذاب تیار ہے۔(۷۹) (اے نبی) تم ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو، اگر تم ان کے لیے ستر مرتبہ استغفار کرو گے تب بھی اللہ انہیں معاف نہیں کرے گا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کا رویہ اپنایا ہے، اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت تک نہیں پہنچاتا۔(۸۰)

اور تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ ایک موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدقہ دینے کی ترغیب دی، تو حضرت عبدالرحمن بن عوف ؓ نے چار ہزار درہم پیش کردیئے اور عاصم بن عدی نے سو وسق کھجوریں حاضر کردیں، اس پر منافقین نے طنز کیا، کہنے

لگے: اجی کچھ نہیں، یہ تو ریا کاری ہے، ایک صحابی حضرت ابوعقیلؓ بھی تھے وہ ایک صاع کھجور لے کر آئے اور صدقہ کے مال میں ڈال دیا۔ اس پر منافقین آپس میں ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ اللہ کو اس کے ایک صاع کی کیا ضرورت تھی؟ (چونکہ یہ صدقہ تھوڑا سا تھا اس لیے ان لوگوں نے ان کا مذاق بنایا) اور ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت ابوعقیل نے خوب زیادہ محنت کر کے دو صاع کھجوریں حاصل کیں (ایک صاع ساڑھے سیر کا ہوتا ہے) ان میں سے ایک صاع گھر والوں کو دے دیا اور ایک صاع لے کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور پوری صورت حال عرض کر دی، آپ نے فرمایا: اس کو مال صدقہ میں ڈال دو۔ منافق ان کا تمسخر کرنے لگے اور کہنے لگے کہ اس مسکین کے صدقہ سے اللہ بے نیاز تھا (کیا ذرا سی چیز لے کر آیا) اللہ تعالیٰ نے ان کے اس تمسخر کا تذکرہ فرمایا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس تمسخر پر سزا دے گا اور ان کے لیے عذاب الیم ہے۔ (انوار البیان)

منافقوں کے متعلق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم:

دسویں پارے کے آخر تک منافقوں کا ہی تذکرہ ہے اور ان منافقوں کے بارے میں اللہ تعالی نے یہاں تک فرمادیا کہ اگر آپ ان کے بارے میں ستر بار بھی استغفار کریں گے تو بھی اللہ ان کی مغفرت نہیں کرے گا۔ یہ واقعہ عبداللہ بن ابی بن سلول- جو منافقوں کا سردار تھا- کے انتقال کا ہے، اس نے ہر موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور مسلمانوں کو تکلیف پہنچائی؛ لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا کرتہ مبارک بھی اس کو کفن کے لئے عطا فرمایا اور اس کے لئے دعا مغفرت بھی کی اور نماز جنازہ بھی پڑھائی، لیکن اس کے بعد آپ کو منع کر دیا گیا کہ نہ آپ ان کے لئے استغفار کریں اور نہ آپ ان کی نماز جنازہ پڑھیں۔ (آیت نمبر ۸۰، ۸۴)

مخلصین کی جماعت:

اسی طرح ان مخلص مسلمانوں کا بھی تذکرہ ہے جو اپنے کسی عذر کی وجہ سے غزوہ میں شرکت نہ کر سکے؛ ورنہ ان کے جذبات کا یہ عالم تھا کہ جہاد میں شرکت نہ کرنے کے غم کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو امڈ امڈ آتے تھے، روایات میں آتا ہے کہ یہ سات انصاری صحابہ تھے، حضرت سالم بن عمیر، حضرت علبہ بن زید، حضرت عبدالرحمن بن کعب، حضرت عمرو بن الحمام، حضرت عبداللہ بن مغفل، حضرت ہرمی بن عبداللہ اور حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہم انہوں نے غزوہ تبوک میں شامل ہونے کیلئے اپنے شوق کا اظہار فرمایا اور آنحضرت سے سواری کی درخواست کی، جب آپ نے فرمایا کہ میرے پاس سواری نہیں تو وہ روتے ہوئے واپس ہوئے۔ (خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ: ......اعلان جنگ۔

خلاصہ رکوع: ۱ ......مسائل اربعہ۔ (۱) اعلان جنگ۔ (۲) مہلتِ غور۔ (۳) مدت معینہ کے معاہد کفار۔ (۴) مدت غیر معینہ کے معاہدے۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۔ (۲) آیت: ۲۔ (۳) آیت: ۴۔ (۴) آیت: ۱۔

خلاصہ رکوع:۲......وجہ مخاصمت۔ماخذ: آیت:۸،۷۔

خلاصہ رکوع:۳......رفع اعذار ثلاثہ۔ماخذ:(۱) آیت:۱۷۔(۲) آیت:۱۹۔(۳) آیت:۲۳۔

خلاصہ رکوع:۴......بقیہ دو عذر۔(۱) قلت تعداد۔(۲) اور ضروریات زندگی کا فقدان مانع جہاد نہیں ہوسکتا۔ (۳)اور کس سے لڑا جائے۔ماخذ:(۱) آیت:۲۵۔(۲) آیت:۲۸۔(۳) آیت:۲۹۔

خلاصہ رکوع:۵......مسلمانوں کو تمام اقوام عالم سے لڑنا ہوگا،اس لئے سال میں چار مہینے مہلت اور آرام کے ہیں۔ ماخذ: آیت:۳۰،۳۶۔

خلاصہ رکوع:۶......تمام مسلمانوں کو لڑنا پڑے گا۔ماخذ: آیت:۳۸،۴۱۔

خلاصہ رکوع:۷......خود اپنے آپ کو جہاد سے مستثنی رکھنا علامت نفاق ہے(۱)اور اقسام ثلاثہ مستثنین۔ماخذ:(۱) آیت:۴۵۔(۲) آیت ۴۶۔(۳) آیت ۴۹۔ثلاثہ(۴) آیت:۵۸۔

خلاصہ رکوع:۸......مستثنین کی قسم رابع ماخذ: آیت:۶۱۔

خلاصہ رکوع:۹......(۱) منافقین کا نصب العین۔(۲) اور ان کی سزا۔(۳) مؤمنین کا نصب العین۔(۴)اور ان کی جزا۔ماخذ:(۱) آیت:۶۷۔(۲) آیت ۶۸۔(۳) آیت:۷۱۔(۴) آیت:۷۲

خلاصہ رکوع:۱۰......(۱) مؤمنین کو کفار اور منافقین سے جہاد اور درشتی کا حکم۔(۲)اور مستثنین کی قسم خامس کا ذکر۔ ماخذ:(۱) آیت:۷۳۔(۲) آیت:۷۵۔

خلاصہ رکوع:۱۱(۱) نتیجہ تخلف ۔(۲) تحدید کے بعد ان کی حالت میں تغیر۔ ماخذ: (۱) آیت:۸۱ - (۲) آیت:۸۳۔

خلاصہ رکوع:۱۲......تنبیہ تخلف پر ترتیب آثار۔ماخذ: آیت:۹۰۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

دسویں سپارے کے چند اہم فوائد

(۱) کوئی بھی قوم حسب، نسب اور فرقہ وارانہ تشخص کی وجہ سے اللہ تعالی کی نعمتوں کا حقدار نہیں ٹھہرتی، جب تک کہ وہ اپنے اندر استحقاق والی صفات پیدا نہ کرے۔

(۲) خیانت اور عہد شکنی ہر صورت میں حرام ہے، خواہ مسلمان کے ساتھ معاملہ درپیش ہو یا کافر کے ساتھ۔

(۳) جن انسانوں کا اللہ سے تعلق مضبوط ہوتا ہے اللہ تعالی دشمنوں کے مکروفریب سے خود ان کی حفاظت فرماتا ہے۔

(۴) سچے مؤمن کا سینہ حکمت وبصیرت کے نور سے روشن جبکہ کافر اس سے محروم ہوتا ہے۔

(۵) اسلام، دشمن کو اس لئے قید نہیں کرتا کہ اس کا استحصال کرے یا اس کی بے بسی و کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے انتقام لے بلکہ اسلام قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دیتا ہے۔

(۶) مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں ان کے ساتھ تعاون تمام مسلمانوں پر واجب ہے۔

(۷) اہل تقوی اللہ کے محبوب ہیں، اللہ کے پسندیدہ کام کرنا اور ناپسندیدہ سے بچنے کا نام تقوی ہے۔

(۸) سچا مومن اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا، اللہ کے ڈر کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور گناہ چھوڑ دیئے جائیں۔

(۹) کفروشرک کے باوجود صلہ رحمی اور حسن سلوک جائز ہے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے سوال کیا: ''یارسول اللہ! میری والدہ بڑی رغبت سے میرے پاس آئی ہیں، کیا میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کروں؟ آپ نے فرمایا: ہاں تمہیں اس کی اجازت ہے۔

(۱۰) وہ ایمان جو ٹھوس بنیادوں پر قائم نہ ہو وہ سعادت اور نجات کے لئے کافی نہیں۔

***

پارہ:۱۱

منافقین کے جھوٹے اعذار:

دسویں پارہ کے آخر میں مخلص اہل ایمان کے علاوہ ان منافقوں کا تذکرہ تھا جنہوں نے مالی وسائل اور سواری کی استطاعت رکھنے کے باوجود غزوۂ تبوک میں شرکت نہیں کی تھی۔

گیارہویں پارہ کی ابتدا میں بھی اہل نفاق کا تذکرہ ہے، نزولِ قرآن کے زمانہ میں جس طرح شہروں میں منافق لوگ رہتے تھے، اسی طرح وہ دیہات میں بھی آباد تھے۔ مدینہ شہر کے منافقوں کا ذکر مختلف انداز سے ہو چکا ہے اور آگے بھی آرہا ہے۔ اب آج کے درس میں اللہ تعالیٰ نے بعض دیہاتی منافقین کے قبیح کارنامے بیان کر کے ان کی مذمت بیان فرمائی ہے۔ البتہ سارے لوگ ایک سے نہیں ہوتے، دیہات میں جہاں نفاق وکفر میں شدید تر لوگ رہتے تھے وہاں اچھے اور مخلص مسلمان بھی تھے، اللہ نے ان کی تعریف کی ہے اور ان کا انجام بھی بیان فرمایا ہے۔ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو تبوک سے واپسی پر راستہ ہی میں اطلاع دے دی تھی کہ جب آپ مدینہ پہنچیں گے تو منافق آپ کے سامنے مختلف قسم کے اعذار پیش کریں گے کہ ہم انتہائی سخت مجبوریوں کی بنا پر آپ کے ساتھ غزوہ میں شریک نہ ہو سکے؛ ورنہ ہم نے جانے کا تو پختہ ارادہ کر رکھا تھا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اور منافقوں نے قسمیں کھا کھا کر آپ کو اپنی سچائی کا یقین دلانے کی کوشش کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مروت اور شرافت کی بنا پر حقیقت کو جانتے ہوئے بھی خاموشی اختیار فرمائی اور انہیں جھوٹا قرار نہیں دیا۔

چنانچہ ارشار باری تعالیٰ ہے:

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ ...... الیٰ............فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ۝۹۶

(مسلمانو) جب تم لوگ (تبوک سے) واپس ان (منافقوں) کے پاس جاؤ گے، تو یہ تمہارے سامنے (طرح طرح کے) عذر پیش کریں گے۔ (اے پیغمبر) ان سے کہہ دینا کہ: تم عذر پیش نہ کرو ہم ہرگز تمہاری بات کا یقین نہیں کریں گے۔ اللہ نے ہمیں تمہارے حالات سے اچھی طرح باخبر کر دیا ہے اور آئندہ اللہ بھی تمہارا طرز عمل دیکھے گا، اور اس کا رسول بھی، پھر تمہیں لوٹا کر اس ذات کے سامنے پیش کیا جائے گا جس کو چھپی اور کھلی تمام باتوں کا پورا علم ہے، پھر وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔ (۹۴) جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے تو یہ لوگ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے، تاکہ تم ان سے درگزر کرو۔ لہذا تم بھی ان سے درگزر کر لینا۔ یقین جانو یہ سراپا گندگی ہیں، اور جو کمائی یہ کرتے رہے ہیں،

اس کے نتیجے میں ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔(۹۵) یہ تمہارے سامنے اس لیے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، حالانکہ اگر تم ان سے راضی ہو بھی گئے تو اللہ تو ایسے نافرمان لوگوں سے راضی نہیں ہوتا۔(۹۶)

خدا کی راہ میں کراہیت سے خرچ کرنا:

اعراب منافقین میں وہ لوگ بھی ہیں جنہیں اگر کسی وقت خدا کے راستہ میں کچھ خرچ کرنا پڑ جاتا ہے تو ایسی کراہیت سے خرچ کرتے ہیں جیسے کوئی جرمانہ اور تاوان ادا کرتا ہو، وہ ابھی تک اس کے منتظر ہیں کہ مسلمان حوادث دہر سے کسی گردش اور آفت میں پھنس جائیں تو ہم خوب شادیانے بجائیں۔ یہ خبر نہیں کہ انہیں کی قسمت گردش میں آرہی ہے۔ اسلام تو غالب و فائق ہو کر رہے گا اور یہ منافقین سخت ذلیل و رسوا ہوں گے۔ خدا ہر ایک کی باتیں اور دعائیں سنتا ہے اور جانتا ہے کہ کون عزت و کامیابی کا اہل ہے اور کون لوگ ذلت اور رسوائی کے مستحق ہیں۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾

انہی دیہاتیوں میں وہ بھی ہیں جو (اللہ کے نام پر) خرچ کیے ہوئے مال کو ایک تاوان سمجھتے ہیں، اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ تم مسلمانوں پر مصیبتوں کے چکر آ پڑیں، (حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ) بدترین مصیبت کا چکر تو خود ان پر پڑا ہوا ہے۔ اور اللہ ہر بات سنتا، سب کچھ جانتا ہے۔

انفاق کے معنی تو مطلق خرچ کرنے کے ہیں، خواہ وہ خرچ کسی نوعیت کا بھی ہو، لیکن قرآن مجید نے اسے عموماً موقع مدح ہی پر استعمال کیا ہے اور مطلق انفاق سے مراد کار خیر میں خرچ ہی لی ہے، جیسے مطلق قتال بول کر قرآن مجید نے عموماً مراد جہاد فی سبیل اللہ لی ہے۔ برے اور بے جا موقعوں پر خرچ کے لیے قرآن مجید نے عموماً لفظ ''اسراف'' کا استعمال کیا ہے۔ ''یتخذ مغرما''۔ یعنی ایسے موقعوں پر یہ منافقین مسلمانوں کی شرما شرمی خرچ تو کر گزرتے ہیں، لیکن اسے جرمانہ ہی کی رقم کی طرح اپنے لیے گراں سمجھتے ہیں۔ یہ نمونہ ہے ان کے بخل کا، محققین نے لکھا ہے کہ مصارف شرعی کو تکلیف و جبر تصور کرنا علامات نفاق میں سے ہے۔ ''یتربص بکم الدوائر''۔ یعنی مسلمانوں کے حق میں منتظر ہی رہا کرتے ہیں، کہ کب یہ زمانہ کی گردش کا شکار ہوتے ہیں، یہ نمونہ ہے ان کے حسد و عداوت اسلام کا ''الدوائر'' دائرۃ وہ مصیبت ہے جس سے نجات نہ ہو سکے اور جو دائرہ کی طرح انسان کو گھیر لے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے کو روپیہ کا مالک سمجھے گا، اسے خرچ کرنا یقیناً گراں گزرے گا اور جو کوئی مالک اللہ کو سمجھے گا اور اپنے کو محض امین یا متولی، اسے تو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بہت غنیمت معلوم ہوگا۔ (ماجدی: ۲/ ۵۵۴)

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ آخری دور میں ایسا زمانہ بھی آئے گا جب لوگ زکوٰۃ کو تاوان سمجھنے لگیں گے اور اس کی ادائیگی سے گریز کریں گے۔ حالانکہ یہ فرض ہے اور فرض کی ادائیگی سے خوش ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی

توفیق بخشی ہے، پھر فرمایا: بعض دیہاتی ایسے بھی ہیں۔

مخلص مسلمانوں کی تعریف:

منافقوں کے مقابلے میں اللہ تعالی نے مخلص مسلمانوں کی صفات بیان فرمائی ہیں، اور ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں، اور جھوٹ بول کر غلط کو صحیح قرار دینے کی کوشش نہیں کرتے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق یہ کل دس حضرات تھے، ان میں سے سات کو اپنی اس سستی پر اتنی شرمندگی تھی کہ آپ کے واپس مدینہ منورہ تشریف لانے سے پہلے ہی یہ حضرات خود مسجد نبوی ﷺ پہنچے اور اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا اور یہ کہا کہ جب تک آپ ﷺ خود ہمیں معاف فرما کر نہیں کھولیں گے ہم انہی ستونوں سے بندھے رہیں گے، جب آپ ﷺ واپس تشریف لائے تو دریافت کیا کہ کیا معاملہ ہے؟ وجہ معلوم ہونے پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں بھی ان لوگوں کو جب تک نہیں کھولوں گا جب تک اللہ انہیں کھولنے کا حکم نہیں دے گا؛ چنانچہ اس موقعہ پر اللہ تعالی نے یہ درج ذیل آیت نازل فرمائی:

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾

اور کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کر لیا ہے۔ انہوں نے ملے جلے عمل کیے ہیں، کچھ نیک کام، اور کچھ برے۔ امید ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول کر لے گا۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (۱۰۲)

صدقے کی دو خاصیتیں:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

(اے پیغمبر) ان لوگوں کے اموال میں سے صدقہ وصول کر لو جس کے ذریعے تم انہیں پاک کر دو گے اور ان کے لیے باعث برکت بنو گے اور ان کے لیے دعا کرو۔ یقیناً تمہاری دعا ان کے لیے سراپا تسکین ہے، اور اللہ ہر بات سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ (۱۰۳)

یہی حضرات جنہوں نے توبہ کے طور پر اپنے آپ کو ستونوں سے باندھ لیا تھا، جب ان کی توبہ قبول ہوئی اور انہیں آزاد کیا گیا، تو انہوں نے شکرانے کے طور پر اپنا مال صدقے میں دینے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے شروع میں فرمایا کہ مجھے تم سے کوئی مال لینے کا حکم نہیں دیا گیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ ان سے صدقہ قبول فرمالیں، آیت میں صدقے کی دو خاصیتیں بیان فرمائی گئی ہیں، ایک یہ کہ وہ انسان کو گناہوں اور برے اخلاق سے پاک ہونے میں مدد دیتا ہے، اور دوسرے یہ کہ اس سے انسان کی نیکیوں میں برکت اور ترقی ہوتی ہے۔ (توضیح القرآن)

''وصل علیھم''۔علماء نے یہاں سے یہ ادب نکالا ہے کہ صدقہ جس کو دیا جائے وہ اور امام جس کی خدمت میں صدقہ تقسیم کے لئے پیش کیا جائے ان دونوں کے لئے صدقہ دینے والے کو دعا دینا مستحب ہے، بلکہ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ امام جو اپنے لئے صدقہ نہیں لیتا بلکہ تقسیم صدقات کا صرف امین و منتظم ہے، جب وہ دعائے خیر پر مامور ہوا تو مسکین ومحتاج تو بدرجہ اولی دعائے خیر وادائے شکر پر مامور ہوگا۔

فقہاء صوفیہ نے کہا ہے کہ آیت سے بہ قاعدۂ عبارۃ النص ظاہر ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مومنین کے تزکیہ اخلاق وتصفیہ قلوب اور عطائے مقام تسکین ورضا پر مامور تھے اور بہ قاعدۂ اشارۃ النص یہ کہ بزرگوں کی خدمت بہ غرض حصول دعائے خیر کرنی چاہیے۔ یہ بھی کہا ہے کہ رسول کی دعا امت کے حق میں، امام کی رعایا کے حق میں، مشایخ کی شاگردوں اور مریدوں کے حق میں اور بڑوں کی چھوٹوں کے حق میں وعدۂ قبول رکھتی ہے۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت سے متعدد مسائل صوفیہ کا اثبات ہوتا ہے، مثلاً اعتراف ذنوب کی فضیلت، معترف کا قبول عذر، بعض اعمال (مثلاً صدقہ) کی برکات، شیخ کی برکات (جیسا کہ تزکیہ کو آپ ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا) وقس علی ہذا۔

مسجد ضرار:

اس کے بعد منافقوں کی ایک بڑی سازش کا تذکرہ ہے جس کے ذریعے یہ منافق مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ڈالنا چاہتے تھے اور کفر کو فروغ دینا چاہتے تھے، اللہ نے قرآن کریم کی آیات اتار کر اس سازش کو ناکام بنا دیا۔ اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے مدینہ منورہ تشریف لانے سے پہلے ایک شخص ابو عامر مدینہ میں رہتا تھا جو زمانہ جاہلیت میں نصرانی ہوگیا تھا اور راہبانہ زندگی اختیار کر لی تھی، مدینہ منورہ میں اس کی بہت عزت تھی، لوگ اس کو سردار کا درجہ دیتے تھے؛ لیکن جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ آپ کے پاس حاضر ہوا اور کچھ اشکالات اور اعتراضات کئے جن کے جواب آپ ﷺ نے مرحمت فرمائے لیکن یہ مطمئن نہیں ہوا اور کہنے لگا کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو وہ مردود اور عزیز واقارب سے دور ہو کر مرے، آپ ﷺ نے فرمایا: آمین۔

اس کے بعد اس کو مسلمانوں سے دشمنی ہوگئی اور غزوہ بدر سے لیکر غزوہ حنین تک کوئی ایسا موقع اس نے ضائع نہیں ہونے دیا جس کے ذریعے وہ مسلمانوں کو تکلیف پہنچا سکے؛ چنانچہ غزوہ بدر کے بعد اس نے کفار کو غزوہ احد کے لئے بھی ابھارا اور میدان احد میں گڑھے بھی کھدوائے جن میں گر کر آپ ﷺ زخمی ہوئے اور آپ کے دندان مبارک شہید ہوئے اور اس کی سازشوں سے بعد کے بھی غزوات پیش آئے۔ غزوہ حنین کے بعد یہ شام چلا گیا اور وہاں سے مدینہ منورہ کے منافقین کے نام خط لکھا اور پھر ان کے ساتھ مل کر ایک سازش تیار کی، جس میں اس نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ تم ایک عمارت مسجد کے نام سے بناؤ جو بغاوت کے مرکز کے طور پر استعمال ہو اور سیدھے سادھے مسلمانوں کو جب وہ نماز کے لئے مسجد میں آئیں تو بہکایا جا سکے، چنانچہ ان منافقین نے قباء کے علاقے میں یہ عمارت بنائی اور آنحضرت ﷺ سے یہ درخواست

کی کہ بہت سے کمزور لوگوں کو مسجد قباء دور پڑتی ہے اس لئے ان کی آسانی کی خاطر یہ مسجد ہم نے بنائی ہے، آپ ﷺ تشریف لاکر نماز پڑھا دیں تا کہ اس میں برکت حاصل ہو، آپ ﷺ اس وقت تبوک جانے کی تیاری فرما رہے تھے، اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اللہ نے چاہا تو واپسی پر نماز پڑھ لوں گا؛ لیکن جب آپ تبوک سے واپس تشریف لائے تو مدینہ منورہ سے کچھ پہلے ذُواَوان کے مقام پر یہ آیتیں نازل ہوئیں جن میں آپ ﷺ پر اس نام نہاد مسجد کی حقیقت کھول دی گئی اور اس میں نماز پڑھنے سے آپ ﷺ کو منع فرما دیا گیا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے وہیں سے دو صحابیوں مالک بن خشعم اور معن بن عدی رضی اللہ عنہما کو بھیجا کہ وہ اس عمارت کو تباہ کر دیں، چنانچہ ان حضرات نے اس کو جلا کر خاک کر دیا۔ اللہ تعالی نے اس کا نام مسجد ضرار رکھا ہے اور اس کے بالمقابل مسجد قباء کی تعریف فرمائی جس کی تعمیر آپ ﷺ نے فرمائی تھی اور جس کو اسلام کی سب سے پہلی باقاعدہ مسجد ہونے کا شرف حاصل ہے، اس مسجد کی فضیلت یہ بتائی ہے کہ اس میں نماز پڑھنے والے پاکی اور صفائی کا خاص خیال رکھتے ہیں، اس میں جسم کی ظاہری پاکی بھی داخل ہے اور اعمال واخلاق کی پاکی اور صفائی بھی۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ .... الیٰ.......وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴿۱۰۸﴾

اور کچھ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد اس کام کے لیے بنائی ہے کہ (مسلمانوں کو) نقصان پہنچائیں، کافرانہ باتیں کریں، مومنوں میں پھوٹ ڈالیں اور اس شخص کو ایک اڈہ فراہم کریں جس کی پہلے سے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ ہے اور یہ قسمیں ضرور کھالیں گے کہ بھلائی کے سوا ہماری کوئی اور نیت نہیں ہے، لیکن اللہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ (۱۰۷) (اے پیغمبر) تم اس (نام نہاد مسجد) میں کبھی (نماز کے لیے) کھڑے مت ہونا۔ البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقوی پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ حق دار ہے کہ تم اس میں کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک صاف ہونے کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ پاک صاف لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ (۱۰۸)

حضور ﷺ نے ان لوگوں سے دریافت کیا کہ تم کونسا عمل کرتے ہو، جس کی وجہ سے اللہ نے تمہاری تعریف کی ہے، تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم طہارت کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ استنجا پاک کرنے کے لیے ہم پہلے ڈھیلے استعمال کرتے ہیں اور پھر پانی۔

اہل ایمان کی صفات:

مسجد ضرار کے مقابلے میں مسجد قبا اور اہل نفاق کے مقابلے میں ان اہل ایمان کا تذکرہ ہے جو اپنے مال اور اپنی جانیں حصول جنت کے لیے اللہ کی راہ میں وقف کر چکے ہیں، ان اہل ایمان کی تو ایسی صفات ذکر کی گئی ہیں جو ہر مومن کو

اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ ...... الیٰ...... وَالۡحٰفِظُوۡنَ لِحُدُوۡدِ اللّٰہِ ؕ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۱۲﴾

واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اوران کے مال اس بات کے بدلے خرید لیے ہیں کہ جنت انہی کی ہے۔ وہ اللہ کے راستے میں جنگ کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں مارتے بھی ہیں، اورمرتے بھی ہیں۔ یہ ایک سچا وعدہ ہے جس کی ذمہ داری اللہ نے تورات اورانجیل میں بھی لی ہے، اورقرآن میں بھی۔ اورکون ہے جواللہ سے زیادہ اپنے عہدکو پورا کرنے والا ہو؟ لہٰذا اپنے اس سودے پر خوشی مناؤ جوتم نے اللہ سے کرلیا ہے۔ اور یہی بڑی زبردست کامیابی ہے ۔(۱۱۱) (جنہوں نے یہ کامیاب سودا کیا ہے وہ کون ہیں؟) توبہ کرنے والے! اللہ کی بندگی کرنے والے! اس کی حمد کرنے والے! روزے رکھنے والے! رکوع میں جھکنے والے! سجدے میں گرنے والے! نیکی کی تلقین کرنے والے، اور برائی سے روکنے والے، اور اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں کی حفاظت کرنے والے، (اے پیغمبر) ایسے مومنوں کوخوشخبری دے دو۔(۱۱۲)

مشرک کے لئے استغفار کی ممانعت:

جس طرح زندگی میں کفار اورمشرکین سے براءت اور بیزاری ایمان کے لوازمات سے ہے، اسی طرح ان کے مرنے کے بعدان سے تبری اور بیزاری ایمان کےلوازم میں سے ہے کہ مرنے کے بعدنہ کافرکا جنازہ پڑھنا جائز ہےاورنہ اس کی قبر پر کھڑا ہونا جائز ہے اورنہ اس کے لیے دعاءمغفرت جائز ہے، اگرچہ وہ مسلمانوں کے رشتہ دارہی کیوں نہ ہوں **كما قال الله تعالیٰ: ان الله لا يغفر ان يشرك به ويغفر مادون ذلك لمن يشاء**۔ خلاصہ یہ ہے کہ مردہ کافروں سے براءت اور بیزاری کاحکم ہے، اہل ایمان کے لیے جائزنہیں کہ وہ مشرکوں اورکافروں کے لیےان کے مرنے کے بعد دعاء مغفرت کریں اگرچہ وہ ان کےقریبی رشتہ دارہی کیوں نہ ہوں، بعداس کے کہ ان پر یہ ظاہر ہوگیا کہ یہ مشرک دوزخ والے ہیں، کفرکا ٹھکانہ ہی دوزخ ہے۔ (تفسیرادریسی: ۳/۵۲۷)

صحیح بخاری ومسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ابوطالب نے اگرچہ آپ کی بڑی مددکی تھی لیکن انہوں نے آخروقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا، جب ان کی وفات کا وقت آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ترغیب دی کہ وہ کلمہ پڑھ کرمسلمان ہوجائیں، مگراس وقت ابوجہل وغیرہ نےمخالفت کی اوروہ مسلمان نہیں ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت فرمایا کہ میں آپ کے لئے اس وقت تک استغفار کرتا رہوں گا جب تک مجھے اس سے منع نہ کردیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ يَّسۡتَغۡفِرُوۡا لِلۡمُشۡرِكِيۡنَ وَلَوۡ كَانُوۡۤا اُولِىۡ قُرۡبٰى مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمۡ

أَنَّهُمْ أَصْحَٰبُ ٱلْجَحِيمِ ﴿١١٣﴾

یہ بات نہ تو نبی کو زیب دیتی ہے اور نہ دوسرے مومنوں کو کہ وہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا کریں، چاہے وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ ان پر یہ بات پوری طرح واضح ہوچکی ہے کہ وہ دوزخی لوگ ہیں۔(۱۱۳)

اس کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے لئے استغفار کرنے سے روک دیا گیا۔اسی طرح بعض مسلمانوں نے بھی اپنے مشرک باپ داداؤں کے لئے استغفار کرنے کا ارادہ کیا تھا ان سب کو بھی منع کر دیا گیا۔اس سے علمائے کرام نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کسی کافر کے لئے اس کی زندگی میں اس نیت کے ساتھ دعا کرنا کہ وہ مسلمان ہوجائے اور اس کی مغفرت ہو جائے جائز ہے،لیکن اگر کسی شخص کے بارے میں یہ یقین ہو کہ اس کی موت کفر پر ہوئی ہے تو اس کے لئے مغفرت کی دعا کرنا جائز نہیں ہے۔(خلاصہ مضامین قرآن کریم)

ابراہیمؑ کی اپنے باپ کے لیے دعا:

مذکورہ آیت سے ذہن فوراً حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی طرف جاتا ہے کہ انہوں نے بھی تو اپنے مشرک باپ کے لیے بخشش کی دعا کی تھی، بلکہ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے اس عمل کی بنا پر بعض مسلمان بھی اپنے مشرک قرابت داروں کے لیے دعائے مغفرت کرتے تھے۔اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ابراہیمؑ نے اپنے والد کو بتوں کی پرستش سے روکنے کی ہر چند کوشش کی، اسے سمجھایا کہ تم ان بتوں کی پوجا کیوں کرتے ہو جو نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں اور نہ تمہیں کچھ فائدہ پہنچاتے ہیں۔اس کے جواب میں باپ نے ابراہیمؑ کو دھکے دیکر گھر سے نکال دیا۔ابراہیمؑ نے فرمایا، اچھا تم تو میری بات نہیں مانتے مگر" **ساستغفر لک ربی انه کان بی حفیا** (مریم) میں تمہارے لیے اپنے پروردگار سے بخشش کی دعا کروں گا کیونکہ میرا پروردگار میرے ساتھ بڑا ہی مہربان ہے۔ابراہیمؑ کی اپنے باپ کے حق میں دعا اسی وعدے کے مطابق تھی جس کو اللہ نے بیان فرمایا ہے" **وما کان استغفار ابراهیم لابیه الا عن موعدة وعدها ایاه** "یعنی ابراہیمؑ کی اپنے باپ کے لیے دعا مغفرت ایک وعدے کی بناء پر تھی۔" **فلما تبین له انه عدو لله تبرا منه** " مگر جب انہیں واضح ہوگیا کہ ان کا باپ دشمن خدا ہے تو آپ اس سے بیزار ہوگئے یا استغفار کرنے سے بری ہوگئے۔(معالم العرفان:۹/ ۵۶۵)

پچاس دن تک بائیکاٹ:

غزوۂ تبوک میں شرکت سے جو لوگ محروم رہ گئے تھے وہ دس صحابہ تھے،جن میں سے سات کا واقعہ بیان ہو چکا، اب باقی ان میں تین ایسے مخلص مسلمان بھی تھے جن کے اخلاص اور ایمان میں کسی کو شک نہیں تھا،یعنی حضرت کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

ان تینوں نے کوئی عذر نہیں تراشا بلکہ صاف صاف اعتراف کرلیا کہ پیچھے رہ جانے میں سراسر ہماری اپنی غلطی، سستی اور کاملی کو دخل تھا، ان کے معاملہ کو الگ رکھا گیا تھا، یہاں تک کہ پچاس دن تک ان کا بائیکاٹ بھی کیا گیا۔

قبول توبہ کا اعلان بذریعہ وحی:

لیکن پھر انہیں سچ بولنے کی وجہ سے ایسا نوازا گیا کہ ان کی توبہ کی قبولیت کا اعلان وحی کے ذریعے سے کیا گیا، یہ اعلان ان کے لیے اتنی بڑی بشارت تھا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن مالک سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''جب سے تمہیں تمہاری والدہ نے جنا ہے آج سے زیادہ بہتر اور مبارک دن تم پر نہیں آیا۔'' ان حضرات کی قبول توبہ کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ......... الی...... اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے رحمت کی نظر فرمائی ہے نبی پر اور ان مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے ایسی مشکل کی گھڑی میں نبی کا ساتھ دیا، جبکہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل ڈگمگا جائیں، پھر اللہ نے ان کے حال پر توجہ فرمائی، یقیناً وہ ان کے لیے بہت شفیق، بڑا مہربان ہے۔(۱۱۷) اور ان تینوں پر بھی (اللہ نے رحمت کی نظر فرمائی ہے) جن کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا تھا، یہاں تک کہ جب ان پر یہ زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود تنگ ہوگئی، ان کی زندگیاں ان پر دوبھر ہوگئیں، اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ (کی پکڑ) سے خود اسی کی پناہ میں آئے بغیر کہیں اور پناہ نہیں مل سکتی، تو پھر اللہ نے ان پر رحم فرمایا، تاکہ وہ آئندہ اللہ ہی سے رجوع کیا کریں۔ یقین جانو اللہ بہت معاف کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (۱۱۸)

فوائد ضروریہ:

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے دونوں ساتھیوں کے واقعہ سے بہت سے فوائد مستنبط ہوتے ہیں۔

(۱) مومن بندوں پر لازم ہے کہ ہمیشہ سچ بولیں، سچی بات کہیں، سچ ہی میں نجات ہے۔ اور جھوٹ میں ہلاکت ہے۔ منافقین نے غزوۂ تبوک کے موقعہ پر جھوٹے عذر پیش کر کے دنیا میں جانیں چھڑا لیں لیکن آخرت کا عذاب اپنے سر لے لیا اور مخلصین مومنین نے سچ بولا اور سچی توبہ کی۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ان کی توبہ قبول فرمانے کا اعلان فرما دیا؛ اگر کوئی شخص اپنے اکابر سے اور متعلقین سے جھوٹ بولے، چند دن ممکن ہے کہ اس کا جھوٹ چل جائے لیکن پھر اس کی پول کھل ہی جاتی ہے۔ اور ذلت کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

(۲) امیر المومنین اگر مناسب جانے تو بعض افراد کے بارے میں مقاطعہ کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ عامۃ المسلمین کو حکم دے سکتا ہے کہ فلاں فلاں شخص سے سلام کلام بند رکھیں۔ جب وہ صحیح راہ پر آ جائے تو مقاطعہ ختم کر دیا جائے۔

(۳) بعض مرتبہ ابتلاء پر ابتلا ہو جاتا ہے۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناراضگی میں اور مقاطعہ کی مصیبت میں مبتلا تو تھے ہی، اوپر سے شاہ غسان کا یہ خط ملا کہ تم ہمارے پاس آ جاؤ تو ہم تمہاری قدر دانی کریں گے، اللہ

تعالیٰ نے انہیں ایمان پر استقامت بخشی اور انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضامندی ہی کو سامنے رکھا اور بادشاہ کے خط کو تنور میں جھونک دیا، اگر وہ اس وقت اپنے عزائم میں کچے پڑ جاتے اور شاہ غسان کی طرف چلے جاتے تو اس وقت کی ظاہری مصیبت بظاہر دور ہو جاتی؛ لیکن ایمان کی دولت سے محروم ہو کر آخرت برباد ہو جاتی۔ اس قسم کے ابتلاءات اور امتحانات سامنے آتے رہتے ہیں۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے استقامت کی دعا کرے اور استقامت پر رہے۔

(۴) حضرت کعبؓ مقاطعہ کے باوجود مسجد میں حاضر ہوتے رہے، نمازیں پڑھتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں سلام بھی پیش کرتے رہے۔ یہ نہیں سوچا کہ چلو آپ روٹھے ہم چھوٹے، جیسا کہ ان لوگوں کا طریقہ ہوتا ہے جن کا تعلق اصلی نہیں ہوتا۔

(۵) جب اللہ اور اس کے رسول کا حکم آ جائے تو اس کے مقابلہ میں کسی عزیز قریب کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ حضرت قتادہؓ جو حضرت کعب بن مالکؓ کے چچا زاد بھائی اور انہیں سب سے زیادہ محبوب تھے جب انہیں سلام کیا تو جواب نہیں دیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے سلام کلام کی ممانعت تھی۔

(۶) جب آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں تینوں حضرات کی توبہ قبول فرمانے کا ذکر تھا تو حضرات صحابہ نے کعب بن مالکؓ اور ان کے دونوں ساتھیوں کو جلدی سے بشارت دینے کی کوشش کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دینی معاملات میں کسی کو کوئی کامیابی حاصل ہو جائے جس کا اسے علم نہ ہو تو اسے بشارت دینی چاہئے اور اس میں جلدی کرنی چاہئے۔

(۷) پھر جب حضرت کعبؓ توبہ کا اعلان سننے کے بعد اپنے گھر سے نکلے تو حضرات صحابہؓ نے جوق در جوق ان سے ملاقاتیں کیں اور برابر انہیں مبارکبادیاں دیتے رہے، یہ مبارک بادی توبہ قبول ہونے پر تھی، معلوم ہوا کہ دینی امور میں اگر کسی کو کامیابی حاصل ہو جائے تو اسے مبارک بادی دینا چاہئے۔

(۸) جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حضرت کعب پہنچے تو حضرت طلحہ بن عبید اللہ کھڑے ہوئے اور دوڑ کر ان سے مصافحہ کیا اور مبارک بادی دی، اس سے معلوم ہوا کہ زبانی مبارک بادی کے ساتھ عملی طور پر مبارکباد دینا بھی مستحب ہے۔

(۹) آئندہ کے لیے گناہ نہ کرنے کا عہد کرنا اور جو کچھ گناہ کیا ہو اس پر سچے دل سے نادم ہونے سے توبہ قبول ہو جاتی ہے (اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تلافی کرنا بھی لازم ہوتا ہے) لیکن توبہ کو اقرب الی القبول بنانے کے لیے مزید کوئی عمل کرنا مستحب ہے۔ اور توبہ قبول ہونے کے بعد بطور شکر کچھ مال خیرات کرنا بھی مستحب ہے۔ صلاۃ التوبہ جو مشروع ہے اس میں یہی بات ہے کہ توبہ کی قبولیت جلد ہو جائے اور قبول کرانے کے لیے ندامت کے ساتھ کوئی اور عمل بھی شامل ہو جائے۔ حضرت کعب نے توبہ قبول ہو جانے کے بعد جو یہ عرض کیا کہ میں نے اللہ کی رضا کے لیے بطور صدقہ اپنا پورا مال خرچ کرنے کی نیت کی ہے۔ یہ نیت اگر پہلے سے تھی تو صلوٰۃ التوبہ کی طرح ایک عمل ہے اور اگر بعد میں نیت کی تھی تو بطور ادائے شکر تھی۔

(۱۰) حضرت کعب نے عرض کیا کہ میری توبہ کا یہ بھی جز و ہے کہ میں اپنا پورا مال بطور صدقہ خرچ کردوں، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سب خرچ نہ کرو، کچھ مال روک لو۔ اس پر انہوں نے کہا کہ تو میں اپنا خیبر والا حصہ روک لیتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ پورا مال صدقہ کر کے پریشانی میں نہ پڑا جائے۔ البتہ اگر کسی نے پورا مال صدقہ کرنے کی نذر مان لی (جو زبان سے ہوتی ہے) تو اس کو پورا مال صدقہ کرنا واجب ہے، لیکن اس سے بھی یوں کہا جائے گا کہ اپنے اور اپنے بال بچوں کے لیے بقدر ضرورت کچھ روک لے اور آئندہ جب مال تیری ملکیت میں آجائے تو جو مال روک لیا تھا اسی جنس کا مال صدقہ کر دینا تا کہ نذر پر پوری طرح عمل ہو جائے۔ حضرت کعبؓ کے واقعہ میں چونکہ نذر نہیں تھی محض نیت تھی، اس لیے جتنا مال روک لیا تھا۔ اس کے برابر میں صدقہ کرنے کا ذکر حدیث میں نہیں ہے۔

(۱۱) جو شخص جس قدر کسی گناہ سے بچنے کا اہتمام کرنے کا عہد کر لیتا ہے اسے عموماً ایسے مواقع پیش آتے رہتے ہیں، جن میں اس گناہ کے کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ ایک بڑا امتحان ہوتا ہے۔ حضرت کعبؓ نے چونکہ ہمیشہ سچ بولنے کا عہد کر لیا تھا اس لیے اس بارے میں ان کا بار بار امتحان ہوتا رہتا تھا۔ (انوار البیان)

صادقین کی مصاحبت:

ہر شخص کو معاشرت کے لیے، اٹھنے بیٹھنے کے لیے، مسافرت کے لیے اور مصاحبت کے لیے صادقین کی صحبت اختیار کرنا لازم ہے، جیسے ساتھی ہوں گے ویسا ہی خود ہو جائے گا اور یہ ایسی چیز ہے جس کا عموماً مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔ آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ سچوں کے ساتھ ہونے میں تقویٰ کا حکم دینے کے بعد سچوں کے ساتھ ہونے کا حکم دیا۔ اپنے لیے بھی صادقین اور صالحین کی مصاحبت کی فکر کریں اور اپنی اولاد کے لیے بھی اسی کو سوچیں، صادقین کے ساتھ بھی رہیں، ان کی کتابیں بھی پڑھیں۔ کتاب بھی بہترین ساتھی ہے مگر کتاب اچھی ہو۔ اچھائی سکھاتی ہو اور اچھے لوگوں کی لکھی ہوئی ہو۔ (انوار البیان)

يَاۤيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴿۱۱۹﴾

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔ (۱۱۹)

فائدہ:

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان کے بعد تقوی ضروری ہے اور پھر صادقین اور صالحین کی معیت یعنی صحبت بھی ضروری ہے؛ کیونکہ **اتقوا اللہ** کے بعد **وکونوا مع الصدقین** کا حکم دیا جو وجوب اور لزوم کے لیے ہے، کوئی کمال بدون کامل کی صحبت کے حاصل نہیں ہوسکتا، محض مطالعہ کتب کافی نہیں جب تک کسی عالم کی صحبت اور خدمت میں رہ کر علم حاصل نہ کیا جائے، صحابیت کی حقیقت ہی شرف صحبت ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۳/ ۵۳۳)

اہل ایمان کو تاکید:

ان آیات میں متخلفین پر عتاب عام فرمایا ہے کہ جن اہل مدینہ اور اعراب نے اس غزوہ میں آرام طلبی کی بناء پر رسول

کا ساتھ نہیں دیا اور ان خیرات وبرکات سے محروم رہے کہ جو آپ کے رفقاء سفر کو نصیب ہوئیں اور آئندہ کے لیے نصیحت کی کہ مسلمانوں کو یہ سزاوار نہیں کہ جب کوئی موقعہ جاں نثاری کا آئے تو رسول اللہ ﷺ سے علیحدہ ہو جائیں اور اپنی راحت اور حفاظت کو رسول اللہ ﷺ کی حفاظت پر مقدم سمجھیں۔ (تفسیر ادریسی: ۳/ ۵۳۵)

چنانچہ فرماتے ہیں:

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا .... الیٰ.........لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴿۱۲۱﴾

مدینہ کے باشندوں اور ان کے ارد گرد کے دیہات میں رہنے والوں کے لیے یہ جائز نہیں تھا کہ وہ اللہ کے رسول (کا ساتھ دینے سے) پیچھے رہیں، اور نہ یہ جائز تھا کہ وہ بس اپنی جان پیاری سمجھ کر ان کی (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی) جان سے بے فکر ہو بیٹھیں۔ یہ اس لیے کہ ان (مجاہدین) کو جب کبھی اللہ کے راستے میں پیاس لگتی ہے، یا تھکن ہوتی ہے، یا بھوک ستاتی ہے، یا وہ کوئی ایسا قدم اٹھاتے ہیں جو کافروں کو گھٹن میں ڈالے، یا دشمن کے مقابلے میں کوئی کامیابی حاصل کرتے ہیں تو ان کے اعمال نامے میں (ہر ایسے کام کے وقت) ایک نیک عمل ضرور لکھا جاتا ہے۔ یقین جانو کہ اللہ نیک لوگوں کے کسی عمل کو بیکار جانے نہیں دیتا۔ (۱۲۰) نیز وہ جو کچھ (اللہ کے راستے میں) خرچ کرتے ہیں، چاہے وہ خرچ چھوٹا ہو یا بڑا، اور جس کسی وادی کو وہ پار کرتے ہیں، اس سب کو (ان کے اعمال نامے میں نیکی کے طور پر) لکھا جاتا ہے، تاکہ اللہ انہیں (ہر ایسے عمل پر) وہ جزا دے جو ان کے بہترین اعمال کے لیے مقرر ہے۔ (۱۲۱)

اہل ایمان کو چار اہم باتوں کی تاکید کی گئی ہے:

(۱) پہلی یہ کہ وہ خفیہ اور علانیہ تقوی کو لازم پکڑے رکھیں۔

(۲) دوسری یہ کہ وہ اہل نفاق سے دور رہتے ہوئے صرف سچوں کی صحبت اختیار کریں۔

(۳) تیسری یہ کہ وہ رزق کی تنگی اور کشادگی میں اللہ کے رسول کو اپنے اوپر ترجیح دیں۔

(۴) چوتھی بات حقیقت میں اللہ کی طرف سے وعدہ ہے کہ ہر قسم کی عبادت اور اطاعت کا اللہ کی طرف سے اجر مل کر رہے گا اور یہ کہ اللہ کے دین کے لیے جس قدر مشقت اٹھائی جائے گی اتنا ہی اجر وثواب عطا ہوگا۔

حصول علم اور جہاد سے استثناء:

جب جہاد سے تخلف پر ملامت کی گئی اس سے بعض مسلمانوں کو یہ شبہ ہوا کہ ہر جہاد میں مسلمانوں پر نفیر یعنی خروج فرض عین ہے، اس لیے یہ بتلایا کہ ہر جہاد میں جانا فرض عین نہیں بلکہ فرض علی الکفایہ ہے اور یہ بتلاتے ہیں کہ جس طرح جہاد فرض علی الکفایہ ہے اسی طرح تفقہ فی الدین یعنی تحصیل علم دین بھی فرض کفایہ ہے، جب کوئی لشکر جہاد کے لیے روانہ ہو اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہر میں مقیم ہوں تو ایک جماعت کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس موجود رہنا ضروری ہے، تاکہ وہ آں

حضرت ﷺ کی خدمت بابرکت میں رہ کر تفقہ فی الدین حاصل کریں یعنی دین سیکھیں، تاکہ مجاہدین کا لشکر جب جہاد سے واپس آئے تو اس عرصہ میں جو دین سیکھا ہے اس سے ان کو آگاہ کریں۔ (تفسیر ادریسی: ۳/ ۵۳)

چنانچہ فرماتے ہیں:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ .... الی........لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴿۱۲۲﴾

اور مسلمانوں کے لیے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ وہ (ہمیشہ) سب کے سب (جہاد کے لیے) نکل کھڑے ہوں؛ لہذا ایسا کیوں نہ ہو کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک گروہ (جہاد کے لیے) نکلا کرے، تاکہ (جو لوگ جہاد میں نہ گئے ہوں وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے لیے محنت کریں، اور جب ان کی قوم کے لوگ (جو جہاد میں گئے ہیں) ان کے پاس واپس آئیں تو یہ ان کو متنبہ کریں، تاکہ وہ (گناہوں سے) بچ کر رہیں۔ (۱۲۲)

جہاد کی فضیلت اور اہمیت کے باوجود حکم دیا گیا ہے کہ سارے ہی مسلمانوں کو جہاد میں نہیں چلے جانا چاہیے؛ بلکہ کچھ لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود رہنا چاہیے۔ تاکہ آپ سے دین کی سمجھ حاصل کریں۔

اسلامی مملکت کی ضروریات:

اسلام کو اپنی دعوت کی ابتدا میں جیسے دشمنوں کی طاقت توڑنے کے لیے جہاد کی ضرورت تھی یونہی ان بنیادوں کی بھی ضرورت تھی جن پر اسلامی مملکت کی عمارت کھڑی کی جاسکے، اس مقصد کے لیے شرعی احکام کے نزول کا سلسلہ مستقل جاری تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے افراد کی تیاری میں ہمہ تن مصروف تھے جو مستقبل کے مدرس، مربی، معلم، قاضی، حاکم، عامل اور منتظم بن سکیں، اس لیے حکم دیا گیا کہ مسلمانوں کی معتدبہ تعداد کو مدینہ میں ہی رہنا چاہیے تاکہ وہ دین کی سمجھ حاصل کرسکیں۔

دین کی سمجھ:

اسلامی مملکت کی ضروریات سے قطع نظر فی ذاتہ بھی علم دین حاصل کرنا بہت بڑا عمل ہے، اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس کے ساتھ اللہ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرمادیتا ہے۔

فقیہ اور شیطان:

یہ بھی آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے کہ: ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ بھاری ثابت ہوتا ہے۔

جہاد کا اہم اصول:

اس سورت کے آغاز میں مشرکین سے براءت کا جو اعلان کیا گیا تھا اس میں ہر مسلمان کا یہ فرض تھا کہ وہ ان مشرکین سے جنگ کے لئے تیار رہے، جو اس اعلان براءت پر عمل نہ کریں، جیسا کے شروع میں عرض کیا گیا، وہ نومسلم جو فتح مکہ کے

بعد مسلمان ہوئے تھے ان کے دل میں اپنے مشرک رشتہ داروں کے لئے نرم گوشہ ہوسکتا تھا، لہذا آخر سورت میں انہیں دوبارہ متوجہ کیا جارہا ہے کہ جس طرح اسلام کی تبلیغ میں ترتیب یہ ہونی چاہئے کہ انسان اپنے قریبی لوگوں سے ان کا آغاز کرے، اسی طرح جب جنگ کی نوبت آجائے تو اس میں بھی یہی ترتیب ہونی چاہئے کہ پہلے ان لوگوں سے جنگ ہونی چاہئے جو تمہارے قریب ہیں، ان کے بعد دوسروں کا نمبر آئے گا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا قَاتِلُوا الَّذِيۡنَ يَلُوۡنَكُمۡ مِّنَ الۡكُفَّارِ وَلۡيَجِدُوۡا فِيۡكُمۡ غِلۡظَةً ؕ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ۝۱۲۳

اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑو جو تم سے قریب ہیں۔ اور ہونا یہ چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی محسوس کریں۔ اور یقین رکھو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

جہاد کے لیے ایک اہم اصول یہ بتایا گیا ہے کہ الاقرب فالاقرب کے ضابطہ کے تحت جہاد کیا جائے، یعنی قریب کے کفار سے جہاد کرتے ہوئے اس کا دائرہ دور تک وسیع کیا جائے۔

نکتہ:

حضرات صوفیہ فرماتے ہیں کہ مومن کا قریبی دشمن اس کا نفس امارہ ہے۔ جو کفران نعمت میں سب سے آگے ہے اور تمام دشمنوں میں سب سے زیادہ یہی قریب ہے، اس لیے نفس امارہ سے جہاد وقتال جہاد اکبر ہے۔

فکر وعمل کی نجاست:

سورۂ توبہ کی آخری آیات میں دوبارہ منافقین کی مذمت کی گئی ہے کہ ان حرماں نصیبوں کو قرآن سے بھی کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ فکر وعمل کے اعتبار سے ان کی نجاست ہی میں اضافہ ہوتا ہے۔

رؤوف، رحیم:

اور اس سورت کی آخری آیت میں اللہ نے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف بیان فرمائی ہے اور آپ کے لیے اپنے اسمائے حسنیٰ میں سے دونام منتخب فرمائے ہیں یعنی رؤوف اور رحیم۔

لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ۝۱۲۸

(لوگو) تمہارے پاس ایک ایسا رسول آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے، جس کو تمہاری ہر تکلیف بہت گراں معلوم ہوتی ہے، جسے تمہاری بھلائی کی دھن لگی ہوئی ہے، جو مومنوں کے لیے انتہائی شفیق، نہایت مہربان ہے۔ (۱۲۸)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے اپنے ناموں میں سے یہ دونام آپ کے سوا کسی کے لیے بھی جمع نہیں فرمائے۔

خلاصہ رکوع : ۱۳......اقسام منافقین ۔(۱) نا قابل معافی کیونکہ ان میں نفاق اعتقادی ہے، اوران کا نصب العین افتراق بین المسلمین ہے۔ (۲) قابل معافی ان میں نفاق عادی ہے، اعتقادی نہیں ۔ ماخذ : (۱) آیت :۱۰۱۔ (۲) آیت : ۱۰۲،۱۰۶۔

خلاصہ رکوع : ۱۴......(۱) مخلص مؤمنوں کا مسلک ۔(۲) اور قابل معافی حضرات کا مخلصین سے الحاق، منافقین کے بعداب مخلصین کا مسلک واضح کیا جاتا ہے۔ ماخذ : (۱) آیت :۱۱۱، ۱۱۲۔ (۲) آیت :۱۱۸۔

خلاصہ رکوع : ۱۵......انسداد تخلف کے لئے اشاعت تعلیم ۔ ماخذ : آیت : ۱۲۲۔

خلاصہ رکوع : ۱۶......طریق جنگ کی تعلیم ۔ ماخذ : آیت : ۱۲۳۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ یونس

تعارف:

یہ سورت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھی۔ البتہ بعض مفسرین نے اس کو تین آیتوں (آیت نمبر ۴۰ ،۹۴اور ۹۵) کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی تھیں ۔لیکن اس کا کوئی یقینی ثبوت موجود نہیں ہے۔

وجہ تسمیہ:

سورت کا نام حضرت یونس (علیہ السلام) کے نام پر رکھا گیا ہے جن کا حوالہ آیت نمبر ۹۸ میں آیا ہے۔ مکہ مکرمہ میں سب سے اہم مسئلہ اسلام کے بنیادی عقائد کو ثابت کرنا تھا، اس لئے اکثر مکی سورتوں میں بنیادی زور توحید، رسالت اور آخرت کے مضامین پر دیا گیا ہے۔ اس سورت کے بھی مرکزی موضوعات یہی ہیں ۔ اس کے ساتھ اسلام پر مشرکین عرب کے اعتراضات کے جواب دیئے گئے ہیں اور ان کے غلط طرز عمل کی مذمت کی گئی ہے، اورانہیں تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر انہوں نے اپنی ضد جاری رکھی تو دنیا اور آخرت دونوں میں ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آسکتا ہے۔ اسی سلسلہ میں پچھلے انبیائے کرام میں سے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی مخالفت کے نتیجے میں فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ اور حضرت نوح اور حضرت یونس (علیہما السلام) کے واقعات اختصار کے ساتھ بیان فرمائے گئے ہیں ۔ ان میں کافروں کے لئے تو یہ کہ انہوں نے پیغمبر کی مخالفت میں جو رویہ اختیار کیا ہوا ہے، اس کے نتیجے میں ان کا انجام بھی ایسا ہی ہوسکتا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے یہ تسلی کا سامان بھی ہے کہ ان ساری مخالفتوں کے باوجود آخری انجام ان شاء اللہ انہی کے حق میں ہوگا۔ (توضیح القرآن)

جوسورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں ان میں زیادہ تر احکام ومسائل ہیں، اور جو مکہ میں نازل ہوئیں، ان میں توحید، نبوت ورسالت، حشر ونشر کا بیان ہے اور کفار ومنافقین کا رد ہے۔ یہ سورت مکی ہے اس لئے اس میں بھی اصول دین کا بیان ہے۔

مشرکین مکہ کہتے تھے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے نام سے جو کلام لوگوں کو سنا رہے ہیں وہ محض زبان کی جادوگری ہے، کچھ شاعرانہ تخیلات ہیں اور کچھ کاہنوں کی طرح عالم بالا کی باتیں ہیں، مشرکین کو ان کے ان غلط اور باطل خیالات کا جواب دیا جاتا ہے کہ تم جو سمجھ رہے ہو وہ صحیح نہیں ہے۔ یہ اللہ کا نازل کیا ہوا کلام ہے، اگر تم اس کی طرف توجہ نہ کروگے تو حکمت ودانائی سے بھی محروم ہو جاؤ گے اور اس دنیا کی ذلت ورسوائی بھی تمہارا مقدر بنے گی جس میں سب کو ایک دن جانا ہے۔

توحید، ربوبیت اور حیات اخروی کے بارے میں ایسے دلائل جو ان لوگوں کے لئے طمانیت اور عقل وضمیر کا سکون بخش سکتے ہیں جن میں جہالت اور تعصب کی بو نہیں ہے۔ ان غلط فہمیوں کا ازالہ جو لوگوں کو توحید اور آخرت کا عقیدہ تسلیم کرنے میں مانع ہو رہے ہیں۔

دنیوی زندگی کے بعد آخرت کی زندگی میں جو پیش آنے والا ہے، اس کی پیشگی خبر تا کہ انسان عبرت وموعظت حاصل کر کے اپنے عمل کو درست کرے اور مستقبل میں پچھتانے سے محفوظ رہے۔

اللہ تعالیٰ سرکش لوگوں کو اس دنیا میں جو ڈھیل اور مہلت دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی اپنے بندوں پر رحمت ومغفرت کرنے میں بہت جلدی کرتے ہیں؛ لیکن ان کے گناہوں اور کوتاہیوں پر ان کی پکڑ لمبی مہلت اور ڈھیل کے بعد کرتے ہیں۔ گنہگار اور سرکش لوگوں کو اللہ تعالی ڈھیل دیتے رہتے ہیں، جب کوئی عذر اور گنجائش باقی نہیں رہتی تب ان کی گرفت کرتے ہیں۔ اگر مہلت دیئے بغیر اللہ تعالی لوگوں سے دار وگیر شروع کر دیں تو بہت کم لوگ ان کی پکڑ سے بچ سکیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ اجمال واختصار کے ساتھ اور حضرت موسی علیہ السلام کا قصہ قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا، جس سے چار امور کی نشاندہی مقصود ہے۔

اول یہ کہ: تم لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ سلم کے ساتھ جو معاملہ کر رہے ہو وہ اس سے ملتا جلتا ہے جو نوح اور موسی علیہما السلام کی قوموں نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ ان کا جو انجام ہوا تھا وہی تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تم آج بے کسی اور کمزوری کی حالت میں دیکھ رہے ہو، اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ وہ اور ان کے ساتھی ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے۔ ان کی پشت پر بھی وہی خدا ہے جو موسیٰؑ و ہارونؑ کی پشت پر تھا اور وہ ایسے طریقہ سے صورت حال بدلتا ہے کہ لوگ اس کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ: راہ راست پر آنے کے لئے خدا تم کو جو مہلت دے رہا ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ اگر تم نے یہ موقع ضائع کر دیا تو فرعون کا سا انجام ہوگا۔ چوتھے یہ کہ جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہیں وہ مخالفوں کے مقابلے میں اپنی حالیہ کمزوری اور بے سروسامانی سے مایوس نہ ہوں۔

یہ کتاب (قرآن) برحق ہے۔ جو اس کی پیروی کرے گا وہ کامیاب وکامران ہوگا اور جو اس پیغام حق سے روگردانی کرے گا وہ اللہ کے قہر وغضب کا نشانہ بنے گا۔ (قرآن ایک نظر میں)

سورت کا موضوع:

اس سورت میں ایمان کے بنیادی ارکان اور عقائد اور بالخصوص قرآن کریم سے بحث کی گئی ہے۔

سورۂ یونس قرآن کریم کی دسویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اکیاون (۵۱) نمبر پر ہے، اس سورۃ میں کل رکوع ۱۱، تعداد آیات ۱۰۹، کلمات ۱۸۶۱ حروف ۷۷۳۳ ہے۔

ربط:

سورۂ یونس کا سورۂ توبہ کے ساتھ ربط یہ ہے کہ پہلے سے توحید و رسالت، حقانیت قرآن اور قیامت کا اثبات کیا جا رہا ہے، بعض تہدیدی قصے بیان فرمائے گئے، اس سورۃ کا حاصل بھی یہی چند مضامین ہیں، اول اثبات توحید، ثانی اثبات رسالت، ثالث اثبات قرآن، رابع اثبات معاد، خامس تہدید، بعض قصص، اور مضمون اول کے ضمن میں ابطال شرک، ثانی کے ضمن میں اس کے متعلق بعض شبہات کا جواب، ثالث کے ضمن میں اس کی تکذیب اور رابع کے ضمن میں جزا و سزا، اور فنا، دنیا کا بیان اور مضمون خامس کے ضمن میں بعض شبہات کا جواب اور آپ کی تسلی مذکور ہے، یہ سب مضامین کفار کے ساتھ محاجہ میں ذکر فرمائے گئے، اس سے پہلی سورۃ میں بھی انہی سے محاجہ تھا، فرق صرف یہ ہے کہ وہاں محاجہ سنانی کا ذکر ہے اور یہاں محاجہ لسانی کا، نیز وہاں کفار کے مختلف فرقوں سے تھا اور یہاں صرف مشرکین سے، چنانچہ آیات میں غور کرنے سے یہ سب امور ظاہر ہو سکتے ہیں، اس بیان سے دونوں سورتوں اور اس سورۃ کے اخیر میں بھی تناسب وارتباط ظاہر ہو گیا۔

شان نزول:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ کی بعثت کے وقت عام طور پر اہل عرب نے انکار کیا کہ اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے شخص کو رسول بنانے سے بلند و بالا ہے (العیاذ باللہ) اس پر آیت ''**اکان للناس عجبا**'' اور ''**وما ارسلنا قبلک الا رجالا**'' آیات نازل ہوئیں، یعنی کفار جو تعجب کرتے ہیں اس پر اللہ پاک فرماتا ہے کہ اس میں تعجب کی کونسی بات ہے کہ پیغمبر انسانوں کی جنس میں سے ہو، اور یہ کون سے تعجب کی بات ہے کہ اگر تمہیں میں سے کسی پر وحی بھیجی گئی اور اسے پیغمبر بنا دیا گیا، اس پر وہ لوگ کہنے لگے کہ اگر انسان ہی کو نبی بنانا تھا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے لوگ زیادہ موزون اور مناسب ہیں۔ اور یوں کہا: ''**وقالوا لولا انزل هذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم**'' یعنی مکہ میں ولید بن مغیرہ اور طائف میں عروہ بن مسعود ثقفی یہ دونوں زیادہ حقدار ہیں نبوت کے، اس کے جواب میں حق تعالی نے فرمایا: ''**اهم یقسمون رحمة ربک**'' کہ کیا وہ اپنے رب کی رحمت کی خود تقسیم کرتے ہیں (جب کہ یہ ہمارا کام ہے) ہم جسے چاہیں نبی بنائیں۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

خلاصۂ سورت:

سورۂ یونس میں اللہ کے سامنے معبودان باطلہ شفاعت کریں گے؛ تین جگہ مذکور ہوا:

(۱) اولاً اجمالاً ''مَا مِنۡ شَفِيۡعٍ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِهٖ ط '' میں کہ آخرت میں جن انبیاءؑ اور صلحاء کو شفاعت کی اجازت ملے گی، صرف وہی شفاعت کریں گے، باقی کسی کو بھی اجازت کے بغیر لب کشائی کی جرأت نہ ہوگی۔

(۲) ''وَيَقُوۡلُوۡنَ هٰٓؤُلَاۤءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰهِ ط '' میں ضمناً مذکور ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام شرکاء سے پاک ہے، جنہیں یہ اللہ کے ہاں شفیع غالب سمجھتے ہیں۔

(۳) ''قُلۡ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ شَكٍّ مِّنۡ دِيۡنِىۡ فَلَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِيۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ '' میں دعوائے سورت مذکور ہوا ہے کہ اگر تم لوگ میرے دین میں شک کرتے ہو تو میں ان معبودوں کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو، ہاں! میں تو صرف اس معبود کی عبادت کرتا ہوں جو تمہاری جان قبض کرتا ہے۔

اس دعوے پر گیارہ دلائل پیش کیے گئے ہیں، دس دلائل عقلیہ اور ایک دلیل وحی۔ (خلاصۂ مضامین قرآن: مولانا منظور یوسف)

نبوت سے مشرکوں کو تعجب

سورت کی ابتدا کتاب اللہ اور رسول اللہ کے ذکر سے ہوتی ہے، بتایا گیا ہے کہ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت سے کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کوئی نئی بات نہیں، بلکہ ہر امت میں کوئی نہ کوئی رسول آتا رہا ہے۔

الٓرٰ قف تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡحَكِيۡمِ ① اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنۡ اَوۡحَيۡنَاۤ ....الی..............قَالَ الۡكٰفِرُوۡنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيۡنٌ ②

الر۔ یہ اس کتاب کی آیتیں ہیں جو حکمت سے بھری ہوئی ہے۔ (۱) کیا لوگوں کے لیے یہ تعجب کی بات ہے کہ ہم نے خود انہی میں کے ایک شخص پر وحی نازل کی ہے کہ: ''لوگوں کو (اللہ کی خلاف ورزی سے) ڈراؤ، اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، ان کو خوشخبری دو کہ ان کے رب کے نزدیک ان کا صحیح معنی میں بڑا پایہ (بڑا مقام) ہے (مگر جب اس نے لوگوں کو یہ پیغام دیا تو) کافروں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادوگر ہے۔ (۲)

مشرکین عرب اپنے سے قدیم تر جاہلی قوموں کی طرح اپنے پیغمبر کے پیام کی اعجازی کیفیت وتاثیر کو بس سحر ہی پر محمول کر سکتے اور یہی کرتے۔ اور آج جاہلیت جدید کے علمبردار بڑے بڑے ''دانایان فرنگ'' بھی اس کے سوا کیا کر رہے ہیں۔ حیرت انگیز، محیر العقول مادی کامیابیوں اور فتح مندیوں سے تو انکار کر ہی نہیں سکتے، بس تعبیر یہ کرنے لگتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) ساری اسکیمیں کسی بڑے ''چالاک دماغ'' کا نتیجہ تھیں۔ (ماجدی: ۳/ ۸)

خالق ومخلوق کے درمیان تعلق:

اس کے بعد ربوبیت، الوہیت اور عبودیت کی حقیقت اور خالق ومخلوق کے درمیان تعلق کی بنیاد بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ جو رب اور خالق ہے وہی معبود بننے کے لائق ہے، کائنات کا یہ سارا نظام اس کی ربوبیت اور قدرت پر گواہ ہے۔

هُوَالَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا .... الیٰ.....فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ۝

اور اللہ وہی ہے جس نے سورج کو سراپا روشنی بنایا، اور چاند کو سراپا نور، اور اس کے (سفر) کے لیے منزلیں مقرر کر دیں، تاکہ تم برسوں کی گنتی اور (مہینوں کا) حساب معلوم کر سکو۔ اللہ نے یہ سب کچھ بغیر کسی صحیح مقصد کے پیدا نہیں کر دیا وہ یہ نشانیاں ان لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتا ہے جو سمجھ رکھتے ہیں۔ (۵) حقیقت یہ ہے کہ رات دن کے آگے پیچھے آنے میں اور اللہ نے آسمانوں اور زمین میں جو کچھ پیدا کیا ہے، اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جن کے دل میں خدا کا خوف ہو۔ (۶)

اس کائنات کے جن حقائق کی طرف قرآن کریم اشارہ فرماتا ہے اس سے دو باتیں ثابت کرنی مقصود ہوتی ہیں، ایک یہ کہ کائنات کا یہ محیر العقول نظام جس میں چاند سورج ایسے نپے تلے حساب کے پابند ہو کر اپنا کام کر رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی نشانی ہے، اس بات کو مشرکین عرب بھی تسلیم کرتے تھے کہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں، قرآن کریم فرماتا ہے کہ جو ذات اتنے عظیم الشان کاموں پر قادر ہو اسے اپنی خدائی میں آخر کسی اور شریک کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے، لہٰذا یہ پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی توحید کی گواہی دیتی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ ساری کائنات بے مقصد پیدا نہیں کی گئی، اگر اس دنیوی زندگی کے بعد آخرت کی ابدی زندگی نہ ہو جس میں نیک لوگوں کو اچھا صلہ اور برے لوگوں کو برائی کا بدلہ نہ ملے تو اس کائنات کی پیدائش بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے، لہٰذا یہی کائنات توحید کے ساتھ ساتھ آخرت کی ضرورت بھی ثابت کرتی ہے۔ (توضیح القرآن)

دو گروہ:

معاد کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کا حال و مآل بیان ہوتا ہے، جو لوگ قیامت کا انکار کرتے ہیں ان کی تہدید ہے اور ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے اخروی نتائج کا بیان ہے اور یہ بتلاتے ہیں کہ جو لوگ آخرت کے منکر ہیں اور حیات فانیہ پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں اور اس کو اپنا مقصود اور مطمح نظر سمجھ بیٹھے اور اس قدر غافل ہیں کہ دلائل قدرت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے وہ شقی اور بد بخت ہیں اور جو لوگ آخرت کو مانتے ہیں اور اس کے لیے تیاری کرتے ہیں وہ سعید اور خوش نصیب ہیں، ان کا عمل ان کے سامنے نور بن کے چلے گا اور جس درجہ کا ایمان ہوگا اسی درجہ کا نور ہوگا، ان آیات میں اولاً منکرین آخرت کا حال اور مآل بیان کیا اور پھر مصدقین آخرت کا حال اور مآل بیان کیا تاکہ خوب فرق واضح ہو جائے۔ (تفسیر ادریسی: ۳/ ۵۶۳)

چنانچہ فرماتے ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا ....وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴿۱۰﴾

جولوگ ہم سے (آخرت میں) آ ملنے کی کوئی توقع ہی نہیں رکھتے، اور دنیوی زندگی میں مگن اور اسی پر مطمئن ہو گئے ہیں، اور جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔(۷) ان کا ٹھکانا اپنے کرتوت کی وجہ سے دوزخ ہے۔(۸) (دوسری طرف) جولوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں، ان کے ایمان کی وجہ سے ان کا پروردگار انہیں اس منزل تک پہنچائے گا کہ نعمتوں سے بھرے باغات میں ان کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔(۹) اس میں (داخلے کے وقت) ان کی پکار یہ ہوگی کہ:'' یا اللہ! تیری ذات ہر عیب سے پاک ہے'' اور ایک دوسرے کے خیر مقدم کے لیے جو لفظ وہ بولیں گے، وہ سلام ہوگا، اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی:'' تمام تعریفیں اللہ کی ہیں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے''۔(۱۰)

انسان کی گمراہی کے اسباب:

(۱) آخرت سے غفلت (۲) فساد پر رضامندی (۳) مادی زندگی پر شاد و شادمان ہو کر آخرت کی طرف سے بالکل ہی بے پرواہونا۔

پہلے تو یہ ہوتا ہے کہ نعمت آخرت کی تمنا وطلب دل سے مٹ جاتی ہے اور پھر یہ ہوجاتا ہے کہ اپنے انجام وفنا کی طرف بھی خیال نہیں جاتا۔ اسی دنیوی زندگی کی دلچسپیوں اور رنگینیوں میں ایسا انہماک ہوجاتا ہے کہ'' اوپر'' کی کھٹک کبھی بھی نہیں پیدا ہوتی، بلکہ جب کوئی اس مستقل زندگی کی یاد دلاتا بھی ہے تو الٹا اسی پر مضحکہ شروع کر دیا جاتا ہے کہ اس بدعقلی کو دیکھو، نقد کو چھوڑ کر ہمیں ادھار کی طرف اور آگے کے بجائے پیچھے کی طرف لیے جارہا ہے، اور سیاسیات ومعاشیات وطبعیات کے زندہ ورنگین مشغلوں سے ہٹا کر ہمیں دینیات کے خشک و بے حاصل مسائل میں پھنسانا چاہتا ہے۔(ماجدی: ۳/ ۱۲)

تکذیب کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کی فطرت میں عجلت ہے، یہاں تک کہ یہ بعض اوقات اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے عذاب اور ہلاکت کی دعائیں مانگتا ہے۔

منکرین نبوت کے ایک شبہ کا جواب:

منکرین نبوت کے ایک شبہ کا جواب دیتے ہیں کہ کفار اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ اگر محمد ﷺ خدا کے سچے نبی ہیں تو ان کی مخالفت کرنے پر عذاب کیوں نہیں آتا اور ہم پر آسمان سے پتھر کیوں نہیں برستے۔ اور ہم ہلاک کیوں نہیں کر دیئے جاتے، لہٰذا حق سبحانہ ان کے اس شبہ کا جواب ارشاد فرماتے ہیں کہ منکرین اور مخالفین پر فوراً عذاب نازل کرنا ہماری حکمت اور رحمت کے خلاف ہے۔ ہم جیسے لوگوں پر رحمت اور نعمت نازل کرنے میں جلدی کرتے ہیں اگر ایسے ہی ان کے ہلاک کرنے میں جلدی کریں تو کام ہی تمام ہوجائے۔ اللہ کی حکمت اور رحمت یہی ہے کہ ان کے ہلاک کرنے میں جلدی نہ کی جائے، ویسے خدا تعالیٰ کو ان کے پکڑنے پر ہر وقت قدرت ہے۔ وہ حلیم بھی ہے اور حکیم بھی ہے۔ شاید سنبھل جائیں۔ اور حق کو قبول کرلیں، یہ اس کا فضل ہے کہ وہ شر کی دعا جلدی قبول نہیں کرتا، نیز اس سے اہل ایمان کو ادب سکھانا ہے کہ شر کے

مانگنے میں جلدی نہ کریں۔(تفسیر ادریسی: ۳/۵۶۵)

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور اگر اللہ (ان کافر) لوگوں کو برائی (یعنی عذاب) کا نشانہ بنانے میں بھی اتنی ہی جلدی کرتا جتنی جلدی وہ اچھائیاں مانگنے میں مچاتے ہیں تو ان کی مہلت تمام کردی گئی ہوتی (لیکن ایسی جلد بازی ہماری حکمت کے خلاف ہے) لہذا جو لوگ ہم سے (آخرت میں) ملنے کی توقع نہیں رکھتے، ہم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں۔(۱۱)

حدیث شریف میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تنگ دل ہوکر اپنے خلاف، اپنی اولاد کے خلاف اور اپنے اموال کے خلاف بددعا نہ کیا کرو، کہیں یہ بددعا اس گھڑی کے موافق نہ ہوجائے جس میں دعا قبول ہوجاتی ہے۔ بعض اوقات ایسے بھی ہیں کہ انسان دعا کرتا ہے تو ضرور قبول ہوجاتی ہے، اسی لیے فرمایا"**لا تدعوا علی انفسکم ولا علی اولادکم ولا اموالکم لا یوافق ساعۃ فیستجاب**''(مسلم شریف) بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بددعا کرنے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ اگر ایسی دعا قبول ہوگئی تو نقصان ہوجائے گا۔

تکذیب کرنے والوں کا حال:

ان جھٹلانے والوں کا حال یہ ہے کہ یہ قرآن کو جھٹلانے اور اس کا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آتے اور اللہ کے نبی سے استہزاء کے طور پر کہتے ہیں کہ

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ .... الیٰ........اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾

اور وہ لوگ جو (آخرت میں) ہم سے آملنے کی توقع نہیں رکھتے، جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں، جبکہ وہ بالکل واضح ہوتی ہیں، تو وہ یہ کہتے ہیں کہ:''یہ نہیں، کوئی اور قرآن لے کرآؤ، یا اس میں تبدیلی کرو''۔ (اے پیغمبر) ان سے کہہ دو کہ:''مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کروں، میں تو کسی اور چیز کی نہیں، صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔ اگر کبھی میں اپنے رب کی نافرمانی کر بیٹھوں تو مجھے ایک زبردست دن کے عذاب کا خوف ہے۔(۱۵) کہہ دو کہ:''اگر اللہ چاہتا تو میں اس قرآن کو تمہارے سامنے نہ پڑھتا، اور نہ اللہ تمہیں اس سے واقف کراتا، آخر اس سے پہلے بھی تو میں ایک عمر تمہارے درمیان بسر کر چکا ہوں۔ کیا پھر بھی تم عقل سے کام نہیں لیتے؟(۱۶)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جواب:

روشن خیالان عرب کی اسی فرمایشی ترمیم کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) اپنی عمر کے ۴۰-۵۰ سال تمہاری آنکھوں کے سامنے گزار چکا ہوں، میرے تدین، راست بازی، صداقت شعاری پر تم سب گواہ ہو، کبھی کسی خفیف معاملہ میں بھی کذب وافتراء سے مجھے کام لیتے تم نے دیکھا یا سنا ہے؟ پھر جب یہ نہیں، تو اتنے بڑے افتراء کی - کہ اپنے کلام کو خدا کا کلام کہہ کر پکاروں - آخر مجھے جرأت ہو ہی کیوں کر سکتی ہے؟ تمہاری عقلیں اس احتمال ہی کو کیسے تسلیم کر رہی ہیں؟

(۲) تمہارے درمیان اپنی عمر کا اتنا بڑا حصہ میں گزار چکا۔ میری ایک ایک خوبی سے تم واقف ہو چکے، میری بولی، میرے انداز کلام کو تم خوب اچھی طرح جان چکے، پہچان چکے، تمہیں قرآن میں اور میرے کلام میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟ میں چاہوں بھی تو قرآن جیسے ممتنع النظیر کلام پر کب قادر ہو سکتا ہوں؟ اب تک میرا کوئی کلام اس ٹکر کا جب نہ ہوا، تو آج کیسے ہوا جا رہا ہے؟

قرآن کا یہ استدلال اپنے کلام الٰہی ہونے پر پورا وزن دار اس وقت بھی تھا۔ پھر جس وقت سے احادیث رسول مدون ہو گئیں اس وقت سے تو اس دلیل میں اور زیادہ جان پڑ گئی ہے، حدیثوں کے چھوٹے بڑے مجموعہ ایک دو نہیں، بیسیوں کی تعداد میں آج سے نہیں صدیوں سے شائع چلے آرہے ہیں، کیا عقل کے اندھوں کو اتنا نظر نہیں آتا کہ جو زبان بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ کی ہے وہ قرآن کی ہے یا ہو سکتی ہے؟ زبان، انداز بیان، اسلوب کلام، نوعیت تراکیب کا اتنا نمایاں و واضح فرق بھی کیا شام، مصر، فلسطین، عراق وغیرہ کے اہل زبان یہود اور نصرانیوں (اور وسیم رضوی جیسے تیاگیوں) کو بھی نہیں سجھائی دیتا؟ (ماجدی: ۳/۱۷)

کہ میں یکا یک جھوٹ بولنا شروع کر دوں یا ایسا معجزانہ کلام تمہارے سامنے پیش کر دوں؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں انسانوں پر تو جھوٹ نہ بولوں اور اللہ پر جھوٹ بولنے کی جرأت کر لوں۔

ابوسفیان اور بادشاہ ہرقل:

آپ ﷺ کی سیرت کی صفائی اور زبان کی صداقت کا یہی وہ پہلو تھا جس کا دشمن بھی اعتراف کرنے پر مجبور تھے، ابوسفیان سے زمانہ کفر میں جب روم کے بادشاہ ہرقل نے سوال کیا تھا کہ کیا دعویٰ نبوت سے پہلے تم نے کبھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹ بولتے ہوئے سنا ہے؟ تو کافر اور مشرک ہونے کے باوجود ابوسفیان بھی اس سوال کا جواب نفی میں دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔

ہرقل نے اس کا جواب سن کر کہا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ تو جھوٹ نہ بولے اور اللہ پر جھوٹ بولنا شروع کر دے۔

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مشرکین نے بچپن سے نزول قرآن کے زمانہ تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مشاہدہ کیا تھا، وہ جانتے تھے کہ آپ نے نہ کسی کتاب کا مطالعہ کیا، نہ کسی استاذ کی شاگردی اختیار کی۔ پھر

چالیس سال گزر گئے تو آپ ﷺ یکا یک ایک عظیم کتاب ان کے پاس لے کر آ گئے جو علم اصول کے نوادر، علم احکام کی باریکیوں، علم اخلاق کے لطائف اور پہلوں کے واقعات کے اسرار پر مشتمل تھی اور جس کی فصاحت و بلاغت کا مقابلہ کرنے سے بڑے بڑے ادیب اور شاعر عاجز آ گئے۔

ہر وہ شخص جسے عقل سلیم عطا کی گئی ہے وہ جانتا ہے کہ یہ سب کچھ وحی کے بغیر نہیں ہوسکتا ہے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

خدائی مہربانی:

مشرکین کی بت پرستی اور توحید کے دلائل ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ ...... الیٰ ...... لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

وہ اللہ ہی تو ہے جو تمہیں خشکی میں بھی اور سمندر میں بھی سفر کراتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہوتے ہو، اور یہ کشتیاں لوگوں کو لے کر خوشگوار ہوا کے ساتھ پانی پر چلتی ہیں اور لوگ اس بات پر مگن ہوتے ہیں، تو اچانک ان کے پاس ایک تیز آندھی آتی ہے اور ہر طرف سے ان پر موجیں اٹھتی ہیں اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ہر طرف سے گھر گئے۔ تو اس وقت وہ خلوص کے ساتھ صرف اللہ پر اعتقاد کر کے صرف اسی کو پکارتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) (یا اللہ!) اگر تو نے ہمیں اس (مصیبت سے) نجات دے دی تو ہم ضرور بالضرور شکر گزار لوگوں میں شامل ہو جائیں گے۔ (۲۲)

امام ابن تیمیہؒ اور بعض مصنفین نے عکرمہؓ ابن ابوجہل کے اسلام لانے کا واقعہ نقل کیا ہے، جس کا تعلق بھی بحری سفر کے ساتھ ہے، ۸ ھ میں جب مکہ فتح ہوا تو عکرمہؓ وہاں سے بھاگ گیا۔ آگے چل کر کشتی میں سوار ہو گیا، یہ کشتی کوئی تیس میل کے قریب گئی ہوگی کہ طوفان میں گھر گئی۔ کشتی کے مسافر لات اور عزیٰ نامی بتوں کی دہائی دینے لگے، مگر ملاحوں نے بتایا کہ اس مشکل موقع پر لات، عزیٰ وغیرہ کام نہیں آئیں گے بلکہ یہ صرف خدا تعالیٰ کو پکارنے کا موقع ہے، اگر اس کی مشیت میں ہوگا تو وہ بچا لے گا۔ یہ سن کر عکرمہؓ کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ دل میں سوچا کہ اسی خدا کو نہ مان کر تو ہم بھاگے ہیں اور اب اسی کو پکاریں۔ اس کی کایا پلٹ گئی اور اسے سمجھ آ گئی کہ جس خدا کو سمندری طوفان میں پکارنا ہے اس کو خشکی پر کیوں نہ پکاریں؛ چنانچہ اس نے دل میں عہد کیا کہ اگر اس طوفان سے بچ گیا تو واپس جا کر محمد ﷺ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا۔ اور یہ واقعہ عکرمہؓ کے ایمان کا سبب بنا۔ (معالم العرفان: ۱۰/۱۰۱)

دنیوی زندگی کی مثال:

دنیا کی بے ثباتی کو مثال کی صورت میں یوں پیش کیا ہے کہ جیسے آسمان سے خوب زور شور کی بارش ہو، ہر قسم کے نباتات کی روئیدگی خوب ہو۔ آدمی کے کھانے کے قابل پھل پھلاری، میوہ، غلہ اور جانوروں کے کھانے کے قابل پتیاں، بھوسہ وغیرہ کی خوب پیداوار ہو، پھر جب ہر طرف سرسبزی و شادابی پھیل جائے، لہلہاتا کھیت، سرسبز درخت، شاداب باغ

ہر طرف پورے زیب وزینت کے ساتھ نظر آنے لگیں اور انسان سمجھنے لگے کہ بس ہم ان تمام لذتوں اور نعمتوں سے لطف اٹھانے کے پوری طرح مالک ومختار ہیں کہ یک بیک حکم الٰہی سے کوئی ایسا آسمانی یا زمینی حادثہ پیش آجائے کہ سارا گل وگلزار تہس نہس ہوکر رہ جائے اور حالت یہ ہوجائے کہ گویا کل یہاں کچھ تھا ہی نہیں! یہ مرقع ہے انسانی زندگی کا کہ بڑے سے بڑے نامور و بااقبال انسان کا بھی خاتمہ دفعۃً موت پر ہوکر رہ جاتا ہے! اور یہ حال ہے دنیا کا جس میں غافل انسان ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔ (ماجدی: ۳/ ۲۴، ۲۵)

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ .... الیٰ............ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ﴿۲۴﴾

دنیوی زندگی کی مثال تو کچھ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا جس کی وجہ سے زمین سے اگنے والی وہ چیزیں خوب گھنی ہوگئیں جو انسان اور مویشی کھاتے ہیں یہاں تک کہ جب زمینوں نے اپنا یہ زیور پہن لیا، اور سنگھار کر کے خوشنما ہوگئی اور اس کے مالک سمجھنے لگے کہ بس اب یہ پوری طرح ان کے قابو میں ہے، تو کسی رات یا دن کے وقت ہمارا حکم آگیا (کہ اس پر کوئی آفت آجائے) اور ہم نے اس کو کٹی ہوئی کھیتی کی سپاٹ زمین میں اس طرح تبدیل کر دیا جیسے کل وہ تھی ہی نہیں، اسی طرح ہم نشانیوں کو ان لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جو غور وفکر سے کام لیتے ہیں۔ (۲۴)

شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے اس مثال کی نہایت لطیف پیرائے میں انسانی زندگی کے ساتھ مطابقت کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جس طرح بادلوں سے پانی نازل ہوکر زمین پر چشمے، دریا، نہریں، کنویں اور سمندر وجود میں آتے ہیں، اسی طرح روح انسانی بھی عالم بالا سے آتی ہے اور خاکی جسم کے ساتھ مل کر قوت پکڑتی ہے، روح اور جسم کے ملاپ سے انسان معرض وجود میں آتا ہے اور پھر یہ انسان بڑے بڑے کام انجام دیتا ہے۔ آدمی تعلیم مکمل کر لیتا ہے، ہنر میں پختہ ہوجاتا ہے، کاروبار اور صنعت وحرفت میں مہارت حاصل کر لیتا ہے، سائنس دان اور انجینئر بن جاتا ہے، اعلیٰ عہدے پر فائز ہوجاتا ہے تو پھر وہ اور اس کے متعلقین اس کی استعداد پر بھروسا کرنے لگتے ہیں کہ اب ہم کامیابی کے قریب پہنچ گئے اور ہمارے دن پھرنے والے ہیں، خوشحالی آنے والی ہے جس کے نتیجہ میں عیش وآرام کی زندگی ملنے والی ہے، تو اچانک اس شخص کو موت آجاتی ہے اور سارا بنا بنایا کھیل یکدم ختم ہوجاتا ہے۔ (معالم العرفان: ۱۰/ ۱۰۸، کشف الرحمٰن، تفسیر عثمانی: ۲۷۹)

اہل جنت وجہنم کا حال:

وَاللّٰهُ یَدْعُوْۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴿۲۵﴾...... الیٰ.......هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴿۲۷﴾

اور اللہ لوگوں کو سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے تک پہنچا دیتا ہے (۲۵) جن لوگوں نے بہتر کام کیے ہیں، بہترین حالت انہی کے لیے ہے اور اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی، نیز ان کے

چہروں پر نہ کبھی سیاہی چھائے گی، نہ ذلت۔ وہ جنت کے باسی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔(۲۶) رہے وہ لوگ جنہوں نے برائیاں کمائی ہیں تو (ان کی) برائی کا بدلہ اسی جیسا برا ہوگا اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی، اللہ (کے عذاب) سے انہیں کوئی بچانے والا نہیں ہوگا۔ ایسا لگے گا جیسے ان کے چہروں پر اندھیری رات کی تہیں چڑھا دی گئی ہیں۔ وہ دوزخ کے باسی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔(۲۷)

مشرکین سے سوال:

پھر تلقین کے انداز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ آپ ان سے سوال کریں:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ ...... الی...... فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ۝۳۲

(اے پیغمبر! ان مشرکوں سے) کہو کہ: ''کون ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے؟ یا بھلا کون ہے جو سننے اور دیکھنے کی قوتوں کا مالک ہے؟ اور کون ہے جو جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے باہر نکال لاتا ہے؟ اور کون ہے جو ہر کام کا انتظام کرتا ہے؟ تو یہ لوگ کہیں گے کہ: اللہ! تو تم ان سے کہو: '' کیا پھر بھی تم اللہ سے نہیں ڈرتے؟ (۳۱) پھر تو لوگو! وہی اللہ ہے جو تمہارا مالک برحق ہے، پھر حق واضح ہو جانے کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ اس کے باوجود تمہیں کوئی کہاں الٹ لئے جا رہا ہے۔(۳۲)

عرب کے مشرکین یہ مانتے تھے کہ ساری کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، لیکن ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس نے بیشتر اختیارات مختلف دیوتاؤں کو سونپ دیئے ہیں جو خدائی میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ہیں، اور اب ان کو راضی رکھنے کے لیے ان کی عبادت کرنی چاہئے۔ اس لیے یہ آیت کریمہ ان پر یہ حقیقت واضح کر رہی ہے کہ جب تم خود مانتے ہو کہ یہ سارے کام اللہ تعالیٰ کرتا ہے تو پھر کسی اور کی عبادت کرنا کیسی بے عقلی کی بات ہے۔

اہل شرک سے مطالبہ:

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ .... الی........ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ۝۳۶

کہو کہ: جن کو تم اللہ کے ساتھ شریک مانتے ہو، کیا ان میں کوئی ایسا ہے جو تمہیں حق کا راستہ دکھائے؟ کہو کہ: اللہ حق کا راستہ دکھاتا ہے، اب بتاؤ کہ جو حق کا راستہ دکھاتا ہو کیا وہ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کی بات مانی جائے، یا وہ (زیادہ حق دار ہے) جس کو خود اس وقت تک راستہ نہ سوجھے جب تک کوئی دوسرا اس کی رہنمائی نہ کرے؟ بھلا تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ تم کس طرح کی باتیں طے کر لیتے ہو؟ (۳۵) اور (حقیقت یہ ہے کہ) ان (مشرکین) میں سے اکثر لوگ کسی اور چیز کے نہیں، صرف وہمی اندازے کے پیچھے چلتے ہیں، اور یہ یقینی بات ہے کہ حق کے معاملے میں وہمی اندازہ کچھ بھی کام نہیں دے سکتا۔ یقین جانو جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں، اللہ اس کا پورا پورا علم رکھتا ہے۔(۳۶)

یہاں یہ صاف بتادیا کہ مشرکین ومنکرین کے پاس نہ کوئی دلیل عقلی محکم ہے اور نہ کوئی استدلال نقلی مستحکم ۔ یہ لوگ تو اندھیرے میں پڑے محض اٹکل کے تیر چلا رہے ہیں ۔ ہمارے زمانہ کے ایک فاضل یگانہ علامہ مناظر احسن گیلانی نے یہ بات بہت خوب کہی ہے کہ اثبات توحید کے دلائل قائم کرنے کے بجائے ہم کو تو مطالبہ اہل شرک سے کرنا چاہیے کہ وہ الٹی سیدھی کوئی دلیل تو تعدد آلہہ کے ثبوت میں لائیں !

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ انسانی ظن وتخمین ، وہم وخیال جن کا شاندار اور موعوب کن نام ''حکمت وفلسفہ'' یا ''علوم عقلیہ'' رکھا گیا ہے، قرآن اور شریعت اسلامی میں مطلق ان کا کوئی درجہ نہیں ۔قرآن صرف حقائق کا قائل ہے، جو ہر روز بدلتے نہیں۔ ''علوم نظری''، ''اصول موضوعہ'' اور '' نظریات'' انہیں کو مبارک رہیں جن کی تحقیقات ہر صبح اور ہر شام بدلتی رہتی ہیں ۔یہیں سے یہ ہے کہ عقائد کے لئے دلائل ظنی کافی نہیں ۔ **وفی هذه الاية دليل على انه لا يكتفى بالظن فی العقائد** (قرطبی) (ماجدی: ۳۳)

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ فروعات اور اعمال میں گمان پر چلنا جائز ہے، جیسے مجتہدین اور فقہائے کرام ظنی باتوں کے ذریعے ہی مسائل کا حل نکالتے ہیں ، آپ اس پر عمل کر سکتے ہیں ،مگر عقیدے کے معاملے میں ظن پر عمل نہیں کیا جا سکتا، وہاں قرآن وسنت سے نص کی ضرورت ہے، جب تک پکی دلیل موجود نہ ہو، محض سنی سنائی اور قیاسی باتوں سے دلیل قائم نہیں کی جاسکتی ، لہٰذا عقیدے کے متعلق ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ حق بات کی تلاش کرے، پھر اس کے مطابق عمل کرے۔ (معالم العرفان: ۱۰/ ۱۴۰)

قرآن کی صداقت کے حوالے سے چیلنج:

قرآن کی صداقت کے حوالے سے انہیں چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر یہ انسانی کلام ہے، تو تم بھی اس جیسی کوئی سورت بنا کر دکھادو اور اس مقصد کے لیے عرب وعجم میں سے جسے بلانا چاہتے ہو بلالو۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۸﴾

کیا پھر بھی یہ لوگ کہتے ہیں کہ : پیغمبر نے اسے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے؟ کہو کہ : پھر تو تم بھی اس جیسی ایک ہی سورت (گھڑ کر) لے آؤ، اور (اس کام میں مدد لینے کے لیے) اللہ کے سوا جس کسی کو بلا سکو بلالو، اگر سچے ہو۔ (۳۸)

پھر اللہ جل شانہ نے ان کی تکذیب کا سبب خود ہی فرمادیا: وہ یہ کہ انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ وہ جس چیز سے جاہل ہوتا ہے اور اس کی حقیقت سمجھ نہیں پاتا تو سرے سے اس کا انکار ہی کر دیتا ہے۔

ہٹ دھرمی چھوڑنے اور ایمان کی دعوت:

مشرکین نے توحید، بعث بعد الموت اور قرآن کی صداقت کا جو انکار کیا تو اس کی ایک بڑی وجہ ان کی جہالت اور عدم

علم بھی تھا۔ اس سورت میں انہیں کہیں زجر اور تنبیہ کے ساتھ اور کہیں نصیحت اور خیر خواہی کے انداز میں ان تینوں بنیادی عقائد کے بارے میں ہٹ دھرمی چھوڑنے اور ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔

قرآن کریم کی اعلیٰ صفات:

قرآن کریم کی اعلیٰ صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ .... الی.......هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴿۵۸﴾

لوگو تمہارے پاس ایک ایسی چیز آئی ہے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک نصیحت ہے، اور دلوں کی بیماریوں کے لیے شفا ہے، اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت کا سامان ہے۔ (۵۷) (اے پیغمبر) کہو کہ: یہ سب کچھ اللہ کے فضل اور رحمت سے ہوا ہے، لہٰذا اسی پر تو انہیں خوش ہونا چاہیے، یہ اس تمام دولت سے کہیں بہتر ہے جسے یہ جمع کر کر کے رکھتے ہیں۔ (۵۸) (خلاصۃ القرآن: م اش)

ان چار اوصاف کی تشریح میں صاحب روح نے بعض محققین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ نفس انسانی کے لئے حصول کمال میں چار مرتبہ یا منزلیں ہیں اور ان میں سے ہر لفظ ایک ایک مرتبہ یا منزل کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔ (۱) پہلا مرتبہ تہذیب ظاہر کا، یعنی معاصی سے اور اعمال بد سے بچنے کا ہے۔ موعظت اسی مقصد کے لئے ہوتا ہے۔ (۲) دوسرا مرتبہ تہذیب باطن کا، یعنی اخلاق ذمیمہ وعقائد فاسدہ سے بچنے کا ہے۔ اس کو (آیت) ''شفآء لما فی الصدور'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۳) تیسرا مرتبہ عقائد حقہ و اخلاق فاضلہ سے آراستہ ہونے کا ہے۔ یہ منزل ھُدٰی کی ہے۔ (۴) چوتھا مرتبہ انوار الٰہی سے جگمگا اٹھنے کا ہے اور یہ حاصل ہے مقام رحمت کا۔

اور یہ سب ایک سرسری سا خاکہ ہے، امام رازیؒ کے ایک مبسوط مقالہ کا، جو انہوں نے تفسیر کبیر میں تحریر فرمایا ہے، اور جس کا لب لباب یہ کہ موعظت سے اشارہ ہے ظاہری اعمال کی اصلاح وتطہیر کا اور اس کا نام شریعت ہے، اور شفاء سے مراد اصلاح باطن وطہارت روحانی ہے جو کام ہے طریقت کا، اور ھدیٰ سے مقصود وہ نورانیت ہے جو صدیقین کے قلوب میں پیدا ہوتی ہے، اس کو منزل حقیقت کہتے ہیں، اور رحمت سے مراد انسانیت کی تکمیل کا آخری مرتبہ ہے جس سے انوار نبوت خلق کی اصلاح کرتے ہیں۔ (ماجدی: ۳/ ۴۴)

انسان کا مستقبل کے بارے میں فکر مند ہونا:

ہر انسان بظاہر کتنا ہی خوشحال ہو لیکن پھر بھی اپنے مستقبل کی فکر اسے لگی رہتی ہے اور وہ اگر ایمان والا ہو تو اس کو آخرت کی زندگی کی بھی فکر ہوتی ہے کہ نامعلوم وہاں کیا ہوگا اور اس طرح ماضی کا بھی کوئی نہ کوئی رنج وغم پریشان کرتا ہی رہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس رنج وفکر سے آزاد ہونے کا نسخہ یہاں ارشاد فرمایا کہ

أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

یا درکھو کہ جو اللہ کے دوست ہیں ان کو نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔(۶۲)

یعنی اللہ کے دوستوں کے بارے میں بھی بتادیا گیا کہ اللہ کے دوست وہ ہیں جو ایمان لائے اور تقوی اختیار کئے رہے۔اور اللہ نے اپنے دوستوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے لئے خوشخبری ہے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔یہی زبردست کامیابی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ کہنے کو یہ مختصر سی آیت ہے اور مختصر سی بات ہے،لیکن دیکھا جائے تو یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ دنیا میں اس کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔اللہ تعالی ہم سب کو بھی اپنے اولیاء میں شامل فرمائے۔(خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اللہ کے ولی کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا" اذا رأو ذکر اللہ " کہ اللہ کے ولی وہ ہیں کہ انہیں دیکھ کر اللہ یاد آجائے۔مطلب یہ ہے کہ جن کو دیکھ کر دنیا کا مال و دولت بلڈنگز، کارخانے، جاہ واقتدار اور ٹھاٹ باٹ یاد آئے وہ اللہ کے ولی نہیں ہوسکتے۔اللہ کے ولی تو وہ ہیں جو غرور وتکبر سے پاک ہیں۔

نصیحت کے تین قصے:

توحید کے دلائل، بعث بعد الموت کا یقینی ہونا اور قرآن کریم کی صداقت بیان کرنے اور مشرکین کے مزعومات کی تردید کے بعد عبرت اور نصیحت کے لیے تین قصے بیان کیے گئے ہیں۔

جن میں سے پہلا قصہ شیخ الانبیاء حضرت نوح علیہ السلام کا ہے،جن کی عمر اور زمانہ تبلیغ تمام انبیاء علیہم السلام سے زیادہ طویل مگر ان کے متبعین بہت کم تھے۔پھر حضرت موسی اور حضرت ہارون علیہما السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے جنہوں نے فرعون جیسے خدائی کے دعویدار کا مقابلہ کیا، تیسرا قصہ یونس علیہ السلام کا ہے اور انہی کے نام پر اس سورت کا نام رکھا گیا ہے۔

قرآن کریم میں حضرت یونس علیہ السلام کا صراحتاً نام چار جگہ آیا ہے اور دو مقامات پر انہیں ''مچھلی والے'' کی صفت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

مچھلی کا حضرت یونسؑ کو نگلنا اور اگلنا:

وہ اپنی قوم کے ایمان سے مایوس اور اللہ کا عذاب آنے کو یقینی دیکھ کر ''نینوا'' کی سرزمین چھوڑ کر چلے گئے، آگے جانے کے لیے جب وہ کشتی میں سوار ہوئے تو کشتی والوں نے سمندر میں طغیانی کی وجہ سے انہیں سمندر میں پھینک دیا۔ ایک بڑی مچھلی نے انہیں نگل لیا، اللہ نے انہیں مچھلی کے پیٹ میں بھی زندہ رکھا، بالآخر چندروز بعد مچھلی نے انہیں ساحل پر اگل دیا۔

ادھر یہ ہوا کہ ان کی قوم کے مرد اور عورتیں، بچے اور بڑے سب صحراء میں نکل گئے اور انہوں نے آہ وزاری اور توبہ واستغفار شروع کردیا اور سچے دل سے ایمان قبول کرلیا جس کی وجہ سے اللہ کا عذاب ان سے ٹل گیا۔

مشرکین کو تنبیہ:

یہ تین قصے ذکر کرنے کے بعد مشرکین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر وہ کفروشرک سے باز نہ آئے تو قیامت سے پہلے ہی ان پر عذاب آسکتا ہے۔

مومنین کو بشارت:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو بشارت سنائی گئی ہے کہ اللہ کی مدد قریب ہے، یہ ہماری سنت ہے کہ ہم بالآخر اہل ایمان کو نجات دیتے ہیں۔

سورۂ یونس کی ابتداء اور انتہاء:

جیسے سورۂ یونس کی ابتداء قرآن حکیم کے ذکر سے ہوئی تھی، اسی طرح اس کی انتہا بھی اس سچی کتاب کی اتباع اور پیروی کے حکم پر ہو رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ......... الی.........وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

(اے پیغمبر) ان سے کہو کہ: اے لوگو اگر تم میرے دین کے بارے میں کسی شک میں مبتلا ہو تو (سن لو کہ) تم اللہ کے سوا جن جن کی عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کرتا، بلکہ میں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہاری روح قبض کرتا ہے۔ اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں مومنوں میں شامل رہوں۔ (۱۰۴) اور (مجھ سے) یہ (کہا گیا ہے) کہ: اپنا رخ یکسوئی کے ساتھ اس دین کی طرف قائم رکھنا، اور ہرگز ان لوگوں میں شامل نہ ہونا جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک مانتے ہیں۔ (۱۰۵) اور اللہ تعالی کو چھوڑ کر کسی ایسے (من گھڑت معبود) کو نہ پکارنا جو تمہیں نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے، نہ کوئی نقصان۔ پھر بھی اگر تم (بفرض محال) ایسا کر بیٹھے تو تمہارا شمار بھی ظالموں میں ہوگا۔ (۱۰۶) اور اگر تمہیں اللہ کوئی تکلیف پہنچا دے تو اس کے سوا کوئی نہیں ہے جو اسے دور کردے، اور اگر وہ تمہیں کوئی بھلائی پہنچانے کا ارادہ کرلے تو کوئی نہیں ہے جو اس کے فضل کا رخ پھیر دے۔ وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے پہنچا دیتا ہے، اور وہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔ (۱۰۷) (اے پیغمبر) کہہ دو کہ: لوگو تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس حق آ گیا ہے، اب جو شخص ہدایت کا راستہ اپنائے گا وہ خود اپنے فائدے کے لیے اپنائے گا، اور جو گمراہی اختیار کرے گا، اس کی گمراہی کا نقصان خود اسی کو پہنچے گا، اور میں تمہارے کاموں کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ (۱۰۸) اور جو وحی تمہارے پاس بھیجی جا رہی ہے، تم اس کی اتباع کرو، اور صبر سے کام لو، یہاں تک کہ اللہ کوئی فیصلہ کر دے، اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ (۱۰۹)

مکی زندگی میں حکم یہ تھا کہ کفار کی طرف سے پہنچنے والی ہر تکلیف پر صبر کیا جائے، ہاتھوں سے انتقام لینے کی اجازت نہیں تھی، اس آیت میں یہی حکم دیا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کافروں کا فیصلہ اللہ تعالی پر چھوڑ دو، وہی ان کے بارے

میں مناسب فیصلہ کرے گا، چاہے اس طرح کہ دنیا میں ان کو عذاب دے، یا آخرت میں، اور چاہے اس طرح کہ مسلمانوں کو جہاد کی اجازت دے جس کے ذریعے ان کی زیادتیوں کا بدلہ لیا جا سکے۔ (توضیح القرآن، خلاصۃ القرآن: م اش)

موضوع سورۃ:...... دعوت الی القرآن ۔ دعوۃ تلک آیات الکتاب الحکیم (سورۃ یونس کی سب سے پہلی آیت) نتیجہ: و اتبع ما یوحی الیک الآیہ (سورۃ یونس کی سب سے آخری آیت) شواہد: شاہد وہ چیز ہے جس میں کسی طریقہ سے موضوع کا ذکر آ جائے۔ (۱) کان للناس عجبا. (۲) ان الذین لا یرجون لقائنا. (۳) ان الذین آمنوا وعملوا الصلحت. (۴) جائتھم رسلھم بالبینت. (۵) اذا تتلی علیھم آیاتنا. (۶) قل ھل من شرکائکم. (۷) وما کان ھذا القرآن ان یفتری. الآیہ. (۸) ام یقولون افتری. الآیہ. (۹) ومنھم من یؤمن بہ ومنھم من لا یؤمن بہ. (۱۰) یا ایھا الناس قد جاءتکم موعظۃ. (۱۱) وما تکون فی شان وما تتلو منہ من قرآن. (۱۲) الذین امنوا وکانوا یتقون. (۱۳) واتل علیھم نباء نوح. (۱۴) واغرقنا الذین کذبوا بایاتنا. (۱۵) ثم بعثنا من بعدہ رسلا. (۱۶) ثم بعثنا من بعدھم موسی. الآیہ. (۱۷) فان کنت فی شک مما انزلنا الیک. (۱۸) ولا تکونن من الذین کذبوا. (۱۹) ولو شاء ربک. (۲۰) قل یا ایھا الناس ان کنتم فی شک. (۲۱) قل یا ایھا الناس قد جائکم الحق من ربکم.

خلاصہ رکوع: ۱...... ہم نے انہیں کتاب حکیم دی، اور احسان یہ کیا کہ انہی کے ہم جنس انسان کی معرفت پیغام وحی پہنچایا، یہ احمق بجائے اس کے کہ فائدہ اٹھائیں، اس کی تاثیر کو جادو کہہ کر اعراض کر رہے ہیں۔ ماخذ: آیت ۱، ۲۔

خلاصہ رکوع: ۲...... (۱) پیغام الٰہی کی قبولیت سے تو انکار کرتے ہیں، اور جب مصیبت آتی ہے تو اس کے دروازے پر آ کر ہاتھ پھیلاتے ہیں، مصیبت ٹل جاتی ہے تو پھر نافرمان ہو جاتے ہیں۔ ماخذ: آیت: ۱۲۔

خلاصہ رکوع: ۳...... اے نافرمانو! جس دنیا کی زندگی پر تم مغرور ہو وہ بے حقیقت ہے، اس پر مغرور ہو کہ تم پیغامات الٰہی کے تسلیم کرنے سے اعراض نہ کرو۔ ماخذ: آیت: ۲۴۔

خلاصہ رکوع: ۴...... (۱) یہ لوگ خدا تعالیٰ کو خالق، رازق، مدبر مانتے ہیں۔ (۲) پھر بھی اس کے احکام کی تعمیل سے جی چراتے ہیں۔ (۳) اور قرآن پر خودساختہ ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔ ماخذ: (۱) آیت: ۳۱۔ (۲) آیت: ۳۴۔ (۳) آیت: ۳۷۔

خلاصہ رکوع: ۵...... (۱) اگر تکذیب سے باز نہ آئیں تو ان سے بیزاری کا اعلان کر دیجئے۔ (۲) یہ باطن کے اندھے اور بہرے، قرآن حکیم کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں؟ ماخذ: (۱) آیت: ۴۱۔ (۲) آیت: ۴۲، ۴۳۔

خلاصہ رکوع: ۶...... یہ منکرین موعظت وشفا (قرآن) آئندہ ساری دنیا کے خزانے دے کر بھی جان چھڑانے کے لئے تیار ہوں گے۔ ماخذ: آیت: ۵۴، ۵۷۔

خلاصہ رکوع :۷......(۱) ہم آپ کی تلاوت قرآن اور بقیہ اعمال حیات سے پورے واقف ہیں ۔(۲) ایسے اللہ والوں کو بارگاہ الٰہی کی حاضری میں کوئی خطرہ نہ ہوگا۔(۳) اور آپ مخالفین کی بدزبانی سے کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ ماخذ: (۱) آیت:۶۱۔(۲) آیت: ۶۲۔(۳) آیت:۶۵۔

خلاصہ رکوع :۸......تذکیر بایام اللہ، دیکھ لیجئے نوح علیہ السلام اور بعد کے انبیاء علیہم السلام سے عناد رکھنے والے برباد ہوگئے۔ ماخذ: آیت :۷۱، ۷۴۔

خلاصہ رکوع:۹......تذکیر بایام اللہ، دیکھ لیجئے فرعون اپنے لشکر سمیت موسیٰ علیہ السلام سے عناد رکھنے کے باعث غرق ہوگیا۔ ماخذ: آیت:۹۰۔

خلاصہ رکوع:۱۰......(۱) اے مخاطبین قرآن! اس میں شک مت کرو۔(۲) اور محض شک کی بنا پر اس کی تکذیب نہ کرو۔(۳) ورنہ تمہارا بھی وہی حشر ہوگا جو پہلے جھٹلانے والوں کا ہوا۔ ماخذ: (۱) آیت: ۹۴۔(۲) آیت:۹۵۔(۳) آیت:۱۰۲، ۱۰۳۔

خلاصہ رکوع:۱۱......(۱) اے لوگو! تمہارے شک کی بنا پر میں اپنا مسلک چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔(۲) جو شخص اس قرآن کو مانے گا خود نفع اٹھائے گا، ورنہ انکار کا وبال اس کے سر عائد کیا جائے گا۔ ماخذ:(۱) آیت: ۱۰۴۔(۲) آیت: ۱۰۸۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورۃ ہود مکیۃ :

موضوع سورۃ:......دعوت الی التوحید۔

خلاصہ رکوع :۱......مقصد تنزیل کتاب جذبہ توحید کی تکمیل اور سابقہ فروگزاشتوں سے استغفار ہے۔ ماخذ: آیت:۳،۲۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

گیارہویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) صدقہ کرنے والوں کو دعا دینا اللہ کا حکم اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک سنت ہے۔

(۲) مسلمانوں کی اکثریت ایسی ہے کہ ان کے اعمال ملے جلے ہیں، وہ اطاعت وعبادت بھی کرتے ہیں اور ان سے گناہ بھی سرزد ہو جاتے ہیں، ان میں سے توبہ کرنے والوں کو رحمت اور مغفرت کی امید رکھنی چاہئے۔

(۳) حقیقی صلحاء وہی ہیں جن کے قول وعمل میں تضاد نہ ہو اور وہ ہر صورت میں سچ بولیں۔

(۴) تقوی صرف خشوع خضوع کا نام نہیں ہے بلکہ کفار کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جانا بھی تقوی ہے اور ایسے ہی متقیوں کو اللہ کی مدد حاصل ہوتی ہے۔

(۵) قرآن کریم کا مذاق اڑانے والے اگر توبہ نہ کریں تو ان کی موت کفر پر واقع ہوتی ہے۔

(۶) حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص صبح شام یہ کلمات سات مرتبہ پڑھے گا، اللہ پریشانی سے اس کی حفاظت فرمائے گا، خواہ وہ کیسی ہی پریشانی کیوں نہ ہو۔ **حسبي الله لا إله إلا هو عليه توكلت وهو رب العرش العظيم.**

(۷) ایمان اور اعمال صالحہ جنت کی چابیاں اور اس کی طرف ہدایت کا راستہ ہیں۔

(۸) جہاد فی سبیل اللہ جو اللہ کی رضا کے لئے ہو اس کا بدلہ جنت ہے۔

(۹) اسلام ظاہری و باطنی ہر قسم کی نظافت کی ترغیب دیتا ہے۔

(۱۰) خوف اور امید کی بڑی فضیلت ہے، خوف انسان کو گناہوں کے چھوڑنے پر اور امید زیادہ سے زیادہ نیکیاں جمع کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

***

پارہ:۱۲

بارہواں پارہ دوسورتوں پر مشتمل ہے سورۂ ہوداورسورۂ یوسف۔

سورۂ هود

اس سورت کے مضامین بھی پچھلی سورت یعنی سورہ یونس سے ملتے جلتے ہیں، البتہ سورۃ یونس میں جن پیغمبروں کے واقعات اختصار کے ساتھ بیان ہوئے تھے اس سورت میں تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، خاص طور پر حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح ، حضرت شعیب اور حضرت لوط علیہم السلام کے واقعات زیادہ تفصیل سے انتہائی بلیغ اور مؤثر اسلوب میں بیان کئے گئے ہیں اوران واقعات سے بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالی کی نافرمانی بڑی بڑی زورآور قوموں کو تباہ کر چکی ہے اور جب انسان اس نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالی کے قہر اور عذاب کا مستحق ہوجائے تو چاہے وہ کتنے ہی بڑے پیغمبر سے قریبی رشتہ رکھتا ہواس کا یہ رشتہ اس کو عذاب الٰہی سے نہیں بچا سکتا، جیسے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کو نہیں بچاسکا۔ اس سورت میں عذاب الٰہی کے واقعات بہت ہی مؤثر انداز میں بیان ہوئے ہیں اور دین پر استقامت کا حکم بہت ہی تاکید سے فرمایا گیا کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے سورہ ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے، ان سورتوں میں جو تنبیہ کی گئی ہے اس کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی امت کے بارے میں یہ خوف لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ بھی اپنی نافرمانی کی وجہ سے اس طرح کے کسی عذاب کا شکار نہ ہوجائے۔ (توضیح القرآن)

سورۂ ہود کی صرف پانچ آیات گیارہویں پارہ میں ہے، بقیہ پوری سورت بارہویں پارہ میں ہے، یہ مکی سورت ہے، اس میں ۱۲۳ آیات اور ۱۰ رکوع ہیں۔

سورۂ ہود یہ قرآن کریم کی گیارہویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۵۲ نمبر پر ہے، جس میں ۱۰ رکوع، آیات ۱۲۳ اور کلمات ۱۹۳۶ اور کل حروف ۷۹۲۴ ہیں۔

ربط:

سورہ ہود کا سورۃ یونس کے ساتھ ربط یہ ہے کہ سورہ یونس میں الوہیت وحقانیتِ قرآن ورسول اور کفر کا بطلان اور اس پر وعید کا بیان تھا اور سورہ ہود میں کفار کا ہلاک ہونا اور مومنین کا نجات پانا اور دونوں کے لئے وعدہ اور وعید کا ذکر ہے۔

خلاصہ سورۂ ہود:

اس سورۃ کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) اس میں رسالت وتوحید کا ذکر ہے اور اس کے ضمن میں ایمان پر خیر دارین کا وعدہ اور اعراض پر عذاب کی وعید اور اس کی مناسبت سے بعث کا ذکر اور نزول عذاب کے بارے میں ان کا منشاء

اشتباہ کہ تاخیر عذاب ہے اور انسان کی ایک اکثری جبلی خصلت سے اس اشتباہ کی تقریر ''ولئن اذقنا الانسان '' الخ میں (۲) ان کے انکار رسالت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دل تنگی پر تسلی (۳) قرآن پر جو وہ شبہ کرتے تھے اس کا جواب (۴) استحقاق عذاب کے متعلق ان کے ایک زعم باطل کا ابطال (۵) مؤمنین کی فضیلت اور کفار کی بدانجامی، پھر دونوں کے تفاوت کی ایک مثال (٦) ان سب مضامین کی تقریر و تائید کے لئے چند قصص جن سے توحید و رسالت اور وقوع وعید اور مؤمنین کی فلاح اور منکرین کا خسارہ سب ثابت ہوتا ہے، پھر قصص کے بعد ان پر وعید کی تفریع اور اس میں قیامت کی جزا وسزا اور وعید میں سب مشرکین کا اشتراک (۷) منکرین کے خلاف کا پہلے سے چلا آنا آپ کی تسلی کے لئے اور اس کے ضمن میں تاخیر عذاب کی حکمت جس کا ذکر اول سورۃ میں ان کی منشاء اشتباہ کی تقریر میں آیا تھا اور پھر اس عذاب کا اپنے وقت پر واقع ہونا (۸) ان کفار سے اعراض کر کے اہل ایمان کو اپنے کام میں لگے رہنے کا حکم (۹) استقامت، قطع موالاۃ کفار واقامت صلوۃ وصبر کا حکم (۱۰) عبرت کے واسطے امم سابقہ مہلکہ کا اجمالی حال اور اس کا ظاہری سبب اجرام اور حقیقی سبب یعنی مشیت وحکمت (۱۱) ذکر قصص کی بعض حکمتیں (۱۲) کفار سے آخری کلام کہ اگر نہیں مانتے تو جس حال میں چاہو رہو، خود نتیجہ دیکھ لوگے اور اس کی تقریر کے لئے اللہ تعالی کا عالم الغیب و مرجع کل امور اور ان کے اعمال پر مطلع ہونا، اور اس کے ضمن میں عبادت اور توکل کا وجوب کہ مناسب مقام ہے، یہ سب مضامین نہایت ترتیب وتہذیب کے ساتھ مذکور ہیں اور ان کا باہمی تناسب اور سابقہ کے مضامین سے تقارب ظاہر ہے بالخصوص سورۂ ہذا کا آغاز اور سورۂ سابقہ کا انجام تو ہمہ تن متحد ہے، اس لئے کہ دونوں میں توحید و رسالت کا اثبات ہے واللہ اعلم!

فضائل:

◇ ...... حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ تعالی عنہ کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص سورۂ ہود کو پڑھے گا اس کو ان لوگوں کی تعداد سے دس گنا ثواب ملے جنہوں نے حضرت نوح، ہود، شعیب، صالح، لوط اور ابراہیم علیہم السلام کی تصدیق یا تکذیب کی ہوگی۔

◇ ...... حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ کو کس چیز نے بوڑھا بنا دیا آپ نے فرمایا کہ سورۂ ہود اور سورۂ واقعہ، ''عم یتسائلون'' اور ''اذا الشمس کورت'' نے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورت:

سورت کی ابتداء میں چار دعوے بیان ہوئے: (۱) صرف اللہ ہی کو پکارو۔ (۲) اللہ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں ہے۔ (۳) وحی کی تبلیغ میں کوتاہی نہیں کرنی ہے۔ (۴) مسئلہ واضح ہے مگر یہ لوگ ضد اور عناد کی وجہ سے نہیں مانتے۔

قصص الانبیاء کا سورت کے دعووں کے ساتھ ربط:

اس کے بعد انبیاء سابقین کے سات قصے مذکور ہیں، جن میں سے حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت شعیب اور

حضرت صالح علیہم السلام کے قصوں کا تعلق پہلے دعوے کے ساتھ ہے، یعنی جس طرح ان انبیاء کرام نے اللہ ہی کو پکارا اور اس کی دعوت دی اسی طرح آپ بھی دعوت دیں، حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے قصے کا تعلق دوسرے دعوے کے ساتھ اور حضرت موسیٰ کے قصے کا تعلق تیسرے دعوے کے ساتھ ہے اور ایک آیت چوتھے دعوے کے لئے ہے۔

سورت کی آیت نمبر ۲ میں سورت کا پہلا دعوی مذکور ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس لئے صرف اللہ تعالی ہی کو پکارو۔ اس کے بعد آیت نمبر ۵ میں دوسرا دعویٰ بیان ہوا کہ صرف اللہ ہی غیب کا علم جانتا ہے۔ تیسرا دعویٰ آیت نمبر ۱۲ میں بیان ہوا کہ اللہ کی نازل کردہ وحی میں کوتاہی نہیں کرنی اور چوتھا دعویٰ آگے چل کر آیت نمبر ۱۷ میں بیان ہوا کہ مسئلہ تو واضح ہو چکا ہے، مگر یہ لوگ ضد اور عناد کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے۔

آیت نمبر ۱۷ تک سورت کے چاروں دعوے تمام ہوئے، اس کے بعد قصص کا تذکرہ ہے، جو ان دعووں پر مرتب ہوں گے۔ (خلاصۂ مضامین قرآن: مولانا منظور یوسف)

مضامین:

اس سورہ میں مضامین تقریباً وہی ہیں جو سورہ یونس میں تھے۔ مگر تنبیہ کا اندازہ اس سے زیادہ سخت ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ سورہ یونس کی بہ نسبت یہاں دعوت مختصر ہے، فہمائش میں استدلال کم اور وعظ ونصیحت زیادہ ہے اور تنبیہ مفصل اور پر زور ہے۔ دعوت یہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات مانو۔ شرک سے باز آجاؤ۔

فہمائش یہ ہے کہ دنیوی زندگی پر اترا کر جن قوموں نے رسولوں کی دعوت کو ٹھکرایا وہ نہایت برا انجام دیکھ چکی ہیں۔ تاریخ کے مسلسل تجربات اس راہ کی تباہی کی شہادت دے رہے ہیں جس پر منکرین چل رہے ہیں۔

تنبیہ یہ ہے کہ عذاب میں تاخیر دراصل مہلت ہے جو اللہ اپنے فضل سے عطا کر رہا ہے۔ اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو عذاب آ کر رہے گا۔

ساتھ ہی اس سورہ میں قوم نوح، قوم عاد وثمود، قوم لوط، اصحاب مدین اور قوم فرعون کے قصے بیان ہوئے ہیں اور یہ قصے سورہ یونس میں بیان کئے ہوئے قصوں کے علاوہ دوسرے نقطہ نظر سے بیان ہوئے ہیں۔ وہ یہ کہ خدا جب فیصلے پر آتا ہے تو پھر بالکل بے لاگ طریقے سے فیصلہ چکاتا ہے۔ اس میں کسی کے ساتھ ذرہ برابر بھی رعایت نہیں ہوتی۔ اس وقت نہیں دیکھا جاتا کہ کون کس کا بیٹا ہے اور کس کا عزیز؟ رحمت صرف اس کے حصے میں آتی ہے جو راہ راست پر آ گیا۔ ورنہ عذاب الہی سے نہ رسول (حضرت نوح علیہ السلام) کا بیٹا بچتا ہے اور نہ رسول (حضرت لوط علیہ السلام) کی بیوی۔

قرآن کے روشن کتاب ہدایت ہونے کے تذکرے کے بعد توحید کی دعوت دی گئی ہے اور اللہ سے طلب مغفرت کی تعلیم ہے۔ پھر قیامت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ جو قرآن پر عمل کرے گا اور توبہ واستغفار کرتا رہے گا قیامت میں اچھا انعام پائے گا اور جو ایسا نہیں کرے گا وہ عذاب میں مبتلا ہوگا۔ اللہ ہر پوشیدہ اور ظاہر بات سے واقف ہے۔ (خلاصۂ مضامین قرآنی)

تین سورتوں میں تین نبیوں (حضرت یونس، حضرت ہود، حضرت یوسف) کے نام آئے ہیں۔ تینوں سورتیں مکہ مکرمہ سخت حالات میں اتری جس سے مسلمانوں کو تسلی دی، جو سورتیں انبیاء کے نام سے ہے وہ سورت کا مقصد بھی بتاتی ہیں۔ جیسا کہ سورۂ یونس تقدیر الٰہی کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی طرح سورہ ہود، سورۂ یوسف میں قصہ کے آخیر میں کوئی نہ کوئی مقصد آگے پیچھے کے فقروں سے معلوم ہوتا ہے۔ سورہ ہود ابو طالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال، صحابۂ کرام کی حبشہ کی ہجرت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طائف کی ہجرت اور مطعم بن عدی کی پناہ میں مکہ واپسی والے پس منظر میں نازل ہوئی، جب امت پر کوئی ایسی حالت آئے تو اس سورت کی طرف توجہ کر کے اس کی تلاوت کریں، اگر مخلوق سے امید ختم ہو جاتی ہے تو آدمی تین باتوں میں سے ایک پر مجبور ہو جاتا ہے (۱) ثابت قدمی دکھائے (۲) دشمن کی مصیبتوں سے مایوس ہو کر ان کی اطاعت قبول کر لے۔ (۳) یا دشمنوں پر مظالم شروع کر دے۔

یہ سورت رہنمائی کرتی ہے کہ ثابت قدمی اور مضبوطی سے تبلیغ کرتے رہنا چاہیے اور آنے والی مصیبتوں سے گھبرانا نہیں چاہیے، مظالم سے بچنا ہے۔ ایسے وقت میں درمیانی راہ استقامت اور صبر ہے، ان کی باتوں میں نہ الجھیں، خوف کے مارے کوئی اشتعال انگیز قدم نہ اٹھائیں۔ یہ سب سے مشکل کام ہے، اس لیے **فاستقیم** فرمایا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے توازن کہا۔

اس سورت میں موجودہ دور کے مسلمانوں کو دہشت اور بزدلی کے درمیان راہ دکھائی ہے، سورہ ہود ہمیں قرآن کی آیات پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے؛ تاکہ برے حالات میں بھی آپ کو صحیح رہنمائی مل سکے۔

داعی تبلیغ دین میں اعتدالی راہ اپنائے، حضرت نوح علیہ السلام کی ۹۵۰ سالہ استقامت، قوم تھک گئی؛ لیکن آپ ثابت قدم رہے، اس سے ہمیں سکون ملتا ہے (۲) گھبراہٹ - دہشت گردی سے دور، سکون سے جواب دیا، چڑچڑاہٹ اور غصہ سے دور رہے، کشتی بنانے کا عمل کافی مدت تک چلا، لکڑی کہاں سے آئی؟ وغیرہ کا تحمل سے جواب دیا۔ حضرت شعیب (علیہ السلام) اور حضرت ہود (علیہ السلام) بھی ان تینوں امور میں ثابت قدم رہے۔ سورت ۱۰۳-۱۰۸ کی آخری آیات یہ بتاتی ہیں کہ دنیا کے پریشان کن دن ہمیشہ کے لیے نہیں رہیں گے، دوبارہ استقامت کا ذکر آیا، اور اس کی سب سے بڑی وجہ نماز، نیک اعمال اور صبر کا خصوصی تعاون ہے، موجودہ حالات بھی ایسے ہی ہیں، لہٰذا مسلمانوں کو ان تینوں سورتوں کے بنیادی مقاصد پر عمل کرنا چاہیے۔ (خواطر، قرآن سارانس گجراتی)

قرآن کی عظمت شان:

اس سورت کی ابتدا میں قرآن کریم کی عظمت شان کو بیان کیا گیا ہے کہ یہ اپنی آیات، معانی اور مضامین کے اعتبار سے محکم کتاب ہے، اور اس میں کسی بھی اعتبار سے فساد اور خلل نہیں آسکتا اور نہ اس میں کوئی تعارض یا تناقض پایا جاتا ہے۔

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ①

الر، یہ وہ کتاب ہے جس کی آیتوں کو (دلائل سے) مضبوط کیا گیا ہے، پھر ایک ایسی ذات کی طرف سے ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو حکمت کی مالک اور ہر بات سے باخبر ہے۔(۱)

قرآن کے محکم ہونے کی بڑی وجہ:

اس کے محکم ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس کی تفصیل اور تشریح اس ذات نے کی ہے جو حکیم بھی ہے اور خبیر بھی ہے، اس کا ہر حکم کسی نہ کسی حکمت پر مبنی ہے اور اسے انسان کے ماضی، حال، مستقبل، اس کی نفسیات، کمزوریوں اور ضروریات کا بخوبی علم ہے۔

صفت ترزیق وصفت تخلیق کا بیان:

صفت ترزیق اور صفت تخلیق کو بیان کرتے ہیں کہ وہی سب کا رازق ہے اور وہی سب کا خالق ہے اور مخلوق رزق کی محتاج ہے اس لیے اس نے اپنے فضل سے مخلوق کا رزق اپنے ذمہ کرلیا ہے جب تک خالق کو کسی جان دار کا زندہ رکھنا مقصود ہے اس وقت تک اس کو رزق پہنچتا رہے گا۔ اور جو حیوان بھوک سے مرجائے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کمی آگئی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس کے زندہ رکھنے کا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے جس حیوان کا جتنا رزق مقرر کردیا ہے وہ اس سے غافل نہیں اور زمین کے تمام جانداروں کا رزق اس کے ذمہ ہونا اس کی دلیل ہے کہ اس کا علم تمام کائنات کو محیط ہے، اگر اس کو تمام اشیاء کا علم نہ ہوتا تو اس قدر بے شمار مخلوقات کو رزق کیسے دیتا۔

نیز یہ بھی ناممکن ہے کہ خالق کو اپنی مخلوق کا علم نہ ہو۔ **الا یعلم من خلق**۔ پس اس کا خالق اور رزاق ہونا اس کے کمال علم اور کمال قدرت کی دلیل ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۱/۴)

چنانچہ ارشاد ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۝۶ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۝۷

اور زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ نے اپنے ذمے نہ لے رکھا ہو، وہ اس کے مستقل ٹھکانے کو بھی جانتا ہے، اور عارضی ٹھکانے کو بھی۔ ہر بات ایک واضح کتاب میں درج ہے۔(۶) اور وہی ہے جس نے تمام آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا؛ تاکہ تمہیں آزمائے کہ عمل کے اعتبار سے تم میں کون زیادہ اچھا ہے۔ اور اگر تم (لوگوں سے) یہ کہو کہ تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، وہ یہ کہیں گے کہ یہ کھلے جادو کے سوا کچھ نہیں ہے۔(۷)

یعنی ادنی سے ادنی ،حقیر سے حقیر کیڑے کے لئے بھی سامان رزق کی فراہمی کے اسباب وہی پیدا کرتا رہتا ہے، اس کی ربوبیت اور صفت علم کا احاطہ کون کرسکتا ہے۔آیت کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اسباب رزق کی طرف سے غافل و بےفکر ہوجائے بلکہ مراد یہ ہے کہ تکیہ اسباب پر نہ کرے،سبب کا مبدأ مرجع ومنتہا اللہ کو ہی سمجھے رہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اسباب کو اگر اس اعتقاد کے ساتھ اختیار کیا جائے کہ ''مسبب'' اللہ تعالیٰ ہی ہے اور یہ اعتقاد نہ رکھا جائے کہ بدون اسباب کے رزق حاصل ہی نہیں ہوتا تو یہ توکل کے منافی نہیں، حاصل یہ کہ وثوق اور ربط قلب بس حق تعالیٰ ہی کے ساتھ ہونا چاہیے۔(ماجدی:۳/۸۰)

انسان کی فطری کمزوری:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب عذاب الٰہی سے ڈراتے تو کفار نہایت بے باکی سے یہ کہہ دیتے کہ وہ عذاب کیوں نہیں آتا؟ اب اس آیت میں طبیعت انسانی کا حال بیان کرتے ہیں کہ وہ اکثر وبیشتر ایک حال پر نہیں رہتی اگر عیش وآرام کے بعد ذرا تکلیف میں مبتلا ہوا تو ناامید ہوکر بیٹھ جاتا ہے اور اگر مصیبت کے بعد راحت پہنچتی ہے تو اترانے لگتا ہے۔(تفسیر ادریسی:۴/۷)

چنانچہ فرماتے ہیں:

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ۝٩ .....الیٰ............اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝١١

اور جب ہم انسان کو اپنی طرف سے کسی رحمت کا مزہ چکھائے دیتے ہیں، پھر وہ اس سے واپس لے لیتے ہیں تو وہ مایوس (اور) ناشکرا بن جاتا ہے۔(۹)اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچنے کے بعد ہم اسے نعمتوں کا مزہ چکھا دیں،تو وہ کہتا ہے کہ ساری برائیاں مجھ سے دور ہوگئیں۔(اس وقت) وہ اترا کر شیخیاں بگھارنے لگتا ہے۔(۱۰) ہاں! مگر جولوگ صبر سے کام لیتے ہیں،اور نیک عمل کرتے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں،ان کو مغفرت اور بڑا اجر نصیب ہوگا۔(۱۱)

ضد اور عناد کی پٹی:

جولوگ ان دلائل میں غور وفکر نہیں کرتے اور جنہوں نے اپنی آنکھوں پر ضد اور عناد کی پٹی باندھ رکھی ہے وہ توحید کا بھی انکار کرتے ہیں اور قرآن کو اللہ کا کلام تسلیم کرنے سے بھی انکار کرتے ہیں۔ان منکرین کو چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر واقعی قرآن انسانی کاوش ہے تو تم بھی اس جیسی دس سورتیں بنا کر لے آؤ۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝١٣

بھلا کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ یہ وحی اس (پیغمبر) نے اپنی طرف سے گھڑ لی ہے؟ (اے پیغمبر ان سے) کہہ دو کہ:

پھر تو تم بھی اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں بنالاؤ، اور (اس کام میں مدد کے لیے) اللہ کے سوا جس کسی کو بلاسکو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔ (۱۳)

منکرین کو تین بار چیلنج:

منکرین کو تین بار چیلنج دیا گیا تھا، (۱) پہلی بار پورے قرآن کی مثال لانے، (۲) دوسری بار قرآن جیسی دس سورتیں (۳) اور تیسری بار سورۂ بقرہ میں قرآن کریم جیسی صرف ایک سورت بنا کر لانے کا چیلنج دیا گیا تھا، لیکن تینوں بار وہ اس چیلنج کو قبول کرنے سے عاجز رہے۔

دلائل اعجاز قرآن پر ایک اجمالی نظر:

اعجاز قرآن پر دلائل تو بے شمار ہیں جس پر علماء دین نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، اس وقت اجمالی اور اختصار کے ساتھ چند حرف ہدیہ ناظرین ہیں۔

(۱) قرآن کریم؛ اصول دین یعنی توحید اور رسالت اور قیامت کی ایسی تفصیل اور تحقیق پر مشتمل ہے کہ توریت، انجیل اور زبور میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔

(۲) پھر یہ کہ قرآن کریم اثبات الوہیت و وحدانیت اور اثبات نبوت و رسالت اور اثبات قیامت کے ایسے دلائل عقلیہ اور براہین قطعیہ پر مشتمل ہے کہ جس کے جواب سے روئے زمین کے فلاسفہ عاجز اور درماندہ ہیں اور بڑے بڑے دہری اور مادہ پرست ان دلائل کے سامنے لاجواب ہیں۔

(۳) حرام و حلال کی تفصیل کرتا ہے۔

(۴) قرآن کریم، انبیاء سابقین کی نصیحتوں اور ان کے کلمات و موعظت کا جامع ہے۔

(۵) عقل معاش اور عقل معاد دین اور دنیا کی رہنمائی کرتا ہے۔

(۶) گذشتہ امتوں کے عبرت آمیز واقعات بیان کرتا ہے اور آئندہ کے لیے اہل ایمان کو بشارت دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو کافروں کے مقابلہ میں غلبہ عطاء فرمائے گا۔

(۷) اور قیامت تک آنے والے حوادث کلیہ کی تم کو خبر دیتا ہے کہ زمانہ کس رفتار سے جائے گا اور کس حال میں اس کی بساط پلٹی جائے گی اور کس طرح قیامت قائم ہوگی، یہ تو قرآن کریم کے معنوی اعجاز کے چند وجوہ ہیں اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اس کے دلائل اعجاز اور اسرار بلاغت کی کوئی حد نہیں۔ (تفسیر ادریسی: ۴/ ۱۰، ۱۱)

جھوٹ بولنا سب سے بڑا گناہ:

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جھوٹ بولنا بہت بڑا گناہ ہے، اللہ تعالی نے اس کو سب سے بڑا ظلم قرار دیا ہے اور ایسے لوگوں کی ۱۳ حالتوں اور ذلتوں کو آیت نمبر ۱۸ تا ۲۲ میں بیان کیا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰی رَبِّهِمْ ....الی..........لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ﴿۲۲﴾

اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے؟ ایسے لوگوں کی ان کے رب کے پاس پیشی ہوگی، اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ: یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹی باتیں لگائی تھیں۔ سب لوگ سن لیں کہ اللہ کی لعنت ہے ان ظالموں پر۔ (۱۸) جو اللہ کے راستے سے دوسروں کو روکتے تھے، اور اس میں کجی تلاش کرتے تھے اور آخرت کے تو وہ بالکل ہی منکر تھے۔ (۱۹) ایسے لوگ روئے زمین پر کہیں بھی اللہ سے بچ کر نہیں نکل سکتے، اور اللہ کے سوا انہیں کوئی یار و مددگار میسر نہیں آسکتے۔ ان کو دوگنا عذاب دیا جائے گا، یہ (حق بات کو نفرت کی وجہ سے) نہ سن سکتے تھے، اور ان کو (حق) سجھائی دیتا تھا۔ (۲۰) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کے لیے گھاٹے کا سودا کرلیا تھا، اور جو معبود انہوں نے گھڑ رکھے تھے، انہیں ان کا کوئی سراغ نہیں ملے گا۔ (۲۱) لامحالہ یہی لوگ ہیں جو آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ (۲۲)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی پر جھوٹ بولنا اور افتراء کرنا سب سے زیادہ بے جا حرکت ہے اور جو حکم اللہ نے نہیں دیا اس کو اللہ کی طرف منسوب کرنا ہی سب سے بڑا ظلم ہے۔ اور یہی حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر افتراء کرنے اور جھوٹ بولنے کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص مجھ پر وہ بات کہے جو میں نے نہیں کہی تو اسے اپنا ٹھکانا آگ میں بنانا چاہئے۔ اور امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں کسی ایسے گناہ سے واقف نہیں ہوں جس کے مرتکب کو اہل سنت میں سے کسی نے کافر قرار دیا ہو سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جھوٹ بولنے کے۔ (موضوعات کبیر از ملا علی قاری رحمہ اللہ، حوالہ درس قرآن) (خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

انسانوں کے دو گروہ:

دنیا کے اندر قرآن کریم اور وحی الہی کو ماننے والی اور نہ ماننے والی دو جماعتیں ہیں، جن کے بارے میں اللہ تعالی نے مثال دے کر فرمایا کہ ان دو گروہوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو اور دوسرا دیکھتا بھی سنتا بھی ہو کیا یہ دونوں اپنے حالات میں برابر ہو سکتے ہیں؟'' یعنی جس طرح ایک وہ شخص جو سب کچھ دیکھ سکتا ہے اور دوسرا وہ شخص جو کچھ بھی نہیں دیکھ سکتا؛ برابر نہیں ہو سکتے، تو پھر ایک وہ شخص جو ایمان رکھتا ہے اور قرآن کو مانتا ہے اور دوسرا وہ شخص جو نہ ایمان رکھتا ہے اور نہ قرآن کو مانتا ہے کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰی وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴿۲۴﴾

ان دو گروہوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو، اور دوسرا دیکھتا بھی ہو، سنتا بھی ہو۔ کیا یہ دونوں اپنے حالات میں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا پھر بھی تم عبرت حاصل نہیں کرتے؟ (۲۴)

قرآن کا ایک عجیب انداز:

قرآن کریم کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ دلائل کے ذریعہ کفار اور مشرکین کے نظریات کی تردید کے بعد گزشتہ اقوام اور انبیاء کے واقعات اور قصص بیان کرتا ہے، ایسا کرنے سے دلائل کی تاکید بھی ہوجاتی ہے، اور کلام میں تفنن اور تنوع بھی پیدا ہوجاتا ہے، انسان کی طبیعت تنوع پسند ہے، اللہ تعالی نے جیسے تکوینی آیات یعنی اس حسی اور مادی جہان میں تنوع کا لحاظ رکھا ہے، یوں ہی تشریعی آیات یعنی قرآن میں بھی اس کا لحاظ رکھا ہے۔

حسی جہاں:

آپ حسی جہاں میں دیکھیں تو لحہ بہ لحہ مناظر، موسم اور اوقات بدلتے جاتے ہیں۔

کہیں پھول، کہیں کانٹے، کہیں بلند و بالا پہاڑ، کہیں ہموار میدان، کہیں دریاؤں کی سرکش موجیں، کہیں اڑتی ہوئی خاک، پھر کبھی سردی کبھی گرمی، کبھی بہار کبھی خزاں، کبھی صبح کبھی دوپہر اور کبھی شام۔

تشریعی جہاں:

یوں ہی اس تشریعی جہاں میں مضامین بدلتے رہتے ہیں، احکام کے ساتھ اخبار، دلائل کے ساتھ قصص و واقعات، مواعظ کے ساتھ جنت اور جہنم کے مناظر، بشارت کے ساتھ انذار اور وعدوں کے ساتھ وعیدوں کا بیان ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے، اور کلام ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف، ایک منظر سے دوسرے منظر کی طرف، ایک قصہ سے دوسرے قصہ کی طرف اور ایک مضمون سے دوسرے مضمون کی طرف منتقل ہوتا چلا جاتا ہے اور پڑھنے سننے والا اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔

وحی، نبوت اور قرآن:

سورۂ ہود میں بھی قرآن کے اس خاص انداز کی جھلک نمایاں دکھائی دیتی ہے۔

◇ پہلے قرآن کی صداقت اور توحید ورسالت کی حقانیت کے دلائل ذکر کیے گئے۔

◇ اس کے بعد حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب، حضرت موسی اور حضرت ہارون علیہم السلام کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔

◇ یہ تمام قصے وحی کے اثبات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی سچائی اور قرآن کے معجزہ ہونے کو بیان کرنے کے لیے لائے گئے ہیں۔

مشرکین مکہ بخوبی جانتے تھے:

مشرکین مکہ بخوبی جانتے تھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ قراءت جانتے ہیں نہ ہی کتابت سے آشنا ہیں اور نہ ہی آپ نے کسی کی شاگردی اختیار کی؛ لیکن اس کے باوجود اتنی صحت، باریکی اور کامل درجہ کی درستگی کے ساتھ ان واقعات کو بیان کرنا وحی کے بغیر کیسے ممکن تھا، خود قرآن نے اس طرف متوجہ کرنے کے لیے انبیاء اور مرسلین کے

واقعات بیان کرنے کے بعد عام طور پر وحی اور نبوت کا تذکرہ کیا ہے۔

قوم نوح کے سوالات:

اہل حق اور اہل باطل کا برابر ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جیسا کہ بینا اور نابینا اور شنوا اور بہرے کا برابر ہونا ناممکن ہے۔ پس غور کرلو کہ ان دو مختلف اور متضاد فریقین کا انجام کیسے یکساں ہوسکتا ہے۔

اب آگے اسی مضمون کی تائید اور تاکید کے لیے چند عبرتناک واقعات بیان کرتے ہیں، جن میں اول قصہ حضرت نوح (علیہ السلام) کی قوم کا ہے کہ جو صدہا سال کی نصیحت کے بعد بھی راہ راست پر نہ آئے بالآخر غرق ہوئے، یہ قصہ اگرچہ سورہ یونس میں مذکور ہو چکا ہے، مگر یہاں کچھ زائد حالات کا ذکر ہے جن سے جدید فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب نوح (علیہ السلام) کو چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی، ساڑھے نوسو برس قوم کو نصیحت کرتے رہے اس کے بعد طوفان آیا۔ طوفان کے ساٹھ برس بعد تک زندہ رہے، اس قسم کے واقعات سے کفار کو تنبیہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب سے دلگیر نہ ہوں اطمینان اور صبر کے ساتھ دعوت اور تبلیغ میں لگے رہیں۔ (تفسیر ادریسی: ۴/ ۲۲، ۲۳)

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾

اس پر ان کی قوم کے وہ سردار لوگ جنہوں نے کفر اختیار کرلیا تھا، کہنے لگے کہ: ہمیں تو اس سے زیادہ (تم میں) کوئی بات نظر نہیں آرہی کہ تم ہم جیسے ہی ایک انسان ہو، اور ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ صرف وہ لوگ تمہارے پیچھے لگے ہیں جو ہم میں سب سے زیادہ بے حیثیت ہیں، اور وہ بھی سطحی طور پر رائے قائم کرکے۔ اور ہمیں تم میں کوئی ایسی بات بھی دکھائی نہیں دیتی جس کی وجہ سے ہم پر تمہیں کوئی فضیلت حاصل ہو، بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ تم سب جھوٹے ہو۔

قوم نوح کے سوال اور حضرت نوح علیہ السلام کے جواب:

قوم نوح کے تین سوال تھے:

(۱) آپ بشر کیوں؟ (۲) آپ کے متبعین کم درجے کے لوگ ہیں؟ (۳) آپ پر وحی کیوں آتی ہے؟

آپ نے جواب دیا کہ اللہ نے اپنی رحمت سے میرا انتخاب فرمایا ہے، اگر تمہارا انتخاب نہیں فرمایا تو میں کیا کروں؟ اسی طرح تم کہتے ہو کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں، اور جو لوگ میرے متبعین ہیں، وہ تمہاری نظر میں کم درجے کے ہیں اور سب صرف ظاہری طور پر ایمان لائے ہیں، تو میں تم سے یہ نہیں کہتا میرے پاس خزانے ہیں یا مجھے غیب کا علم ہے، یا میں فرشتہ ہوں اور نہ ہی یہ سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں کو تم حقیر جانتے ہو، اللہ ان کو بھلائی نہ دے گا؛ لیکن جب قوم لاجواب ہوگئی، تو کہنے لگے کہ بس بس بہت لڑ چکے، اب اپنی دعوت الگ رکھو اور جس چیز (عذاب) کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو، اسے لے

آ ؤ، ہم ماننے والے نہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ....... الی.......فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾

نوح نے کہا: اے میری قوم! ذرا مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے آئی ہوئی ایک روشن ہدایت پر قائم ہوں، اور اس نے مجھے خاص اپنے پاس سے ایک رحمت (یعنی نبوت) عطا فرمائی ہے، پھر بھی وہ تمہیں سجھائی نہیں دے رہی، تو کیا ہم اس کو تم پر زبردستی مسلط کر دیں جبکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو؟ (۲۸) اور اے میری قوم! میں اس (تبلیغ) پر تم سے کوئی مال نہیں مانگتا، میرا اجر اللہ کے سوا کسی اور نے ذمے نہیں لیا، اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، میں ان کو دھتکارنے والا نہیں ہوں، ان سب کو اپنے رب سے جا ملنا ہے؛ لیکن میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم ایسے لوگ ہو جو نادانی کی باتیں کر رہے ہو۔ (۲۹) اور اے میری قوم! اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو کون مجھے اللہ (کی پکڑ) سے بچائے گا؟ کیا تم پھر بھی دھیان نہیں دو گے؟ (۳۰) اور میں تم سے یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ میرے قبضے میں اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب کی ساری باتیں جانتا ہوں، اور نہ میں تم سے یہ کہہ رہا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں۔ اور جن لوگوں کو تمہاری نگاہیں حقیر سمجھتی ہیں، ان کے بارے میں بھی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ انہیں کبھی کوئی بھلائی عطا نہیں کرے گا۔ ان کے دلوں میں جو کچھ ہے اسے اللہ سب سے زیادہ جانتا ہے۔ اگر میں ان کے بارے میں ایسی باتیں کہوں تو میرا شمار یقینا ظالموں میں ہوگا۔ (۳۱) انہوں نے کہا کہ: اے نوح! تم ہم سے بحث کر چکے، اور بہت بحث کر چکے۔ اب اگر تم سچے ہو تو لے آؤ وہ (عذاب) جس کی دھمکی ہمیں دے رہے ہو۔ (۳۲)

غیب کی خبریں:

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾

(اے پیغمبر) یہ غیب کی کچھ باتیں ہیں جو ہم تمہیں وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں۔ یہ باتیں نہ تم اس سے پہلے جانتے تھے، نہ تمہاری قوم۔ لہٰذا صبر سے کام لو اور آخری انجام متقیوں ہی کے حق میں ہوگا۔ (۴۹)

حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس آیت نے دو حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ایک یہ کہ یہ واقعہ نہ صرف آپ کو بلکہ قریش اور عرب کے غیر اہل کتاب میں سے کسی کو پہلے معلوم نہیں تھا، اور آپ کے پاس اس کو اہل کتاب سے سیکھنے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے معلوم ہوا ہے۔ اس سے آپ کی نبوت اور رسالت کی دلیل ملتی ہے۔ دوسرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی طرف سے جس تکذیب اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس واقعے کے ذریعہ

آپ کو اول تو صبر سے کام لینے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اور دوسرے یہ تسلی دی گئی ہے کہ جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کو شروع میں سخت مشکلات پیش آئیں، مگر آخر انجام انہی کے حق میں ہوا اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالآخر ان لوگوں پر غالب آئیں گے۔ (توضیح القرآن، خلاصۃ القرآن: م اش)

حضرت ہودؑ کی دعوت اور قوم کی ہلاکت :

نوح (علیہ السلام) کے قصہ کے بعد دوسرا قصہ ہود (علیہ السلام) اور ان کی قوم عاد کا ہے جس میں قوم عاد کی ضلالت اور عذاب کا حال بیان فرمایا ہے، یہ لوگ شرک اور بت پرستی میں مبتلا تھے اور دولت وثروت کی وجہ سے مغرور تھے۔ اور انبیاء (علیہ السلام) اور ان کے متبعین کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے قوم عاد کو دو خصوصیتیں عطا فرمائی تھیں، ایک قوت وتوانائی کما قال تعالیٰ و قالوا من اشد منا قوۃ۔ دوم یہ کہ ان کے بلاد نہایت سرسبز اور شاداب تھے، یمن ان کا مسکن تھا۔ صاحب زراعت اور صاحب عمارت تھے۔

اس قصہ میں اشارہ اس طرف ہے کہ قوم عاد؛ ہود (علیہ السلام) کی قریبی رشتہ دار تھی اور ہود (علیہ السلام) اسی قبیلے کے ایک فرد تھے، مگر آخرت کے معاملہ میں قرابت نسبی کچھ کام نہ آئی۔ صرف ایمان کام آیا جیسے نوح (علیہ السلام) کے بیٹے کو نسب کام نہ آیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں: (تفسیر ادریسی: ۴/ ۴۳)

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ .... الیٰ........ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾

اور قوم عاد کے پاس ہم نے ان کے بھائی ہود کو پیغمبر بنا کر بھیجا، انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، تمہاری حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم نے جھوٹی باتیں تراش رکھی ہیں۔ (۵۰) اے میری قوم! میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجرت نہیں مانگتا، میرا اجر کسی اور نے نہیں، اس ذات نے اپنے ذمے لیا ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے، کیا پھر بھی تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ (۵۱) اے میری قوم! اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی مانگو، پھر اس کی طرف رجوع کرو، وہ تم پر آسمان سے موسلا دھار بارشیں برسائے گا، اور تمہاری موجودہ قوت میں مزید قوت کا اضافہ کرے گا، اور مجرم بن کر منہ نہ موڑو۔ (۵۲) انہوں نے کہا: اے ہود! تم ہمارے پاس کوئی روشن دلیل لے کر نہیں آئے اور ہم اپنے خداؤں کو صرف تمہارے کہنے سے چھوڑنے والے نہیں ہیں، اور نہ ہم تمہاری بات پر ایمان لا سکتے ہیں۔ (۵۳) ہم تو اس کے سوا کچھ اور نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے خداؤں میں سے کسی نے تمہیں بری طرح جھپیٹے میں لے لیا ہے، ہود نے کہا: میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں، اور تم بھی گواہ رہو کہ تم اللہ کے سوا جس جس کو اس کی خدائی میں شریک مانتے ہو، میں اس سے بری ہوں۔ (۵۴) اب تم سب کے سب ملکر میرے خلاف چالیں چل لو، اور مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ (۵۵) میں نے تو اللہ پر بھروسہ کر رکھا ہے جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار۔ زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے قبضے میں نہ ہو، یقیناً میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے۔ (۵۶) پھر بھی اگر تم

منہ موڑتے ہو تو جو پیغام دے کر مجھے تمہارے پاس بھیجا گیا تھا میں نے وہ تمہیں پہنچا دیا ہے، اور (تمہارے کفر کی وجہ سے) میرا پروردگار تمہاری جگہ کسی اور قوم کو یہاں بسا دے گا، اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ بیشک میرا پروردگار ہر چیز کی نگرانی کرتا ہے۔ (۵۷) اور (آخر کار) جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت کے ذریعے ہود کو اور جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لائے تھے، ان کو بچا لیا، اور انہیں ایک سخت عذاب سے نجات دے دی۔ (۵۸) یہ تھے عاد کے لوگ جنہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کا انکار کیا، اور اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی، اور ہر ایسے شخص کا حکم مانا جو پرلے درجے کا جابر اور حق کا پکا دشمن تھا۔ (۵۹) اور (اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ) اس دنیا میں بھی پھٹکار ان کے پیچھے لگا دی گئی، اور قیامت کے دن بھی۔ یاد رکھو کہ قوم عاد نے اپنے رب کے ساتھ کفر کا معاملہ کیا تھا۔ یاد رکھو کہ بربادی عاد ہی کی ہوئی، جو ہود کی قوم تھی۔ (۶۰)

حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت اور قوم کی بربادی:

اب یہ تیسرا قصہ حضرت صالح (علیہ السلام) اور ان کی قوم ثمود کا ہے اور حضرت ہود (علیہ السلام) اور حضرت صالح (علیہ السلام) کے درمیان سو برس کا فاصلہ ہے۔ حضرت ہود (علیہ السلام) کی امت کو عاد اولیٰ کہتے ہیں اور حضرت صالح (علیہ السلام) کی امت کو عاد ثانیہ کہتے ہیں۔ جس کا نام ثمود ہے اور حجر میں- جو شام اور مدینہ منورہ کے درمیان ہے- رہا کرتے تھے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ ....الیٰ...............اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾

صالح علیہ السلام نے کہا: اے میری قوم! ذرا مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے آئی ہوئی ایک روشن ہدایت پر قائم ہوں، اور اس نے مجھے خاص اپنے پاس سے ایک رحمت (یعنی نبوت) عطا فرمائی ہے، پھر بھی اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو کون ہے جو مجھے اللہ (کی پکڑ) سے بچا لے؟ لہٰذا تم (میرے فرائض سے روک کر) بربادی میں مبتلا کرنے کے سوا مجھے اور کیا دے رہے ہو؟ (۶۳) اور اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے ایک نشانی بن کر آئی ہے۔ لہٰذا اس کو آزاد چھوڑ دو کہ یہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرے، اور اس کو برے ارادے سے چھونا بھی نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں عنقریب آنے والا عذاب آ پکڑے۔ (۶۴) پھر ہوا یہ کہ انہوں نے اس کو مار ڈالا، چنانچہ صالح علیہ السلام نے کہا کہ: تم اپنے گھروں میں تین دن اور مزے کر لو، (اس کے بعد عذاب آئے گا اور) یہ ایسا وعدہ ہے جسے کوئی جھوٹا نہیں کر سکتا۔ (۶۵) پھر جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے صالح کو اور ان کے ساتھ جو ایمان لائے تھے، ان کو اپنی خاص رحمت کے ذریعے نجات دی، اور اس دن کی رسوائی سے بچا لیا، یقیناً تمہارا پروردگار بڑی قوت کا، بڑے اقتدار کا مالک ہے۔ (۶۶) اور جن لوگوں نے ظلم کا راستہ اپنایا تھا، ان کو ایک چنگھاڑ نے آ پکڑا، جس کے نتیجے میں وہ اپنے گھروں میں اس طرح اوندھے پڑے رہ گئے۔ (۶۷) جیسے کبھی وہاں بسے ہی نہ تھے۔ یاد رکھو کہ ثمود نے اپنے رب کے ساتھ کفر کا معاملہ کیا تھا، یاد رکھو کہ بربادی ثمود ہی کی ہوئی۔ (۶۸)

حضرت شعیبؑ کی قوم کے ساتھ گفتگو:

یہ چھٹا قصہ شعیب (علیہ السلام) کا ہے جو خطیب الانبیاء کے لقب سے معروف ہیں اور مدین کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ یہ لوگ بڑے سرمایہ دار تھے، ان کا مذہب یہ تھا کہ ہم اپنے مالوں کے تصرف میں آزاد اور مختار ہیں (جیسا کہ آج کل کے سرمایہ دار کہتے ہیں) جس طرح چاہیں ان میں تصرف کریں، حضرت شعیب (علیہ السلام) یہ فرماتے تھے کہ یہ اموال اگرچہ تمہارے مملوک ہیں مگر تمہاری ملکیت مالک حقیقی کی ملکیت اور اس کے حکم کے ماتحت ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ .... الیٰ.........اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ۝۹۵

وہ کہنے لگے: اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جن کی عبادت کرتے آئے تھے، ہم انہیں بھی چھوڑ دیں اور اپنے مال و دولت کے بارے میں جو کچھ ہم چاہیں، وہ بھی نہ کریں، واقعی تم تو بڑے عقل مند، نیک چلن آدمی ہو۔ (۸۷) شعیب نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! ذرا مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشن دلیل پر قائم ہوں، اور اس نے خاص اپنے پاس سے مجھے اچھا رزق عطا فرمایا ہے، تو پھر میں تمہارے غلط طریقے پر کیوں چلوں؟ اور میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے کہ میں جس بات سے تمہیں منع کر رہا ہوں، تمہارے پیچھے جا کر وہی کام خود کرنے لگوں۔ میرا مقصد اپنی استطاعت کی حد تک اصلاح کے سوا کچھ نہیں ہے، اور مجھے جو کچھ توفیق ہوتی ہے صرف اللہ کی مدد سے ہوتی ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کر رکھا ہے اور اسی کی طرف میں (ہر معاملے میں) رجوع کرتا ہوں۔ (۸۸) اور اے میری قوم! میرے ساتھ ضد کا جو معاملہ تم کر رہے ہو، وہ کہیں تمہیں اس انجام تک نہ پہنچا دے کہ تم پر بھی ویسی ہی مصیبت نازل ہو جیسی نوح کی قوم پر یا ہود کی قوم پر یا صالح کی قوم پر نازل ہو چکی ہے۔ اور لوط کی قوم تو تم سے کچھ دور بھی نہیں ہے۔ (۸۹) تم اپنے رب سے معافی مانگو، پھر اسی کی طرف رجوع کرو، یقین رکھو کہ میرا رب بڑا مہربان، بہت محبت کرنے والا ہے۔ (۹۰) وہ بولے: اے شعیب! تمہاری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمارے درمیان ایک کمزور آدمی ہو، اور اگر تمہارا خاندان نہ ہوتا تو ہم تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیتے۔ ہم پر تمہارا کچھ زور نہیں چلتا۔ (۹۱) شعیب نے کہا: اے میری قوم! کیا تم پر میرے خاندان کا دباؤ اللہ سے زیادہ ہے؟ اور اس کو تم نے بالکل ہی پس پشت ڈال رکھا ہے۔ یقین جانو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، میرا پروردگار اس سب کا پورا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ (۹۲) اور اے میری قوم! تم اپنے حال پر رہ کر (جو چاہو) عمل کیے جاؤ، میں بھی (اپنے طریقے کے مطابق) عمل کر رہا ہوں۔ عنقریب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کس پر وہ عذاب نازل ہوگا جو اسے رسوا کر کے رکھ دے گا، اور کون ہے جو جھوٹا ہے؟ اور تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔ (۹۳) اور (آخر کار) جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے شعیب کو اور ان کے ساتھ جو ایمان لائے تھے، ان کو اپنی خاص رحمت سے بچا لیا، اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انہیں

ایک چنگھاڑ نے آ پکڑا، اور وہ اپنے گھروں میں اس طرح اوندھے منہ گرے رہ گئے۔(۹۴) جیسے کبھی وہاں بسے ہی نہ تھے۔ یادرکھو! مدین کی بھی ویسی ہی بربادی ہوئی جیسی بربادی ثمود کی ہوئی تھی۔(۹۵)

استغفار بہت بڑی حقیقت اور بڑی ضروری چیز ہے۔ بزرگان دین فرماتے ہیں کہ انسان کے لئے استغفار بمنزلہ صابن کے ہے۔ انسان کے دل پر جتنی زیادہ میل کچیل ہوگی اتنی زیادہ استغفار کی ضرورت ہوگی۔ اس کے بعد تسبیح و تحلیل بمنزلہ خوشبو کے ہے اور استغفار کے بعد تسبیح و تہلیل انسان کی روح کو نکھار دیتی ہے۔ اسی لئے بزرگان دین ان وظائف کی بڑی تلقین کرتے ہیں۔

حدیث شریف میں استغفار کے کئی کلمات آئے ہیں۔ مثلاً **استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم و اتوب الیہ** میں اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ اور قائم ہے اور میں اس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ **استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ**۔ میں ہر گناہ سے اللہ تعالیٰ کی بخشش طلب کرتا ہوں اور اس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ خالی استغفر اللہ کا ورد بھی کرتا رہے تو درست ہے، صحابہ بیان کرتے ہیں کہ خود حضور (علیہ الصلوۃ والسلام) ایک ایک مجلس میں سو سو مرتبہ استغفار کے کلمات اپنی زبان مبارک سے ادا فرماتے تھے۔ ترمذی اور ابن ماجہ شریف کی روایت میں آتا ہے: **کلکم خطاؤون و خیر الخطائین التوابون** یعنی تم میں سے ہر شخص خطا کار ہے اور بہتر خطا کار وہ ہے جو غلطی کرنے کے بعد معافی مانگ لیتا ہے اور اس پر اصرار نہیں کرتا۔ جب کوئی شخص صدق دل سے تائب ہوجاتا ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا: **التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ** گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔ تو فرمایا: ایک تو اللہ سے معافی مانگو اور دوسرے یہ کہ **ثم توبوا الیہ** پھر اس کے سامنے توبہ بھی کرو کہ آئندہ ایسا غلط کام نہیں کروں گا۔ (معالم العرفان: ۱۰/ ۴۶۴)

عبرتیں اور نصیحتیں:

امم ظالمہ کے عبرتناک قصص کا بیان ہوا جن میں کفار کے شبہات اور انبیاء کرام (علیہ السلام) کے جوابات کا ذکر تھا، اب ان واقعات کے ذکر کرنے کی حکمت بیان کرتے ہیں کہ دیکھ لو کہ کفر و تکذیب کا انجام باعتبار دنیا کے بھی برا ہے اور باعتبار آخرت کے بھی برا ہے جن لوگوں نے انبیاء (علیہ السلام) کا مقابلہ کیا۔ وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوئے اور ان کی بستیاں تباہ و برباد ہوئیں، ان آیات میں کفر و تکذیب کا مقابلہ کیا۔ وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوئے اور ان کی بستیاں تباہ و برباد ہوئیں ان آیات میں کفر و تکذیب کے دنیوی انجام کو بیان کرتے ہیں تا کہ عبرت پکڑیں اور آئندہ آیت **ام فی ذلک لایۃ لمن خاف عذاب الاخرۃ** میں کفر و تکذیب کے عذاب اخروی کو بیان کرتے ہیں، تا کہ لوگ نصیحت پکڑیں اور سمجھیں کہ حق اور صداقت کا انجام کیسا ہوتا ہے۔ اور اس قسم کے عجیب و غریب واقعات کا بلا تعلیم و تعلم بیان کرنا یہ آپ ﷺ کی نبوت کی دلیل ہے، کیونکہ اس قسم کا علم بدون وحی الٰہی ناممکن اور محال ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۴/ ۶۹)

چنانچہ فرماتے ہیں :

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ .... الی.......... لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿۱۰۵﴾

یہ ان بستیوں کے کچھ حالات ہیں جو ہم تمہیں سنا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ (بستیاں) وہ ہیں جو ابھی اپنی جگہ کھڑی ہیں، اور کچھ کٹی ہوئی فصل (کی طرح بے نشان) بن چکی ہیں۔(۱۰۰) اور ان پر ہم نے کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ انہوں نے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب تمہارے پروردگار کا حکم آیا تو جن معبودوں کو وہ اللہ کے بجائے پکارا کرتے تھے، وہ ان کے ذرا بھی کام نہ آئے، اور انہوں نے ان کو تباہی کے سوا اور کچھ نہیں دیا۔(۱۰۱) اور جو بستیاں ظالم ہوتی ہیں، تمہارا رب جب ان کو گرفت میں لیتا ہے تو اس کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے۔ واقعی اس کی پکڑ بڑی دردناک، بڑی سخت ہے۔(۱۰۲) ان ساری باتوں میں اس شخص کے لیے بڑی عبرت ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہو۔ وہ ایسا دن ہوگا جس کے لیے تمام لوگوں کو اکٹھا کیا جائے گا، اور وہ ایسا دن ہوگا جسے سب کے سب کھلی آنکھوں دیکھیں گے۔(۱۰۳) ہم نے اسے ملتوی کیا ہے، تو بس ایک گنی چنی مدت کے لیے ملتوی کیا ہے۔(۱۰۴) جب وہ دن آجائے گا تو کوئی اللہ کی اجازت کے بغیر بات نہیں کر سکے گا۔ پھر ان میں کوئی بدحال ہوگا، اور کوئی خوشحال۔(۱۰۵)

ان واقعات میں ایک طرف تو عقل فہم اور سمع و بصر والوں کے لیے بے پناہ عبرتیں اور نصیحتیں ہیں، اور دوسری طرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مخلص اہل ایمان کے لیے تسلی اور ثابت قدمی کا سامان اور سبق ہے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

سعداء واشقیاء کا حال:

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ .... الی........ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾

چنانچہ جو بدحال ہوں گے وہ دوزخ میں ہوں گے جہاں ان کی چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں گی۔(۱۰۶) یہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں، الا یہ کہ تمہارے رب ہی کو کچھ اور منظور ہو، یقیناً تمہارا رب جو ارادہ کر لے، اس پر اچھی طرح عمل کرتا ہے۔(۱۰۷) اور جو لوگ خوشحال ہوں گے وہ جنت میں ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں، الا یہ کہ تمہارے رب ہی کو کچھ اور منظور ہو۔ یہ ایک ایسی عطا ہوگی جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آئے گی۔(۱۰۸)

امام بلخی رحمہ اللہ نے شقی اور سعید کی پانچ پانچ نشانیاں لکھی ہیں۔ سعید کی پانچ یہ ہیں (۱) دل کی نرمی (۲) اللہ کے خوف سے بہت رونا (۳) آرزو کا تھوڑا ہونا (۴) دنیا سے نفرت (۵) اللہ کے سامنے شرمندہ رہنا۔ اور شقی کی پانچ نشانیاں یہ ہیں (۱) دل کی سختی (۲) آنکھوں کی خشکی (۳) دنیا کی رغبت (۴) آرزوؤں کا زیادہ ہونا (۵) بے حیائی۔ اللہ تعالیٰ ہم

سب کی حفاظت فرمائیں۔اور سعداء میں ہمیں شامل فرمائیں۔(خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

استقامت کا حکم:

فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٢﴾

لہذا (اے پیغمبر) جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق تم بھی سیدھے راستے پر ثابت قدم رہو، اور وہ لوگ بھی جو توبہ کر کے تمہارے ساتھ ہیں، اور حد سے آگے نہ نکلو۔یقین رکھو کہ جو عمل بھی تم کرتے ہو وہ اسے پوری طرح دیکھتا ہے۔(۱۱۲)

اس لیے یہ واقعات بیان کرتے ہوئے آپ کو استقامت کا حکم دیا گیا ہے جو کہ حقیقت میں پوری امت کو حکم ہے، استقامت ایک ایسا حکم ہے، جس کا تعلق عقائد، اقوال واعمال اور اخلاق سب ہی کے ساتھ ہے۔استقامت کوئی آسان چیز نہیں ہے؛ بلکہ انتہائی مشکل صفت ہے جو اللہ کے مخصوص بندوں ہی کو حاصل ہوتی ہے، استقامت کا مطلب یہ ہے کہ پوری زندگی ان تعلیمات کے مطابق گزاری جائے جن کے مطابق گزارنے کا اللہ تعالی نے حکم دیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس آیت سے زیادہ سخت آیت کوئی نازل نہیں ہوئی۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایک موقع پر ریش مبارک میں چند سفید بال دیکھتے ہوئے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑھاپا تیزی سے آرہا ہے، تو آپ نے فرمایا: مجھے ہود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔

علماء کہتے ہیں کہ آپ کا ارشاد سورہ ہود کی اس آیت کی طرف تھا جس میں آپ کو استقامت کا حکم دیا گیا ہے۔(خلاصۃ القرآن:م اش)

استقامت کا لغوی معنی تو ہے سیدھا کھڑا ہونا، جس میں کسی طرف جھکاؤ نہ ہو اور شریعت کی اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، کسب معاش اور اس کے آمد وخرچ کے تمام ابواب میں اللہ جل شانہ کی قائم کردہ حدود کے اندر شریعت کے بتلائے ہوئے راستے پر سیدھا چلتا رہے، خلاصہ یہ کہ اپنی پوری زندگی ان تعلیمات کے مطابق گذار دی جائے جن کے مطابق گزارنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس دنیا میں سب سے دشوار کام استقامت ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس سے زیادہ سخت آیت کوئی نازل نہیں ہوئی۔علمائے ربانیین نے استقامت کو عین کرامت قرار دیا ہے، بلکہ حضرات صوفیائے کرام نے تو یہاں تک فرمایا کہ استقامت سے بڑی کوئی کرامت نہیں۔

اللہ کی طرف رغبت حاصل کرنے کا اور استقامت کے حصول کی کوشش کرنے کا اللہ نے نسخہ ارشاد فرمایا کہ

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِیْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۱۵﴾

اور (اے پیغمبر) دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم کرو، یقینا نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ ایک نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جو نصیحت مانیں۔ (۱۱۴) اور صبر سے کام لو، اس لیے کہ اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ (۱۱۵)

اس آیت کریمہ میں انتہائی جامع نصیحت فرما دی، کیونکہ استقامت ایک مشکل کام ہے، اس لئے اس سلسلے میں نماز سے مدد حاصل کرو کہ وہ نیکیوں کی سردار ہے، اس کی وجہ سے برائیاں مٹیں گی اور نیکیاں بڑھ کر استقامت کے حصول میں مددگار ہوگی، اور اگر اس دوران میں کوئی تکلیف آجائے تو صبر کا دامن تھام لو کیونکہ اللہ نیکیوں کو ضائع نہیں فرماتے، جلد ہی وہ اس پریشانی اور تکلیف کو دور فرما دیں گے۔ (خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

نماز ایک ایسی عبادت ہے جس سے تعلق باللہ درست ہوتا ہے۔ پانچ وقتہ نماز تقرب الی اللہ کا بہترین ذریعہ ہے، اگر انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست ہوجائے گا تو انسان ظلم سے بچ جائیں گے، وہ تمام حقوق ادا کریں گے اور ظلم و زیادتی کا قلع قمع کر دیں گے۔ اس کے برخلاف اگر حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ضائع کیا گیا تو اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم نہیں رہ سکے گا اور ساری باتیں بگڑ جائیں گی، جو شخص نماز کو ضائع کرتا ہے، اس کے لئے دین کی باقی باتوں کو ضائع کرنا آسان ہے۔ حضرت عمر فاروق کا قول بھی ہے کہ لوگو! نماز قائم کرو تا کہ تمہارا تعلق باللہ درست رہے۔ (معالم العرفان: ۱۰/۵۵۹)

گذشتہ واقعات پر مرتب ہونے والے امور:

(۱) تلقین استقلال وتسلی، یعنی: آپ کو جس کام کا حکم دیا گیا ہے، آپ اس کام پر استقامت کے ساتھ قائم رہیں۔ (۲) دائرہ دین سے مت نکلو۔ (۳) کافروں اور مشرکوں کی طرف میلان مت رکھو۔ (۴) نمازوں کو ان کے اوقات میں پابندی کے ساتھ ادا کرو۔ (۵) صبر کو مضبوطی سے تھامو اور اخلاق سے پیش آؤ۔ (خلاصۂ مضامین قرآن مولانا منظور یوسف)

سرکش قوموں کی گرفت:

گویا یہ بتایا گیا کہ جس اللہ نے کل کی نافرمان بستیوں پر عذاب نازل کیا تھا وہ آج بھی سرکش قوموں کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے، عام طور پر کسی قوم پر اللہ کا عذاب اس وقت نازل ہوتا ہے جب اس کے اندر دو خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں، ایک تو یہ کہ ایسے دردمند اور ہوشمند لوگ نہیں رہتے جو انہیں فتنہ وفساد سے منع کریں اور دوسری خرابی یہ کہ وہ قوم حد سے زیادہ عیش پرستی اور گناہوں میں مست ہوجاتی ہے۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِیَّةٍ یَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِی الْاَرْضِ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّنْ اَنْجَیْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَاۤ اُتْرِفُوْا فِیْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿۱۱۶﴾

تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں، بھلا ان میں ایسے لوگ کیوں نہ ہوئے جن کے پاس اتنی بچی کھچی سمجھ تو ہوتی کہ وہ لوگوں کو زمین میں فساد مچانے سے روکتے؟ ہاں تھوڑے سے لوگ تھے جن کو ہم نے (عذاب سے) نجات دی تھی۔ اور جو لوگ ظالم تھے، وہ جس عیش وعشرت میں تھے، اسی کے پیچھے لگے رہے، اور جرائم کا ارتکاب کرتے رہے۔

استقامت دین:

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کے لیے تسلی اور صبر و استقامت کے پہلو کو مذکورہ واقعات کے بعد اس سورت کی اختتامی آیات میں بیان کیا گیا ہے:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِۦ فُؤَادَكَ ۚ .... الیٰ............ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٢٣﴾

اور (اے پیغمبر) گزشتہ پیغمبروں کے واقعات میں سے وہ سارے واقعات ہم تمہیں سنا رہے ہیں جن سے ہم تمہارے دل کو تقویت پہنچائیں۔ اوران واقعات کے ضمن میں تمہارے پاس جو بات آئی ہے وہ خود بھی حق ہے اور تمام مومنوں کے لیے نصیحت اور یاددہانی بھی ہے۔ (۱۲۰) اور جو لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں، ان سے کہو کہ: تم اپنی موجودہ حالت پر عمل کیے جاؤ، ہم بھی (اپنے طریقے پر) عمل کر رہے ہیں۔ (۱۲۱) اور تم بھی (اللہ کے فیصلے کا) انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ (۱۲۲) آسمانوں اور زمین میں جتنے پوشیدہ بھید ہیں، وہ سب اللہ کے علم میں ہیں، اور اسی کی طرف سارے معاملات لوٹائے جائیں گے۔ لہذا (اے پیغمبر) اس کی عبادت کرو، اور اس پر بھروسہ رکھو۔ اور تم لوگ جو کچھ کرتے ہو، تمہارا پروردگار اس سے بے خبر نہیں ہے۔ (۱۲۳)

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے موعظت کی تعریف یوں کی ہے **قهر المدرك الظلمانية بانوار المعارف القدسانية** یعنی انسانوں میں موجود تاریکی والے علوم وخیالات کو مقدس علوم اور معارف کے ساتھ مغلوب کرنے کا نام موعظت ہے۔ اس پر ترغیب اور ترہیب دونوں چیزیں آتی ہیں، کبھی انسان کو اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی ترغیب ہوتی ہے اور کبھی برے انجام سے ڈر آتا ہے اور اس طرح انسانی نفس موعظت سے متاثر ہوتا ہے۔ وعظ ونصیحت کا مقصود کوئی گانا بجانا نہیں ہوتا بلکہ تاریک خیالات کو ذہنوں سے نکال کر وہاں پر پاکیزہ خیالات کو جگہ دینا ہوتا ہے۔ (معالم العرفان: ۱۰/ ۵۷۲)

خلاصہ رکوع: ۲...... (۱) منکرین توحید، رحمت الٰہی کو زوال مصائب کا سبب نہیں سمجھتے بلکہ ایک اتفاقی امر جانتے ہیں۔ (۲) اطاعت کتاب اللہ سے جی چراتے ہیں، اسے بیکار بنانے کے لئے طرح طرح کے حیلے تراشتے ہیں۔ (۳) یہی ان کے خسران کا باعث ہوگا اور اہل توحید کامیاب ہوں گے۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۰۔ (۲) آیت: ۱۳، ۱۲۔ (۳) آیت: ۲۱، ۲۳۔

خلاصہ رکوع: ۳...... تذکیر بایام اللہ، حضرت نوح علیہ السلام توحید کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ماخذ: آیت: ۲۶۔

خلاصہ رکوع: ۴......معاندین توحید بالآخر برباد ہوتے ہیں۔ ماخذ: آیت: ۴۴۔

خلاصہ رکوع: ۵......تذکیر بایام اللہ، واقعہ قوم عاد، (۱) انہیں توحید کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ (۲) انکار کے باعث ہلاک ہوتے ہیں۔ ماخذ: (۱) آیت: ۵۰۔ (۲) آیت: ۶۰۔

خلاصہ رکوع: ۶......تذکیر بایام اللہ، (۱) قوم ثمود نے دعوت توحید کو رد کیا۔ (۲) اور ہلاک ہوئی۔ ماخذ: (۱) آیت: ۶۱۔ (۲) آیت: ۶۷۔

خلاصہ رکوع: ۷......تذکیر بایام اللہ، قوم لوط تعلق باللہ بگاڑنے کے باعث ہلاک ہوئی ہے۔ ماخذ: آیت: ۸۷، ۸۲۔

خلاصہ رکوع: ۸......تذکیر بایام اللہ۔ (۱) شعیب علیہ السلام کی دعوت الی التوحید۔ (۲) قوم کا انکار کے باعث ہلاک ہونا۔ ماخذ: (۱) آیت: ۸۴۔ (۲) آیت: ۹۴۔

خلاصہ رکوع: ۹......تذکیر بایام اللہ۔ (۱) فرعون کا جرم خلق اللہ کو اللہ تعالی سے توڑنا تھا۔ (۲) اس لئے تابع اور متبوع دونوں ملعونین ہوئے۔ (۳) تمام برباد شدہ قوموں کا جرم انکار توحید ہی تھا۔ ماخذ: (۱) آیت: ۹۷۔ (۲) آیت: ۹۹۔ (۳) آیت: ۱۰۱۔

خلاصہ رکوع: ۱۰......(۱) آپ کی دعوت پر بھی مخالفین ویسے ہی سر اٹھائیں گے۔ (۲) آپ اللہ تعالی کی عبادت میں شاغل رہیں، اس پر اعتماد کریں پھر دیکھیں کیا نتائج نکلتے ہیں۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۲۱، ۱۲۲۔ (۲) آیت: ۱۲۳۔

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ یوسف

سورۂ یوسف مکی ہے، اس میں ۱۱۱ آیات اور ۱۲ رکوع ہیں۔

یہ سورت بھی مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھی۔ بعض روایات میں ہے کہ کچھ یہودیوں نے آنحضرت ﷺ سے یہ سوال کروایا تھا کہ بنواسرائیل کے لوگ جو فلسطین کے باشندے تھے، مصر میں جا کر کیوں آباد ہوئے؟ ان لوگوں کا خیال تھا کہ آپ کے پاس چونکہ بنواسرائیل کی تاریخ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، اس لیے آپ اس سوال کا جواب نہیں دے پائیں گے، اور اس طرح آپ کے خلاف یہ پروپیگنڈا کرنے کا موقع مل جائے گا کہ آپ (معاذ اللہ) سچے نبی نہیں ہیں۔ اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ پوری سورۂ یوسف نازل فرمادی جس میں پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ حضرت یوسف (علیہ السلام) کا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے۔ دراصل بنواسرائیل کے جد امجد حضرت یعقوب (علیہ السلام) تھے، انہی کا دوسرا نام اسرائیل بھی تھا۔ ان کے بارہ صاحبزادے تھے، انہی کی نسل سے بنواسرائیل کے بارہ قبیلے پیدا

ہوئے۔اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یعقوب (علیہ السلام) اپنے صاحبزادوں کے ساتھ فلسطین میں مقیم تھے جن میں حضرت یوسف (علیہ السلام) اوران کے بھائی بنیامین بھی شامل تھے۔ان دونوں کے سوتیلے بھائیوں نے سازش کر کے حضرت یوسف (علیہ السلام) کوایک کنویں میں ڈال دیا، جہاں سے ایک قافلے نے انہیں اٹھا کرمصر کے ایک سردار کے ہاتھ بیچ دیا،شروع میں وہ غلامی کی زندگی گزارتے رہے،لیکن اس واقعے کے تحت جس کی تفصیل اس سورت میں آرہی ہے،اس سردار کی بیوی زلیخا نے انہیں گرفتار کر کے جیل بھجوادیا۔اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ مصر کے بادشاہ کے ایک خواب کی صحیح تعبیر دینے پر بادشاہ ان پر مہربان ہوا،اورانہیں نہ صرف جیل سے نکال کر باعزت بری کر دیا، بلکہ انہیں اپناوزیرخزانہ مقرر کیا،اور بعد میں حکومت کے سارے اختیارات انہی کوسونپ دیے۔اس کے بعد حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اپنے والدین کوفلسطین سے مصر بلوالیا۔اس طرح بنواسرائیل فلسطین سے مصر منتقل ہو گئے۔

سورۂ یوسف کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حضرت یوسف (علیہ السلام) کا پورا واقعہ ایک ہی تسلسل میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے،اورتقریبا پوری سورت اسی کے لیے وقف ہے،اور یہ واقعہ کسی اورسورت میں نہیں آیا۔اس واقعے کو اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے ان کافروں پرایک حجت قائم فرمادی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا انکار کرتے تھے۔ یہ بات ان پر بھی واضح تھی کہ اس واقعے کا علم ہونے کا آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا،لہذا یہ تفصیل آپ کو وحی کے علاوہ کسی اورطریقے سے حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔اس کے علاوہ مکہ مکرمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اورآپ کے صحابہ کرام کوکفار مکہ کی طرف سے جن تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا،ان کے پیش نظراس واقعے میں آپ کے لیے تسلی کا بھی بڑا سامان تھا کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) اپنے بھائیوں کی سازش کے نتیجے میں بڑے سخت حالات سے گزرے،لیکن آخرکار اللہ تعالیٰ نے انہی کوعزت،شوکت اورسر بلندی عطا فرمائی، اورجن لوگوں نے انہیں تکلیفوں کا نشانہ بنایا تھا،ان سب کوان کے آگے جھکنا پڑا۔اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کواگرچہ مکہ مکرمہ میں تکلیفیں اٹھانی پڑ رہی ہیں،لیکن آخرکار یہ سازشی لوگ آپ ہی کے سامنے جھکیں گے،اورحق غالب ہوکر رہے گا۔اس کے علاوہ بھی اس واقعے میں مسلمانوں کے لیے بہت سے سبق ہیں،اورشاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کوبہترین قصہ قرار دیا ہے۔(توضیح القرآن)

وجہ تسمیہ:

چونکہ اس سورت میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے،اس لیے اسے سورۂ یوسف کا نام دے دیا گیا۔

یہ قرآن کریم کی بارھویں سورۃ ہے اورترتیب نزول کے اعتبار سے ۵۳ نمبر پر ہے،اس سورۃ میں کل رکوع ۱۲، آیات ۱۱۱،کلمات ۱۸۰۸،اورکل حروف ۷۱۴۱ ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

ربط:

پہلی سورۃ میں اللہ عزوجل نے "**وکلا نقص علیک**" الآیۃ سے قصوں کی حکمت کا بیان کیا تھا،اس حکمت کے پیش

نظر تقریباً اس پوری سورۃ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا گیا ہے، جس طرح پہلے قصوں سے آپ کو تسلی دینا مقصود تھا ایسے ہی اس قصہ سے بھی آپ کو تسلی دی جارہی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی طرح آپ کے بھائی برادر بھی ناکام رہیں گے اور آپ ہر طرح منصور و مظفر ہوں گے۔

شان نزول:

◇...... درمنثور میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ ہم کو کوئی قصہ سنا دیں تو خوب ہو، اس پر یہ قصہ نازل ہوا۔

◇...... خازن میں بروایت ضحاک ابن عباس رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ یہود نے آپ سے یہ قصہ امتحاناً پوچھا تھا، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

خلاصہ سورۂ یوسف:

(۱) یہ سورۃ تمام تر مشتمل ہے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ پر اور قصہ کے آغاز سے پہلے قرآن کی حقیقت جس میں یہ قصہ بیان ہوا۔

(۲) قصہ کے ختم کے بعد اولاً توحید کا مضمون اور اس کے اخلال پر وعید۔

(۳) رسالت کی بحث اور منکرین کی بدانجامی کی اجمالی حکایت۔

(۴) ایسی حکایات اور قصص کا موجب عبرت ہونا۔

قصہ یوسف کے احسن القصص ہونے کی وجہ:

اس قصہ کو احسن القصص کیوں فرمایا؟ اس کی وجہ روح المعانی میں مختصر الفاظ میں یہ لکھی ہے کہ یہ قصہ ان امور پر مشمل ہے۔(۱) حاسد و محسود (۲) مالک و مملوک (۳) شاہد و مشہود (۴) عاشق و معشوق (۵) قید و رہائی (۲) قحط و خوشحالی (۷) گناہ اور عفو (۸) فراق و وصال (۹) بیماری و صحت (۱۰) حل وارتحال (۱۱) عزت و ذلت۔

قصہ کے نتائج:

(۱) قضاء و قدر کا کوئی دافع و مانع نہیں ہے (۲) خدا جس کو کوئی چیز پہنچانا چاہیں تو کوئی روک نہیں سکتا (۳) حسد سے حاسد ہی کو نقصان و خزلان ہوتا ہے (۴) صبر کشادگی کی کنجی ہے (۵) تدبیر کرنا عقل کی بات ہے (۲) اصلاح امور معاش میں عقل کام کی چیز ہے۔

فائدہ:

یہ قصہ اس سورۃ میں بالاستیعاب بیان کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صحابہ کی درخواست پر نازل ہوا، اس لئے بسط وتمام کے ساتھ بیان کیا گیا تا کہ صحابہ کا مقصود حاصل ہو جائے اور صحابہ کو راحت وسیری حاصل ہو۔

نیز اس قصہ کو دوسرے قصوں کی طرح مکرر نہیں ذکر کیا گیا، چونکہ دوسرے قصوں میں استیعاب نہیں ہے، اس لئے ہر ہر مقام کے مناسب مختلف فوائد کے لئے کچھ کچھ اجزاء لائے گئے بخلاف اس قصہ کے کہ سب اجزاء اور فوائد ایک جگہ مجتمع کردیئے گئے اس لئے اس میں تکرار نہیں ہے، واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

حضرت یوسفؑ کے چھ امتحان:

(۱) صبر کا امتحان یعنی کنویں میں ڈالے گئے مگر صبر کیا (۲) امانت کا امتحان (۳) فراست کا امتحان (۴) استقامت کا امتحان (۵) حلم کا امتحان (۶) تواضع کا امتحان۔ (خلاصۂ مضامین قرآن مولانا یوسف منظور)

بائبل میں حضرت یوسف وحضرت موسیٰ علیہما السلام کے زمانہ کے بادشاہ کو فرعون تحریر کرنا:

بنی اسرائیل حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں ۲۰ ویں صدی قبل مسیح میں مصر میں داخل ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تیرھویں صدی قبل مسیح میں مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں گئے، یہ دونوں واقعات بائبل میں بھی مذکور ہیں اور قرآن کریم میں بھی، مگر قرآن مجید کے بیانات خارجی تاریخ سے کامل مطابقت رکھتے ہیں، چنانچہ بائبل کے معتقدین کے لئے یہ مسئلہ پیدا ہوگیا کہ وہ بائبل کے بیان کو لیں یا تاریخ کے بیان کو، کیوں کہ دونوں کو بیک وقت لینا ممکن نہیں۔

حضرت یوسف جس زمانہ میں مصر میں داخل ہوئے ہیں، اس زمانہ میں وہاں ان لوگوں کی حکومت تھی، جن کو تاریخ میں چرواہے بادشاہ (Hyksos Kings) کہا جاتا ہے، یہ لوگ عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے اور باہر سے آکر مصر پر قابض ہوگئے تھے، یہ خاندان دو ہزار سال قبل مسیح سے لے کر پندرھویں صدی قبل مسیح کے آخر تک مصر میں حکمران رہا، اس کے بعد مصر میں غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بغاوت ہوئی اور ہکسوس کی حکومت ختم کردی گئی۔

اس کے بعد مصر میں ملک والوں کی حکومت قائم ہوئی، اس وقت جس خاندان کو مصر کی بادشاہی ملی اس نے اپنے حکمرانوں کے لئے فرعون کا لقب پسند کیا، فرعون کے لفظی معنی سورج، دیوتا کی اولاد کے ہیں، اس زمانہ میں مصر کے لوگ سورج کو پوجتے تھے، چنانچہ حکمرانوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ سورج دیوتا کا مظہر ہیں، تاکہ مصریوں کے اوپر اپنا حق حکومت ثابت کیا جاسکے۔

بائبل حضرت یوسف کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کو بھی فرعون کہتی ہے، اور حضرت موسیٰ کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کو بھی فرعون کہتی ہے۔

مگر قرآن شریف اس قسم کے اختلاف بیانی سے خالی ہے، اس لئے حاملین قرآن کریم کے لئے یہ مسئلہ نہیں کہ قرآن کریم کو لینے کے لئے انہیں تاریخی حقیقت کو چھوڑنا پڑے، قرآن کریم کے زمانۂ نزول میں یہ تاریخی واقعات لوگوں کو معلوم نہ تھے، یہ تاریخ ابھی تک قدیم آثار کی صورت میں زمین کے نیچے دفن تھی جن کو بہت بعد میں زمین کی کھدائی سے برآمد کیا گیا، اوران کی بنیاد پر مصر کی تاریخ مرتب کی گئی۔

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں حضرت یوسف کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کا ذکر آتا ہے، تو قرآن اس کے لئے ملک مصر (مصر کا بادشاہ) کا لفظ استعمال کرتا ہے، اور حضرت موسیٰ کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کا ذکر آتا ہے تو وہ اس کو بار بار فرعون کہتا ہے، اس طرح قرآن کریم کا بیان خارجی تاریخی حقیقت کے عین مطابق ٹھہرتا ہے، جب کہ بائبل کا بیان خارجی تاریخی حقیقت سے ٹکراتا ہے، یہ واقعہ بتاتا ہے کہ قرآن کریم کا مصنف ایک ایسا مصنف ہے جو انسانی معلومات کے ماوراء تمام کو براہ راست دیکھ رہا ہے۔ (جدید فلسفہ اور علم الکلام: ۳۵۰،۳۵۱)

واقعات میں تکرار:

قرآن کریم میں دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات میں تکرار پایا جاتا ہے، لیکن یہ تکرار کھٹکتا نہیں ہے، ہر جگہ نئے الفاظ، نئی تعبیر، کوئی نہ کوئی نیا سبق، نئی عبرت اور نئی نصیحت پائی جاتی ہے۔ یہ واقعات چھوٹے چھوٹے خوبصورت ٹکڑوں کی صورت میں پورے قرآن میں بکھرے ہوئے ہیں، ان ٹکڑوں کو جوڑنے سے پورا واقعہ سمجھ میں آتا ہے۔

اس واقعہ میں تکرار نہیں:

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے میں تکرار نہیں، یہ واقعہ اول سے آخر تک پورے کا پورا سورۂ یوسف ہی میں مذکور ہے، دوسری سورتوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کا نام تو آیا ہے؛ لیکن ان کے واقعہ کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی کسی دوسری سورت میں مذکور نہیں ہے۔

مخالفین عاجز:

اہل علم نے کہا ہے کہ مخالفین نہ تو قرآن کے ''مکرر'' قصوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی ''غیر مکرر'' قصوں کا۔

احسن القصص:

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کو خود قرآن نے ''احسن القصص'' قرار دیا ہے کیونکہ اس قصے میں جتنی عبرتیں اور نصیحتیں پائی جاتی ہیں وہ شاید ہی کسی دوسرے قصے میں پائی جاتی ہوں۔

اس قصہ کی جامعیت:

جامعیت کے اعتبار سے دیکھیں تو:

اس میں دین بھی ہے دنیا بھی ہے، توحید وفقہ بھی ہے اور سیرت وسوانح بھی، خوابوں کی تعبیر بھی ہے اور سیاست و حکومت کے رموز بھی، انسانی نفسیات بھی ہیں اور معاشی خوشحالی کی تدبیریں بھی، حسن وعشق کی حشر سامانی بھی ہے اور زہد وتقویٰ کی دستگیری بھی، اس میں انبیاء اور صالحین کا تذکرہ بھی ہے اور ملائکہ اور شیاطین کا بھی، جنوں اور انسانوں کا بھی تو چوپاؤں اور پرندوں کا بھی، بادشاہوں، تاجروں، عالموں اور جاہلوں کے حالات بھی ہیں تو راہ راست سے ہٹ جانے والی عورتوں کی حیلہ سازی، مکاری اور حیا باختگی بھی۔

پھر اس قصہ میں مد بھی جزر بھی، گمنامی بھی ہے اور شہرت بھی، غربت بھی ہے اور ثروت بھی، عزت بھی ہے اور ذلت بھی، صبر وثبات بھی ہے اور بندگی شہوت بھی۔

حضورصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور یوسفؑ کے حالات وواقعات میں مماثلت:

ایک بڑی خوبی جو اس قصہ میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس قصے کے ضمن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مخالفین کے حال اور مستقبل کا پورا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے، یوسف علیہ السلام کی طرح ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی قریشی بھائیوں نے حسد کیا، قتل کے مشورے کیے، آپ کو مکہ چھوڑنا پڑا، تین دن تک غار ثور میں روپوش ہونا پڑا، وہاں سے مدینہ ہجرت فرما گئے، وہاں بتدریج آپ کو عروج حاصل ہوا، یہاں تک کہ آپ پہلی اسلامی مملکت کے سربراہ بن گئے۔

فتح مکہ کے بعد:

مکہ فتح ہوا تو قریشی بھائی نادم وشرمندہ ہوئے، انہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سرافگندہ ہونا پڑا، اسے حسن اتفاق کہیے یا عہد اور قصد کہ اس موقع پر آپ نے فرمایا:

’’میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی: ’’جاؤ تم آزاد ہو، تم پر کوئی الزام نہیں‘‘۔

دیباچہ قصہ یوسف:

سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ اس قدر مشہور ہے کہ حقیقی مسلمان گھرانوں کے بچوں تک کو ازبر ہے، اس لیے اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اجمالی طور پر ہم اسے بیان کر کے ان بصائر وعبر کو بیان کرنے پر خصوصی توجہ دیں گے جو اس قصہ سے ہم کو حاصل ہوتی ہیں۔

چونکہ سورۂ یوسف بارہویں اور تیرہویں دونوں پاروں میں آئی ہے اور یہ قصہ تسلسل کے ساتھ بیان ہوا ہے، اس لیے ہم اس تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے پہلے پورے قصے کا خلاصہ بیان کرتے ہیں، پھر عبرتوں اور نصیحتوں کو بیان کریں گے۔

قصہ یوسفؑ پر اجمالی نظر:

◇ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے۔

◇ حضرت یوسف علیہ السلام ان میں سے غیر معمولی طور پر حسین تھے۔

◇ ان کی سیرت اور صورت دونوں کے حسن کی وجہ سے، والد گرامی ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔

محبت کی وجہ:

محبت کی ایک وجہ آپ کا اور آپ کے بھائی بنیامین کا سب سے چھوٹا ہونا بھی تھا جبکہ دونوں کی والدہ بھی انتقال کر چکی تھیں۔

حضرت حسنؓ کی بیٹی سے سوال:

چھوٹے بچے سے محبت انسان کی فطرت ہے، حسن رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے سوال کیا گیا کہ آپ کو اپنے بچوں میں سب سے زیادہ کس سے محبت ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ''چھوٹے سے جب تک کہ وہ بڑا نہ ہو جائے، غائب سے جب تک کہ وہ واپس نہ آجائے اور بیمار سے جب تک کہ وہ تندرست نہ ہو جائے۔

◇ اس محبت کی وجہ سے بھائی حسد میں مبتلا ہو گئے۔
◇ وہ اپنے والد کو تفریح کا کہہ کر حضرت یوسف علیہ السلام کو جنگل میں لے گئے۔
◇ اور آپ کو کنویں میں گرا دیا۔
◇ وہاں سے ایک قافلہ گزرا۔
◇ انہوں نے پانی نکالنے کے لیے کنویں میں ڈول ڈالا تو اندر سے آپ نکل آئے۔
◇ قافلہ والوں نے مصر جا کر بیچ دیا۔
◇ عزیز مصر نے خرید کر اپنے گھر میں رکھ لیا۔
◇ جوان ہوئے تو اس کی بیوی آپ پر فریفتہ ہو گئی۔
◇ اس نے برائی کی دعوت دی۔
◇ آپ نے اس کی دعوت ٹھکرا دی۔
◇ عزیز مصر نے بدنامی سے بچنے کے لیے آپ کو جیل میں ڈلوا دیا۔
◇ قید خانے میں بھی آپ نے دعوت توحید کا سلسلہ جاری رکھا جس کی وجہ سے قیدی آپ کی عزت کرتے تھے۔
◇ بادشاہ وقت کے خواب کی صحیح تعبیر بتانے کی وجہ سے آپ اس کی نظروں میں بچ گئے۔
◇ اس نے آپ کو خزانے، تجارت اور مملکت کا خود مختار وزیر بنا دیا۔
◇ مصر اور گرد و پیش میں قحط کی وجہ سے آپ کے بھائی غلہ حاصل کرنے کے لیے مصر آئے۔
◇ ایک دو ملاقاتوں کے بعد آپ نے انہیں بتایا کہ میں تمہارا بھائی یوسف ہوں۔
◇ پھر آپ کے والدین بھی مصر آگئے اور سب یہیں آکر آباد ہو گئے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

ایک بہترین واقعہ:

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۱﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲﴾ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ
اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۳﴾

الر۔ یہ اس کتاب کی آیتیں ہیں جو حق واضح کرنے والی ہے۔ (۱) ہم نے اس کو ایسا قرآن بنا کر اتارا ہے جو عربی

زبان میں ہے، تاکہ تم سمجھ سکو۔(۲) (اے پیغمبر) ہم نے تم پر یہ قرآن جو وحی کے ذریعے بھیجا ہے اس کے ذریعے ہم تمھیں ایک بہترین واقعہ سناتے ہیں، جبکہ تم اس سے پہلے اس (واقعے سے) بالکل بے خبر تھے۔(۳)

اس قصہ کو احسن القصص یعنی بہترین قصہ اس لیے فرمایا کہ اس قصہ میں عبرتیں اور حکمتیں ہیں اور نکات ہیں اور اس میں بادشاہوں سے غلاموں تک برتاؤ اور عورتوں کے مکروفریب کا اور دشمنوں کے ایذاء پر صبر کا اور قدرت کے وقت عفو اور جودوکرم کا بیان ہے اور حاسد اور محسود کے انجام کا بیان ہے، حسد کا انجام نقصان اور خذلان ہے اور صبر مفتاح الفرج ہے اور عفت و پاکدامنی موجب عزت و رفعت ہے، سورۂ ہود کے ختم پر صبر اور استقامت کا ذکر تھا، اس قصہ کو ذکر کر کے بتلا دیا کہ صبر اور استقامت ایسا ہوتا ہے کہ یوسف (علیہ السلام) نے غیابت الجب اور امرأۃ العزیز کی تہمت اور جیل خانہ کی مصیبت اور باپ کی مفارقت وغیرہ وغیرہ پر کس طرح صبر کیا۔

نیز یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کی دلیل ہے جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وحی الٰہی سے صحیح صحیح واقعات بیان فرماتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ دیکھے اور نہ کسی سے سنے اور نہ کہیں پڑھے، اور بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ اس قصہ کو احسن القصص اس لیے فرمایا کہ یہ قصہ جن آدمیوں کا ہے وہ سب آدمیوں میں احسن اور اجمل تھے اور بعض نے کہا ہے کہ احسن القصص کے معانی اعجب القصص کے ہیں یعنی یہ قصہ بہت ہی عجیب ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۴/ ۹۳)

عزیز مصر کی بیوی کا گناہ کی طرف دباؤ اور اللہ پاک کی طرف سے بچاؤ:

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَن نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۚ .... الیٰ............. إِنَّكِ كُنتِ مِنَ الْخَاطِئِينَ ﴿٢٩﴾

اور جس عورت کے گھر میں وہ رہتے تھے، اس نے ان کو ورغلانے کی کوشش کی، اور سارے دروازوں کو بند کر دیا، اور کہنے لگی: آ ہی جاؤ! یوسف نے کہا: اللہ کی پناہ! وہ میرا آقا ہے، اس نے مجھے اچھی طرح رکھا ہے، سچی بات یہ ہے کہ جو لوگ ظلم کرتے ہیں انہیں فلاح حاصل نہیں ہوتی۔(۲۳) اس عورت نے تو واضح طور پر یوسف (کے ساتھ برائی) کا ارادہ کر لیا تھا، اور یوسف کے دل میں بھی اس عورت کا خیال آچلا تھا، اگر وہ اپنے رب کی دلیل کو نہ دیکھ لیتے، ہم نے ایسا اس لیے کیا تاکہ ان سے برائی اور بے حیائی کا رخ پھیر دیں۔ بیشک وہ ہمارے منتخب بندوں میں سے تھے۔(۲۴) اور دونوں آگے پیچھے دروازے کی طرف دوڑتے، اور (اس کشمکش میں) اس عورت نے ان کے قمیص کو پیچھے کی طرف سے پھاڑ ڈالا۔ اتنے میں دونوں نے اس عورت کے شوہر کو دروازے پر کھڑا پایا۔ اس عورت نے فوراً (بات بنانے کے لیے اپنے شوہر سے) کہا کہ: جو کوئی تمہاری بیوی کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے، اس کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ اسے قید کر دیا جائے، یا کوئی اور دردناک سزا دی جائے؟(۲۵) یوسف نے کہا: یہ خود تھیں جو مجھے ورغلا رہی تھیں، اور اس عورت کے خاندان ہی میں سے ایک گواہی دینے والے نے یہ گواہی دی کہ: اگر یوسف کی قمیص سامنے کی طرف سے پھٹی ہو تو عورت سچ کہتی ہے، اور وہ

جھوٹے ہیں۔(۲۶) اور اگر ان کی قمیص پیچھے کی طرف سے پھٹی ہے تو عورت جھوٹ بولتی ہے، اور یہ سچے ہیں۔(۲۷) پھر جب شوہر نے دیکھا کہ ان کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو اس نے کہا کہ: یہ تم عورتوں کی مکاری ہے، واقعی تم عورتوں کی مکاری بڑی سخت ہے۔(۲۸) یوسف! تم اس بات کا خیال نہ کرو، اور اے عورت! تو اپنے گناہ کی معافی مانگ، یقینی طور پر تو ہی خطا کار تھی۔(۲۹)

حضرت یوسفؑ کا معصیت کے مقابلہ میں جیل کو پسند کرنا:

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ...............الی..............مَا رَاَوُا الْاٰیٰتِ لَیَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِیْنٍ ﴿۳۵﴾

یوسف نے دعا کی کہ: یارب! یہ عورتیں مجھے جس کام کی دعوت دے رہی ہیں، اس کے مقابلے میں قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ اور اگر تو نے مجھے ان کی چالوں سے محفوظ نہ کیا تو میرا دل بھی ان کی طرف کھنچنے لگے گا، اور جو لوگ جہالت کے کام کرتے ہیں، ان میں میں بھی شامل ہو جاؤں گا۔(۳۳) چنانچہ یوسف کے رب نے ان کی دعا قبول کی، اور ان عورتوں کی چالوں سے انہیں محفوظ رکھا۔ بیشک وہی ہے جو ہر بات سننے والا، ہر چیز جاننے والا ہے۔(۳۴) پھر ان لوگوں نے (یوسف کی پاکدامنی کی) بہت سی نشانیاں دیکھ لینے کے بعد بھی مناسب یہی سمجھا کہ انہیں ایک مدت تک قید خانے بھیج دیں۔(۳۵)

دو قیدیوں کا خواب اور ان کو دین کی دعوت پیش کرنا:

گزشتہ آیات میں یوسف (علیہ السلام) کی دعا **رب السجن احب الی مما یدعونی الیه** اور اس کی قبولیت و استجابت کا ذکر کیا ہے، دعا میں یہ درخواست تھی کہ اے پروردگار ایسے زنان خانہ اور محل سرائے سے تو جیل بہتر ہے، بارگاہ خداوندی میں یوسف علیہ السلام کی دعا بلفظہ قبول ہوئی کہ زنان خانہ سے نکال کر جیل خانہ بھیج دیئے گئے، اب وقت آیا کہ **ولنعلمه من تاویل الاحادیث**۔ کا ظہور ہو کہ جیل خانہ میں پہنچ کر لوگوں کے خوابوں کی تعبیریں دیں اور ان کو توحید اور اسلام کی دعوت دیں اور خداداد معجزہ اور کرامت کو ان پر ظاہر کریں تاکہ قبول حق میں معین اور مددگار ہو۔ ولی پر اپنی کرامت کا اظہار ضروری نہیں مگر نبی پر اپنے معجزہ اور کرامت کا اظہار ضروری ہے، کیونکہ معجزہ اور کرامت نبوت کی دلیل ہے اور جس طرح نبوت کا اعلان ضروری ہے اسی طرح دلائل نبوت کا اظہار اور اعلان بھی واجب اور ضروری ہے، اس لیے حضرت یوسف (علیہ السلام) نے خواب کی تعبیر سے پہلے اپنے معجزہ اور کرامت کو اس طرح بیان فرمایا۔ **لا یاتیکما طعام ترزقنه الا نباتکما بتاویله قبل ان یاتیکما** تاکہ دلیل نبوت بیان کرنے کے بعد ان کو توحید اور ملت ابراہیمی کے اتباع کی دعوت دے سکیں۔ (تفسیر ادریسی: ۴/۱۲۵)

چنانچہ فرماتے ہیں:

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ .... الی......... قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿٤١﴾

اور یوسف کے ساتھ دو اور نوجوان قید خانے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے (ایک دن یوسف سے) کہا کہ: میں (خواب میں) اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں۔ اور دوسرے نے کہا کہ: میں (خواب میں) یوں دیکھتا ہوں کہ میں نے اپنے سر پر روٹی اٹھائی ہوئی ہے (اور) پرندے اس میں سے کھا رہے ہیں۔ ذرا ہمیں اس کی تعبیر بتاؤ، ہمیں تم نیک آدمی نظر آتے ہو۔ (۳۶) یوسف نے کہا: جو کھانا تمہیں (قید خانے میں) دیا جاتا ہے، وہ ابھی آنے نہیں پائے گا کہ میں تمہیں اس کی حقیقت بتا دوں گا، یہ اس علم کا ایک حصہ ہے جو میرے پروردگار نے مجھے عطا فرمایا ہے۔ (مگر اس سے پہلے میری ایک بات سنو) بات یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا دین چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، اور جو آخرت کے منکر ہیں۔ (۳۷) اور میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کی پیروی کی ہے۔ ہمیں یہ حق نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک ٹھہرائیں۔ یہ (توحید کا عقیدہ) ہم پر اور تمام لوگوں پر اللہ کے فضل کا حصہ ہے، لیکن اکثر لوگ (اس نعمت کا) شکر ادا نہیں کرتے۔ (۳۸) اے میرے قید خانے کے ساتھیو! کیا بہت سے متفرق رب بہتر ہیں، یا وہ ایک اللہ جس کا اقتدار سب پر چھایا ہوا ہے؟ (۳۹) اس کے سوا جس جس کی تم عبادت کرتے ہو، ان کی حقیقت چند ناموں سے زیادہ نہیں ہے جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں اتاری۔ حاکمیت اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے، اسی نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی سیدھا سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (۴۰) اے میرے قید خانے کے ساتھیو! (اب اپنے خوابوں کی تعبیر سنو) تم میں سے ایک کا معاملہ تو یہ ہے کہ وہ (قید سے آزاد ہو کر) اپنے آقا کو شراب پلائے گا۔ رہا دوسرا تو اسے سولی دی جائے گی، جس کے نتیجے میں پرندے اس کے سر کو (نوچ کر) کھائیں گے۔ جس معاملے میں تم پوچھ رہے تھے، اس کا فیصلہ (اسی طرح) ہو چکا ہے۔ (۴۱)

خواب کی حقیقت:

رؤیا کے معنی خواب کے ہیں، اس کی تین قسمیں ہیں۔

(اول حدیث نفس) جس کا لفظی ترجمہ "دل کی باتیں" ہیں۔ انسان دن میں جس کام میں مشغول اور منہمک ہورات کو بھی خواب میں اس کو وہی چیزیں نظر آتی ہیں، جیسا کہ عاشق کو خواب میں طرح طرح سے اپنا معشوق ہی دکھلائی دیتا ہے اور بلی کو خواب میں گوشت کے چھچھڑے نظر آتے ہیں، جسے الیکشن کی دھن ہوتی ہے اسے خواب میں اسمبلی ہال ہی کی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔

(دوم اضغاث احلام) جس کا لفظی ترجمہ "خواب پریشان" ہے، نفس اور شیطان کے القاء سے جو چیزیں خواب میں

دکھائی دیں وہ اضغاث احلام ہیں اور احتلام بھی اسی قبیل سے ہے، خواب کی یہ دو قسمیں فاسد ہیں، ان کی کوئی تاویل اور تعبیر نہیں۔

(خواب کی تیسری قسم) رؤیائے صالحہ ہے یعنی درست خواب کہ جو وساوس شیطانی اور ہوائے نفسانی سے پاک ہو ایسا ہی خواب حقیقتاً خواب ہوتا ہے اور محتاج تعبیر ہوتا ہے اور ایسے ہی خواب کو حدیث میں رویائے صالحہ اور جزء نبوت بتلایا گیا ہے، اس قسم کا خواب القاء ربانی ہوتا ہے اور مؤید الٰہی ہوتا ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۴/ ۹۵)

شاہ مصر کا خواب اور اس کی تعبیر و تدبیر:

حق جل شانہ جب کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ایسے اسباب بھی پیدا فرما دیتے ہیں جن کی طرف آدمی کا خیال بھی نہیں جاتا، چنانچہ جب حضرت یوسف (علیہ السلام) کو قید خانہ سے نجات دلانا منظور ہوا تو بادشاہ مصر ریان بن ولید کو ایک خواب دکھایا جو ان کی رہائی اور ظاہری عروج کا سبب بنا اور بادشاہ نے ایسا عجیب خواب دیکھا جس کی تعبیر سے تمام مُعبّر عاجز آ گئے، اس خواب کی تعبیر کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تو اس وقت اس ساقی کو یوسف (علیہ السلام) یاد آئے اور اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ مجھے جیل خانہ جانے کی اجازت دیجئے۔ وہاں ایک مرد صالح ذی علم محبوس ہیں۔ ان سے خواب کی تعبیر پوچھ آؤں، چنانچہ بادشاہ نے اجازت دی اور وہ ساقی حضرت یوسف (علیہ السلام) کی خدمت میں حاضر ہوا اور خواب بیان کر کے اس کی تعبیر پوچھی، اس طرح بادشاہ کا خواب اور یوسف (علیہ السلام) کی تعبیر ان کی رہائی، عروج اور بلندی کا سبب بنا، کیونکہ خواب کی جو تعبیر دی وہ نہایت عجیب وغریب تھی اور پھر تعبیر کے ساتھ تدبیر بھی تھی اور پھر تدبیر کے ساتھ ایک تبشیر بھی تھی کہ قحط کے سات سال گزرنے کے بعد خوب بارش ہوگی اور پھل اور میوے افراط سے پیدا ہوں گے، چنانچہ فرماتے ہیں: اور بادشاہ مصر نے ایک خواب دیکھا بادشاہ کا نام ریان بن ولید تھا اور عزیز مصر اس کا وزیر تھا۔ (تفسیر ادریسی: ۴/ ۱۳۰)

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ .... الیٰ........... ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

(چنانچہ اس نے قید خانے میں پہنچ کر یوسف سے کہا) یوسف! اے وہ شخص جس کی ہر بات سچی ہوتی ہے، تم ہمیں اس (خواب) کا مطلب بتاؤ کہ سات موٹی تازی گائیں ہیں جنہیں سات دبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں، اور سات خوشے ہرے بھرے ہیں، اور دوسرے سات اور ہیں جو سوکھے ہوئے ہیں، شاید میں لوگوں کے پاس واپس جاؤں (اور انہیں خواب کی تعبیر بتاؤں) تاکہ وہ بھی حقیقت جان لیں۔ (۴۶) یوسف نے کہا: تم سات سال تک مسلسل غلہ زمین میں اگاؤ گے، اس دوران جو فصل کاٹو، اس کو اس کی بالیوں ہی میں رہنے دینا، البتہ تھوڑا سا غلہ جو تمہارے کھانے کے کام آئے، (وہ نکال لیا کرو)۔ (۴۷) پھر اس کے بعد تم پر سات سال ایسے آئیں گے جو بڑے سخت ہوں گے، اور جو کچھ ذخیرہ تم نے ان

سالوں کے واسطے جمع کر رکھا ہوگا، اس کو کھا جائیں گے، ہاں البتہ تھوڑا سا حصہ جو تم محفوظ کر سکو گے (صرف وہ بچ جائے گا) (۴۸) پھر اس کے بعد ایک سال ایسا آئے گا جس میں لوگوں پر خوب بارش ہوگی، اور وہ اس میں انگور کا شیرہ نچوڑیں گے۔(۴۹)

قید سے رہائی سے پہلے جیل میں جانے کی وضاحت اور بے قصوری ثابت کرانا:

یہاں پھر قرآن کریم نے واقعے کے وہ حصے حذف فرما دیئے ہیں جو خود سمجھ میں آسکتے ہیں۔یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی جو تعبیر دی تھی وہ بادشاہ کو بتائی گئی۔ بادشاہ نے تعبیر سن کر ان کو قدر دانی کے طور پر اپنے پاس بلوانا چاہا۔ اور اس مقصد کے لیے اپنا ایک ایلچی بھیجا، اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے چاہا کہ اپنی رہائی سے پہلے اس جھوٹ الزام کی واضح طور پر صفائی کروائیں جو ان پر لگایا گیا تھا۔اس لیے اس مرحلے پر انہوں نے ایلچی کے ساتھ جانے کے بجائے بادشاہ کو یہ پیغام بھجوایا کہ آپ پہلے ان عورتوں کے معاملات کی تحقیق کریں جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، چونکہ ان عورتوں کو ساری بات معلوم تھی، اور ان کے ذریعے حقیقت کا معلوم کرنا زیادہ آسان تھا، اسی لیے زلیخا کے بجائے ان کا حوالہ دیا۔اور اگرچہ یہ تحقیق جیل سے رہا ہونے کے بعد بھی کی جاسکتی تھی۔لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے شاید اس لیے یہ طریقہ اختیار فرمایا، تاکہ بادشاہ اور عزیز مصر وغیرہ پر یہ بات واضح ہوجائے کہ ان کو اپنی بے گناہی پر اتنا یقین ہے کہ وہ بے گناہی ثابت ہوئے بغیر جیل سے رہا ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔دوسرے حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے انداز سے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ انہیں کوئی اعزاز دیں گے۔اس اعزاز کے ملنے کے بعد تحقیقات کے غیر جانب دارانہ ہونے میں لوگوں کو شکوک اور شبہات ہو سکتے تھے۔اس لیے آپ نے مناسب یہی سمجھا کہ جیل سے اس وقت نکلیں جب غیر جانب دارانہ تحقیق کے نتیجے میں الزام کا ہر داغ دھل چکا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ بادشاہ کو حضرت یوسف علیہ السلام کی سچائی کا یقین ہوگیا، اور اس نے جب ان عورتوں کو بلا کر ان سے اس انداز میں سوال کیا جیسے اسے ساری حقیقت معلوم ہے تو وہ حقیقت سے انکار نہ کرسکیں، بلکہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی بے گناہی کی صاف لفظوں میں گواہی دی۔اس مرحلے پر عزیز مصر کی بیوی زلیخا کو بھی یہ اقرار کرنا پڑا کہ اصل غلطی اسی کی تھی۔شاید اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ اپنے جرم کے اقرار اور توبہ کے ذریعے وہ بھی پاک صاف ہوسکے۔(توضیح القرآن)

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ........الی..............اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

اور بادشاہ نے کہا کہ: اس کو (یعنی یوسف کو) میرے پاس لے کر آؤ۔ چنانچہ جب ان کے پاس ایلچی پہنچا تو یوسف نے کہا: اپنے مالک کے پاس واپس جاؤ، اور ان سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا قصہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے؟ میرا پروردگار ان عورتوں کے مکر سے خوب واقف ہے۔(۵۰) بادشاہ نے (ان عورتوں کو بلا کر ان سے) کہا: تمہارا

کیا قصہ تھا جب تم نے یوسف کو ورغلانے کی کوشش کی تھی؟ان سب عورتوں نے کہا کہ: حاشاللہ! ہم کو ان میں ذرا بھی تو کوئی برائی معلوم نہیں ہوئی۔عزیز کی بیوی نے کہا کہ: اب تو حق بات سب پر کھل ہی گئی ہے۔ میں نے ہی ان کو ورغلانے کی کوشش کی تھی ،اور حقیقت یہ ہے کہ وہ بالکل سچے ہیں۔(۵۱)(جب یوسف کو قید خانے میں اس گفتگو کی خبر ملی تو انہوں نے کہا کہ:) یہ سب کچھ میں نے اس لیے کیا تا کہ عزیز کو یہ بات یقین کے ساتھ معلوم ہوجائے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کے ساتھ کوئی خیانت نہیں کی، اور یہ بھی کہ جولوگ خیانت کرتے ہیں اللہ ان کے فریب کو چلنے نہیں دیتا۔(۵۲)اور میں یہ دعوی نہیں کرتا کہ میرا نفس بالکل پاک صاف ہے، واقعہ یہ ہے کہ نفس تو برائی کی تلقین کرتا ہی رہتا ہے، ہاں میرا رب رحم فرمادے تو بات اور ہے(کہ اس صورت میں نفس کا کوئی داؤ نہیں چلتا) بیشک میرا رب بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (۵۳)

حضرت یوسف علیہ السلام کی تواضع اور عبدیت کا کمال دیکھئے کہ اس موقع پر جب ان کی بے گناہی خود ان عورتوں کے اعتراف سے ثابت ہوگئی ،تب بھی اس پر اپنی بڑائی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے یہ فرمارہے ہیں کہ میں اس انتہائی خطرناک جال سے جو بچا ہوں اس میں میرا کوئی کمال نہیں ،نفس تو میرے پاس بھی ہے جو انسان کو برائی کی تلقین کرتا رہتا ہے،لیکن یہ اللہ تعالی کا رحم وکرم ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے اس کے فریب سے بچالیتا ہے، البتہ دوسرے دلائل سے یہ بات واضح ہے کہ اللہ تعالی کا یہ رحم وکرم اسی پر ہوتا ہے جو گناہ سے بچنے کے لئے اپنی سی کوشش کر گزرے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے دروازے تک بھاگ کر کی تھی اور ساتھ ہی اللہ تعالی سے رجوع کرکے اس سے پناہ مانگی۔(توضیح القرآن)

سورۂ یوسف سے ہدایت:

انسان کو پہلی ہدایت جو سورہ یوسف سے ملتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد اور حکمت عملی دونوں میں اللہ کی مقرر کردہ حدوں سے آگے نہ بڑھے۔کامیابی اور ناکامی اللہ کے ہاتھ میں ہے، جو شخص کسی جائز مقصد کے لیے صحیح وجائز حربے اختیار کرتا ہے،خواہ وہ یہاں کامیاب نہ ہو، اسے کسی قسم کی رسوائی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا؛لیکن جو شخص کسی مذموم مقصد کے لیے غلط چال اختیار کرتا ہے اسے آخر کار ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دوسری ہدایت یہ ہے کہ اللہ پر مکمل بھروسہ رکھیں اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کردیں، جو بھی حق وانصاف کے لیے جدوجہد کرتے ہیں،خواہ دنیا ان کو مٹانے کے لیے تمام حربے اختیار کرے،تب بھی وہ اپنے مدنظر یہ رکھتا ہے کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ اعتماد انہیں غیر معمولی اطمینان اور راحت دیتا ہے اور وہ تمام مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود برابر اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔

اس واقعہ سے سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ اگر ایک مومن حقیقی اسلامی سیرت وکردار کا حامل ہو اور اس میں حکمت عملی کی خوبی بھی ہو تو وہ اکیلا ہی پورے ملک کو فتح کرسکتا ہے،حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھو! سترہ سال کی عمر میں تنہا، بے

بس، سامان کے بغیر، پردیس اور پھر کمزوری کی انتہا یہ کہ غلام بنا کر بیچ دیا گیا، اس سے مزید تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور ایک گھناؤنے جرم میں عمر قید کی سزا سنائی گئی، اس حد تک دھکیلنے کے باوجود وہ صرف اپنے ایمان اور اخلاق کی بنیاد پر اٹھے ہیں اور پورے ملک پر اپنا قبضہ وسکہ جما دیتے ہے۔(قرآن سارانس گجراتی)

موضوع سورۃ......رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقبل کے متعلق پیش گوئی۔

خلاصہ سورۃ:......جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو بعد التکلیف راحت اور سرفرازی نصیب ہوئی اور ان کے بھائی نادم ہوئے، اسی طرح قریش مکہ بھی فتح مکہ کے روز نادم ہوئے۔

خلاصہ رکوع:۱......حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی تعبیر سرفرازی۔ ماخذ: آیت:۴،۶۔

خلاصہ رکوع:۲......حضرت یوسف علیہ السلام کی علیحدگی کی درخواست، اور ان کا القاء فی غیابات الجب۔ ماخذ: آیت:۱۱، ۱۲، ۱۵۔

خلاصہ رکوع:۳......امتحان امانت حضرت یوسف علیہ السلام۔ ماخذ: آیت:۲۳۔

خلاصہ رکوع:۴...... باوجود ثبوت برأت کے یوسف علیہ السلام کو بعض مصالح کی بنا پر انہوں نے جیل خانہ بھیجا۔ ماخذ: آیت:۳۵۔

خلاصہ رکوع:۵......حضرت یوسف علیہ السلام کی فراست کا چھوٹا امتحان۔ ماخذ: آیت:۴۱۔

خلاصہ رکوع:۶......حضرت یوسف علیہ السلام کی فراست کا ایک بڑا امتحان۔ ماخذ: آیت:۴۷ تا ۴۹ -(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

بارہویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) قرآن کریم کے نزول کی علت یہ ہے کہ لوگ اللہ کی عبادت کریں اور مشرک استغفار اور توبہ کریں تا کہ دنیا وآخرت کی سعادت اور کمال حاصل کرسکیں۔

(۲) اہل معصیت کو اللہ کی مہلتوں سے دھوکے میں نہیں پڑنا چاہئے اس لئے کہ پھر پکڑ اچانک آتی ہے اور ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا۔

(۳) مؤمن کا کمال یہ ہے کہ وہ صبر وشکر میں ڈھلا ہوا ہو کیونکہ اس کا بدلہ مغفرت اور جنت ہے۔

(۴) انبیا علیہم الصلوۃ والسلام کی یہ ذمہ داری نہیں کہ وہ لوگوں کو ہدایت دیں بلکہ ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں کو کفر اور نافرمانی کے انجام سے ڈرائیں۔

(۵) جنت کے وارث اہل ایمان وطاعت ہیں اور جہنم کے وارث اہل کفر وظلم ہیں۔

(۶) دنیا میں عذاب کے نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ بدلے کی جگہ آخرت ہے دنیا نہیں۔

(۷) اولاد میں سے کسی ایک سے زیادہ محبت کا اظہار دوسروں میں عداوت کا باعث بنتا ہے۔

(۸) غم کا اظہار گناہ نہیں حدیث میں ہے ''اے ابراہیم! ہم تمہارے فراق میں غمزدہ ہیں۔''

(۹) کسی چیز میں کوئی حکمت نہیں مگر اللہ کے حکم سے اور حق وہی ہے جسے اللہ نے حق قرار دیا اور باطل وہ ہے جسے اللہ نے باطل قرار دیا۔

(۱۰) باپ کے لفظ کا استعمال دادا میں بھی ہوتا ہے اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک باپ ہے اپنے بعد والے کا۔

***

پارہ: ۱۳

نصائح:

سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ اجمالی طور پر عرض کیا جاچکا ہے، اب اس قصہ سے جو نصیحتیں حاصل ہوتی ہیں وہ عرض کی جاتی ہیں لیکن یہ وضاحت ضروری ہے کہ ان عبرتوں اور نصیحتوں کا تعلق اس قصہ کے صرف اس حصہ سے نہیں ہے جو تیرہویں پارہ میں آیا ہے، بلکہ مجموعی طور پر پورے واقعے سے جو بصائر وعبر حاصل ہوتے ہیں وہ ذیل میں بالترتیب لکھے جارہے ہیں:

مصیبت ذریعہ نعمت اور راحت:

بعض اوقات مصیبت نعمت اور راحت تک پہنچنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کی ابتدا تو المناک پریشانیوں سے ہوئی، انہیں کنویں میں بے یار و مددگار ڈال دیا گیا مصر میں غلاموں کی منڈی میں ان کی خرید وفروخت ہوئی، عورتوں کے فتنہ کا سامنا کرنا پڑا، کئی سال تک جیل کی کال کوٹھڑی میں بند رہے لیکن انجام یہ ہوا کہ وہ مصر کے حکمراں بنے اور انہیں دینی اور دنیاوی عزت نصیب ہوئی۔

حسد بیماری ہے:

حسد انتہائی خوفناک بیماری ہے، سگے بھائیوں میں بھی یہ بیماری پیدا ہوجائے تو افسوسناک واقعات جنم لیتے ہیں۔

اخلاق، اعلی اوصاف اور بہتر تربیت:

اچھے اخلاق، اعلی اوصاف اور بہتر تربیت بہرحال اپنا رنگ دکھا کر رہتی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کی تربیت ایک عظیم باپ کے ہاتھوں خاندان نبوت میں ہوئی تھی اور آباء واجداد کی اخلاقی میراث میں سے بھی آپ نے وافر حصہ پایا تھا، مثالی تربیت اور اخلاقی کمال ہی کی وجہ سے آپ مصائب وشدائد کے سامنے بڑی پامردی سے کھڑے رہے، جس کی وجہ سے کلفت کے بعد راحت کا اور ظاہری ذلت کے بعد حقیقی عزت کا دور آکر رہا۔

دین پر جمے رہنا:

عفت وامانت اور استقامت ساری بھلائیوں کا سرچشمہ ہے، مردوں کے لیے بھی اور عورتوں کے لیے بھی، یونہی دین پر جمے رہنے والوں کو ایک نہ ایک دن عزت اور احترام حاصل ہوکر رہتا ہے اور حقیقت اور حق کو جتنا بھی چھپایا جائے، بالآخر وہ ظاہر ہوکر رہتے ہیں۔

مرد اور عورت کا اختلاط:

مرد اور عورت کا اختلاط اور خلوت میں میل جول، فتنہ کا باعث ہوتا ہے، نہ زلیخا کو خلوت میسر آتی اور نہ ہی وہ برائی کی

منصوبہ بندی کرتی ،اسی لیے اسلام نے مرد وزن کے خلوت میں ملنے کوحرام قرار دیا ہے،ترمذی اورنسائی میں حدیث ہے کہ
''جب مرد اور عورت تنہائی میں ملتے ہیں تو ان کے ساتھ تیسرا فرد شیطان ہوتا ہے۔''

اخلاقی نجاستوں سے پرہیز:

ذات باری پر ایمان اور عقیدہ کی پختگی سے مصائب کا برداشت کرنا اور اخلاقی نجاستوں سے دامن بچانا آسان ہو جاتا ہے۔

معصیت سے مصیبت بہتر:

مومن کو چاہیے کہ وہ ہر تنگی اور پریشانی کے وقت صرف اللہ کی طرف رجوع کرے۔جب عزیز مصر کی بیوی نے برائی کا ارتکاب نہ کرنے کی صورت میں جیل کی دھمکی دی تھی تو آپ نے معصیت پر مصیبت کو ترجیح دیتے ہوئے اپنے رب کو پکارا تھا: اے میرے رب جیل مجھے اس برائی سے زیادہ محبوب ہے جس کی دعوت زنان مصر مجھے دیتی ہیں۔

بعض اللہ والوں کے بارے میں آتا ہے کہ جب کسی مصیبت اور بیماری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ان سے تعزیت کی گئی تو انہوں نے جواب دیا: الحمد للہ! بمصیبتے گرفتارم نہ معصیتے۔(اللہ کا شکر ہے مصیبت میں مبتلا ہوں، معصیت میں نہیں)

سچے داعی کی صفات:

سچا داعی، انتہائی مشکل اور پریشان کن حالات میں بھی دعوت کے فریضہ سے غافل نہیں ہوتا، سیدنا یوسف علیہ السلام جیل میں بھی دعوت وتبلیغ اور اصلاح وارشاد کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، جو لوگ آپ سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھنے کے لیے آئے، ان کو بھی آپ نے پہلے توحید کی دعوت دی، اس کے بعد خواب کی تعبیر بتلائی اور کہا جاتا ہے کہ جیل کے قیدیوں نے آپ کی دعوت سے متاثر ہو کر ایمان قبول کر لیا تھا، خود مصر کا بادشاہ بھی اسلام لے آیا تھا۔

داعی اور پیشوا کی پاک دامنی:

ہر مسلمان کو عموماً اور داعی اور پیشوا کو خصوصاً اپنے دامن کی صفائی کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے، حضرت یوسف علیہ السلام کو کئی سال بعد جب رہائی نصیب ہوئی تو آپ نے اس وقت تک جیل سے باہر قدم رکھنے سے انکار کر دیا، جب تک کہ آپ کی براءت اور طہارت کا اعلان اور اعتراف نہ کر لیا جائے؛ تاکہ کل کو آپ کو یہ طعنہ نہ دیا جائے کہ معاذ اللہ! تھے تو مجرم مگر رحم اور ترس کھاتے ہوئے رہا کر دیا گیا۔

صبر کی فضیلت اور نتائج:

اس واقعہ سے صبر کی فضیلت اور اس کے بہترین نتائج کا بھی یقین آجاتا ہے۔حضرت یوسف علیہ السلام نے کنویں کی تاریکی سے جیل کی تنہائی تک اور عزیز مصر کے گھر سے بھائیوں کو معاف کرنے تک ہر جگہ مضبوطی کے ساتھ صبر کا دامن تھامے رکھا۔

اس صبر کے جو نتائج سامنے آئے وہ کسی سے مخفی نہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ صبر، راحتوں اور نعمتوں کے دروازے کی چابی، نصف ایمان اور اللہ کی نصرت اور رحمت کو متوجہ کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔

پاک دامنی کی شہادتیں:

اس قصہ کے مطالعہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت کی کئی شہادتیں سامنے آتی ہیں۔

پہلی شہادت رب العالمین کی ہے۔

دوسری شہادت شیطان کی ہے، کیونکہ شیطان نے باری تعالی کے سامنے قسم کھا کر کہا تھا: تیری عزت کی قسم میں سب (انسانوں) کو گمراہ کردوں گا، سوائے تیرے ان بندوں کے جوان میں سے مخلص ہیں۔ اور اس میں شک ہی کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام مخلص اور منتخب تھے۔ لہذا انہیں راہ راست سے ہٹانا خود شیطان کے بقول ممکن ہی نہ تھی۔

تیسری شہادت خود حضرت یوسف علیہ السلام کی، ابھی گزرا ہے کہ انہوں نے فرمایا تھا: اے میرے رب! مجھے جیل زیادہ محبوب ہے اس برائی سے جس کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں۔

چوتھی شہادت عزیز مصر کی بیوی کی ہے جب اس نے واضح طور پر کہا تھا: ''اب حق واضح ہو گیا، میں نے اسے پھسلانے کی کوشش کی تھی اور یہ سچوں میں سے ہے''۔

پانچویں شہادت عزیز مصر کے خاندان کے اس فرد کی ہے جس نے کہا تھا: اگر قمیص آگے سے پھٹی ہے تو یہ سچی ہے اور یوسف (معاذ اللہ) جھوٹوں میں سے ہے اور اگر قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو زلیخا جھوٹی ہے اور یوسف سچوں میں سے ہے۔ جب دیکھا گیا تو آپ کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی۔

چھٹی شہادت ان زنان مصر کی ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، انہوں نے آپ کے کردار کی صفائی کی گواہی دیتے ہوئے کہا تھا: ''ہمیں یوسف کے بارے میں کسی برائی کا علم نہیں ہے۔''

پاکدامنی ثابت:

ان تمام شہادتوں سے قطعی طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی ثابت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی سیاہ دل آپ کی طرف برائی کی نسبت کرتا ہے تو اس سے بڑا جاہل اور کوئی بھی نہیں۔

تقدیر بہر صورت غالب رہتی ہے:

بارہویں نصیحت اس قصہ سے یہ حاصل ہوتی ہے کہ اللہ کسی کو تکلیف میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر لے تو اس کی تقدیر اور فیصلے کو کوئی ٹال نہیں سکتا اور اگر کسی کے ساتھ خیر اور عزت کا فیصلہ کر لے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔

حضرت یوسفؑ کا تواضع:

چونکہ حضرت یوسف نے اپنی براءت پر بہت زیادہ زور دیا۔ ممکن تھا کوئی سطحی آدمی اس سے فخر اور غرور واعجاب کا شبہ

کرنے لگتا، اس لیے اپنی نزاہت کی حقیقت کھول دی کہ میں کوئی شیخی نہیں مارتا، نہ پاک صاف رہنے میں اپنے نفس پر بھروسہ کرسکتا ہوں۔ محض خدا کی رحمت واعانت ہے جو کسی نفس کو برائی سے روکتی ہے۔ یہ ہی رحمت خصوصی عصمت انبیاء (علیہم السلام) کی کفیل وضامن ہے، ورنہ نفس انسانی کا کام عموماً برائی کی ترغیب دینا تھا۔ خدا تعالیٰ کی خصوصی توفیق و دستگیری نہ ہوتی تو میرا نفس بھی دوسرے نفوس بشریہ کی طرح ہوتا۔ ''اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ'' سے اشارہ کردیا، کہ نفس امارہ جب توبہ کرکے ''لوامہ'' بن جائے تو خدا اس کی پچھلی تقصیرات معاف فرما دیتا ہے۔ بلکہ رفتہ رفتہ مہربانی سے ''نفس مطمئنہ'' کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔ (تفسیر عثمانی: ۳۲۱)

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۵۳﴾

اور میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرا نفس بالکل پاک صاف ہے، واقعہ یہ ہے کہ نفس تو برائی کی تلقین کرتا ہی رہتا ہے، ہاں میرا رب رحم فرمادے تو بات اور ہے (کہ اس صورت میں نفس کا کوئی داؤ نہیں چلتا) بیشک میرا رب بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (۵۳)

بادشاہ کی جانب سے اقتدار کا ملنا اللہ پاک کا بڑا انعام:

بادشاہ کو یوسف (علیہ السلام) کی براءت اورنزاہت کا کامل یقین ہوگیا اور یوسف (علیہ السلام) کی اس شرط- نے کہ عورتوں سے بھی دریافت کرلیا جائے- بادشاہ کو اور بھی اطمینان دلا دیا کہ تحقیقات کی شرط وہی آدمی لگا سکتا ہے جس کو اپنی براءت کا کامل یقین ہو اور خواب کی تعبیر اور پھر اس کے متعلق تدبیر سن کر تو بادشاہ حیران ہی رہ گیا اور کہنے لگا۔

(تفسیر ادریسی: ۴/۱۳۹)

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ ۚ .... الیٰ...........وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور بادشاہ نے کہا کہ: اس کو میرے پاس لے آؤ، میں اسے خالص اپنا (معاون) بناؤں گا۔ چنانچہ جب (یوسف بادشاہ کے پاس آگئے اور) بادشاہ نے ان سے باتیں کیں تو اس نے کہا: آج سے ہمارے پاس تمہارا بڑا مرتبہ ہوگا، اور تم پر پورا بھروسہ کیا جائے گا۔ (۵۴) یوسف نے کہا کہ: آپ مجھے ملک کے خزانوں (کے انتظام) پر مقرر کردیجیے۔ یقین رکھیے کہ مجھے حفاظت کرنا خوب آتا ہے (اور) میں (اس کام کا) پورا علم رکھتا ہوں۔ (۵۵) اور اس طرح ہم نے یوسف کو ملک میں ایسا اقتدار عطا کیا کہ وہ اس میں جہاں چاہیں اپنا ٹھکانا بنائیں۔ ہم اپنی رحمت جس کو چاہتے ہیں پہنچاتے ہیں اور نیک لوگوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔ (۵۶) اور آخرت کا جو اجر ہے وہ ان لوگوں کے لیے کہیں زیادہ بہتر ہے جو ایمان لاتے اور تقویٰ پر کاربند رہتے ہیں۔ (۵۷)

بادشاہ اس انٹرویو سے بالکل مطمئن ہوگیا، اور یوسفؑ کا انتخاب کسی اعلیٰ منصب کے لیے کرلیا، بادشاہ اور پھر مشرک

بادشاہ سے اگر ملنا جلنا اور سرکاری تعلقات قائم کرنا مطلق اور ہر صورت میں حرام ہوتا تو ظاہر ہے کہ ایک پیغمبر برحق اسے اپنے لیے کیوں کر روا رکھتے؟ سرکاری تعلق جب نبوت کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے تو ولایت و عام صالحیت کے ساتھ بدرجہ اولیٰ۔ (ماجدی: ۳؍ ۱۹۳)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ انبیاء (علیہم السلام) کی بعثت کا اصل مقصد تو عقیدہ توحید، ایمان، نیکی اور اخلاق کی تعلیم ہے؛ مگر ان کی بعثت کا ایک اہم مقصد لوگوں سے ظلم کو دور کرنا بھی ہے۔ اسی لیے جب کسی علاقے میں غیر معمولی حالات پیدا ہوجائیں اور یہ خطرہ لاحق ہو کہ لوگوں سے من مانی قیمت وصول کر کے ان پر ظلم کیا جائے گا، تو ایسی صورت میں حکومت کے لیے اشیائے صرف کی قیمتوں پر کنٹرول کرنا ضروری ہوجاتا ہے، عام حالات میں جب کہ اشیائے صرف کی فراوانی ہو، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ تجارت کو کھلا چھوڑ دیا جائے اور کسی چیز کی قیمت پر کنٹرول نہ کیا جائے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھاؤ مقرر کرنے کی درخواست کی گئی تو آپ نے انکار کردیا، اور فرمایا تجارت کو آزاد چھوڑ دو تاکہ کسی پر زیادتی نہ ہو، فرمایا اگر میں قیمت مقرر کردوں اور اس سے کسی پر زیادتی ہو، تو یہ درست نہیں۔

امام محمدؒ کے مطابق اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ جب لوگوں پر ظلم ہورہا ہو تو اس ظلم کو دور کرنے کے لیے قیمتوں پر کنٹرول کرنا جائز ہوجاتا ہے۔ (معالم العرفان: ۱۰؍ ۲۷)

بھائیوں کی جانب سے معافی مانگنا:

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ﴿۸۹﴾........... الیٰ........... يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴿۹۲﴾

یوسف نے کہا: تمہیں کچھ پتہ ہے کہ تم جب جہالت میں مبتلا تھے تو تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا؟ (۸۹) (اس پر) وہ بول اٹھے: ارے کیا تم ہی یوسف ہو؟ یوسف نے کہا: میں یوسف ہوں، اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر بڑا احسان فرمایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص تقوی اور صبر سے کام لیتا ہے، تو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ (۹۰) انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ نے تم کو ہم پر ترجیح دی ہے، اور ہم یقیناً خطا کار تھے۔ (۹۱) یوسف بولے: آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہوگی، اللہ تمہیں معاف کرے، وہ سارے رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ (۹۲)

بادشاہی میں بھی فقیری، اور دعا میں عاجزی:

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ .... الیٰ............... عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴿۱۰۴﴾

میرے پروردگار! تو نے مجھے حکومت سے بھی حصہ عطا فرمایا، اور مجھے تعبیر خواب کے علم سے بھی نوازا۔ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا رکھوالا ہے۔ مجھے اس حالت میں دنیا سے اٹھانا کہ میں تیرا فرمانبردار رہوں، اور مجھے نیک لوگوں میں شامل کرنا۔(۱۰۱) (اے پیغمبر) یہ تمام واقعہ غیب کی خبروں کا ایک حصہ ہے جو ہم تمہیں وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں، اور تم اس وقت ان (یوسف کے بھائیوں) کے پاس موجود نہیں تھے جب انہوں نے سازش کر کے اپنا فیصلہ پختہ کر لیا تھا (کہ یوسف کو کنویں میں ڈالیں گے)۔(۱۰۲) اس کے باوجود اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں، چاہے تمہارا کیسا ہی دل چاہتا ہو۔(۱۰۳) حالانکہ تم ان سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجرت نہیں مانگتے۔ یہ تو دنیا جہان کے سب لوگوں کے لیے بس ایک نصیحت کا پیغام ہے۔(۱۰۴)

یہ تو ہر دوست اور ہر دشمن کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی سے نہیں پڑھا تھا اور نہ ایسے لوگوں کی صحبت اٹھائی تھی جو سیدنا حضرت یوسف (علیہ السلام) کا قصہ آپ کو بتاتے اور سناتے، تفصیل کے ساتھ یہ قصہ بتا دینا یہ واضح طریقہ پر آپ کی نبوت کی دلیل ہے، اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ کو یہ قصہ بتایا اور آپ نے لوگوں کو سنایا، یہودیوں نے جب یہ قصہ سنا جسے وہ اپنے آباء واجداد سے سنتے آئے تھے تو انہیں اسلام قبول کر لینا لازم تھا، لیکن انہوں نے پھر بھی اسلام قبول نہیں کیا، صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ یہودیوں نے کفار مکہ سے کہا کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کرو کہ وہ کیا سبب تھا جس کی وجہ سے بنی اسرائیل اپنے وطن کو چھوڑ کر مصر میں آ کر آباد ہوئے، قریش نے آپ سے سوال کیا تو سورۃ یوسف نازل ہوئی، یہودی اپنے خیال میں بہت دور کی کوڑی اٹھا کر لائے تھے اور انہوں نے سمجھا تھا کہ آپ کی طرف سے اس کا جواب نہ مل سکے گا اور قریش مکہ بھی چاہتے تھے کہ آپ کو کسی طرح زچ کریں لیکن جب جواب مل گیا تو دونوں فریق وہیں رہے جہاں تھے یعنی اسلام قبول نہیں کیا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ یہ غیب کی خبریں ہم آپ کو وحی کے ذریعے بتاتے ہیں، جب یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں نے آپس میں مل کر یہ طے کر لیا کہ ان کو کنویں میں ڈال دیں اور وہ طرح طرح کی تدبیریں سوچ رہے تھے اس وقت وہاں آپ موجود نہیں تھے، یہ بات یہودیوں کو معلوم تھی اور قریش مکہ کو بھی سمجھا دی تھی، پھر یہ بات آپ کو کس نے بتا دی، ظاہر ہے کہ وحی کے ذریعہ اس بات کا علم ہوا لہٰذا سوال کرنے والوں اور سوال کی تلقین کرنے والوں پر لازم ہوا کہ آپ کی تصدیق کریں اور آپ پر ایمان لائیں، آپ کا دل چاہتا تھا کہ یہ لوگ اسلام قبول کر لیں معجزات سامنے آتے رہتے تھے لیکن اسلام قبول نہیں کرتے تھے، آپ کو امید تھی کہ یہ قصہ سن کر یہودی اور قریش مسلمان ہو جائیں گے لیکن انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا حالانکہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کا قصہ بتا دیں تو اسلام قبول کر لیں گے (**کماذکرہ صاحب الروح عن بعضھم**) آپ کو حرص تھی کہ لوگ اسلام قبول کر لیں اور خصوصاً قصہ یوسفی سنانے کے بعد تو اور زیادہ امید ہو گئی تھی، جب وہ لوگ ایمان نہ لائے تو آپ کو رنج ہوا، اللہ تعالیٰ نے آپ کے رنج کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اگرچہ آپ اس بات

میں حرص کریں، اس کے بعد فرمایا: آپ ان سے اس پر کسی معاوضے کا سوال نہیں کرتے، یہ جہاں والوں کے لئے صرف نصیحت ہی ہے، ان کے ایمان نہ لانے میں آپ کا کوئی نقصان نہیں، ان کا اپنا خسارہ ہے کہ نصیحت کو نہیں مانتے اور حق کی طرف نہیں آتے۔(انوارالبیان)

قصہ سے مکہ کے مشرکین اور دنیا میں بسنے والوں کے لیے نصیحت:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا............ الی.........وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴿۱۰۸﴾

اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر ان کا گزر ہوتا رہتا ہے، مگر یہ ان سے منہ موڑ جاتے ہیں۔(۱۰۵)اور ان میں سے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اللہ پر ایمان رکھتے بھی ہیں تو اس طرح کہ وہ اس کے ساتھ شرک بھی کرتے جاتے ہیں۔(۱۰۶) بھلا کیا ان لوگوں کو اس بات کا ذرا ڈر نہیں ہے کہ اللہ کے عذاب کی کوئی بلا آ کر ان کو لپیٹ لے، یا ان پر قیامت اچانک ٹوٹ پڑے اور انہیں پہلے سے احساس بھی نہ ہو؟(۱۰۷)(اے پیغمبر) کہہ دو کہ: یہ میرا راستہ ہے، میں بھی پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں، اور جنہوں نے میری پیروی کی ہے وہ بھی، اور اللہ (ہر قسم کے شرسے) پاک ہے، اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں۔(۱۰۸)

یعنی اہل مذاہب میں سے جو لوگ انکار خدا نہیں، بلکہ اقرار خدا کے مدعی ہیں، ان کا بھی عموما حال یہ ہے، ایک طرف خدا کو بھی مانے جاتے ہیں، اور دوسری طرف اس کے شریک دیوی دیوتا بھی قرار دیئے چلے جاتے ہیں جو صاف توحید کے منافی ہے، جاہلیت عرب اس نوعیت کے شرک میں خصوصیت کے ساتھ مبتلا تھی، ان کا شرک یہ نہ تھا کہ چند خدا برابر درجہ کے ہیں، بلکہ ایک رب الارباب کے اقرار کے ساتھ یہ متعدد چھوٹے چھوٹے دیوی دیوتاؤں کو بھی کائنات میں متصرف و مدبّر مانتے رہتے تھے۔

ابومندر ہشام الکلبی الکوفی متوفی ۲۰۴ھ کی کتاب الاصنام میں ہے کہ بنی اسماعیل نے بھی رفتہ رفتہ دوسری قوموں کی طرح بت پرستی شروع کر دی اور امت نوح کے بتوں کو اختیار کرلیا اور گو دین ابراہیم و اسمٰعیل کی طرح وہ تعظیم کعبہ اور حج و عمرہ وطواف وغیرہ پر قائم رہے لیکن تلبیہ حج وعمرہ میں بھی شرک داخل کر دیا اور خدائے واحد کے تلبیہ کے بجائے بنی نزار نے تلبیہ یوں شروع کر دیا: **لبيك اللهم لبيك لا شريك لك الاشريك هو لك، تملكه وماملك.** اسی طرح قبیلہ ربیعہ وغیرہ کے بھی مشرکانہ تلبیے نقل کئے ہیں۔ اور آگے لکھا ہے کہ اول شخص جس نے عرب میں دین اسماعیل کے بجائے مذہب شرک رائج کیا، اس کا نام عمرو بن ربیعہ معروف بہ لحی بن حارثہ تھا، اور وہ قبیلۂ ازد کا تھا؛ خزاعہ کا مورث اعلی، سیرت ابن ہشام میں یہ نام عمرو بن لحی آتا ہے۔

اور حدیث میں بھی اس کی یہی صورت آتی ہے، شرک کی یہ صورت دنیا کی اکثر قوموں پر مسلط رہی ہے۔ مشرکوں اور

جاہلی مشرکوں کا جو انجام ہوتا ہے اسے چھوڑیئے، خود ہماری قوم کے اہل قبور ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ مزارات ومقابر سے بالکل تعبد کا سا معاملہ رکھنا، ان پر چادریں چڑھانا، ان پر نذریں ماننا، نفع ونقصان انہیں سے وابستہ جاننا، یہ سب کہیں ان کو اس آیت کے زد میں تو نہیں لے آتا۔ (ماجدی: ۳/ ۲۲۸)

اختتامی عبرت:

سورۂ یوسف کا اختتام اس آیت پر ہوا ہے۔ ''ان کے قصے میں عقلمندوں کے لیے عبرت ہے۔'' یہ (قرآن) ایسی بات نہیں جسے خود بنا لیا جائے بلکہ بیان کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس سے پہلے (نازل) ہوئی ہیں اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے، گویا اس طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ جو اللہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکال کر تخت پر بٹھا سکتا ہے، وہ اللہ اس بات پر قادر ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عزت عطا کرے اور ان کے لائے ہوئے دین کو تمام ادیان پر غالب کردے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿١١١﴾

یقیناً ان کے واقعات میں عقل وہوش رکھنے والوں کے لیے بڑا عبرت کا سامان ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو جھوٹ موٹ گھڑ لی گئی ہو، بلکہ اس سے پہلے جو کتابیں آچکی ہیں ان کی تصدیق ہے، اور ہر بات کی وضاحت اور جو لوگ ایمان لائیں ان کے لیے ہدایت اور رحمت کا سامان۔ (۱۱۱)

یہ سورۃ یوسف کی آخری آیت ہے، اس میں چار باتیں بتائی ہیں: اول یہ کہ حضرات انبیاء کرام (علیہم السلام) اور ان کی قوموں کے قصوں میں عقل والوں کے لیے عبرت ہے، جو لوگ اپنی عقل کو کام میں لاتے ہیں، غور وفکر کرتے ہیں، وہ عبرت حاصل کر لیتے ہیں۔ دوسری بات یہ بتائی کہ یہ قرآن جو پڑھا جاتا ہے اور دوست ودشمن سب کے سامنے اس کی تلاوت کی جاتی ہے، یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی طرف سے تراش لیا ہو، اس میں جو امم سابقہ کے واقعات بیان کئے ہیں وہ بھی تراشے ہوئے نہیں ہیں، پھر اس سے دور کیوں بھاگتے ہیں؟ اور تیسری بات یہ ہے کہ یہ قرآن سابقہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو توحید کی دعوت ان کتابوں میں تھی وہی قرآن مجید میں ہے، پھر قرآن کی دعوت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے، خاص کر یہود ونصاریٰ جو اہل کتاب ہیں ان کو تو قرآن سے دور بھاگنے کا کوئی موقع ہی نہیں، جب قرآن ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور وہی بیان کرتا ہے جو ان کی کتابوں میں ہے تو سب سے پہلے ان کو قبول کرنا لازم ہے، کما قال تعالیٰ (وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ) چوتھی بات یہ بتائی کہ قرآن میں ہر بات کی تفصیل ہے یعنی واضح طور پر تمام عقائد اور اصولی طور پر تمام احکام بتا دیئے۔

نیز یہ قرآن ایمان والوں کے لیے ہدایت بھی ہے، رحمت بھی، کیونکہ یہی حضرات اس کے احکام قبول کرتے ہیں اور

اس کی آیات کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ (انوارالبیان)

خلاصہ رکوع: ۷......امتحان امانت وفراست کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کی سرفرازی۔ ماخذ: آیت: ۵۴۔

خلاصہ رکوع: ۸......حضرت یوسف علیہ السلام کی سرفرازی کے بعد کنعان میں قحط کا پڑنا اور پہلی دفعہ ان کے بھائیوں کا مصر میں آنا۔

خلاصہ رکوع: ۹......حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا دوبارہ آنا اور اپنے حقیقی بھائی کو حکمت عملی سے رکھ لینا۔ ماخذ: آیت: ۶۹، ۷۶۔

خلاصہ رکوع: ۱۰......حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا تیسری دفعہ آنا اور آپس میں تعارف کرانا۔ ماخذ: آیت: ۸۸، ۹۰۔

خلاصہ رکوع: ۱۱......بنی اسرائیل کے سارے خاندان کا مصر میں آنا اور بچپن والے خواب کی تعبیر کا انجام پانا۔ ماخذ: آیت: ۹۹، ۱۰۰۔

خلاصہ رکوع: ۱۲......حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں عقلمندوں کے لئے پیش گوئی ہے۔ ماخذ: آیت: ۱۱۱۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الرعد

مکی سورۃ ہے، اس میں ۴۳ آیات اور ۶ رکوع ہیں۔

تعارف

یہ سورت بھی ہجرت سے پہلے نازل ہوئی تھی، اور اس کا بنیادی موضوع اسلام کے بنیادی عقائد یعنی توحید، رسالت اور آخرت کا اثبات اور ان پر عائد کیے جانے والے اعتراضات کا جواب ہے۔ پچھلی سورت یعنی سورۃ یوسف کے آخر (آیت نمبر ۱۰۵) میں اللہ تعالی نے فرمایا تھا کہ آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالی کی قدرت کاملہ اور اس کی وحدانیت کی بہت سی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں، لیکن کفار ان کی طرف دھیان دینے کے بجائے ان سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ اب اس سورت میں کائنات کی ان نشانیوں کی کچھ تفصیل بیان فرمائی گئی ہے جو پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ جس قادر مطلق نے اس کائنات کا یہ محیر العقول نظام بنایا ہے، اسے اپنی خدائی قائم کرنے کے لیے کسی مددگار یا شریک کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر انصاف کے ساتھ غور کیا جائے تو اس کائنات کا ہر ذرہ اللہ تعالی کی توحید کی بھی گواہی دیتا ہے، اور اس بات کی بھی کہ یہ سارا نظام اس نے بے مقصد پیدا نہیں کر دیا۔ اس کا یقینا کوئی مقصد ہے، اور وہ یہ کہ اس دنیوی زندگی میں کیے ہوئے ہر کام کا کسی دن حساب ہو، اور اس دن نیکیوں کا انعام اور برائیوں کی سزا دی جائے۔ اس سے خود بخود آخرت کا عقیدہ ثابت ہوتا

ہے۔ پھر نیکی اور برائی کا تعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے واضح ہدایات بندوں کو دی جائیں۔ ان ہدایات کا ذریعہ اللہ تعالی کے پیغمبر ہیں جو وحی کے ذریعے اللہ تعالی کے احکام معلوم کرکے دنیا والوں تک پہنچاتے ہیں۔ لہذا اسی سے رسالت کا عقیدہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ (توضیح القرآن)

اس سورت میں بھی اس طرف توجہ دلائی گئی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ ازسرتا پا حق ہے۔ یہ کتاب (قرآن) رشد وہدایت کا سرچشمہ ہے۔ بار بار مختلف طریقوں سے توحید، معاد اور ثبوت ورسالت کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ اس پر ایمان لانے کے اخلاقی اور روحانی فوائد بیان کئے ہیں۔ اور نہ ماننے کے نقصانات کی نشان دہی کی ہے۔ دنیا دار العمل ہے، یہاں کے ہر کام کا بدلہ آخرت میں ملے گا۔ (قرآن ایک نظر میں)

وجہ تسمیہ:

آیت نمبر ۱۳ میں رعد کا ذکر آیا ہے۔ (کڑکنے والی بجلی) پس اسی مناسبت سے اس سورت کا نام سورۂ رعد رکھا گیا۔

یہ قرآن کریم کی تیرہویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۹۶ نمبر پر ہے، جس میں کل رکوع ۶، آیات ۴۳ اور کلمات ۸۶۲، کل حروف ۳۶۱۴ ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

ربط:

سورۂ یوسف کے آخر میں توحید ورسالت اور رسالت سے متعلق شبہات کا جواب اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور قرآن پاک کی حقانیت اور وعدہ وعید کے مضامین کا بیان تھا، اس سورۃ میں بھی یہی مضامین ہیں فرق صرف اجمال وتفصیل کا ہے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مضامین:

اس سورۃ کا مرکزی مضمون تو یہ بتانا ہے کہ جو پیغام یہ رسول پیش کررہے ہیں وہی حق ہے، مگر یہ لوگوں کی غلط فہمی اور ہٹ دھرمی ہے کہ اسے قبول نہیں کررہے ہیں۔ اس سلسلہ میں بار بار مختلف طریقوں سے توحید، معاد اور رسالت کی حقانیت ثابت کی گئی ہے اور ان پر ایمان لانے کے اخلاقی اور روحانی فوائد سمجھائے گئے ہیں، درمیان میں جا بجا مخالفین کے اعتراضات کا ذکر کئے بغیر ان کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ نیز مومنین کو- جو برسوں کی طویل اور سخت جدوجہد کی وجہ سے تھکے جارہے تھے اور بے چینی کے ساتھ غیبی امداد کے منتظر تھے- تسلی دی گئی ہے۔ (خلاصۂ مضامین قرآنی)

شرک کفر سراسر جہالت اور حماقت کا کام ہے، اس کی وضاحت کے لیے نہ صرف منطقی مثالیں استعمال کی گئی ہیں بلکہ دلوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے یکے بعد دیگرے دلائل اور شواہد پیش کرکے لوگوں کو مختلف طریقوں سے (ترغیب وترہیب سے) نصیحت کی گئی ہے، ساتھ ہی مسلمانوں کو یقین دلایا گیا ہے کہ اللہ کی مدد ضرور آئے گی۔

خلاصۂ سورت یہ ہے کہ حق مضبوط وطاقتور ہے، چاہے وہ نظر نہ آئے، اور باطل کمزور اور ہارنے والا ہے، چاہے وہ

بظاہر طاقتور ہی کیوں نہ ہو، بہت سے لوگ اس سے بے خبر ہیں، اور باطل کی ظاہری چمک دمک سے دھوکہ کھا جاتے ہیں، بظاہر دھوکہ دہی سے تجارت بڑھتی ہے، جھوٹ سے فائدہ ہوتا ہے، کسی شخص کو اس طرح دھوکہ دیتے ہوئے دیکھ کر دوسرے لوگ بھی سچائی دیانت، امانت داری وغیرہ کو اہمیت نہیں دیتے۔ سورت ایسے لوگوں کو خبردار کرتی ہے کہ یہ چیزیں وقتی طور پر اچھی لگتی ہیں، زیادہ دیر نہیں چلتیں، اس کی جڑیں مضبوط نہیں ہوتیں، سورت کی پہلی ہی آیت میں واضح کیا گیا ہے کہ اللہ پاک اور اس کی کتاب حق ہیں، پھر قدرت کی نشانیاں بیان کی گئیں۔ یہ سب انتظامات کس کی قدرت اور طاقت سے ہورہے ہیں؟ سورج، چاند، زمین، نہریں، زراعت، مختلف پھل، سبزیاں وغیرہ کو اس طرح پیش کیا جیسے کوئی اوپر سے نیچے کی طرف دیکھ رہا ہو۔ ان دلائل کو جاننے کے بعد بھی یہ سوچنا کتنی حماقت ہے کہ موت کے بعد کی زندگی تعجب خیز ہے۔ اتنی وسیع طاقت اور قدرت والے خدا پاک کے لیے یہ کتنا آسان ہے، اس کے بعد ۳۲ متضاد چیزوں کا ذکر کیا کہ اللہ کے سوا کسی کی قدرت میں نہیں ہے کہ وہ ایک ساتھ ان پر قابو پالیں۔

صحیح اور غلط کے درمیان فرق کو تین مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ (۱) اسی طرح جو لوگ باطل کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہو کر اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں سے امید رکھتے ہیں وہ ایسے ہیں جیسا کہ وہ پانی سے ایسی امید باندھیں کہ میں پکاروں گا اور اس سے میری پیاس چھپ جائے گی، لہٰذا یہ امید اور پکارنا نامناسب ہے، اس سے بے وقوف نہ بنو، حرام حرام ہی رہے گا۔ (۲) آگے پانی کے اوپر رہی جھاگ کی مثال ہے جو پانی کے اوپر رہتا ہے یہ ختم ہونے والا ہے، موتی اندر رہتا ہے، اس میں حق کو موتی سے اور باطل کو جھاگ سے تشبیہ دی۔ (۳) اصلی سونا آگ میں باقی رہتا ہے، فضلہ نکل جاتا ہے۔

بجلی گرنے کے فائدے اور نقصانات دونوں ہیں۔ اندر سے چیزوں کو دیکھو، ہر ایک کو چاہیے کہ سورہ رعد پڑھ کر ان تمام باتوں پر عمل کریں۔ کیونکہ قرآن سچی کتاب ہے اور وہ اس کے پڑھنے والے کو باطل سے دھوکہ کھانے سے بچاتی ہے۔ (قرآن سارانس گجراتی)

تین بنیادی عقائد:

اس سورت میں تینوں بنیادی عقائد یعنی توحید، نبوت اور بعث بعد الموت سے بحث کی گئی ہے۔

حروف مقطعات کا راز:

اس سورت کی پہلی آیت میں قرآن کریم کی حقانیت کا ذکر ہے، یہ نکتہ قابل غور ہے کہ جن سورتوں کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے ان کی ابتدا میں عام طور پر قرآن کریم کا ذکر ہوتا ہے، جس سے اس قول کو تقویت حاصل ہوتی ہے، جس کے مطابق حروف مقطعات ان مخالفین کو چیلنج کرنے کے لیے لائے جاتے ہیں جو قرآن مجید کو معاذ اللہ انسانی کاوش قرار دیتے ہیں۔

نیز شروع میں اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ قرآن سراسر سچی اور اصلی باتوں سے پر اور سراسر حقیقت کا اظہار

ہے۔ یہ انسان کے پاس اس کے پیدا کرنے والے اور پالنے والے احکم الحاکمین کا پیغام لے کر آیا ہے اور اللہ عزوجل نے اپنے رسول ﷺ کو یہ کتاب دے کر تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ①

المر، یہ (اللہ کی) کتاب کی آیتیں ہیں، اور (اے پیغمبر) جو کچھ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، برحق ہے، لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لا رہے۔(۱)

وحدانیت کے دلائل:

سورت کی ابتدا میں اللہ کے وجود اور اس کی وحدانیت کے دلائل بیان کیے گئے ہیں کہ آسمانوں اور زمین، سورج اور چاند، رات اور دن، پہاڑوں اور نہروں، غلہ جات اور مختلف رنگوں، ذائقوں اور خوشبوؤں والے پھلوں کو پیدا کرنے والا وہی ہے اور موت اور زندگی، نفع اور نقصان اس اکیلے کے ہاتھ میں ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ.......... الیٰ.......... اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ④

اللہ وہ ہے جس نے ایسے ستونوں کے بغیر آسمانوں کو بلند کیا جو تمہیں نظر آسکیں، پھر اس نے عرش پر استوا فرمایا اور سورج اور چاند کو کام پر لگا دیا، ہر چیز ایک معین میعاد تک کے لیے رواں دواں ہے۔ وہی تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے، وہی ان نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم اس بات کا یقین کر لو کہ (ایک دن) تمہیں اپنے پروردگار سے جا ملنا ہے (۲) اور وہی ذات ہے جس نے یہ زمین پھیلائی، اس میں پہاڑ اور دریا بنائے، اور اس میں ہر قسم کے پھلوں کے دو دو جوڑے پیدا کیے، وہ دن کو رات کی چادر اڑھا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ساری باتوں میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کریں۔(۳) اور زمین میں مختلف قطعے ہیں جو پاس پاس واقع ہوئے ہیں اور انگور کے باغ اور کھیتیاں اور کھجور کے درخت ہیں، جن میں سے کچھ دہرے تنے والے ہیں، اور کچھ اکہرے تنے والے۔ سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں، اور ہم ان میں سے کسی کو ذائقے میں دوسرے پر فوقیت دے دیتے ہیں۔ یقیناً ان سب باتوں میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیں۔(۴)

معلوم ہوا کہ یہ سورت مصنوعات اور آیات خداوندی میں غور و فکر کی دعوت دے رہی ہے کہ آسمان اور زمین، سورج اور چاند، رات اور دن، پہاڑ اور صحراء، جنگل اور نہریں، غلہ جات اور مختلف رنگوں، ذائقوں اور خوشبوؤں والے پھل پیدا کرنے والا وہی ہے اور موت اور زندگی، نفع و نقصان اس اکیلے کے ہاتھ میں ہے، ذرا غور و فکر تو کرو۔

صرف زمین میں ہی انسان غور و فکر کرے تو اللہ کی قدرت کی روشن دلیلیں اس کو نظر آجائیں گی کہ انسانی ضرورت کی ساری چیزیں بھی اسی زمین سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ انسان تو زیادہ سے زیادہ زمین کو نرم کر کے اس میں بیج ڈال دیتا ہے اور

کبھی کبھی پانی دے دیتا ہے لیکن آگے انسان بالکل بے بس ہوجاتا ہے، یہ اللہ ہی ہے جو اس سے پھل، پھول پیدا کرتا ہے اور وہ طرح طرح کے ذائقوں اور رنگوں پر مشتمل ہوتے ہیں، کوئی شیریں ہے تو کوئی ترش، کوئی چھوٹا ہے تو کوئی بڑا۔ اللہ رب العزت کی عجیب قدرت ہے کہ اس نے ان میں بھی نر اور مادہ کا نظام رکھا ہے، جدید سائنس نے بھی اس بات کو مان لیا ہے کہ عالم میں کوئی پھل اور پھول ایسا نہیں جس میں دونوں صفتیں نر اور مادہ نہ پائی جاتی ہوں۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

بعث بعد الموت:

قیامت کے دن میں بعث و جزاء کو ثابت کیا گیا ہے، یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جو مشرکین کی سمجھ میں نہیں آتا تھا:

◇ وہ اللہ کے وجود کا اقرار بھی کرتے تھے۔

◇ اسے ارض وسماء کا خالق بھی تسلیم کرتے تھے۔

◇ لیکن مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا انکار کرتے تھے۔

◇ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ ہڈیوں کے بوسیدہ اور گوشت پوست کے مٹی میں رل مل جانے کے بعد انسان دوبارہ کیسے زندہ ہوجائے گا۔

کفار ومشرکین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تین قسم [(۱) مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے اور یہ ہماری عقل میں نہیں آتا۔ (۲) اگر آپ نبی ہیں اور ہم آپ کی نافرمانی میں لگے ہوئے ہیں تو آپ ہم پر جلد عذاب کیوں نہیں منگواتے؟ (۳) جو معجزہ اور نشانی ہم طلب کرتے ہیں وہ کیوں ظاہر نہیں کئے جاتے)] کے اعتراضات تھے، سورہ رعد میں اللہ تعالی نے ان اعتراضات اور ان کے جوابات کو نقل فرمایا ہے:

وَاِنۡ تَعۡجَبۡ فَعَجَبٌ قَوۡلُهُمۡ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِىۡ خَلۡقٍ جَدِيۡدٍ .... الیٰ.......... هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ۝۵

اور اگر تمہیں (ان کافروں پر) تعجب ہوتا ہے تو ان کا یہ کہنا (واقعی) عجیب ہے کہ: کیا جب ہم مٹی ہوجائیں گے تو کیا سچ مچ ہم نئے سرے سے پیدا ہوں گے؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب (کی قدرت) کا انکار کیا ہے، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے گلوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں اور وہ دوزخ کے باسی ہیں۔ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ (۵) اور یہ لوگ خوشحالی (کی میعاد ختم ہونے) سے پہلے تم سے بدحالی کی جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ ان سے پہلے ایسے عذاب کے واقعات گزر چکے ہیں جس نے لوگوں کو رسوا کرڈالا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ لوگوں کے لیے ان کی زیادتی کے باوجود تمہارے رب کی ذات ایک معاف کرنے والی ذات ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کا عذاب بڑا سخت ہے۔ (۶) اور جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: بھلا ان پر (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر) ان کے رب کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ (اے پیغمبر) بات یہ ہے کہ تم تو صرف خطرے سے ہوشیار کرنے والے ہو، اور ہر قوم کے

لیے کوئی نہ کوئی ایسا شخص ہوا ہے جو ہدایت کا راستہ دکھائے۔(۷)

انسان کی حفاظت:

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾

ہر شخص کے آگے اور پیچھے وہ نگراں (فرشتے) مقرر ہیں جو اللہ کے حکم سے باری باری اس کی حفاظت کرتے ہیں یقین جانو کہ اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے حالات میں تبدیلی نہ لے آئے۔اور جب اللہ کسی قوم پر کوئی آفت لانے کا ارادہ کرلیتا ہے تو اس کا ٹالنا ممکن نہیں ، اور ایسے لوگوں کا خود اس کے سوا کوئی رکھوالا نہیں ہوسکتا۔(۱۱)

نگراں سے یہاں مراد فرشتے ہیں،اس آیت نے واضح فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی حفاظت کے لئے کچھ فرشتے مقرر فرما رکھے ہیں جو باری باری اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔قرآن کریم میں اصل لفظ معقبٰت استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں باری باری آنے والے،اس کی تفصیل بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے کہ ایک جماعت دن کے وقت انسانوں کی نگرانی پر مامور ہے اور دوسری جماعت رات کے وقت ان کی حفاظت کرتی ہے ابوداؤد کی ایک روایت میں حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ یہ فرشتے مختلف حادثات سے انسانوں کی حفاظت کرتے ہیں،البتہ جب اللہ تعالی کا ہی حکم یہ ہو کہ کسی شخص کو کسی تکلیف میں مبتلا کیا جائے تو یہ فرشتے وہاں سے ہٹ جاتے ہیں۔ابن جریر میں بروایت حضرت عثمان غنیؓ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان فرشتوں کا کام صرف دنیاوی تکالیف اور مصائب سے ہی حفاظت نہیں بلکہ وہ انسانوں کو گناہوں سے محفوظ رکھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں،انسان کے دل میں خوف خدا اور نیکی کا داعیہ پیدا کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ گناہ سے بچ جائے،لیکن اگر وہ پھر بھی فرشتوں کے الہامات سے غفلت برت کر گناہ میں مبتلا ہو ہی جائے تو پھر وہ دعا اور کوشش کرتے ہیں کہ وہ جلد توبہ کر کے گناہ سے پاک ہوجائے،لیکن اگر وہ پھر بھی کسی طرح متنبہ نہیں ہوتا تو پھر وہ فرشتے اس گناہ کو اس کے اعمال نامے میں لکھ دیتے ہیں۔حضرت کعب بن احبار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ فرشتوں کا پہرہ انسانوں پر نہ ہو تو جنات ان کی زندگی وبال بنادیں۔

اللہ بھی اپنا معاملہ بدل دیتا ہے:

ایک اصولی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ انسانوں کی حفاظت پر جو فرشتے مقرر ہیں،اس سے کسی کو یہ غلط فہمی ہوسکتی تھی کہ جب اللہ تعالی نے حفاظت کا یہ انتظام کررکھا ہے تو پھر انسان کو بے فکر ہو جانا چاہئے اور گناہ وثواب کی پرواہ بھی نہیں کرنا چاہئے ، کیونکہ یہ فرشتے اس کی حفاظت پر مامور ہیں،اللہ تعالی نے مذکورہ آیت میں اس غلط فہمی کو بھی دور فرمادیا ہے کہ جب وہ قوم خود ہی اپنے آپ کو نعمت کی بجائے مصیبت اور کشائش کی بجائے تنگی کا مستحق بنالیتی ہے تو پھر اللہ بھی اپنا معاملہ

بدل دیتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے اور اسے کوئی دور نہیں کر سکتا، چنانچہ وہ نگران فرشتے بھی ایسی صورت میں کام نہیں دیتے۔

آج اگر امت مسلمہ اپنے لیے عزت چاہتی ہے تو اسے ذلت والے اسباب ترک کر کے،عزت والے اسباب و وسائل اختیار کرنے ہوں گے، محض عزت کی آرزو سے عزت کا حصول ناممکن ہے۔(خلاصہ القرآن:م اش، خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

حق کی پائیداری اور باطل کی بے ثباتی کی دو مثالیں:

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا ....الیٰ..............فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ‌ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ ؕ﴿۱۷﴾

اسی نے آسمان سے پانی برسایا جس سے ندی نالے اپنی اپنی بساط کے مطابق بہہ پڑے، پھر پانی کے ریلے نے پھولے ہوئے جھاگ کو اوپر اٹھالیا، اور اسی قسم کا جھاگ اس وقت بھی اٹھتا ہے جب لوگ زیور یا برتن بنانے کے لیے دھاتوں کو آگ پر تپاتے ہیں۔اللہ حق اور باطل کی مثال اسی طرح بیان کررہا ہے کہ (دونوں قسم کا) جو جھاگ ہوتا ہے وہ تو باہر گر کر ضائع ہوجاتا ہے، لیکن وہ چیز جو لوگوں کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔اسی قسم کی تمثیلیں ہیں جو اللہ بیان کرتا ہے۔(۱۷)

حق کی پائیداری اور باطل کی بے ثباتی کی دو مثالیں بیان فرمائی گئیں ہیں،ایک مثال تو یہ دی کہ جب آسمان سے بارش اترتی ہے اور پانی رواں ہوتا ہے تو کوڑے کرکٹ اور گھاس پھونس کو پانی کی سطح پر بہالاتا ہے اور دوسری مثال یہ بیان فرمائی کہ جیسے تیز آگ میں چاندی،لوہا، تانبہ اور دوسری دھاتیں پگھلاتے ہیں تاکہ زیور اور ہتھیار وغیرہ تیار کریں،اس میں بھی میل کچیل اور جھاگ اوپر اٹھتا ہے مگر تھوڑی دیر بعد میل کچیل علیحدہ کردیا جاتا ہے اور جو اصلی اور کارآمد چیز ہوتی ہے وہی باقی رہ جاتی ہے جس سے لوگ مختلف طور پر نفع اٹھاتے ہیں، یہی مثال حق اور باطل کی بھی ہے کہ جب وحی آسمانی دین حق کو لیکر اترتی ہے تو انسانوں کے قلوب اپنے اپنے ظرف کے موافق فائدہ حاصل کرتے ہیں اور جب حق و باطل کا سامنا اور ٹکراؤ ہوتا ہے تو جس طرح میل کچیل یا کوڑا کرکٹ اوپر آجاتا ہے اسی طرح بظاہر باطل جھاگ کی طرح حق کو دبالیتا ہے، لیکن ایسا عارضی اور وقتی ہوتا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد جو اصلی اور کارآمد چیز تھی وہی رہ جاتی ہے اور باطل جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے یا کوڑا کرکٹ کی طرح بہہ جاتا ہے۔ان مثالوں سے مقصود یہ ہے کہ کسی مؤمن کو باطل کی عارضی عیش سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے،انجام کار حق ہی خالص چیز کی طرح ثابت وقائم رہے گا، دنیا بھر میں باطل کی مادی جھاگ جو اٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے یہ جھاگ خود بخود بیٹھ جائے گی ،لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں حق کے سچے پرستار کھڑے ہوجائیں، لیکن افسوس! جو صورت نظر آرہی ہے وہ تو یہ ہے کہ حق کے نام لیواؤں نے اہل باطل کے اور اہل باطل نے اہل حق کے طور

طریقے اپنا رکھے ہیں، وہ ان طریقوں کو اپنا کر فائدہ اٹھا رہے ہیں اور حق کے نام لیوا ان کے طور طریقے اپنا کر اپنی دنیا بھی برباد کر رہے ہیں اور آخرت بھی۔

اہل تقویٰ کی صفات:

اہل تقوی اور حقیقی عقل مندوں کی آٹھ صفات بتائی گئی ہیں:

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ۝۲۰..........الی..........سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۝۲۴

(یعنی) وہ لوگ جو اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں، اور معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔(۲۰) اور جن رشتوں کو اللہ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے، یہ لوگ انہیں جوڑے رکھتے ہیں، اور اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں، اور حساب کے برے انجام سے خوف کھاتے ہیں۔(۲۱) اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی خوشنودی کی خاطر صبر سے کام لیا ہے، اور نماز قائم کی ہے اور ہم نے انہیں جو رزق عطا فرمایا ہے، اس میں سے خفیہ بھی اور علانیہ بھی خرچ کیا ہے، اور وہ بدسلوکی کا دفاع حسن سلوک سے کرتے ہیں، وطن اصلی میں بہترین انجام ان کا حصہ، (۲۲) یعنی ہمیشہ رہنے کے لیے وہ باغات جن میں وہ خود بھی داخل ہوں گے، اور ان کے باپ دادوں، بیویوں اور اولاد میں سے جو نیک ہوں گے وہ بھی، اور (ان کے استقبال کے لیے) فرشتے ان کے پاس ہر دروازے سے (یہ کہتے ہوئے) داخل ہوں گے۔(۲۳) کہ تم نے (دنیا میں) جو صبر سے کام لیا تھا، اس کی بدولت اب تم پر سلامتی ہی سلامتی نازل ہوگی، اور (تمہارے) اصلی وطن میں یہ تمہارا بہترین انجام ہے۔(۲۴)

اہل تقوی اور حقیقی عقل مندوں کی آٹھ صفات:

(۱) وہ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور عہد شکنی کے مرتکب نہیں ہوتے۔

حضرت میمون بن مہران فرماتے ہیں کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں مسلمان اور کافر کی تفریق نہیں، (۱) عہد کسی سے بھی ہو؛ پورا کرنا چاہئے (۲) ہر ایک سے صلہ رحمی کی جائے (۳) امانت میں خیانت نہ کی جائے، چاہے وہ کسی کی ہو۔

(۲) جن رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں جوڑے رکھتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی نیکی جس کا صلہ بہت جلد ملتا ہو صلہ رحمی سے بڑھ کر نہیں ہے، اور کوئی گناہ جس کا وبال دنیا میں علاوہ سزائے آخرت کے ملے گا قطع رحمی اور ظلم سے بڑھ کر نہیں، ایک حدیث میں ہے کہ قطع رحمی کرنے والا جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا۔

(۳) اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

(۴) حساب سے خوف رکھتے ہیں۔

(۵) اللہ کی رضا کے لیے صبر کرتے ہیں۔

(۶) نماز قائم کرتے ہیں۔

(۷) اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں۔

(۸) برائی کا جواب بھلائی اور اچھائی سے دیتے ہیں۔

ایک حدیث شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ تم اپنے طرز عمل کو لوگوں کے طرز عمل کا تابع بنا کر نہ رکھو، یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اگر لوگ بھلائی کریں گے تو ہم بھلائی کریں گے اور اگر لوگ ظلم کریں تو ہم بھی ظلم کریں گے۔ تم اپنے نفس کو ایک قاعدے کا پابند بناؤ، اگر لوگ نیکی کریں تو تم بھی نیکی کرو اور اگر لوگ تم سے بدسلوکی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔

اشقیاء کی علامات:

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۗءُ الدَّارِ ﴿٢٥﴾

اور (دوسری طرف) جو لوگ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو مضبوطی سے باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور جن رشتوں کو اللہ نے جوڑے رکھنے کا حکم دیا ہے، انہیں کاٹ ڈالتے ہیں، اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، تو ایسے لوگوں کے حصے میں لعنت آتی ہے، اور اصلی وطن میں برا انجام انہی کا ہے۔ (۲۵)

اہل تقویٰ کے مقابلے میں اشقیاء کی تین نمایاں علامات ہیں:

پہلی یہ کہ وہ اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں۔

دوسری یہ کہ اللہ نے جن رشتوں کو باقی رکھنے کا حکم دیا ہے وہ انہیں ختم کرتے ہیں۔

اور تیسری یہ کہ وہ زمین میں فساد کرتے ہیں۔ (خلاصہ القرآن: م اش، خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

مقام نبوت اور بشر:

انبیاء بھی دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہوتے ہیں، ان کے بیوی بچے بھی ہوتے ہیں، جہاں تک ان کے معجزات کا تعلق ہے تو یہ ان کا ذاتی کمال نہیں ہوتا، بلکہ یہ اللہ کے حکم سے صادر ہوتے ہیں، وہ لوگ مقام نبوت سے ناواقف ہیں جو بشر ہونے کی وجہ سے ان کی نبوت کا انکار کرتے ہیں۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿٢٧﴾

اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ ان پر (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر) ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟ کہہ دو کہ: اللہ جس کو چاہتا ہے، گمراہ کر دیتا ہے اور اپنے راستے پر انہی کو لاتا ہے جو اس کی

طرف رجوع کریں۔(۲۷)

یہاں اس کا جواب دینے کے بجائے یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ مطالبات ان کی گمراہی کی دلیل ہیں، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے، گمراہی میں پڑا رہنے دیتا ہے اور ہدایت اسی کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ سے رجوع کر کے ہدایت مانگے، اور حق کی طلب رکھتا ہو، ایسا شخص ایمان لانے کے بعد اس کے حقوق ادا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں سکون حاصل کر لیتا ہے، پھر اس کو اس قسم کے شکوک پیدا نہیں ہوتے، وہ ہر حال کو اللہ تعالیٰ کی مشیت پر چھوڑ کر اس پر مطمئن رہتا ہے، اگر اچھی حالت ہو تو اس پر شکر ادا کرتا ہے اور اگر کوئی تکلیف ہو تو اس پر صبر کر کے اللہ تعالیٰ سے اس کے دور ہونے کی دعا کرتا ہے اور اس بات پر مطمئن ہوتا ہے کہ جب تک تکلیف ہے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کے تحت ہے، اس لئے مجھے اس سے شکوہ نہیں ہے، اس طرح اسے تکلیف کے حالات میں بھی اطمینان قلب نصیب رہتا ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنی بیماری دور کرنے کے لئے آپریشن کروائے تو آپریشن کی تکلیف کے باوجود اسے اطمینان رہتا ہے کہ یہ عمل عین حکمت کے مطابق ہے۔(توضیح القرآن، خلاصۃ القرآن)

دلی اطمینان کی چیز: ذکر اللہ:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۝۲۸

یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور جن کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ یاد رکھو کہ صرف اللہ کا ذکر ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔(۲۸)

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ ہر دن کے لیے کسی مومن کا ذکر الٰہی میں حصہ اس سے کم نہیں ہونا چاہیے کہ وہ "سبحان اللہ۔ الحمد للہ۔ لا الہ الا اللہ۔ اللہ اکبر۔" سو سو مرتبہ کہے، بعض بزرگان دین اس کے ساتھ ساتھ ایک سو مرتبہ استغفار اور ایک سو مرتبہ درود شریف پڑھنے کی تلقین بھی کرتے ہیں، مشائخ چشت کے طریقے پر بیعت ہونے والے عوام کو یہ عمل ہر روز صبح و شام کرنا ہوتا ہے، اس کے علاوہ اذکار کے تمام کلمات جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں یا جو سلف صالحین سے منقول ہیں، وہ سب اطمینان قلب کا باعث ہیں۔

حصن حصین کی روایت میں آتا ہے "**کل مطیع ذاکر اللہ**" یعنی اللہ کا ہر اطاعت گزار اس کا ذاکر ہے، یعنی اگر وہ زبان سے ذکر نہیں بھی کرتا مگر اس کی طرف سے خدا کی اطاعت کا ہر کام اس کی طرف سے ذکر ہی سمجھا جائے گا، تاہم زبانی ذکر ملت ابراہیمی کا بہت بڑا اصول ہے "**ولذکر اللہ اکبر**"۔ اللہ کا ذکر ہر چیز سے بڑا ہے، جب انسان اللہ کا اسم پاک اپنی زبان سے ادا کرتا ہے تو اس پر خدا تعالیٰ کی تجلی نازل ہوتی ہے جس سے اسے سکون قلب حاصل ہوتا ہے، آپ بزرگوں کی سوانح حیات پڑھ کر دیکھ لیں، یہ اللہ والے دنیا کے ساز و سامان سے بے نیاز مگر سکون قلب کی دولت سے مالا مال رہے ہیں، انہیں کوئی پریشانی اور بے چینی نہیں ہوئی کیونکہ اللہ کے ذکر سے بڑھ کر سکون والی اور کوئی چیز نہیں۔ مفسرین فرماتے

ہیں کہ بعض بزرگ زیادہ تر ذکر الٰہی میں ہی منہمک رہتے ہیں، وہ دنیا کے لوازمات کی طرف محض اس لیے راغب نہیں ہوتے کہ اس دوران خدا تعالیٰ کی تجلی کا نزول نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس سے محروم رہ جائیں گے، لہذا وہ خدا کی تجلی کے حصول کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں، تا کہ ان کے سکون قلب کی دولت میں کسی وقت بھی کمی نہ آنے پائے، بہر حال سکون قلب کے لیے ذکر کا طریقہ بھی صحیح ہونا ضروری ہے، اگر کوئی بدعتی یا غیر مشروع طریقہ اختیار کیا گیا تو اس سے چین نصیب نہیں ہوگا کیونکہ بہتر نتیجہ صحیح راستہ اختیار کرنے سے ہی حاصل ہوگا۔ (معالم العرفان: ۱۱/ ۱۱۵)

نبوت ورسالت کی خود شہادت:

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی نبوت ورسالت کی خود شہادت دی ہے، اسی طرح وہ اہل کتاب کی نبوت کے گواہ ہیں جو تعصب سے پاک ہیں۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ..............الیٰ......قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾

(اے پیغمبر! جس طرح دوسرے رسول بھیجے گئے تھے) اسی طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی امت میں رسول بنا کر بھیجا ہے جس سے پہلی بہت سی امتیں گزر چکی ہیں، تا کہ تم ان کے سامنے وہ کتاب پڑھ کر سنا دو جو ہم نے وحی کے ذریعے تم پر نازل کی ہے، اور یہ لوگ اس ذات کی ناشکری کر رہے ہیں جو سب پر مہربان ہے، کہہ دو کہ: وہ میرا پالنے والا ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ اسی پر میں نے بھروسہ کر رکھا ہے، اور اسی کی طرف مجھے لوٹ کر جانا ہے۔ (۳۰)

شرک کی طرف راغب کیوں؟

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫ ....الیٰ...........وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

اور (اے پیغمبر) حقیقت یہ ہے کہ تم سے پہلے پیغمبروں کا بھی مذاق اڑایا گیا تھا، اور ایسے کافروں کو بھی میں نے مہلت دی تھی مگر کچھ وقت کے بعد میں نے ان کو گرفت میں لے لیا، اب دیکھ لو کہ میرا عذاب کیسا تھا؟ (۳۲) بھلا بتاؤ کہ ایک طرف وہ ذات ہے جو ہر ہر شخص کے ہر ہر کام کی نگرانی کر رہی ہے، اور دوسری طرف ان لوگوں نے اللہ کے ساتھ شریک مانے ہوئے ہیں؟ کہو کہ: ذرا ان (خدا کے شریکوں) کے نام تو بتاؤ (اگر کوئی نام لو گے) تو کیا اللہ کو کسی ایسے وجود کی خبر دو گے جس کا دنیا بھر میں اللہ کو بھی پتہ نہیں ہے؟ یا خالی زبان سے ایسے نام لے لو گے جن کے پیچھے کوئی حقیقت نہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کافروں کو اپنی مکارانہ باتیں بڑی خوبصورت لگتی ہیں اور (اس طرح) ان کی ہدایت کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے۔ اور جسے اللہ گمراہی میں پڑا رہنے دے، اسے کوئی راہ پر لانے والا میسر نہیں آسکتا۔ (۳۳) ایسے لوگوں کے لیے دنیوی زندگی میں بھی عذاب ہے اور یقینا آخرت کا عذاب کہیں زیادہ بھاری ہوگا، اور کوئی

نہیں ہے جو انہیں اللہ (کے عذاب) سے بچا سکے۔(۳۴)(دوسری طرف) وہ جنت جس کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اس کے پھل بھی سدا بہار ہیں، اور اس کی چھاؤں بھی! یہ انجام ہے ان لوگوں کا جنہوں نے تقوی اختیار کیا، جبکہ کافروں کا انجام دوزخ کی آگ ہے۔(۳۵)

عنوان سورۃ الرعد:......آفتاب ثبوت کے طلوع ہونے کے بعد بھی بعض ہستیاں منور نہیں ہوئیں، بلکہ اپنے کفر وضلالت کی ظلمت میں محجوب رہتی ہیں۔

خلاصہ رکوع:۱......(۱) نازل شدہ کتاب تو ضروریات کے مطابق تھی لیکن معاندین اس کے ماننے سے انکار کرتے ہیں۔(۲) یہ لوگ رب کی تدبیر کا فقط ایک حصہ (مرئی) مانتے ہیں۔(۳) اور دوسرے سے انکار کرتے ہیں، اس لئے قرآن کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ماخذ:(۱) آیت:۱۔(۲) آیت:۲، ۳، ۴۔(۳) آیت:۵۔

خلاصہ رکوع:۲......(۱) علم الٰہی ان کی ہر حالت پر حاوی ہے۔(۲) اگر یہ لوگ اصلاح نہیں کرنا چاہتے تو اللہ تعالی بھی ان سے بے پرواہ ہے۔(۳) لیکن آئندہ چل کر اللہ تعالیٰ سے یہ بھی بھلائی کی امید نہ رکھیں۔ ماخذ:(۱) آیت: ۸، ۹۔(۲) آیت:۱۱۔(۳) آیت:۱۸۔

خلاصہ رکوع:۳......(۱) اس کتاب کو صحیح ماننے اور نہ ماننے والے برابر نہیں ہو سکتے۔(۲) جس طرح دونوں کے طرز عمل میں فرق ہے، اسی طرح جزائے اعمال میں بھی فرق ہوگا۔ ماخذ:(۱) آیت:۱۹۔(۲) آیت:۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۵۔

خلاصہ رکوع:۴......(۱) مخالف کہتے ہیں: کوئی ایسی نشانی ظاہر ہوتی جس سے ہمارے دل قرآن پر مطمئن ہو جاتے۔(۲) ایمان والوں کو اس ذکر الٰہی (قرآن حکیم) سے اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔(۳) قرآن مجید تو اعلی درجہ کا مؤثر ہے، لیکن تمہارے دل پہاڑ، زمین اور مردوں سے بھی زیادہ بے کار ہو چکے ہیں۔ ماخذ:(۱) آیت:۲۷۔(۲) آیت:۲۹۔(۳) آیت:۳۱۔

خلاصہ رکوع:۵......(۱) آپ سے پہلے بھی نبیوں کا تمسخر اڑایا گیا، ایسے لوگوں کو پہلے اللہ تعالی نے مہلت دی، پھر دنیا میں عذاب چکھایا۔(۲) اس کے بعد آخرت کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ماخذ:(۱) آیت:۳۲۔(۲) آیت:۳۵۔

خلاصہ رکوع:۶......(۱) اگر انہیں آپ کے بیوی بچوں سے شبہ ہو رہا ہے، تو کیا پہلے انبیاء علیہم السلام کے بیوی بچے نہ تھے؟(۲) بہرحال آپ کا کام پیغام پہنچانا ہے اس کے بعد ہم خود ان سے نپٹ لیں گے۔ ماخذ:(۱) آیت:۳۸۔(۲) آیت:۴۰۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ ابراهیم

دوسری مکی سورتوں کی طرح اس سورت کا موضوع بھی اسلام کے بنیادی عقائد کا اثبات اوران کا انکار کرنے کے خوفناک نتائج پر تنبیہ ہے۔ چونکہ عرب کے مشرکین حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتے تھے، اس لیے سورت کے آخر سے پہلے رکوع میں ان کی وہ پراثر دعا نقل فرمائی گئی ہے جس میں انہوں نے شرک اور بت پرستی کی صاف صاف برائی بیان کرتے ہوئے اللہ تعالی سے درخواست کی ہے کہ انہیں اوران کے بیٹوں کو بت پرستی سے محفوظ رکھا جائے۔

وجہ تسمیہ:

آیت نمبر ۳۵ تا ۴۱ میں حضرت ابراہیمؑ کا قصہ بیان کیا گیا ہے، اسی لیے اس سورت کوسورۂ ابراہیم کہا جاتا ہے۔

سورۂ ابراہیم یہ قرآن کریم کی چودہویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۷۲ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں کل رکوع ۷، آیات ۵۲، کلمات ۸۴۵ اور حروف ۳۶۰۱ ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

ربط:

سورۂ رعد کا اختتام رسالت کی بحث پر ہوا تھا اور سورۃ ابراہیم کی ابتداء بھی مضمون رسالت سے ہے جس سے دونوں سورتوں میں مناسبت ظاہر ہے۔

خلاصہ سورۂ ابراہیم:

(۱) رسالت کی بحث جس سے سورۃ کا آغاز ہورہا ہے (۲) کفار کی سزا کا بیان جس کو "**من ورائه جهنم** سے ذکر فرمایا گیا ہے۔ (۳) مومنین کی جزا کا بیان "**وادخل الذين امنوا**" سے کیا گیا ہے، یہ دونوں مضمون معاد سے متعلق ہیں (۴) توحید کا بیان "**الم تر كيف ضرب الله**" الایۃ سے کیا گیا ہے اور اسی کی تقریر کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا گیا ہے۔ (۵) "**لا تحسبن الله غافلا عما يعمل الظالمون**" سے پھر مضمون معاد کی طرف عود کیا گیا ہے اور سورۃ کے ختم کی آیت ان سب مضامین کی جامع ہے، مضامین مذکورہ سورۃ رسالت، معاد، توحید میں مناسبت ظاہر ہے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

خلاصۂ سورت:

اس سورت میں ایمان اور کفر کو بہترین مثالوں سے واضح کیا، آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ لوگوں کو کفر کے اندھیروں سے نکال کر ایمان اور نیک اعمال کے اجالے کی طرف لاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے قصص کے ذریعے آپ کو تسلی دی کہ ان کو بھی لوگوں کی مخالفت اور دشمنی کا سامنا کرنا پڑا، اسی طرح آپ کو بھی برداشت کرنا پڑے گا، لیکن نتیجہ اچھا نکلے گا۔

عرب کے مشرکین ابراہیم (علیہ السلام) کو مانتے تھے۔ اسی لیے سورت کے آخر میں ان کی مؤثر دعا نقل کی

ہے۔جس میں آپ نے شرک اور بت پرستی کی برائی کو واضح الفاظ میں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ ان کو (حضرت ابراہیم علیہ السلام) اوران کے بیٹوں کو بھی بت پرستی سے دور رکھنا، اسی لیے سورت کا نام ''ابراہیم'' رکھا گیا ہے۔

ایمان کی نعمت سب سے بڑی نعمت اور کفر کی ہلاکت سب سے بڑی ہلاکت ہے،لوگوں کی نظر میں ایسا نہیں ہے، وہ دنیاوی اولاد، بیوی، مال، مکان کو بڑی نعمت اوراس کے نقصان کو بڑا نقصان سمجھتا ہے۔سورہ ابراہیم اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ ایمان سب سے بڑی نعمت ہے۔(۱) قرآن اندھیروں سے روشنی کی طرف لاتا ہے، حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے قصے میں بھی صبر اور شکر کی طرف اشارہ ہے۔

شکر کی حقیقت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ اللہ پاک کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور حرام کاموں میں خرچ نہ کرے اور زبان سے بھی اللہ پاک کا شکرادا کرے اور اپنے طرز عمل اور اعمال کو اس کی مرضی کے مطابق بنائے۔

صبر کا خلاصہ یہ ہے کہ فطرت کے خلاف احکام سے پریشان نہ ہوں، قول وفعل میں ناشکری سے بچے اور اللہ کی رحمت کے دنیا میں امیدوار رہے اور آخرت میں صبر کے عظیم اجر کا یقین رکھے۔

انبیاء کے حالات کو بیان کر کے بتلایا کہ سب نبیوں کی تعلیم میں صبر وشکر کا بڑا حصہ ہے۔بے نیاز ذات مغفرت کا وعدہ کرتی ہے۔آیت نمبر ۱۴، ۱۶، ۱۷ میں ترہیب سے سمجھایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں ان کے اعمال کی حالت خاکستری کی مانند ہے جسے ہوا ادھر ادھر اڑا دیتی ہے، خود ابلیس بھی قیامت میں کہے گا کہ اللہ نے سچے وعدے کیے تھے لیکن میں نے تم سے جھوٹے وعدے کیے تھے۔ہاں! میں نے کوئی زبردستی نہیں کی تھی بلکہ میں نے بلایا اور تم چلے گئے، اس لیے تم ہی خود قصوروار ہو،، اس سے بڑی توہین کیا ہوسکتی ہے؟ مثالوں سے سمجھایا کہ نعمت کس کو کہیں گے اوراس کا شکریہ کیسے ادا کریں۔

آخر میں دو مثالیں دیں:(۱) ابراہیم (علیہ السلام) توحید کی علامت،، حقیقی داعی، شاکر تھے، وہ اپنے اور اپنی اولاد کے لیے ایمان اور نماز کی پابندی کی دعا کرتے ہیں۔شرک کرنے والے ظالموں کو بخشا نہیں جائے گا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایمان کی خاطر قربانیاں دیں۔ساری زندگی شرک کے خلاف لڑتے رہے۔اسی لیے سورت کا نام ابراہیم رکھا گیا۔

سورہ ابراہیم میں اللہ تعالیٰ نے شرک اور اسلام کے درمیان فرق کو دو مثال (شجرۂ طیبہ اور شجرۂ خبیثہ) سے سمجھایا، اس کی ایک مثال مٹی کے ٹیلے پر اگنے والا ایک کانٹے دار پودا ہے، جسے ایک چھوٹے سے جھٹکے سے اکھاڑ پھینکا جا سکتا ہے، اس کے مقابلے میں دعوت اسلامی کی مثال ایک مقدس پھلدار درخت ہے۔جس کی جڑیں پاتال میں ہیں اور جس کی شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہیں۔اللہ تعالیٰ مومنین کو دنیا میں تقویت دے گا اور آخرت میں کامیابی عطا فرمائے گا۔شرط یہ ہے کہ وہ صبر واستقامت کے ساتھ حق پر قائم رہیں اور اللہ پر بھروسہ کر کے ان پر آنے والی آزمائشوں کا مقابلہ کریں۔اس

حقیقت کو تاریخ کی روشنی میں واضح کرنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کرام کے ان واقعات کو پیش کیے، جن سے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ راہ حق پر ثابت قدم رہنے والوں نے مخالفین کو مغلوب اور تباہ کیا، لیکن یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بالادستی صرف ان کو ملے گی جو پہلے مرحلے میں صبر اور استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

اسلام کے مخالفین کا آخرت میں جو حال ہوگا اس کا بیان ہے کہ جو کچھ وہ کرتے تھے وہ خاک ورا کھ ہوجائے گا۔ لیڈر اور ان کے پیروکار سب ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے، حتیٰ کہ شیطان بھی اعلان کرے گا کہ اس کا اپنے پیروکاروں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور کہے گا کہ میں نے صرف تمہیں اپنے پاس بلایا تھا۔ تم نے ہی میری بات مان لی، اب مجھے ہی کو ملامت کرو، نہ میں تمہارے کسی کام آسکتا ہوں اور نہ تم میرے کام آسکتے ہو، بلاشبہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والوں کا انجام دردناک ہے۔

قریش کے سرکردہ سرداروں کو تنبیہ کی گئی کہ تم نے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو کفر اور شرک کا سبب بنالیا اور اس طرح اپنی قوم کو جہنم کے دہانے پر پہنچا دیا ہے۔ اس میں آج کے لیڈروں کے لیے بھی ایک سبق ہے، کاش! وہ قرآن کو سمجھتے، مسلمانوں کو نصیحت کی گئی کہ وہ باقاعدگی سے نماز پڑھیں، قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ خرید وفروخت ہو، دوستی نہیں کام آئے گی، ظالموں کے اعمال سے اللہ کو غافل نہ سمجھو، وہ صرف اس دن کے لئے ان سے گریز کررہا ہے جس میں اس کی آنکھیں کھلی رہ جائے گی، وہ گھبرا جائیں گے اور شکایت کریں گے کہ اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑی سی مزید چھوٹ دے، ہم آپ کے عمل کی بجا آوری کریں گے، اور رسولوں کی پیروی کریں گے، اللہ تعالیٰ اعلیٰ ہے اور اس کے پاس انتقام کی طاقت ہے۔ وہ دن یاد کرو جب اس زمین کی جگہ دوسری زمین بدلی جائے گی اور آسمان بھی اور سب اللہ کے حضور حاضر ہوں گے اور غضبناک ہوں گے اور آپ اس دن مجرموں کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھیں گے۔ اور ان کے منہ آگ سے ڈھکے ہوں گے، تاکہ اللہ ہر جاندار کو اس کی کمائی کا بدلہ دے اور اللہ پاک کو حساب میں دیری نہیں ہوگی، یہ لوگوں کے لیے ایک اعلان ہے، تاکہ وہ اس سے آگاہ ہوجائیں اور وہ جان لیں کہ یہ ایک ہی معبود ہے اور جو لوگ عقل رکھتے ہیں وہ اس بھولے ہوئے سبق کو یاد کرلیں۔ (قرآن سارانس گجراتی)

نزول قرآن کی حکمت اور مقصد:

اس سورت کی ابتداء بھی حروف مقطعات سے ہوئی ہے، گزشتہ سورت کی طرح اس سورت کا آغاز بھی قرآن کریم کی عظمت سے کیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بتلا دیا گیا کہ قرآن کے نازل کرنے اور نبی کریم (علیہ السلام) کی بعثت سے مقصد یہ ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کتاب کے ذریعے سے لوگوں کو اندھیرے سے روشنی کی طرف نکالیں اور جو لوگ دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں ان کو آخرت کا راستہ بتلائیں، دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے اور "ظلمات" یعنی اندھیروں سے کفر اور شرک اور معصیت کے انواع واقسام مراد ہیں اور اس کی پہلی آیت میں نزول قرآن کی حکمت اور مقصد بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۱﴾

الر۔ (اے پیغمبر) یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تم پر نازل کی ہے، تاکہ تم لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آؤ، یعنی اس ذات کے راستے کی طرف جس کا اقتدار سب پر غالب ہے، (اور) جو ہر تعریف کا مستحق ہے۔(۱) (خلاصہ القرآن: م اش)

رسول کو قومی زبان میں بھیجنے کی حکمت:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۴﴾

اور ہم نے جب بھی کوئی رسول بھیجا، خود اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تا کہ وہ ان کے سامنے حق کو اچھی طرح واضح کر سکے۔ پھر اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے، ہدایت دے دیتا ہے اور وہی ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، جس کی حکمت بھی کامل۔(۴)

اللہ تعالی نے قرآن کریم کو عربی زبان میں نازل فرمایا کیونکہ اس کے اولین مخاطب عربی ہی تھے اور قانون خداوندی ہے کہ احکام شریعت ہمیشہ اسی قوم کی زبان میں نازل فرماتے ہیں تا کہ وہ اس کو آسانی سے سمجھ سکیں، چنانچہ حضرت موسی علیہ السلام اور ان کی قوم کی زبان عبرانی تھی اس لئے ان پر تورات بھی عبرانی زبان میں نازل کی گئی، حضرت عیسی علیہ السلام اور ان کی قوم کی زبان سریانی تھی تو انجیل بھی سریانی زبان میں نازل کی گئی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیوں کہ قیامت تک آنے والے ہر انسان کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے، چاہے اس کی زبان کوئی بھی ہو، اس لئے اللہ تعالی نے قرآن کریم کی سب سے خوبصورت اور فصیح و بلیغ زبان میں یعنی عربی زبان میں نازل فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عربی سے محبت پیدا کرنے کیلئے حکم فرمایا کہ عربی زبان سیکھو تین وجہ سے (۱) قرآن عربی میں ہے (۲) میری زبان عربی ہے (۳) اہل جنت کی زبان عربی ہے۔ اور حضرت عمرؓ نے فرمایا: عربی سیکھو اسلئے کہ وہ تمہارا دین ہے۔ یعنی تمہارا دین اس زبان میں ہے، چنانچہ عربی زبان کو سیکھے بغیر نہ قرآن کریم کو سمجھا جا سکتا ہے نہ احادیث کو، اس لئے مسلمان جہاں دوسری زبان سیکھتے ہیں وہیں ان کو عربی بھی سیکھنی چاہئے بلکہ اس کو اور زبانوں پر ترجیح دینا چاہئے۔ (خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

اس قوم کی زبان جو اس پیغمبر کی مخاطب اول و براہ راست ہوتی ہے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور تمام پیغمبروں سے ممتاز، دوہری حیثیت رکھتے تھے، ایک حیثیت تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رہبر عالم ہونے کی تھی جس کی توضیح قرآن مجید کی ایک آیت میں نہیں متعدد آیتوں میں ہے۔ للناس۔ کافۃ للناس وغیرہ الفاظ کے ذریعہ سے۔ دوسری حیثیت پیغمبر عرب ہونے کی تھی اور یہاں اسی کا ذکر ہے۔

اس آیت سے ایک اور اصل بھی ہاتھ آتی ہے، وہ یہ کہ کسی قوم پر پوری اور کافی تبلیغ جبھی ہو سکتی ہے جب خود اس قوم کی زبان میں ہو، پھر اگر امت کو قرآن کی تبلیغ ساری دنیا میں مدنظر ہے اور یہ ہونی چاہئے تو اس کے سوا کیا صورت کہ اس کے ترجمے دنیا کی مشہور زبانوں میں کئے جائیں، گو ظاہر ہے کہ ترجمہ بہتر سے بہتر ہو اصل قرآن سے فروتر ہی رہے گا۔

ایک بڑے مفسر نے کہا ہے کہ اب عجم کو کوئی عذر باقی نہیں رہا، جب ان کی زبانوں پر ترجمے قابل فہم ہوں تو یہی ترجمہ ان پر حجت بن جاتا ہے۔ (ماجدی: ۳/ ۲۶۸)

شکر، ناشکری:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝

اور وہ وقت بھی جب تمہارے پروردگار نے اعلان فرما دیا تھا کہ اگر تم نے واقعی شکر ادا کیا تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا، اور اگر تم نے ناشکری کی تو یقین جانو، میرا عذاب بڑا سخت ہے۔ (۷)

شکر کی حقیقت:

شکر کی حقیقت یہ ہے کہ انسان منعم کے فضل و احسان کا اقرار کرے، اس کی تعریف کرے اور نعمت کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرے جس مقصد کے لیے وہ نعمت عطا کی گئی ہے۔

نعمت علم کا تقاضا یہ ہے کہ عمل کیا جائے اور جاہلوں کو تعلیم دی جائے، نعمت مال کا شکر یہ ہے اسے نیکی اور احسان کے مواقع پر خرچ کیا جائے، اسی پر دوسری نعمتوں کو قیاس کر لیا جائے۔

حضرت خاتم النبیین کو تسلی:

حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے بتایا گیا ہے کہ سابقہ انبیاء کے ساتھ بھی ان کی قوموں نے اعراض و انکار اور عداوت و مخالفت کا یہی رویہ اختیار کیا تھا جو آپ کی قوم اختیار کیے ہوئے ہے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ .... الیٰ .... وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝

(اے کفار مکہ) کیا تمہیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، قوم نوح، عاد، ثمود اور ان کے بعد آنے والی قومیں جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ان سب کے پاس ان کے رسول کھلے کھلے دلائل لے کر آئے، تو انہوں نے ان کے منہ پر اپنے ہاتھ رکھ دیے، اور کہا کہ: جو پیغام تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے، ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں، اور جس بات کی تم ہمیں دعوت دے رہے ہو، اس کے بارے میں ہمیں بڑا بھاری شک ہے۔ (۹)

انبیاء اور ان کی قوم کی گفتگو:

اسی سلسلہ میں اللہ تعالی نے وہ گفتگو ذکر کی ہے جو بعض انبیاء اور انہیں جھٹلانے والوں کے درمیان ہوئی، ان مکذبین

نے انبیاء کی دعوت کے جواب میں چار شبہات پیش کیے:(۱) رب العالمین کے وجود کے بارے میں شبہ (۲) بشر رسول نہیں ہوسکتا (۳) تقلید آباء (۴) معجزہ دکھانا اللہ کا اختیار ہے۔ چنانچہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

قَالَتۡ رُسُلُهُمۡ اَفِى اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ ...... الی ...... تَصُدُّوۡنَا عَمَّا كَانَ يَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاۡتُوۡنَا بِسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ‏ ﴿۱۰﴾

ان کے پیغمبروں نے ان سے کہا: کیا اللہ کے بارے میں شک ہے جو سارے آسمانوں اور زمین کا خالق ہے؟ وہ تمہیں بلا رہا ہے کہ تمہاری خاطر تمہارے گناہ معاف کردے، اور تمہیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دے۔ انہوں نے کہا کہ: تمہاری حقیقت اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ تم ایسے ہی انسان ہو جیسے ہم ہیں۔ تم یہ چاہتے ہو کہ ہمارے باپ دادا جن کی عبادت کرتے آئے ہیں ان سے ہمیں روک دو، لہٰذا کوئی صاف صاف معجزہ لاکر دکھاؤ۔ (۱۰)

نبیوں کو ستانے والوں کا انجام:

وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِرُسُلِهِمۡ لَنُخۡرِجَنَّكُمۡ مِّنۡ اَرۡضِنَاۤ اَوۡ لَتَعُوۡدُنَّ فِىۡ مِلَّتِنَا‌ ..... الی .... وَمِنۡ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيۡظٌ‏ ﴿۱۷﴾

اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا تھا، انہوں نے اپنے پیغمبروں سے کہا کہ: ہم تمہیں اپنی سرزمین سے نکال کر رہیں گے، ورنہ تمہیں ہمارے دین میں واپس آنا پڑے گا۔ چنانچہ ان کے پروردگار نے ان پر وحی بھیجی کہ: یقین رکھو، ہم ان ظالموں کو ہلاک کردیں گے۔ (۱۳) اور ان کے بعد یقیناً تمہیں زمین میں بسائیں گے، یہ ہے ہر اس شخص کا صلہ جو میرے سامنے کھڑا ہونے کا خوف رکھتا اور میری وعید سے ڈرتا ہے۔ (۱۴) اور ان کافروں نے خود فیصلہ مانگا، اور (نتیجہ یہ ہوا کہ) ہر ڈینگیں مارنے والا ہٹ دھرم نامراد ہوکر رہا۔ (۱۵) اس کے آگے جہنم ہے اور (وہاں) اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا۔ (۱۶) وہ اسے گھونٹ گھونٹ کرکے پیے گا، اور اسے ایسا محسوس ہوگا کہ وہ اسے حلق سے اتار نہیں سکے گا، موت اس پر ہر طرف سے آرہی ہوگی، مگر وہ مرے گا نہیں، اور اس کے آگے (ہمیشہ) ایک اور سخت عذاب موجود ہوگا۔ (۱۷)

ایمان اور کفر کی شاندار مثال:

اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ .... الی .... وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيۡنَ‌ ۙ وَيَفۡعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ‏ ﴿۲۷﴾

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کی کیسی مثال بیان کی ہے؟ وہ ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہے جس کی جڑ (زمین میں) مضبوطی سے جمی ہوئی ہے، اور اس کی شاخیں آسمان میں ہیں۔ (۲۴) اپنے رب کے حکم سے وہ ہر آن پھل دیتا ہے۔ اللہ (اس قسم کی) مثالیں اس لیے دیتا ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ (۲۵) اور ناپاک کلمے کی مثال ایک خراب درخت کی طرح ہے جسے زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جائے، اس میں ذرا بھی جماؤ نہ ہو۔ (۲۶) جو لوگ

ایمان لائے ہیں، اللہ ان کو اس مضبوط بات پر دنیا کی زندگی میں جماؤ عطا کرتا ہے اور آخرت میں بھی، اور ظالم لوگوں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے، اور اللہ (اپنی حکمت کے مطابق) جو چاہتا ہے کرتا ہے۔(۲۷)

کلمہ طیبہ سے مراد کلمہ توحید یعنی لا الہ الا اللہ ہے اور اکثر مفسرین نے فرمایا ہے کہ پاکیزہ درخت سے مراد کھجور کا درخت ہے جس کی جڑیں زمین میں مضبوطی کے ساتھ جمی ہوتی ہیں، اور تیز ہوائیں اور آندھیاں اسے نقصان نہیں پہنچاسکتیں، نہ اسے اپنی جگہ سے ہلاسکتی ہیں، اسی طرح جب توحید کا کلمہ انسان کے دل ودماغ میں پیوست ہوجاتا ہے تو ایمان کی خاطر اسے کیسی ہی تکلیفوں یا مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے اس کے ایمان میں کوئی کمزوری نہیں آتی، کھجور کے درخت کی دوسری صفت اس آیت میں یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ اس کی شاخیں آسمان کی طرف بلند ہوتی ہیں، اور زمین کی کثافتوں سے دور رہتی ہیں، اسی طرح جب توحید کا کلمہ مومن کے دل میں پیوست ہوجاتا ہے تو اس کے تمام نیک کام- جو درحقیقت اسی کلمے کی شاخیں ہیں- آسمان کی طرف بلند ہوتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ تک پہنچ کر اس کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں، اور دنیا پرستی کی کثافتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

ناپاک کلمہ سے مراد کفر کا کلمہ ہے، اس کی مثال ایسا خراب درخت ہے جس کی کوئی مضبوط جڑ نہ ہو؛ بلکہ وہ جھاڑ جھنکاڑ کی شکل میں خود اُگ آئے، اس میں جماؤ بالکل نہیں ہوتا، اس لئے جو شخص چاہے اسے آسانی سے اکھاڑ ڈالتا ہے، اسی طرح کافرانہ عقیدوں کی کوئی عقلی یا نقلی بنیاد نہیں ہوتی، ان کی تردید آسانی سے کی جاسکتی ہے، اور غالباً اس سے مسلمانوں کو یہ تسلی دی گئی ہے کہ کفر وشرک کے جن عقیدوں نے آج مسلمانوں پر زمین تنگ کی ہوئی ہے عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ان کو اس طرح اکھاڑ پھینکا جائے گا جیسے جھاڑ جھنکاڑ کو اکھاڑ پھینک دیا جاتا ہے۔(خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام؛ پوری کائنات انسانوں کی خدمت میں:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً .... الیٰ..............اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے تمہارے رزق کے لیے پھل اگائے، اور کشتیوں کو تمہارے لیے رام کردیا، تاکہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلیں، اور دریاؤں کو بھی تمہاری خدمت پر لگادیا۔(۳۲) اور تمہاری خاطر سورج اور چاند کو اس طرح کام پر لگایا کہ وہ مسلسل سفر میں ہیں، اور تمہاری خاطر رات اور دن کو بھی کام پر لگایا۔(۳۳) اور تم نے جو کچھ مانگا، اس نے اس میں سے (جو تمہارے لیے مناسب تھا) تمہیں دیا۔ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو شمار (بھی) نہیں کرسکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بہت بے انصاف، بڑا ناشکرا ہے۔(۳۴)

حضرت ابراہیمؑ کی دعائیں:

ان آیات میں دعاء ابراہیمی کا ذکر کرتے ہیں چونکہ اہل مکہ کو یہ زعم تھا کہ ہم ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد میں سے

ہیں اور ان کے طریقہ پر ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی یہ دعا نقل فرمائی تا کہ معلوم ہو جائے کہ وہ بڑے مؤحد تھے اور شرک سے متنفر تھے۔ اور اپنی اولاد کے لیے یہی دعا کرتے تھے کہ اے اللہ ان سب کو شرک اور بتوں سے دور رکھنا، لہٰذا ان کی نسل کو چاہیے کہ ان کے طریقہ پر چلے اور انہیں کی دعاؤں سے یہ ریگستانی خطہ ایک پر امن اور آباد شہر بنا، لہٰذا تم کو چاہیے کہ ان احسانات کو دیکھ کر خدا کے شکر گزار بنو، خانہ کعبہ کے اہل وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو ایک خدا کی عبادت کریں، یہ گھر ابراہیم (علیہ السلام) نے خدا کی عبادت کے لیے بنایا تھا، اسی وجہ سے اس گھر کو بیت اللہ کہا جاتا ہے اور چونکہ ابراہیم (علیہ السلام) توحید اسلام کی دعوت دیتے تھے اور عبادت اصنام سے منع کرتے تھے اس لیے ان کا قصہ کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی تشریح ہے، اس لیے کہ توحید بمنزلہ شجرہ طیبہ کے ہے اور شرک بمنزلہ شجرہ خبیثہ کے ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: (تفسیر ادریسی: ۴/۲۶۷)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ ....الیٰ................وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾

اور یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم نے (اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے) کہا تھا کہ: یا رب! اس شہر کو پر امن بنا دیجیے اور مجھے اور میرے بیٹوں کو اس بات سے بچائیے کہ ہم بتوں کی پرستش کریں۔ (۳۵) میرے پروردگار! ان بتوں نے لوگوں کی بڑی تعداد کو گمراہ ہی کیا ہے۔ لہذا جو کوئی میری راہ پر چلے، وہ تو میرا ہے، اور جو میرا کہنا نہ مانے، تو (اس کا معاملہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں) آپ بہت بخشنے والے بڑے مہربان ہیں۔ (۳۶) اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد کو آپ کے حرمت والے گھر کے پاس ایک ایسی وادی میں لا بسایا ہے جس میں کوئی کھیتی نہیں ہوتی، ہمارے پروردگار! (یہ میں نے اس لیے کیا) تا کہ یہ نماز قائم کریں۔ لہذا لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے کشش پیدا کر دیجیے، اور ان کو پھلوں کا رزق عطا فرمایئے۔ تا کہ وہ شکر گزار بنیں۔ (۳۷) اے ہمارے رب! ہم جو کام چھپ کر کرتے ہیں، وہ بھی آپ کے علم میں ہیں، اور جو کام علانیہ کرتے ہیں، وہ بھی۔ اور اللہ سے نہ زمین کی کوئی چیز چھپی ہوئی ہے، نہ آسمان کی کوئی چیز۔ (۳۸) تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق (جیسے بیٹے) عطا فرمائے۔ بیشک میرا رب بڑا دعائیں سننے والا ہے۔ (۳۹) یا رب! مجھے بھی نماز قائم کرنے والا بنا دیجیے اور میری اولاد میں سے بھی (ایسے لوگ پیدا فرمایئے جو نماز قائم کریں) اے ہمارے پروردگار! اور میری دعا قبول فرما لیجیے، (۴۰) اس دن میری بھی مغفرت فرمایئے میرے والدین کی بھی، اور ان سب کی بھی جو ایمان رکھتے ہیں۔ (۴۱)

نسلوں کا دین پر برقرار رہنا اور امن وچین اور سکون سے زندگی گذارنا اور بقدر ضرورت روزی کا بندوبست ہو جانا انسان کی بنیادی ضرورتیں ہیں، مذکورہ آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعائیں خاص طور پر ذکر کی گئی ہیں جو انہوں نے بیت اللہ کی تعمیر کے بعد اہل مکہ، اپنی اولاد اور خود اپنے خاندان کے لیے کی تھیں۔

اقامت صلوۃ کی دعا:

ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے اقامت صلوۃ کی دعا بھی کی " **رب اجعلنی مقیم الصلوۃ** "۔اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا دے" **ومن ذریتی** "۔اور میری اولاد میں سے بھی ایسے لوگ پیدا فرما جو نماز کو قائم کریں، اقامت صلوۃ بہت بڑی حقیقت ہے جس کے ذریعے تعلق باللہ درست ہوتا ہے، تو آپ نے اپنے اور اپنی اولاد کے حق میں یہی دعا کی کہ ہمیں مکمل شرائط اور اخلاص کے ساتھ نماز ادا کرنے والے بنا دے، اگر نماز درست ہوگئی تو ہر چیز درست ہو جائے گی اور اگر نماز ہی درست نہ ہوئی، تو نہ دین درست ہوگا اور نہ دنیا، انسان الحاد اور بدعملی کا شکار ہی رہے گا۔

ہمارے بزرگوں میں سے حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ ایک دفعہ دیوبند سے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں بارہ چودہ کوس کا سفر پیدل طے کر کے پہنچے، حضرت گنگوہیؒ نے آمد کا مقصد پوچھا تو عرض کیا کہ میرے حق میں دعا کریں کہ میں نماز ٹھیک طریقے پر ادا کرسکوں، میرا یہاں آنے کا اور کوئی مقصد نہیں، اس پر حضرت گنگوہیؒ نے عجیب جملہ ارشاد فرمایا، کہنے لگے اگر نماز ٹھیک طریقے پر آگئی تو سب کچھ آ گیا، پھر باقی کیا رہ گیا، فرمایا یہی بات تو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے جس کام کی جڑ بنیاد صحیح ہوگئی اس کے سارے معاملات صحیح ہو گئے ، اللہ کے ساتھ تعلق بھی درست ہو جائے گا اور دنیا کے سارے معاملات بھی ٹھیک ہو جائیں گے، سیاست ہو یا معیشت، حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد؛ نماز کی درستگی کے ساتھ ہی سب کچھ درست ہو جائے گا، تو ابراہیم (علیہ السلام) نے بھی یہی دعا کی کہ مولائے کریم! مجھے اور میری اولاد کو نمازی بنا دے۔

ابوداؤد شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جب آدمی نماز پڑھ کر فارغ ہوتا ہے تو اس کی نماز کا صرف دسواں حصہ قبول ہوتا ہے جبکہ نو حصے ضائع ہو جاتے ہیں، بعض لوگوں کا نواں حصہ، بعض کا آٹھواں حصہ اور بعض کی نصف نماز قبول ہوتی ہے، جس کی آدھی نماز قبول ہو جائے تو وہ بڑی شان والا آدمی ہوتا ہے اور جس کی پوری کی پوری نماز قبول ہو جائے وہ مقربین الٰہی میں شمار ہوتا ہے، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی قبولیت کا دارومدار اخلاص، صلاحیت اور نیکی پر ہے، نماز میں جس قدر ان چیزوں کا حصہ ہوگا، اسی قدر نماز کی قبولیت بھی ہوگی۔ (معالم العرفان: ۱۱/ ۳۰۸، ۳۰۹)

قیامت کی منظر کشی:

سورۂ ابراہیم کے آخری رکوع میں قیامت کی منظر کشی کی گئی ہے اور جہنم کے ہولناک عذابوں کا تذکرہ ہے، اسی طرح اس کی آخری آیت میں اس کا مقصد نزول بیان کیا گیا ہے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ .... الی........ اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝۵۲

اور یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ جو کچھ یہ ظالم کررہے ہیں، اللہ اس سے غافل ہے۔ وہ تو ان لوگوں کو اس دن تک کے لیے مہلت دے رہا ہے جس میں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔(۴۲) دوسروں کو اوپر اٹھائے دوڑ رہے ہوں گے، ان کی نگاہیں جھپکنے کو واپس نہیں آئیں گی اور ان کے دل (بدحواسی میں) اڑے جارہے ہوں گے۔(۴۳) اور (اے پیغمبر) تم لوگوں کو اس دن سے خبردار کرو جب عذاب ان پر آن پڑے گا، تو اس وقت یہ ظالم کہیں گے کہ: اے ہمارے پروردگار! ہمیں تھوڑی سی مدت کے لیے اور مہلت دے دیجیے تا کہ ہم آپ کی دعوت قبول کرلیں، اور پیغمبروں کی پیروی کریں۔(اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ:) ارے کیا تم لوگوں نے قسمیں کھا کھا کر پہلے یہ نہیں کہا تھا کہ تم پر کوئی زوال نہیں آسکتا؟(۴۴) اور تم ان لوگوں کی بستیوں میں رہ چکے تھے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، اور یہ بات کھل کر تمہارے سامنے آچکی تھی کہ ہم نے ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا، اور ہم نے تمہیں مثالیں بھی دی تھیں۔(۴۵) اور وہ لوگ اپنی ساری چالیں چل چکے تھے، اور ان کی ساری چالوں کا توڑ اللہ کے پاس تھا، چاہے ان کی چالیں ایسی کیوں نہ ہوں جن سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل جائیں۔(۴۶) لہٰذا اللہ کے بارے میں ہرگز یہ خیال بھی دل میں نہ لانا کہ اس نے اپنے پیغمبروں سے جو وعدہ کر رکھا ہے، اس کی خلاف ورزی کرے گا۔ یقین رکھو کہ اللہ اپنے اقتدار میں سب پر غالب ہے، (اور) انتقام لینے والا ہے۔(۴۷) اس دن جب یہ زمین ایک دوسری زمین سے بدل دی جائے گی، اور آسمان بھی (بدل جائیں گے) اور سب کے سب خدائے واحد وقہار کے سامنے پیش ہوں گے۔(۴۸) اور اس دن تم مجرموں کو اس حالت میں دیکھو گے کہ وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں گے۔(۴۹) ان کے قمیص تارکول کے ہوں گے، اور آگ ان کے چہروں پر چھائی ہوئی ہوگی۔(۵۰) تا کہ اللہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دے۔ یقیناً اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔(۵۱) یہ تمام لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے، اور اس لیے دیا جارہا ہے تا کہ انہیں اس کے ذریعے خبردار کیا جائے، اور تا کہ وہ جان لیں کہ معبود برحق بس ایک ہی ہے، اور تا کہ سمجھ رکھنے والے نصیحت حاصل کرلیں۔(۵۲)

ظالموں کی مخفی تدبیریں اللہ کے انبیاء کی مخالفت میں اور قرآن پاک کے پروگرام کو ناکام بنانے کے لیے ہمیشہ سے ہوتی آئی ہیں اور آج بھی دنیا میں ہورہی ہیں۔ غیر مسلم اقوام نہیں چاہتیں کہ دنیا میں اللہ کا دین اور قرآن کا پروگرام غالب آئے، پرانی اقوام میں سے فرعون، نمرود، اہل تبوک اور اہل حجر نے کیا کیا تدبیریں اختیار کیں؟ یمن کے باشندوں اور مصریوں نے اللہ کے دین کے خلاف کیسے کیسے پروگرام بنائے، جسمانی اور ذہنی تکالیف پہنچائیں اور لوگوں کو دین کے راستے سے روکنے کے لیے بڑے بڑے لالچ دیے اور مال صرف کیا۔

آج بھی دنیا میں یہی کچھ ہورہا ہے، یہود، نصاریٰ، ہنود، دہریے، قرآن پاک کے خلاف طرح طرح کے حربے استعمال کررہے ہیں، کہیں ہسپتال کھول کر لوگوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے، اور کہیں سکول وکالج جاری کرکے لوگوں کو گمراہ کیا جاتا ہے، عورتوں اور ایڈ کی پیش کش کرکے اہل ایمان کو دین سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر مسلمان

اس سے بالکل غافل پڑے ہیں اور اس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لے رہے ہیں۔

یہودیوں اور عیسائیوں نے مغربی ممالک میں مستشرقین کے نام پر اڈے قائم کر رکھے ہیں جہاں مغربی باشندوں کو مشرقی علوم کی تربیت دی جاتی ہے، ان کی یونیورسٹیوں میں قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے، انہیں ڈگریاں دی جاتی ہیں اور پھر انہی سے اسلام کے خلاف کتابیں اور مضامین لکھائے جاتے ہیں تاکہ لوگ دین اسلام سے محروم ہو جائیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ لوگ دین کا فتوی علمائے حقہ سے لینے کی بجائے یہودی اور عیسائی ماہرین علوم شرقیہ کی طرف رجوع کرنے لگیں اور اس طرح اسلام کا پروگرام تہ و بالا ہو جائے۔

مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ:

کتنے افسوس کا مقام ہے کہ آج ہندو، عیسائی اور یہودی تو اپنے مذہب پر کاربند ہیں مگر مسلمان اپنے سچے دین سے غافل ہیں، ہندوؤں نے اپنے مبلغ مغربی ممالک میں بھیج رکھے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے امریکن ہندومت قبول کر چکے ہیں مگر مسلمان اپنے حال میں مست ہیں۔ انہیں اپنے دین کی کوئی فکر نہیں، اگر تبلیغ کے نام پر کوئی بیرون ملک جاتا ہے تو وہ انہی کے رنگ میں رنگ کر رہ جاتا ہے، اور اپنی بات کو بھول جاتا ہے، امریکہ اور برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں اعلی تعلیم کے لیے وظائف پانے والے مسلمان کتنے ہیں جو اپنا ایمان سلامت لے کر واپس آتے ہیں، مسلمانوں کے پاس وسائل موجود ہیں مگر صلاحیت نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمان آج ساری دنیا میں انحطاط کا شکار ہیں، یہ سب کافروں کی باریک تدبیروں کا نتیجہ ہے۔ (معالم العرفان: ۱۱/ ۳۱۹، ۳۲۰)

عنوان عام ساری سورۃ کا:......مقصد بعثت انبیاء علیہم السلام۔

خلاصہ رکوع: ۱......مقصد بعثت محمدی و موسوی ایک ہے۔ ماخذ: آیت: ۱، ۵۔

خلاصہ رکوع: ۲...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ایک ہی ہے۔ ماخذ: آیت: ۹، ۱۰۔

خلاصہ رکوع: ۳......مخالفین انبیاء علیہم السلام سے ان کے متبوعین کی بیزاری۔ ماخذ: آیت: ۲۱۔

خلاصہ رکوع: ۴......مخالفین انبیاء علیہم السلام کا مقتدائے اعظم اور اس کی قیامت میں بیزاری۔ ماخذ: آیت: ۲۲۔

خلاصہ رکوع: ۵......متبعین حق کو محسن حقیقی کی اطاعت کی تلقین۔ ماخذ: آیت: ۳۱۔

خلاصہ رکوع: ۶......(۱) اتباع حق میں نمونہ ابراہیمی پیش نظر رہے۔ (۲) اور درس گاہ ابراہیمی سے تعلق رہے۔ ماخذ: (۱) آیت: ۳۵۔ (۲) آیت: ۳۷۔

خلاصہ رکوع: ۷......معرضین حق کا قیامت کے دن احساس اور تردید درخواست۔ ماخذ: آیت: ۴۴۔

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

تیرہویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) جائز ہے پکا عہد لینا اہم امور میں اگر چہ قریبی لوگوں سے مثلا اولاد سے ہی ہو۔

(۲) معاصی کا صدور آدمی سے جب ہی ہوتا ہے جبکہ وہ اللہ کی جلالت شان اور اس کے وعدہ وعید سے غافل ہو۔

(۳) صاحب فضل وکمال لوگوں کے استقبال کے لئے شہر سے باہر نکلنا جائز ہے مثلا حجاج وغیرہ کے لئے۔

(۴) اللہ تعالی کی سنت ہے کہ وہ بعض دفعہ اپنے رسولوں اور مومن بندوں کی مدد میں تاخیر فرماتے ہیں، تا کہ ان کے دشمنوں کی دشمنی کھل کر سامنے آجائے، پھر جب اللہ کی مدد آتی ہے تو اللہ کے ولی عزت دار ہو جاتے ہیں اور ان کے دشمن ذلیل۔

(۵) عقیدے کی بنیاد تین چیزیں ہیں: توحید، رسالت، مرنے کے بعد زندہ ہونا اور جزاء وسزا کا ملنا۔

(۶) نعمتیں ہمیشہ گناہوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے زائل ہوتی ہیں۔

(۷) جب آسمانی بجلی چمکے تو اس وقت یہ دعا پڑھنا مستحب ہے: **سبحان من یسبح الرعد بحمدہ و الملائکۃ من خیفتہ.**

(۸) مؤمن مثل زندہ کے ہے، دیکھتا ہے، جانتا ہے اور عمل کرتا ہے اور کافر مثل مردہ کے ہے اندھا ہے، نہ جانتا ہے اور نہ عمل کرتا ہے۔

(۹) اللہ کا وعدہ ہے اعمال صالحہ کرنے والے مومن بندے سے خوشحالی اور اچھے ٹھکانے کا۔

(۱۰) کفر، شرک اور ظلم یہ عذاب کو لازم کرتے ہیں، اس لئے کہ یہ لوگ اللہ کا ذکر اور شکر نہیں کرتے اور ذکر وشکر کا نہ ہونا ہی ان باتوں کا سبب ہے جس کی وجہ سے ہمیشہ کا عذاب لازم ہو جاتا ہے۔

***

پارہ: ۱۴

سورۃ الحجر

اس سورت کی آیت نمبر ۹۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکہ مکرمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی تھی، کیونکہ اس آیت میں پہلی بار آپ کو کھل کر اسلام کی عام تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے۔ سورت کے شروع میں یہ حقیقت بیان فرمائی گئی ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالی کی طرف سے نازل کی ہوئی کتاب ہے، اور جو لوگ اس کی مخالفت کرر ہے ہیں، ایک وقت آئے گا جب وہ تمنا کریں گے کہ کاش وہ اسلام لے آتے۔ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی (معاذ اللہ) مجنون کہتے ، اور کبھی کاہن قرار دیتے تھے۔ ان باتوں کی تردید کرتے ہوئے کہانت کی حقیقت آیت نمبر ۱۷ اور ۱۸ میں بیان فرمائی گئی ہے۔ ان لوگوں کے کفر کی اصل وجہ ان کا تکبر تھا، اس لیے ابلیس کا واقعہ آیات نمبر ۲۶ تا ۴۴ میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کے تکبر نے کس طرح اس کو اللہ تعالی کی رحمت سے محروم کیا۔ کفار کی عبرت کے لیے حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت شعیب اور حضرت صالح علیہم السلام کے واقعات اختصار کے ساتھ بیان فرمائے گئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کافروں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کی محنت بیکار جا رہی ہے۔ ان کا فریضہ اتنا ہے کہ وہ موثر انداز میں تبلیغ کریں، جو وہ بہترین طریقے پر انجام دے رہے ہیں۔ نتائج کی ذمہ داری ان پر نہیں ہے۔ سورت کا نام قوم ثمود کی بستیوں کے نام پر رکھا گیا ہے جو حجر کہلاتی تھیں، اور ان کا ذکر اس سورت کی آیت نمبر ۸۰ میں آیا ہے۔ (توضیح القرآن)

سورۃ الحجر یہ قرآن کریم کی پندرہویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۵۴ نمبر پر ہے، جس میں کل ٦ رکوع، ۹۹ آیات، ٦٦٣ کلمات اور ۲۹۰۷ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ میں جو ملک شام اور مدینہ طیبہ کے درمیان ایک وادی ہے وہاں کے رہنے والوں کی ہلاکت کو بیان فرمایا گیا ہے، جو ایک عبرتناک قصہ ہے یعنی قوم ثمود کا حال، اس لئے یہ سورۃ اس نام سے موسوم ہوئی۔

ربط:

سورۃ ابراہیم کے ختم پر قرآن کی فضیلت کا بیان تھا، اس سورۃ کے شروع میں بھی یہی مضمون مذکور ہے، اس لئے ارتباط ظاہر ہے۔

خلاصہ مضامین سورۃ:

(۱) حقیقت قرآن کا بیان (۲) تعذیب کفار، جس کا بیان ''وان جھنم لموعدھم اجمعین لھا سبعة ابو اب ''میں ہے (۳) تحقیق رسالت (۴) اثبات توحید (۵) بعض انعامات کا ذکر (۲) اطاعت گزاروں کی جزا کا ذکر (۷) مخالفین کی سزا کا بیان (۸) رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کا مضمون، ان سب مضامین میں ارتباط ظاہر ہے۔

فائدہ:

''**لھا سبعة ابو اب**'' جہنم کے سات دروازے ہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ رکھ کر بتلایا کہ اس طرح اوپر نیچے جہنم کے دروازے ہوں گے۔ ابن جریج فرماتے ہیں کہ جہنم کے سات طبقوں کے نام اور ترتیب یہ ہے (۱) جہنم (۲) لظیٰ (۳) حطمہ (۴) سعیر (۵) سقر (۲) جحیم (۷) ہاویہ۔

ضحاک فرماتے ہیں کہ پہلے درجہ میں گنہگار موحدین رہیں گے۔ دوسرے میں یہود۔ تیسرے میں نصاری۔ چوتھے میں صابی (ستارہ پرست) پانچویں میں مجوسی۔ چھٹے میں مشرکین۔ ساتویں میں منافقین۔ **اعاذنا اللہ منھا!** (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

یہ سورت مکہ کے سخت پریشان کن اور جدوجہد کے مرحلے میں اتری، لوگ شکوک وشبہات، توہمات، تمسخر اور الزام تراشی سے اسلام کو بدنام کر رہے تھے۔ (جیسا کہ موجودہ زمانے میں ہے) طنز اور الزام تراشی جسمانی تکلیف سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے، سورہ حجر مومنین کو تسلی دیتی ہے کہ دشمنوں کا مذاق، میڈیا کے زہر آلود حملے آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، اسلام کے داعی اور تبلیغ کرنے والوں اور اس سے محبت کرنے والوں کو تسلی دیتی ہے، ان لوگوں سے مایوس نہ ہوں جو آپ پر اسلام، پردہ، جہاد، طلاق وغیرہ کی تعلیم پر بے جا اعتراضات اور الزام لگاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت کرے گا اور آپ کی بھی۔

اس سورت میں حفاظتی آیات کا ذکر ہے، مثلاً: قرآن کی حفاظت، آسمان کی حفاظت، زمین کی حفاظت، جو اللہ آسمان وزمین کی حفاظت پر قدرت رکھتا ہے وہ اللہ اپنے دین اور کتاب کی حفاظت پر بھی قادر ہے، رزق کا انتظام، مسلمانوں کی حفاظت، جنت میں بھی حفاظت کے ساتھ، ابلیس کا قصہ (حضرت آدم علیہ السلام کی تفصیل کے بغیر) اس موضوع کو خاص طور پر واضح کرتا ہے کہ اچھے لوگوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، اللہ کا شیطان کو مہلت دینا اور شیطان کا قبول کرنا، اس سورت میں حفاظت کی تمام صورتیں بیان کی ہیں، جس جگہ قوم ثمود آباد تھیں اس کے نام سے حجر رکھا، وہاں اس نے مضبوط پہاڑوں کو چیر کر پختہ گھر بنائے اور یہ سوچ رہے تھے کہ اس کی وجہ سے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، چنانچہ اللہ پاک نے ان گھروں کو چھوڑ دیا، لیکن صبح (رات کو نہیں، رات کو زیادہ خوف ہوتا ہے، دن میں سکون ہوتا ہے) اونچی آواز میں چیخ وپکار کے عذاب سے ختم کر دیا۔ اس نے مسلمانوں کو دکھایا کہ ایک محافظ مکڑی کے جالے اور کبوتر کے انڈوں سے بھی ان کی حفاظت کر سکتا ہے۔ سخت پکڑنے والی ذات پہاڑوں کی حفاظت لیے ہوؤں کو بھی پکڑ کر عذاب دے سکتا ہے، اس لیے

سورت کے شروع میں اس نے اپنی قدرت کے مناظر دکھائے۔

حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ بھی اللہ کی قدرت کا تعارف کراتا ہے،قوم لوط بھی صبح کو ہلاک ہوئی، آخر میں داعی حضرات کو بتلایا کہ تم کو سورۃ فاتحہ اور قرآن شریف جیسی عظیم نعمتیں عطا کی ہیں؛ اس لیے کافروں کی سرگرمیوں، ٹیکنالوجی، ثقافت اور پر تعیش زندگی سے کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس کیے بغیر اپنی دعوت میں لگے رہو۔ اللہ پاک کی قدرت حجر والوں کی طرح ان کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ بطور علاج تسبیح ،نماز اور عبادتیں ہے۔ (قرآن سارانس گجراتی،خواطر قرآنیہ)

اسلام کے بنیادی عقائد کا اثبات:

اس سورت کا آغاز بھی حروف مقطعات سے ہوتا ہے اور اس کی پہلی آیت میں قرآن کریم کی تعریف اور توصیف ہے، اس سورت میں بھی اسلام کے بنیادی عقائد کا اثبات ہے۔

قیامت کے دن کفار آرزو کریں گے:

قیامت کے دن کفار جب عذاب کی شدت اور ہولناکی کا مشاہدہ کریں گے تو وہ آرزو کریں گے کہ اے کاش! ہم مسلمان ہوتے ،لیکن ظاہر ہے کہ اس دن کا ایمان اور ایمان کی تمنا کسی کام نہیں آئے گی۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الۤرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ۝۱........ الیٰ..........مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ۝۵

الر۔ یہ (اللہ کی) کتاب اور روشن قرآن کی آیتیں ہیں۔ (۱) ایک وقت آئے گا جب یہ کافر لوگ بڑی تمنائیں کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔ (۲) (اے پیغمبر) انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دو کہ یہ خوب کھالیں، مزے اڑالیں، اور خیالی امیدیں انہیں غفلت میں ڈالے رکھیں، کیونکہ عنقریب انہیں پتہ چل جائے گا (کہ حقیقت کیا تھی)۔ (۳) اور ہم نے جس کسی بستی کو ہلاک کیا تھا، اس کے لیے ایک معین وقت لکھا ہوا تھا۔ (۴) کوئی قوم اپنے معین وقت سے نہ پہلے ہلاک ہوتی ہے اور نہ اس سے آگے جا سکتی ہے۔ (۵)

یعنی آج منکرین نے قرآن و اسلام جیسی عظیم الشان نعمت الٰہیہ کی قدر نہیں کی، لیکن ایسا وقت آنے والا ہے جب یہ لوگ اپنی محرومی پر ماتم کریں گے اور دست حسرت مل کر کہیں گے: کاش ہم مسلمان ہوتے! وہ وقت کب آئے گا؟ اس میں اختلاف ہوا ہے، ہم ابن الانباری کے قول کے موافق اس کو عام رکھتے ہیں۔ یعنی دنیا و آخرت میں جو مواقع کافروں کی نامرادی اور مسلمانوں کی کامیابی کے پیش آتے رہیں گے ہر موقع پر کفار کو رو رو کر اپنے مسلمان ہونے کی تمنا اور نعمت اسلام سے محروم رہ جانے کی حسرت ہوگی۔ اس سلسلہ میں پہلا موقع تو جنگ بدر کا تھا جہاں کفار مکہ نے مسلمانوں کی طرف کھلا ہوا غلبہ اور تائید غیبی دیکھ کر اپنے دلوں میں محسوس کیا کہ جس اسلام نے فقراء مہاجرین اور اوس وخزرج کے کاشتکاروں کو اونچی ناک والے قریشی سرداروں پر غالب کیا، افسوس ہم اس دولت سے محروم ہیں۔ اسی طرح اسلامی فتوحات وترقیات کی ہر

ایک منزل پر کفار کو اپنی تہی دستی وحرمان پر پچھتانے اور دل سے اشک حسرت بہانے کا موقع ملتا رہا۔ انتہائی حسرت و افسوس کا مقام وہ ہوگا جب فرشتہ جان نکالنے کے لیے سامنے کھڑا ہے اور عالم غیب کے حقائق آنکھوں سے نظر آ رہے ہیں۔ اس وقت ہاتھ کاٹیں گے اور آرزو کریں گے کہ کاش ہم نے اسلام قبول کرلیا ہوتا کہ آج عذاب بعدالموت سے محفوظ رہ سکتے۔ اس سے بھی بڑھ کر یاس انگیز نظارہ وہ ہوگا جو طبرانی کی حدیث میں ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے بہت سے آدمی اپنے گناہوں کی بدولت جہنم میں جائیں گے اور جب تک خدا چاہے گا وہاں رہیں گے۔ بعدہ مشرکین ان پر طعن کریں گے کہ تمہارے ایمان وتوحید نے تم کو کیا فائدہ دیا؟ تم بھی آج تک ہماری طرح دوزخ میں ہو، اس پر حق تعالیٰ کسی موحد کو جہنم میں نہ چھوڑے گا۔ یہ فرما کر نبی کریم ﷺ نے یہ آیت پڑھی (رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ) گویا یہ آخری موقع ہوگا جب کفار اپنے مسلمان ہونے کی تمنا کریں گے۔ (تفسیر عثمانی: ۷۴۳)

پھر فرمایا (ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا) کہ آپ ان کو چھوڑ یئے یعنی ان کی طرف سے رنجیدہ نہ ہویئے، انہیں اسلام قبول نہیں کرنا، وہ آپ کی دعوت پر لبیک کہنے والے نہیں ہیں، یہ لوگ دنیا میں مشغول ہیں کھانا پینا اور دوسری چیزوں سے متمتع ہونا یہی ان کی زندگی ہے، موت کے بعد کے حالات کی طرف سے غافل ہیں اور بڑی بڑی آرزوئیں باندھ رکھی ہیں، ان آرزوؤں نے انہیں آخرت سے غافل کر رکھا ہے، ان حالات میں جس قدر بھی آگے بڑھیں گے مزید عذاب در عذاب کے مستحق ہوتے چلے جائیں گے۔ (انوار البیان)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور نے فرمایا " **الکافر یا کل فی سبعة امعاء** "۔ یعنی کافر آدمی سات آنتوں میں کھانا کھاتا ہے وہ خوب پیٹ بھرتا ہے کیونکہ اسے آخرت کی کوئی فکر نہیں ہوتی، اس کے برخلاف " **والمؤمن یا کل فی معی واحد** "۔ مومن آدمی صرف ایک آنت میں کھاتا ہے یعنی وہ صرف اتنا کھانا کھاتا ہے جس سے اس کی روح اور جسم کا رشتہ برقرار رہ سکے اور اس میں اتنی قوت موجود رہے جس سے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور دیگر فرائض انجام دے سکے اسی لیے فرمایا کہ انہیں چھوڑ دیں، کھانے دیں اور فائدہ اٹھانے دیں، انہیں جلد ہی نتیجے کا پتہ چل جائے گا۔

حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارشاد مبارک ہے کہ دو چیزوں کے متعلق میں اپنی امت کے لوگوں پر خوف رکھتا ہوں یعنی **اتباع الھوی و طول الامل** ان میں سے ایک خواہشات کی پیروی ہے اور دوسری لمبی لمبی آرزوئیں ہیں، اتباع ہوی کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کے قانون کو چھوڑ کر شیطان کے پیچھے چلتا رہے۔ (معالم العرفان: ۱۱/ ۳۴۳)

ایمانی دعوت سے انکار واستہزاء:

جبکہ آج ان کا حال یہ ہے کہ جب اللہ کا رسول انہیں ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے تو وہ اسے مجنون اور دیوانہ کہتے ہیں اور وہ ایمانی دعوت کے مقابلے میں انکار اور استہزاء کا وہی رویہ اختیار رکھے ہوئے ہیں، جو گزشتہ نافرمان قوموں نے اختیار کیا تھا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ۝۶ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۝۷

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ: اے وہ شخص جس پر یہ ذکر (یعنی قرآن) اتارا گیا ہے! تم یقینی طور پر مجنون ہو۔(۶) اگر تم واقعی سچے ہو تو ہمارے پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لے آتے ؟ (۷) (خلاصۃ القرآن: م اش)

قرآن کی حفاظت کا ذمہ:

قرآن کریم سے پہلے بھی آسمانی کتابیں نازل ہوئیں؛لیکن کیونکہ وہ خاص خاص قوموں اور خاص خاص زمانوں کیلئے نازل کی گئی تھیں، اس لئے اللہ تعالی نے ان کی حفاظت کا کوئی ذمہ نہیں لیا تھا، بلکہ ان کی حفاظت کا کام انہی لوگوں کے سپرد کر دیا تھا جو ان کے مخاطب تھے لیکن کیونکہ قرآن کریم آخری آسمانی کتاب ہے جو قیامت تک کے لیے نافذ العمل ہے، اس لئے اللہ تعالی نے اس کی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہے، یہ ہی وجہ ہے کہ آج تقریباً پندرہ سو سال گذرنے کے باوجود بھی اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوسکی اور نہ قیامت تک ہو سکے گی۔ان شاء اللہ۔

اللہ تعالی نے اس کی حفاظت کے لئے انسانوں کے سینوں کو کھول دیا اور چھوٹے چھوٹے بچے اسے اس طرح یاد کر لیتے ہیں کہ اگر بالفرض کوئی دشمن قرآن کریم کے سارے نسخے (معاذ اللہ) ختم کردے یا جلا دے (جیسے کہ آج کل یہود ونصاری اس منصوبے پر عمل کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں قرآن کریم کو جگہ جگہ جلا کر) تب بھی ان شاء اللہ یہ چھوٹے چھوٹے اللہ کے سپاہی اسے دوبارہ کسی معمولی تبدیلی کے بغیر لکھوا سکتے ہیں اور یہ قرآن کریم کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝۹

حقیقت یہ ہے کہ یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔(۹)

اللہ کی قدرت اور وحدانیت:

اس سورت کی متعدد آیات میں اللہ تعالی کی قدرت اور وحدانیت کے دلائل ذکر کیے گئے ہیں جو چیخ چیخ کر اپنے خالق کے وجود اور اس کی عظمت کی گواہی دے رہے ہیں۔

یہ دلائل آسمانوں، زمینوں، چاند ستاروں، پہاڑوں اور میدانوں، سمندروں اور نہروں، درختوں اور پرندوں کی صورت میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔

فرمایا گیا:

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ۝۱۹......

الی........هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ۝۲۵

اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا ہے، اور اس کو جمانے کے لیے اس میں پہاڑ رکھ دیے ہیں، اور اس میں ہر قسم کی چیزیں توازن کے ساتھ اگائی ہیں۔(۱۹) اور اس میں تمہارے لیے بھی روزی کے سامان پیدا کیے ہیں اور ان (مخلوقات) کے لیے بھی جنہیں تم رزق نہیں دیتے۔(۲۰) اور کوئی (ضرورت کی) چیز ایسی نہیں ہے جس کے ہمارے پاس خزانے موجود نہ ہوں، مگر ہم اس کو ایک معین مقدار میں اتارتے ہیں۔(۲۱) اور وہ ہوائیں جو بادلوں کو پانی سے بھر دیتی ہیں، ہم نے بھیجی ہیں، پھر آسمان سے پانی ہم نے اتارا ہے، پھر اس سے تمہیں سیراب ہم نے کیا ہے، اور تمہارے بس میں یہ نہیں ہے کہ تم اس کو ذخیرہ کر کے رکھ سکو۔(۲۲) ہم ہی زندگی دیتے ہیں، اور ہم ہی موت دیتے ہیں، اور ہم ہی سب کے وارث ہیں۔(۲۳) تم میں سے جو آگے نکل گئے ہیں، ان کو بھی ہم جانتے ہیں اور جو پیچھے رہ گئے ہیں ان سے بھی ہم واقف ہیں۔(۲۴) اور یقین رکھو کہ تمہارا پروردگار ہی ہے جو ان سب کو حشر میں اکٹھا کرے گا، بیشک اس کی حکمت بھی بڑی ہے، اس کا علم بھی بڑا۔(۲۵)

انسان کی تخلیق کی ابتداء:

توحید اور قدرت کے تکوینی دلائل ذکر کرنے کے بعد انسان کی تخلیق کی ابتدا کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو کہ اس دنیا کے پہلے انسان ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کی صورت میں سامنے آیا۔

آدمؑ کی پیدائش ربانی قدرت کا مظہر:

آپ کی پیدائش یقیناً ربانی قدرت کے مظاہر میں سے ایک مظہر تھی، کیونکہ بے جان مٹی سے ایک ایسی شخصیت پیدا کر دینا جسے حرکت کرنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، سوچنے سمجھنے، عناصر کو مسخر کرنے اور امکانات کی دنیا میں آگے بڑھنے کی قدرت حاصل ہے۔ یقیناً اللہ کے قادر اور حکیم ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری انسانیت کا قصہ ہے:

حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری انسانیت کا قصہ ہے، جس وقت اللہ تعالی نے آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اس میں اپنی روح پھونکی، فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا اور اپنی قدرت کے اسرار اور حکمت کے عجائبات ان پر کھولے، تو ان تمام امور میں جیسے حضرت آدم علیہ السلام کی تکریم تھی اسی طرح ان کی اولاد کی بھی تکریم تھی۔ فرشتوں کو جب سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کر دیا۔

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ۚ﴿۲۶﴾........الی..........وَاِنَّ عَلَيۡكَ اللَّعۡنَةَ اِلٰى يَوۡمِ الدِّيۡنِ ﴿۳۵﴾

ہم نے انسان کو سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔(۲۶) اور جنات کو اس سے پہلے ہم نے لو کی آگ سے پیدا کیا تھا۔(۲۷) اور وہ وقت یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا کہ: میں گارے کی

کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ایک بشر کو پیدا کرنے والا ہوں۔(۲۸)لہذا جب میں اس کو پوری طرح بنالوں، اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔(۲۹) چنانچہ سارے کے سارے فرشتوں نے سجدہ کیا۔(۳۰) سوائے ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔(۳۱) اللہ نے کہا: ابلیس! تجھے کیا ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوا؟(۳۲) اس نے کہا: میں ایسا (گرا ہوا) نہیں ہوں کہ ایک ایسے بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا ہے۔(۳۳) اللہ نے کہا: اچھا تو یہاں سے نکل جا، کیونکہ تو مردود ہو گیا ہے۔(۳۴) اور تجھ پر قیامت کے دن تک پھٹکار پڑی رہے گی۔(۳۵)

سجدہ سے انکار:

اہل علم کے نزدیک راجح اور صحیح قول یہ ہے کہ ابلیس فرشتہ نہیں بلکہ جن تھا۔ البتہ فرشتوں کے درمیان رہتا تھا، سجدہ سے انکار کی وجہ سے اسے آسمانوں سے نکال دیا گیا اور وہ ابدی لعنت کا مستحق ٹھہرا۔

انتقام کی آگ:

اس نے حضرت آدم علیہ السلام سے انتقام لینے کے لیے قیامت کے دن تک زندگی کی مہلت مانگی اور یہ مہلت اسے دے دی گئی۔ یہ مہلت اس نے اولاد آدم کو گمراہ کرنے کے لیے مانگی تھی اور اپنے اس مقصد کا اس نے کسی لگی لپٹی کے بغیر اظہار کر دیا تھا، اس نے کہا تھا:

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۳۹

کہنے لگا: یا رب! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، اس لیے اب میں قسم کھاتا ہوں کہ ان انسانوں کے لیے دنیا میں دلکشی پیدا کروں گا۔ اور ان سب کو گمراہ کر کے رہوں گا۔ (خلاصۃ القرآن)

شیطان کا زور کسی بندہ پر نہیں:

شیطان کوشش کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سارے ہی بندے اس کا اتباع کرنے لگیں لیکن منتخب بندے اس کے قابو میں نہیں آتے، وہ اس کے حملوں کو اور اس کے بہکانے کے طریقوں کو سمجھتے ہیں، وہ جو معاصی کو مزین کرتا ہے اس سے متاثر نہیں ہوتے، ہاں جو لوگ بھٹکنے کا مزاج رکھتے ہیں، ہدایت کو پسند نہیں کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور کتابوں میں جو ہدایات ہیں ان کو اپنانے سے گریز کرتے ہیں، ایسے لوگوں پر شیطان کا قابو چل جاتا ہے، ایسا تسلط تو شیطان کا کسی پر نہیں ہے کہ زبردستی گناہ کرالے، اس کا کام تو وسوسے ڈالنا، گناہوں کی ترغیب دینا اور گناہوں کو مزین کر کے پیش کرنا ہے، آگے بندے اپنے اختیار سے کفر و شرک کرتے ہیں اور گناہوں کے کام میں لگتے ہیں۔ (انوار البیان)

چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝۴۲

یقین رکھو کہ جو میرے بندے ہیں، ان پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا، سوائے ان گمراہ لوگوں کے جو تیرے پیچھے چلیں گے۔

جہنم کے سات دروازے:

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جہنم کے سات گیٹ سات طبقات کے لحاظ سے ہیں، جہنم کے کل سات طبقے ہیں اور ہر طبقے کا الگ الگ دروازہ ہے، ہر طبقے کے لوگ اپنے مخصوص دروازے سے جہنم میں داخل ہوں گے، جہنم کے ان سات طبقات کا ذکر قرآن پاک میں بھی آتا ہے یعنی جہنم، سعیر، لظی، حطمہ، سقر، جحیم، اور ہاویہ ۔

لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ۝۴۴

اس کے سات دروازے ہیں۔ ہر دروازے (میں داخلے) کے لیے ان (دوزخیوں) کا ایک ایک گروہ بانٹ دیا گیا ہے۔(۴۴)

جہنم کے سات دروازے ہیں تو جنت کے آٹھ ہیں، حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ جنت میں بھی لوگ اعمال کے لحاظ سے داخل ہوں گے، مثلاً ایک دروازے سے صرف روزہ دار داخل ہوں گے، علی ہذا القیاس، اور آٹھواں دروازہ محض صحیح عقیدے والے لوگوں کے لیے مخصوص ہوگا، ایسے لوگ جن کے پاس عمل تو کوئی نہیں ہوگا، مگر عقیدہ بالکل درست ہوگا، ان کے ایمان اور توحید کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل وکرم سے اس دروازے میں داخل کرے گا جس شخص کا عقیدہ فاسد ہوگا وہ کبھی جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ (معالم العرفان: ۱۱/ ۳۸۷)

قرآن کا انداز:

چونکہ قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ ترہیب کے ساتھ ترغیب اور دوزخ کے ساتھ جنت کا بھی تذکرہ کرتا ہے، اس لیے شیطان کی اتباع کرنے والوں کے تذکرہ کے بعد ان سعادت مندوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو امن اور سلامتی کی جگہ یعنی جنت میں ہوں گے، وہاں انہیں نہ تھکاوٹ ہوگی نہ کوئی تکلیف اور پریشانی، ان کے سینے ایک دوسرے کے بارے میں صاف ہوں گے۔ جنت جیسی امن وسلامتی اور راحت واطمینان کی جگہ کا ذکر کرنے کے بعد سورۂ حجر بندوں پر اللہ تعالی کے فضل واحسان اور رحمت کا ذکر کرتی ہے، بندہ کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو اسے اللہ تعالی کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالی سارے گناہوں کو معاف کرسکتا ہے اور اس کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝۴۵ ....الیٰ............وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۝۵۰

(دوسری طرف) متقی لوگ باغات اور چشموں کے درمیان رہیں گے۔(۴۵)(ان سے کہا جائے گا کہ) ان (باغات) میں سلامتی کے ساتھ بے خوف ہو کر داخل ہو جاؤ۔(۴۶) ان کے سینوں میں جو کچھ رنجش ہوگی، اسے ہم نکال پھینکیں گے، وہ بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے اونچی نشستوں پر بیٹھے ہوں گے۔(۴۷) وہاں نہ کوئی تھکن ان کے پاس آئے گی، اور نہ ان کو وہاں سے نکالا جائے گا۔(۴۸) میرے بندوں کو بتا دو کہ میں ہی بہت بخشنے والا، بڑا مہربان

ہوں۔(۴۹)اور یہ بھی بتادو کہ میرا عذاب ہی دردناک عذاب ہے۔(۵۰)

خوف اور امید:

یہ آیات خوف اور امید دونوں مقامات کی جامع ہیں،مومن کے دل میں اللہ تعالی کا خوف بھی ہونا چاہیے اور اس کی رحمت کی امید بھی ہونی چاہیے۔(خلاصۃ القرآن: م اش)

مومن کی شان جو حدیث میں بتائی گئی ہے کہ اس کا قلب ہمیشہ بیم ورجا،خوف وامید کے درمیان رہتا ہے، اس کی بنیاد انہی صفات الہی پر ہے۔ بندہ جب خدائے آمرزگار کی رحمت بیکراں اور مغفرت بے پایاں پر نظر کرتا ہے تو اسے ہر طرف امید ہی امید نظر آتی ہے۔لیکن جب نظر اپنی کوتاہیوں،لغزشوں، خطاؤں کی طرف جاتی ہے،تو قلب کا خشیت الہی سے تھرا جانا بھی بالکل قدرتی اور صحیح ہے۔البتہ دونوں صفات کے درمیان فرق اور بڑا اہم فرق یہ ہے کہ مغفرت ورحمت مطلق ہے، مستحق وغیر مستحق سب کے لیے عام ہے، بخلاف اس کے عذاب وعتاب محدود ومخصوص ہے،صرف مستحقین کے لیے، یہ ناممکن ہے کہ کوئی غیر مستحق عذاب الہی کا شکار ہوجائے لیکن یہ صرف ممکن ہی نہیں بلکہ واقع بھی ہوگا کہ کتنے ہی قابل تعزیر، بدکار وبدعمل محض مغفرت الہی سے بخش دیے جائیں گے، یہی راز ہے اس کا کہ قرآن بھر پڑھ جایئے اسمائے حسنیٰ الغفور، الودود، العفو، الرحیم ، الرؤف، الرحمٰن الغفار التواب وغیرہا صدہا مقامات پر ملیں گے، بہ خلاف اس کے المعذب المؤلم وغیرہ کہیں ایک جگہ بھی نہ ملے گا۔(ماجدی: ۳/ ۳۱۷)

ابراہیم علیہ السلام کے مہمان:

اللہ کی رحمت اور فضل واحسان کے بعد حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے مہمانوں کا تذکرہ ہے جو انسانی شکل میں نورانی فرشتے تھے اور آپ کو بیٹے کی خوشخبری سنانے کے لیے آئے تھے۔

بظاہر ولادت کی عمر:

کہا جاتا ہے کہ اس وقت آپ کی عمر کم وبیش ۱۲۰ سال تھی ، اہلیہ بھی بہت بوڑھی تھیں، بظاہر یہ ولادت کی عمر نہ تھی اس لیے آپ کو بیٹے کی خوشخبری سن کر خوشی بھی بہت ہوئی اور تعجب بھی ہوا۔آپ نے فرشتوں کے سامنے تعجب کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا:

قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ۝۵۵

وہ بولے : ہم نے آپ کو سچی خوشخبری دی ہے ، لہذا آپ ان لوگوں میں شامل نہ ہوں جو ناامید ہوجاتے ہیں۔(۵۵)

سوال کرنے کا مقصد:

میرے سوال کرنے کا مقصد تو یہ معلوم کرنا ہے کہ یونہی بڑھاپے میں ہمیں بیٹا دیا جائے گا یا جوانی لوٹا کر اور کسی

دوسری عورت سے شادی کرنے کے بعد۔

قوم لوط کو عذاب نے آ پکڑا:

فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوشخبری سنا کر حضرت لوط علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ آپ اپنے گھر والوں کو ساتھ لے کر رات ہی کو اس بستی سے نکل جائیے کیونکہ آپ کی بستی والے گناہوں کی سرکشی میں اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ اللہ تعالی نے ان کے ناپاک وجود سے زمین کو پاک کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ارشاد باری تعالی ہے:

فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ ﴿٧٤﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ ﴿٧٥﴾

پھر ہم نے اس زمین کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا، اور ان پر پکی مٹی کے پتھروں کی بارش برسادی۔(۷۴) حقیقت یہ ہے کہ اس سارے واقعے میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو عبرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں۔(۷۵)

وادی حجر بھی عذاب کی لپیٹ میں:

وادی حجر کے رہنے والوں یعنی حضرت صالح علیہ السلام کی قوم بھی ظلم اور زیادتی کی راہ پر چل نکلی تھی اور بار بار سمجھانے کے باوجود بت پرستی کو چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہو رہی تھی، انہیں مختلف معجزات بھی دکھائے گئے؛ بالخصوص پہاڑی چٹان سے اونٹنی کی ولادت کا معجزہ جو کہ حقیقت میں کئی معجزوں کا مجموعہ ہے: اونٹنی کا چٹان سے برآمد ہونا، نکلتے ہی اس کی ولادت کا قریب ہونا، اس کی جسامت کا غیر معمولی بڑا ہونا، اس سے بہت زیادہ دودھ کا حاصل ہونا۔لیکن ان بدبختوں نے اس معجزہ کی کوئی قدر نہ کی۔

اونٹنی کی ہلاکت:

بجائے اس کے کہ وہ اسے دیکھ کر ایمان قبول کر لیتے انہوں نے اس اونٹنی کو ہلاک کر دیا چنانچہ وادی حجر والے بھی عذاب کی لپیٹ میں آ کر رہے۔

وَإِن كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ ﴿٧٨﴾ فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ ﴿٧٩﴾

اور ایکہ کے باشندے (بھی) بڑے ظالم تھے۔(۷۸) چنانچہ ہم نے ان سے بھی انتقام لیا۔اور ان دونوں قوموں کی بستیاں کھلی شاہراہ پر واقع ہیں۔(۷۹)

دونوں سے مراد حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کی بستیاں ہیں۔جیسا کہ اوپر گذرا۔حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں تو بحر مردار کے پاس تھیں، اور حضرت شعیب علیہ السلام کی بستی مدین بھی اردن میں واقع تھی، اور اہل عرب شام جاتے ہوئے ان دونوں کے پاس سے گذرا کرتے تھے۔

نعمت قرآن کا ذکر:

اس سورت کے آخر میں سورہ فاتحہ کی فضیلت اور قرآن کریم کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے، اس سے آگے نعمت قرآن کا ذکر ہے، جسے یہ نعمت حاصل ہو جائے اسے مال داروں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا چاہیے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ کی طرف جو حق نازل کیا گیا ہے اسے کھول کر بیان فرما دیجئے۔ گویا گزشتہ سورت کی طرح اس سورت کی ابتدا اور اختتام بھی قرآن پر ہوا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾

اور ہم نے تمہیں سات ایسی آیتیں دے رکھی ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں، اور عظمت والا قرآن عطا کیا ہے۔ (۸۷) اور تم ان چیزوں کی طرف ہرگز آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو جو ہم نے ان (کافروں) میں سے مختلف لوگوں کو مزے اڑانے کے لیے دے رکھی ہیں، اور نہ ان لوگوں پر اپنا دل کڑھاؤ، اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، ان کے لیے اپنی شفقت کا بازو پھیلا دو۔ (۷۹)

سبع من المثانی سے مراد سورۂ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں جو ہر نماز میں بار بار پڑھی جاتی ہیں، غالباً اس موقع پر سورۂ فاتحہ کا خصوصی حوالہ اس لئے دیا گیا ہے کہ اس سورت میں بندوں کو ایاک نعبد و ایاک نستعین کے ذریعے ہر بات اللہ سے مانگنے کی تلقین فرمائی گئی ہے، گویا یہ ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ جب کوئی تکلیف یا مصیبت پیش آئے، اللہ تعالی سے رجوع کر کے اسی سے مدد مانگو، اور اسی سے صراط مستقیم پر قائم رہنے کی دعا کرو۔ (خلاصۃ القرآن: م اش، خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

خلاصہ رکوع: ۱...... (۱) پہلی امتوں کی طرح مخالفین اسلام کی تباہی کی ایک میعاد معین ہے۔ (۲) ان کی مخالفت سے کیا بگڑ سکتا ہے، ہم اس قرآن کے محافظ ہیں جو اسلام کا ترجمان ہے۔ ماخذ: (۱) آیت: ۳، ۴۔ (۲) آیت: ۹۔

خلاصہ رکوع: ۲...... (۱) جس طرح ہم نے تمہاری جسمانی غذا کے لئے خاص اہتمام کر رکھا ہے۔ (۲) اسی طرح روحانی غذا کے لئے بھی خاص اہتمام ہے کہ آسمان پر تمہارا کوئی دشمن نہیں پہنچ سکتا۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۹۔ (۲) آیت: ۱۷۔

خلاصہ رکوع: ۳...... (۱) اگر تم نے قرآن حکیم کی تعلیم نہ پائی (۲) تو فطری کمزوری کے باعث شیطان تمہیں گمراہ کر دے گا۔ (۳) پھر آخرت میں تمہارا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ ماخذ: (۱) آیت: ۲۶۔ (۲) آیت: ۳۹۔ (۳) آیت: ۴۳۔

خلاصہ رکوع: ۴...... اگر تم (بذریعہ تعلیم قرآن) متقی بن گئے تو پھر ٹھکانا جنت ہوگا۔ ماخذ: آیت: ۴۵۔

خلاصہ رکوع: ۵...... تذکیر بایام اللہ، دیکھ لو حق سے اعراض کرنے والوں کا کیا نتیجہ نکلا۔ ماخذ: آیت: ۷۳، ۷۸، ۷۹۔

خلاصہ رکوع: ۶...... (۱) تذکیر بایام اللہ۔ (۲) اگر یہ لوگ نہیں مانتے تو ان سے منہ موڑ لو۔ (۳) اور قرآن عظیم کو مضبوط پکڑ لو۔ (۴) ان ٹھٹھا کرنے والوں کے شر سے بچانے کے لئے ہم کافی ہیں۔ ماخذ: (۱) آیت: ۸۰ تا ۸۴۔ (۲)

آیت: ۸۵۔(۳) آیت: ۸۷۔(۴) آیت: ۹۵۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ النحل

اس سورت کا بنیادی موضوع اللہ تعالی کی ان نعمتوں کا مفصل بیان ہے جو اللہ تعالی نے اس کائنات میں انسان کے فائدے کے لیے پیدا فرمائی ہیں۔ اسی لیے اس سورت کو سورۃ النعم (نعمتوں کی سورت) بھی کہا جاتا ہے۔عرب کے مشرکین عام طور سے یہ مانتے تھے کہ ان میں سے بیشتر نعمتیں اللہ تعالی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔اس کے باوجود وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ تعالی کی خدائی میں وہ بت بھی شریک ہیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے۔اس طرح اللہ تعالی کی ان نعمتوں کا تذکرہ فرما کر انہیں توحید پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ان کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور ایمان نہ لانے کی صورت میں انہیں اللہ تعالی کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ یہ سورت جس زمانے میں نازل ہوئی، اس وقت بہت سے مسلمان کفار کے ظلم وستم سے تنگ آ کر حبشہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو رہے تھے۔آیت نمبر ۴۱، ۴۲ میں ان کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کے مصائب و آلام کا دور ختم ہونے والا ہے۔اور انہیں دنیا میں بھی اچھا ٹھکانا عطا ہوگا، اور آخرت میں بھی ان کے لیے بڑا اجر وثواب ہے، بشرطیکہ وہ صبر سے کام لیں، اور اللہ تعالی پر بھروسہ رکھیں۔سورت کے آخری حصے میں اسلامی شریعت کے کچھ اہم احکام بھی بیان فرمائے گئے ہیں جو ایک مسلمان کے طرز عمل کی بنیاد ہونے چاہیے۔نحل عربی میں شہد کی مکھی کو کہتے ہیں۔اس سورت کی آیت نمبر ۶۸ میں اللہ تعالی نے اپنے انعامات کا تذکرہ کرتے ہوئے شہد کی مکھی کا حوالہ دیا ہے کہ وہ کس طرح اللہ کے حکم سے پہاڑوں اور جنگلوں میں اپنے چھتے بناتی اور شہد پیدا کرتی ہے۔اسی لیے سورت کا نام نحل رکھا گیا ہے۔(توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی سولہویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۷۰ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں کل رکوع ۱۶، تعداد آیت ۱۲۸، کل کلمات ۱۸۱۷ اور کل حروف ۷۷۴۹ ہیں یہ سورۃ مکی ہے اس سورۃ کا دوسرا نام سورۃ النعم بھی ہے۔

ربط:

اس سورۃ میں یہ مضامین ہیں، توحید جو احسان جتلانے کے پیرایہ میں مذکور ہے، جس کو مزید تنبیہ کے لئے وعید کی تمہید سے شروع کیا گیا ہے اور گزشتہ سورۃ کے ختم پر بھی توحید اور عدم توحید پر وعید کا ذکر تھا جیسا کہ ''**یجعلون مع اللہ**'' اور ''**فسبح بحمد ربک**'' سے معلوم ہوتا ہے، اس سے پہلی سورۃ کے اختتام اور اس سورۃ کے آغاز میں تناسب واضح ہے۔

خلاصۂ مضامین:

اس سورۃ میں توحید کے ضمن میں شرک کا رد اور اہل شرک کی مذمت اور بعض آیات میں نبوت اور قرآن کے انکار پر وعید اور ان کے بالمقابل قرآن کی تصدیق کرنے والوں کے لئے بشارت کا ذکر ہے، یہی مضمون پانچویں رکوع کے ختم تک

چلا گیا ہے، پھر چھٹے رکوع کے اول میں ہجرت کی فضیلت اور نبوت کا اثبات اور منکرین کے لئے وعید بیان فرما کر توحید کی طرف عود کیا گیا ہے، پھر رکوع ہشتم کے آخر میں رسالت اور قرآن کی حقانیت کے بیان کے بعد مضمون توحید مذکور ہے اور گیارہویں رکوع کے قریب ختم سے قرآن کی حقانیت، برکت اور اس کی تعلیمات میں سے بعض کی خوبی اور ایفاء عہد کی زیادہ تاکید، اس کے بعد اعمال صالحہ کی مطلقا فضیلت مذکور ہے۔ تیرہویں رکوع کے قریب ختم سے قرآن ورسالت کی بحث اور منکر کے لئے وعید اور اکراہ کی صورت میں زبانی انکار کے استثناء کا ذکر ہے۔ چودہویں رکوع میں زبانی انکار کا ایمان کی برکت سے معافی کا بیان ہے۔ پندرہویں رکوع میں کفر کا اخروی و دنیوی وبال اور رسوم شرکیہ کا ابطال، توبہ کی ترغیب ذکر فرمائی گئی ہے۔ سولہویں رکوع میں رسالت محمدیہ کا اثبات اور اس کی تقویت کے لئے رسالت ابراہیمیہ کا ذکر اور منصب رسالت کے بعض آداب اور مخالفت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر وتقوی کی تلقین اور اس کی فضیلت مذکور ہے اور اس پر سورۃ کو ختم کردیا گیا ہے، اس تفصیل سے تمام اجزاء سورۃ کا تناسب بالکل واضح ہے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورت کا آغاز تہدید آمیز اور محکم انداز سے شروع کرنے کی وجہ ظاہر ہے کہ مشرکین مکہ بار بار نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہتے تھے کہ جب ہم تمہیں کھلم کھلا جھٹلا چکے ہیں، تمہاری مخالفت پر پوری شد و مد سے کمربستہ ہیں، پھر خدا کا وہ عذاب کیوں نہیں آجاتا، تم جس کا حوالہ دیتے رہتے ہو، اس بات کو وہ اس طرح دہراتے تھے جیسے منکرین ملحدین پر خدا کا عذاب نہ آنا ہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر برحق نہ ہونے کی دلیل ہے، ان کے اس غرور اور گھمنڈ کو دیکھتے ہوئے ایک انتہائی تلخ تحکمانہ اور تہدید آمیز انداز بیان اختیار کیا۔

اس کھلی زجر وتوبیخ کے بعد توحید اور دعوت حق کے دلائل وشواہد کا بیان شروع ہوتا ہے۔ باطل پر اصرار اور حق کے مقابلے میں مغرور اور روگردانی کے عبرتناک نتائج سے ڈرایا جاتا ہے۔ منکرین حق کے دلوں میں جو شکوک وشبہات تھے اور تین اعتراضات کو وہ ہمیشہ دہراتے رہتے تھے، ایک ایک کر کے ان کا جواب دیا گیا ہے۔ (قرآن ایک نظر میں)

سورۂ نحل کا آغاز ایک زبردست وارننگ وترہیب کے ساتھ ہوا۔ اللہ پاک کا فیصلہ ابھی آنے والا ہے! اب اس کے لیے عجلت نہ کریں، وہ اس شرک سے پاک وبلند ہے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔ وہ اپنے ان بندوں پر وحی کو نازل کرتا ہے جسے وہ چاہتا ہے اپنے حکم سے، فرشتوں کے ذریعے خبردار کرتا ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو تم مجھ سے ڈرتے ہو، بے شک وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اس نے انسان کو ایک چھوٹے گندے قطرے سے پیدا کیا۔ اور جلد ہی ایک واضح جھگڑالو بن گیا، اور اس نے ان تمام نشانیوں کو نظر انداز کردیا کہ اللہ نے جانوروں کو اس کی خوراک اور طرح طرح کے فوائد کے لیے پیدا کیا ہے۔ سمندر جیسی عظیم اور پرخطر چیز کو اس کے تابع کردیا، تو وہ ذات جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا اور ایک وہ جو کچھ پیدا نہیں کر سکتے دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ خدا کو چھوڑ کر جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ خود مخلوق ہیں اور نہ ہی زندہ ہیں اور نہ کچھ جانتے ہیں کہ انہیں کب دوسری بار زندہ کیا جائے گا۔

ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا اورانہوں نے تنبیہ کی کہ اللہ کی عبادت کریں اور طاغوت کی عبادت سے اجتناب کریں، پھران میں سے کسی کواللہ نے ہدایت دی اور کوئی گمراہ ہوگیا، زمین پر چل پھر کر دیکھیں کہ جھوٹوں کا انجام کیا ہوا؟

کیا یہ لوگ اللہ پاک کی بنائی ہوئی چیز پر غور نہیں کرتے کہ اس کا سایہ اللہ کے آگے سجدہ کرکر دائیں بائیں کیسے گرتا ہے؟ یہ سب اپنی عاجزی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں، زمین وآسمان میں جتنی بھی مخلوقات ہیں اور جتنے فرشتے ہیں سب اللہ کے سامنے سر جھکاتے ہیں، وہ کبھی بغاوت نہیں کرتے۔ وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، اور حکم کی بجا آوری کرتے ہیں۔

آخرت کے انجام سے نہ ڈرنے والوں کو خبردار کیا گیا ہے، اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے مظالم پر بروقت پکڑتا تو پوری روئے زمین پر کوئی نہ بچتا، لیکن یہ ان سب کو ایک مقررہ مدت تک مہلت دیتا ہے۔ پھر جب وہ وقت آتا ہے تو ایک لمحہ بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔

ان منکروں کو یہ بھی اندازہ نہیں کہ اس دن کیا ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ کھڑا کریں گے، پھر نہ منکروں کو دلیلیں پیش کرنے کا موقع دیا جائے گا اور نہ توبہ اور نہ ہی ان کے عذاب میں کمی ہوگی۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! انہیں اس دن سے ڈرائیں جب آپ کو ان کے سامنے گواہی کے لئے کھڑا کیا جائے گا۔ یہ اسی گواہی کی تیاری ہے کہ ہم نے آپ پر یہ صحیفہ نازل کیا ہے جو اطاعت میں سر جھکانے والوں کے لیے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے۔

اس سورت کو علماء کرام نے نعمتوں کی سورت کہا ہے، یہ تمام نعمتیں اس کے مطلوبہ مقصد کے لیے ہیں، اس لیے انعامات کے استعمال کے بعد اس کے غلط استعمال سے منع فرمایا۔ وحی کی نعمتوں کا غلط استعمال، اچھی جگہ استعمال پر صارف کی تعریف بھی کی، سب سے بڑی نعمت انبیاء اور ان کے ذریعے ہدایت، انسانی ذہانت، ٹیکنالوجی سب کچھ اس کا دیا ہوا ہے، راحت کے بعد نعمت کو بھول گیا اس کی تفصیل، لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا، لوگوں کو معاف کرنے پر عظیم نعمت، انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ اگر اللہ پاک اپنی ستاری کا پردہ اٹھا دے تو کتنی فضیحت ورسوائی ہو؛ اس لیے گناہوں کی پردہ پوشی بھی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ (قرآن سارانس گجراتی، خواطر قرآنیہ)

وجہ تسمیہ:

نحل شہد کی مکھی کو کہتے ہیں۔ چونکہ اس سورت میں شہد کی مکھی کا ذکر آیا ہے اس لیے اس کا نام سورہ نحل ہے۔

طالب عذاب مشرکین کو تنبیہ:

اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ① .... الیٰ .... خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ③

اللہ کا حکم آن پہنچا ہے، لہٰذا اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ جو شرک یہ لوگ کر رہے ہیں، وہ اس سے پاک اور بہت بالا و برتر ہے۔ (۱) وہ اپنے حکم سے فرشتوں کو اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اس پر زندگی بخشنے والی وحی کے ساتھ اتارتا

ہے کہ: لوگوں کو آگاہ کردو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، لہذا تم مجھی سے ڈرو، (کسی اور سے نہیں)۔(۲) اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق مقصد سے پیدا کیا ہے۔ جو شرک یہ لوگ کرتے ہیں، وہ اس سے بہت بالا و برتر ہے۔(۳)

یہ عذاب الٰہی کی آمد کی وعید ہے جو کہ مستقبل میں نازل ہونے والا ہے، مگر اس آیت کریمہ میں اتی ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، جس کا معنی یہ ہونا چاہیے کہ اللہ کا حکم آچکا ہے، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قرآن کا یہ اسلوب بیان ہے کہ جو واقعہ مستقبل میں یقینی طور پر پیش آنے والا ہوتا اسے مضارع کی بجائے ماضی کے صیغہ میں بیان کیا جاتا ہے، چنانچہ قیامت اور جنت، دوزخ کے اکثر واقعات ماضی کے صیغے کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ''کل ما ات''۔ ہر چیز جو یقینی طور پر آنے والی ہے، وہ اتنی ہی اٹل ہوتی ہے جیسے وہ آچکی ہے، چونکہ قیامت اور جزائے عمل لازمی طور پر واقع ہونے والے ہیں اس لیے اللہ نے انہیں ماضی میں بیان کیا اور مطلب یہی ہے کہ اللہ کا حکم عنقریب آنے والا ہے: (آیت) ''فلاتستعجلوہ''۔ لہذا جلدی نہ کرو، وہ آیا ہی چاہتا ہے۔ (معالم العرفان: ۱۱/ ۴۳۹)

اللہ پاک کی نعمتیں بے شمار ہیں:

اللہ کی نعمتوں کا بیان ہے کہ اس نے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا، انسان کو نطفے سے پیدا کیا، چوپائے پیدا کئے جن میں مختلف منافع بھی ہیں اور وہ اپنے مالک کے لئے فخر و جمال کا باعث بھی ہوتے ہیں، گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کئے جو بار برداری کے کام بھی آتے ہیں اور ان میں رونق اور زینت بھی ہوتی ہے۔ بارش وہی برساتا ہے، پھر اس بارش سے زیتون، انگور، کھجور اور دوسرے بہت سے میوے جات اور غلے وہی پیدا کرتا ہے، رات اور دن، سورج اور چاند کو اسی نے انسان کی خدمت میں لگا رکھا ہے، دریاؤں سے تازہ گوشت اور زیور وہی مہیا کرتا ہے، سمندر میں جہاز اور کشتیاں اس کے حکم سے رواں دواں ہیں، اور اس جیسی نعمتیں ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ بجا طور پر فرماتے ہیں: اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۸﴾

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننے لگو، تو انہیں شمار نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔(۱۸)

جب انسان اللہ کی نعمتوں کا شمار نہیں کر سکتا تو ان کا مکمل طور پر شکر کیسے ادا کر سکتا ہے، انسان کے جسم اور اس کے مختلف اجزاء کو ہی لیجئے، اگر اس میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو زندگی کا مزہ ختم ہو جاتا ہے، انسان تمنا کرتا ہے کہ اگر دنیا کا سارا مال و متاع بھی خرچ کر کے یہ خرابی دور ہو جائے تو سودا سستا ہے، اگر معدے میں زخم ہو جائے یا پیشاب رک جائے یا سوء ہضم کا عارضہ مستقل طور پر لاحق ہو جائے، تو نہ کھانے کا مزہ آتا ہے نہ پینے کا، اگر گردہ یا جگر خراب ہو جائے یا شریانے تنگ ہو جائیں، خون کی پیداوار میں رکاوٹ ہو جائے، تو ایسی تکلیف ہوتی ہے کہ انسان موت کی آرزو کرنے لگتا ہے، غافل انسان کو کیا خبر کہ اس کے جسم کا نظام کیسے چلایا جا رہا ہے یا اگر صرف داخلی اور بدنی نعمتوں پر ہی ایک سرسری نظر ڈال

لے تو دنگ رہ جاتا ہے اور یہ اقرار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ واقعی اس کی نعمتوں کو شمار نہیں کیا جا سکتا، خارجی نعمتوں کا تو تذکرہ ہی کیا۔ (خلاصۃ القرآن بحوالہ خلاصہ مضامین قرآن کریم)

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جب اتنی زیادہ ہیں کہ شمار میں نہیں آسکتیں، تو ان کا حق تو یہ تھا کہ انسان ہر آن اللہ تعالیٰ کا شکر ہی ادا کرتا رہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اس لیے وہ اپنی مغفرت اور رحمت کا معاملہ فرما کر شکر کی اس کوتاہی کو معاف فرماتا رہتا ہے۔ البتہ یہ مطالبہ ضرور ہے کہ وہ اس کے احکام کے مطابق زندگی گذارے اور ظاہر و باطن ہر اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار رہے۔ اس کے لیے اسے یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہر کام کو جانتا ہے۔ چاہے وہ چھپ کر کرے یا علانیہ۔ (توضیح القرآن)

ہجرت اور صبر کے اچھے نتائج:

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ ...... الیٰ.........الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور جن لوگوں نے دوسروں کے ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر اپنا وطن چھوڑا ہے، یقین رکھو کہ انہیں ہم دنیا میں بھی اچھی طرح بسائیں گے، اور آخرت کا اجر تو یقیناً سب سے بڑا ہے۔ کاش کہ یہ لوگ جان لیتے۔ (۴۱) یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے صبر سے کام لیا ہے، اور جو اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ (۴۲)

منکرین کے لیے سخت وعید:

اللہ تعالیٰ نے منکرین قرآن و رسالت کو ان کی ریشہ دوانیوں پر سخت تنبیہ فرمائی ہے اور بعض سزاؤں کا ذکر کر کے فرمایا کہ کیا یہ لوگ اس بات سے نڈر ہو گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر مختلف قسم کے عذاب نازل فرمائے، ارشاد ہوتا ہے:

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ .... الیٰ...........فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۷﴾

تو کیا وہ لوگ جو برے برے منصوبے بنا رہے ہیں اس بات سے بالکل بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ انہیں زمین میں دھنسا دے، یا ان پر عذاب ایسی جگہ سے آپڑے کہ انہیں احساس تک نہ ہو؟ (۴۵) یا انہیں چلتے پھرتے ہی اپنی پکڑ میں لے لے، کیونکہ وہ اسے عاجز نہیں کر سکتے۔ (۴۶) یا انہیں اس طرح گرفت میں لے کہ وہ دھیرے دھیرے گھٹتے چلے جائیں۔ کیونکہ تمہارا پروردگار بڑا شفیق، نہایت مہربان ہے۔ (۴۷)

اللہ تعالیٰ نے عذاب کی وہ مختلف صورتیں بیان فرمائی ہیں جن میں یہ لوگ گرفتار ہو سکتے ہیں:

(۱) زمین میں دھنس جانا۔ (۲) بیرونی ذرائع سے عذاب۔ (ان پر ایسی جگہ سے عذاب لے آئے جہاں سے ان کو خبر بھی نہ ہو) (۳) چلتے پھرتے گرفت۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، وہ جب چاہے اپنی مخلوق کی گرفت کر لے، کوئی آسمانی

آفت نازل ہوجائے، حادثہ پیش آجائے یا کوئی طوفان بادوباراں آجائے اور یہ چشم زدن میں ماخوذ ہوجائیں، ایسے لوگوں کو اپنی فکر کرنی چاہیے کہ خدا تعالیٰ ان کی گرفت ان کے بستر پر بھی کرسکتا ہے، اور چلتے پھرتے، کاروبار کرتے، جشن مناتے یا لہو ولعب میں مصروف ہونے کی صورت میں بھی وہ گرفت کرنے پر قادر ہے، لہذا انہیں اللہ کی پکڑ سے بے خوف نہیں ہونا چاہیے۔ (۴) عذاب بعد از خوف۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی دوسری قوم یا فرد کو مبتلائے بلا دیکھ کر خوف پیدا ہوتا ہے اور پھر آخر میں خود خوف زدگان کی باری بھی آجاتی ہے اور وہ بھی عذاب کا شکار ہوجاتے ہیں۔

(معالم العرفان: ۱۱/ ۸ ۵۳-۵۴۰)

کفار کی دو خصلتوں کی مذمت:

(۱) بیٹی کی پیدائش کو معیوب سمجھنا (۲) جس اولاد (بیٹی) کو اپنے لیے ناپسند کرتے تھے اس کو اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے، یعنی فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ یعنی اول تو ان کا یہ فیصلہ ہی برا ہے کہ لڑکیوں کو عذاب اور ذلت سمجھیں، دوسرے یہ کہ جس کو اپنے لئے ذلت سمجھیں اس کو اللہ کی طرف منسوب کریں۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝۵۸ .... الیٰ...... وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶۰

اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی (پیدائش) کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے، اور وہ دل ہی دل میں کڑھتا رہتا ہے۔ (۵۸) اس خوشخبری کو برا سمجھ کر لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے کہ) ذلت برداشت کر کے اسے اپنے پاس رہنے دے، یا اسے زمین میں گاڑ دے۔ دیکھو انہوں نے کتنی بری باتیں طے کر رکھی ہیں۔ (۵۹) بری بری باتیں تو انہی میں ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اور اعلیٰ درجے کی صفات صرف اللہ کی ہیں، اور وہ اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ (۶۰)

ان آیتوں میں واضح اشارہ پایا گیا ہے کہ گھر میں لڑکی پیدا ہونے کو مصیبت اور ذلت سمجھنا جائز نہیں، یہ کفار کا فعل ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ مسلمان کو چاہئے کہ لڑکی کی پیدائش پر زیادہ خوشی کا اظہار کرے تاکہ اہل جاہلیت کے فعل پر رد ہو سکے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ وہ عورت مبارک ہوتی ہے کہ جس کے پیٹ سے پہلے لڑکی پیدا ہو، قرآن کریم کی آیت شریف **یھب لمن یشاء اناثا ویھب لمن یشاء الذکور** میں بھی اناث کو مقدم کرنے سے اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ پہلے پیٹ سے لڑکی پیدا ہونا افضل ہے۔ ایک اور حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ جس کو لڑکیوں میں سے کسی کے ساتھ سابقہ پڑے اور پھر وہ ان کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرے، تو یہ لڑکیاں اس کے لئے جہنم کے درمیان پردہ بن کر حائل ہوجائیں گی۔ (روح البیان) خلاصہ یہ کہ لڑکی کے پیدا ہونے کو برا سمجھنا یہ جاہلیت کی رسم ہے، مسلمانوں کو اس سے اجتناب کرنا چاہئے اور اس کے بالمقابل جو اللہ کا وعدہ ہے اس پر مطمئن اور مسرور ہونا چاہئے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

مجرموں کو مہلت دی جاتی ہے:

اللہ تعالیٰ بڑے حلیم وکریم ہیں باوجود جرم عظیم کے مؤاخذہ اور گرفت میں جلدی نہیں کرتے بلکہ حلم سے مجرمین کو مہلت دیتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں: اور اللہ کی عزت ورفعت اس کو مقتضی ہے کہ ان ظالموں اور گستاخوں کو فوراً عذاب سے ہلاک کر دیا جائے لیکن اس کا حلم اور حکمت اس کی مقتضی ہے کہ ان ظالموں کو کچھ مہلت دی جائے۔ ارشاد باری ہے:

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى...... الیٰ...... لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ۝۶۲

اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم کی وجہ سے (فوراً) اپنی پکڑ میں لیتا تو روئے زمین پر کوئی جاندار باقی نہ چھوڑتا، لیکن وہ ان کو ایک معین وقت تک مہلت دیتا ہے۔ پھر جب ان کا وہ معین وقت آجائے گا تو وہ گھڑی بھر بھی اس سے آگے پیچھے نہیں ہوسکیں گے۔ (۶۱) اور انہوں نے اللہ کے لیے وہ چیزیں گھڑ رکھی ہیں جنہیں خود ناپسند کرتے ہیں، پھر بھی ان کی زبانیں (اپنی) جھوٹی تعریف کرتی رہتی ہیں کہ ساری بھلائی انہی کے حصے میں ہے۔ لازمی بات ہے کہ (ایسے رویے کی وجہ سے) ان کے حصے میں تو دوزخ ہے، اور انہیں اسی میں پڑا رہنے دیا جائے گا۔ (۶۲)

شہد کی مکھی:

شہد کی مکھی بھی عام مکھیوں جیسی ایک مکھی ہے لیکن وہ حکم الٰہی سے ایسے حیرت انگیز کام کرتی ہے جن کے کرنے سے انسانی عقل عاجز ہے۔ خواہ چھتہ بنانے کا عمل ہو یا آپس میں مختلف ذمہ داریوں کی تقسیم، یا دور دراز واقع درختوں، باغات اور فصلوں سے قطرہ قطرہ شہد کا حصول۔

ہر عمل بڑا ہی عجیب:

ان کا ہر عمل بڑا ہی عجیب ہوتا ہے، ان کے بنائے ہوئے چھتے میں بیس سے تیس ہزار تک خانے ہوتے ہیں، یہ خانے مسدس ہوتے ہیں اور آج کے کسی جدید ترین آلہ سے اگر ان کی پیمائش کی جائے تو ان میں بال برابر بھی فرق نہیں ہوگا۔

شہد کا چھتہ:

◇ پھر اس چھتے میں شہد جمع کرنے کا گودام۔

◇ بچے جننے کے لیے میٹرنٹی ہوم۔

◇ اور فضلہ کے لیے اسٹور، سب الگ الگ ہوتے ہیں۔

ہزاروں مکھیوں پر ایک ملکہ حکمرانی کرتی ہے۔ اس چھوٹی سی مملکت میں اس کا سکہ چلتا ہے اور اس کے حکم سے ڈیوٹیوں کی تقسیم ہوتی ہے۔

◇ چھتے پر کام کرنے والی مکھیوں میں سے بعض دربانی کے فرائض انجام دیتی ہیں۔

◇ بعض انڈوں کی حفاظت کرتی ہیں۔
◇ بعض نابالغ بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔
◇ بعض انجینئرنگ اور چھتے کی تراش خراش اور تعمیر میں لگی رہتی ہیں۔
◇ جب کسی مکھی کو تلاش وجستجو کے دوران کسی جگہ پر شہد کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے تو وہ واپس آکر ایک خاص قسم کے رقص کے ذریعے دوسری ساتھیوں کو منزل تک پہنچنے کے لیے راستے کی نشاندہی کرتی ہے۔
◇ لیکن یہ احتیاط ضرور کرتی ہے کہ جس پھول کو وہ نچوڑ چکی ہوتی ہے اس پر ایک خاص قسم کی نشانی چھوڑ آتی ہے، تاکہ بعد میں آنے والی کارکن کا وقت ضائع نہ ہو اور اسے ''خجل خراب'' نہ ہونا پڑے۔
◇ اگر کوئی بھی غلطی سے گندگی پر بیٹھ جائے یا کوئی زہریلا مواد لے آئے تو چیکنگ پر مامور عملہ اسے باہر روک لیتا ہے اور اسے اس جرم کی سزا کے طور پر قتل کر دیا جاتا ہے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

شہد کی مکھی سے شہد اور مویشیوں کے گوبر اور خون کے بیچ سے دودھ اللہ پاک کا عظیم انعام:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ ....الیٰ.............لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝

اور اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، اور زمین کے مردہ ہوجانے کے بعد اس میں جان ڈال دی۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو بات سنتے ہیں۔ (۶۵) اور بیشک تمہارے لیے مویشیوں میں بھی سوچنے کا بڑا سامان ہے، ان کے پیٹ میں جو گوبر اور خون ہے اس کی بیچ میں سے ہم تمہیں ایسا صاف ستھرا دودھ پینے کو دیتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہوتا ہے۔ (۶۶) اور کھجور کے پھلوں اور انگوروں سے بھی (ہم تمہیں ایک مشروب عطا کرتے ہیں) جس سے تم شراب بھی بناتے ہو، اور پاکیزہ رزق بھی، بیشک اس میں بھی ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ (۶۷) اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ: تو پہاڑوں میں، اور درختوں میں اور لوگ جو چھتریاں اٹھاتے ہیں ان میں اپنے گھر بنا۔ (۶۸) پھر ہر قسم کے پھلوں سے اپنی خوراک حاصل کر، پھر ان راستوں پر چل جو تیرے رب نے تیرے لیے آسان بنا دیے ہیں۔ (اسی طرح) اس مکھی کے پیٹ سے وہ مختلف رنگوں والا مشروب نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ یقیناً ان سب باتوں میں ان لوگوں کے لیے نشانی ہے جو سوچتے سمجھتے ہوں۔ (۶۹) اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا ہے پھر وہ تمہاری روح قبض کرتا ہے، اور تم میں سے کوئی ایسا ہوتا ہے جو عمر کے سب سے ناکارہ حصے تک پہنچا دیا جاتا ہے، جس میں پہنچ کر وہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی کچھ نہیں جانتا۔ بیشک اللہ بڑے علم والا، بڑی قدرت والا ہے۔ (۷۰)

دودھ ایک ایسی عظیم نعمت ہے جس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ جس شخص کو اللہ دودھ عطا فرمائے اسے یوں دعا کرنی چاہیے (ترمذی) **اللھم زدنا منه** "اے اللہ اس نعمت میں مزید اضافہ فرما، اس کے علاوہ اگر کوئی دوسری نعمت حاصل ہو تو کہنا چاہیے" **اللھم اطعمنا خیر امنه** "۔اے اللہ! ہمیں اس سے بہتر نعمت عطا کر، مگر دودھ چونکہ بہترین نعمت ہے، اس لیے اس میں اضافہ کی درخواست کی جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بھی ارشاد مبارک ہے کہ اکل وشرب کی تمام اشیاء میں سے دودھ ہی ایک ایسی چیز ہے جو کھانے اور پینے دونوں کے کام آتی ہے، یہ ایک بہترین اور لذیذ مشروب بھی ہے اور غذائیت کے اعتبار سے بہترین غذا بھی ہے۔

دودھ جنت کی نعمتوں میں بھی سرفہرست ہے، جہاں اللہ نے پانی، شہد، شراب طہور کی نہروں کا ذکر کیا ہے وہاں دودھ کی نہروں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

ابن ماجہ شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "**علیکم بالشفائین العسل و القران**"۔ یعنی شفا والی دو چیزوں کو لازم پکڑو، ایک شہد ہے اور دوسری قرآن پاک۔ سورہ بنی اسرائیل میں موجود ہے" **وننزل من القران ما ھو شفآء ورحمة للمؤمنین** "۔ ہم نے قرآن پاک کو نازل فرمایا ہے جس میں مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے، مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم باطنی بیماریوں یعنی سینے کے تمام روگوں کفر، شرک، نفاق، بدعقیدگی اور بداخلاقی کی شفا ہے، جب کہ شہد میں اللہ نے ظاہری امراض کی شفا رکھی ہے۔ (معالم العرفان: ۱۱/ ۵۷۹، ۵۸۸)

غیر متعصب انسان:

اگر کوئی غیر متعصب انسان شہد کی مکھی کی زندگی پر ہی غور وفکر کر لے تو وہ اللہ کے وجود اور اس کی قدرت وحکمت کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

فقر وغنی اور معیشت میں انسانوں کے مختلف درجات:

فقر وغنی اور معیشت میں انسانوں کے مختلف درجات ہونا کہ کوئی غریب ہے، کوئی امیر، کوئی متوسط۔ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ اللہ تعالی کی حکمت بالغہ کا تقاضہ ہے اور انسانی مصالح کا مقتضی اور رحمت خداوندی ہے، اگر یہ صورت نہ رہے اور مال وسامان میں سب انسان سب برابر ہو جائیں تو نظام عالم میں خلل اور فساد پیدا ہو جائے گا، اس لئے جب سے دنیا آباد ہوئی ہے کسی دور اور کسی زمانے میں تمام انسان مال کے اعتبار سے برابر نہیں رہے اور نہ ہو سکتے ہیں، اور اگر زبردستی ایسی مساوات پیدا کر بھی دی جائے تو چند ہی روز میں تمام انسانی کاروبار میں خلل اور فساد کا مشاہدہ ہو جائے گا۔ روس کا کمیونزم کا نظام اس کی زندہ مثال ہے۔

حق تعالی نے جیسے تمام انسانوں کو عقل ودماغ، قوت وطاقت اور صلاحیتوں میں مختلف مزاجوں میں تقسیم کیا ہے اور ان میں ادنی، اعلی اور متوسط کی اقسام ہیں جس کا کوئی بھی صاحب عقل انکار نہیں کر سکتا، اسی طرح یہ بھی ناگزیر ہے کہ مال

ومتاع میں بھی یہ مختلف درجات قائم ہوں کہ ہر شخص اپنی اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے صلہ پائے اور اگر اہل صلاحیت اور نااہل کو برابر کردیا جائے تو اہل صلاحیت کے ساتھ ناانصافی ہوگی اوران کی حوصلہ شکنی ہوگی، جب معیشت میں اس کو سب کے برابر ہی رہنا ہے تو کون سا داعیہ ہے جو اسے جدو جہد اور فکر و عمل پر مجبور کرے اور اس کا لازمی نتیجہ صلاحیتوں کو برباد کرنا ہوگا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّىْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿٧١﴾

اور اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں کو رزق کے معاملے میں دوسروں پر برتری دے رکھی ہے۔اب جن لوگوں کو برتری دی گئی ہے وہ اپنا رزق اپنے غلاموں کو اس طرح نہیں لوٹا دیتے کہ وہ سب برابر ہو جائیں۔تو کیا یہ لوگ اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں؟(۷۱)(خلاصہ مضامین قرآن کریم)

توحید اور شرک کی آسان مثال:

اللہ تعالیٰ نے خود دو مثالیں بیان کر کے اپنی وحدانیت کا مسئلہ واضح فرمایا ہے، پہلی مثال ایک آزاد اور ایک غلام شخص کی ہے، جب کہ دوسری مثال دو ایسے شخصوں کی ہے کہ ان میں سے ایک بہرہ ہے جو بالکل نکما ہے جب کہ دوسرا آدمی عدل وانصاف کا دلدادہ ہے اور صراط مستقیم پر ہے، ان دو مثالوں کو اللہ نے مشرک اور موحد کے تقابل میں بیان کر کے توحید کا مسئلہ سمجھایا ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا ..... الی......وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٧٦﴾

اللہ ایک مثال دیتا ہے کہ ایک طرف ایک غلام ہے جو کسی کی ملکیت میں ہے، اس کو کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں، اور دوسری طرف وہ شخص ہے جس کو ہم نے اپنے پاس سے عمدہ رزق عطا کیا ہے، اور وہ اس میں سے پوشیدہ طور پر بھی اور کھلے بندوں بھی خوب خرچ کرتا ہے۔کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ساری تعریفیں اللہ کی ہیں، لیکن ان میں سے اکثر لوگ (ایسی صاف بات بھی) نہیں جانتے۔(۷۵) اور اللہ ایک اور مثال دیتا ہے کہ دو آدمی ہیں، ان میں سے ایک گونگا ہے جو کوئی کام نہیں کر سکتا، اور اپنے آقا پر بوجھ بنا ہوا ہے، وہ اسے جہاں کہیں بھیجتا ہے، وہ کوئی ڈھنگ کا کام کر کے نہیں لاتا، کیا ایسا شخص اس دوسرے آدمی کے برابر ہو سکتا ہے جو دوسروں کو بھی اعتدال کا حکم دیتا ہے اور خود بھی سیدھے راستے پر قائم ہے؟(۷۶)

حصول معرفت الٰہی کی مثالیں:

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ۭ ..... الی........اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٧٩﴾

اورآسمانوں اورزمین کے سارے بھیداللہ کے قبضے میں ہیں۔اورقیامت کا معاملہ آنکھ جھپکنے سے زیادہ نہیں ہوگا، بلکہ اس سے بھی جلدی۔یقین رکھو کہ اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔(۷۷)اوراللہ نے تم کوتمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے ، اور تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل پیدا کیے ، تاکہ تم شکر ادا کرو۔(۷۸)کیاانہوں نے پرندوں کونہیں دیکھا کہ وہ آسمان کی فضا میں اللہ کے حکم کے پابند ہیں؟انہیں اللہ کے سوا کوئی اورتھامے ہوئے نہیں ہے۔یقینا اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جوایمان رکھتے ہوں۔(۷۹)

اللہ تعالی نے گھرکواپنی نعمتوں میں سے شمار فرمایا:

قرآن کریم ہر چیز کی روح کو بیان کرتا ہے، انسان کے گھر کا اصل مقصد اور سب سے بڑی غرض وغایت قرآن کریم نے سکون کوقرار دیا ہے، اسی طرح ازدواجی زندگی کا اصل مقصد بھی سکون ہی کوقرار دیا ہے، کیونکہ عادۃً انسان کسب معاش اور دیگر ضروریات زندگی کے حصول کے لئے زیادہ تر وقت گھر سے باہر ہی گزارتا ہے اور گھر بنانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جب حرکت وعمل سے تھک جائے تو گھر پر جاکر آرام کرے اور سکون حاصل کرے اور سکون اصل میں قلب ودماغ کا سکون ہے جواس کواپنے گھر میں ہی حاصل ہوتا ہے، جب کہ اس گھر میں دو صفتیں ہوں (۱) انسانی طبیعت کے مطابق گھر ایسا ہو کہ اس میں اس کوسکون ملے (۲) گھر کے مکین ایسے ہوں جوایک دوسرے کی راحت اور سکون کا باعث بنیں۔

آج کی دنیا میں تعمیرات کا سلسلہ عروج پر ہے اوران میں ظاہری ٹپ ٹاپ پر بے حد خرچ بھی کیا جاتا ہے لیکن ان میں ایسے مکانات بہت کم ہیں جن میں قلب اور جسم کا سکون حاصل ہو،بعض اوقات تومصنوعی تکلفات خود ہی آرام وسکون کو برباد کردیتے ہیں اور وہ نہ ہوں تو گھر کے مکین ہی ایک دوسرے کا سکون ختم کردیتے ہیں، ایسے عالی شان مکانات سے وہ جنگی جھونپڑی اچھی ہے جس میں رہنے والے کے قلب وجسم کوسکون حاصل ہورہا ہو۔اللہ تعالی نے گھرکواپنی نعمتوں میں سے شمار فرمایا ہے، چنانچہ ارشادفرمایا:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ............الیٰ............ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ۝۸۰

اوراس نے تمہارے لیےتمہارے گھروں کوسکون کی جگہ بنایا، اورتمہارے لیے مویشیوں کی کھالوں سے ایسے گھر بنائے جوتمہیں سفر پر روانہ ہوتے وقت اور کسی جگہ ٹھہرتے وقت ہلکے پھلکے محسوس ہوتے ہیں۔اوران کے اون، ان کے رویں اوران کے بالوں سے گھریلو سامان اور ایسی چیزیں پیدا کیں جو ایک مدت تک تمہیں فائدہ پہنچاتی ہیں۔(۸۰)

(خلاصہ مضامین قرآن کریم)

مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ دنیاوی لحاظ سے سعادت مند شخص وہ ہے جسے اچھا گھر، اچھی بیوی ، اور اچھی سواری میسر ہو، اگر یہ تینوں چیزیں ناموافق ہوں یعنی مکان میں گرمی سردی اور بارش سے بچاؤ کا انتظام نہ ہو، بیوی مرضی

کے خلاف ہو، اور سواری بھی تنگ کرتی ہو، تو ایسا شخص دنیاوی لحاظ سے شقی ہوگا، بہرحال مکان سکونت اور آرام کے لیے ہے اور انسان کی بنیادی ضروریات میں شامل ہے۔ (معالم العرفان: ۱۱/ ۶۳۴)

جامع ترین آیت:

قرآن کریم تمام مکارم اخلاق اور محاسن آداب اور اعمال خیر کا حکم دیتا ہے اور تمام برائیوں اور بداخلاقیوں اور بد اعمالیوں سے منع کرتا ہے اور قوت غضبیہ اور قوت شہویہ کی اصلاح کرتا ہے کہ نہ کوئی فحش بات زبان سے نکالو اور نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ قسم کھا کر توڑو اور نہ خدا سے بدعہدی کرو اور ہر وقت یہ خیال رکھو کہ یہ دنیا دار فانی ہے اور قیامت آنے والی ہے۔ جس دن ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہوگا، ایسی کتاب کے کتاب ہدایت، کتاب رحمت اور کتاب بشارت ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟ اور ایسی کتاب کی جامعیت اور کاملیت میں کیا تردد ہوسکتا ہے؟ گویا کہ گزشتہ آیت (تبیانا لکل شیء الخ) کی دلیل اور برہان ہے اور چونکہ یہ آیت اجمالاً تمام عقائد حقہ اور مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کے حکم پر اور تمام فواحش اور منکرات اور اعمال بد کی ممانعت پر مشتمل ہے، تو عجب نہیں کہ شاید اسی جامعیت کے لحاظ سے خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیزؒ نے خطبہ جمعہ کے اخیر میں اس کو درج کرنے کا حکم دیا کہ اس میں تمام اچھی باتوں کا حکم اور تمام بری باتوں سے ممانعت کا حکم اجمالاً مذکور ہے، لہٰذا ایسی کتاب مستطاب پر دوڑ کر ایمان لانا چاہیے۔ بعد ازاں یہ بتلایا کہ ہدایت اور ضلالت سب اس کے قبضہ قدرت میں ہیں، جس کو چاہے ہدایت دے اور جس کو چاہے گمراہ کرے اور اخیر میں یہ بتلایا کہ شیطان کے پنجہ سے رہائی کا طریقہ یہ ہے کہ شیطان سے اللہ کی پناہ مانگو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ (تفسیر ادریسی: ۴/ ۳۹۵)

جامع ترین آیت جس کے بارے میں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ آیت خیر وشر کی سب سے زیادہ جامع ہے۔ یہی وہ آیت ہے جسے سن کر ولید بن مغیرہ دشمن اسلام بھی تعریف کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝۹۰

بیشک اللہ انصاف کا، احسان کا، اور رشتہ داروں کو (ان کے حقوق) دینے کا حکم دیتا ہے، اور بے حیائی، بدی اور ظلم سے روکتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔ (۹۰)

اس آیت میں تین باتوں کا حکم دیا گیا ہے اور تین باتوں سے منع کیا گیا ہے۔ عدل، احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیا گیا ہے اور فحشاء، (یعنی ہر قبیح قول اور عمل) منکر (ہر وہ عمل جس سے شریعت نے منع کیا ہے) اور بغی (حد سے تجاوز کر جانا جیسے تکبر ظلم اور حسد وغیرہ) سے منع کیا گیا ہے۔

عدل:

عدل کا حکم عام ہے، احکام اور معاملات میں بھی عدل ضروری ہے، فرائض اور واجبات میں بھی، اولاد کے ساتھ بھی،

دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ بھی، اپنے پرائے کے ساتھ بھی اور بیویوں، خادموں اور ملازموں کے ساتھ بھی۔

احسان:

ہر اچھا عمل احسان ہے:

احسان کا تعلق اللہ کے ساتھ بھی ہے، جماعت اور خاندان کے ساتھ یہاں تک کہ حیوانوں کے ساتھ بھی احسان کا حکم ہے۔

قرابت کے ساتھ تعاون:

یوں تو ہر مستحق کی مدد کرنی چاہیے لیکن قرابت کے ساتھ تعاون کرنے کا دہرا اجر ملتا ہے۔

فحشاء:

ہر ایسا عمل جس کی قباحت بالکل واضح ہو وہ فحشاء ہے جیسے زنا، لواطت، شراب، جوا وغیرہ۔

منکر:

منکر ایسے اعمال جو شریعت کی نظر میں قبیح ہیں اور جن سے طبع سلیم نفرت کرتی ہے۔

بغی:

بغی یہ ہے کہ انسانوں کی عزت وحرمت اور ان کے اموال اور جانوں پر زیادتی کی جائے۔ حدیث شریف میں یہ ہے کہ ''ظلم کے سوا کوئی گناہ ایسا نہیں جس کا بدلہ اور عذاب جلد دیا جاتا ہو''۔ اس سے معلوم ہوا کہ ظلم پر آخرت کا عذاب شدید تو ہوتا ہی ہے کہ یہ فلاں ظلم کی سزا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مظلوم کی مدد کرنے کا وعدہ فرما رکھا ہے۔

(خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن: م اش)

عہد کی پاسداری کا حکم:

وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمۡ وَلَا تَـنۡقُضُوا الۡاَيۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡكِيۡدِهَا وَقَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰهَ عَلَيۡكُمۡ كَفِيۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ۝۹۱

اور جب تم نے کوئی معاہدہ کیا ہو تو اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرو، اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد انہیں نہ توڑو، جبکہ تم اپنے اوپر اللہ کو گواہ بنا چکے ہو۔ تم جو کچھ کرتے ہو، یقیناً اللہ اسے جانتا ہے۔ (۹۰)

لفظ عہد ان تمام معاملات ومعاہدات کو شامل ہے جن کا زبان سے التزام کیا جائے یعنی اس کی ذمہ داری لی جائے خواہ اس پر قسم کھائے یا نہیں۔ کسی سے عہد کر لینے کے بعد عہد شکنی کرنا بڑا گناہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز عہد شکنی کرنے والے کی پشت میں ایک جھنڈا نصب کر دیا جائے گا جو میدان حشر میں اس کی رسوائی کا سبب ہوگا۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

انسان کے پاس موجود موت کے بعد ختم ہوجائے گا:

مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَلَنَجۡزِيَنَّ الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡۤا .... الیٰ......... وَلَنَجۡزِيَنَّهُمۡ اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۷﴾

جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ سب ختم ہوجائے گا، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ اور جن لوگوں نے صبر سے کام لیا ہوگا ہم انہیں ان کے بہترین کاموں کے مطابق ان کا اجر ضرور عطا کریں گے۔(۹۶) جس شخص نے بھی مومن ہونے کی حالت میں نیک عمل کیا ہوگا، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، ہم اسے پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے، اور ایسے لوگوں کو ان کے بہترین اعمال کے مطابق ان کا اجر ضرور عطا کریں گے۔(۹۷)

کفر کی مثال اور انجام:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرۡيَةً كَانَتۡ اٰمِنَةً مُّطۡمَئِنَّةً يَّاۡتِيۡهَا رِزۡقُهَا رَغَدًا .... الیٰ........ فَكَذَّبُوۡهُ فَاَخَذَهُمُ الۡعَذَابُ وَهُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾

اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے جو بڑی پر امن اور مطمئن تھی، اس کا رزق اس کو ہر جگہ سے بڑی فراوانی کے ساتھ پہنچ رہا تھا، پھر اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری شروع کردی، تو اللہ نے ان کے کرتوت کی وجہ سے ان کو یہ مزہ چکھایا کہ بھوک اور خوف ان کا پہننا اوڑھنا بن گیا۔(۱۱۲) اور ان کے پاس انہی میں سے ایک پیغمبر آیا تھا، مگر انہوں نے اس کو جھٹلایا، چنانچہ جب انہوں نے ظلم اپنالیا تو ان کو عذاب نے آ پکڑا۔

دین کی تبلیغ سمجھداری اور تکالیف پر صبر کے ساتھ کی جائے:

اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ............ الیٰ............ اتَّقَوْا وَّالَّذِيۡنَ هُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ ﴿۱۲۸﴾

اپنے رب کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت کے ساتھ اور خوش اسلوبی سے نصیحت کر کے دعوت دو، اور (اگر بحث کی نوبت آئے تو) ان سے بحث بھی ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو۔ یقیناً تمہارا پروردگار ان لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کے راستے سے بھٹک گئے ہیں، اور ان سے بھی خوب واقف ہے جو راہ راست پر قائم ہیں۔(۱۲۵) اور اگر تم لوگ (کسی کے ظلم کا) بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی زیادتی تمہارے ساتھ کی گئی تھی۔ اور اگر صبر ہی کرلو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت بہتر ہے۔(۱۲۶) اور (اے پیغمبر) تم صبر سے کام لو، اور تمہارا صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے۔ اور ان (کافروں) پر صدمہ نہ کرو، اور جو مکاریاں یہ لوگ کررہے ہیں ان کی وجہ سے تنگ دل نہ ہوں۔(۱۲۷) یقین رکھو کہ اللہ ان لوگوں کا ساتھی ہے جو تقوی اختیار کرتے ہیں اور جو احسان پر عمل پیرا ہیں۔(۱۲۸)

تبلیغ کے تین طریقے:

(۱) آپ لوگوں کو حکمت اور بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلائیں، یہ طریقہ اس وقت موثر ہوتا ہے جب سامعین

پڑھے لکھے لوگ ہوں اور بات کو جلد قبول کرنے والے ہوں۔

(۲) دوسرا طریقہ موعظۂ حسنہ کا ہے، یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو دین سے ناواقف ہوں، مسائل نہ جانتے ہوں، ان کو بہترین طریقے سے وعظ و نصیحت کریں۔

(۳) تیسرا طریقہ مجادلہ کا ہے، یہ اس وقت اپنایا جاتا ہے جب مخاطب ضدی اور ہٹ دھرم ہو۔(خلاصۂ مضامین قرآن مولانا منظور یوسف)

فضول مطالبے:

سورت کی ابتدائی آیت ان لوگوں کے جواب میں نازل ہوئی تھی ، جو آپ سے جلد عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ایسے فضول مطالبوں سے آپ کی طبیعت کا مکدر ہونا یقینی تھا، جبکہ آخری آیت میں آپ کو صبر کرنے اور تنگدل نہ ہونے کی تلقین کی گئی ہے، لہذا ابتدا اور انتہا میں مناسبت بالکل واضح ہے۔(خلاصۃ القرآن: م اش)

خلاصہ رکوع :۱......(۱) مقصد وحی دعوت الی التوحید ہے۔ (۲) تذکیر بآلاء اللہ۔ ماخذ: (۱) آیت:۲۔ (۲) آیت:۳ تا ۸۔

خلاصہ رکوع:۲......تذکیر بالاء اللہ کے ذریعہ سے دعوت الی التوحید۔ماخذ: آیت:۱۰ تا ۱۷۔

خلاصہ رکوع :۳...... (۱) تمہارا معبود ایک ہے۔ (۲)اس کے ساتھ تعلق درست کرنے کے لئے اتباع قرآن ضروری ہے۔ماخذ:(۱) آیت:۲۲۔(۲) آیت:۲۴۔

خلاصہ رکوع:۴......(۱)منکرین توحید دنیا میں برباد۔(۲)اورآخرت میں جہنم رسید ہوں گے۔(۳)اوراللہ والے قران حکیم سے حسن عقیدت رکھتے ہیں ، اوراس کی جزائے خیر پائیں گے۔ ماخذ: (۱) آیت:۲۶۔ (۲) آیت:۲۹۔ (۳) آیت:۳۰۔

خلاصہ رکوع: ۵......(۱)منکرین توحید کا مسئلہ تقدیر کو آڑ بنانا۔(۲)اگر مشیت الٰہی شرک کو جائز رکھتی تو ہر نبی پیغام توحید کیسے لاتا؟ماخذ:(۱) آیت:۳۵۔(۲) آیت:۳۶۔

خلاصہ رکوع:۶......(۱) توحید پرستی کے باعث جن لوگوں کو وطن مالوف چھوڑنے پر مجبور کیا گیا ہے انہیں دنیا اور آخرت میں جزائے خیر ملے گی۔(۲)تعلق باللہ کی اصلاح کے واسطے قرآن حکیم نازل ہوا۔ ماخذ:(۱) آیت:۴۱۔(۲) آیت:۴۴۔

خلاصہ رکوع:۷......(۱)تمہارا معبود ایک ہے۔(۲) وہی تمہارا محسن اور مصیبت میں کام آنے والا ہے۔(۳) یہ لوگ ایسے بے سمجھ ہیں کہ بجائے اس کی قدر کرنے کے گستاخی کرتے ہیں، اوراس کی طرف محض جھوٹ سے بیٹیاں منسوب کرتے ہیں۔ماخذ:(۱) آیت:۵۱-(۲) آیت:۵۳۔(۳) آیت:۵۷ تا ۵۹۔

خلاصہ رکوع: ۸......(۱) پہلی امتوں کی طرح ان پر بھی شیطان مسلط ہو چکا ہے۔(۲) ان تمام غلط باتوں کی اصلاح فقط قرآن حکیم سے ہوسکتی ہے۔ ماخذ: (۱) ۶۳ (۲) ۶۴۔

خلاصہ رکوع: ۹...... اس شبہ کا ازالہ کہ انسان کی زبان سے کلام الٰہی کس طرح ظاہر ہوسکتا ہے ۔ ماخذ: آیت: ۶۶، ۶۷۔

خلاصہ رکوع: ۱۰......ضرورت توحید کی امثلہ۔ ماخذ: آیت: ۱۷، ۶۷، ۶۷۔

خلاصہ رکوع: ۱۱......دلائل توحید۔ ماخذ: آیت: ۷۸، ۸۰، ۷۹، ۸۱۔

خلاصہ رکوع: ۱۲......(۱) قیامت کے دن ان منکرین کا کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔(۲) یہ لوگ اپنے شرک و کفر سے اس دن خود بیزار ہوں گے۔(۳) اگر آپ اپنی اصلاح کرنا چاہیں تو قرآن رہنمائی کے لئے موجود ہے۔ ماخذ: (۱) آیت: ۸۴-(۲) آیت: ۸۷۔(۳) آیت: ۸۹۔

خلاصہ رکوع: ۱۳......قرآن حکیم کا اصلاحی نظام (پروگرام) یہ ہے۔ ماخذ: آیت: ۹۰ تا ۹۴، ۹۲، ۹۵۔

خلاصہ رکوع: ۱۴......(۱) بوقت ضرورت نظام نامہ میں جب تبدیلی ہوتی ہے تو بے سمجھی سے اسے قرآن حکیم کے خود ساختہ ہونے کی دلیل بنا لیتے ہیں۔(۲) یہ غافل قیامت کے دن نقصان اٹھائیں گے۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۰۱۔(۲) آیت: ۱۰۸، ۱۰۹۔

خلاصہ رکوع: ۱۵......(۱) قیامت کے دن گرفت سے بچنے کے لئے بہتیرا جھگڑا کریں گے، لیکن بداعمالی کی سزا پا کر رہیں گے۔(۲) ہاں اگر سزا سے بچنا چاہتے ہیں تو اس وقت اپنی اصلاح کر لیں۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۱۱۔(۲) آیت: ۱۱۹۔

خلاصہ رکوع: ۱۶......اگر اللہ تعالیٰ کے شاکر بندے بننا چاہتے ہیں اور دنیا اور آخرت کی بھلائی کے خواہاں ہیں تو ابراہیم علیہ السلام کا نمونہ اختیار کریں۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

چودہویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) قرآن کریم کھول کر بیان کر دیتا ہے ہر اس بات کو جس کی طرف انسان کی سعادت اور کمال کے اعتبار سے احتیاج ہو۔

(۲) اللہ تعالی کے انسان پر رحمت کے مظاہر میں سے ایک یہ ہے کہ انسان عذاب طلب کرتا ہے اور اللہ رحمت نازل فرماتا ہے۔

(۳) اللہ تعالی نے قرآن کریم کی حفاظت کا خود ذمہ لے رکھا ہے ہر طرح کی کمی بیشی سے۔

(۴) انسان کی اصل تخلیق مٹی سے ہے اور جنوں کی آگ کے شعلے سے۔

(۵) اسلام وہ راستہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالی نے رہنمائی فرمائی ہے اپنی رحمت اور فضل سے اور اس کے علاوہ جتنے بھی راستے ہیں وہ عدل اور حق سے ہٹے ہوئے ہیں۔

(۶) کائنات میں پھیلی ہوئی نشانیوں میں غور وفکر کرنا ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم کی آیات میں غور کرنا، کیونکہ بندہ حق کی معرفت غور وفکر کے بغیر نہیں حاصل کر سکتا۔

(۷) انسان اللہ تعالی کی نعمتوں کے شکر سے عاجز ہے لیکن وہ اس سے اتنا ہی شکر طلب کرتا ہے جتنا اس کے لئے ممکن ہے۔ کلمہ ''الحمد للہ'' سب سے بہترین شکر ہے اور اپنے عاجز ہونے کا اعتراف، یہ بھی شکر کا ایک طریقہ ہے۔

(۸) اعمال نفس کے تزکیہ اور روح کی پاکیزگی کا باعث ہیں، یہ ہی وجہ ہے کہ قلب اور جوارح کے اعمال جنت میں داخلے کا سبب ہیں۔

(۹) اللہ کی نشانیوں کو جھٹلانے والے محروم ہوتے ہیں اللہ کی ہدایت سے؛ اس لئے کہ ہدایت کا راستہ ایمان اور قرآن ہے۔ پس جس نے ان کا انکار کر دیا اس کو ہدایت کہاں سے ملے گی۔

(۱۰) مومن جھوٹ نہیں بولتا اس لئے کہ سچائی پر ثواب اور جھوٹ پر عذاب ہونے پر اس کا ایمان ہے اور کافر جھوٹ بولتا ہے اس لئے کہ اس کو سچ اور جھوٹ کے ثواب وعتاب پر ایمان نہیں۔

***

پارہ:۱۵

سورۃ الاسراء

اس سورت کی سب سے پہلی آیت ہی یہ بتا رہی ہے کہ اس کا نزول معراج مبارک کے واقعے کے بعد ہوا ہے۔ اگرچہ معراج کے واقعے کی ٹھیک ٹھیک تاریخ یقینی طور پر متعین کرنا مشکل ہے، لیکن زیادہ تر روایات کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ عظیم واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے دس سال بعد اور ہجرت سے تین سال پہلے پیش آیا تھا۔ اس وقت تک اسلام کی دعوت کا پیغام نہ صرف عرب کے بت پرستوں تک، بلکہ یہودیوں اور عیسائیوں تک بھی پہنچ چکا تھا۔ اس سورت میں معراج کے غیر معمولی واقعے کا حوالہ دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا نا قابل انکار ثبوت فراہم کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد بنو اسرائیل کے واقعے کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ کس طرح انہیں دو مرتبہ اللہ کی نافرمانی کی پاداش میں ذلت ورسوائی اور دشمن کے ہاتھوں بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح مشرکین عرب کو سبق دیا گیا ہے کہ وہ قرآن کریم کی مخالفت سے باز آجائیں، ورنہ ان کو بھی اسی قسم کے انجام سے سابقہ پیش آسکتا ہے، کیونکہ اس وقت قرآن کریم ہی وہ واحد کتاب ہے جو اعتدال کے ساتھ سیدھے راستے کی طرف ہدایت کر رہی ہے۔ (آیت نمبر ۹) پھر آیت نمبر ۲۲ سے ۳۸ تک مسلمانوں کو ان کے دینی، معاشرتی اور اخلاقی طرزِ عمل کے بارے میں نہایت اہم ہدایات دی گئی ہیں۔ اور مشرکین کے نامعقول اور معاندانہ طرزِ عمل کی مذمت کر کے ان کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے اسی کی عبادت کرتے رہیں۔

چونکہ سورت کے شروع میں بنو اسرائیل کے ساتھ پیش آنے والے دو اہم واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس لیے سورت کا نام سورۃ بنی اسرائیل ہے۔ اور اس کا دوسرا نام سورۃ الاسراء بھی ہے۔ اسراء سفرِ معراج کو اور خاص طور پر اس سفر کے اس حصے کو کہا جاتا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام سے بیت المقدس تک لے جایا گیا، سورت کا آغاز ہی چونکہ اس معجزانہ سفر کے تذکرے سے ہوا ہے، اس لیے اس کو سورۃ الاسراء بھی کہا جاتا ہے۔ (توضیح القرآن)

معراج کے واقعہ کا ذکر کر کے مشرکین مکہ اور بنی اسرائیل دونوں پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ اب مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ دونوں کی امانت خائنوں سے چھین کر اس نبیٔ امی کے حوالے کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ (قرآن ایک نظر میں)

یہ قرآن کریم کی سترہویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۵۰ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۱۲ رکوع، ۱۱۱ آیات، ۱۵۸۲ کلمات اور ۶۷۱۰ حروف ہیں، یہ سورۃ بھی مکی ہے، اس سورۃ کا دوسرا نام سورۂ اسراء بھی ہے۔

ربط :

(۱) پہلی سورۃ کے ختم پر رسالت محمدیہ کا اثبات اور اس کی تقویت کے لئے رسالت ابراہیمیہ کا ذکر تھا، اس سورۃ کے شروع میں قصہ معراج کا ذکر ہے جو کہ خارق عظیم ہے، جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت واضح طور پر ثابت ہو رہی ہے، لہٰذا سورۂ نحل کے اختتام اور اس سورۃ کے آغاز میں کھلا تناسب ہے۔

(۲) پہلی سورۃ کے ختم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عبادت تسبیح اور تکالیف ومنکرین کے انکار پر صبر کا حکم دیا گیا تھا جس کی آپ نے بخوبی تعمیل فرمائی، اب اس سورۃ کی ابتداء میں اس عبادت وصبر کا نتیجہ ذکر فرمایا گیا یعنی آپ کو آسمانوں کی بلندیوں پر پہنچانا جس میں صدہا اسرار غیب اور آسمان وجنت ودوزخ کے مناظر دکھلائے گئے اور یہ امر نبوت کی اعلیٰ ترقی پر دلالت کرتا ہے۔

خلاصہ مضامین :

اس سورۃ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تقویت کی خاطر حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہما السلام کا ذکر فرمایا گیا ہے، پھر انبیاء کی تصدیق کی طرف راغب کرنے کے لئے طوفان نوح سے نجات اور مکذبین کو ڈرانے کے لئے بنی اسرائیل کے فساد کا قصہ اور ان کا سزا پانا ذکر فرمایا گیا، اور قرآن کو- جو کہ دلیل رسالت ہے- ہادی بنایا گیا۔ دوسرے رکوع میں منکرین پر عذاب کے فوراً نہ آنے سے جو رسالت پر شبہ ہوسکتا تھا اس پر کلام کیا گیا، چنانچہ عذاب کا وقت بتایا گیا اور قریب میں جو عذاب آچکا تھا وہ بتلایا گیا، نیز دنیا کی محبت جو کہ ایمان سے مانع ہے اس کی مذمت کی گئی، تیسرے اور چوتھے رکوع میں بعض قرآنی احکام بیان فرمائے گئے اور قرآن کے لفظی اعجاز اور معنوی خوبیوں سے رسالت پر استدلال کیا گیا۔ پانچویں رکوع میں اثبات توحید، قرآن ورسالت کی بحث ہے۔ چھٹے رکوع میں ان کا اعتراض اور قرآن ورسالت پر جو مسلمانوں کو غصہ آتا تھا اس میں نرمی کا حکم دیا گیا، اس کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کی رسالت سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تقویت اور رسالت سے متعلق ایک شبہ کا جواب ہے۔ ساتویں رکوع میں مخالفت کا نقصان ظاہر کرنے کے لئے ابلیس کا قصہ ذکر کیا گیا۔ آٹھویں رکوع میں مخالفت پر قیامت کی وعید اور کچھ رسالت کا مضمون مذکور ہے۔ نویں رکوع میں قرآن کے بعض آثار اور منکرین کی ناشکری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے مذکور ہے اور دسویں رکوع میں آخر سورۃ تک رسالت کے ہی متعلق بحث ہے، اس اجمالی تقریر سے اس سورۃ کے اجزاء کا باہمی ارتباط وتناسب واضح ہے، واللہ اعلم!

فضائل :

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ کہف اور سورۂ مریم سب سے پہلی اور سب سے بہتر اور بڑی فضیلت والی سورتیں ہیں۔ مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نفلی روزے کبھی تو اس طرح پے در پے لگا تار رکھتے چلے جاتے کہ ہم اپنے دل میں کہتے کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم پورا مہینہ روزوں ہی میں گزار دیں گے اور کبھی کبھی بالکل ہی نہ رکھتے یہاں تک کہ ہم سمجھ لیتے کہ شاید آپ اس مہینے میں روزے ہی نہ رکھیں گے۔ اور آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ ہر رات کو سورہ بنی اسرائیل اور سورہ زمر پڑھا کرتے تھے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

واقعۂ معراج:

مسلسل دس سال کے صبر کے بعد حق تعالیٰ نے ایسی عزت و کرامت و رفعت و بلندی عطا فرمائی جس نے دس سالہ مصیبتوں اور ذلتوں کو عزتوں اور راحتوں سے بدل دیا۔

حق جل شانہ نے آپ ﷺ کو اسراء اور معراج کی کرامت اور عزت سے سرفراز کیا اور ایک رات میں تمام آسمانوں کی سیر کرائی اور آیات کبریٰ کا مشاہدہ کرایا لقد رای من ایت ربه الکبری اور صبر جمیل پر جس معیت سراپا خیر و برکت کا وعدہ فرمایا تھا وہ پورا کر دیا اور اپنے قرب خاص سے آپ ﷺ کو نوازا۔ **کما قال تعالیٰ ثم دنا فتدلی فکان قاب قوسین او ادنی فاوحی الی عبده مااوحی۔** اور اس خارق عادت واقعہ کو آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی دلیل بنایا اور مسجد اقصی تک سیر کرانے میں اہل مکہ کو متنبہ کر دیا کہ اب عنقریب مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ کی تولیت اور امامت نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب و احباب کی طرف منتقل ہونے والی ہے اور عنقریب حضور پر نور ﷺ کو نبی القبلتین کا لقب ملنے والا ہے اور یہ سب اس وعدہ معیت کا اظہار ہے جس کا **ان اللہ مع الذین اتقوا و الذین هم محسنون** میں خدا تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ اپنے عباد متقین اور محسنین کو اپنی معیت خاصہ سے سرفراز فرمائے گا۔

اور چونکہ ایک رات میں عروج و نزول اور سیر سمٰوٰت خداوند کریم کی قدرت و مرحمت کا عجیب کرشمہ تھا اس لیے اس کو تسبیح اور تنزیہ سے شروع کیا گیا، تا کہ کوئی ملحد اور زندیق اس سیر سمٰوٰت کو قدرت خداوندی سے خارج نہ سمجھے اور چونکہ کفار نے اس واقعہ کی تکذیب کی اور آپ ﷺ کا مذاق اڑایا اس لیے منکرین اور مخالفین کی تہدید کیلئے قوم نوح کے قصہ کی طرف اشارہ فرمایا اور بنی اسرائیل کی تباہی اور بربادی کا قصہ ذکر فرمایا کہ جس طرح خداوند قدیر نے پہلے معاندین کو سزا دی اسی طرح وہ اب بھی معاندین کو سزا دینے پر قادر ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۴/۴۳۰)

چنانچہ فرماتے ہیں:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۱﴾............ الیٰ............ ذُرِّیَّۃَ مَنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ ؕ اِنَّہٗ کَانَ عَبۡدًا شَکُوۡرًا ﴿۳﴾

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصی تک لے گئی جس کے ماحول پر ہم نے

برکتیں نازل کی ہیں، تاکہ ہم انہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بیشک وہ ہر بات سننے والی، ہر چیز دیکھنے والی ذات ہے۔ (۱) اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اس کو بنی اسرائیل کے لیے اس ہدایت کا ذریعہ بنایا تھا کہ تم میرے سوا کسی اور کو اپنا کارساز قرار نہ دینا۔ (۲) اے ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا۔ اور وہ بڑے شکر گزار بندے تھے۔

معراج کا واقعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا معجزہ اور آپ کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا، یہ اعزاز انسانوں میں ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوا، یہ واقعہ بیداری کی حالت میں پیش آیا، اگر یہ نیند کی حالت میں پیش آیا ہوتا تو اسے اتنے اہتمام کے ساتھ قرآن کریم میں ذکر نہ کیا جاتا اور نہ ہی مشرکین اسے جھٹلاتے؛ کیونکہ خواب میں تو اس واقعہ سے بھی زیادہ عجیب وغریب واقعات اور مناظر انسان دیکھتا ہے اور کوئی بھی اسے جھوٹا نہیں کہتا، اس سورت کی پہلی آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور رات کے وقت انہیں ایک جانور پر سوار کیا جس کا نام براق تھا، وہ انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ آپ کو مسجد حرام سے بیت المقدس تک لے گیا، یہ سفر معراج کا پہلا مرحلہ تھا، جسے اسراء کہا جاتا ہے، پھر وہاں سے حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کو ساتوں آسمانوں پر لے گئے، ہر آسمان پر آپ کی ملاقات پچھلے پیغمبروں میں کسی پیغمبر سے ہوئی، اس کے بعد جنت کے ایک درخت سدرۃ المنتہی پر تشریف لے گئے، اور آپ کو اللہ تعالی سے براہ راست ہم کلامی کا شرف عطا ہوا، اسی موقع پر اللہ تعالی نے آپ کی امت پر پانچ نمازیں فرض فرمائیں، پھر رات ہی رات میں آپ واپس مکہ مکرمہ تشریف لے آئے، اس آیت میں اس سفر کے صرف پہلے حصے کا بیان اس لئے کیا گیا ہے کہ آنے والے تذکرے سے اسی کا تعلق زیادہ تھا، البتہ سفر کے دوسرے حصے کا تذکرہ سورۃ نجم میں آئے گا۔

صحیح روایات کے مطابق یہ معجزانہ سفر بیداری کی حالت میں پیش آیا تھا اور اس طرح اللہ تعالی کی قدرت کاملہ کی ایک عظیم نشانی آپ کو دکھائی گئی تھی، یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ یہ واقعہ بیداری کے بجائے خواب میں دکھایا گیا؛ کیونکہ یہ بات صحیح احادیث کے تو خلاف ہے ہی؛ قرآن کریم کا اسلوب واضح طور پر یہ بتا رہا ہے کہ یہ غیر معمولی واقعہ تھا جسے اللہ تعالی نے اپنی ایک نشانی قرار دیا ہے، اگر یہ صرف ایک خواب کا واقعہ ہوتا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، انسان خواب میں بہت کچھ دیکھتا رہتا ہے، پھر اسے اپنی ایک نشانی قرار دینے کے کوئی معنی نہیں تھے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن: م اش)

لفظ عبد سے اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ بہ ایں شرف وکرامت و بہ ایں کمالات معجزانہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبد محض ہی رہے، یہ نہیں ہوا کہ فوق العبد ہو کر کچھ شرکت الوہیت و ربوبیت میں حاصل کر لی ہو، نصرانیوں کی عبرت انگیز مثال سب کے سامنے ہے۔

اور لفظ عبد سے بہ قول فاضل گیلانیؒ اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ اس مقام کا تعلق منصب رسالت سے اتنا نہیں جتنا کہ کمال عبدیت وعبودیت سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو- جو مغلوبیت کی ظاہری پستی میں ہر طرح سے گھرا ہوا تھا- معراج کی کس انتہائی بلندی تک پہنچا دیا اور جو ظاہری طور پر سب سے زیادہ بے بس تھا اسے کس بے مثال حد تک اونچا کر دیا گیا۔

اور مقام عبدیت میں پستی تو صرف عوام وجہلاء کو نظر آتی ہے، محققین عارفین کے نزدیک یہ تو عین اشرفیت اور کمال افضلیت کا مظہر ہے۔

سمیع جب اسماء الٰہی میں آتا ہے تو اس سے مراد ایسے سننے والے سے ہوتی ہے جس سے باریک ترین آواز بھی غیر مسموع نہیں رہ سکتی اور جو بغیر کسی آلہ یا عضو کے سنتا ہے اور سمیع صیغہ مبالغہ کا ہے۔

اور بصیر جب اسماء الٰہی میں آتا ہے تو اس سے مراد ایسے دیکھنے والے سے ہوتی ہے جس پر بغیر کسی آلہ یا عضو کے ساری چیزوں کا ظاہر و باطن روشن رہتا ہے اور بصر سے اللہ کے حق میں مراد وہ صفت ہے جس سے اس کو کامل ترین انکشاف ہوتا رہتا ہے۔ مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ پر سب کچھ روشن ہے، اس نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال کو سن کر اور احوال کو دیکھ کر آپ کو اس درجہ کا قرب عطا کیا، انبیاء پر پروردگار کی رحمت کا تو عین مقتضا ہی یہ تھا کہ ایسے با کمال بندہ کو بلندی کے انتہائی سرے تک پہنچا دے۔ (ماجدی: ۴/ ۸، ۱۱)

شکر کی تعریف:

جس طرح صبر، اللہ کا ذکر اور شعائر اللہ کی تعظیم اصول دین میں سے ہے، اسی طرح شکر بھی دین کا اہم جزو ہے، جس کی بڑی تلقین کی گئی ہے، بزرگان دین فرماتے ہیں کہ عام لوگوں کا شکر زبان سے ہوتا ہے، عابد لوگوں کا اعمال سے اور عارف لوگوں کا شکر استقامت احوال سے ہوتا ہے، حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ میں ابھی سات آٹھ سال کی عمر میں تھا کہ مجھے میرے استاد اور ماموں حضرت سریؒ نے پوچھا: بیٹا، شکر کیا ہوتا ہے؟ فرماتے ہیں کہ حضرت استاد کی صحبت سے اتنا فیض حاصل ہو چکا تھا کہ میں نے جواب دیا: حضرت! شکر یہ ہے کہ اللہ کی کسی نعمت کو معصیت میں نہ لگایا جائے، سری صاحبؒ نے فرمایا تمہیں یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی؟ کہنے لگے: آپ کی مجلس میں بیٹھنے سے، غرضیکہ خدا تعالیٰ کی کسی نعمت کو اگر معصیت کے کام میں لگا دیا تو یہ اس نعمت کی ناشکر گزاری ہوگی۔

ایک شخص نے حضرت سہلؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: حضرت میرے ساتھ بہت برا سلوک ہوا، چور گھر میں داخل ہو کر سارا مال ومتاع لوٹ کر لے گئے ہیں، آپ نے جواباً فرمایا: خدا کا شکر کرو کہ تمہارے مال کا ہی نقصان ہوا ہے، اگر شیطان تمہارے دل میں داخل ہو کر توحید ہی کو خراب کر دے، تو تم کیا کرو گے؟ لہٰذا ایمان سلامت بچ جانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

آثار میں آتا ہے کہ حضرت داوٗدؑ نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ اے پروردگار! میں تو تیرا شکریہ کسی طرح بھی ادا نہیں کرسکتا، کیونکہ شکریہ ادا کرنا بھی تیری ایک نعمت ہے، اور جب بھی میں شکرادا کرتا ہوں تو ایک اور نعمت تلے دب جاتا ہوں، اللہ نے فرمایا: اے داوٗد! اب تم نے مقام شکر کو پالیا ہے، انسان کی طرف سے عجز وانکساری کا اظہار ہی بہت بڑا شکر ہے، اگراور کچھ نہیں تو انسان کو زبان سے تو بہر حال اللہ کا شکرادا کرنا چاہیے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ جب کوئی بندہ کھانا کھاتا ہے یا مشروب پیتا ہے اور پھر "الحمدللہ" کہہ کر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی ہوجاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے میرا شکریہ ادا کیا ہے۔

(معالم العرفان: ۱۲/ ۳۴-۳۶)

بنی اسرائیل کا فتنہ وفساد:

بنی اسرائیل کو پہلے سے بتادیا گیا تھا کہ تم ملک شام میں دوبارفساد مچاؤ گے اور دونوں بار ہم بطور سزا کے تمہارے اوپر اپنے بندوں کو مسلط کردیں گے۔

حضرت شعیاء علیہ السلام کا ناحق قتل:

چنانچہ پہلی مرتبہ جب انہوں نے تورات کی مخالفت کی اور حضرت شعیاء علیہ السلام جیسے نبی کو ناحق قتل کیا، تو ان پر بخت نصراور اس کے لشکر کو مسلط کردیا گیا جو پورے ملک میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھیل گئے۔ انہوں نے علماء اور رؤساء کو قتل کردیا، تورات جلاڈالی، بیت المقدس کو ویران کردیا اور بہت سارے اسرائیلیوں کو گرفتار کرکے لے گئے۔

حضرت زکریا اور حضرت یحیٰ علیہما السلام کی شہادت:

دوسری باریہود کا فتنہ وفساد اس وقت عروج کو پہنچ گیا جب انہوں نے حضرت زکریا اور حضرت یحیٰ علیہما السلام کو شہید کیا اور وہ گناہوں میں حد سے بڑھ گئے۔

اب کی بار بابل کا ایک بادشاہ- جسے بیردوس یا خردوس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے- ان پر مسلط کردیا گیا۔

مسلمانوں کا غلبہ:

یہی فتنہ وفساد یہود کی تاریخ رہی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی انہوں نے اپنے آباء کی روایت کے مطابق جب جرائم اور سازشوں کی راہ اختیار کی تو ان پر مسلمانوں کو غلبہ عطا کردیا گیا جنہوں نے انہیں جزیرہ عرب سے نکال باہر کیا۔

ہٹلر؛ خدائی کوڑا:

ماضی قریب میں ہٹلران کے لیے خدائی کوڑا ثابت ہوا جس نے بے شمار یہودیوں کو قتل کیا اور بے شمار کو زندہ جلاڈالا۔

آج پھران کا فتنہ وفساد عروج تک پہنچ گیا ہے، اب دیکھیے ان پر اللہ کا قہر کب نازل ہوتا ہے۔

یہودیوں پر دشمنوں کا سخت حملہ اور اس سے عبرت:

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ ....الیٰ..........لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٠﴾

اور ہم نے کتاب میں فیصلہ کر کے بنو اسرائیل کو اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد مچاؤ گے، اور بڑی سرکشی کا مظاہرہ کرو گے۔(۴) چنانچہ جب ان دو واقعات میں سے پہلا واقعہ پیش آیا تو ہم نے تمہارے سروں پر اپنے ایسے بندے مسلط کر دیے جو سخت جنگجو تھے، اور وہ تمہارے شہروں میں گھس کر پھیل گئے اور یہ ایک ایسا وعدہ تھا جسے پورا ہو کر رہنا ہی تھا۔(۵) پھر ہم نے تمہیں یہ موقع دیا کہ تم پلٹ کر ان پر غالب آؤ، اور تمہارے مال و دولت اور اولاد میں اضافہ کیا، اور تمہاری نفری پہلے سے زیادہ بڑھا دی۔(۶) اگر تم اچھے کام کرو گے تو اپنے ہی فائدے کے لیے کرو گے، اور برے کام کرو گے تو بھی وہ تمہارے لیے ہی برا ہوگا۔ چنانچہ جب دوسرے واقعے کی میعاد آئی (تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کر دیا) تاکہ وہ تمہارے چہروں کو بگاڑ ڈالیں، اور تاکہ وہ مسجد میں اسی طرح داخل ہوں جیسے پہلے لوگ داخل ہوئے تھے، اور جس جس چیز پر ان کا زور چلے، اس کو تہس نہس کر کے رکھ دیں۔(۷) عین ممکن ہے کہ (اب) تمہارا رب تم پر رحم کرے۔ لیکن اگر تم پھر وہی کام کرو گے، تو ہم بھی دوبارہ وہی کریں گے، اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا ہی رکھا ہے۔(۸) حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھا ہے، اور جو لوگ (اس پر) ایمان لا کر نیک عمل کرتے ہیں، انہیں خوشخبری دیتا ہے کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے۔(۹) اور یہ بتاتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے لیے ہم نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔(۱۰)

دنیا اور آخرت کی چاہت کے درمیان فرق:

اللہ تعالیٰ کا عام قانون یہ ہے کہ وہ کسی مجرم قوم کو فوراً ہلاک نہیں کرتا بلکہ اس کی اصلاح کے لیے ایسے حالات اور اسباب پیدا کرتا ہے جن میں غور و فکر کر کے برائی کا راستہ چھوڑ کر نیکی کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں، گویا اللہ تعالیٰ جلد بازی سے کام نہیں لیتا، اس کے برخلاف انسان عام طور پر جلد باز واقع ہوا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اس کی فرمائش فوراً ہی پوری کر دی جائے، اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قانون بیان فرمایا ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ.............الیٰ...........لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿٢٢﴾

جو شخص دنیا کے فوری فائدے ہی چاہتا ہے تو ہم جس کے لیے چاہتے ہیں جتنا چاہتے ہیں، اسے یہیں پر جلدی دے دیتے ہیں، پھر اس کے لیے ہم نے جہنم رکھ چھوڑی ہے جس میں وہ ذلیل و خوار ہو کر داخل ہوگا۔(۱۸) اور جو شخص آخرت (کا فائدہ) چاہے اور اس کے لیے ویسی ہی کوشش کرے جیسی اس کے لیے کرنی چاہیے، جبکہ وہ مومن بھی ہو، تو ایسے لوگوں

کی کوشش کی پوری قدردانی کی جائے گی۔(۱۹)(اے پیغمبر) جہاں تک (دنیامیں) تمہارے رب کی عطا کا تعلق ہے ہم ان کو بھی اس سے نوازتے ہیں، اوران کو بھی اور (دنیامیں) تمہارے رب کی عطا کسی کے لیے بند نہیں ہے۔(۲۰) دیکھو ہم نے کس طرح ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دے رکھی ہے اور یقین رکھو کہ آخرت درجات کے اعتبار سے بہت بڑی ہے، اور فضیلت کے اعتبار سے بھی کہیں زیادہ ہے۔(۲۱) اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بناؤ، ورنہ تم قابل ملامت (اور) بے یارومددگار ہوکر بیٹھ رہو گے۔(۲۲)

''**وسعی لھا سعیھا**''۔محض تمنا ہرگز کافی نہیں۔ جب انسان نیکی حاصل کرنا چاہے تو لازم ہے کہ عملاً بھی اس کی طرف قدم بڑھائے، محض آرزو وتمنا کا درجہ قطعاً ناکافی ہے۔اور عمل بھی اپنے ظن وتخمین سے نہیں یا اپنی ہوائے نفس کے ماتحت نہیں بلکہ قانون شریعت کے مطابق ہو۔گویا دوسری شرط تصحیح عمل ہوئی حسب ضابطہ شریعت۔

اعمال وطاعات کا شریعت کے سانچہ میں ڈھلا ہوا ہونا بہت ہی ضروری ہے۔اپنے دل سے گڑھی ہوئی ریاضتیں اور مجاہدات کیسے ہی شدید ہوں ہرگز نافع نہ ہوسکیں گے اگر معیار شریعت سے ہٹے ہوئے رہے۔

تیسری اور سب سے زبردست شرط یہ تصحیح عقیدہ کی ہوئی، منکر قانون الٰہی کا عمل کوئی سا بھی مقبول نہیں۔اس مضمون کی جہاں بھی آیتیں قرآن مجید میں آئی ہیں ہر جگہ قید وھو مومن کی لگی ہوئی ہے۔(ماجدی: ۴/۲۵)

امام ابوبکر جصاص ؒ محمد ابن عجلان راوی سے حدیث نقل کرتے ہیں کہ ایک موقع پر انہوں نے ذکر کیا کہ جس میں یہ تین باتیں نہ ہوں وہ جنت کا مستحق نہیں ہوگا پہلی چیز نیت صحیحہ ہے، دوسری چیز ایمان صادق ہے اور تیسری چیز عمل مصیب یعنی درست عمل ہے اور درست عمل وہی ہوگا، جو سنت کے مطابق ہوگا اگر کوئی اچھا عمل بھی بدعت کے طریقے پر انجام دیا گیا تو وہ مفید نہیں ہوگا بلکہ الٹا وبال جان بن جائے گا۔(معالم العرفان: ۱۲/۴۷)

اجتماعی زندگی کے اسلامی آداب واخلاق:

قرآن کریم کی عظمت، انسان کی فطرت وطبیعت میں داخل جلد بازی اور ہر انسان کے ساتھ اس کے عمل اور نتائج عمل کے لازم ہونے کا ذکر کرنے کے بعد اجتماعی زندگی کے تقریبا ۱۲ اسلامی آداب واخلاق بیان کیے گئے ہیں۔حقیقت میں اخلاق وآداب ہی کی وجہ سے کوئی امت اور فرد عزت اور عظمت کے مستحق بنتے ہیں۔

بعض حضرات نے ان آداب کو معراج کا پیغام بھی قرار دیا ہے، یہ آداب جو آیت ۲۳ سے آیت ۳۹ تک مذکور ہیں درج ذیل ہیں:

(۱) اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

عبادت انتہائی درجے کی تعظیم کو کہا جاتا ہے جو اس اعتقاد پر مبنی ہو کہ جس ذات کی تعظیم کر رہا ہوں وہ نفع ونقصان کی مالک ہے اور اس کے پاس تصرف ہے، یہ تعظیم رکوع وسجود کی شکل میں ہوتی ہے یا نذر ونیاز کی صورت میں یا محض مافوق

الاسباب پکارنے کی صورت میں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے "**فلا تدعوا مع اللہ احدا**"۔ (الجن) اللہ کے سوا کسی کو (مافوق الاسباب) نہ پکارو، "**فادعوا اللہ**" صرف اللہ ہی کو پکارو، سورۃ النمل میں ہے "**امن یجیب المضطر اذا دعاہ**"۔ کون ہے جو مضطرب کی دعا کو سنتا ہے "**ء الہ مع اللہ**"۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی الہ ہے، غرضیکہ اللہ نے اسلامی ریاست کے منشور کی پہلی شق یہی بیان فرمائی کہ عبادت صرف اللہ کی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اللہ تعالیٰ کی کسی بھی صفت مختصہ میں کسی کو شریک نہ بناؤ، یہود ونصاری حلت وحرمت کے معاملے میں شرک میں مبتلا ہوئے، انہوں نے اپنی طرف سے بعض چیزوں کو حلال اور بعض کو حرام ٹھہرا لیا حالانکہ یہ منصب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کا ہے، مگر انہوں نے یہ منصب انسانوں کو سونپ دیا، الغرض! اللہ نے پہلی بات یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔

(۲) والدین کے ساتھ بھلائی کرتے رہو۔ حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اولاد پر ماں باپ کا کیا حق ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''وہ دونوں ہی تیری جنت یا دوزخ ہیں۔'' یعنی ان کی اطاعت وخدمت جنت میں اور ان کی بے ادبی اور ناراضگی دوزخ میں لے جاتی ہے۔

والدین سے نیک سلوک کرنے کے سلسلے میں ان کا مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بڑی صاحبزادی حضرت اسماءؓ کی والدہ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں مدینہ منورہ آئیں، اس وقت حضرت صدیقؓ اسے طلاق دے چکے تھے اور وہ شرک پر ہی قائم تھی حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ میری ماں آئی ہے اور وہ مشرکہ ہے، تو کیا اس حالت میں میں اس کے ساتھ صلہ رحمی کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا "**صلی امک**" اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو، اس کی خدمت تواضع کرو، کپڑے دو، کرائے کے پیسے دو وغیرہ وغیرہ، مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے مشرک والدین کے ساتھ بھی نیک سلوک کرنے کا حکم ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ بعد نماز فرض اور جہاد فی سبیل اللہ کے بہترین عمل خدمت والدین ہے۔

(۳) رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق دو۔ اس آیت میں اہل قرابت، مسکین اور مسافروں کو مالی مدد دینے اور صلہ رحمی کرنے والوں کا حق فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ یہ دینا ان پر احسان نہیں، بلکہ ایسے لوگوں کی کفالت - جو ضرورت مند ہوں - اہل استطاعت پر فرض ہے۔

حق کا لفظ مالی وغیر مالی ہر قسم کے حقوق پر شامل ہے لیکن یہاں ذکر حقوق مالی ہی کا ہو رہا ہے، حق کے لفظ نے یہ بھی بتا دیا کہ عزیزوں، مسکینوں وغیرہ کی اعانت واجب ہے، ان کا حق ہے کہ وہ مالداروں سے اعانت طلب کریں اور مالداروں پر لازمی ہے کہ ان پر احسان رکھ کر نہیں اپنا فرض سمجھ کر ان کی اعانت کریں، یہ معنی ہیں صحیح سوشلزم (اشتراکیت) کے۔ نہ یہ کہ ایک طرف ناداروں کو سرمایہ داروں کے خلاف بھڑکا دیا جائے اور غصہ دلا دیا جائے، اور دوسری طرف نظام

سرمایہ داری مالداروں کے قلب میں قساوت پیدا کردے۔

خدمت والدین کے حکم کے معا بعد یہ ہدایت لانا گویا یہ کہنا ہے کہ حقوق خدمت صرف والدین تک محدود نہ رہیں، والدین کے بعد ہی دوسرے عزیزوں کا نمبر ہے اور پھر درجہ بدرجہ ہر تعلق اور سابقہ رکھنے والے کا۔

عام ائمہ کرام اور مفسرین عظام فرماتے ہیں کہ یہاں پر جس حق کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے، یہ اخلاقی حق ہے اور اس کی حیثیت نفل کی ہے، کیونکہ فرضی حق زکوٰۃ کی صورت میں ادا ہوجاتا ہے، تاہم امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ قرابتداروں کا یہ حق وجوبی حق ہے، اگر کسی صاحب استطاعت مومن کے اقربا روزمرہ کے نان ونفقہ سے بھی محتاج ہیں تو اس شخص پر اپنے اقربا کا نفقہ اٹھانا واجب ہوجاتا ہے جب تک کہ وہ خود مکتفی نہ ہوجائیں، اسی طرح اگر نابالغ بچے زیر کفالت ہیں تو ان کے سن بلوغت تک پہنچنے تک ان کی معاونت ضروری ہے، یا اگر لڑکی ہے تو اس کی شادی ہونے تک اس کے اخراجات برداشت کیے جائیں، اگر کوئی عزیز نابینا ہے، لنگڑا ہے، خود کمانے کے قابل نہیں ہے، اس کی کوئی جائیداد بھی نہیں ہے تو اس کی کفالت بھی صاحب حیثیت عزیز کے ذمہ واجب ہوگی، اس نفقہ میں روٹی، کپڑا، رہائش اور دیگر ضروریات زندگی شامل ہیں۔

(۴) مال کو فضول خرچی میں نہ اڑاؤ یعنی نہ بخل کرو، نہ ہاتھ اتنا کشادہ رکھو کہ کل کو پچھتانا پڑے۔

قرآن مجید میں یہاں ''تبذیر'' اور دوسری جگہ ایک اور لفظ ''اسراف'' کا استعمال ہوا ہے، اُردو زبان میں اس کا ترجمہ بھی فضول خرچی سے کیا جاتا ہے؛ لیکن عام طور پر مفسرین نے تبذیر اور اسراف میں فرق کیا ہے، ناجائز مصرف میں پیسے خرچ کرنا 'تبذیر' اور جائز کام میں ضرورت سے زیادہ پیسہ خرچ کرنا 'اسراف' ہے، یہ دونوں ہی ناپسندیدہ عمل ہیں۔

(۵) اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے ضعیف اور کمزور طبقہ ہی کی وجہ سے اللہ تعالی کی طرف سے تمہاری امداد ہوتی ہے اور تمہیں رزق دیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اپنے اہل وعیال، والدین اور بچوں پر جو خرچ کرتا ہے، اسے وہ انہی کمزور عورتوں اور بچوں کی خاطر ہی ملتا ہے۔

قتل اولاد کی حمایت میں ایک بڑی دلیل جاہلی قوموں کے ہاتھ میں والدین کی مفلسی رہی ہے اور اسی دلیل سے کام لے کر آج بیسویں صدی میں بڑے طمطراق کے ساتھ ''منع حمل'' کی تحریک کو اٹھایا گیا ہے۔ قرآن مجید اس نظریہ باطل کی قطعی تردید کرتا ہے۔

صحیحین کی روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: "**ای ذنب اعظم**" حضرت سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا "**ان تجعل للہ ندا و ھو خلقک**"۔ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تم اللہ کا شریک بناؤ حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے، ابن مسعودؓ نے پھر عرض کیا: حضور! اس کے بعد بڑا گناہ کونسا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "**ان تقتل ولدک مخافۃ من یطعمہ**"۔ کہ تو اپنی اولاد کو اس ڈر سے قتل کردے کہ اس کی خوراک کا بندوبست کون کرے گا، گویا شرک کے بعد دوسرے نمبر پر قتل اولاد کا جرم ہے، انہوں

نے تیسری مرتبہ عرض کیا: حضرت! اس کے بعد کون سا گناہ ہے؟ تو رحمت عالم نے فرمایا" ان تزنی حلیلة جارک " کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرو، بدکاری تو ویسے بھی بہت بری حرکت ہے مگر پڑوسی کے حق میں ڈاکہ ڈالنا تو بہت ہی معیوب ہے، کیونکہ اللہ نے ہمسایہ کے بڑے حقوق رکھے ہیں۔

(۶) زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ساتوں آسمان اور زمین شادی شدہ زنا کار پر لعنت کرتی ہیں اور جہنم میں ایسے لوگوں کی شرمگاہ سے ایسی سخت بدبو پھیلے گی کہ اہل جہنم بھی پریشان ہوں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت تو یہ ہے کہ نسل انسانی کو نکاح کے ذریعے زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے، جو کوئی اللہ کی اس مصلحت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انسانی آبادی کو محدود کرنا چاہتا ہے وہ ملعون ہے، اس پر خدا تعالیٰ اور ملاء اعلی کی لعنت برستی رہے گی، اس خلاف فطرت کارروائی کے حق میں آج بھی یہی دلیل پیش کی جاتی ہے کہ دنیا کی آبادی وسائل رزق کی نسبت زیادہ بڑھ رہی ہے، اگر یہ اسی طرح بڑھتی رہی تو ان کی خوراک اور دیگر ضروریات زندگی کیسے مہیا ہوں گی؟ چنانچہ خاندانی منصوبہ بندی کا کام کسی ایک ملک میں نہیں بلکہ اقوام متحدہ کے تحت پوری دنیا میں ہو رہا ہے، جس کے لیے یہ عالمی ادارہ امداد بھی مہیا کرتا ہے، دراصل اس قسم کی منصوبہ بندی میں شرک کا پہلو بھی نکلتا ہے کہ لوگ خدا تعالیٰ کی صفت رزاقیت کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں، ان بیوقوفوں سے کوئی پوچھے: کیا روزی تمہاری منصوبہ بندی سے حاصل ہوتی ہے؟ وسائل رزق تو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔" ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین "۔ (الذریت) رزاق تو وہ رب العزت ہے جو زورآور اور مضبوط ہے، دنیا بھر میں خوراک کی کمی کا تعلق آبادی کی کثرت سے نہیں بلکہ وسائل رزق کے غلط استعمال سے ہے، وسائل خود غلط استعمال کرتے ہیں، مگر دعوی یہ ہے کہ ہماری پلاننگ سے لوگوں کو معیشت حاصل ہوتی ہے۔ زنا بجائے خود بھی قبیح ہے اور بلحاظ دوسرے مفاسد کے بھی، افراد کی روحانی پاکیزگی اور اخلاقی طہارت کے بھی منافی اور صالح تمدن و معاشرہ کی اجتماعی صالحیت کے بھی، روحانیت اور عبودیت کے چہرہ پر بھی ایک داغ اور جسمانی، معاشرتی، معاشی مضرتوں اور خطروں کے اعتبار و لحاظ سے بھی قابل نفرت۔

(آیت)'' ولا تقربوا الزنی ''۔ الفاظ قرآنی پر غور ہو۔ (آیت)'' لاتزنوا ''۔ ارشاد نہیں ہو رہا ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے: (آیت)'' لاتقربوا الزنی ''۔ زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو۔ اس کے مبادی دواعی مقدمات تک سے بچو۔ **یقول تعالیٰ ناھیا عن الزنی وعن مقاربته ومخالطة اسبابه ودواعیه.** (ابن کثیر) **وھو نھی عن دواعی الزنا ولو ارید بالنھی عن نفس الزنا تقال ولا تزنوا.** (مدارک) گویا اس حکم امتناعی کے تحت میں بے حیائی و بے حجابی کے سارے قولی، فعلی، تقریری، تحریری، تصوری، لباسی مظاہرے آگئے۔ (ملاحظہ ہو انگریزی تفسیر القرآن کا حاشیہ۔)

یہ شریعت اسلامی ہی ہے جس نے ہر غیر نکاحی ازدواجی تعلق کو ہر حال اور ہر صورت میں حرام قرار دے دیا ہے؛ ورنہ اکثر قدیم وجدید جاہلی تہذیبوں اور قانونوں میں زنا بجائے خود تو کوئی جرم ہی نہیں جب تک کہ جبر کی آمیزش یا حقوق شوہری

میں دست اندازی وغیرہ اس میں شامل نہ ہو، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بابل، مصر، ایران، ہند قدیم وغیرہ کے متعدد جاہلی مذہبوں نے تو خاص خاص حالات میں ایک عبادت یا عمل مقدس مان رکھا ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ برے راستے سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے کی عورت پر غلط نگاہ ڈالے گا تو کوئی دوسرا اس کی عورت کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گا اور اس طرح یہ ایک غلط روش چل نکلے گی، جس کا نتیجہ بہت ہی برا برآمد ہوگا۔

حضرت بریدہؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں زناکار پر لعنت بھیجتے ہیں، خاص طور پر الشیخ الزانی (معمر زناکار) کے متعلق فرمایا کہ ان لوگوں کی شرمگاہوں سے ایسی سخت بدبو اٹھے گی جس سے اہل دوزخ بھی پناہ مانگیں گے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آتا ہے کہ جب کوئی آدمی اس فعل کا ارتکاب کرتا ہے تو ایمان اس کے جسم سے نکل کر اس کے اوپر سائبان کی طرح لٹکتا رہتا ہے پھر جب وہ اس فعل سے الگ ہوجاتا ہے تو واپس آجاتا ہے۔

(۷) کسی جاندار کو ناحق قتل نہ کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر گناہ کے بارے میں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے مگر کافر کو اور جس نے جان بوجھ کر کسی مسلمان کو ناحق قتل کردیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے "**لزوال الدنیا اهون علی الله من قتل رجل مسلم**"۔ (ترمذی: کتاب الدیات) یعنی پوری دنیا کی تباہی ایک طرف اور ایک مومن کا قتل ناحق ایک طرف ہے، گویا ساری دنیا کی تباہی ایک قتل ناحق کے برابر ہے۔ ابن ماجہ، ترمذی، نسائی شریف کی روایت میں آتا ہے "**لو ان اهل السموت واهل الارض**"۔ اگر تمام آسمانوں اور زمین والے مل کر کسی ایک مومن کے قتل میں شریک ہوجائیں تو اللہ تعالیٰ سب کو جہنم میں اوندھے منہ گرائے گا، ایک قتل ناحق کے بدلے تمام روئے زمین و آسمان کے بسنے والوں کو ماخوذ کیا جاسکتا ہے۔

(۸) یتیم کے مال میں ناجائز تصرف نہ کرو۔

یتیم کے مال کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ ہاں اگر اس کی حفاظت و نگہداشت اور خیر خواہی مقصود ہو تو مضائقہ نہیں۔ جس وقت جوان ہوجائے اور اپنے نفع نقصان کو سمجھنے لگے، مال اس کے حوالہ کردو۔

(۹) وعدہ کرو تو اسے پورا کرو یعنی جیسے فرائض و واجبات اور احکام الٰہی کے پورا کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہوگا، ایسے ہی باہمی معاہدات کے متعلق بھی سوال ہوگا۔

اس میں سب عہد داخل ہیں، خواہ اللہ سے کیے جائیں یا بندوں سے بشرطیکہ غیر مشروع نہ ہوں۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ کسی کو قول و قرار صلح کا دے کر بدعہدی کرنا، اس کا وبال ضرور پڑتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عملی منافق کی ایک نشانی یہ ہے "**اذا عاهد غدر**"۔ جب وہ عہد کرتا ہے تو غداری کرتا ہے،

اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرتا ہے، اور اگر اس سے جھگڑا ہو جائے تو گالی گلوچ پر اتر آتا ہے۔

(الترغیب والترھیب)

(۱۰) ناپ تول پورا پورا کیا کرو۔

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بازار میں تشریف لے گئے اور تاجروں سے یوں خطاب فرمایا "**یامعشر التجار قدو لیتم امرین هلکت فیه الامم السابقة قبلکم**"۔ اے تاجروں کے گروہ! تمہیں دو چیزوں کا ذمہ دار بنایا گیا ہے جن کی وجہ سے کئی سابقہ اقوام ہلاک ہوئیں، فرمایا: وہ دو چیزیں "**المکیال و المیزان**"۔ ناپ اور تول ہیں، سابقہ قومیں ان دو چیزوں میں کمی بیشی کی وجہ سے عذاب کی مستحق ٹھہریں، لہٰذا تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ تم ان کے نقش قدم پر نہ چلنا اور کسی کا حق ضائع نہ کرنا۔

(۱۱) جس چیز کے بارے میں تحقیق نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان مسلم شریف میں ہے "**کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع**"۔ کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات کو بلا تحقیق آگے چلا دے۔

یعنی بے تحقیق بات زبان سے مت نکال، نہ اس کی اندھا دھند پیروی کر۔ آدمی کو چاہیے کہ کان، آنکھ اور دل و دماغ سے کام لے کر اور بقدر کفایت تحقیق کر کے کوئی بات منہ سے نکالے یا عمل میں لائے۔ سنی سنائی باتوں پر بے سوچے سمجھے یوں ہی اٹکل پچو سے کوئی قطعی حکم نہ لگائے یا عمل درآمد شروع نہ کرے۔ اس میں جھوٹی شہادت دینا، غلط تہمتیں لگانا، بے تحقیق چیزیں سن کر کسی کے درپے آزار ہونا یا بغض و عداوت قائم کر لینا، باپ دادا کی تقلید یا رسم و رواج کی پابندی میں خلاف شرع اور ناحق باتوں کی حمایت کرنا، ان دیکھی یا ان سنی چیزوں کو دیکھی یا سنی ہوئی بتلانا۔ غیر معلوم اشیاء کی نسبت دعویٰ کرنا کہ میں جانتا ہوں، یہ سب صورتیں اس آیت کے تحت میں داخل ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ قیامت کے دن تمام قویٰ کی نسبت سوال ہوگا کہ ان کو کہاں کہاں استعمال کیا تھا، بے موقع تو خرچ نہیں کیا؟

(۱۲) زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تواضع اور پستی اختیار کرو، کوئی آدمی کسی دوسرے پر فخر اور اپنی بڑائی کا امتیاز نہ کرے اور کوئی کسی پر ظلم نہ کرے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان مبارک ہے کہ جس انسان میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ تکبر ہمیشہ حق کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا "**الکبر بطر الحق و غمط الناس**"۔ تکبر یہ ہے کہ حق بات کو ٹھکرا دیا جائے اور دوسروں کو حقیر سمجھا جائے، سچی بات کو بلا سوچے سمجھے ٹھکرا دینا اور چھوٹے آدمیوں کی بات کو کوئی حیثیت نہ دینا تکبر کی علامت ہے، حق یہ ہے کہ سچی بات خواہ کسی اعلیٰ کی طرف سے ہو یا ادنی کی طرف سے اس کو تسلیم کرنا چاہیے، جو شخص تکبر کی وجہ سے حق بات کو ٹھکراتا ہے اور کسی کو حقیر سمجھتا ہے وہ خدا تعالیٰ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ (خلاصہ مضامین

قرآن کریم،خلاصۃ القرآن: م اش،تفسیرعثمانی،ماجدی،معالم العرفان)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا .... الیٰ .... مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾

اور تمہارے پروردگار نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اف تک نہ کہو، اور نہ انہیں جھڑکو۔ بلکہ ان سے عزت کے ساتھ بات کیا کرو۔(۲۳) اور ان کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرتے ہوئے ان کے سامنے اپنے آپ کو انکساری سے جھکاؤ، اور یہ دعا کرو کہ: یارب! جس طرح انہوں نے میرے بچپن میں مجھے پالا ہے، آپ بھی ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ کیجیے۔(۲۴) تمہارا رب خوب جانتا ہے تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم نیک بن جاؤ، تو وہ ان لوگوں کی خطائیں بہت معاف کرتا ہے جو کثرت سے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔(۲۵) اور رشتہ دار کو اس کا حق دو، اور مسکین اور مسافر کو (ان کا حق) اور اپنے مال کو بے ہودہ کاموں میں نہ اڑاؤ(۲۶) یقین جانو کہ جو لوگ بے ہودہ کاموں میں مال اڑاتے ہیں، وہ شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے۔(۲۷) اور اگر کبھی تمہیں ان (رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں) سے اس لیے منہ پھیرنا پڑے کہ تمہیں اللہ کی متوقع رحمت کا انتظار ہو تو ایسے میں ان کے ساتھ نرمی سے بات کرلیا کرو۔(۲۸) اور نہ تو (ایسے کنجوس بنو کہ) اپنے ہاتھ کو گردن سے باندھ کر رکھو، اور نہ (ایسے فضول خرچ کہ) ہاتھ کو بالکل ہی کھلا چھوڑ دو جس کے نتیجے میں تمہیں قابل ملامت اور قلاش ہو کر بیٹھنا پڑے۔(۲۹) حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق میں وسعت عطا فرما دیتا ہے، اور (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگی پیدا کر دیتا ہے۔ یقین رکھو کہ وہ اپنے بندوں کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہے، انہیں پوری طرح دیکھ رہا ہے۔(۳۰) اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی رزق دیں گے، اور تمہیں بھی۔ یقین جانو کہ ان کو قتل کرنا بڑی بھاری غلطی ہے۔(۳۱) اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو، وہ یقینی طور پر بڑی بے حیائی اور بے راہ روی ہے۔(۳۲) اور جس جان کو اللہ نے حرمت عطا کی ہے، اسے قتل نہ کرو، الا یہ کہ تمہیں (شرعا) اس کا حق پہنچتا ہو، اور جو شخص ظلماً قتل کر دیا گیا ہو، تو ہم نے اس کے ولی کو (قصاص کا) اختیار دیا ہے۔ چنانچہ اس پر لازم ہے کہ وہ قتل کرنے میں حد سے تجاوز نہ کرے، یقیناً وہ اس لائق ہے کہ اس کی مدد کی جائے۔(۳۳) اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکو، مگر ایسے طریقے سے جو (اس کے حق میں) بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنی پختگی کو پہنچ جائے، اور عہد کو پورا کرو، یقین جانو کہ عہد کے بارے میں (تمہاری) باز پرس ہونے والی ہے۔(۳۴) اور جب کسی کو کوئی چیز پیمانے سے ناپ کر دو تو پورا ناپو، اور تولنے کے لیے صحیح ترازو استعمال کرو۔ یہی طریقہ درست ہے اور اسی کا انجام بہتر ہے۔(۳۵) اور جس بات کا تمہیں یقین نہ ہو، (اسے سچ سمجھ کر) اس کے پیچھے

مت پڑو، یقین رکھو کہ کان، آنکھ اور دل سب کے بارے میں (تم سے) سوال ہوگا۔(۳۶) اور زمین پر اکڑ کر مت چلو۔ نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ بلندی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتے ہو۔(۳۷) یہ سارے برے کام ایسے ہیں جو تمہارے پروردگار کو بالکل ناپسند ہیں۔(۳۸) (اے پیغمبر) یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تمہارے پروردگار نے تم پر وحی کے ذریعے پہنچائی ہیں۔ اور (اے انسان) اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بنا، ورنہ تجھے ملامت کر کے، دھکے دے کر دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔(۳۹)

شرک کی نحوست؛ قرآن میں غور وفکر سے محرومی:

وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِیۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لِیَذَّکَّرُوۡا ؕ وَمَا یَزِیۡدُهُمۡ اِلَّا نُفُوۡرًا ﴿۴۱﴾ .... الی ....وَتَظُنُّوۡنَ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۵۲﴾

اور ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے وضاحتیں کی ہیں، تاکہ لوگ ہوش میں آئیں، مگر یہ لوگ ہیں کہ اس سے ان کے بدکنے ہی میں اور اضافہ ہو رہا ہے۔(۴۱) کہہ دو کہ: اگر اللہ کے ساتھ اور بھی خدا ہوتے جیسے کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو وہ عرش والے (حقیقی خدا) پر چڑھائی کرنے کے لیے کوئی راستہ پیدا کر لیتے۔(۴۲) حقیقت یہ ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں اس کی ذات ان سے بالکل پاک اور بہت بالا و برتر ہے۔(۴۳) ساتوں آسمان اور زمین اور ان کی ساری مخلوقات اس کی پاکی بیان کرتی ہیں، اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، لیکن تم لوگ ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو، حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا بردبار، بہت معاف کرنے والا ہے۔(۴۴) اور (اے پیغمبر) جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ایک ان دیکھا پردہ حائل کر دیتے ہیں۔(۴۵) اور ہم ان کے دلوں پر ایسا غلاف چڑھا دیتے ہیں کہ وہ اسے سمجھتے نہیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں۔ اور جب تم قرآن میں تنہا اپنے رب کا ذکر کرتے ہو تو یہ لوگ نفرت کے عالم میں پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہیں۔(۴۶) ہمیں خوب معلوم ہے کہ جب یہ لوگ تمہاری بات کان لگا کر سنتے ہیں تو کس لیے سنتے ہیں، اور جب یہ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں (تو ان باتوں کا بھی ہمیں پورا علم ہے) جب یہ ظالم (اپنی برادری کے مسلمانوں سے) یوں کہتے ہیں کہ: تم تو بس ایک ایسے آدمی کے پیچھے چل پڑے ہو جس پر جادو ہو گیا ہے۔(۴۷) دیکھو انہوں نے تم پر کیسی کیسی پھبتیاں چست کی ہیں۔ یہ راہ سے بھٹک چکے ہیں۔ چنانچہ یہ راستے پر نہیں آسکتے۔(۴۸) اور یہ کہتے ہیں کہ: کیا جب ہمارا وجود ہڈیوں میں تبدیل ہو کر چورا چورا ہو جائے گا تو بھلا کیا اس وقت ہمیں نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھایا جائے گا؟(۴۹) کہہ دو کہ: تم پتھر یا لوہا بھی بن جاؤ۔(۵۰) یا کوئی اور ایسی مخلوق بن جاؤ جس کے بارے میں تم دل میں سوچتے ہو کہ (اس کا زندہ ہونا) اور بھی مشکل ہے، (پھر بھی تمہیں زندہ کر دیا جائے گا) اب وہ کہیں گے کہ: کون ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا؟ کہہ دو کہ: وہی زندہ کرے گا جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا، پھر وہ تمہارے سامنے سر ہلا ہلا کر کہیں گے کہ:

ایسا کب ہوگا؟ کہہ دینا کہ: کیا بعید ہے کہ وہ وقت قریب ہی آ گیا ہو۔(۵۱) جس دن وہ تمہیں بلائے گا تو تم اس کی حمد کرتے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل کروگے، اور یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ تم بس تھوڑی سی مدت (دنیا میں) رہے تھے۔(۵۲)

خدائی ڈھیل انسان کو مستحق عذاب نہ بنادے:

حق تعالیٰ کی بے شمار عظیم الشان نعمتیں جو انسانوں پر ہر وقت مبذول ہیں ان کو بیان کرکے یہ بتلانا منظور ہے کہ ان تمام نعمتوں کا بخشنے والا بجز ایک حق تعالیٰ کے کوئی نہیں ہوسکتا اور سب نعمتیں اس کی ہیں تو اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرانا بڑی گمراہی ہے۔(معارف القرآن مفتی شفیع صاحب)

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ........... الیٰ............ فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝

تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے لیے سمندر میں کشتیاں لے چلتا ہے، تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو۔ یقینا وہ تمہارے ساتھ بڑی رحمت کا معاملہ کرنے والا ہے۔(٦٦) اور جب سمندر میں تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو جن (دیوتاؤں) کو تم پکارا کرتے ہو، وہ سب غائب ہوجاتے ہیں۔ بس اللہ ہی اللہ رہ جاتا ہے۔ پھر جب اللہ تمہیں بچا کر خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو تم منہ موڑ لیتے ہو۔ اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔(٦٧) تو کیا تمہیں اس بات کا کوئی ڈر نہیں رہا کہ اللہ تمہیں خشکی ہی کے ایک حصے میں دھنسا دے، یا تم پر پتھر برسانے والی آندھی بھیج دے، اور پھر تمہیں اپنا کوئی رکھوالا نہ ملے؟(٦٨) اور کیا تم اس بات سے بھی بے فکر ہوگئے ہو کہ وہ تمہیں دوبارہ اسی (سمندر) میں لے جائے۔ پھر تم پر ہوا کا طوفان بھیج کر تمہاری ناشکری کی سزا میں تمہیں غرق کر ڈالے، پھر تمہیں کوئی نہ ملے جو اس معاملے میں ہمارا پیچھا کرسکے؟ (٦٩) اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی ہے، اور انہیں خشکی اور سمندر دونوں میں سواریاں مہیا کی ہیں، اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا ہے، اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت عطا کی ہے۔(٧٠) اس دن کو یاد رکھو جب ہم تمام انسانوں کو ان کے اعمال ناموں کے ساتھ بلائیں گے۔ پھر جنہیں ان کا اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، تو وہ اپنے اعمال نامے کو پڑھیں گے، اور ان پر ریشہ برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔(٧١) اور جو شخص دنیا میں اندھا بنا رہا، وہ آخرت میں بھی اندھا، بلکہ راستے سے اور زیادہ بھٹکا ہوا رہے۔(٧٢)

مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت:

اللہ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا اشارہ دیا ہے کہ کفار و مشرکین کی بڑھتی ہوئی ایذا رسانیوں کے پیش نظر آپ کو یہاں سے ہجرت کرنا پڑے گی اور دوسری آیت میں اللہ نے فتح مکہ کی پیش گوئی فرمائی ہے۔

اکثر انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو زندگی میں ہجرت کا مرحلہ پیش آیا، جب قوم و ملک کے تمام لوگ مخالف ہوگئے، انہیں اتنی تکالیف پہنچائی گئیں کہ ان کا اپنے وطن میں رہنا محال ہوگیا تو پھر اللہ کے حکم سے نبی کو اپنا گھر بار اور وطن چھوڑنا

پڑا، حضرت ابراہیمؑ کے خلاف پوری قوم اکٹھی ہوگئی، حتیٰ کہ باپ بھی دشمنوں کے ساتھ مل گیا، تو آپ کو کہنا پڑا، "انی ذاهب الی ربی سیهدین "۔ (الصفٰت) میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں، وہی مجھے راستہ دکھائے گا، خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بھی ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ آپ کا مکہ میں رہنا دوبھر ہوگیا اور اللہ نے آپ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دے دیا، یہ ہجرت تمام اہل ایمان کے لیے فرض قرار دے دی گئی تھی، کیونکہ کفار کی ناکامی اور مسلمانوں کی کامیابی کا راز اسی میں پنہاں تھا، ایسی حالت میں ہجرت سے مستثنیٰ صرف عورتیں اور بچے ہوتے ہیں یا وہ کمزور لوگ ہوتے ہیں جو سفر کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں یا جن کو راستہ بتانے والا کوئی نہ ہو، اور کوئی صاحب استطاعت آدمی ہجرت پر آمادہ نہیں ہوتا تو وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ (معالم العرفان: ۱۲/ ۲۳۲)

درج ذیل آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہجرت کا حکم دینے کے بعد ہجرت کی دعا سکھلائی ہے:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ ....الیٰ........وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

اور یہ دعا کرو کہ: یارب! مجھے جہاں داخل فرما اچھائی کے ساتھ داخل فرما، اور جہاں سے نکال اچھائی کے ساتھ نکال، اور مجھے خاص اپنے پاس سے ایسا اقتدار عطا فرما جس کے ساتھ (تیری) مدد ہو۔ (۸۰) اور کہو کہ: حق آن پہنچا، اور باطل مٹ گیا، اور یقیناً باطل ایسی ہی چیز ہے جو مٹنے والی ہے۔ (۸۱)

ایمان قبول نہ کرنے کے لیے جھوٹی دلیلوں کا سہارا لینا:

مشرکین جواب سے عاجز اور لاچار ہوگئے تو انہوں نے از راہ عناد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے شمار بے سروپا فرمائشیں شروع کیں اور کہا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سچے نبی ہیں تو یہ نشانات دکھلائیے، جن کا آئندہ آیت میں ذکر ہے، ان کے جواب میں یہ آیتیں نازل ہوئیں، ان آیات میں کفار کے ان شبہات کا جواب دیا گیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت سے متعلق تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۫ فَاَبٰۤی اَكْثَرُ النَّاسِ ....الیٰ........قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾

اور ہم نے انسانوں کی بھلائی کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی حکمت کی باتیں طرح طرح سے بیان کی ہیں، پھر بھی اکثر لوگ انکار کے سوا کسی اور بات پر راضی نہیں ہیں۔ (۸۹) اور کہتے ہیں کہ: ہم تم پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک تم زمین کو پھاڑ کر ہمارے لیے ایک چشمہ نہ نکال دو۔ (۹۰) یا پھر تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہوجائے، اور تم اس کے بیچ بیچ میں زمین کو پھاڑ کر نہریں جاری کر دو۔ (۹۱) یا جیسے تم دعوے کرتے ہو، آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے ہم پر گرا دو، یا پھر اللہ کو اور فرشتوں کو ہمارے آمنے سامنے لے آؤ۔ (۹۲) یا پھر تمہارے لیے

ایک سونے کا گھر پیدا ہو جائے، یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ، اور ہم تمہارے چڑھنے کو بھی اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک تم ہم پر ایسی کتاب نازل نہ کر دو جسے ہم پڑھ سکیں۔ (اے پیغمبر) کہہ دو کہ: سبحان اللہ! میں تو ایک بشر ہوں جسے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ (۹۳)

علاوہ ازیں اس سورت میں:

قرآن کریم کی عظمت وصداقت، اس کے نزول کے مقاصد اور اس کے معجزہ ہونے، اللہ کی طرف سے انسان کو تکریم دیئے جانے، اسے روح اور زندگی جیسی نعمت کے عطا ہونے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز تہجد کا حکم دیئے جانے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا قصہ اور قرآن کریم کے تھوڑا تھوڑا نازل ہونے کی حکمت جیسے مضامین بھی مذکور ہیں۔

اللہ پاک کی نہ کوئی اولاد ہے اور نہ کوئی ساجھی:

سورت کے اختتام پر بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ شریک اور اولاد سے پاک ہے اور وہ اسمائے حسنیٰ کے ساتھ متصف ہے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾

اور کہو کہ: تمام تعریفیں اللہ کی ہیں جس نے نہ کوئی بیٹا بنایا، نہ اس کی سلطنت میں کوئی شریک ہے، اور نہ اسے عاجزی سے بچانے کے لیے کوئی حمایتی درکار ہے اور اس کی ایسی بڑائی بیان کرو جیسی بڑائی بیان کرنے کا اسے حق حاصل ہے۔ (۱۱۱) (خلاصۃ القرآن: م اش)

افضل ذکر:

سورۃ کی ابتدا "سبحن الذی" سے اور اختتام الحمد للہ پر ہوا۔ یہ تنزیہہ کے کلمات ہیں جنہیں دہراتے رہنا چاہیے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے "**افضل الدعآء الحمد للہ**" یعنی سب سے افضل دعا الحمد کہنا ہے، اس پر اللہ اتنا دے دیتا ہے کہ اتنا مانگنے والوں کو بھی نہیں دیتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی ہے "**افضل الذکر لا الہ الا اللہ**" سب سے افضل ذکر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار ہے، صحیح روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک بھی ہے "**افضل الکلام اربع سبحان اللہ و الحمد للہ و لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر**"۔ یہ چار افضل کلمات ہیں، ان میں سے جس کو چاہو پہلے کہو اور جس کو چاہو بعد میں، دوسری روایت میں آتا ہے کہ اللہ نے اپنے فرشتوں کے لیے بھی یہی کلام منتخب فرمایا ہے، وہ بھی ان کلمات سے اللہ کی عظمت بیان کرتے ہیں۔ (معالم العرفان: ۱۲/۳۱۱)

خلاصہ سورت:......رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی باقی ادیان سے نسبت کیا ہے؟ جس طرح آپ امام الانبیاء علیہم السلام ہیں، اسی طرح آپ کا دین امام الادیان ہے۔

خلاصہ رکوع:۱......دعوت حقہ اور اس پر لبیک کہنے کی ضرورت۔ ماخذ: آیت: ۱۰،۹۔

خلاصہ رکوع: ۲......جس طرف ہم تمہیں دعوت دیتے ہیں وہ نہار روحانی ہے جس میں بیدار رہو کر اپنی قوتوں کو کام میں لانے کی ضرورت ہے۔ ماخذ: آیت: ۱۲۔

خلاصہ رکوع: ۳......تفصیل احکام دعوت حقہ۔ ماخذ: آیت: ۲۲ تا ۳۰۔

خلاصہ رکوع: ۴......تفصیل احکام دعوت حقہ۔ ماخذ: آیت: ۳۱ تا ۴۰۔

خلاصہ رکوع: ۵...... دعوت حقہ پر لبیک کہنے میں جو موانع ہیں، ان کی تردید۔ ماخذ: (۱) آیت: ۴۲۔ (۲) آیت: ۴۵۔ (۳) آیت ۴۷۔ (۴) آیت: ۴۹۔

خلاصہ رکوع: ۶......دعوت حقہ پر لبیک کہنے میں جو موانع ہیں، ان کی تردید۔ ماخذ: آیت: ۵۳، ۵۶۔

خلاصہ رکوع: ۷......اگر دعوت حقہ پر لبیک نہ کہی تو گزرگاہ دنیا میں ایک زبردست ڈاکو ہے، جو تمہارے متاع ایمان کو سلب کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہے، لہذا اگر تم نے اس دعوت پر لبیک کہہ کر یہ خطرناک راستہ طے کیا تو متاع ایمان سلامت لے جاؤ گے۔ ماخذ: آیت: ۶۱ تا ۶۵۔

خلاصہ رکوع: ۸......اگر اس دعوت پر لبیک نہ کہی تو عمی باطن قائم رہے گا، جس کے نتائج قبیحہ آخرت میں بھگتنے پڑیں گے۔ ماخذ: آیت: ۲۷۔

خلاصہ رکوع: ۹......اگر عمی دنیوی اور اخروی سے بچنا چاہتے ہو تو منبع شفا ورحمت سے جرعہ نوشی کیا کرو۔ ماخذ: آیت: ۸۲۔

خلاصہ رکوع: ۱۰......سوالات غیر متعلقہ سے احتراز لازمی ہے۔ ماخذ: آیت: ۸۵، ۹۰ تا ۹۳۔

خلاصہ رکوع: ۱۱......غیر متعلقہ سوالات سے احتراز لازمی ہے۔ ماخذ: آیت: ۹۴، ۹۸۔

خلاصہ رکوع: ۱۲......دعوت حقہ پر لبیک کہنے والوں کے اوصاف۔ ماخذ: آیت: ۱۰۷ تا ۱۰۹۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورة الكهف

حافظ ابن جریر طبری نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اس سورت کا شان نزول یہ نقل کیا ہے کہ مکہ مکرمہ کے کچھ سرداروں نے دو آدمی مدینہ منورہ کے یہودی علماء کے پاس یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجے کہ تورات اور انجیل کے یہ علماء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ یہودی علماء نے ان سے کہا کہ آپ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم سے تین سوالات کیجیے۔ اگر وہ ان کا صحیح جواب دے دیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ واقعی اللہ تعالی کے نبی ہیں اور اگر وہ صحیح جواب نہ دے سکے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کا نبوت کا دعوی صحیح نہیں ہے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ ان

نوجوانوں کا وہ عجیب واقعہ بیان کریں جو کسی زمانے میں شرک سے بچنے کے لیے اپنے شہر سے نکل کر کسی غار میں چھپ گئے تھے۔ دوسرے اس شخص کا حال بتائیں جس نے مشرق سے مغرب تک پوری دنیا کا سفر کیا تھا۔ تیسرے ان سے پوچھیں کہ روح کی حقیقت کیا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں شخص مکہ مکرمہ واپس آئے، اور اپنی برادری کے لوگوں کو ساتھ لے کر انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تین سوال پوچھے۔ تیسرے سوال کا جواب تو پچھلی سورت میں آچکا ہے۔ اور پہلے دو سوالات کے جواب میں یہ سورت نازل ہوئی جس میں غار میں چھپنے والے نوجوانوں کا واقعہ تفصیل سے بیان فرمایا گیا ہے، انہی کو اصحاب کہف کہا جاتا ہے۔ کہف عربی میں غار کو کہتے ہیں، اصحاب کہف کے معنی ہوئے غار والے اور اسی غار کے نام پر سورت کو سورۃ الکہف کہا جاتا ہے۔ دوسرے سوال کے جواب میں سورت کے آخر میں ذوالقرنین کا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے جنہوں نے مشرق و مغرب کا سفر کیا تھا۔

اس کے علاوہ اسی سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ واقعہ بھی بیان فرمایا گیا ہے جس میں وہ حضرت خضر علیہ السلام کے پاس تشریف لے گئے تھے، اور کچھ عرصہ ان کی معیت میں سفر کیا تھا۔ یہ تین واقعات تو اس سورت کا مرکزی موضوع ہیں۔ ان کے علاوہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو خدا کا بیٹا قرار دے رکھا تھا، اس سورت میں بطور خاص اس کی تردید بھی ہے اور حق کا انکار کرنے والوں کو وعیدیں بھی سنائی گئی ہیں، اور حق کے ماننے والوں کو نیک انجام کی خوشخبری بھی دی گئی ہے۔

سورہ کہف کی تلاوت کے فضائل احادیث میں آئے ہیں۔ خاص طور پر جمعہ کے دن اس کی تلاوت کی بڑی فضیلت آئی ہے، اور اسی لیے بزرگان دین کا معمول رہا ہے کہ وہ جمعہ کے دن اس کی تلاوت کا خاص اہتمام کرتے تھے۔

(توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی اٹھارہویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۶۹ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں کل رکوع ۱۲، آیات ۱۱۰، کلمات ۱۶۰۸ اور کل حروف ۶۶۲۰ ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورت کو سورۂ کہف اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں ان لوگوں کے حیرت انگیز حال کا بیان ہے جو کہف یعنی غار میں تین سونو برس تک سو کر جاگے تھے، یہ حضرات اپنے ایمان کو بچانے کے لئے غار میں چھپ گئے تھے، اس وقت جو مسلمان ستائے جارہے تھے ان کو اصحاب کہف کا قصہ سنایا گیا تا کہ ان کی ہمت بلند ہو اور انہیں معلوم ہو کہ اہل ایمان اپنے ایمان کو بچانے کے لئے پہلے کیا کچھ کر چکے ہیں۔

ربط:

سورہ اسراء کے اخیر میں خدا کی حمد میں تین صفات سلبیہ ذکر فرمائی گئیں تھیں کہ خدا اولاً شریک و مددگار سب سے

پاک ہے، اس سورۃ کو بھی حمد سے ہی شروع کیا گیا، جس سے تناسب طرفین ظاہر ہے۔

فضائل:

اس سورت کے فضائل میں بہت سی احادیث وارد ہیں:

(۱) حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص رات کو گھر میں سورہ کہف پڑھ رہا تھا اور گھوڑا بھی وہیں بندھا ہوا تھا کہ گھوڑا ابد کنے لگا، اس شخص نے اوپر سر اٹھا کر دیکھا تو ایک نور دکھائی دیا جو بادل کی طرح سایہ کئے ہوئے تھا، صبح کو اس نے یہ ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو پڑھا کرو، یہ سکینت یعنی نور اطمینان ہے جو اس کو پڑھنے کی وجہ سے نازل ہوئی تھی۔

(۲) ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص جمعہ کے دن سورہ کہف پڑھ لے وہ اگلے جمعہ تک ہر فتنہ سے محفوظ رہے گا۔

(۳) ایک روایت میں ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن سورہ کہف تلاوت کرے اس کے قدم سے لے کر آسمان کی بلندی تک نور ہو جائے گا، جو قیامت کے دن روشنی دے گا اور پچھلے جمعہ سے اس دن تک اس کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔

(۴) حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس شخص نے سورۃ کہف کی پہلی دس آیتیں حفظ کر لیں وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔

(۵) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سورۂ کہف پوری کی پوری ایک وقت میں نازل ہوئی اور ستر ہزار فرشتے اس کے ساتھ آئے۔

خلاصۂ سورۃ:

یہ سورۃ مشرکین کے تین سوالات کے جوابات میں نازل ہوئی جو انہوں نے یہود کے مشورہ اور سکھلانے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کئے تھے، مشرکین مکہ نے یہود سے جا کر کہا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی ہونے کا دعوی کرتے ہیں، ہمیں ایسے سوال بتاؤ جو امتحان کی غرض سے پوچھے جائیں، چنانچہ یہود نے تین سوال سکھلائے کہ یہ جا کر پوچھو، وہ تین سوال یہ تھے۔ (۱) اصحاب کہف کون تھے؟ (۲) قصہ خضر اور موسی کی حقیقت کیا ہے؟ (۳) ذوالقرنین کا قصہ کیا ہے؟ بعض نے بجائے خضر و موسی علیہما السلام کے قصہ کے روح کے متعلق سوال ذکر کیا ہے۔ یہ تینوں قصے عیسائیوں اور یہودیوں کی تاریخ سے متعلق تھے، اہل عرب میں ان کا کوئی چرچا نہ تھا، اس لئے یہود نے امتحان کی غرض سے ان سوالات کا انتخاب کیا تھا، تا کہ یہ بات کھل جائے کہ واقعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی غیبی ذریعہ علم ہے یا نہیں؟ چنانچہ اللہ جل شانہ نے یہ پوری سورۂ کہف نازل فرما کر اپنے نبی کی زبان مبارک سے ان کے تمام سوالات کے جوابات دیئے اور صرف یہی نہیں کہ ان کے پوچھے ہوئے سوالات کے جوابات دیئے بلکہ ان تینوں قصوں کو پوری طرح اس صورت حال پر بھی چسپاں کر دیا جو اس وقت مکہ میں

کفر و اسلام کے درمیان درپیش تھی، اصحاب کہف کے متعلق بتلایا گیا کہ وہ اسی توحید کے قائل تھے جس کی دعوت ہمیں قرآن پیش کررہا ہے ان کا حال مکہ کے مٹھی بھر مظلوم مسلمانوں سے اور ان کی قوم کا حال کفار قریش کے حال کی طرح تھا، اس قصہ سے اہل ایمان کو یہ سبق دیا گیا کہ اگر کفار کا کہیں غلبہ بے پناہ ہو اور ایک مؤمن کو ظالم معاشرہ میں دین وایمان پر قائم رہنا مشکل ہو تب بھی اس کو باطل کے آگے سر نہیں جھکانا چاہئے اور کفار مکہ کو جتلایا گیا کہ اصحاب کہف کا قصہ عقیدہ آخرت کی صحت اور سچائی کا ایک ثبوت ہے، جس خدائے قادر مطلق نے اصحاب کہف کو ایک مدت دراز سلا کر پھر زندہ اٹھایا اسی طرح اس کی قدرت سے دوبارہ قیامت میں تمام انسانوں کو زندہ کرکے اٹھانا کچھ بعید نہیں جس کا کفار انکار کرتے تھے۔

اس کے بعد قصہ ذوالقرنین سنایا گیا اور اس میں سوال کرنے والوں کو یہ سبق دیا گیا کہ تم اپنی ذرا ذرا سی سرداریوں پر پھول رہے ہو، حالانکہ ذوالقرنین اتنا بڑا فرمانرواں تھا کہ اس کے وقت میں تمام سرزمین کے بادشاہ اس کے تابع تھے لیکن وہ اپنی حقیقت کو نہ بھولا، ہمیشہ اپنے خالق کے آگے سر تسلیم خم رکھتا تھا اور قیامت وآخرت پر ایمان رکھتا تھا اور قیامت کی سزا و جزاء کا قائل تھا۔ خلاصہ یہ کہ اس سورۃ میں مضامین توحید و رسالت کے ساتھ قیامت، آخرت، حشر و نشر، جزا و سزا اور دنیا کے فنا و زوال کا حال بیان فرمایا گیا۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورہ کہف کے مضامین اس بات کی نشان دہی کررہے ہیں کہ مکہ کے آخری دور میں نازل ہونے والی سورت ہے۔ یہ وہ دور تھا جب مشرکین مکہ دعوت حق کو دبانے کے لئے استہزاء، اعتراضات، تخویف اور بہتان تراشی جیسے تمام حربے آزما چکے تھے، اب ان کی مخالفت، ظلم وستم، مار پیٹ اور معاشی دباؤ کے دائرے میں داخل ہو چکی تھی۔ ان کے ان حربوں کی وجہ سے کچھ مسلمان حبش کی طرف ہجرت کر گئے۔ مکہ میں جو مسلمان بچ گئے تھے ان کو اور خود نبی کریم علیہ السلام کو ان کے افراد خانہ کے ساتھ مشرکین نے شعب ابی طالب میں محصور کرکے ان کا مکمل معاشی اور معاشرتی بائیکاٹ کر دیا۔ آپ کی رفیقہ حیات حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالی عنہا اور مشفق چچا ابو طالب کے انتقال کے ساتھ یہ جانکاہ دور ختم ہوا؛ لیکن مکہ کی زندگی آپ کے لئے بھی آزمائشوں سے اتنی پر تھی کہ آپ کو اپنا یہ عزیز ترین شہر اپنا مولد و مسکن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑنا پڑا۔ آپ بحکم الٰہی اپنے مخلص اور جاں نثار ساتھیوں سمیت مکہ سے مدینہ ہجرت کر گئے۔

ہجرت مدینہ سے قبل مکہ میں مسلمانوں کو ستایا جارہا تھا، اس وقت انہیں اصحاب کہف کا قصہ سنایا تاکہ ان کی ہمت بندھے اور معلوم ہو کہ اہل ایمان اپنا ایمان بچانے کے لئے اس سے پہلے کی مصیبتیں جھیل چکے ہیں۔ (قرآن ایک نظر میں)

وجہ تسمیہ:

کہف غار کو کہتے ہیں؛ چونکہ اس سورت میں غار والوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس لیے اسے سورۂ کہف کہا جاتا ہے۔

سورۂ کہف کی فضیلت:

اس سورت کی فضیلت کے بارے میں متعدد احادیث وارد ہیں۔ امام احمد، مسلم اور نسائی نے حضرت ابو درداء رضی

اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ جو شخص سورۂ کہف کی آخری دس آیات پڑھے گا وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔ اہل علم کہتے ہیں کہ سنت یہ ہے کہ جمعہ کے دن یا رات میں سورہ کہف پڑھی جائے؛ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھے گا اس کے لیے دو جمعوں کے درمیان کو نور سے منور کر دیا جائے گا۔

ابتداء الحمد للہ سے:

سورۂ کہف ان پانچ سورتوں میں سے ایک ہے جن کی ابتداء الحمد اللہ سے ہوتی ہے، باقی چار سورتیں یہ ہیں۔ فاتحہ، انعام، سبا اور فاطر۔

معرکۂ ایمان و مادیت:

حضرت مولانا علی میاں نور اللہ مرقدہ نے اس سورت کی تفسیر میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں طویل غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس سورت کا موضوع "معرکہ ایمان و مادیت" ہے۔

سب سے بڑا علمبردار دجال:

اس سورت کا آخری دور کے فتنوں سے خاص تعلق ہے جس کا سب سے بڑا علمبردار دجال ہوگا، یہ سورت مسلمانوں کو دجال کے فتنہ سے مقابلہ کے لیے تیار کرتی ہے، اس سورت میں جتنے اشارے واقعات اور مثالیں گزری ہیں وہ سب ایمان اور مادیت کی کشمکش کو بیان کرتی ہیں۔

سورۂ کہف میں تین قصے اور تین تمثیلیں بیان ہوئی ہیں۔

اصحاب کہف:

پہلا قصہ اصحاب کہف کا ہے، یہ وہ چند صاحب ایمان نوجوان تھے جنہیں دقیانوس نامی بادشاہ بت پرستی پر مجبور کرتا تھا، وہ ہر ایسے شخص کو قتل کر دیتا تھا جو اس کی شرکیہ دعوت کو قبول نہیں کرتا تھا۔

◇ ان نوجوانوں کو ایک طرف مال و دولت کے انبار، اونچے عہدوں پر تقرر اور معیار زندگی کی بلندی جیسی ترغیبات دی گئیں۔

◇ اور دوسری طرف ڈرایا دھمکایا گیا اور جان سے مار دینے کی دھمکیاں دی ہیں۔

◇ ان نوجوانوں نے ایمان کی حفاظت کو ہر چند مقدم جانا اور اسے بچانے کی خاطر نکل کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے شہر سے بہت دور ایک پہاڑ کی غار تک پہنچ گئے۔

غار میں پناہ:

انہوں نے اس غار میں پناہ لینے کا ارادہ کیا، وہ جب غار میں داخل ہو گئے تو اللہ نے انہیں گہری نیند سلا دیا، یہاں وہ تین سو نو سال تک سوتے رہے۔

جب نیند سے بیدار ہوئے تو کھانے کی فکر ہوئی، ان میں سے ایک کھانا خرید نے کے لیے شہر آیا، وہاں اسے پہچان لیا گیا، تین صدیوں میں حالات بدل چکے تھے، اہل شرک کی حکومت کب کی ختم ہو چکی تھی اور اب موحد برسر اقتدار تھے، ایمان کی خاطر گھر بار چھوڑنے والے نوجوان ان کی نظر میں قومی ہیروز کی حیثیت اختیار کر گئے۔

اس قصہ سے سبق:

اس قصہ سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ مومن کو ایمان کے سلسلہ میں بڑا حساس ہونا چاہیے اور اگر خدانخواستہ مادیت اور ایمان دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا مرحلہ آئے تو اسے بہرطور ایمان کی حفاظت ہی کو ہر مادی چیز پر ترجیح دینی چاہیے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

جوانی کا بہترین دور:

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی میں جوانی کا دور ہی ایسا زمانہ ہے جس میں انسان کچھ کر سکتا ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے تین دور بیان فرمائے ہیں یعنی بچپن، جوانی اور بڑھاپا، بچپن کا زمانہ پختگی کا زمانہ ہوتا ہے اور انسان ناسمجھی کی وجہ سے کوئی اہم کام انجام نہیں دے سکتا، بڑھاپا ضعف اور کمزوری کا دور ہوتا ہے اس لیے اس دور میں انسان کوئی انقلابی قدم نہیں اٹھا سکتا، البتہ جوانی کا دور ہی قوت کا دور ہوتا ہے جس میں انسان انقلابی اقدام کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کی فکر صحیح ہو، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر پہلے ایمان لانے والے بھی نوجوان ہی تھے جنہوں نے پوری دنیا میں اسلامی انقلاب برپا کر دیا، اسلام کے ابتدائی دور میں جو بوڑھے آدمی ایمان لائے ان کی تعداد اٹھارہ اور بیس کے درمیان ملتی ہے، حدیث شریف میں جن سات آدمیوں کو قیامت کے دن عرش کا سایہ نصیب ہوگا، ان میں "**شاب نشا فی عبادۃ اللّٰہ**" بھی ہے یعنی وہ نوجوان جس کا وقت زیادہ تر عبادت الٰہی میں گزرا ہے۔ (معالم العرفان: ۱۲/ ۳۴۵)

جب بندہ اللہ کا مطیع ہو جاتا ہے تو آسمان زمین کی چیزیں اس کے تابع ہو جاتی ہے:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾............الیٰ........فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾

ہم تمہارے سامنے ان کا واقعہ ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں۔ یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے، اور ہم نے ان کو ہدایت میں خوب ترقی دی تھی۔ (۱۳) اور ہم نے ان کے دل خوب مضبوط کر دیے تھے، یہ اس وقت کا ذکر ہے جب وہ اٹھے، اور انہوں نے کہا کہ: ہمارا پروردگار وہ ہے جو تمام آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ ہم اس کے سوا کسی کو معبود بنا کر ہرگز نہیں پکاریں گے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم یقیناً انتہائی لغو بات کہیں گے۔ (۱۴) یہ ہماری قوم کے لوگ ہیں جنہوں نے اس پروردگار کو چھوڑ کر دوسرے معبود بنا رکھے ہیں۔ (اگر ان کا عقیدہ صحیح ہے تو) وہ اپنے معبودوں کے ثبوت میں کوئی واضح دلیل کیوں پیش نہیں کرتے؟ بھلا اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ

باندھے؟ (۱۵) اور (ساتھیو) جب تم نے ان لوگوں سے بھی علیحدگی اختیار کر لی ہے اور ان سے بھی جن کی یہ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں تو چلو اب تم اس غار میں پناہ لے لو، تمہارا پروردگار تمہارے لیے اپنا دامن رحمت پھیلا دے گا، اور تمہارے کام میں آسانی کے اسباب مہیا فرمائے گا۔ (۱۶) اور (وہ غار ایسا تھا کہ) تم سورج کو نکلتے وقت دیکھتے تو وہ ان کے غار سے دائیں طرف ہٹ کر نکل جاتا، اور جب غروب ہوتا تو ان سے بائیں طرف کترا کر چلا جاتا، اور وہ اس غار کے ایک کشادہ حصے میں (سوئے ہوئے) تھے۔ یہ سب کچھ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، جسے اللہ ہدایت دیدے، وہی ہدایت پاتا ہے، اور جسے وہ گمراہ کر دے اس کا تمہیں ہرگز کوئی مددگار نہیں مل سکتا جو اسے راستے پر لائے۔ (۱۷) تم انہیں (دیکھ کر) یہ سمجھتے کہ وہ جاگ رہے ہیں، حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے، اور ہم ان کو دائیں اور بائیں کروٹ دلواتے رہتے تھے، اور ان کا کتا دہلیز پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے (بیٹھا) تھا۔ اگر تم انہیں جھانک کر دیکھتے تو ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوتے، اور تمہارے اندر ان کی دہشت سما جاتی۔ (۱۸) اور (جیسے ہم نے انہیں سلایا تھا) اسی طرح ہم نے انہیں اٹھا دیا تا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ گچھ کریں۔ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا: تم اس حالت میں کتنی دیر رہے ہوں گے؟ کچھ لوگوں نے کہا: ہم ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم (نیند میں) رہے ہوں گے۔ دوسروں نے کہا: تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ تم کتنی دیر اس حالت میں رہے ہو۔ اب اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر کی طرف بھیجو، وہ جا کر دیکھ بھال کرے کہ اس کے کون سے علاقے میں زیادہ پاکیزہ کھانا (مل سکتا) ہے۔ پھر تمہارے پاس وہاں سے کچھ کھانے کو لے آئے، اور اسے چاہیے کہ ہوشیاری سے کام کرے، اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے۔ (۱۹)

دو ثمر بار اور قیمتی باغوں کا مالک:

پہلی مثال ایک قصہ کی صورت میں پیش کی گئی ہے، یہ قصہ ایک ایسے شخص کا ہے جو انتہائی ثمر بار اور قیمتی باغوں کا مالک تھا، ان کے علاوہ مال و دولت کے حصول کے کئی دوسرے اسباب بھی اس کے لیے مہیا ہو گئے تھے، دولت کی کثرت نے اسے فخر اور غرور میں مبتلا کر دیا۔

وہ بڑے بڑے دعوے کرنے لگا، اسے یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ ثروت وغنا اسے ہمیشہ حاصل رہے گی اور اس پر کبھی بھی زوال نہیں آئے گا۔ اس کا خیال تھا کہ اول تو قیامت قائم ہی نہیں ہوگی اور اگر ہوئی بھی تو وہاں بھی مجھے خوشحالی حاصل رہے گی۔

دولت کی پٹی:

اس کے صاحب ایمان دوست نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اسباب کو خدا کا درجہ مت دو، انہیں سب کچھ نہ سمجھو اور اللہ کو ہرگز نہ بھولو، اس کائنات میں وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے لیکن دولت نے اس کی آنکھوں پر ایسی پٹی باندھ دی کہ سورج سے بھی زیادہ یہ روشن حقیقت اس کی سمجھ میں نہ آسکی۔

اللہ کا عذاب:

پھر اللہ کا عذاب آیا اور اس کے باغات جل کر کوئلہ ہو گئے، تباہی اور بربادی کے بعد وہ پچھتانے لگا کہ اے کاش! میں نے شرک نہ کیا ہوتا اور اسباب کو خدا کا درجہ نہ دیا ہوتا مگر اس کا پچھتاوا اس کے کسی کام نہ آیا۔

شرک فی الاسباب:

یہ بات واضح ہے کہ یہ شخص خدا کو مانتا تھا اور قیامت کا مبہم سا تصور بھی اس کے دل میں تھا اور یہ جو اس نے کہا کہ: اے کاش! میں نے شرک نہ کیا ہوتا'' تو اس سے مراد ''شرک فی الاسباب'' تھا یعنی اسباب ہی کو سب کچھ سمجھ لینا اور مسبب الاسباب کو بھول جانا۔

بے لاگ تجزیہ:

اگر بے لاگ تجزیہ کیا جائے تو ہم یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ غیر مسلم تو اس شرک میں مبتلا تھے ہی، بہت سارے مسلمان بھی اس شرک میں مبتلا ہو چکے ہیں، اس میں شک نہیں کہ اسباب کو اختیار کرنا ایمان اور توکل کے منافی نہیں، مگر اسباب کو موثر بالذات سمجھنا یقیناً ایمان کے منافی ہے۔

فرمابردار اور نافرمان کے درمیان فرق:

چنانچہ ارشاد ہے:

وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلًا رَّجُلَيۡنِ جَعَلۡنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيۡنِ مِنۡ اَعۡنَابٍ وَّحَفَفۡنٰهُمَا بِنَخۡلٍ
.....الی........هُوَ خَيۡرٌ ثَوَابًا وَّخَيۡرٌ عُقۡبًا ﴿۴۴﴾

اور (اے پیغمبر) ان لوگوں کے سامنے ان دو آدمیوں کی مثال پیش کرو۔ جن میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دو باغ دے رکھے تھے، اور ان کو کھجور کے درختوں سے گھیرا ہوا تھا، اور ان دونوں باغوں کے درمیان کھیتی لگائی ہوئی تھی۔ (۳۲) دونوں باغ پورا پورا پھل دیتے تھے، اور کوئی باغ پھل دینے میں کوئی کمی نہیں چھوڑتا تھا، اور ان دونوں کے درمیان ہم نے ایک نہر جاری کر دی تھی۔ (۳۳) اور اس شخص کو خوب دولت حاصل ہوئی تو وہ اپنے ساتھی سے باتیں کرتے ہوئے کہنے لگا کہ: میرا مال بھی تم سے زیادہ ہے، اور میرا جتھ بھی تم سے زیادہ مضبوط ہے۔ (۳۴) اور وہ اپنی جان پر ڈھاتا ہوا اپنے باغ میں داخل ہوا۔ کہنے لگا: میں نہیں سمجھتا کہ یہ باغ کبھی بھی تباہ ہوگا۔ (۳۵) اور میرا خیال یہ ہے کہ قیامت کبھی نہیں آئے گی، اور اگر کبھی مجھے اپنے رب کے پاس واپس بھیجا بھی گیا، تب بھی مجھے یقین ہے کہ مجھے اس سے بھی اچھی جگہ ملے گی۔ (۳۶) اس کے ساتھی نے اس سے باتیں کرتے ہوئے کہا: کیا تم اس ذات کے ساتھ کفر کا معاملہ کر رہے ہو جس نے تمہیں مٹی سے، اور پھر نطفے سے پیدا کیا، پھر تمہیں ایک بھلا چنگا انسان بنا دیا؟ (۳۷) جہاں تک میرا تعلق ہے، میں تو یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اللہ میرا پروردگار ہے، اور میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں مانتا۔ (۳۸) اور جب تم

اپنے باغ میں داخل ہو رہے تھے، اس وقت تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ! (جو اللہ چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے، اللہ کی توفیق کے بغیر کسی میں کوئی طاقت نہیں)۔ اگر تمہیں یہ نظر آ رہا ہے کہ میری دولت اور اولاد تم سے کم ہے۔(۳۹)

حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمہیں عرش اور جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ نہ بتاؤں؟ اور وہ ہے "لاحول ولاقوۃ الا باللہ"۔ یعنی برائی سے بچنے اور نیکی کرنے کی توفیق نہیں ہے جب تک اللہ نہ چاہے، ایک روایت میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر انعام کرے تو اسے یوں کہنا چاہیے "ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ"۔ یہ کلمات کہنے سے اللہ تعالیٰ اسے حوادثات اور پریشانیوں سے محفوظ رکھے گا، کیونکہ یہ بندہ اخلاص کے ساتھ عقیدہ توحید پر کاربند ہے اور سارے معاملات کو اللہ تعالیٰ کی طرف تفویض کرتا ہے، اللہ تعالیٰ پر توکل کا یہ کمال درجے کا کلمہ ہے، امام مالکؒ کا تو تکیہ کلام ہی یہ تھا "ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ" بعض کہتے ہیں کہ آپ نے اپنے مکان کی پیشانی پر یہ کلمہ کندہ کرایا ہوا تھا، کسی نے آپ سے کہا، حضرت! قرآن میں تو یہ کلمہ باغ کے بارے میں آیا ہے اور آپ نے اسے اپنے مکان پر لکھ دیا ہے، فرمایا: میرا یہ گھر اور میری اولاد میرا باغ ہی تو ہے، میں ان سب کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں، میں اس کی توحید کا قائل ہوں اور اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں۔ (معالم العرفان: ۱۲/ ۴۲۴)

دنیوی زندگی کی حقیقت:

دنیا کی بے ثباتی کے لئے ایک دوسری مثال بیان فرماتے ہیں تاکہ دنیا کی اندرونی حقیقت ظاہر ہو جائے اور لوگ اس کی ظاہری زیب و زینت کو دیکھ کر فریفتہ نہ ہوں اور اس کی ظاہری آرائش سے دھوکہ نہ کھائیں اور سمجھ جائیں کہ یہ دنیا ہیچ ہے۔ قابل فخر نہیں، قابل فخر اور قابل شکر باقیات صالحات یعنی اعمال صالحہ ہیں جن کے مقابلہ میں ساری دنیا کی آرائش اور زیبائش ہیچ ہے۔ دنیا تو خسیس ہے اگر نفیس کی خواہش ہے تو آخرت کی تیاری کریں اور آخرت کے لیے کوئی ذخیرہ اور خزینہ تیار کریں اور وہ خزانہ اعمال صالح کا ہے، دیکھ لو کہ ابلیس تکبر اور اپنی اصل پر غرور کی وجہ سے کیسا ذلیل وخوار ہو کر نکلا۔ اور آخر میں فرمایا کہ قوم عاد اور ثمود کی بستیوں کو دیکھ لیں کہ تکبر اور غرور کی وجہ سے کیسے ہلاک ہوئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ متکبرین ایک حقیر اور فانی چیز پر فخر کر رہے ہیں، حالانکہ ایک خسیس اور سریع الزوال چیز پر فخر کرنا نادانی ہے۔ پھر قیامت کے ہولناک منظر کو بیان کیا کہ اس دنیا کے فناء وزوال کے بعد جب قیامت قائم ہوگی تو اس وقت ایمان اور عمل صالح کام آئے گا۔ دنیا کی مال ودولت کچھ کام نہ آئے گی۔

(تفسیر ادریسی: ۴/ ۶۰۶)

چنانچہ فرماتے ہیں:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ ....الی........وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾

اوران لوگوں سے دنیوی زندگی کی یہ مثال بھی بیان کردو کہ وہ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا، تو اس سے زمین کا سبزہ خوب گھنا ہوگیا، پھر وہ ایسا ریزہ ریزہ ہوا کہ اسے ہوائیں اڑا لے جاتی ہیں اور اللہ ہر چیز پر مکمل قدرت رکھتا ہے۔(۴۵) مال اوراولاد دنیوی زندگی کی زینت ہیں،اور جو نیکیاں پائیدار رہنے والی ہیں، وہ تمہارے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں،اور امید وابستہ کرنے کے لیے بھی بہتر۔(۴۶) اور(اس دن کا دھیان رکھو) جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور تم زمین کو دیکھو گے کہ وہ کھلی پڑی ہے اور ہم ان سب کو گھیر کر اکٹھا کر دیں گے،اوران میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔(۴۷) اور سب کو تمہارے رب کے سامنے صف باندھ کر پیش کیا جائے گا۔آخر تم ہمارے پاس اسی طرح آ گئے جس طرح ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔اس کے برعکس تمہارا دعوی یہ تھا کہ ہم تمہارے لیے (یہ) مقرر وقت کبھی نہیں لائیں گے۔(۴۸) اور (اعمال کی) کتاب سامنے رکھ دی جائے گی؛ چنانچہ تم مجرموں کو دیکھو گے کہ وہ اس کے مندرجات سے خوف زدہ ہیں،اور کہہ رہے ہیں کہ: ہائے ہماری بربادی! یہ کیسی کتاب ہے جس نے ہمارا کوئی چھوٹا بڑا عمل ایسا نہیں چھوڑا جس کا پورا احاطہ نہ کرلیا ہو اور وہ اپنا سارا کیا دھرا اپنے سامنے موجود پائیں گے اور تمہارا پروردگار کسی پر کوئی ظلم نہیں کرے گا۔(۴۹)

زوال اور فنا میں دنیا کی زندگی:

یعنی زوال اور فنا میں دنیا کی زندگی اس بارش کی طرح ہے جو آسمان سے برستی ہے،اس کی وجہ سے پوری زمین سرسبز ہوجاتی ہے، فصلیں لہلہا اٹھتی ہیں، پھول کھل جاتے ہیں، ہر طرف خوشنما منظر دکھائی دیتے ہیں۔

کمال پر زوال:

پھر اس کمال پر زوال آتا ہے، پھول مرجھا جاتے ہیں، پتے جھڑنے لگتے ہیں، فصل کو کاٹ دیا جاتا ہے، اسے پیروں تلے روندا جاتا ہے، وہ چورا چورا ہو کر ہوا میں بکھر جاتی ہے۔

جاہل اور احمق دھوکے کا شکار:

یہ حال دنیا کی نعمتوں کا ہے جو کہ زوال پذیر ہیں۔صحت، جوانی، زندگی، خوشحالی اور عیش وعشرت کی ساری صورتیں عارضی ہیں، ان نعمتوں کی وجہ سے صرف جاہل اور احمق ہی دھوکے کا شکار ہوتے ہیں۔

اصحاب عقل:

اصحاب عقل جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ دنیا کی زندگی کا سامان اور زینت ہے، باقی رہنے والی اور ہمیشہ کی زندگی میں کام آنے والی چیزیں نیک اعمال ہیں:

صدقہ خیرات ہے، ذکر وتلاوت ہے، اچھے اخلاق ہیں اور بنی نوع انسان کی سچی ہمدردی ہے۔

تکبر اور غرور:

تکبر اور غرور کی مثال حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ابلیس کے قصہ میں بیان کیا گیا ہے۔

جب اس نے کبر وغرور کی وجہ سے اللہ کے حکم کے باوجود حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔اس کا خیال تھا کہ میں افضل ہوں اور یہ کیسے ممکن ہے کہ افضل مفضول کے سامنے سجدہ کرے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴿۵۰﴾

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ: آدم کے آگے سجدہ کرو۔ چنانچہ سب نے سجدہ کیا،سوائے ابلیس کے وہ جنات میں سے تھا، چنانچہ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔کیا پھر بھی تم میرے بجائے اسے اور اس کی ذریت کو اپنا رکھوالا بناتے ہو۔حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن ہیں؟ (اللہ تعالی کا) کتنا برا تبادل ہے جو ظالموں کو ملا ہے۔(۵۰)

بندگی کا تقاضہ:

اس قصہ کے ضمن میں انسان کو سمجھایا گیا ہے کہ وہ کبھی بھی فخر اور گھمنڈ میں مبتلا نہ ہو اور اللہ کے حکموں کے سامنے منطق نہ لڑائے کہ بندگی کا تقاضا انقیاد ہے نہ کہ حجت بازی اور انکار!

انسان کی غفلت اور سرکشی کے دوسبب:

انسان کی غفلت اور سرکشی کے دوسبب ہیں: ایک تو دنیا کی مال و دولت اور دوسرا سبب اغواء شیطانی ہے، مذکورہ آیت میں اس کا ذکر فرماتے ہیں اور بنی آدم (علیہ السلام) کو ابلیس کی عداوت پر آگاہ فرماتے ہیں کہ یہ تمہارا اور تمہارے باپ کا قدیمی دشمن ہے،اس سے ڈرتے رہنا اور بچتے رہنا۔(تفسیر ادریسی: ۴/ ۶۱۲)

حضرت موسی اور حضرت خضر علیہما السلام:

دوسرا قصہ حضرت موسی اور حضرت خضر علیہما السلام کا ہے، سیدنا موسی علیہ السلام کو جب اللہ کی طرف سے یہ اطلاع ہوئی کہ سمندر کے کنارے ایک ایسے صاحب رہتے ہیں جن کے پاس ایسا علم ہے جو آپ کے پاس نہیں تو آپ ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، چلتے چلتے آپ سمندر کے کنارے پہنچ گئے، یہاں آپ کی ملاقات حضرت خضر علیہ السلام سے ہوئی اور آپ نے ان سے ساتھ رہنے کی اجازت مانگی، انہوں نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ آپ کوئی سوال نہیں کریں گے، پھر تین عجیب واقعات پیش آئے۔

(۱) پہلے واقعہ میں حضرت خضر علیہ السلام نے اس کشتی کو پھاڑ ڈالا جس کے مالکان نے انہیں کرایہ لیے بغیر بٹھالیا تھا۔

(۲) دوسرے واقعہ میں ایک معصوم بچے کو قتل کر دیا۔

(۳) تیسرے واقعہ میں ایک ایسے گاؤں میں گرتی ہوئی بوسیدہ دیوار کی تعمیر شروع کر دی، جس گاؤں والوں نے انہیں کھانا تک کھلانے سے انکار کر دیا تھا۔حضرت موسی علیہ السلام تینوں مواقع پر خاموش نہ رہ سکے اور بول پڑے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تیسرے سوال کے بعد حضرت خضر علیہ السلام نے جدائی کا اعلان کر دیا کہ اب آپ میرے ساتھ نہیں

چل سکتے۔ البتہ تینوں واقعات کی اصل حقیقت انہوں نے آپ کے سامنے بیان کر دی، فرمایا کہ:

کشتی کا تختہ اس لیے توڑا تھا کیونکہ آگے ایک ظالم بادشاہ کے کارندے کھڑے تھے جو ہر سالم اور نئی کشتی زبردستی چھین رہے تھے۔ جب میں نے اسے عیب دار کر دیا تو یہ اس ظالم کے قبضے میں جانے سے بچ گئی، یوں ان غریبوں کا ذریعہ معاش محفوظ رہا۔

بچے کو اس لیے قتل کیا کیونکہ یہ بڑا ہو کر والدین کے لیے بہت بڑا فتنہ بن سکتا تھا جس کی وجہ سے ممکن تھا وہ انہیں کفر کی نجاست میں مبتلا کر دیا، جب کہ اللہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے انتہائی نیک والدین محض اس کی محبت میں ایمان سے محروم ہو جائیں۔ اس لیے اللہ نے اسے مارنے کا اور اس کے بدلے انہیں باکردار اور محبت واطاعت کرنے والی اولاد دینے کا فیصلہ فرمایا۔

گرتی ہوئی دیوار اس لیے تعمیر کی کیونکہ وہ دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی، ان کے والدین اللہ کے نیک بندے تھے، دیوار کے نیچے خزانہ پوشیدہ تھا، اگر وہ دیوار گر جاتی تو لوگ خزانہ لوٹ لیتے اور نیک والدین کے یہ دو یتیم بچے اس سے محروم ہو جاتے، ہم نے اس دیوار کو تعمیر کر دیا، تاکہ جوان ہونے کے بعد وہ اس خزانے کو نکال کر اپنے کام میں لا سکے۔

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے واقعہ سے سبق:

حضرت موسیٰ اور حضرت خضرؑ کے واقعہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمارے سامنے شب وروز جو واقعات پیش آتے ہیں:

◇ کسی کو جوانی یا بچپن میں موت آجاتی ہے۔

◇ کوئی کسی حادثہ کا شکار ہو کر زخمی ہو جاتا ہے۔

◇ کسی کی عمارت گر جاتی ہے۔

◇ کسی کا چلتا ہوا کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے۔

تو ان تمام واقعات کے پس پردہ بڑی عجیب وغریب حکمتیں اور حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں۔

دنیا کا ظاہر و باطن:

اس دنیا کے ظاہر اور باطن میں بڑا اختلاف ہے۔ انسان کی نظر ظاہر میں الجھی رہتی ہے اور باطنی رازوں کے ادراک سے اس کی عقل قاصر رہ جاتی ہے۔

مادیت کے علمبرداروں کی تردید:

یہ قصہ مادیت کے ان علمبرداروں کی تردید کرتا ہے جو ظاہر ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور اس کے پس پردہ کسی حکیم وخبیر کی حکمت کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

تہذیب انسانی:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف مثالیں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ فطرت انسانی کی اصلاح ہو جائے اور نہ اس وقت

تک ممکن نہیں، جب تک انسان کفر، شرک، ظلم اور بداخلاقی سے باز نہ آجائے، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں، کہ اگر انسان کے باطن میں شرک کی نجاست موجود ہے تو نئے اور اچھے کپڑے پہننے کا کیا فائدہ؟ آپ نے یہ بھی فرمایا" **اذا اخرجت زور دخل نور** " انسان کی فطرت میں اس وقت تک نور داخل نہیں ہوتا جب تک کہ اس سے جھوٹ خارج نہیں ہوجاتا، گویا انسان کی تہذیب اور شائستگی اس وقت ممکن ہوگی جب اس سے شرک، ظلم اور بداخلاقی دور ہوجائے گی، اس سلسلہ میں قرآن پاک انسان کی راہنمائی کرتا ہے کہ انسان کس طرح مہذب بن سکتا ہے۔ (معالم العرفان: ۱۲/ ۴۵۲)

اللہ تعالیٰ کے نظام کی عجیب وغریب مثال:

قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آزمائش کے لیے روح اور اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق جو سوالات کیے تھے وہ یہود کے بتلانے اور سمجھانے سے کئے تھے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان باتوں کا جواب دے دیں تو جانو کہ وہ نبی ہیں ورنہ نہیں، اس لئے یہود کے سنانے کے لیے موسیٰؑ اور خضرؑ کا قصہ بیان فرماتے ہیں، تاکہ معلوم کریں کہ نبی کے لیے یہ شرط نہیں کہ اس کو سب چیزیں معلوم ہوں اور وہ تمام اخبار اور قصص کا عالم ہو بلکہ نبوت کے لیے وحی اور علوم ہدایت کی معرفت ضروری ہے۔ چنانچہ موسیٰؑ باوجود کلیم ہونے کے ان علوم سے واقف نہ تھے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت خضرؑ کو عطا کیے تھے، اس لئے حضرت موسیٰؑ نے خضرؑ کی ملاقات کے لیے سفر کیا تاکہ وہ ان سے علوم حاصل کریں جو اللہ تعالیٰ نے خاص ان کو عطا کئے ہیں معلوم ہوا کہ نبی اور رسول کے لیے تمام علوم کا عالم ہونا اور تمام واقعات اور قصص سے باخبر ہونا اور ہر قسم کے علم سے واقف ہونا ضروری نہیں، البتہ نبی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان علوم ہدایت سے پوری طرح باخبر ہو جن کو رضائے خداوندی اور قرب خداوندی اور امت کی اصلاح اور تربیت میں دخل ہو اور اللہ تعالیٰ نے حضرت خضرؑ کو جو علم دیا وہ اس قسم کا نہ تھا بلکہ دوسری قسم کا تھا، اس قسم کے علوم میں خضرؑ موسیٰؑ سے بڑھ کر تھے مگر عند اللہ افضلیت اور تقرب کا دارومدار علوم ہدایت اور علوم شریعت پر ہے، ان علوم میں موسیٰؑ سب سے اعلیٰ اور افضل اور سب سے بالا اور برتر تھے، ان علوم میں روئے زمین پر ان سے بڑھ کر کوئی نہ تھا۔

موسیٰؑ ایک بار بنی اسرائیل میں وعظ فرما رہے تھے، تو کسی نے پوچھا کہ اس وقت آدمیوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ حضرت موسیٰؑ نے کہا "میں"، مطلب یہ تھا کہ جن علوم کو ہدایت اور قرب الٰہی کے حصول میں دخل ہے ان علوم میں کوئی میرے برابر نہیں اور یہ کلام باعتبار معنی اور مقصود کے صحیح تھا، کیونکہ آپؑ اللہ کے اولوالعزم رسول تھے اور کلیم اللہ تھے اور صاحب تورات تھے اور صاحب معجزات عظیمہ تھے، اس وقت روئے زمین پر آپؑ سے بڑھ کر کسی کو علوم ہدایت کی معرفت حاصل نہ تھی۔ مگر لفظ ظاہراً مطلق تھا، مقام رسالت کے مناسب یہ تھا کہ علی الاطلاق اپنے کو سب سے بڑا عالم نہ کہتے، سب سے زیادہ علم کی نسبت خداوند ذوالجلال کی طرف مناسب تھی، مقربین کی ادنیٰ سے ادنیٰ اور معمولی سے معمولی بات پر بھی باز پرس ہوجاتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اپنے برگزیدہ بندے کو احتیاط فی الکلام کی تعلیم دی جائے،

موسیٰؑ کا جواب اگر چہ باعتبار معنی اور مقصود کے صحیح تھا لیکن حق تعالیٰ کو یہ الفاظ پسند نہ آئے، اس لئے کہ جواب کے ظاہری عموم اور اطلاق سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ روئے زمین پر من کل الوجوہ موسیٰؑ اعلم الناس ہیں، اس لئے بغرض تادیب وتنبیہ یہ ارشاد ہوا کہ ہمارا ایک بندہ مجمع البحرین میں ہے وہ تم سے زیادہ علم رکھتا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ بعض علوم میں وہ تم سے زیادہ ہے، گو ان علوم کو قرب الٰہی اور رضائے خداوندی کے حصول میں دخل نہ ہو۔ لہٰذا سائل کے جواب میں اپنے کو مطلقاً اعلم الناس کہنا مناسب نہ تھا، بلکہ مناسب یہ تھا کہ جواب کو خدا تعالیٰ کے علم محیط پر محول کرتے اور کہتے کہ اللہ اعلم کہ اللہ ہی سب سے زیادہ جاننے والا ہے، اللہ کے بہت سے مقبول اور مقرب بندے ہیں، سب کی خبر اس کو ہے اور اسی کو معلوم ہے کہ اس نے اپنے خزانہ غیب میں سے کس کو کون سا علم عطا کیا ہے، فوق کل ذی علم علیم۔

حق جل شانہ نے حضرت موسیٰؑ کو اس سہو اور نسیان پر متنبہ فرمایا اور خضرؑ کے پاس جانے کا حکم دیا۔ موسیٰؑ اس ارشاد خداوندی کو سن کر ان سے ملنے کے مشتاق ہوئے اور پوچھا کہ ان سے ملنے کی کیا صورت ہے؟ ارشاد ہوا کہ مجمع البحرین یعنی روم اور فارس کے دوسمندر آپس میں ملتے ہیں وہاں پتھر کے پاس میرا ایک نیک بندہ ہے جو تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے، ہم نے اس کو ایک خاص علم دیا ہے، جا کر اس سے ملو اور ناشتہ کے لیے ایک مچھلی تل کر اپنے زنبیل میں رکھ لو اور روانہ ہو جاؤ، جہاں وہ مچھلی گم ہو جائے وہیں تم کو ہمارا وہ بندہ ملے گا۔ چنانچہ موسیٰ (علیہ السلام) نے ایک مچھلی بھنوا کر زنبیل میں رکھ لی اور یوشع بن نون کو اپنے ساتھ لے کر مجمع البحرین روانہ ہوئے۔ (تفسیر ادریسی: ۴/ ۶۱۸)

چنانچہ فرماتے ہیں:

وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبۡرَحُ حَتّٰۤی اَبۡلُغَ مَجۡمَعَ الۡبَحۡرَیۡنِ اَوۡ اَمۡضِیَ حُقُبًا۞..... الیٰ......... ذٰلِكَ تَاۡوِیۡلُ مَا لَمۡ تَسۡطِعۡ عَّلَیۡهِ صَبۡرًا○

اور (اس وقت کا ذکر سنو) جب موسی نے اپنے نوجوان (شاگرد) سے کہا تھا کہ: میں اس وقت تک اپنا سفر جاری رکھوں گا جب تک دوسمندروں کے سنگھم پر نہ پہنچ جاؤں، ورنہ برسوں چلتا رہوں گا۔ (۶۰) چنانچہ جب وہ ان کے سنگھم پر پہنچے تو دونوں اپنی مچھلی کو بھول گئے، اور اس نے سمندر میں ایک سرنگ کی طرح کا راستہ بنا لیا۔ (۶۱) پھر جب دونوں آگے نکل گئے، تو موسی نے اپنے نوجوان سے کہا کہ: ہمارا ناشتہ لاؤ، سچی بات یہ ہے کہ ہمیں اس سفر میں بڑی تھکاوٹ لاحق ہو گئی ہے۔ (۶۲) اس نے کہا: بھلا بتایئے! (عجیب قصہ ہو گیا) جب ہم اس چٹان پر ٹھہرے تھے تو میں مچھلی (کا آپ سے ذکر کرنا) بھول گیا۔ اور شیطان کے سوا کوئی نہیں ہے جس نے مجھ سے اس کا تذکرہ کرنا بھلایا ہو، اور اس (مچھلی) نے تو بڑے عجیب طریقے پر دریا میں اپنی راہ لے لی تھی۔ (۶۳) موسی نے کہا: اسی بات کی تو ہمیں تلاش تھی؛ چنانچہ دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے واپس لوٹے۔ (۶۴) تب انہیں ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ ملا جس کو ہم نے اپنی خصوصی رحمت سے نوازا تھا، اور خاص اپنی طرف سے ایک علم سکھایا تھا۔ (۶۵) موسی نے ان سے کہا: کیا میں آپ کے

ساتھ اس غرض سے رہ سکتا ہوں کہ آپ کو بھلائی کا جو علم عطا ہوا ہے، اس کا کچھ حصہ مجھے بھی سکھا دیں؟ (٦٦) انہوں نے کہا: مجھے یقین ہے کہ آپ میرے ساتھ رہنے پر صبر نہیں کر سکیں گے۔ (٦٧) اور جن باتوں کی آپ کو پوری پوری واقفیت نہیں ہے، ان پر آپ صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں؟ (٦٨) موسیٰ نے کہا: ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے، اور میں آپ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ (٦٩) انہوں نے کہا: اچھا! اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو جب تک میں خود ہی آپ سے کسی بات کا تذکرہ شروع نہ کروں، آپ مجھ سے کسی بھی چیز کے بارے میں سوال نہ کریں۔ (٧٠) چنانچہ دونوں روانہ ہوگئے، یہاں تک کہ جب دونوں ایک کشتی میں سوار ہوئے تو ان صاحب نے کشتی میں چھید کر دیا۔ موسیٰ بولے: ارے کیا آپ نے اس میں چھید کر دیا تاکہ سارے کشتی والوں کو ڈبو ڈالیں؟ یہ تو آپ نے بڑا خوفناک کام کیا۔ (٧١) انہوں نے کہا: کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکیں گے؟ (٧٢) موسیٰ نے کہا: مجھ سے جو بھول ہوگئی، اس پر میری گرفت نہ کیجیے، اور میرے کام کو زیادہ مشکل نہ بنائیے۔ (٧٣) وہ دونوں پھر روانہ ہوگئے، یہاں تک کہ ان کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی تو ان صاحب نے اسے قتل کر ڈالا، موسیٰ بول اٹھے: ارے کیا آپ نے ایک پاکیزہ جان کو ہلاک کر دیا، جبکہ اس نے کسی کی جان نہیں لی تھی، جس کا بدلہ اس سے لیا جائے؟ یہ تو آپ نے بہت ہی برا کام کیا۔ (٧٤) انہوں نے کہا: کیا میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ رہنے پر صبر نہیں کر سکیں گے؟ (٧٥) موسیٰ بولے: اگر اب میں آپ سے کوئی بات پوچھوں تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیے۔ یقیناً آپ میری طرف سے عذر کی حد کو پہنچ گئے ہیں۔ (٧٦) چنانچہ وہ دونوں پھر روانہ ہوگئے، یہاں تک کہ جب ایک بستی والوں کے پاس پہنچے تو اس کے باشندوں سے کھانا مانگا تو ان لوگوں نے ان کی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انہیں وہاں ایک دیوار ملی جو گرنا ہی چاہتی تھی، ان صاحب نے اسے کھڑا کر دیا۔ موسیٰ نے کہا: اگر آپ چاہتے تو اس کام پر کچھ اجرت لے لیتے۔ (٧٧) انہوں نے کہا: لیجیے میرے اور آپ کے درمیان جدائی کا وقت آ گیا۔ اب میں آپ کو ان باتوں کا مقصد بتائے دیتا ہوں جن پر آپ سے صبر نہیں ہوسکا۔ (٧٨) جہاں تک کشتی کا تعلق ہے وہ کچھ غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں مزدوری کرتے تھے، میں نے چاہا کہ اس میں کوئی عیب پیدا کر دوں، (کیونکہ) ان کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر (اچھی) کشتی کو زبردستی چھین کر رکھ لیا کرتا تھا۔ (٧٩) اور لڑکے کا معاملہ یہ تھا کہ اس کے ماں باپ مومن تھے، اور ہمیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ یہ لڑکا ان دونوں کو سرکشی اور کفر میں نہ پھنسا دے۔ (٨٠) چنانچہ ہم نے یہ چاہا کہ ان کا پروردگار انہیں اس لڑکے کے بدلے ایسی اولاد دے جو پاکیزگی میں بھی اس سے بہتر ہو، اور حسن سلوک میں بھی اس سے بڑھی ہوئی ہو۔ (٨١) رہی یہ دیوار، تو وہ اس شہر میں رہنے والے دو یتیم لڑکوں کی تھی، اور اس کے نیچے ان کا ایک خزانہ گڑا ہوا تھا، اور ان دونوں کا باپ ایک نیک آدمی تھا۔ اس لیے آپ کے پروردگار نے یہ چاہا کہ یہ دونوں لڑکے اپنی جوانی کی عمر کو پہنچیں، اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ یہ سب کچھ آپ کے رب کی رحمت کی بنا پر ہوا ہے، اور میں نے کوئی کام اپنی رائے سے نہیں کیا۔ یہ تھا

مقصد ان باتوں کا جن پر آپ سے صبر نہیں ہو سکا۔(۸۲)

حضرت موسیٰؑ کے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایسے مقبول بزرگ کوئی حرکت خلاف شریعت کریں گے، اسی لئے انہوں نے مطیع رہنے کی حامی بھر لی، گویا کہ ان کا وعدہ یہ تھا کہ امور مباح میں آپ کا ساتھ دیتا رہوں گا، اس پر بھی اتنی احتیاط رکھی کہ لفظ ان شاء اللہ ملائی جس سے اقرار عہد و پیمان پیدا نہیں ہونے پایا اور اس لئے ان دونوں باتوں کی بناء پر آیندہ نقض عہد کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

آیت سے استنباط کیا گیا ہے کہ متعلم کے لئے پہلی چیز یہ ہے کہ استاد کے احکام کی اطاعت اور اس پر ترک اعتراض ومخالفت کی عادت اختیار کرے اور اپنی طرف سے انتہائی فروتنی اور تذلل برتے۔

سارے قصہ سے ظاہر ہے کہ پیغمبر کے لئے شرط علوم متعلقہ نبوت سے اطلاع ہے نہ کہ تمام علوم سے۔ حضرت موسیٰؑ نے اس علم سے جس کے لئے اتنا بڑا سفر کیا تھا اور جس کے سیکھنے کے لئے اس شوق سے آئے تھے دست برداری گوارا کر لی، مگر یہ گوارا نہ کیا کہ خلاف منصب نبوت ایسے منکر افعال پر (ان کے منشائے باطن کچھ بھی سہی) سکوت گوارا کر لیں۔ اسی لئے محققین کا بالاتفاق فیصلہ ہے کہ کوئی شغل، کوئی کسب اپنے آثار روحانی و لطائف نورانی کے لحاظ سے کیسا ہی مزکی نفس و مجلی قلب ہو، اگر احکام شریعت ظاہری کے خلاف ہوگا؛ ہرگز جائز و حلال نہیں۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ ایسے مغیبات پر مطلع ہو جانا یا ان کا منکشف ہو جانا مقاصد میں سے نہیں، چنانچہ موسیٰؑ باوجود اس کے کہ قطعی نبی اور اولوالعزم اور اہل شرع مستقل ہونے سے خضرؑ سے اکمل تھے۔ پھر بھی ان واقعات سے محتجب رہے۔(ماجدی: ۴/۱۳۹،۱۴۹)

تیسرا واقعہ ذوالقرنین کا ہے لیکن اسے ان شاء اللہ ہم سولہویں پارہ کے اہم مضامین میں ذکر کریں گے۔(خلاصۃ القرآن: م اش)

خلاصہ سورۃ......تمہید کے بعد انسان کی چار قسم کی زندگی کی تمثیل ہے، اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہر شعبہ زندگی میں تعلق باللہ درست ہونے پر اصلی عزت اور پوری راحت نصیب ہوتی ہے۔

اقسام زندگی......(۱) ادنی درجہ کا دیندار۔(مثال) اصحاب کہف۔ رکوع: ۱ سے ۴ تک۔

(۲) ادنی درجہ کا دنیادار۔(مثال) اصحاب الجنتین۔ رکوع: ۵ سے ۸ تک۔

(۳) اعلی درجہ کا دیندار۔(مثال) حضرت موسی علیہ السلام۔ رکوع: ۱۰،۹۔

(۴) اعلی درجہ کا دنیادار۔(مثال) ذوالقرنین۔ رکوع: ۱۲،۱۱۔

خلاصہ رکوع: ۱......(۱) تمہید۔(۲) اصحاب الکہف کا کہف میں چھپنا۔(۳) اور اٹھنا۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۔(۲) آیت: ۱۰۔(۳) آیت: ۱۲۔

خلاصہ رکوع: ۲......اصحاب کہف کے چھپنے کا سبب توحید پرستی تھی۔ ماخذ آیت: ۱۶۔

خلاصہ رکوع: ۳......(۱) اٹھنے کے بعد ایک کو طعام خریدنے کے لئے بھیجنا۔(۲) لوگوں کا اطلاع پانا کہ اس پر قیاس کر کے قیامت کے قائل ہوں۔ ماخذ: (۱) آیت:۱۹۔(۲) آیت:۲۰۔

خلاصہ رکوع: ۴......غار میں سوکر اٹھنے کی میعاد تین سو نو سال تھی۔ ماخذ: آیت:۲۵۔

خلاصہ رکوع: ۵......(۱) ایک توحید پرست کا دو باغوں والے مشرک ساتھی کو تبلیغ کرنا۔(۲) باغ کی تباہی کے بعد مشرک کی ندامت۔ ماخذ: (۱) آیت: ۳۷، ۳۸۔(۲) آیت: ۴۲۔

خلاصہ رکوع:۶......تتمہ مضمون سابق، اعمال صالحہ کے مقابلہ میں متاع دنیا کی بے حقیقتی۔ ماخذ: آیت:۴۶، ۴۵۔

خلاصہ رکوع : ۷......تعلق باللہ توڑنے والے مشرک اپنے دشمن شیطان کے ساتھ رشتہ جوڑ رہے ہیں ۔ ماخذ: آیت:۵۰۔

خلاصہ رکوع:۸......رب کے بلاوے پر بھی جو شخص اس سے تعلق نہ جوڑے اس سے بڑھ کر اور کون بدنصیب ہے۔ ماخذ: آیت: ۵۷۔

خلاصہ رکوع:۹......(۱) موسیٰ علیہ السلام کا خضر علیہ السلام کی ملاقات کے لئے سفر کرنا۔(۲) اور ملاقات کے بعد شرائط استفادہ کا طے پانا۔ ماخذ: (۱) آیت: ۶۰۔(۲) آیت: ۶۶ تا ۷۰۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

پندرہویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) رسول اللہ ﷺ کو معراج جاگنے کی حالت میں روح اور جسم دونوں کے ساتھ کرائی گئی تھی۔

(۲) تین مساجد کو تمام مساجد پر شرف و بزرگی حاصل ہے: مسجد حرام، مسجد اقصی اور مسجد نبوی۔

(۳) رات اور دن دونوں نشانیاں ہیں، جو دلالت کرتی ہیں اللہ تعالی کے علم، قدرت اور اس کی تدبیر پر۔

(۴) دونوں دارین کی سعادت وشقاوت کا مدار انسان کے کسب اور عمل پر ہے، یہ ہی سنت اللہ ہے۔

(۵) جو اللہ تعالی عطا فرمائیں اس کو کوئی روک نہیں سکتا، بس واجب ہے کہ اللہ پر توکل کیا جائے اور ماسواء سے اعراض کیا جائے۔

(۶) ضروری ہے رشتہ داروں کے حقوق کا خیال رکھنا نیکی اور صلہ رحمی کے ساتھ۔

(۷) کسی کی اتنی ہی تعریف کرنا چاہئے جتنی تعریف کے وہ لائق ہے، ورنہ خالی تعریف جھوٹ ہے۔

(۸) شرک اور کفر پر موت قیامت کے دن ہمیشہ کی کامیابی سے مانع ہے۔

(۹) آداب میں سے یہ ہے کہ بندے کو یوں نہیں کہنا چاہئے کہ میں عنقریب یہ کام کردوں گا بلکہ اس کے ساتھ ان شاء اللہ بھی کہنا چاہئے۔

(۱۰) کبر اور غرور یہ دونوں کفر اور شرک تک پہنچا دیتے ہیں۔

***

پارہ:۱۶

سولہویں پارہ کی ابتدائی آیات میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے قصہ کا بقیہ ذکر کیا گیا ہے، اس کے بعد ذوالقرنین کا قصہ مذکور ہے۔

شروع سورت میں اصحاب کہف کا قصہ ذکر فرمایا جو قریش کے دوسرے سوال کا جواب تھا۔ اب اخیر سورت میں ذوالقرنین کا قصہ ذکر فرماتے ہیں جو قریش کے تیسرے سوال کا جواب ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذوالقرنین ایک عادل اور نیک دل بادشاہ تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے مشرق سے مغرب تک کی حکمرانی اور فرمانروائی عطا کی تھی اور روئے زمین کے تمام بادشاہ اس کے زیر فرمان تھے، ظاہر میں وہ بادشاہ تھا مگر باطنی طور پر وہ اصحاب کہف سے زیادہ فقیر اور درویش تھا، بادشاہت اور ولایت، امیری اور فقیری دونوں کا جامع تھا۔

علماء شریعت یہ کہتے ہیں کہ ذوالقرنین کو ذوالقرنین اس لیے کہا گیا کہ وہ دنیا کے دونوں کناروں (مشرق ومغرب) پر پہنچ گیا اور مشرق سے لیکر مغرب تک دنیا کا فرماں روا اور بادشاہ بنا اور اولیائے طریقت یہ کہتے ہیں کہ اس کو ذوالقرنین اس لیے کہا گیا کہ اس کو علم ظاہری اور علم باطنی دونوں عطا کیے گئے تھے۔ (فتح الباری وعمدۃ القاری)

اصحاب کہف، کافر وظالم فرماں روا سے بھاگ کر پہاڑ کی غار میں جا کر چھپے اور ذوالقرنین یاجوج ماجوج جیسے ظالموں اور مفسدوں کو پہاڑ کے پیچھے دھکیل کر آہنی دیوار قائم کر رہا تھا کہ کوئی کافر اور ظالم اور فتنہ پرداز ملک میں داخل ہو کر فتنہ وفساد برپا نہ کر سکے۔ اصحاب کہف کافروں اور ظالموں سے ڈر کر غار میں جا کر چھپے اور ذوالقرنین جیسا بادشاہ مشرق سے لے کر مغرب تک کافروں اور ظالموں کو دھمکاتا ہوا چلا گیا۔

ذوالقرنین کا یہ قصہ جس طرح اس کی سلطنت اور شان وشوکت کے بیان پر مشتمل ہے، اسی طرح اس کی کرامتوں اور خارق عادت کارناموں کے بیان پر بھی مشتمل ہے جو اس کے ولی کامل ہونے کے دلائل ہیں، ذوالقرنین فرشتہ تو نہ تھا بلکہ فرشتہ صفت انسان تھا، جن کو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی قوت اور قدرت کا ایک نمونہ بنایا تھا۔

ذوالقرنین ابراہیم علیہ السلام کا ہم عصر تھا۔ ان پر ایمان لایا تھا، ان کے صحابہ میں سے تھا۔ خانہ کعبہ کے سامنے ان سے ملا اور مصافحہ کیا اور دعا کی درخواست کی، ان کی دعا کی برکت سے مشرق ومغرب کے سفر اس پر آسان ہو گیا اور خارق عادت اور محیر العقول فتوحات پر اس کو قدرت حاصل ہوئی اور خضر علیہ السلام اس کے وزیر باتدبیر یا امیر لشکر تھے اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو بادشاہت کے ساتھ علم وحکمت بھی عطا فرمائی اور ہیبت کا لباس پہنایا کہ تمام روئے زمین کے بادشاہ ان کے تابع تھے اور اس سے ڈرتے تھے۔ قریش نے یہود کی تلقین سے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ وہ کون سا

بادشاہ ہے جس نے مشرق ومغرب کا سفر کیا اور اس کا قصہ کیا ہے؟ ان آیات میں ان کے سوال کے جواب میں ذوالقرنین کا قصہ بیان فرمایا کہ وہ ایک بادشاہ تھا اور مرد صالح تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے مشرق ومغرب کی حکومت اور خارق عادت شان و شوکت سے نوازا تھا اور ہر طرح کے ساز وسامان اس کے لیے مہیا کر دیئے تھے، جیسا کہ ارشاد ہے:

انا مکنا له فی الارض و اٰتینٰه من کل شیء سببا جس طرح اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا تھا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کے لیے اقطار ارض اور جوانب عالم کو مسخر کر دیا تھا اور تمام راستوں کا علم اس کو عطا کر دیا تھا۔ (عمدۃ القاری وزاد المیسر)

روایت کیا گیا کہ چار آدمی تمام روئے زمین کے بادشاہ ہوئے جن میں سے دو مومن تھے اور دو کافر تھے، دو مومن ذوالقرنین اور سلیمان علیہ السلام تھے اور دو کافر بخت نصر اور نمرود تھے، اور پانچواں فرمانروا امام مہدی علیہ السلام ہیں جو اخیر زمانہ میں ظاہر ہوں گے اور تمام روئے زمین کے بادشاہ ہوں گے، پہلے چار بادشاہ امم سابقہ میں سے تھے اور پانچویں بادشاہ امت محمدیہ ﷺ میں سے یعنی (امام مہدی علیہ السلام) ہوں گے۔ **لیظھرہ علی الدین کله**۔

گزشتہ قصہ میں طلب علم کے لیے سفر کا بیان تھا، اب اس قصہ میں انتظام مملکت اور قیام معدلت اور مغرورین و متکبرین اور مفسدین کی سرکوبی کے لیے سفر کا بیان ہے؛ تاکہ معلوم ہو جائے کہ بادشاہ کامل وہ ہے جو خدا کے ماننے والوں کے ساتھ نرمی کرے اور ظالموں اور مفسدوں کو سزا دے۔ (تفسیر ادریسی: ۵/ ۱۴-۱۶)

چنانچہ فرماتے ہیں:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝۸۳

اور یہ لوگ تم سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ: میں ان کا کچھ حال تمہیں پڑھ کر سناتا ہوں۔ (۸۳)

اجتماعی نظام کے لیے ضروری بات:

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اجتماعی نظام کے لیے ضروری ہے کہ اچھے لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے اور بدمعاشوں کی سرکوبی کی جائے، اگر ایسا نہیں ہوگا تو نظام سلطنت بگڑ جائے گا اور ملک میں بدامنی پیدا ہو جائے گی، البتہ انگریزی قانون میں اس اصول کی پابندی نہیں کی جاتی، وہاں تو مفاد کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ کس طرف ہے؟ بعض اوقات مفاد کی خاطر غنڈوں کو بھی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں فتنہ وفساد کا بازار گرم ہے، اسی لیے ذوالقرنین نے کہا کہ ہم ہر ظالم کو اس کے ظلم کی سزا دیں گے۔ (معالم العرفان: ۱۲/ ۵۱۵)

ذوالقرنین کی شخصیت:

ذوالقرنین کی شخصیت میں مفسرین کا اختلاف ہے۔

◇ بہت سے حضرات سکندر مقدونی کو ذوالقرنین قرار دیتے ہیں۔لیکن صحیح بات یہ ہے کہ سکندر کو ذوالقرنین قرار دینا مشکل ہے، کیونکہ یہ شخص ایمان اور خوف خدا سے خالی تھا۔

◇ جبکہ قرآن نے جس شخص کا ذکر کیا ہے وہ صرف وسائل واسباب رکھنے والا بادشاہ ہی نہیں تھا؛ بلکہ اس کے اندر ایمانی صفات بھی پائی جاتی تھیں اور اس نے ظالم و جابر بادشاہوں کے برخلاف اللہ کے دیے ہوئے وسائل کو صرف انسانیت کی خدمت اور قیام عدل کے لیے استعمال کیا۔

◇ بعض حضرات نے سکندر کے علاوہ دوسرے کئی بادشاہوں کو قرآن کا ذوالقرنین قرار دینے کی کوشش کی ہے،لیکن اگر کسی شخصیت کا تعین نہ بھی ہو سکے تو بھی اس مقام کے سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی ، کیونکہ قرآن کا مقصود تاریخی تفصیلات ، جزئیات اور شخصیات کا ذکر کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصود قصہ سے پیدا ہونے والی عبرت اور نصیحت کو اپنے قارئین کی طرف منتقل کرنا ہے۔

◇ قرآن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ذوالقرنین کو اللہ تعالی نے مادی قوت بھی عطا کی تھی اور روحانی اور ایمانی طاقت بھی اسے حاصل تھی،اس کی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع تھا،وہ ایک طرف مشرق کے آخری کنارے اور دوسری طرف مغرب کے انتہائی سرے تک پہنچ گیا تھا۔

مضبوط دیوار کی فتوحات:

اپنی فتوحات کے زمانے میں اس کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو پہاڑوں کے درمیان آباد تھی اور ہمیشہ ایک وحشی قوم کے حملوں کا نشانہ بنتی تھی، جسے قرآن نے یاجوج ماجوج کا نام دیا ہے،اس مظلوم قوم کی درخواست پر ذوالقرنین نے ایک ایسی مضبوط دیوار تعمیر کر دی جس کی وجہ سے وہ یاجوج ماجوج کی یورش اور حملوں سے محفوظ ہو گئے۔(خلاصۃ القرآن:م اش)

ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج کا قصہ:

قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ..... الیٰ..........فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّيْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾

انہوں نے کہا:اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج اس زمین میں فساد پھیلانے والے لوگ ہیں۔تو کیا ہم آپ کو کچھ مال کی پیش کش کر سکتے ہیں،جس کے بدلے آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی دیوار بنا دیں؟ (۹۴) ذوالقرنین نے کہا: اللہ نے مجھے جو اقتدار عطا فرمایا ہے،وہی (میرے لیے) بہتر ہے۔لہذا تم لوگ (ہاتھ پاؤں کی) طاقت سے میری مدد کرو،تو میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنا دوں گا۔(۹۵) مجھے لوہے کی چادریں لا دو، یہاں تک کہ جب انہوں نے (درمیانی خلا کو پاٹ کر) دونوں پہاڑی سروں کو ایک دوسرے سے ملا دیا تو کہا کہ:اب آگ دہکاؤ، یہاں تک کہ جب اس (دیوار) کو لال انگارا کر دیا تو کہا کہ: پگھلا ہوا تانبا لاؤ،اب میں اس پر انڈیلوں گا۔(۹۶) چنانچہ (وہ

دیوار ایسی بن گئی کہ) یاجوج ماجوج نہ اس پر چڑھنے کی طاقت رکھتے تھے، اور نہ اس میں کوئی سوراخ بنا سکتے تھے ۔ (۹۷) ذوالقرنین نے کہا: یہ میرے رب کی رحمت ہے (کہ اس نے ایسی دیوار بنانے کی توفیق دی) پھر میرے رب نے جس وقت کا وعدہ کیا ہے جب وہ وقت آئے گا تو وہ اس (دیوار) کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دے گا، اور میرے رب کا وعدہ بالکل سچا ہے۔ (۹۸) اور اس دن ہم ان کی یہ حالت کر دیں گے کہ وہ موجوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں گے اور صور پھونکا جائے گا تو ہم سب کو ایک ساتھ جمع کر لیں گے ۔ (۹۹) اور اس دن ہم دوزخ کو ان کافروں کے سامنے کھلی آنکھوں لے آئیں گے۔ (۱۰۰) جن کی آنکھوں پر (دنیا میں) میری نصیحت کی طرف سے پردہ پڑا ہوا تھا، اور جو سننے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ (۱۰۱)

یاجوج ماجوج:

یہ دیوار قرب قیامت میں ریزہ ریزہ ہو جائے گی اور یاجوج ماجوج پوری دنیا میں پھیل جائیں گے ۔

ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحشؓ بیان کرتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیند سے بیدار ہوئے تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے" **لا الہ الا اللہ ویل للعرب من شر قد اقترب** "۔ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، عربوں کے واسطے ہلاکت ہے کہ ایک شر ان کے قریب آ چکا ہے، آپ نے یہ بھی فرمایا" **فتح من ردم یاجوج وماجوج** "یعنی یاجوج وماجوج کے بند کو تھوڑا سا کھول دیا گیا ہے، آپ نے ہاتھ کی انگلیوں سے دس کا اور ایک روایت کے مطابق نوے کا سوراخ بھی بنا کر دکھایا کہ اس دیوار میں اتنا سوراخ ہو گیا ہے، ام المؤمنین نے عرض کیا حضور! " **انھلک وفینا صالحون** "۔ کیا ہم ہلاک کر دیے جائیں گے جب کہ ہمارے درمیان نیک لوگ بھی ہوں گے، آپ نے فرمایا کہ لوگ اس وقت ہلاک کر دیے جائیں گے" **اذا کثر الخبث** " جب خباثت اور فتنہ وفساد بڑھ جائے گا، چاہے ان میں نیک آدمی بھی موجود ہوں۔ ترمذی شریف کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج وماجوج اس بند کو دن بھر توڑتے رہتے ہیں مگر جب رات ہوتی ہے تو وہ بند یا دیوار پھر ویسے کی ویسے مکمل ہو جاتی ہے، عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ نزول پر جب ان اقوام کے خروج کا وقت آئے گا، تو اس وقت ان کی زبان سے نکلے گا کہ ہم ان شاء اللہ کل اس دیوار کو توڑ دیں گے اور پھر اگلے دن دیوار میں شگاف پڑ جائے گا، اور یاجوج وماجوج وہاں سے نکل کھڑے ہوں گے، یہ درجہ دوئم کی روایت ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت سے پہلے ساری دنیا پر یاجوج ماجوج کا غلبہ ہوگا، یہ لوگ بڑی تباہی مچائیں گے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے مطابق کسی وبائی مرض (طاعون وغیرہ میں) مبتلا ہو کر ایک دم ہی ہلاک بھی ہو جائیں گے، کتاب الایمان میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد بھی موجود ہے کہ عام انسانوں اور اقوام یاجوج ماجوج کی آبادی کا تناسب ایک اور نوسو ننانوے (۹۹۹) کا ہے، یہ تمام لوگ کفر وشرک میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جہنمی ہوں گے۔

(معالم العرفان: ۱۲/ ۵۲۲، ۵۳۰)

دجال:

ذوالقرنین مادی وسائل کی بہتات کے باوجود اللہ پر ایمان رکھتا تھا، جبکہ مادیت پرست افراد اور بادشاہ ظاہری اسباب ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اس وقت مادیت کی بندگی میں پیش پیش ہونے کا سہرا مغربی تہذیب کے سر بندھتا ہے اور اس تہذیب کا جو سب سے بڑا نمائندہ ظاہر ہوگا اسے زبان نبوت میں دجال کہا گیا ہے۔

دجال کا ظہور:

اور لگتا یہ ہے کہ اس ظہور میں اب زیادہ دیر نہیں ہوگی؛ کیونکہ ایمان اور مادیت کے درمیان آخری معرکہ برپا ہونے میں اب تھوڑا وقت ہی باقی رہ گیا ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو دجالی تہذیب اور دجال کے ظہور کے وقت اپنے ایمان بچانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

مومن کے دل کو تھرا دینے اور لرزا دینے کے لئے کافی:

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾

جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، کیا وہ پھر بھی یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے چھوڑ کر میرے ہی بندوں کو اپنا رکھوالا بنالیں گے؟ یقین رکھو کہ ہم نے ایسے کافروں کی مہمانی کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ (۱۰۲)

پورا رکوع اگر ذرا بھی خیال کر کے پڑھا جائے تو مومن کے دل کو تھرا دینے اور لرزا دینے کے لئے کافی ہے۔ آہ، کہ آج ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جن کی صبح وشام، رات اور دوپہر، سب اسی دنیا کے اڈھیر بن میں، رضائے مولی سے بالکل منہ موڑے ہوئے گزر رہی ہے، اور اپنے زعم و پندار میں اپنے کو محقق و مصلح، شاعر و ادیب، فنکار اور آرٹسٹ، اور خدا معلوم روشن خیالی کے ایجاد کیے ہوئے کیسے کیسے خوشنما القاب سے اپنے کو آراستہ سمجھتے رہتے ہیں، تا آنکہ جب موت آجاتی ہے، اس وقت آنکھیں کھلتی ہیں کہ ارے ہم کس دھوکے میں پڑے رہے، یہاں تو پرسش ان ''علوم و''فنون'' و''صنائع'' میں سے کسی کی بھی نہیں ''اللھم احفظنا''۔

اللہ پاک کا علم لامحدود ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ .... الی........ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

(اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دو کہ: اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے سمندر روشنائی بن جائے، تو میرے رب کی باتیں ختم نہیں ہوں گی کہ اس سے پہلے سمندر خشک ہو چکا ہوگا، چاہے اس سمندر کی کمی پوری کرنے کے لیے ہم ویسا ہی ایک اور سمندر کیوں نہ لے آئیں۔ (۱۰۹) کہہ دو کہ: میں تو تمہی جیسا ایک انسان ہوں (البتہ) مجھ پر یہ وحی آتی ہے کہ تم سب کا خدا بس ایک خدا ہے۔ لہذا جس کسی کو اپنے مالک سے جا ملنے کی امید ہو، اسے چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے، اور اپنے

مالک کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائے۔(۱۱۰)

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا گیا کہ جب حضور ﷺ گھر میں ہوتے تو آپ کیا کام کرتے تھے؟ ام المؤمنین نے جواب دیا: "**کان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بشرا من البشر**" یعنی حضور ﷺ انسانوں میں سے ایک انسان تھے، آپ انسانوں والے کام کرتے تھے، آپ کپڑے دھو لیتے یا مکان کی صفائی کر لیتے، بکری کا دودھ دوھ لیتے، جوتے کو ٹانکا لگا لیتے، کپڑے میں کوئی تکلیف دہ چیز کانٹا وغیرہ ہوتا تو اسے نکال دیتے اور پھر آرام بھی فرماتے۔

حضور ﷺ کا تعلق نوع انسانی کے ساتھ تھا، آپ کسی دوسری جنس میں سے نہیں تھے، اسی مقام پر آ کر لوگ دھوکا کھاتے اور بھٹک جاتے ہیں اور آپ کو نوع انسانی سے ہی خارج کر دیتے ہیں، بحیثیت انسان آپ کی بیویاں تھیں، اولاد تھی، والدین اور آباء واجداد تھے، آپ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے، البتہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت زیادہ فضیلت عطا فرمائی "**وکان فضل اللہ علیک عظیما**"۔ اور یہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم تھا، تاہم آپ نسل انسانی میں سے تھے، ملائکہ، جنات یا کسی دوسری مخلوق میں سے نہیں تھے، انسان ہونا باعث شرف ہے، اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا "**انی خالق بشرا من طین**"۔ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں، لوگ سمجھتے ہیں کہ نبی کو انسان کہنے سے (نعوذ باللہ) اس کی توہین ہوجاتی ہے، بھائی! ایسی بات نہیں ہے، انسان انسان میں بڑا فرق ہے، ایسے لوگوں کے سامنے اپنے جیسے انسانوں کا نمونہ ہوتا ہے جو ہر لمحہ نافرمانی کرتے اور فسق وفجور میں مبتلا ہوتے ہیں، اگر حضور ﷺ کو بھی ایسا ہی انسان تصور کیا جائے تو بلاشبہ باعث توہین ہوگا، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص امتیاز بخشا ہے، اللہ کا ہر نبی معصوم عن الخطا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں گارنٹی حاصل ہوتی ہے کہ ان سے گناہ نہ سرزد ہونے دیا جائے، اگر کوئی معمولی سی لغزش ہو بھی جائے تو فوراً تنبیہ ہوجاتی ہے مگر تمام انبیاء انسان ہی ہوتے ہیں اور حضور خاتم النبیین ﷺ تو سید البشر اور سید الانبیاء ہیں۔ آپ پوری نوع بشر کے امام ہیں، آپ کو نسل انسانی سے خارج کر کے "نور من نور اللہ" کا عقیدہ رکھنا غلط ہے اور یہ خدا کا جزو بنانے کے مترادف ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا "**وجعلوا له من عباده جزءا، ان الانسان لکفور مبین**"۔ (زخرف)

بعض مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے اس کا جزو بنالیا ہے، بیشک انسان تو کھلا ناشکر گزار ہے، اسی لیے ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں یا مسیح اور عزیر علیہما السلام کو خدا کا بیٹا کہنا خدا کے لیے اولاد ثابت کرنا ہے اور یہی کفر کی بات ہے، چنانچہ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے خود حضور ﷺ سے بشریت کا اعلان کروا دیا ہے تاکہ کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

(معالم العرفان: ۱۲/ ۵۴۸)

سورۂ کہف کے اختتام پر گویا ان لوگوں کو حکم دیا گیا ہے جو صرف مادیت اور ظاہری وسائل ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتے

ہیں، پس جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے چاہیے کہ اچھے کام انجام دے اور اپنے پروردگار کی بندگی میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کرے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

خلاصہ رکوع: ۱۰......(۱) حضرت موسی علیہ السلام نے تین مرتبہ شرائط تلمذ کو توڑا۔ (۲) اور جدا کر دیئے گئے۔ ماخذ: (۱) آیت: ۷۱، ۷۴، ۷۷۔ (۲) آیت: ۷۸۔

خلاصہ رکوع: ۱۱......(۱) ذوالقرنین کے پاس ہر طرح کا دنیاوی ساز و سامان موجود تھا۔ (۲) لیکن اس کے باوجود باغی اور طاغی نہیں تھا، اس لئے اس کا ذکر خیر قرآن میں آیا۔ ماخذ: (۱) آیت: ۸۴، ۸۵- (۲) آیت: ۹۸۔

خلاصہ رکوع: ۱۲......مشرک کی سزا جہنم ہے۔ (۲) اور اس کے سارے اعمال رائیگاں ہوں گے۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۰۲۔ (۲) آیت: ۱۰۳ تا ۱۰۵۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ مریم

اس سورت کا بنیادی مقصد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں صحیح عقائد کی وضاحت اور ان کے بارے میں عیسائیوں کی تردید ہے۔ اگرچہ مکہ مکرمہ میں، جہاں یہ سورت نازل ہوئی، عیسائیوں کی کوئی خاص آبادی نہیں تھی، لیکن مکہ مکرمہ کے بت پرست کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی تردید کے لیے عیسائیوں سے مدد لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے صحابہ کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر رہے تھے جہاں عیسائی مذہب ہی کی حکمرانی تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ مسلمان حضرت عیسی، حضرت مریم، حضرت زکریا اور حضرت یحیی علیہم السلام کی صحیح حقیقت سے واقف ہوں۔ چنانچہ اس سورت میں ان حضرات کے واقعات اسی سیاق و سباق میں بیان ہوئے ہیں۔ اور چونکہ یہ واضح کرنا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے نہیں ہیں، جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے، بلکہ وہ انبیائے کرام ہی کے مقدس سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ اس لیے بعض دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کا بھی مختصر تذکرہ اس سورت میں آیا ہے۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ ولادت اور اس وقت حضرت مریم علیہا السلام کی کیفیات سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اسی سورت میں بیان ہوئی ہیں، اس لیے اس کا نام سورۃ مریم رکھا گیا ہے۔ (توضیح القرآن)

سورۂ مریم یہ قرآن کریم کی ۱۹ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۴۴ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ٦ رکوع، ۹۸ آیات، ۹٦۸ کلمات اور کل ۳۹۸٦ حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے آغاز کے قریب ہی حضرت عیسی علیہ السلام کی ولادت اور آپ کی والدہ حضرت مریم کے واقعہ کی تفصیل

بیان کی گئی ہے، اس لئے اس سورۃ کا نام مریم رکھا گیا۔

فائدہ:

مفسر ابن کثیرؒ کے قول کے مطابق حضرت مریم کا نام قرآن پاک میں ۳۰ جگہ آیا ہے اور سوائے حضرت مریم کے اور کسی عورت کا نام صراحۃً قرآن پاک میں نہیں ہے۔

ربط:

سورۂ کہف کے خاتمہ پر خدا تعالی کی بے پناہ قدرت کی نشانیوں کا انکار کرنے والوں کو عذاب جہنم کی اطلاع دی گئی تھی اور ان آیات الٰہی کے تسلیم کرنے والوں کو فردوس اعلی کی بشارت سنائی گئی، ساتھ ہی آپ کی بشریت کا اعلان اور آپ کی زبان وحی ترجمان کا اعلان تھا۔ سورہ مریم کا بھی عمومی مضمون ومرکزی بیان ان آیات الٰہی کا تذکرہ ہی ہے۔ نیز یہ مضامین باہم بھی متلازم ومتناسق ہیں اور سورۃ گزشتہ کے ختم پر جس طرح آپ کی رسالت کا ذکر ہے اس سورۃ کے ختم پر بھی اسی طرح بعض انبیاء سابقین کی نبوت کا مضمون ہے۔

خلاصہ سورۃ:

سورۃ کی ابتداء حضرت زکریا علیہ السلام کے ذکر سے فرمائی گئی کہ اللہ تعالی نے حضرت زکریا علیہ السلام پر خاص رحمت فرمائی تھی، چونکہ آپ کے یہاں کوئی اولاد نہ تھی، آپ نے اللہ سے دعا مانگی آپ کی دعا قبول ہوئی اور فرشتہ نے آپ کو فرزند کی بشارت دی جن کا نام بھی اللہ کی طرف سے یحییٰ تجویز کیا گیا، پھر حضرت یحییٰ علیہ السلام کی نبوت اور ان کی پاکیزہ زندگی کا ذکر کیا گیا، دوسرے رکوع میں حضرت مریم علیہا السلام کی پارسائی اور عبادت گزاری کا تذکرہ فرماتے ہوئے حضرت عیسی علیہ السلام کی پیدائش کا حال بیان فرمایا گیا اور دونوں گروہوں یعنی یہود اور نصاری کی تردید کی گئی جو حضرت مریم علیہا السلام پر معاذ اللہ حضرت عیسی علیہ السلام کی پیدائش کی بناء پر بہتان لگاتے تھے یا جو حضرت عیسی علیہ السلام کو خدا کا بیٹا سمجھتے تھے۔

تیسرے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر فرمایا کہ آپ صدیق بھی تھے اور نبی بھی، پھر آپ کی دعوت دین کا تذکرہ ہے۔ چوتھے رکوع میں حضرت موسی، حضرت ہارون، حضرت اسماعیل، حضرت ادریس علیہم السلام کا تذکرہ فرمایا اور بتلایا کہ ان سب انبیاء کی دعوت یہی دعوت اسلام رہی ہے، ساتھ ہی ناخلف لوگوں کا انجام بد ذکر فرمایا۔ پانچویں رکوع میں حیاۃ بعد الموت پر منکر انسان کے تعجب کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی موجودہ پیدائش سے استدلال فرمایا کہ کیا یہ عدم سے وجود میں لانا نہیں ہے۔ جب انسان کچھ بھی نہ تھا پھر اس کو وجود دیا گیا، تو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا حق تعالی کے لئے کیا مشکل ہے۔ چھٹے رکوع میں بتلایا گیا کہ کافروں پر شیطان کا پورا تسلط رہتا ہے جو انہیں طرح طرح سے کفر پر ابھارتے اور اکساتے ہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ قیامت میں ان منکرین ومجرمین کو سزا دی جائے گی اور پیادہ جہنم کی طرف ہانکا

جائے گا بالمقابل ان مجرمین کے مؤمنین مخلصین کو حق تعالی کی مہمانی نصیب ہوگی اور جنت میں ان کا ابدی ٹھکانہ ہوگا، اخیر میں یہود و نصاری ومشرکین عرب جو حق تعالی کے اولاد رکھنے کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کا ردفرمایا گیااور کفار کو یہ تنبیہ کی گئی کہ اللہ اور رسول کی مخالفت کرنے پر پہلے بھی قومیں ہلاک اور دنیا سے نیست و نابود ہوچکی ہیں، جن کا کوئی نام ونشان بھی نہ رہا اوراس ہیئت پر سورۃ کوختم فرمایا گیا۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

قریش نے جب یہ دیکھا کہ صحابہ کرام حبشہ میں جا کر مطمئن ہو گئے اور اطمینان کے ساتھ ارکان اسلام بجالانے لگے۔تومشورہ کر کے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کونجاشی اوراس کے تمام ندماءاورمقربین کے لئے تحائف اور ہدایا دے کر اپنا ہم خیال بنالینا؛ چنانچہ عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ یہ دونوں حبشہ پہنچے، اول تمام ندماء اور مصاحبین کونذریں پیش کیں اور یہ بیان کیا کہ ہمارے شہر کے چندسفیہ اور نادان اپنا آبائی دین چھوڑ کرتمہارے شہر میں پناہ گزیں ہوئے ہیں۔انہوں نے اپنا آبائی دین چھوڑ کرتمہارا دین بھی اختیارنہیں کیا،یعنی عیسائی بھی نہیں ہو گئے، بلکہ ایک نیا دین اختیارکیا ہےجس سے نہ ہم اورنہ آپ؛ کوئی بھی واقف نہیں۔ہماری قوم کے اشراف اورسر برآوردہ لوگوں نے ہم کو بادشاہ کی خدمت میں اس لیے بھیجا ہے کہ یہ لوگ ہمارے حوالے کردیئے جائیں۔آپ حضرات بادشاہ سے سفارش کیجئے کہ ان لوگوں کوبغیرکسی مکالمہ اورگفتگو کے ہمارے سپرد کردے: چنانچہ جب یہ لوگ باریاب ہوئے اورتحائف اور ہدایا کی نذر پیش کر کے اپنے مدعا کو پیش کیا،تومقربین اور مصاحبین نے پوری تائید کی۔عمروبن العاص اورعبداللہ بن ابی ربیعہ کو یہ بہت شاق اورگراں تھا کہ شاہ حبشہ صحابہ کرام کو بلاکران سے کچھ دریافت کرے یاان کی کسی بات کو سنے۔

ناظرین خوب سمجھ سکتے ہیں کہ شاہ حبشہ کا صحابہ سے کسی قسم کا سوال یا گفتگوکرنا کیوں شاق اورگراں تھااور یہ کیوں چاہتے تھے کہ بادشاہ بغیرکسی مکالمے اورگفتگو کے ان لوگوں کو ہمارے سپرد کردے۔وجہ ظاہر ہے، وہ یہ کہ یہ خوب سمجھتے تھے کہ حق ان لوگوں کی زبان سے نکلااورادھردل میں اترا۔غرض یہ کہ ان لوگوں نے بادشاہ کےسامنے اپنامدعا پیش کیااور درباریوں نے پوری تائید کی کہ یہ لوگ اس وفد کےحوالے کردیئے جائیں۔جس چیز کا اندیشہ تھاوہی سامنے آئی، نجاشی کو غصہ آگیااورصاف کہہ دیا کہ میں بغیر دریافت حال اور بدون گفتگو کےتمہارے حوالےنہیں کرسکتا۔یہ کیسےممکن ہے کہ جو لوگ اپنا وطن چھوڑ کرمیرے قلمرو میں آٹھہرے ہیں ان کو بغیرکسی تحقیق اورتفتیش کے ان کے مخالفوں کے حوالے کردوں؟ اورایک آدمی صحابہ کے بلانے کے لئے روانہ کیا۔قاصدصحابہ کے پاس پہنچااور بادشاہ کا پیام پہنچایا۔اس وقت صحابہ میں سے کسی نے یہ کہا کہ دربارمیں پہنچ کرکیا کہو گے(یعنی بادشاہ تو عیسائی ہےاورہم مسلمان ہیں، بہت سےعقائدمیں اس کے خلاف ہیں) صحابہ نے کہا کہ ہم دربارمیں وہی کہیں گے جوہمارے نبی نے ہم کوسکھایا اور بتایا ہے، جوکچھ بھی ہواس سے سرموتجاوزنہ کریں گے،دربارمیں پہنچےاورصرف سلام پراکتفا کرکے فرمایا:

ایها الملك اے بادشاہ! ہم سب جاہل اور نادان تھے۔بتوں کو پوجتے اور مردار کوکھاتے تھے،قسم قسم کی بے

حیائیوں میں مبتلا تھے۔قرابتوں کو قطع کرتے، پڑوسیوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے۔ہم میں جو زبردست ہوتا وہ یہ چاہتا کہ کمزور کو کھا جائے۔ اس حالت میں تھے کہ اللہ تعالی نے ہم پر اپنا فضل فرمایا، ہم میں سے اپنا ایک پیغمبر بھیجا جس کے حسب ونسب اور صدق اور امانت اور پاکدامنی اور عفت کو ہم خوب پہچانتے ہیں، اس نے ہم کو اللہ کی طرف بلایا کہ ہم اس کو ایک مانیں اور ایک جانیں اور ایک سمجھیں ،صرف اس کی عبادت اور بندگی کریں اور جن بتوں اور پتھروں کی ہم اور ہمارے آباواجداد پرستش کرتے تھے ان سب کو یک لخت چھوڑ دیں۔سچائی اور امانت اور صلہ رحمی اور پڑوسیوں سے حسن سلوک اور خونریزی اور حرام باتوں سے بچنے کا حکم دیا اور تمام بے حیائیوں سے اور باطل اور ناحق کہنے سے اور یتیم کا مال کھانے سے اور کسی پاک دامن پر تہمت لگانے سے ہم کو منع کیا اور یہ حکم دیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں، کسی کو اس کا شریک نہ کریں، نماز پڑھیں اور زکوۃ دیں اور روزہ رکھیں،غرض یہ کہ جان اور مال سے خدا کی راہ میں دریغ نہ کریں۔

حضرت جعفر نے اس کے علاوہ اور بھی تعلیمات اسلام کا ذکر کر کے فرمایا پس ہم نے ان کی تصدیق کی اور ان پر ایمان لائے اور جو کچھ وہ منجانب اللہ لے کر آئے اس کا اتباع اور پیروی کی؛ چنانچہ ہم صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔حلال چیزوں کو کرتے ہیں اور حرام چیزوں سے بچتے ہیں محض اس پر ہماری قوم نے ہم کو طرح طرح سے ستایا اور قسم قسم کی اذیتیں پہونچائیں تا کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر گذشتہ بے حیائیوں میں پھر مبتلا ہو جائیں، جب ہم ان کے مظالم سے تنگ آ گئے اور اپنے دین پر چلنا اور ایک خدا کی عبادت اور بندگی کرنا دشوار ہو گیا، تب ہم نے اپنا وطن چھوڑا اور اس امید پر کہ آپ ظلم نہ کریں گے۔آپ کی ہمسائیگی کو سب پر ترجیح دی۔نجاشی نے کہا: کیا تم کو اس کلام میں سے کچھ یاد ہے جو تمہارے پیغمبر اللہ کی طرف سے لائے ہیں؟ حضرت جعفر نے فرمایا: ہاں! نجاشی نے کہا: اچھا اس میں سے کچھ پڑھ کر مجھ کو سناؤ۔ حضرت جعفر نے سورہ مریم کا ابتدائی حصہ پڑھ کر سنایا۔بادشاہ اور تمام درباریوں کے آنسو نکل آئے،روتے روتے بادشاہ کی ڈاڑھی تر ہو گئی۔ جب حضرت جعفر تلاوت ختم فرما چکے تو نجاشی نے کہا: یہ کلام اور وہ کلام جو عیسی علیہ السلام لیکر آئے؛ دونوں ایک ہی شمع دان سے نکلے ہوئے ہیں اور قریش کے وفد سے صاف طور پر کہہ دیا کہ میں ان لوگوں کو ہرگز تمہارے سپرد نہ کروں گا اور نہ اس کا کوئی امکان ہے۔جب عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ اس طرح بادشاہ کے دربار سے بے نیل ومرام باہر نکلے،تو عمرو بن العاص نے کہا کہ میں کل بادشاہ کے سامنے ایسی بات کہوں گا جس سے وہ ان لوگوں کو بالکل نیست و نابود ہی کر دے گا۔عبداللہ بن ابی ربیعہ نے کہا: ایسا ہرگز نہ کرنا، ان لوگوں سے ہماری قرابتیں ہیں، یہ ہمارے عزیز اور رشتہ دار ہیں، اگر چہ مذہبا ہمارے مخالف ہیں، مگر عمرو بن العاص نے ایک نہ سنی۔اگلا روز ہوا کہ عمرو بن العاص نے نجاشی سے کہا کہ اے بادشاہ! یہ لوگ حضرت عیسی علیہ السلام کی شان میں بہت ہی سخت بات کہتے ہیں۔نجاشی نے صحابہ کو بلا بھیجا۔اس وقت صحابہ کو بہت تشویش ہوئی۔ جماعت میں سے کسی نے کہا کہ بادشاہ سے حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں کیا کہو گے۔اس پر سب نے متفقہ طور پر کہا کہ خدا کی قسم ہم وہی

کہیں گے جو اللہ نے اور اس کے رسول نے کہا ہے، جو کچھ بھی ہو ذرہ برابر اس کے خلاف نہ کہیں گے۔

دربار میں پہنچے، نجاشی نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر دریافت کیا کہ تم لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ حضرت جعفر نے فرمایا: ہم ان کے بارے میں وہی کہتے ہیں جو ہمارے نبی ﷺ نے فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے اور خدا کی خاص روح اور خدا کا خاص کلمہ تھے۔ نجاشی نے زمین پر سے ایک تنکا اٹھا کر یہ کہا۔ خدا کی قسم مسلمانوں نے جو کہا ہے عیسیٰ علیہ السلام اس سے ایک تنکے کی مقدار بھی زائد نہیں۔ اس پر درباریوں نے بہت ناک بھوں چڑھائے، مگر نجاشی نے ذرہ برابر پرواہ نہ کی اور صاف کہہ دیا کہ تم کتنا ہی ناک بھوں چڑھاؤ مگر حقیقت یہی ہے اور مسلمانوں سے کہا کہ تم امن سے رہو۔ (سیرت مصطفیٰ: ۱/۲۴۹-۲۵۱)

اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ مسلمان جہاں بھی جائے اپنا سچا دین پیش کرے، دشمنوں کے ڈر سے اپنا مذہب نہ بدلے، ان شاء اللہ اللہ پاک کی مدد ضرور آ کر رہے گی، جیسا کہ حضرت جعفرؓ نے حق پیش کیا اور شہنشاہ نجاشی نے انہیں قیام کا حق دیا۔

اولاد کی تربیت:

انسان کو اولاد کی خواہش ہوتی ہے، اس کی جوانی ان کی پرورش کرنے میں اور بوڑھاپا ان کی ازدواجی زندگی اور وراثت میں اضافہ کرنے میں چلا جاتا ہے، اولاد کی محبت فطری ہے، سورۂ مریم اس موضوع کو بیان کر کے پوچھ رہی ہے کہ آپ کو اولاد کیوں چاہیے؟ صرف فائدے کے لیے؟ وراثت کے لیے؟ صرف زمین و مکان کے لیے؟

سورۂ مریم دین کو دنیا پر مقدم رکھنے کی رہنمائی کرتی ہیں اور اس کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہیں، تم بھی دین دار ہو اور تمہاری اولاد بھی دین دار ہو، اور اس کے بعد بھی دین دار۔ اس طرح سلسلہ جاری رہنا چاہیے، تم دین دار ہوں اولاد نہ ہو، تو پھر وہ اپنی اولاد کی صحیح تربیت نہیں کر سکے گی۔ وہ اسے دنیاوی خواہشات اور ہوس کی طرف لے جا کر برباد کر دے گا۔ اس لیے اس سورت میں ولد (لڑکا) اور دینی میراث کی تفصیل ہی مرکزی محور ہے، سورت میں اکثر لڑکوں اور وراثت کی تفصیل ہے، اس کی مثال ہے۔ حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت مریم، حضرت عیسیٰ، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت موسیٰ (علیہم السلام) وغیرہ کو بیان کرتے ہوئے ہم سے پوچھا گیا کہ کیا آپ اپنی اولاد کی تربیت اللہ کی معرفت والی کرنا چاہتے ہیں؟ حضرت زکریاؑ نے اپنے خاندان میں کسی کو (نبی بننے کے لائق) نہیں دیکھا، اس لیے اولاد کی خواہش کا اظہار کیا، حضرت یحییٰؑ کی بھی تربیت کی۔ بچوں سے محبت اور ان کے مستقبل کی فکر فطری ہے؛ لیکن اس میں دین کو اچھی طرح شامل کرنا چاہیے، حضرت مریم کی والدہ اور حضرت مریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تربیت کی، ماں اور باپ کی اطاعت کے بارے میں سورت میں توجہ دی گئی، اور یہ بات یقینی ہے کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب اولاد نیک ہو، انہیں آخرت کی فکر ہو، انہیں ماں اور باپ کا درجہ معلوم ہو، نیکی کا شوق رکھتے ہوں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معاملہ اس سے الٹا ہے۔ باپ مشرک ہے، پھر بھی آپ ان کو نرمی،

شفقت، محبت کے ساتھ دعوت دیتے ہیں، اس سے ہمیں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم معلوم ہوتا ہے،نو جوان اولاد ماں باپ کے ساتھ شائستگی سے پیش آئے، چاہے وہ دین پر عمل نہ کرتے ہوں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کے کافر ہونے کے باوجود اچھا سلوک کیا،تو اللہ تعالیٰ نے نیک اولاد عطا فرمائی (اسحٰق ، یعقوب)، اس سے دونسلوں کی نبوت کی بشارت بھی دی، ساتھ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر کیا کہ وہ اپنے گھر والوں کو بھی نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کرتے تھے، حضرت موسی علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کا ذکر کیا، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کے لیے دعا کر کے نبوّت میں شریک بنایا، اس کے بعد تمام انبیاء کا مختصراً بیان کیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سب اپنی اولاد کے بارے میں فکر مند تھے، لیکن پھر ان کے بعد تربیت میں کمی آتی گئی ،تو ان کی اولاد دنیاوی خواہشات اور دنیاوی ورثہ (مالی دولت) کے لالچ میں پڑ گئی اور انہوں نے اپنی اولاد کی صحیح تربیت نہ کی تو وہ بددین بن گئی، تو کیا آپ کو بھی ان میں سے بننا ہے جس کے نتیجے میں جنت ملے یا اپنی اولاد کو بے نمازی، خواہشات پرست بنا کر جہنمی بنانا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان اولاد کے لحاظ سے فرق ظاہر کیا ہے اس کی آپ کو ضرورت ہے، میں اولاد سے بے نیاز ہوں۔ اولاد کی ضرورت والی آیات نرمی سے بیان کی ،دوسری سورتوں کے مقابلہ میں اس سورت میں لفظ رحمت، رحمن وغیرہ ۲۰ بار مختلف طریقے سے استعمال ہوا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے اولاد کو بیان کرنے کے لیے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں، کیونکہ وہ اس سے بے نیاز ہے، ہم سب محتاج ہیں، یہ اللہ پاک کے لیے عیب کی بات ہے، الزام تراشی اور بہتان ہے اس لیے سخت الفاظ استعمال کیے، سورت میں نرمی اور سختی دونوں کا سنگم ہے جو کہ قرآن شریف کا معجزہ ہے۔

سورت کا نام مریم رکھا گیا، کیونکہ عورت کی تربیت کا اثر زیادہ ہوتا ہے، وہ بچے کے ساتھ زیادہ وقت بتاتی ہے، حضرت مریم کی والدہ اور خود آپ نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تربیت فرمائی؛ چنانچہ یہ سورت عورتوں کی ذمہ داری کی طرف توجہ مرکوز کر رہی ہے کہ وہ بچوں کو اچھی تعلیم دیں۔ (قرآن سارانس گجراتی)

دوسری مکی سورتوں کی طرح سورۂ مریم میں بھی اللہ کے وجود، توحید اور بعث وجزاء سے بحث کی گئی ہے، اس سورت میں اللہ تعالی نے مختلف انبیاء کرام علیہم السلام کے قصص ذکر فرمائے ہیں۔

حضرت زکریا کا قصہ:

سب سے پہلے حضرت زکریا علیہ السلام کا قصہ بیان ہوا ہے جو بوڑھے ہو چکے تھے، ہڈیاں کمزور پڑ گئی تھیں، بال سفید ہو گئے تھے، اہلیہ بوڑھی بھی تھیں اور بانجھ بھی۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی عمر ۱۲۰ سال اور اہلیہ کی عمر ۹۸ سال ہوگئی تھی۔ بظاہر اب اولاد کا ہونا ممکن نظر نہیں آتا تھا لیکن پھر بھی اللہ کے سامنے ہاتھ اٹھا دیئے۔۔

بیٹا مانگنے سے پہلے:

بیٹا مانگنے سے پہلے بارگاہ رب العالمین میں تین امور عرض کیے:

(۱) پہلا یہ کہ میں بہت کمزور ہوں (۲) دوسرا یہ کہ میں مایوس نہیں ہوں، کیونکہ آپ نے کبھی بھی میری دعا رد نہیں فرمائی۔(۳) اور تیسرا یہ کہ اس دعا سے میرا مقصد دین کی منفعت ہے، اس کے بعد صراحۃً اپنی دینی خلافت کے لیے اللہ سے بیٹا مانگا۔ لیکن ساتھ ہی یہ درخواست بھی کہ ایسا بیٹا عطا فرمانا جس سے تو بھی خوش ہو اور تیرے بندے بھی خوش ہوں۔

بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود اولاد دینا اللہ پاک کی قدرت:

اللہ تعالیٰ نے یہ دعا بھی قبول فرمائی اور انہیں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صورت میں انتہائی صالح اور عابد و زاہد بیٹا عطا فرمایا جسے نبوت سے بھی سرفراز فرما دیا۔

كٓهٰيٰعٓصٓ ۝١ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝٢ .... الیٰ ....وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ۝٩

کھیعص (۱) یہ تذکرہ ہے اس رحمت کا جو تمہارے پروردگار نے اپنے بندے زکریا پر کی تھی۔(۲) یہ اس وقت کی بات ہے جب انہوں نے اپنے پروردگار کو آہستہ آہستہ آواز سے پکارا تھا۔(۳) انہوں نے کہا تھا کہ: میرے پروردگار! میری ہڈیاں کمزور پڑ گئی ہیں، اور سر بڑھاپے کی سفیدی سے بھڑک اٹھا ہے، اور میرے پروردگار! میں آپ سے دعا مانگ کر کبھی نامراد نہیں ہوا۔(۴) اور مجھے اپنے بعد اپنے چچازاد بھائیوں کا اندیشہ لگا ہوا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے، لہذا آپ خاص اپنے پاس سے مجھے ایک ایسا وارث عطا کر دیجیے۔(۵) جو میرا بھی وارث ہو، اور یعقوب (علیہ السلام) کی اولاد سے بھی میراث پائے اور یارب! اسے ایسا بنائیے جو (خود آپ کا) پسندیدہ ہو۔(۶) (آواز آئی کہ) اے زکریا! ہم تمہیں ایک ایسے لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا۔ اس سے پہلے ہم نے اس کے نام کا کوئی اور شخص پیدا نہیں کیا۔(۷) زکریا نے کہا: میرے پروردگار! میرے یہاں لڑکا کس طرح پیدا ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے، اور میں بڑھاپے سے اس حال کو پہنچ گیا ہوں کہ میرا جسم سوکھ چکا ہے۔(۸) کہا: ہاں! ایسا ہی ہوگا۔ تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ یہ تو میرے لیے معمولی بات ہے، اور اس سے پہلے میں نے تمہیں پیدا کیا تھا جب تم کچھ بھی نہیں تھے۔(۹)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ مؤمن، نیک بخت اور اچھے اعمال والی اولاد اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ اس لئے جب اللہ سے اولاد مانگی جائے تو صالح اولاد مانگی جائے۔ نیز دعا کے آداب بھی معلوم ہوئے کہ:

(۱) دعا خوب عاجزی کے ساتھ کرے۔(۲) اللہ کی ربوبیت کا اقرار کرے۔(۳) پھر اپنی کمزوری، بے بسی اور ظاہری اسباب کے مفقود ہونے کو بیان کرے۔(۴) پھر اپنا مطلب بیان کرے۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ دعا کا آہستہ اور خفیہ طور پر کرنا ہی افضل ہے۔ ان آیات سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ اولاد کا مانگنا زہد اور نبوت کے منافی نہیں۔ دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ کسی ایسی چیز کا مانگنا جو اسباب بعیدہ سے مسبب ہو ادب کے خلاف نہیں۔

امام ابوبکر جصاصؒ نے اپنی تفسیر میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت نقل کی ہے"**خیر الذکر الخفی، وخیر الرزق مایکفی**"۔ بہتر ذکر وہ ہے جو آہستہ ہو اور بہتر روزی وہ ہے جو انسان کے لیے کفایت کر جائے۔

امام رازیؒ نے تو یہ نفسیاتی توجیہ بھی کی ہے کہ آواز کی بلندی سے تو اپنی قوت ہی کا اظہار ہوتا ہے اور آواز کی پستی سے اپنے عجز و مذلت کا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ:

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کا قصہ بیان کرنے کے بعد اس سے بھی زیادہ عجیب قصہ بیان کیا گیا ہے اور وہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی ولادت کا قصہ ہے۔

تخلیق انسانی چار طریقے سے ہوئی ہے اور ہر ایک میں قدرت الٰہی کی واضح نشانیاں موجود ہیں:

(۱) مرد اور عورت دونوں کی قربت سے۔ جیسے عام انسانوں کی پیدائش۔

(۲) بغیر مرد اور عورت کے جیسے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش۔

(۳) بغیر عورت کے جیسے حضرت حوا علیہا السلام کی پیدائش۔

(۴) بغیر مرد کے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش۔

اللہ تعالیٰ نے ہر طریقہ کی پیدائش ظاہر فرمادی تاکہ انسان کو اس کی ہر طرح قدرت پر ایمان ہو۔

حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہم السلام کے قصوں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ بندے کے سوال اور اس کی طلب پر بھی عنایت فرماتے ہیں، جیسے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو حضرت زکریا علیہ السلام نے مانگا اور بعض اوقات بلا سوال اور بلا طلب بھی عطا فرماتے ہیں، جیسے حضرت مریم کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بلا مانگے عطا فرمائے گئے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت کا قصہ:

◇ بے شک حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت عجیب طریقے سے ہوئی تھی؛ کیونکہ ان کے والدین توالد وتناسل کی عمر سے گزر چکے تھے۔

◇ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بغیر باپ کے ہوئی اور ان کی والدہ باکرہ تھیں۔ یہاں سورۂ مریم میں اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے بتایا ہے کہ یہ عجیب وغریب واقعہ کیسے پیش آیا۔

◇ کیسے حضرت مریم اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر عبادت کے لیے بیت المقدس کے مشرقی گوشے میں چلی گئیں۔

◇ کیسے جبرئیل علیہ السلام ان کے پاس آئے، انھوں نے گریبان میں پھونکا اور انہیں حمل ٹھہر گیا۔

◇ کیسے ان پر حزن وملال کی شدید کیفیت طاری ہوئی۔

◇ ولادت کے بعد بچے کو اٹھائے ہوئے جب قوم کے پاس آئیں تو یہودیوں کی زبانیں کھل گئیں اور وہ بھانت

بھانت کی بولیاں بولنے لگے۔

◇ حضرت مریم نے اللہ کے حکم سے بیٹے کی طرف اشارہ کیا تو ماں کی گود میں لیٹا ہوا بیٹا بولنے لگا۔

انی عبداللہ:

اور اس کی زبان سے سب سے پہلے کلمہ جو نکلا وہ یہ تھا ''انی عبداللہ'' یقینا میں اللہ کا بندہ ہوں۔

دنیائے رنگ و بو میں قدم رکھنے کے بعد زندگی کے اس موڑ پر جب کہ ابھی آپ بولنے کی عمر تک نہیں پہنچے تھے۔

معجزانہ انداز میں اپنی والدہ کی پاکدامنی:

معجزانہ انداز میں اپنی والدہ کی پاکدامنی بتانے کے لیے بولے بھی تو آپ کی زبان سے پہلا کلمہ ہی ایسا نکلا جو آپ کے بارے میں غالی قسم کے عیسائیوں کی کھڑی کی گئی شرکیہ عمارت کو دھڑام سے گرانے کے لیے کافی ہے۔

چھ اعزازات:

آپ نے اپنے اسی اعجاز خطاب میں فرمایا ''کہ مجھے رب تعالی نے کچھ اعزازات سے سرفراز فرمایا ہے۔''

(۱) پہلا یہ کہ بندہ ہوں، نہ رب ہوں، نہ رب کا بیٹا ہوں۔

(۲) دوسرا یہ کہ مجھے وحی و نبوت عطا کی گئی ہے۔

(۳) تیسرا یہ کہ اللہ نے مجھے مبارک بنایا ہے، میرا وجود لوگوں کے لیے برکت اور رحمت کا باعث ہے، میں خیر کا معلم اور امت کے لیے نافع ہوں۔

(۴) چوتھا یہ کہ مجھے دوسرے انبیاء کی طرح شرعی امور اور عبادات کا مکلف بنایا گیا ہے، ان میں سے نماز اور زکوۃ کا آپ نے خاص طور پر ذکر فرمایا جو کہ ان دونوں عبادات کی اہمیت اور عظمت کی دلیل ہے۔

(۵) پانچواں یہ کہ میں اپنی والدہ کا فرمانبردار اور عزیز واقارب کا خدمت گار ہوں، میری طبیعت میں تواضع ہے، کبر و غرور نہیں ہے۔

(۶) چھٹا یہ کہ مجھے دنیا اور آخرت میں امن اور سلامتی کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن: م اش)

اعجازی شان لی ہوئی ولادت:

حضرت عیسی علیہ السلام کی اعجازی شان لی ہوئی ولادت یہود و نصاری کے درمیان اختلاف کا باعث بن گئی:

عیسائیوں نے انہیں ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) قرار دیا، تو یہودیوں نے (معاذ اللہ) ابن زنا کہنے میں کوئی شرم محسوس نہ کی۔

حضرت عیسیٰؑ کا پیدائش کے بعد فوراً بات کرنا، اپنے خدا ہونے کا انکار اور والدہ کی پاکدامنی کا اظہار:

فَاَتَتۡ بِهٖ قَوۡمَهَا تَحۡمِلُهٗ ؕ قَالُوۡا يٰمَرۡيَمُ لَقَدۡ جِئۡتِ شَيۡـًٔـا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾ ......الی......اِنَّا نَحۡنُ نَرِثُ الۡاَرۡضَ وَمَنۡ عَلَيۡهَا وَاِلَيۡنَا يُرۡجَعُوۡنَ ﴿۴۰﴾

پھر وہ اس بچے کو اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں، وہ کہنے لگے کہ: مریم تم نے تو بڑا غضب ڈھا دیا۔ (۲۷) اے ہارون کی بہن! نہ تو تمہارا باپ کوئی برا آدمی تھا، نہ تمہاری ماں کوئی بدکار عورت تھی۔ (۲۸) اس پر مریم نے اس بچے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا: بھلا ہم اس سے کیسے بات کریں جو ابھی پالنے میں پڑا ہوا بچہ ہے؟ (۲۹) (اس پر) بچہ بول اٹھا کہ: میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی ہے، اور نبی بنایا ہے۔ (۳۰) اور جہاں بھی میں رہوں، مجھے بابرکت بنایا ہے، اور جب تک زندہ رہوں، مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ (۳۱) اور مجھے اپنی والدہ کا فرمانبردار بنایا ہے، اور مجھے سرکش اور سنگ دل نہیں بنایا۔ (۳۲) اور (اللہ کی طرف سے) سلامتی ہے مجھ پر اس دن بھی جب میں پیدا ہوا، اور اس دن بھی جس دن میں مروں گا، اور اس دن بھی جب مجھے دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔ (۳۳) یہ ہیں عیسیٰ بن مریم! ان (کی حقیقت) کے بارے میں سچی بات یہ ہے جس میں لوگ جھگڑ رہے ہیں۔ (۳۴) اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کوئی بیٹا بنائے، اس کی ذات پاک ہے۔ جب وہ کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اس سے یہ کہتا ہے کہ ہو جا۔ چنانچہ وہ ہو جاتی ہے۔ (۳۵) اور (اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دو کہ:) یقیناً اللہ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار، اس لیے اس کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔ (۳۶) پھر بھی ان میں سے مختلف گروہوں نے اختلاف ڈال دیا ہے، چنانچہ جس دن یہ ایک زبردست دن کا مشاہدہ کریں گے، اس دن ان کی بڑی تباہی ہوگی جنہوں نے کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ (۳۷) جس روز یہ ہمارے پاس آئیں گے اس دن یہ کتنے سننے والے اور دیکھنے والے بن جائیں گے۔ لیکن یہ ظالم آج کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ (۳۸) اور (اے پیغمبر) ان کو اس پچھتاوے کے دن سے ڈرائیے جب ہر بات کا آخری فیصلہ ہو جائے گا، جبکہ یہ لوگ (اس وقت) غفلت میں ہیں، اور ایمان نہیں لا رہے۔ (۳۹) یقین جانو کہ زمین اور اس پر سارے رہنے والوں کے وارث ہم ہی ہوں گے، اور ہماری طرف ہی ان سب کو لوٹایا جائے گا۔ (۴۰)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور ان کے بارے میں اہل کتاب کا اختلاف بیان کرنے کے بعد سورۂ مریم منتقل ہو جاتی ہے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کی طرف، جو کہ مشرک باپ کے ساتھ پیش آیا، تاکہ عقیدہ شرک میں جو جھوٹ، کبر و غرور، جہل و عناد اور ضلالت و حماقت پائی جاتی ہے اس کی ایک جھلک دکھائی جائے۔

حقیقی داعی کا سراپا:

یونہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اخلاق و اوصاف خاص طور پر ان کا حلم اور بردباری، حکمت اور دردمندی بھی نمایاں کرنا مقصود ہے، تاکہ داعیانِ حق کے سامنے ایک حقیقی داعی کا سراپا آ جائے جسے وہ اپنے لیے نمونہ بنا سکیں۔

ہر قوم و ملت اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتی ہے:

اسی طرح اس قصہ سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ حق کی دعوت اور حق پر استقامت کی وجہ سے حضرت خلیل پر کیسے باران

رحمت نازل ہوئی، ان کی نسل میں ایک بڑی امت پیدا ہوئی، ان کی اولاد میں انبیاء، صلحاء اور بالخصوص حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور یہ بات بڑی عجیب ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر ملت ان کی طرف اپنی نسبت کرنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔

والد؛ آزر کی دھمکیاں:

سورۂ مریم بتاتی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو اپنے والد کو بت پرستی میں مبتلا پایا، جب آپ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا تو آپ نے دعوت توحید واصلاح کا آغاز اپنے گھر ہی سے کیا اور اپنے والد کو نرمی اور محبت سے سمجھانے کی کوشش کی، باوجود باپ کے مشرک ہونے کے آپ نے اپنی گفتگو میں ادب کا پہلو ملحوظ رکھا؛ لیکن آپ کا والد آزر دھمکیوں پر اتر آیا اور کہنے لگا:

"اگر تم (بتوں کو برا بھلا کہنے سے) باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کروں گا اور تم مجھے ایک طویل زمانے تک چھوڑ دو۔" (آیت ۴۹)

عراق سے شام کی طرف ہجرت:

جب مسلسل دعوت کے باوجود نہ آزر راہ راست پر آیا اور نہ ہی قوم کی سمجھ میں آپ کی دعوت آئی، تو آپ محض اللہ کی رضا کی خاطر عراق سے شام ہجرت فرما گئے، اللہ کے لیے قوم اور خاندان کو چھوڑنے کا صلہ اللہ نے یہ دیا کہ حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کی صورت میں ان سے کہیں بہتر بیٹے اور مونس وغم خوار عطا فرما دیئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان کرنے والی آیات:

اس سورۃ کا یہ تیسرا قصہ ہے جس میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی خدا پرستی کا ذکر ہے کہ وہ کیسے خدا پرست تھے اور کس طرح انہوں نے اپنے باپ کو توحید کی دعوت دی؟ اور کس طرح شرک اور بت پرستی کا بطلان ظاہر کیا اور اس دعوت اور تبلیغ میں اپنے باپ کے ادب اور احترام کو ملحوظ رکھا اور پھر کس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے باپ کو چھوڑا اور اپنے آبائی وطن سے ہجرت کی؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے درجے بلند کیے اور ان کو اولاد صالح عطا فرمائی اور تمام امتوں اور قوموں میں ان کا ذکر خیر جاری رکھا۔ علامہ سیوطیؒ نے بحر میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) ایک سو پچھتر برس زندہ رہے اور ان کے اور آدم (علیہ السلام) کے درمیان دو ہزار سال کا فاصلہ ہے اور ان کے اور حضرت نوح (علیہ السلام) کے درمیان ایک ہزار برس کا فاصلہ ہے۔ نیز حضرت مریم (علیہ السلام) اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے قصہ میں ان مشرکین کا رد فرمایا جو کسی زندہ عاقل کو خدا کا شریک ٹھہراتے تھے۔ اب ان آیات میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا قصہ ذکر کر کے ان مشرکین کا رد فرماتے ہیں جو بے جان بتوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے تھے، اس قسم کے مشرک قیامت کے دن اپنی حماقت پر بہت ہی زیادہ حسرت کریں گے۔ (تفسیر ادریسی: ۵/۷۰)

چنانچہ فرماتے ہیں:

وَاذۡكُرۡ فِي الۡكِتٰبِ اِبۡرٰهِيۡمَ ۬ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيۡقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾..... الیٰ......وَوَهَبۡنَا لَهُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِنَا وَجَعَلۡنَا لَهُمۡ لِسَانَ صِدۡقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾

اور اس کتاب میں ابراہیم کا بھی تذکرہ کرو۔ بیشک وہ سچائی کے خوگر نبی تھے۔(۴۱) یاد کرو جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ: ابا جان! آپ ایسی چیزوں کی کیوں عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں، اور نہ آپ کا کوئی کام کرسکتی ہیں؟ (۴۲) ابا جان! میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، اس لیے میری بات مان لیجیے، میں آپ کو سیدھا راستہ بتلا دوں گا۔(۴۳) ابا جان! شیطان کی عبادت نہ کیجیے یقین جانیے کہ شیطان خدائے رحمن کا نافرمان ہے۔(۴۴) ابا جان! مجھے اندیشہ ہے کہ خدائے رحمن کی طرف سے آپ کو کوئی عذاب نہ آ پکڑے، جس کے نتیجے میں آپ شیطان کے ساتھی بن کر رہ جائیں۔(۴۵) ان کے باپ نے کہا: ابراہیم! کیا تم میرے خداؤں سے بیزار ہو؟ یاد رکھو، اگر تم باز نہ آئے تو میں تم پر پتھر برساؤں گا، اور اب تم ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو جاؤ۔(۴۶) ابراہیم نے کہا: میں آپ کو (رخصت کا) سلام کرتا ہوں۔ میں اپنے پروردگار سے آپ کی بخشش کی دعا کروں گا۔ بیشک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔(۴۷) اور میں آپ لوگوں سے بھی الگ ہوتا ہوں، اور اللہ کو چھوڑ کر آپ لوگ جن جن کی عبادت کرتے ہیں، ان سے بھی، اور میں اپنے پروردگار کو پکارتا رہوں گا۔ مجھے پوری امید ہے کہ اپنے رب کو پکار کر میں نامراد نہیں رہوں گا۔(۴۸) چنانچہ جب وہ ان سے اور ان (بتوں) سے الگ ہو گئے جنہیں وہ اللہ کے بجائے پکارا کرتے تھے، تو ہم نے انہیں اسحاق اور یعقوب (جیسی اولاد) بخشی، اور ان میں سے ہر ایک کو نبی بنایا۔(۴۹) اور ان کو اپنی رحمت سے نوازا، اور انہیں اونچے درجے کی نیک نامی عطا کی۔(۵۰)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں کئی اہم فوائد موجود ہیں۔

(۱) انبیاء کی سنت یہ ہے کہ تبلیغ کی ابتداء اپنے گھر سے کرتے ہیں۔

(۲) جب تبلیغ کرتے ہیں تو حلم، بردباری، حکمت اور دردمندی جیسے اوصاف ان میں نمایاں ہوتے ہیں اور اپنے لہجے کو آخری حد تک نرم رکھتے ہیں۔

(۳) ابتداء میں مشکلات ہوتی ہیں۔ جھٹلایا بھی جاتا ہے، دھتکارا بھی جاتا ہے، دھمکیاں بھی ملتی ہیں لیکن پھر اللہ کی طرف سے رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں، جیسے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام پر باران رحمت نازل ہوئی کہ ان کی نسل میں ایک بڑی امت پیدا ہوئی، ان کی اولاد میں انبیاء، صلحاء اور بالخصوص حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے۔

انبیاء کے ناخلف جانشین:

اس کے بعد سورہ مریم حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت اسماعیل اور حضرت ادریس علیہم السلام کا تذکرہ کرتی

ہے۔اور بتاتی ہے کہ ان انبیاء کے جانشین ایسے لوگ ہوئے جنہوں نے نمازیں ضائع کیں اور خواہشات اور شہوت کی بندگی کا راستہ اختیار کرلیا۔

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾

پھر ان کے بعد ایسے لوگ ان کی جگہ آئے جنہوں نے نمازوں کو برباد کیا، اور اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے چلے۔ چنانچہ ان کی گمراہی بہت جلد ان کے سامنے آجائے گی۔(۵۹)

بعث بعد موت یقینی ہے:

وَيَقُوۡلُ الۡاِنۡسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوۡفَ اُخۡرَجُ حَيًّا ﴿۶۶﴾..........الیٰ..........ثُمَّ نُنَجِّى الَّذِيۡنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيۡنَ فِيۡهَا جِثِيًّا ﴿۷۲﴾

اور (کافر) انسان یہ کہتا ہے کہ: جب میں مر چکا ہوں گا تو کیا واقعی اس وقت مجھے زندہ کر کے نکالا جائے گا؟(۶۶) کیا اس انسان کو یہ بات یاد نہیں آتی کہ ہم نے اسے شروع میں اس وقت پیدا کیا تھا جب وہ کچھ بھی نہیں تھا؟ (۶۷) تو قسم ہے تمہارے پروردگار کی! ہم ان کو اور ان کے ساتھ سارے شیطانوں کو ضرور اکٹھا کریں گے، پھر ان کو دوزخ کے گرد اس طرح لے کر آئیں گے کہ یہ سب گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے۔(۶۸) پھر ان کے ہر گروہ میں سے ان لوگوں کو کھینچ نکالیں گے جو خدائے رحمن کے ساتھ سرکشی کرنے میں زیادہ سخت تھے۔(۶۹) پھر یہ بات ہم ہی خوب جانتے ہیں کہ وہ کون لوگ ہیں جو سب سے پہلے اس دوزخ میں جھونکے جانے کے زیادہ مستحق ہیں۔(۷۰) اور تم میں سے کوئی نہیں ہے جس کا اس (دوزخ) پر گزر نہ ہو۔اس بات کا تمہارے پروردگار نے حتمی طور پر ذمہ لے رکھا ہے۔ (۷۱) پھر جن لوگوں نے تقوی اختیار کیا ہے، انہیں تو ہم نجات دے دیں گے، اور جو ظالم ہیں، انہیں اس حالت میں چھوڑ دیں گے کہ وہ اس (دوزخ میں) گھٹنوں کے بل پڑے ہوں گے۔(۷۲)

صحیح بخاری میں ہے کہ خباب بن ارت صحابیؓ آہنگری کا کام کرتے تھے، جاہلیت کے زمانہ میں عاص بن وائل کافر نے ان سے ایک تلوار بنوائی جس کی قیمت اس کے ذمے قرض تھی۔ زمانۂ اسلام میں خبابؓ نے اس سے اپنے قرض کا تقاضہ کیا، اس نے کہا کہ جب تک تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا انکار نہ کرے گا اس وقت تک میں تیرا قرض نہیں دوں گا۔ خبابؓ نے کہا: واللہ ہرگز ہرگز میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا انکار نہیں کروں گا، یہاں تک کہ تو مرے اور پھر دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے، تو وہ بولا کہ جب میں مر کر زندہ ہوں گا تو وہاں بھی میرے پاس مال اور اولاد سب کچھ ہوگا جیسا کہ اب ہے۔پس اسی وقت تیرا سارا قرض چکادوں گا۔جلدی کیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اسی بدبخت کا قول نقل فرمایا اور اس کا جواب دیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ اس بدبخت کو کیوں کر معلوم ہوا کہ وہاں بھی اس کو مال اور اولاد ملے گا؟ کیا یہ عالم الغیب ہے یا اس نے خدا سے اقرار کرلیا ہے؟ ہم اس کی یہ سب باتیں لکھ رہے ہیں۔قیامت کے دن باز پرس کریں گے

اورسزادیں گے۔(تفسیرادریسی)

سورت کا اختتام:

سورت کے اختتام پر بتایا گیا ہے کہ مومنوں کے لیے اللہ تعالیٰ دلوں میں محبت پیدا کردے گا اور موجودہ مجرموں کو بھی پہلے مجرموں کی طرح ہلاک کردیا جائے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۝ .....الیٰ.........هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ۝

(ہاں) بیشک جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہیں، خدائے رحمن ان کے لیے دلوں میں محبت پیدا کردے گا۔(۹۶) چنانچہ (اے پیغمبر) ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں آسان بنادیا ہے تاکہ تم اس کے ذریعے متقی لوگوں کو خوشخبری دو، اور اسی کے ذریعے ان لوگوں کو ڈراؤ جو ضد کی وجہ سے جھگڑے پر آمادہ ہیں۔(۹۷) ان سے پہلے ہم کتنی ہی قوموں کو ہلاک کرچکے ہیں۔کیا تمہیں ٹٹولنے سے بھی ان میں سے کسی کا پتہ ملتا ہے، یا ان میں سے کسی کی بھنک بھی تمہیں سنائی دیتی ہے؟(۹۸)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ میں اور میری والدہ مسلمان ہونے کے بعد چار سال تک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں رہ کر تحصیل علم کرتے رہے، پھر آپ سے عرض کیا: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے حق میں دعا فرمائیں، آپ نے دعا فرمائی: اے اللہ مومنین کے دل میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے لیے محبت ڈال دے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کی برکت سے جو مومن مجھے دیکھتا مجھ سے محبت کرتا، ہمارے لیے بھی حکم ہے کہ جب کسی بستی میں جائیں تو یوں دعا کریں، **"اللھم حبب صالحیھا الینا و حببنا الیھم"**۔اے اللہ! اس بستی کے نیک لوگوں کے لیے ہمارے دلوں میں محبت ڈال دے اور ان کے دلوں میں ہمارے لیے محبت پیدا کردے، اور محبت کا معیار یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں خدا تعالیٰ کی محبت ہوگی وہ ضرور نیک لوگوں سے محبت کریں گے، اور جو خدا کی محبت سے خالی ہوں گے وہ نیک لوگوں سے بغض رکھیں گے، کافر چونکہ خدا کی محبت سے محروم ہوتے ہیں اس لیے وہ انبیاء اور صالحین سے بغض رکھتے ہیں، بہر حال نیک لوگوں کے لیے محبت خدا تعالیٰ کی طرف سے انعام ہے۔(معالم العرفان: ۱۲/۲۱۷)

فنا فی اللہ:

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے سامنے اپنی خواہشات کو فنا کردیتے ہیں اور خالص اس کے ہوکر رہ جاتے ہیں، ان کی محبت انسانوں کے قلوب میں پیدا کردی جاتی ہے جو کہ حقیقت میں نتیجہ ہوتی ہے خود باری تعالیٰ کی محبت کا۔

اللہ جب اپنے کسی بندہ سے محبت کرتا ہے:

جیسا کہ صحیحین اور مسند احمد میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

اللہ تعالی جب اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام کو بلا کر اطلاع دیتا ہے کہ میں اپنے فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں، تم بھی اس سے محبت کرو، جبرئیلؑ اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر آسمانوں میں اعلان کر دیتا ہے کہ اللہ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو، چنانچہ آسمانوں والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر زمین والوں کے دلوں میں اس کی قبولیت اور محبت رکھ دی جاتی ہے۔

جب اللہ کسی بندہ سے ناراض ہوتے ہیں:

اس کے برعکس جب اللہ کسی بندہ سے ناراض ہوتے ہیں تو اس کی اطلاع جبرئیل کو دیتے ہیں۔ جبرئیل اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں، پھر سارے آسمان والوں کو اس کی اطلاع دیتا ہے، چنانچہ وہ سب سے نفرت کرنے لگتے ہیں، پھر اس نفرت کا اثر زمین پر بھی ظاہر ہوتا ہے اور زمین والے بھی اس سے نفرت شروع کر دیتے ہیں۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

خلاصہ سورۃ:......خیالات فاسدہ (متعلقہ عیسی علیہ السلام) کی اصلاح۔

خلاصہ رکوع:۱......ذکر پیدائش یحییٰ علیہ السلام جو معتاد قانون کے خلاف ہوئی تھی۔ ماخذ: آیت: ۷۔

خلاصہ رکوع :۲......(۱) واقعہ ولادت عیسی علیہ السلام ۔ (۲) اور خلاصہ تعلیم عیسی علیہ السلام ۔ ماخذ: (۱) آیت:۱۶ تا۲۱۔(۲) آیت:۳۰ تا ۳۲۔

خلاصہ رکوع:۳......بعض انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات مختصہ کا ذکر۔ ماخذ: آیت:۴۱،۵۰۔

خلاصہ رکوع: ۴......بعض انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات مختصہ کا ذکر۔ ماخذ: آیت:۵۱، ۵۴، ۵۶۔

خلاصہ رکوع:۵......ابتلاء في الشرک یوم المجازاۃ کے نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ ماخذ: آیت:۶۶، ۸۱۔

خلاصہ رکوع:۶......ذکر نتیجہ سورۃ مریم۔ ماخذ: آیت :۸۸ تا ۹۱۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ طٰہٰ

یہ سورت مکہ مکرمہ کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی تھی۔ مستند روایات سے ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ اسی سورت کو سن کر اسلام لائے تھے۔ ان کی بہن حضرت فاطمہ اور ان کے بہنوئی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہما ان سے پہلے خفیہ طور پر اسلام لا چکے تھے جس کا انہیں پتہ نہیں تھا۔ ایک روز وہ گھر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادے سے نکلے۔ راستے میں نعیم بن عبداللہ نامی ایک صاحب انہیں ملے، انہوں نے حضرت عمر سے کہا کہ آپ پہلے اپنے گھر کی خبر لیں جہاں آپ کی بہن اور بہنوئی مسلمان ہو چکے ہیں۔ حضرت عمر غصے کے عالم میں واپس آئے تو بہن اور بہنوئی حضرت خباب بن ارتؓ سے سورۃ طٰہٰ پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر کو آتے دیکھا تو انہوں نے وہ صحیفہ جس پر سورۃ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی، کہیں چھپا دیا، لیکن حضرت عمر پڑھنے کی آواز سن چکے تھے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تم مسلمان ہو چکے ہو، اور یہ کہہ کر

بہن اور بہنوئی دونوں کو بہت مارا۔ اس وقت ان دونوں نے کہا کہ آپ ہمیں کوئی بھی سزا دیں، ہم مسلمان ہو چکے ہیں، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کلام اللہ تعالی کی طرف سے نازل ہوا ہے، وہ پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر نے کہا کہ اچھا مجھے بھی دکھاؤ، وہ کیسا کلام ہے۔ بہن نے ان سے غسل کروا کر صحیفہ ان کو دکھایا جس میں سورۃ طہٰ لکھی ہوئی تھی۔ اسے پڑھ کر حضرت عمرؓ مبہوت رہ گئے، اور انہیں یقین ہو گیا کہ یہ کسی انسان کا نہیں، اللہ تعالی کا کلام ہے۔ حضرت خبابؓ نے بھی انہیں اسلام لانے کی ترغیب دی، اور بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی ہے کہ اللہ تعالی ابوجہل یا عمر بن خطاب میں سے کسی ایک کو اسلام کی توفیق دے کر اسلام کی قوت کا سامان پیدا فرما دے۔ چنانچہ اسی وقت وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اسلام قبول کر لیا۔

جس زمانے میں یہ سورت نازل ہوئی، وہ مسلمانوں کے لیے بڑی آزمائش اور تکلیفوں کا زمانہ تھا۔ کفار مکہ نے ان پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اس لیے اس سورت کا بنیادی مقصد ان کو تسلی دینا تھا کہ اس قسم کی آزمائشیں حق کے علمبرداروں کو ہر زمانے میں پیش آئی ہیں، لیکن آخری انجام انہی کے حق میں ہوا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں حضرت موسی علیہ السلام کا واقعہ نہایت تفصیل کے ساتھ اسی سورت میں بیان ہوا ہے جس سے دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں، یہ بھی کہ ایمان والوں کو آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور یہ بھی کہ آخری فتح انہی کی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ثابت کرنا مقصود ہے کہ تمام انبیائے کرام کی بنیادی دعوت ایک ہی ہوتی ہے کہ انسان خدائے واحد پر ایمان لائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ (توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی بیسویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۴۵ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۸ رکوع اور ۱۳۵ آیات ہیں، کلمات ۱۲۵۱ اور حروف ۵۴۶۶ ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

ربط:

سورۂ مریم میں توحید و رسالت اور وحی کا مضمون ہے اور تنزیلا ممن خلق' سے توحید کے متعلق مضمون ہے اور ھل اتاک سے حضرت موسی کے قصہ کے ضمن میں توحید و رسالت دونوں کی تقریر ہے، رسالت موسویہ سے رسالت محمدیہ کی توضیح ہے، نیز اوپر کی سورۃ ذکر قرآن پر ختم ہوئی ہے اور یہ سورۃ ذکر قرآن سے شروع ہوئی ہے اس لئے پہلی سورۃ کے خاتمہ اور اس سورۃ کے فاتحہ میں خاص ربط و مناسبت حاصل ہے۔

شان نزول:

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ مکہ میں ابتداء نزول قرآن کے وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز میں بھی پاؤں پر کھڑے ہو کر اس قدر طویل قیام کرتے تھے کہ قدم مبارک ورم کر جاتے، جس کو دیکھ کر کفار قریش کہتے تھے کہ محمد پر قرآن کیا نازل ہوا زحمت میں پڑ گیا، اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔

یہ بھی منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن سے لوگوں کو اس قدر وعظ و پند فرماتے تھے کہ نفس کے سب آرام جاتے رہتے تھے، اس پر کفار کے جھگڑے مزید تھے، تب کفار کہنے لگے کہ قرآن کیا اترا یہ شخص مشقت ومصیبت میں پڑ گیا، اس پر حق تعالی نے فرمایا: اے نبی! میں نے قرآن اس لئے نہیں نازل کیا کہ آپ مصیبت میں پڑ جائیں بلکہ یہ تو خداترس لوگوں کو نصیحت کے لئے ہے۔

فضائل:

محمد بن اسحق بن خزیمہ نے اپنی کتاب ''التوحید'' میں ایک حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالی نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے ایک ہزار سال پہلے سورۃ طٰہٰ اور سورۃ یٰسین کی تلاوت فرمائی، جسے سن کر فرشتے کہنے لگے: وہ امت بہت ہی خوش نصیب ہے جس پر یہ کلام نازل ہوگا اور وہ زبانیں یقیناً مستحق مبارک باد ہیں جن سے خدا کے کلام کے یہ الفاظ وارد ہوں گے (یہ روایت غریب ہے۔)

خلاصہ سورۃ:

سورۃ کی ابتداء قرآن پاک کے تذکرہ سے اس طرح فرمائی گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا گیا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ پر یہ قرآن اس لئے نازل نہیں کیا گیا ہے کہ آپ تکلیف ومشقت میں پڑیں، بلکہ یہ تو اس لئے اتارا گیا ہے کہ اس سے نصیحت حاصل کی جائے، مگر اس سے نصیحت وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو دل میں خدا کا خوف رکھتے ہیں، پھر خدا تعالی نے اپنی ذات پاک کا تعارف فرمایا اور اپنی توحید بیان فرمائی، اس کے بعد حضرت موسی علیہ السلام کی نبوت کے واقعہ کو ذکر فرمایا اور فرعون کے پاس پیغام توحید پہنچانے کا حکم دیا۔

دوسرے رکوع میں حضرت موسی علیہ السلام کی دعا اور درخواست کا ذکر ہے کہ میرے بھائی ہارون کو میرا مددگار بنادیجئے، چنانچہ یہ درخواست منظور فرمائی گئی، نیز حضرت موسی علیہ السلام کی پیدائش، پرورش اور جوانی کے واقعات اور ہر موقع پر اللہ جل شانہ کی دستگیری اور نجات کا تذکرہ ہے۔

تیسرے رکوع میں حضرت موسی علیہ السلام کی تبلیغ اور اس کے مقابلہ میں فرعون کی حیل وحجت اور انکار کا ذکر فرمایا گیا، حضرت موسی علیہ السلام سے جادوگروں کے مقابلہ اور مقابلہ کا انجام ظاہر فرمایا گیا کہ جادوگروں نے فرعون کے غیظ وغضب کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے ایمان کا اظہار کردیا اور اسی پر قائم رہے۔

چوتھے رکوع میں حضرت موسی علیہ السلام کا راتوں رات بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جانا مذکور ہے کہ فرعونی تعاقب میں ناکام ہوئے اور سمندر میں غرق ہوگئے۔

پانچویں رکوع میں ذکر کیا گیا کہ جب حضرت موسی علیہ السلام توریت لینے گئے تو بعد میں بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی شروع کردی اور حضرت ہارون علیہ السلام کے منع کرنے سے باز نہ آئے، حضرت موسی علیہ السلام نے طور سے واپسی

پر یہ حال دیکھ کر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

چھٹے رکوع میں قیامت کے دن کا ذکر ہے کہ اس دن یہ مضبوط اور عظیم الشان پہاڑ کس طرح ریزہ ریزہ ہوجائیں گے اور زمین بالکل ہموار کر دی جائے گی، نیز ایمان اور عمل صالح رکھنے والوں اور برائیوں اور کفر وشرک سے ملوث انسانوں کو ان کے عمل کے مطابق قیامت میں جزاء وسزا دیئے جانے کا تذکرہ فرمایا۔

ساتویں رکوع میں مجمل طور پر حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ کا بیان ہے۔

آٹھویں رکوع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرما کر تلقین فرمائی گئی کہ آپ ان منکرین کی کفر آمیز باتوں پر صبر کیجئے اور شب وروز اپنے پروردگار کی حمد وثنا اور تسبیح وتقدیس کیجئے اور اپنے معبود حقیقی کی طرف توجہ رکھئے، نیز آپ کو اور آپ کے توسط سے امت مسلمہ کو تعلیم دی گئی کہ کفار کے دنیوی ساز وسامان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا چاہئے۔ اخیر میں منکرین کا یہ قول ذکر ہے جو عناداً یہ کہتے ہیں کہ یہ رسول ہمارے پاس ایسی نشانی اپنی نبوت کی کیوں نہیں لاتے جس کو دیکھ کر ہم ان کو نبی ماننے پر مجبور ہوجائیں۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ آپ کی نبوت کی عظیم الشان نشانی یہ قرآن ہے جو ان کے پاس پہنچ چکا ہے، اب ان کے پاس عذر کی کوئی گنجائش نہیں ہے، لہذا اخیر میں منکرین سے فیصلہ کن بات کہہ دینے کی تلقین فرمائی گئی کہ اچھا ہم سب منتظر ہیں، تھوڑا انتظار اور کرلو، تم کو عنقریب معلوم ہوجائے گا کہ راہ راست والے منزل مقصود تک پہنچنے والے کون ہیں؟

وجہ تسمیہ:

آیت نمبر ایک میں ہے طٰہٰ؛ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صفاتی نام ہے، اس سورت میں اسی نام سے آپ کو اللہ نے مخاطب کیا ہے، اسی نام کی مناسبت سے اس سورت کا نام سورۂ طٰہٰ رکھا گیا ہے۔

سورۂ طٰہٰ اور سورۂ مریم میں مناسبت:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سورہ طٰہٰ سورۂ مریم کے بعد نازل ہوئی، دونوں سورتوں کے درمیان مضمون کے اعتبار سے بھی واضح مناسبت پائی جاتی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ جو کہ سورۂ مریم میں اجمالی طور پر مذکور تھا وہ سورہ طٰہٰ میں تفصیل کے ساتھ آیا ہے، اسی طرح سورۂ مریم میں حضرت آدم علیہ السلام کا صرف نام آیا تھا، جب کہ یہاں ان کا واقعہ قدرے وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے، اس سورت میں بھی اصول دین سے بحث کی گئی ہے۔

سورۂ طٰہٰ ہجرت حبشہ سے قبل نازل ہو چکی تھی جب کہ اہل ایمان قریش مکہ کی طرف سے سخت تکالیف برداشت کر رہے تھے، اس سورۃ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی بہن کے گھر میں اسی سورت کی تلاوت سن کر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔

مکی سورت ہونے کے ناطے اس میں زیادہ تر چار بنیادی عقائد (۱) قرآن کی حقانیت وصداقت (۲) توحید (۳)

رسالت اور (۴) معاد کا ذکر ہے۔ اس سورت کا بیشتر حصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات پر مشتمل ہے، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے پیروکاروں کے لیے تسلی کا مضمون ہے کہ تمام تر مصائب برداشت کرنے کے بعد جس طرح فرعون کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کامیابی حاصل ہوئی اسی طرح کفار و مشرکین کی ایذاء رسانیوں پر صبر و تحمل کے صلہ میں بالآخر کامیابی اہل ایمان ہی کے حصے میں آئے گی۔

سورت کی ابتداء میں قرآن کی حقانیت وصداقت کا ذکر ہے، پھر توحید کے ضمن میں سامری کی بچھڑا سازی اور پھر اس کو جلا کر راکھ کر دینے کا تذکرہ ہے، سورۂ ہٰذا میں حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کی کشمکش کا ذکر کر کے اہل ایمان کو خبر دار کیا گیا ہے کہ کہیں شیطان تمہیں بھی بہکا کر جنت سے محروم نہ کر دے جس طرح اس نے تمہارے جدامجد کو کیا تھا۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے قانون امہال وتدریج بھی بیان کیا ہے اور واضح کر دیا ہے کہ ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر ہے جو لمحہ بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہوتا، مصیبت کے وقت صبر کرنے اور نماز پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے، معاد کے سلسلے میں قرآن سے اعراض کرنے والوں کو قیامت والے دن اندھا کر کے اٹھائے جانے کا ذکر ہے، سابقہ نافرمان اقوام کی ہلاکت کو اس امت کے لیے بطور عبرت ذکر کیا گیا ہے، نیز دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ کر کے رفاہیت بالغہ سے بے اعتنائی برتنے کی تاکید کی گئی ہے۔ (معالم العرفان: ۱۳/۲۱،۲۲)

حضرت موسیٰ ؑ کا قصہ بظاہر ایک مقدمے کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور اس وقت کے حالات کی کوئی ظاہری نشانی نہیں ہے، لیکن جن حالات میں یہ مقدمہ زیر سماعت ہے، وہ دوسری باتوں کے ساتھ جن کی طرف یہ مقدمہ اہل مکہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، ان کے کلام سے نہیں، بلکہ بعض اس میں اشارے چھپے ہوئے ہیں۔

جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر کسی ساز وسامان اور لشکر کے تنہا قریش کے خلاف حق کی تبلیغ کے لیے مقرر کیے گئے تھے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی فرعون کی طرف اس عظیم کام کے لیے مقرر کیا گیا تھا کہ فرعون جیسے ظالم و باغی کو ظلم اور بغاوت چھوڑنے کی نصیحت کریں، ان کے ساتھ کوئی فوج نہیں بھیجی گئی، اہل مکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اعتراضات، شبہات، الزامات، چالیں اور مکر کر رہے ہیں وہ وہی ہتھیار ہیں جو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف استعمال کیے تھے۔ پھر دیکھیں کہ وہ اپنی تمام چالوں میں کیسے ناکام ہوا اور آخر کار کون فتح یاب ہوا، فرعون یا حضرت موسیٰ ؑ؟ اسی سلسلے میں خود مسلمانوں کو یقین دلایا گیا ہے کہ وہ اپنے وسائل کی کمی کا موازنہ کفار قریش کے وسائل سے نہ کریں، کیونکہ جس کام میں اللہ کی مدد شامل ہو وہ بالآخر کامیاب ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں وہ تمام امور واضح ہو گئے ہیں جو اہل مکہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تنازعات سے متعلق تھے۔ اس کے بعد ایک مختصر حکم ہے، جو کہ ایک نصیحت ہے جو آپ کو آپ کی اپنی زبان میں سمجھانے کے لیے بھیجی گئی ہے، اگر آپ عمل برآں ہوں گے تو آپ اپنے آپ پر احسان کریں گے، اگر بجا آوری نہیں

کرتے تو آپ کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

پھر حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا اور بتایا گیا کہ آپ جس راستے پر چل رہے ہیں وہ درحقیقت شیطان کی پیروی ہے، بعض اوقات شیطان کے فریب میں آنا ایک عارضی کمزوری ہے، جن میں سے انسان مشکل سے بچ سکتا ہے؛ لیکن انسان کا اصل طریقہ یہ ہے کہ جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی طرح اقرار کرتا ہے، اور توبہ کرتا ہے اور خدا کی عبادت کی طرف لوٹتا ہے۔ بار بار کے اصرار اور بار بار نصیحت کے باوجود غلطیاں کرنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے، جس کا نقصان انسان کو خود اٹھانا پڑتا ہے۔

آخر میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو ان منکرین حق کے بارے میں جلدی نہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے، خدا پاک کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کسی قوم کو اس کے کفر پر فوراً پکڑ نہیں کرتا، بلکہ اسے اس کی اصلاح کے لیے کافی چھوٹ دیتا ہے، لہٰذا آپ بے خوف ہو کر ان لوگوں کے مظالم کو صبر سے برداشت کریں اور تبلیغ کرتے رہیں۔

اس کے لیے نماز کی تاکید کی گئی ہے، تاکہ اہل ایمان صبر، برداشت، قناعت، رضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور خود انحصاری کی صفات کے حامل ہوں، جو دعوتِ حق کی خدمت کے لیے ضروری ہیں۔ (قرآن سارانس گجراتی)

تلاوت اور دعوت میں مشقت:

اصل بات یہ تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی تلاوت اور دعوت دونوں میں بے پناہ مشقت اٹھاتے تھے، راتوں کو نماز میں اتنی طویل قراءت فرماتے کہ پاؤں مبارک پر ورم آجاتا اور پھر انسانوں تک قرآن کے ابلاغ اور دعوت میں بھی اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے تھے اور جب کوئی اس دعوت پر کان نہ دھرتا تو آپ کو بے پناہ غم ہوتا، اسی لیے رب کریم نے کئی مقامات پر آپ کو تسلی دی ہے، یہاں بھی یہی سمجھایا گیا کہ آپ اپنے آپ کو زیادہ مشقت میں نہ ڈالیں، اس قرآن سے ہر کسی کا دل متاثر نہیں ہوسکتا، یہ تو صرف اس شخص کے لیے نصیحت ہے جو (دل میں اللہ کا) خوف رکھتا ہو۔

قرآن شریف نازل کرنے کا مقصد:

طٰهٰ ﴿١﴾ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ﴿٢﴾.......الی.......اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ﴿٨﴾

طٰہٰ (۱) ہم نے تم پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم تکلیف اٹھاؤ (۲) البتہ یہ اس شخص کے لیے ایک نصیحت ہے جو ڈرتا ہو۔ (۳) اسے اس ذات کی طرف سے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا جارہا ہے جس نے زمین اور اونچے اونچے آسمان پیدا کیے ہیں۔ (۴) وہ بڑی رحمت والا عرش پر استوا فرمائے ہوئے ہے۔ (۵) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اور ان کے درمیان جو کچھ ہے وہ سب بھی اسی کی ملکیت ہے، اور زمین کی تہوں کے نیچے جو کچھ ہے وہ بھی۔ (۶) اگر تم کوئی بات بلند آواز سے کہو (یا آہستہ) تو وہ چپکے سے کہی ہوئی باتوں کو، بلکہ اور زیادہ چھپی ہوئی باتوں کو بھی جانتا ہے۔ (۷) اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کے اچھے اچھے نام ہیں۔ (۸)

مخصوص بندوں کی حفاظت کا انتظام:

یہ سمجھانے کے بعد اللہ نے اپنی بعض صفات ذکر فرمائی ہیں تا کہ آپ کو قلبی اطمینان ہو کہ اللہ میرے ساتھ ہے، وہ میری حفاظت کرے گا اور مجھے کسی حال میں بھی تنہا نہیں چھوڑے گا، اس وضاحت کے بعد گویا نمونہ کے طور پر حضرت موسی علیہ السلام کا قصہ ذکر کر کے بتایا گیا ہے کہ اللہ اپنے مخصوص بندوں کی حفاظت کے لیے خصوصی انتظام کرتا ہے۔

سیدنا موسی علیہ السلام

عجیب وغریب واقعات اور اشارات:

حضرت موسی علیہ السلام کا قصہ قرآن کریم میں دوسرے انبیاء کے مقابلے میں زیادہ تفصیل اور تکرار کے ساتھ آیا ہے، کیونکہ اس میں عجیب وغریب واقعات اور اشارات ہیں جو انسان کو اللہ کی نعمتوں اور قدرت کے بارے میں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔

تکرار میں حکمت:

شاید اس تکرار میں ایک حکمت یہ بھی ہو کہ ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی فرعون ہوتا ہے، جس کے مقابلے کے لیے اہل ایمان کو مستعد رکھنا ضروری ہے۔

واقعات میں تقدیم وتاخیر:

یہاں سورۃ طہ میں آیت ۹ سے ۹۸ تک تقریباً مسلسل حضرت موسی علیہ السلام کا قصہ بیان ہوا ہے اور اس میں آپ کی زندگی کے بیشتر واقعات آ گئے ہیں لیکن ان میں تقدیم وتاخیر ہے، مثال کے طور پر آپ کے تذکرہ کی ابتداء مدین سے واپسی، آگ دیکھنے، باری تعالی سے شرف ہم کلامی اور نبوت ملنے کے واقعہ سے ہو رہی ہے اور ولادت کے بعد صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈالنے کا واقعہ بعد میں ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ زمانی ترتیب کے اعتبار سے پہلا واقعہ بعد میں اور دوسرا پہلے پیش آیا تھا، ایسا کرنے کی ایک بڑی وجہ "تفنن" ہے، یعنی ایک ہی واقعہ کو قرآن انداز بدل بدل کر بار بار بیان کرتا ہے، تا کہ پڑھنے والے اکتا بھی نہ جائیں اور ان کی نظر میں واقعے کی جزئیات تلاش کرنے کی بجائے عبرت اور نصیحت کے حصول پر مرکوز رہیں۔

چند عنوانات:

سورہ طہ میں آپ کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان حالات کو ذہن نشین کرنے کے لیے چند عنوانات قائم کیے جا سکتے ہیں یعنی:

◇ باری تعالی کے ساتھ شرف ہم کلامی۔

◇ دریا میں ڈالا جانا۔

◇ اللہ کی طرف سے آپ کو اور آپ کے بھائی حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس جانے کا حکم۔
◇ فرعون کے ساتھ موعظہ حسنہ کے اصول کے تحت مباحثہ۔
◇ اس کے مقابلہ کے لیے جادوگروں کو جمع کرنا۔
◇ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فتح۔
◇ ساحروں کا قبول ایمان۔
◇ راتوں رات بنی اسرائیل کا اللہ کے نبی کی قیادت میں مصر سے خروج۔
◇ فرعون کا بمع لاؤ لشکر تعاقب اور ہلاکت۔
◇ کریم ورحیم مولا کی نعمتوں کے مقابلے میں بنی اسرائیل کا کفران اور ناشکراپن۔
◇ سامری کا بچھڑا بنانا اور اسرائیلیوں کی ضلالت۔
◇ تورات لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طور سے واپسی اور اپنے بھائی پر غصے کا اظہار۔

سات خصوصی انعامات:

ان آیات کے مطالعہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رب کریم کے سات خصوصی انعامات سامنے آئے ہیں:

(۱) فرعون کے ظلم اور پکڑ سے حفاظت جبکہ وہ اور اس کے کارندے نومولود اسرائیلی بچوں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔

(۲) لوگوں کے دلوں میں آپ کی محبت کا ڈالا جانا، یہاں تک کہ جو بھی آپ کو دیکھتا تھا وہ آپ سے محبت کرنے لگتا تھا۔

(۳) آپ کی تربیت اور پرورش کا خصوصی اہتمام اور نگرانی۔

(۴) پوری عزت اور احترام کے ساتھ رضاعت کے لیے حقیقی والدہ کی طرف آپ کو لوٹا دینا۔

(۵) آپ سے ایک قبطی قتل ہو گیا لیکن آپ کو قصاص میں قتل ہونے سے بچا لیا گیا۔

(۶) مدین سے واپسی پر آپ کو نبوت عطا کر دی گئی۔

(۷) اللہ نے آپ کو شرف ہم کلامی بخشا اور اپنے قرب اور محبت کے لیے آپ کو منتخب فرما لیا۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

کہاں سامری کا بنایا جھوٹا خدا اور کہاں عظیم رب!:

اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا۝۹۸ .... الیٰ.........اِذْ یَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِیْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا یَوْمًا۝۱۰۴

حقیقت میں تم سب کا معبود تو بس ایک ہی اللہ ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ (۹۸) (اے پیغمبر) ماضی میں جو حالات گزرے ہیں ان میں سے کچھ واقعات ہم اسی طرح تم کو سناتے ہیں، اور ہم

نے تمہیں خاص اپنے پاس سے ایک نصیحت نامہ عطا کیا ہے۔(۹۹) جو لوگ اس سے منہ موڑیں گے، تو وہ قیامت کے دن بڑا بھاری بوجھ لادے ہوں گے۔(۱۰۰) جس (کے عذاب) میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور قیامت کے دن ان کے لیے یہ بدترین بوجھ ہوگا۔(۱۰۱) جس دن صور پھونکا جائے گا، اور اس دن ہم سارے مجرموں کو گھیر کر اس طرح جمع کریں گے کہ وہ نیلے پڑے ہوں گے۔(۱۰۲) آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں گے کہ تم (قبروں میں یا دنیا میں) دس دن سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔(۱۰۳) جس بارے میں وہ باتیں کریں گے اس کی حقیقت ہمیں خوب معلوم ہے۔ جبکہ ان میں سے جس کا طریقہ سب سے بہتر ہوگا، وہ کہے گا کہ تم ایک دن سے زیادہ نہیں ٹھہرے (۱۰۴)۔

قرآنی قصص کے نزول کی حکمت عملی:

اس قصے کے آخر میں قرآنی قصص کے نزول کی حکمت اور قرآن سے اعراض کرنے والوں کو قیامت کے دن جس سزا کا سامنا کرنا پڑے گا اس کا ذکر ہے، پھر اس کی مناسبت سے قیامت کے ہولناک احوال کا بیان ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ .... الیٰ .... وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾

اور لوگ تم سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں (کہ قیامت میں ان کا کیا بنے گا؟) جواب میں کہہ دو کہ میرا پروردگار ان کو دھول کی طرح اڑا دے گا۔(۱۰۵) اور زمین کو ایسا ہموار چٹیل میدان بنا کر چھوڑے گا۔(۱۰۶) کہ اس میں تمہیں نہ کوئی بل نظر آئے گا، نہ کوئی ابھار۔(۱۰۷) یہ سن کر سب کے سب منادی کے پیچھے اس طرح چلے آئیں گے کہ اس کے سامنے کوئی ٹیڑھ نہیں دکھا سکیں گے۔ اور خدائے رحمن کے آگے تمام آوازیں دب کر رہ جائیں گی، چنانچہ تمہیں پاؤں کی سرسراہٹ کے سوا کچھ سنائی نہیں دے گا۔(۱۰۸) اس دن کسی کی سفارش کام نہیں آئے گی، سوائے اس شخص (کی سفارش) کے جسے خدائے رحمن نے اجازت دے دی ہو، اور جس کے بولنے پر وہ راضی ہو۔(۱۰۹) وہ لوگوں کی ساری اگلی پچھلی باتوں کو جانتا ہے، اور وہ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے۔(۱۱۰) اور سارے کے سارے چہرے حی و قیوم کے آگے جھکے ہوں گے، اور جو کوئی ظلم کا بوجھ لاد کر لایا ہوگا نامراد ہوگا۔(۱۱۱) اور جس نے نیک عمل کیے ہوں گے جبکہ وہ مومن بھی ہو تو اسے نہ کسی زیادتی کا اندیشہ ہوگا، نہ کسی حق تلفی کا۔(۱۱۲) اور ہم نے اسی طرح یہ وحی ایک عربی قرآن کی شکل میں نازل کی ہے، اور اس میں تنبیہات کو طرح طرح سے بیان کیا ہے، تاکہ لوگ پرہیزگاری اختیار کریں، یا یہ قرآن ان میں کچھ سوچ سمجھ پیدا کرے۔(۱۱۳)

بھول چوک انسان کی فطرت:

یہ بتلانے کے لیے کہ بھول چوک انسان کی فطرت میں داخل ہے، پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے نسیان کا ذکر کیا گیا ہے، پھر ابلیس کے ساتھ ان کا معاملہ ہوا تھا اسے بیان کیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ إِلَىٰٓ ءَادَمَ مِن قَبْلُ...... الی........ ثُمَّ ٱجْتَبَٰهُ رَبُّهُۥ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ ﴿۱۲۲﴾

اور ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک بات کی تاکید کی تھی، پھر ان سے بھول ہوگئی، اور ہم نے ان میں عزم نہیں پایا۔ (۱۱۵) یاد کرو وہ وقت جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو، چنانچہ سب نے سجدہ کیا، البتہ ابلیس تھا جس نے انکار کیا۔(۱۱۶) چنانچہ ہم نے کہا کہ: اے آدم! یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے، لہذا ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو جنت سے نکلوادے، اور تم مشقت میں پڑ جاؤ۔(۱۱۷) یہاں تو تمہیں یہ فائدہ ہے کہ نہ تم بھوکے ہوگے، نہ ننگے۔(۱۱۸) اور نہ یہاں پیاسے رہوگے، نہ دھوپ میں تپوگے۔(۱۱۹) پھر شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا۔ کہنے لگا: اے آدم! کیا میں تمہیں ایک ایسا درخت بتاؤں جس سے جاودانی زندگی اور وہ بادشاہی حاصل ہوجاتی ہے جو کبھی پرانی نہیں پڑتی؟ (۱۲۰) چنانچہ ان دونوں نے اس درخت میں سے کچھ کھالیا جس سے ان دونوں کے شرم کے مقامات ان کے سامنے کھل گئے، اور وہ دونوں جنت کے پتوں کو اپنے اوپر گانٹھنے لگے۔ اور (اس طرح) آدم نے اپنے رب کا کہا ٹالا، اور بھٹک گئے۔(۱۲۱) پھر ان کے رب نے انہیں چن لیا، چنانچہ ان کی توبہ قبول فرمائی، اور انہیں ہدایت عطا فرمائی۔(۱۲۲)

عصمت انبیاء:

عصمت انبیاء کے بارے مین مختصراً چند باتیں ذکر کی جاتی ہیں:

(۱) اہل حق کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام خداوند ذوالجلال کی نافرمانی سے معصوم ہوتے ہیں۔ صغیرہ اور کبیرہ سے پاک اور منزہ ہوتے ہیں، ''قصداً اور ارادتاً'' ان سے حق تعالیٰ کی نافرمانی ممکن نہیں۔

(۲) عصمت کے معنی یہ ہیں کہ ظاہر و باطن نفس اور شیطان کی مداخلت سے بالکلیہ پاک اور منزہ ہوں اور نفس اور شیطان یہی دونوں چیزیں مادہ معصیت ہیں اور مادہ معصیت سے پاک ہونے ہی کا نام عصمت ہے۔

ملائکہ بھی معصوم ہوتے ہیں مگر ان کی عصمت اضطراری ہوتی ہے کہ ان میں شر کا مادہ اور داعیہ ہی نہیں ہوتا۔ بخلاف انبیاء کرام علیہم السلام کے کہ ان کی عصمت اختیاری ہوتی ہے، اس لیے کہ ان میں بمقتضائے بشریت مادہ نفسانیت ہوتا ہے مگر حفاظت ربانی اور تائید یزدانی ان کی محافظ اور نگہبان ہوتی ہے کہ مجال نہیں کہ مادہ معصیت ذرہ برابر ان کو جادہ اطاعت سے ہٹا سکے یا کوئی ایسی چیز ان سے سرزد ہوسکے جو کہ ان کے دامن عصمت کو آلودہ کرسکے۔ حق جل شانہ کی نظر عنایت اور فرشتوں کی محافظت ان کو اپنے احاطہ میں لیے ہوتی ہے اور ان کا قدم اس احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔

(۳) انبیاء کرام میں نفوس ہوتے ہیں مگر وہ نفوس قدسیہ ہوتے ہیں اور عصمت و نزاہت میں ملائکہ کے ہمرنگ ہوتے ہیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام اگرچہ ظاہر میں بشر ہوتے ہیں مگر مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے فرشتوں کے ساتھ متحد ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے انبیاء کرام علیہم السلام کسی مباح اور جائز امر کا ہوائے نفسانی کی بناء پر ارتکاب نہیں کرتے، بلکہ مباح کے اباحت بیان کرنے کے لیے مباح اور امر جائز کا ارتکاب کرتے ہیں جو کہ عین تشریع ہے، نبی پر جس طرح فرض کے فرضیت

کا بیان کرنا فرض ہے اسی طرح مباح کی اباحت کا بیان کرنا بھی فرض ہے، کیونکہ تبلیغ احکام نبی پر فرض ہے۔

بخلاف اولیاء کے کہ وہ بسا اوقات مباحات کو محض اپنی ہوا نفسانی کی بنا پر بھی کرتے ہیں، اس لیے اہل سنت والجماعت کا اجماعی مسلک یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام معصوم ہیں اور اولیاء محفوظ ہیں۔ ہوائے نفس سے بالکلیہ پاک اور منزہ نہیں بخلاف نبی کے کہ وہ ہوائے نفس سے بالکل پاک اور منزہ ہوتا ہے۔ **وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی۔ قل ما یکون فی ان ابدلہ من تلقای ء نفسی ان اتبع الا ما یوحی الی۔** معاذ اللہ انبیاء کرامؑ ہماری طرح اسیر حرص وشہوت نہیں ہوتے۔ ورنہ خدا تعالیٰ ہم پر ان کی بے چون وچرا اطاعت فرض نہ کرتا۔ اور نبی کریم ﷺ کو جو خلاصہ موجودات اور زبدۂ کائنات ہیں ان کو انبیاء کرام علیہ السلام کی اقتداء کا حکم نہ دیتا اور یہ ارشاد نہ فرماتا: **اولئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ۔** (تفسیر ادریسی: ۵/ ۱۷۱، ۱۷۲)

اللہ کی یاد سے اطمینان ملے گا:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾........الی.....اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾

اور جو میری نصیحت سے منہ موڑے گا تو اس کو بڑی تنگ زندگی ملے گی، اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ (۱۲۴) وہ کہے گا کہ: یا رب! تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا، حالانکہ میں تو آنکھوں والا تھا؟ (۱۲۵) اللہ کہے گا: اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئی تھیں، مگر تو نے انہیں بھلا دیا۔ اور آج اسی طرح تجھے بھلا دیا جائے گا۔ (۱۲۶) اور جو شخص حد سے گزر جاتا ہے، اور اپنے پروردگار کی نشانیوں پر ایمان نہیں لاتا، اسے ہم اسی طرح سزا دیتے ہیں، اور آخرت کا عذاب واقعی زیادہ سخت اور زیادہ دیر رہنے والا ہے۔ (۱۲۷) پھر کیا ان لوگوں کو اس بات نے بھی کوئی ہدایت کا سبق نہیں دیا کہ ان سے پہلے کتنی نسلیں تھیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا، جن کی بستیوں میں یہ لوگ چلتے پھرتے بھی ہیں؟ یقیناً جن لوگوں کے پاس عقل ہے، ان کے لیے اس بات میں عبرت کے بڑے سامان ہیں۔ (۱۲۸)

مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآن سے اعراض کی مختلف صورتیں ہیں:

(۱) اس کی تلاوت کی طرف کوئی دھیان نہ دے۔

(۲) قرآن پڑھنے اور سیکھنے کی فکر نہ کرے۔

(۳) قرآن کریم پڑھے مگر غلط سلط، تصحیح حروف کی فکر نہ کرے۔

(۴) صحیح پڑھے مگر بے توجہی اور بے دلی سے۔

(۵) قرآن کریم کے احکام کو سمجھنے کی طرف توجہ نہ دے۔

(۶) اور سمجھنے کے بعد عمل کی طرف توجہ نہ دینا بھی قرآن سے اعراض ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ انسان کے برے اعمال اور گناہ قیامت کے روز ایک بوجھ کی صورت میں اس کے اوپر لاد دیئے جائیں گے۔(خلاصہ مضامین قرآن کریم)

تم بھی منتظر رہو:

آخری آیت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ ان معاندین سے کہہ دیجئے کہ

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿١٣٥﴾

(اے پیغمبران سے) کہہ دو کہ: (ہم) سب انتظار کر رہے ہیں، لہذا تم بھی انتظار کرو، کیونکہ عنقریب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ سیدھے راستے والے لوگ کون ہیں، اور کون ہیں جو ہدایت پا گئے ہیں؟ (۱۳۵) (خلاصۃ القرآن: م اش)

یعنی دلیلیں اور حجتیں تو ساری تمام ہو چکیں۔ اب اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا تم بھی انتظار کرو، اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں، وہ وقت دور نہیں جب ہر شخص کے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو کر واضح ہو جائے گا۔

عنوان سورۃ:......دعوت الی التوحید۔

خلاصہ رکوع:۱......رحمٰن کی رحمت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان کی رہنمائی کے لئے ہدایات بھیجی جائیں لیکن مستفید فطرت سلیمہ والے ہی ہوں گے۔ ماخذ: آیت: ۳ تا ۵۔

خلاصہ رکوع: ۲......ہارون علیہ السلام کی نبوت کے لئے موسیٰ علیہ السلام کی سفارش مع ذکر احسانات موسیٰ علیہ السلام۔ ماخذ: آیت: ۲۹ تا ۳۱، ۳۷ تا ۴۱۔

خلاصہ رکوع: ۳......(۱) ممسوخ الفطرت والوں کا تسلیم حق سے انکار کرنا۔ (۲) اور سلیم الفطرت والوں کا سر تسلیم خم کرنا۔ ماخذ: (۱) آیت: ۵۶۔ (۲) آیت: ۷۰۔

خلاصہ رکوع: ۴......اتمام حجت کے بعد موسیٰ علیہ السلام کا مصر سے خروج اور معاندین حق کا ان کے پیچھے پڑ کر تباہ ہونا۔ ماخذ: آیت: ۷۷، ۷۸۔

خلاصہ رکوع:۵......(۱) ہارون علیہ السلام کا بنی اسرائیل کی اصلاح سے عاجز آجانا۔ (۲) اور موسیٰ علیہ السلام کے آنے سے اصلاح ہونا۔ ماخذ: (۱) آیت: ۹۱۔ (۲) آیت: ۹۷۔

خلاصہ رکوع:۶......معرضین حق کے لئے شفاعت نہیں ہوگی۔ ماخذ: آیت: ۱۰۹۔

خلاصہ رکوع: ۷......(۱) واقعہ عصیان آدم علیہ السلام۔ (۲) اور عصیان کے ازالہ کے لئے تذکیر کی ضرورت ہے۔ (۳) اور اعراض ذکر سے عمی کا باقی رہنا۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۲۱۔ (۲) آیت: ۱۲۳۔ (۳) آیت: ۱۲۵۔

خلاصہ رکوع: ۸......تلقین صبر اور تعلق باللہ کی درستی کے لئے شب و روز سعی جاری رہے۔ ماخذ: آیت: ۱۳۰۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سولہویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) دعا آہستگی سے مانگنا مستحب ہے۔

(۲) اللہ کی قدرت اسباب کے اوپر ہے، اگر اللہ چاہے تو اسباب کو موقوف کردے اور اس کے بغیر ہی عطا کردے۔

(۳) انبیاء کے وارث مال میں نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالی ان کی اولاد کو نبوت اور علم وحکمت ودانائی عطا فرما دیتے ہیں۔

(۴) جس بچے کو حفظ قرآن کی دولت کم سنی میں ہی دے دی گئی تو اس کو حکمت ودانائی عطاء کردی گئی۔

(۵) اولیاء اللہ سے کرامات کا ظہور یہ حق ہے۔

(۶) لازم ہے والدین کے ساتھ نیکی کرنا احسان کے ساتھ اور ان کی اطاعت کرنا معروف کاموں میں اور ان سے تکلیف کو دور کرنا۔

(۷) اللہ تعالی نے جس چیز کو برکت والا بنایا ہے اس سے برکت حاصل کرنا جائز ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے اور آپ کی تعلیمات کے مطابق۔

(۸) مومن کی شجاعت یہ ہے کہ وہ خوفزدہ نہیں ہوتا قتل یا سولی کے ڈر سے۔

(۹) دنیا کی تکلیف کو برداشت کرنا اور صبر کرنا آسان ہوجاتا ہے، اگر آدمی کی نظر آخرت کے عذاب پر ہو۔

(۱۰) اللہ کا غضب عبادات کے ترک اور اوامر ونواہی کی خلاف ورزی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

* * *

پارہ:۱۷

سورۃ الانبیاء

اس سورت کا بنیادی مقصد اسلام کے بنیادی عقائد یعنی توحید، رسالت اور آخرت کا اثبات ہے، اور ان عقائد کے خلاف کفار مکہ جو اعتراضات اٹھایا کرتے تھے، سورت میں ان کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ان لوگوں کا ایک اعتراض یہ تھا کہ ایک ہم جیسے انسان کو پیغمبر بنا کر کیوں بھیجا گیا ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ انسانوں کے پاس انسان ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجنا مناسب تھا، اور اس ضمن میں بہت سے پچھلے پیغمبروں کا حوالہ دیا گیا ہے کہ وہ سب انسان ہی تھے، اور انہوں نے اپنی اپنی قوموں کو انہی عقائد کی تعلیم دی تھی جو حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے عقائد ہیں۔ انبیائے کرام کے اسی حوالے کی بنا پر اس سورت کا نام سورۃ الانبیاء رکھا گیا ہے۔ (توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی اکیسویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۷۳ نمبر پر ہے، اس میں سات رکوع، ۱۱۲ آیات، ۱۱۸۷ کلمات اور ۵۱۵۴ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

چونکہ اس سورۃ میں مسلسل متعدد انبیاء کا ذکر آیا ہے اس لئے اس کا نام بطور علامت سورۃ الانبیاء رکھ دیا گیا۔

ربط:

سورۂ طٰہٰ میں بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ پیغام دیا تھا کہ وہ قوم میں '' **لا الہ الا انا فاعبدنی** '' کی تبلیغ کریں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاجت روا اور کارساز نہیں لہٰذا اسی کو پکاریں، اب سورۂ انبیاء میں یہ بتایا گیا ہے کہ نہ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرف یہی وحی کی گئی تھی، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدونی '' کہ اللہ کے سوا کوئی حاجت روا اور مشکل کشا نہیں لہٰذا اسی کو پکارو۔

سورہ بنی اسرائیل میں تحقیق معاد، تحقیق نبوت، تحقیق توحید اور توحید و رسالت کی تائید کے لئے بعض انبیاء علیہم السلام کے قصے مذکور ہیں اور یہ مضامین بالخصوص قصص کا مضمون وجہ ارتباط ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں خاص طور پر حسب ذیل امور زیر بحث آئے ہیں:

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کفار مکہ اور مشرکین عرب کو جو غلط فہمیاں تھیں ان کا بڑی تفصیل سے رد کیا

گیا ہے۔

(۲) قرآن کریم پر کفار جو اعتراضات کیا کرتے تھے ان کا جواب دیا گیا ہے۔

(۳) مکذبین ومنکرین دین حق کی تباہی وبربادی کے عبرتناک واقعات سے کفار مکہ کو ڈرایا گیا ہے۔

(۴) شرک کی تردید میں اللہ تعالی کے لئے اولاد کے غلط عقیدہ کا پرزور رد فرمایا گیا ہے۔

(۵) انسانی جبلت کا بیان کہ آدمی جلدی کا بنا ہوا ہے، اس لئے وہ یوں چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ ابھی ہو جائے۔

(۶) انبیاء کے ساتھ منکرین کے استہزاء کا انجام کہ عذاب الٰہی سے بچنا ممکن نہیں۔

(۷) گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات وحالات کا تذکرہ؛ جس سے یہ سمجھایا گیا ہے کہ سارے انبیاء کرام انسان ہی تھے فرشتے نہ تھے اور تمام انبیاء کی اصل یہی دین اسلام تھا جو اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں، اخیر میں بتلایا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائنات کے لئے رحمت ہیں اور اب انسانوں کی نجات کا انحصار آپ کی پیروی اختیار کرنے پر ہے، جو اسے پوری طرح قبول کریں گے وہی خدا کی آخری عدالت سے کامیاب نکلیں گے اور جو لوگ اسے رد کریں گے وہ آخرت میں بدترین انجام سے دوچار ہوں گے، حاصل یہ کہ اس سورۃ میں انسان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے مضامین کا بیان ہے۔ انسان دنیا کے دھندوں میں اس طرح پھنسا ہوا ہے گویا اسے ہمیشہ یہیں رہنا ہے، اس لئے ابتداء سورۃ میں اللہ جل شانہ لوگوں کو متنبہ فرما رہے ہیں کہ قیامت قریب آ گئی ہے، حساب کتاب کی گھڑی سر پر کھڑی ہے۔

اس مضمون کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اپنی دو انگلیاں کھڑی کر کے ارشاد فرمایا کہ میں ایسے وقت پر مبعوث کیا گیا ہوں کہ میں اور قیامت دو انگلیوں کی طرح ہیں، یعنی میرے بعد قیامت ہی ہے کوئی اور نبی آنے والا نہیں ہے، تو معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس بات کی علامت ہے کہ نوع انسانی کی تاریخ اب اپنے آخری دور میں داخل ہو چکی ہے، آغاز اور وسط کے مراحل گزر چکے ہیں اور اب آخری مرحلہ شروع ہو چکا ہے جس کا خاتمہ قیامت ہی پر ہونا ہے واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

میری قدیم دولت اور کمائی:

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سورہ بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہ اور انبیاء نزول کے اعتبار سے پہلی اور میری قدیم دولت اور کمائی ہیں"۔

دنیا کی زندگی کا زوال:

سورۃ الانبیاء کی ابتداء میں دنیا کی زندگی کے زوال کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

قیامت کا وقوع:

گزشتہ سورت کے آخر میں ذکر خداوندی سے اعراض کرنے والوں اور آخرت سے غفلت برتنے والوں کی مذمت کا

بیان تھا۔ ومن اعرض عن ذکری فان له معیشة ضنکا ونحشره یوم القیمة اعمی۔ اوراس کے بعد کی آیت ولا تمدن عینیک الی مامتعنا به ازواجامنهم زهرة الحیوة الدنیا، لنفتنهم فیه۔ میں دنیا کے سامان زیبائش وآرائش پر نظر کرنے کی ممانعت تھی، کیونکہ دنیا کی رونق پر نظر کرنا فتنہ عظیم ہے اور آخرت سے غفلت کا سبب ہے، اس لیے ان آیات میں قرب ساعت (یعنی قرب قیامت) کی خبر دیتے ہیں کہ خواب غفلت سے بیدار ہوجائیں اور آخرت کی فکر کریں۔ اور اس کے لیے کچھ تیاری کریں اور انبیاء کی ہدایت پر عمل کریں۔ (تفسیر ادریسی: ۱۸۰/۵)

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ①

لوگوں کے لیے ان کے حساب کا وقت قریب آ پہنچا ہے، اور وہ ہیں کہ غفلت کی حالت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔

یعنی حساب و کتاب اور مجازات کی گھڑی سر پر کھڑی ہے لیکن یہ لوگ (مشرکین وغیرہ) سخت غفلت و جہالت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ کوئی تیاری قیامت کی جوابدہی کے لیے نہیں کرتے۔ اور جب آیات اللہ سنا کر خواب غفلت سے چونکائے جاتے ہیں تو نصیحت سن کر نہایت لاپرواہی کے ساتھ ٹلا دیتے ہیں۔ گویا کبھی ان کو خدا تعالیٰ کے حضور پیش ہونا اور حساب دینا ہی نہیں۔ سچ ہے ''اَلنَّاسُ فِیْ غَفَلَاتِهِمْ وَرَحَی الْمَنِیَّةِ تَطْحَنُ''۔ (تفسیر عثمانی: ۴۲۹)

عظمت والا کلام:

ان کے سامنے جب بھی کوئی نئی آیت آتی ہے اس کا مذاق اڑاتے اور اسے جھٹلا دیتے ہیں، وہ جانتے ہی نہیں کہ اس عظمت والے کلام کو کس سنجیدگی، وقار اور عاجزی کے ساتھ سننا چاہیے۔

یہ رسول نہیں ہے:

مشرکین آپس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ شخص جو رسالت کا دعوے دار ہے، یہ رسول نہیں ہے، بلکہ تمہارے جیسا ایک انسان ہے اور یہ دوسرے انبیاء جیسے مادی معجزات کے پیش کرنے سے عاجز ہے۔

لَاهِیَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاَسَرُّوا النَّجْوَی ۖ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ③

کہ ان کے دل فضولیات میں منہمک ہوتے ہیں۔ اور یہ ظالم چپکے چپکے (ایک دوسرے سے) سرگوشی کرتے ہیں کہ: یہ شخص (یعنی محمد ﷺ) تم ہی جیسا ایک انسان نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا پھر بھی تم سوجھتے بوجھتے جادو کی بات سننے جاؤ گے؟

قرآن کا جواب:

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ⑦ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِیْنَ ⑧

قرآن نے جواب دیا ہے کہ جتنے بھی انبیاء پہلے آئے ہیں وہ سب کے سب انسان تھے، کھاتے پیتے تھے اور

دوسرے انسانی تقاضے بھی پورے کرتے تھے، کوئی ایک نبی ایسا نہیں تھا جو بشری تقاضوں سے پاک ہو۔

ایسی کتاب جس میں تمہارا تذکرہ ہے:

جہاں تک معجزات کا تعلق ہے تو قرآن سے بڑا معجزہ کون سا ہوسکتا ہے؟ اس کے وجوہ اعجاز میں سے ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن کے آئینہ میں مختلف عقائد وخیالات اور اخلاق واعمال کے لوگ اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں، اس میں ہر قوم اور ہر شخص کا تذکرہ موجود ہے، کہیں صراحۃً اور کہیں اشارۃً ۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰

”(اب) ہم نے تمہارے پاس ایک ایسی کتاب اتاری ہے جس میں تمہارے لیے نصیحت ہے۔ کیا پھر بھی تم نہیں سمجھتے؟ (۱۰)

اس آیت کا ایک ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم نے تمہارے پاس ایک ایسی کتاب اتاری ہے جس میں تمہارے ہی ذکر خیر کا سامان ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ کتاب عربی زبان میں نازل کی گئی ہے، جس کے براہ راست مخاطب تم عرب لوگ ہو، اور یہ تمہارے لیے بہت بڑے اعزاز کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا آخر کلام تم پر تمہاری زبان میں نازل فرمایا، اور اس سے رہتی دنیا تک دنیا کی ساری قوموں میں تمہارا ذکر خیر جاری رہے گا۔ (توضیح القرآن)

قرآن لانا؛ میں اپنا تذکرہ تلاش کروں:

مشہور تابعی اور عرب سردار حضرت احنف بن قیس رحمہ اللہ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک دن بیٹھے ہوئے تھے، کسی نے یہی آیت پڑھ دی، وہ چونک پڑے اور کہا ذرا قرآن مجید تو لانا، میں اس میں اپنا تذکرہ تلاش کروں اور دیکھوں میں کن لوگوں کے ساتھ ہوں اور کن لوگوں سے مجھے مشابہت ہے، وہ قرآن کے اوراق الٹتے رہے اور مختلف لوگوں کے احوال پڑھتے رہے۔

◇ پہلے انہوں نے وہ آیات پڑھیں جن کے اندر ان سعادت مندوں کا تذکرہ ہے جن میں سے کسی نے جان اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کردی، کسی نے سارا مال خرچ کردیا، کوئی رات بھر بستر سے جدا رہتا ہے اور کوئی برائی کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔

◇ پھر وہ آیات پڑھیں جن میں مشرکوں، کافروں، منافقوں اور فاسقوں کا ذکر ہے، دونوں قسم کی آیات پڑھنے کے بعد وہ کہہ اٹھے کہ:

”اے اللہ! میں ان دونوں گروہوں میں سے نہیں ہوں۔“

◇ پھر انہوں نے سورۂ توبہ کی وہ آیت پڑھی جس میں ایسے لوگوں کا ذکر ہے جن سے گناہ بھی ہوئے اور انہوں نے

نیک اعمال بھی کیے، یہ آیت کریمہ پڑھ گروہ پکار اٹھے کہ: ''ہاں! یہ میرا تذکرہ ہے۔''

یوں بالآخر انہوں نے قرآن میں اپنا تذکرہ تلاش کر ہی لیا۔

مشرکین کی مضحکہ خیز اور حماقت آمیز حرکتیں:

مشرکین کی مضحکہ خیز اور حماقت آمیز حرکتوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ قرآن کے بارے میں کسی ایک رائے پر متفق نہ تھے (۱) کبھی کہتے کہ یہ سحر ہے۔ (۲) کبھی کہتے یہ شعر ہے۔ (۳) کبھی کہتے یہ خواب پریشاں ہے۔ (۴) کبھی اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا افتراء بتاتے (۵) اور کبھی کسی سے سیکھا ہوا کلام قرار دیتے۔

قرآن کہتا ہے:

ان کے اضطراب اور اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

''بلکہ وہ کہتے ہیں کہ

◇ یہ قرآن خواب پریشان ہے۔ ◇ بلکہ اس نے اس کو اپنی طرف سے بنالیا ہے۔ ◇ بلکہ یہ شاعر (اور قرآن شعر) ہے۔ ◇ تو جیسے (مادی) معجزات پہلے انبیاء لے آئے تھے اسی طرح یہ بھی لائے''۔

ظالم قوموں کا انجام:

سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ اگر تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لاتے تو گذشتہ امتوں کی تاریخ کی ورق گردانی کرو اور دیکھو کہ کتنی قومیں اسی انکار پر ہلاک کردی گئیں۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۱۱﴾

اس کے بعد قرآن نے مشرکین کو ان ظالم قوموں کے انجام کی طرف متوجہ کیا ہے جنہیں اللہ نے بصارت اور بصیرت رکھنے والوں کے لیے عبرت کا سامان بنادیا، ان تباہ شدہ قوموں نے جب عذاب الٰہی کے آثار دیکھے تو بھاگ نکلنے کی کوشش کی، لیکن اللہ نے انہیں مہلت نہ دی اور انہیں راکھ کا ڈھیر بنادیا۔ (۱۱۔۱۵)

اب بھاگنے کی کوشش نہ کرو:

ان سے کہا گیا: اب بھاگنے کی کوشش نہ کرو؛ بلکہ واپس لوٹو اسی عیش وعشرت کی طرف جس نے تمہیں مدہوش کر رکھا تھا، انہی بلند وبالا مکانات کی طرف جن پر تمہیں بڑا ناز تھا، انہی قصبوں اور محلوں کی طرف جہاں تم اکڑ اکڑ کر چلا کرتے تھے، وہاں جاؤ تاکہ جب سوال کرنے والے تم سے نزول عذاب کے منظر کے بارے میں سوال کریں تو تم انہیں جواب دے سکو۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ بات انہیں استہزاء اور تذلیل کے طور پر کہی گئی تھی۔

اللہ نے یہ سب کچھ لہولعب کے لیے پیدا نہیں کیا:

ابتداء سورت سے لیکر یہاں تک کا مضمون تحقیق نبوت ورسالت سے متعلق تھا، اب آئندہ آیات میں توحید کا اثبات

اور شرک کا ابطال فرماتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ آسمان وزمین کی پیدائش میں غور وفکر کرو، تاکہ تم کو اللہ کی معرفت حاصل ہو، عالم علوی اور عالم سفلی کی تمام چیزیں اللہ کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں۔

(یا یوں کہو) کہ گزشتہ آیات میں کفار کی غفلت اور اعراض اور ان کے لہو ولعب کو بیان کیا، اب آگے یہ بیان کرتے ہیں کہ عالم کی پیدائش کھیل تماشہ نہیں بلکہ حق اور باطل میں فرق کرنے کے لیے یہ عالم پیدا کیا گیا ہے کہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ وہ دنیا میں آزاد ہے جو چاہے کرے، نہ عذاب ہے اور ثواب ہے اور نہ کوئی دارو گیر اور پکڑ دھکڑ ہے۔ **ایحسب الانسان ان یترک سدی**۔ تم کو چاہیے کہ آسمان اور زمین کی پیدائش کو کھیل اور تماشہ نہ سمجھو بلکہ اس کے عجائب وغرائب میں نظر اور فکر سے کام لو اور گزشتہ بستیوں کو جو ہلاک اور برباد کیا گیا، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ انہوں نے دنیا کو کھیل اور تماشہ سمجھا اور جس غرض کے لیے دنیا پیدا کی گئی اس سے غفلت اور اعراض برتا۔ اور آسمان وزمین کے عجائب میں غور وفکر سے اس کے صانع اور خالق کا پتہ نہ لگایا اور انبیاء ورسل نے جب ان کو خبردار کیا تو ان کی تکذیب کی۔ حق تعالیٰ نے اس تکذیب کی پاداش میں ان پر عذاب نازل کیا۔ (تفسیر ادریسی: ۵/۱۸۸)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ⑯

کائنات کی اس کھلی ہوئی کتاب میں رب العالمین کی وحدانیت کے بے شمار دلائل بکھرے ہوئے ہیں، اس کائنات میں ارض وسماء، شمس وقمر اور لیل ونہار وغیرہ کی صورت میں جو کچھ بھی ہے اسے اللہ نے لہو ولعب کے لیے پیدا نہیں کیا؛ بلکہ حکمت کے تحت اور اس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے کہ انسان اس میں غور وفکر کرے اور عبرت حاصل کرے، اس عالم رنگ و بو کی ہر چیز اللہ کی اطاعت اور تسبیح میں لگی ہوئی ہے، سوائے کافر انسان کے جس نے اپنا وتیرہ غفلت اور سرکشی کو بنا لیا ہے۔ (۱۶-۲۰)

مشرکین کا باطل نظریہ:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ㉒

اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا دوسرے خدا ہوتے تو دونوں درہم برہم ہو جاتے۔ لہٰذا عرش کا مالک اللہ ان باتوں سے بالکل پاک ہے جو یہ لوگ بنایا کرتے ہیں۔

یہ توحید کی ایک عام فہم دلیل ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر اس کائنات میں ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو ہر خدا مستقل خدائی کا حامل ہوتا، اور کوئی کسی کا تابع نہ ہوتا۔ اس صورت میں ان کے فیصلوں کے درمیان اختلاف بھی ہو سکتا تھا۔ اب اگر ایک خدا نے ایک فیصلہ کیا، اور دوسرے خدا نے دوسرا فیصلہ تو یا تو ان میں سے ایک دوسرے کے آگے ہار مان لیتا، تو پھر وہ خدا ہی کیا ہوا جو کسی سے ہار مان لے، یا دونوں اپنے اپنے فیصلے کو نافذ کرنے کے لیے زور لگاتے تو متضاد فیصلوں کی تنفیذ سے آسمان اور زمین کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اسی دلیل کی ایک دوسری تشریح یہ بھی کی جا سکتی ہے کہ جو لوگ آسمان اور زمین

کے لیے الگ الگ خدا مانتے ہیں، ان کا یہ عقیدہ اس لیے بالکل باطل ہے کہ مشاہدے سے یہ بات ثابت ہے کہ یہ پوری کائنات ایک ہی مربوط نظام میں بندھی ہوئی ہے۔ چاند، سورج اور ستاروں سے لے کر دریاؤں، پہاڑوں اور زمین کی نباتات اور جمادات تک سب میں ایک ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان سب کو ایک ہی ارادے، ایک ہی مشیت اور ایک ہی منصوبہ بندی نے کام پر لگا رکھا ہے۔ اگر آسمان اور زمین کے خدا الگ الگ ہوتے تو کائنات میں اس ربط اور ہم آہنگی کا فقدان ہوتا، جس کے نتیجے میں یہ سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ (توضیح القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

دلیل کا مطالبہ:

مشرکین کا گمان یہ تھا کہ اللہ اپنے مقربین کو اپنا نائب مقرر کرتا ہے اور اپنی کچھ صفات بھی انہیں دے دیتا ہے، اس کے جواب میں یہ بتایا گیا کہ قاعدہ ہے کہ مدعا کے واسطے تین دلیلیں پیش کی جاتی ہیں: دلیل عقلی، دلیل نقلی اور وحی، جبکہ تم لوگوں کے پاس ان تینوں قسموں میں کوئی دلیل نہیں ہے، اگر ہے تو پھر پیش بھی کرو، چنانچہ ارشاد ہے:

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِیَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِیْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾

بھلا کیا اسے چھوڑ کر انہوں نے دوسرے خدا بنا رکھے ہیں؟ (اے پیغمبر) ان سے کہو کہ: لاؤ اپنی دلیل! یہ (قرآن) بھی موجود ہے جس میں میرے ساتھ والوں کے لیے نصیحت ہے، اور وہ (کتابیں) بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لیے نصیحت تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ حق بات کا یقین نہیں کرتے، اس لیے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ (۲۴)

مشرکین سے کہا جا رہا ہے کہ توحید پر تو بہت سی دلیلیں قائم ہیں عقلی بھی، نقلی بھی، تم شرک پر بھی کوئی دلیل پیش کر کے دکھاؤ، افسوس ہے کہ ہمارے یہاں کے متکلمین نے اس پہلو پر اب تک بہت کم توجہ کی ہے۔ عموماً اب تک بجائے عقیدہ شرک پر مطالبہ دلیل کے دلائل توحید ہی پر قائم کیے جاتے رہے ہیں۔ گویا صرف دفاع اور صفائی پیش کرنا اہل توحید کا کام رہ گیا ہے اور ہجوم و اقدام اہل شرک کے حصہ میں آ گیا ہے۔ (ماجدی: ۲۹۱/۴)

ظاہر ہے ان کے پاس اپنے شرک اور بت پرستی کے جواز پر نہ کوئی عقلی دلیل تھی اور نہ ہی نقلی دلیل تھی۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

عقیدہ جزئیت اور اس کی تردید:

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾.........الی......اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾

اس کے بعد عقیدہ جزئیت کی نفی کی گئی ہے۔عقیدۂ جزئیت یہ ہے کہ اللہ تعالی کے لئے اولاد کو(جیسا کہ یہود کا حضرت عزیر اور نصاری کا حضرت عیسی علیہما السلام کے بارے میں عقیدہ تھا) یا بیٹیوں کو ثابت کرنا، جیسا کہ مشرکین کا عقیدہ تھا۔

یہاں سات طرح سے اس عقیدہ کی نفی کی گئی ہے:

(۱) سبحانہ، یعنی اللہ تعالی تمام نائبوں سے پاک ہے۔

(۲) جنہیں تم خدا کا بیٹا یا بیٹیاں گردانتے ہو، یہ سب اللہ تعالی کے بندے ہیں، کوئی الہ نہیں۔

(۳) اسی معزز اور مقرب ہونے سے لوگوں نے انہیں اللہ کا جز مقرر کر دیا۔

(۴) یہ اللہ تعالی کے حکم سے آگے نہیں چلتے، نہ مخالفت فعلی کرتے ہیں اور نہ ہی قولی۔

(۵) اللہ تعالی کو غیب دان جانتے ہیں۔

(۶) اور ادب کا حال یہ ہے کہ جس شخص کے بارے میں اللہ تعالی پسند کرے گا، اس کے حق میں سفارش کریں گے۔

(۷) اللہ تعالی کی معصیت سے ڈرنے والے ہیں۔(آیت نمبر ۲۱-۲۸)

اللہ تعالیٰ کی قدرت اور خالقیت کے چھ دلائل:

مشرکین کے باطل نظریات کی تردید کے بعد ایک خالق اور قادر کے وجود پر چھ دلائل ذکر کیے گئے ہیں، یہ سب کے سب تکوینی دلائل ہیں، جن کا نظروں سے مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور جن کی حقیقت کو بحث اور تحقیق کے بعد اہل علم نے تسلیم کیا ہے۔

آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ (۳۰)

پہلی دلیل یہ دی کہ آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے، ہم نے دونوں کو جدا جدا کر دیا۔آسمان کو فرشتوں کا مسکن بنادیا اور زمین کو انسانوں کا۔قرآن نے جو آسمان اور زمین کے جڑے ہونے کا نظریہ پیش کیا، اسے نہ عرب جانتے تھے اور نہ ہی اس وقت کی دوسری (معاصر) اقوام میں سے کوئی قوم اس نظریہ سے باخبر تھی۔

ماہرین ارضیات اور فلکیات:

ابھی تقریباً دو سو سال ہوئے کہ ارضیات اور فلکیات کے ماہرین طویل تجربات اور مشاہدات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سارے سیارے خواہ وہ سورج اور ستارے ہوں یا زمین اور چاند، یہ سب آپس میں ملے ہوئے تھے، پھر یہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے، جبکہ قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے یہ حقیقت بلاخوف تردید بیان کر دی تھی، اسے قرآن کے معجزہ کے سوا کیا نام دیا جاسکتا ہے؟

ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۰

دوسری دلیل یہ دی کہ ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا ہے، یہ ایک عظیم انکشاف تھا جو کہ ایک امی کی زبان سے کروایا گیا اور آج دنیا بھر کے اہل علم تسلیم کرتے ہیں کہ تمام زندہ اشیاء کے وجود میں پانی کو بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔

پانی کے بغیر زندگی محال ہے:

ظاہر ہے کہ تمام جانداروں بلکہ نباتات کی زندگی کا انحصار بھی پانی پر ہے، پانی کے بغیر نہ کوئی جاندار زیادہ دیر تک زندہ رہ سکتا ہے اور نہ درخت اور کھیتیاں۔ اللہ نے کچھ مخلوق ایسی بھی پیدا کی ہے جو ہمیشہ پانی میں رہتی ہے اور اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے بھی پانی سے باہر آجائے تو زندہ نہیں رہ سکتی۔ مچھلیاں، مینڈک، مگرمچھ اور کیڑے مکوڑے اللہ کی کتنی ہی مخلوق ہے جو پانی کے اندر ہی پیدا ہوتی ہے، وہیں زندگی گزارتی ہے اور پھر وہیں مرجاتی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ ہم نے پانی کے ذریعے ہر چیز کو زندگی بخشی، گویا پانی مبداء حیات ہے۔

پانی سے مراد نطفہ بھی ہوسکتا ہے۔ اللہ نے قطرہ آب سے انسان جیسی اشرف المخلوقات ہستی کو پیدا کیا۔ اگرچہ فرشتوں کو نور سے اور جنات کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے مگر زمین کی اکثر مخلوق بشمول چرند، پرند، کیڑے مکوڑے سے اور ہر قسم کے حیوانات کو پانی کے ذریعے ہی حیات نصیب ہوتی ہے۔ ہر جاندار کے مادہ حیات میں پانی کی کثرت ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کا انحصار دوران خون پر موقوف ہے اور جدید تحقیق کے مطابق خون میں اسی فیصد پانی اور باقی بیس فیصد دیگر اجزاء ہیں۔ تو اس لحاظ سے بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسانی زندگی کا انحصار پانی پر ہے۔ اگر کسی جاندار کے جسم میں پانی کی کمی پیدا ہوجائے تو خون منجمد ہوکر رہ جاتا ہے اور انسان اور جانور ہلاک ہوجاتے ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح جانداروں اور نباتات کو پانی کے ذریعے زندگی بخشی ہے۔ یہ اس کی وحدانیت کی دلیل ہے۔

سب پانی کے محتاج ہیں، آپ چاند کو دیکھ لیجئے، وہ اپنی بناوٹ میں زمین کے مشابہ ہے لیکن چونکہ وہاں پانی نہیں ہے اس لیے اس کی سطح پر زندگی ناممکن ہے۔ (معالم العرفان: ۱۳ / ۲۹۵، خلاصۃ القرآن: م اش)

زمین کبھی کبھی سانس لیتی ہے:

وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ

تیسری دلیل یہ دی کہ اور ہم نے زمین میں جمے ہوئے پہاڑ پیدا کیے ہیں تاکہ وہ انہیں لے کر ہلنے نہ پائے۔ یہ حقیقت قرآن کریم نے کئی مقامات پر بیان فرمائی ہے کہ جب زمین کو بچھایا گیا تو وہ ہلتی تھی، اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے پہاڑ پیدا کر کے اس پر جمائے تو اس کو قرار حاصل ہوا۔ جدید سائنس نے بھی صدیوں کے بعد یہ پتہ لگایا ہے کہ بڑے بڑے براعظم اب بھی بہت سست رفتار سے سمندر کے پانی پر سرکتے رہتے ہیں، مگر اب ان کی رفتار اتنی دھیمی ہے کہ عام آنکھیں ان کا ادراک نہیں کرسکتیں۔

اب بھی دنیا میں کہیں کہیں ایسے آتش فشاں پہاڑ پائے جاتے ہیں جن کے ذریعے گویا کہ زمین کبھی کبھی سانس لیتی

ہے اور اس میں بھڑکنے والی آگ باہر دکھائی دیتی ہے، اگر زمین کی جلد سخت نہ ہوتی اور اس پر پہاڑوں کا بوجھ نہ ہوتا تو یہ آگ زندگی محال کر دیتی۔

زمین میں کشادہ راستے:

وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿٣١﴾

چوتھی دلیل یہ دی کہ ہم نے زمین میں کشادہ راستے بنائے ہیں تا کہ لوگ ان پر چلیں، آپ ہموار میدانوں کو چھوڑ دیں، پہاڑی سلسلوں ہی کو دیکھ لیجئے جو ملک در ملک چلے جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالی نے ان کے درمیان کشادہ وادیاں اور راستے رکھے ہیں، جن کی وجہ سے انسانوں کو اپنے اسفار میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

آسمان کو محفوظ چھت بنایا:

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۖ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿٣٢﴾

پانچویں دلیل یہ دی ہے کہ ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا ہے، اس چھت میں لاکھوں ستارے، سورج اور چاند جو اپنے اپنے مدار میں انتہائی تیز رفتاری سے گھوم رہے ہیں، نہ ان میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور نہ ہی وہ خلط ملط ہوتے ہیں۔

کون ہے جو اس نظام کو سنبھالے ہوئے ہے:

اگر ایک ستارہ بھی اپنے مدار سے ہٹ جائے تو نظام عالم میں خلل واقع ہو جائے، تو وہ کون ہے جو اس سارے نظام کو سنبھالے ہوئے ہے اور کسی کو بھی ایک مخصوص رفتار اور راستے سے ادھر ادھر نہیں ہونے دیتا، کیا لات و ہبل؛ کیا عزیٰ اور منات۔

نہیں، رب العالمین کے سوا کوئی نہیں۔

رات اور دن، سورج اور چاند، نجوم اور افلاک کی حرکت کا نظریہ:

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿٣٣﴾

چھٹی دلیل تکوینی دلائل میں سے یہ دی ہے کہ رات اور دن، سورج اور چاند کو اللہ نے بنایا ہے، یہ سب آسمان میں تیر رہے ہیں جیسے مچھلی پانی میں تیرتی ہے، انہیں یکے بعد دیگرے آنے جانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی، اور یہ کبھی رکتے بھی نہیں مسلسل چلتے رہتے ہیں، حرکت ہی میں ان کی زندگی ہے۔ (۳۳)

رات اور دن، سورج اور چاند، نجوم اور افلاک کی حرکت کا نظریہ قرآن نے اس وقت پیش کیا تھا، جب اس حوالے سے بڑے بڑے باخبر بھی بے خبر تھے، اس قرآنی نظریہ کی علم جدید تائید کر رہا ہے، سائنس دانوں نے تو رصد گاہوں اور جدید ترین مشینوں سے لیس لیبارٹریوں میں برسہا برس کی تحقیق کے بعد اس علمی حقیقت کو دریافت کیا ہے۔

بے خبروں کو باخبر کرنا:

مگر سوال یہ ہے کہ وہ نبی امی جسے لکھنا پڑھنا بھی نہیں آتا تھا اس کے پاس وحی کے سوا کون سا راستہ تھا جس کے

ذریعے خبریں پا کر وہ پوری دنیا کو باخبر کررہا تھا، کیا نبی امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک زبان سے ان حقائق کا بیان ہونا اس کی صداقت کی دلیل نہیں؟

یقیناً ہے مگر اس دلیل کو تسلیم کرنے کے لیے آنکھوں سے تعصب اور عناد کی پٹی اتارنا ضروری ہے۔

مشرکین کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موت کا انتظار:

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ط ....الی..........بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ط وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ﴿۳۵﴾

مشرکین کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موت پر ان کا پیغام ختم ہوکررہ جائے گا اور بعد میں ان کا دین نہیں چل سکے گا۔ کیا یہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کی صورت میں یہ لوگ نہیں مریں گے؟ کیا انہوں نے دنیا میں بقاء دائمی کا کوئی معاہدہ کررکھا ہے؟ ہر انسان کو موت کے مرحلہ سے گزرنا ہے اور اس کے اچھے اور برے اعمال کا بدلہ اسے مل کررہے گا۔ اگر آپ کا استہزاء اور تمسخر کیا جارہا ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، پہلے انبیاء کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور ان مذاق اڑانے والوں کو ان کا مذاق ہی تباہی کا شکار کردیا کرتا تھا، اللہ کا عذاب اگر رات دن میں کسی وقت اچانک آجائے تو انہیں کون بچائے گا؟ ہمارا عذاب ایسا زبردست ہوتا ہے کہ اس کی ذراسی جھلک دیکھ کر ہی یہ چلانے لگیں گے۔

یہاں انسان کے لئے تین قانون بیان کردیئے:

(۱) ایک یہ کہ ہر ذی حیات کے لئے موت لازمی ہے، خواہ جلد خواہ طویل ترین مدت کے بعد۔

(۲) انسان جب تک زندہ رہے گا اس کا امتحان برابر ہوتا رہے گا۔ کہ کن کن حالات میں وہ ایمان وطاعت کی طرف مائل رہتا ہے اور کن کن حالات میں کفر ومعصیت کی طرف جھک جاتا ہے۔

(۳) ہر انسان کو اللہ ہی کے حضور میں واپس جاکر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہے۔ (ماجدی: ۲۹۹/۴)

سعدی صاحب نے گلستان میں ذکر کیا ہے کہ کسی نے نوشیروان بادشاہ ایران کو خوشخبری سنائی کہ آپ کا فلاں دشمن اس دنیا سے رخصت ہوگیا ہے، خبر دینے والے شخص کا خیال تھا کہ یہ خبر سن کر بادشاہ خوش ہوگا، مگر وہ عقلمند آدمی تھا، اس نے جواب دیا "اگر دشمن مرگیا ہے تو تم نے کس سے سنا ہے کہ وہ مجھے چھوڑ دے گا'' مجھے بھی تو بالآخر مرنا ہے۔

اگر عدو بمر دجائے شادمانی نیست

کہ زندگانی ما نیز جاودانی نیست

اگر دشمن مرجائے تو یہ کوئی خوشی کا مقام نہیں ہے، کیونکہ ہمارے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آنے والا ہے۔ (معالم العرفان: ۱۳/ ۳۰۴)

انصاف والا ترازو:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ط وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ

اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ﴿۴۷﴾

اور ہم قیامت کے دن ایسی ترازویں لا رکھیں گے جو سراپا انصاف ہوں گی، چنانچہ کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔اور اگر کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا، تو ہم اسے سامنے لے آئیں گے، اور حساب لینے کے لیے ہم کافی ہیں۔

یعنی یہی نہیں کہ تمام لوگوں سے انصاف ہوگا؛ بلکہ اس بات کا بھی اہتمام کیا جائے گا کہ انصاف سب لوگوں کو آنکھوں سے نظر آئے، اس غرض کے لئے اللہ تعالی ایسی ترازویں برسرِ عام نصب فرمائیں گے جن میں انسانوں کے اعمال کو تولا جائے گا اور اعمال کے وزن کے حساب سے انسانوں کے انجام کا فیصلہ ہوگا، انسان جو عمل بھی کرتا ہے اس دنیا میں اگرچہ ان کا نہ کوئی جسم نظر آتا ہے اور نہ ان میں کسی وزن کا احساس ہوتا ہے، لیکن آخرت میں اللہ تعالی ان کا وزن کرنے کی ایسی صورت پیدا فرمائیں گے جن سے ان اعمال کی حقیقت واضح ہوجائے، اگر انسان سردی گرمی جیسی چیزوں کو تولنے کے لئے نئے نئے آلات ایجاد کرسکتا ہے تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالی اس بات پر بھی قادر ہے کہ وہ ان اعمال کو تولنے کا عملی مظاہرہ فرمادیں۔

۱۷/انبیاء کے قصے:

توحید، نبوت، معاد اور حساب وجزاء پر دلائل دینے کے بعد ۱۷/انبیاء کے قصے ذکر کیے گئے ہیں:

یعنی حضرت موسی، حضرت ہارون، حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت نوح، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت ایوب، حضرت اسماعیل، حضرت ادریس، حضرت ذوالکفل، حضرت یونس، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسی علیہم السلام (آیت: ۴۸-۹۱)

ان تمام انبیاء کی دعوت ایک ہی تھی وہ یہ کہ:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ﴿۹۴﴾

''پھر جو مومن بن کر نیک عمل کرے گا تو اس کی کوشش کی ناقدری نہیں ہوگی، اور ہم اس کوشش کو لکھے جاتے ہیں۔'' (۹۴)

ان سترہ انبیاء میں چھ کے قصے قدرے تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام:

ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بت پرست قوم کا تذکرہ کہ عید کے موقع پر وہ پکنک منانے اور کھیل کود کرنے شہر سے باہر چلے گئے اور اپنے بتوں کے آگے نذر و نیاز کے چڑھاوے چڑھا گئے۔ابراہیم علیہ السلام نے ان بتوں کو کلہاڑے سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور جب مشرک قوم لوٹ کر آئی اور اپنے خداؤں کی حالت زار دیکھی تو ابراہیم علیہ السلام کو بلا کر باز پرس کرنے لگی۔انہوں نے فرمایا کہ تم سمجھتے ہو کہ بت کچھ کر سکتے ہیں اور بولتے بھی ہیں تو انہی سے پوچھ لو۔بڑے بت کے کندھے پر کلہاڑے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سب کو کاٹ پیٹ کر برابر کر دیا ہے۔وہ بے اختیار پکار اٹھے کہ یہ پتھر کے بت تو بول ہی نہیں سکتے۔یہ حقیقت حال کیسے بیان کریں گے؟ ابراہیم علیہ السلام کہنے لگے: افسوس کا مقام ہے کہ

ایسے بے اختیار معبودوں کی تم پرستش کرتے ہو؟ وہ لوگ لا جواب ہوکر انتہائی نادم اور شرمندہ ہوئے اور ابراہیم علیہ السلام کے لئے آگ کا الاؤ جلا کر اس میں پھینک دیا۔ اللہ تعالی نے ابراہیم علیہ السلام کی حفاظت فرمائی اور ان کی مشرک قوم کو نا کام ونامراد کیا۔ ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق نامی بیٹا اور یعقوب نامی نامور پوتا عطاء فرمایا۔ (خلاصۂ قرآن: از مفتی عتیق الرحمٰن)

(٢) حضرت لوط علیہ السلام:

آپ کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام جس بستی کی طرف بھیجے گئے تھے وہ بستی سدوم تھی، جن افعال خبیثہ اور شنیعہ کے یہ لوگ عادی تھے ان میں سب سے زیادہ گندہ فعل لواطت تھا اور اس کے علاوہ اور بھی برے افعال کے خوگر تھے، مثلاً رہزنی اور کبوتر بازی اور گانا بجانا اور شراب خوری اور ڈاڑھی کٹانا اور مونچھیں بڑھانا اور سیٹی بجانا اور تالیاں بجانا اور ریشمی کپڑے پہننا وغیرہ وغیرہ۔ اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے خباثت کے نتیجہ میں ہلاک کر دیا۔ (ادریسی: ۵/ ٢٣٨)

(٣) حضرت نوح علیہ السلام:

حضرت نوح علیہ السلام جنہیں ان کی طویل عمر اور اللہ تعالی کی راہ میں صبر وتحمل کرنے کی وجہ سے شیخ الانبیاء بھی کہا جاتا ہے، انہوں نے ٩٥٠ سال تک فریضہ دعوت سرانجام دیا۔

(٤) حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام:

حضرت داؤد اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہما السلام کا قصہ جو دونوں نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی، انہیں روحانی اور مادی دونوں طرح کی نعمتوں سے خوب نوازا گیا تھا۔ نیز جنگ سے بچاؤ کے لئے داؤد علیہ السلام کی زرہ سازی کو بیان کر کے بتایا کہ دستکاری اور مزدوری کر کے کمانا کوئی عیب نہیں ہے اور اپنا دفاع کرنا توکل کے منافی نہیں ہے۔

کمالات خاص حضرت داؤد علیہ السلام:

(١) انتہائی خوبصورت آواز (٢) جب آپ تلاوت کرتے، یا تسبیح پڑھتے تو تمام چرند پرند اور پہاڑ بھی آپ کے ساتھ تلاوت اور تسبیحات پڑھتے۔ (٣) اللہ تعالی نے آپ کیلئے لوہے کو موم بنا دیا تھا۔

کمالات خاصہ حضرت سلیمان علیہ السلام:

(١) اللہ تعالی نے ان کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا تھا۔ (٢) اسی طرح جنات کو بھی آپ کے لئے مسخر کر دیا تھا۔ (٣) پرندوں کی بولی کی سمجھ بھی آپ کو عطا کی گئی تھی۔ (٤) فیصلہ کرنے کی بہت اعلی قوت عطا فرمائی۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن)

(۵) حضرت ایوب علیہ السلام:

حضرت ایوب علیہ السلام جنہیں مصائب وآلام کے ذریعہ آزمایا گیا، انہوں نے ایسے صبر کا مظاہرہ فرمایا کہ ان کا صبر ضرب المثل بن گیا، ان مصائب وآلام میں وہ مسلسل اللہ تعالی کی طرف متوجہ رہے، ان کی توجہ نے رحمت باری تعالی کو

متوجہ کر ہی لیا، ان کی دعائیں قبول ہوئیں اور دورِ ابتلا ختم ہو گیا۔

حضرت ایوب (علیہ السلام) کو چار ابتلاء پیش آئے:

(۱) مال جاتا رہا۔ (۲) اولاد مر گئی (۳) بدن بیماری سے پھٹ گیا۔ (۴) سوائے بیوی کے سب نے چھوڑ دیا اور شماتت کرنے لگے کہ ایوب (علیہ السلام) نے کوئی ایسا سخت گناہ کیا ہے جس کی سزا ایسی سخت ملی ہے۔ ایوب (علیہ السلام) نے اس ابتلاء اور بلا پر صبر کیا۔ اول تو دعا پر بھی راضی نہ تھے، حیا اور شرم کی وجہ سے صحت کی دعا بھی نہ کرتے تھے، بالآخر بیوی کے اصرار سے اپنی صحت کے لیے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے قبول کی۔ اللہ تعالیٰ نے صحت اور تندرستی بھی عطاء کی اور جو اولاد مر گئی تھی اس کو دوبارہ زندہ کر دیا، چونکہ جو اولاد اکٹھی ہی دب کر مر گئی بظاہر وہ موت اجل نہ تھی؛ بلکہ موت ابتلاء و آزمائش تھی، اس لیے ان بنی اسرائیل کی طرح دوبارہ زندہ کر دی گئی جن کو طاعون سے بھاگنے کی وجہ سے ہلاک کر دیا گیا، بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے ایوب (علیہ السلام) کو پہلے کی طرح مال و دولت بھی عطاء کر دیا، جس قدر مال ان کا جاتا رہا تھا اسی قدر اللہ نے پھر ان کو دے دیا بلکہ اس سے زائد۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایوب (علیہ السلام) ایک دن غسل فرما رہے تھے کہ اوپر سے سونے کی ٹڈیاں برسنے لگیں۔ ایوب (علیہ السلام) ان کو اپنے کپڑے میں جمع کرنے لگے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ایوب! کیا میں نے تجھ کو اس چیز سے غنی نہیں کیا کہ جس کو تو دیکھتا ہے۔ عرض کیا: کیوں نہیں تیری برکت سے غناء نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ میرا سونے کی ٹڈیوں کی طرف رغبت کرنا دنیاوی غنا حاصل کرنے کے لئے نہیں ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ سونے کی ٹڈیاں تیری طرف سے بلا سبب ظاہری کے برس رہی ہیں اور یہ تیری طرف سے بلا شبہ برکت ہیں اور بندہ کتنا ہی مالدار ہو جائے مگر خدا کی برکت سے غنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ سے طلب زیادت قناعت کے منافی نہیں، البتہ غیر اللہ سے سوال قناعت کے منافی ہے۔ (ادریسی: ۵/۲۴۶)

(۶) حضرت یونس علیہ السلام:

ان کا مختصر قصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شہر نینویٰ کی طرف (جو موصل کے مضافات میں سے ہے) مبعوث فرمایا تھا۔ یونس (علیہ السلام) نے ان کو بت پرستی سے روکا اور حق کی طرف بلایا۔ وہ ماننے والے کہاں تھے، روز بروز ان کا عناد و تمرد ترقی کرتا رہا۔ آخر بددعا کی اور قوم کی حرکات سے خفا ہو کر غصہ میں بھرے ہوئے شہر سے نکل گئے، حکم الٰہی کا انتظار نہ کیا اور وعدہ کر گئے کہ تین دن کے بعد تم پر عذاب آئے گا، ان کے نکل جانے کے بعد قوم کو یقین ہوا کہ نبی کی بددعا خالی نہیں جائے گی، کچھ آثار بھی عذاب کے دیکھے ہوں گے۔ گھبرا کر سب لوگ بچوں اور جانوروں سمیت باہر جنگل میں چلے گئے اور ماؤں کو بچوں سے جدا کر دیا۔ میدان میں پہنچ کر سب نے رونا چلانا شروع کیا، بچے اور مائیں، آدمی اور جانور سب شور مچا رہے تھے، کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، تمام بستی والوں نے سچے دل سے توبہ کی، بت توڑ ڈالے۔ خدا تعالیٰ کی

اطاعت کا عہد باندھا اور حضرت یونس (علیہ السلام) کو تلاش کرنے لگے کہ ملیں تو ان کے ارشاد پر کاربند ہوں۔ حق تعالیٰ نے آنے والا عذاب ان پر سے اٹھا لیا۔ (فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ) ادھر یونس (علیہ السلام) بستی سے نکل کر ایک جماعت کے ساتھ کشتی پر سوار ہوئے، وہ کشتی غرق ہونے لگی۔ کشتی والوں نے بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ارادہ کیا کہ ایک آدمی کو نیچے پھینک دیا جائے (یا اپنے مفروضات کے موافق یہ سمجھے کہ کشتی میں کوئی غلام مولا سے بھاگا ہوا ہے) بہرحال اس آدمی کی تعیین کے لیے قرعہ ڈالا۔ وہ یونس (علیہ السلام) کے نام نکلا۔ دو تین مرتبہ قرعہ اندازی کی، ہر دفعہ یونس (علیہ السلام) کے نام پر نکلتا رہا۔ یہ دیکھ کر یونس (علیہ السلام) دریا میں کود پڑے۔ فوراً ایک مچھلی آ کر نگل گئی۔ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو حکم دیا کہ یونس (علیہ السلام) کو اپنے پیٹ میں رکھ، اس کا ایک بال بیکا نہ ہو۔ یہ تیری روزی نہیں بلکہ تیرا پیٹ ہم نے اس کا قید خانہ بنایا ہے۔ اس کو اپنے اندر حفاظت سے رکھنا۔ اس وقت یونس (علیہ السلام) نے اللہ کو پکارا۔ (لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ) اپنی خطا کا اعتراف کیا کہ بیشک میں نے جلدی کی کہ تیرے حکم کا انتظار کیے بدون بستی والوں کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔ گو یونس (علیہ السلام) کی یہ غلطی اجتہادی تھی جو امت کے حق میں معاف ہے، مگر انبیاء کی تربیت و تہذیب دوسرے لوگوں سے ممتاز ہوتی ہے۔ جس معاملہ میں وحی آنے کی امید ہو، بدون انتظار کیے قوم کو چھوڑ کر چلا جانا ایک نبی کی شان کے لائق نہ تھا۔ اسی مناسب بات پر دارو گیر شروع ہو گئی۔ آخر توبہ کے بعد نجات ملی، مچھلی نے کنارہ پر آ کر اگل دیا۔ اور اس بستی کی طرف صحیح سالم واپس کیے گئے۔ (تفسیر عثمانی: ۸۴۳)

(۷) حضرت اسمٰعیل و ادریس وذوالکفل علیہم السلام:

ان تینوں پیغمبروں نے بڑی بڑی تکالیف اور آزمائشوں پر صبر کیا۔ اسمعیل (علیہ السلام) نے ذبح کی تکلیف پر صبر کیا اور خدا کے لیے جان دینے پر راضی ہو گئے اور ابتداءً جو مکہ میں قیام کیا۔ اس میں بھی بڑی مشقتیں برداشت کیں۔ اور ادریس (علیہ السلام) کی عبادت کا قصہ سورہ مریم میں گزر چکا ہے کہ وہ ترک طعام و شراب کی وجہ سے فرشتوں کے ساتھ ملحق ہو گئے تھے اور ذوالکفل (علیہ السلام) بقول اکثر محققین نبی تھے اور ظاہر قرآن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی تھے اور ان کو ذوالکفل (علیہ السلام) کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ قوم میں عدل و انصاف کے کفیل تھے اور دن میں روزہ رکھتے اور شب میں تہجد کے کفیل تھے اور بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے فقیروں اور مسکینوں کی پرورش کی کفالت اپنے ذمہ لی تھی۔ (واللہ اعلم) (ادریسی: ۵/ ۲۴۷)

(۸) یاجوج ماجوج:

یاجوج ماجوج جن کا ذکر سورہ کہف میں ہو چکا ہے، یہاں ان کا دوبارہ ذکر آیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ قیامت کے قریب یاجوج ماجوج کو کھول دیا جائے گا اور وہ ہر بلندی سے اتر رہے ہوں گے۔

یاجوج ماجوج کا خروج علامات قیامت میں سے ہے۔ پہلے مسیح (علیہ السلام) کا نزول ہوگا۔ وہ دجال کو ختم کریں گے، اس کے بعد یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مسیح (علیہ السلام) کو پیغام بھیجیں گے **انی اخرجت عبادا لایدان لاحد بقتالھم** میں نے ایسی مخلوق کو نکالا ہے جن کے ساتھ مقابلے کی کسی کو تاب نہیں، لہٰذا تم چیدہ چیدہ بندوں کو ہمراہ لے کر طور پر چلے جاؤ۔

یاجوج ماجوج دراصل حضرت نوح (علیہ السلام) کے بیٹے یافث کی اولاد میں سے ہیں۔ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ اس مخلوق کی عمریں بڑی لمبی ہوتی ہیں۔ اس بات کا اندازہ اس چیز سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان میں سے کوئی آدمی اس وقت تک نہیں مرتا جب تک کہ اپنی اولاد میں سے ایک ہزار کی تعداد کو نہیں دیکھ لیتا۔ باقی تمام انسانوں اور یاجوج ماجوج کی آبادی کی نسبت ۱:۹۹۹ ہے یعنی ہر انسان کے مقابلے میں یاجوج ماجوج ۹۹۹ ہیں۔ البتہ ان کی اکثریت کفر وشرک میں مبتلا ہوگی اور یہ سب جہنم میں جائیں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ یہ لوگ دنیا میں بڑا فساد مچائیں گے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ اپنے مردوں کو بھی کھا جاتے ہیں۔ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ جب یہ سد سکندری کے عقب سے ظاہر ہوں گے تو ہر چیز کو فنا کرتے چلے جائیں گے۔ بحیرہ طبریہ کے بارے میں آتا ہے کہ اس کا سارا پانی پی جائیں گے؛ حتیٰ کہ ان کے بعد میں آنے والے پوچھیں گے کہ کیا اس خشک ندی میں کبھی پانی بھی بہتا تھا۔ اس قوم کی زیادتیوں کی وجہ سے مخلوق خدا سخت پریشانی میں مبتلا ہو جائے گی۔ پھر ان پر طاعون جیسی ایک وبا نازل ہوگی جس میں سب مر جائیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایسے جانور بھیجے گا جو ان کی نعشوں کو اٹھا اٹھا کر زمین کے نشیبی علاقوں میں لے جائیں گے۔ پھر خوب بارش ہوگی جو ان نعشوں کی پس ماندہ گندگی کو دھو ڈالے گی۔ حدیث میں آتا ہے کہ یاجوج ماجوج کے مکمل خاتمہ کے بعد بھی انسان دنیا پر آباد رہیں گے اور وہ بیت اللہ کا حج بھی کریں گے البتہ اس کے بعد جلدی ہی قیامت برپا ہو جائے گی۔ (معالم العرفان: ۱۳/ ۳۹۳)

(۹) اصنام دوزخ کا ایندھن:

مشرکین اور ان کے اصنام قیامت کے دن دوزخ کا ایندھن بنیں گے اور کوئی بھی کسی کے کام نہیں آسکے گا۔

(۱۰) آہ وزاری کی دعا:

انبیاء متقدمین کے قصص بیان کرنے کے بعد بتایا گیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین اور دنیا میں سارے جہانوں کے لیے رحمت ہیں، آپ نے اللہ کا پیغام انسانوں کو پہنچا دیا، مگر جب ہر قسم کے دلائل پیش کرنے کے بعد بھی لوگ نہ سمجھے، تو آپ نے اللہ سے دعا کی:

قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

''اے میرے پروردگار! حق کے ساتھ فیصلہ کر دے اور ہمارا پروردگار بڑا مہربان ہے، اسی سے ان باتوں میں جو تم بیان کرتے ہو مدد مانگی جاتی ہے۔''

اللہ نے اپنے نبی کی دعا قبول فرمائی اور غزوۂ بدر کے موقع پر مشرکین پر اللہ تعالی کا عذاب نازل ہو کر رہا۔اس دعا پر سورۂ انبیاء اختتام پذیر ہوجاتی ہے۔(خلاصۃ القرآن، خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:......دعوت الی الذکر، اور انبیاء علیہم السلام کا آفاقی اور نفسی مصائب میں بامداد الٰہی نجات پانا۔

خلاصہ رکوع:۱......دعوت الی الذکر۔ماخذ: آیت:۲۔

خلاصہ رکوع:۲......تذکیر بایام اللہ۔ماخذ: آیت:۱۱ تا ۱۵۔

خلاصہ رکوع:۳......(۱) تذکیر بآلاء اللہ۔(۲) اور اخیر میں تذکیر بما بعد الموت۔ماخذ: (۱) آیت: ۳۱ تا ۳۳۔ (۲) آیت: ۳۵۔

خلاصہ رکوع:۴......تذکیر بما بعد الموت۔ماخذ: آیت: ۴۷۔

خلاصہ رکوع:۵......(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام۔(۲) اور لوط علیہ السلام کا مصائب آفاقی سے نجات پانا۔ماخذ: (۱) آیت: ۶۹، ۷۰۔(۲) آیت: ۷۱ تا ۷۴۔

خلاصہ رکوع:۶......متعدد انبیاء علیہم السلام کا اپنی اپنی مصیبت سے نجات پانا۔ماخذ: آیت: ۷۶، ۷۸، ۷۹، ۸۴، ۸۳، ۸۵، ۸۶۔

خلاصہ رکوع:۷......(۱) عود الی المقصود یعنی اعلان توحید کا اعادہ۔(۲) اور توحید پرستوں کا مملکت الٰہی میں فاتح ہو کر رہنا۔ماخذ: (۱) آیت: ۱۰۸۔(۲) آیت: ۱۰۵۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الحج

اس سورت کا کچھ حصہ مدنی ہے، اور کچھ مکی۔مطلب یہ ہے کہ اس سورت کا نزول مکہ مکرمہ میں ہجرت سے پہلے شروع ہو چکا تھا، اور تکمیل ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں ہوئی۔اسی سورت میں یہ بتایا گیا ہے کہ حج کی عبادت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں کس طرح شروع ہوئی، اور اس کے بنیادی ارکان کیا ہیں؟ اسی وجہ سے اس کا نام سورۃ حج ہے۔مکہ مکرمہ میں مشرکین نے مسلمانوں کو طرح طرح کے ظلم کا نشانہ بنایا تھا، وہاں مسلمانوں کو صبر کی تلقین کی جاتی تھی، لیکن مدینہ منورہ آنے کے بعد اسی سورت میں پہلی بار مسلمانوں کو کفار کے ظلم وستم کے مقابلے میں جہاد کی اجازت دی گئی، اور فرمایا گیا کہ جن کافروں نے مسلمانوں پر ظلم کر کے انہیں اپنا وطن اور گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا ہے، اب مسلمان ان کے خلاف تلوار اٹھا سکتے ہیں۔اس طرح جہاد کو ایک عبادت قرار دے کر یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ نہ صرف اس کا ثواب آخرت میں ملے گا، بلکہ دنیا میں بھی مسلمانوں کو ان شاء اللہ فتح نصیب ہوگی۔اس کے علاوہ اسلام کے بنیادی عقائد بھی بیان کیے گئے ہیں۔

چنانچہ سورت کا آغاز آخرت کے بیان سے ہوا ہے جس میں قیامت کا ہولناک منظر بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ (توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی ۲۲ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۱۰۳ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۱۰ رکوع، ۷۸ آیات، ۱۲۶۳ کلمات اور ۵۴۳۲ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

چونکہ اس سورۃ میں حج کا ذکر ہے، اس لئے بطور علامت اس کا نام سورۂ حج رکھا گیا ہے۔

ربط:

سورۂ انبیاء کے خاتمہ میں مسئلہ معاد کا ذکر تھا، اس سورۃ میں اس سے ابتداء کی جاتی ہے تا کہ انسان کو پرہیزگاری اور خدا ترسی اور عبادت کی طرف کامل رغبت ہو اور دل میں خوف رہے، گویا خاتمہ سورۃ سابقہ اور اس سورۃ کے شروع میں مابہ الارتباط مضمون انذار ہے۔

خلاصہ مضامین سورۃ:

اس سورۃ کی ابتداء احوال قیامت کے ذکر سے فرمائی گئی اور سمجھایا کہ قیامت کا انکار کرنے والے شیطان لعین کی پیروی کرتے ہیں، جس کے متعلق یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ جو شخص اس سے تعلق رکھے گا تو وہ اس کو جہنم کا راستہ دکھلائے گا۔ حیات بعد الممات یعنی مر کر دوبارہ زندہ ہونے کا ثبوت ایک نہایت معقول دلیل کے ذریعہ دیا گیا ہے، پھر دنیا میں کئے ہوئے برے اعمال کی سزا آخرت میں جہنم کی آگ بتائی گئی اور مؤمنین صالحین کو جنت کی خوش خبری دی گئی، پھر کفار و مشرکین عرب جو اتباع ابراہیمی کا دعوی کرتے تھے ان کا رد فرمایا گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خانہ کعبہ کو تعمیر کرنے کا مقصد ظاہر کیا گیا کہ یہ اللہ کی عبادت اور بندگی کے لئے ہے، اور کفر و شرک اور بت پرستی کی ظاہری و معنوی نجاست سے پاک صاف رکھنے کے لئے ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا تھا کہ لوگوں کو اس بیت عتیق کے طواف کرنے اور حج کرنے کا اعلان کر دیں، پھر حج کے سلسلہ میں قربانی کا ذکر فرمایا گیا اور قربانی کی حقیقت کو بیان فرمایا گیا، مؤمنین صادقین جو کفار مکہ کے مظالم ایک عرصہ تک برداشت کرتے رہے اب ان کو جہاد کی اجازت دی گئی پھر جہاد کا منشا ظاہر فرمایا گیا اور مجاہدین کی صفت بتلائی گئی کہ جنگ و جہاد کے بعد اگر انہیں زمین میں قوت و اقتدار و حکومت حاصل ہو تو یہ لوگ خود بھی نماز کی پابندی کریں اور زکوۃ ادا کریں اور دوسروں کو بھی نیک کاموں کے کرنے اور برے کاموں سے منع کرنے کا حکم دیں، پھر تکذیب انبیاء کا نتیجہ بتلا کر کفار مکہ کو ڈرایا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب حقیقی بیان کر کے آپ کی تسلی فرمائی گئی کہ جو لوگ کفر پر مصر ہیں وہ تو اللہ تعالی کی باتوں کی طرف سے شک و شبہ میں رہیں گے، یہاں تک کہ ان پر قیامت کا دن آ پہنچے۔ پھر مہاجرین اور مجاہدین کی مدح فرمائی گئی اور ان کے لئے عمدہ روزی یعنی نعمائے جنت کا وعدہ فرمایا گیا، پھر

اللہ تعالی نے اپنی قدرت کاملہ اور تصرفات کا اظہار فرما کر بتلایا کہ اللہ نے ساری کائنات کو انسان کا خادم بنایا، اس سے انسانوں کو یہ جتلانا مقصود ہے کہ جس خدا کی مہربانی اور رحمت کی یہ حالت ہو اس کی مخالفت کرنا کونسی عقل تجویز کرسکتی ہے؟ پس لوگوں کو چاہئے کہ اس کی مخالفت سے باز آئیں اور غیر اللہ کی پرستش ترک کردیں۔ پھر غیر اللہ کی بے کسی کا حال بیان فرمایا کہ مشرکین جن کی عبادت کرتے تھے وہ ایک مکھی تک تو پیدا نہیں کرسکتے اور پیدا کرنا تو بڑی بات ہے وہ تو ایسے عاجز ہیں کہ اگر کبھی ان سے کچھ چھین لے جائے تو وہ اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ غرض بتوں کی بے کسی اور بے بسی بتلا کر توحید کی دعوت دی گئی، پھر اسی طرح مسئلہ رسالت کو سمجھایا گیا اور اخیر میں اہل ایمان اور اہل اسلام کو ہدایت کی گئی کہ اگر یہ کافر منکر نہیں مانتے تو نہ سہی، تم برابر اطاعت خداوندی میں لگے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

الغرض پوری سورۃ میں جگہ جگہ مناسب مواقع پر تذکیر ونصیحت بھی ہے اور شرک کے خلاف اور توحید وآخرت کے حق میں مؤثر دلائل بھی ہیں، بعض مفسرین نے صراحت کی ہے کہ یہ عجیب سورۃ ہے، اس کا کچھ حصہ رات میں کچھ حصہ دن میں، کچھ سفر میں کچھ حضر میں نازل ہوا۔ کچھ مکی ہے کچھ مدنی، کسی آیت کا صلح کے متعلق نزول ہوا، کسی کا جنگ کے متعلق، کوئی ناسخ ہے کوئی منسوخ، کوئی محکم ہے کوئی متشابہ۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مشرکین سے خطاب کی ابتداء مکہ میں کی گئی اور مدینہ میں جا کر اس کا سلسلہ پورا کیا گیا۔ اس حصہ میں ان کو پورے زور کے ساتھ متنبہ کیا گیا کہ تم نے ضد اور ہٹ دھرمی اور جاہلانہ خیالات واوہام پر اصرار کیا اور رسول کی تکذیب پر اڑے رہے۔ نبی کو جھٹلا کر نبی اور مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنا کر تم نے اپنا ہی کچھ بگاڑا ہے۔ اب تمہارا جو انجام قریب ہے وہ اس سے مختلف نہ ہوگا جو تم سے پہلے اس روش پر چلنے والے منکرین حق اور مشرکین کا ہو چکا ہے اور پھر تم کو تمہارے خود ساختہ معبود نہ بچا سکیں گے۔ ساتھ ہی مشرکین مکہ کی اس روش پر گرفت کی گئی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کردیا ہے۔ حالانکہ مسجد حرام ان کی ذاتی جائیداد نہیں اور وہ کسی کو حج سے روکنے کا حق نہیں رکھتے، اس سلسلہ میں مسجد حرام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ایک طرف یہ بتایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب خدا کے حکم سے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تو سب لوگوں کو حج کا اذن عام تھا۔ دوسری طرف یہ بتایا گیا کہ یہ گھر مشرک کے لئے نہیں بلکہ خدائے واحد کی بندگی کے لئے تعمیر ہوا۔ یہ کتنا غضب ہے کہ وہاں ایک خدا کی بندگی تو ہو ممنوع اور بتوں کی پرستش کے لئے پوری آزادی۔

تذبذب میں گرفتار لوگوں کو سرزنش کی گئی ہے کہ راحت وعیش کے ساتھ ایمان کے تقاضے نہیں چل سکتے۔ آزمائشوں اور خطرات سے گھبرانے کی بناء پر تذبذب کی روش کسی ایسی مصیبت اور نقصان سے نہیں بچا سکتی جو بہر حال منجانب اللہ آنے والی ہے۔

مسلمانوں کو قریش کے مظالم کا جواب طاقت سے دینے کی اجازت عطا کی گئی ہے اور ساتھ ہی ان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اب جب تمہیں ایک سرزمین پر اقتدار حاصل ہو رہا ہے تو تمہاری روش کیا ہونی چاہئے۔ نیز اہل ایمان کے

لئے ''مسلم'' کے نام کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصل جانشین تم لوگ ہو، ان ہی نے تمہارا نام ''مسلم'' رکھا تھا، تمہیں اس خدمت کے لئے منتخب کیا جاتا ہے کہ دنیا میں حق کی شہادت کے بلند مقام پر رہو۔

پوری سورۃ میں جگہ جگہ مناسب مواقع پر تذکیر اور نصیحت بھی ہے اور شرک کے خلاف اور توحید و آخرت کے حق میں موثر دلائل بھی ہیں۔ (خلاصہ مضامین قرآنی)

اس سورت میں تین طبقوں کو مخاطب کیا گیا ہے، مشرکین مکہ کو، ان لوگوں کو جو شک و تردد اور تذبذب کی کیفیت میں مبتلا تھے۔ اور تیسرے مؤمنین صادقین۔

مشرکین سے خطاب کی ابتداء مکہ میں کی گئی اور مدینہ میں اس خطاب کو انتہا تک پہنچایا گیا۔ اس خطاب میں پوری قوت کے ساتھ تنبیہ کی گئی کہ تم جہالت اور گمراہی کی جس روش پر چل رہے ہو، اسی روش پر چلنے والے تم سے پہلے تباہی سے دوچار ہو چکے ہیں۔

دوسرا طبقہ وہ تھا جو اسلام تو قبول کر چکا تھا مگر اس کی راہ میں کسی مصیبت کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا، ان کو سرزنش کی گئی کہ قبول حق کا کون سا طریقہ ہے کہ راحت و آسائش ہو تو اللہ کا نام لیتے رہو اور اگر اللہ کے راستے میں کوئی تکلیف آجائے تو تمہارے قدم پیچھے ہٹ جائیں۔

تیسرا طبقہ مومنین مخلصین کا ہے، ان کو ظلم کا جواب طاقت سے دینے کی اجازت دی گئی ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ جب تم بدی کی قوتوں کو پامال کر کے غالب آؤ تو تمہاری روش کیا ہونی چاہئے۔ اور اپنی حکومت میں تمہیں کن مقاصد کو بروئے کار لانا چاہئے؟ (قرآن ایک نظر میں)

عمومی اور کلی قاعدہ:

قارئین کرام یہ بات تو بار بار پڑھ چکے ہیں کہ مکی سورتوں میں عام طور پر عقائد سے بحث ہوتی ہے جبکہ مدنی سورتوں میں مسائل و احکام زیر بحث آتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مدنی سورتوں میں عقائد ذکر نہیں کیے جاتے، مذکورہ اصول محض غالب مضمون کے اعتبار سے ہے، عمومی اور کلی قاعدہ ہرگز نہیں ہے۔

دونوں مضامین:

سورۂ حج ہی کو لے لیجئے:

یہ اگرچہ مدنی ہے اور اس میں ہجرت و جہاد، حج اور قربانی جیسے شرعی احکام بھی ہیں، لیکن اس میں مکی سورتوں والے موضوعات زیادہ ہیں یعنی عقیدہ توحید، وعید و انذار، بعث و جزاء، جنت اور دوزخ، قیامت کے مناظر اور ہولناکیاں۔

قیامت کے مناظر:

سورت کی ابتداء اس انداز سے ہوتی ہے کہ دل دہل جائیں اور جسم پر کپکپی طاری ہو جائے۔ ارشاد ہوتا ہے:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ① يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ②

اے لوگو! اپنے پروردگار (کے غضب) سے ڈرو۔ یقین جانو کہ قیامت کا بھونچال بڑی زبردست چیز ہے۔ جس دن وہ تمہیں نظر آ جائے گا اس دن ہر دودھ پلانے والی اس بچے (تک) کو بھول بیٹھے گی، جس کو اس نے دودھ پلایا اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا بیٹھے گی، اور لوگ تمہیں یوں نظر آئیں گے کہ وہ نشے میں بدحواس ہیں، حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہوگا۔ (۱-۲)

بعث ونشور:

قیامت کا ذکر کرنے کے بعد بعث ونشور یعنی دوبارہ زندہ ہونے پر دو وجہ سے استدلال کیا گیا ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ...... (۵)

جو لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو ناممکن یا مشکل سمجھتے ہیں، ان سے کہا جا رہا ہے کہ خود اپنی تخلیق پر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے کس حیرت انگیز طریقے پر کتنے مرحلوں سے گذار کر تمہیں پیدا فرمایا تھا۔ تمہارا کوئی وجود نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے تمہیں وجود بخشا، تم میں جان نہیں تھی، اللہ تعالیٰ نے تم میں جان ڈالی۔

پہلا استدلال انسان کی تخلیق کے مراحل:

پہلا استدلال انسان کی تخلیق کے مختلف مراحل سے ہے، انسان اپنی پیدائش اور تکوین میں سات مراحل سے گزرتا ہے۔

(۱) پہلا مرحلہ مٹی: انسانوں کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو بلا واسطہ مٹی سے پیدا کیا گیا، بالواسطہ ہر انسان کا مٹی سے تعلق ہے۔

(۲) دوسرا مرحلہ نطفہ: ہر انسان منی اور نطفہ سے پیدا ہوتا ہے، منی خون سے، خون غذا سے اور غذا مٹی سے پیدا ہوتی ہے، مٹی اور نطفہ کے درمیان زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔

(۳) تیسرے مرحلہ میں خون کا لوتھڑا بنتا ہے۔

(۴) چوتھے مرحلہ میں بوٹی بنتی ہے، جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی ہوتی ہے۔

(۵) پانچویں مرحلہ میں بچہ پیدا ہوتا ہے جو کہ حواس کے اعتبار سے کمزور ہوتا ہے۔

(۶) چھٹے مرحلہ میں وہ جوان ہو جاتا ہے اور قوت وعقل کے کمال کو پہنچ جاتا ہے۔

(۷) ساتویں مرحلہ میں یا تو وہ جوانی ہی میں انتقال کر جاتا ہے یا اتنا بوڑھا ہو جاتا ہے کہ اس پر بچپنے کا گمان ہوتا ہے۔

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ان مراحل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تفصیل سے ارشاد فرمایا ہے کہ انسان کا مادہ

چالیس روز تک رحم میں جمع رہتا ہے، پھر چالیس دن کے بعد علقہ یعنی جما ہوا خون بن جاتا ہے، پھر چالیس ہی دن کے بعد مضغہ یعنی گوشت کی بوٹی بن جاتی ہے، اس کے بعد اللہ تعالی کی طرف سے ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو اس میں روح پھونک دیتا ہے اور اس بچے سے متعلق چار باتیں اس فرشتے کو لکھوا دی جاتی ہیں: اول یہ کہ اس کی عمر کتنی ہوگی، دوسرے اس کا رزق کتنا ہوگا، تیسرے وہ کیا کیا عمل کرے گا، چوتھے یہ کہ انجام کار یہ شقی و بدبخت ہوگا یا سعید و نیک بخت۔

(قرطبی بحوالہ معارف القرآن)

مسند احمد میں حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بچہ جب تک بالغ نہیں ہوتا اس کے نیک عمل اس کے والدین کے حساب میں لکھے جاتے ہیں اور جو کوئی برا عمل کرے تو وہ نہ اس کے حساب میں لکھا جاتا ہے نہ والدین کے۔ پھر جب وہ بالغ ہو جاتا ہے تو قلم حساب اس کے لئے جاری ہو جاتا ہے اور دو فرشتے جو اس کے ساتھ رہنے والے ہیں ان کو حکم دے دیا جاتا ہے کہ اس کی حفاظت کریں اور قوت بہم پہنچائیں۔ جب حالت اسلام میں چالیس سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالی اس کو تین قسم کی بیماریوں سے محفوظ فرما دیتے ہیں یعنی جنون، جذام اور برص سے۔ جب پچاس سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالی اس کا حساب ہلکا کر دیتے ہیں، جب ساٹھ سال کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالی اس کو اپنی طرف رجوع کی توفیق دیتے ہیں، جب ستر سال کا ہو جاتا ہے تو سب آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جب اسی (۸۰) سال کو پہنچتا ہے تو اللہ تعالی اس کی حسنات کو لکھتے ہیں اور سیئات کو معاف فرما دیتے ہیں اور جب نوے سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالی اس کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔ (معارف القرآن)

انسان کی پیدائش کی جو حالت ذکر کی گئی وہ ایک طرف تو اللہ تعالی کی قدرت کاملہ کی دلیل ہے، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے مرنے کے بعد انہیں دوبارہ زندہ کر سکتا ہے اور دوسری طرف یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جن لوگوں کو دنیا میں پیدا کیا گیا ہے ان کی پیدائش ہی اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ انہیں ایک اور زندگی دی جائے، کیونکہ اگر دوسری زندگی نہ ہو تو دنیا میں نیکی کرنے والے بدی کرنے والے، ظالم اور مظلوم سب برابر ہو جائیں گے اور اللہ تعالی ایسی ناانصافی کے لئے انسانوں کو پیدا نہیں کر سکتا کہ جو چاہے گناہ یا ظلم کرتا رہے اور اسے اپنے عمل کی کوئی سزا نہ ملے اور اسی طرح دنیا میں کوئی شخص کتنی پاکباز زندگی گزارے اور اس کو کوئی انعام نہ ملے، لہذا اللہ تعالی کی حکمت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ جب انسانوں کو دنیا میں پیدا کیا ہے تو آخرت میں انہیں دوسری زندگی دے کر انہیں انعام یا سزا ضرور دے۔ چنانچہ اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝

اور اس لیے کہ قیامت کی گھڑی آنے والی ہے، جس میں کوئی شک نہیں ہے، اور اس لیے کہ اللہ ان سب لوگوں کو دوبارہ زندہ کرے گا جو قبروں میں ہیں۔ (۷)

دوسری زندگی کا انکار:

وہ انسان جو خود ان مراحل سے گزرتا ہے وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اللہ دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ بالخصوص آج کا انسان جو کہ جانتا ہے کہ ایک نطفہ اور جرثومہ میں باری تعالی نے تمام انسانی خواص چھپا رکھے ہیں۔ یہ معلومات رکھنے والا انسان کیسے فنا کے بعد دوسری زندگی کا انکار کر سکتا ہے۔

دوسرا استدلال:

دوسری دلیل بعث کے امکان پر یہ دی گئی ہے کہ مردہ زمین پر اللہ بارش برساتا ہے تو اس میں زندگی جاگ اٹھتی ہے اور طرح طرح کی چیزیں اگنے لگتی ہیں، جو رب مردہ زمین کو زندہ کر سکتا ہے وہ مردہ انسانوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے۔

ایمان اور دین کی کرنسی:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿١١﴾

اور لوگوں میں وہ شخص بھی ہے جو ایک کنارے پر رہ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ چنانچہ اگر اسے (دنیا میں) کوئی فائدہ پہنچ گیا تو وہ اس سے مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اسے کوئی آزمائش پیش آ گئی تو وہ منہ موڑ کر (پھر کفر کی طرف) چل دیتا ہے۔ ایسے شخص نے دنیا بھی کھوئی، اور آخرت بھی۔ یہی تو کھلا ہوا گھاٹا ہے۔ (۱۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد کئی واقعات ایسے پیش آئے کہ کچھ لوگ اس لالچ میں اسلام لائے کہ اسلام کی وجہ سے انہیں دنیا میں کچھ فوائد حاصل ہوں گے لیکن جب ان کی توقع پوری نہ ہوئی بلکہ کوئی آزمائش آ گئی تو وہ دوبارہ کفر کی طرف لوٹ گئے۔ یہ آیت ان کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ لوگ حق کو حق ہونے کی وجہ سے قبول نہیں کرتے بلکہ دنیا کے مفادات کی خاطر قبول کرتے ہیں اور ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی جنگ میں اس نیت سے ایک کنارے ہو گیا کہ دونوں لشکروں میں سے جس کا پلہ بھاری نظر آئے گا اس کے ساتھ ہو جاؤں گا تاکہ کچھ مفادات حاصل کر سکوں اور سبق یہ دیا گیا کہ اسلام پر عمل اس لالچ میں نہ کرو کہ اس دنیا میں ہی تمہیں کوئی فائدہ مل جائے گا بلکہ اس لئے کرو کہ وہ برحق ہے اور اللہ تعالی کی بندگی کا تقاضا یہ ہی ہے، جہاں تک دنیا کے مفادات کا تعلق ہے وہ اللہ کی حکیمانہ مشیت ہے کہ کس کو کیا دیا جائے۔ چنانچہ اسلام لانے کے بعد دنیوی فوائد بھی حاصل ہو سکتے ہیں جن پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے اور کوئی آزمائش بھی آ سکتی ہے جس میں صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے اور اللہ تعالی سے دعا کرنا چاہئے کہ مصیبت دور فرما کر آزمائش سے نکال دے۔

ان احمقوں نے گویا ایمان اور دین کو کرنسی سمجھ رکھا ہے، جس کے کھرا یا کھوٹا ہونے کا فیصلہ وہ دنیوی نفع اور نقصان کے اعتبار سے کرتے ہیں۔

ملل اور مذاہب:

ملل اور مذاہب کا جائزہ لیا جائے تو انہیں چھ گروہوں اور جماعتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ؀۱۷

بلاشبہ مومن ہوں یا یہودی، صابی ہوں یا نصرانی اور مجوسی، یا وہ جنہوں نے شرک اختیار کیا ہے، اللہ قیامت کے دن ان سب کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا گواہ ہے۔

(۱) مسلمان: مسلمان، جو کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتے ہیں اور قرآن پر ایمان رکھتے ہیں۔

(۲) یہودی: یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے امتی، اصحاب تورات ہیں۔

(۳) عیسائی: عیسائی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے امتی، اصحاب انجیل ہیں۔

(۴) صابی: صابی، کہا جاتا ہے کہ یہ فرقہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں تھا، ستاروں کی عبادت کرتے تھے۔

(۵) مجوسی: مجوس، یہ کسی آسمانی مذہب کے پیروکار نہیں تھے، سورج، چانداور آگ کی پرستش کرتے تھے۔

(۶) مشرک: مشرک، بتوں کی پوجا پاٹ کرنے والے۔

شیطانی فرقے ورحمانی فرقے:

ان میں سے پانچ فرقے شیطان کے ہیں اور صرف پہلا فرقہ رحمن کا ہے، ان فرقوں کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کیا جائے گا۔

حضرت ابراہیمؑ کو ہدایت:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـــًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْقَاۗىِٕمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ؀۲۶

اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے ابراہیم کو اس گھر (یعنی خانہ کعبہ) کی جگہ بتادی تھی (اور یہ ہدایت دی تھی کہ) میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا، اور میرے گھر کو ان لوگوں کے لیے پاک رکھنا جو (یہاں) طواف کریں، اور عبادت کے لیے کھڑے ہوں، اور رکوع سجدے بجالائیں۔ (۲۶)

علماء نے لکھا ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر دس بار ہوئی ہے:

(۱) ملائکہ نے کی (۲) حضرت آدم علیہ السلام نے کی (۳) حضرت شیث علیہ السلام نے کی (۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی (۵) قوم عمالقہ نے کی (۶) حارث جرہمی نے کی (۷) قریش کے مورث اعلیٰ قصی نے کی (۸) قریش مکہ نے کی (۹) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے (۱۰) حجاج بن یوسف نے۔

اللہ کے محارم کی تعظیم:

وَاَذِّنۡ فِى النَّاسِ بِالۡحَجِّ يَاۡتُوۡكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاۡتِيۡنَ مِنۡ كُلِّ فَجٍّ عَمِيۡقٍ ﴿۲۷﴾

اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو، کہ وہ تمہارے پاس پیدل آئیں، اور دور دراز کے راستوں سے سفر کرنے والی ان اونٹنیوں پر سوار ہوکر آئیں جو (لمبے سفر سے) دبلی ہوگئی ہوں۔ (۲۷)

ایک حدیث میں ہے کہ جس نے ایک مرتبہ لبیک کہا وہ ایک حج کرتا ہے اور جس نے دو مرتبہ لبیک کہا وہ دو مرتبہ حج کرتا ہے اور اسی طرح جس نے جتنی مرتبہ لبیک کہا اتنے ہی حج اس کو نصیب ہوتے ہیں۔ (فضائل حج)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے بیت اللہ کی تعمیر کی، اس کے بعد ایک پہاڑ پر کھڑے ہوکر حج کا اعلان کیا، اللہ تعالی نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ اعلان ارض وسما میں رہنے والوں تک پہنچادیا اور ہر کسی نے اسے سن لیا۔ حج اور شعائر حج کی مناسبت سے یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اللہ کے محارم کی تعظیم، ایمان کی علامات میں سے ہے، جیسے نیکیوں کے کرنے میں اجر عظیم ہے اسی طرح اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں اور اعمال سے بچنے میں بڑا ثواب ہے۔

ذٰلِكَ ۚ وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ ؕ وَاُحِلَّتۡ لَـكُمُ الۡاَنۡعَامُ اِلَّا مَا يُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ فَاجۡتَنِبُوا الرِّجۡسَ مِنَ الۡاَوۡثَانِ وَاجۡتَنِبُوۡا قَوۡلَ الزُّوۡرِ ﴿۳۰﴾

جانوروں کی قربانی کرنا ہر آسمانی دین میں عبادت قرار دیا گیا ہے۔ جو تکلیفوں اور مصیبتوں کو صبر واستقلال سے برداشت کرے اور حق کے راستے سے نہ ڈگمگائے اس کے لئے اللہ کی طرف سے بھلائی ہے۔ قربانی کا فلسفہ اور اس کا اصل مقصود۔ دغاباز اور ناشکرے لوگوں کا آخری انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ راستے سے چھانٹ لیے جاتے ہیں اور حق پرست غالب آجاتے ہیں۔

قیامت کی نشانیوں میں البتہ آتا ہے کہ قرب قیامت میں حبشہ کا ایک ظالم شخص کعبۃ اللہ کو گرادے گا۔ اس سے پہلے کئی لشکر آتے رہے مگر اللہ نے ان کو زمین میں دھنسا دیا۔ اور بیت اللہ شریف کی آزادی پر حرف نہیں آنے دیا۔

مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں کہ بیت اللہ محض اینٹوں اور پتھروں کی عمارت کا نام نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ پتھر اکھاڑ کر دوسری جگہ گھر بنا دیا جاتا تو وہ بھی بیت اللہ ہوتا۔ مگر یہ بات نہیں ہے۔ بیت اللہ دراصل اس مقام کا نام ہے جس مقام پر یہ گھر تعمیر ہوا ہے۔ اگرچہ یہ مادی گھر ہے مگر اللہ نے اسے اپنی ذاتی تجلیات کا مہبط بنایا ہے اور یہ درجہ کسی دوسرے مقام کو حاصل نہیں ہے۔ اللہ نے اسے ہماری عبادت کے لئے جہت بنایا ہے۔ قربانی کے جانور حدود حرم میں منیٰ یا دوسری جگہوں پر قربان کیے جاتے ہیں۔ اپنے اپنے ملکوں میں قربانی کرتے وقت بھی جانوروں کے رخ قبلہ کی طرف پھیر دینے چاہئے۔ یہ اس قدیم گھر کی تعظیم کے احکام میں سے ہے۔ (معالم العرفان: ۱۳/ ۲۷۴)

مومنوں کی علامات:

حقیقی مومنوں کی چار علامات ہیں:

(۱) اللہ کا خوف (۲) مصائب پر صبر (۳) نماز کی پابندی (۴) نیک مصارف میں خرچ کرنا۔

الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴿۳۵﴾

جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دلوں پر رعب طاری ہو جاتا ہے، اور جو اپنے اوپر پڑنے والی ہر مصیبت پر صبر کرنے والے ہیں، اور نماز قائم کرنے والے ہیں، اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے، اس میں سے (اللہ کے راستے میں) خرچ کرتے ہیں۔ (۳۵)

بندوں کا تقویٰ:

جانوروں کی قربانی کا حکم دینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ ان کا خون اور گوشت اللہ تک نہیں پہنچتا بلکہ اللہ تک تو بندوں کا تقوی پہنچتا ہے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ﴿۳۷﴾

اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون، لیکن اس کے پاس تمہارا تقوی پہنچتا ہے، اس نے یہ جانور اسی طرح تمہارے تابع بنا دیئے ہیں، تا کہ تم اس بات پر اللہ کی تکبیر کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت عطا فرمائی، اور جو لوگ خوش اسلوبی سے نیک عمل کرتے ہیں، انہیں خوشخبری سنا دو۔ (۳۷)

جس کے دل میں تقوی ہو گا وہ گناہوں سے بچے گا اور نیک اعمال صرف اللہ کی رضا کے لیے کرے گا۔

جہاد وقتال کی اجازت:

مناسک حج کا ذکر کرنے کے بعد مسلمانوں کو جہاد وقتال کی اجازت دی گئی ہے، کیونکہ کفار مسلمانوں کو اللہ کے دین سے اور مکہ میں داخل ہونے سے روکتے تھے، ابتداء میں اگرچہ صبر اور عفو و درگزر کی تلقین کی جاتی رہی لیکن جب مدینہ میں مسلمانوں کے قدم جم گئے اور ان کی طرف سے تحمل و برداشت کے رویہ کے باوجود مشرکین کی شرارتوں اور زیادتیوں کا سلسلہ جاری رہا تو اب انہیں سورۂ حج کی اس آیت (۳۹) کے ذریعے قتال کی اجازت دے دی گئی۔

تقریباً ستر آیات کے بعد یہ پہلی آیت:

متعدد صحابہ اور تابعین کی رائے یہ ہے کہ تقریبا ستر آیات میں ہاتھ روک کر رکھنے کی تلقین کے بعد یہ پہلی آیت تھی جس میں قتال کی اجازت دی گئی۔

جہاد کی حکمت:

ساتھ ہی جہاد کی حکمت بھی بیان کر دی گئی، وہ یہ کہ اگر اللہ جہاد کی اجازت نہ دیتا تو پھر دشمن خودسر ہو جاتے اور اہل کفر،

مومنوں پر چھا جاتے ،جس کی وجہ سے عبادت خانے ویران ہوجاتے لیکن جب انہیں اینٹ کا جواب پتھر سے ملنے کا ڈر ہوگا تو وہ اس اقدام سے پہلے سو بار سوچیں گے (افسوس کہ آج کفار کو مسلمانوں کی طرف سے نہ اقدام کا ڈر ہے نہ دفاع کا، یقین ہے اس لیے وہ جنگلی درندوں کی طرح اسلامی ممالک میں دندناتے پھر رہے ہیں)۔

مقصد بعثت:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾

(اے پیغمبر) کہہ دو کہ: اے لوگو! میں تو تمہیں وضاحت کے ساتھ خبر دار کرنے والا ہوں ۔(۴۹)

دوسرے انبیاء کی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد بھی دعوت کا پہنچا دینا تھا۔

آپ اپنے مقصد بعثت کی تکمیل میں لگے رہے اور مشرکین تمسخر، انکار اور آپ کی دعوت میں شبہات پیدا کرنے کا کام کرتے رہے، ہر نبی کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا آیا ہے۔

دوسری طرف اللہ کا بھی دستور رہا ہے کہ وہ شیاطین کے پیدا کردہ وساوس اور شبہات کا ازالہ کرتا رہا ہے۔ (۵۲۔۵۳)

شیاطین کے طریقے:

آج بھی اہل مغرب ، زمانہ قدیم کے شیاطین کے طریقے کو زندہ رکھے ہوئے ہیں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے اسلامی عقائد اور تعلیمات میں وسوسہ انگیزی کرتے رہتے ہیں۔

تشریعی احکام پر سورۃ کا اختتام:

قدرت الٰہیہ کے دلائل بیان کرنے اور کفار کے معبودان باطلہ کی تردید کے بعد دوبارہ تشریعی احکام کی طرف کلام کا رخ مڑ جاتا ہے اور اہل ایمان کو جہاد فی سبیل اللہ، اقامت صلوۃ اور ادائیگی زکوۃ کا حکم دیا گیا ہے، انہی احکام پر سورۂ حج کا اختتام ہوجاتا ہے۔

ایمان والوں کا اصل رکھوالا:

اس سے بڑھ کر حماقت، بے حیائی اور شرمناک گستاخی کیا ہوگی کہ ان چیزوں کو خالق ارض وسماوات کے ساتھ خدائی میں شریک کیا جائے جو مکھی جیسی حقیر چیز پیدا کرنے پر بھی قادر نہیں ، دین میں کوئی ایسا مشکل اور کٹھن کام نہیں جس کا کرنا ناممکن یا دشوار ہو، احکام میں ہر طرح کی رخصتوں اور سہولتوں کا لحاظ رکھا ہے۔ انعامات الہیہ کی قدر کرو، ہر کام میں اللہ کی رسی مضبوط پکڑے رہو۔

وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾

اور اللہ کو مضبوطی سے تھامے رکھو، وہ تمہارا رکھوالا ہے، دیکھو، کتنا اچھا رکھوالا، اور کتنا اچھا مددگار۔

اہل ایمان کا اصل رکھوالا اوران کی حفاظت کرنے والا صرف اللہ ہی ہے، جن لوگوں نے اللہ کے احکامات کی پابندی کی، اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑا ان کے اوپر دشمن کبھی بھی قابو نہ پا سکا، سورۂ حج کا اختتام اس پیغام پر ہوتا ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو، وہ تمہارا رکھوالا ہے، دیکھو کتنا اچھا رکھوالا ہے اور کتنا اچھا مددگار ہے۔

(خلاصۃ القرآن: م اش، خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

انسان کو ضمیر کی پابندی سے ہٹانے والی چیز ہمیشہ یہی خوف ہوتا ہے کہ اگر فلاں کو میں نے خوش نہ رکھا تو وہ مجھے نقصان پہنچا دے گا۔ قرآن نے بار بار ضرب کاری اسی گمان فاسد پر لگائی ہے، اور بار بار اعلان کیا ہے کہ کام بنانے والا اور ہر طرح کی نصرت واعانت کرنے والا تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کی طرف خیال لے جانا بھی حماقت ونادانی ہے۔ (ماجدی: ۴/ ۳۹۵)

موضوع سورۃ: ...... نجات یوم المجازات تعلق باللہ کی درستی پر موقوف ہے۔

خلاصہ رکوع: ۱ ...... جو قادر مطلق انقلابات یومیہ نظام عالم پر قادر ہے وہ سارے نظام کے انقلاب پر بھی قادر ہے۔ ماخذ: آیت: ۵، ۶، ۷۔

خلاصہ رکوع: ۲ ...... بعض آدمی تعلق باللہ درست کرنے کے بعد ابتلاء وافتتان کے وقت تعلق توڑ کر بے کس مخلوق کے ساتھ جاکر جوڑتے ہیں۔ ماخذ: آیت: ۱۱ تا ۱۳۔

خلاصہ رکوع: ۳ ...... (۱) تعلق باللہ قائم کرنے والوں کی جزائے خیر کا ذکر۔ (۲) اور درس گاہ توحید سے روکنے والوں کی سزا۔ ماخذ: (۱) آیت: ۲۳۔ (۲) آیت: ۲۵۔

خلاصہ رکوع: ۴ ...... تعلق باللہ درست کرنے والے تعظیم شعائر اللہ سے تقوی قلبی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ماخذ: آیت: ۳۲۔

خلاصہ رکوع: ۵ ...... تعلق باللہ درست کرنے والے اپنے طیب مال قربان کر کے اپنے جذبہ صادقہ کی تصدیق کرتے ہیں۔ ماخذ: آیت: ۳۴، ۳۷۔

خلاصہ رکوع: ۶ ...... متعلقین باللہ ہمیشہ امن کے حامی ہیں، لیکن مملکت الٰہی میں بغاوت پھیلانے والوں کی سرکوبی کے لئے سر بکف ہیں۔ ماخذ: آیت: ۳۹۔

خلاصہ رکوع: ۷ ...... جب انبیاء علیہم السلام نے حق کی آواز اٹھائی، تو شیطان نے بھی مقابلے کے لئے ہتھیار سنبھالے۔ ماخذ: آیت: ۵۲۔

خلاصہ رکوع: ۸ ...... تعلق باللہ درست کرنے والے ضرورت کے وقت وطن و دیار کو خیر باد کہیں گے، ان کی ضروریات کا کفیل اللہ تعالیٰ ہوگا۔ ماخذ: آیت: ۵۸۔

خلاصہ رکوع:۹......آٹھویں رکوع کا تتمہ ہے،یعنی وسائل رزق اس نے مہیا فرمائے ہیں۔ماخذ: آیت:٦۵۔

خلاصہ رکوع:۱۰......(۱) غیر اللہ سے تعلق جوڑنے والوں کے ضعف کا بیان۔(۲)اور متعلقین باللہ کی کامیابی کا ذکر۔آیت: ۷۳۔ماخذ:(۱) آیت:۷۷۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سترہویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) صفات الٰہی میں سے چند صفات یہ ہیں: وہ پیدا کرتا ہے، رزق دیتا ہے، زندہ کرتا ہے، موت دیتا ہے۔پس جس میں یہ صفات نہ ہوں وہ الہ کیسے ہوسکتا ہے۔

(۲) شرک پر بھی کوئی مضبوط دلیل نہیں ہوتی اور نہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت کے صحیح ہونے پر ذہن میں صحیح دلیل کا وجود ہوسکتا ہے۔

(۳) مشرکین کا شرک اور کفر پر اصرار اس وجہ سے ہے کہ ان کی توجہ قرآن کریم کے تدبر اور اس کی آیات کے تفکر پر نہیں ہے۔

(۴) متقین کی صفات میں سے یہ ہے کہ وہ بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں، واجب کے چھوڑنے کے ذریعے ان کی نافرمانی نہیں کرتے، حرام کام نہیں کرتے، ہر وقت اللہ سے ڈرنے والے ہیں، اللہ کا خوف رکھتے ہیں۔

(۵) ہاتھ کے ذریعے غلط کام کو روکنا زیادہ بہتر ہے بنسبت صرف زبان کے ساتھ روکنے کے اور دونوں کو جمع کرنا ہی زیادہ افضل ہے۔

(۶) اللہ کی ذات وصفات میں بغیر علم النبی یا علم نبوی کے بحث ومباحثہ کرنا حرام ہے۔

(۷) اسلام کے سوا جتنے بھی ادیان ہیں سب شیطان کی وحی ہیں، اسی وجہ سے اس کے ماننے والے خسارہ میں ہیں۔ اسلام اللہ کا دین ہے اور یہ ہی سچا ہے اور اس کے ماننے والے کامیاب ہیں۔

(۸) کلام میں سب سے اچھا کلمہ کلمۂ توحید اور اللہ کا ذکر ہے۔

(۹) عجلت پسندی انسان کی طبیعت ہے لیکن اس کے ذریعے سے اللہ سے جلد عذاب مانگنا احمقوں کا کام ہے۔

(۱۰) آخرت کے دن کافر اور مومن ہر ایک کو بدلہ دیا جائے گا۔

***

پارہ:۱۸

سورۂ مومنون

اس سورہ کی ابتدائی آیات میں اسلام کی تمام بنیادی تعلیمات کو جمع کر دیا گیا ہے؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ جو شخص ان دس آیتوں پر عمل کا اہتمام کرے گا، وہ جنت میں داخل ہوگا، ''**أنزل عليّ عشر آيات من أقامهن دخل الجنة**'' (ترمذی، باب ومن سورۃ المومنون، حدیث نمبر: ۳۱۷۳) اور اُم المومنین حضرت عائشہؓ سے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے اسی سورہ کی آیت نمبر: ۱ سے آیت نمبر: ۹ تک تلاوت فرمائی، (تفسیر قرطبی: ۱۲/۱۰۴) یعنی یہی آیات آپ ﷺ کے اخلاق اور آپ ﷺ کی پاکیزہ زندگی کا خلاصہ ہیں، ان میں پہلا حکم خشوع کا ہے، خشوع کا تعلق اصل میں انسان کے دل سے ہے، یعنی دل کا پوری طرح اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور سکون و اطمینان کے ساتھ اللہ کی یاد میں مشغول ہونا، اور جب دل میں یہ کیفیت ہو تو انسان کے اعضاء سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک صاحب کو نماز میں اپنی داڑھی سے کھیلتے ہوئے دیکھا، تو فرمایا کہ اگر اس کے قلب میں خشوع کی کیفیت ہوتی تو اس کا جسم بھی پُرسکون رہتا: ''**لو خشع قلب هذا لخشعت جوارحه**'' (مصنف ابن ابی شیبہ، باب فی مس الحیۃ فی الصلاۃ، حدیث نمبر: ۶۷۸۷) خشوع چوں کہ ایسی چیز نہیں ہے جس کو برقرار رکھنے پر انسان کو پوری قدرت حاصل ہو؛ اس لئے یہ نماز کے ارکان میں سے تو نہیں ہے کہ جس کے چھوٹ جانے سے نماز درست نہیں ہو؛ لیکن نماز کے قبول ہونے میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

دوسرا وصف بیان کیا گیا کہ وہ لَغو باتوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھتا ہو، لغو سے مراد ہے بے فائدہ کام، اس میں گناہ بھی شامل ہے، وہ باتیں بھی شامل ہیں، جو انسان کو اس کے فرائض سے غافل کر دینے والی ہیں، وہ باتیں بھی جو بے فائدہ ہوں اور ایسے کام بھی جو بے محل ہوں، بعض اوقات ایک کام اپنی اصل کے اعتبار سے درست ہوتا ہے؛ لیکن اگر وقت کی رعایت کئے بغیر اس کام کو کیا جائے تو اُلٹے نقصان پہنچتا ہے، ایسے موقع پر اس کام کو چھوڑنا لغو سے اِعراض کرنے میں شامل ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ کعبۃ اللہ کی عمارت کو منہدم کر کے حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر کے مطابق دوبارہ تعمیر کرنا چاہتے تھے؛ لیکن خواہش کے باوجود آپ ﷺ نے اس لئے نہیں کیا کہ اندیشہ تھا کہ اس کی وجہ سے لوگوں میں ابھی نئے نئے مسلمان ہونے کی وجہ سے غلط فہمی اور بدگمانی پیدا ہو سکتی ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ بہت سی دفعہ اس پہلو کو سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے اُمت میں انتشار کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

تیسرا وصف یہ ہے کہ وہ اہتمام کے ساتھ زکوٰۃ ادا کیا کرتے ہیں، زکوٰۃ بندوں کے ساتھ مالی حسن سلوک کا عنوان

ہے، گویا یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ غریب انسانوں کی مالی مدد کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

چوتھا وصف یہ ہے کہ وہ اپنی عصمت وعفت کی حفاظت کرتا ہے، عصمت وعفت کی حفاظت کا تعلق مرد وعورت کے مخصوص فعل ہی سے نہیں ہے؛ بلکہ انسان کے خیالات، اس کی آنکھیں، اس کی زبان اور اس کے ہاتھ جو اس کو گناہ تک لے جانے میں معاون بنتے ہیں، عفت وعصمت کی حفاظت میں یہ سب شامل ہیں؛ البتہ شوہر و بیوی کا تعلق اور مالک اور اس کی کنیز (جس کا اسلام سے پہلے رواج تھا، اور اسلام نے اس کو آہستہ آہستہ ختم کردیا) کا تعلق پاک دامنی کے خلاف نہیں ہے، اگرچہ اپنی عزت وآبرو کی حفاظت کے مخاطب مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی ہیں؛ لیکن یہاں مردوں کا ذکر کیا گیا ہے؛ کیوں کہ عورت کی طرف ایسی بات کی نسبت حیا کے خلاف ہے؛ اس لئے قرآن مجید میں عام طور پر مردوں کو مخاطب بنا کر یہ حکم دیا گیا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح بھوک پیاس وغیرہ انسان کی فطرت میں داخل ہے، اسی طرح اللہ نے شہوت کو بھی انسان پر مسلط کر رکھا ہے۔ انسانی جسم میں موجود مادہ تولید باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے جو کہ ہر جائز یا ناجائز ذرائع سے ممکن ہوتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ناجائز ذرائع پر پابندی لگا دی ہے تاکہ انسان کی نسل خراب نہ ہو، اور شہوت رانی کے بعد انسان اپنی ذمہ داری بھی محسوس کرے، یہ اسی صورت میں ہوگا۔ جب انسان اپنی منکوحہ بیوی سے متمتع ہوگا۔ پھر وہ اپنی اولاد کی پرورش کی ذمہ داری بھی اٹھائے گا۔ اور اگر محض شہوت رانی کر کے انسان علیحدہ ہوجائے تو نہ وہ قانون کی پابندی کرنے والا ہوگا اور نہ اس کے نتیجے میں آنے والی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے گا۔ یہی وہ قباحت ہے جو پوری انسانی سوسائٹی کو خراب کرتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نکاح کی پابندی عائد کر کے معاشرے کو مہذب، متمدن اور ذمہ دار بنایا ہے، اس طریقے سے نسل انسانی کی حفاظت بھی ہوگی، جس طرح ایمان اور عقیدے کی حفاظت ضروری ہے اسی طرح نسل اور اخلاق کی حفاظت بھی ضروری ہے اور یہ نکاح کی صورت میں ہی ہوسکتی ہے۔

آج ہم دنیا بھر میں دیکھ رہے ہیں کہ شہوانی جذبات کے فرو کرنے میں خدائی قوانین کی پرواہ نہیں کی جارہی، بلکہ مغرب کی متمدن دنیا میں تو خود ساختہ قوانین کے ذریعے خدائی احکام کے الٹ کیا جارہا ہے۔ برطانوی قانون کے مطابق اگر دو مرد باہمی رضامندی سے ہم جنسی کے مرتکب ہوتے ہیں تو قانون کی نظر میں ان پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا۔ اسی طرح امریکہ، برطانیہ اور یورپ کے کئی دوسرے ممالک میں بالغ مرد وزن باہمی رضامندی سے بدکاری کر سکتے ہیں، ان پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ قانون کی نظر میں قصوروار ہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص زنا بالجبر کا مرتکب ہوتا ہے تو پھر ان کا قانون حرکت میں آتا ہے، ورنہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زنا کے متعلق فرمایا ہے: زنا کے قریب نہ جاؤ کہ یہ بے حیائی اور برا راستہ ہے۔ زنا عقل اور دستور دین سب کے خلاف ہے۔ اور ہم جنسی تو زنا سے بھی زیادہ فحش ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ نکاح کے راستے میں تو معاشرے نے طرح طرح کی پابندیاں لگا رکھی ہیں اور غلط راستہ کھلا ہے۔ فرمایا: جائز ذرائع کے علاوہ جو کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے گا تو وہ تعدی کرنے والا ہوگا اور اللہ کے ہاں ماخوذ ہوگا۔

پانچواں اور چھٹا وصف یہ ہے کہ ایمان والے امانتوں اور وعدوں کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں، امانت میں خیانت نہیں کرتے اور نہ وعدہ خلافی کرتے ہیں، امانت کا تعلق صرف مال ہی سے نہیں ہے؛ بلکہ ذمہ داریوں سے بھی ہے، جیسے دفتروں میں جو اوقات کار متعین ہیں، وہ امانت ہے، اس میں کمی کرنا امانت میں خیانت ہے، وعدہ میں وہ وعدہ بھی شامل ہے، جو معاملات میں دونوں فریق کی جانب سے ہو، جیسے نکاح، ملازمت، خرید وفروخت اور دوسرے مالی معاملات جن میں دو طرفہ وعدہ ہوتا ہے، اور وہ وعدے بھی شامل ہیں جو ایک طرفہ طور پر کیا کرتے ہیں، جیسے کسی کے ساتھ حسن سلوک کا یا قرض وغیرہ دینے کا وعدہ۔

ساتواں وصف یہ ہے کہ وہ نمازوں کی پابندی رکھتے ہیں، یعنی ہر نماز کو نہ صرف ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں؛ بلکہ اس کو اس کے مستحب وقت میں پڑھتے ہیں اور اس کے ارکان یعنی قیام رُکوع، سجدہ وغیرہ کو مسنون طریقہ پر انجام دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں کے لئے جنت الفردوس کا وعدہ فرمایا ہے، جو ان صفات کے حامل ہیں۔ (آسان تفسیر، معالم العرفان: ۱۳ / ۵۷۲، ۵۷۳)

صفات مومنین بیان کرنے کے بعد انسان، زمین وآسمان اور نباتات وحیوانات کی پیدائش کی طرف اور دوسرے آثار کائنات کی طرف توجہ دلائی ہے، جس سے مقصود یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ توحید اور روز جزا کی جن حقیقتوں کو تسلیم کرنے کے لئے پیغمبر تم سے کہتا ہے، ان کے برحق ہونے پر تمہارا اپنا وجود اور یہ پورا نظام کائنات گواہ ہے۔

اس کے بعد بعض انبیاء اور ان کی امتوں کے قصے بیان کئے ہیں جو بظاہر اگر چہ قصے ہیں مگر قارئین وسامعین کو ان کے بین السطور میں چند باتیں سمجھانا مقصود ہیں۔

◇ اول یہ کہ تم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر جو اعتراضات کر رہے ہو یہ کوئی نئے نہیں، تم سے پہلے گمراہ لوگ یہی اعتراض اپنے پیغمبروں پر کرتے رہے۔

◇ دوسرے یہ کہ توحید اور عقیدہ آخرت کی جو تعلیم محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں، یہی تعلیم ہر دور کے انبیاء نے دی ہے، اس میں کوئی انوکھی اور نرالی بات نہیں۔

◇ تیسرے یہ کہ جن لوگوں نے انبیاء کی باتوں پر توجہ نہ دی اور ان کی مخالفت کی وہ تباہ وبرباد ہوئے۔

◇ چوتھے یہ کہ، خدا کی طرف سے ہر زمانے میں انبیاء ایک ہی دین لاتے رہے، وہی دین حق ہے، اس کے سوا جو بھی دین ومذہب ہے وہ لوگوں کا من گھڑت ہے اور اس کی پیروی کسی کو فوز وفلاح سے ہمکنار نہیں کرسکتی۔

ان امور کے بعد اس حقیقت کو آشکارا کیا کہ بعض لوگ کسی قوم یا گروہ کی دنیوی شان وشوکت اور مال ودولت سے مرعوب ہوجاتے ہیں، سو کسی کا مال ودولت، جاہ وحشم اور خوش حالی ہرگز اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ ہدایت پر ہے۔ (قرآن ایک نظر میں)

یہ قرآن کریم کی ۲۳ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۷۴ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۶ رکوع، ۱۱۸ آیات اور ۱۰۷۰ کلمات اور ۴۵۳۴ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

چونکہ مؤمنون کا لفظ اس سورۃ کی پہلی ہی آیت میں آیا ہے اور اس سورۃ میں ایمان والوں کی صفات بیان کی گئی ہیں، ان کے اطوار و عادات بتلائے گئے ہیں، اس لئے اس سورۃ کا نام مؤمنون رکھ دیا گیا۔

ربط:

(۱) سورۂ حج کے اخیر میں یہ بیان تھا کہ اے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم کو خدا نے برگزیدہ کیا ہے کہ تم اور لوگوں پر دنیا و آخرت میں نیکی اور بدی کے معاملات میں شہادت ادا کرو جس کام یا جس شخص کو تم اچھا کہو وہی اچھا اور بھلا ہے، اور رسول ایسے معاملات میں تم پر شہادت ادا کرنے والا ہے، تمہاری اچھائی اور برائی رسول کی شہادت پر موقوف ہے، اور یہ بات ظاہر ہے کہ گواہ جب تک عدل یعنی نیک اور معتبر نہ ہو تو اس کی گواہی کیا؟ اس لئے اس سورۃ میں اصول حسنات کی طرف اس جملہ "**فاقیموا الصلوة واتوا الزكوة واعتصموا بالله**" سے اجمالاً اشارہ تھا، اب اس سورۃ میں اس کی تشریح فرمائی گئی اور اصول حسنات بیان فرمانے سے پہلے ان پر عمل کرنے والوں کو فلاح کا مژدہ بھی سنایا گیا کہ ان کی فلاح میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔

(۲) گزشتہ سورۃ کے آخری رکوع میں آیا ہے **یایها الذین امنوا ارکعوا واسجدوا واعبدوا ربکم وافعلوا الخیر لعلکم تفلحون**، اے ایمان والو! رکوع و سجود کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ اور بھلائی کے کام کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔ اب اس سورۃ کی ابتداء میں بھلائی کے کاموں کی تشریح کی گئی ہے جن پر دنیا و آخرت کی کامیابی کا انحصار ہے۔ گویا گزشتہ سورۃ میں بھلائی کے کاموں کی نوید سنائی گئی تھی اور اس سورۃ میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ جو لوگ بھلائی کے کاموں کو بالفعل انجام دیں گے، وہ کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ اس سورۃ کا گذشتہ سورۃ کے ساتھ ربط ہے۔

فضائل:

ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی تو آپ نے قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی: "**اللهم زدنا ولا تنقصنا واكرمنا ولا تهنا واعطنا ولا تحرمنا وأثرنا ولا تؤثر علينا وارض عنا وارضنا**" کہ اے اللہ! تو ہمیں زیادہ کر کم نہ کر، ہمارا اکرام کر اہانت نہ کر، ہمیں انعام عطا کر، محروم نہ رکھ، ہمیں دوسروں پر اختیار کر ہم پر دوسروں کو پسند نہ فرما، ہم سے خوش ہو جا اور ہمیں خوش کر دے، پھر فرمایا کہ مجھ پر دس آیتیں اتری ہیں جو ان پر جم گیا وہ جنتی ہو گیا پھر آپ نے شروع سورۃ سے دس آیتیں تلاوت فرمائیں، مگر امام ترمذی نے اس حدیث کو منکر کہا ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کی ابتداء میں مؤمنین کی چند صفات بیان کی گئی ہیں کہ اللہ اور رسول پر ایمان لانے والوں میں یہ باتیں پیدا ہوتی ہیں اور ایسے ہی لوگ دنیا وآخرت وفلاح کے مستحق ہوتے ہیں، اس کے بعد انسان کی پیدائش اور دوسرے آثار کائنات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جس سے یہ ذہن نشیں کرانا مقصود ہے کہ توحید اور معرفت الٰہی کی جس حقیقت کو تسلیم کرنے کا سبق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں اس کے برحق ہونے پر تمہارا اپنا وجود اور یہ پورا نظام عالم گواہ ہے۔

اللہ کی عبادت کے لئے ضروری ہے کہ اس کی معرفت حاصل کی جائے اور یہ معرفت اس کی قدرت کی نشانیاں دیکھ کر جو دنیا میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں ہر عقلمند اور ذی ہوش حاصل کرسکتا ہے، پھر انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کے قصے ذکر فرمائے گئے ہیں جن سے کئی باتیں بتلانی مقصود ہیں، ایک یہ کہ آج دعوت نبی پر جو شبہات اور اعتراضات کئے جارہے ہیں یہ پہلے بھی انبیاء پر کر چکے ہیں، دوسرے یہ کہ یہ توحید اور آخرت کی تعلیم ایسی نہیں کہ جو بالکل نئی ہو اور جو دنیا نے کبھی سنی نہ ہو، بلکہ ہر زمانہ میں یہ صدائے حق اٹھتی رہی ہے۔ تیسرے یہ کہ حق کا انکار کر کے باطل پر اصرار کرنے والے کا انجام آخر کار تباہی و ہلاکت ہوتا ہے۔ چوتھے یہ کہ دین اسلام اس وقت سے دین الٰہی ہے جب سے انسان کے قدم زمین پر پہنچے ہیں، پھر انبیاء کے تذکروں کے بعد بتایا گیا کہ دنیوی خوشحالی، مال و دولت، قوت و اقتدار وہ چیزیں نہیں جو کسی شخص یا گروہ کے راہ راست پر ہونے کی یقینی علامت ہوں اور ان کو اس بات کی دلیل سمجھا جائے کہ خدا اس شخص پر مہربان ہے اور خدا کو اس کا رویہ پسند ہے۔ اسی طرح اس کے برعکس کسی کا غریب اور خستہ حال ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ خدا اس کے رویہ سے ناراض ہے، بلکہ وہ اصل چیز جس پر خدا کے یہاں محبوب یا مغضوب ہونے کا مدار ہے وہ ایمان، خدا پرستی اور تقوی و راست بازی ہے، آخر میں انسان کو سمجھایا گیا ہے کہ یہ دنیا کی زندگی کوئی کھیل نہیں ہے، اس کو بیکار اور فضول باتوں میں نہ گزارنا چاہئے۔ قرآن مجید کی باتوں کو سچا مان کر اس پر عمل کرنا چاہئے اور اللہ عزوجل سے مغفرت ورحمت کی دعا کرتے رہنا چاہئے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن، معالم العرفان: ۱۳/ ۵۶۷)

پارہ کی ابتدا سورۃ المومنون سے ہورہی ہے۔

اس سورت میں اصول دین سے بحث کی گئی ہے۔

جنت الفردوس کے مستحقین کی صفات:

سورت کی ابتدائی نو آیات میں مومنین کی سات ایسی صفات ذکر کی گئی ہیں جن کی وجہ سے وہ جنت الفردوس کے مستحق ہوں گے، وہ سات صفات درج ذیل ہیں:

(۱) سچا ایمان جو کہ ریا اور نفاق سے پاک ہو۔

(۲) نماز میں خشوع یعنی اللہ کے سامنے عاجزی اور خوف کے ساتھ کھڑے ہوں۔

(۳) لغو سے اعراض، (ہر ایسے قول وفعل کو کہا جاتا ہے جس میں کوئی فائدہ نہ ہو)۔

(۴) کامل طریقے سے زکوۃ کی ادائیگی، گویا وہ حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کا بھی خیال رکھتے ہیں۔

(۵) وہ زنا اور فحش کاموں سے اپنے آپ کو بچا کر رکھتے ہیں۔

(۶) وہ امانتوں کی حفاظت کرتے ہیں اور وعدے پورے کرتے ہیں۔

(۷) نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں، وقت کا بھی لحاظ رکھتے ہیں اور ارکان وآداب کی بھی رعایت کرتے ہیں۔

شکم مادر میں انسانی وجود کے مراحل:

ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ﴿۱۳﴾..................الیٰ..........................فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ﴿۱۴﴾

مومنین کی صفات بیان کرنے کے بعد خود انسان کی زندگی اور اس کی تخلیق کے مختلف مراحل میں ایمان کے جو دلائل پائے جاتے ہیں، وہ ذکر کیے گئے ہیں:

قرآن نے شکم مادر میں انسانی وجود کے مراحل (نطفہ، جما ہوا خون، لوتھڑا، ہڈی، ہڈی پر گوشت کا لباس اور اس کے بعد مکمل انسان) آج سے کئی سو سال پہلے اس وقت بیان کیے تھے، جب کہ عرب وعجم کے حکماء میں سے کوئی بھی ان مراحل کے بارے میں لب کشائی کی جرأت نہیں پاتا تھا۔آج کی جدید سائنس اور میڈیکل تحقیقات بھی ان مراحل کی تصدیق کرتی ہیں۔

تکوینی دلائل:

انسان کے وجود میں دلائل ایمان بیان کرنے کے بعد تین قسم کے تکوینی دلائل بیان کیے گئے ہیں:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ .... الیٰ..........................وَلَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ كَثِیْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۱﴾

(۱) ساتوں آسمانوں اور ان کے اندر جو عجیب مخلوقات ہیں ان کی تخلیق۔

(۲) بارش کا برسانا اور اس کے ذریعے مختلف غلہ جات اور پھلوں کا اگانا۔

(۳) چوپایوں اور ان کے اندر دودھ، گوشت، اون، سواری اور بار برداری جیسے منافع کا پیدا کرنا۔(۱۷-۲۲)

بعض انبیاء کے قصص:

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ............... الیٰ..............وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْیَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰیَةً وَّاٰوَیْنٰهُمَاۤ اِلٰی رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ ﴿۵۰﴾

اللہ تعالی کی قدرت اور وحدانیت کے دلائل ذکر کرنے کے بعد اب سورت منتقل ہو جاتی ہے بعض انبیاء علیہم السلام کے قصص کی طرف۔

اس سلسلہ میں حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون اور حضرت عیسی بن مریم علیہم السلام کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔ (۳۳-۵۰)

ان تمام انبیاء کی ایک ہی دعوت، ایک ہی پروگرام اور ایک ہی مقصد تھا، یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب ایک ہی زمانے اور ایک ہی ملک میں مبعوث ہوئے تھے۔ لیکن ان انبیاء کے جانے کے بعد ان کے امتی مختلف فرقوں اور گروہوں میں تقسیم ہو گئے، ہر گروہ اپنے خیال میں مست اور خیالات پر خوش تھا۔

مسلمان ایک نہیں:

کیسے کہا جائے کہ آج مسلمان بھی اسی صورتحال سے دو چار ہیں، قرآن بھی ایک، نبی بھی ایک، قبلہ بھی ایک لیکن مسلمان ایک نہیں، بھانت بھانت کی بولیاں، تکفیر و تفسیق کے فتوے، باہم جدل ونزاع۔

اختلافات کا حل:

ان اختلافات کے حل کی ایک ہی صورت ہے، وہ یہ کہ ہر فرقہ کتاب وسنت کے سامنے گردن تسلیم خم کر دے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو باہم جدل ونزاع میں مصروف ہیں اور ان کے دل غفلت اور جہالت میں پڑے ہوئے ہیں، تو دوسری طرف اللہ کے وہ نیک بندے ہیں جو آپس میں محبت کرتے ہیں، ان کے دل بیدار اور ہدایت کے نور سے منور ہیں۔

چار نمایاں صفات:

اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ﴿۵۷﴾.......... الیٰ............وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ﴿۶۰﴾

نیک بندوں میں چار نمایاں صفات پائی جاتی ہیں:

◇ پہلی صفت یہ ہے کہ وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

◇ دوسری صفت یہ ہے کہ وہ اللہ کی تکوینی اور تشریعی آیات پر ایمان رکھتے ہیں۔

◇ تیسری صفت یہ کہ وہ ریا سے بچتے ہیں اور ہر عمل خالص اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں۔

◇ چوتھی صفت یہ کہ انہیں احسان کی صفت حاصل ہوتی ہے، یعنی نیک اعمال کرنے کے باوجود ڈرتے رہتے ہیں کہ پتہ نہیں ہمارے اللہ کے ہاں یہ قبول بھی ہو رہے ہیں یا نہیں (۵۷-۶۰)۔

ترمذی وابن ماجہ کی ایک حدیث ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے اس آیت کا مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہ کام کر کے ڈرنے والے کیا وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے ہیں یا چوری کرتے ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے صدیق کی بیٹی یہ بات نہیں، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ شاید ہمارے یہ عمل اللہ کے نزدیک ہماری کسی کوتاہی کے سبب قبول نہ ہوں۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مؤمن نیکی کرتا ہے اور ڈرتا رہتا ہے اور منافق بدی کرتا ہے اور پھر بھی بے فکر رہتا ہے۔ نیز آپ فرماتے تھے کہ ہم نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو نیک عمل کر کے اتنا ڈرتے تھے کہ لوگ برے عمل کر کے بھی اتنا نہیں ڈرتے۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ نے باوجود عمر بھر کی بے نظیر دینی خدمات اور ذخیرہ اعمال صالحہ کے اور عشرہ مبشرہ میں سے ہونے کے جب دنیا سے رخصت ہونے لگتے ہیں، تو فرماتے ہیں کہ اگر آخرت میں برابر سرابر بھی چھوٹ جاؤں تو غنیمت ہے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن: م اش)

حرمان نصیب:

ان مخلص مومنوں کے مقابلے میں وہ حرمان نصیب بھی ہیں جو قرآن اور صاحب قرآن کا مذاق اڑاتے ہیں۔

اَفَلَمۡ يَدَّبَّرُوا الۡقَوۡلَ اَمۡ جَآءَهُمۡ مَّا لَمۡ يَاۡتِ اٰبَآءَهُمُ الۡاَوَّلِيۡنَ۝۶۸ ....الیٰ............ اَمۡ تَسۡـَٔلُهُمۡ خَرۡجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيۡرٌ ۖ وَّهُوَ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ۝۷۲

سرکشی کے اسباب:

ان کے استہزاء اور سرکشی کے تین بڑے اسباب قرآن نے بیان کیے ہیں:

◇ پہلا یہ کہ وہ عقلوں کو استعمال نہیں کرتے بلکہ قرآن میں غور و تدبر کیے بغیر استہزاء اور انکار کرنے لگتے ہیں۔

◇ دوسرا یہ کہ وہ محض ضد اور عناد کی بنا پر اللہ کے رسول کو جھٹلاتے ہیں ورنہ ایسا نہیں کہ وہ آپ کو پہچانتے نہ ہوں۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت و امانت حسب نسب اور شخصیت کو خوب اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز جھوٹ نہیں بول سکتے۔

◇ تیسرا سبب سوالیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ کیا انہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں (معاذ اللہ) کوئی جنون کے آثار دکھائی دیتے ہیں؟

◇ یا چوتھا سبب ہے کہ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں سے کچھ مالی منفعت کے امیدوار اور طلب گار ہیں۔

حق کو خواہشات کے تابع:

حق جل شانہ نے کفار کی ان باتوں کو نقل کر کے سب کا جواب دیا اور بتلا دیا کہ ان کے ایمان نہ لانے کی اصل وجہ یہ نہیں کہ یہ لوگ قرآن کریم کے ظاہری اور معنوی اعجاز سے واقف نہیں یا آپ کی صداقت اور امانت سے یا آپ کی فہم و فراست سے واقف نہیں یا آپ کو پہچانتے نہیں یا آپ ان سے کسی مالی منفعت کے امیدوار ہیں، ان میں سے انکار کی کوئی بھی وجہ نہیں، بلکہ وجہ یہ ہے کہ حسد اور بغض کی وجہ سے انکار کرتے ہیں اور غرور اور تکبر کی وجہ سے حق کے سامنے جھکنے کو تیار

نہیں اور بجائے اس کے کہ وہ حق کا اتباع کریں چاہتے یہ ہیں کہ حق ان کی خواہشوں کے تابع ہوجائے، بالفرض اگر حق ان کی خواہشوں کے تابع ہوجائے تو کارخانہ عالم درہم برہم ہوجائے۔ یہ لوگ بڑے سرکش ہیں، بغیر کسی عذاب اور بلاء آسمانی کے حق کے سامنے جھکنے والے نہیں۔ (۶۸ - ۷۲) (معارف القرآن ادریسی: ۵/۳۷۳)

صحیحین کی روایت ہے کہ جب قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا اور سخت مزاحمت شروع کردی، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی: "اے اللہ ان کے مقابلے میں میری مدد فرما۔ یوسف علیہ السلام کے سات سالہ قحط جیسے سات برسوں سے" چنانچہ ایسا سخت قحط شروع ہوا کہ اہل مکہ کو مردار جانور، کتے اور ہڈیاں تک کھانے کی نوبت آگئی اور کفار سات برس تک اس قحط میں مبتلا رہے۔ بالآخر اس مصیبت سے تنگ آکر ابوسفیان- جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آپ کو اللہ کا اور رشتہ داریوں کا واسطہ دیتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ہم لوگ خون اور اونٹوں کا اون بھی کھا گئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو رحمۃ للعالمین تھے، فوراً اللہ کے آگے ہاتھ اٹھا دیئے۔ چنانچہ وہ قحط دور ہوگیا۔ (درس قرآن بحوالہ خلاصہ مضامین قرآن کریم)

آیت ۷۵ (وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَ كَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴿۷۵﴾) میں اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: اور اگر ہم ان پر رحم کریں اور اس تکلیف کو دور کردیں جس میں یہ مبتلا ہیں، تب بھی یہ بھٹکتے ہوئے اپنی سرکشی پر اڑے رہیں گے۔

آیت ۷۵ اور اس جیسی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بلیات ومصائب مثل قحط وغیرہ یہ سب قہر الہی کی نشانیاں ہیں اور مقصد ان کا یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان سے سبق حاصل کرکے اللہ کے آگے فروتنی اور عاجزی اختیار کریں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو سخت عذاب کو دعوت دیتا ہے۔ خواہ وہ دنیا ہی میں ہو یا فوت ہونے کے بعد۔

علم ومعرفت کے ذرائع انسان کو تین قسم کے عطا کئے گئے ہیں:

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ﴿۷۸﴾

(۱) کان (۲) آنکھ (۳) دل

انہی چیزوں کے ذریعے کسی چیز کا یقینی علم ہوسکتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم جگہ جگہ توحید، وقوع قیامت کی آیات میں جابجا دیکھنے، سننے اور سوچنے سمجھنے کی دعوت دیتا ہے کہ اللہ کی باتیں سنو، اس کی قدرت کی نشانیاں دیکھو اور اس کی معرفت حاصل کرو۔ یہی اصل شکر اور حقیقی شکر گزاری ہے اس منعم کی ان نعمتوں کی۔ آیت ۷۸ میں یہی بتایا جارہا ہے کہ اللہ کا یہ عظیم الشان احسان انسانوں پر ہے کہ اس نے اسے سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوت عطاء فرمائی۔ ان نعمتوں کا شکر تو یہ تھا کہ اللہ کی دی ہوئی قوت کو صحیح طور پر کام میں لایا جائے۔ احکام الہی کو سننا، اس کی قدرت کی نشانیوں کو دیکھنا اور دل میں اس کی معرفت حاصل کرنا اور اللہ کی وحدت وعظمت وجلالت پر ایمان لانا ہی ان قوتوں کا ٹھیک اور صحیح استعمال تھا؛ لیکن اکثر انسانوں نے

ان نعمتوں کا غلط استعمال کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: مگر تم لوگ بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔" (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

قیامت کے دن انسانوں کی دو قسمیں:

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَہُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ﴿۱۰۱﴾........الیٰ.........قٰلَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا لَّوْ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴿۱۱۴﴾

صور پھونکنے کا ذکر قرآن پاک میں مختلف مقامات پر آیا ہے، نفخہ صور دو دفعہ واقع ہوگا۔ جب پہلی مرتبہ صور میں پھونکا جائے گا تو کائنات کی ہر چیز درہم برہم ہوجائے گی۔ پھر جب دوسری مرتبہ صور میں پھونکا جائے گا۔ تو ساری مخلوق دوبارہ زندہ ہوجائے گی اور پھر ان کا حساب کتاب اور جزا و سزا کا فیصلہ ہوگا۔ (بخاری، مسلم) ان دو نفخوں کے درمیان چالیس سال کا وقفہ ہوگا۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے دریافت کیا، حضور! صور کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ ایک قرن یعنی سینگ جیسی چیز ہے، جس کا منہ ایک طرف سے تنگ اور دوسری طرف سے کشادہ ہے۔ تنگ حصہ فرشتے کے منہ میں ہے اور وہ اللہ کے حکم کے انتظار میں ہے کہ کب حکم ہو اور وہ اس میں پھونک مار دے، ترمذی شریف اور بعض دوسری کتابوں میں یہ حدیث بھی آتی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: میں کیسے خوش رہ سکتا ہوں یا کیسے بے فکر ہوسکتا ہوں۔ جب کہ صور پھونکنے والا فرشتہ بالکل تیار کھڑا ہے، منہ میں صور تھامے ہوئے ہے، اس نے اپنی پیشانی جھکا رکھی ہے اور اللہ کے حکم کا منتظر ہے، یہ سن کر صحابہ کرامؓ پریشان ہوگئے، تو حضور ﷺ نے فرمایا قولوا حسبنا اللہ و نعم الوکیل علی اللہ توکلنا خدا تعالیٰ کی طرف دھیان رکھو اور اس طرح کہو: ہمارے لئے اللہ ہی کافی ہے جو بہترین کارساز ہے اور ہم اسی پر بھروسہ کرتے ہیں، مشکلوں کو آسان کرنے والی وہی ذات ہے۔ (معالم العرفان: ۱۳/ ۶۷۴)

قیامت کے دن اللہ کے دربار میں جب تمام انسان پیش ہوں گے تو اس وقت ان کی دو قسمیں ہوں گی، ایک نیک بخت اور دوسرے بدبخت۔ نیک بخت لوگوں کے اعمال نامہ بھاری ہوں گے جو ان کی طرف اللہ کے فضل کو متوجہ کریں گے اور بدبخت لوگوں کے اعمال نامے ہلکے ہوں گے جس کی وجہ سے اللہ کا غضب ان کی طرف متوجہ ہوگا۔ اس وقت کفار دنیا میں لوٹنے کی تمنا کریں گے۔ ظاہر ہے کہ ان کی تمنا پوری نہیں ہوگی۔

ابن کثیر میں ہے کہ ایک دن نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو خطبہ دیا جس میں ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ جب اہل جنت کو جنت میں اور اہل جہنم کو جہنم میں داخل کردیں گے تو سوال کریں گے کہ اے اہل جنت تم زمین پر کتنے سال رہے؟ وہ عرض کریں گے: ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تمہیں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ملا، تو تم نے اس میں بہت اچھی تجارت کی کہ میری رحمت، میری رضا اور میری جنت کو خرید لیا، اب تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس میں رہو۔ پھر اہل دوزخ سے سوال کیا جائے گا کہ تم دنیا میں کتنے سال رہے؟ وہ بھی وہی جواب دیں گے جو اہل جنت نے دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تمہیں دنیا میں جو رہنے کا موقع ملا تو تم نے اس میں بہت بری تجارت کی، میری آگ اور ناراضگی کو خرید لیا،

اب تم دائمی طور پر اسی میں رہو۔ سورہ مومنون کی آخری آیات میں اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔

آخری آیت میں اللہ تعالی نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطے دعا مانگنے کا حکم فرمایا ہے کہ مجھ سے یہ دعا مانگو کہ اے میرے رب! مجھے معاف فرمادے اور مجھ پر رحم فرما اور آپ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

انسان مکلف ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ﴿۱۱۵﴾........ الی.......وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ﴿۱۱۸﴾

ہر چیز کی تخلیق اللہ تعالیٰ کے منشا اور حکمت کے مطابق عمل میں آئی ہے۔ اللہ نے انسان کو ایک پروگرام دے کر دنیا میں بھیجا ہے۔ اس سے اس کی کارکردگی کی باز پرس ضروری ہے اور اس کے لئے اس کا واپس لوٹایا جانا بھی ضروری ہے۔ الغرض! اللہ نے انسان کو مکلف یعنی قانون کا پابند بنایا ہے لہٰذا وہ سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا، پھر حساب کتاب کی منزل آئے گی اور جزاوسزا کا فیصلہ ہوگا۔

مَلکیت اور بہیمیت کی کشمکش:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ حجۃ اللہ البالغہ میں اپنی حکمت کے مطابق بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں ملکیت اور بہیمیت دو قوتیں رکھی ہیں۔ ملکیت سے فرشتوں جیسی پاکیزہ خصلتیں مثلاً اللہ کے سامنے عجز و نیاز مندی، عدل و انصاف، عبادت و ریاضت، خودغرضی اور کمینی باتوں سے اجتناب وغیرہ شامل ہیں، جب کہ بہیمیت میں کھانا پینا، اولاد پیدا کرنا، خواہشات کی تکمیل، جسم کا بناؤ سنگھار، آرام وراحت وغیرہ خصائل شامل ہیں۔ گویا انسان ملکیت اور بہیمیت کی کشمکش کا نام ہے، انسانی فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس میں صفت ملکیت غالب اور بہیمیت مغلوب ہو، اور پھر اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہو۔

شاہ صاحبؒ مثال کے ذریعے سمجھاتے ہیں کہ گائے بھینس، بھیڑ، بکری وغیرہ جب تک گھاس یا چارہ کھاتے ہیں ان کا بہیمی مزاج درست رہتا ہے۔ وہ کام بھی کرتے ہیں اور دودھ بھی دیتے ہیں، اگر یہی جانور گھاس کی بجائے گوشت کھانے لگیں تو یہ ان کی فطرت کے خلاف ہوگا اور ان کا مزاج بگڑ جائے گا۔ اسی طرح درندوں کی فطری خوراک گوشت ہے۔ جب تک گوشت کھاتے رہیں گے ان کا مزاج درست رہے گا۔ اگر شیر، چیتا، بھیڑیا وغیرہ گوشت کی بجائے گھاس چرنے لگیں تو ان کا مزاج بگڑ جائے گا۔ انسان کے مزاج کی مثال بھی ایسی ہی ہے جب تک وہ طہارت، سماحت، عبادت، ریاضت اور فکر کی پاکیزگی جیسے کام کرتا رہتا ہے تو اس کا ملکی مزاج بالکل ٹھیک رہتا ہے۔ اور جونہی وہ نجاست، تکبر، خودغرضی، ظلم وجور وغیرہ کو اختیار کرتا ہے تو اس کا مزاج خراب ہوجاتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ بھی غلط ہی نکلتا ہے۔

الغرض! اللہ نے انسان کو ملکیت اور بہیمیت کا مزاج بخشا ہے۔ اللہ نے اس میں مکلف بننے کی صلاحیت رکھ دی ہے۔

اور یہی اس کا کمال ہے۔ گویا اللہ نے انسان کو فطری طور پر مکلف بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک جیسی امانت کو ارض وسما اور پہاڑوں نے تو اٹھانے سے انکار کر دیا مگر **وحملها الانسان** (الاحزاب) انسان نے اس کو اٹھایا۔ جب انسان مکلف ٹھہرا تو پھر اس پر جزائے عمل بھی آئے گا، وہ پیدا ہوا ہے تو موت سے بھی ہمکنار ہوگا، اس کے ذمے قانون کی پابندی بھی لازم آئے گی۔ اگر وہ اس میں ناکام رہے گا تو خطیرۃ القدس جیسے پاک مقام کا ممبر نہیں بن سکے گا، گویا اس کی ترقی کا راز اس کے مکلف ہونے میں ہے، لہٰذا یہ خیال باطل ہے کہ اللہ نے اسے فضول پیدا کیا ہے اور یہ کہ وہ اس کی طرف نہیں لوٹائے جائیں گے۔ (معالم العرفان: ۱۳/ ۶۸۳)

اس سورت کی اخیر کی چار آیات یعنی آیات ۱۱۵ تا ۱۱۸ کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اس لئے ان آیات کا ورد رکھنا چاہئے۔

ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جہاد کے لئے ایک سریہ (چھوٹا لشکر) بھیجا اور یہ حکم فرمایا کہ صبح وشام یہ آیتیں پڑھا کریں یعنی **افحسبتم** سے آخر تک۔ صحابہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حسب الارشاد یہ آیتیں پڑھیں تو اللہ تعالی نے ہمیں فتح عطا فرمائی اور ہم مال غنیمت لے کر لوٹے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ان کا گزر ایک بیمار پر ہوا، آپ ﷺ نے اس کے کان میں یہی آخری آیات پڑھ کر دم کر دیں جس کی وجہ سے وہ جلد اچھا ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب اس کا علم ہوا تو دریافت کیا کہ تم نے ان کے کان میں کیا پڑھا تھا؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے عرض کیا کہ یہ آیتیں پڑھی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر کوئی آدمی جو یقین رکھنے والا ہو یہ آیتیں پہاڑ پر پڑھ دے تو وہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے۔ (معارف القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:...... تعلق باللہ کی درستی پر دنیا اور آخرت کی عزت کا دارومدار ہے۔

خلاصہ رکوع: ۱...... تعلق باللہ درست کرنے والوں کے اوصاف۔ (۲) اور اس تعلق کی ضرورت۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱ تا ۱۱۔ (۲) آیت ۱۲ تا ۱۶۔

خلاصہ رکوع: ۲...... تذکیر بایام اللہ جن لوگوں نے تعلق باللہ درست نہیں کیا، انہیں ذلیل ہونا پڑا۔ ماخذ: آیت: ۲۳ تا ۲۷۔

خلاصہ رکوع: ۳...... تذکیر بایام اللہ، جن لوگوں نے اپنا تعلق باللہ درست نہیں کیا انہیں رسوا کیا گیا۔ ماخذ: آیت: ۴۱۔

خلاصہ رکوع: ۴...... (۱) تمام انبیاء علیہم السلام کا نصب العین توحید۔ (۲) نتائج تعلیم یکساں اور مقصد تعلق باللہ کی اصلاح۔ ماخذ: (۱) آیت: ۵۱، ۵۲۔ (۲) آیت: ۵۳۔

خلاصہ رکوع: ۵...... تذکیر بآلاء اللہ سے تعلق باللہ کی طرف توجہ۔ ماخذ: آیت: ۷۸، ۷۹۔

خلاصہ رکوع:۶......(۱) تعلق باللہ توڑنے والوں کا یوم المجازاۃ میں احساس (۲) اور طریق فیصلہ۔ ماخذ: (۱) آیت:۱۰۶۔ (۲) آیت: ۱۰۳، ۱۰۲۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ النور

اس سورت کا مرکزی موضوع معاشرے میں بے حیائی اور فحاشی کو روکنے اور عفت وعصمت کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہدایات اور احکام دینا ہے۔ پچھلی سورت کے شروع میں مومنوں کی جو خصوصیات بیان فرمائی گئی تھیں، ان میں سے ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، یعنی باعفت زندگی گزارتے ہیں۔ اب اس سورت میں باعفت زندگی گزارنے کے ضروری تقاضے بیان فرمائے گئے ہیں۔ چنانچہ سورت کے شروع ہی میں زنا کی شرعی سزا بیان فرمائی گئی ہے، اور ساتھ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ جس طرح زنا انتہائی گھناؤنا جرم ہے، اسی طرح کسی بے گناہ پر شرعی ثبوت کے بغیر زنا کا الزام لگانا بھی نہ صرف سخت گناہ ہے، بلکہ اس پر بھی سخت قانونی سزا مقرر فرمائی گئی ہے۔

غالب گمان یہ ہے کہ یہ سورت ہجرت کے بعد چھٹے سال نازل ہوئی، اس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کے ایک قبیلے بنوالمصطلق کے بارے میں یہ اطلاع ملی تھی کہ وہ آپ پر حملہ کرنے کے لیے ایک لشکر جمع کر رہا ہے۔ آپ نے اس کے حملے سے پہلے ہی پیش قدمی کر کے اس کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ اسی سفر سے واپسی پر منافقین نے حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف بڑی کمینگی کے ساتھ ایک بے بنیاد تہمت لگائی، اور اسے مدینہ منورہ میں بڑے پیمانے پر شہرت دی جس سے کچھ مخلص مسلمان بھی متاثر ہو گئے۔ اس سورت کی آیات: ۱۱ تا ۲۰ حضرت عائشہ کی براءت کا اعلان کرنے کے لیے نازل ہوئیں۔ اور جن لوگوں نے تہمت لگانے کا گھناؤنا جرم کیا تھا ان کو اور معاشرے میں عریانی و فحاشی پھیلانے والوں کو سخت عذاب کی وعیدیں سنائی گئیں۔ نیز عفت وعصمت کی حفاظت کے پہلے قدم کے طور پر خواتین کو پردے کے احکام بھی اسی سورت میں دیے گئے ہیں، اور دوسروں کے گھر جانے کے لیے ضروری آداب و احکام کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔ (توضیح القرآن)

سورۂ نور یہ قرآن کریم کی ۲۴ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۱۰۲ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۹ رکوع، ۶۴ آیات، ۱۴۲۰ کلمات اور ۲۴۱۰ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے پانچویں رکوع کی پہلی آیت میں ''اللہ نور السموت والارض'' کا جملہ آیا ہے یعنی اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے تو چونکہ اس سورۃ میں اللہ کے نور کا ذکر ہے اس لئے اس سورۃ کا نام سورۃ النور ہے۔

ربط:

سابقہ سورۃ کے اخیر میں آیت ''افحسبتم انما خلقنکم عبثا'' سے معلوم ہوا تھا کہ انسان کی پیدائش کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس کو احکام کا مکلف کیا جائے اور آخرت میں ان احکام کی اطاعت یا مخالفت پر جزا و سزا ملے۔ اس سورۃ میں بعض احکام کی تفصیل بیان فرمائی گئی ہے، چنانچہ نصف سورۃ تک تو احکام عملیہ کا بیان ہے اور خاتمہ کے قریب بھی گھر میں دخول کے لئے اجازت اور عفت وغیرہ کے مسائل کا بیان ہے، گویا یہ سورۃ من وجہ تفصیل و تکمیل ہے سورۃ سابقہ کے شروع کی آیت: ''والذین ہم لفروجھم حافظون'' کی، اس طور پر اس سورۃ کو پہلی سورۃ کے اول و آخر سے ارتباط ہو گیا۔

فضیلت:

صحیح حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اپنی عورتوں کو سورۂ نور کی تعلیم دو۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کے مرکزی مطالب عورت کی عفت سے متعلق ہیں، اس سورۃ میں زیادہ تر گھریلو اور اجتماعی زندگی کے پاک صاف رکھنے کے طریقے بتائے گئے ہیں، ناجائز تعلقات جنسی کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ پاکیزہ گھرانوں کی مستورات کے متعلق وہم وگمان کی بنا پر برے خیالات پھیلانے والوں کی سزا کا قانون بیان فرمایا گیا ہے، بیوی پر ناپاکی کا الزام لگانے والے خاوند کے لئے لعان کا قانون بتلایا گیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی براءت اور پاکدامنی کی شہادت دی گئی ہے اور آپ کے متعلق بدگمانی پھیلانے والوں کو سرزنش کی گئی اور مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی بابت بدگمانیوں سے بچیں ورنہ سخت سزا کے سزاوار ہوں گے۔ مسلمان مردوں اور عورتوں کو پاکیزہ زندگی اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی اور اس کا طریقہ بتلایا گیا ہے، بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی کرنے کی مصلحت سمجھائی گئی۔ اسلامی معاشرہ کو بیہودہ باتوں سے پاک صاف رکھنے کے لئے معاشرتی اور تمدنی قوانین کی تعلیم دی گئی ہے، اس سورۃ میں مسلمانوں کو بشارت دی گئی کہ انہیں زمین کی حکومت وسلطنت دی جائے گی، تاکہ انہیں اسلام کی خوبیاں اور برکتیں تمام دنیا میں پھیلانے کا موقع مل جائے، پھر آپس میں مل جل کر رہنے کی تعلیم دی گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب و تعظیم کی تلقین کی گئی اور بتلایا گیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمہارا برتاؤ کیسا ہونا چاہئے۔

خلاصہ یہ کہ اس سورۃ میں بڑے بڑے اور اہم قوانین وہدایات کے علاوہ منافقین اور مؤمنین کی علامتیں بتائی ہیں، تاکہ معاشرہ میں پتہ چل جائے کہ مخلصین اہل ایمان کون ہیں اور منافقین کون ہیں؟ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اسے سورۂ نور ایک تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں ''نور'' کا لفظ آیا ہے ''اللہ نور السموت والارض'' دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سورت میں ایسے آداب وفضائل اور احکام وقواعد بیان کیے گئے ہیں جو اجتماعی زندگی کی راہ کو منور اور روشن

کردیتے ہیں۔

عفت وعصمت:

اس سورت میں زیادہ تر ایسے احکام مذکور ہیں، جو عفت وعصمت سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے یہ سورت عورتوں کو سکھانے کا خاص طور پر حکم دیا گیا ہے۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد:

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اپنے مردوں کو سورہ مائدہ اور اپنی عورتوں کو سورۃ النساء سکھاؤ۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی یہ سورت خواتین کو سکھانے کی تاکید فرمائی ہے۔

احکام وآداب

مفسرین کرام اور علماء عظام یہ بنیادی بات بیان کرتے ہیں کہ قانون خواہ کتنا اچھا ہو جب تک اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر کوئی ڈاکٹر مریض کے لئے نسخہ تجویز کرتا ہے تو اس اچھے سے اچھے نسخے کو بھی محض زبانی پڑھنے سے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا جب تک نسخے کے مطابق دوائی خرید کر استعمال نہ کی جائے۔ اسی طرح قانون کی محض تلاوت کا کچھ فائدہ نہیں جب تک اس پر عمل درآمد نہ کیا جائے۔

پہلا اور دوسرا حکم زنا کی سزا اور زانیوں کا حکم بیان کرنے کے بارے میں ہے۔

زنا کو دنیا کے ہر مذہب اور ہر مہذب معاشرہ میں جرم سمجھا گیا ہے، یہ آخرت کے اعتبار سے تو ایک شدید گناہ ہے ہی؛ لیکن دنیا میں بھی سماج کے لئے اور خود زنا کرنے والے مرد وعورت کے لئے نہایت نقصاندہ اور مضرت رساں ہے، زنا سے انسانیت شرمسار ہوتی ہے؛ کیوں کہ جو صنفی جذبات انسان کے اندر ہوتے ہیں، وہی دوسرے جانداروں میں ہوتے ہیں؛ لیکن ان کے یہاں ان کی شناخت محفوظ نہیں ہوتی، انسان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی ایک پہچان رکھتا ہے، وہ باپ دادا کی نسبت سے جانا جاتا ہے، اس نسبت پر اسے فخر ہوتا ہے اور اگر کسی انسان کے بارے میں یہ بات کہی جائے کہ اس کے باپ کا پتہ نہیں ہے تو اس کے لئے یہ حد درجہ عار کی بات ہوتی ہے؛ اس لئے زنا اور اس سے پیدا ہونے والی اولاد انسانی سماج کے لئے ایک بدنما داغ سے کم نہیں، دوسرے: انسان کو قدم قدم پر خاندان کی ضرورت پڑتی ہے، زنا کے ذریعہ جو بچے پیدا ہوتے ہیں، وہ خاندان سے محروم ہوتے ہیں، نہ ان کی خوشی اور غم میں کوئی مونس وغمخوار ہوتا ہے، نہ اس کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کا کوئی شخص ذمہ دار ہوتا ہے، ان کی حیثیت اپنے آپ اُگ جانے والے پودوں کی ہوتی ہے، جن کی نہ کوئی دیکھ ریکھ ہوتی ہے اور نہ کوئی قدر وقیمت، تیسرے: یہ عورت کے خاندان کے ساتھ زیادتی ہے، عورت چاہے

اپنی رضامندی سے برائی کی مرتکب ہو؛لیکن یہ اس کے پورے خاندان کے لئے رسوائی کا باعث ہوتا ہے، چوتھے: طبی اعتبار سے بھی یہ گناہ حد درجہ نقصان دہ ہے،مختلف امراض خبیثہ - آتشک، سوزاک اور ایڈس - زنا کے نتیجے میں انسان کو اپنا نشانہ بناتے ہیں اور تکلیف دہ اور رسوا کن موت تک پہنچا کر رہتے ہیں؛ اسی لئے شریعت نے زنا کی سب سے سخت سزا رکھی ہے، اگر شادی شدہ مرد و عورت زنا کا ارتکاب کریں تو ان کی سزا سنگسار کرنا ہے،جس کا ذکر متعدد حدیثوں میں آیا ہے، (نسائی) اور اس پر اُمت کا اجماع و اتفاق ہے، (ہدایہ اولین :۵۰۹) امام فخر الدین رازیؒ نے ابوبکر جصاص رازیؒ سے نقل کیا ہے کہ سنگسار کرنے سے متعلق روایت تواتر کے درجہ کو پہنچتی ہے، (مفاتیح الغیب :۱۱/ ۴۲۸) کنوارے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے زنا کی سزا سو کوڑے ہے،جس کا اس آیت میں ذکر ہے، اگر شرعی اُصولوں کے مطابق یہ جرم ثابت ہو جائے تو اس سزا پر فقہاء کا اتفاق ہے۔ (تفسیر قرطبی :۱۲/ ۱۶۸ بحوالہ آسان تفسیر)

امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں حضرت حذیفہؓ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا **یا معشر الناس اتقوا الزنا** اے انسانوں کے گروہ! زنا جیسی برائی سے بچتے رہو، کیونکہ اس میں چھ باتیں پائی جاتی ہیں جن میں سے تین کا تعلق دنیا سے اور تین کا تعلق آخرت سے ہے۔ دنیا سے متعلق تین باتیں یہ ہیں کہ زانی کے چہرے کی رونق ختم ہو جاتی ہے، بعض اوقات وہ محتاجی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کی عمر میں خیر و برکت ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس کی آخرت کی خرابی یہ ہے کہ اس پر اللہ کی ناراضگی نازل ہوتی ہے۔ اس کا حساب برا ہوگا اور وہ جہنم کا شکار بنے گا۔ (تفسیر کبیر)

پہلا حکم:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲

زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد دونوں کو سو کوڑے لگاؤ۔ یہ سزا اس زانی اور زانیہ کی ہے جو آزاد، عاقل، بالغ ہو مگر نکاح کئے ہوئے نہ ہو اور اگر اس جرم کا ارتکاب شادی شدہ مرد یا عورت نے کیا ہو تو ایسے مرد و عورت کی سزا رجم یعنی سنگسار کرنا ہے،یعنی اتنے پتھر مارے جائیں کہ وہ مر جائے اور یہ سزا متواتر احادیث میں بیان ہوئی ہے۔

زانیہ عورت اور زانی مرد کی سزا کا حکم بیان کرنے کے بعد اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا: ''اور اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے دین کے معاملے میں ان پر ترس کھانے کا کوئی جذبہ تم پر غالب نہ ہو۔'' اس سے معلوم ہوا کہ نماز، روزہ، حج، زکوۃ ہی دین نہیں بلکہ شرعی سزاؤں کا جاری کرنا بھی عین دین ہے۔ اسی طرح دین کو قائم کرنے کا مطلب صرف نماز، روزہ ہی قائم کرنا نہیں بلکہ اللہ تعالی کے جملہ قانون اور نظام شریعت کو قائم کرنا دین ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں اللہ کے قانون کو چھوڑ کر کوئی دوسرا قانون نافذ کیا جائے گا تو گویا اللہ کے دین کو رد کر دیا گیا۔ آگے یہ بھی بتلا دیا کہ یہ بھی نہ ہونا چاہئے کہ یہ سزا چپکے سے سب سے چھپا کر دی جائے، بلکہ دوسروں کی عبرت کے لئے فرمایا کہ ''اور یہ بھی چاہئے

کہ مومنوں کا ایک مجمع ان کی سزا کو کھلی آنکھوں دیکھے۔'' (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

زانیہ اور زانی میں تقدم و تاخر:

اس آیت کریمہ میں زانیہ کو زانی پر مقدم رکھا گیا ہے۔ حالانکہ جہاں چوری کی سزا کا ذکر ہے وہاں فرمایا **السارق والسارقة** (المائدۃ) یعنی چور مرد اور چور عورت۔ یہاں مرد کو عورت کے مقابلے میں مقدم لایا گیا ہے، امام محمد بن ابوبکر رازیؒ اس کی توجیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ مرد کی نسبت عورت کا مادہ شہوت زیادہ قوی ہوتا ہے، اس لئے اس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے، حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ میرے استاد شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کا قول ہے کہ اللہ نے اس معاملے میں عورت کو اس لئے مقدم رکھا ہے کہ عورتیں اکثر ناقصات العقل ہوتی ہیں اور بہکاوے میں جلدی آجاتی ہیں اور اکثر ان کی تحریض پر ہی اس جرم کا ارتکاب ہوتا ہے اس لئے عورت کو پہلے بیان کیا گیا ہے۔ آپ نے اس کی دوسری وجہ بیان کی ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں ضعیف اور قابل رحم ہوتی ہے مگر اس سزا کے معاملے میں اللہ نے نرمی اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے، اس لئے عورت کا ذکر پہلے کیا ہے۔ مطلب یہ کہ جب عورت صنف نازک ہونے کے باوجود کسی نرمی کی مستحق نہیں تو مرد کو سزا دیتے وقت تو بطریق اولیٰ نرمی اختیار نہیں کی جائے گی۔ آپ نے ایک تیسری وجہ بھی بیان فرمائی ہے۔ کہتے ہیں کہ جہاں تک زنا کی قباحت کا تعلق ہے وہ تو مرد و زن کے لئے یکساں ہے، لیکن حمل ٹھہر جانے کی صورت میں عورت کے لئے زیادہ شرم و عار کا باعث ہوگا۔ لہٰذا عورت کو مقدم رکھا گیا ہے۔ (معالم العرفان: ۱۳/ ۷۰۰)

ایک عمومی رویہ:

اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۫ وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۳﴾

''زانی مرد نکاح کرتا ہے تو زنا کار یا مشرک عورت سے ہی نکاح کرتا ہے اور زنا کار عورت سے نکاح کرتا ہے تو وہی مرد جو خود زانی ہو یا مشرک ہو اور یہ بات مومنوں کے لئے حرام کر دی گئی ہے۔'' یعنی بدکار مرد یا عورت کو نکاح کے لئے پسند کرنا مسلمان کے لئے حرام ہے۔ اس لئے مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے لئے شریک زندگی تلاش کرتے وقت اس کی نیکی اور پاک دامنی کا ضرور خیال رکھیں۔

تیسرا حکم حد قذف کا ہے:

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴﴾

یعنی اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، تو ان کو اسی کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو، اور وہ خود فاسق ہیں۔ (۴) (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

اللہ اللہ! اللہ کو مسلمان مرد و مسلمان عورت کی عزت کے تحفظ کا کس درجہ اہتمام ہے! گواہ ایک نہیں دو بھی نہیں۔ اکٹھے چار چار گواہ، وہ بھی چشم دید ہونے چاہیے۔ اگر اس تعداد میں ایک کی بھی کمی رہ جائے گی تو حد جاری نہ ہو سکے گی، اور جب چار چشم دید گواہ موجود نہیں اس لیے اجراء حد بھی نہ ہو سکے گا، تو بلا ضرورت ایسی بات زبان سے نکالنا ایک مسلمان کی خواہ مخواہ آبروریزی کرنا اور بلا وجہ ایک گندگی کو اچھالنا اور پھیلانا ہے جو شریعت اسلام اور خدائے اسلام کی نظر میں نہایت ناپسندیدہ ہے۔ یہ چاروں گواہ مرد ہونے چاہئیں۔ (ماجدی: ۴/ ۴۳۸)

چوتھا حکم لعان کا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ⑥

حکم لعان جو کہ میاں بیوی کے ساتھ خاص ہے، اگر شوہر بیوی پر زنا کی تہمت لگائے مگر اس کے پاس چار گواہ نہ ہوں تو وہ دونوں ایک دوسرے پر لعنت کرلیں گے اور پھر ان کے درمیان جدائی کر دی جائے گی۔

یوں تو کسی بھی مرد و عورت کو زنا کی حالت میں دیکھنا ایک پاک باز انسان کے لئے رنج و صدمہ کا باعث ہے، لیکن اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو اس حالت میں دیکھے تو یقیناً اس کے جذبات غیر معمولی طور پر مشتعل ہو جائیں گے؛ کیوں کہ یہ براہ راست اس کی غیرت کے لئے چیلنج ہے؛ چنانچہ قرآن میں جب یہ حکم نازل ہوا کہ اگر کسی عورت پر کوئی مرد تہمت لگائے اور وہ اپنے اس دعوی پر چار آنکھوں دیکھے گواہ نہ پیش کر سکے تو اس کو اسی کوڑے لگائے جائیں گے، تو بعض صحابہ کو حیرت ہوئی کہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو اس حال میں دیکھے تو کیا اس کے لئے بھی یہی حکم ہوگا؟

چنانچہ مذکورہ حکم اللہ پاک کی طرف سے نازل ہوا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے اور اس کے پاس چار آنکھوں دیکھے گواہ نہ ہوں اور بیوی کو جرم کا اقرار نہ ہو تو پہلے شوہر سے چار دفعہ قسم کھلائی جائے گی کہ اس نے اپنی بیوی کے بارے میں جو کہا ہے، وہ سچ ہے، اور پانچویں دفعہ کہلایا جائے گا: اگر اس نے یہ بات جھوٹ کہی ہے تو اس پر اللہ کی لعنت، پھر عورت سے چار دفعہ قسم کھلائی جائے گی کہ شوہر نے اس پر جو الزام لگایا ہے، وہ اس میں جھوٹا ہے، اور پانچویں دفعہ کہلایا جائے گا: اگر میرا شوہر اپنے دعوی میں سچا ہو تو مجھ پر اللہ کا غضب، ''لعان'' کے بعد دونوں ایک دوسرے پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو جائیں گے۔ (آسان تفسیر: ۱۵۹، ۱۶۰)

پانچویں حکم کے طور پر قصہ افک بیان کیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ .... الیٰ.......................اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۶﴾

اس آیت میں قصہ افک بیان کیا گیا ہے یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کا واقعہ جو آیت ۱۱ سے ۲۶ تک پھیلا

ہوا ہے۔اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ سن ٦ ہجری میں جب غزوہ بنوالمصطلق پیش آیا جس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھیں، واپسی کے سفر میں ایک جگہ پڑاؤ ڈالا گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک ہار گم ہو گیا اور وہ اس کی تلاش میں جنگل کی طرف نکل گئیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا علم نہ تھا، اس لئے آپ نے لشکر کو روانہ ہونے کا حکم دے دیا اور جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا واپس آئیں تو قافلہ جا چکا تھا۔اللہ تعالی نے انہیں ذہانت اور تحمل کا غیر معمولی مقام عطا فرمایا تھا۔وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر جانے کے بجائے اسی جگہ بیٹھ گئیں جہاں سے روانہ ہوئیں تھیں۔حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کو اس کام پر مقرر کیا گیا تھا کہ وہ قافلے کے پیچھے چلیں اور جو چیز قافلے والوں کی گر گئی ہو ان کو اٹھا کر لے آئیں۔وہ جب اس جگہ سے گزرے جہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیٹھی ہوئی تھیں تو انہیں اس سانحے کا علم ہوا اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو لے کر مدینہ منورہ پہنچے۔اس واقعے کو منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی نے ایک بتنگڑ بنا لیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تنہا صفوان بن معطل کے ساتھ سفر کیا ہے اور اس کی وجہ سے آپ پر وہ گھناؤنی تہمت لگائی جسے زبان سے نکالنا بھی ایک غیرت مند مسلمان کے لئے مشکل ہے۔عبداللہ بن ابی نے اس تہمت کو اتنی شہرت دی کہ تین سادہ لوح مسلمان بھی اس کے فریب میں آ گئے۔بالآخر سورہ نور کی یہ آیات نازل ہوئیں جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مکمل براءت ظاہر کرنے کے ساتھ ان لوگوں کو سخت وعیدیں سنائیں جو اس سازش کے کرتا دھرتا تھے۔اللہ تعالی نے دس آیات میں اس واقعہ کا ذکر فرمایا اور تاریخ انسانی میں ایسا پہلی بار ہوا کہ کسی شخصیت کی پاک دامنی کا اعلان بذریعہ وحی کیا گیا۔جس سے دشمن اپنے فریب میں ناکام ہوا، اسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خصوصیات میں سے شمار کیا جاتا ہے۔

عبرت:

آیت نمبر ۱۱ میں بیان ہے کہ اس واقعہ میں تمہارے لیے بھلائی ہے؛ کیونکہ اس نے لوگوں کو باور کرایا کہ جب بھی ایسے کوئی واقعہ کے متعلق سنو، اسے فوراً معاشرے میں پھیلا نہ دو بلکہ اپنے بھائیوں اور بہنوں کے بارے میں اچھا خیال رکھیں، جس کی آیت ۱۳ میں وضاحت کی کہ جس وقت تم لوگوں نے یہ بات سنی تھی تو کہہ دیتے کہ یہ کھلم کھلا جھوٹ ہے، اس میں کوئی صداقت نہیں ہے، یہ ایک صحابی ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ کے درمیان گفتگو کی تصدیق ہے، کیونکہ مذکورہ بالا لفظ ان کے کان میں پڑے تو ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے براہ راست کہا کہ صفوان مجھ سے بہتر اور مہذب ہے، تو ان کی بیوی نے کہا کہ عائشہ مجھ سے زیادہ پاکیزگی رکھتی ہیں، تو یہ الزام جھوٹا ہے، انسانوں کو کسی کی عزت وآبرو پر حملہ کرنے سے گریز کرنا چاہیے اور اسی طرح ایسی افواہیں پھیلانے سے گریز کیا جائے، جس کی وجہ سے بے شرمی کو فروغ ملتا ہے، اسی لیے ایک قانون بیان کیا کہ اگر کوئی کسی پر زنا کا الزام لگاتا ہے تو اسے چار آدمیوں کو بطور گواہ لانا ہوگا جنہوں نے خود یہ فعل دیکھا ہو، ورنہ جرمانے کے طور پر ۸۰ کوڑے کھانے پڑیں گے؛ تاکہ باہمی احترام برقرار رہے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خواطر قرآنیہ)

حضرت عائشہؓ کی نو خصوصیات:

مفسر قرآن امام بغوی، صاحب تفسیر مظہری، مفسر قرطبی اور بعض دیگر مفسرین نے یہ روایت بیان کی ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نو خصوصیات عطا فرمائی ہیں۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ نے میری تصویر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میرے نکاح سے پہلے دکھا دی تھی؛ چنانچہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان کیا ہے کہ عائشہؓ تیری تصویر مجھے جبرائیلؑ نے ریشم کے ٹکڑے پر خواب میں دکھائی، تو میں نے اس خواب کی یہی تعبیر نکالی کہ ایسا ہو کر رہے گا؛ چنانچہ ہجرت سے پہلے آپ کا نکاح حضرت صدیقہؓ سے ہوگیا جب کہ اس وقت صدیقہؓ کی عمر صرف چھ سات سال تھی، البتہ رخصتی تین سال بعد مدینہ منورہ جا کر ہوئی۔ یہ نکاح حضرت صدیق اکبرؓ نے خود کیا۔

ام المومنین نے فرمایا کہ میری دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام ازواج مطہرات میں سے صرف میں دوشیزہ ہوں، باقی سب پہلے سے ایک یا دو دفعہ شادی شدہ ہیں۔ فرمایا: میری تیسری خصوصیت یہ ہے کہ جب اللہ کے رسول کا اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو اس وقت آپ کا سر مبارک میری گود میں تھا۔ یہ بھی انتہائی قرب کی علامت ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ بیان کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر بھی میرے گھر میں بنی۔ اس گھر میں فرشتوں کا ہمیشہ ہجوم رہتا ہے، آپ کی زندگی میں بھی اور اس کے بعد بھی۔ پھر فرمایا کہ پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ بسا اوقات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایسی حالت میں وحی نازل ہوتی کہ میں آپ کے ساتھ ایک ہی لحاف میں ہوتی۔ یہ خصوصیت بھی کسی دوسری بیوی کو حاصل نہیں ہوئی۔ چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ اول اور آپ کے صدیق کی بیٹی ہوں۔ فرمایا: ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ میری براءت میں اللہ نے پورے دو رکوع کی سولہ آیات نازل فرمائیں۔ آٹھویں خصوصیت یہ ہے **خلقت طیبة** اللہ نے مجھے پاک پیدا کیا ہے اور پاک ہستی کے پاس ہی رکھا ہے۔ (معالم العرفان: ۱۳/ ۲۴۷)

چھٹا حکم گھر میں داخل ہونے کی اجازت اور آداب کے بارے میں ہے:

قانون انسداد بے حیائی کا یہاں سے دوسرا حصہ بیان فرمایا، مقصد یہ ہے کہ اسلامی معاشرے سے عریانی، فحاشی اور بے حیائی کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا جائے۔ ان جرائم کی ترغیب عام طور پر عورتوں کے بے پردگی سے ہوتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مذکور آیات میں کسی کے گھر میں داخلے کے وقت پردے کو ملحوظ رکھنے سے متعلق بعض قوانین بیان فرمائے ہیں۔ ان قوانین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مخلوق کے تخلیق شدہ قوانین سے دنیا کی عدالتیں عام طور پر لوگوں سے بھری رہتی ہیں، جب کہ اسلامی قوانین کا بنیادی مقصد معاشرے سے مخاصمت اور شر و فساد کی بیخ کنی ہوتا ہے۔ جب کوئی جھگڑا ہی پیدا نہیں ہوگا تو نہ کوئی عدالتوں میں جائے گا اور نہ وہاں ہجوم ہوگا۔

يَاۤيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ .... الیٰ................وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۲۹﴾

فرمایا گیا: کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہوا کرو۔ مستحب یہ ہے کہ اجازت سے قبل سلام کرلیا جائے، اور اگر اجازت نہ ملے تو واپس چلے جاؤ۔ (۲۷۔۲۹)

گھروں میں داخلے کے آداب:

◇ پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ہی گھر میں داخل ہوتا ہے جہاں اس کی منکوحہ بیوی موجود ہے، تو اس کے لئے داخلے سے قبل اجازت حاصل کرنا ضروری نہیں۔ البتہ پھر بھی مستحب بات یہ ہے کہ داخلے کے وقت خاوند کوئی ایسی حرکت کردے جس سے بیوی کو اطلاع ہو جائے کہ اس کا خاوند گھر میں داخل ہو رہا ہے۔

◇ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص ایسے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں اس کی بیوی کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ہوں۔ لہٰذا داخلے سے قبل اطلاع دینا ضروری ہے، خواہ گھر میں والدہ، بہن یا بیٹی ہی ہو۔

◇ تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص ایسے مقام میں داخل ہونا چاہتا ہو جہاں رہائش اور عدم رہائش دونوں کا امکان ہے، تو ایسے مقام پر بھی بلا اجازت داخل ہونے کی گنجائش نہیں ہے۔

◇ چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی ایسی جگہ میں داخل ہونا چاہتا ہے، جس میں کسی خاص فرد یا خاندان کی رہائش نہیں بلکہ وہ مفاد عامہ کی جگہ (Public places) ہے۔ ایسی جگہوں میں بلا اجازت داخل ہو سکتے ہیں۔

نظریں نیچی رکھیں:

مفاد عامہ کے ایسے مقامات جن میں کسی کی انفرادی رہائش نہ ہو وہاں بلا اجازت داخل ہو سکتے ہیں البتہ ان کے مخصوص حصوں میں بھی بلا اجازت داخل ہونا جائز نہیں۔ دراصل یہ پابندی برائی، زنا اور بدکاری کی روک تھام کے لئے لگائی گئی ہے کیونکہ برائی کی تحریک بلا تکلف میل جول کے ذریعے ہی پیدا ہوتی ہے۔

درج ذیل آیات میں اسی قانون کا تتمہ ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی کے گھر میں جاتا ہے یا راستہ چلتے کسی غیر محرم سے واسطہ پڑتا ہے تو نگاہوں کو نیچا رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، اگر کسی مومن مرد کے سامنے غیر محرم عورت آجائے یا مومن عورت کے سامنے غیر محرم مرد آجائے تو دونوں کو غض بصر کا حکم دیا گیا۔ عام محاورہ ہے **النظر بریدالزنا** یعنی نگاہ زنا کی ڈاک ہوتی ہے۔ پہلے کسی غیر محرم پر نگاہ پڑتی ہے پھر خیالات فاسد ہوتے ہیں اور پھر برائی کی ترغیب پیدا ہوتی ہے، اسی لئے نظر کو آنکھوں کا زنا قرار دیا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نگاہ کی حفاظت کا سختی سے حکم دیا ہے تاکہ برائی، بدکاری اور زنا کی نوبت ہی نہ آسکے۔ اور مسلمانوں کی سوسائٹی ایسی قباحتوں سے پاک رہے۔

بعض صحابہ کرامؓ مختلف راستوں، گھاٹیوں، پلوں یا دیگر اونچی جگہوں پر بیٹھا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا تو انہوں نے عرض کیا کہ ہم ایسے مقامات پر بلا مقصد نہیں بیٹھتے بلکہ بعض اوقات کسی سے ملاقات کرنی ہوتی ہے، کوئی مشورہ وغیرہ کرنا ہوتا ہے تو ہم ایسی جگہوں پر اکٹھے ہو جاتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ اگر آپ کا وہاں بیٹھنا ضروری

ہے تو پھر ایسے مقام کا حق بھی ادا کرو۔ صحابہؓ کے دریافت کرنے پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایسے مقامات پر بیٹھنے کا حق یہ ہے کہ کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ، اپنی نگاہوں کو نیچی رکھو، کوئی ضرورتمند ہو تو اس کی مدد کرو اور سلام کا جواب دو، مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر موقع پر اپنی نگاہوں کی حفاظت کا حکم دیا ہے۔ دوسرا مسئلہ شرمگاہوں کی حفاظت کا بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں دونوں کو اپنے اپنے ستر کی نگرانی کا حکم دیا ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ .... الیٰ......... وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾

ساتواں حکم ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو یہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی نظریں جھکا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔

عورتوں کو اپنے شوہروں، اپنے والد، سسر، حقیقی بیٹوں، شوہر کے بیٹوں، بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں، عورتوں، لونڈیوں، ان طفیلی مردوں جو عورتوں کی طرف توجہ نہ رکھتے ہوں، اسی طرح ان بچوں کے سامنے جو خواتین کی پردے کی باتوں سے واقف نہ ہوں، اپنی زینت ظاہر کرنے کی اجازت دی گئی ہے، ان کے علاوہ کسی کے سامنے اپنی زینت ظاہر کرنے کی اجازت نہیں۔(۳۱)

حقوق زوجیت:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ؕ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۲﴾

آٹھواں حکم یہ دیا گیا ہے کہ ایسے آزاد مرد اور عورتیں یا غلام جو حقوق زوجیت ادا کر سکتے ہوں ان کا نکاح کروا دو، یونہی لونڈیوں کے نکاح کی بھی ترغیب دی گئی ہے، اصل میں اسلام، زنا کو کسی طور بھی برداشت نہیں کرتا اور زنا کا اس وقت تک سدباب نہیں ہوسکتا جب تک کہ نکاح کو آسان نہ کیا جائے، اسلام نے نکاح کو آسان بھی کیا ہے اور اس کی ترغیب بھی دی ہے۔(۳۲)

لونڈی، غلام:

نواں حکم لونڈیوں اور غلاموں کے بارے میں ہے، اسلام کی روشنی دنیا میں پھیلنے سے پہلے جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانے کا رواج تھا، اور اس لاوارث اور بے سہارا طبقے پر بے پناہ ظلم کیا جاتا تھا۔

اسلام نے اس رواج میں انقلابی اصلاحات کیں، ان پر ظلم کا دروازہ قطعی طور پر بند کر دیا۔

◇ دوسرے انسانوں کی طرح ان کے لیے بھی حقوق مقرر کئے۔

◇ انہیں آزاد کرنا اللہ کی رضا کا سبب بتایا۔

◇ مختلف گناہوں کے کفارہ کے طور پر بھی انہیں آزاد کرنے کا حکم دیا۔

◇ ایک اہم ہدایت یہ کی کہ جو غلام یا لونڈی کچھ روپیہ پیسہ ادا کر کے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہوں، اس کے ساتھ یہ معاہدہ کرلیا کرو، اس معاہدے کو اصطلاح میں ''مکاتبت'' کہا جاتا ہے۔

حرام ذریعہ معاش:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ......... الیٰ........ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۹﴾

دسواں حکم اصل میں زمانہ جاہلیت کے ایک قطعی حرام ذریعہ معاش کی تردید کے لیے ہے، نزول قرآن سے قبل بعض ظلم پیشہ اور حریص لوگوں نے لونڈیاں رکھی ہوئی تھیں جنہیں اجرت کے بدلے زنا پر مجبور کرتے تھے۔

عبداللہ ابن ابی جیسا ''چودھری'' جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت مدینہ سے پہلے مدینہ کا ''بے تاج بادشاہ'' بنانے کی تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں اس نے بھی ایسی لونڈیاں پال رکھی تھی۔

ناجائز اور حرام:

یہاں ایسا کرنے سے منع کیا گیا، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر وہ بخوشی زنا پر آمادہ ہوں تو پھر جائز ہے، ناجائز اور حرام تو دونوں صورتوں میں ہے، بتانا یہ مقصود ہے کہ جب وہ لونڈی ہونے کے باوجود اس فعل سے نفرت کرتی ہیں تو تم جو کہ آزاد ہو تمہیں تو بطریق اولی اس سے نفرت کرنی چاہیے۔

عقیدہ، ایمان اور نور حق:

یہ دس احکام وآداب بیان کرنے کے بعد عقیدہ وایمان اور نور حق کا بیان ہے جس کے ذریعے اللہ تعالی مخلوق کو ہدایت دیتا ہے، بات کو واضح کرنے کے لیے یہاں تین مثالیں ذکر کی گئی ہیں اور یہ قرآن کا ایک خاص انداز ہے کہ وہ معانی کی وضاحت کے لیے حسی مثالیں پیش کرتا ہے۔

ان میں سے پہلی مثال اہل یقین وایمان کے لیے ہے، دوسری اور تیسری مثال اہل باطل کے لیے ہے۔

پہلی مثال:

پہلی مثال میں مومن کے دل میں جو نور ہوتا ہے اسے اس چراغ کے نور کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو صاف شفاف شیشے سے بنی ہوئی کسی قندیل میں ہو اور اس قندیل کو کسی طاقچے میں رکھ دیا جائے تا کہ اس کا نور معین جہت ہی میں رہے جہاں اس کی ضرورت ہے، اس چراغ میں جو تیل استعمال ہوا ہے وہ تیل زیتون کے مخصوص درخت سے حاصل شدہ ہے، اس تیل میں ایسی چمک ہے کہ بغیر آگ دکھائے ہی چمکتا دکھائی دیتا ہے۔(۳۵)

یہی حال مومن کے دل کا ہے کہ وہ حصول علم سے قبل ہی ہدایت پر عمل پیرا ہوتا ہے پھر جب علم آجائے تو نور علی نور کی

صورت ہو جاتی ہے۔

یحییٰ بن سلام کا قول:

یحییٰ بن سلام رحمہ اللہ کا قول ہے کہ مومن کا دل حق کو بیان کیے جانے سے پہلے ہی حق کو پہچان رہا ہوتا ہے کیونکہ اس کا دل پہلے ہی سے حق کے موافق ہوتا ہے۔

دوسری مثال:

اہل باطل کے لیے جو دو مثالیں بیان فرمائی ہیں، ان میں سے پہلی مثال ان کے اعمال کی ہے جنہیں وہ اچھا سمجھتے تھے، ارشاد ہوتا ہے:

کہ ان کے اعمال کی مثال سراب جیسی ہے، جیسے پیاسا شخص دور سے سراب کو پانی سمجھ بیٹھتا ہے، لیکن جب قریب آتا ہے تو وہاں پانی کا نام ونشان بھی نہیں ہوتا۔

یہی حال کافر کا ہے کہ وہ اپنے اعمال کو نافع سمجھتا ہے لیکن جب موت کے بعد اللہ کے سامنے پیش ہوگا تو وہاں کچھ بھی نہیں ہوگا، اس کے اعمال غبار بن کر اڑ چکے ہوں گے۔(۳۹)

دوسری مثال:

دوسری مثال میں ان کے عقائد کو سمندر کی تہ بہ تہ تاریکیوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جہاں انسان کو اور تو اور اپنا ہاتھ تک دکھائی نہیں دیتا، یہی حال کافر کا ہے جو کفر اور ضلالت کی تاریکیوں میں سرگرداں رہتا ہے۔(۴۰)

عالم بالا اور عالم اسفل:

اہل حق اور اہل باطل کی مثالیں بیان کرنے کے بعد عالم بالا اور عالم اسفل میں رات اور دن کے ہیر پھیر، بارش برسانے، ارض وسما کی تخلیق، پرندوں کی اڑان، اور مختلف قسم کے چوپایوں کو پیدا کرنے کی صورت میں اللہ کے وجود اور توحید کے جو دلائل ہیں ان کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔(۴۱۔۴۵)

تقابلی تذکرہ:

دلائل توحید کے بعد منافقین اور مومنین دو گروہوں کا تقابلی تذکرہ ہے۔

منافق:

منافق ایمان اور اطاعت کے جھوٹے دعوے کرتے ہیں لیکن جب عملی زندگی میں کوئی ایسا مرحلہ پیش آتا ہے جہاں اللہ اور اس کے رسول کی بات ماننے میں ان کا ذاتی نقصان ہوتا ہے تو وہ اعراض کرتے ہیں۔

مومن:

جب کہ مومن ہر حال میں اطاعت پر آمادہ رہتے ہیں، سچے مومنوں کے ساتھ اللہ نے وعدہ کیا کہ انہیں زمین پر

خلافت عطا کرے گا، اللہ نے اپنا یہ وعدہ پورا کر دکھایا۔

مسلمانوں کو جزیرۃ العرب پر غلبہ حاصل ہوا، مشرق و مغرب کے ممالک ان کے زیرنگیں آ گئے اور انہوں نے فارس اور روم جیسی مضبوط سلطنتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔(۴۷۔۵۵)

اجتماعی اور معاشرتی زندگی:

توحید کے دلائل، منافقوں اور مومنوں کے تقابل اور وعدہ خلافت کے بعد اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے تین مزید احکام بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) پہلا حکم؛ چھوٹے بچوں اور گھر میں رہنے والے غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں ہے کہ وہ نماز فجر سے پہلے دو پہر کے قیلولہ کے وقت اور نماز عشاء کے بعد اگر تمہارے خلوت والے کمرے میں داخل ہوں تو اجازت لے کر داخل ہوں۔

کیونکہ ان تین اوقات میں عام طور پر عمومی لباس اتار کر نیند کا لباس پہن لیا جاتا ہے۔

(۲) دوسرا حکم یہ ہے کہ بچے جب بالغ ہو جائیں تو دوسرے بالغ افراد کی طرح ان پر بھی لازم ہے کہ وہ جب بھی گھر میں آئیں تو اجازت لے کر یا کسی بھی طریقے سے اپنی آمد کی اطلاع دے کر آئیں۔

مثال کے طور پر کھانس کر یا پاؤں کی آہٹ پیدا کر کے۔

(۳) تیسرا حکم ان عورتوں کے بارے میں ہے جو بہت بوڑھی ہو جائیں اور نکاح کی عمر سے گزر جائیں کہ وہ اگر پردہ کے ظاہری کپڑے اتار دیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

گزشتہ دس احکام کے ساتھ ملا کر کل تیرہ احکام و آداب مذکور ہو چکے ہیں۔

چودھواں ادب یہ بتایا گیا ہے کہ جب تم گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کیا کرو۔

پندرھواں ادب یہ ہے کہ جب تم کسی اجتماعی مشورہ وغیرہ کے سلسلہ میں مجلس میں بیٹھے ہو تو اجازت کے بغیر مجلس سے نہ اٹھا کرو۔

سولھواں ادب یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسے نہ پکارا کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔

سورت کا اختتام:

اس بات پر ہوا ہے کہ یہ ساری کائنات اللہ کی قدرت اور علم کے ماتحت ہے، اللہ مخلوق کے حالات اور اعمال جانتا ہے، قیامت کے دن ہر کسی کو اس کے اعمال کے بارے میں بتا دیا جائے گا۔(خلاصۃ القرآن: م اش)

موضوع سورۃ:......قانون انسداد بداخلاقی۔

خلاصہ رکوع:۱...... بداخلاقی ثابت ہونے کے بعد سزا میں رعایت نہ کی جائے۔(۲) بداخلاق کو جماعت شرفاء سے خارج کر دیا جائے۔(۳) ثبوت جرم میں پوری تحقیق ہو، اگر تہمت لگانے کے بعد ثبوت نہ دے تو اسے سزا دی جائے۔

ماخذ: (۱) آیت: ۲۔ (۲) آیت: ۳۔ (۳) آیت: ۴۔

خلاصہ رکوع: ۲......واقعہ افک تمہید قانون حجاب۔ ماخذ: آیت: ۱۱۔

خلاصہ رکوع: ۳...... بقیہ واقعہ افک جو قانون حجاب کی تمہید ہے۔ ماخذ: آیت: ۲۲۔

خلاصہ رکوع: ۴......قانون حجاب۔ ماخذ: آیت: ۲۷۔

خلاصہ رکوع: ۵......تمثیل نور الہی۔ ماخذ: آیت: ۳۵۔

خلاصہ رکوع: ۶...... مدارج استفادہ نور الہی۔ ماخذ: آیت: ۴۵، ۴۲۔

خلاصہ رکوع: ۷......نور الہی سے کماحقہ مستفید ہونے والوں کے لئے خلافت ارضی کا وعدہ۔ ماخذ: آیت: ۵۵۔

خلاصہ رکوع: ۸......قانون الہی کا غلط استعمال نہ ہونے پائے چونکہ قانون حجاب تحفظ اخلاق کے لئے تھا، اس لئے جہاں بداخلاقی کا شائبہ نہیں ہے، وہاں حجاب ضروری نہیں ہے۔ جیسے: ''الذین لم یبلغوا الحلم منکم'' اور ''القواعد من النساء'' ماخذ: آیت: ۵۸، ۶۰۔

خلاصہ رکوع: ۹......داعی نور الہی کے ساتھ حسن صحبت کی تلقین۔ ماخذ: آیت: ۶۲، ۶۳۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الفرقان

اس سورہ کا آغاز اللہ تعالی کی حمد وثناء سے ہوتا ہے جس میں خاص طور اللہ تعالی کے اس انعام کا ذکر کیا گیا ہے کہ اس نے فرقان یعنی حق وباطل کے درمیان فرق کرنے والی یہ کتاب قرآن مجید نازل فرمائی ہے؛ اس لئے اس سورہ کا نام ''سورۂ فرقان'' ہے۔

اس سورہ میں بنیادی طور پر توحید ورسالت، قرآن مجید کی صداقت، آخرت میں جزاء وسزا اور شرک وبت پرستی کی تردید پر گفتگو کی گئی ہے، اس کے ضمن میں اللہ تعالی کی نشانیوں، کائنات میں پھیلی ہوئی دلیلوں اور گذشتہ اقوام جیسے قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، اصحاب رس اور قوم لوط وغیرہ کا ذکر آیا ہے اور اہل مکہ کو ان کے انجام سے سبق لینے کی دعوت دی گئی ہے۔

اس سورہ کے اخیر میں اللہ تعالی کے مخلص اور نیک بندوں کی صفات تواضع، بردباری، نماز تہجد کا اہتمام، اللہ کا خوف، خرچ میں اعتدال، شرک، قتل اور زنا جیسے گناہوں سے اجتناب، جھوٹ اور جھوٹی گواہی سے پرہیز، نصیحتوں کی باتیں قبول کرنے، اللہ کے سامنے جھکنے اور اللہ سے مانگنے کا ذکر فرمایا گیا ہے، غرض کہ یہ ایسی جامع آیتیں ہیں، جو زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ (آسان تفسیر)

یہ قرآن کریم کی ۲۵ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۴۲ نمبر پر ہے، جس میں ۶ رکوع، ۷۷ آیات، ۹۰۶ کلمات اور ۳۹۱۹ حروف ہیں، یہ مکی سورۃ ہے، یعنی مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی پہلی آیت ''تبارک الذي نزل الفرقان'' میں لفظ فرقان آیا ہے جو قرآن مجید کا ایک نام ہے، اس لئے اس سورۃ کا نام ''الفرقان'' مقرر کیا گیا۔

فائدہ:

اللہ تبارک وتعالی نے اپنی کتاب کے ۵۵ نام رکھے ہیں جن میں سے ایک نام ''فرقان'' آیا ہے، فرقان کے لفظی معنی ہیں ہر وہ چیز جس سے حق و باطل کے درمیان فرق کیا جا سکے، چونکہ قرآن کریم بھی حق و باطل اور خیر وشر، ہدایت و ضلالت، حرام وحلال، عدل وظلم، علم وجہل، نور وظلمت، مفید ومضر، مفسد و مصلح، صدق و کذب، راستی وکجی، صواب وخطا میں فرق کرنے والا ہے، اس مناسبت سے قرآن کا ایک نام ''الفرقان'' بھی ہے۔

ربط:

سورۂ نور کے آخر میں حقوق رسول کا ذکر تھا، اس سورۃ کے شروع میں بھی رسالت کا اثبات ہے اور باقی مضامین بھی دونوں سورتوں کے مشترک ہیں، یا یہ کہ سورہ نور کے آخر میں یہ جملہ تھا ''قد یعلم ما انتم علیه'' کہ اللہ کو معلوم ہے جس حال میں تم ہو، جس دن دنیا سے لوٹ کر تم اس کے پاس آؤ گے وہ تمہیں بتلائے گا کہ تم کیا کرتے تھے، اس کلام میں عرب کے ان اعمال فاسدہ کی طرف تنبیہ تھی جن میں وہ شب وروز غرق تھے اور ظلمات میں مبتلا تھے، ان کاموں میں سے ہر ایک سے بدتر بت پرستی تھی۔ دوسرے اس جملہ میں نیک وبد کی جزا وسزا پانے کا اشارہ تھا مگر یہ دو باتیں مشرکین عرب کے بالکل خلاف تھیں، پھر ان باتوں کو رد کرنے والی چیز نبوت تھی کہ ایک شخص دعوی کر کے یہ کہے کہ میں خدا کی طرف سے تمہیں ان باتوں سے منع کرنے کے لئے آیا ہوں اور یہ بھی ان کے نزدیک حیرت انگیز بات تھی، اس لئے ان تینوں مسائل کا جو اصول مذہب میں اس سورۃ کے شروع میں ثابت کرنا ضروری ہوا سب سے اول مسئلہ نبوت شروع کیا، اس لئے کہ اس پر زیادہ توحید ومعاد کے مسئلہ کی بنیاد ہے۔

خلاصہ سورۃ:

دوسری مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ میں بھی عقائد یعنی اثبات توحید، اثبات رسالت، حشر ونشر قیامت وآخرت، جزا وسزا، شرک کی برائی، مشرکین کی مذمت کے مضامین ہیں، اور مضمون کی مناسبت سے بعض گزشتہ پیغمبروں اور ان کی قوم کے واقعات بیان کئے گئے ہیں اور توجہ دلائی گئی ہے کہ جن قوموں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا وہ دنیا میں ناکام اور آخرت میں عذاب کے مستحق ہوئے، قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی پر کفار ومشرکین مکہ کے اعتراضات وشبہات میں سے ایک ایک کو نقل کر کے ان کے جواب دیئے گئے ہیں، ساتھ ہی دعوت حق سے اعراض کے برے نتائج بھی صاف صاف بتلائے گئے ہیں۔ پھر دنیا میں اللہ کی معرفت کی نشانیاں بتلائی گئیں جن سے توحید کی تعلیم دی گئی، اخیر

میں اہل ایمان کے بلند اخلاق وکردار اور ان کے اعمال کا ذکر فرمایا تا کہ ان کو دیکھ کر مشرکین اپنے برے اعمال سے تائب ہو جائیں اور اپنے اعمال کا مؤمنین کے اعمال سے موازنہ کریں تا کہ ہدایت وضلالت اور سعادت وشقاوت کا فرق ان کی نظروں اور نگاہوں کے سامنے آجائے۔ واللہ اعلم (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورۂ مومنون میں مؤمنین کی اخلاقی خوبیوں کا جو نقشہ کھینچا تھا، اسی طرح اس میں بھی اخلاقی محاسن کی ایک واضح تصویر دکھادی ہے، اور لوگوں کو بتادیا کہ وہ اپنے آپ کو اس تصویر پر منطبق کر کے دیکھ لیں، اگر وہ ہو بہو قرآن کی کھینچی ہوئی اس تصویر کے مطابق ہیں تو اللہ کے نزدیک کامیاب ترین انسان ہیں۔

ایک طرف انسانی سیرت وکردار کا وہ نمونہ ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تربیت یافتہ افراد پیش کر رہے ہیں، اور دوسری طرف وہ نمونۂ اخلاق ہے جو عرب کے ایک عام آدمی میں نمایاں ہے، فیصلہ اہل نظر کے ہاتھ میں ہے کس کو اپنا کر فوز وفلاح سے ہم کنار ہوتے ہیں، اور ابدی سعادتوں کے حق دار بنتے ہیں اور کس پر قائم رہ کر شقاوت اور بدبختی کے گڑھوں میں پھنسے رہنا گوارا کرتے ہیں۔ (قرآن ایک نظر میں)

مضامین:

قرآن اور ذات رسالت مآب پر منکرین ومخالفین کے اعتراضات وشبہات میں سے ایک ایک کا جچا تلا جواب دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی دعوت حق سے اعراض کے برے نتائج بھی صاف صاف بتائے گئے ہیں۔ آخر میں اہل ایمان کے بلند اخلاق وکردار کا نقشہ سامنے لاکر عوام الناس کے سامنے رکھ دیا گیا ہے، تا کہ اگر ان میں عقل ہے تو اس کسوٹی پر کس کر دیکھ لیں کہ کون کھوٹا ہے اور کون کھرا؟ ایک طرف سیرت وکردار کے لوگ ہیں جو رسول کی تعلیم سے اب تک تیار ہوئے ہیں، اور دوسری طرف وہ نمونہ اخلاق ہے جو عام اہل عرب میں پایا جاتا ہے اور جسے برقرار رکھنے کے لئے جاہلیت کے علمبردار ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ اب فیصلہ تمہارے اختیار میں ہے کہ ان دو نمونوں میں سے کسے پسند کرتے ہو؟

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ۝۱

اس رکوع میں قرآن کے نزول کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ لوگوں کو برے اعمال کے برے نتیجوں سے یہ قرآن آگاہ کرتا ہے، پھر شرک کی مذمت اور اس کی تردید کی گئی ہے۔ پھر قرآن کے بارے میں کفار جو کہا کرتے تھے اسے نقل کر کے تردید کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے، اس کا نازل کیا ہوا ہے۔ پھر منکرین رسالت کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ ان کے نزدیک رسول کو عام آدمیوں کی طرح نہیں ہونا چاہئے جو کھائے پئے اور بازاروں میں چلے۔ (منکرین کا یہ خیال اور اس کی تردید پہلے بھی چند سورتوں میں گذر چکی ہے)

مشرکین کے اعتراضات:

جس کے بارے میں مشرکین مختلف قسم کے اعتراضات اٹھاتے اور اس کی آیات کو جھٹلاتے تھے:

(۱) ایک گروہ گزشتہ قوموں کے قصے اور کہانیاں قرار دیتا تھا۔

(۲) دوسرا گروہ اسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا افتراء اور ایسی تخلیق کہتا تھا جس میں اہل کتاب نے آپ کے ساتھ تعاون کیا تھا۔

(۳) تیسرے گروہ کے خیال میں یہ واضح جادو تھا۔(۱۔۶)

صاحب قرآن کا تذکرہ:

قرآن کے بعد صاحب قرآن یعنی حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ ہے، ضدی اور معاند لوگ آپ کی تکذیب کرتے تھے۔

◇ ان کا خیال تھا کہ رسول، بشر نہیں بلکہ فرشتہ ہوتا ہے۔

◇ اور اگر بالفرض انسانوں میں سے کسی کو نبوت و رسالت ملے بھی تو وہ دنیاوی اعتبار سے خوشحال اور سر برآوردہ لوگوں کو ملتی ہے، کسی غریب اور یتیم کو ہرگز نہیں مل سکتی۔(۷۔۹)

باطل دعاوی کی تردید:

اللہ تعالی نے ان کی خام خیالیوں اور باطل دعوؤں کی تردید واضح دلائل سے کی ہے۔

معاندین کی گذشتہ اقوال کی تردید:

تَبٰرَكَ الَّذِیْۤ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَیْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَ یَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ⑩

اس رکوع میں پہلے بتایا گیا ہے کہ منکرین رسول جو باتیں کہتے ہیں (جس کا تذکرہ گزشتہ رکوع میں کیا جا چکا ہے وہ دراصل اس لئے کہ وہ قیامت کے منکر ہیں۔ پھر قیامت سے متعلق اس کی چند ہولنا کیوں کو بیان کیا ہے۔اس کے بعد سمجھایا ہے کہ دنیاوی آرائشوں اور مال وثروت سے بہتر وہ جنت اور اس کی ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہیں جو تقوی پر استوار عمل کے صلہ میں ملے گی۔

مشرکین کے معبودوں کا مشرکین سے اعلان براءت:

دوسرا مضمون اس رکوع میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بروز قیامت اللہ تعالی ان مشرکوں کو اوران کے معبودوں کو جمع کرے گا اوران کے معبودوں سے سوال ہوگا کہ کیا تم نے ان لوگوں کو گمراہ کیا، یا پھر وہ لوگ خود ہی گمراہ تھے؟ تو اس وقت ان کے معبودان سے براءت کا اعلان کریں گے اوران کی تکذیب کریں گے۔(آیت نمبر:۱۷۔۱۹) اور آخر میں ان کے چوتھے اشکال کا جواب دیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل جتنے انبیاء بھی مبعوث ہوئے، وہ سب کے سب بھی بشر ہی تھے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرشتہ ہونے کا مطالبہ کیونکر؟ (آیت نمبر ۲۰) (خلاصہ مضامین قرآنی، خلاصۃ القرآن: م اش)

موضوع سورۃ:......سورۃ نور دعوت الی النور تھی، اتباع نور الہی میں جو موانع ہیں ان کا رفع سورۃ فرقان میں ہے۔

مخالفین نور کوتوحید قرآن حکیم اور رسالت میں شک ہے، ان مسائل کے متعلق حجابات اٹھا دیئے جائیں گے، اس کے بعد آدمی دو قسم کے ہو جائیں گے۔

خلاصہ رکوع:١......اجمال مسائل ثلاثہ (١) توحید۔ (٢) قرآن حکیم ۔ (٣) رسالت - ماخذ: (١) آیت: ٣، ٢۔ (٢) آیت: ٤ تا ٦۔ (٣) آیت: ٧ تا ٩۔

خلاصہ رکوع:٢......مسئلہ رسالت۔ ماخذ: آیت: ٢٠۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

اٹھارہویں پارے کے چند اہم فوائد

(١) زکوۃ ادا کرنا، امانت کی حفاظت، عہد کو پورا کرنا اور نماز کی پابندی ہر مومن پر لازم ہے۔

(٢) قیامت کے دن اعمال کا وزن ہونا یہ حق ہے اور اس کا انکار کفر ہے۔

(٣) کسی مسلمان کا مذاق اڑانا حرام ہے۔

(٤) صبر کا درجہ ایمان میں ایسا ہے جیسے سر کا درجہ جسم میں۔

(٥) سزا ہمیشہ جرم کے بڑے یا چھوٹے اور قلیل یا کثیر کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

(٦) باطل، برائی، فحش کام اور منکرات کو شیطان خوش نما بنا کر پیش کرتا ہے، اس میں اس کی اتباع حرام ہے۔

(٧) اگر کسی نے قسم کھائی کہ میں یہ کام نہیں کروں گا یا یہ کام کروں گا مگر بعد میں اس کے علاوہ میں خیر دیکھتا ہے تو اس کو چاہئے کہ قسم کا کفارہ دے اور خیر کا کام کرے۔

(٨) اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے اور وہ توبہ کرے اور اپنی اصلاح کرے تو اس سے معافی اور درگزر سے کام لینا چاہئے۔

(٩) کسی کے گھر میں داخلے کے وقت لازما اجازت طلب کرنا چاہئے۔

(١٠) اجتماعی کام میں امام المسلمین سے اجازت طلب کرنا لازم ہے اور امام المسلمین کو اختیار ہے کہ وہ عوام کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے جس کو چاہے اجازت دے اور جس کو چاہے نہ دے۔

***

پارہ:۱۹

لایعنی مطالبات:

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾

اٹھارویں پارے کے آخر میں حضور اکرم ﷺ پر کفار کے اعتراضات کا تذکرہ تھا کہ وہ لوگ کہا کرتے تھے کہ رسول بشر کیسے ہوسکتا ہے؟ اسے تو فرشتہ ہونا چاہئے اور اگر بالفرض انسانوں میں سے بھی کسی کو نبوت و رسالت ملے تو ایسے آدمی کو ملنا چاہئے جو کسی قوم کا سردار ہو اور دنیاوی اعتبار سے خوشحال ہو، کسی غریب اور یتیم کو کیسے مل سکتی ہے؟ اللہ تعالی نے ان کے باطل اعتراضات کے جوابات مرحمت فرمائے تھے۔ انیسویں پارے کے آغاز میں بھی ان مشرکین و مکذبین کے اعتراضات اور لایعنی مطالبات کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالی نے ان کا اعتراض نقل فرمایا ہے: ''جن لوگوں کو یہ توقع ہی نہیں ہے کہ وہ (کسی وقت) ہم سے آملیں گے وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے؟ یا پھر ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ہم خود اپنے پروردگار کو دیکھ لیں؟ (آیت ۲۱)

ان مطالبات کا جواب:

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾

اس کے جواب میں فرمایا گیا: فرشتوں کو یہ اس وقت دیکھ پائیں گے جب وہ ان کی روحیں قبض کرنے کے لیے آئیں گے اور جب یہ فرشتوں کو دیکھ لیں گے تو ان کے لیے کوئی خوشخبری نہیں ہوگی۔

قیامت کے دن ایمان نہ ہونے کا نقصان:

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾

ماجرا قیامت کا بیان ہو رہا ہے، کافروں کو اپنے جن جن اعمال پر غرہ ہوگا کہ ہم نے دنیا میں فلاں فلاں اعمال خیر بھی تو کیے ہیں، چونکہ وہ ایمان سے خالی ہوں گے، قیامت کے دن انہیں غبار پریشان کی طرح بالکل بے مصرف کر کے دکھا دیا جائے گا، اسی حقیقت کی تعلیم ایک بار پھر ہوگئی کہ جس طرح کوئی مکان بغیر بنیاد کے نہیں ہوسکتا اسی طرح کوئی حسن عمل بغیر ایمان یا اعتقاد صحیح کے ممکن نہیں۔ (ماجدی: ۵۰۱/۴)

ندامت کی وجہ سے:

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿۲۷﴾

چونکہ قبولیت اعمال کی بنیادی شرط یعنی ایمان سے یہ خالی ہیں اس لیے قیامت کے دن ان کے اعمال بھی کسی کام نہیں آئیں گے اور وہ خاک بن کر اڑ جائیں گے، وہ دن ان کے لیے بڑا سخت ثابت ہوگا، یہ ندامت کی وجہ سے اپنے ہاتھوں کو کاٹیں گے اور کہیں گے :

"کہ اے کاش! ہم نے پیغمبر کا راستہ اختیار کیا ہوتا۔" (۲۷)

اللہ کے رسول کی اللہ کے حضور شکایت :

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾

اس دن اللہ کا رسول اللہ کے حضور شکایت کرے گا کہ اے میرے رب! میری قوم نے قرآن چھوڑ دیا تھا۔ (۳۰) مفسرین نے لکھا ہے کہ اگرچہ سیاق وسباق کی روشنی میں یہاں قوم سے مراد کافر لوگ ہیں لیکن یہ مسلمانوں کے لئے بھی ڈرنے کا مقام ہے، اگر مسلمان ہونے کے باوجود قرآن کریم کو پس پشت ڈال دیا جائے تو کہیں وہ بھی اس سنگین جملے کا مصداق نہ بن جائیں اور نبی کریم ﷺ روز قیامت شفاعت کے بجائے شکایت پیش نہ کریں۔

قرآن چھوڑنے کی صورتیں :

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن کو چھوڑنے کی کئی صورتیں ہیں:

◇ پہلی یہ کہ قرآن کو سنے، نہ اس پر ایمان لائے۔

◇ دوسری صورت یہ کہ پڑھتا بھی ہو اور ایمان بھی رکھتا ہو لیکن اس پر عمل نہ کرتا ہو۔

◇ تیسری یہ کہ زندگی کے معاملات اور تنازعات میں اسے حکم نہ بنائے۔

◇ چوتھی یہ کہ اس کے معانی میں غور وتدبر نہ کرے۔

◇ پانچویں یہ کہ قلبی امراض میں اس سے شفا حاصل نہ کرے۔

میرے محترم قارئین!

اگلی سطریں پڑھنے سے پہلے کچھ دیر کے لیے رک جایئے اور چند لمحوں کے لیے اپنے بارے میں اور پھر پوری امت کے بارے میں بے لاگ فیصلہ کیجئے کہ آج ہم کس کس انداز میں قرآن کو چھوڑ چکے ہیں؟ اور یہ بھی سوچیے کہ جب ہم مہلک روحانی اور اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہونے کے باوجود نہ پرہیز کرتے ہیں اور نہ وہ آسمانی دوا استعمال کرتے ہیں جس میں یقینی شفا ہے تو اس کا نتیجہ مزید بیماریوں میں مبتلا ہونے اور ہلاکت کے سوا کوئی نکل سکتا ہے؟ یقیناً نہیں اور ہرگز نہیں۔

(خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن: م اش)

قرآن یکبارگی کیوں نہیں نازل ہو جاتا:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ .... الی .... وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾

مشرکین یہ اعتراض بھی اٹھاتے تھے کہ جیسے تورات اور انجیل یکبارگی نازل ہوگئیں یونہی قرآن بھی یکبار کیوں نہیں نازل ہوا۔(۳۲)

تدریجاً نازل ہونے میں کئی حکمتیں:

(۱) جب کبھی کوئی جدید وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بصیرت اور قوت قلب میں اور زیادتی ہوجاتی، باران رحمت کا آسمان سے تھوڑا تھوڑا نازل ہونا کھیتی کی درستگی اور پختگی کا سامان ہے، یہی وجہ ہے کہ جب کوئی جدید آیت نازل ہوتی تو صحابہؓ کے ایمان میں اور زیادتی ہوجاتی۔

(۲) نیز وقتاً فوقتاً آیات کا حسب موقعہ اور حسب واقعہ اور حسب ضرورت نازل ہونا مزید بصیرت کا سبب ہے جس سے یقین اور معرفت میں اور اضافہ ہوجاتا ہے اور مراد کے سمجھنے میں سہولت ہوجاتی ہے۔

(۳) نیز وقتا فوقتا جبریل امین (علیہ السلام) کا آنا فقط آپ کے قلب مبارک کی تسلی اور تسکین کا باعث نہ تھا بلکہ سب کے لئے موجب صد خیر و برکت تھا۔

(۴) کفار دشمنی اور عداوت پر تلے ہوئے تھے، جب کوئی نیا عناد دیکھتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پریشان ہوجاتے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی کے لئے کوئی آیت نازل ہوجاتی جو آپ کی تقویت قلب کا باعث ہوتی۔

(۵) علاوہ ازیں قرآن کریم میں ایسے احکام بھی ہیں جن میں ناسخ اور منسوخ بھی ہیں جس کا تعلق مختلف اوقات سے ہے اور ظاہر ہے کہ ناسخ و منسوخ دونوں کا بیک وقت نازل ہونا اور آن واحد میں دونوں کا جمع ہونا غیر معقول ہے۔

(۶) نیز قرآن کریم کی بہت سی آیتیں مشرکین کے اعتراضات کے جوابات میں نازل ہوئیں اور ظاہر ہے کہ جواب سوال اور اعتراض کے بعد ہوتا ہے اور اعتراض کے بعد شافی جواب کامل جانا خاص بصیرت اور معرفت کا سبب ہوتا ہے۔ نیز بہت سی آیتیں نئے واقعات کے فیصلہ کے متعلق نازل ہوئیں اور ظاہر ہے کہ فیصلہ تو واقعہ کے وقوع کے بعد ہوگا۔

(۷) نیز قرآن تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار سے یہ کہتے کہ اگر تم کو اس کے کلام الٰہی ہونے میں شبہ ہے تو ایک آیت اس کے مثل بنالاؤ، جب کوئی آیت نازل ہوتی تو ہر بار قرآن کا اعجاز اوران کا عجز ظاہر ہوتا، تو ثابت ہوگیا کہ جب بلغاء عرب ایک آیت کے مثل لانے سے عاجز ہیں تو پورے قرآن کے مثل لانے سے بدرجہ اولیٰ عاجز ہیں۔ مختصر یہ کہ مشرکین کا یہ اعتراض محض بے حاصل ہے، قرآن چاہے دفعۃ نازل ہو یا تھوڑا تھوڑا وہ ہر حال میں معجز ہے کسی طرح نازل ہو۔ اس کے اعجاز میں فرق نہیں آتا۔ قرآن کریم کا نزول ایک دفعہ ہو یا متفرق طور پر وہ بہر صورت معجز ہے، یہ تمام کلام امام رازیؒ کے کلام کی تشریح ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۵/۵۰۰)

ہر دور میں نافرمانوں کی ایک ہی روش:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ۝۳۵

کفار کے اعتراضات کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت نوح، حضرت ہود اور حضرت صالح علیہم السلام کی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں نافرمانوں کی ایک ہی روش رہی ہے، لہٰذا اس بات سے گھبرانا نہیں چاہیے کہ اہل مکہ اللہ کے آخری نبی کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ حضور خاتم النبیین علیہ السلام کے کچھ حالات حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملتے جلتے ہیں۔ ان کا واسطہ بھی ایک جابر شخص فرعون کے ساتھ تھا مگر اللہ کے اس عظیم نبی نے خدا کا پیغام نہایت نامساعد حالات میں لوگوں تک پہنچایا، ان کی ایذاء رسانیوں پر صبر کیا اور بالآخر اللہ نے فرعون اور اس کے حواریوں کو تباہ و برباد کیا۔ پھر بعض دوسری اقوام کی تباہی کا حال بھی ذکر کیا گیا ہے اور اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو تسلی دی گئی ہے کہ وہ صبر کا دامن نہ چھوڑیں۔ بالآخر کامیابی وکامرانی انہیں کے حصے میں آئے گی۔ اور وہ دنیا اور آخرت دونوں مقامات پر سرخرو ہوں گے۔

تیز بارش کی مثال:

جاننے والے جانتے ہیں کہ یکا یک برسنے والی تیز بارش کھیتی کو تباہ کر دیتی ہے؛ لیکن مناسب وقت تک بتدریج برس کر زمین کے سوتوں میں جذب ہونے والی بارش سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ (۴۵-۳۹) (خلاصۃ القرآن: م اش)

چوپایوں سے تشبیہ:

أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ ۖ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٤٤﴾

کیسی ہی نصیحتیں سنایئے، یہ تو چوپائے جانور ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر، انہیں سننے یا سمجھنے سے کیا واسطہ؟ چوپائے تو بہرحال اپنے پرورش کرنے والے مالک کے سامنے گردن جھکا دیتے ہیں۔ اپنے محسن کو پہچانتے ہیں، نافع ومضر کی کچھ شناخت رکھتے ہیں۔ کھلا چھوڑ دو تو اپنی چراگاہ اور پانی پینے کی جگہ پہنچ جاتے ہیں، لیکن ان بدبختوں کا حال یہ ہے کہ نہ اپنے خالق ورازق کا حق پہچانا، نہ اس کے احسانات کو سمجھا۔ نہ بھلے برے کی تمیز کی، نہ دوست دشمن میں فرق کیا، نہ غذائے روحانی اور چشمہ ہدایت کی طرف قدم اٹھایا؛ بلکہ اس سے کوسوں دور بھاگے اور جو قوتیں خدا تعالیٰ نے عطا کی تھیں ان کو معطل کیے رکھا بلکہ بے موقع صرف کیا۔ اگر ذرا بھی عقل وفہم سے کام لیتے تو اس کارخانہ قدرت میں بے شمار نشانیاں موجود تھیں جو نہایت واضح طور پر اللہ تعالیٰ کی توحید وتنزیہ اور اصول دین کی صداقت وحقانیت کی طرف رہبری کر رہی ہیں جن میں سے بعض نشانیوں کا ذکر آئندہ آیات میں کیا گیا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

علاوہ ازیں اللہ کی قدرت ووحدانیت کے دلائل بیان کیے گئے ہیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا ﴿٤٥﴾

آیت نمبر ۴۵ سے اللہ تعالی نے اپنی قدرت کی کئی نشانیوں کا ذکر فرمایا ہے۔ جن پر انسان غور کرے تو ان میں سے ہر چیز اللہ کی توحید پر واضح دلیل ہے۔ مثلاً ”کیا تم نے اپنے پروردگار (کی قدرت) کو نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح سائے کو

پھیلاتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اسے ایک جگہ ٹھہرا دیا، پھر ہم نے سورج کو اس کے لئے رہنما بنا دیا ہے۔'' دھوپ چھاؤں کی تبدیلیاں انسان کی زندگی کے لئے انتہائی اہم ہیں۔ اگر دنیا میں ہمیشہ دھوپ رہتی تب بھی زندگی دوبھر ہو جاتی اور اگر ہر وقت سایہ ہی سایہ رہتا تو بھی انسان کا کاروبار زندگی معطل ہو کر رہ جاتا۔ اللہ تعالی ہر روز ان دونوں کا حسین امتزاج اس طرح پیدا فرماتے ہیں کہ صبح کے وقت سایہ زمین پر پھیلا ہوا ہوتا ہے، پھر جوں جوں سورج چڑھتا جاتا ہے اس کا سایہ ملتا رہتا ہے؛ یہاں تک کہ عین دوپہر کے وقت وہ کالعدم ہو جاتا ہے پھر جوں جوں سورج مغرب کی طرف ڈھلتا ہے سایہ پھر رفتہ رفتہ بڑھنا شروع ہوتا ہے، یہاں تک کہ غروب کے وقت پورے افق کو گھیر لیتا ہے۔ اس طرح انسانوں کو دھوپ چھاؤں کی یہ تبدیلی دھیرے دھیرے حاصل ہوتی ہے اور ناگہانی تبدیلی کے نقصانات سے بچاؤ ہوتا رہتا ہے۔

(خلاصہ مضامین قرآن کریم)

سایہ اور دھوپ کا تغیر اور تبدل اور کمی اور زیادتی اور ان کا فنا اور زوال یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سب چیزیں حادث ہیں اور ان کے تغیرات اور انقلابات کی باگ کسی علیم وقدیر کے ہاتھ میں ہے کہ جو ان تغیرات سے اپنی قدرت کا تماشا دکھا رہا ہے۔ کہ دیکھ لو کہ وجود اور عدم کا تماشا اس طرح دکھلایا جاتا ہے اور دھوپ اور سایہ جو کارخانہ عالم کا تانا اور بانا اس کو قدرت اور مشیت کی انگلیوں پر اس طرح نچایا جاتا ہے اور سایہ اور دھوپ کے ان تغیرات میں اور ان کھیل اور تماشوں میں بندوں کے لیے نعمتوں اور راحتوں کے عجیب عجیب سامان ہیں جن کے شکر سے زبان قاصر ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۵/ ۵۱۲)

عباد الرحمٰن کی صفات:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس اللہ سرہ ازالۃ الخفاء میں فرماتے ہیں: تمام قرآن میں حق جل شانہ کی یہ سنت جاری ہے کہ اللہ تعالیٰ جابجا اہل ہدایت اور اہل ضلالت کو میزان عدل پر رکھ کر تولتے ہیں اور ان کے اوصاف بیان کرتے ہیں، ایک فریق کو نعمائے جنت کی بشارت سناتے ہیں اور دونوں فریق کے ان اوصاف کا ذکر کرتے ہیں جن کے ساتھ وہ معروف ومشہور ہوں، پس اسی قاعدہ کے مطابق سورہ فرقان میں بھی اللہ تعالیٰ نے کفار کے شبہات و اعتراضات اور ان کے جاہلانہ خصائل وعادات کا ذکر کر کے ان کی پاداش کا ذکر کیا، بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے اپنے عباد مقربین اور ان کی صفات ثابتہ ومشہورہ کا بیان کیا۔ (ادریسی: ۵/ ۵۲۲)

اور وہ صفات یہ ہیں:

(۱) تواضع (۲) جاہلوں سے اعراض (۳) راتوں کو نماز وعبادت (۴) جہنم کے عذاب سے خوف (۵) خرچ کرنے میں اعتدال (۶) نہ فضول خرچی اور نہ ہی بخل (۷) شرک سے مکمل اجتناب (۸) قتل ناحق سے بچ کر رہنا (۹) زنا اور بدکاری سے اپنے آپ کو بچا کر رکھنا (۱۰) جھوٹی گواہی سے احتراز (۱۱) گانے بجانے اور برائی کی مجالس سے

پہلوتہی (۱۲) اللہ کی کتاب سن کر متاثر ہونا اور اس سے فائدہ اٹھانا (۱۳) اللہ تعالی سے نیک بیوی بچوں کی دعا اور یہ دعا کہ ہمیں ہادی اور مہدی بنادیا جائے۔ (۶۳۔۷۴)

صحیح مسلم میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہوجاتے ہیں مگر تین چیزوں سے۔

(۱) ایک فرزند صالح جو اس کے لئے دعا کرے۔ (۲) دوسرے علم کہ جس سے اس کی موت کے بعد نفع اٹھایا جاوے (جیسے تصنیف و تالیف) (۳) اور تیسرے صدقہ جاریہ (جیسے وقف، مسجد، مدرسہ دینیہ، کنواں، مسافر خانہ، قرآن شریف اور دینی کتابیں) ان کا ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔

عبادالرحمٰن میں شامل:

آیئے قارئین! اگلی سورت کے مطالعہ سے قبل ہم اللہ تعالی سے دعا کرلیں کہ اے رحیم و کریم تو محض اپنے فضل و کرم سے یہ تیرہ صفات ہمارے اندر پیدا فرما کر ہمیں بھی ''عبادالرحمن'' میں شامل فرمالے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

خلاصہ رکوع: ۳......تصفیہ مسئلہ قرآن۔ ماخذ: آیت: ۳۲۔

خلاصہ رکوع: ۴...... بقیہ مسئلہ کتاب اللہ (بضمن تذکیر بایام اللہ)۔ ماخذ: آیت: ۳۶، ۳۵۔

خلاصہ رکوع: ۵......تصفیہ مسئلہ توحید۔ ماخذ: آیت: ۴۵، ۴۷، ۴۸۔

خلاصہ رکوع: ۶......اوصاف عبادالرحمٰن جن کے حجابات رفع ہوگئے ہیں۔ ماخذ: آیت: ۶۳ تا ۷۴۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الشعراء

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت کے مطابق یہ سورت سورۂ واقعہ (سورہ نمبر ۵۶) کے بعد نازل ہوئی تھی۔ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کا وہ زمانہ تھا جس میں کفار مکہ آپ کی دعوت کی بڑے زور وشور سے مخالفت کرتے ہوئے آپ سے اپنی پسند کے معجزات دکھانے کا مطالبہ کررہے تھے۔ اس سورت کے ذریعے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی بھی دی گئی ہے، اور کائنات میں پھیلی ہوئی اللہ تعالی کی قدرت کی نشانیوں کی طرف توجہ دلا کر اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اگر کسی کے دل میں انصاف ہو اور وہ سچے دل سے حق کی تلاش کرنا چاہتا ہو تو اس کے لیے اللہ تعالی کی قدرت کی یہ نشانیاں اس توحید کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اور اسے کسی اور معجزے کی تلاش کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی ضمن میں پچھلے انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کی امتوں کے واقعات یہ بیان کرنے کے لیے سنائے گئے ہیں کہ ان کی قوموں نے جو معجزات مانگے تھے، انہیں وہی معجزات دکھائے گئے، لیکن وہ پھر بھی نہ مانے جس کے نتیجے میں انہیں عذاب الٰہی کا سامنا

کرنا پڑا، کیونکہ اللہ تعالی کی سنت یہ ہے کہ جب منہ مانگے معجزات دیکھنے کے باوجود کوئی قوم ایمان نہیں لاتی تو اسے ہلاک کردیا جاتا ہے۔اس بنا پر کفار مکہ کو مہلت دی جارہی ہے کہ وہ نت نئے معجزات کا مطالبہ کرنے کے بجائے توحید ورسالت کے دوسرے دلائل پر کھلی آنکھوں سے غور کر کے ایمان لائیں، اور ہلاکت سے بچ جائیں۔

کفار مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی کاہن کہتے تھے، کبھی جادوگر اور کبھی آپ کو شاعر کا نام دیتے تھے۔سورت کے آخری رکوع میں ان باتوں کی مدلل تردید فرمائی گئی ہے، اور کاہنوں اور شاعروں کی خصوصیات بیان کر کے جتایا گیا ہے کہ ان میں سے کوئی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں پائی جاتی۔اسی ضمن میں آیت ۲۲۴ تا ۲۲۷ نے شعراء کی خصوصیات بیان کی ہیں۔اسی وجہ سے سورت کا نام شعراء رکھا گیا ہے۔(توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی ۲۶ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۴۷ نمبر پر ہے، جس میں ۱۱ رکوع، ۲۲۷ آیات، ۱۳۴۷ کلمات اور ۵۶۸۹ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب میں شاعری کا بڑا زور شور تھا اور عرب قوم پر ایام جاہلیت میں شاعری کا بھوت سوار تھا، ہر خاندان اور قبیلہ کو اپنی شاعری پر فخر تھا، سالانہ میلوں میں مشاعرہ کی محفلیں گرم ہوتی تھیں مگر اس وقت کی عربی شاعری میں سوائے ذاتی فخر، قومی جہالت، عشق بازی، شراب خوری اور فسق و فجور کے تذکرہ کے کچھ نہ تھا، جب کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن پاک کی آیات سنتے تو اس کی فصاحت و بلاغت اور مضامین عالیہ سے حیران و عاجز ہو کر طرح طرح کی الزام تراشی پر اتر آتے، کبھی یہ کہتے کہ یہ (نعوذ باللہ) کاہن ہیں، کبھی ساحر کہتے اور کبھی کہتے کہ شاعر ہیں، اس سورۃ کے اخیر میں حق تعالی نے شعراء کی حقیقت بیان فرمائی کہ وہ تباہی کی باتیں اشعار میں جمع کیا کرتے ہیں اور ہر وادی سخن میں حیران و پریشان پھرا کرتے ہیں، تو کہاں شاعری اور کہاں قرآن کی آیات جن میں سراسر راستی ہدایت، مکارم اخلاق اور توحید وغیرہ کے مضامین عالیہ ہیں، اسی مناسبت سے اس سورۃ کا نام شعراء ہوا۔

ربط:

سورۂ فرقان کے آخر میں یہ جملہ تھا ''فقد کذبتم فسوف یکون لزاما'' کہ تم لوگ جھٹلا چکے دیکھو کیسی سزا ملتی ہے۔اگرچہ ان کی تکذیب کے مقابلہ میں بہت سے مواقع پر شہادتیں پیش کی گئی تھیں کہ ان میں غور کرنے کے بعد عاقل کے لئے تکذیب کی گنجائش نہیں رہتی، مگر اس کے بعد یہاں اس سورۃ میں دلائل اثبات نبوت بیان کرنا اور گزشتہ انبیاء اور ان کی نافرمان سرکش قوموں کے واقعات بیان کرنے سے اتمام حجت اور اپنے محبوب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کی تسلی بھی مقصود ہے، اس لئے سورۂ فرقان کے بعد اس سورۃ کا ذکر مناسب ہوا۔یا یوں کہئے کہ سابقہ سورۃ کا ختم مکذبین کی وعید پر تھا اس سورۃ کے شروع میں، ایسے ہی سب سے آخری رکوع میں قرآن کریم اور رسالت کی حقانیت کے ساتھ منکرین

کی توبیخ مذکور ہے، جس سے دونوں سورتوں میں تناسب ظاہر ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کے زمانہ نزول میں مکی زندگی بہت سخت تھی، ہر وقت ہر طرف سے کفار کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین پر ہجوم تھا، منکرین اسلام انکار اور مخالفت پر جمے ہوئے تھے، اپنے باپ دادا کی حرکت اور دین کو چھوڑنا ان پر شاق تھا، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے طرح طرح کے بے تکے مطالبات اور خواہشیں کرتے تھے، مثلا پہاڑوں کو مکہ کے چاروں طرف سے ہٹا دینا، ریگستان میں پانی کی نہریں جاری کر دینا، پہاڑ سونے کے بن جانا، کسی فرشتہ کا آپ کے ساتھ ساتھ رہنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحمت للعالمین ان گمراہوں کی ہدایت کے لئے بے چین رہتے تھے۔ معقول دلائل کے ساتھ ان کے عقائد کی غلطی اور توحید و آخرت کی صداقت سمجھانے کی ہر ممکن کوشش فرمایا کرتے مگر وہ عناد ہٹ دھرمی کی صورتیں اختیار کرتے جس سے آپ طبعا متاثر ہوتے اور دل ہی دل میں ان کفار کے ایمان کے لئے آپ غم کھاتے، ان حالات میں یہ سورۃ نازل ہوئی جس کی ابتداء میں آپ کو تسلی دی گئی کہ آپ ان کفار کے ایمان نہ لانے سے اپنی جان کیوں گھلا رہے ہیں۔ ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں کہ انہوں نے کوئی نشانی نہیں دیکھی بلکہ عناد اور ضد ہے۔

طالب حق کے لئے تو خدا کی زمین پر ہر طرف نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں، جنہیں دیکھ کر وہ حق کو پہچان سکتا ہے، لیکن ہٹ دھرم کسی چیز کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لا سکتے۔ نہ زمین و آسمان کی نشانیاں دیکھ کر، نہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات دیکھ کر، پھر اسی مناسبت سے گزشتہ زمانہ کے سات پیغمبروں کا تذکرہ فرمایا اور ان کی قوموں کے مختصر حالات بیان فرمائے، جنہوں نے اس ہٹ دھرمی سے کام لیا تھا جس سے اب کفار مکہ کام لے رہے تھے، انبیاء سابقین کے احوال سنا کر جہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی جا رہی تھی وہیں اور بھی چند ضروری باتیں ذہن نشیں کرائی گئیں، مثلا بتلایا گیا کہ ہر زمانہ میں کفار کی ذہنیت ایک سی رہی ہے، ان کی حجتیں اور اعتراضات یکساں رہے ہیں ان کے حیلے اور بہانے ایک ہی قسم کے رہے ہیں اور آخر کار ان کا انجام بھی یکساں رہا اس کے برعکس ہر زمانہ میں انبیاء کی بنیادی تعلیم ایک سی رہی ان کی سیرت اور اخلاق کا رنگ ایک تھا اور ان سب کے ساتھ اللہ کی رحمت کا معاملہ بھی ایک تھا، اس سورۃ میں ایک بات جو بار بار دہرائی گئی وہ یہ ہے کہ اللہ زبردست قادر توانا بھی ہے اور غفور رحیم بھی ہے۔ گزشتہ انبیاء اور ان کی امتوں کے واقعات میں اللہ کے قہر و غضب کی مثالیں بھی موجود ہیں اور رحمت کی بھی، جس سے لوگوں کو سمجھنا چاہئے کہ وہ کن باتوں سے اپنے آپ کو رحمت الٰہی کا مستحق بناتے ہیں اور کن باتوں سے خدا کے قہر و غضب کو بلاتے ہیں۔

سورۃ کے اخیر میں قرآن کی حقانیت کا ذکر فرمایا کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب ہے جو بواسطہ جبریل امین علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل ہوئی اور فرمایا کہ علماء اہل کتاب اس کی حقیقت کو خوب اچھی طرح پہچانتے ہیں، ان کو معلوم ہے کہ اس کتاب کا ذکر انبیاء سابقین کے صحیفوں اور کتابوں میں موجود ہے۔ پھر قرآن کریم کے عربی زبان میں نازل ہونے کی وجہ بیان فرمائی اور بتلایا کہ یہ قرآن وحی ربانی ہے نہ کہ القائے شیطانی، لہذا یہ قرآن نہ شعر

ہے، نہ سحر ہے، نہ کہانت ہے، بلکہ یہ کلام ایسا ہے جو ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے اور شعر اور سحر و کہانت کو اصلاح خلق سے کیا تعلق ہے؟ اخیر میں منکرین و مخالفین کو وعید سنائی گئی کہ وہ مخالف و منکر قرآن ہو کر جو ظلم کر رہے ہیں اس کا انجام ان کو عنقریب معلوم ہو جائے گا، اسی وعید و تنبیہ پر اس سورت کو ختم فرمایا گیا۔ واللہ تعالی اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لیے دل کو بھانے والے جو اسباب بن سکتے تھے اس کی تفصیل ہے، موسیٰ کے زمانے میں جادو کا رواج تھا، اور مقبول تھا، تو حضرت موسیٰ کو ایسا ہی معجزہ دیا؛ تاکہ لوگوں کے دلوں میں رعب و دبدبہ پیدا کیا جاسکے اور سچائی کو قبول کرنے میں مدد کریں، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں عربی ادب (شعر شاعری) کا رواج تھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے عربی ادب کا ایسا سمندر بہہ نکلا کہ مشہور و مقبول شاعروں نے اپنی انگلیاں منہ میں ڈال دی جب انہوں نے اسے سنا۔

تاہم یہ سمجھنا ضروری ہے کہ شاعری کا صحیح اور غلط استعمال کیا جاسکتا ہے، وہ بے شرمی پھیلانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، رسالت اور اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے لئے بھی، اس لیے انسان کی سوچ کا پاکیزہ ہونا ضروری ہے۔

اس سورت کا بنیادی موضوع رسالت کی تصدیق کرنا ہے، انبیاء علیہم السلام کے واقعات اور ان کے مشن میں رکاوٹ پیدا کرنے والے عناصر کا نتیجہ اس موضوع کو سمجھنے میں آسانی پیدا کرتا ہے، سورت کے آغاز میں قرآن شریف کا سچ اور واضح ہونے کا اعلان ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانوں کی رہنمائی کا حریص بتایا گیا ہے، انبیاء علیہم السلام کے واقعہ سے جو سبق حاصل کرنا ہے وہ درج ذیل ہیں: (ا) اقلیت اور اکثریت کے نقطہ نظر کی خامیوں کو واضح کرنے کے لیے آٹھ مرتبہ بیان کیا گیا ہے کہ نیک اور پاکیزہ لوگ کبھی اکثریت میں نہیں رہے۔ حق و باطل کی کشمکش میں اللہ کی مدد حق والوں کے ساتھ ہوتی ہے، خواہ وہ اقلیت میں ہو، باطل مٹ جاتا ہے، خواہ وہ اکثریت میں ہو۔ انسانی مزاج کا یہ تقاضہ ہے کہ محسن کے احسان کو فراموش نہ کرے، ہدایت کا حق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کو چاہتا ہے ہدایت کی دولت سے نوازتا ہے، مال و متاع کا غلط استعمال اور اس کا دکھاوا، غیر ضروری تعمیرات اور تکبر کبھی اچھے نتائج نہیں لاتے۔ ناشکری انسان کے وجود کو ختم کر دیتی ہے، نفسانی خواہشات، ہوس کی تکمیل پتھروں کی بارش کی طرح عذاب کا باعث بنتی ہے، حقوق العباد میں کمی اللہ کے غضب کا سبب بنتی ہے۔ (خواطر قرآنیہ، قرآن سارانس گجراتی)

عمومی اسلوب:

عمومی اسلوب کے مطابق اس کے فورا بعد بندوں پر اللہ تعالی کا بہت بڑا احسان جو کہ قرآن کی صورت میں ہے اس کا ذکر ہے۔

احساس کی ذمہ داری:

طٰسٓمّٓ ① تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ③

قرآن کے بارے میں ایک احساس ذمہ داری تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا جو کہ اس کے علوم و معارف اور احکام بندوں تک پہنچانے میں اپنی جان کو ہلکان کیے ہوئے تھے اور آپ کے دل میں انسانیت کی ہدایت کا ایسا درد تھا، ایسا لگتا تھا کہ آپ کی جان ہی لے لے گا (۲۔۳)

علامہ بغوی معالم التنزیل میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جب اہل مکہ نے تکذیب کی تو یہ آپ کو شاق گزرا، چونکہ آپ کو اس بات کی حرص تھی کہ وہ لوگ ایمان لے آئیں، اس لیے ان کی تکذیب سے آپ کو تکلیف ہوتی تھی۔ آپ کو تسلی دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آیت (لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ) نازل فرمائی (جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنا کام کرتے رہیں، ان کے غم میں آپ کو جان ہلاک کرنا نہیں ہے)۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ ہم اگر چاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل فرما دیں جسے یہ تسلیم کر لیں اور اس کی وجہ سے ان کی گردنیں جھک جائیں اور اس طرح سے جبراً و قہراً ایمان لے آئیں لیکن ایسا کرنا نہیں ہے، کیونکہ لوگوں کو مجبور نہیں کیا گیا بلکہ اختیار دیا گیا ہے تاکہ اپنے اختیار سے ایمان قبول کریں۔

اس کے بعد مخاطبین کی عام حالت بیان فرمائی کہ جب بھی رحمن کی طرف سے کوئی نئی نصیحت آتی ہے تو قبول کرنے کے بجائے اعراض کرتے ہیں، ان کے جھٹلانے اور آیات کا مذاق بنانے کا نتیجہ عنقریب ان کے سامنے آجائے گا، یعنی تکذیب اور استہزاء کی سزا پائیں گے، صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ آنے والے عذابوں کو انباء سے تعبیر فرمایا جو نباء کی جمع ہے، نباء خبر کے معنی میں آتا ہے، چونکہ قرآن عظیم نے پہلے سے تکذیب و استہزاء کے عواقب کی خبر دی ہے اس لیے (اَنْبٰٓؤُا مَا کَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ) فرمایا یعنی تکذیب پر عذاب آنے کی جو خبریں دی گئی تھیں ان کا ظہور ہو جائے گا۔ (انوار البیان)

مخالفین کا رویہ:

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ۝

دوسرا رویہ مخالفین کا تھا جن کے سامنے نصیحت اور ہدایت کی جو بھی بات آتی تھی، اس سے اعراض کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ (۵)

انبیاء کے قصے:

اس کے بعد اس سورت میں متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ:

اس سورت میں متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کے قصے ذکر کئے گئے ہیں، جن میں پہلا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے جو آیت ۱۰ سے شروع ہو رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے فرعون کے پاس جانے کا حکم فرمایا۔ آپ حکم خداوندی کی اتباع میں اس کے دربار میں حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ پہنچ گئے۔ فرعون نے سب سے پہلے اپنے ان

احسانات کو یاد دلانا شروع کر دیا جو اس نے حضرت موسی علیہ السلام کی پرورش کے دوران کئے تھے اور ساتھ ہی حضرت موسی علیہ السلام کو ڈرانے کے لئے ان سے جو قتل ہو گیا تھا اس کا بھی تذکرہ کر دیا۔ حضرت موسی علیہ السلام نے جواب میں پہلے قتل والے واقعہ کی وضاحت فرمائی کہ میں نے جان بوجھ کر قتل نہیں کیا تھا بلکہ غلطی اور خطا سے مجھ سے یہ فعل سرزد ہو گیا تھا اور باقی رہی تمہارے احسانات کی بات تو وہ احسانات تم کیسے جتلا سکتے ہو جبکہ تم نے میری قوم کو تو غلام بنا رکھا ہے۔ فرعون نے پھر سوال کیا کہ یہ رب العالمین کیا چیز ہے؟ اس کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ رب العالمین کی حقیقت و ماہیت کیا ہے وہ بتاؤ؟ حضرت موسی علیہ السلام نے جواب میں اللہ کی صفات کو بیان فرمایا کیونکہ اللہ کی حقیقت و ماہیت کو کوئی نہیں جان سکتا؛ چنانچہ ارشاد فرمایا: رب العالمین وہ ہے جس نے ارض وسماء کو پیدا کیا، ان دونوں میں اس کا حکم چلتا ہے، تمہیں بھی اس نے پیدا کیا ہے اور تمہارے آباء کو بھی اسی نے پیدا کیا ہے۔ وہی مشرق سے سورج طلوع کرتا ہے اور مغرب میں غروب کرتا ہے۔ حضرت موسی علیہ السلام کی ان باتوں کے جواب میں فرعون اول فول بکتا رہا اور دھمکیاں دینے لگا۔ حضرت موسی علیہ السلام نے اسے پیشکش کی کہ کیا میں تمہیں ایسی چیز دکھاؤں جو حق کو واضح کر دے، اس کے کہنے پر آپ نے لاٹھی زمین پر ڈال دی اور وہ اژدہا بن گئی اور ہاتھ کو بغل سے نکالا تو وہ سورج کی طرح چمکنے لگا۔ فرعون نے ان معجزات کو سحر پر محمول کیا اور آپ کو نیچا دکھانے کے لئے پورے مصر کے جادوگروں کو جمع کر لیا۔ مقابلے کے دن ساحروں کی رسیاں اور لاٹھیاں دوڑتے ہوئے سانپ محسوس ہونے لگیں۔ حضرت موسی کی لاٹھی اژدہا بن کر ان سب کو نگل گئی۔ ساحروں کو اللہ نے ہدایت دی اور وہ سمجھ گئے کہ یہ جادو نہیں ہے بلکہ یہ کچھ اور ہی ہے۔ اس لئے فوراً رب العالمین کے سامنے سجدے میں گر کر انہوں نے ایمان قبول کر لیا اور وہ فرعون کی دھمکیوں کے باوجود بھی ایمان پر جمے رہے۔ حضرت موسی علیہ السلام اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کو لے کر رات کے وقت مصر سے نکل گئے۔ فرعون نے تعاقب کیا مگر اللہ نے اس کو دریا میں غرق کر دیا۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن: م اش)

اس واقعہ میں رب العالمین کی حیثیت کے بارے میں سوال منطقی کہلاتا ہے۔ جب فرعون نے اللہ تعالیٰ کی حقیقت اور ماہیت کے متعلق سوال کیا تو جواب میں موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ کی صفات کو بیان کیا، وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات اور حقیقت کو تو کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ وہ تو وراء الوراء ہے۔ وہ ایسی ذات ہے جس کے متعلق حدیث میں آتا ہے **لا فکرۃ فی الرب** رب تعالیٰ کی ذات میں غور وفکر نہ کرو۔ وہ انسانی عقل وفہم سے بالاتر ہے، لہٰذا اس کی پہچان اس کی مصنوعات کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔ اس کی مصنوعات میں غور کرو گے تو اس کی صفت سمجھ میں آئے گی۔ اور پھر خدا کی ذات کا تصور قائم ہوگا، چنانچہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا ذکر کیا کہ رب العالمین وہ ہے جس نے زمین وآسمان اور تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے اور جو ان کی تدبیر کرتا ہے۔ (معالم العرفان: ۱۴/ ۱۸۷)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ:

دوسرا قصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیان کیا گیا ہے جو آیت ۶۹ سے شروع ہو رہا ہے کہ انہوں نے اپنے والد اور

قوم کو بڑی حکمت کے ساتھ ایمان وتوحید کی دعوت دی اور رب العالمین کے بارے میں فرمایا کہ وہ وہ ہے:

(۱) جس نے مجھے پیدا کیا۔ (۲) وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ (۳) وہی مجھے کھلاتا ہے۔ (۴) میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی شفاء دیتا ہے۔ (۵) جو موت دے گا اور پھر وہی زندہ کرے گا (۶) اور جو حساب و کتاب کے دن میری خطا بخش دے گا۔

پھر اللہ کے حضور چند دعائیں بھی فرمائیں:

(۱) مجھے حکمت عطا فرما دیجئے (۲) مجھے نیک لوگوں میں شامل کر دیجئے (۳) لوگوں میں میرا اچھا ذکر جاری فرما دیجئے (۴) مجھے جنت میں جگہ عنایت فرما دیجئے۔ (۵) میرے باپ کی مغفرت فرما دیجئے (حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اللہ تعالی سے اس کی مغفرت کی دعا کریں گے لیکن جب اللہ تعالی کی طرف سے ممانعت آ گئی اور معلوم ہو گیا کہ وہ ایمان نہیں لائے گا تو انہوں نے بھی اس سے براءت کا اظہار فرما دیا) (۶) مجھے آخرت میں رسوانہ فرمایئے گا۔

فرعون اور اس کی قوم چونکہ سب سے زیادہ متکبر تھی، لہٰذا اس سورۃ میں تاریخ انبیاء اور ان کی اقوام کا حال حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے شروع کیا گیا ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا ذکر ہے کیونکہ آپ کا مخاطب نمرود جیسا مغرور بادشاہ تھا۔ اس کے بعد اب نوح (علیہ السلام) اور ان کی قوم کا ذکر آ رہا ہے کہ غرور و تکبر میں نمرود کے بعد قوم نوح کا نمبر آتا ہے، فرعون کے تکبر کا حال یہ تھا کہ اس نے کہہ دیا انا ربکم الاعلی (نازعات) میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں اور نمرود نے ابراہیم (علیہ السلام) کے سامنے اپنی بڑائی کا اظہار اس طرح کیا انا احی و امیت (بقرہ) میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔

حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ:

تیسرا قصہ حضرت نوح علیہ السلام کا ہے جو آیت ۱۰۵ سے شروع ہو رہا ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کو ساڑھے نو سو سال ایمان کی دعوت دی لیکن قوم نے نہیں مانا؛ چنانچہ اللہ تعالی نے ان سب کو غرق کر دیا۔

حضرت ہود علیہ السلام کا قصہ:

چوتھا قصہ حضرت ہود علیہ السلام کا ہے جو آیت ۱۲۳ سے شروع ہو رہا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام قوم عاد کے نبی تھے، یہ لوگ جسمانی قوت، عمر کی طوالت اور خوش حالی کے اعتبار سے دنیا کی ایک نمایاں قوم تھے۔ انہوں نے بغیر ضرورت کے بڑے بڑے محلات تعمیر کئے ہوئے تھے جب انہوں نے اپنی طاقت اور خوش حالی پر تکبر کیا اور دعوت ایمان کو ٹھکرا دیا تو اللہ نے ان کو بھی ہلاک کر دیا۔

اسراف کی بیماری:

مختلف اقوام میں مختلف اخلاقی بیماریاں پائی جاتی رہی ہیں۔ عقیدے کی بیماری، کفر و شرک تو ہر قوم میں تھا۔ تاہم قوم

نوح ،قوم ابراہیم اور قوم فرعون کی اخلاقی بیماریوں کا ذکر ہو چکا ہے۔اسی طرح قوم عاد میں ظلم وستم کے علاوہ اسراف کی بیماری عام تھی ۔ بڑی بڑی عمارات تعمیر کرنا ان کا عام مشغلہ تھا، جن کا کوئی خاص مصرف نہیں بلکہ محض نمود ونمائش مطلوب ہوتی تھی۔اتبنون بکل ریع ایة تعبثون سے اسی چیز کی طرف اشارہ ہے۔

طبرانی نے جید سند کے ساتھ روایت بیان کی ہے جسے صاحب تفسیر مظہری نے بھی نقل کیا ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے بارے میں برائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کی دولت کو مٹی اور گارے میں لگا دیتا ہے۔دیکھ لیں آج بلڈنگ بازی کا شوق لوگوں کے سروں پر سوار ہو چکا ہے۔آخرت کی کچھ فکر نہیں۔محض دنیا کی نمود ونمائش کے لیے عمارات تعمیر کی جارہی ہیں، وگرنہ اگر محض رہائش مقصود ہو تو وہ کم خرچ سے تھوڑی جگہ پر بھی بن سکتی ہے۔اس کے آرائش وزیبائش کے اخراجات کو کم کیا جاسکتا ہے ،مگر لوگ ان کو اس طرح تعمیر کر رہے ہیں گویا کہ ہمیشہ ان میں رہائش پذیر ہوں گے۔

حضرت صالح علیہ السلام کا قصہ:

پانچواں قصہ حضرت صالح علیہ السلام کا ہے جو آیت ۱۴۱ سے شروع ہو رہا ہے۔ان کی قوم سرسبز وشاداب باغات اور زمینوں پر آباد تھی اور انہیں ہر طرح کا سکون واطمینان حاصل تھا لیکن انہوں نے بھی اللہ کے نبی کو جھٹلایا، اللہ کی نشانی ناقہ (اونٹنی) کو قتل کیا۔حضرت صالح علیہ السلام کو بھی قتل کرنے کا ارادہ کیا، اللہ نے ان سب کو ہی ہلاک کر دیا۔

حضرت لوط علیہ السلام کا قصہ:

چھٹا قصہ حضرت لوط علیہ السلام کا ہے۔ جو آیت ۱۶۰ سے شروع ہو رہا ہے، جن کی قوم فسق وفجور، شہوت پرستی اور بدکاری میں حد سے بڑھ گئی تھی ۔ وہ ایسا عمل کرتے تھے جو ان سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا جس سے حیوان بھی نفرت کرتے ہیں ۔جب انہوں نے بھی اپنی بری خصلتوں کو نہیں چھوڑا اور اللہ کے نبی کی بات کو نہیں مانا تو اللہ نے ان کا بھی نام ونشان مٹا دیا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کا قصہ:

ساتواں قصہ حضرت شعیب علیہ السلام کا ہے جو آیت ۱۷۶ سے شروع ہو رہا ہے ۔اللہ نے ان کی قوم کو بھی بہت نوازا تھا، گھنے جنگلات تھے،ثمر بار باغات تھے، میٹھے پانی کے چشمے تھے لیکن انہوں نے بھی اللہ کے رسول کی نافرمانی کی جس کی وجہ سے اللہ نے ان کو بھی ہلاک کر دیا۔اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے قصہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

ان في ذالك لاية وما كان اكثرهم مؤمنين و ان ربك لهو العزيز الرحيم.

یعنی اس واقعہ میں بھی بڑی عبرت ہے، پھر بھی اکثر ایمان نہیں لاتے اور یقین رکھو کہ تمہارا پروردگار صاحب اقتدار بھی ہے بڑا مہربان بھی۔

قصص قرآن کریم کی چار حکمتیں ہیں:

(۱) آپ کو تسلی دینا کہ گزشتہ انبیاء کو بھی اسی طرح جھٹلایا گیا ہے، جس طرح یہ آپ کو جھٹلاتے ہیں مگر آپ تسلی رکھیں کیونکہ آخر کار فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔

(۲) ان قصص میں دین الٰہی کا نچوڑ ہے، شریعتیں اور ان کے احکامات ضرورت کے وقت تبدیل ہوتے رہتے ہیں مگر ان سب میں یہ مشترک ہے کہ دین حق ہمیشہ سے ایک ہی ہے اور ہر نبی اپنے اپنے زمانے میں اس دین حق کی تعلیم دیتا آیا ہے۔

(۳) ان قصص میں مومنین کے لئے نصیحت ہے کیونکہ یہ قصے ایسے واقعات سے پر ہیں جو برائی، گمراہی، نافرمانی اور سرکشی سے روکتے ہیں اور ایمان، تقوی اور نیکی کی ترغیب دلاتے ہیں۔

(۴) یہ قصص لوگوں کے لئے سامان عبرت رکھتے ہیں چونکہ پچھلی اقوام کی بداعمالیوں کے نتائج وانجام کو دیکھ کر خود اپنی بداعمالیوں پر نظر جائے گی اور ان کے انجام سے خوف پیدا ہوگا اور ان قصص سے سبق اور عبرت حاصل کر کے اپنی اصلاح کی فکر کرے گا، جس نے دین حق کو مضبوطی سے پکڑ لیا وہ کامیاب اور بامراد رہا اور جو اس سے بھٹکا اور اعراض کیا تو اس کا نتیجہ ہمیشہ تباہی اور بربادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ سورۃ الشعراء کی آیت ۲۱۴ ''اور اے پیغمبر آپ اپنے قریب ترین خاندان کو خبردار کریں۔'' سب سے پہلی آیت ہے جس کے ذریعے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہلی بار تبلیغ کا حکم ہوا اور یہ ہدایت دی گئی کہ تبلیغ کا آغاز اپنے قریبی خاندان کے لوگوں سے فرمائیں۔ چنانچہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد آپ نے اپنے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے ان کو دین حق کی دعوت دی۔ اس میں یہ بھی سبق ملتا ہے کہ اصلاح کا کام کرنے والوں کو سب سے پہلے اپنے گھر اور خاندان تک حق کی دعوت پہنچانی چاہئے۔ اللہ رب العزت ہمیں بھی سب سے پہلے اپنی اور ساتھ میں اپنے گھر والوں کی اور ساتھ ہی ہر مسلمان کی فکر نصیب فرمائے۔

سورۃ کی ابتداء اور انتہاء:

جیسے اس سورت کی ابتدا قرآن عظیم کے ذکر سے ہوئی تھی اسی طرح اس کا اختتام بھی قرآن کریم کے حوالے سے مشرکین کے باطل اعتراضات کی تردید سے ہو رہا ہے۔ (۲۲۷۔۲۲۱) (معالم العرفان، خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن: م اش)

قلب سلیم والا کامیاب ہوگا:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾ إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۹﴾

قیامت والے دن ہر شخص کو مال واولاد تو مفید نہیں ہوگی، البتہ الا من اتی اللہ بقلب سلیم مگر جو کوئی اللہ تعالیٰ کے پاس قلب سلیم لے کر آیا وہ کامیاب ہوگا، اس دن قلب سلیم ہی مفید ہوگا۔ مطلب یہ کہ جس انسان کا دل کفر، شرک، نفاق اور بدعقیدگی کی آلودگیوں سے پاک ہوگا، اس لیے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں صرف کیا ہوا مال بھی مفید ہوگا اور اس کی نیک اولاد بھی مفید ہوگی جو اس کے لیے دعائیں کرے گی۔

حضرت خواجہ ضیاء الدین نخشبیؒ اپنی کتاب سلک السلوک میں لکھتے ہیں کہ لوگوں نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ قلب سلیم کس کو کہتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ قلب سلیم ایسا دل ہے جو چوبیس خصلتوں سے پاک اور بیس خصلتوں سے پر ہو۔ فرمایا: بری خصلتیں یہ ہیں؛ شرک، کفر، نفاق، عداوت (بلا وجہ) اور رغبت (لایعنی امور کی طرف) حرص، جہالت، اصرار (گناہ پر) تکبر، تعلق (غلط باتوں سے) طمع، لمبی آرزو، بے صبری، خود پسندی، بخل، مایوسی، بےفکری (خدا کی گرفت سے) حسد، بدگمانی اور نسیان (حق وانجام کو فراموش کر دینا) پھر فرمایا: اچھی خصلتیں یہ ہیں، جو انسان میں موجود ہونی چاہئیں یعنی توحید، اخلاص، نصیحت، زہد، قناعت، یقین، علم، تفویض (اپنے امور کو اللہ کے سپرد کرنا) لوگوں سے مایوسی، آرزو کا اختصار، صبر، موت کی یاد، سخاوت، توبہ، تواضع، خوف ورجاء، بھوک، حسن ظن، اللہ کا ذکر اور اس کی محبت۔ (معالم العرفان: ۱۴/ ۲۳۶)

موضوع سورۃ:......سورۃ نور کے اخیر میں ذکر نور تھا، سورۃ فرقان میں مخالفین کے حجاب رفع کئے گئے تھے، سورۃ شعراء میں متبعین نور اور معاندین نور الٰہی کے ساتھ سلوک الٰہی بصفت عزیز ورحیم ہوگا، یعنی ہمیشہ متبعین کے ساتھ صفت رحیم کا سلوک رہا، اور معاندین کے ساتھ صفت عزیز نے سلوک کیا، حاصل یہ ہے کہ اس سورۃ میں عزیز ورحیم کے مظاہر کا بیان ہوگا۔

خلاصہ رکوع: ۱......(۱) مخالفین کے قرآن پر ایمان نہ لانے سے آپ زیادہ مغموم نہ ہوں۔ (۲) اگر ہم چاہیں تو فورا ان کی گردنیں خم کرادیں۔ (۳) جس چیز کی یہ تکذیب کرتے ہیں، اس کے متعلق چند قوموں کے واقعات ان کے سامنے آجاتے ہیں۔ ماخذ: (۱) آیت: ۳۔ (۲) آیت: ۴۔ (۳) آیت: ۶۔

خلاصہ رکوع: ۲......قصہ موسیٰ علیہ السلام وفرعون، اس سورۃ میں امم سابقہ کے واقعات بلحاظ ان کے جرائم کے مذکور ہیں۔ چنانچہ فرعون اپنی خدائی کا دعویدار ہے، اس لئے اس کا قصہ سب سے پہلے آیا ہے۔ ماخذ: آیت: ۱۰۔

خلاصہ رکوع: ۳...... بقیہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وفرعون۔ ماخذ: آیت: ۳۴۔

خلاصہ رکوع: ۴...... بقیہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وفرعون۔ ماخذ: ۵۲۔

خلاصہ رکوع: ۵......فرعون اپنی خدائی منواتا تھا (جس کا ذکر قصہ ماسبق میں ہے) ابراہیم علیہ السلام کی قوم مشرک ہے، اور اجرام علویہ کو شریک خدا بناتی ہے۔ ماخذ: آیت: ۷۷۔

خلاصہ رکوع: ۶......مظہر صفت عزیز ورحیم دکھانے کے لئے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے۔ ماخذ: آیت: ۱۰۵۔

خلاصہ رکوع: ۷......ہود علیہ السلام اور ان کی قوم عاد کا ذکر (بضمن تذکیر بایام اللہ)۔ ماخذ: آیت: ۱۲۴، ۱۲۳۔

خلاصہ رکوع: ۸......صالح علیہ السلام اور قوم ثمود کا قصہ (یہ قصہ بھی صفت عزیز ورحیم کا مظہر ہے)۔ ماخذ: آیت: ۱۴۱ تا ۱۵۹۔

خلاصہ رکوع:۹......لوط علیہ السلام اوران کی قوم کا واقعہ۔ماخذ: آیت:۱۶۰ تا ۱۷۵۔

خلاصہ رکوع:۱۰......حضرت شعیب علیہ السلام اوران کی قوم کا واقعہ(یہ بھی صفت عزیز ورحیم کا مظہر ہے)۔ماخذ: آیت:۱۷۷تا۱۸۰۔

خلاصہ رکوع:۱۱......مخالفین قرآن کو کہا جاتا ہے: اگر تم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو تسلیم نہیں کرو گے تو تمہارے ساتھ بھی صفت عزیز اسی قسم کا سلوک کرے گی۔ماخذ: آیت:۲۱۶، ۲۱۷۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورة النمل

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت کے مطابق یہ سورت پچھلی سورت یعنی سورۃ شعراء کے فوراً بعد نازل ہوئی تھی۔دوسری مکی سورتوں کی طرح اس کا موضوع بھی اسلام کے بنیادی عقائد کا اثبات اور کفر کے برے نتائج کا بیان ہے۔حضرت موسیٰ، اور حضرت صالح علیہما السلام کے واقعات کی طرف مختصراً اشارہ کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی قوموں نے اس بنا پر ان کی بات نہیں مانی کہ انہیں اپنی دولت اور اپنے سماجی رتبے پر گھمنڈ تھا۔اسی طرح کفار مکہ بھی گھمنڈ میں مبتلا ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر رہے تھے۔دوسری طرف حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی دولت اور بے نظیر بادشاہت سے نوازا تھا، لیکن یہ دولت اور بادشاہت ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرنے سے مانع نہیں ہوئی۔اسی طرح سبا کی ملکہ بلقیس بھی بہت دولت مند تھی، لیکن حق واضح ہونے کے بعد اس نے اس کو فوراً قبول کر لیا۔اس سیاق میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور سبا کی ملکہ کا واقعہ اس سورت میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور اس کے بعد کائنات میں پھیلی ہوئی قدرت خداوندی کی نشانیوں کو بڑے موثر انداز میں ذکر فرمایا گیا ہے جن سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ثابت ہوتی ہے۔(توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی ۲۷ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۴۸ نمبر پر ہے، اس میں ۷ رکوع، ۹۳ آیات، ۱۱۶۷ کلمات، ۴۸۳۹ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے دوسرے رکوع میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ کے سلسلہ میں وادی النمل یعنی چیونٹیوں کے میدان کا ذکر آیا ہے، نمل کے معنی چیونٹی کے ہیں، اس لئے بطور نشانی کے اس سورۃ کا نام ''نمل'' مقرر ہوا۔

ربط:

سورۂ سابقہ کا اختتام اثبات وحی اور اثبات رسالت پر ہوا تھا، یہی مضمون اس سورۃ کے شروع میں ذکر فرمایا گیا ہے۔

خلاصہ سورۃ:

دیگر مکی سورتوں کی طرح اس میں بھی عقائد کی اصلاح یعنی توحید کی تعلیم ،نبوت کا اثبات، آخرت کا یقین اور چند انبیاء علیہم السلام کے تذکرے ہیں۔اس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے کہ سارے جہان کا پیدا کرنے والا ایک اللہ ہے، اس نے انسانوں کو پیدا کر کے ان کی ہدایت کے لئے وقتاً فوقتاً نبی بھیجے اور رسالت کا سلسلہ قائم کیا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ختم فرمادیا گیا اور آپ پر قرآن نازل کیا گیا جس میں انسانوں کو بتلایا گیا کہ ان کو زندگی میں کیا کرنا چاہئے؟ انسان کو اس دنیا میں ایک وقت مقررہ تک رہنا ہے اس کے بعد اس کی یہاں کی زندگی ختم ہوجائے گی، ہر فرد بشر جو اس دنیا میں آیا ہے ایک نہ ایک دن وہ مرجائے گا اور آخرکار یہ ظاہری عالم بھی سارا فنا ہوجائے گا، پھر کچھ مدت کے بعد جس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے سارے انسان شروع دنیا سے آخر تک دوبارہ زندہ ہوجائیں گے اور عالم آخرت شروع ہوجائے گا۔ جہاں ہر شخص کے اعمال کی جانچ پڑتال کی جائے گی اور اعمال کے مطابق اس کو جزاء وسزا دی جائے گی۔نتیجہ کے لحاظ سے قرآن کے منکروں کو دائمی عذاب،مصیبت اور بے چینی نصیب ہوگی اور اس کے ماننے والوں کو ابدی راحت،خوشی آرام اور چین حاصل ہوگا، خدا کے پیغمبروں کی ہدایت نہ ماننے والوں کی عبرت کے لئے بعض پہلی امتوں اور ان کے پیغمبروں کے قصے بیان فرمائے گئے، اولاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اور پھر بنی اسرائیل کے دو جلیل القدر اور صاحب سلطنت انبیاء حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام جن کی سلطنت جن وانس اور جانوروں تک پر تھی ان کے واقعات ذکر کئے گئے، حضرت سلیمان علیہ السلام سے متعلق دو واقعات کا بیان اس سورۃ میں فرمایا گیا، ایک وہ جو چیونٹیوں کے ساتھ پیش آیا اور اسی بنا پر اس سورۃ کا نام سورہ نمل رکھا گیا۔ اور دوسرا واقعہ ملکہ سبا کا، جس کی بابت ہدہد نے آکر خبر دی اور پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو زیر فرمان کیا۔ اس کے بعد دو اور قوموں کا بیان ہے، اخیر میں اپنی قدرت کی بعض نشانیاں واضح کر کے واقعات عالم سے عبرت حاصل کرنے پر زور دیا گیا اور دنیا کے خاتمہ کی ایک علامت بتلائی گئی، پھر قیامت کے حالات واضح کئے گئے اور سورۃ کے خاتمہ پر بتلایا گیا کہ ان باتوں کو جاننے کے بعد انسان کے لئے کوئی چارہ کار نہیں سوائے اس کے کہ قرآن کے احکام پر چلے۔ واللہ اعلم بالصواب! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورۃ مبارکہ میں اللہ نے بعض انبیاء (علیہم السلام) کا ذکر بھی کیا ہے۔پچھلی سورۃ میں انبیاء کا تذکرہ تسلی کے مضمون کے طور پر ہوا تھا کہ اللہ نے کس طرح سابقہ نافرمان اقوام کو ہلاک کیا اور اپنے انبیاء (علیہم السلام) کو کامیاب بنایا، اب اس سورۃ میں بعض انبیاء کا تذکرہ اللہ کی قدرت کاملہ کے نمونہ کے طور پر کیا گیا ہے، مثلاً حضرت سلیمان (علیہ السلام) اور ایک چیونٹی کا واقعہ بیان ہوا ہے۔صالح (علیہ السلام) کی اونٹنی کا ذکر ہے، وہ بھی اللہ کی قدرت کا نمونہ تھی؛ ملکہ سبا کا ذکر ہے جو حضرت سلیمان (علیہ السلام) پر ایمان لائی، اس کے علاوہ بھی اللہ کی وحدانیت کے عقلی اور نقلی دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر ہر عقل مند آدمی توحید خداوندی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔بعض ذیلی مضامین اور مسائل بھی اسی

سورۃ مبارکہ میں آ گئے ہیں۔ (معالم العرفان: ۱۴/ ۳۳۷)

سورہ نمل کی خصوصیت :

سورہ نمل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ان تین سورتوں میں سے ایک ہے جو جس ترتیب سے نازل ہوئیں اسی ترتیب سے قرآن کریم میں موجود ہیں۔ یعنی شعراء، نمل اور قصص۔

سورت کا آغاز :

طٰسٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۱﴾

حروف مقطعات والی دوسری سورتوں کی طرح اس کی ابتداء بھی قرآن کریم کی عظمت اور تعارف سے ہو رہی ہے، بتایا گیا کہ یہ ان لوگوں کے لیے کتاب ہدایت ہے جو اہل ایمان ہیں۔ (۱،۳)

انبیاء کے قصص :

اس کے بعد حضرت موسیٰ، حضرت صالح اور حضرت لوط علیہم السلام کے قصے اجمالی طور پر اور حضرت داؤد اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہما السلام کا قصہ قدرے تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام :

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی دولت اور بے نظیر بادشاہت سے نوازا تھا؛ لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفار کی طرح اس دولت پر گھمنڈ نہ کیا اور یہ دولت ان کے لئے اللہ تعالی کے احکامات پر عمل سے مانع نہ ہوئی۔ اسی طرح ملکہ سباء "بلقیس" بھی بہت بڑی سلطنت کی ملکہ اور بے پناہ دولت کی مالک تھی، لیکن جب اس پر حق پوری طرح واضح ہو گیا تو اس نے اس کے قبول کرنے میں تاخیر نہ کی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے تھے اور اللہ تعالی نے دونوں باپ بیٹوں کو ایک عظیم الشان سلطنت بھی عطا فرمائی اور دونوں باپ بیٹوں کو نبوت سے بھی سرفراز فرمایا، بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہ فضیلت بھی دی تھی کہ ان کے لئے انسانوں، جنوں اور پرندوں کو بھی مسخر کر دیا تھا اور ساتھ ہی انہیں جانوروں اور پرندوں کی زبان بھی سکھا دی تھی۔

قرآن کریم کی اس سورت میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے دو واقعے ذکر فرمائے گئے ہیں، ایک چیونٹیوں کا واقعہ اور دوسرا ملکہ سبا کا واقعہ۔

چیونٹیوں کا واقعہ :

ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا اپنے لشکر کے ساتھ ایسی سرزمین پر گزر ہوا جہاں چیونٹیوں کے بل بنے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنی بستی بسا رکھی تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے سنا کہ ایک چیونٹی دوسری چیونٹیوں سے کہہ رہی تھی کہ اے چیونٹیو! سلیمان علیہ السلام کا لشکر آ رہا ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں نہ دیکھیں اور پاؤں کے نیچے مسل ڈالیں۔ اس لئے جلدی

کرواور اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ ورنہ آج تمہاری خیر نہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس چیونٹی کی جو یہ بات سنی تو آپ کو اس کی ہوشیاری پر تعجب ہوا اور ہنسی آ گئی کہ اتنی چھوٹی سی مخلوق اور اس پر یہ ہوشیاری اور ساتھ ہی نعمت عظیمہ پر کہ اللہ نے مجھے جانوروں اور پرندوں کی بولی سمجھنے کی نعمت عطا فرمائی۔ اللہ کا شکر ادا کرنے لگے۔ چنانچہ فرمایا: میرے پروردگار! مجھے اس بات کا پابند بنا دیجئے کہ میں ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو آپ نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی ہیں اور وہ نیک عمل کروں جو آپ کو پسند ہوں اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل فرمالیجئے۔ (آیت ۱۹، ۱۸)

ملکہ سبا کا واقعہ:

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں جس طرح انسان اور جنات شامل تھے اسی طرح پرندے بھی شامل تھے اور ان میں ایک پرندہ ہدہد بھی تھا جس کے ذمہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے پانی تلاش کرنے کی ذمہ داری لگا رکھی تھی، کیونکہ ہدہد میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ پانی کو زمین کے نیچے بھی محسوس کر لیتا ہے، چنانچہ وہ اس کی خبر حضرت سلیمان علیہ السلام کو دیتا اور آپ جنات کو بھیج کر اس جگہ سے لشکر کے لئے پانی نکلوا لیتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کسی ضرورت سے ہدہد کو طلب کیا تو معلوم ہوا کہ وہ موجود نہیں ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اس کو اس غیر حاضری پر سخت سزا دوں گا یا میں اس کو ذبح کر ڈالوں گا یا پھر یہ کہ وہ کوئی معقول عذر پیش کر دے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہدہد حاضر ہوا اور آپ کو ملکہ سبا اور اس کی قوم کے بارے میں اطلاع دی کہ وہ سورج کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ قوم سبا عرب میں یمن کی طرف آباد تھی، جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ خبر سنی تو فرمایا کہ ہم تیرے سچ یا جھوٹ کی آزمائش کر لیتے ہیں اور آپ نے ایک خط لکھ کر ہدہد کے حوالے کر دیا کہ ملکہ سبا کو پہنچا دے اور پھر وہاں سے ہٹ کر یہ سننا کہ وہ کیا باتیں کرتے ہیں۔ ملکہ سبا کو اپنے مادی اسباب پر بڑا ناز تھا مگر جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا مختصر اور جامع خط پڑھا تو فوراً اندازہ لگا لیا کہ میں ان کا مقابلہ نہ کر سکوں گی۔ اس لئے اظہار اطاعت کی غرض سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کر لیا اور جب سلیمان علیہ السلام کے محلات اور ان کا جدید ترین ساز و سامان دیکھا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ معجزہ بھی دیکھا کہ آپ علیہ السلام نے اس کا وہ تخت جو بہت بھاری اور قیمتی تھا اس کے پہنچنے سے پہلے منگوا لیا ہے تو اس کو یقین ہو گیا کہ اس بادشاہ کی اطاعت کے بغیر چارہ نہیں، اس لئے اس نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ سے ماخوذ نصائح:

◇ جو شخص اسلام کا داعی بننا چاہتا ہے اس کے لیے علم حاصل کرنا ضروری ہے؛ کیونکہ علم اسلام کا قلب ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ عالم کو اپنے علم پر فخر نہیں کرنا چاہیے بلکہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے؛ کیونکہ علم حاصل کرنے کے جتنے ذرائع ہیں، وہ سب اللہ کی طرف سے عطا کیے گئے ہیں۔

◇ جنہوں نے کامیابیاں حاصل کیں، اگر ان کے خاندان کا کوئی فرد ان جیسی صلاحیت کا مالک ہو، تا کہ کامیابی اور ترقی جاری رہے، تو ایسا شخص حقیقی وارث (جانشین) ہونے کا حقدار ہے۔

◇ اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبانیں سیکھنے میں کوئی حرج نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دیگر زبانیں بولنے والے لوگوں میں دین پھیلانے کا ایک ذریعہ ہے۔

◇ اگر ایک جگہ مختلف برادریوں کے لوگ ہوں تو ان کی برابری برقرار رکھنے کے لیے ان کے مختلف گروپ بنائے جائیں؛ تا کہ انتظامات اچھے طریقے سے ہوسکیں۔

◇ منتظم اور لیڈر ایسا ہونا چاہیے کہ وہ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر اپنی برادری کو بچانے کی فکر کرے۔

◇ چودھری، لیڈر اور وزیر کو چاہیے کہ وہ اپنے لوگوں کا خیال رکھے تا کہ اس کی حکمرانی میں کسی کو کوئی پریشانی نہ ہو، یا کوئی غیر قانونی سرگرمی نہیں ہو رہی ہے، ہاں! اگر کوئی کوتاہی ظاہر ہوتی ہے یا پتہ چل جاتی ہے اور کوئی معقول وجہ نہیں پائی جاتی ہے تو قانون کے تحت سزا عائد کی جائے۔

◇ مقبول ذریعہ کو چھوڑ کر پیغام پھیلانے کے لیے جو پیغام رساں بن سکتا ہے ان اسباب کو استعمال کیے جا سکتے ہیں، جیسے موجودہ دور میں ٹیلی فون، انٹرنیٹ وغیرہ۔

◇ کوئی سنی سنائی چیز کو نشر کرنے کے بجائے صحیح طریقے سے تحقیق کرنی چاہیے، جب تک حقیقت واضح نہیں ہوگی اس پر پابندی لگائی جائے۔

◇ ملکہ بلقیس کی حکومت کفر کے ساتھ باقی رہنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ درباریوں کے مشورے کے بغیر اپنا کوئی حکم نہیں دیتی تھیں، اس سے صلاح ومشورہ کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

◇ شہنشاہ، وزیر اور لیڈر ذہین ہونا چاہیے؛ کیونکہ اس کا ایک غلط فیصلہ عوام کو بہت نقصان پہنچا سکتا ہے۔

◇ فریق مخالف پر اسلامی ثقافت اور دعوت کا اثر اس وقت محسوس ہوتا ہے جب کوئی شخص بغیر کسی لالچ کے اسلام کی تبلیغ کرتا ہے، مال ودولت کے لیے اپنی عزت نفس کو نیلام نہ کریں۔

◇ دستیاب ٹیکنالوجی کو دعوت وتبلیغ کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ (خواطر قرآنیہ)

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کا تذکرہ فرمایا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم میں نو جماعتیں تھیں، جن کے نو سردار تھے اور ان لوگوں کا کام ملک میں فساد پھیلانا تھا۔ ایک دن انہوں نے مشورہ کیا کہ حضرت صالح علیہ السلام کی طرف سے روزانہ کی پریشانی ہے (نعوذ باللہ) اس لئے ان کو قتل کر دیا جائے؛ چنانچہ آپس میں معاہدہ کرلیا کہ رات کو سب مل کر حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کر دیتے ہیں لیکن اللہ تعالی نے انہیں ان کے ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی عذاب کی لپیٹ میں لے لیا۔ (آیت ۴۵ سے ۵۲)

اس کے بعد حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا تذکرہ ہے کہ ان کی قوم ایسی برائی میں مبتلا ہوگئی تھی کہ انہیں ہر وہ شخص جو انہیں اس برائی سے روکتا برا لگتا تھا اور جو ان کے ساتھ اس گھناؤنے فعل میں شریک ہو جاتا تو اس کو سمجھ دار خیال کرتے تھے۔ بالکل وہی صورت ہے جو آج کل دین داروں کے ساتھ ہے کہ آج نیکی کی راہ پر چلنے والا دقیانوسی اور جاہل ہے جبکہ برائی کا ساتھ دینے والوں کو ترقی پسند اور روشن خیال سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عقل سلیم عطا فرمائیں۔

(خلاصہ مضامین قرآم کریم، خلاصۃ القرآن)

پھر مادیت پسندوں کی تردید کی اور بیان کیا کہ آسمان میرا، زمین میری، بارش سے برسا ہوا پانی میرا جس سے زراعت ہوتی ہے۔ پہاڑ میرے بنائے ہوئے ہیں، تم میں سے کسی کی طاقت ہے جو ان چیزوں کو بنا سکے؟ (۶۰،۶۱)

جدید ٹیکنالوجی کی بنیاد پر کوئی اپنی عبادت نہ کرانے لگ جائے اس لیے اس نے ایک ایسے جانور کے بارے میں بتلایا جو انسانوں کے ساتھ گفت وشنید کرے گا اور قیامت کے دن کے بارے میں بتائے گا جس کے لوگ منکر ہیں، لہٰذا لوگ سوچ کر قبول کرے کہ ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ کائنات کو چلانے والے (اللہ پاک) کی طاقت کے سامنے کچھ نہیں ہے۔

سورت کے آخر میں زمین کے وجود کی تباہی کا بیان ہے، اس وقت حضرت اسرافیل علیہ السلام اللہ پاک کے حکم سے صور میں پھونکیں گے تو دنیا کی ہر چیز کے چیتھڑے اڑ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے پاس جا کر ہر ایک کے اعمال کا حساب ہوگا، تو اس وقت کسی کے لیے کامیابی اور کسی کے لیے ناکامی نامہ ملے گا۔ (خواطر قرآنیہ، قرآن سارانس گجراتی)

اس سورت کے نصف اول میں انبیاء کرام (علیہ السلام) کے قصے ذکر فرمائے، اب اس کے بعد نصف دوم میں دعوت وتبلیغ کا طریقہ اور دلائل توحید اور مبداء اور معاد کو بیان کیا۔

چنانچہ فرمایا: اے نبی! جب یہ واقعات آپ ﷺ نے بیان کر دیئے اور ان کو سنا دیئے تو کہئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جس نے اپنی قدرت سے کافروں کا قصہ تمام کیا اور اللہ کے ان بندوں پر سلام ہو جن کو اس نے منتخب کیا یعنی انبیاء کرام پر اور ان کے اصحاب پر جن کی بدولت یہ گندگی اور نجاست دور ہوئی۔ ان واقعات میں غور کر کے بتلاؤ کہ کیا وہ خدا بہتر ہے جس کی قدرت کا یہ حال ہے یا وہ چیزیں بہتر ہیں جن کو تم الوہیت میں خدا کا شریک ٹھہراتے ہو، یعنی ظاہر ہے کہ قادر مطلق بلا شبہ عاجز مطلق سے بہتر ہے، پس اس عقلی دلیل سے بھی یہی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی مستحق عبادت ہے، اب آئندہ آیات میں چند کمالات قدرت کی تفصیل بیان کرتے ہیں کہ مشرکین ان میں غور کر کے بتلائیں کہ اللہ بہتر ہے یا یہ بت بہتر ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اس سورت میں قوم ثمود اور قوم لوط کی ہلاکت کا ذکر کر کے ارشاد فرماتے ہیں: اے پیغمبر آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ اللہ دونوں جہان کی سلامتی ان لوگوں کو دیتا ہے کہ جو اس کی بارگاہ میں برگزیدہ اور پسندیدہ ہیں اور اس اصطفا اور برگزیدگی کے مدارج اور مراتب ہیں۔ مرتبہ اعلیٰ انبیا ومرسلین کی برگزیدگی کا ہے بعد ازاں ان مسلمانوں کی برگزیدگی کا ہے، جنہوں نے انبیاء ومرسلین کی مدد اور نصرت کر کے اعلاء کلمۃ اللہ کیا اور بالخصوص

جنھوں نے آنحضرت ﷺ کی مدد اور نصرت کی اور اس کا اولین مصداق مہاجرین اولین ہیں، پھر انصار کرام اور مہاجرین اولین کے مقابلہ میں وہ اشقیا کفار ہیں جو اعلاء کلمۃ الکفر میں ساعی اور کوشاں رہے۔(تفسیر ادریسی: ٥/ ٦١٢)

روایات میں آتا ہے کہ نبی کریم سرور دو عالم ﷺ انیسویں پارے کی آخری آیت کی تلاوت کرتے یعنی **قل الحمد للہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفی - ءاللہ خیر اما یشرکون.** تو فوراًاس کے جواب میں فرماتے **:بل اللہ خیر و أبقی و اجل و أکرم.** نہیں بلکہ اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا بزرگ و برتر ہے۔

اسی طرح اس آیت کے ذریعہ یہ آداب بھی سکھائے گئے ہیں کہ جب کوئی تقریر، وعظ، خطبہ یا نصیحت کرنا ہو تو اس کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور اس کے پیغمبروں پر درود و سلام بھیج کر کرنا چاہیئے۔(خلاصہ مضامین قرآم کریم، خلاصۃ القرآن)

موضوع سورۃ......معاندین حق پر اتمام حجت ہونے کے بعد عذاب نازل ہوگا، جس طرح مادہ فاسدہ جب تک پک نہ جائے، جراح نشتر نہیں لگاتا، اسی طرح مصلح روحانی عذاب کی نشتر اس وقت لگائے گا جس وقت مادہ فساد پختہ ہو جائے گا، گویا معاندین کا کفر زہریلے پھوڑے کی طرح ہے، اس عضو کو کاٹ دیا جاتا ہے جس میں وہ پھوڑا ظاہر ہوتا کہ باقی جسم اس کے اثر بد سے بچ جائے۔ اسی طرح شرک و کفر میں مبتلا ہونے والوں کو ایک مدت تک علاج کرنے کے بعد کاٹ دیا جاتا ہے تاکہ بقیہ ملت کی روحانی زندگی بچ جائے۔

خلاصہ رکوع :١......(١) معاندین حق پر اتمام حجت ہونے کے بعد عذاب نازل ہوتا ہے۔(٢) چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے مخالفین کو جب آپ کی صداقت کا یقین ہو گیا (**وجحدوا بها. الآیہ**) اور پھر بھی اصلاح نہ کی تو تباہ کر دیئے گئے۔ ماخذ: (١) آیت: ٥، ٤۔(٢) آیت: ١٤۔

خلاصہ رکوع: ٢......حضرت سلیمان علیہ السلام بلقیس کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔ ماخذ: آیت: ٣١۔

خلاصہ رکوع: ٣......(١) بلقیس نے مشورہ کے بعد ہدیہ بھیجا۔(٢) سلیمان علیہ السلام نے ہدیہ واپس کیا اور اتمام حجت پر مادہ فاسد کے اخراج کی دھمکی دی۔(٣) دھمکی سے ان کی اصلاح ہو گئی، اور بچ گئے۔ ماخذ: (١) آیت: ٣٢، ٣٥۔(٢) آیت: ٣٧۔(٣) آیت: ٤٢۔

خلاصہ رکوع:......(١) صالح علیہ السلام کی قوم مادہ فاسدہ پکنے کے بعد تباہ ہوتی ہے۔(٢) علی ہذا القیاس لوط علیہ السلام کی قوم۔ ماخذ: (١) آیت: ٤٩۔(٢) آیت: ٥٢۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

انیسویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گواہی دیں گے ان لوگوں کے بارے میں جو قرآن کو چھوڑ بیٹھے، اس کو سنتے نہیں، اس کو سمجھتے نہیں اور اس پر عمل نہیں کرتے اور ان کے بارے میں اللہ کے دربار میں شکایت کریں گے۔

(۲) اللہ کی اپنے بندوں کے بارے میں یہ سنت ہے کہ چاہے کوئی نبی ہو یا ہادی یا ڈرانے والا، اس کا انسانوں میں سے دشمن ضرور ہوگا۔

(۳) قیامت کے دن مجرموں کو منہ کے بل گھسیٹا جائے گا نہ کہ پیروں کے ذریعے۔

(۴) جادو بھی ایک فن ہے، اس کا سیکھنا اور سکھانا دونوں حرام ہیں۔

(۵) ایمانی قوت بہادری کی اصل ہے، اس وجہ سے کہ مؤمن موت کا مشتاق ہوتا ہے کہ وہ اس کو اس کے رب سے ملانے والی ہوتی ہے۔

(۶) جنت کے وارث وہ لوگ ہیں جو تقوی والے ہیں۔

(۷) جس نے کسی ایک نبی کی بھی تکذیب کی تو اس نے سارے نبیوں کی تکذیب کی ہے، کیونکہ ان سب کی دعوت ایک ہے۔

(۸) امانت داری شعار ہے ہر رسول اور تمام صادقین وصالحین کا ہر امت میں اور ہر زمانے میں۔

(۹) عذاب اور اس کی نشانیوں کو دیکھنے کے بعد توبہ اور ندامت فائدہ نہیں دیتی۔

(۱۰) اللہ کی نعمت اور فضل کے مشاہدے کے وقت شکر واجب ہے۔

***

پارہ:۲۰

گزشتہ آیات میں مشرکین اور منکرین نبوت کے انجام بد کا ذکر فرمایا جو خدا کی قدرت اور اس کے قہر کی نشانی تھی، اب پھر مشرکین کی توبیخ وتہدید کے لئے اپنے آثار قدرت اور دلائل الوہیت ووحدانیت ذکر کرتے ہیں کہ شاید یہ بدنصیب شرک سے باز آجائیں، ان کو چاہئے کہ خدا کے قہر کی نشانیوں میں بھی غور کریں اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں بھی غور کریں، جو سب کی سب اس کی توحید اور اس کے عظمت وجلال پر دلالت کرتی ہیں اور سمجھیں اور جانیں کہ خدا کے سوا سب عاجز اور ذلیل ہیں، لہٰذا شرک سے توبہ کریں اور یقین کریں کہ معبود برحق وہ ہے کہ جو قادر مطلق ہو اور تمام صفات کمال کے ساتھ موصوف ہو۔ اور واحد قہار کے قہر سے بچنے کی فکر کریں، گزشتہ آیت میں مجملا یہ فرمایا: ءاللہ خیر اما یشرکون۔ بھلا اللہ بہتر ہے یا وہ بت بہتر ہیں جن کو مشرکین اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں، اس سے مقصود مشرکین کو سرزنش کرنا اور الزام دینا تھا کہ بت جو اپنے عابدوں کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ان سے کوئی بلا ٹال سکتے ہیں وہ بہتر ہیں یا اللہ واحد قہار بہتر ہے، اس کو کیوں نہیں پوجتے تا کہ اس کے قہر اور عذاب سے محفوظ رہیں۔ (تفسیر ادریسی:۶/ ۲، ۳)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ توحید خداوندی کے دو درجے ایسے ہیں جن میں سارے کافر اور مشرک بھی متفق ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ واجب الوجود ہے یعنی اس کی ہستی خود بخود ہے، کسی کی عطا کردہ نہیں۔ اس بات کے مشرک بھی قائل ہیں کہ صرف خدا کا وجود ذاتی ہے، باقی ساری مخلوق کا وجود خدا تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔

توحید کا دوسرا درجہ خالقیت کا ہے، کسی نئے یا پرانے مشرک ہندو، مجوسی شنٹو، ویت نامی، چینی، رومی سے پوچھ لیں۔ سب کہیں گے کہ پیدا کرنے والی ذات فقط خدا ہے، باقی سب مخلوق ہے۔ آگے چل کر توحید کا تیسرا درجہ تدبیر کا آتا ہے۔ یہاں آکر اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔ ایک صحیح مومن کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر چیز کی تدبیر بھی اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے۔ مگر نجومی اس کو ستاروں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور مشرک کبھی شجر وحجر کی طرف، کبھی جنات اور فرشتوں کی طرف اور کبھی اولیاء اللہ کی طرف، یہیں سے شرک کی ابتداء ہوتی ہے اور پھر چوتھا درجہ عبادت کا ہے، ایک سچا مومن عبادت بھی صرف اللہ کی کرتا ہے۔ اسی کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے، اسی سے حاجت روائی اور مشکل کشائی چاہتا ہے، مگر مشرک غیر اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوجاتے ہیں، اس کے نام کی منتیں مانتے ہیں اور اس سے اپنی حاجت براری کرتے ہیں۔

(معالم العرفان: ۱۴/ ۴۲۵، ۴۲۶)

آگے بیسویں پارے کے شروع میں بھی اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کی نشانیاں بیان کر کے سوالیہ انداز میں ارشاد فرمارہے ہیں "ءالٰہ مع اللہ" کہ کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی ایسا کرسکتا ہے؟ اور یہ جملہ اللہ نے پانچ مرتبہ اپنی مختلف نشانیوں

کو بیان کرنے کے بعد بیان فرمایا۔

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَأَنْبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ﴿٦٠﴾

(۱) کیا وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور آسمان سے بارش برسا کر خوبصورت اور تر و تازہ باغات لہلہائے ہیں ''ءإلـه مع الله'' کیا پھر بھی تم کہتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ نہیں! بلکہ ان لوگوں نے راستے سے منہ موڑ رکھا ہے۔(۶۰)

أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ أَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۗ ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦١﴾

(۲) وہ محسن حقیقی جس نے انسان کے لئے زمین کو باعث قرار بنایا ہے، اس کے سینے میں نہریں جاری کی ہیں، اس کی پشت پر بھاری پہاڑ رکھ دیئے ہیں اور میٹھے اور کھارے پانی کو خلط ملط ہونے سے بچانے کے لئے ان کے درمیان رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں ''ءإلـه مع الله'' کیا پھر بھی تم کہتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ نہیں! بلکہ ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے ناواقف ہیں۔(۶۱)

أَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْأَرْضِ ۗ ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٦٢﴾

(۳) مجبوری، مظلومیت، بیماری اور تکلیف کے وقت کسے پکارا جاتا ہے؟ ''ءإلـه مع الله'' کیا پھر بھی تم کہتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور خدا ہے؟ نہیں بلکہ تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو۔(۶۲)

امام قرطبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے مضطر کی دعا قبول کرنے کا ذمہ لے لیا ہے اور اس آیت میں اس کا اعلان بھی فرمادیا ہے، جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ دنیا کے سب سہاروں سے مایوس اور خلائق سے منقطع ہو کر صرف اللہ تعالی ہی کو کارساز سمجھ کر دعا کرنا سرمایہ اخلاص ہے اور اللہ تعالی کے نزدیک اخلاص کا بڑا درجہ ہے، وہ جس کسی بندہ سے پایا جائے - وہ مومن ہو یا کافر اور متقی ہو فاسق فاجر - اس کے اخلاص کی برکت سے اس کی طرف رحمت حق متوجہ ہو جاتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ تین دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں:

(۱) مظلوم کی دعا (۲) مسافر کی دعا (۳) باپ جو اپنی اولاد کے لئے دعا کرے۔

امداد غیبی کا عجیب واقعہ:

امام ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں حافظ ابن عساکرؒ کے حوالے سے ایک واقعہ نقل کیا ہے، یہ بزرگ چھٹی اور ساتویں

صدی ہجری کے محدث اور عظیم مؤرخ ہیں، جن کی تاریخ کی کتاب اسی (۸۰) جلدوں پر محیط ہے، تو انہوں نے کسی شخص کا واقعہ لکھا ہے۔ متعلقہ شخص کا اپنا بیان ہے کہ میں خچر پر بار برداری کا کام کرتا تھا اور مسافروں کا سامان وغیرہ دمشق سے زبدانی تک کرائے پر لے جاتا تھا۔ ایک دفعہ کسی مسافر نے مجھ سے بار برداری کا معاملہ طے کیا۔ میں نے سامان خچر پر لادا اور معروف راستے پر چل دیا۔ مسافر کہنے لگا کہ یہ راستہ دور ہے، تم اس راستے سے چلو جو نزدیک ہے۔ میں نے کہا کہ میں تو اس راستے سے واقف نہیں ہوں، مگر مسافر نے اصرار کیا کہ وہ خود اس راستے سے واقف ہے لہٰذا انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ چنانچہ وہ نئے راستے سے چل دیئے، حتیٰ کہ ایسی خوفناک وادی میں پہنچ گئے جہاں ہر طرف انسانی جسم کی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ مسافر نے اس مقام پر رکنے کے لیے کہا۔ جب خچر کو روک دیا تو مسافر کی شکل میں آنے والا ڈاکو کھل کر سامنے آ گیا۔ اس نے لنگوٹا کس لیا، اور چھرا لے کر مجھے قتل کرنے کے لیے بڑھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ شخص جان بوجھ کر مجھے اس راستے پر لایا ہے تاکہ مجھے قتل کر کے میرے خچر اور سامان پر قبضہ کر لے، میں نے بھاگنا چاہا مگر اس نے تعاقب کیا۔ وہ تھا بھی مجھ سے طاقتور، لہٰذا میں اس کے سامنے بے بس تھا۔ میں نے اس کی منت کی کہ میرا مال لے لو مگر مجھے قتل نہ کرو مگر وہ اپنے ارادے سے باز آنے والا نہیں تھا۔ بالآخر میں نے کہا: موت سے پہلے مجھے دو رکعت نماز ہی پڑھ لینے دو، وہ مان گیا اور میں نے نماز شروع کر دی۔ اس وقت پریشانی کا یہ عالم تھا کہ قرآن پاک کا کوئی حصہ زبان پر نہیں آ رہا تھا۔ بڑی کوشش کے بعد صرف یہی ایک آیت میری زبان سے ادا ہوئی **امن یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوء**. اچانک میں نے دیکھا کہ سامنے سے ایک تیز گھڑ سوار ہماری طرف آ رہا ہے جس کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ وہ قریب پہنچا اور اپنا نیزہ اس ڈاکو کے سینے میں پیوست کر کے اس کو ہلاک کر دیا۔ یہ کام کرنے کے بعد گھڑ سوار فوراً واپس ہوا۔ میں اس کے پیچھے بھاگا اور دریافت کیا کہ تم کون ہو جس نے مجھے اس مشکل وقت میں بچایا ہے، تو وہ کہنے لگا: میں اسی ہستی کا بھیجا ہوا ہوں جو مجبور و بے کس آدمی کی فریاد سنتا ہے اور جسے تو نے پکارا تھا۔

اَمَّنۡ يَّهۡدِيۡكُمۡ فِىۡ ظُلُمٰتِ الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ وَمَنۡ يُّرۡسِلُ الرِّيٰحَ بُشۡرًاۢ بَيۡنَ يَدَىۡ رَحۡمَتِهٖ‌ ؕ ءَاِلٰـهٌ مَّعَ اللّٰهِ‌ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ۝۶۳

(۴) بر و بحر کی تاریکیوں میں راستہ کون دکھاتا ہے؟ بارش برسنے سے پہلے ٹھنڈی ہوائیں کون چلاتا ہے؟ ''ءإلـہ مع اللہ'' کیا پھر بھی تم کہتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ نہیں اللہ اس شرک سے بالاتر ہے جس کا ارتکاب یہ لوگ کر رہے ہیں۔ (۶۳)

اَمَّنۡ يَّبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ وَمَنۡ يَّرۡزُقُكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ‌ ؕ ءَاِلٰـهٌ مَّعَ اللّٰهِ‌ ؕ قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝۶۴

(۵) انسان کو ابتداء میں کس نے پیدا کیا تھا اور دوبارہ کون پیدا کرے گا؟ ءإلـہ مع اللہ'' کیا پھر بھی تم کہتے ہو اللہ

کے ساتھ کوئی اور خدا ہے۔ کہو: لاؤ اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو۔ (۶۴)

کائناتی مناظر سے دلائل:

قرآن کا عمومی اسلوب یہی ہے کہ وہ اللہ تعالی کی الوہیت اور وحدانیت پر کائناتی مناظر اور نفس انسانی کے حقائق سے استدلال کرتا ہے، یوں وہ پوری کائنات کو بحث ومناظرہ کا میدان بنا دیتا ہے، یہاں تک کہ مخالف بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں جو یہ سارے کام کر سکے۔ (۶۰-۶۴)

دوسری زندگی کا مسئلہ:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ﴿۶۷﴾..........الیٰ..........وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴿۷۷﴾

◇ عقیدہ توحید کے بعد دوسرا بنیادی مسئلہ جو مشرکین کی سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ دوسری زندگی کا مسئلہ تھا، وہ کہتے تھے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہم اور ہمارے آبا مٹی ہو جائیں تو ہمیں دوبارہ پیدا کر دیا جائے گا۔

◇ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی کہ منکرین کے ایمان نہ لانے پر غمگین نہ ہوں۔

◇ اللہ کے عالم الغیب ہونے کا بیان کہ وہ ہر ظاہر وباطن چیز کا علم رکھتا ہے، دلوں کے بھید تک سے واقف ہے، اس لیے ہر شخص اپنے عمل اور اپنی سازشوں اور منصوبوں اور نیتوں اور ارادوں کے مطابق ٹھیک ٹھیک بدلہ پائے گا۔

◇ قرآن میں بنی اسرائیل کے واقعات اور ان کے اختلافات وغیرہ اس لیے ہیں تاکہ مسلمان عبرت حاصل کریں۔ (۶۷-۷۷)

دابۃ الارض کا لوگوں سے گفتگو کرنا:

سورۃ النمل کی آیت / ۸۲ میں بھی اللہ تعالی نے اس دابۃ الارض کا ذکر فرمایا ہے۔

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ﴿۸۲﴾

اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیامت کی دس نشانیوں کا تذکرہ فرمایا جن میں سے ایک دابۃ الارض کا بھی ذکر فرمایا۔

روایت میں ہے کہ یہ دابۃ الارض مکہ مکرمہ میں کوہ صفا سے نکلے گا اور اپنے سر سے مٹی جھاڑتا ہوا مسجد حرام میں حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان پہنچ جائے گا، لوگ اس کو دیکھ کر بھاگیں گے۔ ایک جماعت رہ جائے گی، یہ دابۃ الارض ان کے چہروں کو ستاروں کی طرح روشن کر دے گا۔ اس کے بعد وہ وہاں سے نکلے گا اور جہاں کوئی کافر ملے گا اس کے چہرے پر کفر کا نشان لگا دے گا۔ کوئی اس کی پکڑ سے بھاگ نہ سکے گا۔ یہ ہر مومن اور کافر کو پہچانے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کی آخری علامات میں سب سے پہلے آفتاب کا طلوع مغرب کی طرف سے ہوگا اور آفتاب کے بلند ہونے کے بعد دابۃ الارض نکلے گا، اس کے بعد قیامت آجائے گی ۔(ابن کثیر)

حضرت اسرافیلؑ کا صور پھونکنا:

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ۝۸۷

ان کے لچر اور کھوکھلے اعتراض کے جواب میں اللہ نے اپنے نبی کو تسلی بھی دی اور مشرکین کو وعید بھی سنائی کہ جو کچھ پہلے مجرموں کے ساتھ ہوا وہ تمہارے ساتھ بھی ہوسکتا ہے، زمین پر چل پھر کر دیکھ لو کہ ان کے ساتھ کیا ہوا، اس کے بعد قیامت کے بعض مناظر بیان کیے گئے ہیں۔

اور بتایا گیا ہے کہ یہ جہاں بس اس وقت تک باقی ہے جب تک صور نہیں پھونک دیا جاتا۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام پہلی بار صور پھونکیں گے تو ارض وسماء کی ساری مخلوق پر خوف اور ہیبت طاری ہوجائے گی، دوسری بار صور پھونکیں گے تو کائنات کی ہر چیز کو موت آجائے گی، جب تیسری بار صور پھونکیں گے تو سب قبروں سے زندہ اٹھ کھڑے ہوں گے۔

زیادہ تر مفسرین کا رجحان اس طرف ہے کہ صور دوبار پھونکا جائے گا، پہلی مرتبہ کے صور سے ساری مخلوق ہلاک ہوجائے گی اور آیت نمبر ۸۷ میں اسی کا بیان ہے اور دوسرا صور وہ ہوگا جس کے بعد تمام لوگ زندہ ہوجائیں گے اور اس کا ذکر سورہ زمر کی آیت نمبر ۶۸ کے آخر میں ہے۔

سورت کا اختتام:

جیسے اس سورت کی ابتدا عظمت قرآن کے بیان سے ہوئی تھی یونہی اس کے اختتام پر بتایا جارہا ہے کہ انسان کی سعادت یہ ہے کہ وہ اس کتاب مقدس کی تعلیمات کو مضبوطی سے تھام لے۔(خلاصۃ القرآن، خلاصۂ مضامین قرآن کریم، خلاصہ مضامین قرآنی، معالم العرفان: ۱۴/ ۴۳۳)

خلاصہ رکوع: ۵......تذکیر بآلاء اللہ ماقبل سے رابطہ کیا، اس درجہ کے منعم کے احسان فراموش کو مذکورۃ الصدر سزاؤں کا ملنا خلاف انصاف ہے، ہرگز نہیں! ماخذ: آیت: ۶۰ تا ۶۶۔

خلاصہ رکوع: ۶......(۱) معاندین حق کا انکار مجازاۃ۔(۲) اور اس کی تردید۔ ماخذ: (۱) آیت: ۶۷۔ (۲) آیت: ۶۹۔

خلاصہ رکوع: ۷......اعادہ دعوی (جس دن مادہ فاسدہ کے اخراج کا وقت آئے گا یہ بول نہیں سکیں گے)۔ ماخذ: آیت: ۸۵۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ قصص

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں ہے کہ یہ سورت سورۃ نمل کے بعد نازل ہوئی تھی ، اور مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری سورت ہے جو مکہ مکرمہ میں ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ، کیونکہ اس کی آیت نمبر ۸۵ اس وقت نازل ہوئی تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کی غرض سے مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔

سورت کا مرکزی موضوع ان شبہات اور اعتراضات کو دور کرنا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ورسالت پر کیے جاتے تھے، اسی غرض سے حضرت موسیٰؑ کا قصہ بیان کیا جو چند حقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔

◇ اول یہ کہ: اللہ تعالی جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے غیب سے ایسے سامان فراہم کر دیتے ہیں کہ انسان کے فکر و ذہن کی اس تک رسائی نہیں ہوسکتی۔

◇ دوسرے یہ کہ: اللہ تعالی جب کسی کو نبوت عطا کرتے ہیں تو اس کی منادی نہیں کی جاتی ، نہ کوئی جشن یا میلہ منعقد ہوتا ہے، یہ کج فہموں کی بات ہے کہ چپکے سے نبوت کیسے مل گئی ؟ موسی علیہ السلام کی مثال بتادی کہ جن کا تم حوالہ دیتے ہو ان کو اسی طرح خاموشی سے نبوت مل گئی تھی ،آگ کی تلاش میں نکلے تھے پیغمبری لے کر لوٹے۔

◇ تیسرے یہ کہ: اللہ تعالی اپنے جس بندے سے کام لینا چاہتے ہیں؛ بے سروسامانی کے باوجود بھی لے لیتے ہیں، سروسامان والے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

◇ چوتھے یہ کہ: تم لوگ بار بار موسیٰؑ کا حوالہ دے کر یہ کہتے ہو کہ محمد کو وہ کیوں نہیں دیا گیا جو موسیٰؑ کو دیا گیا تھا؟ یعنی عصا اور ید بیضا کا معجزہ ۔ گویا تم ایمان تو لانا چاہتے ہو مگر معجزوں کے منتظر ہو۔ حالانکہ ایسا نہیں، کیا جب موسیٰؑ نے معجزے دکھائے تھے تو کیا معجزوں کا مطالبہ کرنے والے ایمان لے آئے تھے۔ وہ اس وقت بھی ایمان نہیں لائے تھے، اور انکار حق کی پاداش میں تباہ وبرباد ہوئے تھے۔ یہی انجام مشرکین مکہ کا بھی ہوگا۔

سورت کی پہلی ۴۳ آیتوں میں حضرت موسی علیہ السلام کی ابتدائی زندگی کی وہ تفصیلات بیان فرمائی گئی ہیں جو کسی اور سورت میں بیان نہیں ہوئیں۔ اس واقعے کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمانے کے بعد آیات ۴۴ تا ۴۷ میں اللہ تعالی نے اشارہ فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان واقعات کو اتنی تفصیل سے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، اس کے باوجود جب آپ یہ واقعات بیان فرما رہے ہیں تو اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ آپ پر اللہ تعالی کی طرف سے وحی آتی ہے۔ کفار مکہ کی طرف سے آپ کی نبوت اور رسالت پر جو اعتراضات کیے جاتے تھے، ان کا شافی جواب بھی اس سورت میں دیا گیا ہے، اور آپ کو تسلی دی گئی ہے کہ جو لوگ ضد پر اڑے ہوئے ہیں، ان کے طرز عمل کی کوئی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوتی۔ پھر کفار مکہ جن جھوٹے خداؤں پر ایمان رکھتے تھے، ان کی تردید کی گئی ہے۔ قریش کے بڑے

بڑے سردار اپنی دولت پر غرور کی وجہ سے بھی آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کرتے تھے۔ ان کی عبرت کے لیے آیات ۷۶ تا ۸۲ میں قارون کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں سب سے زیادہ دولت مند شخص تھا، لیکن اس کی دولت اسے تباہی سے نہ بچا سکی جو غرور اور ضد کے نتیجے میں اس پر آ کر رہی۔ سورت کے آخر میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اگرچہ اس وقت آپ بے سروسامانی کی حالت میں مکہ مکرمہ چھوڑنے پر مجبور ہو رہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ آپ کو فاتح کی حیثیت سے دوبارہ مکہ مکرمہ واپس آنے کا موقع عنایت فرمائے گا۔

(توضیح القرآن، قرآن ایک نظر میں)

یہ قرآن کریم کی ۲۸ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۴۹ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۹ رکوع، ۸۸ آیات، ۱۴۵۴ کلمات اور ۶۰۱۱ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی پچیسویں آیت میں لفظ قصص استعمال ہوا ہے، قصص کے معنی قصہ کے ہیں، اس سورۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اس لئے علامت کے طور پر اس کا نام سورۂ قصص رکھا گیا۔

ربط:

اس نصف سورۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے فرعون کے ساتھ اور پھر قارون کے ساتھ مذکور ہے، جس سے سورہ نمل کے خاتمہ کے جملہ ''ومن اضل'' الخ کے مضمون پر من وجہ استدلال ہے، جس سے دونوں سورتوں میں تناسب ہو گیا۔

خلاصہ سورۃ:

دوسری سورتوں کی طرح اس سورۃ میں بھی توحید و رسالت کا اثبات، شرک کی مذمت، مصدقین رسالت کی مدح اور مکذبین رسالت کی مذمت، آخرت کی تعلیم، کفار مکہ کے شبہات و اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ اس سورۃ کا جو زمانہ نزول ہے اس وقت مکہ معظّمہ کے لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے متبعین اہل اسلام کو حد سے زیادہ تنگ کر رکھا تھا مگر یہ قرآن ہی کا معجزانہ اثر تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تعلیم کا نتیجہ تھا کہ آپ کے متبعین اہل اسلام سخت سے سخت مصیبت کے سامنے سینہ سپر رہتے۔ اور ہمت میں ذرا فرق نہ آنے دیتے۔ اس سورۃ میں پہلے تفصیل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ اہل اسلام کی ڈھارس اور تسلی کے لئے سنایا گیا اور بتایا گیا کہ یہ ساری اذیتیں کچھ عرصہ کے لئے ہیں، عنقریب اللہ کے فضل سے کامیابی و کامرانی کا زمانہ بھی آنے والا ہے، مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا کہ اللہ کے فرمانبردار بندوں کا قدم بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی دین سے نہیں ڈگمگایا۔ اور جب ظالموں کی دست درازی حد سے گزر جاتی ہے تو دنیا کے نگہبان اور اس نظام کائنات کے محافظ رب العالمین کی طرف سے مظلوموں کی مدد کا غیب سے سامان ہو

جا تا ہے، چنانچہ جب بنی اسرائیل پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے جانے لگے تو اللہ رب العزت نے حضرت موسی علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم وستم سے نکالنے کے لئے آپ کو فرعون کے پاس جانے کا حکم ملا، آپ نے مصر پہنچ کر بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کیا مگر فرعون نے ان کو رہا نہ کیا، تو حضرت موسی علیہ السلام بحکم خداوندی بنی اسرائیل کو راتوں رات مصر سے لے کر نکل گئے، جس پر فرعون اور اس کے لشکر نے پیچھا کیا مگر بحکم الٰہی فرعون اور اس کا تمام لشکر سمندر میں غرق ہو گیا اور بنی اسرائیل آزاد ہو گئے، پھر محکوم سے حاکم بن گئے، اس قصہ سے کئی باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱)......اللہ تعالی جو کچھ کرنا چاہتا ہے اس کے لئے وہ غیر محسوس طریقہ سے ظاہری اسباب و ذرائع فراہم کر دیتا ہے، جس بچہ کے ہاتھوں فرعون کا تختہ پلٹا اللہ نے خود فرعون کے گھر میں اس کی پرورش کرائی، اور فرعون یہ نہ جان سکا کہ وہ کس کی پرورش کر رہا ہے۔

(۲)......نبوت کسی کو کسی جشن یا اجلاس عام میں اعلان کر کے نہیں دی جاتی، کفار مکہ کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر اعتراض تھا کہ بیٹھے بٹھائے آپ کہاں سے نبی بن گئے، تو ان کو جتلایا گیا کہ حضرت موسی علیہ السلام کو بھی اس طرح راہ چلتے نبوت مل گئی تھی، آپ کوہ طور کی وادی میں آگ لینے گئے تھے کہ پیغمبری عطا ہو گئی۔

(۳)......اللہ جب اپنے کسی بندے سے دین کا کوئی کام لینا چاہتا ہے تو وہ بغیر کسی لاؤ لشکر اور ظاہری ساز وسامان کے تنہا رکھتا ہے اور بڑے بڑے لاؤ لشکر والے اس کے سامنے عاجز ہو جاتے ہیں، کہاں فرعون کی ظاہری شوکت اور کہاں موسی علیہ السلام کی بے سروسامانی۔ مگر حضرت موسی علیہ السلام کامیاب ہوئے اور فرعون ناکام رہا۔

(۴)......حضرت موسی اور فرعون اور اس کے بعد قارون کے اس قصہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ثبوت قرار دیا گیا کہ امی ہونے کے باوجود ہزار سال پہلے گزرے ہوئے تاریخی واقعات اس تفصیل کے ساتھ من وعن سنانا آپ کی نبوت کی واضح دلیل ہے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

یہ سورت حضرت موسی علیہ السلام کی زندگی کے ابتدائی حالات اور نبوت کے بعد قوم کو دعوت دینے، قوم کے ردو انکار اور ایذارسانی اور آخر کار حضرت موسیٰؑ اور ان کے متبعین کے غلبے اور فرعون اور اس کی قوم کی مغلوبیت و ہلاکت کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد دعوی توحید پر دلائل عقلیہ ونقلیہ مذکور ہیں، اسی طرح تخویفات اور تبشیرات بھی ذکر کی گئی ہیں۔ (خلاصہ مضامین قرآن از مولانا منظور یوسف)

اس سورت کا بنیادی مقصد اللہ کے وعدوں پر یقین کرنا ہے۔

اس سورت کا نزول اس وقت ہوا جب اللہ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے وطن مکہ کو چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر کے جا رہے تھے، اور مکہ چھوڑنے کے غم میں آنکھوں سے آنسوں جاری تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ اللہ جانتا ہے کہ میرے دل میں تیری کتنی محبت ہے، اگر میری قوم تجھے چھوڑنے پر مجبور نہ کرتی تو میں کبھی نہ نکلتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ میں

آپ کو واپس لاؤں گا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ اور ان کے ساتھ پیش آمدہ حالات کو بیان کیا، تا کہ آپ کو اطمینان ہو کہ جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مساوی ہے، جیسے اللہ پاک نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ سے وعدہ کیا کہ اگر تو اس بچے کو سمندر میں پھینک دے گی تو میں تمہیں تمہارا بچہ واپس بھیج دوں گا اور یہی نہیں بلکہ میں اس کو رسالت سے نوازوں گا۔ اللہ پاک آپ سے یہی وعدہ کر رہا ہے کہ میں تمہیں تمہارے وطن (مکہ مکرمہ) واپس لے آؤں گا۔ (۸۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں بہت کچھ مشترک ہے، جس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مکہ چھوڑ کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا جس کی وجہ سے مصر سے مدین چلے گئے، جہاں مکہ کے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جان لینے کے لیے بے تاب تھے وہیں فرعون بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جان کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اسی طرح دونوں کی وطن واپسی کی مدت؛ یہاں تک کہ یہ واضح ہے کہ اللہ کے وعدوں کی تکمیل، قربانی، دشمنوں کی جانب سے ملنے والے مصائب کو برداشت پر موقوف ہے، لہٰذا اگر اسلامی مبلغ (داعی) کو یہ معلوم ہو جائے کہ انبیاء والا کام آسان نہیں ہے، لیکن وہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے کام جاری رکھے گا تو اللہ کی مدد ضرور شامل حال ہوگی۔

آیات ۷، ۱۳، ۲۵، ۲۶ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں خواتین کا ایک اہم کردار رہا ہے، اگر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر ایک نظر ڈالیں تو اس میں خواتین کا اہم کردار رہا ہے۔ جیسے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہ۔ (پہلی شہید ہونے والی خاتون) حضرت سمیہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے واقعات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات ایک جیسے ہیں، اس لیے ہر امتی کو اللہ کے وعدوں پر یقین رکھنا چاہئے۔

آیت ۵ میں اللہ پاک نے وعدہ کیا ہے کہ ہم ان لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتے ہیں جو زمین میں کمزور ہیں اور جو اچھوت سمجھے جاتے ہیں، اور ان پر احسان کا معاملہ کر کران کو ایک نمونہ بناؤں۔ یہ صرف بنی اسرائیل کے لیے نہ تھا بلکہ اس کے بعد آنے والوں کے لیے بھی تھا۔ جیسے حضرت عمار بن یاسر کہ جنہیں حضرت عمرؓ نے عراق کا گورنر مقرر کیا تھا۔ لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا، حضرت عمار گورنری سنبھال نہیں سکتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں جانتا ہوں؛ لیکن میں اس آیت پر عمل کرنا چاہتا ہوں کہ کمزوروں کو حکومت دی گئی، حضرت عمار نے دین کے لیے بہت تکلیفیں برداشت کیں تو میں ان کو گورنر بنا رہا ہوں اور اسی وعدے پر بھروسہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے سفر میں سراقہ بن مالک سے فرمایا تھا کہ جب کسریٰ کا کنگن تمہارے ہاتھ میں ہوگا تو سراقہ تمہاری کیا حالت ہوگی؟ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سراقہ کو بلا کر دیا گیا۔

قارون کے واقعہ سے جو سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے عبادات، کردار اور عمل سے عزت نہیں پاتا، وہ اپنے

ظاہری دکھاوے سے لوگوں کے سامنے بڑا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا تکبر، ظلم اور مال و دولت میں اسراف کرنے جیسی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے؛ لیکن اللہ پاک صاف فرماتا ہے کہ آخرت کا گھر ہم نے ان لوگوں کے لیے بنایا ہے جو دنیا میں تکبر نہیں کرتے اور نہ ظلم وستم کرتے ہیں۔ اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے اچھے نتائج ہیں۔

اور سورت کے آخر میں اس بات کا خلاصہ ہے کہ پوری دنیا تباہ و برباد ہو جائے گی، صرف اللہ پاک کی ذات ہی باقی رہے گی اور سب کو اس کے روبرو ہونا ہے اس لیے ہر ایک کو آخرت کی تیاری کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ (خواطر قرآنیہ، قرآن سارانس گجراتی)

گزشتہ سورت کی طرح اس سورت کا آغاز بھی حقانیت قرآن سے فرمایا جو رسالت محمدیہ کی سب سے واضح اور روشن دلیل ہے اور فرعون کا قصہ ذکر کیا جس سے اہل نخوت و رعونت کی تہدید مقصود ہے کہ متکبرین کو چاہئے کہ فرعون کے قصہ سے عبرت پکڑیں کہ جس نے بنی اسرائیل کو ضعیف اور کمزور سمجھ کر ظلم وستم میں کسر نہ اٹھا رکھی اور اپنی وقتی طاقت کے غرور میں خدا کے حکم اور اس کی تاخیر اور مہلت سے غافل رہا، اس کا جو انجام ہوا وہ سب کو معلوم ہے، اسی طرح قریش مکہ کو چاہئے کہ مسلمانوں کو ضعیف اور کمزور سمجھ کر خدا کی گرفت سے بے خوف نہ ہو جائیں۔ خدا تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ انہی کمزور مسلمانوں کو ایسی قوت اور طاقت عطا کرے کہ انہی کو تم پر حکمران کر دے، اللہ کی قضا و قدر کی کسی کو خبر نہیں۔

نیز گزشتہ سورت کے آخر میں مضطر کے متعلق یہ ارشاد فرمایا تھا۔ **امن یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوء ویجعلکم خلفاء الارض** کہ اللہ تعالیٰ مضطر کی دعا قبول کرتا ہے اور اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے اور مظلوم کو ظالم پر حکمران بناتا ہے، اس سورت میں بھی بنی اسرائیل کے اضطرار اور بے چینی کو دور کرنے کا ذکر فرماتے ہیں۔ یہ کتاب جو واضح اور جلی ہے اور حقائق و معارف کو ظاہر کرنے والی ہے، اے نبی! ہم آپ کے سامنے موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کا کچھ حال ذکر کرتے ہیں۔ جو ٹھیک ٹھیک اور واقع کے مطابق ہے ان لوگوں کی بصیرت اور ہدایت کے لئے جو حق کے ماننے والے اور قبول کرنے والے ہیں۔ طالبان حق کی ہدایت اور عبرت کے لئے اس قصہ کو بیان کرتے ہیں تا کہ ان واقعات کو سن کر عبرت پکڑیں اور نصیحت حاصل کریں اور اپنی اصلاح اور تربیت کا ذریعہ بنائیں۔ قرآن کریم میں جا بجا جو قصے بیان کئے جاتے ہیں ان کو محض قصہ اور افسانہ نہ سمجھیں۔ بلکہ ان کو ہدایت نامہ اور نصیحت نامہ سمجھیں۔ (تفسیر ادریسی: ٦/ ٢٠، ٢١)

طٰسٓمّٓ ① تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ② نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ③

اللہ تعالیٰ کے پانچ وعدے:

سورہ قصص کی ابتداء میں اللہ پاک نے پانچ وعدے فرمائے:

(١) ہم کمزوروں یعنی بنی اسرائیل پر احسان کرنا چاہتے ہیں۔

(٢) ہم ان کو مذہبی قوت دینا چاہتے ہیں۔

(۳) ہم انہیں وارث بنانا چاہتے ہیں۔
(۴) ہم ان کو زمین میں خلافت دینا چاہتے ہیں۔
(۵) ہم ان کے دشمن فرعون کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔

ان پانچ وعدوں کو پورا کرنے کے لئے حضرت موسی علیہ السلام کی پیدائش ہوئی، چالیس سال میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت ملی، پھر چالیس سال دعوت دیتے رہے، اسی سال بعد فرعون کی ہلاکت ہوئی تو دو وعدے پورے ہوئے، کمزوروں کو غلبہ اور دشمن کی ہلاکت، پھر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا میدان تیہ میں انتقال ہو گیا، پھر حضرت یوشع علیہ السلام نے جہاد کیا تو باقی وعدے بھی پورے ہوئے ،اللہ کی حکمت ہے کہ یہ کام اتنے طویل عرصے میں بتدریج ہوئے، ورنہ اللہ تعالی قادر مطلق ہے، ایک لمحہ میں یہ سب کام ہو سکتے تھے۔ (خلاصہ مضامین قرآن از مولانا منظور یوسف)

حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ:

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ④

سورۂ قصص کی آیت ۴ سے حضرت موسی علیہ السلام اور فرعون کا قصہ شروع ہورہا ہے کہ فرعون کی مصر میں حکومت تھی اور اس وقت مصر میں دو قوم آباد تھیں، ایک قبطی اور دوسری بنی اسرائیل۔ آیت / ۴ میں اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں کہ فرعون نے زمین میں سرکشی اختیار کر رکھی تھی اور اس نے وہاں کے باشندوں کو الگ الگ گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا، جن میں سے ایک گروہ کو اس نے اتنا دبا رکھا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو فساد پھیلایا کرتے ہیں۔ فرعون کو کسی نجومی نے یہ کہہ دیا تھا کہ بنی اسرائیل کا ایک شخص تمہاری حکومت ختم کر دے گا۔ اس لئے اس نے یہ حکم جاری کر دیا تھا کہ بنی اسرائیل میں جو بچہ پیدا ہو اسے قتل کر دیا جائے۔ جب حضرت موسی علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی والدہ کو فکر ہوئی کہ ان کو بھی فرعون کے آدمی قتل کر ڈالیں گے۔ اللہ تعالی نے اس موقع پر ان کے دل میں الہام فرمایا کہ اس بچے کو صندوق میں رکھ کر دریائے نیل میں ڈال دو؛ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اللہ نے اس صندوق کو فرعون کے محل کے پاس پہنچا دیا اور فرعون کے خدام میں سے کسی کی نظر اس صندوق پر پڑ گئی اور وہ اس صندوق کو اٹھا کر محل میں لے آیا۔ فرعون نے جب اس بچے کو دیکھا تو اس کو بھی ذبح کرنے کا ارادہ کیا مگر اللہ نے فرعون کی بیوی حضرت آسیہ کے دل میں بچہ کے لئے نرم گوشہ پیدا کر دیا اور انہوں نے اس بچے کو گود لینے کا ارادہ کر لیا اور فرعون سے اس انداز سے بات کی کہ وہ پتھر دل بھی نرم پڑ گیا اور اس بچے کو اپنے محل میں رکھنے کی اجازت دے دی۔ اس طرح اللہ رب العزت نے فرعون کے دشمن کو جس کو مارنے کے لئے وہ خون خرابہ کرتا پھر رہا تھا اس کی گود میں اور اس کی پرورش میں لا کر ڈال دیا۔

دوسری طرف ان کی والدہ اپنے بچے کی طرف سے پریشان تھیں کہ پتہ نہیں میرے بچہ کا کیا انجام ہوا۔ فرط غم کی وجہ سے انہیں تصور ہی تصور میں صندوق فرعونیوں کے ہاتھ لگنے اور بچے کے گلے سے خون کا فوارہ نکلتا نظر آرہا تھا، لیکن اللہ کو کیونکہ والدہ کی آنکھوں کو بھی ٹھنڈا کرنا تھا اس لئے اللہ نے ایسا انتظام فرمایا کہ فرعون کی اہلیہ نے جب بچے کو دودھ پلانے کا ارادہ کرلیا تو دودھ پلانے والی کی تلاش شروع کروائی، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی بھی عورت کا دودھ منہ میں نہیں لیتے تھے۔ ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن بھی صندوق کے ساتھ کنارے کنارے چل رہی تھیں، جب انہوں نے دیکھا کہ بچے کو فرعون کی بیوی نے لے لیا ہے لیکن بچہ دودھ نہیں پی رہا تو انہوں نے اپنی والدہ کو یہ خدمت سونپنے کی تجویز پیش کی، اس کے مشورے پر ان کی ماں کو بلوایا گیا۔ بچے نے فوراً ہی دودھ پینا شروع کردیا، اس طرح ان کی والدہ کو بطور دایہ مقرر کردیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح بچے کو انہی کی گود میں پہنچادیا۔ فرعون کی کوشش تو یہ تھی کہ کوئی اسرائیلی بچہ اپنی ماں کا دودھ نہ پیئے، اپنے اس سے پہلے ہی اس کو قتل کردیا جائے لیکن اللہ کا فیصلہ کچھ اور تھا اور ہوا وہی جو اللہ نے چاہا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جوانی کی حدود میں قدم رکھا تو ان سے ایک قبطی کا قتل ہوگیا جس پر آپ بہت نادم ہوئے اور اللہ سے معافی مانگی۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ جس جگہ مسلمان اور غیر مسلم دونوں رہتے ہوں، خواہ وہاں حکومت غیر مسلم ہی کی ہو وہاں کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں کہ وہ کسی غیر مسلم کو قتل کرے یا اس کے جان و مال کو کسی طرح کا نقصان پہنچائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک شخص کے مشورے پر مصر سے مدین کی طرف تشریف لے گئے لیکن جب وہاں پہنچے تو وہاں کوئی جان پہچان نہ تھی، جس کی وجہ سے نہ کوئی ٹھکانہ تھا اور نہ کوئی کھانے پینے کا انتظام۔ چنانچہ اللہ کے حضور دعا فرمانے لگے:

رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ ﴿۲۴﴾

ترجمہ: میرے پروردگار! جو کوئی بہتری تو مجھ پر اوپر سے نازل کردے، میں اس کا محتاج ہوں۔

اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو بڑی جامعیت عطا فرماتے ہیں، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا بھی جوامع الکلم میں سے ہے کہ اس میں انسان کی ضرورت کی ہر چیز آگئی، جس کا انسان محتاج ہوسکتا ہے اور انسان کس چیز کا محتاج نہیں؟

◇ اگر روٹی کا محتاج ہے تو بھوک کا بھی تو محتاج ہے۔

◇ سائے کا محتاج ہے تو دھوپ کا بھی محتاج ہے۔

◇ بیداری کا محتاج ہے تو نیند کا بھی محتاج ہے۔

مدین پہنچ کر آپ ایک درخت کے سائے میں ایک کنویں کے کنارے تشریف فرما ہوگئے، لوگ اس کنویں سے پانی بھر بھر کر اپنی بکریوں کو بھی پلا رہے تھے اور اپنے برتن بھی بھر رہے تھے۔ اس دوران وہاں دو باحیا اور پردہ دار بچیاں بکریوں کو پانی پلانے کے لئے آگئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے از راہ احسان و ہمدردی ان کی بکریوں کو پانی کھینچ کر پلایا۔

علماء نے یہاں پر ایک مسئلہ لکھا ہے کہ ضرورت کے وقت خواتین کا کسی کام سے باہر نکلنا جائز ہے، البتہ اگر مرد وہ کام کر سکتے ہوں تو انہیں ہی کرنا چاہئے، دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ ضرورت کے وقت نا محرم خواتین سے بات کرنا جائز ہے، خاص طور پر اگر انہیں کسی مشکل میں دیکھیں تو ان کی مدد کے لئے ان کا حال پوچھ کر حتی الامکان ان کی مدد کرنا چاہئے بشرطیکہ کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔ (آسان ترجمہ قرآن)

ان بچیوں کے والد حضرت شعیب علیہ السلام تھے جو کافی بوڑھے ہو چکے تھے، ان بچیوں نے اس واقعہ کی اطلاع اپنے والد کو دی۔ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالی بڑی زبردست فہم و فراست عطا فرماتے ہیں؛ چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام فوراً سمجھ گئے کہ یہ اجنبی آدمی کوئی شریف مسافر ہے اس لئے ان دونوں میں سے ایک بچی کو دوبارہ بھیجا کہ وہ اس نوجوان کو لے کر آئے۔ اللہ تعالی نے اس طرح حضرت موسی علیہ السلام کی دعا کو قبول فرمایا کہ ان کو نہ صرف باعزت ٹھکانہ عطا فرمایا بلکہ نیک سیرت وصورت بیوی بھی عطاء فرمادی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد اہلیہ کے ساتھ مصر کا ارادہ کیا۔ راستہ لمبا تھا، پیدل سفر تھا، اہلیہ حاملہ تھیں اور سخت سردی کا زمانہ تھا۔ اس لئے جب جنگل میں آگ بھڑکتے ہوئے دیکھی تو آگ لینے کے لئے تشریف لے گئے۔ اللہ تعالی نے آگ کی جگہ نبوت عطا فرمادی اور ساتھ ہی عصا اور ید بیضاء کا معجزہ بھی عنایت فرمایا اور حکم فرمایا کہ فرعون کے پاس جا کر کلمہ حق کہو جس نے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں پر تنگ کر رکھی ہے اور جو '' **انا ربکم الاعلی** '' کا دعویدار ہے۔ حضرت موسی علیہ السلام اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے ساتھ فرعون کے دربار میں پہنچے اور اس کو ہر طرح سے اللہ کا پیغام پہنچایا، مگر وہ سرکشی میں اتنا آگے بڑھ چکا تھا اور اس کے اردگرد ایسے حواریوں کا ٹولہ موجود تھا جنہوں نے تکبر میں مبتلا کر رکھا تھا، جس کی وجہ سے اسے حق کی پہچان ہی نہ ہوسکی، یہاں تک کہ اسے اللہ نے اس کے لشکروں سمیت ڈبو دیا۔ (خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

نمایاں کردار:

یہ قصہ جس کے نمایاں کردار تین ہیں

◇ حضرت موسی علیہ السلام ◇ بنی اسرائیل ◇ اور فرعون!

جس کا کچھ حصہ یہاں اور بقیہ جزئیات پورے قرآن میں مذکور ہیں:

اس قصے سے مجموعی طور پر جو بصیرتیں اور عبرتیں حاصل ہوتی ہیں وہ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمہ اللہ تعالی نے قصص القرآن میں ذکر فرمائی ہیں، ہم ان کا خلاصہ اپنے الفاظ میں افادۂ عام کے لیے تحریر کیے دیتے ہیں۔

◇ اگر انسان مصائب و آلام پر صبر کرے تو دنیا اور آخرت میں اس کے اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

◇ جو شخص اپنے معاملات میں اللہ پر بھروسہ رکھتا ہو، اللہ تعالی اس کی مشکلات ضرور آسان کر دیتا ہے۔

◇ جس کا معاملہ حق کے ساتھ عشق تک پہنچ جاتا ہے، اس کے لیے باطل کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہیچ ہو کر رہ جاتی ہے۔

◇ اگر کوئی بندہ حق کا پرچم لے کر پوری استقامت کے ساتھ کھڑا ہو جائے تو دشمنوں ہی کے گروہ سے اس کے حمایتی پیدا کر دیے جاتے ہیں۔

◇ جس کے دل میں ایمان پیوست ہو جائے وہ ایمان کی خاطر سب کچھ یہاں تک کہ نقد جان بھی لٹانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

◇ غلامی کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہمت اور عزم کی روح سے انسان محروم ہو جاتا ہے۔

(اس لیے بنی اسرائیل نے ارض مقدس میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔)

◇ وراثت زمین اسی قوم کا حق ہے جو میدان جد و جہد میں ثابت قدم رہتی ہے۔

◇ باطل کی طاقت کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو، بالآخر اس کو نامرادی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

◇ اللہ کی عادت یہ ہے کہ جن قوموں کو ذلیل اور حقیر سمجھا جاتا ہے ایک دن آتا ہے کہ اللہ انہیں زمین کا وارث بنا دیتا ہے۔

◇ جو شخص یا جماعت جان بوجھ کر قبول حق سے سرکشی کرے، اللہ اس سے قبول حق کی استعداد چھین لیتا ہے۔

(فرعون اور اس کے حواریوں کے ساتھ یہی ہوا۔)

◇ یہ بہت بڑی گمراہی ہے کہ انسان حق کی اتباع کی بجائے حق کو اپنی خواہشات کے تابع کرنا شروع کر دے۔

(یوم السبت میں شکار کی ممانعت کے باوجود اسرائیلی حیلہ بازی کرتے رہے۔)

◇ کوئی حق کو قبول کرے یا نہ کرے، داعی کا فرض ہے کہ وہ فریضہ دعوت ادا کرتا رہے۔

(بعض اہل حق، سبت کی بے حرمتی سے آخر وقت تک منع کرتے رہے۔)

◇ ظالم حکمران قوم کی بد عملیوں کے نتیجے میں اس پر مسلط کیے جاتے ہیں۔

◇ اپنی قوم کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلانا انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت ہے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

مومن اہل کتاب کی صفات اور مشرکین کے حیلے بہانوں کا ازالہ:

آیت نمبر ۵۱ سے لے کر ۶۰ تک میں قرآن کریم پر ایمان لانے کی ترغیب دی گئی ہے اور مشرکین مکہ کے عناد اور ان کی ضد کو بیان کیا گیا ہے کہ اہل کتاب کے اس قرآن پر ایمان لانے اور اس کو قبول کرنے کے باوجود مشرک لوگ صرف اور صرف ضد اور عناد کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے۔

مؤمن اہل کتاب کی درج ذیل صفات بیان کی گئی ہیں:

◇ دونوں شریعتوں پر استقامت کے ساتھ رہے۔

◇ برائیوں کو اچھائیوں کے ذریعے ختم کیا۔

مفسرین نے لکھا کہ آیت ۵۴ کے اس جزء میں دو اہم ہدایتیں ہیں۔

(۱) اگر کسی شخص سے کوئی گناہ خطاء سرزد ہوجائے تو اس کا علاج یہ ہے کہ اس کے بعد نیک عمل کی فکر کرے تو نیک عمل اس گناہ کا کفارہ ہوجائے گا۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے فرمایا: بدی اور گناہ کے بعد نیکی کرو تو وہ گناہ کو مٹا دے گی۔

(۲) جو شخص کسی کے ساتھ ظلم اور برائی سے پیش آئے اگرچہ قانون شرع کی رو سے اس کو اپنا انتقام لینا جائز ہے بشرطیکہ انتقام برابر سرابر ہو، مگر اولی اور احسن یہ ہے کہ انتقام کے بجائے برائی کے بدلے میں بھلائی اور ظلم کے بدلے میں احسان کرے کہ یہ اعلیٰ درجہ مکارم اخلاق کا ہے اور دنیا و آخرت میں اس کے منافع بے شمار ہیں۔ ایک دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: ''تم بدی کا دفاع ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو (یعنی ظلم کے بدلے میں احسان کرو) نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے اور جس کے درمیان دشمنی تھی وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایسا ہوجائے گا جیسے وہ تمہارا جگری دوست ہے۔ (سورۃ حم السجدہ آیت ۳۴)

◇ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں۔

◇ شرک اور ہر قسم کی لغویات سے اعراض کرتے ہیں۔

◇ بے سمجھ اور جاہل قسم کے لوگوں سے نہیں الجھتے۔

بعض کافروں نے اسلام لانے میں یہ رکاوٹ ظاہر کی تھی کہ:

◇ اسلام لانے کے بعد عرب کے لوگ ہماری عزت کرنا چھوڑ دیں گے اور ہمارے خلاف قتل و غارت گری کا بازار گرم کر کے ہمیں یہاں سے نکال باہر کریں گے۔ قرآن کریم نے اس کے تین جواب دیئے ہیں:

(۱) ہم نے حدود حرم کو اتنا محفوظ بنایا ہے کہ سارے عرب میں قتل و غارت گری ہو رہی ہو لیکن حرم والے کو کوئی کچھ نہیں کہتا، جب تمہارے کفر کے باوجود اللہ تعالی نے تمہاری ایسی حفاظت فرمائی ہے تو کیا اللہ اس وقت تمہاری حفاظت نہیں کرے گا۔ (آیت ۵۷)

(۲) بربادی تو اللہ کی نافرمانی سے آتی ہے۔ چنانچہ تم سے پہلے جن قوموں نے کفر کی راہ اختیار کی وہی تباہ ہوئیں، نہ کہ وہ لوگ جو ایمان لے آئے تھے۔ (آیت ۵۸)

(۳) اگر بالفرض اسلام لانے کے بعد کچھ تکالیف آ بھی جائیں تو وہ صرف دنیاوی تکلیفیں ہوں گی جو کہ آخرت کی تکلیفوں کے مقابلے میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتیں۔

◇ دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ ان لوگوں کو اپنی معیشت اور سرمایہ کاری پر غرور تھا، اس رکاوٹ کا ازالہ یوں کیا گیا کہ ان لوگوں کو ان لوگوں سے عبرت حاصل کرنی چاہیے، جنہیں اپنی مضبوط معیشت پر ناز تھا مگر ایمان نہ لانے کی وجہ سے ہم نے ان تمام بستیوں کو تہس نہس کر دیا۔

◇ تیسری رکاوٹ دنیا کا غرور تھا، جواب دیا گیا کہ اس دنیاوی زندگی کا بھی خاتمہ ہونا ہے، یہ تو تھوڑے دنوں کی زندگی ہے لہذا اس کے دھوکے میں نہ پڑو۔ (۵۱-۶۰)

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی :

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے عزیزوں قریبیوں کے ایمان نہ لانے پر رنج قدرۃً اور زیادہ تھا، اور شوق واہتمام بھی انہی کے ایمان لانے کا طبعاً زیادہ تھا، یہ حسرت وتمنا آپ کے لیے بالکل طبعی تھی کہ دور دور کے لوگ آ کر اس نعمت سے بہرہ ور ہو جاتے ہیں، اور اپنے خاص الخاص عزیز، یہاں تک کہ ابو طالب جیسے شفیق چچا اور بزرگ خاندان محروم رہے جاتے ہیں۔ یہ آیت آپ کی تسلی کے لیے ہے کہ ہدایت کا تعلق تو مشیت تکوینی سے ہے، اس میں آپ کی مرضی اور پسند کو دخل نہیں۔

ہدایت کے ایک معنی تو راہ دکھانے، اراءۃ الطریق کے ہوتے ہیں، یہاں اس کی نفی پیغمبر کی ذات سے نہیں ہو رہی ہے، وہ تو پیغمبر کے عین فرائض میں داخل ہے۔ دوسرے معنی ہدایت کے منزل مقصود تک پہنچا دینا اور ایصال الی المقصود ہے، یہاں نفی اس کی کی جا رہی ہے کہ یہ رسول کے بس کی چیز نہیں، تمام تر مشیت تکوینی کے تابع ہے اور مشیت الٰہی بھی اسی شخص کے لیے ہوتی ہے جو خود اپنی ہدایت چاہتا ہے، اپنی قوت ارادی وانتخاب سے صحیح کام لے کر خواہ مخواہ معاند نہیں بن بیٹھتا ہے۔ طلب اگر موجود ہے، تو راہ حق خود اس طالب پر واضح ہو کر رہے گی۔ (ماجدی: ۵/ ۱۶۴)

دنیا کا سب سے بڑا سرمایہ دار:

ان مضامین کے بعد فرعون کے زمانے اور فرعون ہی کی طرح کے ایک اور متکبر اور سرکش شخص کا تذکرہ ہے۔ اس کا نام قارون تھا اور خاندانی اعتبار سے حضرت موسی علیہ السلام کا قرابت دار تھا۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ حضرت موسی علیہ السلام کا چچا زاد تھا اور حضرت موسی علیہ السلام کی نبوت سے پہلے فرعون نے اسے بنی اسرائیل کی نگرانی کے لئے مقرر کیا ہوا تھا۔ جب حضرت موسی وہارون علیہما السلام کو اللہ نے نبوت سے سرفراز فرمایا تو اسے بہت حسد ہوا اور بعض روایات میں ہے کہ اس نے حضرت موسی علیہ السلام سے مطالبہ بھی کیا کہ اس کو کوئی منصب دیا جائے؛ لیکن اللہ کو منظور نہ تھا اس لئے منع کر دیا گیا، جس کی وجہ سے وہ اور حسد کی آگ میں جل گیا اور منافقت شروع کر دی۔ اللہ نے اس کو اتنی دولت دی تھی کہ اس کے خزانے کی چابیاں اٹھانے کے لئے بھی طاقتور مزدوروں کی ایک بڑی جماعت کی ضرورت پیش آتی تھی، یہاں تک کہ قارون کا خزانہ ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا۔ دولت کی بہتات نے اسے خودسر اور مغرور بنا دیا تھا۔ حضرت موسی علیہ السلام نے اس کو سمجھایا کہ مال ودولت پر مت اتراؤ، اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دیا ہے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرو، لیکن اس کے جواب میں ہر متکبر کی طرح اس نے بھی وہی جواب دیا ''یہ سب تو مجھے خود اپنے علم کی وجہ سے ملا ہے۔'' (آیت ۷۸) اللہ نے اس کو جواب میں ارشاد فرمایا: علم کا کوئی اعلی درجہ تو درکنار اسے تو اتنی معمولی

بات بھی نہیں معلوم کہ اگر بالفرض اس نے اپنے علم و ہنر سے یہ سب کچھ حاصل کیا بھی ہے تو وہ علم و ہنر کس کا دیا ہوا ہے اور یہ بات بھی اس کو سمجھ میں نہیں آئی کہ اللہ تعالی ایسے بہت سے لوگوں کو ہلاک کر چکا ہے جو اس سے زیادہ مضبوط تھے اور اسی قسم کا دعوی کیا کرتے تھے۔ قارون کا انجام بھی ان لوگوں جیسا ہی ہوا۔ اللہ نے اس کو اس کے خزانوں سمیت زمین میں دھنسا دیا۔ جو لوگ اس کی آن بان دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتے تھے تو وہ اس کے انجام کو دیکھ کر کہنے لگے:

لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

”اگر اللہ ہم پر احسان نہ کرتا تو وہ ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیتا، او ہو یہ پتہ چل گیا کہ کافر لوگ فلاح نہیں پاتے۔“ (آیت ۸۲)

قارون کو نصیحت:

قارون کو اللہ تعالی کی طرف سے یہ پیغام ملا:

(۱) اترایا نہ کر، اس لئے کہ اترانے والوں کو اللہ تعالی پسند نہیں کرتا۔

(۲) اللہ نے جو مال دیا اس کے ذریعے آخرت کی بھلائی حاصل کر۔

(۳) اور سارا مال بھی نہ خرچ کر و بلکہ اس دنیا میں رہنے کے لئے اپنا حصہ بھی رکھ۔

(۴) جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی لوگوں پر احسان کر۔

(۵) زمین میں فساد نہ پھیلا۔

قرآن کریم کی ایک نصیحت:

قارون کا قصہ سنانے کے بعد قرآن کریم نے ایک ایسی نصیحت کی ہے جو ہر مسلمان کو اپنے پلے سے باندھ لینا چاہئے۔ ارشاد فرمایا:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾

”وہ آخرت والا گھر تو ہم ان لوگوں کے لئے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں نہ تو بڑائی چاہتے ہیں اور نہ فساد اور آخری انجام پرہیزگاروں کے حق میں ہوگا۔ جو شخص کوئی نیکی لے کر آئے گا اس کو اس سے بہتر چیز ملے گی اور جو کوئی بدی لے کر آئے گا تو جنہوں نے برے کام کئے ان کو کسی اور چیز کی نہیں، ان کے کئے ہوئے کاموں ہی کی سزا دی جائے گی۔ (آیت ۸۳، ۸۴)

بڑا بننے کی بیماری:

آج بڑا بننے کی بیماری عوام میں نہیں بلکہ خواص میں بھی عام ہو چکی ہے، جو لوگ اس بیماری میں مبتلا ہیں انہیں یہ آیت ہر وقت سامنے رکھنی چاہیے۔

بادشاہ اور سرمایہ دار کا عبرت ناک انجام:

اس سورت کی آخری آیت میں ہے کہ

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۟ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۠ ﴿۸۸﴾

''اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ پکارو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ہر چیز فنا ہونے والی ہے، سوائے اس ذات کے، حکومت اسی کی ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا۔''

فرعون جیسے بادشاہ اور قارون جیسے سرمایہ دار کا عبرتناک انجام اس دعوی کی دلیل ہے کہ اللہ کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

موضوع سورۃ:......اس سورۃ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقبل کی پیش گوئی ہے، جس طرح فرعون پر موسی علیہ السلام اور بنی اسرائیل نے فتح پائی، اسی طرح کفار مکہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان فاتح ہوں گے۔

خلاصہ رکوع: ۱......موسی علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ میں مسلمانوں کے لئے پیش گوئی ہے۔ ماخذ: آیت: ۳۔

خلاصہ رکوع: ۲......موسی علیہ السلام کا جوان ہونے کے بعد بلا اجازت فرعون مصر سے نکلنا (فرعون کے گھر محض تربیت کے لئے رکھے گئے تھے، اب اگر با اجازت جاتے تو شاہزادگی کے طور پر سفر کرتے اور منظور یہ ہے کہ انہیں غلامی کی زندگی کا احساس ہو، تا کہ بنی اسرائیل کی تکالیف کو سمجھیں۔ ماخذ: آیت: ۲۱۔

خلاصہ رکوع: ۳......موسی علیہ السلام کا شعیب علیہ السلام کی خدمت میں جانا، اور دس سال تک خدمت کرنا، تا کہ محکومی کی زندگی کا انہیں پورا احساس ہو۔ ماخذ: آیت: ۲۵، ۲۷۔

خلاصہ رکوع: ۴......محکومی کی دس سالہ زندگی بسر کرنے کے بعد موسی علیہ السلام کا مع اہلیہ کے مصر کی طرف جانا اور راستہ میں نبوت کا عطا ہونا۔ ماخذ: آیت: ۲۹، ۳۲۔

خلاصہ رکوع: ۵......(۱) غرق فرعون کے بعد موسی علیہ السلام کو توریت ملی، بنی اسرائیل کی طرف موسی علیہ السلام مبعوث ہوئے، تو (۲) بنی اسماعیل کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہیں، اور ان پر اتمام حجت ہو رہا ہے۔ ماخذ (۱) آیت: ۴۳۔ (۲) آیت: ۴۶، ۴۷۔

خلاصہ رکوع: ۶......(۱) جس طرح موسی علیہ السلام کی تا بعدار ایک جماعت پیدا ہوگئی تھی، اسی طرح اب بھی ہوگا۔ (۲) اور جس طرح موسی علیہ السلام کو ام القریٰ میں بھیج کر تعلیّ اختیار کرنے والوں کو تباہ کیا گیا تھا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ام القری (مکہ معظّمہ) میں بھیجا گیا ہے اور تعلیّ اختیار کرنے والوں کو تباہ کیا جاوے گا۔ ماخذ: (۱) آیت: ۵۲۔ (۲) آیت: ۵۹۔

خلاصہ رکوع: ۷......معاندین حق جن جن معبودوں کی عبادت کر رہے ہیں، قیامت کے دن وہ ان سے بیزار ہوں

گے۔ ماخذ: آیت: ۶۳۔

خلاصہ رکوع: ۸...... کفار مکہ معظّمہ کا گھمنڈ توڑنے کے لئے قارون کی مثال دی جاتی ہے۔ ماخذ: آیت: ۶۷۔

خلاصہ رکوع: ۹...... عود الی المقصود یعنی تعلّی والوں کی تباہی اور بے کسوں کی سرفرازی اللہ تعالی کے قبضہ میں ہے۔ ماخذ: آیت: ۸۳، ۸۵۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ عنکبوت

یہ سورت مکہ مکرمہ کے اس دور میں نازل ہوئی تھی جب مسلمانوں کو ان کے دشمنوں کے ہاتھوں طرح طرح کی تکلیفیں اٹھانی پڑ رہی تھیں، بعض مسلمان ان تکلیفوں کی شدت سے بعض اوقات پریشان ہوتے اور ان کی ہمت ٹوٹنے لگتی تھی۔ اس سورت میں اللہ تعالی نے ایسے مسلمانوں کو بڑی قیمتی ہدایات عطا فرمائی ہیں۔ اول تو سورت کے بالکل شروع میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالی نے مومنوں کے لیے جو جنت تیار فرمائی ہے وہ اتنی سستی نہیں ہے کہ کسی تکلیف کے بغیر حاصل ہو جائے۔ ایمان لانے کے بعد انسان کو مختلف آزمائشوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ دوسرے یہ تسلی بھی دی گئی ہے کہ یہ ساری تکلیفیں عارضی نوعیت کی ہیں، اور آخر کار ایک وقت آنے والا ہے جب ظالموں کو ظلم کرنے کی طاقت نہیں رہے گی، اور غلبہ اسلام اور مسلمانوں ہی کو حاصل ہوگا۔ اسی پس منظر میں اللہ تعالی نے اس سورت میں پچھلے انبیائے کرام علیہم السلام کے واقعات سنائے ہیں جن میں سے ہر واقعے میں یہی ہوا ہے کہ شروع میں ایمان لانے والوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن آخر کار اللہ تعالی نے ظالموں کو برباد کیا اور مظلوم مومنوں کو فتح عطا فرمائی۔ مکی زندگی کے اسی زمانے میں کئی واقعات ایسے پیش آئے کہ اولاد مسلمان ہوگئی اور والدین کفر پر بضد رہے، اور اپنی اولاد کو واپس کفر اختیار کرنے پر مجبور کرنے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ والدین ہونے کی وجہ سے ان کی اولاد کو دین و مذہب کے معاملے میں بھی ان کی فرمانبرداری کرنی چاہیے۔ اس سورت کی آیت نمبر ۸ میں اللہ تعالی نے اس سلسلے میں یہ معتدل اور برحق اصول بیان فرمایا کہ والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ انسان کا فرض ہے، لیکن اگر وہ کفر یا اللہ تعالی کی نافرمانی کا حکم دیں تو ان کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ جن مسلمانوں کے لیے مکہ مکرمہ کے کافروں کا ظلم وستم ناقابل برداشت ہو رہا تھا، ان کو اس سورت میں نہ صرف اجازت، بلکہ ترغیب دی گئی ہے کہ وہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں وہ اطمینان کے ساتھ ساتھ اپنے دین پر عمل کر سکیں۔ بعض کافر لوگ مسلمانوں پر زور دیتے تھے کہ دین اسلام کو چھوڑ دو، اور اگر اس کے نتیجے میں تم پر اللہ تعالی کی طرف سے کوئی سزا آئی تو تمہاری طرف سے ہم اسے بھگت لیں گے۔ اس سورت کی آیات ۱۲ و ۱۳ میں اس لغو پیشکش کی حقیقت واضح کر دی گئی ہے کہ آخرت میں کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔ اس کے علاوہ توحید، رسالت اور آخرت کے دلائل بھی اس سورت میں بیان ہوئے ہیں۔ اور اس سلسلے میں جو اعتراضات کافروں کی طرف سے اٹھائے جاتے تھے،

ان کا جواب بھی دیا گیا ہے۔

عنکبوت عربی میں مکڑی کو کہتے ہیں اور اس سورت کی آیت نمبر ۴۱ میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ مشرکین کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے مکڑی کے جالے پر بھروسہ کر رکھا ہو، اس لیے اس سورت کا نام سورۃ عنکبوت ہے۔(توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی ۲۹ ویں سورۃ اور ترتیب نزول میں ۸۵ نمبر پر ہے، اس سورت میں ۷ رکوع، ٦٩ آیات، ۹۹۰ کلمات اور ۴۴۱۰ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

ربط:

سورۂ عنکبوت کا سورۂ قصص کے ساتھ رابط یہ ہے کہ سورۂ عنکبوت میں زیادہ تر استقامت علی الدین سے موانع کے متعلق احکام میں ایک مانع تھا کفار کا مسلمانوں کو ایذا پہنچانا فعلا یا قولا۔ دوسرا مانع تھا کفار کا مسلمانوں پر قولی جبر کرنا۔ تیسرا مانع تھا کفار کا مسلمانوں کو بہکانا اور چوتھا مانع ہجرت بعض کے لئے فکر رزق تھا، اس سورۃ میں صادق الایمان لوگوں کو عزم و ہمت اور استقامت کی تعلیم دی گئی ہے اور کفار مکہ کو سخت تنبیہ وتہدید کی گئی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے چوتھے رکوع میں لفظ عنکبوت آیا ہے، جس کے معنی مکڑی کے ہیں، اس سورۃ کی ایک آیت میں کفار کے اعتقادات کو مکڑی کے جالے سے تشبیہ دی گئی ہے جو نہایت کمزور اور بودا ہوتا ہے، اس لئے اس سورۃ کا نام عنکبوت قرار دیا گیا۔

شان نزول:

حضرت خباب ابن ارت رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ چادر مبارک کی ٹیک لگائے ہوئے کعبہ کے سائے میں تشریف فرماتھے اور ہم لوگوں پر دن رات مشرکین کی جانب سے ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے جارہے تھے، میں نے حاضر ہوکر عرض کیا: یارسول اللہ آپ اللہ جل جلالہ سے ہمارے لئے دعا کیوں نہیں فرماتے؟ یہ سن کر آپ سنبھل کر بیٹھ گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک جوش اور جذبہ سے سرخ ہوگیا آپ نے فرمایا تم سے پہلے جو دین وایمان والے گزرے ہیں ان پر اس سے زیادہ سختیاں توڑی گئی ہیں، ان میں سے کسی کو زمین میں گڑھا کھود کر بٹھا دیا جاتا اور اس کے سر پر آرہ چلا کر اس کے دوٹکڑے کردیئے جاتے، لوہے کی کنگھیوں سے ان کا گوشت نوچ ڈالا جاتا، سوائے ہڈیوں اور پٹھوں کے کچھ نہ چھوڑا جاتا، ایسی سختیوں نے بھی ان کو دین سے نہ روکا، خدا کی قسم اللہ پاک اپنے اس دین کو پورا کرکے رہے گا، تم لوگ دیکھ لوگے کہ اکیلا سوار صنعاء یمن سے حضر موت تک آئے گا اور سوائے اللہ کے کسی کا خوف و ہراس اس کے دل میں پنہاں نہ ہوگا لیکن تم لوگ ہر کام میں جلدی چاہتے ہو۔ اس اضطرابی کیفیت کو ٹھنڈے صبر اور تحمل میں تبدیل کرنے کے لئے اللہ تعالی نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

خلاصہ سورۃ:

جس زمانہ میں یہ سورۃ نازل ہوئی اس زمانہ میں مکہ کے مسلمان مشرکوں اور کفار کے ہاتھوں سخت اذیت اٹھا رہے تھے، کفار کی طرف سے اسلام کی مخالفت پورے زور شور سے ہو رہی تھی، ان حالات میں اللہ تعالی نے یہ سورت نازل فرمائی تا کہ ایک طرف کچے مؤمنین کے قلوب میں عزم واستقامت پیدا ہو، اس سورۃ میں مسلمانوں کو صبر کی تلقین کی گئی اور ان کو بتلایا گیا کہ دنیا میں اللہ عزوجل اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے، جولوگ مصائب جھیل کر ثابت قدم رہتے ہیں وہ ہی آخر کامیاب ہوتے ہیں، بغیر مشقت راحت نہیں ملتی اور نہ ہی کسوٹی پر پرکھے بغیر کھرا کھوٹا پہچانا جاتا ہے، مسلمانو! جب تم نے اللہ کے نام کا اقرار کیا تو اب آزمائش کے لئے تیار رہو۔ ایمان کوئی زبانی جمع خرچ نہیں کہ زبان سے کلمہ پڑھ لیا اور پھر جو چاہے کرتا پھرے بلکہ کلمہ پڑھ لینے کے بعد اللہ کے احکام کی پابندی کرنا اور اس کے راستہ میں مشقتیں اور مصیبتیں آئیں تو انہیں ثابت قدمی سے برداشت کرنا چاہئے۔ ایمان کا امتحان ہر زمانہ کے لوگوں کا کیا گیا ہے، اس کے بعد کفار مکہ کے متعلق بتلایا گیا کہ یہ نادان لوگ جو مسلمانوں کو ستا رہے ہیں ہم سے بچ کر کہاں جائیں گے، یہ کفار کا ستانا مسلمانوں کے رفع درجات کا باعث بن رہا ہے، دیکھو ایسا ہرگز نہ ہو کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کرنے لگو، اگر ماں باپ بھی کہیں کہ ایمان چھوڑ دو اور شرک اختیار کرلو، ان کا کہنا بھی اس بارے میں مت مانو، پچھلی قوموں کا حال دیکھو کہ اللہ کو نہ مان کر کیسی کیسی تباہیوں میں پھنسے اور کس بری طرح ہلاک اور برباد ہوئے، انہیں اللہ کے عذاب سے کوئی نہ بچا سکا اور جو اللہ کے فرماں بردار ہوئے ان کو اللہ نے اس دنیا میں بھی اپنی نعمتوں سے نوازا اور آخرت میں بھی ان کے لئے بڑے درجے ہیں۔ یہ اپنا دل لگانے کی جگہ نہیں ہے، جنہوں نے اس میں دل لگایا ان پر مرنے کے بعد فوراً ہی مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور ہاتھ ملتے رہ گئے مگر اس وقت کی ندامت اور پچھتانے سے کیا فائدہ۔

مسلمانوں کو یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ اگر ظلم وستم تمہارے لئے ناقابل برداشت ہو جائے، تو ایمان چھوڑنے کے بجائے گھر بار چھوڑ کر نکل جاؤ، خدا کی زمین وسیع ہے، جہاں خدا کی بندگی کر سکو وہاں چلے جاؤ، سورۃ کے آخر میں یہ جاں فزا پیغام ہے کہ جو ہمارے راستہ میں محنت کرے گا ہم اس کے لئے کامیابی کی راہیں کھول دیں گے اور اللہ اپنے مخلص وفاداروں کے ساتھ ہے۔ نیز دوسری مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ میں توحید، رسالت اور آخرت کو ذہن نشین کرادیا گیا اور اس کے ساتھ شرک کی مذمت اور اس کا ابطال فرمایا گیا ہے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمان کو دین کی حفاظت کے لیے تیار رہنا چاہیے، چاہے کتنا ہی بڑا امتحان کیوں نہ ہو؛ کیونکہ مسلمان کی زندگی کا پروگرام بڑی حد تک کسی نہ کسی آزمائش اور واقعے سے جڑا ہوتا ہے؛ لیکن مومن کو ایمان کی اتنی فکر ہونی چاہیے کہ کوئی بھی حادثہ پیش آنے سے ایمان کمزور نہ ہو؛ لیکن ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان نماز، روزہ اور دیگر عبادات بھی کرتا ہے، پھر بھی یہ صورتحال کیوں؟ اس کا جواب واضح ہے، ہم اللہ تعالیٰ کی حکمت کو نہیں سمجھتے اور یہ دنیا

آخرت میں کامیابی اور ناکامی کا امتحان ہے۔ بغیر امتحان کے لوگوں کو جنت کے مختلف مقامات کا صحیح مالک بنانا ممکن نہیں، اس لیے کل ہر شخص اپنے اعمال اللہ کے سامنے پیش کرے گا اور اس کے مطابق اس کے لیے قطعی فیصلہ کیا جائے گا۔ یہ بڑے انصاف کی بات ہے، کیونکہ اللہ جانتا ہے کہ کون کیا کرنے والا ہے؛ لیکن اپنی مہربانی اور انصاف کی وجہ سے اللہ پاک اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اللہ نے واضح کر دیا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ کو ہماری عبادت کی ضرورت ہے۔ آیت نمبر ۶ میں بتایا گیا ہے کہ محنت کرنے والا آدمی اس سے فائدہ اٹھائے گا، میں دنیا جہان کے لوگوں سے بے نیاز ہوں۔

دوسری آزمائش انسان پر اس راستے میں بھی آتی ہے جس میں وہ مجبور ہو جاتا ہے اور وہ گھر کا فتنہ ہے کہ جب اس کے ماں باپ اسے اللہ پاک کے ساتھ شرک یا ایسا کام کرنے کو کہتے ہیں تا کہ اس کا ایمان کمزور ہو جائے، تو اس کا حل دکھایا جاتا ہے کہ اپنے باپ کے ساتھ مہربانی کرو؛ لیکن جب توحید کی بات ہو تو ان کی بات نہ سنو، پھر اس نے ان مصیبتوں کو بیان کیا جو انبیاء علیہم السلام پر آ پڑی تھیں کہ میرے پیاروں نے خوشی خوشی ہر مصیبت کا سامنا کیا۔ اور اگر فرمانبردار رہے تو کامیاب ہوئے، تم بھی پریشانیوں کا رونا نہ روؤ، اللہ تعالیٰ کا دروازہ نہ چھوڑو، آپ کو کامیابی ملے گی۔

اس لیے مکڑی کی مثال دے کر اس نے سکھایا کہ مکڑی اپنی حفاظت کے لیے جال بناتی ہے، کس قدر پیچیدہ طریقے سے ایک ایک تار کو جوڑتا ہے، لیکن اتنا کمزور ہے کہ ایک ہی اشارہ میں ٹوٹ جاتا ہے، اسی طرح مصیبت کے وقت انسان اللہ کے دروازے کو چھوڑ کر دوسروں سے پناہ مانگتا ہے تو دیکھا جائے تو اللہ پاک کے مقابلے میں وہ مکڑی کے جال کی طرح ہیں۔ (خواطر قرآنیہ)

امت محمدیہ کی آزمائش:

الٓمّٓ ۟ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۟ ....
الیٰ .... وَلَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ؗ وَلَیُسْـَٔلُنَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ۟۠

اس رکوع میں بتایا گیا ہے کہ محض زبان سے اللہ کا اقرار اور ایمان کا دعویٰ مفید نہیں جب تک کہ اس کے مطابق عمل صالح نہ ہو اور جو لوگ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں وہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، تا کہ وہ ایک طرف تو آزمائش کی بھٹی سے نکھر کر نکلیں اور دوسری طرف اپنے آپ کو سچا ثابت کریں، پھر جو لوگ برائیاں کرتے ہیں ان کو دھمکی دی گئی ہے کہ کیا وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ سے بچ کر نکل جائیں گے؟

والدین کی اطاعت کا حکم:

پھر والد سے حسن سلوک کی تعلیم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اگر وہ کسی ایسی بات کا حکم دیں جو شرک وغیرہ جیسی اللہ کی

معصیت کی ہو تو ان کی اطاعت ہرگز نہ کرنی چاہئے۔

اللہ ہی بھیدوں کو جاننے والا ہے:

پھر کہا ہے کہ بہت سے لوگ اللہ پر ایمان کا دعوی تو کرتے ہیں، لیکن جب اللہ کے احکام پر عمل کرنے کی راہ میں مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو دنیا والوں کی سختیوں کو اللہ کے عذاب کی طرح ہولناک سمجھتے ہیں، اور اگر مسلمانوں کو اللہ کی مدد ملتی ہے تو پھر فوراً آگے آگے ہو کر مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے، حالانکہ اللہ ایسے لوگوں کی حالتوں اور ان کے دلوں کے بھید سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی:

مسلمانوں کو یہ بتانے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے کہ خدا کی راہ میں انبیاء نے اور ان کی پیروی کرنے والوں نے کیا کیا مصیبتیں جھیلیں، پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر کیا اور پھر اس واقعہ کو تمام جہان والوں کے لئے عبرت ونصیحت قرار دیا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ آیت ۱۳ سے صرف تمہید ہے کہ انہوں نے لوگوں کو گمراہی اور شرک سے باز رہنے کی کس کس طرح نصیحتیں کیں لیکن لوگوں نے ان کی تکذیب کی۔ آیت ۲۳ سے مخالفین کے تشدد وایذا رسانی کا ذکر ہے۔

قوم کا نبیوں کے ساتھ رویہ:

ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾

بتایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت حق کے جواب میں ان کی قوم نے یہ کہا کہ ان کو قتل کر دو یا آگ میں جلا دو۔ چنانچہ جب وہ نمرود کے پاس طلب کئے گئے اور وہاں نمرود سے مکالمہ ہوا اور نمرود لاجواب ہو گیا تو انہوں نے اس کو آگ میں پھینک دیا، لیکن اللہ نے اپنے خلیل کو آگ میں جلنے سے بچا لیا۔

پھر حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر ہے (جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہجرت کی تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو شام میں دعوت وتبلیغ کے لئے مقرر کیا تھا) حضرت لوط علیہ السلام نے دیکھا کہ لوگ دوسرے گناہوں کے ساتھ بدکاریوں میں بری طرح مبتلا ہیں تو ان کو نصیحتیں کیں۔ خدا کے عذاب سے ڈرایا، ایمان کی طرف بلایا لیکن وہ بجائے اس کے کہ راہ ہدایت اختیار کرتے الٹا حضرت لوط علیہ السلام کے دشمن ہو گئے اور انہیں ملک بدر کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ بالآخر ایسے بدکاروں پر اللہ کے عذاب کے آنے کا وقت آن پہنچا۔

اس کے بعد حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم (اہل مدین) کا تذکرہ ہے کہ انہوں نے بھی اپنے نبی کی تکذیب کی اور درپے آزار ہوئے۔ بالآخر ان کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد قوم عاد اور ثمود کی نافرمانیوں اور ان کے مبتلائے عذاب

ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

پھر قارون، فرعون اور ہامان کا ذکر ہے کہ ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعوت حق پہنچائی مگر انہوں نے تکذیب کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تکلیفیں دیں۔ بالآخر قارون کو زمین میں دھنسا دیا گیا۔ ہامان کو کڑک کے عذاب سے جلا ڈالا۔ فرعون کو مع اس کے لشکر کے غرق کر دیا گیا۔ اس کے بعد آخر میں مشرکین کی حالت کو مکڑی کے جالے سے تشبیہ دی ہے کہ جو لوگ شرک کرتے ہیں ان کا سہارا مکڑی کے جالے کی طرح ہوتا ہے جو انتہائی کمزور ہوتا ہے۔ (٢٣-٤٤)

مثال کی اہمیت:

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿٤٣﴾

یہ مثالیں ہیں جن کو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تورات، انجیل اور قرآن پاک میں بہت سی مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ ان مقاصد پر مکڑی کے جالے کی مثال ہے، جب کہ سورہ نمل میں چیونٹیوں کی مثال بیان کی ہے اور سورۃ النحل میں شہد کی مکھیوں کی مثال ہے۔ سورۃ النور میں نور خداوندی کی مثال بیان کی گئی ہے، کہیں مکھی، مچھر اور کیڑے مکوڑوں کی مثالیں ہیں، کہیں مومن اور کافر کی مثال ہے، تو کہیں کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی مثال ہے۔ الغرض! اللہ نے بہت سی مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ اسی طرح احادیثِ مبارکہ میں بھی بہت سی مثالیں بیان کی گئی ہیں، امام ترمذی نے کتاب الامثال کے نام پر ایک مستقل باب بیان کیا ہے۔ اور مثال بیان کرنے کا فلسفہ یہ ہے کہ کسی باریک مضمون کو انسانی عقل و فہم کے قریب لایا جا سکے۔ حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان مبارک سے سن کر ایک ہزار مثالیں یاد کر رکھی ہیں، آپ فاتح مصر ہیں۔ پہلے کفر میں شدید تھے مگر جب ایمان لے آئے تو اسلام کی فدا کاری میں بھی پیش پیش رہے۔ (معالم العرفان: ١٤/٧٠٠)

موضوع سورۃ......سورۃ عنکبوت سورۃ قصص کے مضمون کا تتمہ ہے، سورۃ قصص میں اس امت کی کامیابی اور سرفرازی کا جو وعدہ کیا گیا ہے، وہ جہاد اور ہجرت سے پورا ہوگا، چونکہ بنی اسرائیل کے جذبات حریت وغیرت مدت ہائے مدیدہ کی غلامی سے مردہ ہو چکے تھے، اس لئے ان کی کامیابی قوائے غیبیہ سے ہوئی، یہاں وہ قصہ نہیں ہے، اس لئے بظاہر قوت بازوئے مسلم اور حقیقت میں اعانت الٰہی سے کامیابی ہوگی۔

خلاصہ رکوع: ١......امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) کا افتنان جہاد سے ہوگا۔ ماخذ: آیت: ٢، ٦۔

خلاصہ رکوع: ٢......تذکیر بایام اللہ اور شروع واقعہ ابراہیم علیہ السلام۔ ماخذ: آیت: ١٤، ١٦۔

خلاصہ رکوع: ٣......تذکیر بایام اللہ، بقیہ واقعہ ابراہیم علیہ السلام، اور لوط علیہ السلام۔ ماخذ: آیت: ٢٢، ٢١، ٢٨۔

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

بیسویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) غیب کا علم اللہ تبارک وتعالی کا خاصہ ہے، جو اس کا دعوی کرے وہ جھوٹا ہے۔

(۲) قیامت کا انکار کرنے والے عنقریب اس کا یقین کرلیں گے، مگر اس وقت ان کو یہ یقین نفع نہیں دے گا۔

(۳) دن اور رات میں بہت سی نشانیاں ہیں جو عقیدہ آخرت اور حساب و جزاء پر واضح دلالت کرتی ہیں۔

(۴) مؤمن وہ ہے کہ تلاوت قرآن اس کے دل کی زندگی کو نفع دے۔

(۵) توبہ ضروری ہے غلطی واقع ہوجانے کے بعد اور سب سے پہلی توبہ یہ ہے کہ اپنے گناہ کا اعتراف کرے۔

(۶) حسن ظن، قوی امید اور مکمل توکل اللہ پر رکھنا ضروری ہے۔

(۷) اللہ تعالی جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جو چاہتا ہے پسند کرتا ہے۔ اس لئے بندے کو جب کوئی اہم امر درپیش ہو تو سنت کے مطابق استخارہ کرلینا چاہئے۔

(۸) اللہ کا فضل، رحمت اور عدل بندے کی حسنات کو دگنا کردیتا ہے اور سیئات کو اتنا ہی کم کردیتا ہے۔

(۹) ضروری ہے والدین کے ساتھ نیکی کرنا معروف کاموں میں اور شرک و معاصی میں ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔

(۱۰) جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں اللہ تعالی جنت میں ان کو صالحین کا ساتھ نصیب فرمائیں گے۔

***

پارہ:۲۱

سورہ عنکبوت کے چار رکوع بیسویں سپارے میں تھے اور بقیہ تین رکوع اکیسویں پارے میں ہیں۔

گزشتہ آیات میں توحید کا ذکر تھا اور اس بات کا ذکر تھا کہ انبیاء کرام (علیہم السلام) نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی اور شرک سے منع کیا، بالآخر وہ منکرین ہلاک ہوئے، ۲۱ ویں پارہ کے آغاز میں آنحضرت ﷺ کی رسالت کا مضمون ذکر کرتے ہیں اور منکرین رسالت کے بعض شبہات کا جواب دیتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کو حکم دیتے ہیں کہ ان کے سامنے قرآن مجید کی تلاوت کیجئے، جو توحید کے مضامین پر اور گزشتہ امتوں کے حال اور مآل پر مشتمل ہے، اور آپ ﷺ کی رسالت کا عظیم معجزہ ہے، عجب نہیں کہ آیات خداوندی کے انوار و برکات سے ان کی ظلمتیں دور ہو جائیں اور نماز کو قائم کیجئے، نماز ایک عجیب عبادت ہے جو فحشاء اور منکر کے دور کرنے میں تریاق کا حکم رکھتی ہے، سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تلاوت قرآن کا حکم دیا کہ بغیر اللہ کا حکم سنے کیسے راہ یاب ہو سکتے ہیں اور پھر نماز کا حکم دیا جو خشوع اور خضوع کی تصویر ہے، بعد ازاں ذکر الٰہی کا حکم دیا جو نماز کی اور تمام عمل صالحہ کی روح ہے، بلکہ تمام عالم کی روح ہے جب تک دنیا میں اللہ کا نام باقی ہے اس وقت تک دنیا قائم ہے، بعد ازاں اہل کتاب سے مناظرہ اور مجادلہ کا طریقہ بتایا کہ ان کو حسن اسلوب سے حق کی دعوت دیجئے، اس لئے کہ علماء اہل کتاب خوب جانتے ہیں کہ یہ وہی نبی آخر الزمان ﷺ ہیں جن کی گزشتہ پیغمبروں نے خبر دی ہے اور جو کتاب ہدایت و حکمت آپ ﷺ پر نازل ہوئی ہے وہ آپ ﷺ کی نبوت کی کافی اور شافی دلیل ہے، یہ بات لوگوں کے سامنے ہے کہ آپ ﷺ امی ہیں، لکھنا پڑھنا نہیں جانتے مگر علم و حکمت کے چشمہ آپ ﷺ کی زبان سے جاری ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۶/ ۱۱۲)

معلوم ہوا کہ یہ علم من جانب اللہ ہے **و ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی** اس حجت واضحہ کے بعد بھی اگر معاندین ایمان نہ لائیں تو وہ اپنے انجام کو سوچ لیں۔

اس لئے اب آئندہ آیات میں اپنے نبی کو حکم دیتے ہیں کہ آپ ان منکرین کے عناد اور تکبر کی پروانہ کیجئے اور ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے رنجیدہ اور غمگین نہ ہوجیئے، جو کتاب ہدایت اللہ کی طرف سے آپ ﷺ پر نازل ہوئی ہے اس کی تلاوت کرتے رہیے، خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی سنائیے اور اقامت صلوٰۃ میں لگے رہئے اور کسی وقت اللہ کے ذکر سے غافل نہ ہوئیے، خطابات تو حضور پر نور ﷺ کو ہیں مگر مقصود امت کو سنانا ہے۔

تلاوت اور نماز کی پابندی کا حکم:

اکیسویں پارے کی پہلی آیت جو سورۂ عنکبوت کی ۴۵ ویں آیت ہے۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ﴿۴۵﴾

اس سے کتاب اللہ کی تلاوت اور نماز کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے اور نماز کا فائدہ یہ بتایا ہے کہ نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ واقعی حقیقت یہ ہے کہ اگر آدمی نماز کو نماز کے طریقے پر پڑھے اور اس کی شرائط و آداب کا لحاظ رکھے اور اس کے مقصد پر دھیان بھی ہو تو یقیناً اس کے ثمرات ونتائج ضرور حاصل ہوتے ہیں اور اس کی نماز اس کو بے حیائی اور برے کاموں سے ضرور روکے گی۔ پھر یہ ہی نماز اس کے اور اس کے گناہوں کے درمیان رکاوٹ بن جاتی ہے، کیونکہ جب انسان نماز میں سب سے پہلے تکبیر کہہ کر اللہ تعالی کی بڑائی کا اعلان اور اقرار کرتا ہے تو وہ اللہ کے سامنے اس بات کا اقرار اور عہد کرتا ہے کہ یا اللہ میں آپ ہی کی بندگی کرتا ہوں اور آپ ہی سے مدد مانگتا ہوں، لہذا اس کے بعد جب کسی گناہ کا خیال اس کے دل میں آئے تو اگر اس نے نماز دھیان سے پڑھی ہے تو اس کا یہ عہد اس کو گناہ سے روکے گا اور اس کے رکوع سجدے اور نماز کی ہر حرکت وسکون اس کو بندگی کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس لئے جو شخص نماز کو سوچ سمجھ کر اس طرح پڑھے جیسے پڑھنا چاہئے تو نماز اسے یقیناً برائیوں سے روکے گی۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

نماز کا برائیوں سے روکنا دو معنی میں ہوسکتا ہے۔ ایک بطریق تسبب، یعنی نماز میں اللہ تعالیٰ نے خاصیت وتاثیر رکھی ہو کہ نمازی کو گناہوں اور برائیوں سے روک دے جیسے کسی دوا کا استعمال کرنا بخار وغیرہ امراض کو روک دیتا ہے۔ اس صورت میں یاد رکھنا چاہیے کہ دوا کے لئے ضروری نہیں کہ اس کی ایک ہی خوراک بیماری کو روکنے کے لئے کافی ہو جائے۔ بعض دوائیں خاص مقدار میں مدت تک التزام کے ساتھ کھائی جاتی ہیں۔ اس وقت ان کا نمایاں اثر ظاہر ہوتا ہے بشرطیکہ مریض کسی ایسی چیز کا استعمال نہ کرے جو اس دوا کی خاصیت کے منافی ہو۔ پس نماز بھی بلاشبہ بڑی قوی التاثیر دوا ہے۔ جو روحانی بیماریوں کو روکنے میں اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ ہاں ضرورت اس کی ہے کہ ٹھیک مقدار میں اس احتیاط کے ساتھ جو اطبائے روحانی نے تجویز کیا ہو خاصی مدت تک اس پر مواظبت کی جائے۔ اس کے بعد مریض خود محسوس کرے گا کہ نماز کس طرح اس کی پرانی بیماریوں اور برسوں کے روگ کو دور کرتی ہے۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ نماز کا برائیوں سے روکنا بطور اقتضاء ہو، یعنی نماز کی ہر ایک ہیئت اور اس کا ہر ایک ذکر مقتضی ہے کہ جو انسان ابھی ابھی بارگاہ الٰہی میں اپنی بندگی، فرمانبرداری، خضوع وتذلل، اور حق تعالٰی کی ربوبیت، الوہیت اور حکومت وشہنشاہی کا اظہار واقرار کر کے آیا ہے، مسجد سے باہر آ کر بھی بدعہدی اور شرارت نہ کرے اور اس شہنشاہ مطلق کے احکام سے منحرف نہ ہو۔ گویا نماز کی ہر ایک ادا نمازی کو پانچ وقت حکم دیتی ہے کہ بندگی اور غلامی کا دعویٰ کرنے والے واقعی بندوں اور غلاموں کی طرح رہے۔ اور بزبان

حال مطالبہ کرتی ہے کہ بے حیائی اور شرارت وسرکشی سے باز آئے۔اب کوئی باز آئے یا نہ آئے مگر نماز بلاشبہ اسے روکتی اور منع کرتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ خود روکتا اور منع فرماتا ہے۔(تفسیر عثمانی)

نماز میں تین صفات:

امام ابوالعالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نماز میں تین صفات پائی جاتی ہیں: (۱) خلوص (۲) خشیت (۳) ذکر اللہ۔

اخلاص نمازی کو نیکی پر آمادہ کرتا ہے۔خشیت اسے برائیوں سے روکتی ہے اور ذکر جو کہ قرآن ہے وہ اسے نیکی کا حکم بھی دیتا ہے اور منکرات سے بھی روکتا ہے۔جس نماز میں ان تینوں میں سے کوئی صفت بھی نہ پائی جائے وہ حقیقت میں نماز ہی نہیں۔(خلاصۃ القرآن)

تین نجات دہندہ اشیاء

امام ابن جریرؒ نے روایت بیان کی ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کہیں جارہے تھے کہ راستے میں حضرت معاذؓ بیٹھے ہوئے ملے۔آپ نے حضرت معاذؓ سے پوچھا: **ماقوام هذه الامة** یعنی اس امت کا ڈھانچہ کیا ہے جس پر درستگی قائم ہوتی ہے؟ تو انہوں نے کہا امت کا قوام تین چیزوں پر ہے۔اور فرمایا: **هن منجيات** یہ تین چیزیں نجات دلانے والی ہیں۔ فرمایا پہلی چیز اخلاص ہے۔

فرمایا: دوسری نجات دہندہ چیز نماز ہے جس پر ملت کا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے اللہ کے ساتھ تعلق کی درستگی نماز پر موقوف ہے۔

اور فرمایا: تیسری چیز اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت ہے۔اطاعت عصمت ہے، جس کے ذریعے انسان کفر، شرک، نفاق، الحاد اور معاصی سے محفوظ ہوجاتے ہیں، تو فرمایا ان تین چیزوں پر امت کا قوام یعنی ڈھانچہ قائم ہوتا ہے۔(معالم العرفان: ۱۴/ ۸۰۶)

ایک حدیث شریف میں ہے کہ جس کی نماز نے اسے برے اور نجس کاموں سے نہ روکا اس کو اس کی نماز نے اللہ سے اور زیادہ دور کر دیا۔ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ اس شخص کی کوئی نماز نہیں ہے جس نے نماز کی اطاعت نہ کی اور نماز کی اطاعت یہ ہے کہ آدمی فحش ومنکرات سے رک جائے۔ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے جسے اس کی نماز نے فحش اور برے کاموں سے نہ روکا اس کی نماز، نماز نہیں ہے۔حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ اس کی نماز قبول ہوئی ہے یا نہیں اسے دیکھنا چاہئے کہ اس کی نماز نے اسے فحش اور منکرات سے کہاں تک روکا۔اگر نماز کے پڑھنے سے وہ برائیوں سے رک گیا تو اس کی نماز قبول ہوئی۔(درس قرآن)

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ فلاں شخص رات میں نماز پڑھتا ہے اور دن میں چوری کرتا ہے اور برے کام کرتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا عنقریب نماز اس کو اس چیز سے روک دے گی جو تو کہہ رہا ہے، چنانچہ کچھ روز نہ گذرے تھے کہ اس شخص نے توبہ کی اور اس کا حال درست ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

کہ میں نے تم سے کہا نہ تھا۔ (دیکھو تفسیر قرطبی)

نماز مسجد تک محدود:

کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو نماز بھی پڑھتے ہیں، جھوٹ بھی بولتے ہیں، وعدہ خلافی بھی کرتے ہیں، ظلم اور لوٹ کھسوٹ کا بازار بھی گرم رکھتے ہیں، بے پردگی، بدنظری اور فحاشی میں بھی ملوث ہیں، ان کی گھر، بازار اور دکان کی زندگی دیکھ کر پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ نمازی ہیں۔ اصل میں وہ نماز اور اس کے اثرات کو مسجد تک محدود رکھتے ہیں اور اپنی انفرادی، معاشرتی، اجتماعی، تجارتی، سیاسی اور اخلاقی زندگی کو نماز سے بالکل الگ تھلک رکھتے ہیں۔

اہل کتاب کے ساتھ مجادلہ:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿٤٦﴾

اہل کتاب اور مشرک لوگ اسلام اور پیغمبر اسلام پر طرح طرح کے بیہودہ اعتراض کرتے تھے۔ پھر نبی کریم (علیہ السلام) کو ان کا جواب بھی دینا پڑتا تھا جس کی وجہ سے بحث مباحثہ بعض اوقات طول پکڑ جاتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس ضمن میں بعض ہدایات دی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے **و لا تجادلو ا اهل الكتب الا بالتی هی احسن** اے اہل ایمان! تم اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو مگر ایسے طریقے سے جو بہتر ہو۔ اہل کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ قرآن پاک سے پہلے جو آسمانی کتابیں تورات اور انجیل نازل ہوئیں ان کو ماننے والے اہل کتاب کہلاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ دونوں کتابیں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائیں جن میں ان امتوں کی راہنمائی کے لیے ٹھیک ٹھیک احکام موجود تھے مگر خود ان کے ماننے والوں نے بعد میں ان کتابوں میں تحریف کر کے ان میں تغیر و تبدل پیدا کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مبارک تک اگرچہ یہ کتابیں اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی تھیں، پھر بھی ان میں بعض باتیں محفوظ رہ گئی تھیں اور وہ قرآن پاک سے مطابقت رکھتی تھیں۔ اس سلسلے میں اکثر بحث و تمحیص ہوتی رہتی تھی۔ اللہ نے مشرکین کے ساتھ بھی بحث مباحثہ کی اجازت دی ہے مگر ان کے دین کی تو جڑ اور بنیاد ہی غلط تھی۔ ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب کسی صورت میں بھی موجود نہیں تھی۔ البتہ اہل کتاب کے پاس چونکہ آسمانی کتابیں موجود تھیں اگرچہ وہ تحریف شدہ تھیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ بحث کرنے میں احتیاط سے کام لینے کا حکم دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان کی کسی صحیح بات کا بھی انکار کر بیٹھو یا کسی غلط بات کو تسلیم کر لو۔ (معالم العرفان: ١٤/ ٧١٢)

مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تبلیغ کے سلسلہ میں مواقع مباحثہ و مناظرہ کے بھی آئیں گے۔ کتابی مذہب والوں یعنی جو توحید و سلسلہ نبوت کے قائل ہیں ان سے مباحثہ کے وقت ہمیشہ نرمی، تہذیب اور ان کی دلجوئی سے کام لیتے رہو کہ اس سے انہیں ترغیب اسلام میں داخل ہونے کی ہوتی رہے گی۔ ہاں البتہ ان میں جو بدزبان ہوں انہیں حسب مصلحت ان کے رنگ میں بھی جواب دیا جا سکتا ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا، اس میں دلالت ہے کہ مخالف کے ساتھ اول نرمی برتے اور جب عناد ظاہر ہو تو خشونت کی اجازت ہے۔ چنانچہ یہی طریقہ ہے اہل اللہ کا مخالفین کے ساتھ۔ البتہ طالبین کے ساتھ طرز دوسرا ہے۔ یعنی ان کے ساتھ نرمی کی جائے جب تک عذر جہل باقی ہے۔ اور جب یہ عذر نہ رہے تو پھر سختی کی جائے۔ اور یہی معاملہ تھا رسول اللہ ﷺ کا صحابہ کے ساتھ۔ (ماجدی: ٥/٢١٦)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت:

اہل کتاب اور مشرکین جو ایمان لانے کی بجائے طرح طرح کی نشانیاں طلب کرتے تھے۔ اللہ نے اپنے نبی سے فرمایا کہ آپ صاف صاف کہہ دیں کہ میرا کام تو کھول کر ڈر سنانا ہے۔ نشانیاں پیش کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے وہ جب چاہے کوئی نشانی ظاہر کر دیتا ہے، اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی علامات میں سے ایک واضح علامت یہ ذکر کی کہ حضور اکرم ﷺ امی تھے یعنی نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ پڑھنا جانتے تھے اور یہ آپ کی صداقت کی، قرآن کریم کی حقانیت کی اور دین اسلام کی سچائی کی بہت بڑی دلیل ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿٤٨﴾

اس آیت میں اس کی حکمت بیان کی گئی ہے کہ امی ہونے کے باوجود جب آپ کی زبان مبارک سے قرآن کریم جاری ہوا تو یہ بذات خود ایک عظیم معجزہ ہے کہ جس شخص نے نہ لکھنا سیکھا نہ پڑھنا سیکھا وہ ایسا فصیح و بلیغ کلام پیش کر رہا ہے، جس کی مثال پیش کرنے سے پورا عرب عاجز ہو گیا۔ اس آیت میں قرآن کریم نے فرمایا اگر آپ پڑھنا لکھنا جانتے تو باطل والے اس میں میخ نکال سکتے تھے یعنی یہ کہنے کا کچھ نہ کچھ موقع مل جاتا کہ آپ نے یہ مضامین کہیں سے پڑھ کر جمع کر لئے ہیں۔

منکرین کے اعتراض کا جواب:

اس واضح اور زندہ دلیل کے باوجود منکرین اعتراض کرتے تھے کہ ہم جن معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں وہ آپ کے ہاتھوں کیوں نہیں ظاہر ہوتے، اللہ فرماتے ہیں کہ

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٥١﴾

کیا قرآن کا معجزہ ان کے لیے کافی نہیں ہے؟ جس کی نظیر پیش کرنے سے ان کے فصحاء اور بلغاء عاجز آ گئے ہیں۔

ان کی جہالت کا حال:

قرآن تو معجزوں کا معجزہ ہے، اس کی موجودگی میں کسی دوسرے معجزہ کا مطالبہ عناد اور جہالت کے سوا کچھ نہیں۔ ان کی جہالت کا تو یہ حال ہے کہ بسا اوقات وہ خود عذاب کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ (٥٣-٥٤)

قرآن کے سائنسی انکشافات:

قرآن کل بھی معجزہ تھا، آج بھی معجزہ ہے لیکن قرآن نے جو علمی اور سائنسی انکشافات کیے تھے، عرب کے بدو اور عجم

کے دانشوران کے سمجھنے سے قاصر تھے مگر آج کا انسان انہیں آسانی سے سمجھ سکتا ہے، اس لیے ناچیز کی رائے یہ ہے کہ انسانی معلومات اور تحقیقات میں جوں جوں اضافہ ہوتا جائے گا، قرآن کریم کی اعجازی شان اتنی ہی نمایاں ہوتی جائے گی۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کا معجزہ ہونا کل کے مقابلے میں آج زیادہ واضح ہے اور آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے، ہوسکتا ہے کل کے عربوں کو تو قرآن کا معجزہ ہونا آسانی سے سمجھ میں آ جاتا ہو مگر عجمیوں کو کچھ مشکل پیش آتی ہو، مگر اشاعت علم کے اس دور میں کیا عرب اور کیا عجم، کیا ہندی اور کیا یورپی، ہر شخص اس کے اعجاز کا اعتراف کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے، شرط صرف یہ ہے کہ وہ اسے پڑھے اور اس میں غور وتدبر کرے۔

ہجرت میں فقر سے ڈر:

معاندین کا حال بیان کرنے کے بعد متقین کا تذکرہ کیا گیا ہے اور انہیں رب العزت نے ہجرت اور دین کی راہ میں آنے والے مصائب پر صبر کی تلقین کی ہے۔ (۵۲۔۵۹)

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

جب کفار مکہ مسلمانوں کی ایذا رسانی پر تل گئے اور مسلمانوں کو احکام اسلام بجالانا دشوار ہوگیا تو حکم نازل ہوا کہ مسلمان مکہ سے ہجرت کر جائیں اور جہاں ارکان اسلام آزادی کے ساتھ ادا کرسکیں وہاں چلے جائیں، کافروں کی زمین میں کافروں کے ساتھ رہنا درست نہیں چنانچہ صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے اول حبشہ کی طرف ہجرت کی، پھر بعد چندے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، زجاجؒ کہتے کہ جس جگہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت نماز روزہ ممکن نہ ہو یا جس جگہ علی الاعلان اللہ تعالیٰ کی معصیت ہونے لگے اور اس کا متغیر کرنا ممکن نہ ہو وہاں سے ہجرت واجب ہے ورنہ مستحب ہے اور چونکہ ترک وطن اور ہجرت اور خویش واقارب سے مفارقت ابتلا عظیم ہے اور بہت بھاری چیز ہے، اس لئے مہاجرین کی تسلی کے لئے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، یہ دنیا فانی ہے **کل نفس ذائقة الموت** ہر شخص کو ایک دن موت کا مزہ چکھنا ہے، فرض کرو کہ آج ہجرت نہ کی تو ایک نہ ایک روز اس دنیا سے ہجرت کرنا ضروری ہے اور اس دنیا کو چھوڑنا ہے، اگر خدا کے لئے تم وطن اور خویش واقارب کو چھوڑوگے وہ تم کو اس کے بدلہ میں اس سے بہتر عطا کرے گا، رزق کسی مکان کے ساتھ مخصوص نہیں، چوپاؤں سے عبرت حاصل کرو کہ وہ بھی تو اپنی روزی ساتھ لئے نہیں پھرتے مگر اللہ تعالیٰ ان کو روزی پہنچاتا ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۶/ ۱۲۴)

ارشاد فرمایا:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۰﴾

جو اللہ کمزور جانوروں کو رزق دیتا ہے وہی تمہیں بھی دے گا، اس لیے ہجرت کی صورت میں تمہیں فقر سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

ابن ابی حاتمؒ کے حوالے سے امام ابن کثیرؒ، امام بغویؒ اور بعض دوسرے مفسرین نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ بیان

نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں حضور ﷺ کے ہمراہ ایک باغ میں داخل ہوا۔ آپ نے اس باغ میں سے کھجوریں تناول فرمانا شروع کیں اور مجھے بھی کھانے کی دعوت دی، میں نے عرض کیا: لا اشتھی حضرت! مجھے تو بھوک نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا لکنی اشتھی کہ مجھے اس وقت کھانے کی خواہش ہے کیونکہ آج چوتھا دن ہے کہ میں نے کچھ نہیں کھایا۔ پھر فرمایا: اے ابن عمرؓ! اگر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں تو وہ مجھے قیصر وکسریٰ سے زیادہ خزانے عطا کردے، مگر میں یہ نہیں چاہتا، میں تو اس چیز کو پسند کرتا ہوں کہ اشبع یوماً و اجوع یوماً کہ ایک دن پیٹ بھر کر کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں، جب کھانے کو مل جائے گا تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں گا اور نہیں ملے گا تو صبر کروں گا کہ اس پر مجھے اجر ملے گا۔ فرمایا، اس وقت کیا حال ہوگا جب لوگ سال بھر کے لیے اناج وغیرہ ذخیرہ کر کے رکھیں گے۔ یعنی لوگوں کا یقین اتنا کمزور ہوجائے گا، ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ابھی ہم اسی باغ میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہی آیت نازل فرمائی۔

یہ آیت کریمہ خاندانی منصوبہ بندی کے نظریہ کو بھی باطل قرار دیتی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جانداروں کے لیے روزی کی کمی نہیں بلکہ کار پردازان اقتدار اس کی تقسیم غلط طریقے سے کررہے ہیں، اگر خوراک کی تقسیم کا نظام درست ہوجائے تو کوئی آدمی بھوکا نہ رہے۔

پھر ارض وسماء کی تخلیق اور شمس وقمر کی تسخیر کے متعلق فرمایا کہ یہ سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے۔ یہ چیزیں تو محض اسباب ہیں وگرنہ حقیقی روزی رساں تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، وہ اپنی حکمت اور مصلحت کے مطابق کسی کی روزی کشادہ کردیتا ہے اور کسی کی تنگ کردیتا ہے۔ پھر اللہ نے بارش کے نزول کی طرف توجہ دلائی کہ آسمان کی طرف سے پانی برسا کر خشک زمین کو زندہ کرنا بھی اسی کا کام ہے، فرمایا اس بات کو سب کافر اور مشرک بھی تسلیم کرتے ہیں مگر اس کے باوجود اللہ کی وحدانیت کو نہیں مانتے بلکہ اس کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔ فرمایا یہ لوگ عقل سے کام کیوں نہیں لیتے؟ (معالم العرفان: ۱۴/ ۷۳۰-۷۳۹)

عالم آخرت ہی اصل زندگی ہے:

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾

یعنی جس طرح کھیل کود میں کچھ دیر تو مزہ آتا ہے، مگر وہ کوئی پائیدار چیز نہیں ہے، ذرا دیر گذرنے کے بعد سارا تماشا ختم ہوجاتا ہے، اسی طرح دنیا کی لذتیں بھی ناپائیدار ہیں، اور کچھ ہی عرصے میں سب ختم ہوجائیں گی۔ اس کے برخلاف آخرت کی زندگی ہمیشہ کے لیے ہے، اس لیے اس کی لذتیں اور نعمتیں سدا بہار ہیں۔ اس لیے اصل زندگی آخرت ہی کی زندگی ہے۔ (توضیح القرآن)

آخری آیت میں پوری سورت کا خلاصہ:

کہا جاسکتا ہے کہ اس سورت کی آخری آیت میں پوری سورت کا خلاصہ اللہ تعالیٰ نے بیان کردیا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾

یہ ان لوگوں کے لئے بڑی عظیم خوشخبری ہے جو اللہ تعالی کے دین پر خود چلنے اور دوسروں کو چلانے کی کوشش کرتے ہیں، جب تک انسان اس راستے میں کوشش جاری رکھے اور مایوس ہو کر نہ بیٹھ جائے، اللہ تعالی کا وعدہ ہے کہ وہ اس کی مدد فرما کر ضرور منزل تک پہنچا دیں گے، لہذا راستے کی مشکلات سے ہار مان کر بیٹھنے کے بجائے نئے عزم وہمت کے ساتھ یہ کوشش ہمیشہ جاری رہنی چاہئے، اللہ تعالی ہم سب کو اس کی مکمل توفیق عطا فرمائیں، آمین۔ (خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم، توضیح القرآن)

خلاصہ رکوع : ٥......معاندین حق کی پروا نہ کریں اور تعلق باللہ کو بذریعہ قرآن مضبوط سے اضبط بنالیں۔ ماخذ: آیت: ٤٥۔

خلاصہ رکوع : ٦...... جہاد فی سبیل اللہ کے لئے اگر ہجرت کی ضرورت پیش آئے تو ہجرت کرنی ہوگی۔ ماخذ: آیت: ٥٦۔

خلاصہ رکوع : ٧......اعادہ دعویٰ بطور نتیجہ (یعنی مسلمان جہاد کریں گے، اور جہاد سے کامیابی ہوگی)۔ ماخذ: آیت: ٦٩۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الروم

یہ قرآن کریم کی ٣٠ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ٨٤ نمبر پر ہے، اس میں چھ رکوع، ٦٠ آیت، ٨٢٧ کلمات اور ٣٥٤٧ حروف ہیں۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

ربط:

سورۂ روم کا سورۂ عنکبوت کے ساتھ ربط یہ ہے کہ سورۂ روم میں یہ مضامین ہیں۔ اول بعض واقعات جو مسلمانوں کے خوش ہونے کا سبب ہیں ان کی پیشین گوئی اور موت کے اوپر دلاسہ کا ذکر ہے، پہلی سورۃ میں کفار کی ایذا رسانی سے جو مسلمانوں کو رنج ہوتا تھا اس پر مجاہدہ وتحمل کی فضیلت مذکور تھی لہذا اس سورۃ میں اس رنج کا ازالہ فرمایا گیا۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی پہلی آیت میں غلبت الروم کے الفاظ آئے ہیں چونکہ اس سورۃ میں سلطنت روم کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے بطور علامت اس سورۃ کا نام ہی سورۃ روم مقرر رہا۔

زمانہ نزول:

جس زمانہ میں یہ سورۃ نازل ہوئی اس زمانہ کی دو بڑی بھاری سلطنتیں فارس اور روم مدت دراز سے آپس میں ٹکراتی چلی آتی تھیں، شام، فلسطین، ایشیائے کوچک یہ رومی سلطنت میں شامل تھے اور یہ حکومت عیسائیوں کے قبضہ میں تھی، اہل

فارس آتش پرست مجوسی مذہب کے پیروکار تھے ان دونوں سلطنتوں میں ۶۰۲ء سے لے کر ۶۱۵ء تک لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ ۵۷۰ء میں ہوئی اور ۶۱۰ء میں آپ کی بعثت ہوئی، مکہ والوں میں روم وفارس کی جنگ کی خبریں پہنچتی رہتی تھیں اسی دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت اور دین اسلام کی تبلیغ نے مکہ کے لوگوں کے لئے ان جنگی خبروں میں ایک خاص دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ فارس کے آتش پرست مجوسیوں کو مشرکین مکہ اپنے نزدیک سمجھتے تھے اور روم کے عیسائی اہل کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے قریبی دوست سمجھے جاتے تھے، جب فارس یعنی مجوسیوں کے غلبہ کی خبر آتی تو مشرکین مکہ خوش ہوتے اور اس سے مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے غلبہ کی فال لیتے، مسلمانوں کو اس بات سے صدمہ ہوتا تھا کہ اہل کتاب مجوسیوں سے مغلوب ہوں، بالآخر ۶۱۴ء کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو ۵ سال گزر چکے تھے فارس نے روم کو ایک مہلک اور فیصلہ کن شکست دی۔ شام، مصر، ایشیائے کوچک وغیرہ سب ممالک رومی عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ سب سے مقدس کلیسا برباد کر دیا گیا۔ بیت المقدس پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے مسیحی دنیا پر قیامت برپا کر دی۔ ۹۰ ہزار عیسائی قتل کئے گئے، تمام بڑے بڑے گرجوں کو مسمار کر دیا گیا، اس فتح کا نشہ خسرو پرویز شاہ فارس پر چڑھا ہوا تھا، جس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے کہ جو اس نے بیت المقدس سے ہرقل نامی بادشاہ روم کو لکھا تھا کہ ’’سب خداؤں سے بڑے خدا شام کی روئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام! تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے، کیوں نہ تیرے رب نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچالیا؟ یہ اس مغرور خسرو پرویز کسری ایران کا خط تھا جو اس وقت تقریباً نصف مشرقی دنیا کا شہنشاہ تھا، بہرحال بیت المقدس کی فتح کے بعد قیصر روم کا اقتدار بالکل فنا ہو گیا تھا۔ اور بظاہر کوئی صورت روم کے ابھرنے اور ایرانیوں کے تسلط سے نکلنے کی باقی نہ رہی۔ اس وقت سلطنت روم پر فارس کے غلبہ کا چرچا ہر زبان پر تھا، یہ حالات دیکھ کر مشرکین مکہ نے بھی خوب خوشیاں منائیں اور مسلمانوں کو چھیڑنا اور طعنہ دینا شروع کیا۔ کہ دیکھو فارس کے آتش پرست فتح پا رہے ہیں اور وحی و رسالت کے ماننے والے عیسائی شکست پر شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اسی طرح ہم عرب کے بت پرست بھی تمہارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے۔ حتی کہ بعض مشرکین نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آج ہمارے بھائی فارسی مجوسیوں نے تمہارے بھائی رومیوں کو مٹا دیا ہے، کل ہم بھی تمہیں اس طرح مٹا ڈالیں گے ان حالات میں قرآن کریم کی یہ سورت نازل ہوئی اور ظاہری اسباب کے بالکل خلاف اعلان کر دیا کہ بیشک اس وقت رومی فارس سے مغلوب ہو گئے لیکن ۹ سال کے اندر اندر پھر وہ غالب اور منصور ہوں گے، اسی قرآنی پیشین گوئی کی بنا پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بعض مشرکین سے شرط باندھ لی، چونکہ اس وقت تک اسلام میں ایسی شرط لگانا حرام نہیں ہوا تھا کہ اگر اتنے سال تک رومی غالب نہ ہوئے تو میں ۱۰۰ / اونٹ تمہیں دوں گا ورنہ اس قدر اونٹ تم مجھ کو دو گے، ادھر ہرقل قیصر روم نے اپنے زائل شدہ اقتدار کو واپس لینے کا تہیہ کر لیا اور منت مانی کہ اگر اللہ نے مجھ کو ایرانیوں پر فتح دے دی تو میں پیدل چل کر بیت

المقدس تک پہنچوں گا، خدا کی قدرت قرآنی پیشین گوئی کے مطابق ٹھیک ۹ سال کے اندر یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ سے ہجرت فرمانے کے ایک سال بعد عین معرکہ بدر کے دن جب کہ مسلمانوں کو مشرکین مکہ پر نمایاں فتح ونصرت حاصل ہوئی اور مسلمان خوشیاں منا رہے تھے، اسی دن یہ خبر سن کر اور زیادہ مسرور ہوئے کہ رومی اہل کتاب کو خدائے تعالی نے ایران کے مجوسیوں پر غالب فرمایا، قرآن کریم کی اسی عظیم الشان پیشین گوئی کی صداقت کا مشاہدہ کر کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مشرکین مکہ سے سو اونٹ لئے جن کے متعلق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب صدقہ کر دیئے جائیں۔''

خلاصہ مضامین سورۃ:

دوسری مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ میں بھی عقائد کے متعلق یعنی توحید و رسالت کا اثبات، شرک کی مذمت، قیامت، آخرت، حشر ونشر، جزا وسزا، جنت وجہنم، بداعمالیوں کے نتائج، اللہ کی قدرت ونشانیوں کا ذکر، قرآن کا مثل باران رحمت ہونا ذکر فرمایا گیا ہے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

جو شخص اللہ کی موجودگی اور حضوری کا ثبوت چاہے تو اس کے دو طریقے ہیں:

(۱) قرآن شریف، جس میں غور کیا جائے۔ (۲) کائنات کی نشانیوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس میں غور کریں تو واضح ہو جائے گا کہ اتنی بڑی کائنات کو چلانے والا کوئی ہے؛ ورنہ وہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر تباہ ہو جاتے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ سورج اپنے وقت سے پہلے طلوع ہوا ہو یا طے شدہ وقت سے پہلے ڈوب گیا ہو، اسی طرح اتنا بڑا آسمان بغیر ستونوں کے کھڑا ہے، یہی وجہ ہے کہ سورہ میں لفظ آیت (علامات) تقریباً ۱۴ بار آیا ہے۔

آیت نمبر ۳۹ میں معیشت کو بچانے کا علاج بتایا ہے کہ آپ سودی لین دین نہ کریں، بظاہر سود سے آمدنی میں اضافہ ہوتا دکھائی دے رہا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ معیشت ڈوب رہی ہے، جس کا ہم آج کل سامنا کر رہے ہیں، دن بہ دن دیوالیہ پن کی خبریں آرہی ہیں اور زکوۃ سے مال میں اضافہ ہوتا ہے؛ لیکن بظاہر اس میں سامان کم ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔

سورہ میں پیش کردہ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہے، وہ ہر چیز سے واقف ہے، اس لیے دنیا کی چمک دمک پر اعتماد کر کر پوری زندگی کی پونجی داو پر نہ لگانی چاہیے، وہ سب سے بڑی بھول ہوگی اگر ایسا کیا تو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسہ رکھنا چاہیے۔

جو ایمان کی دولت سے محروم ہیں ان کی پوری کوشش اور علم حاصل کرنا فقط دنیا کے لیے ہوتا ہے، انہوں نے دنیا کو ہی طلب علم کی انتہاء سمجھی ہے، دیکھا جائے تو آخرت بہت بڑی ہے؛ لیکن لوگ نہ اس کو جانتے ہیں اور نہ جاننا چاہتے ہیں۔ (۷)

اللہ پاک قادر مطلق ہے، اس نے یہ بتانے کے لیے ایک مثال دی کہ میں غیر جاندار (مرغی سے انڈے) اور بے

جان (منی سے انسان) سے جاندار پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔

عام آدمی کی بھی سمجھ میں آجائے ایسی مثال دے کر سمجھا دیا کہ میرا کوئی ساتھی نہیں، جس طرح غلام کا اپنے آقا کے مال میں کوئی حصہ نہیں، اسی طرح غلام اپنے مالک کے حقوق اور جائیداد میں کیسے حصہ دار ہوسکتا ہے؟(۲۹)

اللہ تعالیٰ نے جو حق اور انصاف قبول کرنے کی صلاحیت دی ہے اس کو تبدیل نہیں کرنا چاہیے، جیسا کہ سورج، چاند، سمندر وغیرہ اللہ کے مقرر کردہ کام کے خلاف نہیں کرتے، اسی طرح انسان کو بھی فطرت کے خلاف نہ کرنا چاہئے۔

دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو جسم دیا ہے اس کی ساخت میں تبدیلی جائز نہیں؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بھی کام حکمت سے خالی نہیں ہے۔

مشکل کے وقت اللہ کو یاد کرنا اور آسانی کے وقت اللہ کو بھول جانا عام آدمی کی عادت ہے۔ یہ بطور تنبیہ کہا کہ تم میں تو یہ کمی نہیں؟ اس لیے سب کو اپنے اوپر نظر رکھنی چاہیے، میں اپنے مالک کو تو نہیں بھول گیا۔

اس سورت سے واضح ہوتا ہے کہ ہر دور میں اللہ پاک کی سنت رہی ہے کہ باطل پر حق کو فتح کیا۔ (۴۷)) اگر کسی موقع پر ایسا ہو جائے کہ حق کو شکست ہو گئی ہے، تو خود اپنے سینہ میں جھانکے کہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ حق کے دعویداروں نے ایسے رواج کو ترویج دے رکھا ہے جو باطل کے ہیں یا باطل پرستوں نے حق کے کچھ اصول اپنا لیے ہوں؟ (خواطر قرآنیہ، قرآن سارانس گجراتی)

حزب الرحمٰن، حزب الشیطان:

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ﴿۱۴﴾

سورۂ روم اس معرکہ کی حقیقت بتاتی ہے جو حزب الرحمٰن (رحمٰن کی جماعت) اور حزب الشیطان (شیطان کی جماعت) کے درمیان قدیم زمانہ سے جاری ہے، کفر و ایمان اور حق و باطل کے درمیان میں معرکہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ فیصلہ کا دن نہیں آجاتا، اس دن نہ صرف یہ کہ یہ معرکہ ختم ہوجائے گا بلکہ دونوں جماعتوں کو بھی الگ الگ ٹھکانوں پر پہنچادیا جائے گا۔ ارشاد باری تعالی ہے:

”جس دن قیامت برپا ہوگی وہ الگ الگ فرقے ہوجائیں گے۔“

◇ اہل ایمان کو جنت میں جگہ دی جائے گی۔

◇ اور کافروں کو عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔

پانچ نمازوں کے اوقات کا ذکر:

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ﴿۱۷﴾

سورہ روم کی آیت نمبر ۱۷ اور ۱۸ میں پانچ نمازوں کے اوقات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما

سے پوچھا گیا کہ قرآن کریم میں پانچوں نمازوں کا ذکر ہے؟ تو آپ نے فرمایا ہاں اور پھر یہی آیات تلاوت فرمائیں۔

ابوداود اور طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں آیتوں کے متعلق ارشاد فرمایا:

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾

کہ جس شخص نے صبح کے وقت یہ کلمات پڑھ لئے تو دن بھر اس کے عمل میں جو کوتاہی ہوگی وہ ان کلمات کی برکت سے پوری کر دی جائے گی اور جس نے رات کے وقت یہ کلمات پڑھ لئے تو اس کے رات کے اعمال کی کوتاہی اس کے ذریعے پوری کر دی جائے گی۔ (معارف القرآن)

اللہ تعالیٰ کے وجود اور عظمت وجلال کے دلائل:

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾.......... الیٰ..........وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ۭ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾

اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں اپنے وجود اور عظمت وجلال کے سات دلائل ذکر فرمائے ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ ایک چیز کو اس کی ضد سے پیدا کرتا ہے۔

زندہ اور مردہ ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن وہ اپنی قدرت کاملہ سے نطفہ سے زندہ انسان، انڈے سے بچہ، بیج سے درخت اور اس کے برعکس بھی پیدا کرتا ہے۔ (۱۹)

(۲) انسان جیسے اشرف المخلوقات اور حاکم کائنات کو مٹی سے پیدا کیا جو عناصر اربعہ ''آگ، پانی، ہوا اور مٹی'' کا مجموعہ ہے۔ ان میں مٹی سب سے زیادہ ادنیٰ درجہ کا عنصر ہے۔ انسان کی تخلیق کا مادہ مٹی ہونا حضرت آدم علیہ السلام کے اعتبار سے تو ظاہر ہے اور باقی انسانوں کے اعتبار سے اس طرح کہ اس کی غذائی اور جسمانی ضروریات مٹی سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ (۲۰)

(۳) انسان ہی کی جنس میں اللہ تعالیٰ نے عورتیں پیدا کیں اور ان کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ قائم فرمایا اور پھر ان میں بے مثال محبت پیدا کر دی، حالانکہ بعض اوقات شادی سے پہلے ان کا آپس میں کوئی تعلق اور تعارف ہی نہیں ہوتا۔

(۴) انسانوں کے مختلف طبقات کی زبانیں اور لب ولہجے اور رنگ مختلف بنا دئے، کوئی عربی اور اردو بول رہا ہے تو کسی کی زبان فارسی، فرانسیسی یا انگریزی ہے، کسی کا رنگ کالا ہے اور کسی کا سرخ ہے۔ (۲۲)

(۵) رات اور دن کی تقسیم فرما دی کہ رات کے وقت آرام کرو اور دن کے وقت اللہ کے فضل کو یعنی رزق تلاش کرو اور

اس تقسیم پر انسان اور خالق کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا، اگر یہ کام لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا تو کچھ لوگ ایک وقت سونا چاہتے اور دوسرے لوگ اس وقت میں اپنے کام کر کے ان کی نیند خراب کرتے۔(۲۳)

(٦) آسمانی بجلی بھی اللہ کی ایک نشانی ہے کہ جب یہ چمکتی ہے تو ڈر بھی ہوتا ہے کہ کہیں گر نہ جائے اور ساتھ ہی یہ امید بھی ہوتی ہے کہ اللہ کی رحمت یعنی بارش برسنے والی ہے جس سے مردہ زمین زندہ ہوسکے گی۔(۲۴)

(۷) زمین وآسمان کے ذریعے اللہ نے جو ایک مستحکم نظام قائم کر رکھا ہے یہ بھی اللہ کی قدرت کی ایک بڑی نشانی ہے کہ آسمان کی چھت بغیر ستون کے کھڑی ہے اور ستارے اس کے مدار میں اپنے کام میں مشغول ہیں۔اسی طرح زمین بھی مسلسل حرکت میں ہے مگر ان سب کی حرکت کا کسی کو احساس ہے اور نہ ان کے کام میں ان سے کوئی شکایت۔

زمین میں معصیت کا ارتکاب:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤١﴾

لوگوں نے اپنے ہاتھوں جو کمائی کی، اس کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد پھیلا، تا کہ انہوں نے جو کام کیے ہیں اللہ ان میں سے کچھ کا مزہ انہیں چکھائے، شاید وہ باز آجائیں۔

جس شخص نے زمین میں معصیت کا ارتکاب کیا، وہ بھی فساد فی الارض کا مرتکب شمار ہوگا کیونکہ **صلاح الارض بالطاعة** زمین کی درستگی اطاعت کے ذریعے ہوتی ہے اور نافرمانی باعث فساد ہوتی ہے، اسی لئے بزرگان دین کا مقولہ ہے **اللهم انقلنى من ذلّ المعصية الى عز الطاعة** اے اللہ! ہمیں معصیت کی ذلّت سے نکال کر اطاعت کی عزت تک پہنچا۔

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ **اخلال بالشرائع** یعنی قوانین الٰہیہ کی خلاف ورزی ہی فساد فی الارض ہے۔اس کے برخلاف حضور ﷺ نے اصلاح فی الارض کے ضمن میں فرمایا **لحدّ یقام فی الارض خیر الی اھلھا من ان یمطروا اربعین صباحاً** یعنی زمین پر اللہ کی ایک حد جاری کر دینا اہل علاقہ کے لیے چالیس دن کی اس مسلسل بارش سے زیادہ بہتر ہے جو فصلوں کے لیے مفید ہو۔امام ابوحنیفہؒ بھی فرماتے ہیں **الحدود زواجر** حدود کا اجراء باعث تنبیہ ہوتا ہے۔کسی ایک مجرم پر حد جاری ہوتی ہے تو دوسروں کو تنبیہ ہوتی ہے اور وہ برائی سے باز آجاتے ہیں۔

نیک وبد کی موت:

بخاری، مسلم اور موطا امام مالک میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جب کوئی فاسق فاجر آدمی مرجاتا ہے تو بندے، شہر، درخت اور جانور اُس سے راحت پاتے ہیں، کیونکہ اس گنہگار آدمی کے گناہوں کا ان اشیاء پر منفی اثر ہوتا ہے جس کی وجہ سے رزق میں کمی آتی ہے۔

اس کے برخلاف اگر کوئی اہل ایمان نیک آدمی اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو آسمان کے وہ دروازے روتے ہیں

جہاں سے اس شخص کے اعمال اوپر جایا کرتے تھے۔ اور وہ دروازے بھی روتے ہیں جہاں سے اس کی روزی کا حکم آتا تھا۔

امام ابن کثیرؒ نے ابن زیاد کی گورنری کے زمانے کا واقعہ بیان کیا ہے کہ کسی شخص کو ایک تھیلی ملی جس میں کھجور کی گٹھلی جتنے موٹے موٹے گندم کے دانے تھے۔ اس تھیلی پر لکھا تھا کہ یہ اس زمانے کی پیداوار ہے جب زمین پر عدل وانصاف کا دور دورہ تھا۔ گویا عدل وانصاف کی اتنی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ وافر غلہ پیدا کرتا تھا۔ اسی طرح صحیح حدیث میں آتا ہے کہ مسیح (علیہ السلام) کے دوبارہ نزول پر کفر شرک مٹ جائے گا۔ دنیا میں نیکی اور اطاعت کا دور دورہ ہوگا۔ اس وقت زمین اپنی تمام برکات کو اگل دے گی۔ اور انار کا ایک دانہ سینکڑوں آدمیوں کی خوراک کے لیے کافی ہوگا۔ اس وقت فتنہ فساد ختم ہو جائے گا اور لوگ امن وسکون اور اتفاق واتحاد کی زندگی بسر کریں گے۔

مصائب کی وجوہات

مصائب وآلام دو وجہ سے آتے ہیں یا تو ان کے ذریعے سے نافرمان افراد اور قوموں کی ہلاکت مقصود ہوتی ہے یا پھر انہیں تنبیہ کرنا مطلوب ہوتا ہے تاکہ وہ نافرمانی سے باز آجائیں اور اطاعت کا راستہ اختیار کر لیں۔ قرآن پاک میں ان دونوں اسباب کا ذکر موجود ہے۔ دیکھئے مصائب تو انبیا پر بھی آئے ہیں حالانکہ وہ تو گناہ سے پاک ہوتے ہیں۔ ان کو مصائب کے ذریعے ابتلا میں ڈالا جاتا ہے تاکہ ان کے درجات بلند ہوں، ان کو تہذیب حاصل ہو، اور ان کے نفوس پاک ہو جائیں۔ عام انسانوں کو بھی تکالیف آتی ہیں تو ان کے بھی مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ (معالم العرفان: ١٤/٨٢٦)

اہل حق غالب اور مغلوب:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۝٤٧

یہ سورت بتاتی ہے کہ ہر زمانے میں اللہ کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ حق کو باطل پر غلبہ عطا کرتا ہے۔ (٤٧)

اگر کہیں اہل حق مغلوب ہوں تو انہیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔

◇ کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے باطل کے طور طریقے اپنا لیے ہوں۔

◇ اور باطل پرستوں نے حق کے بعض اصول اختیار کر لیے ہوں۔

اس سورت میں متعدد ایسے تکوینی دلائل او مشاہد مذکور ہیں جو اللہ کی عظمت وقدرت کی گواہی دیتے ہیں۔ (١٩۔٢٧ اور ٤٦-٥٠)

کفار مکہ مردوں کے مانند:

سورت کے اختتام پر ان کفار مکہ کا ذکر ہے جو مردوں کی طرح تھے، نہ تو آیات الٰہیہ کو سنتے تھے، نہ دیکھتے تھے، نہ ہی ان میں غور وفکر کرتے اور نہ ہی اثر قبول کرتے تھے، ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَىِٕنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ۝۵۸

اور ہم نے لوگوں کو سمجھانے کے لیے اس قرآن میں ہر طرح کی مثال بیان کر دی ہے اور اگر تم ان کے سامنے کوئی نشانی پیش کرو تو وہ کافر کہہ دیں گے کہ تم تو جھوٹے ہو‘‘(۵۸) (خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:......غلبہ اسلام کا اعلان، اس کے بعد دلائل غلبہ اور اصول غلبہ بتلائے جائیں گے۔

خلاصہ رکوع:۱......اعلان غلبہ اسلام۔ ماخذ: آیت:۴ (جس دن رومیوں کو فتح ایرانیوں پر ہوئی، اس دن مسلمانوں کو جنگ بدر میں کفار مکہ پر فتح ہوئی۔)

خلاصہ رکوع:۲......دلائل غلبہ۔ ماخذ: آیت:۱۱، ۱۹۔

خلاصہ رکوع:۳......دلائل غلبہ۔ ماخذ: آیت:۲۰ تا ۲۷۔

خلاصہ رکوع:۴......اصول غلبہ اور وہ آٹھ ہیں، جن کی تفصیل اس رکوع میں مذکور ہے۔ ماخذ: آیت:۳۰ تا ۳۸۔

خلاصہ رکوع :۵...... موجب فساد بر و بحر بداعمالی مخلوقات ہے، لہذا مسلمان جب غلبہ پائیں گے تو اسے مٹائیں گے۔ ماخذ: آیت:۴۱۔

خلاصہ رکوع:۶......وہ قادر مطلق جس کے قبضہ میں ضعف اور قوت کی باگیں ہیں، وہ اس خدا پرست کمزور جماعت کو طاقتور اور دشمنان خدا کی طاقت ور جماعت کو کمزور بنا سکتا ہے۔ ماخذ: آیت:۵۴۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ لقمان

یہ سورت بھی مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے بارے میں کفار مکہ کی مخالفت اپنے شباب پر تھی اور کافروں کے سردار حیلوں بہانوں اور پرتشدد کاروائیوں سے اسلام کی نشر واشاعت کا راستہ روکنے کی کوششیں کر رہے تھے، قرآن کریم کا اثر انگیز اسلوب جب لوگوں کے دلوں پر اثر انداز ہوتا تو وہ ان کی توجہ اس سے ہٹانے کے لئے انہیں قصے کہانیوں اور شعر وشاعری میں الجھانے کی کوشش کرتے تھے، جس کا تذکرہ اس سورت کے شروع (آیت نمبر:۶) میں کیا گیا ہے، حضرت لقمان اہل عرب ایک بڑے عقل مند اور دانشور کی حیثیت سے مشہور تھے، ان کی حکیمانہ باتوں کو اہل عرب بڑا وزن دیتے تھے، یہاں تک کہ شاعروں نے اپنے اشعار میں ان کا ایک حکیم کی حیثیت سے تذکرہ کیا ہے، قرآن کریم نے اس سورت میں واضح فرمایا ہے کہ لقمان جیسے حکیم اور دانشور جن کی عقل وحکمت کا تم بھی لوہا مانتے ہو وہ بھی توحید کے قائل تھے، اور انہوں نے اللہ تعالی کے ساتھ کوئی شریک ماننے کو ظلم عظیم قرار دیا تھا، اور اپنے بیٹے کو وصیت کی تھی کہ تم کبھی شرک مت کرنا، اس ضمن میں اس سورت نے ان کی اور بھی کئی قیمتی نصیحتیں ذکر فرمائی ہیں، جو انہوں

نے اپنے بیٹے کو کی تھیں، دوسری طرف مکہ مکرمہ کے مشرکین کا حال یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد کو توحید اور نیک عمل کی نصیحت تو کیا کرتے انہیں شرک پر مجبور کرتے تھے، اور اگر ان کی اولاد میں سے کوئی مسلمان ہوجاتا تو اس پر دباؤ ڈالتے تھے کہ وہ دوبارہ شرک کو اختیار کرلے، اس مناسبت سے حضرت لقمان کی نصیحتوں کے درمیان (آیات نمبر: ۱۴، ۱۵ میں) اللہ تعالی نے ایک بار پھر وہ اصول بیان فرمایا ہے جو پیچھے سورۂ عنکبوت میں بھی گزرا ہے کہ والدین کی عزت اور اطاعت اپنی جگہ لیکن اگر وہ اپنی اولاد کو شرک اختیار کرنے کے لئے دباؤ ڈالیں تو ان کا کہنا ماننا جائز نہیں، اس کے علاوہ یہ سورت توحید کے دلائل اور آخرت کی یاددہانی کے مؤثر مضامین پر مشتمل ہے۔ (توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی ۳۱ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۵۷ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۴ رکوع، ۳۴ آیات، ۵۵۴ کلمات اور ۲۲۱۷ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے دوسرے رکوع میں وہ نصیحتیں نقل کی گئی ہیں جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کی تھیں، اس مناسبت سے اس سورۃ کا نام سورہ لقمان مقرر ہوا۔

فائدہ:

اکثر علماء مفسرین کی رائے یہ ہے کہ حضرت لقمان پیغمبر نہیں تھے، ہاں ایک صالح پاکباز متقی انسان تھے جن کو حق تعالی نے اعلی درجہ کی عقل وفہم ودانائی عطاء فرمائی تھی اور آپ کی عاقلانہ نصیحتیں اور حکمت کی باتیں لوگوں میں مشہور چلی آئی ہیں، جن کا تذکرہ اہل عرب میں بھی تھا۔ چونکہ اس سورۃ میں حضرت لقمان کی نصیحتوں کا ذکر ہے اسی مناسبت سے اس سورۃ کا نام سورۂ لقمان متعین ہوا۔

ربط:

سورہ روم کے ختم پر قرآن کی تعریف مذکور ہے، اس سے سورۂ لقمان کی ابتداء ہے، باقی مضامین بھی قریب قریب ہیں۔

خلاصہ مضامین:

اس سورۃ میں اولاً اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ قرآن کریم کی باتیں حکمت کے موافق ہیں، یعنی اس کی ہر بات میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ ہر کام کا نتیجہ بہتر و درست ہو خواہ اس کی خاطر بظاہر ذاتی فائدہ ترک کرنا پڑے، اسی بناء پر قرآن کی باتوں سے اصل فائدہ وہی اٹھا سکتے ہیں جن کی طبیعت نیک کاموں کی طرف مائل ہوتی ہے اور جو انجام پر نظر رکھتے ہیں، جن کا یہ یقین ہے کہ یہ دنیا عارضی قیام کی جگہ ہے، انسان کی عمر محدود ہے اور اس دنیا کے بعد لازمی نتیجہ آخرت ہے، پھر وہ باتیں چلائی گئیں جن کا انجام اچھا نہیں ہے اور آخرت میں ان کی وجہ سے بڑے مصائب وآفات میں مبتلا ہونا لازمی ہے، ان میں اکثر چیزیں وہی ہیں جن میں فقط دنیا کی کھیل تفریح مقصود ہوتی ہے اور جن میں آج دنیا کے اکثر لوگ

مبتلا ہیں ،مثلاً فضول قصے کہانیاں، ناول، من گھڑت خیالی افسانے ،ناچ رنگ ، گانا بجانا، تھیٹر ،سینما، عالی شان مکانات ان سب کا انجام آخرت میں اچھا نہ ہوگا۔اس کے بعد وہ باتیں بتلائی گئیں جن کا انجام ہر جگہ اچھا ہوگا ،مثلاً خدا کی پہچان ،توحید کا اعتقاد، شرک سے نفرت، بری عادتوں اور بری باتوں سے اجتناب۔اس سورۃ میں حضرت لقمان کی نصیحتیں بیان فرما کر اشارہ کیا گیا کہ دنیا کے عقلمند ان باتوں کی اچھائی پر متفق ہیں جنہیں قرآن میں اچھا کہا گیا ہے اور ان باتوں کو برا جانتے ہیں جنہیں قرآن میں برا کہا گیا ہے، پھر کہا گیا کہ انسان آنکھیں کھول کر دیکھے تو اللہ کی قدرت کی نشانیاں تمام عالم میں ظاہر ہیں جن سے اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے، آخر میں قیامت کی باز پرس سے ڈرایا گیا ہے کہ قیامت آنے کا وقت اللہ ہی جانتے ہیں۔واللہ اعلم !(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

باپ- دادا کی اندھی تقلید نہیں کرنی چاہیے، بلکہ انسان کو اس راستے پر چلنا چاہیے، جو قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا ہے اور یہ سمجھا یا جائے کہ انجام اعمال کے مطابق ہوگا، قیامت میں جائیداد اور مقام و مرتبہ کی کوئی قیمت نہیں ہوگی۔

سورت کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل معجزہ (قرآن کی عظمت) سے ہوا، ساتھ ساتھ قرآن سے فائدہ اٹھانے والوں کے فضائل اور ان کی کامیابی کی بشارت دی۔اور جو لوگ حق کے راستے میں آڑے آتے ہیں ان کی مذمت بیان ہوئی۔جنت-جہنم کے حق اور اللہ پاک کی فطرت اور توحید کے چار دلائل کی تفصیل۔ (خواطر قرآنیہ)

قرآن ہدایت ورحمت کا سبب:

الٓمّٓ ۚ﴿١﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۙ﴿٢﴾ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۙ﴿٣﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ؕ﴿٤﴾

اس سورت کے شروع میں قرآن کریم کو نیک لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت کا سبب قرار دیا ہے اور نیک لوگوں کی تین علامات بیان فرمائی ہیں:

(۱) نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔(۲) زکوۃ کی ادائیگی کرتے ہیں۔(۳) آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں۔

جن لوگوں میں یہ صفات پائی جائیں ان کے بارے میں فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی طرف سے سیدھے راستے پر ہیں اور یہ ہی ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔''

نضر بن حارث کی مذمت:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٦﴾

اس آیت میں مکہ مکرمہ کے ایک مشرک نضر بن حارث کی مذمت بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ اپنی تجارت کے لئے مختلف ممالک کا سفر کرتا اور وہاں سے وہاں کے بادشاہوں کے قصوں پر مشتمل کتابیں خرید لاتا۔بعض روایات میں ہے کہ ایک

گانے والی لونڈی بھی خرید لایا تھا اور لوگوں سے کہتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہیں عاد وثمود کے قصے سناتے ہیں، میں تمہیں ان سے زیادہ دلچسپ قصے اور گانے سناؤں گا۔

اس آیت شریفہ سے ایک اصول یہ معلوم ہوا کہ ہر وہ دل بہلانے کا مشغلہ جو انسان کو اپنے دینی فرائض سے غافل اور بے پرواہ کر دے ناجائز ہے۔ کھیل اور دل بہلانے کو صرف وہ مشغلے جائز ہیں جن میں کوئی فائدہ ہو مثلاً جسمانی یا ذہنی ورزش وغیرہ اور ان مشاغل سے نہ کسی کو تکلیف پہنچے اور نہ دینی فرائض سے غفلت ہو۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

قدرت اور وحدانیت کے دلائل:

باری تعالیٰ نے اپنی قدرت اور وحدانیت کے چار دلائل ذکر فرمائے ہیں۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ⑩

◇ فلکیاتی دنیا:

پہلی دلیل یہ کہ اس نے آسمانوں کو بغیر کسی ستون کے پیدا کیا ہے حالانکہ ان میں روشن ستارے بھی ہیں، شمس وقمر بھی ہیں، سیارے اور کہکشائیں بھی ہیں۔ فلکیات کی دنیا اتنی وسیع ہے کہ یہ زمین جس پر ہم زندگی بسر کر رہے ہو؛ اس کی حیثیت اس کے مقابلے میں وہی ہے جو ایک ذرے کی پوری کائنات کے مقابلے میں حیثیت ہے۔

◇ پہاڑ:

دوسری دلیل وہ پہاڑ ہیں جنہیں زمین کا توازن برقرار رکھنے کے لیے اللہ نے گاڑ رکھا ہے۔ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو یہ زمین، ہوا اور پانی کی وجہ سے ادھر ادھر حرکت کرتی رہتی۔

◇ زمینی، فضائی اور سمندری جانور:

تیسری دلیل بے شمار قسم کے حیوانات، مویشی، چوپائے اور حشرات ہیں، ان کے علاوہ فضاؤں اور سمندر میں رہنے والے ہزاروں قسم کے جاندار ہیں جن کی شکلیں، رنگتیں اور خصوصیات تک اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

انسان کے عجز کا تو یہ حال ہے کہ وہ مکھی اور چیونٹی تک کی مثال نہیں بنا سکتا، چہ جائیکہ صاحب فہم وذکا، بولتا چلتا انسان بنا سکے۔

◇ آسمان سے بارش:

چوتھی دلیل یہ کہ وہ آسمان سے بارش برساتا ہے جس کے ذریعے ہر قسم کی نفیس چیزیں اگاتا ہے۔ (۱۰)

آسمان سے بارش کا برسنا تکوینی عجائب میں سے ایک بڑا عجوبہ اور دلائل قدرت میں سے ایک بڑی دلیل ہے، مگر انسان اس پر غور ہی نہیں کرتا۔ وہ پانی جس سے سمندر، دریا اور نہریں بھری ہوئی ہیں یہ سب آسمان ہی سے برستا ہے، پھر

اس پانی سے جو پھل، پھول، غلہ جات، جڑی بوٹیاں اور درخت اگتے ہیں، ان کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ہزاروں صفحات یقیناً کم ہوں گے۔

حضرت لقمان کی حکمت و دانائی:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ....الیٰ......................وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴿۱۹﴾

حضرت لقمان اہل عرب کے ایک بڑے عقل مند اور دانشور کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اعلیٰ درجے کی عقل وفہم و دانائی عطا فرمائی تھی، مگر اکثر مفسرین کے نزدیک وہ پیغمبر نہیں تھے۔ قرآن کریم نے یہ بتایا کہ حضرت لقمان جن کو تم بھی مانتے ہو وہ بھی توحید کے قائل تھے۔

◇ ان کے اقوال، عبرت و نصیحت کا خزانہ ہوتے تھے۔

◇ ان کا کلام درفشانی۔

◇ ان کی خاموشی تفکر۔

◇ اور ان کے ارشادات موعظت ہوتے تھے۔

◇ اللہ تعالیٰ نے ان کی وہ پانچ وصیتیں ذکر فرمائی ہیں جو انہوں نے اپنے بیٹے کو کی تھیں، یہ بڑی قیمتی اور جامع نصیحتیں ہیں جو کہ عقیدہ، عبادت، سلوک اور اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں:

نصیحت (۱): یہ ہے کہ اے بیٹے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے اور اس کا انجام تباہ کن ہے۔ اس کے بعد خود اللہ تبارک وتعالیٰ والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتے ہیں۔

نصیحت (۲): آخرت کے بارے میں ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے علم سے کوئی چیز مخفی نہیں، گناہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو اور کیسی پوشیدہ جگہ پر کیوں نہ کیا گیا ہو؛ اللہ اسے قیامت کے دن لے آئے گا۔

مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کسی انسان کا عمل اگر کسی مضبوط چٹان کے قلب میں ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے حاضر کردے گا، اور پھر جزائے عمل کے وقت اس کا شمار کیا جائے گا۔

نصیحت (۳): اللہ کی طرف توجہ کے بارے میں ہے، اللہ کی طرف توجہ کی کئی صورتیں بیان فرمائیں:

◇ نماز کو کامل طریقے سے ادا کرو۔

◇ لوگوں کو ہر خیر کی دعوت دو اور ہر شر سے منع کرو۔

◇ اور مصائب وابتلا پر صبر کرو۔

نصیحت (۴): میں اپنے بیٹے کو تکبر اور فخر سے منع فرمایا۔

نصیحت (۵): میں بیٹے کو اخلاق کریمہ کی طرف متوجہ کیا یعنی چال میں میانہ روی اختیار کرو اور بولتے وقت اپنی آواز نیچی رکھو۔(۱۹۔۱۲)

آواز آہستہ رکھنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسان اتنا آہستہ بولے کہ سننے والے کو دقت پیش آئے ، بلکہ مراد یہ ہے کہ جن کو سنانا مقصود ہے ان تک تو آواز وضاحت کے ساتھ پہنچ جائے ،لیکن اس سے زیادہ چیخ چیخ کر بولنا اسلامی آداب کے خلاف ہے، یہاں تک کہ کوئی شخص درس دے رہا ہو، یا وعظ کر رہا ہو تو اس کی آواز اتنی ہی بلند ہونی چاہئے جتنی اس کے مخاطبوں کو سننے سمجھنے کے لئے ضرورت ہے، اس سے زیادہ آواز بڑھانے کو بھی اس آیت کے تحت بزرگوں نے منع فرمایا ہے، اس حکم پر خاص طور سے ان حضرات کو غور کرنے کی ضرورت ہے جو بلاضرورت اسپیکر کا استعمال کر کے لوگوں کے لئے تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔(خلاصۃ القرآن، توضیح القرآن)

نکتہ:

یہاں آیت میں بھدی آواز کو گدھے کی آواز کے ساتھ تشبیہ دی ہے، سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں: حیوانات میں گدھے کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ ہر حیوان کی آواز اللہ کی تسبیح ہے مگر گدھے کی آواز شیطان کے دیکھنے کے سبب سے ہوتی ہے، اس وجہ سے حدیث میں آیا ہے کہ جب گدھے کی آواز سنو تو اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھو، اس لیے کہ گدھے نے شیطان کو دیکھا ہے اور بعض بزرگوں نے یہ کہا ہے کہ گدھے کا چیخنا اور چلانا گھاس اور پانی کے لیے ہوتا ہے یا شہوت جھاڑنے کے لیے ہوتا ہے، یا دوسرے گدھے سے لڑنے کے لیے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو آواز بہیمیت اور سبعیت کے سبب سے پیدا ہوگی وہ سب آوازوں سے بدتر ہوگی اور اسی وجہ سے حدیث میں گدھے کے نمازی کے سامنے سے گذرنے کو قاطع صلاۃ قرار دیا ہے۔(تفسیر ادریسی:۶/۱۸۲)

غیب کی چابیاں:

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝۳۴

سورت کے اختتام پر بتایا گیا ہے کہ پانچ چیزوں کا علم صرف اللہ کے پاس ہے:

(۱) قیامت کب آئے گی؟ (۲) بارش کہاں اور کتنی برسے گی؟ (۳) شکم مادر میں بچہ کن اوصاف کا حامل ہے؟ (۴) انسان کل کیا کرے گا؟ (۵) موت کب اور کس جگہ آئے گی؟

ان پانچ چیزوں کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ ان پانچ مغیبات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیب کی چابیاں قرار دیا ہے۔(خلاصۃ القرآن، توضیح القرآن)

موضوع سورۃ:.......اس کتاب سے فقط محسنین فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

خلاصہ رکوع:۱......نیکوکاروں کواس کتاب سے ہدایت، رحمت اور دانشمندی عطا ہوسکتی ہے۔ماخذ: آیت:۳،۲۔

خلاصہ رکوع:۲......ایک حکیم دانشمند کا طرز عمل دکھایا جاتا ہے (کہ قرآن حکیم کو جو لوگ عملی جامہ پہنائیں گے وہ ایسے ہوجائیں گے)۔ماخذ: آیت:۱۲۔

خلاصہ رکوع:۳......تذکیر بآلاء اللہ جس محسن کے یہ احسانات ہوں کیا اس کے ارشاد کی تعمیل کرنا دانشمندی نہیں؟ ماخذ : آیت:۲۰،۲۱۔

خلاصہ رکوع:۴......تذکیر بآلاء اللہ کیا اس محسن کے احکام کی تعمیل کرنا جس کے یہ احسانات ہوں دانشمندی نہیں ہے؟ ماخذ: آیت:۳۱۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ السجدۃ

اس سورت کا مرکزی موضوع اسلام کے بنیادی عقائد، یعنی توحید، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آخرت کا اثبات ہے، نیز جو کفار عرب ان عقائد کی مخالفت کرتے تھے، اس سورت میں ان کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور ان کا انجام بھی بتایا گیا ہے، چونکہ اس سورت کی آیت:۱۵ سجدے کی آیت ہے، یعنی جو شخص بھی اس کی تلاوت کرے یا سنے اس پر سجدۂ تلاوت واجب ہے، اس لئے اس کا نام تنزیل السجدہ یا الم سجدہ یا صرف سورۂ سجدہ رکھا گیا ہے۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن نماز فجر کی پہلی رکعت میں بکثرت یہ سورت پڑھا کرتے تھے، اور مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے کہ آپ رات کو سونے سے پہلے دو سورتوں کی تلاوت ضرور فرماتے تھے، ایک سورۂ تنزیل السجدہ اور دوسری سورۂ ملک۔ (توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی ۳۲ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے نمبر ۷۵ پر ہے، اس میں ۳ رکوع، ۳۰ آیات، ۳۷۴ کلمات اور ۱۵۷۰ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے دوسرے رکوع کی ۱۵ ویں آیت میں سجدہ کا مضمون آیا ہے، اس لئے اس سورۃ کا نام سورۂ سجدہ قرار دیا گیا۔

ربط:

سورۃ لقمان میں توحید و معاد کے مضامین تھے، سورۂ سجدہ کے شروع میں اثبات حقیقت قرآن سے اثبات رسالت ہے جس کی مناسبت توحید و معاد سے ظاہر ہے۔

خلاصہ مضامین:

دوسری مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ میں بھی زیادہ تر عقائد ہی کے متعلق مضامین ہیں، اس سورۃ کا خاص موضوع

توحید، آخرت ورسالت کے متعلق لوگوں کے شبہات کو دور کر کے ان تینوں حقیقتوں پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ سب سے پہلے اس سورۃ میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ قرآن مجید اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی کتاب ہے جو سارے جہانوں کو پالنے والا ہے اور ان کا محافظ ہے، اس میں شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے انسانوں کی ہدایت کے لئے نازل کی گئی ہے، جس زمانہ میں یہ سورۃ نازل ہوئی اس وقت کفار مکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آپس میں چرچے کرتے تھے کہ یہ عجیب عجیب باتیں گھڑ گھڑ کر سنا رہے ہیں۔ نعوذ باللہ مرنے کے بعد کی خبریں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مرجانے اور مٹی میں مل کر ریزہ ریزہ ہوجانے کے بعد پھر تم زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے اور جزا و سزا ہوگی، دوزخ وجنت ہوگی، کبھی کہتے ہیں کہ یہ دیوی دیوتا کوئی چیز نہیں، بس اکیلا ایک خدا ہی معبود ہے، کبھی کہتے ہیں کہ میں خدا کا رسول ہوں، آسمان سے مجھ پر وحی آتی ہے اور جو کلام میں تم کو سنا رہا ہوں، یہ رب العالمین کا کلام ہے، کفار کی ان سب باتوں کے جوابات اس سورۃ میں دیئے گئے ہیں اور ان سے کہا گیا ہے کہ قرآن جن حقائق کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے ان میں کونسی چیز تعجب کی ہے؟ آسمان اور زمین کے انتظام کو دیکھو، خود اپنی پیدائش اور بناوٹ پر غور کرو کہ یہ نظام کائنات توحید پر دلالت کر رہا ہے یا شرک پر۔ خود اپنی پیدائش پر نظر کرو کیا تمہاری عقل یہی گواہی دیتی ہے کہ جس نے اب تمہیں پیدا کر رکھا ہے وہ تمہیں دوبارہ نہ پیدا کر سکے گا؟ اس کے بعد عالم آخرت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور ایمان کے ثمرات وکفر کے نتائج بیان فرما کر یہ ترغیب دلائی گئی ہے کہ لوگ یہ انجام سامنے آنے سے پہلے کفر وشرک کو چھوڑ دیں اور قرآن کی تعلیم کو قبول کریں، کیونکہ ایمان والے بندے وہی ہیں جو کلام اللہ کی آیات سن کر اکڑفوں چھوڑ دیتے ہیں اور اللہ کے سامنے سربسجود ہوجاتے ہیں، راتوں کو اٹھ کر گڑگڑا کر روتے ہیں۔ اور عاجزی کرتے ہیں، اس سے ڈرتے بھی ہیں اور اس سے بخشش کی امید بھی رکھتے ہیں۔ نیز بتلایا گیا کہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ وہ انسانوں کے قصور پر فوراً گرفت نہیں کرتا ہے اور فیصلہ کن عذاب میں مبتلا نہیں کردیتا ہے بلکہ پہلے چھوٹی چھوٹی تکالیف اور نقصانات بھیجتا ہے؛ تاکہ انہیں تنبیہ ہو اور وہ باز آجائیں لیکن اگر ان سے انسان سبق نہ لے تو اس کے لئے آخرت کا بڑا عذاب ہے۔ اس کے بعد اثبات رسالت کے بیان میں فرمایا کہ دنیا میں یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں کہ ایک شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر خدا کی کتاب آئی ہو بلکہ اس سے پہلے موسی علیہ السلام پر بھی کتاب آئی تھی جسے تم لوگ جانتے ہو، یقین مانو کہ یہ کتاب بھی خدا ہی کی طرف سے آئی ہے اور خوب سمجھ لو کہ اب پھر وہی ہوگا جو موسی علیہ السلام کے عہد میں ہو چکا ہے، امامت، پیشوائی، بڑائی انہیں کو نصیب ہوگی جو اس کتاب الٰہی کو مان لیں گے۔ ابھی موقع ہے کہ اللہ ورسول کے کہنے پر یقین کرلو اور اس دن سے بچنے کی تیاری کرلو؛ ورنہ اس دن کے آجانے پر نہ ایمان لانا کام دے گا نہ سزا میں ڈھیل ہوگی اور نہ مہلت ملے گی کہ آئندہ چال چلن ٹھیک کر کے درست ہوجاؤ ، اس وقت کی مہلت کو غنیمت سمجھو، قیامت آنے والی ہے اور یقینا آکر رہے گی، پھر یہ کہنا فضول ہے کہ کب آئے گی اور کب فیصلہ ہوگا، ماننا ہے تو اب مان لو اور اگر اخیر فیصلہ ہی کا انتظار کرنا ہے تو پھر بیٹھے انتظار کرتے رہو۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

بندہ عاجزی اختیار کرے؛ کیونکہ سجدہ کا مطلب فرمانبردار ہونا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ اور عیدین اور فجر کی نمازوں میں سورہ سجدہ پڑھا کرتے تھے تاکہ انسان عاجزی کے ساتھ زندگی بسر کرے اور تکبر اور ظلم نہ کرے، سورہ میں موت کا ذکر ہے، جس سے آدمی سوچتا ہے کہ ایک دن مجھے اس دنیا سے رخصت ہونا ہے اور سب سے بڑی اور انصاف والی عدالت میں جا کر حساب دینا ہے، تو ایسے اعمال کرتا رہوں جس سے میں جنتی ہو جاؤں۔

آیت نمبر ۱۵ میں مومنوں کے ان صفات کا ذکر ہے جس سے تواضع و عاجزی کا احساس ہوتا ہے، بتلایا کہ جو لوگ میری نصیحتوں بھرا بیان سنتے ہیں، تو وہ صالح وعبادت گزار بن جاتے ہیں اور آخرت میں پکڑے جانے کے خوف سے اور جنت کی امید میں صبح سویرے اٹھ کر تہجد ادا کرتے ہیں۔

آیت نمبر ۲۴ میں حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بتلایا کہ جنہوں نے میری باتوں پر یقین رکھا انہیں میں نے رول ماڈل (نمونہ) بنایا۔ اور ایسے کاموں سے روکا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جا کر شرم وحیا کے ساتھ درخواست کرنی پڑے۔ اے اللہ! ہمیں کچھ وقت دیں کہ ہم نیکی کر کے آئیں، اللہ تعالیٰ انسان کو عذاب عظیم سے پہلے بیدار کرنے کے لیے دنیا میں چھوٹی بڑی مصیبتیں دیتا ہے تاکہ بندہ ہوشیار ہو جائے اور شکر گزار بن جائے۔ آدمی سے سوچنے کو کہا، کیا نافرمان اور فرمان بردار برابر ہو سکتے ہیں؟

اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجرم اور مومن کا حال ظاہر کیا؛ کیوں کہ انسان سوچے، اور نصیحت حاصل کرے کہ قیامت کے دن میرا سر جھک نہ جائے اور میں ذلیل نہ ہو جاؤں، تو خود ضمیر اس بات کی گواہی دے گا کہ اللہ پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں کامیابی ہے، اس لیے راتوں کو اٹھ کر اللہ کے سامنے روئے، اور عذاب سے ڈرے، رحمت کی امید رکھے اور مال دولت کو صحیح راہ میں خرچ کرے تو آخرت میں فلاح پائے گا۔

جنت اور دنیا کی نعمتیں صرف الفاظ میں ایک جیسی لگتی ہے ورنہ تو دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ (خواطر قرآنیہ، قرآن سارانس گجراتی)

مضامین سورت:

گزشتہ سورۃ کی طرح اس سورۃ مبارکہ میں بھی زیادہ تر بنیادی عقائد کا ہی ذکر ہے، چنانچہ اس سورۃ میں بھی توحید کے عقلی اور نقلی دلائل بیان کئے گئے ہیں، شرک کی تردید ہے۔ رسالت کا بیان ہے اور قیامت اور جزائے عمل کی بات بیان کی گئی ہے۔ جہاں تک قرآن حکیم کی حقانیت، صداقت اور اس کے وحی الٰہی ہونے کا تعلق ہے تو یہ ذکر گزشتہ سورۃ کی ابتداء میں بھی گزر چکا ہے اور اس سورۃ کی ابتداء بھی اسی موضوع سے ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے لہٰذا ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو بھی تورات جیسی عظیم کتاب عطا فرمائی تھی مگر آپ کی قوم بنی اسرائیل نے اس نعمت کا شکر ادا نہ کیا، جس کے نتیجے میں انہیں ذلت وخواری کا سامنا

کرنا پڑا۔لہٰذا اس آخری امت کا فرض ہے کہ وہ اللہ کی آخری کتاب ملنے پر اس کا شکرادا کریں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھیں، اس میں غور وفکر کریں، اس کے اصولوں کو اپنائیں اور اسے پوری زندگی کا دستور العمل بنالیں۔اتنی عظیم کتاب کی موجودگی میں بھی اگر ہم ہدایت کسی دوسری جگہ سے تلاش کریں تو یہ ہماری بہت بڑی بدقسمتی ہے۔

(معالم العرفان:۱۵/۱۲۵)

قرآن کی حقانیت:

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ؕ﴿۲﴾ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ۚ بَلۡ ہُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰىہُمۡ مِّنۡ نَّذِیۡرٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ لَعَلَّہُمۡ یَہۡتَدُوۡنَ ﴿۳﴾

سورت کی ابتدامیں قرآن کی حقانیت کا بیان ہے:

جس کا اعجاز واضح ہے،اس کی صداقت کے دلائل روشن ہیں،اس کا انداز بیان انسانی کلام سے بالکل الگ ہے لیکن اس کے باوجود کفار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تہمت لگاتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کلام خود گھڑ لیا ہے۔(۱-۳)

ایک ہزار سال کا مطلب:

یُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الۡاَرۡضِ ثُمَّ یَعۡرُجُ اِلَیۡہِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗۤ اَلۡفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ﴿۵﴾

’’پھر وہ کام ایک ایسے دن میں اس کے پاس اوپر پہنچ جاتا ہے جس کی مقدار تمہاری گنتی کے اعتبار سے ایک ہزار سال ہوتی ہے۔‘‘ ایک ہزار سال کے برابر ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اس کی صحیح تشریح تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اسے متشابہات میں بھی شمار کیا ہے، اور دوسرے مفسرین نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جن امور کا فیصلہ فرماتے ہیں، ان کی تنفیذ اپنے طے شدہ وقت پر ہوتی ہے، چنانچہ بعض امور کی تنفیذ میں انسانوں کی گنتی کے مطابق ایک ہزار سال بھی لگ جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ایک ہزار سال بھی کوئی بڑی مدت نہیں ہے، بلکہ ایک دن کے برابر ہے، چنانچہ جیسا کہ سورۂ حج: آیت ۴۷ میں فرمایا گیا ہے کہ کفار کے سامنے جب یہ کہا جاتا تھا کہ ان کے کفر کے نتیجے میں ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا یا آخرت میں عذاب آئے گا تو وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے، اور کہتے تھے کہ اتنے دن گذر گئے، لیکن کوئی عذاب نہیں آیا، اگر واقعی عذاب آنا ہے تو ابھی کیوں نہیں آجاتا؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ کر رکھا ہے وہ تو ضرور پورا ہوگا۔ رہا اس کا وقت، تو وہ اللہ تعالیٰ کی اپنی حکمت کے مطابق متعین ہوگا۔اور تم جو سمجھ رہے ہو کہ اس کے آنے میں بہت دیر ہوگئی ہے تو درحقیقت تم جس مدت کو ایک ہزار سال سمجھتے ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک دن کے برابر ہے۔(خلاصہ مضامین قرآن کریم، توضیح القرآن)

شاہ عبدالقادر دہلویؒ فرماتے ہیں کہ بڑے بڑے امور اور انتظامات سے متعلق حکم عرش سے جاری ہوتا ہے، پھر وہ نیچے کی طرف آتا ہے تو تمام حسی، معنوی، ظاہری اور باطنی اسباب جمع ہوکر اس حکم کی تعمیل میں لگ جاتے ہیں، اللہ کی مشیت

اور حکمت کے مطابق وہ حکم طویل مدت تک نافذ رہتا ہے۔ اور اس کے بعد اسے واپس لے لیا جاتا ہے اور دوسرا حکم جاری کر دیا جاتا ہے۔ اس کی مثال پیغمبروں کی بعثت ہے۔ اللہ کے جلیل القدر پیغمبروں کی تعلیم کا اثر قرنوں تک رہا۔ اس طرح بڑی بڑی قوموں اور نسلوں کی عملداری سینکڑوں اور ہزاروں سال تک چلتی رہی، غرضیکہ فرمایا کہ اس دنیا کا ایک ہزار سال اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک دن کے برابر ہے۔ (موضح القرآن)

قدرت کے دلائل:

یہ سورت اللہ کی وحدانیت اور اس کی قدرت کے دلائل بیان کرتی ہے۔

◇ یعنی آسمان اور زمین کو اسی نے پیدا کیا۔

◇ ہر کام کی تدبیر وہی کرتا ہے۔

◇ پانی کے ایک حقیر قطرے سے انسان کو اسی نے تخلیق کیا۔

انسانی تخلیق کے مراحل:

شاید انسان اپنی تخلیق کے مراحل کے بارے میں غور وفکر نہیں کرتا کہ اس نے کیسے مٹی سے پانی، نطفہ سے لوتھڑا، لوتھڑے سے بوٹی اور بوٹی سے ہڈی تک کے مراحل طے کیے، پھر کیسے انتہائی پر کشش صورت اور متناسب قد و قامت والا انسان بن گیا۔

مجرموں کا حال:

وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

مجرموں کا حال بتلایا ہے کہ

◇ مجرم قیامت کے دن سر جھکائے کھڑے ہوں گے۔

◇ ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔

◇ وہ آرزو کریں گے کہ کاش! ہمیں دنیا میں لوٹا دیا جائے تو ہم نیک اعمال کریں۔

مومنین کا حال:

اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۱۵﴾ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۫ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۱۶﴾

دوسری طرف مومنین کے بارے میں بتلایا گیا کہ

◇ وہ دنیا میں اللہ کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔

◇ راتوں کو ان کے پہلو بستر سے جدا رہتے ہیں۔

◇ وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتے بھی ہیں۔

◇ اور اس کی رحمت کی امید بھی رکھتے ہیں۔

◇ علاوہ ازیں اللہ کے دیے ہوئے اموال کو اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں۔

ان کے بارے میں فرمایا گیا:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٧﴾

”کوئی متنفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے آخرت میں آنکھوں کی کیسی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے، یہ ان اعمال کا صلہ ہے جو وہ کرتے تھے۔“ (۱۲-۱۷)

انہوں نے ریا اور دکھاوے کے بغیر چھپ چھپ کر اعمال کیے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایسی نعمتیں چھپا رکھی ہیں جو کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتی۔

آیات الٰہی سے اعراض:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ۭ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ﴿٢٢﴾

اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جس کو اپنے پروردگار کی آیتوں کے ذریعے نصیحت کی گئی، تو اس نے ان سے منہ موڑ لیا۔ہم یقیناً ایسے مجرموں سے بدلہ لے کر رہیں گے۔

امام ابن جریرؒ نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت بیان کی ہے کہ تین جرائم کی سزا اللہ تعالیٰ دنیا میں ہی دے دیتا ہے۔

(۱) حق کی مخالفت کرنا دنیا ہی میں سزا کا مستحق بنتا ہے۔آپ روزمرہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ لوگ جھنڈے اٹھا کر اور نعرے لگا لگا کر احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔اسلامی شعار کا مذاق اڑاتے ہیں حتیٰ کہ عورتیں بھی اپنے نام نہاد حقوق کے حق میں جلوس نکالتی ہیں، مسئلہ وراثت کا ہو یا گواہی کا یا نکاح اور طلاق کا، عورتوں کو اللہ کے عطا کردہ حقوق سے تسلی نہیں ہے، وہ اس دنیا کے عارضی حاکموں سے اپنے لئے مزید حقوق طلب کرتی ہیں، یہی تو حق کی مخالفت ہے جو آج سرعام ہو رہی ہے۔

(۲) دوسری چیز والدین کی نافرمانی اور ان کو ناحق تنگ کرنا ہے۔ایسے لوگ دنیا ہی میں سزا کے مستحق بن جاتے ہیں۔

(۳) جو شخص خود ظلم کرتا ہے یا ظالم کی مدد کرتا ہے، وہ بھی دنیا میں سزا پانے کا اہل بن جاتا ہے۔

الغرض! ان تین قسم کے جرائم کی سزا دنیا میں ہی مل جاتی ہے۔اسی لئے فرمایا کہ اس سے بڑا ظالم کون ہے کہ جس کے سامنے اس کے رب کی آیات ذکر کی جائیں۔اور وہ اعراض کر جائے۔اللہ ایسے مجرموں سے ضرور انتقام لے گا۔

(معالم العرفان: ۱۵/۱۵۹)

جنت کی نعمتوں کی حقیقت :

ویسے بھی جنت کی نعمتوں کی صحیح حقیقت کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔ دنیا کی نعمتیں آخرت کی نعمتوں کے ساتھ صرف لفظوں میں مشترک ہیں۔ حقیقت کے اعتبار سے ان کے درمیان زمین آسمان سے بھی کہیں زیادہ فرق ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت موسیٰؑ کی رسالت میں مشابہت :

سورت کے اختتام پر حضرت موسی علیہ السلام کو تورات دیئے جانے کا ذکر ہے جو کہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسی علیہ السلام کی رسالت میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ (خلاصۃ القرآن: م اش)

خلاصہ سورۃ السجدۃ...... دعوت الی الکتاب۔

خلاصہ رکوع: ۱...... جس قادر مطلق نے مٹی سے مختلف تغیرات دے کر تمہیں ذی سمع وبصر وافئدہ انسان بنایا، کیا اس کی ربوبیت کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ تمہاری روحانی تربیت کے لئے ہدایات بھیجے۔ ماخذ: آیت: ۲، ۷ تا ۹۔

خلاصہ رکوع: ۲...... رب العالمین کی کتاب سے استفادہ کرنے والوں اور ترک استفادہ والوں سے سلوک الٰہی۔ ماخذ: آیت: ۱۹ تا ۲۲۔

خلاصہ رکوع: ۳...... جس طرح موسی علیہ السلام کے متبعین کی ایک جماعت پیدا ہوگئی تھی، اسی طرح اب بھی ہوگا۔ ماخذ: آیت: ۲۳، ۲۴۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الاحزاب

یہ سورت حضور سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ ہجرت فرمانے کے بعد چوتھے اور پانچویں سال کے درمیان نازل ہوئی ہے، اس کے پس منظر میں چار واقعات خصوصی اہمیت رکھتے ہیں جن کا حوالہ اس سورت میں آیا ہے، ان چار واقعات کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

پہلا واقعہ جنگ احزاب کا ہے، جس کے نام پر اس سورت کا نام رکھا گیا ہے، بدر واحد کی ناکامیوں کے بعد قریش کے لوگوں نے عرب کے دوسرے قبائل کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اکسایا، اور ان کا ایک متحدہ محاذ بنا کر مدینہ منورہ پر حملہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے پر مدینہ منورہ کے دفاع کے لئے شہر کے گرد ایک خندق کھودی تا کہ دشمن اسے عبور کر کے شہر تک نہ پہنچ سکے، اسی لئے اس جنگ کو جنگ خندق بھی کہا جاتا ہے، اس جنگ کے اہم واقعات اس سورت میں بیان ہوئے ہیں، اور اس موقع پر مسلمانوں کو جس شدید آزمائش سے گزرنا پڑا، اس کی تفصیل بھی بیان فرمائی گئی ہے۔

دوسرا اہم واقعہ جنگ قریظہ کا ہے، قریظہ یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا جو مدینہ منورہ کے مضافات میں آباد تھا، آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد ان سے امن کا ایک معاہدہ کیا تھا، جس کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ مسلمان اور یہودی ایک دوسرے کے دشمنوں کی مدد نہیں کریں گے، لیکن قریظہ کے یہودیوں نے معاہدے کی دوسری خلاف ورزیوں کے علاوہ جنگ احزاب کے نازک موقع پر خفیہ ساز باز کر کے پیچھے سے مسلمانوں کی پشت میں خنجر گھونپنا چاہا، اس لئے جنگ احزاب سے فراغت کے بعد اللہ تعالی کا حکم ہوا کہ فوراً قریظہ پر حملہ کر کے ان آستین کے سانپوں کا قلع قمع فرمائیں، چنانچہ آپ نے ان کا محاصرہ فرمایا، جس کے نتیجے میں ان کے بہت سے افراد قتل ہوئے اور بہت سے گرفتار، اس واقعے کی بھی تفصیل اس سورت میں آئی ہے۔

تیسرا اہم واقعہ یہ تھا کہ اہل عرب جب کسی کو اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیتے تو اس سے ہر معاملے میں سگے بیٹے کا درجہ دیتے تھے، یہاں تک کہ وہ میراث بھی پاتا تھا، اور اس کے منہ بولے باپ کے لئے جائز نہیں سمجھا جاتا تھا کہ وہ اس کی بیوہ یا مطلقہ بیوی سے نکاح کرے، بلکہ اس کو بدترین معیوب عمل سمجھا جاتا تھا، حالانکہ اللہ تعالی کی طرف سے اس کی کوئی ممانعت نہیں تھی، عرب کی یہ جاہلانہ رسمیں دلوں میں ایسا گھر کر گئی تھیں کہ ان کا خاتمہ صرف زبانی نصیحت سے نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی رسموں کا خاتمہ کرنے کے لئے سب سے پہلے خود علی الاعلان ان رسموں کے خلاف عمل فرمایا، تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ اگر اس کام میں ذرا بھی کوئی خرابی ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس بھی نہ جاتے، اس کی بہت سی مثالیں آپ کی سیرت طیبہ میں موجود ہیں، منہ بولے بیٹے کے بارے میں جو رسم تھی، اس کے سد باب کے لئے بھی اللہ تعالی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ اپنے ایک منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہؓ کی مطلقہ بیوی حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمائیں، واضح رہے کہ حضرت زینب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کی بیٹی تھیں، اور حضرت زیدؓ سے ان کا نکاح خود آپ نے کروایا تھا، اس لئے اگرچہ اب ان سے نکاح کرنا آپ کے لئے صبر آزما عمل تھا؛ لیکن آپ نے اللہ تعالی کے حکم اور دینی مصلحت کے آگے سر جھکا دیا، اور ان سے نکاح کرلیا، اسی نکاح کے ولیمے میں حجاب (پردے) کے احکام پر مشتمل آیات نازل ہوئیں جو اس سورت کا حصہ ہیں۔

چوتھا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات نے اگرچہ ہر طرح کے سرد گرم حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھرپور ساتھ دیا، لیکن جب آپ کے پاس مختلف فتوحات کے نتیجے میں مالی طور پر وسعت ہوئی تو انہوں نے اپنے نفقے میں اضافے کا مطالبہ کردیا، یہ مطالبہ عام حالات میں کسی بھی طرح کوئی ناجائز مطالبہ نہیں تھا لیکن پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کا شرف رکھنے والی ان مقدس خواتین کا مقام بلند اس قسم کے مطالبات سے بالاتر تھا۔ اس لئے اس سورت میں اللہ تعالی نے ازواج مطہرات کو یہ اختیار دیا ہے کہ اگر وہ دنیا کی زیب وزینت چاہتی ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اعزاز واکرام کے ساتھ علیحدہ کرنے کو تیار ہیں، اور اگر وہ پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کی ساتھی ہیں اور آخرت کے انعامات کی طلب گار رہیں تو پھر اس قسم کے مطالبے ان کو زیب نہیں دیتے۔

چونکہ حضرت زینب ؓ سے نکاح کے واقعے پر کفار اور منافقین نے آپ کے خلاف اعتراضات کئے تھے، اس لئے اسی سورت میں حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام بلند بتایا گیا ہے، اور آپ کی تعظیم وتکریم اور اطاعت کا حکم دے کر یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ آپ جیسی عظیم شخصیت پر نادانوں کے یہ اعتراضات آپ کے مقام بلند میں ذرہ برابر کمی نہیں کر سکتے، اس کے علاوہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل اور اس سے متعلق بعض تفصیلات بھی اس سورت میں بیان ہوئی ہیں۔ (توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی ۳۳ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۹۰ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۹ رکوع، ۷۳ آیت اور ۱۲۱۰ کلمات اور ۵۹۰۹ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

چونکہ اس سورۃ میں غزوہ احزاب کا ذکر ہے جو ہجرت کے بعد ۵ ھ میں پیش آیا، اس لئے اس کا نام سورہ احزاب مقرر ہوا۔

فائدہ:

احزاب کے لفظی معنی ہیں گروہ، جماعتیں، چونکہ اسلام کی مخالفت میں متعدد جماعتوں نے متحدہ محاذ بنا کر اس موقع پر چڑھائی کی تھی اس لئے اس کو غزوہ احزاب کہتے ہیں۔ اس غزوہ کا دوسرا نام غزوہ خندق بھی ہے چونکہ اس موقع پر حفاظت کے خیال سے مدینہ کے ان اطراف میں خندق کھودی گئی تھی جدھر سے دشمنوں کے آنے کا راستہ تھا۔

ربط:

(۱) پہلی سورۃ کا اختتام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی پر ہوا تھا جو محبوبیت کی دلیل ہے۔ اس سورہ میں بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منصوریت ومحبوبیت اور خصوصیت واکرمیت عند اللہ بوجوہ مختلف کا ذکر ہے جس سے دونوں سورتوں کے مابین تناسب ظاہر ہے۔

(۲) یہ سورت گزشتہ سورت کا تتمہ ہے، گذشتہ سورت کے اخیر میں کافروں کی ایذاؤں پر صبر کا حکم اور سب سے فتح کا وعدہ فرمایا، کافروں اور منافقوں نے بطور طعن کہا کہ وہ فتح کب ہوگی۔ اللہ نے اجمالی جواب تو پہلے ہی دے دیا تھا، **فاعرض عنهم وانتظر انهم منتظرون** اللہ تعالی نے اس سورت میں غزوہ احزاب کا ذکر فرمایا جس میں اللہ کی فتح اور نصرت کا ظہور اس طرح ہوا کہ جس میں اسباب ظاہری کو دخل نہ تھا اور نصرت خداوندی کے جو غیبی کرشمے اس غزوہ میں ظاہر ہوئے وہ سب آپ کے معجزے تھے اور آپ کی نبوت ورسالت کی دلیل تھے اور ابتدائے سورت میں اللہ تعالی نے اپنے نبی کو چند ہدایتیں اور نصیحتیں فرمائیں، جن پر اللہ کی فتح اور نصرت کا مدار ہے کہ تقوی اور صبر اور توکل پر قائم رہیں، سوائے خدا تعالی کے کسی سے نہ ڈریں اور نہ کسی چیز کی جانب التفات کریں اور بالکلیہ اللہ کی طرف متوجہ ہو جائیں، اللہ نے کسی کے دو دل نہیں بنائے کہ جو بیک وقت دو جانب متوجہ ہو سکے اور آغاز سورت میں ایک حکم یہ دیا کہ وحی الٰہی کا اتباع کریں اور ایک

حکم یہ دیا کہ کافرین اور منافقین کے مشوروں اوران کے کہنے پر نہ چلیں ،کافروں اور منافقوں کے کہنے پر چلنا سخت خطرناک ہےاس طرح یہ پانچ حکم ہو گئے۔

فائدہ:

غزوہ اس جنگ یامہم کوکہا جاتا ہےجس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود شریک ہوکر قیادت کی ہواورایسی جنگ یافوجی مہم جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم شریک نہ ہوئے اس کوسریہ کہا جاتا ہے۔

خلاصہ مضامین:

اس سورۃ کے مضامین تین اہم واقعات سے متعلق ہیں، ایک غزوہ احزاب جوشوال ۵ ھ میں پیش آیا،جس کی تفصیلات اس سورۃ کے دوسرے رکوع میں مذکور ہیں،اس کے بعد غزوہ بنوقریظہ کے متعلق جو یہود مدینہ کے ساتھ جنگ احزاب کے فورا بعد ہی پیش آیا،جس کی تفصیلات شروع رکوع میں ہے،اس سورۃ کے زمانہ نزول کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کوتنگی اورعسرت کا سامنا تھااورسب نہایت تنگی سے زندگی بسر کرتی تھیں،اللہ رب العزت کی طرف سےان کوکہا گیا کہ دنیااوراس کی زینت اورخدااوررسول وآخرت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلیں اوراگر دنیا کی عیش و بہار مطلوب ہےتو صاف کہہ دیں اوراگراللہ ورسول کی خوشنودی پسند ہےتوصبر کےساتھ اللہ و رسول کواختیار کئے رہیں،اس فرمان پرتمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نےفوراخدااوررسول اورآخرت کومنتخب کرلیا،اس سلسلہ میں ایک معاشرتی اصلاح کی ابتداء نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے کی گئی اوران کےتوسط سے مسلمان عورتوں کوجاہلیت کی بے پردگی سے پرہیز کاحکم دیا گیااوروقار کےساتھ گھرمیں رہنےاورغیرمردوں کےساتھ بات چیت کرنے میں سخت احتیاط کی تعلیم دی گئی،گویا یہ پردے کےحکم کا آغاز تھا،اس کے بعدحضرت زینب رضی اللہ عنہا کےساتھ حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم کےنکاح کےسلسلہ میں جوذی قعدہ ۵ ھ میں ہوامخالفین کی طرف سےاس پراعتراضات وشبہات اوران کے جوابات ارشادفرمائے گئےاورمسئلہ تبنیت (لے پالک) کی رسم کی اصلاح فرمائی گئی۔عرب کےلوگ متبنیٰ کوحقیقی بیٹے کادرجہ دیتے تھے،اسے باقاعدہ وراثت میں شریک سمجھا جاتا،متبنیٰ کی بیوی منہ بولے باپ کےحق میں حقیقی بیٹے کی بہو کادرجہ رکھتی، اللہ جل شانہ کومنظور ہوا کہ یہ جاہلیت کی رسم خودرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس توڑیں تاکہ کسی مسلمان کے ذہن میں کراہت کاتصور باقی نہ رہے۔اس لئےحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لے پالک کی بیوی (حضرت زید کی مطلقہ) سے نکاح فرمایا،جس پرمنافقین اور یہود نے مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات ڈالنے کی کوشش کی جس پرمسلمانوں کو بتلایا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ اورمقام کیا ہےاورحضور صلی اللہ علیہ وسلم کوصبر کی تلقین فرمائی گئی۔انہیں واقعات کےسلسلہ میں قانون طلاق کی ایک دفعہ بیان ہوئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک خاص ضابطہ بیان ہوا،جس میں یہ وضاحت بیان فرمائی گئی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ان متعدد پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں جو ازدواجی زندگی کے معاملہ میں عام مسلمانوں پر عائد کی گئی ہیں ۔ نیز بعض معاشرتی احکام نازل فرمائے گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں غیر مردوں کی آمد ورفت پر پابندی کا حکم نازل ہوا اور بتلایا گیا کہ ازواج مطہرات عزت وحرمت میں مسلمانوں کی ماں ہیں ،حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان سے کسی کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت زینب کے ساتھ نکاح کے سلسلہ میں چہ میگوئیوں پر سخت تنبیہ کی گئی اور اہل ایمان کو ان سے باز رہنے کی تلقین فرمائی گئی ۔سورۃ کے خاتمہ پر تمام انسانوں کو یاددلایا گیا کہ مخلوقات میں یہ انسان ہی ہے جس نے امانت الٰہی کا بار اٹھایا کہ اللہ کے احکام کی پابندی کروں گا، یہ عہد و پیمان ایک امانت ہے جس کی حفاظت ونگہبانی ہر انسان کے ذمہ واجب ہے، اس سے غفلت، انکار اور بے پروائی کرنے والے سزا کے مستحق ہوں گے ۔

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن، تفسیر ادریسی:۲۱۶/۶)

یہ چھ سورتیں (سورۂ احزاب، سبا، فاطر، یاسین، صٰفات اور صاد) ایک ہی محور کے گرد گھومتی ہیں، جو زندگی کے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہیں: جیسے

سورۃ الاحزاب: نازک حالات میں خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرنا۔

سورت سبا: خدا کے آگے سر تسلیم خم کرنا تہذیبوں کی بقا کا راستہ ہے۔

سورت فاطر: مقام وعزت بھی اللہ پاک کے حوالے ہے۔

سورہ یٰسین: نتیجہ سے مایوس ہونے کے باوجود نرمی وعاجزی کے ساتھ تبلیغ میں اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنا۔

سورۃ الصٰفات: خدا کے سپرد کردو، خواہ تم احکام کی حکمت کو نہ سمجھو۔

سورۂ صاد: بغیر ضد کے سچ کی طرف لوٹو۔

اس سورت میں مصائب ومشکلات کی تصویر پیش کی گئی ہے، جنگ احزاب کی سنگینی اس بات سے جھلکتی ہے کہ ایسا لگتا تھا کہ آنکھوں کی روشنی چلی گئی۔ دل (جگر) نکل آیا۔ اس وقت مسلمانوں کو (امتحان کے طور پر) ہلا کر رکھ دیا گیا تھا۔

اس کے علاوہ اور بھی سنگین معاشرتی حالات تھے۔

موجودہ دور میں جو لوگ شرعی مقاصد کو نہ سمجھنے کی وجہ سے دینی کاموں میں دخل اندازی کرتے ہیں، آیت نمبر ۳۶ میں ان کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب انسان اللہ کا فرمانبردار ہو جائے تو اس کے احکام کو ماننے اور عمل کرنے میں تردد نہ ہونا چاہئے؛ بلکہ بلا جھجک اس پر عمل کیا جائے، کیونکہ انسان کی سوچ کی ایک حد ہے۔ اصولی بات یہ ہے کہ دینی احکام دو قسم کے ہیں: (۱) بعض احکام کے ساتھ اس کی حکمت بھی بیان کر دی ہے۔ (۲) بعض احکامات کے مقصد کا ذکر نہیں ہے، تو دوسری قسم میں انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ میرا بندہ میرے حکم کو مانتا ہے یا پھر اس میں پش وپیش ہوتا ہے، اس لیے اس سورہ میں طاعت کا لفظ سات مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اللہ پاک کے ساتھ سچائی کی اصطلاح آٹھ مرتبہ استعمال ہوئی ہے۔

امانت سے کیا مراد ہے؟

امانت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے حکم کو اپنی ذمہ داری کے تحت اس طرح لے لیا جائے کہ اس پر عمل کرنے پر اجر کا حقدار ہو۔ اور اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں عذاب الٰہی کا حقدار ہوگا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کائنات کی ترتیب کے لیے جو کام زمین وآسمان کو سونپا ہے اس میں وہ بخوشی اپنی ذمہ داری پوری کرر ہے ہیں؛ لیکن اس سے خاص طور پر کہا گیا کہ اگر آپ چاہیں تو ہماری امانتوں میں سے ایک کو قبول کر لیں، تا کہ آپ کو انعام ملے، لیکن اگر زمین وآسمان خوف و دہشت محسوس کرتے ہیں کہ اگر ذمہ داری لیتے ہیں لیکن اس امانت کو پورا کرنے میں نا کام رہے تو ہمیں عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے زمین وآسمان نے بے بسی کا مظاہرہ کیا کہ ہم اس امانت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے لیکن انسان نے یہ ذمہ داری قبول کر لی، کیونکہ انسان کو شرم محسوس ہوئی کہ اس کے ولی کی طرف سے آنے والی ذمہ داری سے انکار یہ مناسب نہیں ہے۔ اللہ سب کو اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ (خواطر قرآنیہ، قرآن سارانس گجراتی)

سورت کے موضوعات:

اس سورت میں تین موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔ یعنی:

(۱) اجتماعی آداب (۲) تشریعی احکام۔ (۳) اور بعض غزوات کا بیان مثلاً غزوہ احزاب، غزوہ بنی قریظہ اور ان دونوں غزوات میں منافقین کی حالت اور کردار۔

نبی کی امت کو چار امور کا حکم:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۱﴾ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ﴿۲﴾

پہلی دو آیتوں میں اپنے نبی کے واسطہ سے نبی کی امت کو ایسے چار امور کا حکم دیا گیا ہے جو کہ حقیقت میں فلاح اور سعادت کے عناصر ہیں۔

- پہلا یہ کہ اللہ سے ڈرتے رہیں۔
- دوسرا یہ کہ کافروں اور منافقوں کی آراء کی اتباع نہ کریں۔
- تیسرا یہ کہ وحی الٰہی کی اتباع کرتے رہیں۔
- چوتھا یہ کہ اللہ پر اعتماد اور بھروسہ کریں۔

ایک قابل توجہ نکتہ:

یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن میں کہیں بھی ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو ''یا محمد'' کہہ کر نہیں پکارا، یہاں بھی ''یا ایھا النبی'' کہہ کر خطاب کیا گیا ہے، جب کہ دوسرے انبیاء کو یا آدم، یا نوح، یا موسی، یا عیسی اور

یازکریا کہہ کرخطاب کیا گیا ہے۔

جاہلانہ خیالات اورتصورات کی تردید:

زمانہ جاہلیت کے بعض معتقدات اور عادات کی تردید کی گئی ہے، جن میں سے بعض عقلی اعتبار سے باطل تھیں اور بعض شرعی اعتبار سے قبیح تھیں۔ درج ذیل آیت میں تین جاہلانہ خیالات اورتصورات کی تردید کی گئی ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـئِْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝۴

(۱) سینے میں دودل:

ان کا یہ خیال تھا کہ بعض لوگوں کے سینے میں دو دل ہوتے ہیں، اس خیال کے رد میں فرمایا گیا کہ اللہ نے کسی آدمی کے پہلو میں دودل نہیں بنائے'' دل تو بس ایک ہی ہوتا ہے یااس میں ایمان ہوگا یا کفر ہوگا، ایک ہی دل میں کفراور ایمان دونوں جمع نہیں ہوسکتے، اس سے ان منافقین کی بھی تردید ہوگئی جنہوں نے کفراور ایمان کے درمیان ایک تیسرا درجہ نفاق کا بھی تجویز کررکھا تھا۔

ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضورﷺ نماز میں بھول گئے تو بعض منافق کہنے لگے کہ آپ کے دودل ہیں، ان میں سے ایک دل کے ساتھ ہماری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور دوسرے دل کے ساتھ مخلص مومنوں کی طرف، اللہ نے اس بات کی تردید فرمائی ہے کہ کسی شخص کے سینے میں دودل نہیں ہوتے، مشرکین مکہ میں سے ایک ذہین آدمی کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اس کے دودل ہیں، اس آیت کریمہ سے اس بات کی نفی ہوگئی۔

(۲) جاہلی ظہار:

جاہلی ظہار یہ تھا کہ اگرکوئی شخص اپنی بیوی کو'' **انت علی کظھر امی** '' (تم میرے اوپر ایسے ہو جیسے میری ماں کی پشت) کہہ دیتا تو ان الفاظ کے کہنے سے اس کی بیوی ہمیشہ کے لیے اس پر حرام ہوجاتی تھی۔لیکن قرآن نے بتایا کہ کفارہ دینے سے بیوی حلال ہوجائے گی۔

(۳) منہ بولے بیٹے کا حکم:

اسلام سے قبل منہ بولے بیٹے کا حکم حقیقی بیٹے جیسا ہوتا تھا، قرآن نے اس غلط تصور کی تردید کی۔ (۴)

روحانی باپ، روحانی مائیں:

جب متبنی (منہ بولا بیٹا) کے تصور کی تردید ہوگئی اور بتایا گیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے حقیقی والد کا حکم نہیں رکھتے تو پھر یہ اعلان کیا گیا کہ آپ کی ابوت (باپ ہونا) ساری امت کے لیے عام ہے اور آپ کی ازواج مطہرات ساری امت کی روحانی مائیں ہیں، ان کا ادب واحترام واجب ہے اور اس کے ساتھ نکاح کرنا

حرام ہے۔

اس کے بعد انیس (۱۹) آیات میں غزوۂ احزاب اور غزوہ بنی قریظہ کی تفصیل ہے۔

غزوہ احزاب:

غزوہ احزاب شوال ۵ ھ میں ہوا، جب مشرکین کے دس یا پندرہ ہزار جنگجوؤں نے مدینہ کا محاصرہ کرلیا، یہ جنگجو مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے، یہود بنی نضیر اور یہود بنی قریظہ جن کے ساتھ مسلمانوں کا صلح کا اور ایک دوسرے کے دشمن کے ساتھ تعاون نہ کرنے کا معاہدہ تھا۔ انہوں نے اس معاہدہ کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی اور ابوسفیان کے ساتھ تعاون کیا، مسلمان صرف تین ہزار تھے، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل کرتے ہوئے مدینہ کے شمال مغرب میں جہاں سے دشمن کے حملہ آور ہونے کا خطرہ تھا، خندق کھودی گئی، اس لیے اسے غزوہ خندق بھی کہا جاتا ہے اور احزاب اس لیے کہتے ہیں کیونکہ جس لشکر نے مدینہ پر چڑھائی کی تھی اس میں مختلف جماعتیں اور قبائل شریک تھے، ان جنگجوؤں نے تقریبا ایک ماہ تک مدینہ کا محاصرہ کیے رکھا، پھر نعیم بن مسعود غطفانی کی کوششوں سے یہود اور قریشی اور غطفانی لشکر کے درمیان پھوٹ پڑ گئی۔ اللہ کی طرف سے انہی دنوں طوفانی آندھی آگئی، جس کی زد میں ان کے خیمے اکھڑ گئے، جانور بدک گئے اور ان کے عزائم پست ہوگئے، پھر قریش اور غطفان اور دوسرے قبائل اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے بغیر راہ فرار اختیار کر گئے۔

غزوہ بنی قریظہ:

ابوسفیان اور اس کے حمایتیوں کے چلے جانے کے بعد مسلمانوں نے بنی قریظہ کا محاصرہ کرلیا اور انہیں ان کی عہد شکنی کی عبرتناک سزا دی۔

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات میں ان دونوں غزوات کا حال اور منظر بیان کیا ہے اور مسلمانوں کو بشارت سنائی ہے کہ عنقریب انہیں مزید فتوحات حاصل ہوں گی۔ چنانچہ مسلمانوں نے نہ صرف فارس اور روم بلکہ بیسیوں ملک اور سینکڑوں شہر فتح کیے (اور ان شاء اللہ قرآن کے ساتھ تعلق مضبوط اور دل میں ایمان راسخ ہوجانے کے بعد پورے عالم کو فتح کریں گے)۔

رب تعالیٰ کی پیشین گوئی:

یوں رب تعالیٰ کی یہ پیشین گوئی پوری ہوکر رہے گی کہ میں نے اپنے آخری رسول کو اس لیے بھیجا ہے کہ دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب کردوں۔

یہ غلبہ یقینی ہے اور کسی صاحب ایمان کو اس میں شک نہیں ہونا چاہیے۔

بظاہر حالات مخالف:

بظاہر حالات مخالف ہیں لیکن جب اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت آئے گا تو حالات بھی موافق ہوجائیں گے اور وہ افراد بھی مہیا ہوجائیں گے جو اپنے اخلاق واعمال کے اعتبار سے پہلی صدی کے مسلمانوں کی یاد تازہ کردیں گے۔

فاتح عالم:

اس میں شک نہیں کہ موجودہ دور کے مسلمان، ایمان، اعمال، اخلاق، معاملات اور کردار کے اعتبار سے ''فاتح عالم'' بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے؛ لیکن کیا اسلام اور قرآن بھی یہ صلاحیت نہیں رکھتے، رب کعبہ کی قسم! ان کے اندر عالم کو اور فاتحین عالم کو فتح کرنے کی پوری پوری صلاحیت ہے اور کون ومکان کے مالک کی قسم! دنیا یہ نظارہ بہت جلد دیکھے گی۔

(خلاصۃ القرآن: م اش)

موضوع سورۃ:......آپ اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے میں کفار اور منافقین کی پروانہ کریں، بلکہ اقارب بھی ادائے فرض میں حارج نہ ہونے پائیں۔

خلاصہ رکوع :۱...... جمال مسائل ثمانیہ۔ ماخذ: آیت:۱ تا ۳۔(۲) **ما جعل الله سے امهاتكم تک ۔(۳) وما جعل ادعيانكم سے غفورا رحيما تک ۔(۴) آیت:۶ ۔(۵) ازواجه امهاتهم۔(۶) واولوا الارحام سے في الكتب مسطورا تک** ۔(۷) آیت:۷۔(۸) آیت:۸۔

خلاصہ رکوع:۲...... تفصیل اجمال نمبر:۱۔(ملاحظہ ہو پہلا رکوع)۔ ماخذ: آیت:۹ تا ۲۰۔

نوٹ:......دوسرے اور تیسرے رکوع میں ثابت کیا جائے گا کہ آپ نے کفار اور منافقین کی پروانہیں کی۔

خلاصہ رکوع:۳...... تفصیل اجمال اول۔ ماخذ: آیت:۲۱۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

اکیسویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) قرآن کریم کا کسی چیز کے واقع ہونے سے پہلے اس کی خبر دینا اور اس کا پھر اس طرح واقع ہو جانا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قرآن وحی الٰہی ہے۔

(۲) قرآن کریم رحمت اور نصیحت ہے مومنین کے لئے۔

(۳) مشرکین دونوں جہانوں میں خسارے میں ہیں کیونکہ انہوں نے باطل کو اختیار کر لیا ہے حق کے بدلے میں۔

(۴) شریعت میں سفر کرنے کی اجازت ہے مگر چند شرائط کے ساتھ: کہ وہ سفر کسی گناہ کے کام کے لئے نہ ہو، اس سفر کی وجہ سے کوئی فرض نہ چھوٹے، اس سفر کی وجہ سے اللہ کی کوئی ناراضگی نہ ہو۔

(۵) جو لوگ اپنے کانوں اور عقل کا صحیح استعمال کرتے ہیں ان کو ایمانی حیات حاصل ہے کیونکہ ایمان ایک روح ہے جب کسی جسم میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ شخص صحیح بات کو سننے والا، دیکھنے والا اور غور و فکر کرنے والا ہو جاتا ہے۔

(۶) لوگوں کی گمراہی کی وجہ ان کا خواہشات کی اتباع کرنا ہے بغیر علم کے۔

(۷) اللہ تعالیٰ متقین کو پسند کرتے ہیں اور کفار کو ناپسند کرتے ہیں۔

(۸) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو نعمتیں اس وجہ سے عطا کرتے ہیں کہ وہ اللہ کا شکر ادا کریں لیکن جب وہ ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دیتا ہے جو چاہتا ہے، جتنا چاہتا ہے اور جب چاہتا ہے۔

(۹) واجب ہے مومنین کے راستے کی اتباع کرنا اور حرام ہے اہل بدعت کے طریقہ پر چلنا۔

(۱۰) پہلے کی امتوں کی ہلاکت میں بہت بڑی عبرت ہے اس شخص کے لئے جو دل رکھتا ہو اور اس کے کان اور آنکھیں کھلی ہوں۔ (سجدہ)

***

پارہ: ۲۲

اکیسویں پارہ کی آخری چند آیات میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے خطاب تھا، چونکہ اس خطاب کا کچھ حصہ بائیسویں پارہ کے شروع میں بھی آیا ہے، ان آیات کا پس منظر احادیث میں یہ بیان ہوا ہے کہ جب فتوحات کا دور شروع ہوا تو ازواج مطہرات نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ہمارے وظیفہ اور نفقہ میں کچھ اضافہ کر دیا جائے، اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۲۸﴾ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾

جن میں انہیں دو باتوں میں سے ایک کا اختیار دیا گیا یا وہ خوشحالی کی زندگی گزارنے کے لیے جدائی اختیار کرلیں اور یا پھر تنگی ترشی کے ساتھ گزر بسر کریں اور اپنی نظر آخرت کی خوش عیشی پر رکھیں، جب آپ نے انہیں اختیار دیا تو ان سب نے آخرت ہی کو ترجیح دی۔

فضائل وخصائص ازواج مطہرات:

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

گذشتہ آیات میں اگرچہ ازواج مطہرات کی تنبیہ اور تادیب کا ذکر تھا لیکن وہ تنبیہ وتادیب بھی ان کے شرف اور امتیاز کو متضمن تھی، اس لئے کہ فاحشہ کے ارتکاب پر دوہرے عذاب کی دھمکی بھی ان کے بلند مرتبہ ہونے کی وجہ سے تھی اور اسی شرف کی وجہ سے خطاب صراحۃً خود ازواج مطہرات کو تھا۔ اب آئندہ آیات میں بھی صراحۃً ازواج مطہرات کو خطاب کر کے ان کے مزید شرف اور امتیاز کو بیان کرتے ہیں، تاکہ پہلے سے زیادہ اتقیا و پرہیز گاری، اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری، زہد اور قناعت اور دنیا سے بیزاری بلکہ دست برداری اور دار آخرت کے اختیار اور اس کی تیاری پر خوب مستحکم ہوجائیں۔ اور ان کے دل دنیا کی حرص اور طمع سے بالکلیہ پاک اور صاف ہوجائیں اور ان خداداد فضائل وخصائص پر حق تعالیٰ کا شکر بھی کریں۔ اور فخر بھی کریں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کی تمام عورتوں پر شرف اور فضیلت بخشی اور ان سے دوہرے اجر کا وعدہ فرمایا۔ اور ان کی تطہیر اور تزکیہ کا ارادہ فرمایا۔

(نیز) گذشتہ آیات میں جو تخییر کا مضمون تھا ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بیبیوں سے یہ کہہ دیں کہ تم کو اختیار ہے کہ دنیا کو اختیار کرو یا آخرت کو۔ اب ان آیات میں حق تعالیٰ کی طرف سے خود ازواج مطہرات

کو خطاب ہے جوان کے شرف اور کرامت کی واضح دلیل ہے کہ ازواج مطہرات نے فقر و فاقہ کے ساتھ خدا کے رسول ﷺ کی زوجیت کو اختیار کیا اور دار آخرت کو دار دنیا کے مقابلہ میں ترجیح دی، اس لئے حق جل شانہ آئندہ آیات میں ازواج مطہرات کو خطاب فرماتے ہیں کہ تم نبی کی بیبیاں ہو اور امہات المومنین ہو، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی اطاعت، عبودیت، تقویٰ، مکارم اخلاق اور محاسن اعمال میں تم کو سب سے آگے ہونا چاہئے اور زمانہ جاہلیت کی بری عادتوں سے تم کو انتہائی دور رہنا چاہئے کیوں کہ تم طیبات اور مطہرات ہو۔ تمہارے گھروں میں اللہ کی وحی نازل ہوتی ہے اور ملائکہ کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ تمہارے گھرانے قدسیوں کی بازگشت ہیں، طبقہ نسواں میں تم سے زیادہ بزرگ کوئی طبقہ نہیں، لہٰذا تم کو چاہیے کہ اپنے گھروں سے قدم باہر نہ نکالو۔ مبادا شیاطین الانس والجن کا کوئی تیر نظر تمہارے لباس تقویٰ وطہارت کو نہ آلگے اور گھر سے باہر نکل کر کسی گندگی اور پلیدی کا کوئی چھینٹا تم کو نہ لگ جائے۔ (تفسیر ادریسی:۶/۲۵۱)

اس موقع پر ازواج مطہرات کی فضیلت بیان کرتے ہوئے انہیں سات احکام دیئے گئے:

ارشاد ہے:

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ...................الی...........................اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

◇ نامحرم مردوں کے ساتھ بات کرتے ہوئے لچک دار لہجہ نہیں اختیار کرنا چاہئے یعنی جان بوجھ کر ایسا لہجہ اختیار نہیں کرنا چاہئے جس میں نزاکت اور کشش ہو، البتہ بات بغیر بد اخلاقی کے ہلکے پھلکے انداز میں کر دینا چاہئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب صرف عام گفتگو کا یہ حکم ہے تو غیر مردوں کے ساتھ ہنسنا بولنا ترنم کے ساتھ اشعار پڑھنا یا گانا وغیرہ کتنا برا ہوگا۔

(۲) بلا ضرورت گھر سے باہر نہ نکلے کیونکہ عورت کا اصل مقام اور محفوظ ٹھکانہ اس کا گھر ہے۔ اس آیت شریفہ سے یہ اصول معلوم ہو گیا کہ عورت کا اصل فریضہ گھر اور خاندان کی تعمیر ہے اور ایسی سرگرمیاں جو اس مقصد میں خلل پیدا کریں اس سے معاشرے کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ (خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

بغیر ضرورت کے گھر سے باہر نکلنا اور وہ بھی بلا پردہ اور بلا نقاب کے شریعت میں قطعاً ممنوع ہے، بلا پردہ اور بلا نقاب عورت کا گھر سے باہر قدم نکالنا شہوانی اور نفسانی لوگوں کی سوئی ہوئی طمع کو جگاتا ہے، شریعت مطہرہ یہ چاہتی ہے کہ بدمعاشوں کی ناپاک نظروں سے عورت کے چہرہ کی حفاظت کی جائے، اس لئے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ بلا ضرورت شدیدہ گھر سے باہر نہ نکلیں۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے **المرأة عورة فاذا خرجت استشرفها الشيطان**۔ یعنی عورت سراپا ستر ہے جس کا مستور رکھنا واجب ہے، جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اسے سر اٹھا کر دیکھتا ہے اور اس کی تاک میں لگ جاتا ہے پھر کراتا جو کراتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جن ممالک میں پردہ نہیں اور مرد و زن کے اختلاط میں وہاں کوئی رکاوٹ نہیں وہاں زنا

کا بازار گرم ہے اور نصف سے زیادہ آبادی غیر ثابت النسب ہے اور انہی اولاد الزنا کی اکثریت اور جمہوریت ہے۔ جہاں زنا کو آزادی حاصل ہے اور نکاح پر پابندی ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۶/ ۲۵۳، ۲۵۵)

اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں میں تقسیم کار کر دیا۔ مرد کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ محنت مشقت کر کے کمائی کرے اور عورتوں کا کام یہ ہے کہ وہ امور خانہ داری کو انجام دیں، بچوں کی پرورش، کھانا پکانا، کپڑے دھونا اور گھر کی صفائی کرنا عورت کے ذمے ہے۔ یہ سب کام گھر کی چار دیواری کے اندر انجام دیئے جاتے ہیں۔

اس کا مطلب عورتوں کو پنجروں میں بند کرنا نہیں بلکہ خرابی کو روکنا ہے۔ ضرورت کے وقت عورت باہر بھی جا سکتی ہے، مگر پردے کے ساتھ۔ خود ازواج مطہرات کے متعلق فرمایا **اذن لکم ان تخرجن لحوائجکن** تم اپنی ضروریات کے لئے باہر جا سکتی ہو۔ بعض بے سہارا عورتوں کو کام کاج کے لئے باہر جانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کی اجازت ہے۔ (معالم العرفان: ۱۵/ ۲۵۴، ۲۵۵)

◇ زمانہ جاہلیت کی طرح اپنی زینت اور ستر کا اظہار کرتے ہوئے باہر نکلیں۔ قرآن کریم نے اس کے لئے ''پہلی جاہلیت'' کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کا زمانہ ہے، مگر ساتھ ہی مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ایک جاہلیت آخر زمانے میں بھی آنے والی ہے اور کم از کم اس بے حیائی کے مقابلے میں اس زمانے کی جاہلیت ہماری آنکھوں کے سامنے اس طرح آ چکی ہے کہ اس نے پہلی جاہلیت کو بھی مات کر دیا ہے۔ (خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

بے پردگی کے نقصانات:

◇ بے پردگی سے بے غیرتی اور بے حمیتی پیدا ہوتی ہے۔ ◇ زنا کا دروازہ کھلتا ہے۔ ◇ اولاد حرام ہوتی ہے۔ ◇ حسب اور نسب ضائع ہو جاتا ہے۔ ◇ شوہر کو اپنی بیوی پر اطمینان نہیں رہتا تو دل سے کیسے محبت رہے۔ ◇ بے پردہ بیوی سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے شوہر کو اس پر یقین نہیں ہوتا کہ یہ میرا ہی بچہ ہے اور ظاہر ہے کہ جو عورت بے پردہ پھرتی ہو اور غیروں سے میل جول رکھتی ہو۔ اس کی اولاد پر کیسے یقین ہو سکتا ہے۔ ◇ اور جب اس بچہ کا اس کی اولاد ہونا یقین نہ رہا تو پھر اس کے مرنے کے بعد اس بچہ کا وارث ہونا بھی یقینی نہ رہا۔ حلال اولاد میراث کی مستحق ہوتی ہے، حرام کا بچہ میراث کا مستحق نہیں ہوتا۔ ◇ بے پردہ عورت شوہر کی راحت، سکون اور اطمینان کا باعث نہیں رہتی۔ شوہر جب گھر آتا ہے تو بیوی کو غائب پاتا ہے اور پریشان ہوتا ہے کہ نہ معلوم کہاں ہو گی۔ ◇ بے پردہ عورت نہ شوہر کی خدمت کر سکتی ہے اور نہ اس کی اطاعت کر سکتی ہے۔ ◇ بے پردہ عورت اولاد کی تربیت اور نگرانی بھی نہیں کر سکتی۔ ◇ بے پردگی باہمی خصومت اور نزاع کا سبب ہے جو بد چلنی کا لازمی نتیجہ ہے۔ ◇ بے پردگی اپنی آوارگی اور آزادی کی پردہ پوشی کے لئے عورت کو جھوٹ اور مکر و فریب پر آمادہ کرتی ہے۔ گھر سے باہر جانے کے عجیب عجیب بہانے بناتی ہے۔ ◇ جس کا اثر اولاد پر پڑتا ہے۔ اولاد بھی

وہی کرے گی جو ماں کو کرتے دیکھے گی۔ ◇ جس قدر بے پردگی بڑھتی جائے گی اسی قدر بے حیائی اور بے غیرتی بڑھتی جائے گی، جس کا لازمی نتیجہ نحوست ہے اور خاندان اور محلہ میں بدنامی اور بے عزتی ہے۔ ◇ حتی کہ اس گھرانہ سے حیاء، شرم، عفت، عصمت اور غیرت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (تفسیر ادریسی: ۲۵۹/۶)

اہل بیت کو حکم:

◇ نماز کی پابندی کرلیں۔

◇ زکوۃ ادا کریں۔

◇ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں۔

◇ گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں ان کو یاد رکھیں۔

ان احکامات کے آخر میں ارشاد فرمایا: ان سب باتوں کا مقصد یہ ہے کہ اے نبی کے گھر والو! اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگی دور کرے اور تمہیں ایسی پاکیزگی عطا کرے جو ہر طرح مکمل ہو۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ کیونکہ آگے پیچھے ذکر ازواج مطہرات کا چل رہا ہے اس لئے وہ تو ''اہل بیت'' میں براہ راست داخل ہیں، لیکن الفاظ کے عموم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادیاں اور ان کی اولاد بھی داخل ہے۔ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت فاطمہ، حضرت علی، حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو اپنی چادر میں ڈھانپ لیا اور یہ آیت تلاوت کی اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ یا اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں۔

قرآن کریم نے مسلمانوں کو جو ہدایات و احکامات دیئے ہیں ان میں عموماً مذکر کا ہی صیغہ استعمال کیا ہے۔ اگرچہ خواتین بھی ان ہدایات و احکامات کی پابند ہیں، لیکن بعض خواتین صحابیات کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اللہ تعالی خاص مؤنث کے صیغے کے ساتھ بھی کوئی حکم نازل فرمائیں۔ چنانچہ اللہ تعالی نے سورہ احزاب کی آیت ۳۵ میں ایسے دس احکام نازل فرمائے جن میں مرد اور عورت دونوں کو براہ راست خطاب فرمایا اور یہ احکام وصفات ایسے شاندار ہیں کہ مرد اور عورت میں سے جو کوئی بھی ان صفات کو اختیار کرے گا وہ مغفرت اور اجر عظیم کا مستحق بن جائے گا۔

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ﴿٣٥﴾

وہ دس صفات یہ ہیں:

(۱) اسلام (۲) ایمان (۳) قنوت (دائمی اطاعت) (۴) صدق (۵) صبر (۶) خشوع (۷) صدقہ (۸) روزے

(۹) شرمگاہ کی حفاظت (۱۰) اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنا۔ (۳۵)

اللہ اور رسول کی نافرمانی کھلی گمراہی:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿۳۶﴾

سورہ احزاب کی آیت ۳۶/ ایسے چند واقعات کے پس منظر میں نازل ہوئی جن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی صحابی کا رشتہ کسی خاتون کے پاس بھیجا، مگر وہ خاتون یا رشتہ دار شروع میں اس رشتے پر راضی نہیں ہوئے اور انکار کی وجہ صرف اپنی خاندانی یا مالی فوقیت تھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ لوگ صرف خاندانی یا مالی برتری کی وجہ سے اچھے رشتوں سے انکار نہ کریں۔ چنانچہ اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی اور جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا حتمی فیصلہ کریں تو نہ کسی مومن مرد کے لئے یہ گنجائش ہے نہ کسی مومن عورت کے لئے کہ ان کو اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے اور جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔ چنانچہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد سب نے رشتہ منظور کرلیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجویز کے مطابق ہی فیصلہ ہوا۔

منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹے جیسا نہیں ہے:

سورہ احزاب کی آیت ۴/ میں یہ ارشاد فرمایا گیا تھا کہ متبنی (منہ بولا بیٹا) حقیقی بیٹے جیسا نہیں ہے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی آپ کے متبنی بیٹے تھے، آپ نے ان کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے کروایا تھا لیکن جب ان کے درمیان نباہ نہ ہوسکا اور ان کے درمیان جدائی واقع ہوگئی تو اللہ تعالی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکاح خود حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے پڑھا دیا۔ اس پر بڑا شور اٹھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرلیا، جبکہ جاہلی تصور میں یہ نکاح حرام تھا۔ چنانچہ اللہ تعالی نے آیت ۳۷/ میں ارشاد فرمایا: جب زید نے اپنی بیوی سے تعلق ختم کرلیا تو ہم نے اس سے آپ کا نکاح کرادیا تاکہ مسلمانوں کے لئے اپنے منہ بولے بیٹے کی بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی تنگی نہ رہے۔''

حضرت زید بن حارثہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی فضیلت:

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ یہ وہ واحد صحابی ہیں جن کا نام قرآن کریم میں آیا ہے، اسی طرح حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا وہ واحد خاتون ہیں جن کا نکاح آسمان پر ہوا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کثرت ازدواج:

یہاں ضمنی طور پر یہ بات بھی جان لی جائے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے مخالفین نے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کثرت ازدواج میں معاذ اللہ شہوت پرستی کے عنصر کو بنیادی وجہ قرار دینے کی ناکام اور ناپاک کوشش کی ہے۔ یہاں اگر دو بنیادی

نکتوں کوملحوظ رکھا جائے تو اعتراضات کی لغویت ظاہر ہو جاتی ہے۔

◇ پہلا نکتہ یہ کہ آپ نے اپنی بھرپور جوانی ایک ایسی خاتون کے ساتھ گزاردی جو عمر میں آپ سے تقریباً دوگنی تھیں، جب تک وہ زندہ رہیں آپ نے کسی دوسری خاتون کو اپنے عقد میں قبول نہیں کیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ جتنی خواتین سے بھی آپ نے شادیاں کی ہیں وہ بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھنے یعنی پچاس سال کی عمر کے بعد کی ہیں۔

◇ دوسرا نکتہ یہ کہ سوائے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے آپ کی کوئی بیوی بھی کنواری نہیں تھی، اگر معاذ اللہ کثرت ازدواج سے آپ کا مقصد شہوت پرستی ہوتا تو آپ یہ شادیاں جوان اور باکرہ لڑکیوں سے کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تعدداز دواج میں تعلیمی، تشریحی، اجتماعی اور سیاسی حکمتیں پوشیدہ تھیں۔

زید بن حارثہ کو زید بن محمد کہنے کی ممانعت:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۴۰

حضرت زید بن حارثہؓ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منہ بولا بیٹا ہونے کی وجہ سے لوگ زید بن محمد کہنے لگے تھے۔ جب یہ حکم نازل ہوا کہ منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹا قرار نہیں دیا جاسکتا تو زید بن محمد کہنے کی بھی ممانعت ہوگئی، چنانچہ آیت ۴۰ میں ارشاد فرمایا کہ آپ کسی مرد کے نسبی باپ نہیں ہیں (کیونکہ آپ کی زندہ رہنے والی اولاد میں صرف بیٹیاں تھیں) لیکن آپ اللہ تعالی کے رسول ہونے کی وجہ سے پوری امت کے روحانی باپ ہیں اور چونکہ آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس لئے جاہلیت کی رسموں کو اپنے عمل سے ختم کرنے کی ذمہ داری آپ پر ہی عائد ہوتی ہے۔

(آسان ترجمہ قرآن، خلاصہ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پانچ صفات جمیلہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۴۵ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۴۶

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں مومنوں کو اللہ تعالی نے جو نعمت عظمی عطا فرمائی ہے، اللہ نے اس کی یاد دہانی بھی کرائی ہے اور آپ کے پانچ امتیازی اوصاف ذکر فرمائے ہیں:

(۱) آپ اپنی امت پر اور دوسری امتوں پر بھی قیامت کے دن گواہی دیں گے؛ کیونکہ پوری دنیا کے انسان آپ کی امت میں شامل ہیں، جنہوں نے ایمان قبول کرلیا وہ ''امت اجابت'' میں شامل ہیں، اور جنہوں نے ایمان قبول نہ کیا وہ ''امت دعوت'' میں داخل ہیں۔

(۲) اہل ایمان کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سعادت اور جنت کی بشارت دینے والے ہیں۔

(۳) کفار اور فجار کو اللہ کے عذاب اور ہلاکت سے ڈرانا آپ کی ذمہ داری ہے۔

(۴) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیکی، اصلاح، اخلاق حسنہ اور استقامت کی دعوت دینے والے ہیں۔

◇ آپ کی دعوت نہ دنیا کی دعوت تھی ۔ ◇ نہ اقتدار کی ۔ ◇ نہ مال غنیمت جمع کرنے کی ۔ ◇ نہ ہی قومیت اور عصبیت کی؛

بلکہ آپ کی دعوت خالص اللہ تعالی کی رضا کے لیے تھی ،جس کا مقصد صلاح اور اصلاح کے سوا کچھ نہ تھا اور اس میں کیا شک ہے کہ انبیاء کے اعمال میں سب سے افضل عمل دعوت ہی ہے، رب تعالی خود فرماتے ہیں:

’’اور اس سے زیادہ اچھی بات والا کون ہے جو اللہ تعالی کی طرف بلائے اور نیک کام کرے اور کہے کہ میں یقینا مسلمانوں میں سے ہوں ۔‘‘(فصلت)

(۵) آپ سراج منیر ہیں، آپ کے پرنور وجود سے ظلمتیں دور ہوئیں اور شبہات کا ازالہ ہوا۔(۴۵-۴۶)

اللہ تعالی نے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو چمکتے ہوئے سورج کے ساتھ تشبیہ دی ہے؛ کیونکہ اللہ تعالی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ شرک وضلال کی گمراہیوں کو دور کیا اور گمراہوں کو ہدایت دی ۔

جیسے جب سورج روشن ہوجاتا ہے تو رات کی تاریکی کافور ہوجاتی ہے اور منزل تک پہنچنا آسان ہوجاتا ہے ۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص احکام:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ ....الیٰ........................مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ﴿۵۱﴾

آیت: ۵۰ اور ۵۱ میں چند وہ احکامات نکاح بیان کئے گئے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص ہیں۔ مثلا

(۱) عام مسلمانوں کو چار سے زیادہ نکاح کی اجازت نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ اجازت دی گئی۔

(۲) عام مسلمانوں کے لئے جائز ہے کہ وہ مسلمان عورتوں کے ساتھ ساتھ کسی اہل کتاب عورت سے بھی نکاح کر سکتے ہیں؛ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اس کو جائز قرار نہیں دیا گیا کہ کوئی اہل کتاب عورت بغیر اسلام قبول کئے آپ کے نکاح میں آئے۔

(۳) عام مسلمانوں کے لئے بغیر مہر نکاح جائز نہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے جائز قرار دے دیا گیا کہ اگر کوئی عورت خود سے یہ پیشکش کرے کہ وہ آپ سے بغیر مہر کے نکاح کرنا چاہتی ہے اور آپ بھی ایسا کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

(۴) عام مسلمانوں کے لئے یہ بات فرض ہے کہ اگر ان کے نکاح میں ایک سے زائد بیویاں ہوں تو ان کے پاس رہنے کی باریاں مقرر کرے اور ہر معاملے میں برابری کا سلوک کرے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ پابندی اٹھالی گئی۔

معاشرت کے کچھ آداب:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى.....الیٰ......اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ﴿۵۳﴾

آیت ۵۳ سے معاشرت کے کچھ آداب بیان کئے جارہے ہیں اور یہ آیات حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ولیمہ کے موقع پر نازل ہوئیں کہ اس وقت کچھ صحابہ کھانے کے وقت سے کافی پہلے آکر بیٹھ گئے اور کچھ حضرات کھانے کے بعد کافی دیر تک بیٹھے رہے، جس پر اللہ تعالی نے تین احکام نازل فرمائے:

(۱) کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل نہ ہوا کرو۔

(۲) اگر کھانے کی دعوت میں بلایا جائے تو کھانے کے بعد وہاں سے اٹھ جایا کرو۔ باتوں میں مشغول ہوکر اپنا اور صاحب خانہ کا وقت ضائع نہ کیا کرو۔

(۳) نامحرم عورت سے اگر سوال کرنا ہو تو پردے کے پیچھے سے کیا کرو، بلا حجاب سامنے نہ آیا کرو۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس آیت میں جن عورتوں سے خطاب ہے وہ ازواج مطہرات ہیں اور جو مرد مخاطب ہیں وہ صحابہ کرام ہیں۔ آج کون ہے جو اپنے نفوس کو ازواج مطہرات اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے زیادہ پاکیزہ سمجھتا ہو، تو پردہ کا حکم جب ان حضرات کے لئے ہے تو عام مسلمانوں کو اس کا کتنا اہتمام کرنا چاہئے۔ قرآن کریم ان آیات کے آخر میں ارشاد فرماتا ہے: یہ طریقہ تمہارے دلوں کو بھی اور ان کے دلوں کو بھی زیادہ پاکیزہ رکھنے کا ذریعہ ہوگا۔ (۵۳)

کسی گھر میں دعوت طعام کے لئے اجازت لے کر جانے کا مطلب یہ بھی ہے کہ کسی کے گھر بلا اجازت طفیلی بن کر نہیں جانا چاہئے۔ ایسا کرنا سخت ناپسندیدہ بات ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ بن بلائے مہمان کی مثال ایسی ہے **دخل دخل سارقا و خرج خرج مغیرا** کہ داخل ہوتے وقت وہ چور ہوتا ہے اور نکلتے وقت ڈاکو۔

ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی۔ آپ کے ساتھ چار آدمی اور بھی تھے۔ جب وہ میزبان کے گھر کی طرف چلے تو ایک مزید آدمی ساتھ مل گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعلقہ مکان پر پہنچ کر صاحب خانہ کو مطلع کیا کہ ہمارے ساتھ ایک بن بلایا مہمان بھی ہے، اگر ایک زائد آدمی کے لئے کھانے کی گنجائش ہے اور تمہاری اجازت ہو تو وہ آدمی بھی آجائے ورنہ ہم اسے واپس لوٹا دیں گے۔ بہرحال اس شخص نے اجازت دے دی۔ (معالم العرفان: ۱۵/۳۲۹)

درود و سلام بھیجنے کا حکم:

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَٰئِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٥٦﴾

سورہ احزاب کی آیت ۵۶ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اہل ایمان کو درود و سلام بھیجنے کا حکم دیا ہے اور یہ واحد ایک ایسی عبادت ہے جس میں اللہ تعالی اور اس کے فرشتے بھی شریک ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ پر درود و سلام کا پڑھنا خود ہمارے لئے باعث عزت و تکریم ہے۔ آپ کا درجہ تو اللہ تعالی نے ویسے ہی بلند کر رکھا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہمارے درود کی ضرورت نہیں بلکہ ہمیں ضرورت ہے، کیونکہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ کے چہرہ مبارک پر خوشی کے آثار تھے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آج ہم چہرہ

انور پر خوشی کے (غیر معمولی) آثار دیکھ رہے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج میرے پاس فرشتہ آیا تھا اس نے کہا اے محمد! کیا آپ اس بات سے خوش نہیں ہیں کہ اللہ عز وجل کہتا ہے، آپ کی امت میں سے جو کوئی آپ پر ایک بار درود بھیجے گا میں اس پر دس رحمتیں نازل کروں گا اور جو کوئی ایک بار سلام بھیجے گا میں اس پر دس بار سلامتی نازل کروں گا، میں نے فرشتے کو جواب دیا کہ ہاں میں خوش ہوں۔'' (مسند احمد، نسائی)

ہر مسلمان عورت کو پردہ کا حکم:

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۵۹

پہلے آیت: ۵۴ میں امہات المومنین پر حجاب کی فرضیت کا حکم نازل ہوا، پھر عمومی طور پر ہر مسلمان خاتون کو پردہ کا حکم دیا گیا، خواہ وہ بیوی ہو یا بیٹی ہو یا ماں، حجاب عورت کی عزت وعصمت کا محافظ اور باعث تکریم وتعریف ہے۔

یعنی اس شریفانہ لباس سے ہر شخص کو اول نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ یہ شریف عزت دار بیبیاں ہیں، بے حیا نہیں ہیں اور اس لئے ان سے چھیڑ چھاڑ کی جرأت راہ چلتے ہوئے بدمعاشوں کو نہ ہوگی، عورت کی عصمت کے تحفظ میں بڑا دخل اس کی وضع ولباس کے وقار کو ہے، جو عورت اپنی وضع وقطع وپوشش سے آوارہ معلوم ہوتی ہے اسے دیکھ کر محض لفنگوں اور بدمعاشوں ہی کے نہیں، بلکہ دوسروں کی طبیعتوں میں بھی گدگدی پیدا ہوتی ہے، بخلاف اس کے جس عورت کی وضع وقطع، چال ڈھال سنجیدہ، حیادارانہ وشریفانہ ہے اور وہ اپنا رکھ رکھاؤ قائم کئے ہوئے ہے، اسے چھیڑنے کی ہمت بدمعاشوں کو بھی مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ فقہاء نے آیت سے نکالا ہے کہ جوان عورت پر نامحرموں سے اپنے چہرہ کا پردہ واجب ہے۔

(ماجدی: ۵/۳۸۰)

حجاب شرعی میں چند شرائط کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

حجاب ایسا ہو کہ پورے بدن کو چھپائے۔

حجاب فی نفسہ پرکشش اور نگاہوں کو متوجہ کرنے والا نہ ہو۔

حجاب ایسا باریک نہ ہو جس سے جسم کی رنگت جھلکے اور نظر آئے۔

کشادہ ہو، ایسا تنگ نہ ہو جو فتنہ کا باعث بننے والے اعضاء کو ظاہر کرے۔

ایسا معطر نہ ہو جس کی خوشبو دوسروں تک پہنچے۔

بناوٹ میں مردوں کے لباس سے مشابہت نہ رکھتا ہو۔

ایسا لباس نہ ہو جو کافر اور مشرک عورتوں کی پہچان بن چکا ہے۔

شہرت کا لباس نہ ہو کہ جسے محض شہرت کے لیے پہنا جائے، حدیث میں اس پر سخت وعید آئی ہے۔

ازواج مطہرات کو پردے کا حکم دیتے وقت فرمایا تھا کہ تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ۔ ظاہری بات ہے کہ ازواج مطہرات اور صحابہ کرام سے تو یہ توقع نہیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف پہنچائیں گے۔ معلوم ہوا کہ یہ حکم عام مسلمانوں کے لئے ہے کہ اگر تم نے حجاب نہ کیا، پردے کا اہتمام نہ کیا تو اس طریقہ سے تم اللہ اور اس کے رسول کو تکلیف پہنچانے والے بن جاؤ گے۔ اللہ ہماری حفاظت فرمائے۔

اللہ تعالی کے بہت سے احکامات تو وہ ہیں جن کے ماننے پر تمام مخلوق مجبور ہے، خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتی، مثلا زندگی اور موت کا فیصلہ، اور بہت سے احکام وہ ہیں جن میں اللہ نے بندے کو اختیار دیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اللہ کا حکم مان لیں۔ اللہ تعالی اس کے بدلے ان کو جنت عطا فرمائیں گے اور اگر نہ مانیں گے تو اللہ تعالی کی طرف سے دنیا میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہاں آخرت میں اللہ کا عذاب چکھنا پڑے گا۔

امانت کا بوجھ اٹھانے سے انکار:

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا ﴿۷۲﴾

سورت کے اختتام پر فرائض وواجبات اور شرعی احکام کی اہمیت بیان کی گئی ہے کہ یہ احکام اس امانت کا حصہ ہیں جو اللہ نے بندوں کو سونپی ہے۔ آسانوں، زمین اور پہاڑوں نے اس امانت کا بوجھ اٹھانے سے انکار کردیا تھا۔ کیونکہ ان کے اندر یہ بوجھ اٹھانے کے صلاحیت نہ تھی لیکن چونکہ انسان کو اللہ نے عقل وفکر اور خیر وشر کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے تو اس نے اس بوجھ کو اٹھا تو لیا مگر اس کا حق ادا نہ کرسکا۔ (خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

حضرت حکیم الامت تھانوی ؒ اپنے ایک وعظ میں فرماتے ہیں کہ اس آیت میں امانت سے تکلیف شرعی مراد ہے اور تکلیف شرعی سے مراد اعمال کو اپنے اختیار سے بجالانا ہے، یعنی جو اپنے اختیار سے اطاعت کرے گا اس کو ثواب ملے گا اور جو اطاعت نہیں کرے گا اس کو عذاب ہوگا، اس کو سن کر سب ڈر گئے، نہ آسمان کو ہمت ہوئی اور نہ زمین کو اور نہ پہاڑوں کو۔ اس امانت کا بوجھ اٹھانے سے سب ڈر گئے اور امانت کے اٹھانے سے انکار کردیا مگر حضرت انسان فوراً بول اٹھے کہ ہم ہیں اس کے اٹھانے والے۔ کچھ دیکھا نہ بھالا اور ہمت کر کے قبول کرلیا، وجہ اس ہمت کی وہ ہے کہ جس طرف کسی صاحب دل نے اشارہ کیا ہے۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

لفظ دیوانہ اس کی طرف اشارہ ہے یعنی جوش عشق اور محبت نے ایسا بیخود اور دیوانہ بنایا کہ بغیر سوچے سمجھے ہی قبول کرلیا، آسمان وزمین میں عشق اور محبت کا مادہ نہ تھا اس لئے ان پر شعور غالب آیا اور بوجھ اٹھانے سے انکار کردیا، انسان پر عشق اور محبت کی وجہ سے بے شعوری غالب آئی اس لئے اقرار کرلیا۔ عشق سے خطاب کی لذت محسوس ہوئی اور اندازہ لگالیا

کہ جب خطاب میں لذت ہےتو جب مکلف ہونے کو مان لیں گےتو بار بار خطاب ہوگا اور خوب لطف آئے گا۔اور بڑا مزہ ہوگا بعد میں چاہے دوزخ میں جلنا پڑے لیکن اس لذت کو نہ چھوڑنا چاہئے اور کچھ نہ سہی اس بہانہ سے بات ہی کرنے کا موقعہ ملا کرے گا جیسے کوئی مریض کسی طبیب پر عاشق ہوجائے اور علاج بھی اسی طبیب کا ہوتو مریض یہ دعا کرے گا کہ اے اللہ میں بیمار رہوں تاکہ حکیم صاحب میرے پاس آتے رہیں، ملائکہ میں بھی مادہ عشق کا نہیں، عشق کے لئے جوش، خروش، شوق، ہیجان اور ولولہ لازم ہے، یہ مادہ انسان میں سب سے زیادہ ہے، اسی وجہ سے اگر انسان کی تعریف میں بجائے حیوان ناطق کے حیوان عاشق کہا جائےتو زیادہ بہتر ہے اور **انه كان ظلوما جهولا** میں کچھ اس کی بے وفائی کی طرف اشارہ ہے۔(تفسیر ادریسی: ۳۴۲:۲)

خلاصہ رکوع: ۴...... تفصیل احتمال دوم یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو دل نہیں ہیں کہ ایک سے اللہ تعالی کو راضی کریں، اور دوسرے سے ازواج کو راضی رکھیں۔ ماخذ: آیت: ۲۸۔

خلاصہ رکوع: ۵...... تفصیل اجمال سوم (چونکہ ادعیا (متبنیٰ) حقیقی بیٹے نہیں ہوتے، اس لئے ان کی ازواج کے ساتھ نکاح کی اجازت ہے)۔ ماخذ: آیت: ۳۷۔

خلاصہ رکوع: ۶...... تفصیل اجمال چہارم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مؤمنین کے مفاد کو ان کے نفسوں سے زیادہ سمجھتے ہیں)۔ ماخذ: آیت: ۴۵، ۴۶۔

جب حضور انور میں یہ صفات پائی جاتی ہیں تو ان کی برکت سے مسلمانوں کے مفاد کو آپ یقیناً زیادہ سمجھتے ہیں۔

خلاصہ رکوع: ۷...... تفصیل اجمال پنجم وششم (ازواج مطہرات مؤمنین کی روحانی مائیں ہیں، ان کی توقیر وحرمت بمنزلہ والدہ کے ہے، اوران سے نکاح ابدالآباد حرام ہے، لیکن تمہاری نسباً مائیں نہیں ہیں، اس لئے پردہ انہیں کرنا چاہئے۔ ماخذ: آیت: ۵۳،۵۳ ۵۵۔

خلاصہ رکوع: ۸...... تفصیل اجمال ہفتم (قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام سے سوال ہوگا کہ انہوں نے تبلیغ فرمائی اور کیا نتیجہ برآمد ہوا، اب امت احکام الٰہی کی پوری قدر کرے، تاکہ قیامت کے دن ان کے حق میں بہتر گواہی آپ دے سکیں۔ ان آیت ۵۹، ۶۶، ۶۷۔

خلاصہ رکوع: ۹...... تفصیل اجمال ہشتم۔ اے مسلمانو! اپنے نبی کی ایذاءدہی سے بچو، اوراپنے فرض منصبی کی سبکدوشی کا طریقہ حضور انور سے سیکھو۔ ماخذ آیت: ۶۹، ۷۳، ۷۲۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ سبا

اس سورت کا بنیادی موضوع اہل مکہ اور دوسرے مشرکین کو اسلام کے بنیادی عقائد کی دعوت دینا ہے، اس سلسلے میں ان کے اعتراضات اور شبہات کا جواب بھی دیا گیا ہے، اور ان کو نافرمانی کے برے انجام سے بھی ڈرایا گیا ہے، اسی مناسبت سے ایک طرف حضرت داود اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی اور دوسری طرف قوم سبا کی عظیم الشان حکومتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے، حضرت داود اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو ایسی زبردست سلطنت سے نوازا گیا جس کی کوئی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی، لیکن ان برگزیدہ پیغمبروں کو کبھی اس سلطنت پر ذرہ برابر غرور نہیں ہوا، اور وہ اس سلطنت کو اللہ تعالی کا انعام سمجھ کر اللہ تعالی کے حقوق ادا کرتے رہے، اور اپنی حکومت کو نیکی کی ترویج اور بندوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں استعمال کیا، چنانچہ وہ دنیا میں بھی سرخرو رہے، اور آخرت میں بھی اونچا مقام پایا، دوسری طرف قوم سبا کو جو یمن میں آباد تھی، اللہ تعالی نے ہر طرح کی خوشحالی سے نوازا؛ لیکن انہوں نے ناشکری کی روش اختیار کی، اور کفر و شرک کو فروغ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر اللہ تعالی کا عذاب آیا، اور ان کی خوشحالی ایک قصۂ پارینہ بن کر رہ گئی، ان دونوں واقعات کا ذکر فرما کر سبق یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے کوئی اقتدار حاصل ہو یا دنیوی خوشحالی نصیب ہو تو اس میں مگن ہو کر اللہ تعالی کو بھلا بیٹھنا تباہی کو دعوت دینا ہے، اس سے مشرکین کے ان سرداروں کو متنبہ کیا گیا ہے جو اپنے اقتدار کے گھمنڈ میں مبتلا ہو کر دین حق کے راستے میں روڑے اٹکا رہے تھے۔ (توضیح القرآن)

قرآن کریم کی ۳۴ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۵۸ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۶ رکوع، ۵۴ آیات، ۸۹۶ کلمات اور ۳۶۳۶ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے دوسرے رکوع میں قوم سبا کا تذکرہ فرمایا گیا ہے، اس مناسبت سے اس سورۃ کا نام سورۂ سبا ہوا۔

ربط:

سورہ سبا کے شروع میں توحید کا ذکر ہے جو امانت مفہوم کلی کی ایک جزئی اعظم ہے اور توحید شرک کے مقابل ہے، جس کا ذکر سورۃ سابقہ کے خاتمہ پر تھا، جس سے تناسب ظاہر ہے۔

خلاصہ مضامین:

سورۃ کی ابتداء اللہ کی صفات کمالیہ سے فرمائی گئی ہے۔ اور بتلایا گیا کہ تمام حمد و ثنا اسی ایک خدا کو زیبا ہے جو ہر شئی کا خالق و مالک ہے، بڑی حکمت والا بڑا باخبر ہے، اس کے بعد وقوع قیامت کا ذکر فرمایا گیا اور اس کی غرض و حکمت بتلائی گئی تا کہ اللہ دنیا میں ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو اچھا صلہ دے اور کفار و مشرکین کو سزا و عذاب دے، آگے

حضرت داود اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا قصہ ذکر فرمایا کہ اللہ نے ان کو کیسے کمالات اور بعض خصوصی امتیازات عطا فرمائے تھے کہ داود علیہ السلام کے ساتھ چرند پرند حتیٰ کہ پہاڑ بھی تسبیح کرتے تھے اور لوہا ان کے ہاتھ میں موم جیسا نرم ہو جاتا تھا۔حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت ہوا پر بھی تھی اور ہوا آپ کا تخت حسب منشاء لے کر اڑا کرتی تھی، جنات کو آپ کا خدمت گزار بنا دیا گیا تھا جو آپ کے لئے بڑی بڑی عمارتیں بنا دیتے ،ان انعامات کو یاد دلا کر آل داود کو شکر گزاری کی تعلیم دی گئی اور یہ کہ میرے تمام بندوں ہی کو شکر گزار ہونا چاہئے ، کیونکہ ایسا کون ہے جس پر حق تعالیٰ کا احسان نہ ہو،اس کے بعد قوم سبا کا ذکر فرمایا گیا جن کو اللہ نے بہت سی دنیوی نعمتوں سے نوازا تھا مگر انہوں نے نافرمانی کی اور بجائے شکر کے کفران نعمت کیا اور جب انبیاء علیہم السلام کے سمجھانے سے بھی باز نہ آئے تو ان پر زبردست سیلاب کا عذاب آیا،جس نے ان کے باغات اور بستیوں کو غارت کر دیا اور ان کو ناشکری کی سزا ملی ،اس کے بعد شرک کی مذمت ذکر فرماتے ہوئے کہا گیا کہ مشرکین جن کی پوجا کرتے ہیں ان کے قبضہ میں زمین و آسمان کی ذرہ برابر بھی کوئی چیز نہیں ہے۔اس ذیل میں توحید کی تبلیغ اور شرک سے اجتناب کی تعلیم دی گئی ۔ جو لوگ عذاب قیامت کا تمسخر کرتے تھے ان کو بتلایا گیا کہ اس وعدہ کا ایک خاص دن مقرر ہے جس سے نہ ایک ساعت کوئی پیچھے ہٹ سکتا ہے نہ آگے بڑھ سکتا ہے،اس کے بعد قیامت کا منظر بیان کیا گیا کہ جب کافروں کے سردار اور ان کے متبعین قیامت میں جمع ہوں گے تو اتباع کرنے والے ان سرداروں سے کہیں گے کہ تمہیں نے ہمیں گمراہ کیا، اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایمان لے آتے ، اس پر وہ جواب دیں گے کہ کیا ہم نے تمہیں زبردستی روکا تھا؟ تم اپنے کئے کے خود مجرم ہو،اس پر یہ جواب دیں گے کہ تمہاری رات دن کی کوشش اور فریب دہی ہمیں مجبور کرتی تھی کہ ہم کفر کریں۔نہ تم ہمیں اس وقت یہ سبق پڑھاتے نہ ہم ایمان سے محروم رہتے۔

الغرض ایک دوسرے کو ملزم گردانیں گے اور اپنے دل میں پشیمان ہوں گے، پھر ان سب کی گردنوں میں طوق ڈال کر اور زنجیروں سے جکڑ کر جہنم رسید کر دیا جائے گا ،آگے کفار عرب کو کہا گیا کہ انہیں تو قرآن کریم اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر کرنی چاہئے تھی ،اس لئے کہ ان میں پہلے اور کوئی آسمانی کتاب نہیں آئی تھی اور نہ کوئی پیغمبر ان میں آیا،ان کو بتلایا گیا کہ یہی قومیں مال و دولت میں تم سے بڑھی ہوئی تھیں ،نافرمانی کی وجہ سے جب ان پر عذاب آیا تو مال و دولت ان کے کچھ کام نہ آیا،تمہارے کس کام آئے گا اگر تم تکذیب کرتے رہو گے۔ جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ دیوانہ اور مجنون کہتے تھے ان سے کہا گیا کہ جو شخص تم کو اچھی باتیں بتائے ،پچھلے لوگوں کے حالات تمہیں سنا کر عبرت و نصیحت دلائے، آئندہ آنے والے عذاب سے تمہیں آگاہ کرے اور اس سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے،تو اے احمقو! کیا ایسا شخص دیوانہ ہو سکتا ہے؟ اخیر میں کفار کی حالت کا نقشہ کھینچا جو انہیں میدان حشر میں درپیش ہوگی ، وہ اس وقت کی ہول اور ہیبت سے بدحواس ہوں گے اور اس وقت اپنے ایمان لانے کو ظاہر کریں گے مگر اس دن کا ایمان لا نافع بخش نہ ہوگا اور ان کو داخل جہنم کر دیا جائے گا ،اس وعید و تنبیہ پر سورۃ کو ختم فرمایا گیا۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت کا مقصد: ثقافت کی بقا کے لیے اللہ کے حکم کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔

اس سورہ میں دو مثالیں پیش کی گئی ہیں: (ا) ایک ایسا معاشرہ جس کی ثقافت مومنین کی صفات سے تشکیل پائی، مثال کے طور پر حضرت داود علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام؛ کہ اللہ پاک نے عظیم سلطنت کے ساتھ ساتھ اس وقت کی تمام ٹیکنالوجی اور اس قدر غلبہ عطا کیا کہ ایسی بادشاہی ان کے علاوہ کسی کے نصیب میں نہیں آئی۔ وہ ان تمام آلات واسباب کے باوجود تکبر کرنے کے بجائے اللہ کے شکر گذار اور بندے ہی بن کر رہے، جس کی وجہ سے دنیا آخرت میں فلاح وفوز کے مستحق ٹھہرے۔

وہ قوم جس کی ثقافت اللہ کی نافرمانی میں پلی بڑھی تھی، جسے اللہ پاک نے ایسی جگہ آباد کیا کہ زمین زرخیز، سڑک کے دونوں طرف باغات، فضا بالکل پاک وغیرہ، (زندگی کی تمام سہولتیں موجود تھیں) لیکن وہ ان کو ہضم نہ ہوئی اور وہ پھولے نہ سمائے اور ناشکرے بن گئے، جس کی وجہ سے اللہ کے غضب عذاب کے شکار ہو گئے۔ آج صرف ان کی کہانیاں رہ گئی ہیں۔ اس ضمن میں جنات کے بارے میں لوگوں کے وہم وگمان کی تردید کرتے ہوئے بیان کیا کہ آپ جن جنوں کے سامنے انتقال فرما گئے، ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی خبر تک نہ ہوئی، تو وہ غیب کی باتوں کو کیسے جانیں گے؟ ان دو مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نافرمانی اور اس کے ساتھ شرک وغیرہ تباہی وبربادی کا سبب ہے۔

آیت نمبر ۴۵ میں اہل مکہ کو آگاہ کر دیا گیا کہ تمہاری دولت، طاقت وغیرہ اس کا دسواں حصہ بھی نہیں جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں، جب انہوں نے سرکشی کی تو اللہ نے انہیں تباہ کر دیا؛ لہٰذا اگر تم ثقافت کو بچانا چاہتے ہو تو اپنے آپ کو اللہ کا فرمانبردار بنائیں، اس کے علاوہ آپ سب مل کر سوچیں کہ جو پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ واقعی پاگل نہیں ہے، لہٰذا ضد چھوڑ دو، ان کی بات مان لو اور اس کے قدموں پر گر جاؤ۔

سورت اللہ تعالیٰ کی حمد سے شروع ہوئی ہے، اللہ پاک کا تعارف کرایا گیا کہ اللہ پاک تمام مخلوقات کا خالق، مضبوط انتظام کرنے والا، تدبیر کرنے والا، ہر چیز کا جاننے والا ہے اور اللہ پاک کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے۔

بعد ازاں مشرکین کے بارے میں بتایا کہ وہ لوگ حساب کتاب اور مرنے کے بعد کی زندگی کا انکار کرتے ہیں تو آپ رب کی قسم کھا کر کہیں کہ قیامت آئے گی، نیکی کرنے والے کو اچھا بدلہ دیا جائے گا اور برائی کرنے والوں کو سزا ملے گی۔

(خواطر قرآنیہ)

اس سورت میں شروع سے لے کر اخیر تک تین مضمون بیان فرمائے، توحید، رسالت اور قیامت، یہی تینوں مضمون امانت الہیہ کے جزء اعظم ہیں اور جو لوگ عیش پرستی میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں وہی لوگ قیامت اور حشر ونشر کے زیادہ منکر ہوتے ہیں، ان کی نظر صرف دنیاوی لذتوں پر ہوتی ہے، اس لیے اس سورت میں دلائل توحید کے علاوہ ان لوگوں کی خاص طور پر تہدید وتوبیخ کی گئی جو قیامت کے منکر تھے وہ یہ کہتے تھے **لا تأتينا الساعة** ان کے جواب میں کہا گیا۔ **قل بلى**

و ربي لتاتينكم اس لیے اس سورت کا آغاز اللہ تعالے کی حمد اور شکر سے کیا گیا اور بتلادیا گیا کہ حمد وشکر کی مستحق صرف وہی ذات ہے جو آسمان وزمین کی مالک ہے، اس لئے کہ تمام نعمتوں کا سرچشمہ آسمان کی بارش اور زمین کی پیداوار ہے، اس لیے اس سورت میں دلائل توحید کے ساتھ دلائل قیامت کو بھی بیان کیا تاکہ مشرکین اور منکرین قیامت کا رد ہوجائے اور ان لوگوں کا بھی رد فرمایا کہ جو نبی کریم کو منتری اور ساحر اور مجنون کہتے تھے کہ جو شخص علم وحکمت کی باتیں پیش کرتا ہو اس کو مجنون کہنا خود اس کہنے والے کے دیوانہ اور مجنون ہونے کی دلیل ہے۔

قرآن کریم میں پانچ سورتیں ہیں جن کی ابتداء الحمدللہ سے کی گئی ہے۔(۱) فاتحہ (۲) انعام (۳) کہف (۴) سبا (۵) فاطر۔

حقیقت تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں لیکن بظاہر وہ نعمتیں دو قسم کی ہیں، ایک نعمت ایجاد اور ایک نعمت بقاء، ایجاد کے معنی معدوم کو موجود کرنے کے ہیں اور بقاء کے معنی موجود کو باقی اور زندہ رکھنے کے اور زندہ رہنے کے سامان عطا کرنے کے ہیں اور پھر ایجاد اور بقاء کی دو قسمیں ہیں ایک دنیوی اور ایک اخروی اور ایک روحانی اور ایک جسمانی، پس ان پانچ سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے کہیں ایجاد کی نعمتیں اور کہیں بقا کی نعمتیں ذکر کیں اور کہیں دنیاوی اور جسمانی نعمتوں اور کہیں اخروی اور روحانی نعمتوں کا ذکر کیا، جس سے ہر جگہ شکر کی ترغیب دینا مقصود ہے، اس سورت کے شروع میں اول عالم دنیا کی نعمتوں کا ذکر فرمایا اور اس کے بعد عالم آخرت کی نعمت مغفرت اور ان کے رزق کریم کا اور دیگر معنوی نعمتوں کا ذکر فرمایا اور ان لوگوں کی مذمت کی جو اخروی نعمتوں کے منکر ہیں۔(تفسیر ادریسی: ۶/ ۳۴۶، ۳۴۷)

حمد وشکر کی مستحق ذات اللہ تعالیٰ کی ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ①

اس سورت کا آغاز اللہ تعالی کی حمد وثنا سے کیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ حمد وشکر کی مستحق صرف وہی ذات ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا مالک ہے۔ اللہ تعالی سب کی حقیقت سے آگاہ اور سب کے حالات سے خوب واقف ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ کا علم اس کائنات کے ہر چھوٹے سے چھوٹے ذرے کا بھی احاطہ کئے ہوئے ہے۔

سورۂ سبا کی آیت ر ۳ میں اللہ تعالی نے مشرکین کا اعتراض نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہیں آئے گی۔ آیت ر ۴ میں اللہ نے اس کا جواب دیا کہ اگر یہ دنیا ہی سب کچھ ہو اور کوئی دوسری زندگی آنے والی نہ ہو تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ اللہ تعالی نے اپنے فرمانبرداروں اور نافرمانوں کے درمیان کوئی فرق ہی نہیں رکھا۔ آخرت کی زندگی اس لئے ضروری ہے کہ اس میں فرمانبرداروں کو ان کی نیکی کا انعام دیا جائے اور نافرمانوں کو سزا ملے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

’’(اور قیامت اس لئے آئے گی) تاکہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں اللہ ان کو انعام دے، ایسے لوگوں کے لئے مغفرت ہے اور باعزت رزق۔‘‘

تمام قرآن کریم میں تین آیتیں ایسی ہیں جن میں اللہ تعالی نے قیامت کے آنے پر قسم کھائی ہے۔ایک سورۃ یونس کی آیت: ۵۳ جہاں ارشاد ہے:

وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ۭ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ڔ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۵۳

ترجمہ: لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ قیامت کا آنا حق ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ ہاں میرے رب کی قسم وہ یقینا حق ہے اور تم خدا کو مغلوب نہیں کر سکتے۔

دوسری اس سورہ سبا کی آیت ۳ ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ ۙ

ترجمہ: اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے وہ کہتے ہیں ہم پر قیامت نہیں آئے گی۔آپ فرما دیجئے میرے عالم الغیب پروردگار کی قسم وہ تم پر ضرور آ کر رہے گی۔

اور تیسری سورہ تغابن کی آیت ہے:

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۷

ترجمہ: جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، وہ یہ دعوی کرتے ہیں کہ انہیں کبھی دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا۔کہہ دو: کیوں نہیں؟ میرے پروردگار کی قسم! تمہیں ضرور زندہ کیا جائے گا، پھر تمہیں بتایا جائے گا کہ تم نے کیا کچھ کیا تھا، اور یہ اللہ کے لیے معمولی سی بات ہے۔

شاکر اور کافر میں تقابل:

سورہ سبا میں اللہ تعالی نے حضرت داود، حضرت سلیمان علیہما السلام اور اہل سبا کا تذکرہ کیا ہے کہ ان پر اللہ تعالی نے بہت انعامات فرمائے تھے، گویا شاکر اور کافر کا تقابل اور موازنہ کیا ہے، حضرت داود اور سلیمان علیہما السلام اللہ کے شکر گزار بندے تھے کہ ہر نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرتے اور اہل سبا اس کے برعکس تھے۔

حضرت داود علیہ السلام:

حضرت داود علیہ السلام کو اللہ تعالی نے بہت سارے انعامات سے نوازا،

◇ حد اعجاز تک پہنچا ہوا صوتی جمال عطا فرمایا تھا۔

◇ وہ جب اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے تھے تو پہاڑ اور پرندے بھی ان کے ہم نوا بن جاتے تھے۔

◇ وہ جب زبور پڑھتے تو جو جانور ان کی قراءت سنتا تھا اس پر گریہ طاری ہو جاتا تھا۔

◇ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے لوہا نرم کر دیا تھا، وہ اسے جس طرف چاہتے موڑ لیتے اور جو کچھ چاہتے اس سے بنا لیتے۔

◇انہوں نے ''کارخانہ'' بنا رکھا تھا، جس میں لوہے کی مضبوط زرہیں بنتی تھیں۔اسے دنیا کی پہلی ''اسٹیل مل'' بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔(خلاصۃ القرآن)

حکایت:

داؤد(علیہ السلام) زمانہ بادشاہت میں ہیئت بدل کر ملک میں پھرتے اور لوگوں سے بادشاہ کا حال دریافت کرتے تاکہ اگر کسی کو کوئی شکایت ہو تو اس کی اصلاح کرسکیں، جس شخص سے بھی پوچھتے تو وہ داؤد(علیہ السلام) کی عبادت اور ان کی نیک خلقی اور عدل وانصاف کی تعریف کرتا، ایک دن ایک فرشتہ انسان کی صورت میں ملا تو داود(علیہ السلام) نے اس کو اپنے سے انجان سمجھ کر اس سے اپنا حال پوچھا، اس نے کہا داؤد(علیہ السلام) سب آدمیوں سے بہتر ہے اور بہت اچھا ہے لیکن اس میں ایک خصلت ہے، اگر وہ نہ ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا، داود(علیہ السلام) نے پوچھا وہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ وہ خود بھی مسلمانوں کے بیت المال سے کھاتا ہے اور اپنے اہل وعیال کو بھی اس میں سے کھلاتا ہے، اگر وہ خود اپنی محنت اور ہاتھ کی کمائی سے کھاتا تو بہتر ہوتا۔ داؤد(علیہ السلام) نے بارگاہ خداوندی میں دعا شروع کی کہ مجھے کوئی ایسی حرفت سکھا دیں جس سے میں اور میرے اہل وعیال مستغنی ہوجائیں، پس اللہ تعالیٰ نے ان کو زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی جیسا کہ سورۂ انبیاء میں گذرا **وعلمناہ صنعۃ لبوس لکم** کہ اللہ عزوجل نے لوہا ان کے لئے نرم کردیا اور زرہ بنانے کی صنعت ان کو سکھلادی، چنانچہ داؤد(علیہ السلام) زرہ بناتے اور اس کو فروخت کرتے، اس میں سے ایک تہائی صدقہ کردیتے اور ایک تہائی اہل وعیال پر خرچ کردیتے اور ایک تہائی آئندہ زرہ بنانے کے لئے ذخیرہ رکھ چھوڑتے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک زرہ چار ہزار درہم میں فروخت ہوتی۔(تفسیر قرطبی، روح المعانی)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ انسان کے لیے بہتر روزی وہ ہے جو وہ اپنے ہاتھ سے کماتا ہے اور اللہ کے نبی اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔ ہاتھ کی کمائی سے مراد صرف مزدوری یا صنعت وحرفت ہی نہیں بلکہ محنت کا ہر کام مراد ہے۔ جس میں کاشتکاری، ملازمت، تعلیم وغیرہ بھی آجاتے ہیں، جو شخص ہاتھ کے بجائے دماغی کام کرتا ہے۔ ذہن کے ذریعے سوچتا سمجھتا اور منصوبہ سازی کرتا ہے وہ بھی اس مد میں آتا ہے، مطلب یہ کہ جو آدمی اپنے ظاہری اور باطنی قویٰ کو استعمال میں لاکر کوئی کام کرتا ہے وہ ہاتھ کی کمائی والوں میں شامل ہے اور اللہ کے نبی نے اسے بہتر روزی قرار دیا ہے۔(تفسیر قرطبی)

حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ مذکورواقعہ سے تین مسئلے نکلے: ایک خرق عادت کا اثبات، (۲) دست کاری سے کمانے کی فضیلت (۳) ہر کام میں اعتدال، انتظام وتناسب کی رعایت؛ یہاں تک کہ امور حسی ودنیوی میں بھی۔(ماجدی:۵/۳۹۵)

حضرت سلیمان علیہ السلام:

جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر خصوصی انعامات کیے تھے یونہی حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی خوب نوازا تھا۔

◇ انہیں اللہ تعالیٰ نے پرندوں کی بولی سکھائی تھی۔

◇ ان کے لیے تانبا بہتے ہوئے چشمے کی شکل اختیار کر جاتا، اس سے جو چاہتے، بسہولت بنا لیتے۔

◇ جنات ان کے تابع تھے، ان سے آپ تعمیرات اور حمل ونقل کے مشکل ترین کام لیتے تھے۔

◇ ان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا گیا تھا۔

◇ آج کل جیسے ہوائی جہاز ہوتے ہیں یونہی آپ کا ہوائی تخت تھا جو دو ماہ کی مسافت دن کے تھوڑے سے حصے میں طے کر لیتا تھا۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ صبح کو دمشق سے اپنے تخت اور بساط پر بیٹھ کر ہوا میں روانہ ہوتے اور اصطخر فارس میں اتر کر قیلولہ کرتے اور دمشق اور اصطخر کے درمیان تیز رفتاری کے ساتھ کامل ایک ماہ کی مسافت ہے پھر شام کو اصطخر سے روانہ ہوتے اور رات کابل میں بسر کرتے اور اصطخر سے کابل تک تیز رفتاری کے ساتھ ایک ماہ کی مسافت ہے۔ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے لئے ایسا مسخر کر دیا تھا کہ ایک دن میں دو مہینہ کی پیدل مسافت طے کرتے تھے۔ (تفسیر قرطبی)

محیر العقول نعمتیں:

اللہ تعالیٰ کی ان محیر العقول نعمتوں کے باوجود دونوں باپ بیٹا فخر وغرور کا شکار نہ ہوئے اور ذکر وشکر سے ایک لحظہ کے لیے بھی غافل نہ ہوئے۔

جب کہ عمومی صورت انسان کی یہ رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے شکر کرنے والے بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔

اہل سبا کا قصہ:

دوسرا قصہ جو یہاں بیان ہوا ہے وہ اہل سبا کا ہے، پہلا قصہ اگر اہل شکر وایمان کے لیے روشن مینار تھا تو دوسرا قصہ اہل کفر وعصیان کی تاریک جھلک ہے۔

اہل سبا پر نعمتوں کی فراوانی:

اہل سبا کو رزق کی فراوانی، صحت افزا آب وہوا، زرخیز زمین اور پھل دار باغات جیسی نعمتیں عطا کی گئی تھیں۔ طویل مسافت تک دورویہ باغات چلے جاتے تھے، نہ گرمی اور دھوپ ستاتی اور نہ ہی بھوک پریشان کرتی، پانی ذخیرہ کرنے کے لیے ایک ڈیم بھی تھا جسے "سد مآرب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے ان نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا بلکہ ناشکری پر اتر آئے، پھر وہی ہوا جو ناشکری قوم کے ساتھ ہوتا ہے۔

سد مآرب:

ایک مشہور تاریخی بند ہے جو پہاڑوں کے پانی کے ذخیرہ کے لئے بنایا گیا ہے، مآرب ملک سبا کا دارالسلطنت تھا،

موجودہ شہر صنعاء سے کوئی ۶۰ میل مشرق میں اور سطح سمندر سے کوئی ۳۹۰۰ فٹ بلند، قوم سبا ایک بڑی متمدن قوم تھی۔ اس کا یہ کئی میل کا لانبا چوڑا بند سبا کے انجینئروں کی فنکاری کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ یہ عظیم الشان بند ظہور اسلام سے کچھ قبل ٹوٹا ہے، تخمیناً ۵۴۲ء میں۔ اس کی تباہ کاریوں کے آثار صدیوں بعد تک قائم رہے۔ چنانچہ ایک سیاح نے ۱۸۴۸ء میں معائنہ کیا۔ طول میں یہ بند ۱۵۰ فٹ اور عرض میں ۵۰ فٹ تھا۔ (ماجدی: ۳۹۹/۵)

اللہ کا عذاب:

بند ٹوٹ کر عذاب کی صورت اختیار کر گیا اور اس کے پانی نے تباہی مچا دی، باغات اور بستیاں خس و خاشاک بن کر بہہ گئی۔

جہاں پھل اور پھول تھے وہاں جھاڑ جھنکار کے سوا کچھ بھی نہ بچا اور اہل سبا کا ذکر صرف داستانوں میں رہ گیا۔ (۱۵-۲۱)

عقلی اور نقلی دلائل سے تردید اور توہین:

اس سورت میں مسلسل مشرکین کے عقائد و نظریات کی عقلی اور نقلی دلائل سے تردید اور توہین ہے۔

◇ کبھی ان سے کہا گیا کہ بلاؤ ان کو جنہیں تم اللہ کے سوا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے ہو، دیکھتے ہیں کہ وہ تمہیں کیا فائدہ پہنچاتے ہیں۔

◇ کبھی تلقین کے اسلوب میں ان سے سوال کرنے کا حکم دیا گیا کہ بتاؤ تمہیں آسانوں اور زمین سے کون رزق دیتا ہے؟ کبھی یہ سوال کیا گیا کہ جنہیں تم اللہ کے ساتھ عبادت میں شریک سمجھتے ہو ذرا انہیں سامنے تو لاؤ تا کہ میں دیکھوں کہ ان کے اندر کون سی ایسی صفت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ عبادت کے مستحق بن گئے ہیں؟ (۲۲-۲۷)

پیام ہدایت کی عالمگیری کا دعویٰ:

توحید کے ساتھ رسالت کا ذکر کر دیا۔ یعنی آپ ﷺ کا فرض اور آپ ﷺ کی بعثت کی غرض یہی ہے کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کے لوگوں کو ان کے نیک و بد سے آگاہ کر دیں سو کر دیا۔ جو نہیں سمجھتے وہ جانیں۔ سمجھدار آدمی تو اپنے نفع نقصان کو سوچ کر آپ ﷺ کی بات کو ضرور مانیں گے۔ ہاں دنیا میں کثرت جاہلوں اور ناسمجھوں کی ہے۔ ان کے دماغوں میں کہاں گنجائش ہے کہ کارآمد باتوں کی قدر کریں۔ (تفسیر عثمانی)

ارشادی باری ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۸

اور (اے پیغمبر) ہم نے تمہیں سارے ہی انسانوں کے لیے ایسا رسول بنا کر بھیجا ہے جو خوشخبری بھی سنائے اور خبردار بھی کرے، لیکن اکثر لوگ سمجھ نہیں رہے ہیں۔

اتنی صراحت کے ساتھ اپنے پیام ہدایت کی عالمگیری کا دعویٰ دنیا کے کسی دین نے بھی نہیں کیا، یہ خصوصیت آسمانی کتابوں میں صرف قرآن کی ہے۔ قرآن ہی اعلان کے ساتھ کہتا ہے کہ پیام محمدی ہر ملک، ہر قوم، ہر طبقہ انسانیت اور ہر زمانہ کی ہدایت کے لیے ہے۔ اسلام کے دو دعوے ایسے ہیں، جن میں دنیا کا کوئی دوسرا دین اس کا شریک نہیں، دونوں دعوے اسلام کے امتیازات خصوصی میں سے ہیں، ایک یہ بار بار تصریح و وضاحت کے ساتھ کہنا کہ میری تعلیم ساری دنیا کے لیے ہے۔ (دوسرے مذاہب جیسے اپنی قوم یا ملک کے باہر کسی کو جانتے ہی نہیں) دوسرے پیغمبر اسلام ﷺ کو سلسلہ انبیاء کا خاتم قرار دینا۔ (ماجدی: ۵/۴۰۶)

کفر کی بنیادی وجہ:

آگے چل کر سورۂ سبا میں کفار اور مشرکین کی سرکشی اور کفر کی بنیادی وجہ، ثروت و غنا کو بتایا ہے۔ انہیں اس پر اتنا ناز تھا کہ ان کا خیال تھا ہمارے جیسے اصحاب مال و اولاد کو نہ دنیا میں عذاب ہوسکتا ہے نہ آخرت میں عذاب ہوگا۔ قرآن کے الفاظ میں

وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۝۳۵

''اور کہا کہ: ہم مال اور اولاد میں تم سے زیادہ ہیں اور ہمیں عذاب ہونے والا نہیں ہے۔''

آخرت کے معاملے کو دنیا پر قیاس:

وہ آخرت کے معاملے کو بھی دنیا پر قیاس کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ جیسے اللہ تعالی نے انہیں دنیا کی وسعت اور خوشحالی عطا فرمائی ہے، یہی معاملہ ان کے ساتھ آخرت میں بھی کیا جائے گا، انہیں جواب دیا گیا کہ'' فرمادیجئے! کہ میرا رب جس کے لیے چاہے روزی کشادہ کر دیتا ہے اور تنگ بھی کر دیتا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے'' (۳۶)

ثروت و غنا پر فخر و غرور:

ثروت و غنا پر فخر و غرور ہی انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے استہزاء اور تحقیر پر آمادہ کرتا تھا اور وہ آپ کو مجنون اور دیوانہ کہنے سے باز نہیں آتے تھے، اس لیے اللہ نے فرمایا:

'' آپ ان سے فرمادیجئے، میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، تم اللہ کے لیے دو دو اور اکیلے اکیلے مستعد ہو جاؤ پھر غور و فکر کرو (تم یقیناً اس نتیجہ پر پہنچو گے کہ تمہارے ساتھی یعنی (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کو کوئی جنون نہیں، وہ تم کو سخت عذاب کے آنے سے پہلے صرف ڈرانے والے ہیں۔ (۴۶)

چاہت کے درمیان پردہ:

آخری آیت میں بتایا گیا کہ وہ آخرت میں ایمان قبول کرنا چاہیں گے لیکن ان کی چاہت اور ان کے درمیان پردہ حائل کر دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ ایمان سے محروم ہی رہیں گے۔ (۵۴) (خلاصۃ القرآن، خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:......تصفیہ مسئلہ مجازات۔

خلاصہ رکوع:۱......انکار مسئلہ مجازات۔ ماخذ: آیت ۳۔

خلاصہ رکوع: ۲......(۱) اگر یہ لوگ شکر گزار بنیں تو داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کی طرح سرفراز کئے جائیں گے، (۲) اور اگر باز نہ آئے تو قوم سبا کی طرح نعمتوں سے محروم ہو سکتے ہیں۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۲، ۱۰، ۱۳۔ (۲) آیت: ۱۵ تا ۱۷۔

خلاصہ رکوع: ۳......اگر خوف مجازات سے تعلق باللہ قائم نہ رکھا تو غیر اللہ کا تعلق شفاعت کے لئے بھی مفید نہ ہوگا۔ ماخذ: آیت: ۲۲، ۲۳۔

خلاصہ رکوع: ۴......ضال اور مضل ہستیوں کا یوم المجازات میں مجادلہ۔ ماخذ: آیت: ۳۳، ۳۱۔

خلاصہ رکوع: ۵......ضال اور مضل نے اپنے زعم میں جنہیں معبود بنا رکھا تھا، ان کی طرف سے بیزاری۔ ماخذ: آیت: ۴۱، ۴۰۔

خلاصہ رکوع: ۶......یوم المجازات کے بتلانے میں میری ذاتی کوئی غرض نہیں ہے۔ ماخذ: آیت: ۴۷۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ فاطر

اس سورت میں بنیادی طور پر مشرکین کو توحید اور آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے، اور فرمایا گیا ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالی کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی جو نشانیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں، اُن پر سنجیدگی سے غور کرنے سے اول تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس قادر مطلق نے یہ کائنات پیدا فرمائی ہے اسے اپنی خدائی کا نظام چلانے میں کسی شریک یا مددگار کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور دوسرے یہ کہ وہ یہ کائنات کسی مقصد کے بغیر فضول پیدا نہیں کرسکتا، یقیناً اس کا کوئی مقصد ہے، اور وہ یہ کہ جو لوگ یہاں اس کے احکام کے مطابق نیک زندگی گزاریں، انہیں انعامات سے نوازا جائے، اور جو نافرمانی کریں ان کو سزا دی جائے، جس کے لئے آخرت کی زندگی ضروری ہے، تیسرے یہ کہ جو ذات کائنات کے اس عظیم الشان کارخانے کو عدم سے وجود میں لے کر آئی ہے، اس کے لئے اس کو ختم کر کے نئے سرے سے آخرت کا عالم پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے، جسے ناممکن سمجھ کر اس کا انکار کیا جائے، اور جب یہ حقیقتیں مان لی جائیں تو اس سے خودبخود یہ بات ثابت ہوسکتی ہے کہ جب اللہ تعالی کو یہ منظور ہے کہ اس دنیا میں انسان اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے، تو ظاہر ہے کہ اپنی مرضی لوگوں کو بتانے کے لئے اس نے رہنمائی کا کوئی سلسلہ ضرور جاری فرمایا ہوگا، اسی سلسلے کا نام رسالت، نبوت یا پیغمبری ہے، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی سلسلے کے آخری نمائندے ہیں، اس سورت

میں آپ کو یہ تسلی بھی دی گئی ہے کہ اگر کافر لوگ آپ کی بات نہیں مان رہے ہیں تو اس میں آپ پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؛ بلکہ آپ کا فریضہ صرف اتنا ہے کہ لوگوں تک حق کا پیغام واضح طریقے سے پہنچا دیں، آگے ماننا نہ ماننا ان کا کام ہے اور وہی اس کے لئے جواب دہ ہیں۔ (توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی ۳۵ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے نمبر ۴۳ پر ہے، اس سورۃ میں ۵ رکوع، ۴۵ آیات، ۷۹۲ کلمات اور ۳۲۸۹ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے ابتدائی جملہ میں **الحمد للہ فاطر السموات والارض** مذکور ہوا ہے کہ تمام تر حمد اللہ کو لائق ہے جو آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اس واسطے اس سورۃ کا نام بطور علامت فاطر مقرر ہوا۔

نیز اس سورۃ کا دوسرا نام سورہ ملائکہ بھی ہے، چونکہ اس سورۃ میں ملائکہ کا ذکر ہے اس لئے اس سورۃ کو سورہ ملائکہ بھی کہتے ہیں۔

ربط:

اس سورۃ کا زیادہ تر حصہ ابطال شرک و اثبات توحید میں ہے اور سورۃ سابقہ کے ختم پر انکار حق کی عاقبت کا بیان تھا جو انکار توحید کو شامل ہے، پس ذکر توحید کے ساتھ جس سے یہ سورۃ شروع ہو رہی ہے تناسب واضح ہے۔

خلاصہ سورۃ:

چونکہ یہ سورۃ مکی ہے، اس لئے اس میں بھی دوسری سورتوں کی طرح عقائد سے متعلق مضامین بیان فرمائے گئے ہیں جس میں توحید کو ثابت کیا گیا ہے اور شرک کو باطل قرار دیا گیا۔ اہل مکہ اور ان کے سرداروں نے دعوت توحید کے مقابلہ میں جو رویہ اختیار کر رکھا تھا اس پر ناصحانہ انداز میں ان پر تنبیہ اور ملامت بھی کی گئی ہے اور معلمانہ انداز میں فہمائش بھی۔

سورۃ کی ابتداء اللہ تعالی اپنی قدرت کاملہ کے بیان سے فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اس زمین پر انسانوں کو بسایا اور ان کی ہدایت کے لئے رسول بھیجے اور ان رسولوں کے پاس اپنے فرشتوں کے ذریعہ سے پیغام ہدایت بھیجا، پھر جس طرح انسان کی جسمانی پرورش اور تربیت کے بے شمار سامان دنیا میں پیدا کئے۔ اسی طرح روحانی و اخلاقی تربیت کے لئے نبوت و رسالت کا سلسلہ قائم کیا گیا اور کتابیں نازل کی گئیں، اس سلسلہ رسالت کی آخری کڑی رسالت محمدیہ ہے اور آخری کتاب قرآن کریم ہے، انسان کو چاہیئے کہ اللہ کی نعمتوں کو پہچانے اور زمین و آسمان میں بے شمار پھیلے ہوئے آثار سے توحید کا سبق حاصل کرے، وہ نعمتیں جو اللہ نے دے رکھی ہیں ان کی ناشکری کفر و سرکشی انسان کا شیوہ نہ ہونا چاہیئے۔

مزید براں انسان کو یہ قرآن اور رسالت محمدیہ کی یہ عظیم نعمتیں ملیں پھر بھی اکثر لوگ اس سے اعراض و سرکشی کرتے

ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں، پہلے بھی انبیاء کی تکذیب ہوتی رہی ہے۔ پھر بتلایا گیا کہ اللہ نے جو پیغام قرآن کی شکل میں دیا ہے وہ حق ہے۔ دنیا کے دھندوں میں پھنس کر اس کو نہ بھول جانا اور شیطان تمہارا دشمن ہے، اس کا کہنا مانو گے تو وہ تمہیں نار جہنم کی طرف لے جائے گا، جو لوگ شیطان کے دھوکہ میں آ جاتے ہیں ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ بری باتوں کو اچھا اور اپنے آپ کو اچھوں کے برابر سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ وہ برے ہیں۔ کافروں کے لئے آخرت میں سخت عذاب ہے اور ایماندار و نیکوکار بڑا اجر پائیں گے اس لئے اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کو اس کی نشانیاں دیکھ کر پہچانو جو دنیا میں پھیلی پڑی ہیں، انسان کی اپنی پیدائش پھر اس کی پرورش کا انتظام سب ایک اللہ عز وجل کے دست قدرت میں ہے، اس لئے انسان سراسر اسی کا محتاج ہے اور ہر ایک اپنے اپنے کام کا ذمہ دار ہے، کوئی اپنے سوا اور کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، برے اعمال کی سزا بعض وقت دنیا میں بھی مل جاتی ہے لیکن قیامت میں تو ضرور ہی ملے گی، یہ اللہ کی سنت ہے کہ سرکشی اور نافرمانی پر فوراً گرفت نہیں ہوتی مہلت ملتی ہے، اگر مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر نتائج بھگتنے پڑیں گے، اس لئے جسے سنبھلنا ہے وہ سنبھل جائے، آخر وہ مقرر گھڑی آ کر رہے گی اور جب آ جائے گی تو پھر کسی کی کچھ نہ چلے گی اور فیصلہ اللہ عز وجل کے ہاتھ میں ہوگا اور چونکہ وہ اپنے بندوں کے حال سے خوب واقف ہے اس لئے ہر کسی کو اس کے کئے کا بدلہ دے گا۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت کا مقصد اگلی سورت کی طرح عزت وتکریم اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہے۔

جو لوگ سیدھی راہ چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ہم کسی کی عزت کریں گے تو ہماری عزت وتکریم میں کمی ہوگی اس لیے وہ داعیوں کی عزت نہیں کرتے، جس کی بدولت لوگ ان کے حامی نہ بنیں اور ان کی عزت برقرار رہے؛ لیکن ان کی تردید آیت ۱۰ میں کی کہ کس کو عزت سے محروم کیا جائے، کس کو عزت دی جائے یہ اللہ تعالیٰ اور زمین کے خالق کے ہاتھ میں ہے اور سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تکریم کے مقام کو نوازے، کیونکہ ہماری نیکیاں اللہ تعالیٰ کے حضور جاتی ہیں اور قبول ہوتی ہیں۔

آیات ۱۵-۱۷ میں ہے کہ ہم اللہ کے فرمانبردار کیوں نہیں بن جاتے؟ کیونکہ ہم بنیادی ضروریات میں بھی اسی کے محتاج ہیں، جب کہ اللہ پاک قادر مطلق ہے، لہٰذا ہمیں اللہ پاک کی ضرورت ہے نہ کہ اللہ پاک کو ہماری۔

اللہ پاک نے ہمیں کہا کہ کائنات (زمین-آسمان) کے شاندار انتظامات کو دیکھو اور سوچو کہ بارش، کھیتوں کی فصلیں، پھلوں میں رنگ، انسان کی خود ساختہ تخلیق، میٹھا اور کھارا پانی کا سمندر ایک دوسرے کے ساتھ ملے بغیر بہہ رہا ہے، جانوروں کی زندگی کا طریقہ، جس کے نظام میں میرا کسی طرح سے کوئی شریک نہیں، تو عبادت و بندگی میں میرا شریک کیوں؟

آخر میں ایک چیلنج کیا کہ آپ جس آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر بیٹھ کر فخر کرتے ہو، اگر دونوں میں سے ایک اگر اپنا توازن کھو دے تو کیا اس میں توازن پیدا کرنے کی طاقت کسی میں ہے؟

کیا آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے اللہ کے سوا کوئی اور ہے جو خدا کی صفات اور اختیارات کا مالک ہو؟ وہ آپ کو کہتے ہیں، آپ اس زمین پر غیر ذمہ دار نہیں ہیں، لیکن آپ کو اپنے تمام اعمال کا حساب دینا ہوگا، کیا اس میں کوئی تعجب کی بات ہے؟ کیا تم ہر روز نہیں دیکھتے کہ بے جان انڈے سے چہچہاتا چوزہ نکلتا ہے اور زندہ مرغی بے جان انڈا دیتی ہے۔ بے جان زمین سے پیداوار ہوتی ہے۔ پھر وہی زرخیز زمین بے جان ہوجاتی ہے، خاک اڑنے لگتی ہے، تو کیا اللہ تعالیٰ کے لیے یہ مشکل کام ہے کہ وہ تم سب کو دنیا کے خاتمے کے بعد دوبارہ زندہ کرے؟

اس سورت میں توحید کی تبلیغ، شرک کے ستونوں کا گرنا، دین حق کی پابندی کی تلقین ہے۔ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا ہے، اس پر سمجھ میں آجائے ایسے دلائل دیئے، جس طرح اللہ تعالیٰ بارش برسا کر بنجر زمین کو ہریالی میں بدل دیتا ہے، رات دن کو باری باری لاتا ہے، انسان کو تخلیق کے مختلف مراحل سے گزارتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ مردہ انسان کو دوسری بار زندہ کرسکتا ہے۔ (خواطر قرآنیہ، قرآن سارانس گجراتی)

سورہ الحمد میں مبداء اور معاد کی تمام نعمتوں کا اجمالاً ذکر کیا اور باقی ان چار سورتوں میں کسی جگہ کسی نعمت کو تفصیل کے ساتھ اور کسی نعمت کو اجمال اور ایجاز کے ساتھ بیان کیا اور چونکہ یہ سورت ان پانچ سورتوں میں کی آخری سورت ہے جن کو الحمد سے شروع فرمایا، اس لیے اس سورت میں آخری انجام یعنی سعادت اور شقاوت کا کافی بیان فرمایا۔ لہذا عاقل اور دانا کا کام یہ ہے کہ انجام کی فکر کرے اور اللہ کے وعدہ کو حق جانے اور شیطان کے دھوکہ میں نہ آئے اور بڑے اعمال کو اچھا نہ سمجھے، آخرت کی عزت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں ہے اور آخرت کی فکر اور اس کی تیاری میں سعادت ہے اور آخرت کا انکار اور اس سے غفلت انسان کی شقاوت ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۶/ ۳۸۴)

اس سورہ میں توحید باری کی دعوت، اس کے وجود پر دلائل، شرک کی بنیادوں کا انہدام اور دین حق پر قائم رہنے کی تاکید ہے۔ سورت کی ابتدا میں اس خالق اور مبدع ہستی کا ذکر خیر ہے جس نے عالم کون ومکان کو، انسانوں، فرشتوں اور جنات کو پیدا کیا، انسانی نظروں کو ان تکوینی آیات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جو اس کتاب جہان کے ہر ورق پر پھیلی ہوئی ہیں۔

اہم نصائح:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا .... الی.................... إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَصْنَعُونَ ﴿٨﴾

آیت ۵ تا ۸ میں کئی اہم نصیحتیں کی گئی ہیں:

◇ اللہ اور اس کے رسول کے کئے ہوئے سب وعدے حق اور سچ ہیں اور جو ان کے خلاف ہیں ان میں دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔

◇ دنیا کی زندگی کے دھوکے میں نہ پڑو کیونکہ جو اس کے دھوکہ میں آ گیا وہ اس میں مشغول ہو کر اللہ اور آخرت کو

بھول جاتا ہے۔

◇ شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے، اس کا کام ہی انسان کو ورغلانہ اور اللہ سے غافل کرنا ہے، لہذا ایک عاقل انسان کو ہمیشہ اس سے ہوشیار اور دور رہنا چاہئے، اگر خدانخواستہ کبھی غلطی ہو بھی جائے تو فوراً توبہ کرلے۔

◇ شیطان کیونکہ اپنا انجام جانتا ہے کہ وہ جہنمی ہے، اس لئے وہ چاہتا ہے کہ انسانوں کو بھی جہنم میں لے جاؤں۔ اس لئے وہ لوگوں کے سامنے اچھائی کو برائی، بدی کو بھلائی، حق کو باطل اور باطل کو حق، نفع کو نقصان اور نقصان کو نفع بنا کر پیش کرتا ہے۔ اچھے اور برے کی تمیز ختم کر دیتا ہے۔ گویا کہ یہ دل کی موت ہوتی ہے اور آدمی کا اس حال پر پہنچ جانا نہایت خطرناک ہے کہ اس کی نگاہ میں ہدایت، گمراہی اور گمراہی ہدایت بن جاتی ہے۔

امام قشیری چوتھی صدی کے بزرگ گزرے ہیں۔ وہ اپنی کتاب ''رسالہ قشیریہ'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ شیطان انسان کا سخت ترین دشمن ہے، جس کے متعلق خود اللہ جل شانہ کا فرمان ہے **انه یریکم هو و قبیله من حیث لا ترونهم** (اعراف) وہ اور اس کا قبیلہ تمہیں ایسی جگہ سے دیکھ رہا ہے جہاں سے تم اسے نہیں دیکھ سکتے۔ اس کی دشمنی انسان کے لیے ہر لحظہ جاری ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسے آدم (علیہ السلام) کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا اور اس نے انکار کیا تو وہ مردود ٹھہرا مگر اس نے اللہ کے سامنے عہد کیا، پروردگار **لاغوینهم اجمعین** (الحجر) میں تیرے بندوں کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے مخلص بندوں کے۔ کہنے لگا، میں آگے پیچھے، دائیں بائیں غرضیکہ ہر راستے سے آکر انسان کو گمراہ کروں گا۔ چنانچہ شیطان اور اس کے چیلے ہر وقت انسان کے درپے رہتے ہیں۔ تو ایسے ازلی دشمن سے بچنے کے لیے امام قشیریؒ فرماتے ہیں کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنی چاہئے۔ اس سلسلہ میں حضور ﷺ نے بعض کلمات بتائے جن کے ورد سے شیطان کے شر سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ مثلاً **لاحول و لا قوة الا بالله** گناہ سے بچاؤ اور نیکی کی انجام دہی پس اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ممکن ہے، اسی طرح **اعوذ بالله من الشیطن الرجیم** میں مردود شیطان سے اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں۔ یہ الفاظ بھی آتے ہیں **اعوذ بالله من الشیطن الرجیم من همزه و نفخه و نفثه** میں اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں شیطان مردود کی چھیڑ چھاڑ، اس کے تکبر اور اس کے سحر سے۔ **اعوذ بالله القادر من الشیطن الغادر** میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں جو قادر ہے شیطان سے بچنے کے لیے جو غدار ہے۔ بہرحال شیطان کے اغواء سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی استعانت کی ضرورت ہے۔

بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جب انسان سو جاتا ہے اور شیطان کو انسان کے اندر داخل ہونے کے لیے کوئی راستہ نہیں ملتا تو وہ ناک میں گھس کر بیٹھ جاتا ہے اور دل پر پھونکیں مارتا رہتا ہے اور اس طرح وسوسہ اندازی کرتا ہے پھر جب انسان بیدار ہو کر اللہ کا نام لیتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اس کو اللہ کے ذکر سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔

(معالم العرفان: ۱۵/ ۵۳۰)

◇ ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ آخرت میں انسان کی مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ ہے۔

◇ ہدایت اور گمراہی، نیکی اور بدی اور حق و باطل میں تمیز من جانب اللہ ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گمراہی میں پڑا رہنے دیں اور جس کو چاہے ہدایت سے نوازیں؛ اس لئے ہدایت کا طالب ہر کسی کو اللہ سے ہی ہونا چاہئے اور اسی سے ہدایت اور صراط مستقیم کی دعا کرتے رہنا چاہئے۔

مرنے کے بعد کی زندگی پر حسی دلائل:

مرنے کے بعد کی زندگی پر ایسے حسی اور بدیہی دلائل ذکر کیے ہیں جو ہر شہری اور دیہاتی کی سمجھ میں آسکتے ہیں، بتایا گیا کہ اللہ بارش سے مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے، شب و روز کو یکے بعد دیگرے لاتا ہے اور جو انسان کو تخلیق کے مختلف مراحل سے گزارتا ہے وہ مردہ انسانوں کو بھی دوبارہ زندہ کرسکتا ہے۔(۹)

ایمان اور کفر کا فرق:

وَاللّٰهُ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ .... الی............وَمَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾

آیت ۹ تا ۲۲ چار مثالیں دے کر مؤمن اور کافر کا فرق بتایا گیا ہے۔

◇ پہلی مثال اعمیٰ اور بصیر سے دی گئی ہے یعنی مؤمن کی مثال آنکھوں والے کی سی ہے اور کافر کی مثال اندھے کی سی ہے، اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہوسکتے۔

◇ دوسری مثال ظلمت اور نور سے دی یعنی کافر کی مثال ظلمت اور تاریکی کی سی ہے اور مؤمن کی شان نور اور روشنی کی سی ہے اور روشنی اور اندھیرا دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔

◇ تیسری مثال ظل اور ٹھنڈی چھاؤں اور دھوپ سے دی گئی ہے، یعنی مومن کے ایمان پر جو ثمرۂ جنت مرتب ہوگا اس کی مثال ٹھنڈے سائے کی سی ہے اور کافر کے کفر پر جو ثمرۂ جہنم مرتب ہوگا، اس کی مثال جلتی ہوئی دھوپ کی سی ہے۔

◇ چوتھی مثال زندہ اور مردہ کی دی گئی ہے یعنی مؤمن مثل زندہ شخص کے ہے اور کافر مثل مردہ لاش کے ہے۔ (خلاصۃ القرآن)

فقراء الی اللہ:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ﴿۱۵﴾

اے دنیا جہان کے لوگو! تم سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف محتاج ہو۔ فَقار دراصل پشت کے مہرے کو کہا جاتا ہے، جس شخص کا مہرہ ٹوٹا ہوا ہو اس کی کمر سیدھی نہیں ہوسکتی اور اس لحاظ سے وہ محتاج ہوتا ہے۔ تو فرمایا تم سارے کے سارے اللہ کے دروازے کے فقیر ہو اور اپنی تمام حاجات اسی سے طلب کرتے ہو۔ سورۃ الرحمٰن میں بھی فرمایا ہے: آسمان اور زمین کی مخلوق اسی سے مانگتی ہے، مخلوق میں خواہ اللہ کے مقرب فرشتے ہوں یا جنات ہوں۔ نبی، ولی سب اللہ تعالیٰ کی

عنایات کے محتاج ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ انسان تو زبان وحال سے مانگتے ہیں مگر شجر وحجر صرف زبان حال سے طلب کرتے ہیں۔ درخت پودے وغیرہ جن میں حس وحرکت نہیں، جن کی زبان نہیں کہ وہ بول کر اپنی ضروریات کا اظہار کر سکیں۔ ان کی حالت اسی طرح جانور، کیڑے مکوڑے، چرند اور پرندے ہیں، سمندروں کی لاتعداد مخلوق ہے، سب کی حاجات ہیں اور وہ سارے کے سارے اپنی زبان حال ہی سے اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجات میں سوال کر رہے ہیں۔ اللہ کی مقرب مخلوق فرشتے بھی اللہ تعالیٰ سے ترقی وعروج اور انعامات کے طالب ہیں اور اپنے انداز سے درخواست کرتے ہیں۔ جنات کا اپنا انداز ہے غرضیکہ ساری مخلوق اسی کی محتاج ہے اور اسی کے آگے دست سوال دراز کئے ہوئے ہے۔ فرمایا: وہ صرف ایک ہی ذات ہے جو کسی سے سوال نہیں کرتی ہے، بلکہ سب اس کے سوالی ہیں۔ **و الله هو الغنی الحمید** اور وہ ذات خداوندی ہے جو بے نیاز اور تعریفوں والی ہے، وہ ہستی تمام کمالات کے ساتھ متصف ہے، ہر عیب اور نقص سے پاک ہے۔ ساری مخلوق اسی سے استعانت کرتی ہے، وہ ہر چیز کا خالق اور مالک ہے لہٰذا عبادت کے لائق بھی وہی ہے، اس کے علاوہ کوئی ہستی عبادت کے لائق نہیں۔ غنی اور صمد وہ ذات ہے جس کی طرف قصد کیا جاتا ہے اور اس کو کسی قسم کا احتیاج نہیں ہوتا۔ ہندی زبان میں ایسی ذات کو" نرادھار" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ابن ماجہ شریف کی روایت میں آتا ہے **من لم یسئل الله لغضب علیه** جو ذات اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتی اللہ اس پر ناراض ہوتا ہے کہ مجھ سے سوال کیوں نہیں کرتا۔ (معالم العرفان: ۱۵/ ۵۵۴)

قدرت کی بے شمار نشانیاں:

اس کے بعد دوبارہ وحدانیت اور قدرت کے دلائل سے یہ سورت بحث کرتی ہے، رنگا رنگ اور متنوع پھولوں، سفید، سرخ اور سیاہ پہاڑوں، مختلف رنگوں، زبانوں اور مزاجوں والے انسانوں اور ہزاروں قسم کے پرندوں، مچھلیوں، حشرات اور چوپاؤں میں اس کی قدرت کی بے شمار نشانیاں ہیں۔

سورہ فاطر میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ، اس کی شان خلاقی ورزاقی، اس کے کمالات واحسانات اور اس کے بعض عجائب قدرت کو بیان کرتے ہوئے آیت ۲۸ میں یہ ارشاد فرمایا: ان سب نشانیوں سے عبرت پکڑنا اور سبق حاصل کرنا انہی لوگوں کا کام ہے جن کے دل میں اللہ کی خشیت ہو اور خشیت کن کے دلوں میں ہوگی اس کے بارے میں اس آیت شریفہ میں فرمایا: اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔ اس آیت شریفہ کے تحت لکھا ہے کہ اس جملہ میں علماء سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اللہ کی عظمت وجلال کا اور اس کے احکام اور اوامر ونواہی کا علم ہو اور پھر وہ اللہ کے حکموں پر چلتے ہوں، جس درجے کا علم ہو اسی درجہ کا ان کو خوف وخشیت ہوگا۔ اس لئے نبی کریم ﷺ کے دل میں سب سے زیادہ خشیت تھی۔

حدیث شریف میں ہے کہ آپ یہ دعا مانگا کرتے تھے:

اللهم إني أسئلک من خشيتك ما تحول بيني و بين معاصيک.

ترجمہ: یا اللہ میں آپ سے آپ کی اتنی خشیت طلب کرتا ہوں کہ جو حائل ہوجائے میرے اور آپ کے معاصی کے درمیان۔

جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا: اللہ کی قسم میں تم سب سے زیادہ دل میں اللہ کی خشیت اور خوف رکھنے والا ہوں۔

دین اور کائناتی علم رکھنے والے علماء:

علم دین سے مقصود تزکیۂ نفس اور اصلاح عمل ہے ورنہ ہیچ ہے۔ جیسے علم طب سے مقصود جسمانی صحت کی حفاظت ہے، محض دواؤں کے نام اور ان کے خواص یاد کرلینا مقصود نہیں، یہ ناممکن ہے کہ واقع میں کوئی شراب پیئے اور اس کو نشہ نہ ہو۔ اسی طرح یہ ناممکن ہے کہ کوئی حقیقۃً علم دین کا ایک جام پیئے اور اس پر دین کا نشہ اور سکر نہ آئے۔ عالم دین خدا کے نزدیک وہ ہے کہ علم اس کے دل میں گھر کرگیا ہو، محض باتیں بنانے اور لمبی تقریر کرنے سے اللہ کے نزدیک عالم نہیں ہوجاتا، اگر واقع میں دل میں خشیت اور خوف خداوندی ہوتا تو معاصی پر جرأت نہ کرتا۔ (تفسیر ادریسی: ۶/۴۱۱)

اہل علم کہتے ہیں: اس آیت کے تحت صرف وہ علماء نہیں آتے جو شریعت کا علم رکھتے ہیں، بلکہ ہر وہ شخص آتا ہے جو خدا ترسی دل میں رکھتا ہو اور اللہ اور اس کے احکام کی معرفت رکھتا ہو اور ان کا عمل بھی ان کے مرتبہ علم و معرفت کے مناسب رہتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ پھر اس تعریف کے تحت وہ کائناتی علم رکھنے والے بھی آجاتے ہیں جو صحیح نہج میں کائنات کے اسرار پر نظر ڈالتے ہیں، تو یہ نظر انہیں اللہ تعالی کی وحدانیت اور قدرت کے اعتراف پر مجبور کردیتی ہے اور یہی بات ان کے اندر اللہ کا خوف و خشیت اور عظمت پیدا کردیتی ہے۔ (خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

نفع بخش تجارت:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا .... الیٰ...............وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝۳۰

آیت ۲۹ اور ۳۰ میں آخرت کی نفع بخش تجارت کا طریقہ بتلایا گیا ہے۔

(۱) کتاب اللہ کی تلاوت جو تمام اذکار اور عبادات نافلہ کی جڑ ہے اور قرب خداوندی کا ذریعہ ہے۔ اس کی تلاوت گویا اللہ تعالی سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہونا ہے۔

(۲) نماز کی درستگی و پابندی جو تمام فرائض اور جسمانی عبادتوں کی جڑ ہے اور دین کا ستون ہے۔

(۳) ظاہری اور پوشیدہ طور پر خیرات کرنا جن میں تمام مالی عبادتیں آگئیں۔

ان تین کاموں کے کرنے والے یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی آخرت کی تجارت خسارے میں نہیں رہے گی اور یقینا اللہ تعالیٰ بھی ان کی تجارت کو خسارہ میں نہیں ڈالیں گے بلکہ اور زیادہ ہی نفع عطا فرمائیں گے۔ جیسے ان آیات کے آخری حصہ سے معلوم ہوتا ہے یعنی انہ غفور شکور یقیناوہ بہت بخشنے والا اور قدردان ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو یہ تجارت خوب زوروشور سے کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

امت کے تین گروہ:

قرآن کریم براہ راست تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا لیکن اس کا وارث پھر ان مسلمانوں کو بنایا گیا جنہیں اللہ نے اس کام کے لئے چن لیا تھا کہ وہ اللہ کی کتاب پر ایمان لائیں لیکن ایمان لانے کے بعد وہ تین گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک تو وہ تھے جو ایمان تو لے آئے لیکن اس کے تقاضوں پر پوری طرح عمل نہ کیا۔ فرائض میں بھی غفلت کی اور گناہوں کا بھی ارتکاب کیا، ان کے بارے میں اس آیت / ۳۲ میں فرمایا انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو فرائض وواجبات پر تو عمل کرتے ہیں اور گناہوں سے بھی پرہیز کرتے ہیں لیکن نفلی عبادات اور مستحب کاموں کو نہیں کرتے، ان کے بارے میں اس آیت میں فرمایا: انہی میں سے کچھ ایسے ہیں جو درمیانے درجے کے ہیں اور تیسرا گروہ وہ ہے جو صرف فرائض وواجبات پر اکتفا کرنے کے بجائے نفلی عبادتوں اور مستحب کاموں کا بھی پورا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں اس آیت میں فرمایا:' اور کچھ وہ ہیں جو اللہ کی توفیق سے نیکیوں میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور یہ اللہ کا بڑا افضل ہے۔ یہ تینوں ہی قسمیں مسلمانوں کی ہیں اور سب ہی اپنے ایمان کی بدولت ان شاء اللہ جنت میں جائیں گے مگر کوئی پہلے اور کوئی بعد میں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس آخری گروہ میں شامل فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کا حلم:

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

سورت کے اختتام پر اللہ کے حلم اور بردباری کا ذکر ہے کہ وہ گناہوں پر نقد اور فوری سزا نہیں دیتا۔

اگر ایسا ہوتا تو زمین پر انسان تو انسان کوئی حیوان اور چرند پرند بھی زندہ نہ رہ سکتا، اس نے جزا سزا کے لیے ایک وقت معین کر رکھا ہے وہ وقت جب آجائے گا تو پھر کامل عدل کا نظام حرکت میں آجائے گا۔

(خلاصۃ القرآن، خلاصۂ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:......مجازات سے پہلے جس تنبیہ کی ضرورت ہے وہ بذریعہ ارسال رسل ہوگی، تاکہ گرفت کے وقت یہ کہنے نہ پائیں کہ ہمیں بلا اطلاع گرفت کی گئی۔

خلاصہ رکوع:ا...... اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی خالق نہیں اور گرفت کا وعدہ بھی سچا ہے، لہذا اگر اصلاح کرنا چاہو تو

بذریعہ ملائکہ عظام جو تعلیم مل رہی ہے اس پر عمل کرلو۔ ماخذ: آیت: ۵، ۳، ۱۔

خلاصہ رکوع: ۲...... جس طرح کھاری اور میٹھا دریا یکساں نہیں ہو سکتے، اس طرح وحی سے استفادہ کرنے والے اور معرض برابر نہیں ہو سکتے۔ ماخذ: آیت: ۱۲۔

خلاصہ رکوع: ۳...... نور اور ظلمت، سایہ اور دھوپ، مردہ اور زندہ جس طرح برابر نہیں ہو سکتے، اسی طرح مستفیدین وحی اور معرضین برابر نہیں ہو سکتے۔ ماخذ: آیت ۱۸ تا ۲۲۔

خلاصہ رکوع: ۴...... جس طرح ایک پانی سے مختلف الاذواق اور مختلف الالوان اور مختلف الخواص اشیاء پیدا ہوتی ہیں، اسی طرح رحمت الٰہی کے باب مفتوح ہونے پر قلوب سے مختلف کیفیات ظاہر ہوتی ہے۔ ماخذ: آیت: ۲۷، ۲۸۔

خلاصہ رکوع: ۵...... ہم نے تمہیں خلیفہ بنا کر رحمت الٰہی کا باب مفتوح کر دیا ہے، فائدہ اٹھاؤ گے تو بھلا تمہارا ہے ورنہ نقصان بھی تمہارا ہے۔ ماخذ: آیت: ۳۹۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورہ یٰس

اس سورت میں اللہ تعالی نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی وہ نشانیاں بیان فرمائی ہیں جو نہ صرف پوری کائنات میں بلکہ خود انسان کے اپنے وجود میں پائی جاتی ہیں، اللہ تعالی کی قدرت کے ان مظاہر سے ایک طرف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو ذات اتنی قدرت اور حکمت کی مالک ہے اس کو اپنی خدائی کا نظام چلانے کے لئے نہ کسی شریک کی ضرورت ہے نہ کسی مددگار کی، اس لئے وہ اور صرف وہ عبادت کے لائق ہے، اور دوسری طرف قدرت کی ان نشانیوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جس ذات نے یہ کائنات اور اس کا محیر العقول نظام پیدا فرمایا ہے، اس کے لئے یہ بات کچھ بھی مشکل نہیں ہے کہ وہ انسانوں کے مرنے کے بعد انہیں دوسری زندگی عطا فرمائے، اس طرح قدرت کی ان نشانیوں سے توحید اور آخرت کا عقیدہ واضح طور پر ثابت ہو جاتا ہے، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو یہی دعوت دینے کے لئے تشریف لائے ہیں کہ وہ ان نشانیوں پر غور کر کے اپنا عقیدہ اور عمل درست کریں، اس کے باوجود اگر کچھ لوگ اس دعوت کو قبول نہیں کر رہے ہیں تو وہ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں؛ کیونکہ اس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالی کی طرف سے عذاب کے مستحق بن رہے ہیں، اسی سلسلے میں آیات نمبر ۱۳ سے ۲۹ تک ایک ایسی قوم کا واقعہ ذکر فرمایا گیا ہے جس نے حق کی دعوت کو قبول نہ کیا؛ بلکہ حق کے داعیوں کے ساتھ ظلم و بربریت کا معاملہ کیا جس کے نتیجے میں حق کے داعی کا انجام تو بہترین ہوا لیکن حق کے یہ منکر اللہ تعالی کے عذاب کی پکڑ میں آ گئے؛ چونکہ اس سورت میں اسلام کے بنیادی عقائد کو بڑے فصیح و بلیغ اور جامع انداز میں بیان فرمایا گیا ہے، اس لئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے اس سورت کو قرآن کا دل قرار دیا ہے۔ (توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی ۳۶ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۴۱ ہے، اس سورۃ میں ۵ رکوع، ۸۳ آیات، ۷۳۹ کلمات اور ۳۰۹۰ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کو شروع ہی لفظ یٰسین سے فرمایا گیا، اس لئے علامت کے طور پر اس سورۃ کا نام یٰسین مقرر ہوا۔

ربط:

اس سورۃ کا خلاصہ تین مضامین ہیں، جن میں سے ایک اثبات رسالت ہے اور پہلی سورۃ میں اس رسالت سے کفار کا انکار واستکبار مذکور تھا، جس سے اس کے خاتمہ اور اس سورۃ کے شروع میں ارتباط ظاہر ہو گیا، اس سورۃ میں دوسرا مضمون اثبات حشر اور تیسرا اثبات توحید ہے۔

فائدہ:

لفظ یٰسین بعض کے نزدیک قرآن پاک کا نام ہے، بعض نے فرمایا ہے کہ یہ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور بعض نے کہا کہ یہ سورۃ کا نام ہے جس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔ **ان الله قرأ طٰه ويٰسين قبل ان خلق السموات و الأرض بالف عام.**

فضائل:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر شے کا دل ہوتا ہے قرآن کا دل سورۃ یٰسین ہے، جو شخص اس سورۃ کو ایک مرتبہ پڑھے گا اللہ عزوجل اس کو دس قرآن پڑھنے کا ثواب عطا فرمائے گا۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس سورۃ کو قرآن کا دل اس لئے فرمایا گیا کہ یہ سورۃ قرآن کی خاص دعوت یعنی توحید و رسالت و آخرت کو نہایت پرزور طریقہ سے پیش کرتی ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اس سورۃ کو قرآن کا قلب اور دل اس لئے فرمایا کہ انسان کی زندگی کا دارومدار دل پر ہے اور روحانی زندگی کا دارومدار ایمان پر ہے، جس کے خاص اور اہم ترین اصول تین ہیں۔ توحید، رسالت، اور آخرت، اس سورت میں ایمان کے ان تین اہم اصولوں کو- جو دین کا دل و جان ہیں- نہایت مدلل اور مفصل بیان کیا گیا ہے اور ان سب کی جڑ حشر و نشر کا تقرر اور آخرت کی فکر اور تیاری ہے جو اس سورۃ میں خاص طور پر بیان فرمائی گئی ہے۔ اور منکرین حشر کے شبہ کا نہایت مدلل مکمل اور مفصل جواب دیا گیا ہے، پس ایمانی حیات کا سارا دارومدار خوف خدا اور یقین آخرت پر ہے اور یہی سارے دین کا دل ہے جس پر روحانی زندگی کا دارومدار ہے، تو جس دل کو آخرت کی فکر ہے وہ دل تو زندہ ہے، ورنہ مردہ ہے، ایک حدیث میں ہے کہ اس سورۃ کے پڑھنے سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور اس کو اپنے مرنے والوں پر پڑھا کرو۔

علماء نے لکھا ہے کہ ہر سختی کے وقت یٰسین شریف پڑھنی چاہئے کہ اس کی برکت سے وہ سختی رفع ہو جاتی ہے۔ حاجت پوری ہوتی ہے اور موت کے وقت پڑھنے سے میت کی روح آسانی سے نکلتی ہے اور ایمان نصیب ہوتا ہے اور رحمت و

برکت نازل ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری چاہت اور خواہش ہے کہ میری امت کے ہر فرد کے دل میں یہ سورۃ ہو۔

ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ جو اس سورۂ یٰسین کو شروع دن میں پڑھے اس کی تمام دن کی حوائج اور ضرورتیں پوری ہو جائیں۔

خلاصۂ سورۃ:

اس سورۃ میں سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو برحق کہا گیا، یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم یقینا اللہ کے رسول ہیں، منکروں کے انکار سے کچھ نہیں ہوتا، اس دنیا کی ساخت ہی کچھ ایسی رکھی گئی ہے کہ کچھ لوگ آپ کا رسول ہونا تسلیم کریں گے اور کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے قائل نہ ہوں گے اور ایمان نہیں لائیں گے بلکہ الٹے مخالف ہو جائیں گے، ایسے لوگوں کے حق میں ڈرانا یا نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں، جو ڈر کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت مان لیں گے وہ سعادت مند ہیں اور انہیں آخرت میں بڑی راحت و آسائش نصیب ہوگی، اس کے ایمان لانے والوں اور انکار کرنے والوں کا درجہ ایک خاص مثال سے واضح کیا گیا اور رسولوں کے انکار کرنے والوں پر افسوس کیا گیا کہ وہ اپنے بے گانہ رویہ سے آخرت کا سخت عذاب خرید رہے ہیں، رسالت کی اہمیت جتلانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی معرفت کی طرف توجہ دلائی گئی اور بتلایا گیا کہ اس عالم میں اس کی قدرت کی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جو اس دنیا کے بنانے اور پالنے والے کا پتہ دے رہی ہیں، اس کے بعد قیامت کا نقشہ کھینچا گیا اور ایمان لانے والوں کے لئے آخرت میں انعام و اکرام اور انکار کرنے والوں کی سزا کا بیان فرمایا گیا پھر قرآن کی اہمیت جتلائی گئی اور بتلایا گیا کہ یہ کوئی شاعرانہ خیال اور فرضی باتوں کی کتاب نہیں ہے، بلکہ اس میں ہر چیز اور ہر بات کی اصل حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ پھر سمجھایا گیا کہ انسان کا اللہ کی طرف سے منہ موڑنا ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں، انسان کو چاہئے کہ اللہ کی قدرت کا صحیح اندازہ کر کے اس کی طاعت و بندگی بجالائے اور خوب سمجھ لے کہ مر کر دوبارہ زندہ ہونا ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ اللہ کے نزدیک نیست و نابود ہو جانے کے بعد اس چیز کو دوبارہ بنا دینا کچھ مشکل نہیں، دنیا کی ہر چیز چھوٹی ہو یا بڑی اس کے دست قدرت میں ہے، وہ جس چیز کا بھی ارادہ کرتا ہے وہ چیز اس کا کلمہ پاتے ہی موجود ہو جاتی ہے، وہ ہر برائی، عیب، بیچارگی، کمزوری سے پاک اور مبرا ہے اور بالآخر تمام انسانوں کو اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

جان کنی کی آسانی:

ہمارے مسلمان بھائی اس سورت کو جان کنی کی آسانی کے لیے تو پڑھتے ہیں لیکن اس پر عمل کرنے والے کم ہیں، جبکہ اصل فضیلت وثواب اور اللہ کا قرب اس کے مشمولات پر عمل کرنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

رسالت کی سچائی پر قرآن کی قسم:

یٰسٓ ﴿۱﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ ﴿۲﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۳﴾ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۴﴾

اس سورت کی ابتدا میں اللہ تعالی نے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی سچائی پر قرآن کی قسم کھائی ہے۔ (۲-۴)

نکتہ:

والقران الحکیم قسم ہے اور **انک لمن المرسلین علی صراط مستقیم**۔ جواب قسم ہے۔ اس قسم سے ایک تو کفار کا رد مقصود ہے جو قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ یہ رسول نہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں قسم کھا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کو بیان کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں، دوم یہ کہ یہ قسم دراصل جواب قسم کی دلیل ہے۔ دلائل نبوت اور براہین رسالت میں سب سے بڑی دلیل آپ کی نبوت کی یہ قرآن حکیم ہے، جس طرح توریت اور انجیل حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) کی نبوت کی دلیل تھی، اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر یہ قرآن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کی دلیل ہے اور اس کے بعد کا یہ جملہ (علی صراط مستقیم) پہلے جملہ کی تاکید ہے، اس لئے کہ جو رسول ہوگا وہ ضرور راہ راست پر ہوگا۔ ان آیات میں قرآن حکیم کی قسم کھا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو بیان کیا، قرآن حکیم آپ کی نبوت کی سب سے بڑی علمی دلیل ہے، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاص خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی نبوت و رسالت کو قسم کے ساتھ بیان کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کسی اور نبی اور رسول کی رسالت کو قسم کھا کر نہیں بیان فرمایا اور اس کے بعد آنے والے جملہ **لتنذر قوما** سے یہ بتلایا کہ نبی کا کام انذار ہے نہ کہ اجبار یعنی نبی کا کام فقط ڈرانے کا ہے باقی ہدایت دینا یہ اللہ کا کام ہے۔ (تفسیر ادریسی: ۶/ ۴۳۲)

کفار قریش کا کفر وضلال:

پھر ان کفار قریش کا تذکرہ ہے جو کفر و ضلال میں بہت آگے نکل گئے تھے، جس کی وجہ سے وہ اللہ کے عذاب کے مستحق ہو گئے۔

ایک بستی میں پیغمبروں کا پہنچنا اور بستی والوں کا معاندانہ طریقہ پر گفتگو کرنا:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾

ان آیات میں ایک واقعہ کا تذکرہ فرمایا ہے اور وہ یہ کہ ایک بستی (جس کا نام مفسرین نے انطاکیہ بتایا ہے) میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو فرستادہ گئے، مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ دونوں نبی نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ کے رسول حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بھیجے ہوئے آدمی تھے جو انہوں نے اپنے حوارین میں سے بھیجے تھے، چونکہ اللہ تعالیٰ کے ایک رسول نے انہیں بھیجا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت فرمائی اور (اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ) فرمایا اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ

حضرات مستقل نبی تھے، پہلے دو حضرات تشریف لے گئے اور انہوں نے بستی والوں سے کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے ہوئے ہیں، ہماری بات سنو، دین اسلام قبول کرو اور توحید پر آؤ، یہ بات سن کر بستی والوں نے انہیں جھٹلا دیا اور کہا کہ نہیں تم لوگ اللہ کے رسول نہیں ہو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک تیسرے آدمی کو بھیجا جس کے ذریعہ پہلے دو آدمیوں کی تائید کرنا مقصود تھا، اب ان تینوں نے مل کر وہی بات کہی کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں، تم ایمان لاؤ، توحید کو قبول کرو، بستی والوں نے کہا کہ تم کو کیسے اللہ کا فرستادہ مانیں؟ تم تو ہمارے ہی جیسے ہو، تم میں ایسی کونسی فضیلت کی بات ہے جس کی وجہ سے تم اللہ تعالیٰ کے پیغمبر بنائے گئے؟ تمہارا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی ہے ہم اسے نہیں مانتے، ہمارے نزدیک تو رحمن نے تم پر کچھ بھی نازل نہیں فرمایا، تم جو یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہیں یہ جھوٹ ہے۔

ان تینوں حضرات نے کہا کہ تم مانو یا نہ مانو ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم ضرور ضرور تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں، تمہارے ماننے نہ ماننے سے ہمارے کام پر کچھ اثر نہیں پڑتا، ہم نتیجہ کے مکلف نہیں ہیں، ہماری ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ خوب اچھی طرح واضح طور پر بیان کریں، ماننا نہ ماننا یہ تمہارا کام ہے، بستی والے کہنے لگے کہ تمہارا آنا تو ہمارے لیے منحوس ہو گیا، ایک تو تمہارے آنے سے ہمارے اندر دو فرقے ہو گئے، کوئی تمہارا مخالف اور منکر ہے اور کوئی تمہارا موافق ہے (اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ ان لوگوں کے انکار کی وجہ سے بطور عذاب بعض چیزوں کا وقوع ہو گیا تھا، اس کو انہوں نے نحوست بتایا) گاؤں والوں نے مزید کہا کہ تم اپنی باتیں بس کرو، اگر باز نہ آئے تو تمہاری خیر نہیں، اگر تم نے اپنی باتیں نہ چھوڑیں تو ہم پتھروں سے مار مار کر ختم کر دیں گے اور اس کے علاوہ بھی ہم تمہیں سخت تکلیف پہنچائیں گے۔

ان تینوں حضرات نے کہا کہ تم نحوست کو ہماری طرف منسوب کر رہے ہو، تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہے، نہ تم کفر پر جمے رہتے نہ پھوٹ پڑتی، نہ کوئی اور تکلیف آتی، کرتوت تمہارے ہیں اور ان کا نتیجہ ہمارے ذمہ لگا رہے ہو، ہم نے تو اتنا ہی کیا ہے کہ تمہیں توحید کی دعوت دی ہے اور ایمان قبول کرنے کو کہا ہے، اس میں کون سی ایسی بات ہے جسے نحوست کا سبب بنالیا جائے؟ (صاحب تفسیر روح المعانی فرماتے ہیں: کیا اس لیے کہ تمہیں اس چیز کی وعظ و نصیحت کی گئی ہے جس میں تمہاری کامیابی ہے، تم نحوست کی فال لیتے ہو یا یہ کہ تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو۔)

ان تینوں حضرات نے آخر میں فرمایا (**بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ**) بلکہ بات یہ ہے کہ تم حد سے آگے بڑھ جانے والے ہو، تمہارا حد سے آگے بڑھنا یعنی کفر پر جمے رہنا ان چیزوں کا سبب ہے جنہیں ہماری آمد کی نحوست بتا رہے ہیں۔

یاد رہے کہ اسلام میں نحوست کوئی چیز نہیں ہے، تینوں حضرات نے جو یہ فرمایا کہ تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہے، یہ ان کے جواب میں (**علیٰ سبیل المشاکلہ**) فرمایا، کفر کی وجہ سے جو ان لوگوں کی کچھ گرفت ہوئی تھی اسے انہوں نے نحوست بتا دیا، تینوں حضرات نے ان کے الفاظ ان پر لوٹا دیئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا (**الطیرۃ شرک**) یعنی بد

شگونی شرک ہے۔(مشکوٰۃ المصابیح، انوار البیان)

اس واقعہ کو بیان کر کے اہل مکہ کو اس پر متنبہ کیا گیا کہ اہل انطا کیہ نے ہمارے رسولوں کو جھٹلایا، تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا اور ان کے مزعومہ سفارشی بھی ان کو اللہ تعالیٰ کی گرفت سے نہیں چھڑا سکے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی زبر دستی سفارش کرنے والا نہیں، اس لئے تم لوگ بھی اے اہل مکہ شفاعت قہر یہ کے عقیدہ کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرو اور ان تمام اقوام سابقہ کے احوال سے عبرت حاصل کرو، جن کو رسولوں کی تکذیب کی وجہ سے تباہ و برباد کر دیا گیا۔

مرشد کی شرائط:

اتَّبِعُوا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ۝۲۱

اس آیت میں مرشد راہنما کے لئے تین باتوں کے ضروری ہونے کا تذکرہ ہے:

(۱) ایک یہ ہے کہ مرشد نہ ہی جاہ کا طلب گار ہو، (۲) اور نہ ہی مال کا (۳) اور دوسری بات یہ کہ وہ خود بھی ہدایت پر ہو۔

ایک حق پرست ناصح:

اور جب انہی میں سے ایک حق پرست اور ناصح انہیں سمجھانے لگا تو انہوں نے اسے شہید کر دیا۔(۱۳۔۲۱)

اس ناصح کی گفتگو کا کچھ حصہ پارہ ۲۳ کی ابتدا میں ہے جس کا خلاصہ ان شاء اللہ وہیں پیش کیا جائے گا۔

موضوع سورۃ:......مسائل ثلاثہ توحید، رسالت، مجازات۔

خلاصہ رکوع:۱......اجمال مسائل ثلاثہ۔ ماخذ:(۱) رسالت آیت:۳۔(۲) توحید آیت:۵ تا ۱۱۔(۳) مجازات آیت:۱۲۔

خلاصہ رکوع:۲......تفصیل مسئلہ رسالت۔ ماخذ: آیت:۱۳ تا ۳۰۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

بائیسویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) عورت جب کسی اجنبی مرد سے بات کرے تو اسے چاہئے کہ اپنی آواز کو ذرا سخت کرے۔

(۲) عورتوں کو چاہئے کہ اپنے گھروں میں ٹھہری رہیں اور بلا ضرورت شدیدہ نہ نکلیں۔

(۳) جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ ہدایت کے راستے سے گمراہی کے راستے پر نکل جاتا ہے۔

(۴) مومنہ عورت کے لئے ضروری ہے کہ اپنے چہرے کو ڈھانپ لے جب اپنی کسی حاجت سے نکلے۔

(۵) اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کا شکر واجب ہے دل سے بھی، زبان سے بھی اور اعضاء و جوارح سے بھی۔

(۶) حسد ایسی بیماری ہے جس کی کوئی دوا نہیں اور حسد نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے لکڑی آگ کو۔

(۷) قیامت کا ایک دن مقرر ہے، اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔

(۸) نعمتوں کا تذکرہ ضرور کرتے رہنا چاہئے کیونکہ اس کی وجہ سے شکر اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی توفیق ملتی ہے۔

(۹) قیامت کے بارے میں اللہ کا وعدہ سچا ہے، اس لئے دنیا کی زندگی یعنی لمبی عمر، رزق کی وسعت اور جسم کے تندرست ہونے سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔

(۱۰) جو نیک عمل کرے گا تو اس میں اس کا فائدہ ہے اور جو برا عمل کرے گا تو اس کا نقصان ہے۔

* * *

پارہ: ۲۳

حبیب النجار:

بائیسویں پارہ کے آخر میں ان انبیاء کا تذکرہ ہو چکا ہے جنہیں اللہ نے ایک بستی والوں کی ہدایت کے لیے بھیجا تھا مگر وہ ہدایت کی راہ پر چلنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ جب بستی والوں نے تینوں انبیاء کو جھٹلا یا تو بستی والوں میں سے ایک شخص جس کا نام مفسرین نے ''حبیب النجار'' لکھا ہے وہ دوڑتا ہوا آیا تا کہ انبیاء کو ضرر پہنچانے کی صورت میں اپنی قوم کو اللہ کے عذاب سے ڈرائے اور انہیں انبیاء کی اتباع کی تلقین کرے، جب اس نے انہیں سمجھایا اور سب کے سامنے اپنے ایمان کا اعلان کر دیا تو وہ سب اس پر لپک پڑے اور انہوں نے اسے شہید کر دیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں آتا ہے کہ قوم نے اس شخص کو پاؤں کے نیچے اس قدر روندا کہ اس بیچارے کی آنتیں پیٹ سے باہر نکل آئیں اور وہ شہید ہو گیا۔ مفسر وہبؒ کا بیان ہے کہ جب وہ ظالم اس اہل ایمان کو ایذائیں دے رہے تھے تو وہ ان کے حق میں ہدایت کی دعائیں کر رہا تھا۔ یہ شخص بڑا ہی نیک اور عبادت گزار تھا۔ کہتے ہیں کہ دن بھر جو کچھ کما کر لاتا شام کو اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیتا۔ ایک حصہ بال بچوں کے حوالہ کرتا اور دوسرا محتاجوں میں تقسیم کر دیتا۔ (تفسیر ابن کثیر)

کاش میری قوم جان لیتی:

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿٢٧﴾

(آخر کار بستی والوں نے اس کو قتل کر دیا اور اللہ تعالی کی طرف سے اس سے) کہا گیا کہ: جنت میں داخل ہو جاؤ، اس نے (جنت کی نعمتیں دیکھ کر) کہا کہ: کاش! میری قوم کو معلوم ہو جائے کہ اللہ نے کس طرح میری بخشش کی ہے، اور مجھے باعزت لوگوں میں شامل کیا ہے۔

جنت میں اصل داخلہ تو قیامت کے بعد ہی ہوگا البتہ نیک لوگوں کو اللہ تعالی عالم برزخ میں بھی جنت کی بعض نعمتیں عطا فرما دیتے ہیں۔ اس طرح کا معاملہ ان کے ساتھ بھی ہوا، ان جنت کی نعمتوں کو دیکھ کر انہوں نے پھر بھی اپنی قوم کی خیر خواہی چاہی کہ کاش میری قوم کو معلوم ہو جائے کہ اللہ نے کس طرح میری بخشش کی ہے اور مجھے باعزت لوگوں میں شامل کیا ہے۔

آیت ۲۷ میں قرآن کریم نے اس مرد مومن کے قول ''کاش میری قوم کو معلوم ہو جائے''، نقل کر کے درحقیقت کفار مکہ کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے ساتھی بھی اسی طرح تمہارے خیر خواہ اور سچے ہیں جس طرح وہ مرد مؤمن اپنی قوم کا سچا خیر خواہ تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ مومن شخص زندگی میں بھی اپنی قوم کا خیر خواہ رہا اور مرنے کے بعد بھی۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان آیات کے تحت ایک روایت لکھی ہے کہ عروہ بن مسعود ثقفیؓ نے جناب رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دوں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: کہیں تمہاری قوم تمہیں قتل نہ کردے۔ اس پر حضرت عروہ نے فرمایا کہ اس کا تو احتمال بھی نہیں کیونکہ وہ تو مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں تو آپ نے ان کو اجازت دے دی۔ جب یہ وہاں پہنچے اور لات وعزیٰ بتوں کے پاس سے گزرے تو کہنے لگے: اب تمہاری شامت آگئی، اس بات پر پورا قبیلہ ثقیف بگڑ بیٹھا۔ انہوں نے کہنا شروع کیا: اے میری قوم کے لوگو! ان بتوں کی پوجا کو ترک کردو، یہ لات وعزیٰ دراصل کوئی چیز نہیں، اسلام قبول کرو تو سلامتی حاصل ہوگی۔ اے میرے بھائی بندو! یقین مانو کہ یہ بت کچھ حقیقت نہیں رکھتے، ساری بھلائی اسلام میں ہے۔ ابھی تین مرتبہ ہی یہ کلمہ کہا تھا کہ ایک بدنصیب نے دور ہی سے تیر چلایا جوان کے پیوست ہوگیا اور وہ اسی وقت شہید ہوگئے۔ آنحضرت ﷺ کو اطلاع ملی تو فرمایا: یہ ایسے ہی ہے جیسے سورہ یٰسین والا مرد مومن تھا۔

اللہ تعالیٰ کا بندوں پر افسوس:

اس کے بعد اللہ تعالیٰ بندوں پر افسوس کا اظہار فرماتے ہیں کہ

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٣٠﴾

ان کے پاس جو بھی رسول آتا ہے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ (۳۰)

تکوینی دلائل:

اللہ تعالیٰ کے وجود، توحید اور قدرت کے تکوینی دلائل جو قرآن کریم میں بار بار مذکور ہیں ان میں سے سورہ یٰسین میں چار قسم کے دلائل بیان کئے گئے ہیں:

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا .... الیٰ.............. وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿٤١﴾

(۱) مردہ زمین: جسے بارش سے زندہ کر دیا جاتا ہے؛ چنانچہ ارشاد فرمایا اور ان کے لئے ایک نشانی وہ زمین ہے جو مردہ پڑی ہوئی تھی، ہم نے اسے زندگی عطا کی اور اس سے غلہ نکالا جس کی خوراک یہ کھاتے ہیں۔ (آیت ۳۳)

(۲) لیل ونہار: چنانچہ ارشاد فرمایا اور ان کے لئے ایک اور نشانی رات ہے، ہم اس پر سے رات کا چھلکا اتار لیتے ہیں تو یکایک اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔ (آیت ۳۷)

(۳) سورج اور چاند: ارشاد فرمایا اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ سب اس ذات کا مقرر کیا ہوا نظام ہے جس کا اقتدار بھی کامل، جس کا علم بھی کامل۔ (آیت ۳۸)

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ کائنات میں اصل اندھیرا ہے،سورج کے نکلنے سے روشنی کا غلاف کائنات پر چڑھ جاتا ہےاور جب سورج ڈوب جاتا ہےتو پھر اندھیرا واپس آجاتا ہےاور چاند کے بارے میں ارشادفرمایا اور چاند ہے کہ ہم نے اس کی منزلیں ناپ تول کرمقرر کردی ہیں، یہاں تک کہ وہ جب ان منزلوں کے دوروں سے لوٹ کر آتا ہےتو کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح پتلا ہوکررہ جاتا ہے۔(آیت ۳۹)

فلکی نظام:

پرانے یونانی ماہرین فلکیات نے سات سیارے سورج، چاند، مریخ، زہرہ، مشتری، زحل اورعطارد دریافت کئے تھے،مگر موجودہ زمانے کے سائنسدانوں نے دومزید سیارے نیچوں اوراورانوس بھی دریافت کرلیے ہیں جس سے ان کی تعداد بڑھ کرنو ہوگئی ہے۔ان سب کاتعلق نظام شمسی سے ہےاور یہ سارا نظام کہکشاں کا ایک حصہ ہے۔ باریک باریک ستاروں سےمل کر بننے والی سڑکیں کہکشاں کہلاتی ہیں۔ ہرکہکشاں میں کروڑوں بلکہ اربوں ستارے ہوتے ہیں اور پورا نظام شمسی کسی ایک کہکشاں کا جزو ہے۔اس نظام میں سب سے بڑا سیارہ سورج ہےاور باقی سارے سیارے اس کے گرد چکرلگارہے ہیں۔ ہماری زمین سےتو اس نظام کا صرف ایک ہی چاندنظر آتا ہےمگرحقیقت میں سورج کے گرداکتیس چاندمحو گردش ہیں۔ زمین سےقریب ترین سیارہ چاند ہے جو یہاں سے دو لاکھ چالیس ہزارمیل دور ہے۔اگران دونوں کا درمیانی فاصلہ اس سے زیادہ ہوتا تو وہ فوائد حاصل نہ ہوسکتے جواس وقت ہورہے ہیں۔مثال کےطور پراگر چانداورزمین کا درمیانی فاصلہ صرف پچاس ہزارمیل ہوتا توسمندر سے پانی کی اتنی لہریں اٹھتیں کہ پوری زمین کا کاروبار درہم برہم ہوجاتا، کیونکہ اس وقت سمندروں میں جومدوجزر پیدا ہورہا ہےوہ چاندکی دولاکھ چالیس ہزارمیل کی دوری کے اثرات سے پیدا ہورہا ہے۔اگر یہ فاصلہ کم ہوجائےتو چاند کےسمندر پراثرات کی مقدار بڑھ جائے گی اور پانی پورے کرہ ارض پرپھیل جائے گا۔

ہماری یہ زمین ایک ہزارمیل فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کررہی ہےجس کی وجہ سے رات دن اورمختلف موسم پیدا ہوتے ہیں۔ یہ موزوں ترین رفتار ہے کہ زمین پر رہنے والے جانداروں کے مناسب حال ہے۔اگر یہی رفتار دس ہزارمیل فی گھنٹہ ہوجائےتو دن اور رات صرف سواسوا گھنٹے کے رہ جائیں اوران حالات میں زمین کے باشندوں کا استقرارختم ہوکر رہ جائے اور وہ کوئی کام نہ کرسکیں۔اس کے برخلاف اگرزمین کی رفتارصرف ایک سومیل فی گھنٹہ تک کم ہوجائےتو ایک سو بیس گھنٹے کا دن اور اتنی ہی لمبی رات ہوجائے۔ظاہر ہے کہ اتنا لمبا عرصہ سورج کی تپش سے زندگی گزارنا مشکل ہوجاتا اور رات اتنی لمبی ہوتی کہ جانداروں کومنجمد کرکے رکھ دیتی اورزندگی کا سارا کاروبار ٹھپ ہوکررہ جاتا۔الغرض! اللہ تعالیٰ نے زمین اوردیگرسیاروں کی رفتاراس طریقے پرمقرر کی ہےجو جانداروں کی زندگی کے لیے موزوں ترین ہے۔

فضامیں نظرآنے والے ستاروں کی تعداد اربوں اور کھربوں تک ہےمگر وہ اللہ تعالیٰ کے مقررکردہ مدار میں مقررہ رفتار سےچل رہے ہیں۔اس زمین پرتوٹریفک میں ذراسی بےقاعدگی ہوجائےتو بےشمار گاڑیاں آپس میں ٹکراجاتی ہیں۔

مگر ستاروں اور سیاروں کا اتنا بہترین نظام اللہ نے قائم کیا ہے کہ ہر ستارہ اور سیارہ چل رہا ہے مگر آج تک کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ جب تک اللہ کو منظور ہے۔ یہ نظام چلتا رہے گا اور جب وہ چاہے گا اس کو ختم کر کے عالم بالا کا نظام لے آئے گا۔

(معالم العرفان: ۱۵/ ۶۵۰)

(۴) کشتیاں اور جہاز: ارشاد فرمایا اور ان کے لئے ایک اور نشانی یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔ (آیت ۴۱)

ان آیات کے ضمن میں آیت ۳۶ کے تحت اللہ نے ایک ایسی دلیل دی ہے جس کو اس وقت کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔ آج سائنس اس حقیقت اور اس دلیل کو تسلیم کر رہی ہے اور حقیقت یہ ارشاد فرمائی: ''پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کے جوڑے جوڑے پیدا کئے ہیں۔'' انسان کے جوڑے تو مرد اور عورت کی شکل میں واضح ہیں۔ نباتات میں نر اور مادہ ہونے کا علم لوگوں کو ہوتا ہے مگر اللہ تعالی واضح الفاظ میں یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں ابھی تمہیں معلوم ہی نہیں کہ ان کے بھی جوڑے ہوتے ہیں۔ لہذا اب آکر سائنس کو مختلف چیزوں کے جوڑے جوڑے ہونے کا معلوم ہو رہا ہے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

ایٹم میں بھی زوجیت:

یہاں تک کہ ''ایٹم'' جو کہ مادہ کے اجزاء میں سے سب سے چھوٹا جز ہے وہ بھی دو مختلف اجزاء یعنی الیکٹران اور پروٹان سے مرکب ہوتا ہے اور یہ دونوں جز نر اور مادہ کے مشابہ ہیں، سورہ یٰسین کے علاوہ سورہ ذاریات میں بھی اس علمی اور سائنسی تحقیق کی صدیوں پہلے نشاندہی کر دی گئی تھی، وہاں فرمایا گیا ''اور ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا بنایا ہے تا کہ تم نصیحت حاصل کرو''۔

کفار کا عناد اور سنگ دلی:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۷﴾

کفار کے عناد اور ان کی سنگدلی کو بیان کرتے ہیں کہ بڑے ہی سرکش ہیں، کتنے ہی دلائل بیان کرو مگر ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا، اپنی جہالت اور ضلالت پر سختی سے جمے ہوئے ہیں، نہ آگے کی فکر ہے، نہ پیچھے کی فکر ہے نہ پچھلے گناہوں کا خیال ہے اور نہ آئندہ گناہوں کی بدانجامی سے خطرہ ہے، نوبت بایں جا رسید کہ ضد اور عناد میں ان چیزوں سے بھی اعراض کرتے ہیں کہ جو عقلا عالم کے نزدیک بلکہ ان کے نزدیک بھی مسلم اور مستحسن اور قابل فخر ہیں، مثلاً جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں کچھ خرچ کرو (جو ان کے نزدیک بھی کار خیر ہے) تو بطور تمسخر یہ کہتے ہیں کہ ہم کیوں خرچ کریں، خدا خود قادر ہے وہ صاحب احتیاج کی حاجت کو پورا کر سکتا ہے تو جب خدا ہی نے ہمیں دیا تو ہم کیوں دیں، مگر یہ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ

اللہ تعالیٰ بلا واسطہ کسی کو رزق نہیں دیتے، یہ سارا عالم، عالم اسباب ہے، سارا عالم اسباب و وسائل کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، اسباب وسائل کو خدا تعالیٰ نے اپنی داد و دہش کا روپوش اور واسطہ اور ذریعہ بنایا ہے، اللہ کی تقدیر اور اس کی مشیت کا کسی کو علم نہیں، اسباب کے پردہ میں اس کی مشیت کا ظہور ہوتا ہے، زمین سے غلہ پیدا ہوتا ہے، دراصل اگانے والا خدا تعالیٰ ہے مگر زمین اس کی نعمت رزق کا واسطہ ہے، اسی طرح سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ فقراء کو دیا کریں، اصل دینے والا اللہ تعالیٰ ہے اور اغنیاء کے ہاتھ اللہ کی عطا کا واسطہ اور ذریعہ ہیں، ان کے واسطہ سے فقراء کو رزق پہنچتا ہے آخر ان دولت مندوں کو جو رزق مل رہا ہے وہ بھی اسباب و وسائل کے واسطہ سے مل رہا ہے، بلا واسطہ خدا تعالیٰ ان کو رزق نہیں دے رہا ہے اور آسمان سے کوئی خوان ان کے گھر میں نہیں اتر رہا ہے، بادشاہ بعض دفعہ خزانچی سے دلواتا ہے، دونوں صورتوں میں وہ بادشاہ ہی کی عطا ہے خزانچی عطائے شاہی کا ایک واسطہ ہے، یہ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ خدا تعالیٰ نے مخلوق کو مختلف قسم پر پیدا کیا ہے، کسی کو امیر اور کسی کو فقیر اور امیر کو یہ حکم دیا کہ ہماری عطا کردہ دولت میں سے کچھ حصہ فقیروں اور مسکینوں پر خرچ کرے مختلف قسم کی مخلوق پیدا کرنے سے اللہ کا مقصود بندوں کا امتحان ہے کہ کون بخل کرتا ہے اور کون اس کی دی ہوئی نعمت اور دولت کو اس کے حکم کے مطابق خرچ کرتا ہے پس تعجب ہے کہ ان لوگوں میں نہ کوئی تقویٰ ہے اور نہ خوف خدا ہے کہ حکم خداوندی پر چلیں اور نہ مخلوق پر رحم ہے، بڑے ہی سنگدل ہیں اور اپنے بخل کے لئے خدا کی مشیت کو بہانہ بناتے ہیں تا کہ فقیروں کو دے کر اپنے مزوں اور چٹخاروں اور گلچھروں میں فرق نہ آئے۔ (تفسیر ادریسی: ۶/ ۴۵۵)

صور پھونکے جانے کا تذکرہ:

اس کے بعد سورہ یسین قیامت کی ہولناکیوں اور صور پھونکے جانے کا تذکرہ کرتی ہے۔

◇ جس وقت پہلی بار صور پھونکا جائے گا، لوگ اپنے معمولات کی ادائیگی اور خرید و فروخت میں مشغول ہوں گے، صور اسرافیل کی آواز سن کر ان پر خوف اور گھبراہٹ کی کیفیت طاری ہو جائے گی، اسے ''نفخہ فزع'' بھی کہا جاتا ہے۔

◇ دوسری بار کے صور سے حی و قیوم کے سوا سب کو موت آجائے گی اور کوئی ذی روح زندہ نہیں رہے گا۔

◇ تیسری بار جب صور پھونکا جائے گا تو سب قبروں سے جی اٹھیں گے اور حاکم حقیقی کے سامنے پیش ہو جائیں گے۔ وہاں کسی پر ظلم نہیں ہوگا، مومنین متقین کو جنت اور جنت کی نعمتوں سے نوازا جائے گا، جبکہ مجرم جو کہ دنیا میں صلحاء کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے انہیں الگ کر دیا جائے گا۔ (خلاصۃ القرآن)

اعضاء ان کے خلاف:

قیامت کے دن جب کفار مجرموں کی صورت میں اللہ کے دربار میں حاضر ہوں گے تو انہیں اپنے گناہوں کا اقرار کرنا ہی پڑے گا، اس کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوگا، کیونکہ سورہ یسین کی آیت ۶۵ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٦٥﴾

’’ آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے ہم کلامی کریں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے۔‘‘ سورہ حم سجدہ میں ہے کہ ان کی آنکھیں، کان اور ان کی جلد یعنی کھال بھی ان کے اعمال کی گواہی دیں گی۔

مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ یکا یک ہنسے، پھر ہم سے دریافت کیا: جانتے ہو میں کیوں ہنسا؟ ہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی خوب جانتا ہے۔فرمایا میں بندے اور خدا کے درمیان ہونے والی گفتگو کا خیال کر کے ہنسا۔قیامت کے دن بندہ اپنے پروردگار سے کہے گا: کیا آپ نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی ہے؟ اللہ تعالی فرمائیں گے: ہاں دی ہے۔تو پھر یہ کہے گا میں کسی گواہ کی گواہی قبول نہیں کرتا، بس میرا بدن تو میرا ہے، باقی سب میرے دشمن ہیں۔اللہ تعالی فرمائے گا: اچھا ایسے ہی صحیح، تو ہی اپنا گواہ صحیح اور میرے بزرگ فرشتے گواہ نہ سہی؛ چنانچہ اسی وقت اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اعضاء بدن سے فرمایا جائے گا کہ بولو تم ہی گواہی دو کہ اس نے تم سے کیا کیا کام کئے۔وہ کھول کھول کر سچ سچ ایک ایک بات بتلا دیں گے۔پھر اس مہر کو جو منہ پر لگائی گئی تھی توڑ دیا جائے گا تو وہ اپنے اعضاء سے کہے گا کہ تمہارا ستیا ناس ہو، تم ہی میرے دشمن بن بیٹھے، میں تو تمہارے ہی بچاؤ کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ تو بندہ کافر کا حال تھا۔ایک دوسری روایت میں بندہ مومن کے حساب لئے جانے کا حال بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن مؤمن کو بلا کر اللہ تعالی اس کے سامنے اس کے گناہ پیش کریں گے اور پوچھیں گے کیا تم نے یہ گناہ کئے تھے؟ یہ بندہ مومن کہے گا: جی ہاں مجھ سے یہ خطائیں سرزد ہوئی تھیں۔اللہ تعالی فرمائیں گے: جاؤ ہم نے سب بخش دیں اور یہ معاملہ ایسے ہوگا کہ کسی اور مخلوق کو اس کا علم بھی نہ ہوگا اور اس کے بعد اس کی نیکیاں سب کے سامنے لائی جائیں گی کہ اس نے یہ نیکی بھی کی اور یہ نیکی بھی کی۔اللہ رب العزت ہمارے ساتھ بھی یہی معاملہ فرمائے۔آمین (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انسانوں کے اعمال کی حفاظت خود اللہ تعالیٰ نے مکمل طور پر کر رکھی ہے اور اس کا ہر قول اور فعل اس کے اعمال نامے میں درج ہو رہا ہے۔یہ اعمالنامہ موت کے وقت انسان کے گلے میں لٹکا دیا جاتا ہے اور قیامت والے دن متعلقہ شخص کے سامنے پیش کر کے اللہ تعالیٰ فرمائے گا **اقرا کتبک کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا** (بنی اسرائیل) یہ تیرا اعمالنامہ ہے، اسے خود ہی پڑھ لو۔حساب کتاب کے لیے آج کے دن یہی دستاویز کافی ہے۔ چنانچہ خواہ دنیا میں کوئی شخص پڑھا لکھا تھا یا ان پڑھ، اپنا اعمال نامہ خود پڑھ سکے گا۔اس وقت انسان خیال کرے گا کہ میرے اعمال تو میرے اعضاء کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جس خطہ زمین پر انسان نے کوئی اچھا یا برا کام کیا ہوگا زمین کا وہ ٹکڑا بھی اس کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دے گا۔وہاں کے اردگرد کی چیزیں بھی شہادت دیں گی۔ چنانچہ اذان والی حدیث میں آتا ہے کہ اذان کہنے والے شخص کے حق میں اس کے دائیں بائیں کے تمام شجر وحجر گواہی دیں گے، اسی طرح حج کا تلبیہ پکارنے

والے کے حق میں زمین کے آخری حصے تک کی تمام چیزیں گواہی دیں گی کہ مولا کریم! اس شخص نے تیرا نام احترام کے ساتھ بلند کیا تھا۔ (معالم العرفان: ۱۵/ ۶۷۴)

کن فیکون:

چونکہ اس سورت میں زیادہ تر بحث بعث بعد الموت کے حوالے سے ہے اس لیے اس کا اختتام بھی اس پر ہو رہا ہے، فرمایا گیا:

اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؔ بَلٰى ۗ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾

”کیا وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، وہ اس پر قادر نہیں کہ ان جیسے پیدا کر دے؟ کیوں نہیں؟ وہی ہے جو خوب پیدا کرنے اور علم رکھنے والا ہے، اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرما دیتا ہے کہ ہو جا! تو وہ ہو جاتی ہے۔“ (۸۱-۸۲)

حضرت حذیفہ بن الیمانؓ سے مروی ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو یہ کہتے سنا کہ گذشتہ امتوں میں سے ایک شخص پر موت آئی جو بدعمل تھا، اس نے اپنے اہل وعیال کو جمع کر کے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو لکڑیوں کا ایک بڑا انبار جمع کرنا اور پھر اس میں آگ لگانا، جب آگ خوب تیز ہو جائے تو مجھ کو اس میں ڈال کر جلا دینا یہاں تک کہ جب میرا گوشت پوست سب کوئلہ ہو جائے تو اس کو باریک پیس کر آدھا خشکی میں اور آدھا سمندر میں اڑا دینا، اس کے اہل وعیال نے حسب وصیت اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا دیا، اللہ تعالیٰ نے بحر و بر کو حکم دیا کہ اس کی راکھ کے ذرات کو جہاں جہاں ہوں جمع کر کے حاضر کریں، جب وہ تمام ذرات جمع ہو گئے تو اللہ نے ان کو زندہ ہو جانے کا حکم دیا، اس طرح سے وہ شخص دوبارہ زندہ ہو کر موجود ہو گیا، اللہ عزوجل نے اس سے پوچھا کہ یہ حرکت تو نے کیوں کی؟ اس نے عرض کیا کہ اے پروردگار میں نے یہ حرکت تیرے خوف کی وجہ سے کی اور تو اندرون حال کو خوب جانتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو بخش دیا۔ (بخاری ومسلم)

رکوع: ۳......تفصیل مسئلہ توحید۔ ماخذ: آیت: ۳۳۔

خلاصہ رکوع: ۴......تفصیل مسئلہ مجازات۔ ماخذ: آیت: ۵۱۔

خلاصہ رکوع: ۵......اعادہ مسائل ثلاثہ بطور نتیجہ۔ ماخذ: (۱) رسالت آیت: ۶۹، ۷۰۔ (۲) توحید آیت: ۷۱ تا ۷۷۔ (۳) مجازات آیت: ۷۸ تا ۸۴۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الصّٰفّٰت

مکی سورتوں میں زیادہ تر اسلام کے بنیادی عقائد یعنی توحید، رسالت اور آخرت کے اثبات پر زور دیا گیا ہے، اس سورت کا مرکزی موضوع بھی یہی ہے، البتہ اس سورت میں خاص طور پر مشرکین عرب کے اس غلط عقیدہ کی تردید کی گئی ہے جس کی رو سے وہ کہا کرتے تھے کہ فرشتے اللہ تعالی کی بیٹیاں ہیں، یہی وجہ ہے کہ سورت کا آغاز فرشتوں کے اوصاف سے کیا گیا ہے، کفار کو کفر کے ہولناک انجام سے ڈرایا گیا ہے۔

اس سورت میں جو چند تاریخی قصے بیان کئے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ سبق آموز قصہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ وہ اللہ کا اشارہ ملتے ہی اپنے محبوب اور اکلوتے بیٹے کو قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے تھے۔ اس میں ان کفار قریش کے لئے ہی سبق نہ تھا جو اپنے نسبی رشتے ابراہیم علیہ السلام سے جوڑتے تھے بلکہ ان مسلمانوں کے لئے بھی سبق تھا جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لا چکے تھے۔ یہ قصہ سنا کر انہیں بتایا گیا کہ اسلام کی روح کیا ہے۔ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے کیا تقاضے ہیں؟

اور انہیں متنبہ کیا گیا ہے کہ ان کی تمام تر مخالفت کے باوجود اس دنیا میں بھی اسلام ہی غالب آ کر رہے گا، اسی مناسبت سے حضرت نوح، حضرت لوط، حضرت موسی، حضرت الیاس اور حضرت یونس علیہم السلام کے واقعات مختصر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، خاص طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا جو حکم دیا گیا تھا اور انہوں نے قربانی کے جس عظیم جذبے سے اس کی تعمیل فرمائی، اس کا واقعہ بڑے مؤثر اور مفصل انداز میں اسی سورت کے اندر بیان ہوا ہے، سورت کا نام اس کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے۔ (توضیح القرآن، قرآن ایک نظر میں)

یہ قرآن کریم کی تلاوت کے اعتبار سے ۳۷ ویں سورت ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۵۶ نمبر پر ہے، اس سورت میں ۵ رکوع، ۱۸۲ آیات، ۸۷۳ کلمات اور ۳۹۵۱ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورت کی ابتداء ہی لفظ "والصّٰفّٰت" سے ہوئی ہے اس لئے بطور علامت اس کا نام سورۂ صٰفّٰت رکھ دیا گیا۔ صَفّٰت کے معنی ہیں صف باندھنے والے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ صفّٰت زاجرات، تالیات سے مراد فرشتے ہیں، حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ فرشتوں کی صفیں آسمانوں پر ہیں۔ مسلم شریف کی روایت ہے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہم کو سب لوگوں پر تین باتوں میں فضیلت دی گئی ہے۔ (۱) ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں جیسی کی گئیں۔ (۲) ہمارے لئے ساری زمین مسجد بنائی گئی۔ (۳) پانی نہ ملنے کے وقت مٹی کو ہمارے لئے پاک کرنے والا بنایا گیا۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اس طرح صفیں نہیں باندھتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے سامنے صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں، ہم نے عرض کیا کہ کس طرح فرشتے صف بناتے ہیں؟ آپ صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگلی صفوں کو پورا کرتے جاتے ہیں اور صفیں ملایا کرتے ہیں۔

ربط:

سورۃ سابقہ کے مجموعی مضامین توحید و رسالت کے اثبات اور منکرین توحید کے حق میں تھے، یہی مضامین اس سورۃ میں مذکور ہیں، چنانچہ مضمون توحید سے سورۃ کو شروع فرمایا گیا اور مسئلہ بعثت جس پر بعض دلائل توحید سے استدلال کیا گیا پھر مضمون رسالت ختم سورۃ تک مذکور ہے، اس کے بعد ''**فاستفتهم الربک**'' الخ سے توحید و تنزیہہ کی طرف عود کیا گیا اور ''**وان كانو اليقولون**'' سے منکرین کے حق میں وعید ہے، پھر خاتمہ میں ذوالجلال وتنویہ شان رسل کرام ہے جو توحید و رسالت کے مناسب ہے۔ واللہ اعلم

خلاصہ مضامین:

یہ سورۃ مکی ہے، اس لئے اس میں بھی عقائد سے متعلق مضامین توحید و رسالت اور آخرت وغیرہ خاص طور پر مذکور ہیں، جس وقت اس سورۃ کا نزول ہوا وہ وقت تھا جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید و اسلام کا انکار و مخالفت پوری شدت کے ساتھ کفار مکہ کر رہے تھے، اس لئے اس سورۃ میں کفار مکہ کو نہایت پرزور طریقہ سے تنبیہ کی گئی اور اخیر میں انہیں صاف طور پر خبردار کر دیا گیا کہ عنقریب یہی پیغمبر جن کا تم مذاق اڑا رہے ہو تم پر غالب آجائیں گے اور تم اللہ کے لشکر کو اپنے گھر کے صحن میں اترا ہوا پاؤ گے، یہ پیشین گوئی اس زمانہ میں کی گئی تھی جب کہ مخالفین کو اسلام اور مسلمانوں کی کامیابی اور غلبہ کے ظاہری آثار دور دور بھی کہیں نظر نہیں آتے تھے، جس وقت اہل اسلام بری طرح ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے تھے اور مسلمانوں کی قریب تین چوتھائی تعداد مکہ چھوڑ کر ہجرت کر چکی تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بمشکل ۴۰ یا ۵۰ صحابہ مکہ میں رہ گئے تھے اور انتہائی بے کسی کے ساتھ کفار کی زیادتیاں برداشت کر رہے تھے، ان حالات میں ظاہری اسباب کو دیکھتے ہوئے اہل مکہ کسی طرح باور نہیں کر سکتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو غلبہ حاصل ہو جائے گا بلکہ دیکھنے والے یہ سمجھ رہے تھے کہ دین اسلام مکہ کی کھائیوں ہی میں دفن ہو کر رہ جائے گا، مگر تاریخ گواہ ہے کہ صرف پندرہ سولہ سال کے عرصہ میں فتح مکہ کے موقع پر ٹھیک وہی پیش آیا جس سے کفار کو خبردار کیا گیا تھا، اس سورۃ میں تنبیہ کے ساتھ تفہیم و ترغیب بھی پورے طور پر موجود ہے۔ اور توحید و آخرت کے عقیدہ کی صحت پر مختصر مگر دل نشین دلائل دیئے گئے اور مشرکین کے عقائد کا رد فرمایا گیا، اسی سلسلہ میں گزشتہ انبیاء کرام کا ذکر فرمایا گیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے انبیاء کے ساتھ اور ان کی تکذیب کرنے والی قوموں کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے۔ اللہ نے اپنے وفادار بندوں کو کیسے نوازا اور ان کے جھٹلانے والوں کو کیسی سزا دی؟ اس سورۃ میں سب سے زیادہ سبق آموز واقعہ حضرت ابراہیم کی حیات طیبہ کا ہے کہ وہ اللہ کا حکم پاتے ہی اپنے پیارے بیٹے کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اس میں نہ صرف کفار مکہ ہی کے لئے سبق تھا جو حضرت ابراہیم کے ساتھ اپنے نسبی تعلق پر فخر کرتے تھے بلکہ ان مسلمانوں کے لئے بھی سبق تھا جو اللہ اور اس کے

رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے، ان کو یہ واقعہ سنا کر تعلیم دی گئی کہ ایک مؤمن صادق کو کس طرح اللہ کی رضا پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے، سورۃ کے اخیر میں جہاں کفار کو تنبیہ کی گئی وہیں اہل ایمان کو بشارت سنائی گئی کہ اس وقت جن مصائب سے انہیں سابقہ پڑ رہا ہے ان پر گھبرائیں نہیں، آخر کار غلبہ انہیں کو نصیب ہوگا اور اس وقت جو باطل کے علمبردار نظر آرہے ہیں یہ انہیں کے ہاتھوں مغلوب اور مفتوح ہو کر رہیں گے، چنانچہ چند ہی سال بعد واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ محض وقتی تسلی نہ تھی بلکہ ایک ہونے والا واقعہ تھا جس کی پیشین گوئی فرما کر ان کے دل مضبوط کئے گئے۔ خلاصہ یہ کہ اصل موضوع اس سورۃ کا توحید و آخرت ہے اس کی تعلیم دی گئی ہے، اس کے تقاضوں کے مطابق زندگی سنوارنے والوں کو کامیابی کی بشارت اور اس کے خلاف کرنے والوں کو بدانجامی سے ڈرایا گیا ہے واللہ اعلم!

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورت کی ابتداء تین قسموں سے:

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۝۱ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۝۲ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۝۳

اس سورت کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے تین قسمیں کھائی ہیں، حالانکہ اللہ کو کسی بات کی تصدیق کے لئے قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں یا پورے قرآن کریم میں اور جگہ بھی جہاں قسمیں کھائی ہیں تو وہ اول تو عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کا ایک اسلوب ہے، جس سے کلام میں زور اور تاثیر پیدا ہوتی ہے اور دوم یہ کہ جن چیزوں پر قسم کھائی گئی ان پر اگر غور کیا جائے تو وہ اس دعوے کی دلیل ہوتی ہے جو ان کے بعد مذکور ہوتا ہے۔ باقی ہمارے لئے یہ جائز نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی قسم کھائیں۔

سورہ صافات کے آغاز میں جو تین قسمیں کھائی ہیں وہ فرشتوں کی صفات ہیں اور ان میں بندگی کی تمام صورتیں جمع ہیں یعنی صف باندھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا، طاغوتی طاقتوں پر روک ٹوک رکھنا اور اللہ تعالیٰ کے کلام کی تلاوت اور ذکر میں مشغول رہنا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو بھی فرشتوں کی طرح صفوں کی درستگی کی تاکید فرمائی، چنانچہ آپ نے ارشاد فرمایا: ''تم اس طرح صفیں کیوں نہیں باندھتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے سامنے صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا کس طرح فرشتے صف بناتے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگلی صفوں کو پورا کرتے جاتے ہیں اور صفیں ملایا کرتے ہیں۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز میں ہمارے کندھوں کو ہاتھ لگا کر فرمایا کرتے تھے، سیدھے رہو آگے پیچھے مت ہو، ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ (معارف القرآن)

آسمان کے ستاروں کا کام:

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۨالْكَوَاكِبِ ۝۶ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝۷

سورہ صافات کی آیت ٦ اور ۷ میں ارشاد فرمایا: بے شک ہم نے نزدیک والے آسمان کو ستاروں کی شکل میں ایک سجاوٹ عطا کی ہے اور ہر شریر شیطان سے حفاظت کا ذریعہ بنایا ہے۔ان آیات میں آسمانوں، ستاروں اور شہاب ثاقب کا تذکرہ کرنے سے ایک مقصد تو توحید کا اثبات ہے کہ جس ذات نے یک وتنہا اتنے زبردست آفاقی انتظامات کئے ہوئے ہیں وہی لائق عبادت بھی ہے۔ دوسرے اسی دلیل میں ان لوگوں کے خیال کی تردید بھی کردی گئی ہے جو شیطان کو دیوتا یا معبود قرار دیتے ہیں اور بتادیا کہ یہ تو ایک مردود ومقہور مخلوق ہے، ان کو خدائی سے کیا واسطہ۔

اس کے علاوہ اس مضمون میں ان لوگوں کی بھی تردید ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والے وحی یعنی قرآن کو کاہنوں کی کہانت سے تعبیر کیا کرتے تھے۔

عقیدہ آخرت:

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ⑪.........الیٰ....................قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ⑱

آیت ۱۱ تا ۱۸ عقیدہ آخرت کا بیان ہے اور اس سے متعلق مشرکین کے شبہات کا جواب دیا گیا ہے کہ جب اللہ نے فرشتے، چاند، ستارے، سورج اور شہاب ثاقب جیسی مخلوقات اپنی قدرت سے بنا ڈالیں تو اس کے لئے انسان جیسی کمزور مخلوق کو موت دے کر دوبارہ زندہ کر دینا کیا مشکل ہے؟ جس طرح تمہیں پہلی مرتبہ چپکتی ہوئی مٹی سے بنایا اور روح پھونکی اسی طرح جب تم دوبارہ مر کر دوبارہ مٹی ہو جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں دوبارہ زندگی دے دیں گے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

مشرکین کا موقف:

فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ⑲

سورۂ صافات، بعث اور حساب و جزا کے مسئلہ سے بحث کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ بعث بعد الموت کے بارہ میں مشرکین کا موقف بڑا عجیب ہے، وہ اس عقیدے کا مذاق اڑاتے ہیں اور یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ہڈیوں کے چورا چورا ہونے اور خاک میں مل جانے کے بعد انسان دوبارہ کیسے زندہ ہوسکتا ہے؟ اللہ فرماتے ہیں:

جو کام انہیں مشکل بلکہ ناممکن محسوس ہوتا ہے وہ اللہ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں، جب حضرت اسرافیل تیسری بار صور پھونکیں گے تو یہ سب اپنی قبروں سے نکل کر کھڑے ہو جائیں گے۔(۱۹) (خلاصۃ القرآن)

جہنمیوں اور دوزخیوں کے احوال:

جہنمیوں اور دوزخیوں کے احوال بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کے سرداروں کے احوال کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ کافروں کے بڑے بڑے سردار جنہوں نے اپنے چھوٹوں کو بہکایا تھا جب ان کے سامنے آئیں گے تو بجائے اس کے کہ ان کی کوئی مدد کر سکیں سارا الزام انہی پر ڈال دیں گے کہ ہم نے تمہیں مجبور تھوڑی کیا تھا، تم خود ہی ہمارے بہکائے میں

آئے تھے۔

علماء کرام نے اس کے تحت لکھا ہے کہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو ناجائز کام کی دعوت دے اور اسے گناہ پر آمادہ کرنے کے لئے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے تو اسے تو دعوت گناہ کا عذاب بے شک ہوگا ہی، لیکن جس شخص نے گناہ کی دعوت کو اپنے اختیار سے قبول کرلیا وہ بھی اپنے عمل کے گناہ سے بری نہیں ہوسکتا، وہ آخرت میں یہ کہہ کر چھٹکارا نہیں پاسکتا کہ مجھے تو فلاں شخص نے گمراہ کیا تھا۔

جنتیوں کا آپس میں مکالمہ:

اس سورت میں جنتیوں کے آپس میں مکالمہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جنت میں تخت لگے ہوں گے، خدمت گار آگے پیچھے پھر رہے ہوں گے جوان جنتیوں کو میوے بھی لاکر دیں گے، ان کو شراب پیش کی جائے گی جو سفید رنگ کی ہوگی اور اس میں نشہ نہ ہوگا۔ اسی طرح کی نعمتیں ذکر کرتے ہوئے جنتیوں کے آپس کے مکالمہ کا تذکرہ ہے کہ ان میں سے ایک جنتی اپنا واقعہ سنائے گا کہ میرا ایک ساتھی تھا جو مجھے کہا کرتا تھا کہ بڑی عجیب بات ہے کہ تم آخرت کی زندگی پر ایمان رکھتے ہو، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جب مر کر مٹی ہو جائیں گے تو ہمیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور حساب کتاب لیا جائے گا اور جزا وسزا کا معاملہ ہوگا؟ یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ اللہ تعالی اس جنتی سے فرمائیں گے کہ کیا تم اپنے اس ساتھی کا حال جاننا چاہتے ہو؟ اگر چاہتے ہو تو اجازت ہے۔ سو وہ شخص جو قصہ سنارہا تھا جہنم میں جھانکے گا تو اس عقل پرست ساتھی کو جہنم کے وسط میں پڑا ہوا پائے گا۔ تو یہ جنتی اس ساتھی سے کہے گا کہ اللہ کی قسم تو تو مجھے بھی ہلاک کر چکا تھا، اگر میرے پروردگار کی مہربانی نہ ہوتی تو میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوتا جو عذاب میں حاضر کئے گئے ہیں۔ (آیت: ۵۱-۵۷)

علماء نے ان آیات کے تحت لکھا ہے کہ اس واقعہ کا ذکر کرنے کا اصل منشاء یہ ہے کہ لوگ اپنے حلقہ احباب میں اس بات کا دھیان رکھیں کہ کوئی شخص ایسا تو نہیں جو انہیں غلط راستے پر ڈالنا چاہتا ہو، چاہے عقیدے کے اعتبار سے ہو یا عمل کے، کیونکہ بری صحبت سے جو تباہی آسکتی ہے اس کا صحیح اندازہ آخرت ہی میں ہوگا اور اس وقت اس تباہی سے بچنے کا کوئی راستہ نہ ہوگا۔ اس لئے دنیا میں دوستیاں اور تعلقات بہت دیکھ بھال کر قائم کرنا چاہئیں۔ بسا اوقات کسی کافر یا نافرمان شخص سے تعلقات قائم کرنے کے بعد انسان غیر محسوس طریقے پر اس کے افکار ونظریات اور طرز زندگی سے متاثر ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ چیز آخرت کے انجام کے لئے خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے قصص:

آیت ۷۵ سے کچھ انبیاء علیہم السلام کے قصص بیان کئے جارہے ہیں تاکہ ان سے سبق حاصل کیا جائے۔ جن میں حضرت نوح، حضرت ابراہیم واسماعیل، حضرت موسی وہارون، حضرت لوط اور حضرت یونس علیہم السلام کے قصص بیان کئے گئے ہیں۔

◇ ان میں سے پہلا قصہ شیخ الانبیاء حضرت نوح علیہ السلام کا ہے جن کی قوم نے انہیں جھٹلایا تو جھٹلانے والوں کو غرق کردیا گیا۔

◇ دوسرا قصہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوۃ والسلام کا ہے جو دو مرحلوں میں بیان ہوا ہے۔

(۱) پہلے مرحلے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ کا تذکرہ ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنے والد اور قوم کو ایمان کی دعوت دی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کی قوم ان کو ایک میلے میں لے جانا چاہتی تھی مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے ان کو منع کردیا اور طبیعت کی خرابی کا عذر کردیا اور جب وہ لوگ چلے گئے تو ان کے مندر میں جا کر ان کے بتوں کو توڑ دیا اور سب سے بڑے بت کے کندھے پر کلہاڑی لٹکا دی۔ جب ان کی قوم کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کی کوشش کی لیکن اللہ تعالی نے اس آگ کو ہی ان کے لئے گل گلزار بنا دیا۔

(۲) دوسرا مرحلہ حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کا مشہور واقعہ ہے جس کی وجہ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح اللہ کا لقب ملا۔ سورہ صافات کی یہ خصوصیت ہے کہ اللہ تعالی نے یہ واقعہ پورے قرآن میں کہیں اور ذکر نہیں فرمایا بلکہ اسی جگہ ذکر فرمایا ہے۔

آپ علیہ السلام کو خواب میں بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم تین مرتبہ دیا گیا، چنانچہ آپ تسلیم ورضا کے پیکر بن کر فوراً تیار ہو گئے اور بیٹے نے بھی اللہ کے حکم کے آگے بخوشی اپنا سر جھکا دیا اور دونوں باپ بیٹے اللہ کے حکم کو پورا کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام پر چھری پھیرنے لگے تو اللہ کی طرف سے وحی آئی کہ آپ نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، بے شک یہ بہت سخت اور کٹھن آزمائش تھی، اب آپ بیٹے کی جگہ مینڈھے کو ذبح کیجئے۔

خواب کی حقیقت:

نبی کے خواب اور عام لوگوں کے خواب میں فرق ہوتا ہے۔ عام لوگوں کے خواب تین اقسام کے ہوتے ہیں۔ یعنی رحمانی، شیطانی اور نفسانی۔ رحمانی خواب مومن کے حق میں بشارت ہوتی ہے۔ شیطانی خواب شیطان کے اثر سے ہوتے ہیں اور نفسانی خواب وہ ہوتے ہیں جو انسانی خوراک کے اثرات پر مرتب ہوتے ہیں۔ مگر نبیوں کا خواب وحی ہی کی ایک قسم ہے کیونکہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کوئی حکم خواب کے ذریعے بھی دیتا ہے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ نبوت ملنے سے چھ ماہ قبل تک جو خواب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آتے تھے، وہ سچے ہوتے تھے اور ان کا نتیجہ روز روشن کی طرح سامنے آجاتا تھا۔ پھر اس کے بعد نزول وحی شروع ہوگیا۔ قرآن پاک میں حضرت یوسف (علیہ السلام) کے خواب کا ذکر بھی آتا ہے۔ اس کی تعبیر اگرچہ طویل عرصہ کے بعد جا کر نکلی مگر وہ حرف بہ حرف صحیح تھا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی خواب دیکھا تھا کہ آپ طواف کر رہے ہیں۔ آپ کا خیال تھا کہ شاید اسی سال یہ خواب پورا ہوگا۔ اور آپ عمرہ کی سعادت حاصل کریں

گے مگراس سال آپ بغیر عمرہ ادا کئے مقام حدیبیہ سے واپس آ گئے اور اگلے سال جا کر عمرہ ادا کیا۔اس طرح **لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق** (فتح) اللہ نے اپنے رسول کا خواب سچا کر دیا۔(معالم العرفان:۱۵/ ۵۲/ ۷)

◇ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے کے بعد موسی و ہارون والیاس علیہم السلام (کہ جن کو شام میں ایک ایسی قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا تھا جو ''بعل'' نامی بت کی عبادت کرتی تھی، اس بت کے نام پر ''بعلبک'' نامی ایک شہر آباد تھا جس کے آثار آج بھی دمشق کے مغرب میں ملتے ہیں۔) اور لوطؑ (جنہیں اردن کے اطراف میں ''سدوم'' والوں کو اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے بھیجا گیا تھا مگر وہ بدترین قسم کی شہوت پرستی اور کفر میں مبتلا ہو کر اندھے، بہرے ہو چکے تھے، پیغام ہدایت سننے کے لیے آمادہ نہ ہوئے اور بالآخر عبرتناک عذاب کی لپیٹ میں آ کر رہے۔) کے مختصر قصے ذکر کرنے کے بعد حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا گیا ہے۔حضرت یونس علیہ السلام نے ایک عرصے تک اپنی قوم کو ایمان لانے کی دعوت دی اور جب وہ نہ مانی تو ان کو متنبہ کر دیا کہ اب تم پر تین دن کے اندر عذاب آ کر رہے گا۔قوم کے لوگوں نے کہا کہ کیونکہ یہ جھوٹ نہیں بولتے ،اس لئے اگر یہ شہر چھوڑ گئے تو واقعی عذاب آنے والا ہے۔ادھر حضرت یونس علیہ السلام اللہ تعالی کے حکم سے بستی چھوڑ کر چلے گئے۔ادھر جب بستی والوں نے دیکھا حضرت یونس علیہ السلام بستی میں نہیں ہیں اور کچھ عذاب کے آثار بھی محسوس کئے تو انہوں نے عاجزی کے ساتھ توبہ کی جس کے نتیجے میں عذاب ٹل گیا۔حضرت یونس علیہ السلام کو ان کی توبہ کا یہ حال معلوم نہیں تھا، جب انہوں نے دیکھا کہ تین دن گزر گئے اور عذاب نہیں آیا تو انہیں ڈر ہوا کہ اگر میں بستی واپس جاؤں گا تو بستی والے مجھے جھوٹا سمجھیں گے اور یہ اندیشہ بھی تھا کہ جھوٹا سمجھ کر قتل ہی نہ کر دیں۔اس لئے اس خوف کی وجہ سے اللہ تعالی کا حکم آنے سے پہلے ہی وہ اپنی بستی میں جانے کے بجائے سمندر کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور ایک کشتی میں سوار ہو گئے جو آدمیوں سے بھری ہوئی تھی۔اللہ تعالی کو آپ کی یہ بات پسند نہ آئی کہ آپ حکم آنے سے پہلے ہی بستی سے نکل گئے۔اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ کشتی وزن کی وجہ سے ڈوبنے لگی، کشتی والوں نے کئی مرتبہ قرعہ ڈالا کہ کس کو کشتی سے نکالا جائے تاکہ کشتی ڈوبنے سے بچے۔اللہ کی شان ہر مرتبہ حضرت یونس علیہ السلام کا ہی نام آیا اور انہیں پانی میں پھینک دیا گیا جہاں آپ کو مچھلی نے اللہ کے حکم سے نگل لیا۔آپ کچھ عرصے مچھلی کے پیٹ میں رہے اور یہ دعا پڑھتے رہے:

لا إله إلا أنت سبحانك إني كنت من الظالمين

اس کی برکت سے اللہ نے آپ کو مچھلی کے پیٹ سے نجات دی اور ان کی قوم کو بھی توبہ کی برکت سے عذاب سے بچا لیا۔(خلاصہ مضامین قرآن کریم)

مصیبت زدہ آدمی کی دعا:

ترمذی شریف کی روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد موجود ہے **دعوۃ المکروب دعوۃ ذی النون**. یعنی مصیبت زدہ آدمی کی دعا یہی یونس (علیہ السلام) والی دعا ہے۔جو شخص مصیبت کے وقت یہ دعا کرے گا۔اللہ تعالیٰ ضرور اس کو قبول

کرے گا اور مصیبت سے رہائی عطا کرے گا۔مطلب یہ ہے کہ یہ دعا صرف یونس (علیہ السلام) کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہر دعا گو کی مصیبت اس دعا کی برکت سے دور کرے گا۔ (ترمذی)

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں کہ انبیاء چونکہ حقیقی گناہ سے پاک ہوتے ہیں اس لیے معمولی لغزش پر ان کی سزا حقیقی بھی نہیں ہوتی بلکہ ان کو صرف جسمانی تکلیف دی جاتی ہے۔ (بیان القرآن)

پیغمبروں کے واقعات میں بار بار بندہ ہونے کا ذکر:

مثلاً سورہ صافات میں ارشاد ہے:

اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۲﴾

قرآن مجید نے پیغمبرں کے ذکر میں جو بار بار اس قسم کی تصریحات کی ہیں، ان کے مقصد دو ہیں۔

◇ ایک تو پیغمبروں کی مدح، ان کا مستحق دعا و ثنا ہونا، ان کا قابل تقلید ہونا، اہل کتاب کی بدگوئی اور اتہام تراشیوں سے انہیں محفوظ رکھنا، اور ان کی طرف سے صفائی، ورنہ موجودہ توریت میں تو پیغمبروں کی وہ بری گت بنائی گئی ہے کہ اخلاقی و دینی، عملی و اعتقادی کبائر میں سے شاید ہی کوئی ایسا فعل ہو جو ان کی جانب منسوب نہ کر دیئے گئے ہوں، یہاں تک کہ (نعوذ باللہ) کفر و شرک بھی!

◇ دوسری غرض اس کے بالمقابل یہ بھی رہی ہے کہ انہیں ان کے مرتبہ سے زیادہ نہ بڑھایا جائے، انہیں ہر حال میں بندہ ہی سمجھا جائے اور الوہیت کا کوئی جزو بھی شامل نہ ہونا سمجھا جائے۔ (ماجدی:۳۸/۶)

وہی غالب اور منصور ہیں:

انبیاء کے ان قصص کے اختتام پر ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

اور اپنے پیغام پہنچانے والے بندوں سے ہمارا وعدہ ہو چکا ہے کہ وہی غالب اور منصور ہیں اور ہمارا لشکر غالب آ کر رہے گا۔" (۱۷۳)

سورت کے آخر میں آپ کو معاندین سے اعراض کرنے کا حکم ہے اور اللہ کی حمد و تسبیح کا بیان ہے۔ (خلاصۃ القرآن)

آخری تین آیات کی فضیلت:

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾

طبرانی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ جس شخص نے یہ آخری تین آیات نماز کے بعد تین دفعہ تلاوت کیں، اس نے گویا اپنے لئے پورے پیمانے پر اجر ماپ لیا۔ کم از کم ایک مرتبہ تو ضرور پڑھ لینی چاہئے۔ کسی مجلس میں بیٹھ کر طرح طرح کی باتیں ہوتی ہیں، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم دی ہے کہ ہر مجلس کے اختتام پر بھی یہ آیات تلاوت کر لینی چاہئے۔ اگر

ان آیات کے آخر میں یہ بھی کہہ دیا جائے **سبحنک اللھم و بحمدک لا الہ الا انت استغفرک و اتوب الیک** تو اللہ تعالیٰ اس مجلس کی ساری غلطیاں معاف فرما دے گا۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ذکر ہے جس سے عقیدہ درست ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی حمد وثناء بھی ہے اور رسولوں پر سلامتی کا ذکر بھی ہے اور یہ آیات ورد بھی ہیں۔ یہ ساری سورۃ کا لب لباب ہے جو آخر میں بیان کر دیا گیا ہے۔ (معالم العرفان: ۱۵/۸۰۱)

موضوع سورۃ:......دعوت الی التوحید۔

خلاصہ رکوع:۱......(۱) دعوت الی التوحید- (۲) انکار مجازات کے باعث توحید کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ماخذ:(۱) آیت: ۱۳ (۲) آیت:۱۶۔

خلاصہ رکوع: ۲......(۱) دعوت الی التوحید۔ (۲) بضمن تذکیر بما بعد الموت۔ ماخذ: (۱) آیت: ۲۲، ۲۶۔ (۲) آیت: ۴۰، ۴۵، ۴۷۔

خلاصہ رکوع: ۳......توحید پرستوں کی کامیابی۔ ماخذ: آیت: ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۱۱۰، ۸۷، ۱۱۱۔

خلاصہ رکوع: ۴......توحید پرستوں کی کامیابی۔ ماخذ: آیت:۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۸، ۱۳۲، ۱۳۱۔

خلاصہ رکوع: ۵......توحید پرستوں کی کامیابی۔ ماخذ: آیت: ۱۷۱۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الصاد

یہ قرآن کریم کی ۳۸ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے بھی نمبر ۳۸ پر ہے، اس سورۃ میں ۵ رکوع، ۸۸ آیات، ۸۴۳ کلمات اور ۳۱۰۷ حروف ہیں، یہ سورۃ بھی مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء حروف مقطعات میں سے حرف ص سے ہوئی ہے اس لئے بطور علامت اس کا نام سورۂ ص ہوا۔

ربط:

اس سورۃ میں زیادہ تر مضمون رسالت کے متعلق ہے اور رسالت کے مسئلہ کی مناسبت سے بعض آیات میں قرآن کی مدح ہے اور سورۃ الصفت کو بھی ان ہی مضامین میں اس سورۃ سے تقارب ہے اور یہی تقارب وجہ تناسب ہے۔

شان نزول:

اس سورۃ کی ابتدائی آیات کے سبب نزول کے متعلق لکھا ہے کہ جب ابوطالب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا بیمار ہوئے اور سرداران قریش نے محسوس کیا کہ اب یہ ان کا آخری وقت ہے، تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ چل کر ابو طالب سے بات کرنی چاہیئے، وہ ہمارے اور اپنے بھتیجے کا جھگڑا چکا ئیں تو اچھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا انتقال ہو جائے

اوران کے بعد ہم ان کے بھتیجے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کوئی سخت معاملہ کریں، تو عرب کے لوگ ہمیں طعنہ دیں گے کہ جب تک ابوطالب زندہ تھے یہ لوگ ان کا لحاظ کرتے رہے، ان کے مرنے کے بعد ان لوگوں نے ان کے بھتیجے کے اوپر ہاتھ ڈالا ہے، اس رائے پر متفق ہو کر تقریبا ۲۵ سرداران قریش جن میں ابوجہل، ابوسفیان، امیہ بن خلف، عاص بن وائل، اسود بن عبدالمطلب، عقبہ، عتبہ اور شیبہ شامل تھے ابوطالب کے پاس پہنچے، ان سرداران قریش نے پہلے تو حسب معمول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی شکایات بیان کیں۔ پھر کہا کہ ہم آپ کے سامنے ایک انصاف کی بات پیش کرنے آئے ہیں، آپ کا بھتیجا ہمیں ہمارے دین پر چھوڑ دے اور ہم انہیں ان کے دین پر چھوڑ دیتے ہیں، وہ جس معبود کی عبادت کرنا چاہیں کریں مگر وہ ہمارے معبودوں کی برائی اور مذمت نہ کریں اور یہ کوشش نہ کریں کہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں، اس شرط پر آپ ہم سے ان کی صلح کرا دیں۔ ابوطالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلوایا اور کہا بھتیجے تمہاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے ہیں ان کی خواہش ہے کہ تم ایک منصفانہ بات پر اتفاق کرلو تا کہ تمہارا اوران کا جھگڑا ختم ہو جائے، پھر انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ بات بتلائی جو قریش کے سرداروں نے ان سے کی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: چچا جان میں نے تو ان کے سامنے ایسا کلمہ پیش کیا ہے کہ جسے اگر یہ مان لیں تو تمام عرب ان کا مطیع ہو جائے۔ اور عجم ان کے باج گزار ہو جائیں۔ سرداران قریش بولے بتاؤ وہ کیا کلمہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا الہ الا اللہ اس پر وہ سب یکبارگی ناراض ہوئے اور اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ لو سب معبودوں کی نفی کر کے ایک ہی معبود قرار دے دیا، یہ عجیب بات ہے۔

خلاصہ مضامین:

یہ سورۃ مکی ہے اس لئے دوسری سورتوں کی طرح اس میں بھی عقائد سے متعلق مضمون بیان فرمایا گیا ہے، زیادہ تر مضمون رسالت سے متعلق ہے، چونکہ جس زمانہ میں یہ سورۃ نازل ہوئی اس وقت کفار مکہ اور سرداران قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دہی اور مخالفت پر کمر باندھ رکھی تھی تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی طرح تبلیغ دین کو چھوڑ دیں، اس لئے سورۃ کی ابتداء میں قرآن کریم کے نصیحت والی کتاب ہونے کا اعلان کرتے ہوئے کفار کو ان کی ضد اور ہٹ دھرمی پر اللہ عز وجل کے غضب سے ڈرایا گیا ہے اور بتلایا گیا کہ جو لوگ اس سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں اور کفر و انکار پر اصرار کر رہے ہیں اس کا انجام خود ان کے حق میں برا ہوگا، چونکہ جب فیصلہ کا وقت آجاتا ہے تو پھر نجات کی راہ باقی نہیں رہتی، پہلے بھی جن قوموں نے اللہ کے رسولوں کو جھٹلایا ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور وہ برباد ہو گئیں، اس بات کے ثبوت کے طور پر اجمالی طور سے قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود وغیرہ کا ذکر فرمایا گیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرما کر تسلی دی گئی کہ یہ نادان لوگ ہیں ان کی جہالت کی باتوں کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کریں، اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام کا قصہ سنایا گیا کہ اللہ نے ان کی مدد کی اور ان کے مخالفوں پر انہیں فتح دی اور وہ سارے ملک کے بادشاہ ہوئے، ان کے بعد ان

کے فرزند حضرت سلیمان بھی بادشاہ ہوئے اور اللہ کے حکموں کی تعمیل کرتے رہے۔ پھر حضرت ایوب کا ذکر فرمایا گیا کہ انہوں نے مصیبت میں بڑے صبر سے کام لیا اور اللہ سے امید نہ توڑی، آخر اللہ نے ان کو نجات دی، دنیا میں بھی خوشحالی عطاء فرمائی اور آخرت میں بھی اپنی رحمت سے سرفراز کیا۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے ذکر سے منکرین قرآن کو جتلایا گیا کہ تم اپنی جاہ و دولت اور دنیوی شان و شوکت کے لحاظ سے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے اقتدار کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتے ہو اور دنیا کی جاہ و حشمت نے ان کو اللہ کی یاد سے غافل نہیں کیا اور تم بغاوت پر کمر بستہ ہو۔ چنانچہ اس طرح سے پے در پے نو پیغمبروں کا ذکر کر کے فرمانبردار بندوں اور نافرمانوں کے اس انجام کا نقشہ کھینچا ہے جو وہ عالم آخرت میں دیکھنے والے ہیں، چنانچہ دوزخیوں کا حال اور جنتیوں کی کیفیت بڑے پر اثر انداز سے بیان کی گئی۔ اخیر میں حضرت آدم اور ابلیس کا ذکر فرمایا گیا، جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ابلیس اور آدم کے درمیان ازلی عداوت ہے، ابلیس نے آدم کے مرتبہ پر حسد کیا اور حکم خدا کے مقابلہ میں سرکشی اختیار کر کے لعنت کا مستحق ہوا۔ اسی طرح جو لوگ حق سے کفر و انکار کی سرگرمیاں کر رہے ہیں وہ درحقیقت ابلیس کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں اور جس طرح ابلیس مردود بارگاہ ہوا اسی طرح منکرین بھی اپنے لئے مردود بارگاہ ہونے کی راہ ہموار کر رہے ہیں، اس کے برخلاف جو لوگ قرآن کو اپنا رہنما بنا رہے ہیں وہ آدمیت و انسانیت کی راہ ہے۔ گویا قرآن کی مخالفت کی وجہ سے انسان آدمیت سے نکل کر ابلیس کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے مقصد یہ ہے کہ شیطان کی چالوں سے بچو اور رسول کی نصیحت مانو، اگر اسے نہ سنا اور نہ مانا تو پھر بری طرح پچھتاؤ گے۔ واللہ اعلم!

فائدہ:

ص۔ قرآن کریم کا نام ہے۔ خدا تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے یا سورۃ کا نام ہے یا اسم صمد اور صانع و صادق الوعد کی کنجی یا اس سے صدق اللہ یا صدق محمد کی طرف اشارہ ہے، اور احقاف میں ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ یہ آسمان میں ایک دریا ہے، صاحب لباب نے فرمایا کہ وہ ایک دریا ہے اس پر خدا کا عرش ہے یا ایک دریا ہے کہ حق تعالیٰ اس کے سبب سے مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ لفظ ص سے حق تعالیٰ دوستوں کی صفات کے محبت کی قسم کھاتا ہے۔

سلمیؒ نے فرمایا کہ اس کے معنی ہیں کہ قسم ہے صفائے دل عارفاں کی اور تاویلات میں ہے کہ قسم ہے صورۃ محمد کی اور بحر الحقائق میں ہے کہ قسم ہے اس کی صمدیت کے صاد کی ازل میں اور صوریت کے صاد کی ابد میں اور صانعیت کے صاد کی دونوں کے درمیان۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورۃ کی ابتداء:

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ① بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ② كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ③

سورۃ کی ابتداء میں اللہ تعالی نے قرآن کریم کی قسم کھائی اور فرمایا کہ یہ قرآن نصیحت والا ہے اور قسم کھا کر یہ ارشاد فرمایا کہ اس کو جھٹلانے والے بڑائی گھمنڈ اور ہٹ دھرمی میں مبتلا ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کو یہ تعجب ہوتا ہے کہ انہیں سمجھانے اور ڈرانے کے لئے انہی میں سے ایک انسان کیسے نبی بن کر آ گیا جو ہمارے تمام معبودوں کو جھٹلا کر ایک معبود کی طرف سب کو بلا رہا ہے؟ ہم نے تو یہ بات پچھلے دین میں بھی نہیں سنی اور اگر ایسا ہے بھی تو اتنی اہم بات اور نصیحت کرنے کے لئے یہ ہی رہ گیا، ہم میں سے کسی پر کیوں نازل نہیں کی گئی؟ اللہ تعالی نے آیت :۸ / میں ارشاد فرمایا:

ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ۭ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ۝۸

بات اصل میں یہ ہے کہ ان کو اس بات میں شک اس لئے ہے کہ انہوں نے ابھی میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا۔“

تکذیب اور سرکشی کی وجہ:

کفار قریش کی احمقانہ اور جاہلانہ سوچ بتانے کے بعد سورۂ ص امم سابقہ کے متکبرین اور مشرکین کا انجام بتاتی ہے جو تکذیب اور سرکشی کی وجہ سے عذاب الٰہی کے مستحق ٹھہرے۔ (۱۲۔ ۱۴)

ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی بھی دی جارہی ہے کہ ان کی باتوں پر صبر کریں اور اپنے کام میں لگے رہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لئے مختلف انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات ذکر فرمائے ہیں مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام کا قصہ۔

◇ **حضرت داؤد علیہ السلام** کو اللہ نے بڑی دلکش آواز عطا فرمائی تھی اور معجزے کے طور پر یہ خصوصیت عطا فرمائی تھی کہ جب وہ اللہ کا ذکر کرتے تو پہاڑ اور پرندے بھی آپ کے ساتھ شریک ہوجاتے تھے اور ذکر کرنے لگتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی زندگی کا ایک عجیب واقعہ آیت :۲۱ - ۲۴ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سے کوئی لغزش ہوگئی تھی جس پر تنبیہ کرنے کے لئے دو آدمی غیر معمولی طریقے سے آپ کے پاس اس وقت اللہ نے بھیجے جب آپ اپنی عبادت گاہ میں تھے۔ انہوں نے اپنا ایک جھگڑا فیصلے کے لئے آپ کے سامنے پیش کیا، آپ نے فیصلہ تو فرمایا لیکن اس کے ساتھ ہی سمجھ گئے کہ یہ مقدمہ جو آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالی نے ایک لطیف پیرائے میں انہیں تنبیہ کی ہے۔ اس لئے وہ فوراً سجدے میں گر گئے اور توبہ و استغفار میں مشغول ہو گئے۔ قرآن کریم نے تفصیل نہیں بتائی کہ وہ لغزش کیا تھی اور اس مقدمے کے پیش آنے سے اس کا خیال انہیں کس طرح آیا؟ کیونکہ قرآن کریم تو صرف یہ سبق دینا چاہتا ہے کہ بھول چوک تو انسان کی خاصیت ہے، بڑے بڑے بزرگ یہاں تک کہ انبیاء کرام سے بھی معمولی لغزشیں ہوجاتی ہیں لیکن یہ حضرات اپنی لغزشوں پر اصرار نہیں فرماتے بلکہ جونہی اپنی غلطی واضح ہوتی ہے، فوراً اللہ تعالی سے رجوع کر کے اس پر توبہ و استغفار کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ لغزش جو کوئی بھی تھی اللہ تعالی نے اپنے ایک جلیل القدر پیغمبر کو اس پر نہ صرف معاف فرمایا بلکہ اس پر اتنا پردہ ڈالا کہ قرآن کریم میں بھی اسے صراحت کے ساتھ بیان نہیں فرمایا، لہذا اس قصے کو اتنا ہی مبہم رکھنا چاہیئے جتنا قرآن کریم نے اسے مبہم رکھا ہے، کیونکہ جو سبق قرآن کریم دینا

چاہتا ہے وہ اس قصے کے بغیر بھی حاصل ہوجاتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تسلی :

حضرت داود علیہ السلام کا تذکرہ ایک صفت **ذاالاید** سے شروع فرمایا "**ذاالاید**" کا لغوی معنی ہے ہاتھوں والے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی جسمانی قوت سے نوازا تھا، حتیٰ کہ آپ کے ہاتھ پر لوہے کو نرم کردیا تھا اور آپ بغیر تپائے اس سے زرہیں بناتے تھے اور اس طرح ہاتھوں کی کمائی سے رزق حلال کماتے تھے، آپ نے اللہ کے حکم سے اس دور کے نبی کی قیادت میں جالوت پر فتح پائی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکومت اور نبوت عطا فرمائی۔

اس تذکرہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ کی طرح داؤد (علیہ السلام) بھی معمولی حیثیت کے آدمی تھے، یہ کسی خاندانی بادشاہت کے مالک نہیں تھے بلکہ اپنی قوت بازو کے بل پر جالوت کے مقابلے میں فتح پائی، تو اس وقت کے بادشاہ طالوت کے بعد آپ کو حکومت بھی ملی اور نبوت بھی، یہ لوگ آپ پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس شخص کی مالی حالت اچھی نہیں۔ باغات اور کوٹھیاں نہیں، نوکر چاکر اور مال و دولت نہیں تو یہ نبی کیسے بن گیا، فرمایا آپ صبر کریں، اللہ تعالیٰ داؤد (علیہ السلام) کی طرح آپ کو بھی حکومت اور اس کے تمام لوازمات عطا کرے گا، اور یہ سب لوگ مغلوب ہوجائیں گے۔ (معالم العرفان: ۱۶/ ۴۴)

◇ حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد **حضرت سلیمان علیہ السلام** کا ذکر ہے، ان کی سلطنت وسائل و اسباب کے لحاظ سے اپنے والد کی سلطنت سے بھی زیادہ شان و شوکت والی تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جہاد کے لئے بہترین گھوڑے تیار کر رکھے تھے وہ آپ کے سامنے پیش کئے گئے اور آپ ان کا معائنہ فرمارہے تھے، اس دوران آپ نے فرمایا مجھے ان گھوڑوں سے محبت اس وجہ سے نہیں کہ اس سے میرے دبدبے کا اظہار ہوتا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ یہ جہاد کے لئے تیار کئے گئے ہیں اور جہاد اللہ تعالیٰ کی محبت میں کیا جاتا ہے، پھر آپ ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگے۔ اس واقعے کا ذکر کرکے قرآن کریم نے یہ سبق دیا ہے کہ انسان کو دنیا کی دولت و عزت و شوکت حاصل ہوتو اسے مغرور ہونے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہونے کے بجائے اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے اور اسے ان کاموں میں استعمال کرنا چاہئے جو اللہ کو پسند ہوں۔

◇ تیسرا قصہ **حضرت ایوب علیہ السلام** کا ہے۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل سے تھے، ان کے پاس مال و دولت کی بہتات تھی۔ اللہ کی طرف سے آزمائش آئی تو سب کچھ جاتا رہا یہاں تک کہ خود تکلیف دہ بیماری میں مبتلا ہوگئے۔ بعض تفاسیر میں ہے کہ یہ آزمائش اٹھارہ سال تک رہی۔ حضرت ایوب علیہ السلام اس دوران صبر کا دامن تھامے رہے۔ آیت ۴۲ میں شفا کا واقعہ بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت فرمائی کہ:

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴿٤٢﴾

وہ اپنا پاؤں زمین پر ماریں، انہوں نے زمین پر پاؤں مارا تو وہاں سے ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا

اس پانی سے نہائیں اور اس کو پیئیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا تو بیماری جاتی رہی اور آزمائش کا دور ختم ہوا اور اللہ نے پہلے سے بھی زیادہ نوازدیا۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

چھ انبیاء:

حضرت ایوب علیہ السلام کے علاوہ سورۂ ص حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب، حضرت اسماعیل، حضرت یسع اور حضرت ذوالکفل علیہم السلام کا اجمالی ذکر اور اللہ تعالی کی طرف سے ان سب کی تعریف بیان کرتی ہے۔

آخر میں حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ ابلیس کے ساتھ قدرے تفصیل سے مذکور ہے۔

قرآن میں غور وفکر کی دعوت:

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴿۲۹﴾

ایمان وتوحید کے ساتھ طاعت گزاروں کو نجات وانعامات کا مستحق قرار دیا جائے اور فساق وفجار اور کفر ونافرمانی کے ذریعے زمین میں فساد برپا کرنے والوں کو عذاب جہنم کا مستحق بنایا جائے یہی وہ قانون حکمت ہے جس کا ترجمان یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو آپ کی طرف اتاری گئی، بابرکت ہے اس غرض سے کہ لوگ اس کی آیت میں غور وفکر کریں اور اس حقیقت کو معلوم کر کے اور سمجھ کے اس سے اہل فہم نصیحت حاصل کریں کہ تخلیق کائنات کا یہی مقصد ہے اور حکمت خداوندی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ عدل وانصاف قائم کر کے نیکوں کو نیکی کی جزاء اور بدکاروں کو بدکاری کی سزادی جائے، اس لئے ضروری ہوا ہے کوئی وقت حساب وکتاب اور جزاء وسزا کا رکھا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ وقت صرف آخرت اور یوم قیامت ہی ہوسکتا ہے کیونکہ دنیا تو دارالعمل اور دارالامتحان ہے اور حقیقی جزاوسزا دوران عمل دارالعمل اور دارالامتحان میں قائم نہیں کی جاسکتی، اس لئے کہ پھر دنیا کی زندگی میں خیر وشر کی آزمائش کا سلسلہ باقی نہ رہ سکے گا، اس بنا پر مخبر صادق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر اور فرمان خداوندی پر ایمان لاتے ہوئے قیامت کا اقرار کرنا پڑے گا اور یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آسمان وزمین اور جملہ کائنات کی تخلیق عبث وبیکار اور خالی از حکمت نہیں اور ظاہر ہے کہ نیک وبد کے انجام کی یہ تفریق کتاب ہدایت ہی کے ذریعہ بتائی جاسکتی تھی اس لئے یہ کتاب مبارک حق تعالی کی طرف سے نازل کی گئی تا کہ اس کی بات میں تدبر اور غور وفکر سے اہل فہم عبرت ونصیحت حاصل کرلیں اور یقین کرلیں کہ مسئلہ مجازات اور معاد وآخرت عقل اور فطرت کے عین مطابق ہے۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اپنے فوائد قرآن کریم میں فرماتے ہیں شاید "تدبر" سے قوت علمیہ اور "تذکر" سے قوت عملیہ کی تکمیل کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ ان ہی قوتوں کی تکمیل اور اصلاح سے انسانی سعادت کی منزلیں طے ہوتی ہیں۔ (تفسیر ادریسی: ۲۸/۷)

انصاف کی بات:

اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو اس زمانے میں کوئی بھی شخص اللہ کی کتاب میں غور وفکر کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا، کسی نے بہت زیادہ کیا تو تھوڑی بہت خالی تلاوت کرلی اور بس، وگرنہ اس کتاب حکیم کے معانی ومطالب کو سمجھ کر

اس پر عمل کرنا تو بہت دور کی بات ہے، مگر جب ہم ماحول پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس زمانے میں محض تلاوت کر لینا بھی بس غنیمت ہے، کچھ عرصہ پہلے تک مرد وزن صبح کی نماز ادا کرتے، اس کے بعد ہر گھر سے تلاوت قرآن پاک کی آوازیں آیا کرتی تھیں، مگر آج وہ آوازیں ختم ہو کر ریڈیو اور ٹیلیویژن کی آوازیں رہ گئیں ہیں، جو ہر گھر سے صبح وشام سنائی دیتی ہیں، تاہم اس کتاب کا اصل مقصد خالی تلاوت نہیں بلکہ اس کو سمجھنا اور غور وتدبر کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کتاب کی دوسری غرض یہ بیان فرمائی ہے تاکہ عقل مند لوگ نصیحت حاصل کریں، ظاہر ہے کہ نصیحت تو جبھی حاصل ہوگی جب لوگ اس کو سمجھنے کی کوشش کریں گے، اگر اس کو سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی گئی اور محض چوم چاٹ کر اور غلاف میں لپیٹ کر رکھ دیا گیا تو نصیحت کیسے آئے گی؟ حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا قرآن کریم کے ساتھ غداری کرنے کے مترادف ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عظیم المرتبت کتاب کی ظاہری تعظیم بھی ضروری ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی بھی تاکید فرمائی ہے مگر یہ مقصود ومنتہا تو نہیں ہے، اس کی غایت تو اس کو سمجھ کر اس پر عمل کرنا اور پھر دوسروں تک پہنچانا ہے تاکہ سارے صاحب عقل لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔ (معالم العرفان: ۱۶/ ۶۴)

دعوت کی حقیقت ومقصد:

سورت کے اختتام پر اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا ہے کہ آپ اپنی دعوت کی حقیقت اور مقصد بیان فرما دیں:

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ﴿۸۶﴾اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴿۸۷﴾وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ﴿۸۸﴾

”اے پیغمبر! کہہ دو کہ میں تم سے اس کا اجر نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹ کرنے والوں میں ہوں، یہ قرآن تو اہل عالم کے لیے نصیحت ہے اور تم کو اس کا حال ایک وقت کے بعد معلوم ہو جائے گا“ (۸۶-۸۸) (خلاصۃ القرآن)

موضوع سورت:...... تمام امم سابقہ کی تباہی کا باعث تکذیب رسل ہی تھا، اگر یہ لوگ ادب وانابت الی اللہ اختیار کر لیں تو بچ سکتے ہیں۔

خلاصہ رکوع: ۱...... قرآن ذی الذکر کے پہنچانے والے کو جادوگر کہہ رہے ہیں، حالانکہ تمام امم سابقہ کی تباہی کا باعث یہی انکار تھا۔ ماخذ: آیت: ۴، ۱۴۔

خلاصہ رکوع: ۲...... اب بھی ادب وانابت الی اللہ اختیار کر لیں تو رحمت الٰہی ان کو ڈھانپنے کے لئے تیار ہے۔ ماخذ: آیت: ۲۴، ۲۵۔

نوٹ:...... قصص عبرت کے لئے ہوتے ہیں، اس قصہ سے معلوم ہوا کہ انابت واستغفار سے رحمت الٰہی عود کر آتی ہے۔

خلاصہ رکوع: ۳...... ادب وانابت سے رحمت الٰہی ان پر عود کر سکتی ہے۔ ماخذ: آیت: ۳۰۔

نوٹ:...... اس آیت کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے ادب الی اللہ کا واقعہ ہے۔

خلاصہ رکوع: ۴......ادب و انابت الی اللہ رجوع رحمت الٰہی کے لئے اکسیر ہے، مخالفین کو یہ اختیار کرنی چاہئے۔ ماخذ : آیت: ۴۴۔

خلاصہ رکوع: ۵......ضرورت انابت الی اللہ۔ ماخذ: آیت: ۸۳، ۸۲۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الزمر

یہ قرآن کریم کی ۳۹ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۵۰ نمبر پر ہے۔ یہ سورۃ مکی ہے، اس میں ۸ رکوع، ۷۵ آیات، ۱۱۸۴ کلمات اور ۴۹۲۵ حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے آخری رکوع میں لفظ زمر استعمال کیا گیا ہے، زمر کے لفظی معنی ہیں گروہ در گروہ، جوق در جوق، جتھے جتھے، جیسا کہ اس سورۃ کے آخری رکوع میں بتایا گیا کہ کفار کو جہنم کی طرف گروہ در گروہ لے جایا جائے گا اور مؤمنین کو جنت کی طرف گروہ در گروہ لے جایا جائے گا، اس لئے بطور علامت کے اس سورۃ کا نام زمر مقرر کیا گیا۔

ربط:

سابقہ سورۃ میں زیادہ تر مضامین رسالت سے متعلق تھے، اس سورۃ میں زیادہ مضامین توحید کے متعلق ہیں، توحید کا اثبات، اس کا وجوب، اس کے مصدقین کی مدح و جزا، اس کی ضد یعنی شرک کا ابطال، اس سے ممانعت، مکذبین توحید کی قدح اور سزا اور فریقین کا تفاوت حال وقال خاص اہتمام سے مذکور ہے، یہی دونوں سورتوں کے درمیان ارتباط ہے۔

خلاصہ مضامین:

سورۃ کی ابتداء قرآن کریم کی حقانیت کے بیان سے کی گئی ہے اور انسانوں کو تعلیم دی گئی کہ ہر طرف سے منہ موڑ کر خالص اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف جھکیں، اس کی طاعت و بندگی کریں۔ زمین وآسمان کی پیدائش دن رات کا با قاعدہ ایک دوسرے کے پیچھے آتے رہنا، سورج اور چاند کی باقاعدہ ایک نظام میں بندھی ہوئی گردش، حیوانات اور انسان کی پیدائش یہ سب اللہ کی قدرت کو ظاہر کر رہے ہیں اور اس کی توحید پر دال ہیں تو پھر اس کو وحدہ لاشریک نہ ماننے کے کیا معنی؟ پھر انسانوں کی ہدایت کے لئے قرآن نازل کیا گیا، اگر کسی کی سمجھ میں از خود نہیں آتا اور کائنات میں پھیلے ہوئے بے شمار توحید کے دلائل اس کو نظر نہیں آتے تو وہ خدا کو اس قرآن ہی سے جانے اور خدا کو ایک مانے، اللہ کی ذات بڑی قدرت وطاقت والی ہے۔ وہ بڑا دانا و بینا ہے۔ اس لئے اس کا کلام یعنی یہ قرآن زور وقوت اور علم وحکمت کا خزانہ ہے، اس لئے انسان کی بھلائی صرف اس میں ہے کہ اس پر ایمان لائے، اس کے حکموں پر عمل کرے اور قرآن کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر پرہیز گاری اور تقوی کی زندگی بسر کرے، ہر وقت اللہ کی اطاعت میں سرگرم رہے۔ اس کے بعد عام انسانوں کی حالت بیان کی

گئی کہ انسان کی بھی عجیب حالت ہے، جب اس پر کوئی مصیبت آ پڑتی ہے تو اللہ کو پکارنے لگتا ہے اور جب مصیبت ٹل جاتی ہے تو پھر بھول جاتا ہے اور اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ مگر سب انسان برابر نہیں، بعض لوگ بہرحال اللہ ہی کو یاد کرتے ہیں اور اس کی طاعت وشکر گزاری میں اپنے دن رات گزارتے ہیں، اس لئے ان دونوں کا انجام بھی یکساں نہیں ہوگا۔ نیک لوگوں کا انجام دنیا وآخرت دونوں میں اچھا ہوگا وہ بے شمار انعامات کے مستحق ہوں گے اور ان کو یقینا جنت میں بڑے راحت وآرام کی زندگی میسر ہوگی، اس کے برخلاف اللہ سے منہ موڑنے والے دوزخ میں جلیں گے اور اس وقت انتہائی افسوس کے ساتھ کہیں گے کہ ہائے ہماری کم بختی اور شامت اعمال کہ ہم غفلت میں پڑے رہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے اور انہوں نے سمجھانے کا حق ادا کیا لیکن ہم دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے، مگر وہاں اس پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ الغرض اس سورۃ کی تمام تعلیمات کا خلاصہ یہی ہے کہ سچی بات کی پیروی کی جائے اور کفر وشرک سے بچا جائے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورت کا موضوع ومحور:

یہ سورت مکی دور کے بالکل ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی جب مسلمانوں پر سخت ابتلاء وآزمائش کا دور تھا۔ اس لئے اس سورت کا اصل موضوع اور محور عقیدہ توحید ہے کیونکہ اللہ کی وحدانیت کا اعتقاد ہی اصل ایمان ہے۔ سورت کے شروع میں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے لوگوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ؕ﴿۲﴾ اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰی ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ فِیْ مَا هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ؕ۬ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿۳﴾

عبادت کا حق خالصا اللہ ہی کا حق ہے، اس کے علاوہ کسی کا نہیں ہے، اس لئے اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ بندگی خالص اس کے لئے ہو۔" (آیت ۲)

مشرکین عرب عام طور سے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے، لیکن انہوں نے کچھ دیوتا گھڑ کر ان کے بت بنا لیے تھے، اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہم ان کی عبادت کریں گے تو یہ اللہ تعالیٰ سے ہماری سفارش کریں گے، اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوگا۔ قرآن کریم نے اس کو بھی شرک قرار دیا، کیونکہ اول تو ان دیوتاؤں کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی، دوسرے عبادت تو اللہ تعالیٰ کا خالص حق ہے، کسی دوسرے کی عبادت، خواہ کسی نیت سے کی جائے، شرک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص واقعی بزرگ اور ولی اللہ ہو، تب بھی اس کی عبادت شرک ہے، چاہے اس نیت سے ہو کہ اس کے ذریعے ہمیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔ (توضیح القرآن)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں بعض اوقات

کوئی صدقہ وخیرات کرتا ہوں یا کسی پر کوئی احسان کرتا ہوں، جس میں میری نیت اللہ تعالی کی رضا جوئی کی بھی ہوتی ہے اور یہ بھی کہ لوگ میری تعریف وثناء کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ اللہ تعالی کسی ایسی چیز کو قبول نہیں فرماتے جس میں کسی غیر اللہ کو شریک کیا گیا ہو۔ (قرطبی)

قرآن کا علمی اعجاز:

اپنی قدرت کی نشانیاں بیان فرماتے ہوئے آیت: ۶ رمیں ایک ایسی قدرت اور ایک ایسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے جس کو اس زمانے میں کوئی جانتا ہی نہ تھا اور وہ یہ کہ شکم مادر میں انسان کی تخلیق تین تاریکیوں میں ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی طبی حقیقت ہے جس کا صدیوں پہلے اعلان کیا گیا ہے اور اس حقیقت کا حکماء اور ڈاکٹروں کو بیسویں صدی میں علم ہوا ہے۔ ڈاکٹر حضرات کہتے ہیں کہ بظاہر دیکھنے میں وہ ایک ہی پردہ معلوم ہوتا ہے جس میں جنین رہ رہا ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ تین پردے ہوتے ہیں اور تین پردے یا تاریکیاں اس طرح ہوتی ہیں کہ (۱) پہلی اندھیری پیٹ کی (۲) دوسری اندھیری رحم کی (۳) اور تیسری اندھیری اس جھلی کی جس میں بچہ لپٹا ہوا ہوتا ہے اور ان کو تین اندھیریاں اس لئے قرار دیا گیا کہ یہ پردے بچہ کو روشنی سے بچا کر رکھتے ہیں۔

آیت ۱۰ رمیں صبر کرنے والوں کو ایک بہت بڑی خوش خبری سنائی گئی ہے کہ ”جو لوگ صبر کرتے ہیں ان کا ثواب انہیں بے حساب دیا جائے گا۔ حدیث شریف میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز میزان عدل قائم کی جائے گی، اہل صدقہ آئیں گے تو ان کے صدقات کو تول کر اس کے حساب سے پورا پورا دے دیا جائے گا، اسی طرح نماز اور عبادات میں بھی ہوگا مگر جب بلاء اور مصیبت پر صبر کرنے والے آئیں گے تو ان کے لئے کوئی کیل اور وزن نہ ہوگا بلکہ بغیر حساب و اندازہ کے ان کی طرف اجر وثواب بہا دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جن کی دنیاوی زندگی عافیت میں گزری تمنا کرنے لگیں گے کہ کاش دنیا میں ان کے بدن قینچیوں کے ذریعے کاٹے گئے ہوتے تو ہمیں بھی صبر کا ایسا ہی صلہ ملتا۔ (معارف القرآن) (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

مشرک کی مثال:

توحید کا اثبات اور شرک کی نفی کرتے ہوئے اللہ تعالی نے موحد اور مشرک کی مثال بیان کی ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۹﴾

مشرک کی مثال اس غلام جیسی ہے جس میں کئی شریک ہوں اور مزاج کے اعتبار سے بھی وہ تمام شرکاء ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں، نہ آپس میں اتفاق نہ محبت اور یگانگت، ان میں سے ایک غلام کو دائیں بھیجتا ہے تو دوسرا بائیں جانب جانے کا حکم دیتا ہے، ایک کھڑا ہونے کا تو دوسرا بیٹھنے کا حکم صادر کرتا ہے، وہ حیران ہے کس کی مانے اور کس کی نہ

ماننے اور موحد کی مثال اس غلام جیسی ہے جس کا مالک ایک ہو، اس کے اخلاق بھی اچھے ہوں اور وہ اپنے غلام کے جذبات کا بھی لحاظ رکھتا ہو، (۲۹)

یقیناً یہ غلام اخلاص کے ساتھ اس کی خدمت کرے گا اور اسے اپنے مالک سے بھلائی اور احسان ہی کی امید رہے گی۔ پھر جب مالک، رب العالمین ہو اور بندہ اسی کا ہو کر رہ جائے تو اس کے قلبی سکون اور راحت پر یقیناً بادشاہی قربان کی جاسکتی ہے۔ (خلاصۃ القرآن)

موضوع سورۃ:......اخلاص في العبادۃ۔

خلاصہ رکوع:۱......دعوت الی الاخلاص فی العبادۃ بتذکیر بآلاء اللہ۔ ماخذ: آیت: ۴، ۳، ۲، ۶، ۵، ۸۔

خلاصہ رکوع:۲......الدعوت الی الاخلاص فی العبادت بالتذکیر بما بعد الموت۔ ماخذ: آیت: ۱۴، ۱۱، ۱۶، ۱۷، ۲۰۔

خلاصہ رکوع: ۳......الدعوۃ الی الاخلاص فی العبادت بالتذکیر بایام اللہ۔ ماخذ: آیت: ۲۵، ۲۹۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

تیئسویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) انسان کا قوت والا یعنی جوان ہو جانے کے بعد دوبارہ کمزوری یعنی بڑھاپے کی طرف لوٹنا اللہ کی قدرت کا مظہر ہے۔

(۲) یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ قرآن کو صرف مُردوں پر پڑھنے کے لئے مخصوص کرلیا گیا ہے، حالانکہ قرآن تو زندہ انسانوں کے لئے نازل کیا گیا ہے: نصیحت، ہدایت اور تعلیم و تذکیر کے لئے۔

(۳) دنیا میں کفار، فجار اور فساق کی مشابہت اختیار کرنے والوں کا حشر انہی کے ساتھ ہوگا۔

(۴) کلمہ لا الہ الا اللہ کی عظمت شان یہ ہے کہ یہ سب انبیاء کا کلمہ ہے۔

(۵) اللہ کا عدل وانصاف ہے کہ برائی کا بدلہ اس کے مثل دیتے ہے اور اللہ کا فضل ہے کہ مومنین کی نیکیوں کا بدلہ اس کے مثل دس نیکیوں سے سات سو نیکیوں تک دیتے ہیں۔

(۶) آخرت میں موت کا تصور نہیں، وہاں حیات ابدی حاصل ہوگی، جنت میں یا جہنم میں۔

(۷) جو شخص صبح یا شام کے وقت سورۃ الصافات کی آیت ۷۹ ''**سلم علی نوح في العالمین**'' پڑھ لے تو اللہ تعالی اس کی بچھو کے ڈسنے سے حفاظت فرماتے ہیں۔

(۸) قرآن کریم کی برکت بھی اپنے پڑھنے والے اور عمل کرنے والے سے جدا نہیں ہوتی، جو اس برکت کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اس کو پاتا ہے۔

(۹) نیک اولاد اللہ تعالی کا بہت بڑا تحفہ ہے، پس جس کو یہ تحفہ ملے اس کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

(۱۰) اگر لوگ آخرت کے عذاب کو جان لیں یقینی علم کے ساتھ تو پھر نہ جھٹلائیں نہ کفر کریں اور نہ کسی پر ظلم کریں۔ پس عذاب سے جہالت ہی ہلاکت کا سبب ہے۔

***

پارہ: ۲۴

سورہ زمر کے تقریباً پانچ رکوع چوبیسویں سپارے میں آئے ہیں۔جن کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدۡقِ اِذۡ جَآءَهٗ‌ .... الیٰ.................وَمَاۤ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِوَكِيۡلٍ۝۴۱

آیت نمبر ۳۲ تا ۴۱ میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی تردید فرمائی، کچھ دلائل قدرت بیان کیے ہیں اور پیغمبر ﷺ پر طعن کرنے والوں کا رد کیا، پھر فرمایا کہ نفع ونقصان کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے لہذا اسی کی ذات پر بھروسہ کرنا چاہیے، پھر آگے تنبیہ فرمائی کہ تم اپنی جگہ پر کام کرتے رہو، میں اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف ہوں، تمہیں عنقریب پتہ چل جائے گا کہ صحیح راستے پر کون ہے اور گمراہی میں کون بھٹک رہا ہے؟ نیز یہ بھی کہ دائمی عذاب کس پر مسلط ہوتا ہے اور کون اس سے بچتا ہے؟ پھر قرآن پاک کی ہدایت اور راہنمائی کے بارے میں فرمایا کہ ہم نے اس کتاب کو نازل فرمایا ہے، جو اس سے ہدایت پائے گا اس میں اسی کا فائدہ ہے، اور جو گمراہ ہوگا تو اس کا نقصان بھی اسی کو ہوگا، پھر پیغمبر ﷺ کو تسلی دی کہ ان کے مسلسل انکار پر آپ افسوس نہ کریں کیونکہ یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ یہ ایمان کیوں نہیں لائے، بلکہ اپنی کارگزاری کے یہ خود ذمہ دار ہیں اور قیامت کو جواب دہ ہوں گے۔

آیت/۳۶ میں ارشاد فرمایا:

اَلَيۡسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبۡدَهٗ‌ ؕ وَيُخَوِّفُوۡنَكَ بِالَّذِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ‌ ؕ وَمَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنۡ هَادٍ‌۝۳۶

”کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے۔اس آیت کے شان نزول میں مفسرین نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کو اس سے ڈرایا گیا تھا کہ اگر آپ نے ہمارے بتوں کی بے ادبی کی تو ان بتوں کا اثر بہت سخت ہے، آپ بچ نہ سکیں گے۔اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں یہ آیت شریفہ نازل فرمائی اور فرمایا:”کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں؟“

اس آیت کے تحت بعض مفسرین نے فرمایا کہ ”اپنے بندے“ سے مخصوص بندہ یعنی رسول اللہ ﷺ مراد ہیں۔ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کو پڑھنے والے عموماً یہ خیال کر کے گزر جاتے ہیں کہ یہ ایک خاص واقعہ کا ذکر ہے جس کا تعلق کفار کی دھمکیوں اور رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس سے ہے۔اس طرف دھیان نہیں دیتے کہ اس میں ہمارے لئے کیا ہدایت ہے؟ حالانکہ بات بالکل کھلی ہوئی ہے کہ جو شخص بھی کسی مسلمان کو ڈرائے کہ تم نے

فلاں حرام کام یا گناہ نہ کیا تو تمہارے حکام اور افسر یا جن کے تم محتاج سمجھے جاتے ہو تم سے خفا ہو جائیں گے اور تکلیف پہنچائیں گے تو یہ بھی اس میں داخل ہے، اگر چہ ڈرانے والا بھی مسلمان ہو اور جس کو ڈرایا جارہا ہے وہ بھی مسلمان ہو اور یہ ایسا عام ابتلاء ہے کہ دنیا کی اکثر ملازمتوں میں لوگوں کو پیش آتا ہے کہ احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی پر آمادہ ہو جائیں یا اپنے افسروں کے عقاب وعتاب کے مورد بنیں۔ اس آیت نے ان سب کو یہ ہدایت دے دی کہ کیا اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کے لئے کافی نہیں، تم نے خالص اللہ کے لئے گناہوں کے ارتکاب سے بچنے کا عزم کر لیا تو اللہ کی امداد تمہارے ساتھ ہو گی۔

انسان کی موت وحیات:

اللہ تعالیٰ نے انسان کی موت وحیات کو اپنی قدرت کی نشانی کے طور پر پیش کیا ہے اور اس ضمن میں اپنے مکمل اختیار کا ذکر کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾

اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جو وفات دیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت، یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس کے حکم سے مقررہ وقت پر کسی انسان کی جان کھینچ لیتے ہیں۔

نیند اخت الموت یعنی موت کی بہن کہلاتی ہے، جب انسان پر نیند طاری ہوتی ہے تو اس سے روح کھینچ لی جاتی ہے، البتہ اس کی سانس اور نبض چلتی رہتی ہے، اس ضمن میں دو قسم کی توجیہات پائی جاتی ہیں، امام بغویؒ نے حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ نیند کے دوران انسان کی جان اس کے جسم سے کھینچ لی جاتی ہے مگر اس کا تعلق جسم کے ساتھ بھی قائم رکھا جاتا ہے، اس کی مثال سورج کا زمین کے ساتھ تعلق ہے کہ لاکھوں کروڑوں میل دور ہونے کے باوجود سورج کی شعائیں، اس کی روشنی اور حرارت زمین تک پہنچاتی رہتی ہیں، اسی طرح روح کا تعلق بھی جسم کے ساتھ قائم رہتا ہے، اگر چہ نیند کے وقت اسے جسم سے نکال لیا جاتا ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور بعض دوسرے مفسرین اور محققین فرماتے ہیں کہ ہر انسان کی دو روحیں ہوتی ہیں، ایک روح حیوانی ہے، جو شکم مادر میں انسان کی تخلیق کے روز اول سے انسانی جسم کے ساتھ منسلک رہتی ہے اور دوسری روح روح الٰہی یا روح آسمانی ہے جو حمل کے چوتھے ماہ میں انسانی جسم میں داخل کی جاتی ہے، روح حیوانی زندگی بھر جسم میں موجود رہتی ہے، یہ ایک لطیف قسم کا دھواں یا بخار ہوتا ہے جو موت کے وقت انسانی جسم سے نکل جاتا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی روح اس کے جسم سے پرواز کر گئی ہے، البتہ روح الٰہی نیند کی حالت میں جسم سے الگ ہو جاتی ہے اور بعض اوقات اس کی ملاقات دوسری زندگی اور مردہ روحوں کے ساتھ بھی ہو جاتی ہے، اور خواب میں انسان کی ملاقات دور دراز کے رہنے والے یا مر جانے والے عزیزوں اور دوستوں سے بھی ہو جاتی ہے، الغرض! اس نظریہ کے تحت روح حیوانی تو

نیند میں بھی انسانی جسم میں موجود رہتی ہے جس کی وجہ سے اس کی سانس اور نبض چلتی رہتی ہے اور روح الٰہی کو نکال لیا جاتا ہے، اسی چیز کے متعلق یہاں فرمایا ہے کہ نیند کی حالت میں روح کو کھینچ لیا جاتا ہے، پھر جب اس کی موت کا فیصلہ کرلیا جاتا ہے تو اس کی روح الٰہی کو باہر ہی روک لیا جاتا ہے، یعنی جسم میں واپس نہیں لوٹایا جاتا اور جس کے متعلق فوری موت کا فیصلہ نہیں ہوتا، اس کی روح کو واپس جسم میں ایک مقررہ وقت تک لوٹا دیا جاتا ہے، اور مقررہ وقت وہی ہے جو اس کی موت کے لیے مقرر ہے، جب وہ وقت آجاتا ہے، تو پھر اس روح کو نہیں لوٹایا جاتا، شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی روح الٰہی ہر روز کھینچی جاتی ہے اور لوٹائی جاتی ہے حتی کہ موت کا وقت آپہنچتا ہے اور پھر روح الٰہی اور روح حیوانی دونوں الگ الگ ہوجاتی ہیں ۔(معالم العرفان:۱۶/۲۱۹،تفسیر عثمانی)

رحمت اور توبہ کا دروازہ کھلا ہے:

حضرت سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ کچھ لوگ ایسے تھے جنھوں نے قتل ناحق کئے اور بہت کئے اور زنا کا ارتکاب بھی کیا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ جس دین کی خاطر آپ دعوت دیتے ہیں وہ ہے تو بہت اچھا، لیکن فکر یہ ہے کہ جب ہم اتنے بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب کر چکے، اب اگر مسلمان ہو بھی گئے تو کیا ہماری توبہ قبول ہو سکے گی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت/۵۳ نازل فرمائی:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾

بندوں پر اللہ کی خصوصی رحمت اور اس کے فضل واحسان میں سے یہ بھی ہے کہ وہ خطا کاروں، مجرموں اور کافروں کے لیے رحمت اور توبہ کا دروازہ کھلا رکھتا ہے اور انہیں خود توبہ اور رجوع الی اللہ کی دعوت دیتا رہتا ہے، وہ گناہ گاروں کو مایوس نہیں کرتا بلکہ ان کے دل میں امید کا چراغ روشن کرتا ہے، اللہ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے:

’’فرمادیجئے اے میرے بندو! جنھوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے، تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوجاؤ، بے شک اللہ سارے گناہ معاف کردے گا۔ یقیناً وہ بے حد بخشنے والا انتہائی مہربان ہے۔

وہ مجرموں، خطا کاروں اور کافروں کے لئے رحمت اور توبہ کا دروازہ کھلا رکھتا ہے اور انہیں خود رجوع الی اللہ کی دعوت دیتا رہتا ہے، وہ گناہگاروں کو مایوس نہیں کرتا بلکہ ان کے دلوں میں امیدوں کے چراغ روشن کرتا ہے۔

اور یہ توبہ کا دروازہ اس وقت تک کھلا رہتا ہے جب تک جسم میں روح ہے، جب روح کا سلسلہ جسم سے منتقل ہوگیا تو پھر توبہ کا دروازہ بھی بند ہوگیا۔

رحمت خداوندی کا ایک نمونہ:

ابوسعید خدریؓ بیان فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی اسرائیل میں سے کسی کا واقعہ بیان فرمایا کہ جو

ننانوے آدمیوں کو قتل کر چکا تھا، بعد میں اس کو ان بداعمالیوں پر ندامت ہوئی اور اس نے کسی عابد وزاہد کا پتہ معلوم کرنا چاہا کہ جس کے ہاتھ پر جا کر تائب ہو اور اپنی زندگی درست کر لے، ایک راہب کا پتہ معلوم ہونے پر اس کے پاس پہنچا اور اس سے دریافت کیا کہ کیا میرے واسطے توبہ کا امکان ہے، اس نے جواب دیا نہیں۔ اس جواب پر غم وغصہ کی کیفیت میں اس راہب کو بھی قتل کر کے سو (۱۰۰) کا عدد پورا کر دیا، لیکن بدستور وہی تڑپ برقرار رہی اور تلاش میں رہا کہ کسی کے ہاتھ پر بیعت کروں اور تائب ہو جاؤں، کسی عالم سے پوچھا کہ کیا میرے واسطے توبہ کا امکان ہے؟ اس نے جواب دیا کہ کون حائل ہوسکتا ہے، تیرے اور تیری توبہ کے درمیان، اور فلاں بستی میں ایک عالم وعابد ہے، تو اس کے پاس جا۔ اور اس بستی میں رہ کر خدا کی عبادت کرتا رہ، یہ شخص روانہ ہوا، سفر کے دوران موت کے آثار واقع ہوئے تو رحمت اور عذاب کے فرشتے آ گئے اور باہم خصومت کرنے لگے، عذاب کے فرشتے کہتے ہیں ہم اس کی روح قبض کریں گے اور رحمت کے فرشتے کہنے لگے کہ نہیں، ہم اس کی روح قبض کر کے رحمت کے مقام میں لے جائیں گے، حق تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا کہ زمین ناپ لو جس جگہ سے قریب ہو اسی حکم میں اس کو شمار کر لو۔ ساتھ ہی اللہ نے اس طرف کی زمین کو جہاں یہ جا رہا تھا حکم دیا کہ تو نزدیک ہو جا، پیمائش کرنے پر توبہ کی زمین قریب نکلی، اس پر رحمت کے فرشتوں نے اس کی روح قبض کی، اور ایک روایت میں یہ لفظ ہے کہ جس وقت وہ زمین پر گر رہا تھا اس نے اپنا سینہ اور رخ اسی طرف جھکا دیا جس طرح وہ جا رہا تھا، تو ایک بالشت کے بقدر ادھر زمین کم رہ گئی، ایک روایت میں ہے کہ حق تعالیٰ کا حکم ہوا سرزمین معصیت کو کہ تو بعید ہو جا اور توبہ کی زمین کو حکم ہوا تو قریب ہو جا، اور اس طرح ملائکہ رحمت کو قبض روح کا حق عنایت کر دیا گیا۔

گویا قانون الٰہی سے اس شخص کو نافرمانیوں اور معصیتوں سے تائب اور پاک شمار کر لیا گیا، کیونکہ جس تڑپ اور جذبہ کے ساتھ یہ اپنی جگہ سے نکلا اور ارض معصیت کو نفرت سے چھوڑتے ہوئے ارض اطاعت کا رخ اختیار کر لیا، تو درحقیقت یہ اس ارشاد خداوندی کا مصداق بن گیا" **ومن یخرج من بیته مهاجرا الی الله ورسوله ثم یدرکه الموت فقد وقع اجره علی الله**"۔ اور اللہ کے نزدیک اس کا شمار تائبین ومطیعین میں ہو گیا اور تائب انسان بفرمان نبوی اس معصوم بچہ کی طرح ہے جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ (تفسیر ادریسی: ۷/۱۰۲)

لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ وفادار بندوں کا یہ شعار نہیں کہ مغفرت کا وعدہ سن کر بے خوف ہو جائیں، بلکہ مغفرتوں کی بشارتوں کے بعد اور زیادہ گناہوں سے بچنے اور نیکیوں میں ترقی کرنے کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے، حضور اقدس ﷺ سے بڑھ کر کسی کے لیے بشارتیں نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کی سب لغزشوں کی مغفرت فرما دی جس کا اعلان سورۃ الفتح کے شروع میں فرما دیا، اس کے باوجود آپ راتوں رات نمازیں پڑھتے تھے جس کی وجہ سے آپ کے قدم مبارک سوج گئے تھے، جب کسی نے عرض کیا کہ آپ عبادت میں اتنی محنت فرماتے ہیں حالانکہ اللہ پاک نے آپ کا سب کچھ اگلا پچھلا (لغزش والا عمل) معاف فرما دیا، اس پر آپ نے ارشاد فرمایا اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا (کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ

نہ بنوں؟) (بخاری) مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک نے اتنی بڑی مہربانی فرمائی کہ میرا سب کچھ معاف فرمادیا، تو اس کی شکر گزاری کا تقاضا یہ ہے کہ میں مزید اطاعت اور عبادت کے ذریعہ اللہ کے قرب میں ترقی کرتا چلا جاؤں۔ (انوار البیان)

توبہ نہ کرنے والوں کی تین حسرتیں:

اللہ تعالیٰ نے آیت ۵۶ تا ۵۸ میں ان لوگوں کی حسرتوں کا ذکر کیا جو دنیا میں توبہ نہ کرسکے، چنانچہ ان کی تین حسرتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

اَنۡ تَقُوۡلَ نَفۡسٌ یّٰحَسۡرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطۡتُّ فِیۡ جَنۡۢبِ اللّٰہِ .... الیٰ............. تَرَی الۡعَذَابَ لَوۡ اَنَّ لِیۡ کَرَّۃً فَاَکُوۡنَ مِنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ﴿۵۸﴾

(۱) کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی شخص کو یہ کہنا پڑے کہ ہائے افسوس میری اس کوتاہی پر جو میں نے اللہ کے معاملے میں برتی، سچی بات یہ ہے کہ میں تو (اللہ کے احکام کا) مذاق اڑانے والوں میں شامل ہوگیا تھا۔

(۲) یا کوئی یہ کہے اگر مجھے اللہ ہدایت دیتا تو میں بھی متقی لوگوں میں شامل ہوتا۔

(۳) کاش مجھے ایک مرتبہ واپس جانے کا موقع مل جائے تو میں نیک لوگوں میں شامل ہوجاؤں۔ ایسی حسرتیں مرنے کے بعد کوئی فائدہ نہیں دیں گی۔

دوزخ اور جنت کے دروازے اور ان میں داخل ہونے والوں کی کیفیات:

آیت ۷۱ میں دوزخ اور جنت کے دروازے اور ان میں داخل ہونے والوں کی کیفیات بیان کی گئی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ہر لفظ کوئی نہ کوئی معنیٰ لئے ہوئے ہیں۔ قرآن زوائد سے پاک ہے۔

"حتی اذا جآء وھا فتحت ابوابھا"۔ اہل جہنم کے جہنم کے سامنے پہنچنے کی کیفیت میں یہ فرمایا گیا، یہاں تک کہ جب وہ جہنم کے سامنے پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے، "اذا جآء وھا"۔ شرط پر فتحت کا جملہ جزائیہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے پہنچتے ہی فوراً دروازے کھولے جائیں گے تاکہ جلد سے جلد ان کفار و مجرمین کو دار العقوبت میں پہنچادیا جائے اور ایک لمحہ کی بھی مہلت نہ مل سکے، نیز مجرمین کے ساتھ یہی طریقہ برتا جاتا ہے کہ جیل خانہ بند ہوتا ہے، جوں ہی مجرم لایا گیا جیل کے نگران فوراً دروازہ کھول کر مجرم کو اندر دھکیل دیتے ہیں، اس کے بالمقابل اہل جنت کا جنت میں جانا اعزاز واکرام کے ساتھ ہوگا اور اعزاز واکرام کا مقتضیٰ یہ ہے کہ معزز مہمانوں کے استقبال کے لیے دروازے پہلے کھلے رہیں، اس لیے وہاں "وفتحت ابوابھا" کی تعبیر اختیار کی گئی جس کا ترجمہ یہ کیا گیا اور دروازے کھلے ہوں گے جیسا کہ ایک موقعہ پر دخول جنت کے ذکر میں "مفتحۃ لھم الابواب"۔ فرمایا گیا۔ (تفسیر ادریسی: ۷/۱۱۶)

قیامت کے مختلف مناظر:

سورۃ الزمر کے آخر میں اللہ تعالیٰ قیامت کے مختلف مناظر کو بیان فرماتے ہیں کہ جب پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو

سب کے سب مر جائیں گے سوائے اس کے جس کو اللہ چاہے اور جب دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو سب کے سب اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کر اللہ کے سامنے پیش ہوں گے اور ان کا حساب ہوگا اور پھر کافروں کو کھینچ کھینچ کر دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا اور اہل تقوی کو بھی گروہوں کی شکل میں جنت کی طرف لے جایا جائے گا، جہاں ان کا شاندار استقبال ہوگا اور وہ بھی اللہ کی حمد وثناء الحمدللہ رب العالمین کہہ کر کریں گے۔(۶۰-۷۳)

خلاصہ رکوع: ۴......اخلاص في العبادت والوں کے لئے حمایت الٰہی کا اعلان۔ ماخذ: آیت: ۳۶،۳۸۔

خلاصہ رکوع: ۵......تارکین اخلاص في العبادت کے لئے شفاعت کی نفی۔ ماخذ: آیت: ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶۔

خلاصہ رکوع: ۶......اخلاص في العبادة والوں کی نجات کا اعلان۔ ماخذ: آیت: ۵۴، ۵۳، ۶۱، ۶۲۔

خلاصہ رکوع: ۷......ترک اخلاص في العبادة کی سزا۔ ماخذ: آیت: ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷۔

خلاصہ رکوع: ۸......مخلصین اور تارکین اخلاص کے نتائج اخروی۔ ماخذ: آیت: ۴۷، ۳۷، ۲۷۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورة المؤمن

یہاں سے سورۂ احقاف تک ہر سورت حٰمٓ کے حروف مقطعات سے شروع ہو رہی ہے، جیسا کہ سورۃ بقرہ کے شروع میں عرض کیا گیا تھا، ان حروف کا ٹھیک ٹھیک مطلب اللہ تعالی کے سوا کوئی نہیں جانتا، چونکہ یہ سات سورتیں حٰمٓ سے شروع ہو رہی ہیں، اس لئے ان کو حوامیم کہا جاتا ہے، اور ان کے اسلوب میں عربی بلاغت کے لحاظ سے جو ادبی حسن ہے اس کی وجہ سے انہیں عروس القرآن یعنی قرآن کی دلہن کا لقب بھی دیا گیا ہے، یہ تمام سورتیں مکی ہیں، اور ان میں اسلام کے بنیادی عقائد توحید، رسالت، اور آخرت کے مضامین پر زور دیا گیا ہے، کفار کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور کفر کے برے انجام سے خبردار کیا گیا ہے، اور بعض انبیائے کرام کے واقعات کا حوالہ دیا گیا ہے، اس پہلی سورت میں حضرت موسی علیہ السلام کا واقعہ بیان کرتے ہوئے آیت ۲۸ سے ۳۵ تک فرعون کی قوم کے ایک ایسے مرد مومن کی تقریر نقل فرمائی گئی ہے جنہوں نے اپنا ایمان تک چھپایا ہوا تھا، لیکن جب حضرت موسی علیہ السلام پر اور ان کے رفقاء پر فرعون کے مظالم بڑھنے کا اندیشہ ہوا، اور فرعون نے حضرت موسی علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، تو انہوں نے اپنے ایمان کا کھلم کھلا اعلان کرتے ہوئے فرعون کے دربار میں موثر تقریر فرمائی۔(توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی چالیسویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے نمبر ۶۰ پر ہے، اس سورۃ میں ۹ رکوع، ۸۵ آیات، ۱۲۴۲ کلمات اور ۵۲۱۳ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے چوتھے رکوع میں فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کے سلسلہ میں ایک مؤمن شخص جو کہ فرعون کے خاندان سے تھا اور پوشیدہ طور پر ایمان لے آیا تھا، اس لئے حضرت موسیٰ نے حمایت کی تھی اور فرعون کو بھی سمجھا دیا تھا، اس مردمومن کے تذکرہ کی نسبت سے سورۃ کا نام مؤمن قرار دیا گیا، اس سورۃ کا دوسرا نام غافر بھی ہے، چونکہ سورۃ کی ابتدائی آیات میں خدا کی صفات کے ذیل میں فرمایا گیا ہے ''غافر الذنب'' اس نسبت سے اس سورۃ کا نام غافر بھی ہوا۔

ربط:

اس سورۃ کا حاصل تین مضامین ہیں (۱) توحید (۲) معاندین فی الحق کی تہدید (۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا اور سورۃ سابقہ کے ختم پر مؤمنین و کفار کے احوال کا آخرت میں مختلف ہونا مذکور ہے کہ ایک ناجی ہے اور ایک ناری یعنی مبتلائے عذاب ہے اور سورۂ مؤمن میں دنیا میں دونوں احوال کا تفاوت بیان کیا گیا ہے کہ ایک مؤمن منقاد اور دوسرا گرفتار جدال وضلال ہے۔ اس تفصیل سے دونوں سورتوں کے شروع وآخیر میں تناسب ظاہر ہو گیا۔

فضائل سورۃ:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ میں جب ان سورتوں کی تلاوت کرتا ہوں جن کو ''حم'' سے شروع کیا گیا ہے، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا جنت کے باغوں میں آ گیا کہ وہ باغ نرم نرم زمین میں ہیں اور متعجب ہو کر ان کو دیکھتا ہوں۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ''لكل شي لباب و لباب القرآن الحواميم'' یعنی ہر چیز کا لباب (خلاصہ) ہوتا ہے اور قرآن پاک کا لباب حوامیم ہیں، بعض صحابہ اور تابعین سے منقول ہے کہ حوامیم عرائش قرآن اور دیباج قرآن ہیں۔

بعض علماء کا قول ہے کہ حروف مقطعات مقسم بہ ہیں یعنی ان کی قسم کھائی ہے اور ہر حروف سے ایک کلمہ کی طرف اشارہ ہے۔ تو یہاں ح سے اشارہ ہے کلمہ حق کی طرف کہ خدا کا حکم ہرگز رد نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی رکتا ہے۔ اور م سے اشارہ ہے ملک حق کی طرف کہ وہ بھی زائل وفانی نہیں ہوگا اور آگے جواب قسم مذکور ہے۔

خلاصہ مضامین:

یہ سورۃ مکی ہے اور قیام مکہ کے درمیانی زمانہ کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے، جن حالات میں سورۃ نازل ہوئی ہے ان حالات کی طرف اشارات اس سورۃ کے مضامین میں موجود ہیں۔ کفار مکہ نے اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف علاوہ دیگر کاروائیوں کے دومہم خاص طور سے اٹھا رکھی تھیں، ایک یہ کہ قرآن کی تعلیم، اسلام کی دعوت اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں طرح طرح کے الزامات وشبہات پیدا کر کے لوگوں کو بدظن کرنا اور ہر طرف جھگڑے وبحثیں چھیڑ کر الٹے سیدھے سوالات اٹھانا، تاکہ آپ اور آپ کے متبعین پریشان ہوں۔ دوسرے یہ کہ معاذ اللہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر کے دین اسلام کا خاتمہ کر دیا جائے، جس کے لئے کفار طرح طرح کی سازشیں کر رہے تھے اور جیسا کہ بخاری شریف کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے اس کا اقدام بھی کر ڈالا تھا، چنانچہ حضرت عروہ بن زبیر سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمر بن عاص سے کہا کہ مجھے وہ سب سے زیادہ سخت حرکت بیان کیجئے جو مشرکوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کی تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحن کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، تو عقبہ بن معیط آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش مبارک کو پکڑ کر اپنا کپڑا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن میں ڈال کر مروڑنے لگا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گلا گھوٹنے لگا، اس وقت حضرت ابوبکر صدیق پہنچ گئے اور عقبہ کی گردن پکڑ کر رسول اللہ کے پاس سے ہٹا دیا اور فرمایا ''**اتقتلون رجلا ان یقول ربی اللہ وقد جاء کم بالبینات من ربکم**'' کہ کیا تم ایک شخص کو اس وجہ سے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور تمہارے رب کے پاس سے کھلی دلیلیں لے کر آیا ہے۔

اس سورۃ کے شروع میں اللہ کے چند صفاتی نام بتلا کر کہا گیا کہ یہ قرآن اسی اللہ نے نازل کیا ہے جس کی یہ صفات ہیں، یہ اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے اتارا ہے۔ جو اس کو نہیں مانتے، اس میں شک کرتے ہیں اور جھگڑے نکالتے ہیں، اس کے باوجود وہ مال وجاہ کے مالک بنے ہوئے ہیں تو ان کی حالت سے کسی کو دھوکہ نہیں کھانا چاہئے، اللہ نے ان کو مہلت دے رکھی ہے، ورنہ ان کی کیا مجال کہ وہ اس ذات والا صفات کا مقابلہ کریں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے سرکش ایسے ہوئے ہیں جو اللہ کو نہیں مانتے تھے، انہیں اللہ نے دنیا میں بھی سزا دی اور آخرت کا بڑا عذاب ان کے لئے موجود ہے۔ ان کے برخلاف اللہ کے فرمانبردار بندوں کے لئے دنیا وآخرت دونوں میں بھلائی ہی بھلائی ہے، اللہ کے مقرب فرشتے ان کے لئے دعا کرتے ہیں اور اللہ سے ان کے لئے بخشش ومغفرت طلب کرتے رہتے ہیں۔ بدکاروں کو قیامت کے دن ان کے برے اعمال کی سزا ملے گی، ان کے اعمال سب اللہ کے پاس محفوظ ہیں۔ اور قیامت میں ان کے سامنے دکھلائے جائیں گے، اس وقت وہ اپنی کرتوتوں پر شرمندہ ہوں گے اور افسوس کریں گے اور تمنا کریں گے کہ اب دنیا میں ہمیں دوبارہ بھیجا جائے تو ہم اچھے کام کر کے دکھائیں گے۔ مگر اس وقت ان کی وہ تمنا پوری نہ ہوگی۔ اس لئے آگے تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ اللہ کی قدرت کو دنیا ہی میں پہچان لو؛ ورنہ آخرت میں وہ سزا ملے گی کہ جس کا تصور نہیں کر سکتے ہو۔ آگے عبرت کے لئے فرعون اور حضرت موسیٰؑ کا قصہ سنایا گیا کہ حضرت موسی نے فرعون کو بہت کچھ سمجھایا، بلکہ خود اس کے خاندان کے ایک آدمی نے بھی جو خفیہ طور پر ایمان لے آیا تھا خوب سمجھایا، لیکن وہ نہ مانا، بالآخر اللہ نے فرعون اور اس کی قوم کو دنیا میں تباہ کر دیا اور آخرت میں وہ دوزخ میں جھونکے جائیں گے، پھر سمجھایا گیا کہ لوگ اللہ کو کیوں نہیں مانتے، اس کی قدرت تو دنیا جہان کی پیدائش اور خود انسان ہی کی پیدائش سے ظاہر ہے۔ آخر میں منکرین ومکذبین کو بتلایا گیا کہ اللہ دنیا میں اور آخرت میں اپنے رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کی مدد کریں گے اور جو منکر غلط باتوں پر اڑا رہے گا ان کا انجام بہت برا ہوگا۔

اس لئے انسانوں کو چاہئے کہ پہلے ہی سمبھل جائیں، ورنہ انجام کار بڑے خسارے اور گھاٹے میں رہیں گے۔ واللہ اعلم!

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورت کا مقصد دین کی تبلیغ اللہ تعالیٰ پر اعتماد و سہارا لے کر کرنا ہے۔

مبلغ کے لیے اصول:

داعی اور مبلغ کو اللہ کی پناہ پکڑ کر بے خوف ہو کر دعوت دینی چاہیے۔ ظالم کی ظاہری طاقت کو دیکھ کر دعوت سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جان سے مارنے کی دھمکیاں ملیں لیکن وہ اپنے کام میں مشغول رہے۔

◇ حق و باطل کی جدو جہد میں حق کا ساتھ دینا چاہیے، مثال کے طور پر ایک مومن جس کا ایمان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں پختہ تھا، اس نے فرعون کے ظلم کی پرواہ کیے بغیر حق کی آواز بلند کی کہ جو صحیح راہ دکھاتا ہے اس کو ہی قتل کرنے کی سازش کر رہے ہو، اور اپنا انجام اللہ پر چھوڑ دیا، تو اللہ پاک نے اسے اس کے ظلم سے بچا لیا، سچائی پر پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن شکست نہیں ہوتی۔ (۴۵)

◇ دعوت دیتے کے وقت مخالف کے مقام و مرتبہ کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب ماحول بنایا جائے، تکبر ہرگز نہیں ہونا چاہیے، جو آیت نمبر ۲۹ سے واضح ہے۔ آج تو تمہیں ایسی سلطنت حاصل ہے کہ زمین میں تمہارا راج ہے، لیکن اگر اللہ کا عذاب ہم پر آ گیا تو کون ہے جو اس کے مقابلے میں ہماری مدد کرے؟

◇ تبلیغ کے دوران محبت پیدا کرنے والے الفاظ استعمال کیے جائیں؛ تا کہ جن کے سامنے دعوت پیش کر رہے ہو اس کا دل نرم ہو جائے اور کلام اس کے دل میں اتر جائے۔ (۳۰)

◇ تاریخی واقعات کو پیش کیا جائے، تا کہ اچھے برے اعمال کے نتائج ذہن کو دستک دے اور گمراہی کے تالے ٹوٹ جائیں۔

◇ داعی کو خصوصی طور پر دعا کی پابندی کرنی چاہیے؛ کیونکہ جو دنیا میں اپنے رب سے نہیں مانگتا، وہ آخرت میں بہت سی اچھی چیزوں سے محروم ہو جائے گا۔

حروف مقطعات یہ ایک کوڈ ورڈ ہے جو سورہ کے موضوعات اور مقاصد کو واضح کرتا ہے، یہ چھ سورتیں بھی ''حم'' سے شروع ہوتی ہیں، اس لیے تمام سورتوں کا ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ ہے، اس کو پہلے سمجھیں۔

◇ ہر سورت مکہ مکرمہ میں اتری۔

◇ ہر سورت کا آغاز قرآن شریف کی قدر و برتری کو ظاہر کرتا ہے، جیسا کہ حم سجدہ آیت / ۲، شوریٰ / ۲، زخرف / ۲، دخان / ۲، جاثیہ / ۲، احقاف / ۲۔

◇ بنی اسرائیل کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کی گفتگو کی تفصیل: سورہ حم سجدہ: آیت / ۴۵، زخرف / ۴۶،

دخان/ ۱۷، ۱۸ جاثیہ/ ۱۶، احقاف/ ۱۲

◇ رسالت کا بنی اسرائیل سے امت محمدیہ کی طرف منتقل ہوجانا: سورہ شوریٰ: آیت/ ۱۳، جاثیہ/ ۱۸، احقاف/ ۱۲۔

◇ اتحاد کے لیے ابھارنا اور فرقہ واریت کی روک تھام۔ سورہ حم سجدہ: آیت/ ۴۵، شوریٰ/ ۱۳، ۱۴، زخرف/ ۶۵، جاثیہ/ ۱۷۔

◇ بردباری سے کام لینا: سورہ شوریٰ: آیت/ ۲۳، زخرف/ ۸۹، دخان/ ۵۹، احقاف/ ۳۵

مندرجہ بالا سورتوں کا مقصد امت محمدیہ کو متنبہ کرنا ہے کہ آپ قرآن اور اس کے احکام کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں، اسی طرح آپ زمین پر اپنی زندگی اللہ کے بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق گزارنے کے پابند ہیں۔ اگر تم بنی اسرائیل کی طرح ذمہ داری میں سستی کروگے، تو اللہ پاک تمہیں بھی ان کی طرح تباہ کردے گا اور ذمہ داری نبھانے پر جو وعدے تم سے کئے ہیں ان سے محروم کردے گا۔ اسی لیے ہر سورت کے شروع میں قرآن کی قدر ومنزلت کا درس دیا، اتحاد کا سبق دیا، تعصب سے روکا، بردباری کا درس دیا؛ کیونکہ عاجزی تبلیغ کے کام میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ (خواطر قرآنیہ، قرآن سارانس گجراتی)

یہاں سے لے کر سورہ احقاف تک ہر سورت ''حم'' سے شروع ہورہی ہے، یہ سات سورتیں ہیں اور ان کو ''حوامیم'' کہا جاتا ہے اور ان کے اسلوب میں عربی بلاغت کے لحاظ سے جواد بی حسن ہے، اس کی وجہ سے ان کو عروس القرآن یعنی قرآن کی دلہن کا لقب دیا جاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے شروع دن میں آیت الکرسی اور سورہ مؤمن کی ''پہلی تین آیتیں (حم سے الیہ المصیر تک) پڑھ لیں۔ وہ اس دن ہر برائی اور تکلیف سے محفوظ رہے گا۔

ابوداؤد و ترمذی میں ہے کہ آپ نے فرمایا (کسی جہاد کے موقع پر) کہ اگر رات میں تم پر چھاپہ مارا جائے تو تم **حم لا ینصرون** پڑھ لینا، جس کا حاصل لفظ حم کے ساتھ یہ دعا کرنا ہے کہ ہمارا دشمن کامیاب نہ ہو اور بعض روایات میں **حم لا ینصروا** بغیر نون کے آیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب **حم** تم کہوگے تو دشمن کامیاب نہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ **حم** دشمن سے حفاظت کا قلعہ ہے۔ (معارف القرآن)

موضوع سورت:

اس سورت کا اصل موضوع حق و باطل اور ہدایت وضلالت کے درمیان معرکہ کا بیان ہے۔

اس سورت کی ابتداء قرآن کریم کی حقانیت سے ہوئی ہے اور اس کے بعد فوراً اللہ کی چند صفات بیان کی گئیں ہیں:

تازہ اور زندہ کلام:

جو کئی صدیاں گزرنے کے باوجود آپ کی نبوت کی صداقت کا گواہ ہے، اللہ کے علوم ومعارف پر قدامت اور کہنگی کا کوئی اثر نہیں ہے، وہ آج بھی تازہ اور زندہ کلام ہے، سائنسی ترقیاں اور جدید تحقیقات اس کے بیان کردہ علمی حقائق کی

تصدیق کرتی ہیں ۔ جوں جوں انسان کے علم میں اضافہ ہوگا، توں توں وہ قرآن کے ربانی کلام اور معجزہ ہونے کا اقرار کرتا جائے گا، شرط بس یہ ہے کہ اسے قلب سلیم عطا ہوا ور وہ گروہی تعصب اور حاسدانہ بغض وعناد سے بالاتر ہو کر سوچے ۔

ایک ہی آیت میں اللہ تعالیٰ کی چار صفات:

غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِي الطَّوْلِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ③

قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کا ذکر کرنے کے بعد ایک ہی آیت میں اللہ کی چار صفات بیان کی گئی ہیں، یعنی وہ گناہ معاف کرنے والا، توبہ قبول کرنے والا، سخت سزا دینے والا، بندوں پر فضل واحسان کرنے والا ہے ۔ (۳)

ان صفات کو بیان فرما کر دو حقیقتوں کا اظہار فرمایا کہ

◇ (۱) معبود في الحقيقت اس کے سوا کوئی نہیں، خواہ کتنے ہی جھوٹے معبود بنا لئے جائیں ۔

◇ (۲) پلٹ کر یعنی اس دنیا سے گزر کر سب کو آخر کار اس کے پاس جانا ہے ۔ وہی حساب کتاب لینے والا اور جزا وسزا دینے والا ہے، لہٰذا اگر اس کو چھوڑ کر کوئی دوسروں کو معبود بنائے گا تو اپنی اس غلطی کا خمیازہ خود بھگتے گا ۔

فرشتوں کی تعداد:

عرش کو اٹھانے والے فرشتے ابھی چار ہیں اور قیامت کے دن ان کی تعداد آٹھ ہو جائے گی اور اس کے علاوہ عرش کے گرد کتنے فرشتے ہیں ان کی تعداد اللہ ہی جانتا ہے ۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے ۔ ان سب فرشتوں کو کروبی کہا جاتا ہے ۔ یہ سب اللہ تعالی کے مقرب فرشتے ہیں ۔

اہل ایمان کے لیے فرشتوں کی دعائیں:

سورہ مومن کی آیت ۷ میں اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں کہ سب فرشتے مومنین کے لئے خصوصا ان اہل ایمان کے لئے جو گناہوں سے توبہ کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور شریعت کی اتباع کی کوشش کرتے رہتے ہیں، ان کے لئے دعائیں کرتے رہتے ہیں ۔ وہ عرض کرتے ہیں:

◇ اے ہمارے رب! تیری رحمت اور علم ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے پس تو مغفرت فرما دے ان لوگوں کی جو توبہ کرتے ہیں اور تیری راہ کی اتباع کرتے ہیں ۔

◇ اور انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے ۔

اے ہمارے رب! تو انہیں بھی ان دائمی باغات میں داخل فرما دے جن کا تو نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے اور ان کے آباء، ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو نیک ہیں انہیں بھی داخل فرما دے، بے شک تو ہی غالب اور حکمت والا ہے ۔

◇ اور ان کو عذابوں سے بچائے رکھ اور جسے تو نے اس دن عذابوں سے بچا لیا تو بے شک تو نے اس پر مہربانی فرمائی اور یہی بڑی کامیابی ہے ۔" (۷ ۔ ۸)

علماء نے لکھا ہے کہ یہاں پر فرشتوں کی جو دعائیں مذکور ہیں وہ لفظ ’ربنا‘‘ کے ساتھ ہیں اور قرآن کریم میں دیگر مقامات پر جو انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی دعائیں مذکور ہیں۔ وہ بھی عموما ’’رَبِّ‘‘ یا ’ربنا‘‘ سے شروع ہوتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کے وقت اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کے منہ سے لفظ ’’رَبِّ‘‘ سننا بہت پسند ہے، اس لئے اپنی دعاؤں میں اس کا خوب اہتمام کرنا چاہیئے۔

قرآن کریم کا انداز:

قرآن کریم کا انداز بیان یہ ہے کہ ترغیب کے بعد ترہیب اور جنت کے بعد جہنم اور اہل ایمان کے بعد اہل کفر کا تذکرہ کرتا ہے، تاکہ دونوں کی زندگیوں اور حالات کا موازنہ ہو سکے اور کامیاب اور ناکام لوگوں کی پہچان آسان ہو جائے۔ چنانچہ یہاں بھی جنت والوں کے تذکرے کے بعد ’’مقرب فرشتے‘‘ ان کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔

اہل کفر کا تذکرہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ۝۱۰

جب انہیں بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل کر دیا جائے گا اور وہ اپنے اعمال بد کا انجام دیکھ لیں گے تو اپنے آپ سے سخت نفرت کریں گے اور اپنے آپ کو برا بھلا کہتے ہوئے معذرت پیش کریں گے۔ دنیاوی اکڑفوں سب ختم ہو جائے گی اور ذلت اور انکساری کے ساتھ آگ کے شعلوں سے نکالنے کی درخواست کریں گے۔ لیکن ان کی یہ درخواست رد کر دی جائے گی اور جہنم کے داروغے ان سے کہیں گے ’’(آج) تمہیں جتنی بیزاری اپنے آپ سے ہو رہی ہے اس سے زیادہ بیزاری اللہ کو اس وقت ہوتی تھی جب تمہیں ایمان کی دعوت دی جاتی تھی، اور تم انکار کرتے تھے۔‘‘ (۱۰)

اللہ تعالیٰ کی تین صفات:

آیت ۱۵ / میں اللہ تعالیٰ کی تین صفات بیان فرمائی گئی ہیں:

رَفِيْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ۝۱۵

(۱) **رفیع الدرجات** یعنی اونچے درجوں والا ہے یعنی تمام موجودات میں اس کا مقام بدرجہا بلند ہے، وہ جمیع صفات کمال میں سب سے بلند رتبہ ہے۔ اس کے رتبہ کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ سب اس کے محتاج ہیں، ذات میں بھی اور صفات میں بھی، لیکن وہ کسی کا محتاج نہیں۔

(۲) **ذو العرش** عرش کا مالک ہے، عرش کے معنی ہیں تخت شاہی کے اور کبھی عرش عزت، غلبہ اور سلطنت کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں تین مختلف جگہوں پر عرش کی تین صفتیں ذکر فرمائی ہیں: (۱) سورہ توبہ میں **وھو رب العرش المجید** (۲) سورہ مومنون میں **رب العرش الکریم** (۳) سورہ بروج میں **ذو العرش المجید**۔ بہرحال علماء

نے لکھا ہے کہ عرش کی عظمت پر سوائے غائبانہ ایمان رکھنے کے ہم اس کی حقیقت واصلیت کو نہیں سمجھ سکتے، اس لئے اس میں زیادہ بحث میں بھی نہیں جانا چاہئے۔

(۳) یلقی الروح وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے روح (یعنی وحی) نازل کردیتا ہے۔ یہ تینوں صفات ارشاد فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا تاکہ ملاقات کے اس دن سے لوگوں کو خبر دار کرے جس دن وہ سب کھل کر سامنے آجائیں گے۔ اللہ سے ان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہوگی (اس وقت کہا جائے گا) کس کی بادشاہی ہے آج؟ (پھر خود ہی جواب دے گا) صرف اللہ کی جو واحد قہار ہے۔ (آیت:۱۶)

حضرت موسی علیہ السلام اور فرعون کا قصہ:

آیت ۲۳ سے تقریبا دو رکوع میں حضرت موسی علیہ السلام اور فرعون کا قصہ ذکر کیا گیا ہے۔ اس قصہ میں ایک طویل مکالمہ اس مرد مؤمن کا بھی ہے جو آل فرعون سے ہونے کے باوجود موسی علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر ایمان لے آیا تھا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ فرعون کے چچازاد تھے اور ان کا نام شمعان یا حزقیل تھا۔

ایک حدیث میں ہے کہ صدیقین چند ہیں (ایک) حبیب نجار (سورہ یٰسین والے) (دوسرے) یہ مرد مومن جن کا تذکرہ اس سورت میں ہے اور (تیسرے) حضرت ابوبکرؓ اور وہ ان سب میں افضل ہیں۔ (قرطبی)

یہ صاحب خفیہ طور پر ایمان لے آئے تھے جب فرعون اور اس کے وزیر ہامان وغیرہ حضرت موسی علیہ السلام کے قتل کے منصوبے بنانے لگے تو یہ مرد مؤمن حضرت موسی علیہ السلام کے دفاع کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرعون کے سامنے کلمہ حق بلند کرتے ہوئے کہنے لگے: ''کیا تم ایک شخص کو صرف اس لئے قتل کر رہے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے؟ حالانکہ وہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے روشن دلیلیں لے کر آیا ہے۔'' لیکن فرعون اپنی بات پر اڑا رہا۔

آج کے ڈکٹیٹروں کا مزاج:

قارئین کرام اگر آپ اپنے گردوپیش کا جائزہ لیں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ آج کے ڈکٹیٹروں کا مزاج بھی وہی ہے جو کل کے ڈکٹیٹروں کا تھا، وہ اپنے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات کو حرف آخر سمجھتے ہیں، پوری انسانیت ایسے ہی ڈکٹیٹروں کے نرغے میں ہے اور خود امت مسلمہ کی گردنوں پر بھی ایسے ہی خودسر اور متکبر مسلط ہیں جو اپنے آپ کو عقل کل سمجھتے ہیں اور کسی بڑے عالم کی رائے کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔

انسان کو بگاڑنے والی عموما تین چیزیں:

علماء نے لکھا ہے کہ انسان کو بگاڑنے والی عموما تین ہی چیزیں ہوتی ہیں:

(۱) اپنی قوت وطاقت پر ناز (۲) اپنے علم یا قابلیت پر گھمنڈ (۳) دولت اور ثروت میں زیادتی اور اس پر بھروسہ۔ اگر یہ تین چیزیں جمع ہوجائیں تو انسان بڑی تیزی سے تباہی کے راستہ پر آجاتا ہے۔ فرعون کے اندر یہ تینوں ہی

چیزیں جمع ہوگئی تھیں، اس لئے بجائے اس کے کہ وہ اس مرد مؤمن کی بات کو سمجھتا۔ واضح الفاظ میں کہنے لگا: میں تو تمہیں وہی رائے دوں گا جسے میں درست سمجھتا ہوں اور میں تمہاری جو رہنمائی کر رہا ہوں وہ بالکل ٹھیک راستے کی طرف کر رہا ہوں۔ مرد مومن نے بھی فرعون کو سمجھانے کی پوری کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ نرمی سے کام نہیں چلتا تو اس نے ان کو اللہ کے عذاب سے اور پچھلی قوموں پر جو اللہ کا عذاب آیا تھا، اس سے ڈرانا شروع کر دیا لیکن فرعون اور اس کے حواریوں پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اللہ نے فرمایا:

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾ (آیت ۳۵)

ترجمہ: اسی طرح اللہ ہر متکبر جبار کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام اخلاق و اعمال کا سرچشمہ انسان کا دل ہی ہے۔ ہر اچھا برا عمل انسان کے دل سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے حدیث شریف میں ہے کہ انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا یعنی دل ہے کہ جس کے درست ہونے سے سارا بدن درست رہتا ہے اور اس کے خراب ہونے سے سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کی حفاظت فرمائے۔

فرعون کی گھبراہٹ:

مرد مومن کی تقریر اس قدر اچھی اور پر اثر تھی کہ فرعون گھبرا گیا کہ میرے لوگوں پر اس کی بات کہیں اثر نہ کر جائے، اس لئے ان کی تقریر کا اثر ختم کرنے کے لئے مذاق کرنے لگا اور اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا کہ میرے لئے ایک ایسی بلند و بالا عمارت تعمیر کرو کہ میں اس پر چڑھ کر تو دیکھوں کہ موسیٰ کا خدا ہے کہاں؟ علماء نے لکھا ہے کہ عموماً حکمرانوں کا طرز عمل یہ ہی ہوا کرتا ہے کہ مد مقابل کو دلیل سے شکست دینے کی کوشش کرتے ہیں، اگر یہ ہوتا نظر نہ آئے تو پھر استہزاء اور مذاق کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں کہ سامنے والے کی اہمیت لوگوں کے دلوں سے نکل جائے، فرعون نے بھی یہی کوشش کی لیکن مرد مومن نے اس کے باوجود یہ ہی کوشش کی کہ کس طرح ان کے دل میں میری بات اتر جائے لیکن فرعون نہ خود ایمان لایا اور نہ اپنے مقربین کو ایمان لانے دیا، اسی حالات میں اللہ کی پکڑ میں آ گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾

''نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے جو بڑے بڑے منصوبے بنا رکھے تھے اللہ نے اس مرد مؤمن کو ان سب سے محفوظ رکھا اور فرعون کے لوگوں کو بدترین عذاب نے آ گھیرا۔ (آیت ۴۵) اور اس عذاب نے فرعون اور اس کے حواریوں کو ایسا گھیرا کہ وہ عذاب قبر میں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۗ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾

''آگ ہے جس کے سامنے انہیں صبح و شام پیش کیا جاتا ہے۔'' اور آخرت میں تو انہیں شدید ترین عذاب کا سامنا کرنا

ہی پڑے گا۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں : اور جس دن قیامت آجائے گی اس دن حکم ہوگا کہ فرعون کے لوگوں کو سخت ترین عذاب میں داخل کردو۔'' (آیت ۴۶) (خلاصہ مضامین قرآن کریم ،خلاصۃ القرآن)

عذاب قبر کا ذکر :

عذاب قبر کا ذکر کم وبیش ستر (۷۰) احادیث صحیحہ میں آتا ہے، قبر میں دفن کیے جانے والے شخص کا ذکر تو عام ہے کہ دفن کے فورا بعد منکر نکیر نامی فرشتے قبر میں آکر مردے سے سوال وجواب کرتے ہیں جس کے نتیجے میں اس پر راحت یا تکلیف والی منزل ضرور آتی ہے، اور اگر کسی شخص کو دفن ہی نہ کیا گیا ہو، اسے جانوروں نے کھا لیا ہو، آگ نے جلا دیا ہو یا پانی میں غرق ہو گیا ہو، اس کے ذرات ہوا میں اڑ گئے ہوں یا مٹی میں مل گئے ہوں، ہر صورت میں سوال وجواب کی منزل ضرور آتی ہے مگر اس کی کیفیت کا علم ہمیں اس وقت نہیں ہوتا، اس سارے مرحلے کا صحیح صحیح ادراک تو مرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ تم اپنے مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں اللہ تعالی سے دعا کرتا کہ مردوں کی سزا کی جو کیفیت میں دیکھ رہا ہوں وہ تمہیں بھی دکھا دی جائے، وہ ایسی ہولناک کیفیت ہے کہ اگر کوئی دیکھ لے تو مردوں کو دفن ہی نہ کرے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عذاب قبر سے بچاؤ کی یہ دعا بھی تعلیم فرمائی ہے جو کہ نماز میں درود شریف کے بعد پڑھی جانے والی دعاؤں میں شامل ہے **"اللھم انی اعوذبک من عذاب القبر و اعوذبک من فتنۃ المسیح الدجال و اعوذبک من فتنۃ المحیا و الممات "**۔ اے اللہ! میں تیری ذات کے ساتھ پناہ چاہتا ہوں قبر کے عذاب سے، مسیح دجال کے فتنہ سے، اور زندگی اور موت کے فتنہ سے۔ صحیح حدیث میں آپ کا یہ فرمان بھی موجود ہے کہ قبروں میں تمہاری بہت بڑی آزمائش ہوگی اور دجال کے فتنہ کے وقت بھی، لہذا جو شخص عذاب قبر کا انکار تاویل کے ساتھ کرتا ہے، وہ گمراہ اور بدعتی ہے اور جو آدمی سرے سے ہی عذاب وثواب قبر کا منکر ہے اس پر کفر لازم آتا ہے، یہ مسئلہ شفاعت کے مسئلہ کی مانند ہے کہ جو اس کا تاویل کے ساتھ انکار کرے وہ گمراہ اور بدعتی ہے اور جو مطلقا انکار کرتا ہے اس پر تکفیر کا فتوی لگتا ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ارشاد کے مطابق عذاب قبر کو تسلیم کرلے، اگر ہم اس کی کیفیت معلوم کرنا چاہیں تو یہ ممکن نہیں، کیونکہ ہمارے پاس وہ آنکھیں نہیں جن کے ذریعے ہم عذاب وثواب کا مشاہدہ کرسکیں، آپ اس کی مثال اس طرح بیان کرتے ہیں کہ آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کے قریب ایک شخص سویا ہوا ہے، اس کو خواب میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے جل رہا ہے، ڈوب رہا ہے، سانپ ڈس رہا ہے یا اس پر کوئی آفت آگئی ہے جس کی وجہ سے وہ خوفزدہ ہو کر کانپ رہا ہے اور بعض اوقات اس کی چیخیں بھی نکل جاتی ہیں مگر پاس والے آدمی کو اس کی تکلیف کا کچھ ادراک نہیں ہوتا، اس طرح عذاب قبر کا ادراک اس جہاں میں رہنے والوں کو نہیں ہوتا، بلکہ اس کو وہی محسوس کرتا ہے جو اس میں مبتلا ہوتا ہے۔ (معالم العرفان: ۱۶/ ۳۲۵، ۳۲۸)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے قصہ سے تین سبق:

گزشتہ تین رکوعات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا جو قصہ سنایا گیا عین ان حالات کے مطابق تھا جن حالات میں اس سورت کا نزول مکہ معظّمہ میں ہوا، اس وقت کفار مکہ بھی طرح طرح کی سازشوں میں اور الزامات لگانے میں مصروف تھے اور آپ کو قتل کرنے کی سازشیں کر رہے تھے۔ اس صورت حال میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا یہ قصہ سنایا گیا ہے جس میں تین مختلف سبق ہیں۔

(۱) کفار کو بتلایا گیا ہے کہ جو کچھ تم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کر رہے ہو یہی سب کچھ فرعون نے بھی اپنی طاقت کے بھروسے پر کیا تھا، مگر وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا اور تکذیب رسول اور عداوت پیغمبر کے باعث ہلاکت سے دوچار ہوا۔ اگر یہی صورت تمہاری رہی تو تم بھی اس صورت حال سے دوچار ہو جاؤ گے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے متبعین کو تسلی اور سبق دیا گیا ہے کہ یہ کفار چاہے کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہو جائیں اور اہل اسلام ان کے مقابلے میں کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہو جائیں، مگر اللہ کی نصرت ان کے لئے آ کر رہے گی اور آج کے فرعونی بھی وہ ہی دیکھ لیں گے جو گزشتہ فرعون دیکھ چکے ہیں، مگر اس وقت تک صبر، ہمت اور استقلال کے ساتھ ان مصائب کو برداشت کرنا ہوگا۔

(۳) ان لوگوں کو سبق دیا گیا کہ جو دلوں میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو تسلیم کرتے تھے مگر کفار کی زیادتیوں کے ڈر سے خاموش تھے۔ انہیں مرد مؤمن کے حالات سنا کر جتلایا گیا ہے کہ اس مرد مومن نے کس طرح بھرے دربار میں کلمہ حق بلند کیا اور مصلحتوں کو ٹھکرا کر حق کا ساتھ دیا، تمہیں بھی ایسے ہی کرنا چاہیے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن)

دعا کی اہمیت:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝۶۰

اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، بیشک جو لوگ تکبر کی بنا پر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے "**الدعاء مخ العبادة**"۔ یعنی دعا عبادت کا مغز ہے، آپ کا یہ بھی فرمان ہے "**ليس شيء اكرم على الله من الدعاء**"۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں دعا سے زیادہ کوئی چیز عزت والی نہیں ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا "**من لم يسال الله يغضب عليه**"۔ جو شخص اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق بعض لوگ مستجاب الدعوات ہوتے ہیں اور ان کی دعا کو رد نہیں کیا جاتا، مثلاً والد

کی دعا اولاد کے حق میں مستجاب ہوتی ہے، اور اگر والد اولاد پر ناراض ہے تو اس کی بددعا فوراً لگے گی، اسی طرح سفر کے دوران مسافر کی دعا قبول ہوتی ہے، مظلوم کی دعا بھی رد نہیں ہوتی، اسی طرح روزے دار اور حاکم عادل کی دعا کو شرف قبولیت حاصل ہوتا ہے، بیمار کی دعا بھی مقبولیت کے درجے میں ہوتی ہے جب تک وہ تندرست نہ ہو، حاجی جب تک حج کر کے واپس اپنے گھر نہ پہنچ جائے اس کی دعا مقبول ہوتی ہے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے پس پشت دعا کرے تو فرشتہ آمین کہتا ہے اور ساتھ یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ تجھے بھی ایسا ہی عطا فرمائے، غرضیکہ بعض لوگوں کی دعا رد نہیں کی جاتی۔ (معالم العرفان: ۱۶/ ۳۴۰)

چند نعمتوں کا تذکرہ:

فرعون جیسے ناشکروں، متکبروں اور ظالموں کا عبرت آموز تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی چند نعمتوں کا تذکرہ کرتا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا .... الیٰ.........ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦٤﴾

(۱) اللہ نے رات کو بنایا تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو۔

(۲) دن کو بنایا تاکہ تم اس میں دیکھو اور معاش کو تلاش کرو۔

(۳) زمین کو بنایا تاکہ تمہیں قرار حاصل ہو اور سکون بھی ملے۔

(۴) آسمان کو چھت بنایا۔

(۵) حسین صورتوں سے نوازا۔

(۶) رزق کے طور پر پاکیزہ چیزیں عطا کیں۔ (۶۱-۶۴)

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ انسان ان نعمتوں کا شکر ادا کرتا اور اس کو صحیح مقصد میں استعمال کرتا مگر اس نے ناشکری شروع کر دی، بلکہ ان نعمتوں کو دینے والے ہی کی نافرمانی کرنے لگا۔ اللہ نے فرمایا: آپ کہہ دیجئے مجھے اس بات سے منع کر دیا گیا ہے کہ جب میرے پاس میرے رب کی طرف سے کھلی کھلی نشانیاں آچکی ہیں تو پھر بھی ان کی عبادت کروں جنہیں تم اللہ کے بجائے پکارتے ہو؟ اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کے سامنے سر جھکاؤں۔ (آیت ۶۶)

انسانی تخلیق کے مراحل:

اگر انسان خارجی کائنات پر غور وفکر کرنے کی بجائے خود اپنی تخلیق ہی میں غور وفکر کرلے، تو وہ اللہ کو پہچان سکتا ہے، انسان اپنی تخلیق میں مختلف مراحل سے گزرتا ہے، ان میں سے ہر مرحلہ ہی بڑا عجیب اور حیران کن ہے، بے جان مٹی سے اس کی ابتدا ہوتی ہے پھر نطفہ، جما ہوا خون، گوشت کی بوٹی، ہڈیاں، ڈھانچہ، جان عقل، سمع، بصر، پورے جسم میں ہزاروں میل لمبی پھیلی ہوئی رگوں کا حال، خون کی گردش، دل کی حرکت، تین سو ساٹھ جوڑ۔ پیدا ہوتا ہے تو از حد کمزور اور عاجز، نہ

طاقت گفتار، نہ تمیز و عرفان، پھر اسے اللہ عقل و فہم اور قوت و ادراک عطا کرتا ہے، بچپن کے بعد جوانی کی حدود میں قدم رکھتا ہے، پھر بڑھاپا اسے آلیتا ہے اور انسان ویسے ہی ہو جاتا ہے جیسے بچپن میں تھا، نظر کمزور، عقل میں خلل، اعضاء میں ضعف، حواس میں تعطل، چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے عاجز، یہاں تک کہ موت آجاتی ہے، موت بھی اس کی تخلیق کے مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے، موت کے بعد دوبارہ زندگی دی جاتی ہے تاکہ اس کی تخلیق کے بقیہ مراحل کی بھی تکمیل ہو جائے

کون ان سارے مراحل کی نگرانی کرتا ہے؟

ایک طرف انسانی زندگی کا یہ عجوبہ کاریاں اور قدرت الٰہیہ کی زندہ نشانیاں ہیں تو دوسری طرف آیات الٰہیہ میں جھگڑا کرنے والوں کا انکار اور اعراض؛ جو یہ بھول ہی جاتے ہیں کہ ہم مٹی اور نطفہ سے بڑھاپے اور موت تک کن مراحل سے گزرتے ہیں اور کون ہے جو ان سارے مراحل کی نگرانی کرتا ہے؟ اس لیے انسان کی تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یُجَادِلُوۡنَ فِیۡۤ اٰیٰتِ اللّٰہِ ؕ اَنّٰی یُصۡرَفُوۡنَ ﴿۶۹﴾

”کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اللہ کی آیات میں جھگڑتے ہیں، یہ کہاں پھرے جارہے ہیں۔“ (۶۷-۶۹)

ہلاک شدہ اقوام کا انجام:

سورت کے اختتام پر پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین کی گئی ہے، اس کے بعد جھٹلانے والوں کو زمین پر چل پھر کر ہلاک شدہ اقوام کا انجام اور ان کے آثار دیکھنے کی تلقین کی گئی ہے، ان اقوام کو بھی اپنی ظاہری قوت اور مادی وسائل پر بڑا ناز تھا۔ انہوں نے انبیاء کے معجزات اور صداقت کی واضح نشانیوں کو جھٹلا دیا، پھر جب انہوں نے اللہ کا عذاب اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیا تو توحید کا اقرار اور بت پرستی سے بیزاری کا اظہار کیا، لیکن یہ اقرار اور اظہار ان کے کسی کام نہ آیا، اس لیے کہ اللہ کا دستور متکبروں اور سرکشوں کے بارے میں یہ ہے:

فَلَمۡ یَکُ یَنۡفَعُهُمۡ اِیۡمَانُهُمۡ لَمَّا رَاَوۡا بَاۡسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰہِ الَّتِیۡ قَدۡ خَلَتۡ فِیۡ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِکَ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۸۵﴾

کہ عذاب کا مشاہدہ کر لینے کے بعد ان کا ایمان قبول نہیں کیا جاتا۔ (۷۷-۸۵)

فقہاء نے لکھا ہے کہ جب کافر کو عذاب، آخرت اور ملائکہ عذاب نظر آجائیں تو پھر اس کا ایمان قبول نہیں اور حدیث شریف میں ہے کہ غرغرہ سے پہلے تک کی توبہ قبول ہے۔ جب دم سینہ میں اٹکا، روح حلقوم تک پہنچی اور فرشتوں کو دیکھ لیا تو اس کے بعد کوئی توبہ نہیں۔ (خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ: ......حوامیم سبعہ مکیہ ہیں، سب میں دعوت الی القرآن ہے، البتہ ہر ایک کا عنوان علیحدہ ہے۔ چنانچہ سورۂ مؤمن کا موضوع مخالفین قرآن مجید کے لئے انذار ہے۔

خلاصہ رکوع:۱......مخالفین قرآن کے لئے انذار ہے، بضمن تذکیر بایام اللہ۔ ماخذ: آیت: ۵، ۶۔

خلاصہ رکوع: ۲......مخالفین قرآن کے لئے انذار بضمن تذکیر بمابعدالموت۔ ماخذ: آیت: ۱۰، ۱۸۔

خلاصہ رکوع: ۳......مخالفین قرآن کے لئے انذار بضمن تذکیر بایام اللہ۔ ماخذ: آیت: ۲۲، ۲۱۔

خلاصہ رکوع: ۴......مخالفین قرآن کے لئے انذار۔ (۱) بضمن تذکیر بایام اللہ- (۲) و بمابعدالموت - ماخذ: (۱) آیت: ۳۱، ۳۰۔ (۲) آیت: ۳۲۔

خلاصہ رکوع: ۵......مخالفین قرآن کے لئے انذار (۱) بضمن تذکیر بمابعدالموت و بایام اللہ۔ ماخذ: (۱) آیت: ۴۳۔ (۲) آیت: ۴۶، ۴۵۔

خلاصہ رکوع: ۶......مخالفین قرآن کے لئے انذار بضمن تذکیر بمابعدالموت۔ ماخذ: آیت: ۵۲، ۶۰۔

خلاصہ رکوع: ۷......تذکیر بآلاء اللہ یعنی جس خدا تعالی کے احکام کی ممانعت سے ہم تمہیں ڈراتے ہیں، وہ ان خوبیوں والا ہے۔ ماخذ: آیت: ۶۱، ۶۲، ۶۴، ۶۷، ۶۸۔

خلاصہ رکوع: ۸......مخالفین قرآن کے لئے انذار بضمن تذکیر بمابعدالموت۔ ماخذ: آیت: ۷۰ تا ۷۲، ۷۶، ۷۸۔

خلاصہ رکوع:......تذکیر بآلاء اللہ و بایام اللہ۔ ماخذ: آیت: ۸۲، ۷۹۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ حم سجدہ

یہ قرآن کریم کی ۴۱ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۶۱ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۶ رکوع ۵۴ آیات، ۸۰۹ کلمات اور ۳۴۰۶ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

چونکہ یہ سورۃ حروف مقطعات حم سے شروع ہوئی ہے اور ایک جگہ اس سورۃ میں سجدہ تلاوت آیا ہے اس لئے بطور علامت اس کا نام حم سجدہ مقرر ہوا۔

ربط:

یہ سورۃ مضمون توحید سے شروع ہو رہی ہے اور سورۃ گزشتہ اس پر ختم ہوئی تھی، یہی دونوں سورتوں کے اول و آخر میں ربط و تناسب ہے۔

فضیلت سورۃ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حم سات ہیں یعنی حم سے شروع ہونے والی سورتیں سات ہیں اور جہنم کے بھی سات دروازے ہیں۔ حم جہنم کے کسی ایک دروازہ پر ہوگی اور کہے گی یا اللہ جس نے مجھے پڑھا اور مجھ پر ایمان لایا

اس کو اس دروازہ سے داخل نہ کیجئے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں بتایا گیا کہ قرآن کریم وہ کتاب ہے جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئی، انسانوں کو ہدایت کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے، اگر انسان کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا تو یہ اپنی خواہشوں ہی کے پیچھے پڑ جاتا اور شیطان اس کو بہکا کر ادھر ادھر لئے پھرتا، اسی لئے یہ ہدایت نامہ نازل کیا گیا، اس میں انسانوں کو نیک و بد، اچھے برے، صحیح و غلط ،حق و باطل کاموں میں فرق کرنا خوب واضح طور پر سمجھا دیا گیا، اس میں خوشخبری بھی دی گئی، ڈرایا بھی گیا تا کہ علم اور عقل رکھنے والے اس سے فائدہ اٹھائیں ،لیکن افسوس کہ اکثر لوگ اس کی باتوں سے کتراتے ہیں، یہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانوں کے پاس بھیجا گیا جس میں بتلایا گیا کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے، اس کی عبادت کرو اور اس سے اپنے گناہوں اور خطاؤں کی مغفرت طلب کرتے رہو، جو لوگ ایک اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں ان کا انجام بہت برا ہوگا۔ان پر شیطان کا قابو چل گیا ہے، بھلائی صرف انہیں کے لئے ہے جو کہ ایک اللہ پر ایمان لا کر اچھے اعمال کریں، اس کے بعد توحید کے مضمون کو سمجھایا گیا کہ آخر تم اللہ کو کیوں نہیں مانتے؟ آسمان و زمین میں اللہ کی قدرت کی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں، زمین اس نے بنائی، آسمان اس نے بنائے، پھر آسمان کو ستاروں سے مزین اس نے کیا ان کا خالق وہی ایک زبردست و یکتا ہے جو سب کچھ جانتا ہے، اگر اس کو نہ مانا تو تمہارا بھی وہی حشر ہوگا جو تم سے پہلے لوگوں کا ہوا جنہوں نے رسول کی بات نہیں مانی اور ضد و عناد سے اپنے کفر پر اڑے رہے۔ان پر طرح طرح کی آفات مثلاً طوفان، زلزلہ، کڑک وغیرہ آئیں اور وہ تباہ و برباد ہوئے اور صرف وہی بچے جو ایماندار، پرہیز گار اور اللہ سے ڈرنے والے تھے، منکرین و ملزمین کو اپنی قوت طاقت اور ساز وسامان پر غرور تھا، انہوں نے یہ نہ سمجھا کہ اللہ ان سے زیادہ طاقتور ہے۔ یاد رکھو اللہ کے دشمن قیامت کے دن آگ میں ڈال دیئے جائیں گے جہاں وہ طرح طرح کے عذاب بھگتیں گے اور ان کے برے کاموں کی گواہی خود ان کے ہاتھ پیر دیں گے، اس لئے دنیا میں کئے ہوئے اعمال سے مکرنا کسی سے ممکن نہ ہوگا۔اس لئے اس نار جہنم سے جسے بچنا ہے دنیا ہی میں بچے، جس کا طریقہ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی اللہ کے حکموں کے موافق گزارے اور فرمایا گیا کہ تم میں اچھا اور بہتر وہی ہے جو دوسروں کو بھی اللہ کی طرف بلائے، اپنی عادات واخلاق درست کرے تا کہ دوسرے دیکھ کر ویسا ہی کریں۔

آخر میں عام انسانوں کی خصلت بیان فرمائی گئی ہے کہ انسان کا بھی عجیب حال ہے، جب اللہ تعالی اس کو نعمتیں عطاء کرتا ہے تو وہ ہماری طرف سے منہ موڑ لیتا ہے، ہمارے احکام کی پرواہ نہیں کرتا اور جب کوئی مصیبت آتی ہے تو اللہ کے سامنے لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔ خاتمہ پر فرمایا گیا کہ سمجھ لو قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے، جنہوں نے اس کی سچائی مان لی وہ بڑے سمجھدار ہیں، ورنہ رفتہ رفتہ اس کی سچائی بعد میں آنے والے واقعات سے ظاہر ہوتی چلی جائے گی۔ عجیب حال ہے کہ اس قرآن کی سچائی پر لوگ اللہ کی گواہی کو کافی نہیں سمجھتے حالانکہ اللہ کو ہر چیز کی حقیقت معلوم

ہے اور وہ سب کا حال جانتا ہے، اصل بات یہ ہے کہ لوگوں کو یہ دھوکہ لگ گیا ہے کہ انہیں اللہ کے سامنے حاضر نہیں ہونا ہے۔ یاد رکھو کہ اللہ کی قدرت کے اندر ہر چیز گھری ہوئی ہے اور اس کائنات کا ایک ایک ذرہ اللہ کے بس میں ہے اور سب کو اس کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

قرآن کریم کی تین صفات:

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳﴾ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۴﴾

ان آیات میں قرآن کریم کی تین صفات بیان کی گئی ہیں۔

(۱) عربی زبان میں نازل کیا گیا تاکہ اولین مخاطب قریش مکہ کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

(۲) فصلت ایتہ یعنی قرآن کریم کی آیات کو خوب کھول کھول کر واضح کر کے بیان کیا گیا ہے اور مثالوں سے ان کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔

(۳) بشیر ونذیر یعنی اپنے ماننے والوں کو دائمی راحتوں کی خوشخبری سناتا ہے اور نہ ماننے والوں کو ابدی عذاب سے ڈراتا ہے۔

قرآن کریم اور اس کی تمام صفات ایسے ہی لوگوں کو فائدہ دے سکتی ہیں جو سوچنے اور سمجھنے کا ارادہ بھی کرلیں۔

کوئی ابہام اور کوئی اخفاء نہیں:

یہ سورت اپنا آغاز قرآن عظیم کے ذکر سے کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ کتاب اس ہستی کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو بے حد مہربان اور انتہائی رحم کرنے والا ہے، اس سورت کے احکام اور معانی، مضامین اور مقاصد، قصص اور مواعظ، احکام اور امثال، وعدے اور وعیدیں سب بالکل واضح ہیں ان میں کوئی ابہام اور کوئی اخفاء نہیں۔ لیکن اس وضاحت اور بیان کے باوجود بہت سارے لوگ اس سے اعراض کرتے ہیں اور وہ بد بخت اپنے آپ کو خود ہی اندھوں اور بہروں کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں، کانوں میں ڈاٹ ہیں اور اے نبی! ہمارے اور تمہارے درمیان پردہ حائل ہے، لہذا نہ تو ہم تمہاری دعوت سمجھتے ہیں، نہ سنتے ہیں اور نہ ہی تجھے دیکھ پاتے ہیں، مشرکین کے ہذیان اور یاوہ گوئی کے جواب میں اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ آپ اپنی شخصیت کا تعارف اور اپنی بعثت کا مقصد بتادیجئے، آپ فرمادیجئے! مجھے فرشتہ یا کوئی دوسری مخلوق ہونے کا دعویٰ نہیں، میں بشری تقاضے اور ضروریات رکھنے والا تمہارے جیسا انسان ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے وحی اور رسالت کے ساتھ امتیاز بخشا ہے۔ (۲۔۶)

اعمال صالحہ کی پابندی کا فائدہ:

اس سورت کی آیت ۸ میں ارشاد فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۸﴾

''البتہ جولوگ ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں ان کے لئے بے شک ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے اس آیت شریفہ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ مؤمن جن اعمال صالحہ کا عادی ہوتا ہے اگر کسی بیماری، سفر یا دوسرے کسی عذر کی وجہ سے کسی وقت یہ عمل چھوٹ جائے تو بھی اللہ تعالی اس عمل کا اجر ختم نہیں فرماتے، بلکہ فرشتوں کو حکم فرماتے ہیں کہ میرا بندہ جو عمل اپنی تندرستی اور فرصت کے اوقات میں پابندی سے کیا کرتا تھا، ان کا جو اجر تھا وہ اس وقت بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھ دو۔ (معارف القرآن)

زمین وآسمان کو تابعداری کا حکم:

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ .... الیٰ .... قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴿۱۱﴾

آیت ۱۱ میں ارشاد فرمایا کہ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ اس وقت دھویں کی شکل میں تھا اور اس سے اور زمین سے کہا: چلے آؤ چاہے خوشی سے یا زبردستی۔ دونوں نے کہا ہم خوشی خوشی آتے ہیں۔'' چلے آؤ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے حکم کے تابع بن جاؤ۔ علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کے علاوہ دیگر مخلوقات میں یہ قدرت اور طاقت ہی نہیں رکھی کہ وہ اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی کر سکیں۔ اسی لئے فرمایا: ''چاہے خوشی سے آؤ یا زبردستی'' لیکن انسان کا معاملہ کائنات کی دوسری مخلوقات سے مختلف رکھا ہے۔ انسان اللہ تعالی کی طرف سے دو طرح کے احکامات کا پابند ہے۔ ایک تکوینی احکام یعنی کب پیدا ہوگا، عمر کتنی ہوگی، کون کونسی بیماریاں لاحق ہوں گی، اولاد کتنی ہوگی؟ وغیرہ یہ سب تکوینی امور ہیں اور ان میں انسان بھی دوسری مخلوقات کی طرح اللہ کے احکامات کا پابند ہے اور ان کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ اس لئے انسان کو بھی چاہئے کہ وہ زمین وآسمان کی طرح تکوینی امور میں اللہ کا حکم خوش دلی سے قبول کرے، لہذا غیر اختیاری معاملات میں جو بات بھی پیش آئے انسان کو اللہ کا حکم سمجھ کر کم از کم عقلی طور پر راضی رہنا چاہئے۔

دوسرے تشریعی احکام میں یعنی کون سی چیز حلال ہے اور کونسی حرام، اللہ تعالی کو کون سا کام پسند ہے اور کون سا ناپسند، انسان کو کہا گیا کہ وہ وہی کام کرے جو اللہ کو پسند ہے لیکن اس بات پر اسے ایسے مجبور نہیں کیا گیا جیسے تکوینی احکام میں مجبور ہے، بلکہ یہ تشریعی احکام دینے کے بعد اسے اختیار دیا گیا، اگر وہ ان پر عمل کرے تو اللہ خوش ہوگا اور اس پر اجر دے گا اور اگر عمل نہ کرے تو اللہ ناراض ہوگا اور عذاب دے گا۔ یہ ہی اس کا امتحان ہے اور اس پر جنت اور جہنم کا فیصلہ ہوگا۔

عاد وثمود کی تکذیب وانکار اور ان کا انجام:

اس کے بعد یہ سورت مشرکین کے کفر وشرک پر تعجب کا اظہار کرتی ہے جو اللہ کی عظمت وجلال کے آثار کا مشاہدہ کرنے کے باوجود ان کا انکار کرتے ہیں، ان آثار وبراہین کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ عاد وثمود کی تکذیب وانکار اور ان کا انجام ذکر کیا گیا ہے۔

قوم عاد کو حیرت انگیز جسمانی قوت عطا کی گئی تھی، ان کی طاقت کا یہ حال تھا کہ ان کا ایک شخص پہاڑ سے چٹان توڑ کر الگ کر دیتا تھا، چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اس قوت و طاقت کی عطا پر اللہ کا شکر ادا کرتے لیکن وہ شکر کے بجائے گھمنڈ میں مبتلا ہو گئے اور فخریہ طور پر چیلنج کرنے لگے:

وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۱۵﴾

کہ ہے کوئی جو ہم سے زیادہ طاقتور ہو۔ (۱۵)

ان کی حماقت اور نادانی کا جواب:

ان کی حماقت اور نادانی پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے انہیں جواب دیا گیا کہ کیا تم اس ذات کی قوت و طاقت سے غافل ہو گئے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے؟ کیا تم اس حقیقت کو بھول گئے ہو کہ تمہاری طاقت، باری تعالی کی عظمت و کبریائی اور قوت و جلال کے سامنے کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی۔

تیز اور ٹھنڈی ہوا کا عذاب:

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۶﴾

پھر یوں ہوا کہ ان پر تیز اور ٹھنڈی ہوا کا عذاب مسلط کر دیا گیا، مسلسل سات دن تک ہوا چلی اور ہوا نے انہیں اٹھا کر یوں پھینکا گویا وہ بے حیثیت کیڑے مکوڑے اور خس و خاشاک ہوں۔

قرآن و حدیث کے متعدد دلائل سے یہ بات ثابت ہے کہ کوئی دن منحوس یا برا نہیں بلکہ کسی بھی دن کو منحوس یا برا انسان کا عمل بناتا ہے۔ اس لئے اس آیت میں جو عاد و ثمود کے بارے میں فرمایا کہ ہم نے کچھ منحوس دنوں میں ان پر آندھی کی شکل میں ہوا بھیجی'' یہ دنوں کی منحوسیت مراد نہیں ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے اعمال نے اس دن کو ان کے لئے منحوس بنا دیا جس کی وجہ سے وہ دن ان کے لئے منحوس ثابت ہوئے۔

قوم ثمود بھی عذاب کی لپیٹ میں:

قوم ثمود نے بھی ایمان پر کفر کو، ہدایت پر ضلالت کو اور بصارت پر اندھے پن کو ترجیح دی تھی، ایک دن جب کہ وہ اپنی عیاشیوں میں مست تھے ایک چنگھاڑ آئی جس سے کانوں کے پردے پھٹ گئے اور زلزلہ آیا جس سے سب کچھ زیر و زبر ہو کر رہ گیا۔ (۱۷) (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن)

وقوع قیامت اور جزائے عمل:

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۱۹﴾

آیت ۱۹ سے اللہ نے جزائے عمل کے سلسلے میں فرمایا کہ اللہ کے دشمنوں کافروں اور مشرکوں کا دوزخ کے قریب اجتماع ہوگا۔ پھر ان کو ان کے جرائم کے اعتبار سے مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ جب محاسبہ اعمال کی منزل آئے گی تو خود انہیں کے اعضاء و جوارح کو ان پر بطور گواہ پیش کیا جائے گا۔ وہ حیرت زدہ ہوکر پوچھیں گے کہ تم ہمارے خلاف کیوں گواہی دے رہے ہو، تو وہ جواب دیں گے کہ ہمیں اس مالک الملک نے قوت گویائی عطا کی ہے جس نے ہر چیز کو بلوایا ہے۔

امام ابن کثیرؒ نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حبشہ کی طرف ہجرت کر کے جانے والے اصحاب رسول جب وہاں سے واپس آئے تو حضور ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ کیا تم نے ہجرت حبشہ کے دوران کوئی عجیب و غریب واقعہ بھی دیکھا ہے؟ اس پر چند نوجوانوں نے عرض کیا کہ ایک دفعہ ہم کسی مقام پر بیٹھے تھے کہ ہم نے دیکھا کہ ایک بڑھیا راہبہ اپنے سر پر پانی کا مٹکا اٹھائے جا رہی ہے۔ اتنے میں ایک بدمعاش قسم کا نوجوان آیا، جس نے بڑھیا کی گردن پر ہاتھ رکھ کر اس کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ بیچاری گھٹنوں کے بل گر پڑی اور اس کا مٹکا بھی ٹوٹ گیا۔ اس بڑھیا راہبہ نے کہا: اے غدار عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب اللہ تعالیٰ اپنی عدالت کی کرسی پر رونق افروز ہوگا۔ اس وقت تمام مجرموں کو حاضر کیا جائے گا۔ ان کی زبان بند ہوگی اور ان کے اعضاء و جوارح ان کے خلاف گواہی دے رہے ہوں گے۔ اے غدار! تمہیں اس وقت پتہ چلے گا کہ میرے اور تمہارے درمیان کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ آج تو میں اپنی کمزوری کی وجہ سے تجھ سے اس زیادتی کا بدلہ نہیں لیتی مگر وہ منزل عنقریب آنے والی ہے جب ہر حقدار کو اس کا حق دلایا جائے گا۔

حضور ﷺ نے اس نوجوان سے یہ بات سن کر فرمایا صدقت اس بڑھیا نے سچ کہا۔ آپ نے یہ الفاظ بار بار دہرائے، چونکہ اس راہب کو پہلی کتابوں کا علم تھا اس لیے اس نے انہی کی تعلیم کے مطابق نوجوان کو اس کے برے انجام سے خبردار کیا۔ پھر حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کیف یقدس اللہ قوما لا یوخذ لضعیفھم اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو پاک نہیں کرتا جو اپنے کمزوروں کو ان کا حق نہ دلا سکے۔ ایسی قوم ظلم و زیادتی اور گندگی میں مبتلا رہتی ہے حتیٰ کہ جب محاسبے کی منزل آئے گی تو اللہ تعالیٰ خود ان مسرفین سے انتقام لے لے گا۔ (تفسیر ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ کو ہر ظاہر و خفیہ چیز کا علم ہے:

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَآ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ بعض کافر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ کوئی گناہ چھپ کر کریں گے تو اللہ تعالیٰ کو اس کا علم نہیں ہوگا اور ہمارے اس عمل پر کوئی گواہ بھی نہ ہوگا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ اول تو اللہ تعالیٰ کو ہر ظاہر و خفیہ چیز کا علم ہے، کوئی چیز اور کوئی کام اس سے مخفی نہیں اور دوم یہ کہ اللہ نے ہر نیک اور اعمال بد کے لئے گواہ خود اس کے جسم میں رکھ دیئے ہیں یعنی اس کے اعضاء و جوارح کے یہ ہی ہاتھ پاؤں وغیرہ اس کے حق میں اس کے خلاف قیامت

میں گواہی دیں گے۔ یہاں تک کہ دن اور رات بھی گواہی دیں گے، چنانچہ ایک حدیث شریف میں ہے کہ ہر آنے والا دن انسان کو یہ ندا دیتا ہے کہ میں نیا دن ہوں اور جو کچھ تو میرے اندر عمل کرے گا۔ قیامت میں، میں اس پر گواہی دوں گا۔ اس لئے تجھے چاہیئے کہ میرے ختم ہونے سے پہلے کوئی نیکی کرلے تا کہ میں اس کی گواہی دوں اور اگر میں چلا گیا تو پھر تو مجھے بھی نہ پائے گا۔ اسی طرح ہر رات بھی انسان کو یہ ندا دیتی ہے۔ (معارف القرآن) اس آیت میں یہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔

کفار کا قرآن کریم کی تلاوت کے وقت شور مچانا:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴿٢٦﴾

کفار جب قرآن کریم کے مقابلے سے عاجز آ گئے اور اس کے خلاف ان کی ساری تدبیریں ناکام ہوگئیں تو پھر انہوں نے یہ ترکیب کی کہ جب قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی تو سب لوگ شور مچانا شروع کر دیتے، تا کہ اس شور کی وجہ سے کسی کو یہ پتا ہی نہیں چلے کہ کیا پڑھا جا رہا ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوا کہ کفار کا یہ عمل کفر کی علامت تھا۔ اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ قرآن کریم کو خاموشی اور ادب سے سننا واجب ہے اور ایمان کی علامت ہے، آج کل جس طرح ریڈیو، ٹی وی اور موبائل وغیرہ پر قرآن کریم لگا دیا جاتا ہے اور خود اپنے کاموں میں، باتوں میں اور کھانے پینے میں مشغول ہو جاتے ہیں، تو یہ بھی بے ادبی ہے۔ قرآن کریم کی تلاوت کے وقت برکت حاصل کرنے کے لئے اس تلاوت کو متوجہ ہو کر سننا چاہیئے۔ (آیت ۲۲)

مخلص مومنین کا ایک نمایاں وصف ؛ استقامت:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا .... الی............ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿٣١﴾

یہ سورت متکبرین اور منکرین کے مقابلہ میں مخلص مومنین کا تعارف کراتی ہے جن کا نمایاں ترین وصف ایمان پر استقامت ہے، جب انہوں نے ایک بار اللہ کو اپنا رب کہہ دیا تو اب وہ زندگی بھر اپنے اس قول وقرار پر جم گئے، یہی استقامت ہی ولایت ہے اور استقامت سب کرامتوں سے بڑی کرامت ہے، اصحاب استقامت کو جنت میں ٹھکانہ دے کر کہا جائے گا کہ تم یہاں من چاہی زندگی گزارو، یہ بدلہ ہے اس کا کہ تم دنیا میں خدا چاہی زندگی گزار چکے ہو۔ (۳۰-۳۱)

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ استقامت یہ ہے کہ تم اللہ کے تمام احکام و اسرار اور نواہی پر سیدھے جمے رہو، اس سے ادھر ادھر راہ فرار لومڑیوں کی طرح نہ نکالو۔ اصحاب استقامت پر فرشتے اترتے ہیں اور وہ اصحاب استقامت سے کہیں گے کہ تم مت ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور خوشخبری سنو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ تھا۔ ہم ہیں تمہارے رفیق دنیا و آخرت میں اور تمہارے لئے وہاں ہے جو چاہے تمہارا جی اور تمہارے لئے وہاں ہے جو کچھ تم مانگو۔'' یہ خطاب فرشتوں کا کب ہوگا؟ علماء نے لکھا ہے کہ تین وقتوں میں ہوگا، اول موت کے وقت، دوم قبر کے اندر، سوم قبروں سے اٹھنے کے وقت۔ بعض علماء

نے فرمایا کہ مومنین پر فرشتوں کا نزول ہر روز ہوتا ہے جس کے آثار و برکات ان کے اعمال میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ فرشتوں کا مشاہدہ اور ان کا کلام سننا یہ انہی تین مواقع پر ہوگا۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

جلال الدین سیوطیؒ نے شرح الصدور میں تمیم داری صحابیؓ کے حوالہ سے ایک بڑی طویل حدیث اس مضمون کی نقل کی ہے کہ مومن صالح کی روح کے قبض کے وقت فرشتہ موت اس کے پاس اس کی دلچسپیوں کا بہتر سے بہتر سامان لے کر آتا ہے اور جس طرح بچہ کے نشتر لگنے کے وقت اسے بہلا پھسلا لیا جاتا ہے اس احتضار والے مومن کو انہیں دلچسپیوں میں بہلا کر چپکے سے بلا شائبہ تکلیف اس کی روح جسم سے باہر لے جاتا ہے، اس گھڑی جسم روح کو مبارک باد دیتا ہے اور روح جسم کو، فرشتے اس کے حق میں دعائیں اور طلب مغفرت کرتے ہیں اور شیطان پچھاڑیں کھاتا ہے کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا۔ (ماجدی: ۶/ ۲۰۸)

استقامت پر مرتب ہونے والے ثمرات:

آیت مبارکہ "ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا" میں ایمان پر استقامت کے ذکر کے بعد اس پر مرتب ہونے والے عظیم ثمرات اور بہترین نتائج کا بیان ہے۔

پہلا ثمرہ:

"تتنزل علیھم الملئکۃ" ہے کہ فرشتے ان پر اترتے ہیں، اور فرشتوں کا ان اہل ایمان و اہل استقامت پر اترنا ان کا انتہائی اعزاز و اکرام ہے۔

دوسرا ثمرہ:

پیغام بشارت "ان لاتخافوا و لاتحزنوا" ہر خوف اور غم کے دور ہو جانے کا۔

تیسرا ثمرہ:

جنت اور جنت کی نعمتوں کی بشارت جو "وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون"۔ کے عنوان سے فرمائی گئی تاکہ اس بشارت کو سن کر ذہن ابتداء ہی سے ان بلند پایہ انعامات اور نعمتوں کی طرف متوجہ ہو جائے، جن کی تفصیل نعماء جنت کے ذیل میں بیان کی جاچکی۔

چوتھا ثمرہ:

"نحن اولیاء کم" ہے کہ ہم تمہارے ولی، سرپرست اور دوست ہیں دنیا اور آخرت میں اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی ولایت اور محبت دنیا میں اور آخرت میں ایک ایسا عظیم انعام ہے کہ دنیا اور مافیہا کی ساری نعمتیں اس کے مقابلہ میں حقیر ہیں، بلکہ اخروی نعمتوں میں بھی یہ بہت ہی بلند پایہ نعمت ہے، کیونکہ اللہ رب العزت کی رضا اور خوشنودی جنت کی ہر نعمت اور راحت سے زائد اور بلند ہے، جیسے کہ حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ جنت میں اہل جنت کو تمام انعامات سے نوازنے کے بعد

فرمائے گا، اے میرے بندو! کیا تمہیں کچھ اور چیز مطلوب ہے، جنتی جواب دیں گے اے ہمارے رب اب ہمیں اور کیا چاہیے، ہم کو تو وہ نعمتیں دے دی گئیں ہیں جو جہان والوں میں کسی کو نہیں دی گئیں، اس پر اعلان ہوگا، **رضائی لا اسخط علیکم بعدہ ابدا** "۔ کہ میری رضا مندی اور خوشنودی ہے تمہارے لیے، اب آئندہ میں تم پر کبھی ناراض نہیں ہوں گا، " **ورضوان من اللہ اکبر، ذلک ھو الفوز العظیم** "۔

پانچواں ثمرہ:

" **ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم** "۔ کہ ہر خواہش کا پورا ہونا۔

چھٹا ثمرہ:

" **ولکم فیھا ما تدعون** "۔ کہ ہر طلب کی تکمیل کہ جو بھی چیز جنتی طلب کریں گے وہ حق تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوجائے گی، اور ہر طلب کا پورا ہونا اور ہر مطلوب کا مل جانا نہایت ہی عظیم انعام ہے۔

ساتواں انعام وثمرہ:

" **نزلا من غفور رحیم** "۔ اعزاز واکرام ہے، جیسے مہمان کا اعزاز ہوتا ہے اور اس اعزاز واکرام میں خدا کی شان غفور ورحیمی ہر تقصیر سے درگزر کرتے ہوئے استحقاق سے بڑھ کر بے پایاں رحمتوں سے نوازنے والی ہوگی۔ (تفسیر ادریسی: ۷ / ۲۰۴)

اللہ کی طرف دعوت دینے والے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۳۳

اصحاب استقامت میں سے بھی اللہ کے نزدیک سب سے معزز اور قابل تحسین وہ لوگ ہیں جو اخلاص اور حکمت کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اس راہ کی مشکلات کو رضائے الٰہی کے حصول کے لیے برداشت کرتے ہیں۔ (۳۳)

معلوم ہوا کہ انسان کے کلام میں سے افضل اور اچھا کلام وہ ہے جس میں دوسروں کو دعوت حق دی جائے اور اس میں دعوت دینے کی تمام صورتیں داخل ہیں، چاہے وہ تحریراً ہوں یا تقریراً۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ آیت مؤذنوں کے بارے میں نازل ہوئی اور عمل صالح یہ ہے کہ اذان اور اقامت کے درمیان دو رکعت پڑھی جائیں۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ اذان واقامت کے درمیان جو دعا کی جاتی ہے وہ رد نہیں ہوتی۔

دعوت الی اللہ کا سب سے بڑا ذریعہ قرآن کریم ہے، جو شخص قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے۔ اس کے پیغام کو دوسروں تک پہنچاتا ہے، وہ یقینا اللہ کی طرف بلاتا ہے جو اس قرآن کو سننے کی بجائے شوروغل پیدا کرتا ہے تاکہ اس کی آواز دوسروں تک نہ پہنچ سکے، اس سے بدبخت انسان بھی کوئی نہیں چاہیے، تو یہ تھا کہ قرآن حکیم سے بہتر کوئی کلام پیش کیا جاتا اور اس سے بہتر پروگرام اور بہتر تعلیم پیش کی جاتی۔ مگر اس کی بجائے اس کی آواز کو ہی دبانے کی کوشش کی جائے، تو یہ کس قدر

غلط بات ہے۔

مفسر قرآن ابوسعودؒ فرماتے ہیں کہ دعوت الیٰ اللہ سے مراد دعوت الی التوحید والطاعت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی اطاعت کی طرف بلایا جائے، اللہ کا قرآن اور اس کا حامل پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہی دعوت پیش کرتے ہیں، لہٰذا ان سے اچھی بات کس کی ہوسکتی ہے؟ مطلب یہ کہ جس طرح دعوت الیٰ اللہ بہترین بات ہے، اسی طرح داعی الیٰ اللہ یعنی خدا کی طرف بلانے والا بھی بہترین آدمی ہے۔ (معالم العرفان: ۱۶/۴۲۱، ۴۲۲)

چوبیسویں پارے کے اختتام پر فرمایا کہ اللہ کی طرف سے کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا بلکہ انسان اعمال بد کر کے خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ اچھے اعمال کا فائدہ اور برے اعمال کا نقصان اس کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾

جب کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کے لئے کرتا ہے اور جو کوئی برائی کرتا ہے وہ اپنے ہی نقصان کے لئے کرتا ہے اور آپ کا پروردگار بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

موجودہ دور انکشافات، ایجادات اور تحقیقات کا زمانہ ہے، ہر روز نئی نئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ کائنات کے اعتبار سے بھی اور خود انسان کے بارے میں بھی۔ اللہ تعالیٰ اس سورت کے اختتام پر چودہ سوسال پہلے یہ بات ارشاد فرمار ہے ہیں کہ

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۵۳﴾

ہم انہیں اپنی نشانیاں کائنات میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کے اپنے وجود میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل کر سامنے آجائے کہ یہی حق ہے۔ (آیت ۵۳) (خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:......دعوت الی القرآن، رحمٰن اور رحیم کی رحمت کے تقاضا سے قرآن نازل ہوا ہے۔

خلاصہ رکوع:۱......دعوت الی القرآن اور بضمن قرآن، دعوت الی التوحید۔ ماخذ: آیت: ۲، ۶۔

خلاصہ رکوع:۲......دعوت الی القرآن اور مقصود دعوت قرآن دعوت توحید بضمن تذکیر (۱) بآلاء اللہ (۲) و بایام اللہ۔ ماخذ: (۱) آیت: ۹، ۱۳۔ (۲) آیت: ۱۵، ۱۷۔

خلاصہ رکوع:۳......دعوت الی القرآن اور مقصود دعوت قرآن دعوت توحید ہے، بضمن تذکیر بما بعد الموت۔ ماخذ: آیت: ۱۹، ۲۳، ۲۰، ۲۵۔

خلاصہ رکوع:۴......دعوت الی القرآن اور مقصود دعوت قرآن دعوت توحید ہے، بضمن تذکیر بما بعد الموت۔ ماخذ: آیت: ۲۷، ۲۸۔

خلاصہ رکوع:۵......دعوت الی القرآن اور مقصود دعوت قرآن دعوت توحید ہے، بضمن تذکیر بآلاء اللہ۔ ماخذ: آیت: ۳۳، ۳۷، ۳۸، ۳۹۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

چوبیسویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) سخت پریشانی میں اور بڑے اختلاف میں اس دعا کا مانگنا مسنون ہے:

اللهم رب جبرئيل وميكائيل وإسرافيل فاطر السموات والأرض عالم الغيب والشهادة، انت تحكم بين عبادك فيما كانوا فيه يختلفون، إهدني لما اختلف فيه من الحق بإذنك، إنك تهدى من تشاء إلى صراط مستقيم.

(۲) گناہ ظاہر اُہو یا چھپے ہوئے ہوں، بڑے ہوں یا چھوٹے، ان کی وجہ سے پریشانی اور مصائب آتے ہیں۔

(۳) اللہ کی عبادت واجب ہے تمام اوامر میں، اور واجب ہے تمام نواہی میں اجتناب، اور واجب ہے اس کی حمد اور اس کا شکر، اس لئے کہ ہر طرح کی نعمت اس کی طرف سے ہے اور ہر فضیلت اس کے لئے ہے۔

(۴) عرش اٹھانے والے فرشتوں کی تسبیح ہے: ''**سبحان الله وبحمده سبحان الله العظيم**'' جو شخص اس تسبیح کو ۱۰۰ مرتبہ پڑھ لے۔ صبح اور شام کے وقت تو اس کے گناہوں کو معاف کر دیا جاتا ہے، اگر چہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔

(۵) اللہ کے علم کی وسعت اتنی ہے کہ وہ آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور جو دلوں میں چھپا ہوا ہے اس کو بھی جانتا ہے۔

(۶) صبر و تحمل ضروری ہے اللہ کی ذات پر اور اس پر مدد طلب کرنا، استغفار، ذکر اور نماز کے ذریعے۔

(۷) دعا یعنی مانگنا بھی ایک عبادت ہے، اس لئے غیر اللہ سے مانگنا شرک ہے۔

(۸) انسانوں پر اللہ کا احسان ہے کہ اس نے چوپایوں کو اس کا تابع بنایا، جس کی وجہ سے ان سے فائدہ حاصل کرنا، ان کا کھانا، ان پر سواری کرنا ممکن ہوسکا، اس پر اس کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔

(۹) عربی زبان کا اتنا سیکھنا ضروری ہے کہ جس کے ذریعے اللہ کے کلام قرآن عظیم کو سمجھ سکے۔

(۱۰) ایمان اور تقوی یہ دونوں دنیا و آخرت کے عذاب سے بچنے کے راستے ہیں۔

***

پارہ: ۲۵

چوبیسویں پارہ کے آخر میں اللہ کے عدل کامل کا بیان تھا جس کی وجہ سے قیامت کے دن کسی پر بھی ظلم نہیں ہوگا۔

قیامت کاوقوع:

اِلَيۡهِ يُرَدُّ عِلۡمُ السَّاعَةِ ؕ وَمَا تَخۡرُجُ مِنۡ ثَمَرٰتٍ مِّنۡ اَكۡمَامِهَا وَمَا تَحۡمِلُ مِنۡ اُنۡثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلۡمِهٖ ؕ وَيَوۡمَ يُنَادِيۡهِمۡ اَيۡنَ شُرَكَآءِىۡ ۙ قَالُوۡۤا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنۡ شَهِيۡدٍ ﴿۴۷﴾

اب پچیسویں پارہ کے شروع میں ہے کہ قیامت کے وقوع کی متعین تاریخ کا علم صرف اللہ ہی کو ہے ،لوگ خرید وفروخت اور ذاتی دلچسپیوں میں منہمک ہوں گے کہ اچانک قیامت قائم ہو جائے گی ، اس دن اللہ مشرکوں سے سوال کرے گا کہ کہاں گئے میرے وہ شریک جن کی تم عبادت کیا کرتے تھے؟ وہ انتہائی ندامت کے ساتھ جواب دیں گے کہ آج ہمارے درمیان کوئی بھی ایسا فرد نہیں جو تیرے لیے شریک کا اقرار کرتا ہو۔(۴۷)(خلاصۃ القرآن: م اش)

انسان کی دورخی:

وَاِذَاۤ اَنۡعَمۡنَا عَلَى الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوۡ دُعَآءٍ عَرِيۡضٍ ﴿۵۱﴾

انسانی فطرت کے یہ دورُخ اللہ نے بیان کیے ہیں کہ جب وہ خوشحال اور آسودہ حال ہوتا ہے تو اپنے مالک کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے اور اس کو بھول سے بھی کبھی یاد نہیں کرتا اور جب کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو مشکل کشائی کے لیے لمبے ہاتھ کر کے دعائیں مانگتا ہے۔

ہونا یہ چاہیے تھا کہ آسودگی کے وقت بھی انسان اپنے رب تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو قائم رکھے تو پھر وہ جب بھی دعا کرے گا، اللہ تعالیٰ راضی ہوگا، دعا بہر حال ایک اچھی چیز ہے۔(معالم العرفان: ۱۶/ ۴۴۹)

کائنات اور خود انسان کی ذات کے راز:

سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ ؕ اَوَلَمۡ يَكۡفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ﴿۵۳﴾

سورۂ حم کے اختتام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے ساتھ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ اس کائنات اور خود انسان کی ذات کے اندر جو راز ہیں ان کے بارے میں انہیں مطلع فرمائے گا اور یہ راز جب کھلیں گے تو ہر کوئی جان لے گا کہ یہ کتاب برحق ہے۔(۵۳)

انکشافات، ایجادات اور تحقیقات کا زمانہ:

اللہ کا یہ وعدہ سچا تھا اور گزشتہ چودہ سو سال سے اس وعدہ کا ایفاء ہو رہا ہے، کائنات اور انسان کے بارے میں ایسے ایسے انکشافات ہو رہے ہیں جن کا قدیم زمانے کے انسان نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا ، بالخصوص ہمارا زمانہ انکشافات ،

ایجادات اور تحقیقات کا زمانہ ہے، کوئی دن نہیں جاتا جب انسان اور کائنات کے بارے میں کوئی نئی تحقیق اور کوئی نیا انکشاف سامنے نہ آتا ہو۔

◇ بتائیے کس نے سوچا تھا کہ انسان چاند تک پہنچ جائے گا؟ ◇ اور پورے کرۂ ارض کے اردگرد گھوم جائے گا؟ ◇ کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ مشرق میں رہنے والوں کی آوازیں اہل مغرب اور اہل مغرب کی آوازیں اہل مشرق سن سکیں گے۔ ◇ بلکہ آج تو آوازیں ہی نہیں ان کی صورتیں اور حرکات وسکنات بھی دکھائی دے رہی ہیں۔ ◇ ایک وقت تھا کہ انسان سورج کو کائنات کی عظیم ترین چیز سمجھ کر اس کے سامنے جھکتا تھا، آج اس نے معلوم کرلیا کہ نظر آنے والا سورج تو کائنات کا ایک چھوٹا سا کرہ ہے اور اس جیسے کئی سوملین سورج پس پردہ موجود ہیں۔ ◇ انسان سمندروں اور دریاؤں کے پیٹ میں گھس گیا اور ان کے پیٹ میں جو کچھ چھپا تھا اس نے اسے دیکھ لیا۔ ◇ انسان نے اپنے جسم، اس کی بناوٹ، اس کی خصوصیات اور اس کے اسرار ورموز کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرلیا۔ ◇ انسانی نفسیات کے بارے میں بھی اس پر کئی راز منکشف ہوئے ہیں۔

یہی بات قرآن کو دائمی معجزہ ثابت کرتی ہے:

لیکن اس کے باوجود کس کے اندر جرأت ہے کہ وہ دعوی کر سکے کہ وہ کائنات اور انسان کے سارے رازوں سے واقف ہو گیا ہے اور علمی، تحقیقی اور سائنسی ترقی، کمال کی آخری حد کو پہنچ گئی ہے، علم تحقیق کی اس تیز رفتاری کا کوئی بھی مذہبی کتاب، قرآن کے سوا ساتھ نہیں دے سکتی، یہی بات قرآن کو دائمی معجزہ ثابت کرتی ہے، یہ حضرت موسی علیہ السلام کی لاٹھی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہوائی تخت کی طرح مادی معجزہ نہیں ہے، یہ ایک علمی معجزہ ہے اور علمی دور کے لیے نازل ہوا ہے، انسان کا علم جتنی ترقی کرتا جائے گا، اس پر قرآن کی صداقت اتنی ہی کھلتی جائے گی، وہ وقت آکر رہے گا جب ہر غیر متعصب صاحب علم کی گردن قرآن کے سامنے جھک جائے گی۔ (ان شاء اللہ) (خلاصۃ القرآن: م اش)

خلاصہ رکوع: ٦...... دعوت الی القرآن اور مقصد دعوت قرآن، دعوت توحید بضمن تذکیر بما بعد الموت۔ ماخذ: آیت: ۴۷، ۴۸۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الشوری

یہ قرآن کریم کی ۴۲ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے نمبر ٦٢ پر ہے، اس سورۃ میں ۵ رکوع، ۵۳ آیات، ۸٦۹ کلمات اور ۳۵۸۵ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

لفظ شوری کے معنی مشورہ کے ہیں، اس سورۃ کی ۳۸ ویں آیت میں جہاں اہل ایمان کی کچھ صفات بیان کی گئی ہیں۔

انہیں میں سے ایک صفت ''امر ھم شوری بینھم'' ذکرفرمائی گئی ہے کہ مسلمانوں کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں، اس لئے بطور علامت اس سورۃ کا نام سورہ شوری قرار پایا۔

ربط:

سورۂ شوری کا سورۂ حٰم سجدہ کے ساتھ ربط یہ ہے کہ اس سورۃ میں یہ مضامین ایک دوسرے میں متداخل ہیں (۱) توحید وابطال شرک (۲) رسالت (۳) بعث وجزا (۴) انہماک فی الدنیا کی مذمت اور ترغیب طلب آخرت (۵) اہل ایمان کا حسن اعمال وحسن مآل اور کفار کا قبح اعمال وقبح مآل اور سورۂ سابقہ کا افتتاح واختتام توحید و رسالت و بعث میں مشترک ہے۔ یہی دونوں سورتوں کے درمیان تناسب ہے۔

فائدہ:

اس سورۃ کی ابتداء حروف مقطعات **حم عسق** سے ہے جس سے ہونے والے فتنوں کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت امام ثعلبی حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی مرتضی کرم اللہ وجہہ **حم عسق** سے فتنوں کو پہچانتے تھے اور بعض نے کہا کہ لفظ ح سے حرق اور میم سے مہلکہ اور ع سے عذاب اور سین سے مسخ اور قاف سے قذف کی طرف اشارہ ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ یہ حروف نازل ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک سے رنج کا اثر ظاہر ہوا۔ صحابہ نے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے ان چیزوں کی خبر دی گئی ہے جو میری امت پر نازل ہوں گی، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قذف، مسخ، خسف، وغیرہ نیز دجال کے خروج اور حضرت عیسیٰ کے نزول کا ذکر فرمایا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ حروف، حکیم، مجید، علیم، سمیع، قدیر، کے پہلے حروف ہیں یا ان سے حلم، مجد، قدرت کی طرف اشارہ ہے اور کشف الاسرار میں ہے کہ ان حروف سے ان عطاؤں کی طرف اشارہ ہے جو حق تعالی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مرحمت فرمائی اور فرمایا کہ حم سے اشارہ ہے حوض کوثر کی طرف کہ اس حوض سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے پیاسوں کو سیراب کریں گے اور میم سے ملک محدود کی طرف اشارہ ہے کہ مشرق سے مغرب تک حصہ آپ کی امت کے تصرف میں آجائے گا اور عین سے آپ کے عز وجود کی طرف کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نزدیک سب چیزوں سے زیادہ عزیز ہیں اور سین سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنائے مشہور کی طرف اشارہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کی بلندی کو کوئی نہیں پہنچ سکتا اور قاف سے مقام محمود کی طرف کہ شب معراج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا ''**فکان قاب قوسین او ادنی**'' اور قیامت کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شفاعت کبری حاصل ہوگی۔

مقام تو محمود و نامت محمد بدیناں مقامے و نامے کہ دارد

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام محمود اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام محمد ہے، یعنی ایسا مقام اور نام کون رکھتا ہے۔

خلاصہ سورۃ:

یہ سورۃ بھی مکی ہے، اس لئے اس میں بھی عقائد ہی کے متعلق مضامین بیان فرمائے گئے ہیں، جیسے توحید ورسالت کا اثبات، دین اسلام کی حقانیت، آخرت کی زندگی کی کامیابی کا طریقہ، دنیا پرستی کے برے نتائج، کفر وشرک اور انکار حق کا انجام، آخرت کی جزاء وسزا، ایک مسلمان کی صفات اور ذمہ داری اور زندگی بسر کرنے کا طریقہ کہ جس سے دونوں جہان میں کامیابی ہو۔ خلاصہ یہ کہ اس سورۃ میں اللہ عزوجل کے اعلیٰ صفات کی طرف توجہ دلا کر خبردار کیا گیا ہے کہ اس کی طرف سے غافل نہ رہو اس کی نافرمانی اختیار نہ کرو، اللہ کے نہ ماننے والے اس سے چھپے ہوئے نہیں ہیں، وہ ان کی ساری باتیں سنتا اور جانتا ہے، اس لئے جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر اوروں کی طرف جھکے ہوئے ہیں وہ ان کو پوری پوری سزا دے گا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا گیا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے ذمہ ان منکرین ومکذبین کو زبردستی راہ پر لانا نہیں، آپ کا کام فقط تبلیغ کر دینا اور سمجھا دینا ہے، یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے، یہاں لوگ مختلف طریقے اختیار کرتے رہیں گے اور ان سب کا فیصلہ مرنے کے بعد اللہ کے یہاں ہوگا، سب جمع ہوں گے اور سب کے اعمال کی جانچ پڑتال ہوگی، کچھ لوگ جنت میں اور کچھ برے عملوں کی بدولت دوزخ میں جائیں گے، اللہ کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ تمام انسانوں کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اللہ کو یہ منظور ہوا کہ انسانوں کا دنیا میں امتحان لیا جائے اور ان میں سے جو کامیاب ہوں انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے اور جو امتحان میں ناکام رہ جائیں انہیں سزا دی جائے، اگر انسان غور کرے تو اللہ کا پہچاننا کوئی مشکل نہیں، خود آسمان وزمین اس کے ایک ہونے پر گواہ ہیں اور ان کے سارے خزانوں کی کنجیاں اس کے پاس ہیں، وہ اپنی حکمت سے جس کو جتنا چاہتا ہے عطاء فرماتا ہے۔ انسانوں کے لئے دنیا میں اللہ نے ایک ہی دین بنایا ہے۔ اس کو تمام انبیاء وپیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سکھانے چلے آئے ہیں اس لئے اس دین کو مضبوطی سے پکڑنا اور اس پر قائم رہنا چاہئے اور اس میں پھوٹ اور اختلاف نہ ڈالنا چاہئے، دین اتفاق کے لئے آیا ہے لیکن انسان اپنی غلط خواہشوں اور جذبات کا غلط شکار ہو کر اس میں اختلاف پیدا کرتے ہیں اور جنہیں پہلے اللہ کی کتاب مل چکی وہ دنیا کے بکھیڑوں میں پھنس کر اس کو بھلا بیٹھے، اب یہ قرآن آخری کتاب ہے، اس میں محمد رسول اللہ کو ارشاد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کو اصل دین کی طرف دعوت دیں اور خود بھی اس پر چل کر اور عمل کر کے لوگوں کے لئے مثال قائم کر لیں۔ اس کے بعد جو نہ مانے اس کے لئے اللہ کا عذاب تیار ہے۔ دنیا آخر فنا ہو جائے گی اور قیامت ضرور آئے گی جو اس کو بھلا بیٹھا وہ انتہائی گمراہی میں پھنس گیا۔ قرآن کریم ایک کسوٹی ہے اور عدل وانصاف کرنے کے ترازو کی مانند ہے، جو اسے مانیں گے وہ جنت میں جائیں گے اور جو دنیا میں انکار کریں گے ان کا انجام برا ہوگا۔

پھر فرمایا گیا کہ دیکھو ان پر جو مصیبت آتی ہے وہ ان کے برے کرتوتوں کی وجہ سے آتی ہے اور بہت سی خطاؤں کو تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتے ہیں ورنہ بالکل ہی تباہی پھیل جائے، اس لئے انسانوں کو چاہئے کہ توبہ کریں اور سزا سے بچیں، دنیا

کی چیزیں عارضی اور فانی دنیا ہی تک محدود ہیں اور خدا کے یہاں آخرت کی دولت بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے، وہ انہیں کونصیب ہوگی جو ایمان لائیں گے اور اعمال صالحہ اختیار کریں گے۔ جو گناہ اور بے حیائی کی باتوں سے علیحدہ رہنے والے ہوں، جو اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھنے والے ہوں، جب کسی پر غصہ ہوں تو معذرت پر معافی دینے والے ہوں۔ اپنی نمازوں کو باقاعدہ ادا کرتے ہوں اور ان کے کام آپس میں مشورہ سے ہوتے ہوں۔ اور جو کچھ انہیں اللہ نے دیا ہے اس میں سے خدا کے لئے خرچ کرتے ہوں اور جن کی یہ حالت ہے کہ جب ان پر زیادتی ہو تو وہ صرف انتقام لے لیتے ہیں، بدلہ لینے میں زیادتی نہیں کرتے، ایسے لوگوں کے لئے خدا کے یہاں دائمی نعمتیں ہیں۔ ان کے برخلاف وہ لوگ جو ظلم کرتے ہیں اور فساد مچاتے ہیں ایسے گمراہ لوگ اپنا کوئی حامی اور سرپرست نہیں پائیں گے اور جب یہ جہنم کا معائنہ کریں گے تو غایت بے بسی و بے کسی سے تباہ حال ہوں گے۔ اخیر میں فرمایا گیا کہ اے لوگو دیکھو اللہ تعالیٰ تمہاری خیر خواہی سے کہتے ہیں کہ تم کفر و عناد اور ظلم و فساد کو چھوڑ و اور اپنے پروردگار کی بات مانو، اس سے قبل کہ خدا کی طرف سے وہ دن آئے جس سے نہ ہٹنا ممکن ہو سکے گا اور نہ پناہ مل سکے گی اور نہ کوئی تمہارے بارے میں خدا سے روک ٹوک کرنے والا ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ سارا زور اس بات پر ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ، رسول کے کہنے پر چلو قرآن حکیم کی بتلائی ہوئی ہدایات کی روشنی میں اپنی زندگی گزارو۔ واللہ تعالیٰ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مضامین:

اس سورہ میں امت مسلمہ کے برپا کئے جانے کی اصل غرض کی تعلیم دیتے ہوئے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ زمین پر جب اقتدار حاصل ہو تو مسلمان کو کون سی روش اختیار کرنی چاہئے۔

اس مرکزی مضمون کو سمجھانے نیز مخالفین کے اعتراضات رد کرنے کے لئے جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے اس کے اجزاء یہ ہیں:

◇ وحی قرآنی اور رسالت محمدیہ کوئی پہلا واقعہ نہیں، بلکہ سلسلہ وحی و رسالت قدیم سے چلا آرہا ہے۔

◇ اختلاف وانکار بھی کوئی نئی بات نہیں، ہمیشہ سے وحی الٰہی کا انکار اور رسالت کی تکذیب ہوتی رہی ہے۔

◇ اللہ تعالیٰ انسان کے اختیار اور آزادی عمل کو اگر معطل کر کے جبراً سب کو امت واحدہ بنانا چاہتا تو اس کے لئے کوئی دشوار نہ تھا، مگر انسان کو آزادی فکر و عمل دی ہی اس لئے گئی ہے تا کہ یہ امتحان لیا جائے کہ وہ عقل و بصیرت سے کام لے کر برضا و رغبت اللہ کی اطاعت کرتا ہے یا نہیں؟

◇ اسلام، اللہ کا وہ واحد دین ہے جس کی دعوت ہر زمانے کے نبی نے دی۔ اختلاف و سرکشی بعد والوں نے پیدا کئے۔

◇ حضرت نوح علیہ السلام ہوں یا حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام ہوں یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام رسولوں کی بعثت کا مقصد یہ رہا ہے کہ اس دین کو قائم کر لیں۔ یہی مقصد رسالت محمدیہ کا ہے۔ اس بناء پر

مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ وہ دین کو قائم کرنے کے لئے مصروف جدوجہد رہیں۔

◇ مسلمانوں کی مخلصانہ جدوجہد رائیگاں نہ جائے گی۔صبر وثبات اور اللہ پر توکل کے ساتھ اس فریضہ کے لئے جدو جہد ہوگی تو اللہ کی مدد اور رحمت ضرور نازل ہوگی۔

◇ رسول ﷺ کی ذمہ داری صرف تبلیغ ہے، برے اعمال کے خراب نتائج سے آگاہ کردینا ہے، کسی کو زبردستی ہدایت پر گامزن کردینا نہیں ہے، تبلیغ وانذار کے بعد رسول ﷺ کی ذمہ داری ختم ہوجاتی ہے، پھر ہر شخص کا عمل اس کے لئے ،اور ہر شخص اپنے عمل کا آپ جواب دہ ہے۔

◇ رضائے الٰہی اور آخرت کی زندگی کی کامرانیاں ایمان اور عمل صالح سے وابستہ ہیں اور ایسے لوگوں کے اندر جو صفتیں ہوتی ہیں وہ ہیں توکل ، گناہوں اور فحش باتوں سے اجتناب عفوودرگذر، اطاعت الٰہی ،نماز قائم کرنا ، آپس کے معاملات کو باہمی مشورہ سے حل کرنا ، انفاق فی سبیل اللہ اور اللہ سے مدد طلب کرتے رہنا۔

◇ مسلمان کی ذمہ داری اپنی ذات ہی کی اصلاح نہیں ہے بلکہ اپنے اہل وعیال کی ، نیز معاشرے کی اصلاح بھی ہے۔

◇ سورہ میں جابجا مناسب جگہوں پر کفر وشرک اور انکار حق کے برے نتائج سے بھی خبر دار کیا گیا ہے، کہیں کہیں اعتراضات اور شکوک کو بھی دور کیا گیا ہے۔

نوٹ: واضح رہے کہ یہ سورہ مکہ کے اس دور کی ہے، جب کہ مادی حیثیت سے مسلمان بہت کمزور تھے، ظلم وزیادتی کے شکار بنے ہوئے تھے، ایسے وقت میں دین کے قائم کرنے کی ذمہ داری بتاتے ہوئے غلبہ واقتدار کے وقت جورویہ ہونا چاہئے ،اس کا سبق دیا جارہا ہے۔اس سے ایک طرح سے یہ پیشین گوئی ہورہی ہے کہ اسلام کو غلبہ حاصل ہوکر رہے گا۔ دوسرے یہ کہ اسلام کو سربلند کرنا مسلمان کی زندگی کا واحد نصب العین ہونا چاہئے ۔(خلاصہ مضامین قرآنی)

نظریاتی مسئلہ پر بحث:

دوسری مکی سورتوں کی طرح یہ بھی نظریاتی مسئلہ پر بحث کرتی ہے لیکن وحی اور رسالت کے مضمون کو اس میں زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

ابتداء حروف مقطعات:

قرآن کے اعجاز کو بتلانے اور اس کی مثل لانے سے مخالفین کا عجز ظاہر کرنے کے لیے اس کی ابتداء حروف مقطعات سے ہوئی ہے کہ یہی وہ حروف ہیں جنہیں جوڑ کر قرآن بنایا گیا ہے، اگر قرآن واقعی انسانی کاوش ہے تو تم بھی ان حروف کی ترکیب سے قرآن جیسا کلام بناڈالو، پورا قرآن نہیں ،قرآن جیسی کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورت ہی سہی، تمہارے اس کارنامے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ (معاذ اللہ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے نہ پروپیگنڈا کرنا پڑے گا ، نہ مالی وسائل استعمال کرنے پڑیں گے، نہ جنگ کی آگ میں اپنے بیٹوں اور بھائیوں کو جھونکنا پڑے گا، لیکن اس

چیلنج کو نہ کل کے منکرین نے قبول کیا، نہ آج کے منکرین قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔

وحی کا سرچشمہ اولین، آخرین کے لیے ایک ہی:

حروف مقطعات سے سورت کا آغاز کرنے کے متصل بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ③

''اسی طرح تمہاری طرف اور تم سے پہلے لوگوں کی طرف وحی کرتا ہے وہ اللہ جو کہ غالب اور حکیم ہے۔ گویا وحی کا سرچشمہ، اولین اور آخرین کے لیے ایک ہی رہا ہے۔ درمیان میں اللہ کی عظمت وجلال بیان کرنے کے بعد پھر وحی اور قرآن ہی کا ذکر ہے اور ارشاد ہوتا ہے: اور اسی طرح تمہارے پاس قرآن عربی بھیجا تا کہ تم بڑے گاؤں (یعنی مکہ) کے رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے اردگرد رہتے ہیں ان کو راستہ دکھاؤ۔''(۷)

اللہ کے نزدیک دین ایک ہی ہے:

وحی اور رسالت کے مضمون ہی کو موکد کرنے کے لیے یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک دین ایک ہی ہے، تمام انبیاء ایک ہی دین کی دعوت کے لیے دنیا میں تشریف لائے، ان کی شریعتیں اگرچہ مختلف تھیں لیکن ان سب کا دین ایک ہی تھا یعنی دین اسلام۔

حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو اسی دین کی دعوت کے لیے دنیا میں بھیجا گیا تھا اور ان کے متبعین کو تفرقہ سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا تھا لیکن اہل کتاب حسد اور عناد کی بنا پر تفرقہ میں مبتلا ہو گئے، ان کے تفرقہ اور اختلاف ہی کو مٹانے اور قول فیصل سنانے کے لیے اللہ نے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کو حکم دیا:

"آپ اس دین کی طرف دعوت دو اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اس پر مضبوطی سے قائم ہو جاؤ اور ان لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کرو اور ان سے کہو کہ اللہ نے جو کتاب نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا۔''(۱۵)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے آیت ۱۵ کے تحت لکھا ہے کہ اس میں ایک لطیف نکتہ ہے جو قرآن کریم کی صرف ایک اور آیت میں پایا جاتا ہے، باقی کسی اور آیت میں نہیں۔ وہ یہ کہ اس آیت میں دس کلمہ ہیں جو سب مستقل ہیں، الگ الگ ایک ایک کلمہ اپنی ذات میں ایک مستقل حکم ہے اور یہ ہی بات دوسری آیت یعنی آیت الکرسی میں بھی ہے۔ تو اس آیت میں دس احکام ہیں:

◇ پہلا حکم: جو وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کی گئی وہی وحی آپ سے پہلے تمام انبیاء پر آتی رہی، اس لئے تمام لوگوں کو آپ اس کی دعوت دیں اور ہر ایک کو اسی کی طرف بلائیں۔

◇ دوسرا حکم: اللہ تعالیٰ کی عبادات، وحدانیت اور اس کے احکام پر مستقیم رہیے۔

◇ تیسرا حکم: آپ ہرگز ہرگز ان مشرکین کی خواہشات پر نہ چلیں اور ایک بات بھی ان کی نہ مانیں۔

◇ چوتھا حکم: آپ علی الاعلان اپنے اس عقیدہ کی تبلیغ کریں کہ اللہ کی نازل کردہ تمام کتابوں پر میرا ایمان ہے۔ یہ نہیں کہ میں ایک کو مانوں اور دوسری سے انکار کروں۔

◇ پانچواں حکم: آپ اعلان کردیں کہ میں تم میں وہی احکام جاری کرنا چاہتا ہوں جو اللہ کی طرف سے میرے پاس پہنچائے گئے ہیں جو سراسر عدل اور یکسر انصاف پر مبنی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ عدل ان چار بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے جو تمام انبیاء (علیہم السلام) کی شرائع میں قائم رہے ہیں اور یہ اصول کسی امت سے بھی ساقط نہیں ہوئے۔ یہ ہیں (۱) طہارت (۲) اخبات یعنی عاجزی (۳) سماحت یعنی بری چیزوں سے پرہیز اور (۴) عدل، جب کسی انسان میں عدل کا ملکہ پیدا ہوجاتا ہے تو پھر نظام حکومت کو چلانا آسان ہوجاتا ہے۔ عدل سے امن اور ظلم سے بدامنی پیدا ہوتی ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ انسان کے لیے تین چیزیں نجات دہندہ اور تین چیزیں ہلاکت خیز ہیں۔

نجات دہندہ تین چیزیں ہیں:

(۱) **العدل فی الرضا و الغضب**. (خوشی اور غصے کی حالت میں عدل کا دامن تھامے رکھنا۔)

(۲) **القصد فی الغنی و الفقر**. (آسودگی اور تنگ دستی میں میانہ روی اختیار کرنا۔)

(۴) **خشیۃ اللہ فی السر و العلانیۃ**. (ظاہر و باطن میں خوف خدا کو پیش نظر رکھنا۔)

ہلاکت خیز چیزیں یہ ہیں۔

(۱) **شح مطاع**. (بخل کی اطاعت کرنا یعنی مال کی موجودگی میں اپنی ذات، بال بچوں اور محتاجوں پر خرچ نہ کرنا۔)

(۲) **ھوی متبعا**. (شریعت کی بجائے خواہش کے پیچھے چلنا جس پر شیطان راضی ہوتا ہے۔)

(۳) **اعجاب المرء بنفسہ**. (آدمی کا اپنی رائے کو ہی اعلیٰ سمجھنا، چاہے وہ حق کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔)

◇ چھٹا حکم: آپ اعلان کردیں کہ معبود برحق صرف ایک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہی ہمارا اور تمہارا سب کا معبود برحق ہے۔

◇ ساتواں حکم: آپ کہہ دیں کہ ہمارے عمل ہمارے ساتھ، تمہارے عمل تمہارے ساتھ۔

◇ آٹھواں حکم: آپ کہہ دیں کہ ہم سے کوئی جھگڑا اور کسی بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں۔ (یہ حکم مکہ کا تھا پھر مدینہ میں جہاد کی آیتیں و احکام نازل ہوئے۔)

◇ نواں حکم: آپ کہہ دیں کہ قیامت کے دن اللہ ہم سب کو جمع کرے گا اور پھر حق کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا۔

◇ دسواں حکم: آپ کہہ دیں کہ لوٹنا سب کو اللہ ہی کی طرف ہے۔ کوئی بچ کر نکل نہیں سکتا۔ اگرچہ آیت میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے مگر یہ تعلیمات و احکامات امت مسلمہ کے لئے عام ہیں۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم، معالم العرفان:

۱۶/ ۴۸۴، ۴۸۵)

توبہ اور اس کی قبولیت:

وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲۵﴾

اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ جب اس کے بندے اس کی طرف رجوع کریں تو وہ ان کی لغزشوں سے درگزر کر کے ان کی توبہ کو قبول فرما لے۔ حدیث شریف میں آتا ہے التوبۃ الندم یعنی پشیمانی کا نام توبہ ہے، جو شخص گناہ کرنے کے بعد نادم ہو گیا اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو یہی توبہ ہے جس کی قبولیت کا اللہ نے وعدہ فرمایا ہے۔

حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانے میں ایک دیہاتی آدمی مسجد نبوی میں آیا اور جلدی جلدی استغفر اللہ استغفر اللہ کہنے لگا۔ حضرت علیؓ نے اس شخص کو بلا کر کہا کہ استغفار کا یہ طریقہ صحیح نہیں ہے بلکہ یہ تو منافقوں کا طریقہ ہے۔ اس شخص نے عرض کیا کہ حضرت مجھے توبہ کا صحیح طریقہ بتلا دیجئے، تو آپ نے فرمایا کہ سچی توبہ کے لیے چھ شرائط کا پورا کرنا ضروری ہے، جو یہ ہیں۔

(۱) سابقہ گناہوں پر نادم ہو۔

(۲) دوران گناہ جو فرائض ترک کیے ہیں ان کو لوٹایا جائے۔

(۳) کسی دوسرے کے ساتھ ظلم و زیادتی کی ہے تو اس کی تلافی کرے۔

(۴) جس طرح گناہ کے زمانے میں اپنے نفس کو گناہ پر آمادہ کرتا ہے، اب توبہ کے بعد نفس کو اسی طریقے سے اللہ کی اطاعت کے لیے ہموار کرے۔

(۵) جس طرح گناہ کے ارتکاب سے گناہ کی لذت اٹھاتا تھا، اب اطاعت کر کے اس کی لذت بھی حاصل کرے۔

(۶) گناہ کے زمانے میں ہنستا تھا اب اسی قدر رونے کی کوشش کرے۔

غرضیکہ زبان سے توبہ توبہ کرنا اور گناہ پر اصرار کرنا کچھ مفید نہیں ہوگا بلکہ توبہ کی قبولیت کے لیے اس کے لوازمات کی تکمیل بھی ضروری ہے۔ (کشاف، مظہری، بیضاوی)

مصائب نتیجۂ اعمال:

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾

حضرت حسنؓ سے روایت ہے کہ جب سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۰ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، جس شخص کو کسی لکڑی سے کوئی خراش لگتی ہے یا کوئی رگ دھڑکتی ہے یا قدم کو لغزش ہوتی ہے، یہ سب اس کے گناہوں کے سبب سے ہوتا ہے اور ہر گناہ کی سزا اللہ تعالیٰ نہیں دیتے بلکہ جو گناہ اللہ تعالیٰ

معاف کردیتے ہیں وہ ان سے بہت زیادہ ہیں، جن پر کوئی سزا دی جاتی ہے۔حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جس طرح جسمانی اذیتیں اور تکلیفیں گناہوں کے سبب آتی ہیں اسی طرح باطنی امراض بھی کسی گناہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔آدمی سے کوئی ایک گناہ سرزد ہوگیا تو وہ سبب بن جاتا ہے دوسرے گناہوں میں مبتلا ہونے کا۔علماء نے لکھا ہے کہ گناہ کی ایک نقد سزا یہ ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے دوسرے گناہوں میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔اسی طرح نیکی کی ایک نقد جزاء یہ ہے کہ ایک نیکی دوسری نیکی کو کھینچ لاتی ہے۔

مادی جہاں میں ایمان کے دلائل اور تکوینی آیات:

جوں جوں یہ سورت آگے بڑھتی جاتی ہے، وحی اور رسالت کے ساتھ اس کا تعلق واضح ہوتا جاتا ہے، وحی اور رسالت کے مضمون کے علاوہ اس مادی جہان میں ایمان کے جو دلائل اور تکوینی آیات ہیں، ان کی طرف بھی ذہنوں کو متوجہ کیا گیا ہے۔

ایمان والوں کی نمایاں صفات:

ایمان والوں کی درج ذیل نمایاں صفات آیت ۳۶ تا ۴۰ میں بیان کی گئی ہیں:

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ...... الیٰ........ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝۴۰

◇ وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

◇ بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں۔

◇ اگر غصہ آجائے تو معاف کردیتے ہیں۔

ابوہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ ایک شخص ابوبکر صدیقؓ کو برا بھلا کہہ رہا تھا اور ان کی شان میں توہین کررہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہیں تشریف فرما تھے اور یہ باتیں سن کر تعجب فرمارہے تھے اور مسکرا رہے تھے، جب وہ شخص بہت ہی زیادتی کرنے لگا اور حد سے بڑھا تو ابوبکرؓ نے اس کی کسی بات کا جواب دیا، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ناگواری ہوئی اور مجلس سے اٹھ کر تشریف لے جانے لگے، ابوبکرؓ فوراً ہی دوڑے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے حاضر ہو کر عرض کرنے لگے: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ شخص مجھ کو گالیاں دے رہا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹھے رہے، لیکن جب میں نے اس کی کسی بات کا جواب دیا تو آپ ناگواری سے اٹھ کھڑے ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے ابوبکر! جب تک تم خاموش رہے تو ایک فرشتہ تمہارے ساتھ تھا جو تمہاری بات کا جواب دے رہا تھا، لیکن جب تم اس پر غضبناک ہوئے تو فرشتہ اٹھ کر چلا گیا، اور تمہارے درمیان شیطان آگیا، اور ظاہر ہے کہ میں ایسا نہیں تھا کہ شیطان کے ساتھ کسی مجلس میں بیٹھا رہوں، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! تین چیزیں برحق ہیں، ایک یہ کہ جس کسی پر بھی ظلم کیا جائے گا پھر اس سے چشم پوشی اور

درگذر کرے محض اللہ کے لیے، تو اللہ اس کو عزت وسر بلندی عطا فرمائے گا، اور اس کی مدد فرمائے گا، اور جو شخص بھی عطا و بخشش کا دروازہ کھولے گا تو اس پر اللہ کی طرف سے برکت وفراخی کا دروازہ کھلے گا اور جو شخص سوال اور بھیک مانگنے کا دروازہ کھولے گا تو اس کے واسطے اللہ کی طرف سے قلت وتنگی ہی کا دروازہ کھلے گا۔ (تفسیر ادریسی: ۷/ ۲۶۸)

◇ رب کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔

◇ نماز کی پابندی کرتے ہیں۔

◇ اپنے کام باہمی مشورہ سے کرتے ہیں۔

البتہ شوریٰ کے سلسلہ میں یہ یاد رہے کہ مشورہ صرف انہیں امور میں پسندیدہ ہے، جو بجائے خود قابل مشورہ ہوں، اور جو چیزیں احکام قطعی میں داخل ہیں مثلاً نماز پنجگانہ، رمضان کے روزے وغیرہا، سوان میں مشورہ نہیں۔ (ماجدی: ۶/ ۲۵۹)

◇ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

◇ اگر ان پر کوئی ظلم اور زیادتی کرے تو مناسب طریقے سے بدلہ لیتے ہیں۔

اسلامی انقلاب کی راہ ہموار:

یہ صفات اگر آج کے مسلمان اپنے اندر پیدا کرلیں تو ان کی انفرادی اور معاشرتی زندگی میں ایسا انقلاب برپا ہوسکتا ہے جو انہیں علمی اور حقیقی مسلمان بنا کر پوری دنیا میں اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کرسکتا ہے۔ سورہ شوریٰ کی آخری دو آیتوں میں وحی اور رسالت کا ذکر ہے، گویا جس مضمون سے سورت کا آغاز ہوا تھا اسی پر اختتام ہورہا ہے۔ (خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:...... دعوت الی القرآن۔

عنوان خصوصی:...... آپ کی وحی انبیاء علیہم السلام سابقین کی وحی سے مماثل ہے، لہٰذا اس میں انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔

خلاصہ رکوع: ۱...... آپ کی وحی انبیاء سابقین علیہم السلام کی مماثل ہے۔ لہٰذا اس میں انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ ماخذ: آیت: ۳، ۷۔

خلاصہ رکوع: ۲...... دعوت الی القرآن (عنوان خصوصی) آپ کی وحی انبیاء سابقین علیہم السلام کی مماثل ہے، ماخذ: آیت: ۱۳، ۱۵۔

خلاصہ رکوع: ۳...... دعوت الی القرآن۔ ماخذ: آیت: ۲۴۔

خلاصہ رکوع ۴...... آیات الٰہی میں مجادلہ کرنے والوں کی نجات نہیں ہوگی، ہاں ان پر ایمان لانے والوں کو نجات نصیب ہوگی، اور ان کے اوصاف حمیدہ یہ ہیں۔ ماخذ: آیت: ۳۵، ۳۶، ۳۶ تا ۳۹۔

خلاصہ رکوع: ۵...... دعوت الی القرآن۔ ماخذ: آیت: ۵۲، ۵۱۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورۃ الزخرف

اس سورت کا مرکزی موضوع مشرکین مکہ کی تردید ہے جس میں ان کے اس عقیدے کا خاص طور پر ذکر فرمایا گیا ہے جس کی رو سے وہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے، نیز وہ اپنے دین کو صحیح قرار دینے کے لئے یہ دلیل دیتے تھے کہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو اسی طریقے پر پایا ہے، اس کے جواب میں اول تو یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ قطعی عقائد کے معاملے میں باپ دادوں کی تقلید بالکل غلط طرز عمل ہے، اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حوالہ دے کر فرمایا گیا ہے کہ اگر باپ داداؤں ہی کے پیچھے چلنا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کیوں نہیں کرتے، جنہوں نے شرک سے کھلم کھلا بیزاری کا اعلان فرمایا تھا، مشرکین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اعتراضات کیا کرتے تھے اس سورت میں ان کا جواب بھی دیا گیا ہے، ان کا ایک اعتراض یہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو کوئی پیغمبر بھیجنا ہی تھا تو کسی دولت مند سردار کو اس مقصد کے لئے کیوں نامزد نہیں کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں یہ واضح فرمایا ہے کہ دنیوی مال و دولت کا انسان کے تقدس اور اللہ تعالیٰ کے تقرب سے کوئی تعلق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کافروں کو بھی سونا چاندی اور دنیا بھر کی دولت دے سکتا ہے؛ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب ہیں، کیونکہ آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں اس مال و دولت کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اس سورت نے یہ بھی واضح فرمایا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ معاشی وسائل کی تقسیم اپنی حکمت کے مطابق ایک خاص انداز سے فرماتے ہیں، جس کے لئے ایک مستحکم نظام بنایا گیا ہے، اسی ذیل میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ بھی اختصار کے ساتھ بیان فرمایا ہے؛ کیونکہ فرعون کو بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہی اعتراض تھا کہ وہ دنیوی مال و دولت کے اعتبار سے کوئی بڑی حیثیت نہیں رکھتے، اور فرعون کے پاس سب کچھ ہے؛ لیکن انجام یہ ہوا کہ فرعون اپنے کفر کی وجہ سے غرق ہوا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام غالب آکر رہے، نیز اس سورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی مختصر ذکر فرما کر ان کی صحیح حیثیت واضح فرمائی گئی ہے۔ (توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی موجودہ ترتیب کے اعتبار سے ۴۳ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۶۳ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۷ رکوع، ۸۹ آیات ۸۴۳ کلمات اور ۳۶۵۶ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ۳۵ ویں آیت میں لفظ زخرف آیا ہے، زخرف کے معنی ہیں سنہرا آراستہ زینت اور کسی شئے کے کمال حسن کو زخرف کہتے ہیں، اسی اعتبار سے سونے کو زخرف کہا جاتا ہے۔ اس سورۃ کے تیسرے رکوع میں دنیوی مال، دولت، سونا چاندی کی حقیقت واضح کی گئی کہ دنیا کی جاہ و دولت اللہ کے نزدیک کس قدر حقیر ہے، اس لئے علامت کے طور پر اس سورۃ کا نام زخرف قرار پایا۔

ربط:

سورۂ زخرف کا سورۂ شوری کے ساتھ ربط یہ ہے کہ اس سورۃ میں یہ مضامین ہیں (۱) اثبات توحید (۲) ابطال شرک (۳) مشرکین کے اعتراض کا بے ہودہ ہونا (۴) اثبات رسالت (۵) جواب بعض شبہات متعلقہ رسالت (۶) آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تسلی (۷) منکرین کی تہدید۔ اور سورۂ شوری کے ختم پر ایسے ہی سورۂ زخرف کے ختم پر مضمون رسالت مابہ الاشتراک ہے۔ واللہ اعلم!

خلاصہ سورۃ:

یہ سورۃ بھی مکی ہے اور قیام مکہ کے درمیانی زمانہ میں نازل ہوئی اس لئے اس میں بھی عقائد ہی سے متعلق مضامین بیان فرمائے گئے۔ مثلاً اثبات توحید، ابطال شرک، اثبات وحی و رسالت۔

مشرکین کے بعض اعتراضات اور ان کے جوابات، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا تسلیہ، تحقیر دنیا، تہدید منکرین، نیز توحید و رسالت کی تائید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسی علیہ السلام، حضرت عیسی علیہ السلام کے قصے، مؤمنین صادقین کے لئے قیامت کے وعدے اور منکرین و مکذبین کے لئے قیامت کی وعیدیں۔ مکی دور میں جس قدر قرآن کی سورتیں نازل ہوئیں ان میں عملیات و احکام کا حصہ بہت کم ہے۔ زیادہ تر اعتقادات کی تعلیم ہے اور مدنی دور کی سورتوں میں زیادہ تر احکام و عملیات کی تعلیم ہے اس سورۃ کی ابتداء قرآن پاک کے ذکر سے فرمائی گئی اور بتلایا گیا کہ یہ ایک نہایت واضح اور روشن کتاب ہے اس کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔ اور اس میں سراسر دانائی کی باتیں بھری ہوئی ہیں۔ پھر اہل مکہ کو تنبیہ کی گئی کہ تم جتنی چاہے زیادتیاں اور شرارتیں کرو مگر یہ خدا کی کتاب پوری کی پوری نازل ہو کر رہے گی اور ساری دنیا میں اس کا پیغام پھیل کر رہے گا، تم نہیں مانو گے تو جو تم سے زیادہ سمجھدار ہیں وہ مانیں گے، خدا نے پہلی قوموں میں بھی اپنے رسول بھیجے تھے ان احمقوں نے اپنے رسولوں کے ساتھ مذاق کیا جس کے نتیجہ میں خدا نے ان کو ان کی گستاخی کی سزا دی اور اب صرف ان کی کہانیاں باقی رہ گئی ہیں اور ان کے حالات منکرین کو اس کتاب میں سنائے گئے تاکہ وہ عبرت پکڑیں۔

اس کے بعد منکرین سے پھر پوچھا جاتا ہے کہ آخر تم اللہ کو کیوں نہیں مانتے اتنا تو تم بھی اقرار کرتے ہو کہ یہ ساری کائنات اللہ نے پیدا کی ہے پھر اللہ کی ہدایات پر کیوں نہیں چلتے؟ آسمان سے وہ مینہ برساتا ہے، خشکی و تری میں چلنے پھرنے کے ذریعہ کشتیاں اور بوجھ اٹھانے والے جانور تمہارے لئے سب اس نے بنائے تو کیا تمہیں اس کا شکر ادا نہیں کرنا چاہئے؟ حالانکہ تم الٹا اس کا شریک ٹھہراتے ہو اور یہ کتنی بے عقلی ہے کہ یہ کفار مشرکین اللہ کی اولاد مانتے ہیں اور وہ بھی بیٹیاں۔ حالانکہ خود اپنے لئے بیٹیاں بری سمجھتے ہیں، پھر بتلایا گیا کہ اللہ کے کوئی اولاد نہیں ہے جو ہے اس کا بندہ ہے اور وہ سب کا خالق و مالک ہے۔ اس کے بعد کفار و مشرکین کو سمجھایا گیا کہ تم اپنے باپ دادا کے دین کی پیروی مت کرو بلکہ سچائی کے طلبگار بنو اور قرآن کی پیروی کرو۔ دیکھو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باپ کو اور قوم کو گمراہ پا کر ان کا طریقہ چھوڑا اور

اللہ کو اپنا اکیلا معبود مانا اور توحید کا ڈنکا بجایا اور اپنی اولاد کو بھی اسی کی وصیت کر گئے، مگر بعد کے لوگ دنیا کی بے ہودہ باتوں میں پڑ کر توحید کو چھوڑ بیٹھے اور جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم انہیں سمجھانے آئے تو ان کا کہنا ماننے سے انکار کیا، اب یہ کفار مکہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر رہے ہیں اور انکار کا بہانہ یہ بناتے ہیں کہ رسول تو کوئی مشہور اور مالدار دولتمند ہونا چاہیئے تھا، اس کا جواب دیا گیا کہ کوئی ان منکرین سے پوچھے کہ کیا تم اللہ کی رسالت کے ٹھیکیدار ہو کہ اپنی مرضی کے مطابق اسے بانٹو، دنیا کے مال و دولت پر کیا فخر کرتے ہو خدا کے یہاں دولت کوئی حیثیت نہیں رکھتی، رسالت ساری دنیا کی دولتوں سے بڑھ کر حیثیت رکھتی ہے اور وہ اسی کو ملتی ہے جو خدا کے نزدیک اس لائق ہو، دنیوی دولت جو خدا کے نزدیک نہایت حقیر اور ذلیل چیز ہے وہ کافروں کو بہت کچھ دے ڈالتے یہاں تک کہ وہ سونے چاندی کے گھر بنا لیتے، لیکن اتنی دولت اس لئے نہیں دی کہ کہیں لوگ کفر کو اچھا نہ سمجھ بیٹھیں کہ اس سے دولت ملتی ہے اور اس لئے سب کفر ہی کو اختیار کر لیں۔ آگے فرمایا کہ اے نادانو! دنیا کے مال و دولت میں کچھ نہیں رکھا۔ اصل چیز آخرت و عاقبت ہے اور وہ مؤمن متقی پرہیزگاروں کے لئے ہے جو جنت میں دائمی عیش کریں گے اور جو دنیا کو سب کچھ جان بیٹھا اور اللہ کی طرف سے منہ پھیرا، وہ شیطان کا ساتھی بن جائے گا اور آخرت میں دکھ درد اٹھائے گا دیکھو کہ مصر کے فرعون نے سرکشی کی اور ملک و مال پر مغرور ہو کر خدائی کا دعوی کر بیٹھا اور خدا کے رسول موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی اس کا انجام کیا ہوا وہ ذلت کی موت مارا گیا۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بابت بتلایا گیا کہ وہ اللہ کی قدرت کا نمونہ ہیں جن کو لوگ عجائبات قدرت سمجھ کر انہیں کی پوجا کرنے لگے ہیں حالانکہ خود حضرت عیسیٰ کو اللہ کے بندہ ہونے کا اقرار تھا اور ان کی تعلیم یہی تھی کہ میرا اور سب کا پالنے والا صرف ایک اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

پھر بتلایا گیا کہ دنیا میں جو لوگ اللہ کا بندہ بن کر رہے اور اس کا حکم بجالائے ان کو قیامت میں جنتوں میں داخل کیا جائے گا جہاں ہر طرح کا چین اور سکھ نصیب ہوگا اور جو ان کی آرزو ہوگی وہ سب پوری کی جائے گی، ان کے برخلاف مجرمین جہنم میں داخل کئے جائیں گے اور ہمیشہ طرح طرح کے عذاب بھگتتے رہیں گے۔ اخیر میں بتلایا گیا کہ ان کفار نے اس قدر ڈھٹائی کی کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری جناب میں کہنا پڑا کہ اے میرے رب میں نے انہیں قرآن پڑھ کر سنایا، اس کا مطلب سمجھایا اور اس پر عمل کر کے دکھایا۔ غرض ہر طرح انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کی مگر یہ ایسے ضد و عناد میں ڈوبے کہ میری بات ہی نہیں سنتے اور ایمان سے دور بھاگتے ہیں، تو ہم نے اپنے رسول کی یہ بات سن لی اور ہم اپنے رسول کی ان سرکش لوگوں کے مقابلہ میں ضرور مدد کریں گے اور وہ وقت قریب ہے جب ان کی بری گت بننے والی ہے، اس وقت ان کی آنکھیں کھلیں گی اور حقیقت معلوم ہوگی۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

انسان کا مفوضہ ذمہ داری پوری نہ کرنے کی وجہ دنیا کی مادی چمک دمک سے مغلوب ہو کر اس کے فریب میں مبتلا ہو جانا ہے، اللہ کے نزدیک دنیا کی رونق کی کوئی قیمت نہیں، مومن حرص میں نہ پڑ جائے اس لیے کفار کو کم دیا، ورنہ کافروں

کے لیے دنیا جنت ہے، ہاں! آخرت میں مومنوں کے لیے حتمی سکون ہے۔

اور ذکر کیا کہ جنت میں کیا کیا ملے گا، عطیہ کی انتہاء بتلادی کہ جو چاہت ہوگی وہ ملے گا۔ آیات ۷۰، ۷۱ مومنوں کو یہ پیغام دیتی ہیں کہ دنیا کی زینت سے متاثر نہ ہوں، کیونکہ یہ ایک دن ختم ہو جائے گی، لیکن جنت میں اس کی کوئی انتہا نہیں ہوگی، مادیت کے جنون میں مبتلا لوگ رسالت کے بارے میں مختلف سوالات کرتے ہیں، اس کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ جو مالدار لوگ رسول کے انتخاب کے متعلق سوال کرتے ہیں، انہیں رزق تو ہم دیتے ہیں اور وہ بھی دنیا کے نظم ونسق کو برقرار رکھنے کے لیے اور مجھے پورا پورا حق ہے کہ میں کس کو امیر بناؤں کسے رسول بناؤں۔ (۳۱، ۳۲)

کفار نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا تو اس کا جواب دیا جو زیوروں میں پالی پوسی جاتی ہے اور جو بحث مباحثے میں اپنی بات کھل کر بھی نہیں کہہ سکتی؟ تو کیا وہ اللہ کی اولاد ہونے کا مستحق ہے؟ (۱۳، ۱۴)

فرعون کا ذکر ہے کہ وہ مادیت پر متکبر ہو گیا۔ اللہ نے اسے اسی مادیت (پانی) کے ذریعے موت دی، قرآن کے متعلق واضح کیا کہ یہ تمہارے لیے ایک نصیحت ہے اور عنقریب تم سے اس کی ذمہ داری کے بارے میں سوال کیا جائے گا، اس لیے انسان کو سنبھل کر رہنا چاہیے اور قرآن پر عمل کرنا چاہیے۔ (خواطر قرآنیہ)

مضامین:

اس سورہ میں ان جراثیم کی نشاندہی کی گئی ہے جو کفر وشرک اور انکار حق کے امراض پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ:

◇ شرک ایک ایسی برائی ہے کہ اگر انسان ذرا بھی عقل وخرد سے کام لے تو سمجھ سکتا ہے کہ خود انسانی فطرت شرک کے خلاف شہادت دیتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اگر مشرکین سے پوچھا جائے کہ یہ کائنات کس تخلیق کے کرشمے ہیں، تو وہ یہ جواب دینے پر مجبور ہیں کہ ان سب کا خالق اللہ ہی ہے۔

◇ لیکن یہ کس قدر افسوسناک رویہ ہے کہ انسان آثار کائنات کا مشاہدہ کرتا ہے اور دنیا میں انسان کے لئے خدا کے پیدا کئے ہوئے بے شمار انعامات کو دیکھتا ہے، اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس کے باوجود خدا کی ناشکری کرتا ہے اور کفر و شرک اختیار کرتا ہے۔

◇ انکار حق کی علت دنیا پرستی اور سونے چاندی کی ہوس ہے۔ یہ ہوس انسان کو آخرت کی فکر سے بے پرواہ کر دیتی ہے اور آخرت کے انکار اور آخرت فراموشی کے لازمی نتائج حق کا انکار ہے۔ اطاعت الٰہی سے سرکشی ہے اور رسول کی تکذیب ہے۔ دنیا پرستی اور سیم وزر کی ہوس کا روگ ہی تھا، جس نے گذشتہ قوموں کو آخرت کے انکار اور آخرت فراموشی میں مبتلا کیا، اور پھر انجام کار انہیں ہلاکت سے دوچار ہونا پڑا۔

◇ دنیا پرستی انسان کا ذہن اس طرح مسخ کر دیتی ہے کہ پھر دنیوی آرائشوں اور رونقوں کے پیمانے ہی سے انسان کی

قدر و قیمت ناپی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منکرین قرآن کہتے کہ قرآن طائف یا مکہ کے کسی رئیس پر نازل کیوں نہ ہوا؟

یہ ذہنیت بھی کوئی نئی نہیں، بلکہ ہمیشہ سے اس ذہنیت کی اسی طرح کارستانیاں رہی ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مخالفت میں اس ذہنیت کا ہاتھ تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت فرعون نے اسی بناء پر کی کہ وہ کہتا کہ بڑے بڑے شاندار محل جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، سب میری ملکیت ہیں، موسیٰ علیہ السلام ایک معمولی انسان، اگر واقعی یہ اللہ کے مقرب ہوتے تو فرشتے ان کے آگے پیچھے ہٹو بچو کی صدائیں لگاتے نظر آتے، خود ان کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن ہوتے اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ سے رہتے۔

◇ یہ دنیا پرست اور ہوس سیم و زر انسان کو خدا سے سرکشی کراتے ہوئے اس مقام پر لے آتی ہے، جہاں ہلاکت ہوتی ہے اور پھر اس کے غار میں دھکیل دیتی ہے۔ گذشتہ نافرمان قومیں اس طرح تباہ ہوئیں۔

◇ دنیوی آرائشوں میں آزمائش کی حکمتیں کام کر رہی ہیں، یہ چیزیں انسان کی قدر و قیمت جانچنے کی کسوٹی ہیں، انسانی شرافت و عظمت کی کسوٹی سیرت و کردار ہے۔ دنیوی ساز و سامان تو چند روزہ ہیں، آخرت کی متاع پائیدار و لازوال بھی ہے اور عظیم بھی ہے۔ اور یہ متاع متقین کے لئے ہے۔ ان کو خدا کا بیٹا کہنا سراسر جھوٹ ہے، وہ بھی خدا کی مخلوق تھے، بشر تھے، البتہ اللہ نے انہیں دعوت حق کے لئے رسول بنا کر بھیجا تھا۔

◇ قیامت میں متقین اور منکرین حق دونوں گروہوں کے جو حالات و کوائف ہوں گے، ان کا بھی اس سورہ میں بیان ہے۔ (خلاصہ مضامین قرآنی)

سورت کا موضوع:

اس سورت کا موضوع اصول ایمان ہے۔

سورت کی ابتداء:

حٰمٓ ۚ ۝١ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝٢ۙ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝٣ۚ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝٤ؕ

اس سورت کی ابتداء بھی دوسری ''حوامیم'' کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دائمی معجزہ قرآن کریم کے ذکر سے ہوتی ہے اللہ نے اس روشن اور واضح کتاب کی قسم کھا کر فرمایا ہے کہ: ہم نے اسے عربی قرآن بنایا ہے تا کہ تم سمجھو اور یہ (قرآن) بڑی کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں ہمارے پاس لکھی ہوئی اور بڑی فضیلت اور حکمت والی ہے۔ (۱-۴)

مبلغ دین کو مایوس ہو کر نہیں بیٹھنا چاہئے:

اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ۝٥

آیت ۵ میں اللہ تعالیٰ کفار مکہ سے خطاب فرما رہے ہیں کہ کیا ہم تم سے اس نصیحت کو اس بات پر ہٹا لیں گے کہ تم حد

سے گزرنے والے ہو؟ یعنی تم اپنی سرکشی اور نافرمانی میں خواہ کتنے ہی حد سے گزر جاؤ لیکن ہم تمہیں قرآن کے ذریعہ نصیحت کرنا نہیں چھوڑیں گے۔اس آیت کے تحت علماء نے لکھا ہے کہ مبلغ دین کو مایوس ہو کر نہیں بیٹھنا چاہئے۔ جو بھی دعوت اور تبلیغ کا کام کرتا ہو اسے ہر شخص کے پاس پیغام حق لے کر جانا چاہئے اور کسی گروہ یا جماعت کو تبلیغ کرنا محض اس بناء پر نہیں چھوڑنا چاہئے کہ وہ تو انتہا درجہ کے ملحد بے دین یا فاسق وفاجر ہیں، انہیں کیا تبلیغ کی جائے۔فضائل تبلیغ میں لکھا ہے کہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فتنہ کے زمانہ میں جب کہ بخل کی اطاعت ہونے لگے اور خواہشات نفسانیہ کا اتباع کیا جائے، دنیا کو دین پر ترجیح دی جائے، ہر شخص اپنی رائے کو پسند کرے، دوسرے کی نہ مانے اس وقت میں نبی کریم ﷺ نے دوسروں کی اصلاح چھوڑ کر یکسوئی اور اپنی اصلاح کی فکر کا حکم فرمایا ہے مگر مشائخ کے نزدیک ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے اس لئے جو کچھ کرنا ہے ابھی کرلو، خدا نہ کرے کہ وہ وقت دیکھتی آنکھوں آن پہنچے کہ اس وقت کسی قسم کی اصلاح ممکن نہ ہوگی۔(العیاذ باللہ تعالی)

دلائل قدرت :

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ...... الیٰ........ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ﴿۱۳﴾

آیت ۹ تا ۱۳ سے یہ سورت دلائل قدرت سے بحث کرتی ہے کہ یہ آسمان کی نیلی چھت، یہ زمین کا فرش، یہ بلند وبالا پہاڑ، یہ بہتی ہوئی نہریں، یہ تا حد نظر پھیلے ہوئے سمندر، یہ آسمان سے قطرہ قطرہ برسنے والی بارش، یہ سطح آب پر رواں دواں کشتیاں اور جہاز، یہ ہر قسم کے چوپائے جو کھانے کے کام بھی آتے ہیں اور نقل وحمل کے بہترین ذرائع بھی ثابت ہوتے ہیں، یہ سب اپنے خالق اور صانع کی قدرت اور حکمت کے زندہ گواہ ہیں۔ یہ گواہ کل بھی موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں۔ ضرورت صرف ان کانوں کی ہے جو حق کی گواہی سن سکیں، ان آنکھوں کی ہے جو کچھ دیکھ سکیں، ان دلوں کی ہے جو حق کو قبول کر سکیں۔

اللہ کی ایک اور عنایت :

آیت ۱۲ تا ۱۴ میں ارشاد فرمایا: کیا یہ اللہ کی نعمت اور احسان نہیں کہ سرکش اور نافہم جانور انسان کے اشاروں پر کام کرتا ہے اور باوجود زیادہ طاقتور ہونے کے انسان کا فرمانبردار بن جاتا ہے کہ اس پر سوار ہو کر یا سامان لاد کر جہاں چاہتا ہے اور جدھر چاہتا ہے لئے پھرتا ہے۔ اگر اللہ تعالی ان سواریوں کی تسخیر نہ کرتا تو کس طرح ایک حقیر انسان اپنے سے بدر جہا زیادہ طاقتور جانوروں سے کام لے سکتا تھا۔ یہ اللہ ہی کی عنایت ہے۔ دل سے اللہ کا شکر ادا کرو اور زبان سے یوں شکر کرو کہ ہر نقص اور عیب سے پاک ہے وہ ذات جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں دے دیا، ورنہ ہم میں کیا طاقت تھی کہ جو ہم انہیں قابو میں لاتے۔

ان آیات سے ایک خاص تعلیم یہ ملتی ہے کہ ایک کافر اور ایک مومن میں درحقیقت یہی بڑا فرق ہے کہ کائنات کی

نعمتوں کو دونوں استعمال کرتے ہیں لیکن کافر انہیں غفلت اور بے پروائی سے استعمال کرتا ہے اور مومن اللہ کے انعام واحسان کو یاد کر کے اس کا شکرگزار اور احسان مند بندہ بنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی شکر گزاروں میں شامل فرمائے۔

دوسری تعلیم یہ دی گئی کہ انسان کو اپنے ہر دنیوی سفر کے وقت آخرت کے سفر کو یاد کرنا چاہئے جو ہر حال میں ضرور پیش آ کر رہے گا۔ دنیا کے سفر میں سواری کی نعمت وسہولت کو حاصل کر کے آخرت کی نعمت وسہولت کو مستحضر کرے اور یاد کرے کہ آخرت کے سفر کو سہولت کے ساتھ طے کرنے کے لئے ایمان اور اعمال صالحہ کے سوا کوئی اور سواری نہ ہوگی۔ لہٰذا ایمان اور اعمال صالحہ کے لئے ہر آن کوشاں ہونا چاہئے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن)

انتہائی قابل نفرت سوچ:

یہ سورت زمانہ جاہلیت کی ایک اور انتہائی قابل نفرت سوچ کا تذکرہ کرتی ہے، وہ یہ کہ:

وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ.........الیٰ............يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴿۱۶﴾

مشرکین عرب یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ’’فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں‘‘ یہاں سے ان کے اس عقیدے کی تردید کی جارہی ہے اور اس کے خلاف چار دلیلیں پیش کی گئی ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی اولاد ہونا ناممکن ہے، اس لئے کہ اولاد ماں باپ کا جزء ہوتی ہے، کیونکہ وہ ان کے نطفے سے پیدا ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا کوئی جزء نہیں ہوسکتا، وہ ہر قسم کے اجزاء سے پاک ہے، لہٰذا اس کی کوئی اولاد نہیں ہوسکتی، دوسرے یہ کہ ان مشرکین کا اپنا حال یہ ہے کہ وہ اپنے لئے بیٹیوں کی ولادت کو عار سمجھتے ہیں اور اگر کسی کے یہاں کوئی لڑکی پیدا ہوجاتی ہے تو وہ اس پر بہت مغموم ہوتا ہے، اب یہ عجیب بات ہے کہ بیٹی کو خود اپنے لئے تو عیب سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس کی بیٹیاں ہیں، تیسرے اس عقیدے کی رو سے فرشتے مؤنث قرار پاتے ہیں، حالانکہ وہ مؤنث نہیں ہیں، چوتھے اگرچہ عورت ہونا حقیقت میں کوئی عیب یا عار کی بات نہیں ہے، لیکن عام طور سے عورتوں کی صلاحیتیں مردوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہیں، کیونکہ ان کی زیادہ توجہ زیورات اور زیب وزینت کی طرف رہتی ہے، اور اپنی بات کو خوب واضح کر کے کہنے کی صلاحیت بھی اکثر ان میں کم ہوتی ہے، لہٰذا اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کو کوئی اولاد رکھنی منظور ہوتی تو وہ مؤنث ہی کا کیوں انتخاب فرماتا۔

ایک طرف ان کی نفسیات یہ تھی کہ وہ بیٹیوں سے سخت نفرت کرتے تھے، اگر ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوجاتی تو وہ لوگوں سے منہ چھپاتے پھرتے تھے اور اسے زندہ درگور کرنے کی تدبیریں سوچنے لگتے تھے، دوسری طرف وہ اللہ کی طرف بیٹیوں کی نسبت کرتے تھے اور فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ (۱۵۔۱۲) (توضیح القرآن، خلاصۃ القرآن)

مشرکین کا دعویٰ:

سورۂ زخرف، ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی تذکرہ کرتی ہے جن کے بارے میں مشرکین کا دعویٰ تھا کہ ہم ان کی ملت اور شریعت پر ہیں، یہاں ان کے اس دعویٰ کی تردید کی جارہی ہے، یہ بتوں کے پجاری کس منہ سے اپنے آپ

کو ان کی شریعت کا پیرو کار قرار دیتے ہیں جبکہ آپ عقیدہ توحید کے علمبر دار تھے اور یہ سر سے پاؤں تک بت پرستی کی نجاست میں ڈوبے ہوئے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں یہی کلمہ توحید چھوڑا تھا۔(۲۶۔۲۸)

انتہائی حماقت اور جہالت پر مبنی سوچ:

اس کلمہ کی جب حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مشرکین کو دعوت دی تو وہ اس دعوت کو سحر اور آپ کو ساحر کہنے لگے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ان کا تصور اور ان کی سوچ انتہائی حماقت اور جہالت پر مبنی ہے، وہ کہتے ہیں کہ

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿٣١﴾

یہ قرآن دونوں بڑے شہروں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟(۳۱)

کیا اللہ کو، نبی بنانے کے لیے ایک یتیم فقیر اور غریب آدمی ہی ملا تھا، طائف اور مکہ کے سرداروں میں سے کسی سردار پر نظر انتخاب کیوں نہ پڑی؟

اختیار کا مالک:

اس کا جو جواب دیا گیا، اس کا حاصل یہ ہے کہ ان کے درمیان گزر بسر کے ذرائع تک پر تو انہیں کوئی اختیار نہیں، وہ خود اپنے رزق کے بھی مالک نہیں، جب رزق کی تقسیم میں ان کا کوئی اختیار نہیں تو نبوت جیسے عظیم منصب کی تقسیم اور انتخاب میں انہیں کوئی اختیار کیسے دیا جا سکتا ہے۔(۳۲)

اقتدار اور اختیارات پر ناز:

اس کے بعد اس سورت میں حضرت موسی علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو کہ مشرکین کی حماقت اور جہالت کا ایک نمونہ اور جھلک ہے، فرعون کو اپنے اقتدار، سونے چاندی کے انبار اور وسیع اختیارات پر بڑا ناز تھا اور وہ اپنے آپ کو مصر کی سرزمین اور نہروں کا حقیقی مالک سمجھتا تھا اور حضرت موسی علیہ السلام کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ اسے انہیں نہروں اور دریاؤں میں غرق کر دیا گیا جو اس کے خیال میں اس کی اجازت کے بغیر اپنا بہاؤ بھی جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔(۴۶-۵۲) (خلاصۃ القرآن)

دنیا و آخرت کے لحاظ سے بہترین دوستی:

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٧﴾

آیت ۶۷ میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کے دوستانہ تعلقات جن پر آج انسان ناز کرتا ہے اور جن کی خاطر حلال وحرام ایک کر ڈالتا ہے، قیامت کے روز نہ صرف یہ کچھ کام آئیں گے بلکہ ان کی دوستی الٹی دشمنی میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس لئے دنیا و آخرت دونوں کے لحاظ سے بہترین دوستی وہ ہے جو اللہ کے لئے ہو اور اللہ کے لئے محبت و دوستی کا مطلب یہ ہے کہ

دوسرے سے اس بناء پر تعلق ہو کہ وہ اللہ کے دین کا سچا پیرو ہے اور اللہ کے لئے محبت کے بڑے فضائل اور درجات احادیث میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آواز دیں گے کہ کہاں ہیں وہ لوگ جو میرے واسطے آپس میں محبت رکھتے تھے۔ آج جب کہ میرے سایہ کے سوا کہیں سایہ نہیں ہے میں ان کو اپنے سایہ میں جگہ دوں گا۔

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ عرش کے گرد نور کے ممبر ہیں، جن پر ایک جماعت بیٹھے گی، جن کے لباس اور چہرے سرتا پا نور ہوں گے اور وہ لوگ نہ نبی ہوں گے نہ شہید مگر انبیاء وشہداء ان کی حالت پر رشک کریں گے۔ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہوں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے وہ مخلص بندے جو باہم اللہ کے واسطے محبت کرتے ہیں اور اللہ کے واسطے ایک دوسرے کے پاس اٹھتے بیٹھتے اور آتے جاتے ہیں۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

سورت کا اختتام:

سورت کے اختتام پر اللہ اپنے پیغمبر کو جاہلوں سے اعراض کرنے اور صبر کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

فَاصۡفَحۡ عَنۡهُمۡ وَقُلۡ سَلٰمٌ ؕ فَسَوۡفَ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۹﴾

”تم ان سے منہ پھیر لو اور سلام کہہ دو، انہیں عنقریب انجام معلوم ہو جائے گا۔“

یہاں سلام کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے خوبصورتی کے ساتھ قطع تعلق کر لیا جائے، یعنی تمہاری کٹ حجتی کے بعد اب میں تم سے مزید بحث کرنے کے بجائے تم سے شائستگی کے ساتھ علیحدگی اختیار کر لیتا ہوں۔ (خلاصۃ القرآن، توضیح القرآن)

موضوع سورۃ: ......تمہارے اعراض کی وجہ سے قرآن حکیم زمین سے اٹھایا نہیں جا سکتا۔

خلاصہ رکوع:۱......تمہارے اعراض کی وجہ سے قرآن حکیم زمین سے اٹھایا نہیں جا سکتا۔ ماخذ: آیت: ۵ تا ۷۔

خلاصہ رکوع:۲......دعوت الی القرآن۔ ماخذ: آیت: ۲۴۔

خلاصہ رکوع:۳......دعوت الی القرآن۔ ماخذ: آیت: ۳۰، ۳۱۔

خلاصہ رکوع:۴......دعوت الی القرآن۔ ماخذ: آیت: ۴۳، ۳۶، ۴۴۔

خلاصہ رکوع:۵......تذکیر بایام اللہ سے دعوت الی القرآن۔ ماخذ: آیت: ۴۶، ۴۷۔

خلاصہ رکوع:۶......کفار مکہ کے ایک شبہ کا جواب۔ قرآن کریم کی تعلیم کا حاصل سبق توحید ہے، جب عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر خیر قرآن میں آیا تو کفار مکہ نے کہا کہ نصاریٰ کے معبود کی عزت کرتے ہیں، اور ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہیں، اس شبہ کا جواب ہے۔ ماخذ: آیت: ۵۷۔

خلاصہ رکوع:۷......دعوت الی القرآن۔ ماخذ: آیت: ۶۸، ۶۹، ۸۷۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ دخان

یہ قرآن کریم کی ۴۴ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۶۴ نمبر پر ہے۔ اس سورۃ میں ۳ رکوع، ۵۹ آیات، ۳۴۶ کلمات اور ۱۴۹۵ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی دسویں آیت میں لفظ دخان آیا ہے، دخان کے لفظی معنی ہیں دھواں اور اس دخان سے ایک خاص قسم کا دھواں مراد ہے، اس لئے بطور علامت اس سورۃ کا نام دخان مقرر ہوا۔

ربط:

اس سے پہلے ''سورۃ الزخرف'' کا اختتام مضمون توحید و رسالت پر ہوا تھا اور اس سورۃ کا افتتاح انہیں مضامین سے ہے، اس لئے دونوں سورتوں میں تناسب ظاہر ہے۔

فضائل سورۃ:

ترمذی شریف کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص رات کو سورۂ حم دخان پڑھے اس کے لئے صبح تک ستر ہزار فرشتے استغفار کرتے رہیں گے۔ یہ روایت غریب ہے اور اس کے ایک راوی عمر بن خثعم ضعیف ہیں۔ ان کو امام بخاری نے منکر الحدیث کہا ہے۔

ترمذی رحمہ اللہ تعالی کی ایک اور روایت میں ہے کہ جس نے اس سورۃ کو جمعہ کی رات میں پڑھا اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ یہ حدیث بھی غریب ہے۔

مسند بزار میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن صیاد کے سامنے اپنے دل میں سورۂ دخان کو پوشیدہ کر کے اس سے پوچھا: بتا میرے دل میں کیا ہے؟ اس نے کہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بس پرے ہٹ جا، تو تو نامراد رہ گیا، جو اللہ چاہتا ہے ہوتا ہے پھر آپ لوٹ گئے۔

خلاصہ سورۃ:

یہ سورہ مکی ہے اور اس کا زمانہ نزول بھی وہی ہے جب کہ کفار مکہ کی مخالفت نہایت شدید ہو گئی تھی، اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی تھی کہ اے اللہ یوسف علیہ السلام کے قحط جیسے ایک قحط سے میری مدد فرما۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا اس خیال سے کی تھی کہ جب ان کفار پر مصیبت پڑے گی تو ان کی اکڑی ہوئی گردنیں ڈھیلی پڑ جائیں گی اور ان کے دل نصیحت قبول کرنے کے لئے نرم ہو جائیں گے۔ اللہ تعالی نے آپ کی دعاء قبول فرمائی اور مکہ کے علاقہ میں ایسا سخت قحط پڑا کہ اہل مکہ بلبلا اٹھے اور بڑے بڑے ہیکڑ دشمنان حق اور سرداران قریش ۔ جن میں اس وقت ابوسفیان بھی شامل تھے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اپنی قوم کو اس بلاء سے

نجات دلانے کے لئے اللہ سے دعاء کریں۔ نیز انہوں نے یہ وعدہ بھی کیا کہ یہ عذاب قحط پروردگار ہم سے ٹال دے تو ہم ایمان لے آویں گے، یہی موقع ہے جب کہ اللہ عزوجل نے یہ سورۃ مکہ میں نازل فرمائی۔ اس سورۃ میں بھی زیادہ تر عقائد ہی سے متعلق مضامین ہیں۔ مثلاً اثبات توحید ورسالت۔ منکرین پر وعید اور وعید کے لئے بعض اقوام سابقہ کے واقعات، قیامت اور حشر ونشر اور اپنے اعمال کی سزا میں بالآخر جنت یا جہنم میں جانا اور وہاں کے عیش وآرام دکھ اور آزار کا بیان ہے۔ سورۃ کی ابتداء قرآن پاک کے تذکرہ سے فرمائی گئی اور بتلایا گیا کہ یہ تو ایک بہت ہی صاف اور واضح کتاب ہے جسے اللہ نے ایک بڑی برکت والی رات میں نازل کیا۔ جس وقت میں اللہ کے یہاں سال بھر میں ہونے والے معاملات کی بابت حکم جاری ہوتا ہے، یہ قرآن اللہ کی رحمت کا ظہور ہے کیونکہ اس کی رحمت دنیا میں انسان کو بے یار ومددگار کیسے چھوڑ سکتی ہے؟ اللہ تعالی ہی آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کا خالق ہے، وہی سب کی پرورش اور دیکھ بھال کرتا ہے اور موت وحیات بھی اللہ ہی کے اختیار میں ہے، پھر ان منکرین کو جو دین حق کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں اور کھیل کود میں پھنسے ہوئے ہیں انہیں تنبیہ کی گئی اور بتلایا گیا کہ اس وقت کا انتظار کرو جب دھواں ہی دھواں آسمان پر ہوگا اور لوگ سخت دکھ اور تکلیف میں ہوں گے اور گھبرا کر کہیں گے: اے رب اس عذاب کو ہم سے دور کر دے، ہم اس پر ایمان لے آئیں گے، اس پر حق تعالی فرماتے ہیں: بھلا وہ کب ایمان لانے والے ہیں، ان کے پاس اللہ کے سچے رسول کھلی ہوئی اور واضح باتیں لے کر آئے لیکن انہوں نے ان کو جھٹلا دیا، اچھا کچھ مدت کے لئے عذاب روک دیتے ہیں، لیکن یہ پھر وہی کریں گے جو پہلے کیا تھا، اس لئے تنبیہ کی گئی کہ یاد رکھو قیامت کے دن سخت پکڑ ہوگی اور تمہاری ڈھٹائی کا بدلہ دیا جائے گا، پھر مثال کے لئے فرعون کا قصہ سنایا گیا کہ اس نے بھی ایسا ہی کیا تھا اس نے حضرت موسی علیہ السلام کی تکذیب کی تھی، حضرت موسی علیہ السلام نے معجزات دکھلائے، اللہ کی نشانیاں پیش کیں، مگر فرعون نے ان کی کوئی بات نہ مانی، آخر فرعونیوں پر طرح طرح کے عذاب آئے لیکن ان کا حال یہ تھا کہ عذاب آتا تو کہتے اے موسی عذاب کو اپنے رب سے دعا مانگ کر دور کرا دو تو ہم تمہاری بات ماننے کو تیار ہیں، لیکن جب عذاب ہٹ جاتا تو پھر ویسے ہی ڈھیٹ بن جاتے۔ آخر جب حضرت موسی علیہ السلام کو راتوں رات بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے چلے جانے کا حکم ملا تو فرعون نے لشکر سمیت ان کا پیچھا کیا، جس کے نتیجہ میں فرعونی سمندر میں غرق ہوکر ہلاک ہوئے اور بنی اسرائیل کو ان کے ظلم وستم سے نجات ملی اور قیامت میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا، تو عرب کے یہ مشرک بھی انہیں مغروروں کی چال چل رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ موت کے بعد پھر زندہ ہونا کیسا؟ اور کہتے ہیں کہ اے مسلمانو اگر تم دوبارہ زندہ ہونے کو مانتے ہو تو ہمارے مرے ہوئے باپ دادا کو زندہ کر کے دکھاؤ ہم زبانی دعوے کو نہیں مانتے، اس پر ان کو جواب ملا کہ اے نادانو! تم کیا ہو تم سے پہلے تم سے زبردست لوگوں کو ہلاک کیا جا چکا ہے، اس لئے سمجھ سے کام لو یہ دنیا یہ آسمان وزمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے یہ یونہی کھیل تو نہیں بنایا گیا، اس کا بڑا نتیجہ نکلتا ہے جو قیامت کو معلوم ہوگا، پھر فرمایا گیا کہ لوگو قیامت میں

شک مت کرو، یہ دنیا کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ ایک دن فنا ہوکر رہے گی اور سارے انسان اللہ کے سامنے حاضر کئے جاویں گے، ان کے اعمال کا حساب ہوگا، اچھے عمل کرنے والے جنت میں جائیں گے جہاں راحت ہی راحت ہے اور برے عمل کرنے والے جہنم میں جائیں گے جہاں دکھ ہی دکھ ہے، اگر تمہیں یہ نصیحت ماننی ہے تو مانو ورنہ وقت آنے پر ساری حقیقت کھل جائے گی۔

دخان کیا چیز ہے؟

اس میں سلف کے دوقول ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے قریب حضرت عیسی علیہ السلام کے نزول اوران کے ۴۰ سالہ قیام پھر انتقال فرما جانے کے بعد آفتاب کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے ایک زبردست دھواں نمودار ہوگا جو تمام زمین پر چھا جائے گا اور تمام لوگوں کو گھیرے گا جس سے انسان تنگ آجائیں گے، نیک آدمی کو اس کا اثر خفیف پہنچے گا جس سے مسلمان کو ایک زکام کی سی کیفیت پیدا ہوجائے گی اور کافر ومنافق کے دماغ میں دھواں گھس کر بیہوش کردے گا۔ بعض ایک دن میں بعض دودن میں اور بعض تین دن میں ہوش میں آئیں گے اور دھواں چالیس دن تک مسلسل رہے گا پھر مطلع صاف ہوجائے گا۔ دوسرا قول حضرت عبداللہ بن مسعود کا ہے کہ اس سے وہ دھواں مراد نہیں جو علامات قیامت میں سے ہے بلکہ قریش مکہ کی مخالفت اور ایذادہی سے تنگ آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے دعا مانگی تھی کہ ان پر بھی ایسا شدید قحط نازل کردے جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں مصریوں پر مسلط ہوا تھا چنانچہ قحط پڑا جس میں مکہ والوں کو مردار چمڑے اور ہڈیاں تک کھانے کی نوبت آگئی اور قاعدہ ہے کہ شدت بھوک اور مسلسل خشک سالی کے زمانہ میں فضا میں آنکھوں کے سامنے دھواں سا نظر آنے لگتا ہے اور ویسے بھی مدت دراز تک بارش بند رہنے سے آسمان پر گردوغبار وغیرہ چڑھ جاتا ہے اور دھواں معلوم ہونے لگتا ہے اس آیت میں اس کو دخان سے تعبیر فرمایا گیا۔ یہی دوسرا قول حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اختیار فرمایا ہے اور حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمہ اللہ نے پہلا قول اختیار کیا ہے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مضامین:

مندرجہ ذیل مضامین پر یہ سورہ مشتمل ہے:

◇ توحید کی تعلیم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ سلسلہ رسالت کا قائم کرنا اللہ کی انتہائی رحمت ہے، اس سلسلہ رسالت کی آخری کڑی رسالت محمدیہ ہے اور قرآن ایک نہایت بابرکت رات کو نازل کیا گیا تاکہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کرلیں۔

◇ منکرین حق آخرت کے معاملہ میں سخت مغالطہ میں مبتلا ہیں، حالانکہ یہ آکر رہے گی، جس کی نشانیوں میں سے ایک نشانی آسمان کا دھویں سے بھر جانا ہے۔

◇ بنی اسرائیل پر اللہ نے بڑے احسانات وانعامات کئے، انہیں فرعون کے مظالم سے نجات دی لیکن انہوں نے

ناشکری کی، اور جب ناشکری کی تو اللہ نے انہیں جو فضیلت عطا فرمائی تھی وہ ان سے چھین لی گئی۔

◇ اب فضیلت اس امت کے حق میں مقدر ہو چکی ہے جو قرآن کی حامل اور اس پر عامل ہو۔

◇ منکروں اور کافروں کو قیامت میں جو دردناک سزائیں ملیں گی ان کی کچھ تفصیلیں بیان ہوئی ہیں۔

◇ متقین کو قیامت میں جو نعمتیں ملیں گی، اس کا بھی تھوڑا بیان ہے۔ (خلاصہ مضامین قرآنی)

کتاب مبین اور لیلۃ القدر:

حٰمٓ ۝١ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝٢ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝٣

اس سورت کی ابتدا میں بھی اللہ تعالی نے ''کتاب مبین'' یعنی واضح کتاب کی قسم کھائی ہے۔

یہ کتاب اعجاز کے اعتبار سے بھی واضح ہے اور احکام و مضامین کے بیان کے اعتبار سے بھی واضح ہے۔ اللہ نے قسم اس اعتبار سے کھائی ہے کہ ہم نے اس کتاب کو مبارک رات میں نازل کیا، اس سے مراد ''لیلۃ القدر'' ہے جو ساری راتوں سے افضل ہے۔

یہ کتاب اللہ نے بندوں پر رحمت کے طور پر نازل کی ہے، ورنہ وہ بندوں کی عبادت کا محتاج نہیں ہے، اللہ کی ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بندوں کو ہدایت سے محروم نہ رکھے۔ (۱۔۸)

لیکن مشرکین اور کفار، قرآن اور بعث بعد الموت کے بارے میں شک کرتے ہیں۔ (۹)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے فرعون:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے فرعونوں کو حضرت موسی علیہ السلام کی مخالفت کرنے والے فرعون کے انجام سے ڈرایا گیا ہے، اس کی ملکیت میں سونے کے انبار تھے۔ باغات کی بہتات تھی، بیسیوں محلات تھے، سونا اگلتی زمینیں تھیں، ہزاروں خدام اور لونڈیاں تھیں، لاکھوں پر مشتمل فوج تھی، مختصر یہ کہ جو کچھ مصر میں تھا وہ سب اسی کا تھا، وہ ہر جاندار اور بے جان چیز کا اپنے آپ کو مالک سمجھتا تھا لیکن یہ سب کچھ اس کے کسی کام نہ آیا اور وہ اپنے ''مظلوموں'' اور محکوموں کی نظروں کے سامنے دریا کی بے رحم موجوں میں غرق ہو گیا وہ ''آمنت آمنت'' (میں ایمان لے آیا، ایمان لے آیا) کہتا ہی رہ گیا۔ لیکن یہ چیخ و پکار اس کے کسی کام نہ آئی۔ (۲۴)

اس نے جو کچھ اپنے پیچھے چھوڑا، اس سب کا وارث اور مالک بنی اسرائیل کو بنادیا گیا، کل کے محکوم آج کے حاکم اور کل کے مملوک آج کے مالک بن گئے۔ (خلاصۃ القرآن)

فرعونیوں کی ہلاکت پر نہ تو آسمان کو رونا آیا نہ زمین کو:

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ۝٢٩

آیت ۲۹ میں فرمایا گیا کہ ان فرعونیوں کی ہلاکت پر نہ تو آسمان کو رونا آیا نہ زمین کو۔ لیکن احادیث سے معلوم ہوتا

ہے کہ مومن کے مرنے پر آسمان اور زمین دونوں روتے ہیں۔ چنانچہ ترمذی شریف کی حدیث میں ہے کہ رسول مقبول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن جب مرجاتا ہے تو آسمان کا ایک وہ دروازہ جس میں سے اس کا عمل اوپر چڑھتا تھا اور ایک وہ دروازہ جس میں سے اس کے رزق کا نزول ہوتا تھا اس پر روتے ہیں اور اس کے بعد آپ نے یہی آیت پڑھی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ زمین مومن کے مرنے پر چالیس دن تک روتی ہے اور حضرت علیؓ نے فرمایا کہ جب مومن مرتا ہے تو زمین اس کے نماز پڑھنے کی جگہ اور آسمان میں اس کے عمل اوپر چڑھنے کی جگہ اس پر روتی ہے۔

چنانچہ آیت / ۴۳ تا ۵۰ میں ان ہی عذابوں کا تذکرہ ہے جس میں زقوم کے ایک درخت کا بھی تذکرہ ہے، جس کے بارے میں حدیث شریف میں ہے کہ ''زقوم'' جہنم میں پیدا ہونے والا ایک درخت ہے اور وہ دوزخیوں کی خوراک بنے گا۔ اگر اس کا ایک قطرہ اس دنیا میں ٹپک جائے تو یہاں کی تمام چیزیں اس کی بدبو اور گندگی اور زہریلے پن سے متاثر ہو جائیں اور ہمارے کھانے پینے کی ساری چیزیں خراب ہوجائیں۔ پس سوچنے کی بات ہے کہ یہ زقوم جس کو کھانا پڑے اس پر کیا گزرے گی۔

کفار پر عذاب کا تذکرہ کرنے کے بعد چھوٹی سی عقل میں نہ سما سکنے والی ان نعمتوں کا ذکر ہے، جن سے اللہ کے نیک بندوں کو جنت میں نوازا جائے گا۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:...... دعوت الی القرآن کتاب مبین کا نزول لیلہ مبارکہ میں ہوا ہے، اور لیلہ مبارکہ میں ہر امر حکیم کا فیصلہ ہوتا ہے، اگر اس قرآن کا اتباع نہیں کروگے تو دنیاوی ذلت اور اخروی عذاب سے بچ نہیں سکوگے۔

خلاصہ رکوع: ۱...... تذکیر بایام اللہ، احکام الٰہی سے اعراض کے باعث فرعون کا دنیوی عذاب میں مبتلا ہونا۔ ماخذ: آیت: ۲۴، ۱۷۔

خلاصہ رکوع: ۲...... تذکیر بایام اللہ، احکام الٰہی کی مخالفت سے قوم تبع کی تباہی۔ ماخذ: آیت: ۳۷۔

خلاصہ رکوع: ۳...... احکام الٰہی سے انکار کرنے والوں کے لئے عذاب اخروی کا اعلان۔ ماخذ: آیت: ۴۳، ۴۴۔

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ جاثیہ

اس سورت میں بنیادی طور پر تین باتوں پر زور دیا گیا ہے، ایک یہ کہ اس کائنات میں ہر طرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی اتنی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں کہ ایک انسان اگر معقولیت کے ساتھ ان پر غور کرے تو اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کائنات کے خالق کو اپنی خدائی کے انتظام میں کسی شریک کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرا کر اس کی عبادت کرنا سراسر بے بنیاد بات ہے، دوسرے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے

کہ آپ کو شریعت کے کچھ ایسے احکام دئے گئے ہیں جو پچھلی امتوں کو دئے ہوئے احکام سے کسی قدر مختلف ہیں، چونکہ یہ سارے احکام اللہ تعالی کی طرف سے ہیں، اس لئے اس پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہئے ،تیسرے اس سورت میں قیامت کے ہولناک مناظر کا نقشہ کھینچا گیا ہے، اسی سلسلے میں آیت نمبر:۲۸ میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن لوگ اتنے خوف زدہ ہوں گے کہ ڈر کے مارے گھٹنوں کے بل بیٹھ جائیں گے، جاثیہ عربی زبان میں ان لوگوں کو کہتے ہیں جو گھٹنے کے بل بیٹھتے ہوں، اسی لفظ کو سورت کا نام بنادیا گیا ہے۔(توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی ۴۵ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۶۵ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۴ رکوع، ۳۷ آیات، ۴۹۲ کلمات اور ۲۱۴۱ حروف ہیں، یہ سورہ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے آخری رکوع میں اہل باطل اور غیر مقبولین فرقوں کے تذکرہ کے سلسلہ میں لفظ جاثیہ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں خوف سے زانو کے بل گر جانا یعنی تمام اہل باطل فرقوں اور امتوں کے بارے میں بتلایا گیا کہ قیامت میں یہ اہل باطل خسارہ میں پڑیں گے اور مارے خوف کے زانوں کے بل گر پڑیں گے اس تذکرہ کی بناء پر سورۃ کا نام ہی جاثیہ قرار پایا۔

ربط:

اس سورۃ کا خلاصہ تین مضمون ہیں توحید، نبوۃ، معاد اور دوسرے مضامین انہیں کی مناسبت سے ذکر ہوئے ہیں اور سورۃ سابقہ کے آخر میں بطور نتیجہ اور خلاصہ کے اور اس سورۃ کے شروع میں بطور تمہید کے قرآن پاک کا ذکر ہے، جس سے دونوں سورتوں میں باہمی تناسب حاصل ہے۔

خلاصہ سورۃ:

سورۃ کی ابتداء دلائل توحید سے فرمائی گئی ہے، اس سلسلہ میں انسان کو بتلایا کہ اللہ کی توحید کی نشانیاں آسمان وزمین اور خود انسان اور جانوروں کی پیدائش میں موجود ہیں، جن میں عقل وفہم ہے وہ کائنات کے حالات سے سمجھ سکتے ہیں کہ اس کائنات کا ضرور کوئی خالق ہے اور یہ کہ یہ کائنات بہت سے خداؤں کی خدائی میں نہیں چل رہی ہے بلکہ صرف ایک خدا نے اسے بنایا ہے وہی اکیلا اس کا فرماں روا ہے، اسی کے مقرر کردہ نظام عالم کے مطابق یہ کارخانہ چل رہا ہے، رات و دن کا باقاعدہ ایک دوسرے کے آگے پیچھے آتے رہنا، پھر وقت پر بارش ہونا اور مینہ برسنا اور پھر بارش کے ذریعہ مردہ زمین میں تروتازگی پیدا ہونا اور اس سے جانوروں وانسانوں کی کھانے پینے کی چیزیں پیدا ہونا، یہ سب اللہ کی قدرت کو ظاہر کرتا ہے اور یہ سب اس کی توحید کی نشانیاں ہیں۔ پھر بتلایا گیا کہ قرآن مجید کی آیتوں میں جو سچی باتیں بتلائی گئی ہیں وہ حقیقت کو بالکل کھول دیتی ہیں اور ان میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، جو لوگ ان کو نہیں مانتے تو پھر اس سے زیادہ اور کوئی سچی

سیدھی بات ان کے پاس کہاں سے آئے گی جسے یہ مانیں گے، پھر تنبیہ فرمائی گئی کہ جنھوں نے یہ آیتیں سن کر ان سے منہ موڑا اور اپنی رائے پر اڑے رہے ان کی شامت آنی یقینی ہے اور نتیجہ میں وہ جہنم میں داخل ہوں گے، اس قرآن سے منہ موڑ کر جو کچھ یہ منکرین اس دنیا میں کررہے ہیں مرنے کے بعد یہ ان کے کچھ کام نہ آئے گا، مال و دولت سب یہیں پڑا رہ جائے گا اور یہ خود سخت مصیبت میں پھنس جائیں گے، قرآن مجید سیدھا راستہ بتارہا ہے جو اس پر نہیں چلیں گے، وہ درد بھری آفتوں کا شکار ہوں گے، پھر انسانوں کو سمجھایا جاتا ہے کہ دیکھو اللہ کا پہچاننا کچھ مشکل نہیں، اپنے اوپر اس کے احسانات دیکھو، گہرے دریاؤں اور سمندروں میں تمہیں جہاز اور کشتیاں چلانے کا سلیقہ عطاء کرکے تمہارے لئے راستے کھول دیئے کہ ان کے ذریعہ تجارت وغیرہ کرکے بڑے بڑے فائدہ اٹھاتے ہو اور ایک سمندر ہی کیا آسمان زمین کی ساری چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کردیا ہے کہ وہ تمہاری خدمت گزاری میں لگی ہیں، پس انسانوں کو اس کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ بہرحال ایمان والوں کو ان منکرین کے جال میں نہ پھنسنا چاہیئے، یہ عمل صالح کی کوشش میں لگے رہیں، انہیں اس کا بہت بہتر بدلہ ملے گا اور ان نافرمانوں کو اللہ تعالیٰ سخت سزا دے گا، مسلمانوں کو یہ نصیحت فرمائی گئی کہ تمہارے لئے یہ قرآن کافی ہے، اسے چھوڑ کر دوسرے لوگوں کی جو ہوا و ہوس میں گرفتار ہیں ہرگز پیروی مت کرو، اچھے اور برے ایک جیسے نہیں ہوسکتے ہیں، دنیا ہی کو سب کچھ سمجھنے والے اور آخرت کا انکار کرنے والے نادان اور گمراہ ہیں، ان کی نظر آگے نہیں جاتی، یہ مرکر جینے کو نہیں مانتے، یہ ان کی ہٹ دھرمی ہے، حقیقت یہی ہے جو اللہ نے اس قرآن میں ظاہر کردی ہے اور جو کچھ اس میں کہا گیا ہے وہ سب کچھ ہوکر رہے گا۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مضامین:

توحید کی تعلیم و اثبات اور عقیدۂ دہریت کا ابطال اس سورہ کا مرکزی مضمون ہے۔ چنانچہ بتایا ہے کہ:

◇ کائنات میں پھیلی ہوئی اللہ کی بے شمار نشانیوں کو دیکھتے رہنے اور اللہ کے بے شمار انعامات سے فائدے اٹھاتے رہنے کے باوجود توحید کا انکار قابل لعنت ہے۔

◇ بنی اسرائیل پر سالہا سال اللہ نے انعامات و احسانات کئے لیکن اس بدبخت قوم نے اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی ماری۔ اب قرآن نازل ہوا ہے، جو سراپا ہدایت ہے اور رحمت الٰہی ہے۔ بنی اسرائیل کے سنبھلنے کا یہ آخری موقع ہے۔ اگر اس رحمت و ہدایت سے یہ فائدہ اٹھائیں تو ان کے حق میں اچھا ہوگا ورنہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہوکر رہیں گے۔

◇ خواہشات نفس کی پیروی اور دنیوی حیات ہی کو سب کچھ سمجھ لینا، وہ بس کی گانٹھ ہے جو حق سے غفلت اور آخرت کا انکار کراتی ہے اور انسان دہریت میں مبتلا ہوکر سمجھتا ہے کہ بس جو کچھ ہے، یہی دنیا کی زندگی ہے، مرنے کے بعد ہم گل سڑ کر مٹی میں مل جائیں گے اور پھر کوئی زندگی نہیں۔

◇ حالانکہ یہ کائنات اور اس کے یہ آثار اور اس کائنات سے انسان کے تعلق کی نوعیت خود آخرت کے وقوع کی

شہادت دیتے ہیں لیکن انسان نفس کا بندہ ہوکر سب کچھ بھلا بیٹھتا ہے۔

◇ قیامت کا جونقشہ ہوگا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس دن ہر امت اللہ کے حضور گھٹنے ٹیکے حاضر ہوگی، اور ہر امت اپنے نامہ اعمال کے ساتھ پکاری جائے گی اور ہر عمل کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ (خلاصہ مضامین قرآنی)

آغاز حروف مقطعات:

یہ بات تو اب قارئین کرام جان چکے ہوں گے کہ جن سورتوں کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے ان میں سے اکثر سورتوں کی ابتداء ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے بڑے معجزہ قرآن عظیم کے ذکر سے ہوتی ہے، سورہ جاثیہ میں بھی ایسے ہی ہوا ہے۔

اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ اس کائنات میں ہر طرف اللہ تعالی کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی اتنی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں کہ ایک انسان اگر معقولیت کے ساتھ ان پر غور کرے تو اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کائنات کے خالق کو اپنی خدائی کے انتظام میں کسی شریک کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لہذا اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرا کر اس کی عبادت کرنا سراسر بے بنیاد بات ہے۔

تکوینی نشانیوں کی زندہ گواہی:

وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۟ۙ

چنانچہ قرآن کریم کی عظمت بیان کرنے کے بعد یہ سورت آیت ۴/ سے انسان کو اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ انسان خود اپنی پیدائش اور بناوٹ اور دوسرے حیوانات کی ساخت میں غور کرے تو اس کو اللہ تعالی کی ذات کا یقین دلانے کے لئے ہزار ہا نشانیاں ملیں گی۔ اسی طرح دن رات کے ادلنے بدلنے اور آسمان سے بارش کے برسنے اور پھر خشک زمین کے سرسبز وشاداب ہو جانے میں نشانیاں اس کی قدرت اور معرفت کی موجود ہیں تو انسان اگر ذرا بھی سمجھ سے کام لیں تو معلوم ہو جائے کہ یہ امور بجز اس زبردست قادر وحکیم کے اور کسی کے بس میں نہیں۔

مجرموں کے مکروہ چہرے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۟ۙ............... الی....................... وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۟ؕ

پھر ان مجرموں کے مکروہ چہرے سامنے لاتی ہے جو آیات الٰہیہ سننے کے باوجود انکار واستکبار کی راہ نہیں چھوڑتے اور یوں بن جاتے ہیں گویا انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ (۷۔۹)

نعمتوں کے بدلے بنی اسرائیل کی سرکشی:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى

الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶﴾

علاوہ ازیں یہ سورت ان نعمتوں کا بھی تذکرہ کرتی ہے جو اللہ نے بنی اسرائیل کو کتاب، حکمت، نبوت، پاکیزہ روزی اور اہل جہاں پر فضیلت اور عزت کی صورت میں عطا کی تھیں، چاہیے تو یہ تھا کہ ان نعمتوں سے سرفراز ہونے کے بعد وہ بجز اطاعت کا راستہ اختیار کرتے لیکن ہوا یہ کہ وہ بتدریج سرکشی اور معصیت کی راہ پر چل نکلے۔ (۱۶۔۱۷) (خلاصۃ القرآن)

اصول احکام ہر نبی کی امت میں یکساں رہے:

آیت ۱۸ میں فرمایا گیا:

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾

ترجمہ: پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا، سو آپ اس طریقہ پر چلے جایئے اور ان جہلاء کی خواہشوں پر نہ چلئے۔'' اس آیت کے تحت حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ''یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ دین اسلام کے کچھ تو اصول وعقائد ہیں، مثلاً توحید و آخرت وغیرہ اور کچھ عملی زندگی سے متعلق احکام ہیں۔ جہاں تک اصول احکام کا تعلق ہے وہ تو ہر نبی کی امت میں یکساں رہے ہیں اور ان میں بھی ترمیم اور تبدیلی نہیں ہوئی لیکن عملی احکام مختلف انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں اپنے اپنے زمانہ کے لحاظ سے بدلتے رہے ہیں۔ آیت مذکورہ میں انہی دوسری قسم کے احکام کو ''دین کے ایک طریقے'' سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور اسی وجہ سے فقہاء نے اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ امت محمدیہ کے لئے صرف شریعت محمدی ہی کے احکام واجب العمل ہیں۔ پچھلی امتوں کو جو احکام دیئے گئے تھے وہ ہمارے لئے اس وقت تک واجب العمل نہیں ہیں جب تک قرآن وسنت سے ان کی تائید نہ ہو جائے۔ پھر تائید کی ایک شکل تو یہ ہے کہ قرآن یا حدیث میں صراحتاً فرمایا گیا ہو کہ فلاں نبی کی امت کا یہ حکم ہمارے لئے بھی واجب العمل ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ قرآن کریم یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پچھلی امت کا کوئی حکم بطور تحسین ومدح بیان فرمائیں اور اس کے بارہ میں یہ نہ فرمائیں کہ یہ حکم ہمارے زمانہ میں منسوخ ہو گیا ہے۔ اس سے بھی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ حکم ہماری شریعت میں بھی جاری ہے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

شریعت کا معنی دین کے سلسلہ میں واضح راستہ ہوتا ہے اور لفظی معنی پانی کا گھاٹ جہاں سے انسان اور جانور اپنی پیاس بجھاتے ہیں، تاہم جان لینا چاہیے کہ شریعت، مذہب، دین، ملت اور منہاج قرآن وسنت کی اصطلاحات ہیں اور ان کو ان کے پس منظر میں ہی سمجھنا چاہیے، مذہب کا معنی راستہ اور شریعت کا معنی واضح راستہ ہے دین کا معنی اطاعت اور فرمانبرداری ہوتا ہے۔ ملت سے مراد خاص اصول ہوتے ہیں جن کی پیروی ضروری ہوتی ہے اور یہ ملت انبیاء بھی کہلاتی ہے۔ ملت ابراہیم اور ملت اسلامیہ بھی اسی کو کہا جاتا ہے۔ مفسرین اور محدثین ان چیزوں کو سمجھانے کے لیے مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں۔

بعض فرماتے ہیں انسان کے لیے تین چیزیں نہایت ضروری ہیں، سب سے پہلے عقیدے کی اصلاح ضروری ہے کہ تمام اعمال کا دارومدار اسی پر ہے، اگر عقیدہ درست ہوگا تو اعمال مقبول ہوں گے، ورنہ بیکار جائیں گے، اور عقیدے کا تعلق ایمان کے ساتھ ہے، دوسری لازمی چیز اعمال کی درستگی ہے کہ اچھے اعمال ہی انسان کے لئے مفید ہوں گے جب کہ برے اعمال وبال جان بن جائیں گے، یادرہے کہ اعمال کا تعلق اسلام کے ساتھ ہے، تیسری چیز اخلاص ہے کہ اس کی بھی اشد ضرورت ہے، دین میں ریاکاری یا باطل کی آمیزش نہ ہو، بلکہ اس میں زیادہ سے زیادہ اخلاص ہونا چاہیے اور اسی چیز کو احسان کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ (معالم العرفان: ۱۶/ ۸۴۷)

دنیا کی زندگی:

کفار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے ہوں یا موجودہ زمانے کے، ان کے کفر وانکار کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ دنیا کی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ جب کہ قرآن بار بار اس دن پر ایمان لانے کی تاکید کرتا ہے جس دن نیک اور بد ہر کسی کو اس کے اعمال کا بدلہ مل کر رہے گا۔

قرآن کے مختلف انداز:

قرآن کا انداز کہیں حاکمانہ اور کہیں ناصحانہ ہوتا ہے، کہیں خبر کا اسلوب ہوتا ہے اور کہیں انشاء کا، کہیں سوال وجواب کا ہوتا ہے اور کہیں یوں منظر کشی کی جاتی ہے گویا قرآن پڑھنے والا اس دنیا میں قیامت کے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

سورت کے آخر میں قیامت کی منظر کشی:

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

اس سورت کے آخر میں اس دن یعنی قیامت کی منظر کشی بڑے عجیب انداز سے کی گئی ہے کہ قیامت قائم ہو چکی ہے، حشر کا میدان ہے، لوگ خوف کے مارے گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہیں، اللہ تعالی بندوں سے مخاطب ہیں، کہا جارہا ہے کہ تم نے قیامت کو بھلا دیا تھا، آج تمہیں بھلا دیا گیا ہے، تم آیات الٰہیہ کا مذاق اڑایا کرتے تھے آج تم خود مذاق بن کر رہ گئے ہو۔ (۲۸ـ۳۵) (خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ: ......دعوت الی القرآن۔

تفصیل موضوع: ......اتباع کتاب اللہ میں عزت محدود ہے۔

خلاصہ رکوع: ۱......ترک اتباع کتاب اللہ سے ذلت لازمی ہے۔ ماخذ: آیت: ۷ تا۱۱۔

خلاصہ رکوع: ۲...... جو شریعت (بذریعہ قرآن) آپ کو ملی ہے، آپ اس کا اتباع کریں، ان کفار کی خواہشات کا لحاظ نہ کریں۔ ماخذ: آیت: ۱۸۔

خلاصہ رکوع: ۳......ترک اتباع کتاب اللہ سے فطرت سلیمہ سلب ہو جاتی ہے۔ ماخذ: آیت: ۲۳۔

خلاصہ رکوع : ۴...... آیات الٰہی پر استہزاء کرنے والے قیامت کے دن رحمت الٰہی سے محروم ہوں گے اور دوزخ میں داخل کئے جائیں گے۔ ماخذ: آیت : ۳۴،۳۵۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

پچیسویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) جو شخص اللہ کے سوا کسی اور کو ولی بنائے تو ہلاک ہو جائے گا اور جس نے اللہ کو ولی بنایا سب کو چھوڑ کر تو اللہ دنیا وآخرت کے تمام امور میں اس کو کافی ہو جائے گا۔

(۲) اس بات پر ایمان رکھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ''رزاق'' ہے، اس کے ہاتھ میں رزق کے خزانوں کی چابیاں ہیں۔ پس جس پر چاہے وسعت کر دے اور جس پر چاہے تنگی کر دے۔

(۳) اللہ کا دین ایک ہے اور وہ یہ کہ ایمان رکھنا اور ثابت قدم رہنا اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر۔

(۴) نیت کی اصلاح ضروری ہے اس لئے کہ عمل کی قبولیت اور عدم قبولیت کا مدار اس پر ہے۔

(۵) قرآن کریم کا معجزہ ہے کہ اس نے چودہ سو سال پہلے اس بات کا اعلان کیا کہ ہر چیز کا جوڑا ہے حتیٰ کہ ایک ''ذرہ'' کا بھی جوڑا موجود ہے۔

(۶) سواری پر سوار ہوتے وقت سواری کی دعا کا اہتمام ضرور کرنا چاہئے کہ اس میں (۱) سنت کی اتباع بھی ہے۔ (۲) اللہ کا شکر بھی ہے (۳) اور اپنی حفاظت کی دعا بھی ہے۔

(۷) اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی بات کی نسبت کرنا جو اس نے نہ کی ہو حرام ہے۔

(۸) آدمی کی عقل کا کمال یہ ہے کہ وہ ہدایت کی اتباع کرے اگرچہ اس کی قوم اور دیگر اس کی مخالفت کریں۔

(۹) ظالمین کے مقابلے میں اللہ سے مدد طلب کرنا اور ان سے نجات کی دعا کرنا انبیاء کی سنت ہے۔

(۱۰) قرآن کریم نور ہے بلکہ سب سے بڑا نور ہے پس جس نے اس کے ذریعے ہدایت حاصل نہیں کی وہ ہدایت نہیں پا سکتا۔

***

پارہ:۲۶

سورۂ احقاف

اس سورت کی آیت نمبر ۲۹ اور ۳۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس وقت نازل ہوئی تھی جب جنات کی ایک جماعت نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم سنا تھا، معتبر روایات کے مطابق یہ واقعہ ہجرت سے پہلے اس وقت پیش آیا تھا جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم طائف سے واپس تشریف لا رہے تھے اور نخلہ کے مقام پر فجر کی نماز میں قرآن کریم کی تلاوت فرمارہے تھے، دوسری مکی سورتوں کی طرح اس سورت میں بھی اسلام کے بنیادی عقائد یعنی توحید، رسالت اور آخرت کو دلائل کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے، اسی زمانہ میں اس قسم کے واقعات پیش آرہے تھے کہ ایک ہی گھرانے میں والدین مسلمان ہوگئے اور اولاد مسلمان نہیں ہوئی، اور اس نے اپنے والدین کو ملامت شروع کردی کہ وہ کیوں اسلام لائے، اس کے برعکس بعض گھرانوں میں اولاد مسلمان ہوگئی اور والدین مسلمان نہیں ہوئے، اور انہوں نے اولاد پر تشدد شروع کردیا، اس سورت کی آیات ۱۶، ۱۷ میں اسی قسم کی صورت حال کا تذکرہ کیا گیا ہے، اور اسی پس منظر میں اولاد پر ماں باپ کے حقوق بیان فرمائے گئے ہیں، اس کے علاوہ ماضی میں جن قوموں نے کفر اور نافرمانی کی روش اختیار کی ان کے برے انجام کا حوالہ دیا گیا ہے، اور قوم عاد کا خاص طور پر ذکر فرمایا گیا ہے، جس جگہ یہ قوم آباد تھی وہاں بہت سے ریت کے ٹیلے تھے جنہیں عربی زبان میں احقاف کہا جاتا ہے، اسی مناسبت سے اس سورت کا نام احقاف ہے۔ (توضیح القرآن)

جن حالات میں یہ سورت نازل ہوئی، اس پس منظر کو سامنے رکھ کر جب سورت کے مضامین کا مطالعہ کریں گے تو یہ بات بالکل بدیہی طور پر نظر آئے گی کہ یہ بلا شبہ اللہ کا کلام ہے۔ کیونکہ اول سے آخر تک پوری سورت میں ان انسانی جذبات و تاثرات کا ہلکا سا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا جو ان حالات سے گزرنے والے انسان میں فطری طور پر پیدا ہوجاتے ہیں۔

سورت کا مرکزی موضوع کفار کو ان گمراہیوں کے نتائج سے آگاہ کرنا ہے جن میں نہ صرف وہ مبتلا تھے بلکہ ان پر جمے ہوئے تھے۔ کافروں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اگر عقل و دلیل سے حقیقت کو سمجھنے کے بجائے تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام لیا گیا تو بہت برے انجام سے دوچار ہوں گے۔ (قرآن ایک نظر میں)

یہ قرآن کریم کی ۴۶ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۲۶ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۴ رکوع، ۳۵ آیات ۷۵۰ کلمات، ۳۷۰۹ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے تیسرے رکوع کی ابتداء میں لفظ احقاف آیا ہے احقاف حقف کی جمع ہے، اس کے لفظی معنی ہیں ریت

کے لمبے لمبے بلند ٹیلے، لیکن اصطلاحاً یہ صحرائے عرب کے جنوبی مغربی حصہ کا نام ہے جہاں اس وقت کوئی آبادی نہیں اور بجز ریت کے ٹیلوں کے اور کچھ نظر نہیں آتا، لیکن قدیم زمانہ میں یہاں قوم عاد آباد تھی جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا اور جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کی نافرمانی کی پاداش میں آندھی کا عذاب بھیج کر نیست و نابود کر دیا تھا، چونکہ اس سورۃ میں اس بڑے حادثہ کا ذکر ہے، اس لئے اس سورۃ کا نام احقاف مقرر رہوا۔

ربط:

سورۂ احقاف کا سورہ جاثیہ کے ساتھ ربط یہ ہے کہ سورہ جاثیہ کے شروع میں توحید و معاد کا ذکر ہے بایں طور کہ معاد کا ذکر مفصل ہے اور توحید کا مجمل ہے اور سورۃ احقاف کے آخر میں بھی توحید و معاد کا ذکر ہے مگر توحید کا ذکر مفصل ہے اور معاد کا اجمالاً ہے، یہی دونوں میں وجہ رابط ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کا زمانہ نزول نبوت کے دسویں سال کا آخر یا گیارہویں سال کی ابتداء بیان کیا گیا ہے جو اس تاریخی واقعہ سے متعین ہوتا ہے، جو اس سورۃ کے آخری رکوع میں جنات کے آنے اور قرآن سن کر اس سے متاثر ہونے کا واقعہ ذکر فرمایا گیا۔

حدیث اور سیرۃ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ یعنی جنات کی ایک جماعت کا حاضر ہونا اور قرآن کو سن کر اس سے متاثر ہونا اور اپنی قوم جنات میں جا کر ایمان و اسلام کی تبلیغ کرنا اس وقت پیش آیا تھا جب کہ حضور ﷺ اپنے قیام مکہ کے زمانہ میں طائف بغرض تبلیغ و دعوت اسلام تشریف لے گئے تھے اور بظاہر وہاں سے ناکامی وخستہ دلی کے ساتھ واپس تشریف لا رہے تھے، رات کے وقت نخلہ کے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا تھا اور صبح کی نماز میں بآواز بلند قرآن پڑھ رہے تھے کہ جنات کی ایک جماعت کا ادھر سے گزر ہوا اور وہ قرآن سننے لگے، واقعہ کی تفصیل سورہ جن پارہ ۲۹ میں ہے اور تمام معتبر تاریخی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طائف جانا مکہ سے ہجرت سے تین سال پہلے کا واقعہ ہے، جس سے اس سورۃ کے نزول کا زمانہ متعین ہو جاتا ہے اور وہ وہ سال ہے جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام الحزن (غم کا سال) فرمایا ہے، چونکہ اس سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عبدالمطلب اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت خدیجہ کا انتقال ہوا، اس سورۃ میں بتلایا گیا کہ یہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے جو بڑی عزت وقوت اور حکمت والا ہے اور جس نے یہ زمین آسمان اور کل جہاں ایک منظم نظام کے تحت پیدا فرمایا ہے اور ایک معین مدت تک یہ نظام چلتا رہے گا اور بالآخر ایک دن ختم ہو کر قیامت قائم ہوگی، اس دن کفار و مشرکین کا برا حال ہوگا اور قیامت کے دن جھوٹے معبودان کے دشمن ہوں گے اور کہیں گے کہ تم نے ہماری عبادت ہی نہیں کی، پھر بتلایا گیا کہ منکرین قرآن کو سن کر اور اس کے اثرات کو دیکھ کر اسے جادو یا گھڑا ہوا کلام کہتے ہیں، اس کا جواب ارشاد فرمایا گیا کہ آپ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیجئے کہ اگر میں ایسا کرتا تو مجھے اللہ کی گرفت سے نہ تم بچا سکتے نہ کوئی اور، میں کوئی انوکھا رسول نہیں

ہوں۔ میں پہلے ہی رسولوں کی طرح ہوں اور وحی کے مطابق احکام پہنچاتا ہوں، بعض اہل کتاب اپنی کتابوں کی پیشین گوئی کے مطابق مجھے اللہ کا رسول مان چکے ہیں اور ایمان لا چکے ہیں، اگر اب بھی تم مجھے اللہ کا رسول نہ مانو تو تم بڑے ہٹ دھرم اور ضدی ہو۔ پھر فرمایا گیا کہ قرآن لوگوں کی ہدایت کے لئے عربی زبان میں نازل ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جو دنیا میں اللہ کو اپنا رب مان کر اس پر جمے رہیں گے وہ آخرت میں خوف و غم سے نجات پائیں گے، پھر فرمایا گیا کہ سعادت مند وہ ہیں جو دنیا میں اللہ اور والدین کا حق ادا کرنے میں لگے رہتے ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ انہیں نیک کاموں کی توفیق عطاء فرمائے اور بدبخت وہ ہیں جو اللہ کو نہیں مانتے اور ماں باپ کے ساتھ بھی سخت کلامی کرتے ہیں، ایسے لوگ بڑے خسارہ اور نقصان میں ہیں۔ اس کے بعد مشرکین عرب اور کفار مکہ کو قوم عاد کے حالات سے عبرت دلائی گئی ہے کہ وہ قوت میں تم سے زبردست تھے، مگر اللہ کی نافرمانی کے سبب تباہ ہوئے اور خدا کے عذاب کے سامنے کسی کی نہ چل سکی، اس کے بعد قوم جنات پر قرآن کا اثر ہونے کا ذکر فرمایا اور انسان کو سمجھایا گیا کہ وہ اللہ کو مانے، قیامت کو برحق سمجھے، ورنہ آخرت میں سخت سزا کا مستحق ہوگا اور یہ قرآن کا پیغام ہے جو اس کو نہیں مانے گا آخر تباہ ہوگا۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورت کی ابتداء:

سورت کی ابتدا ہوتی ہے قرآن کریم کی حقانیت، توحید اور حشر کے دلائل اور ان بتوں کی مذمت سے جنہیں مشرکوں نے معبود بنا رکھا تھا، حالانکہ وہ نہ سنتے تھے، نہ دیکھتے تھے، نہ نفع اور نقصان ان کے اختیار میں تھا اور نہ ہی وہ پرستش کرنے والوں کی دعائیں قبول کر سکتے تھے۔ (۲۔۶)

مشرکین کے شبہات واعتراضات:

مشرکین کے سامنے جب قرآن پڑھا جاتا تھا تو وہ اس پر مختلف شبہات اور اعتراضات وارد کرتے تھے، وہ بھی تو اسے سحر کہتے تھے اور کبھی آپ کا خود تراشیدہ کلام قرار دیتے تھے، اور کبھی ایمان والوں کے بارے میں کہتے تھے کہ اگر ایمان کوئی اچھی چیز ہوتا تو یہ فقیر، غریب اور مزدور لوگ ایمان قبول کرنے میں ہم سے سبقت نہ لے جاتے۔ مشرکین کے اعتراضات ذکر کرنے کے بعد ان کے مسکت جوابات دیئے گئے ہیں۔ (۷۔۱۲)

مشرکین کی کئی قسم:

آیت: ۶ رمیں ذکر فرمایا:

وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ۝۶

ترجمہ: اور جب لوگوں کو محشر میں جمع کیا جائے گا تو وہ ان کے دشمن بن جائیں گے اور ان کی عبادت ہی سے منکر ہوں گے۔

اس آیت کے تحت مفسرین نے لکھا ہے کہ مشرکین کئی قسم کے ہوتے ہیں، بعض مشرکین نے کچھ دنیا سے گزرے ہوئے انسانوں کو معبود بنا رکھا ہے۔ ان انسانوں کو بسا اوقات یہ پتہ نہیں ہوتا کہ ان کی عبادت کی جا رہی ہے، اس لئے وہ

انکار کردیں گے اور جن کو پتہ ہے وہ یہ کہیں گے کہ درحقیقت یہ ہماری نہیں بلکہ اپنی نفسانی خواہشات کی عبادت کرتے تھے۔

دوسرے بعض مشرکین وہ ہیں جو فرشتوں کو معبود بنائے ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں سورۂ سباء میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ان سے پوچھیں گے کہ کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے؟ تو وہ کہیں گے کہ یہ تو جنات اور شیاطین کی عبادت کیا کرتے تھے، کیونکہ انہوں نے ہی انہیں بہکایا تھا۔ مشرکین کی تیسری قسم وہ ہے جو پتھر کے بتوں کو پوجتی ہے۔ بعض روایات میں یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مشرکین کو دکھانے کے لئے ان بتوں کو بھی زبان دے دیں گے اور چونکہ وہ دنیا میں بے جان پتھر تھے، اس لئے انہیں واقعی یہ پتہ نہیں ہوگا کہ مشرکین ان کی عبادت کرتے تھے، اس لئے وہ بھی یہی کہیں گے کہ یہ لوگ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے یا یہی بات زبانِ حال سے کہیں گے کہ ہم تو بے جان پتھر ہیں، ہمیں کیا پتہ کہ ہماری عبادت کی جاتی تھی۔ (روح المعانی)

فرمانبردار اور نافرمان اولاد کا فرق:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ .... الیٰ .... فَيَقُولُ مَا هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿١٧﴾

سورۂ احقاف آیت ۱۵ تا ۱۷ فرمانبردار اور نافرمان اولاد کا فرق واضح کرتی ہے کہ نیک بیٹا جس کا دل نورِ ایمان سے منور ہے اور اس کے قدم جادۂ شریعت پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں، جب اس کے والدین اسے پال پوس کر جوان کر دیتے ہیں، وہ جسمانی اور عقلی اعتبار سے حدِ کمال کو پہنچ جاتا ہے تو وہ اللہ سے تین دعائیں کرتا ہے۔

◇ پہلی یہ کہ اے اللہ! تو مجھے نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرما۔

◇ دوسری یہ کہ ایسے اعمال کا کرنا میرے لئے آسان کر دیں جن سے آپ راضی ہو جائیں۔

◇ تیسری یہ کہ میری اولاد کو نیک بنا دیں۔ ایسی اولاد کے لئے اللہ کی طرف سے جنت کا وعدہ ہے۔

اور نافرمان بیٹا جس کے والدین اسے ایمان قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں تو وہ جواب میں بڑے تکبر سے کہتا ہے ''اف اف! تم مجھے یہ بتاتے ہو کہ مجھے زمین سے زندہ کر کے نکالا جائے گا، حالانکہ بہت سے لوگ مجھ سے پہلے گزر چکے ہیں'' ان میں سے تو کسی کو میرے سامنے زندہ نہیں کیا گیا، ایسی اولاد کو قیامت کے دن اپنے اعمال کا بدلہ جہنم کی صورت میں مل کر رہے گا۔

قومِ عاد کا قصہ:

وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ ۖ إِذْ أَنْذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ ....

آیت ۲۱ / سے سورۂ احقاف قومِ عاد کا قصہ بیان کرتی ہے جنہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کو جھٹلایا، جس کے نتیجے

میں انہیں تباہ و برباد کر دیا گیا، انہیں عذاب دینے کے لئے بادل بھیجا گیا، چونکہ کئی دنوں سے شدید گرمی پڑ رہی تھی، اس لئے وہ بادل دیکھ کر خوش ہو گئے اور انہیں یقین آ گیا کہ آج تو موسلا دھار بارش ہو گی۔ وہ خوشی کے مارے گھروں سے باہر نکل آئے، اس بادل کے نمودار ہوتے ہی تیز اور طوفانی ہوا چلنے لگی۔ قوم عاد کے لوگ بڑے قد آور اور جسیم تھے، ہوا نے انہیں اپنے دوش پر اٹھایا اور فضا میں لے گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کیڑے مکوڑے اڑ رہے ہیں، پھر انہیں زمین پر پٹخ دیا، وہ زمین پر مردار پڑے یوں محسوس ہوتے تھے گویا کھجور کے کھوکھلے تنے پڑے ہوئے ہیں۔ قوم عاد کا واقعہ سنا کر اہل مکہ کو ڈرایا گیا ہے کہ تم ان سے زیادہ طاقتور نہیں ہو، اگر سرکشی اختیار کرو گے تو تم بھی عذاب الٰہی کی لپیٹ میں آ کر رہو گے۔

سورت کا اختتام:

سورت کے اختتام پر بتایا گیا ہے کہ جو اللہ ارض و سماء کو پیدا کرنے پر قادر ہے وہ مردوں کو بھی دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔ اور آخری آیت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ اولوالعزم انبیاء کی طرح صبر کریں، صبر کا انجام ہمیشہ اچھا ہی ہوتا ہے۔ (خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:...... دعوت کے بعد مہلت ملنا سنت اللہ میں داخل ہے۔

خلاصہ رکوع:۱...... ہر چیز کی اجل معین ہے، لہٰذا کفار کے اعراض پر ان کی تباہی کی بھی ایک مدت معین ہے۔ ماخذ: آیت: ۳، ۶۔

خلاصہ رکوع:۲...... اعراض کے بعد مہلت کا ملنا سنت اللہ میں داخل ہے۔ ماخذ: آیت: ۲۰۔

خلاصہ رکوع:۳...... ذکر قوم عاد بطور تذکیر بایام اللہ (انذار منذر سے انکار کے باعث عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں)۔ ماخذ: آیت: ۲۳، ۲۱۔

خلاصہ رکوع:۴...... اعراض عن الکتاب کے وقت عذاب الٰہی سے بچنا ناممکن ہے، البتہ مہلت سنت اللہ میں داخل ہے۔ ماخذ: آیت: ۲۷، ۳۴، ۲۸، ۳۵۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ محمد

یہ سورت مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں، اور بیشتر مفسرین کی رائے میں جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی، یہ وہ وقت تھا جب عرب کے کفار مدینہ منورہ کی ابھرتی ہوئی اسلامی حکومت کو کسی نہ کسی طرح زیر کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے، اور اس پر حملے کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے، اس لئے اس سورت میں بنیادی طور پر جہاد و قتال کے احکام بیان فرمائے گئے ہیں، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کا کلمہ بلند رکھنے کے لئے جہاد کرتے ہیں، ان کی فضیلت بیان فرمائی گئی ہے، مدینہ منورہ میں ایک بڑی تعداد ان منافقوں کی تھی جو زبان سے تو اسلام لے آئے تھے، لیکن دل سے وہ کافر تھے، ایسے لوگوں

کے سامنے جب جہاد اور لڑائی کی بات کی جاتی تو اپنی بزدلی اور دل کے کھوٹ کی وجہ سے لڑائی سے بچنے کے بہانے تلاش کرتے تھے، اس سورت میں ان کی مذمت کر کے ان کا برا انجام بتایا گیا ہے، جنگ کے دوران جو قیدی گرفتار ہوں ان کے احکام بھی اس سورت میں بیان ہوئے ہیں، چونکہ اس سورت کی دوسری ہی آیت میں حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک نام لیا گیا ہے، اس لئے اس کا نام سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے، چونکہ اس میں جہاد و قتال کے احکام بیان فرمائے گئے ہیں اس لئے اس کو سورۂ قتال بھی کہا جاتا ہے۔ (توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی ۴۷ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا شمار ۹۵ ہے، اس سورۃ میں ۴ رکوع، ۳۸ آیات، ۵۵۸ کلمات اور ۲۴۷۵ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے شروع ہی میں ایمان والوں کے متعلق بتلایا گیا۔ ''و آمنوا بما نزل علی محمد'' کہ وہ ان سب چیزوں پر ایمان لائے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا، اس لئے بطور علامت اس سورۃ کا نام سورۃ محمد رکھا گیا۔ اس سورہ کا دوسرا نام سورۃ قتال بھی ہے۔

ربط:

سورۂ محمد کا سورۃ احقاف کے ساتھ ربط یہ ہے کہ سورۂ احقاف کے آخر میں فاسقین یعنی کفار کی مذمت مذکور تھی اور اس سے پہلے مؤمنین کی فضیلت اور کفار کی مذمت کا ذکر تھا۔ اس سورۃ کے شروع میں بھی یہی مدح و ذم مذکور ہے، اس سے تناسب و ربط ظاہر ہے۔

خلاصۂ سورۃ:

اس سورۃ کے خاص مضامین یہ ہیں (۱) اسلام کی مخالفت کرنے والے اور دین الٰہی کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کرنے والے دشمنان حق سے جہاد و قتال کی اجازت اس سورۃ میں دی گئی ہے۔ (۲) جہاد و قتال سے متعلق اصولی ہدایات و احکام کا بیان اس سورۃ میں فرمایا گیا ہے۔ (۳) منافقین اور ان کی ریشہ دوانیوں کی نشاندہی فرمائی گئی ہے۔ (۴) اطاعت الٰہی اور اتباع رسول کی تاکید کی گئی ہے۔ (۵) زندگی کی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔ (۶) بخل کی مذمت اور اللہ کے راستے میں خرچ کا حکم دیا گیا ہے۔ (۷) کفار و مشرکین کی دنیا و آخرت میں نامراد ہونے کی پیشین گوئی دی گئی ہے۔ اور مسلمانوں کی انجام کار کامیابی کی بشارت سنائی گئی ہے۔ سورۃ کی ابتداء بایں طور فرمائی گئی کہ جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب اور اس کے دین کا دنیا میں انکار کر دیا وہ اپنے گمان میں چاہے جس قدر نیک کام کریں لیکن اللہ کے یہاں آخرت میں وہ سب بیکار رہیں۔ ہاں جو لوگ اللہ کو مان کر اور قرآن کو سچا جان کر نیک کام کریں گے اور قرآن کو اپنا رہنما قرار دیں گے ان کی دنیا و آخرت دونوں سنور جائیں گے۔ پھر اہل اسلام کو حکم دیا جاتا ہے کہ اگر کافر اپنی شرارتوں

سے باز نہ آئے اوران سے قتال کی نوبت آئی تو ہمت اور بہادری سے کام لینا اوران کی گردنیں اڑا دینا، ان کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرنا، چونکہ دنیا سے فساد اور فسادیوں کا مٹانا اور امن وامان قائم کرنا ضروری ہے اور جب فسادی پست ہو جائیں اورلڑائی رک جائے تو پسماندہ فسادیوں کو قید کرلو۔ اس کے بعد حسب مصلحت ان کے ساتھ سلوک کرو، اگر چھوڑ دینے میں مصلحت ہوتو یونہی چھوڑ دو ورنہ ان سے کچھ معاوضہ لے لو۔ یوں تو اللہ تعالی فسادیوں کو بھی تباہ کرسکتا تھا لیکن چونکہ بندوں کی آزمائش مقصود ہے اس لئے ان سے لڑنے کا حکم دیا، تاکہ دین اسلام پر ثابت قدم رہنے والوں کو انعام واکرام سے نوازا جائے اور جو شخص اللہ کے لئے لڑتا ہوا مارا جائے اس کو اس کی قربانی کی پوری پوری جزادی جائے گی۔ پھر ایمان والوں کو نصیحت کی گئی کہ اے ایمان والو! تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اس کے بعد کفار کو تنبیہ کی گئی کہ ان کو پہلے زمانہ کے کافروں کے حالات سے عبرت حاصل کرنی چاہئے، وہ لوگ ان منکرین سے بہت زیادہ زبردست اور قوی تھے لیکن ان کے اعمال کی شامت میں اللہ نے انہیں ہلاک کر دیا، جب وہی نہیں بچے تو یہ کیا بچیں گے، پھر منافقوں کی قلعی کھولی گئی کہ جب ان کو کفار سے لڑنے کا حکم دیا تو بزدلی دکھانے لگے اور جان چرانے لگے، مزید ان کے متعلق فرمایا گیا کہ یہ اپنی خواہشوں کے غلام ہیں اور سیدھی راہ سے بہت دور ہیں، ان کی آنکھیں قیامت کے دن کھلیں گی مگر اس وقت کی بیداری سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اخیر میں اہل اسلام کو ہدایت کی جاتی ہے کہ تم توحید کو مضبوط پکڑ واور اپنے لئے نیز دوسرے ایمان والوں کے لئے بخشش کی دعاء کرتے رہو۔ اسلام کا سیدھا راستہ سچے دل سے اختیار کرو، اللہ اور اس کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بجالاؤ اور تمام ارکان اسلام مثلاً زکوۃ وغیرہ پر عمل کرو، اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرو، ایسا کرنے میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ اور اگر اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرنے سے جی چراؤ گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے اللہ کو تمہارے مال کی ضرورت نہیں، وہ احتیاج سے پاک ہے البتہ تم ہر طرح اللہ کے محتاج ہو، اگر تم حکم ماننے سے انکار کرو گے تو اللہ تعالی تمہارے بدلہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا جو تمہاری طرح نافرمانی نہیں کرے گی۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت میں دشمنوں سے مقابلہ کی تفصیل ہے۔ تو سورت کے مقصد کا جنگ سے کیا تعلق؟ پس معلوم ہونا چاہیے کہ سب سے مشکل کام جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو ماننا پڑتا ہے تو دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر دشمنوں سے جنگ کر کے ان کی سازشوں کو ناکام بنانا ہے۔ اور اس عین وقت پر امتحان ہو جاتا ہے کہ کتنی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کے لائے دین سے محبت ہے یا وہ صرف منھ سے بڑی بڑی باتیں کرتا ہے، آیت نمبر ۲۰ میں منافقوں کی حالت پیش کی ہے کہ جب قتال (جہاد) کا حکم آتا ہے تو منافق آپ کی طرف غشی والے کی طرح دیکھتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری اطاعت کرنی چاہیے، خواہ میدان جنگ میں جانا ہو یا اپنی خواہشات کو تقویٰ پر قربان کرنا ہو یا جب صدقہ دینے کا حکم دیا جائے تو بخل نہ کرنا چاہیے۔ بس اپنی مٹھی کھولو اور دو؛ کیونکہ اس میں اسی کا فائدہ ہوگا اور نہیں دے گا تو خود اس کا نقصان ہوگا۔ (۳۸)

اس کے ساتھ ساتھ تنبیہی پیغام دیا کہ اللہ پاک و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کو ماننے سے اعراض کرو گے تو اللہ پاک تمہاری جگہ دوسری قوم کو لا کھڑا کرے گا، وہ تم جیسے نہیں ہوں گے۔ (خواطر قرآنیہ)

آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی:

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی قرآن کریم کی صرف چار سورتوں میں مذکور ہے۔ آل عمران، احزاب، محمد اور سورۂ فتح... ان چار مواقع کے علاوہ باقی تمام مقامات پر آپ کی کوئی نہ کوئی صفت بیان ہوئی ہے۔

اس سورت کا موضوع حقیقت میں جہاد و قتال ہے۔

کفار اور مومنین کے درمیان فرق:

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۱ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝۲ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝۳

اس سورت کی دوسری آیت میں دو مرتبہ ''اٰمنوا'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگرچہ پہلے جملے میں ایمان اور عمل صالح کا ذکر آ چکا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور آپ پر نازل ہونے والی وحی بھی شامل ہے، مگر اس دوسرے جملے میں اس کو بالتصریح ذکر کرنے میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ ایمان کی اصل بنیاد اس پر ہے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو صدق دل سے قبول کیا جائے۔

بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میری امت جنت میں جائے گی مگر جو انکار کرے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ کون ہے جو آپ کا انکار کرتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا، جس نے نافرمانی کی اس نے مجھے نہ مانا اور میرا انکار کیا۔

صاف معلوم ہوا کہ حقیقت ایمان کی اطاعت کے ساتھ ہے اور ایمان کی اصل بنیاد اس پر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اور قرآن کریم کی تمام تعلیمات کو صدق دل سے قبول کیا جائے اور اس پر مکمل عمل کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسا ہی ایمان نصیب فرمائے۔

جب انسانوں میں ان دو گروہوں یعنی فرمانبردار اور نافرمان کا وجود ہوگا تو ان کے درمیان کشمکش بھی ہوگی ٹکراؤ بھی ہوگا۔ آیت ۴/ سے جہاد کے احکامات شروع ہو رہے ہیں اور اس کے تحت کئی احکامات دیئے گئے ہیں۔ پہلا حکم یہ دیا گیا کہ جب تم کافروں سے ٹکراؤ تو ان کی گردنیں اڑا دو یہاں تک کہ جب ان کو خوب قتل کر چکو تو (جو باقی بچیں انہیں) مضبوطی سے قید کر لو۔

جنگی قیدیوں کے احکام:

پھر ان قیدیوں کے بارے میں چار احکامات دیئے گئے۔

(۱) ان قیدیوں کو بطور احسان بھی آزاد کیا جاسکتا ہے۔

(۲) فدیہ لے کر بھی چھوڑا جاسکتا ہے۔

(۳) اپنے قیدیوں کے ساتھ تبادلہ کرلیا جائے۔

(۴) انہیں غلام اور لونڈی بنالیا جائے۔

لیکن لونڈی اور غلام بنانا فرض یا واجب کا درجہ نہیں رکھتا بلکہ ایک انتظامی اور امکانی صورت ہے جسے بوقت ضرورت اختیار کیا جاسکتا ہے۔

جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا رواج:

جس وقت جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانے کی اجازت دی گئی اس وقت پوری دنیا میں نہ صرف یہ کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنا لینے کا رواج تھا بلکہ ظالم لوگ ایسے آزاد انسانوں کو بھی غلام بنا لیتے تھے جن کا کوئی وارث یا طاقتور خاندان نہیں ہوتا تھا۔ یہ مظلوم طبقہ کسی بھی قسم کے انسانی حقوق سے محروم تھا، اسلام نے ان کے حقوق متعین کئے، انہیں آزاد کرنے کے فضائل بتائے اور ان کے خون کو حرمت بخشی۔

اسلام کے حقوق دینے ہی کا نتیجہ:

یہ اسلام کے حقوق دینے ہی کا نتیجہ تھا کہ تاریخ اسلام میں ایسے بے شمار غلاموں کا تذکرہ ملتا ہے جن میں سے کوئی مفسر تھا اور کوئی محدث، کوئی فاتح اور کوئی وزیر اور فرمانروا۔

مسلمانوں نے کبھی بھی ان کی سابقہ غلامی کی وجہ سے انہیں حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا۔

غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا:

صدقہ خیرات کے دوسرے مصارف کی طرح مسلمانوں نے ایک اہم مصرف غلاموں کے ساتھ تعاون اور انہیں خرید کر آزاد کرنے کا بھی طے کر رکھا تھا۔ قرون اولی کے مسلمان گردنوں کو آزاد کرنے اور کرانے میں کتنی دلچسپی رکھتے تھے اس کا اندازہ بعض صحابہ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد سے ہوتا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ، حضرت عباس، حضرت حکیم بن حزام، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عثمان غنی، حضرت ذوالکلاع حمیری اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم یعنی صرف سات صحابہ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ۳۹۲۰۰ تعداد بنتی ہے۔

دین کی مدد کرنے کے فوائد:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ

وَاَضَلَّ اَعۡمَالَهُمۡ ۞

سورۂ محمد کی آیت ۷ سے ارشادفرمایا گیا ہے کہ: اے ایمان والو! تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مددفرمائیں گے اورتمہارے قدم جمادیں گے اوراگر دین کی مدد نہیں کرو گے تو دنیامیں چل پھر کر مجرمین کا انجام دیکھ لو، کتنی بستیاں تم سے زیادہ جاہ وحشمت اور طاقت وقوت والی تھیں۔ہم نے جب انہیں ہلاک کیا تو کوئی ان کی مدد کو بھی نہ آسکا۔(خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

جنت کی ایک جھلک:

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیۡ وُعِدَ الْمُتَّقُوۡنَ ؕ فِیۡهَاۤ اَنۡهٰرٌ مِّنۡ مَّآءٍ غَیۡرِ اٰسِنٍ........الیٰ.......... هُوَخَالِدٌ فِی النَّارِ وَسُقُوۡا مَآءً حَمِیۡمًا فَقَطَّعَ اَمۡعَآءَهُمۡ ۞

متقی لوگوں سے جس جنت کا وعدہ کیا گیا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اس میں ایسے پانی کی نہریں ہیں جوخراب ہونے والا نہیں، ایسے دودھ کی نہریں ہیں جس کا ذائقہ نہیں بدلے گا، ایسی شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے سراپا لذت ہوگی، اور ایسے شہد کی نہریں ہیں جو نتھرا ہوا ہوگا، اور ان جنتیوں کے لیے وہاں ہر قسم کے پھل ہوں گے، اور ان کے پروردگار کی طرف سے مغفرت! کیا یہ لوگ ان جیسے ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، اور انہیں گرم پانی پلایا جائے گا، چنانچہ وہ ان کی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردے گا۔(۱۵)

ایمان والوں کے مقابلے میں منافقوں کا حال بھی بتایا گیا ہے، آیات قتال سن کر ایمان والوں کی قوت ایمانی میں اضافہ ہوجاتا ہے جب کہ منافقوں پر موت کی سی بے ہوشی طاری ہوجاتی ہے۔(۲۰)(خلاصۃ القرآن)

وعید کا انداز:

جہاد وقتال اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دیتے ہوئے آخر میں گویا وعید کے انداز میں کہا گیا ہے:

وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ ۞

اور اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئے گا اور وہ تمہاری طرح کے نہیں ہوں گے۔''(۳۸)

احادیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب یہ آخری آیت تلاوت فرمائی ''**وان تتولو ایستبدل قوما غیر کم ثم لا یکونو أمثالکم**''(اور اگر تم روگردانی کرو گے تو خدا تعالی تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کردے گا، پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے،تو یہ آیت سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کون لوگ ہیں کہ جو ہمارے بدلے لائے جاتے اور ہم جیسے نہ ہوتے؟ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر ہاتھ رکھ کرفرمایا ''اس کی قوم'' اور فرمایا خدا کی قسم اگر ایمان ثریا پر جا پہنچے تو فارس کے لوگ وہاں سے بھی اس کو اتار لائیں گے۔

علماء نے لکھا ہے کہ حدیث کی اس بشارت عظمی کے کامل اور اولین مصداق امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ہی ہیں۔(خلاصۃ القرآن،

خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:......تقابل الاسلام بالکفر والنفاق۔

خلاصہ رکوع:۱......تقابل الاسلام بالکفر۔ماخذ: کفر،آیت: ۳،۱، ۸، ۹، ۱۱۔ماخذ: اسلام،آیت: ۴، ۳، ۲، ۵، ۱۱۔

خلاصہ رکوع: ۲......تقابل الاسلام بالکفر۔ماخذ: کفر،آیت: ۱۴، ۱۲، ۱۵، ۱۶۔اسلام،آیت: ۱۴، ۱۲، ۱۵، ۱۷۔

خلاصہ رکوع: ۳......تقابل الاسلام بالکفر والنفاق۔ماخذ: کفر،آیت: ۲۰۔اسلام،آیت: ۲۰۔

خلاصہ رکوع: ۴......تقابل الاسلام بالکفر والنفاق۔ماخذ: کفر،آیت: ۳۴۔اسلام،آیت: ۳۵۔(مخزن المرجان فی

خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ فتح

یہ قرآن کریم کی ۴۸ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۱۱۱ نمبر پر ہے۔اس سورۃ میں ۴ رکوع، ۲۹ آیات، ۵۸۷ کلمات اور ۲۵۵۵ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی پہلی ہی آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک فتح کی بشارت دی گئی ہے، اس لئے اس سورۃ کا نام ہی سورۃ الفتح مقرر ہوا۔

ربط:

پہلی سورۃ کے ختم پر اللہ کے راستہ میں جان و مال خرچ کرنے کی ترغیب تھی، اس سورۃ میں اس خرچ کرنے کے چند مواقع کا ذکر ہے۔

شان نزول:

ذیقعدہ ۶ ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کرنے کے ارادہ سے مدینہ سے مکہ کو چلے، راستہ میں مشرکین مکہ نے روک دیا اور مسجد حرام کی زیارت سے مانع ہوئے پھر وہ لوگ صلح کی طرف جھکے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس بات پر کہ آپ آئندہ سال عمرہ ادا کریں گے ان سے صلح کر لی، جسے صحابہ کی ایک بڑی جماعت پسند نہ کرتی تھی جس میں خاص قابل ذکر ہستی حضرت عمر فاروق کی ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہیں قربانیاں کیں اور لوٹ گئے، لوٹتے ہوئے یہ سورۃ مبارکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، جس میں اس واقعہ کا ذکر ہے اور صلح کو باعتبار نتیجہ فتح کہا گیا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تم تو فتح فتح مکہ کو کہتے ہو لیکن ہم صلح حدیبیہ کو فتح جانتے تھے۔ایسے ہی حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تم فتح مکہ کو فتح شمار کرتے ہو اور ہم بیت الرضوان کے واقعہ حدیبیہ کو فتح گنتے ہیں۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں صلح حدیبیہ کو ایک بڑی فتح بتلایا گیا اور مستقبل میں فتح ونصرت کی بشارت کے علاوہ مؤمنین کے لئے جنت کی بشارت اور منافقین کے لئے اللہ کا غضب اور اس کی لعنت کی خبر دی گئی اور منافقین کی بدکاریوں کا ذکر فرمایا گیا۔ بیعت رضوان اور اس میں شریک صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے رضائے الٰہی کی شہادت دی گئی۔ پھر صلح حدیبیہ کی ان حکمتوں اور مصلحتوں میں سے چند کا تذکرہ فرمایا گیا جن کو نہ جاننے سے مسلمان آزردہ خاطر تھے اور جن کا علم صرف اللہ کو تھا یا پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ وہاں تک پہنچی ہوگی۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ کے خواب کا تذکرہ فرمایا کہ وہ بالکل صحیح تھا اور یہ کہ اس کی تعبیر جلد ہی سامنے آئے گی۔ آخر میں صحابہ کرام کی چند عظمتوں کا بیان فرمایا گیا اور ان کی عادات اور کاموں کو سراہا گیا اور صحابہ کرام کو باقی مسلمانوں کے لئے دنیا کے ختم ہونے تک نمونہ قرار دیا گیا اور بتلایا گیا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان کے قدم بقدم چلیں اور وہی عادتیں اور باتیں اختیار کریں جو صحابہ نے کی تھیں، ایمان والوں کو آپس میں ملاپ محبت اور اخلاص سے رہنے کی تلقین فرمائی گئی اور بشارت سنائی گئی اور جو لوگ اللہ کو مان کر نیک کاموں میں لگے ہوئے ہیں ان سے اللہ نے وعدہ کرلیا ہے کہ ان کی خطائیں بخش دی جائیں گی اور ان کو آخرت میں مغفرت اور اجر عظیم سے نوازا جائے گا۔ واللہ اعلم!

فائدہ:

واقعہ صلح حدیبیہ اس طور پر ہے کہ ۶ ھ میں ماہ ذیقعدہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ کے ساتھ مدینہ منورہ سے عمرہ کے ارادہ سے مکہ معظّمہ چلے، یہ خبر مکہ پہنچی تو قریش مکہ نے جمع ہو کر اتفاق کرلیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں نہ آنے دیں گے۔ جب کہ ان کے یہاں حج وعمرہ سے دشمن کو بھی روکا نہیں جاتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام حدیبیہ جو مکہ سے ایک منزل یعنی ۳ میل کے قریب ایک جگہ ہے وہاں قیام فرمایا اور اہل مکہ کے پاس خبر بھیجی کہ ہم جنگ کے ارادہ سے نہیں آئے ہیں، ہم کو آنے دو، ہم عمرہ کر کے واپس چلے جائیں گے، مگر مشرکین مکہ اس پر راضی نہ ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صلح کی غرض سے آئے، اس سلسلہ میں بعض امور پر بحث وتکرار بھی ہوئی اور مسلمانوں کو غصہ اور جوش آیا کہ تلوار سے معاملہ ایک طرف کردیا جائے۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کے اصرار کے موافق سب شرائط صلح کے منظور فرمالئے اور مسلمانوں نے بھی بے انتہا ضبط اور تحمل سے کام لیا اور صلح نامہ تیار ہوگیا، جس میں حسب ذیل شرائط تھیں۔

(۱) اس سال مسلمان مکہ میں داخل ہوئے بغیر ہی واپس چلے جائیں۔ (۲) آئندہ سال مسلمان مکہ میں اس طرح داخل ہوں گے کہ معمولی حفاظتی ہتھیاروں کے علاوہ جنگی ہتھیار ساتھ نہ لائیں اور تلواریں نیام کے اندر ہی رہیں گی، صرف ۳ دن قیام کریں گے اور جب تک مسلمان مکہ میں رہیں گے ہم (مشرکین) مکہ چھوڑ کر پہاڑیوں پر چلے جائیں

گے۔(۳) معاہدہ کی مدت کے اندر دونوں جانب امن وعافیت کا سلسلہ جاری رہے گا۔(۴) اگر کوئی شخص مکہ سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مسلمان ہوکر مدینہ چلا جائے گا تو مسلمانوں کے ذمہ ہوگا کہ اس کو مکہ واپس کریں اور اگر مدینہ سے کوئی شخص فرار ہوکر مکہ آئے گا تو ہم اسے واپس نہ کریں گے۔(۵) تمام قبائل آزاد ہیں کہ ہر دو فریق میں سے جو جس کا حلیف بننا پسند کرے اس کا حلیف (ساتھی) بن جائے۔(۶) یہ معاہدہ دس سال تک رہے گا اور کوئی فریق اس مدت میں اس کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا، یہ صلح کا معاملہ ہوجانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ ہی میں اپنی ہدی (قربانی کے جانور ذبح کردیئے اور حلق وقصر کرکے احرام کھول دیا۔ جب جب صحابہ کو صلح نامہ کی تحریر پر کوئی اعتراض ہوتو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ۔اللہ ورسولہ اعلم۔ صحابہ کو تسلی دیتے حتی کہ یہ سورۃ نازل ہوئی اور خداوند قدوس نے اس صلح اور فیصلہ کا نام فتح مبین رکھا۔

فائدہ ثانیہ:

''بیعت رضوان'': جب قریش مکہ کو یہ خبر پہنچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً ۱۵۰۰ صحابہ کے ساتھ مکہ آرہے ہیں تو قریش نے اتفاق کرلیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو مکہ میں نہ آنے دیں گے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں قیام فرمایا اور حضرت خراش ابن امیہ خزاعی کو اہل مکہ کے پاس بھیجا کہ ان کو خبر دیں کہ ہم فقط بیت اللہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں، ہمیں مکہ میں داخل ہونے سے نہ روکیں۔ مگر اہل مکہ نے اسلام دشمنی میں ان کے اونٹ کو ذبح کر ڈالا اور ارادہ کیا کہ ان کو بھی قتل کر ڈالیں، مگر آپس ہی کے بعض لوگوں نے درمیان میں پڑ کر ان کو بچالیا۔ حضرت خراش نے واپس آکر تمام واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا کہ اب حضرت عمر کو پیغام دے کر اہل مکہ کے پاس بھیجیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معذرت کی اور عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو معلوم ہے اہل مکہ مجھ سے کتنے برہم ہیں اگر آپ حضرت عثمان کو بھیجیں تو ان کی قرابتیں اہل مکہ میں ہیں کفار مکہ ان سے تعارض نہ کریں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلاکر حکم فرمایا کہ ابوسفیان اور رؤسائے مکہ کو ہمارا پیغام پہنچادو کہ ہم لڑنے نہیں آئے، وہ ہمیں عمرہ کرنے دیں اور یہ بھی فرمایا کہ جو کمزور مسلمان مکہ میں مظلومیت کی زندگی گزار رہے ہیں انہیں بشارت سنادو کہ گھبرائیں نہیں۔ عنقریب اللہ رب العزت فتح نصیب فرمائیں گے اور اپنے دین کو غالب کرے گا۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے ایک عزیز کی پناہ میں مکہ میں داخل ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام قریش مکہ کو پہونچایا، ابوسفیان نے کہا کہ ہم ہرگز محمد اور ان کے ساتھیوں کو مکہ میں داخل ہونے نہ دیں گے تم اگر تنہا طواف بیت اللہ کرنا چاہو تو کرسکتے ہو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس بات سے انکار فرمایا، قریش نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حدیبیہ واپس جانے سے روک دیا، مسلمانوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ حضرت عثمان کو کفار مکہ نے قتل کردیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت صدمہ ہوا اور فرمایا کہ میں جب تک ان سے بدلہ نہ لوں گا یہاں سے حرکت نہ کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہ سے

بیعت لی کہ جب تک جان میں جان ہے کفار سے جہاد وقتال کریں گے، چنانچہ تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مکہ گئے ہوئے تھے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ یہ عثمان کی بیعت ہے، جب مشرکین کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ گھبرائے اور فوراً مسلمانوں تک یہ خبر پہونچائی کہ قتل عثمان کی خبر غلط ہے اور ہم صحیح سلامت ان کو آپ کے پاس بھیجتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عثمان صحیح سلامت حدیبیہ تشریف لے آئے، اللہ رب العزت نے صحابہ کی اس جانبازی وفداکاری کی قدر فرماتے ہوئے ان کو اپنی رضا وخوشنودی کا پروانہ عطا فرمایا، ارشاد فرمایا: ''**لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذیبایعونك تحت الشجرة**'' اس لئے اس بیعت کو بیعت رضوان کہتے ہیں۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورہ فتح میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے انعامات اور احسانات بیان کیے گئے ہیں:

(۱) گناہوں کی بخشش (۲) نعمت کی تکمیل (۳) سیدھے راستے کی ہدایت (۴) مدد کا وعدہ (۵) مومنین کے دل کی تسلی۔ (۶) جنت کا وعدہ (۷) منافقوں اور مشرکوں کے بارے میں معاہدہ کا ذکر (۸) مومنین پر اللہ کی رضامندی کا اظہار (۹) غنیمت کا وعدہ (۱۰) مسجد حرام میں داخلے کا وعدہ (۱۱) امن کا پیغام (۱۲) غلبہ اسلام۔ یہ آخری بشارت صحابہ کو سورۃ فتح کے اترنے سے پہلے نہیں بھیجی گئی تھی کہ اسلام تمام مذاہب پر غالب آئے گا۔

خود اللہ پاک کی طرف سے صحابہ کرام کی تعریف جو آیت نمبر ۱۰، ۱۸ میں ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ صحابہ کا اللہ پاک اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سچی محبت ہے کہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر جنگ کے میدان میں ڈٹ کر رہنے کا وعدہ کیا، اپنے کسی ذاتی فائدہ بغیر کہ ہم آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔

صلح حدیبیہ کو سب سے کھلی فتح قرار دیا گیا، اس لیے کہ جس سے مقصد اور مشن کی تکمیل ہوتی ہے اسے سب سے بڑی فتح سمجھا جاتا ہے، حدیبیہ میں بھی ایسا ہی ہوا، معاہدہ کی وجہ سے لوگوں کے درمیان دوریاں قربت میں بدل گئی اور ایک دوسرے کو قریب سے جاننے اور سمجھنے کا وقت ملا، جس کی وجہ سے لوگ اسلام قبول کرنے لگے، گنتی کے دو سالوں میں اتنے لوگ اسلام قبول کر چکے جتنے پچھلے ۱۷ سالوں میں اسلام سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔

مسلمانوں کی خوبیاں بیان کیں جو انہیں اللہ کی طرف سے پہنچی تھیں۔ (۲۹)

مسلمانوں کے احکام کی بجا آوری کی تفصیل تورات میں بھی ہے، اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جماعت نے مادیت پر پورا زور دیا اور مسلمانوں کی تفصیل بھی بائبل میں موجود ہے۔ عیسائیوں نے رہبانیت پر زور دیا، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں دونوں خصوصیات کا مجموعہ ہے۔ (خواطر قرآنیہ)

فتح مبین کا نتیجہ:

جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ:

◇ حدیبیہ میں مسلمانوں کی تعداد کم وبیش ۱۴۰۰ تھی۔

◇ جبکہ صرف دوسال بعد جب ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیر قیادت لشکر مجاہدین کی تعداد دس ہزار تھی۔

یہ انقلاب معاہدہ امن کی وجہ سے برپا ہوا:

جب مصالحت کے بعد مشرکین نے مسلمانوں کے ساتھ میل جول اور معاملات شروع کئے تو مسلمانوں کے کردار کی پختگی، زبان کی سچائی، دامن کی عفت وعصمت اور معاملات کی صفائی نے مشرکوں کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ آخر وہ کون سی مخفی قوت ہے جس نے کل کے شرابیوں اور رہزنوں کو زاہد و پارسا بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے یہ قوت صرف ایمان کی قوت تھی، اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد ان کی گردنیں خود بخود ایمان کے سامنے جھک گئیں۔

اللہ تعالیٰ نے اسے فتح مبین قرار دیا، اس صلح کا فتح مبین ہونا اس وقت بعض مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا لیکن بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ واقع میں فتح مبین تھی اور ابتداء اسلام سے اب تک مسلمانوں کو اس سے بڑی فتح حاصل نہیں ہوئی۔

سورت کی ابتداء میں چار اعزازات:

اس سورت کی ابتداء میں چار اعزازات سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سرفراز فرمایا گیا ہے۔

◇ پہلا اعزاز واکرام یہ تھا کہ اگلی اور پچھلی تمام کوتاہیاں آپ کی معاف فرمادی گئیں۔

◇ دوسرا اعزاز واکرام یہ بیان فرمایا کہ صرف تقصیرات سے درگزر نہیں کیا گیا بلکہ جو کچھ ظاہری اور باطنی اور جسمانی و روحانی انعامات واحسانات اب تک ہو چکے ہیں ان کی پوری تکمیل اور تتمیم کی جائے گی۔

◇ تیسرا اعزاز واکرام یہ بیان فرمایا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ کو ہدایت اور استقامت کی سیدھی راہ پر اللہ تعالیٰ قائم رکھے گا اور معرفت الٰہی کے غیر محدود مراتب پر فائز فرمائے گا۔ لوگ جوق در جوق آپ کی ہدایت سے اسلام کے سیدھے راستہ پر آئیں گے اور اس طرح آپ کے اجر وحسنات کے ذخیرہ میں بے شمار اضافہ ہوگا۔

◇ چوتھا اعزاز واکرام جس سے آپ کو نوازا گیا یہ بیان فرمایا گیا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اللہ کی ایسی مدد آپ کے لئے آئے گی جسے نہ کوئی روک سکے گا نہ دبا سکے گا اور اللہ تعالیٰ آپ کو ایسا غلبہ عنایت فرمائے گا کہ جس میں عزت ہی عزت ہوگی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم واجب وفرض ہے:

لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ۭ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝۹

آیت ۹ کے تحت لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم واجب وفرض ہے۔ ذرا بھی کوئی توہین کرے گا وہ فیض رسالت سے محروم رہے گا۔ بعض مفسرین نے یہاں آپ کی مدد کرنے سے آپ کے دین کی مدد کرنا مراد لیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقیقی مدد آپ کے دین ہی کی مدد ہے۔ پھر آپ کی توقیر وعزت میں آپ کی سنت کے اتباع اور اجراء اور اس کے

قیام اور تبلیغ میں اعانت اور جان و مال سے شریک ہونا یہی آپ کی سچی توقیر وعزت ہے۔

مختصراً آپ کے سارے حقوق ان تین الفاظ میں آجاتے ہیں۔آپ کی محبت، آپ کی عظمت اور آپ کا اتباع۔اگر ان تین میں سے ایک چیز بھی نہ ہوگی تو یقینا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقوق میں کوتاہی ہوگی۔اللہ تعالی ہمیں بھی اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقوق کی ادائیگی کی توفیق کاملہ عطا فرمائیں۔

دو متضاد گروہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰي نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

پھر یہ سورت دو متضاد گروہوں کا تذکرہ کرتی ہے:

◇ پہلا گروہ ان مخلص اہل ایمان کا ہے جنہوں نے وطن سے دور اور غیر مسلح ہونے کے باوجود ہر چہ بادا باد کہتے ہوئے اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھ پر بیعت جہاد کی اور یہ عہد کیا کہ آپ کی قیادت میں فتح یا شہادت تک قتال کریں گے اور میدان جنگ سے راہ فرار اختیار نہیں کریں گے، رب کریم کو ان کا یہ جذبہ پسند آیا اور فرمایا:'' جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔''(۱۰)

◇ سن ۶ ہجری میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ سے عمرہ کے لئے روانہ ہونے کا قصد فرمایا تو اس وقت آپ نے اپنی روانگی کا عام اعلان کر دیا اور مسلمانوں کو ساتھ چلنے کی ترغیب دی۔شاید قرائن سے آپ کو بھی قریش کے ساتھ لڑائی کا احتمال ہوا ہو، اس پر مدینہ کے قرب وجوار کے دیہاتی جنہوں نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا وہ جان چرا کر بیٹھ رہے اور آپس میں کہنے لگے کہ یہ مسلمان اس سفر سے واپس آنے والے نہیں، سب وہیں ختم ہو جائیں گے۔انہی منافقین کا راز آیت ۱۱ سے فاش کیا گیا ہے۔(۱۱)

لفظ بیعت دراصل کسی خاص کام پر عہد لینے کا نام ہے، اس کا قدیم اور مسنون طریقہ باہم عہد کرنے والوں کا ہاتھ پر ہاتھ رکھنا ہے، اگر چہ ہاتھ پر ہاتھ رکھنا شرط اور ضروری نہیں۔بہرحال جس کام کا کسی سے عہد کیا جائے اس کی پابندی شرعاً واجب وضروری ہے اور خلاف ورزی حرام ہے، اسی لئے آگے فرمایا کہ جو شخص اس عہد بیعت کو توڑے گا تو کچھ اپنا ہی نقصان کرے گا، اللہ اور اس کے رسول کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور جو اس عہد کو پورا کرے گا تو اس کو اللہ تعالیٰ بڑا اجر دینے والے ہیں۔(معارف القرآن از مفتی شفیع صاحبؒ)

پیر کے اوصاف:

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ کسی ایسے پیر یا بزرگ سے بیعت ہونا درست ہے، جس میں حسب ذیل اوصاف پائے جائیں۔

(۱) پیر کتاب وسنت کا علم رکھتا ہو، خود پڑھ کر علم حاصل کیا ہو یا کسی بزرگ کی صحبت حاصل کی ہو، بہرحال اس کے پاس کتاب وسنت کا علم ہونا چاہیے۔

(۲) کبائر سے مجتنب اور صغائر پر اصرار نہ کرے، کبائر کا مرتکب بیعت کا اہل نہیں ہوتا، کیونکہ وہ فساق میں شمار ہوتا ہے۔

(۳) بیعت لینے والا دنیا سے بے رغبت اور آخرت کی طرف رغبت رکھتا ہے۔

(۴) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عامل ہو۔ اپنے متعلقین کو اچھی بات کا حکم دے اور اگر ان میں کوئی بری بات دیکھے تو فوراً روک دے۔

(۵) پیر خود رو نہ ہو، بلکہ یہ طریقہ اس نے بزرگوں سے سیکھا ہو یا ان کی صحبت اختیار کی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ باپ کی وفات کے بعد بیٹا جیسا کیسا بھی ہو گدی نشین ہو گیا، نہ کسی سے سیکھا، نہ کسی کی صحبت اختیار کی اور نہ علم حاصل کیا۔ یہ سلسلہ تو تباہ کن ہے جو آج کل اکثر رائج ہے۔

اگر ان شرائط کو پورا کرنے والا کوئی بزرگ مل جائے تو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لینی چاہیے، تاکہ انسان شیطان کے پھندے سے محفوظ رہ سکے۔ ویسے یہ بیعت نہ فرض ہے اور نہ واجب، البتہ سنت ہے۔ (معالم العرفان: ۱۷/۱۱۶)

بیعت کرنے والوں سے اللہ راضی:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ⑱

یقیناً اللہ ان مومنوں سے بڑا خوش ہوا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے اور ان کے دلوں میں جو کچھ تھا وہ بھی اللہ کو معلوم تھا۔ اس لیے اس نے ان پر سکینت اتار دی، اور ان کو انعام میں ایک قریبی فتح عطا فرما دی۔ (۱۸)

اس سورت کے اختتام پر تین امور بیان کئے گئے ہیں۔

◇ پہلا یہ کہ اللہ تعالی نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت اور دین حق دے کر اس لئے بھیجا ہے تاکہ آپ اسے سارے ادیان پر غالب کر دیں (ان شاء اللہ تعالی قیامت سے پہلے ایسا ہو کر رہے گا، جہاں تک علمی اور برہانی غلبہ کا تعلق ہے وہ آج بھی دین اسلام کو ادیان عالم پر حاصل ہے)۔

◇ دوسرے نمبر پر آپ کے صحابہ کی تعریف کی گئی ہے کہ وہ کفار کے مقابلے میں بڑے سخت اور آپس میں بڑے مہربان ہیں اور وہ سب رضاء الٰہی کے طالب ہیں۔

◇ اور تیسرے نمبر پر ان لوگوں کے ساتھ مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے (اے اللہ! تو ہمیں بھی ان میں سے بنا دے۔) (۲۹) (خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:...... بشارت فتح اسلام مع شرائط فتح (۱) صلح حدیبیہ فتح مبین ہے، کیونکہ کفار مکہ صلح میں مقید ہو چکے،

جس کے شرائط وہ نباہ نہیں سکیں گے، بالآخر فسخ معاہدہ کے باعث جنگ ہوگی جس میں فتح مکہ ہوگی۔

خلاصہ رکوع :۱......رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرفرازی میں (۱) مواعید اربعہ کا ذکر (۲) اور منافقین ومشرکین پر غضب ولعنت الٰہی اور داخلہ جہنم کی پیش گوئی۔ ماخذ: (۱) آیت: ۲۔ (۲) آیت: ۶۔

خلاصہ رکوع: ۲......(۱) مخلفین (۲) اور عاجزوں کا ذکر۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۲،۱۱۔ (۲) آیت: ۱۷۔

خلاصہ رکوع: ۳......نتائج بیعت علی الموت۔ ماخذ: آیت: ۱۸ تا ۲۱۔

خلاصہ رکوع: ۴...... (۱) اسلام کی سرفرازی کا اعلان عام۔ (۲) متبعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک زرین اصول کی تلقین کہ ہمیشہ **اشداء علی الکفار رحماء بینھم** رہیں۔ ماخذ: (۱) آیت: ۲۸۔ (۲) آیت: ۲۹۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ حجرات

یہ قرآن کریم کی ۴۹ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۱۰۶ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں دو رکوع، ۱۸ آیات، ۳۵۰ کلمات، ۱۵۱۲ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے پہلے رکوع کی چوتھی آیت میں لفظ حجرات استعمال ہوا ہے جو حجرہ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں وہ بند جگہ جو سونے والے کی حفاظت کرے اور کسی کو باہر سے نہ گھسنے دے، یعنی کوٹھری، خلوت خانہ، پردہ کا مکان، یہاں حجرات سے مراد ازواج مطہرات کے مکانات ہیں۔ اس آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ یعنی پردہ کے مکان میں تشریف فرما ہوں تو حجرہ کے باہر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارا نہ جائے کہ یہ گستاخانہ انداز ہے بلکہ صبر کے ساتھ باہر انتظار کیا جائے، جب آپ حجرہ سے باہر تشریف لے آویں تب ملاقات کی جائے، اس لئے بطور علامت اس سورۃ کا نام سورہ حجرات مقرر ہوا۔

ربط:

پہلی سورۃ میں اصلاح آفاق بالجہاد کا ذکر ہے اور اس میں اصلاح الفس بالارشاد کا بیان ہے اور اس سورۃ کے اجزاء کا مجموعہ حقوق سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اور حقوق اخوان فی الدین کا بیان ہے۔

خلاصہ سورۃ:

ہجرت کے نویں سال عرب کے قبیلہ جوق درجوق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی

اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وفرمانبرداری کا اعلان کیا، اس لئے ان کو اور دوسرے مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وحرمت کے احکام اور آپس کے میل جول کے آداب وقاعدے اور اصلاح معاشرت وحسن معاشرت کے احکام اس سورۃ میں بتلائے گئے۔ گو یا یہ سورۃ اسلامی تہذیب وتمدن کا گہوارہ ہے، اس میں سب سے پہلے خوف خدا کی تاکید فرمائی گئی، اس کے ساتھ آنحضرت کی تعظیم وادب سکھایا گیا اور ہدایت کی گئی کہ اللہ اور اس کے رسول کے سامنے اپنی رائے مت چلاؤ، اللہ کے رسول جو کہیں اس کو سر جھکا کر سنو اور خلوص کے ساتھ اس پر عمل کرو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اونچی آواز سے مت بولو، آپ اندر حجرہ میں تشریف رکھتے ہوں تو پکار کر مت بلاؤ، آگے فرمایا کہ ہر کسی کی بات سن کر بلا تحقیق مت مان لیا کرو۔ آگے فرمایا کہ ایمان والے آپس میں سب بھائی بھائی ہیں، کسی کو کسی پر زیادتی نہیں کرنی چاہیے، اگر مسلمانوں کی دو جماعتوں میں اختلاف ہوجائے تو ان میں صلح کرادو اور اگر کوئی مصالحت پر آمادہ نہ ہو تو جو زیادتی کرے اس سے لڑ کر اس کو سیدھا کردو اور دیکھو آپس میں بدمزگی، تلخی اور جھگڑے ذرا ذرا سی باتوں سے پیدا ہوسکتے ہیں، مثلاً کسی سے تمسخر کرنا، کسی کو برے نام اور برے القاب سے پکارنا۔ کسی کا عیب ظاہر کرنا، پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا، غیبت کرنا، چغلی کھانا، کسی کی طرف سے بدگمانی کرنا، کسی کے بھید معلوم کرنے کی کوشش کرنا، یہ سب بری باتیں ہیں، ان سے بچو۔ تمام انسان حضرت آدم وحوا کی اولاد ہیں۔ ذات پات، خاندان، قوم، کنبہ، برادری یہ محض ایک دوسرے کی شناخت کے لئے ہیں نہ کہ ایک دوسرے پر فخر کرنے کے لئے، سب اللہ کے بندے ہیں اور اللہ کے نزدیک زیادہ مرتبہ والا وہی ہے جو اس سے زیادہ ڈرنے والا ہے، اللہ تعالی تمہارے تمام کاموں کو دیکھ رہا ہے حتی کہ وہ تمہارے دلوں کی باتوں سے بھی واقف ہے، جس نے کفر وشرک سے تائب ہوکر کلمہ پڑھ لیا وہ مسلمان ہے اب اسے چاہئے کہ اسلام کے مقرر کئے ہوئے طریقہ پر چلے، نیک کام کرے، برے کاموں سے بچے تا کہ اس کے دل میں ایمان کی روشنی پیدا ہو، اسلام میں داخل ہوکر کسی پر احسان نہ جتلاؤ، ایمان کی دولت تو احسان خداوندی ہے اور اللہ کی نعمت ہے یہ نہ سمجھو کہ جیسے انسانوں کو دھوکا دیا جاسکتا ہے اللہ کو بھی دھوکہ دے لوگے، اللہ سے کوئی بھی چیز چھپی نہیں، وہ آسمان زمین کے بھیدوں سے بھی واقف ہے، خوب سمجھ لو کہ وہ تمہارے سب کام دیکھ رہا ہے۔ واللہ اعلم (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت میں مکارم اخلاق بھی بیان ہوئے ہیں، اس لئے اسے ''سورۃ الاخلاق والآداب'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس سورت میں اللہ تعالی نے اہل ایمان کو پانچ مرتبہ ''یاایھا الذین امنوا'' کے محبت بھرے انداز سے خطاب کیا ہے۔

اللہ ورسول کی تعظیم وعظمت:

اسلام میں سب سے اول اور اہم مسئلہ اللہ ورسول کی تعظیم وعظمت کا ہے کیونکہ جب اللہ اور رسول کی عظمت وعزت دل میں ہوگی تو ان کے احکام کی تعمیل بھی ہوگی۔ اس آیت میں سب سے پہلا حکم ایمان والوں کو یہ دیا گیا ہے کہ جس معاملہ میں اللہ ورسول کی طرف سے حکم ملنے کی توقع ہو اس کا فیصلہ پہلے ہی آگے بڑھ کر اپنی رائے سے نہ کر بیٹھو بلکہ حکم الہی کا

انتظار کرو اور جس وقت پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کچھ ارشاد فرمائیں خاموشی سے کان لگا کر سنو۔ آپ کے بولنے سے پہلے خود بولنے کی جرأت نہ کرو، جو حکم ادھر سے ملے اس پر بلا چوں و چرا اور بلا پس و پیش عامل بن جاؤ۔ اپنی غرض اور رائے کو آپ کے احکام پر مقدم نہ رکھو بلکہ اپنی خواہشات وجذبات کو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے تابع بناؤ۔

حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی ہوائے نفس یعنی اس کی خواہشات اور نفسی میلانات میری لائی ہوئی ہدایت کے تابع نہ ہو جائیں۔ پس قرآن کریم کی اس آیت کا تقاضا اور مطالبہ بھی یہی ہے جو اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ حقیقی ایمان جب ہی حاصل ہوسکتا ہے اور ایمانی برکات تب ہی نصیب ہوسکتی ہیں جب کہ آدمی کے نفسی میلانات اور اس کے جی کی چاہتیں کلی طور پر احکام الٰہی اور ہدایات وارشادات نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تابع و ماتحت ہو جائیں۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

آیت: ۲ میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲

وہ اللہ کے نبی سے خطاب کرتے ہوئے اپنی آواز پست رکھا کریں، یونہی آپ کا نام یا کنیت ذکر کر کے ایسے نہ پکارا کریں جیسے آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔

حضرت ثابت ابن قیس انصاری رضی اللہ عنہ کا قصہ:

حضرت ثابت ابن قیس انصاری رضی اللہ عنہ کی آواز بھی قدرتی طور پر بلند تھی۔ جب بھی بات کرتے اونچی آواز میں کرتے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ہی ضائع ہو جائیں، تو حضرت ثابت رضی اللہ عنہ اپنی آواز کی بلندی کے ڈر سے گھر میں بیٹھ گئے۔ کہنے لگے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں میری آواز بلند ہوگئی تو مجھے ڈر ہے کہ میرے اعمال ہی ضائع نہ ہو جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ ثابت رضی اللہ عنہ نظر نہیں آرہا ہے، کیا وہ بیمار ہو گیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا، حضور! وہ تو میرا پڑوسی ہے مگر مجھے اس کی بیماری کی کوئی خبر نہیں۔ پھر جب گھر جا کر آپ کا پتہ کیا تو انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ میری آواز قدرتی طور پر بلند ہے اور مجھے اپنے منافق ہونے کا خطرہ ہے، لہٰذا میں اعمال کے ضیاع کے ڈر سے گھر میں بیٹھ گیا ہوں۔ آپ کو اس بات کی خبر ہوئی تو فرمایا کہ اس نے آیت کا مطلب ٹھیک سے نہیں سمجھا، اس کے اعمال ضائع نہیں ہوں گے اور وہ تو جنتی ہے۔ پھر جب حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا قیس کے بیٹے! کیا تمہیں یہ چیز پسند نہیں کہ تمہاری زندگی پسندیدہ گزرے اور تم شہادت کی موت پاؤ؟ اس پر حضرت ثابت رضی اللہ عنہ خوش ہو گئے، چنانچہ پھر ایسا ہی ہوا۔

(معالم العرفان: ۱۷/۱۷۸)

اجتماعی ومعاشرتی آداب:

اکثر نزاعات ومناقشات اورلڑائی جھگڑوں کی ابتداء جھوٹی خبروں سے ہوتی ہے، اس لئے اس اختلاف اورتفریق کے سرچشمہ ہی کو بند کرنے کی تعلیم آیت ۶ میں دی گئی کہ

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ۞

افواہوں پر کان مت دھرا کرواور اگر کوئی ایسا ویسا آدمی کوئی خبر تم تک پہنچائے تو اس کے بارے میں تحقیق کرلیا کرو۔

اس آیت کے شان نزول میں حافظ ابن جریر اور دوسرے مفسرین نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت ولید بن عقبہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنو مصطلق کے پاس زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ جب یہ ان کی بستی کے قریب پہنچے تو وہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے ایلچی کے استقبال کے لیے بڑی تعداد میں بستی کے باہر جمع ہوگئے۔ ولید بن عقبہ یہ سمجھے کہ یہ لوگ لڑائی کے لیے باہر نکل آئے ہیں۔ بعض روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ ان کے اور بنو مصطلق کے درمیان جاہلیت کے زمانے میں کچھ دشمنی بھی تھی۔ اس لیے حضرت ولید کو یہ خطرہ ہوا کہ وہ لوگ اس پرانی دشمنی کی بناپر ان سے لڑنے کے لیے نکل آئے ہیں؛ چنانچہ وہ بستی میں داخل ہونے کے بجائے وہیں سے واپس لوٹ گئے، اور جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ بنو مصطلق کے لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کردیا ہے، اور وہ لڑائی کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقرر فرمایا کہ واقعے کی تحقیق کے بعد اگر واقعی ان لوگوں کی سرکشی ثابت ہو تو ان سے جہاد کریں۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ لوگ تو استقبال کے لیے جمع ہوئے تھے، اور انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار نہیں کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ان روایات کی بنا پر بعض حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ آیت میں جو فاسق کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس سے مراد ولید بن عقبہ ہیں، پھر اس پر جو اشکال ہوتا ہے کہ ایک صحابی کو فاسق قرار دینا بظاہر عدالت صحابہ کے منافی ہے، اس کا یہ جواب دیا ہے کہ بعض صحابہ سے گناہ سرزد ہوئے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں توبہ کی توفیق عطا فرمادی، اس لیے بحیثیت مجموعی ان کی عدالت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس واقعے کے بیان میں جو روایتیں آئی ہیں، اول تو وہ سند کے اعتبار سے مضبوط نہیں ہیں، اور ان میں تعارض و اختلاف بھی پایا جاتا ہے، دوسرے اس واقعے کی بنا پر حضرت ولید کو فاسق قرار دینے کی کوئی معقول وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ اس واقعے میں انہوں نے جان بوجھ کر کوئی جھوٹ نہیں بولا، بلکہ جو کچھ کیا، غلط فہمی کی وجہ سے کیا، جس کی وجہ سے کسی کو فاسق نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت ولید بستی کے قریب پہنچے، اور قبیلے کے لوگ بڑی تعداد میں وہاں جمع ہورہے تھے تو کسی شریر آدمی نے ان سے یہ کہا ہوگا کہ یہ لوگ آپ سے لڑنے کے لیے نکلے ہیں۔ اس شریر آدمی کو آیت میں فاسق قرار دیا گیا ہے، اور حضرت ولید کو یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ تنہا اس شریر آدمی کی خبر پر بھروسہ کرکے

کوئی اقدام کرنے کے بجائے پہلے اس خبر کی تحقیق کرنی چاہئے تھی۔ اس خیال کی تائید ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابن جریر نے نقل کی ہے، اور اس میں یہ الفاظ ہیں کہ **فحدثه الشیطان انهم یریدون قتله**(تفسیر ابن جریر) یعنی شیطان نے انہیں یہ بتایا کہ وہ لوگ انہیں قتل کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر یہی ہے کہ شیطان نے کسی انسان کی شکل میں آ کر انہیں یہ جھوٹی خبر دی ہوگی۔ اس لیے آیت کے لفظ فاسق کو خواہ مخواہ ایک صحابی پر چسپاں کرنے کی کیا ضرورت ہے، جبکہ انہوں نے جو کچھ کیا غلط فہمی میں کیا۔ اس کے بجائے اسے اس مخبر پر چسپاں کرنا چاہئے جس نے حضرت ولید کو یہ غلط خبر دی تھی۔

بہر حال! واقعہ کچھ بھی ہو، قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ اس کی آیتیں چاہے کسی خاص موقع پر نازل ہوئی ہوں، اکثر ان کے الفاظ عام ہوتے ہیں، تاکہ ان سے ایک اصولی حکم معلوم ہو سکے؛ چنانچہ یہ ایک عام حکم ہے کہ کسی فاسق کی خبر پر بغیر تحقیق کے اعتماد نہیں کرنا چاہئے، خاص طور پر جب اس خبر کے نتیجے میں کسی کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہو۔ (توضیح القرآن)

ہمارا معاشرہ اس وقت جھوٹی خبروں اور افواہوں میں گھرا ہوا ہے۔ جھوٹی خبروں کی اشاعت وبال جان بن چکی ہے۔ **اکذب الناس الاخباریون** کے مطابق اخبار والے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں جو بلا تحقیق جھوٹی خبریں شائع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح تاریخ میں بھی بہت سی اناپ شناپ باتیں پائی جاتی ہیں جو ناقابل اعتماد ہوتی ہیں، یہ شرف تو صرف محدثین کرامؒ کو حاصل ہے کہ انہوں نے ہر روایت کی پورے طریقے سے چھان بین اور تحقیق کرنے کے بعد اس کو نقل کیا۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر کوئی فاسق آدمی خبر لائے تو اس پر فوراً عمل شروع نہ کر دو، بلکہ پہلے اس کی اچھی طرح تحقیق کر لو، ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کوئی ایسا قدم اٹھا بیٹھو جو بعد میں پشیمانی کا باعث بن جائے۔

دنیا بھر کے مسلمان بھائی بھائی ہیں:

وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا ۚ

آیت :۹ میں اگلا حکم یہ دیا گیا کہ اگر اتفاق سے مسلمانوں کی دو جماعتوں میں اختلاف رونما ہو جائے اور وہ آپس میں لڑ پڑیں تو پھر دوسرے مسلمانوں کو چاہئے کہ پوری کوشش کریں کہ اختلاف رفع ہو جائے اور اس میں اگر کامیابی نہ ہو اور کوئی ایک فریق دوسرے پر چڑھا چلا جائے اور ظلم و زیادتی ہی پر کمر باندھ لے تو خاموش ہو کر نہ بیٹھو بلکہ جس کی زیادتی ہو سب مسلمان مل کر اس سے لڑائی کریں، یہاں تک کہ وہ فریق مجبور ہو کر اپنی زیادتیوں سے باز آئے اور اللہ کے حکم کی طرف رجوع کر کے صلح کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دے۔ پھر اس وقت چاہئے کہ مسلمان دونوں فریقوں کے درمیان مساوات اور انصاف کے ساتھ صلح اور میل ملاپ کرا دیں۔ کسی ایک کی طرف داری میں جادۂ حق سے ادھر ادھر نہ جھکیں۔ پوری طرح عدل و انصاف کو ملحوظ رکھیں اور صلح و جنگ ہر حالت میں یہ خیال رہے کہ دو بھائیوں کی لڑائی یا دو بھائیوں کی مصالحت ہے۔

ہماری زندگیوں کے لئے اہم باتیں:

سورہ حجرات کی آیت ۱۱، ۱۲ میں کئی اہم احکامات دیئے گئے ہیں جو ہماری زندگیوں کے لئے بہت اہم ہیں۔ مثلاً:

◇ تمسخر: تمسخر وہ ہنسی ہے جس سے مقصود دوسرے کی تحقیر اور دل شکنی اور دل آزاری ہو اور یہ حرام ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ جن کے ساتھ تم تمسخر کر رہے ہو؛ ہوسکتا ہے وہ اللہ کی نظر میں تم سے بہتر ہوں۔

◇ طعنہ۔ طعنہ زنی بھی دل دکھانے والی چیز ہے، جس سے اتفاق ومحبت میں نہ صرف فرق آ جاتا ہے بلکہ اس کی جڑیں ہل جاتی ہیں۔

◇ ''ولا تنابزوا'' یعنی کسی کو چڑانے والے ناموں سے نہ پکارو۔ مثلاً اندھا، کانا، لنگڑا، لولا ایسے القاب سے یاد کرنا خواہ کسی میں وہ باتیں موجود بھی ہوں اس سے منع فرمایا گیا۔

◇ بدگمانی۔ بدگمانی بھی فساد کی جڑ ہے، جب ایک فریق دوسرے فریق سے بدگمان ہوجاتا ہے اور حسن ظن کی گنجائش نہیں چھوڑتا تو مخالف کی کوئی بات ہو، اس کا مطلب اپنے خلاف نکال لیتا ہے، جس کی وجہ سے دلوں میں دوریاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔

◇ ٹوہ لگانا۔ یعنی کسی کے عیبوں اور کمزوریوں کی تفتیش اور جستجو میں پڑنا، اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔

◇ غیبت۔ یعنی کسی کی غیر حاضری میں اس کے عیوب بیان کرنا ایک تو بزدلی ہے، دوسرے اس کے ساتھ چھپی دشمنی ہے اور تیسرے اس کی تذلیل ہے۔ صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ تم جانتے ہو، غیبت کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کسی کی پس پشت ایسی بات کرنا جو اسے ناگوار ہو، کسی نے عرض کیا کہ اگرچہ اس میں وہ بات موجود ہی ہو؟ فرمایا یہی تو غیبت ہے۔

غیبت کرنے کی اللہ تعالی نے ایسی مثال بیان فرمائی ہے جس سے ہر سلیم الطبع انسان نفرت کرتا ہے۔

◇ غیبت کرنے والا کسی جانور کا نہیں بلکہ انسان کا گوشت کھاتا ہے۔

◇ جس انسان کا گوشت یہ کھا رہا ہے وہ کوئی غیر نہیں بلکہ اس کا مسلمان بھائی ہے۔

◇ وہ گوشت کسی زندہ کا نہیں بلکہ مردہ کا ہے۔

کسی کی غیبت، عیب جوئی اور طعن وتشنیع کا منشا محض کبر ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اس لئے آیت: ۱۳، ۱۴/ میں سورہ حجرات نے اس کبر کی بھی جڑ کاٹ دی اور بتلایا کہ اصل میں انسان کا بڑا چھوٹا یا معزز و حقیر ہونا کچھ ذات پات، خاندان ونسب سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ جو شخص جس قدر نیک خصلت متقی پرہیزگار ہو اور اللہ سے ڈرنے والا ہو اسی قدر وہ اللہ تعالی کے ہاں معزز ومکرم ہے۔

ہر قسم کے شرک اور حرام سے بچنا اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنا۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو! بے شک اللہ تعالی نے تم سے زمانہ جاہلیت کی عار اور آباء پر تفاخر کو ختم کر دیا ہے، لوگ بس دو ہی قسم کے ہیں، کچھ لوگ وہ ہیں جو نیک متقی اور اللہ تعالی کے ہاں معزز ہیں

اور کچھ لوگ وہ ہیں جو اللہ کی نظر میں شقی اور ذلیل ہیں، ارشاد باری تعالی ہے: بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ تقوی والا ہے۔

سورہ حجرات کی آخری آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ خالی خولی زبانی ایمان واسلام کے دعوے اورلن ترانی نہ مطلوب ہے نہ محمود بلکہ حقیقت ایمان کی یہ ہے کہ صدق دل سے اللہ اور رسول پر ایمان لائے ،جس کی پہچان اور شناخت یہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان پر عمل پیرا ہو اور جن باتوں سے منع کیا ہے ان سے قطعاً گریز ہو۔ (خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:......مسلمانوں کے آپس میں تعلقات کا دستور العمل (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ادب سکھایا گیا ہے، اس سے استنباطاً آداب امیر نکالے جائیں گے، واللہ اعلم!

پہلا ادب:......آپ کی مجلس میں ادب سے خاموش بیٹھو، بات کرنے میں پیش قدمی نہ کرو۔

دوسرا ادب:......آپ کے سامنے بات کرتے وقت بلند آواز نہ نکالو۔

تیسرا ادب:......اور بلاتے وقت اس طرح مت بلاؤ جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو بے تکلفی سے بلاتے ہو۔

خلاصہ رکوع:۱......(۱) امیر کے ساتھ تعلقات کیسے ہوں۔ (۲) مرکز سے دور افتادہ بھائیوں کے ساتھ تعلقات کیسے ہوں۔ (۳) مرکز میں رہنے والوں کے ساتھ تعلقات کس طرح ہوں، اور بگڑ جائیں تو ان کی اصلاح کیسے ہو۔ ماخذ: (۱) آیت:۱ تا ۵۔ (۲) آیت:۶ تا ۸ - (۳) آیت:۱۰،۹۔

خلاصہ رکوع: ۲......آپس میں طرز معاشرت ایسا اختیار کریں کہ تعلقات میں کشیدگی ہونے نہ پائے۔ ماخذ: آیت:۱۲،۱۱۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ ق

اس سورت کا اصل موضوع آخرت کا اثبات ہے، اسلام کے عقائد میں عقیدۂ آخرت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، یہی وہ عقیدہ ہے جو انسان کے قول وفعل میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے، اور اگر یہ عقیدہ دل میں پیوست ہو جائے تو وہ ہر وقت انسان کو اس بات کی یاد دلاتا رہتا ہے کہ اسے اپنے ہر کام کا اللہ تعالی کے سامنے جواب دینا ہے، اور پھر یہ عقیدہ انسان کو گناہوں، جرائم اور ناانصافیوں سے دور رکھنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے، اس لئے قرآن کریم نے آخرت کی زندگی کو یاد دلانے پر بہت زور دیا ہے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابۂ کرام ہر وقت آخرت کی زندگی کو بہتر بنانے کی فکر میں لگے رہتے تھے، اب جو مکی سورتیں آرہی ہیں، ان میں زیادہ تر اسی عقیدے کے دلائل اور قیامت کے حالات اور جنت اور دوزخ کی منظر کشی پر زور دیا گیا ہے، سورۂ ق کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت فجر اور جمعہ کی

نمازوں میں اس سورت کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ (توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی پچاسویں سورہ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۳۴ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۳ رکوع، ۴۵ آیات، ۳۷۶ کلمات اور ۱۵۲۵ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء حروف مقطعات میں سے لفظ ق سے ہے جس کی تفاسیر علماء نے مختلف فرمائی ہیں۔ اس لئے بطور علامت اس سورۃ کا نام سورۂ ق مقرر ہوا۔

ربط:

گزشتہ سورہ کے ختم پر ''واللہ بصیر بما تعملون'' میں وقوع مجازات کی طرف اشارہ ہے اور اس سورۃ میں تمام تر یہی بعث اور جزاء کا مضمون ہے، اس کا امکان، اس کا وقوع، اس کے واقعات اور جو مضامین ان کے مناسب ہیں مذکور ہے، جس سے دونوں سورتوں کے درمیان تناسب ظاہر ہے۔

فائدہ:

ق بعض نے کہا کہ خدا کا نام ہے، بعض نے کہا کہ قادر۔ قدیر۔ قہار۔ قدوس۔ قیوم کی کنجی اور ابتداء ہے یا ق کے معنی اللہ قائم بالقسط ہیں اور بعض نے فرمایا کہ ق ایک پہاڑ کا نام ہے جو زمین کو گھیرے ہوئے ہے، اس کو حق تعالیٰ نے سبز زمرد کا بنایا ہے۔ باری تعالیٰ نے لفظ ق سے اس کی قسم کھائی ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ قسم ہے قدرت خدا اور قرب الٰہی کی جس کی خبر ''ونحن اقرب الیہ من حبل الورید'' سے اس سورۃ میں دی گئی ہے یا اللہ رب العزت نے اپنے حبیب کی قوت قلب کی قسم کھائی ہے۔ واللہ اعلم!

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کے شروع میں اللہ رب العزت نے قرآن مجید کی قسم کھائی ہے اور فرمایا ہے کہ جن کے پاس قرآن کریم بھیجا گیا ان کو اس بات پر تعجب ہوا کہ ان کے پاس پیغمبر انہیں کی جنس میں سے کیسے آ گیا۔ اور وہ کہنے لگے کہ یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے۔ مزید یہ کہ جو پیغمبر یہ کتاب لے کر آیا ہے وہ یوں کہتا ہے کہ تم کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے۔ یہ تو اور بھی بعید ہے، کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو پھر دوبارہ زندہ ہوں گے؟ کفار کے ان اشکالات کا جواب دیتے ہوئے بتلایا گیا کہ یہ مانا کہ انسان مر کر مٹی ہو جائے گا اور اس کے اجزاء زمین میں بکھر جائیں گے لیکن اللہ کے علم میں ہے کہ اس کے بدن کا ذرہ ذرہ کہاں ہے؟ اس لئے ہر جگہ سمیٹ کر ان اجزاء کو پھر اکٹھا کر کے انسان کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوگا اور اس کی قدرت کی نشانیاں اب بھی دنیا میں ظاہر ہیں، آسمان کی طرف دیکھو اتنی بڑی چھت بغیر کسی ستون اور سہارے کے کس طرح کھڑی ہے اور کس طرح ستارے جگمگا رہے ہیں، پھر آسمان میں نہ کوئی سوراخ ہے

نہ دراڑ۔ پھر زمین کو دیکھو کہ کس طرح دور تک پھیلی ہوئی ہے اور وزنی پہاڑ اس پر جمے ہوئے ہیں اور قسم قسم کی چیزیں اس زمین سے اگ رہی ہیں۔ پھر آسمان سے بارش ہوتی ہے، مردہ زمین زندہ ہو کر ہری بھری ہو جاتی ہے، اور اس میں جان پڑ جاتی ہے اس طرح انسان بھی مرنے کے بعد دوبارہ پیدا ہو جائے گا، اس کے بعد بتلایا گیا کہ اللہ اور اس کے رسول کا انکار کر کے کسی نے بھی اچھا پھل نہ پایا بلکہ انکار کرنے والے بری طرح ہلاک ہوئے۔

چنانچہ پہلے قوم نوح، اصحاب الرس، عاد، ثمود، قوم فرعون، قوم لوط، اصحاب الایکۃ اور قوم تبع ہر ایک نے اپنے رسول کو جھٹلایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تکذیب کرنے والے ہلاک ہو گئے، اس لئے لوگوں کو گزشتہ قوموں کے حالات سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ پھر خود انسان کی پیدائش اور اس کے متعلق خدائی قدرت کا اظہار کیا گیا کہ یہ انسان آپ ہی آپ نہیں بن گیا بلکہ اللہ نے اس کو ارادہ سے پیدا کیا اور اس کے قول و فعل کے نگراں دو فرشتے اس کے ساتھ لگائے جو اس کی نیکی اور بدی فوراً لکھتے رہتے ہیں اور آخر ایک وقت اس انسان پر ایسا آتا ہے کہ جب اس پر موت کی بے ہوشی طاری ہوتی ہے اور موت کا آنا یقینی ہے، پھر جب انسان کو موت آ گئی اور اس کی دنیا کی زندگی ختم ہو گئی تو اس کے بعد ایک وقت آئے گا جب صور میں پھونک ماری جائے گی، اس وقت تمام انسان جہاں بھی ہوں گے پھر زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور وہ ہولناک دن شروع ہو جائے گا جس سے تمام اللہ کے رسول اور نبی ڈراتے چلے آئے ہیں۔ قیامت میں انسان اپنے اعمال کے مطابق جنت یا دوزخ میں جائے گا، اس کے بعد جنت و جہنم کی تکلیف بیان فرمائی گئی اور بتلایا گیا کہ انسان اللہ سے منہ موڑ کر جن کو دنیا میں اپنا ساتھی بنا رہا ہے وہ قیامت کے دن اس کے کچھ کام نہ آئیں گے، وہاں تو اس کی نجات ہوگی جو دنیا میں بن دیکھے اللہ سے ڈرتا رہے گا۔ اور دل سے اللہ کی طرف رجوع کرتا رہے گا اور اس سے غافل نہ ہوگا۔ سورۃ کے خاتمہ پر فرمایا گیا کہ یہ یقینی بات ہے کہ اللہ ہی زندہ کرتے ہیں، وہی موت دیتے ہیں اور اس کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے اور یہ اللہ کے لئے کچھ مشکل بات نہیں ہے۔ اخیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا گیا کہ آپ کو ان منکرین سے زبردستی بات منوانے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہے، بلکہ آپ کا کام اچھی طرح سمجھا دینا ہے گرچہ نصیحت وہی حاصل کرے گا جو اللہ کی وعید سے ڈرتا ہو۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت کا بنیادی موضوع عقیدہ آخرت کو ثابت کرنا ہے۔ طرز بیان اتنا سادہ ہے کہ آدمی تھوڑی سی توجہ دے تو اس کو اپنی ذمہ داری پوری کرنے کا ولولہ پیدا ہو جائے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سورۃ کو کبھی جمعہ کے خطبہ میں، کبھی فجر کی نماز میں، کبھی عید کی نماز میں پڑھا کرتے تھے، تاکہ ماحول بن جائے، جس سے ہر شخص شریعت کے فطری نظام سے واقف ہو اور اپنی مسئولیت کی فکر کرے، انسان اپنے لیے صحیح راستہ اختیار کرے، اسی لیے جہنم کو بیان کرتے ہوئے جنت کی تفصیل، ہدایت کے مقابلہ میں گمراہی کی وضاحت ہے۔

آخرت کے عقیدہ کو مضبوطی سے قائم کرنے کے لیے موت سے شروع کیا کیونکہ کہ وہ آخرت کی پہلی سیڑھی ہے، اور

اس طرح بیان کیا گیا ہے۔موت کی سکرات آ گئی ہے، بس یہی وہ چیز ہے جس سے وہ دور بھاگتا ہے،اور پھر صور پھونکا جائے گا،وہی جزا کا دن ہےاوراس کے آنے کی کیفیت کو بیان کیا،اس کو ہنکانے والا ہانک کرآئے گا اور وہ بھی گواہ کے ساتھ اوراس وقت کی ہولنا کی اس سے سمجھی جاسکتی ہے کہ فرشتہ یہ کہہ رہا ہوگا کہ تیرا دفتر (نامہ اعمال) تیار ہے۔اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں ڈالنے کاحکم دے گا، کیونکہ وہ نافرمان،اور بھلائی کے کاموں سے روک کر حد سے بڑھنے والے ہوں گے۔

انسان کوآخرت سے بیزار ہونے سے بچانے کے لیے تین چیزیں بتلائیں:

(۱) ہم ان خیالات سے واقف ہیں جو انسان کی پیدائش کے بعد اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ (۲) شیطان جو انسانوں کے ساتھ رہنے والا ہے وہ رب کے سامنے اپنا دفاع کرتا ہوا کہے گا کہ میں نے اسے باغی نہیں بنایا بلکہ وہ خودگمراہی کی طرف چل پڑا۔(۳) توانجام سے غفلت میں رہا،اب ہم نے تجھ سے غفلت کا پردہ ہٹا دیا ہے کہ آج تیری نظر بہت تیز ہے۔

اس نے آیت ۴۵ میں سکھایا کہ جوشخص جنت کا راستہ آسان کرنا چاہتا ہےاس کوقرآن کی تعلیمات پرعمل کرنا ضروری ہے۔(خواطرقرآنیہ)

قرآن کی قسم چھ بار:

اللہ پاک نے اپنے کلام میں چھ بارقرآن مجید کی قسم کھائی ہے۔

◇ص والقران ذی الذکر (ص:۱)

◇ق والقرآن المجید (ق:۱)

◇حم والکتب المبین (زخرف:۲)

◇حم والکتب المبین (دخان:۲)

◇یس والقرآن الحکیم (یس:۲)

◇والطور وکتب مسطور (طور:۲)

مشرکین کاتعجب:

یہ سورت بتاتی ہے کہ: مشرکین کو دوسری زندگی، اور انہی میں سے ایک انسان کے نبی بننے پر بڑا تعجب ہوتا تھا۔(۲،۳)

قدرت کاادراک:

حالانکہ محسوسات کی اس دنیامیں ایسے عجائبات اورمخلوقات کی کوئی کمی نہیں جن میں غور وفکر کر کے انسان اللہ کی بے پناہ قدرت کاادراک کرسکتا ہے۔(۶۔۱۱)

تکذیب کا راستہ:

ان سے پہلے قوم نوح، قوم ثمود، قوم عاد، قوم لوط، فرعون اور قوم شعیب بھی انہیں کی طرح تکذیب کا راستہ اختیار کر کے ہلاکت سے دوچار ہو چکے ہیں۔(۱۲۔۱۴)

انسان کا دوبارہ زندہ ہو کر حساب دینا:

ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝۳

سورہ ق کی آیت: ۳ سے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ منکرین کے انکار قرآن کی وجہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے عقیدہ کا بیان ہے کہ یہ کیسے ہوگا؟ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس ایسی محفوظ کتاب ہے جس میں ہر ایک کے اجزاء اور ذرات کی تفصیل اس طرح مذکور ہے کہ وہ زمین میں جہاں بھی چھپ جائے یا بکھر کر غائب ہو جائے تو وہ ہمارے علم میں رہتا ہے اور اسے جمع کر کے دوبارہ انسان بنا دینا ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں ہے۔

مسئولیت کا احساس:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۖ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝۱۶

اس سورت کی آیت: ۱۶ سے انسان کو اس کی مسئولیت کا احساس دلایا گیا ہے کہ انسان کے دل میں جو وساوس اور خیالات گزرتے ہیں ان تک کا اللہ کو علم ہے اور اس کے ساتھ دو فرشتے مقرر ہیں جو اس کے اعمال و اقوال کی نگرانی کرتے ہیں، جب موت آئے گی تو وہ انسان کے اعمال نامہ کو لپیٹ دیں گے اور پھر اسے میدان حشر میں اپنے اعمال کا حساب اور جواب دینا ہوگا۔ سورت کے اختتام پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشرکین کی بے ہودہ گوئی پر صبر کی تلقین اور صبح و شام اللہ کی تسبیح اور عبادت کی تلقین کی گئی ہے۔(خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

وسوسہ ایک معمولی سے خیال کا نام ہے جو انسان کے دل میں غیر اختیاری طور پر پیدا ہوتا ہے۔ عربی زبان میں اس کو ''ھاجس'' کہتے ہیں، گویا ایک ہلکا سا خیال آیا اور چلا گیا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو خیال آتا ہے وہ فوری طور پر نہیں جاتا بلکہ تھوڑی دیر توقف کے بعد جاتا ہے۔ اس کو خاطر کہتے ہیں۔ بعض اوقات کوئی قبیح خیال بھی آ جاتا ہے جس کو ''حدیث نفس'' کہا جاتا ہے، اس پر بھی اس وقت تک مؤاخذہ نہیں جب تک زبان سے اس کا تلفظ ادا نہ کیا جائے یا اس پر عمل نہ کیا جائے، انسان کے نفس میں بعض چیزیں ایسی بھی آتی ہیں جن سے انسان لطف اندوز ہوتا ہے، اس کو ''ہم'' کہتے ہیں اور یہ بھی ادنیٰ درجے کا ارادہ سمجھا جاتا ہے۔ البتہ انسان کے دل میں جو خیال آ کر پختہ ہو جاتا ہے اس کو عزم یا پختہ ارادہ کہا جاتا ہے۔ یہ ضرور قابل مواخذہ ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام وساوس قابل مواخذہ نہیں، فرمایا یہ باریک ترین چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔(معالم العرفان: ۱۷/ ۲۵۲)

موضوع سورۃ......اثبات مجازات (۱) قرآن مجید گواہ ہے کہ آپ مرسل من اللہ ہیں۔(۲) کفار آپ کی رسالت کو

تعجب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

خلاصہ رکوع:۱......(۱) اگر یہ لوگ قرآن حکیم میں غور کرتے تو انہیں مسئلہ رسالت میں شک نہ رہتا۔(۲) دراصل انکار کا باعث انکار مجازات ہے، اگر امم سابقہ کی تباہی میں غور کرتے تو (۳) معلوم ہو جاتا کہ ان کی تباہی کا موجب تکذیب رسل ہی تھا۔ ماخذ: (۱) آیت:۱۔(۲) آیت:۳۔(۳) آیت: ۱۴، ۱۳۔

خلاصہ رکوع:۲...... یہ تو مجازات کے منکر ہیں (۱) اور ہماری طرف سے ہر لحہ مجازات کی تیاری ہو رہی ہے (۲) اس دن ضال اور مضل ایک دوسرے کے سر تھوپیں گے لیکن یہ مخاصمت بیکار ہوگی۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۸۔(۲) آیت: ۲۳ تا ۲۸۔

خلاصہ رکوع: ۳......(۱) اس عذاب سے بچنے کے لئے ادب وانابت الی اللہ کی ضرورت ہے۔ اگر یہ لوگ باز نہ آئیں (۲) تو آپ اپنا تعلق باللہ شب و روز مضبوط سے اضبط بناتے رہیں، (۳) اور تشنہ لبوں کی تربیت فرمائیں۔ ماخذ: (۱) آیت: ۳۱ تا ۳۳۔(۲) آیت: ۳۹، ۴۰۔(۳) آیت: ۴۵۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الذاریات

یہ قرآن کریم کی ۵۱ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۶۷ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۳ رکوع، ۶۰ آیات، ۳۶۰ کلمات اور ۱۵۵۹ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے پہلے فقرے میں والذاریات کا لفظ آیا ہے۔ ذاریات وہ ہوائیں کہلاتی ہیں جو غبار وغیرہ اڑاتی ہیں، اس سورۃ کا نام ذاریات اسی ابتدائی فقرہ سے ماخوذ ہے۔

ربط:

پہلی سورۃ میں معاد کا ذکر تھا اور اس سورۃ میں یہی مضمون زیادہ ہے، چنانچہ سورۃ کی ابتداء اسی مضمون سے فرمائی گئی ہے۔

خلاصہ سورۃ:

سورۃ کی ابتداء قیامت کے ذکر سے اس طرح فرمائی گئی کہ تم ہواؤں کو دیکھتے ہو کہ جب گرمی اور خشکی بڑھ جاتی ہے تو تیزی کے ساتھ گرد وغبار اڑانے والی آندھیاں آتی ہیں، پھر یہی ہوائیں پانی سے بھرے ہوئے بادل اٹھالاتی ہیں پھر ان بادلوں کو جگہ جگہ پہنچاتی ہیں اور ادھر ادھر اللہ کے حکم کے مطابق بارش برساتی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہواؤں کے چلنے کا ایک مقصد ہے، اس طرح انسان کی اس دنیا کی زندگی بھی ایک مقصد ہے، اس کے دنیا میں کئے ہوئے اعمال کے نتیجے ایک دن کھلیں گے اور عدل وانصاف کے ساتھ ہر ایک کو اس کے اعمال کا بدلہ ملے گا، یہ فیصلہ قیامت میں ہوگا جس کی طرف سے

لوگ بہت غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، حتیٰ کہ بعض اس کے وقوع ہی کا انکار کرتے ہیں مگر ان کے انکار سے کیا ہوتا ہے، یہ تو اپنی اٹکل چلاتے ہیں حالانکہ قیامت کا آنا لازمی ہے اور اس دن گمراہ بدکاروں کو جہنم میں ڈالا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ انہیں شرارتوں کی سزا ہے جو تم نے دنیا میں کیں اور جس کا تم دنیا میں مذاق اڑایا کرتے تھے کہ قیامت آنی ہے تو کیوں نہیں آجاتی، ان کے برخلاف جو دنیا میں ایمان لائے اور عمل صالح کئے اور پرہیزگاری کی زندگی گزاری وہ جنت میں داخل ہوں گے، پھر امکان قیامت پر بطور دلیل بتلایا گیا کہ آسمان وزمین کی ساری نشانیاں اور خود انسان کے اندر کی نشانیاں یہی جتلاتی ہیں کہ یہ کارخانہ ایک دن ختم ہوگا اور قیامت قائم ہوگی، اللہ کے تمام رسولوں نے یہی بتایا ہے، جنہوں نے ان کی بات سے انکار کیا تباہ ہوئے، پھر اس کی تائید میں حضرت ابراہیم، قوم لوط، قوم فرعون، قوم عاد، ثمود اور قوم نوح کا ذکر فرمایا گیا اور ماننے والوں اور انکار کرنے والوں کا انجام ذکر فرمایا کہ ان کی کیسی گت دنیا میں بنی اور کیا کیا آفات ان پر آئیں، اس لئے اخیر میں سمجھایا گیا کہ اگر آفتوں سے بچنا ہے تو اللہ کی ذات پر یقین کرو اور سمجھ لو کہ زمین آسمان ایک اللہ کے بنائے ہوئے ہیں، تم اس کی پناہ لو اور کسی کی طرف نہ جھکو، شرک مت کرو، اللہ کا انکار مت کرو، وہی تمہیں رزق دیتا ہے اور تمہاری پرورش کے سامان فراہم کرتا ہے اور تم سے یہی چاہتا ہے کہ تم اس کی اطاعت وفرمانبرداری کرو، اس کے مقرر کئے ہوئے راستہ کو اختیار کرو، اب جو اللہ کے حکم کو نہیں مانتا اور اپنی خواہش پر چلتا ہے وہ ظالم ہے اور قیامت آنے والی ہے، اس دن ان لوگوں سے باز پرس ہوگی اور جب وعدہ کے مطابق وہ دن آجائے گا تو پھر ان منکرین کے بنائے کچھ نہ بنے گی۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مضامین:

اس سورہ کی تعلیمات کے مندرجہ ذیل گوشے ہیں:

(۱) قیامت کے واقع ہونے پر مختلف آثار کائنات سے شہادت۔

(۲) قیامت کے اندیشہ سے بےفکری کا سبب خواہش نفس کی اتباع ہے۔

(۳) خواہشات نفس پر عمل داری مال ودولت کی ہوتی ہے۔ اس لئے مال ودولت کے بارے میں اسلام کا اصولی طور پر جو نظریہ ہے، اس کی تعلیم دی گئی ہے۔

(۴) کائنات اور نظام کائنات کے ذریعہ توحید کا سبق۔

(۵) سوسائٹی میں بےحیائیوں کے خوفناک نتائج کی نشان دہی اور اس کے لئے تاریخی شہادت کے طور پر قوم لوط کی تباہی کا تذکرہ۔

(۶) دنیوی آرائشوں پر اتراتے ہوئے حق سے اعراض کے خطرناک نتائج، اور اس کے لئے فرعون، قوم عاد وثمود اور قوم نوح کا بطور تاریخی شہادت تذکرہ۔

(۷) رسول اور رسول کے توسط سے مسلمانوں کو دعوت دین میں لگے رہنے کی ہدایت، اور مخالفین کی ایذا رسانیوں پر صبر وضبط کی ہدایت۔

(۸) انس وجن کی پیدائش کی اصل غرض وغایت کا بیان۔ (خلاصہ مضامین قرآنی)

قرآن پاک میں متعدد جگہ اللہ تعالی نے قسمیں کھائی ہیں جن میں زیادہ تر حق تعالی نے اپنی مخلوق کی اور صرف ۷ مقامات پر اپنی ذات پاک کی قسم کھائی ہے۔ علماء نے لکھا ہے قسم تاکید کے لئے ہوتی ہے اور حق تعالی نے قسمیں اس لئے کھائی ہیں کہ بندوں پر حجت پوری ہوجائے۔ بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن کریم عربوں کی زبان میں نازل ہوا اور عربوں کا طریقہ تھا کہ کوئی کلام اور بیان اس وقت تک فصیح وبلیغ نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کہ اس میں قسمیں نہ ہوں۔ اس لئے قرآن کریم میں بھی قسمیں کھائی گئیں، تاکہ فصاحت عرب کی یہ قسم بھی کلام ربانی میں رہنے نہ پائے۔

اس سورت کے شروع میں ہی چار چیزوں کی قسم کھا کر اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۙ﴿۱﴾ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ﴿۲﴾ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۙ﴿۳﴾ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۙ﴿۴﴾ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۙ﴿۵﴾ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۶﴾

"جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ سچ ہے اور انصاف کا دن ضرور واقع ہوگا۔ پھر اس کے بعد ایک اور قسم آسمان کی کھا کر فرمایا کہ تم متضاد باتوں میں پڑے ہوئے ہو، یعنی اللہ کو خالق بھی مانتے ہو اور اس کی اس قدرت کا بھی انکار کرتے ہو کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

اس سورت کی آیت ۱۶ سے متقین کا اچھا انجام اور ان کی اعلیٰ صفات کا بیان ہے کہ:

(۱) وہ نیک اعمال کرتے ہیں، (۲) رات کو کم سوتے ہیں (۳) سحر کے وقت توبہ اور استغفار کرتے ہیں (۴) ان کے اموال میں مانگنے والوں اور نہ مانگنے والوں دونوں کا حق ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عظمت وقدرت کی نشانیاں:

آیت ۲۰/ سے اللہ تعالی کی عظمت وقدرت کی تین نشانیاں ذکر کی گئی ہیں۔

(۱) **پہلی نشانی زمین ہے**، ارشاد ہوتا ہے: "اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔ مثلاً: زمین گول ہونے کے باوجود ایسے بچھا دی گئی ہے جیسے کوئی بچھونا بچھایا جاتا ہے۔ اس میں آنے جانے والوں کے لئے راستے بھی ہیں اور اس کے علاوہ میدان، پہاڑ، سمندر، دریا، چشمے اور لوہا، تانبا، سونا، چاندی، کوئلہ اور پیٹرول جیسی خاموش معدنیات بھی، اس میں رب تعالی نے وہ سب کچھ رکھ دیا ہے جس کی انسانوں کو زندگی گزارنے کے لئے ضرورت پیش آسکتی ہے۔

(۲) آیت: ۲۱ میں دوسری نشانی بیان کی گئی ہے **جو کہ خود انسان ہے** جو کہ حقیقت میں عجائب میں سے سب سے بڑا عجوبہ ہے، کروڑوں اور اربوں انسانوں میں سے ہر ایک کی صورت، رنگ، چلنے کا انداز، لہجہ، آواز، طبیعت اور عقلی سطح

مختلف ہے۔اسی لئے فرمایا گیا ہے: اور تمہارے نفوس میں (بھی تو نشانیاں ہیں) کیا تم دیکھتے نہیں۔

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں: جو شخص اپنی تخلیق کے بارے میں غور وفکر کرے گا، وہ جان لے گا کہ اسے پیدا کیا گیا ہے اور اس کے جوڑ اور اعضاء عبادت کے لیے نرم ہوجائیں گے۔

(۳) آیت: ۲۲ میں تیسری نشانی بیان کی گئی ہے **اور تمہارا رزق اور جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان میں ہے**۔ انسان کی زندگی اور اسباب زندگی کی فراہمی کا بہت زیادہ انحصار آسمان پر ہے، یعنی انسانی زندگی بارش کے برسنے اور شمس وقمر کے ظہور پر موقوف ہے۔ موسموں کا ادل بدل بھی انہی سے تعلق رکھتا ہے جو کہ غلہ جات کو اگانے اور پکانے میں خاص تاثیر رکھتا ہے۔

سورت کے اختتام پر جن وانس کی تخلیق کا مقصد بتایا گیا ہے جو کہ اللہ تعالی کی معرفت اور عبادت ہے اور یہ خبر دی گئی ہے کہ ساری مخلوق کے رزق کا اللہ کفیل ہے اور کفار ومشرکین کو قیامت کے دن کے عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ (خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ...... جزاء اعمال یقینی ہے۔

خلاصہ رکوع:۱...... مجازات یقینا ہونے والی ہے۔ ماخذ: آیت: ۵، ۶، ۱۳، ۱۵، ۲۳، ۱۶۔

خلاصہ رکوع: ۲...... جزاء اعمال یقینی ہے۔ ماخذ: آیت: ۳۲، ۳۸ تا ۴۰، ۴۱، ۴۳، ۴۲ تا ۴۶، ۴۵۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

چھبیسویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) استقامت کہتے ہیں ایمان اور عبادت پر ثابت قدم رہنے کو اور اس کو ایک ہزار کرامتوں سے افضل قرار دیا گیا ہے۔

(۲) والدین کے ساتھ نیکی کرنا اور ان دونوں کی اطاعت کرنا واجب ہے۔

(۳) والدین کی نافرمانی کبیرہ گناہ ہے۔

(۴) فلاح اور کامیابی کا راستہ ایمان اور اعمال صالحہ ہیں اور خسارہ اور نقصان کا راستہ شرک اور معاصی ہے۔

(۵) کفر اور شرک کی حالت میں نیکی والے اعمال بھی اس کو قیامت کے دن فائدہ نہیں دیں گے۔ ہاں دنیا میں مال اور اولاد میں کچھ دنیوی فوائد مل جائیں گے۔

(۶) اہل ایمان کی ولایت تقوی ہے۔

(۷) اللہ کے انعامات بندے پر شکر کو واجب کرتے ہیں اور شکر مغفرت اور زیادتی انعام کو واجب کرتا ہے۔

(۸) کفر موجب عذاب ہے اور جو رجوع کرتا ہے اللہ کی طرف اور صدق دل سے مغفرت طلب کرتا ہے اس کی مغفرت کردی جاتی ہے۔

(۹) مومن کے لئے سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس کے دل میں ایمان کے ذریعے اللہ کی محبت بھر جائے اور کفر، فسق اور عصیان کی نفرت بیٹھ جائے، اس کی وجہ سے مؤمن اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مخلوق میں سب سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوجاتا ہے۔

(۱۰) شرف اور کرم کا تعلق صرف تقوی سے ہے، حسب نسب سے نہیں۔ حدیث شریف میں ہے عربی کو عجمی پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں مگر صرف تقوی کی وجہ سے۔

***

پارہ:۲۷

مہمان فرشتوں کی مہم:

چھبیسویں پارہ کے آخر میں ان فرشتوں کا ذکر تھا جنہیں حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام عام مہمان سمجھے تھے، جب آپ پر ان کی حقیقت کھلی اور پتہ چلا کہ یہ فرشتے ہیں تو آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ:

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ﴿۳۱﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ﴿۳۲﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ﴿۳۳﴾

کس مہم پر آئے ہو، انہوں نے بتایا کہ ہمیں قوم لوط پر پتھروں کی بارش برسانے اور انہیں تباہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

علمی تحقیق کا اعلان:

قوم لوط کے علاوہ سورۂ ذاریات فرعون، قوم عاد، قوم ثمود اور قوم نوح کا انجام بتلانے کے بعد ارض وسماء کی تخلیق کی طرف متوجہ کرتی ہے اور اس علمی تحقیق کا اعلان کرتی ہے کہ اللہ نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے۔ (۴۹)

خلاصہ رکوع: ۳......(۱) جزاء اعمال یقینی ہے۔ (۲) جن اور انسان کی پیدائش کی غرض۔ ماخذ: (۱) آیت: ۴۹۔ (۲) آیت: ۵۶۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ طور

یہ قرآن کریم کی ۵۲ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا شمار ۷۶ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۴۹ آیات، ۳۱۹ کلمات، ۱۳۳۴ حروف ہیں، یہ سورہ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء لفظ طور سے ہوئی، اس کو اس سورہ کا علامتی نام قرار دیا گیا، طور سے وہ پہاڑ مراد ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے ہم کلامی کی اور آپ کو توریت ملی۔

ربط:

سورۂ طور کا سورۂ والذاریات سے ربط یہ ہے کہ پہلی سورۃ یوم موعود کی وعید پر ختم ہوئی اور یہ سورۃ یوم موعود کی وعید سے شروع ہوئی ہے۔ پھر حسب عادت قرآنیہ مؤمنین کے لئے وعدہ مذکور ہے، اس سے دونوں سورتوں کے درمیان تناسب

ظاہر ہے۔

خلاصہ سورۃ:

چونکہ یہ سورۃ بھی مکی ہے، اس لئے اس میں بھی عقائد سے متعلق مضامین ہیں، اس سورۃ کی ابتداء بھی قسمیہ کلام سے فرمائی گئی ہے اور اللہ اپنی مخلوق میں سے ان چیزوں کی قسم کھا کر۔ جو اس کی عظیم الشان قدرت کی نشانیاں ہیں۔فرماتا ہے کہ انسان اچھی طرح سمجھ لے کہ نافرمانوں کے لئے اللہ کا عذاب آ کر رہے گا اور جب وہ آجائے گا تو کسی کی مجال نہیں کہ اسے ہٹا سکیں اور یہ عذاب قیامت کے دن جب آئے گا تو بڑا ہولناک وقت ہوگا، آسمان لرزنے اور تھرتھرانے لگے گا، پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے اور روئی کے گالے کی طرح اڑتے پھریں گے، جب وہ دن آجائے گا تو اس دن اللہ اور اس کے رسول کی باتوں کا انکار کرنے والوں کی شامت آجائے گی، وہ لوگ جنہوں نے کھیل کود میں عمر گنوائی ہوگی وہ اس دن جہنم کی آگ میں دھکیل دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا: یہ ہے وہ آگ جس کو تم دنیا میں جھوٹ سمجھتے تھے، اب بتاؤ کیا یہ جادو ہے؟ تم دنیا میں اللہ کے رسولوں کو جادوگر اور ان کی باتوں کو جادو کہتے تھے، بتاؤ یہ عذاب جہنم کیا ہے، کیا ایسے ہی اندھے بنے رہو گے جیسے دنیا میں تھے؟ اب اس جہنم میں داخل ہو جاؤ اور اس میں خواہ تم چیخو چلاؤ یا خاموش رہو۔ بہر حال تمہیں اسی میں رہنا پڑے گا اور یہ تمہارے ہی کرتوتوں کی سزا ہے، ان کے مقابل جو لوگ دنیا میں اللہ پر ایمان لائے اور اللہ کی باتوں کو سچا جانا اور اس کے عذاب سے ڈر کر بری باتوں سے ڈرتے رہے، تو ایسے لوگ اس دن یعنی قیامت میں جنت کے باغات میں راحت و آرام سے بیٹھے ہوں گے اور اللہ کی نعمتوں سے لطف اٹھا رہے ہوں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ جو نعمتیں اللہ نے تم کو دی ہیں خوب کھاؤ پیو، یہ تمہیں ان نیک کاموں کے بدلے میں ملا ہے جو تم دنیا میں کرتے تھے، یہ لوگ آرام سے گدوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے اور ان کو حوریں عطاء کی جائیں گی اور ان کے ساتھ ان کے متعلقین یعنی اہل وعیال کو بھی ملا دیا جائے گا بشرطیکہ انہوں نے بھی ایمان لا کر نیک کام کئے ہوں گے۔ اس روز ہر ایک کے ساتھ انصاف کیا جائے گا اور جیسے جس کے کام دنیا میں تھے ویسے ہی اس کو بدلہ ملے گا۔ نیک لوگوں کے لئے جنت میں صاف ستھرے نوعمر خدمت گزار ہوں گے جو ان کو ہر دم کھانے پینے کی چیزیں جنہیں ان کا دل چاہے گا لا لا کر دینے کے لئے حاضر رہیں گے اور جنتی ایک دوسرے سے کہیں گے کہ دنیا میں ہم ڈرتے تھے کہ معلوم نہیں ہمارا کیا حشر ہوگا اور اللہ سے دعا کرتے تھے کہ ہمیں آگ کے عذاب سے بچائے، سو الحمدللہ اس نے ہمیں بچا لیا وہ بڑا رحیم وکریم ہے۔ سورۃ کے خاتمہ پر رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ لوگوں کو دین و آخرت کی باتیں سناتے رہیئے جو بالکل سچی باتیں ہیں۔ اور جو منکرین ومکذبین ان کو جادو شعر اور اٹکل پچو باتیں کہتے ہیں تو ان کا کہنا بالکل غلط ہے، یہ تو اللہ کا کلام ہے اگر یہ نہیں مانتے تو اب اللہ کے عذاب کا انتظار کریں، وہ ان کو آ کر دبوچ لے گا اور آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ان کو سزا ملے گی، پس آپ صبر سے اللہ کے حکم کی تعمیل کئے جائیں، اللہ آپ کو برابر دیکھ رہا ہے، وہ آپ کی حفاظت فرمائے گا اور آپ اپنے رب کی حمد وثنا میں لگے رہیئے۔

واللہ اعلم!

فائدہ:

اس سورۃ کے شروع میں اللہ نے پانچ قسمیں کھائی ہیں۔

◇ کوہ طور کی قسم یعنی اس پہاڑ کی قسم جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہم کلامی حاصل ہوئی اور توریت عطاء فرمائی گئی۔

◇ اس کتاب کی قسم جو کاغذ میں لکھی ہوئی ہے، اس کتاب سے بعض نے لوح محفوظ مراد لیا ہے اور بعض نے لوگوں کے اعمال نامے، بعض نے تورات، بعض نے قرآن کریم یا تمام آسمانی کتب۔

◇ بیت معمور کی قسم، بیت معمور ساتویں آسمان میں فرشتوں کا کعبہ ہے اور ٹھیک دنیا کے خانہ کعبہ کے مقابل ہے، بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ شب معراج میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ساتویں آسمان پر پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت معمور کی طرف پہنچایا گیا جہاں پر روز ستر ہزار فرشتے عبادت وطواف کے لئے داخل ہوتے ہیں اور پھر ان کو وہاں دوبارہ جانے کی نوبت نہیں آتی۔

◇ سقف مرفوع یعنی اونچی چھت کی قسم، اس سے مراد آسمان یا عرش عظیم۔

◇ بحر مسجور کی قسم یعنی ابلتے ہوئے سمندر کی، یعنی قسم ہے اس سمندر کی جو آگ بنا دیا جائے گا جیسا کہ سورۂ تکویر میں ہے **واذاالبحار سجرت**۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورت کی ایک آیت جو سب کو ہوش میں لانے کے لیے کافی ہے کہ ہر کوئی اپنے اعمال کی اصلاح کر لے، ورنہ آخرت میں اپنے ہی اعمال کے بدولت پکڑا جائے گا۔(۲۱)

اعمال کے مطابق ٹھکانہ:

جو لوگ آخرت کے انکاری ہیں اور غیر ذمہ داری کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کا آخری ٹھکانہ جہنم ہے، انہیں فرشتے کے طعنے سننے پڑیں گے کہ یہ وہی آگ ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے، کیا یہ جادو ہے جو نظر نہیں آتا؟ اندر داخل ہو جاؤ، صبر کرو یا نہ کرو، آج سب کچھ برابر ہے۔(۱۱-۱۶)

اس کے مقابلہ میں جو رب چاہی زندگی گذارتے ہیں، ان کے لیے باغات اور طرح طرح کے انعامات ہیں۔اور ان کو خوش کرنے کے لیے کہا جائے گا کہ آپ کے اعمال کے نتیجے میں مزے کرو۔ (۱۷-۱۹) (خواطر قرآنیہ)

یہ پانچ قسمیں کھا کر فرمایا گیا ہے "**ان عذاب ربك لواقع**" یعنی بے شک آپ کے رب کا عذاب منکرین ومکذبین کے لئے ضرور نازل ہو کر رہے گا، کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا۔ یہ تمام چیزیں جن کی یہاں قسم کھائی گئی ہے شہادت دیتی ہیں کہ وہ خدا بہت بڑی قدرت اور عظمت والا ہے۔ پھر اس کی نافرمانی کرنے والوں پر عذاب کیوں نہیں آئے گا اور کس کی طاقت ہے جو اس کے بھیجے ہوئے عذاب کو الٹا واپس کر دے۔

دلوں پر قرآن کی تاثیر:

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ایک روایت لکھی ہے کہ ایک رات حضرت عمر فاروقؓ شہر کی دیکھ بھال کے لئے نکلے تو ایک مکان سے کسی مسلمان کی قرآن خوانی کی آواز کان میں پڑی۔ وہ یہی سورۂ طور پڑھ رہے تھے۔آپ نے سواری روک لی اور کھڑے ہوکر قرآن سننے لگے، جب وہ اس آیت پر پہنچے **ان عذاب ربك لواقع ماله من دافع**'' تو آپ کی زبان سے نکل گیا کہ رب کعبہ کی قسم سچ ہے، پھر سواری سے اتر پڑے اور دیوار سے سہارا لگا کر بیٹھ گئے۔ چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہی، دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد جب ہوش وحواس ٹھکانے آئے تو اپنے گھر پہنچے، لیکن خدا کے کلام کی اس ڈراؤنی آیت کے اثر سے دل کی کمزوری کی یہ حالت تھی کہ مہینہ بھر تک بیمار پڑے رہے کہ لوگ بیمار پرسی کو آتے تھے۔ گو کسی کو معلوم نہ تھا کہ بیماری کیا ہے؟

اسی طرح قرآن کی شدت تاثیر کے حوالے سے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ زمانہ کفر میں بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں بات چیت کرنے کے لیے مدینہ منورہ آئے، وہ جب پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز مغرب میں سورۂ طور کی تلاوت فرما رہے تھے، جب آپ نے آیت: إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ پڑھی جس کا ترجمہ ہے: بے شک تیرے رب کا عذاب واقع ہوکر رہے گا'' تو حضرت جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے یوں لگا کہ میرا دل پھٹ جائے گا، چنانچہ میں نے نزول عذاب کے ڈر سے اسلام قبول کرلیا، پھر جب آپ نے آیت ۳۵ اور ۳۶ تلاوت فرمائی جس میں اللہ تعالی سوال فرماتے ہیں:

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝۳۵

کیا یہ کسی کے پیدا کیے بغیر ہی پیدا ہو گئے یا انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو پیدا کرلیا یا انہوں نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے؟ (نہیں بلکہ یہ یقین ہی نہیں رکھتے۔تو فرماتے ہیں کہ یہ آیات سن کر مجھے خیال ہوا کہ میرا دل اور ہوش وحواس اڑ جائیں گے۔

تاثیر قرآن کے بے شمار واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں مگر تمام واقعات کا جمع کرنا مقصود نہیں ہے۔اصل مقصد یہ ہے کہ ہم ان واقعات سے سبق حاصل کریں اور ہم بھی قرآن کی تلاوت اور سماع غور وتدبر سے کریں تا کہ ہمارے دل بھی متاثر ہوں۔

متقین کا دائمی مسکن:

آیت ۱۷ سے یہ سورت متقین کے دائمی مسکن یعنی جنت کا تذکرہ کرتی ہے کہ وہاں انہیں حور وغلمان، لذیذ پھل، گوشت اور لبالب جام جیسی نعمتیں مہیا ہوں گی۔

آیت ۲۱ سے اہل جنت کے لئے ایک خاص نعمت کا تذکرہ ہے۔اللہ تعالی اپنے فضل سے متقین کی اولاد کو ان ہی کے

درجہ اور مقام پر پہنچا دے گا اور جنت میں ان کے ساتھ کر دے گا، گو اس اولاد کے اعمال و احوال اپنے بزرگوں کے رتبہ کے نہ ہوں گے۔ یہ متقین کا اکرام اور عزت افزائی کے لئے ہوگا کہ ان کی ایماندار اولاد کو بھی ان کے درجہ میں ان کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا اور یہ شامل کر دینا اور ساتھ رکھنا اس طرح نہ ہوگا کہ متقین کے اعمال میں سے کچھ لے کر ان کی اولاد کو دے دیا جائے اور کاملین کی بعض نیکیوں کا ثواب کاٹ کر ان کی ذریت کو دے دیا جائے نہیں، بلکہ اللہ کا یہ فضل و احسان ہوگا کہ کمتروں کو ابھار کر کاملین کے درجہ میں پہنچا دیا جائے گا۔

جنت میں آپس میں بات چیت کرتے ہوئے کہیں گے:

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

”ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں کے درمیان ڈرا کرتے تھے، پس اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں تیز گرم ہواؤں کے عذاب سے بچا لیا، ہم اس سے پہلے ہی اس کی عبادت کیا کرتے تھے۔ بیشک وہ محسن اور مہربان ہے۔“ (۲۵۔۲۷)

دعوت کے بارے میں مشرکین کا موقف:

اگلی آیات میں یہ سورت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے بارے میں مشرکین کے موقف کی وضاحت کرتی ہے کہ وہ آپ کے ساتھ استہزاء کرتے تھے اور آپ کو کاہن اور مجنون قرار دیتے تھے۔ اللہ نے نبی کو حکم دیا کہ آپ دعوت و تذکیر کا سلسلہ جاری رکھیں، یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ (۲۹)

سورت کے اختتام پر مشرکین کے باطل خیالات کی تردید کی گئی ہے۔ الوہیت اور وحدانیت پر دلائل قائم کیے ہیں اور ان احمقوں کی مذمت کی گئی ہے جو ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ و دعوت میں صبر کرنے اور اللہ کی تسبیح و تحمید کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ خبر دی گئی ہے کہ اللہ آپ کی حفاظت کرے گا اور ظالموں کو دو عذابوں کا سامنا کرنا پڑے گا، ایک دنیا کا عذاب اور دوسرا آخرت کا عذاب۔ (۴۷)

آیت ۴۸، ۴۹ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تاکید کی گئی ہے کہ آپ اٹھتے وقت یعنی مجلس سے یا سونے سے اٹھتے وقت اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیا کیجئے اور رات کے کسی حصہ میں بھی اس کی تسبیح کیا کیجئے اور ستاروں کے غروب ہونے کے بعد بھی۔ غرض دن اور رات کے مختلف اوقات میں اللہ کی تسبیح و تحمید بیان کرتے رہا کریں۔ (خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:...... بداعمالی کی سزا یقینی ہے۔

خلاصہ رکوع: ۱...... معاندین حق پر عذاب آنے والا ہے۔ ماخذ: آیت: ۷، ۱۱، ۱۳، ۱۴، ۱۶۔

خلاصہ رکوع: ۲...... آپ تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھیں، کیا آپ کا ارشاد نہ ماننے میں انہیں مندرجہ ذیل امور مانع ہیں۔

ماخذ: (۱) آیت: ۲۹۔ (۲) آیت: ۳۰، ۳۵، ۳۳، ۳۲، ۳۲ تا ۴۳۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ النجم

یہ قرآن کریم کی ۵۳ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۲۳ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۳ رکوع، ۶۲ آیات، ۵۶۵ کلمات اور ۱۴۵۰ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء ہی لفظ والنجم سے ہوئی، اس لئے علامت کے طور پر اس سورۃ کا نام النجم مقرر ہوا۔

ربط:

پہلی سورۃ کی طرح اس سورۃ میں بھی توحید و رسالت و بعثت و مجازات کا بیان ہے، جس سے دونوں سورتوں میں ارتباط ظاہر ہے۔

خصوصیت:

اس سورۃ کی خصوصیت میں مفسرین نے لکھا ہے کہ یہی سب سے پہلی سورۃ ہے جس میں آیت سجدہ نازل ہوئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ تلاوت کیا اور اس سجدہ میں ایک عجیب سورۃ یہ پیش آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورۃ مجمع عام میں تلاوت فرمائی، جس میں اہل ایمان و کفار سب شریک تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا تو اہل اسلام تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں سجدہ کرتے ہی ہیں، باقی سب لوگوں نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سجدہ کیا، تعجب کی خبر یہ پیش آئی کہ جتنے کفار و مشرکین تھے وہ بھی سب سجدہ میں گر گئے، صرف ایک متکبر شخص نے سجدہ نہیں کیا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے اس شخص کو کفر کی حالت میں مرا ہوا دیکھا ہے۔

فائدہ:

واقعہ معراج کے بعد اس سورۃ کا نزول ہوا اور محقق ارباب سیر و تاریخ کے نزدیک معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک یا ڈیڑھ سال قبل پیش آیا تھا۔

خلاصہ سورۃ:

سورۃ کی ابتداء قسمیہ کلام سے کی گئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت وحقانیت کا قسم کے ساتھ اعلان فرمایا کہ نہ آپ سیدھے راستہ سے ہٹے نہ غلط راستے پر چلے اور جو باتیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں وہ اپنی خواہش سے نہیں کہتے بلکہ اللہ کی وحی سے کہتے ہیں اور بتلایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بڑے قوت والے فرشتے یعنی حضرت جبرئیل کے ذریعے اللہ نے اپنی وحی بھیجی اور یہ فرشتہ دو مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی شکل میں نظر آیا۔ ایک اس

وقت جب کہ ابتدائے نبوت میں ایک مرتبہ وحی لے کر آئے اور سورۂ مدثر کی شروع کی آیتیں نازل ہوئیں اور دوسری مرتبہ شب معراج میں سدرۃ المنتہی کے قریب اور شب معراج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں اور ان کے دیکھنے میں نہ آپ نے غلطی کی اور نہ دل نے سمجھنے میں کوئی کمی کی۔ لہذا اے اہل مکہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنو اور مانو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہ سننا اور اپنے تجویز کردہ دیوی دیوتاؤں کو پوجنا جن کی حقیقت ہی کچھ نہیں محض غلط خیالات کی پیروی ہے، انسان کا ہر خیال صحیح نہیں ہوتا، بات وہی ٹھیک ہے جو اللہ نے اپنے رسول کی معرفت بتلائی کہ اللہ ہی معبود برحق ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، فرشتے بھی اللہ کے بندے اور مخلوق ہیں جو اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں، جو اللہ نے ان کے لئے مقرر کر دیئے ہیں۔ مشرکین نے فرشتوں کو عورتیں بتا کر ان کی بابت غلط خیال قائم کر لیا ہے اور ان کے عورتوں جیسے نام رکھ کر غلطی اور گمراہی میں پھنسے ہیں، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے کہ اے ہمارے رسول جب یہ لوگ اتنی بات نہیں سمجھتے، اپنی ہی بے تکی ہانکے جاتے ہیں اور ہماری باتوں کی طرف توجہ نہیں کرتے، ان کے نزدیک بس جو کچھ ہے دنیا ہی ہے، حالانکہ انسان کو مرنا ہے اور مرنے کے بعد اس کے اعمال کی جانچ ہونی ہے جن لوگوں نے برے کام کئے ہوں گے ان کو سزا ملے گی اور جنہوں نے اچھے کام کئے ہوں گے انہیں ان کا بہت اچھا بدلہ ملے گا اور اچھے کام کرنے والے وہ ہیں جو دنیا میں بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں اور کاموں سے بچتے ہیں اور گناہوں سے دور بھاگتے ہیں اور جان بوجھ کر ان میں نہیں پھنستے ایسے لوگ نیک لوگ ہیں ان سے اگر چھوٹے قصور ہو جائیں تو اللہ تعالی بڑی بخشش اور مغفرت والے ہیں۔ ان کی تقصیرات معاف کر دی جائیں گی انہیں باتوں کو سمجھانے کے لئے اور بدکاری سے روکنے کے لئے پہلے بھی اللہ کے رسول آئے اور انہوں نے انسانوں کو کام کی باتیں سمجھائیں اب اخیر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح سمجھانے اور ڈرانے آئے ہیں اور یہ کتاب اللہ کی بھیجی ہوئی آخری کتاب ہے جس میں ساری کام کی باتیں جمع کر دی گئی ہیں کیا اس کتاب کی باتیں سن کر یہ اہل مکہ تعجب کرتے ہیں اور انہیں سن کر ہنستے ہیں، حالانکہ اللہ سے ڈر کر رونے کا مقام ہے، کیونکہ قیامت آنے والی ہے جس کا صحیح وقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، پس انسانوں کو چاہئے کہ وہ خدا کے سامنے سر ٹیک دیں اور اسی معبود برحق کی بندگی کریں۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مضامین:

یہ سورہ مندرجہ ذیل مضامین و تعلیمات پر مشتمل ہے:

◇ رسالت محمدیہ کی صداقت کا اعلان۔

◇ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطا اور لغزش سے منزہ ہونے کا اعلان۔

◇ معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چند مشاہدات کا تذکرہ۔

◇ کفار ومشرکین کے باطل عقیدوں کی تردید۔

◇ اس کا بیان کہ انبیائے سابقین نے اس دین اور اس کے اصول کی دعوت دی تھی اور پہلے کی ساری آسمانی کتابوں میں اسی دین اسلام اور اس کے اصول کی تعلیمات ہیں۔

◇ اس کا بیان کہ رسول کی تکذیب کرتے ہوئے رو در رو، رسول کی مخالفت اور اس مخالفت پر اصرار خدائی عذاب کو حرکت میں لے آتا ہے، جس کا ثبوت عاد وثمود اور قوم نوح کی تاریخ دے رہی ہے۔

◇ انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب وتاکید۔ اور یہ کہ یہ انفاق نہایت خوش دلی سے ہونا چاہئے۔

◇ خدا کے غیر محدود علم کا تذکرہ۔

◇ آخرت کے مفاسد اور یہ کہ مختلف قسم کی گمراہیوں کا سرچشمہ انکار آخرت بنتا ہے۔ (خلاصہ مضامین قرآنی)

وحی یہ اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے:

آیت ۳ میں ارشاد فرمایا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝٣ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝٤

آپ نبی برحق ہیں، آپ کی زبان مبارک سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکلتا جو خواہش نفس پر مبنی ہو، بلکہ آپ جو کچھ دین کے باب میں ارشاد فرماتے ہیں وہ اللہ کی بھیجی ہوئی وحی اور اس کے حکم کے مطابق ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس بات کا قطعاً کوئی امکان نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی طرف سے باتیں بنا کر اللہ تعالی کی طرف منسوب کریں۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو کچھ سنتا تھا اسے حفظ کرنے کے لئے لکھ لیا کرتا تھا۔ پس بعض لوگوں نے مجھے اس سے روکا اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک انسان ہیں، کبھی کبھی غصہ اور غضب میں بھی کچھ فرما دیا کرتے ہیں، چنانچہ میں لکھنے سے رک گیا، پھر میں نے اس کا ذکر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا تو آپ نے فرمایا: لکھ لیا کرو۔ خدا کی قسم! جس کے قبضہ میں میری جان ہے! میری زبان سے سوائے حق بات کے اور کوئی کلام نہیں نکلتا۔

کافروں کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جو فرشتہ وحی لاتا ہے وہ انسان ہی کی شکل میں آتا ہے، اس لئے آپ کو یہ کیسے پتہ چلا کہ وہ فرشتہ ہی ہے؟ ان آیتوں میں اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس فرشتے کو کم از کم دو مرتبہ اپنی اصل صورت میں بھی دیکھا ہے۔ ان میں سے ایک واقعہ کا اس آیت میں تذکرہ فرمایا گیا ہے اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے یہ فرمائش کی تھی کہ وہ اپنی اصلی صورت میں آپ کے سامنے آئیں۔ چنانچہ وہ اپنی اصلی صورت میں افق پر ظاہر ہوئے اور آپ نے انہیں دیکھا۔ اس وقت آسمان ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ان کے وجود سے بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا، ان کے چھ سو بازو تھے۔

سورہ نجم مشرکین کی مذمت کرتی ہے جو لات وعزی اور منات جیسے بتوں کی عبادت کرتے تھے اور فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔(۱۹)

آیت ۲۳ میں ارشاد فرمایا:

اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهۡوَى الۡاَنۡفُسُ ۚ وَلَقَدۡ جَآءَهُمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمُ الۡهُدٰىؕ ﴿۲۳﴾

منکرین بے اصل خیالات اور اپنے نفس کی خواہش پر چل رہے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے ہدایت آچکی ہے۔ آج ان کفار ومشرکین کو تو چھوڑ یے، کتنے ایسے مسلمان ہیں کہ جو اللہ پاک کی ذات عالی پر ایمان بھی رکھنے کا دعوی کرتے ہیں، اللہ تعالی کو خالق، رازق اور مالک بھی جانتے ہیں مگر قرآن وسنت کی ہدایت کے باوجود اپنے نفس کی خواہشات پر چل رہے ہیں۔

اللہ تعالی ہمیں دین کی سمجھ اور فہم عطا فرمائے اور اپنی بھیجی ہوئی ہدایات یعنی قرآن وسنت اور اسلام وایمان کی سچی پیروی نصیب فرمائیں اور نفسانی اور شیطانی خواہشات سے باز رہنے کی توفیق ہم کو عطا فرمائیں۔

آیت ۳۲ میں ہے ''فلا تزکوا انفسکم''، ''تم اپنے آپ کو مقدس مت سمجھا کرو'' فرما کر اہل ایمان کو خود پسندی اور عجب سے منع فرمایا گیا، صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ حضرت زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا کا نام ان کے والدین نے برہ رکھا تھا جس کے معنی ہیں نیکوکار۔ آنحضرت ﷺ نے جب یہ نام سنا تو یہی آیت ''فلا تزکوا انفسکم'' تلاوت فرما کر اس نام سے منع کیا کیونکہ اس میں اپنے نیک ہونے کا دعوی ہے اور نام بدل کر زینب رکھ دیا۔

حدیث میں آتا ہے کہ خود پسندی آدمی کو تباہ کر دیتی ہے کیونکہ آدمی جب اپنے آپ کو نیکوکار اور مقدس سمجھنے لگتا ہے تو مطمئن ہو جاتا ہے اور پھر سعادت اخروی سے محروم ہو جاتا ہے۔

یہ سورت قیامت کا تذکرہ کرتی ہے جہاں نیک اور برے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ متقین کے بارے میں بتاتی ہے کہ وہ بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور کفار کے بارے میں بتلایا گیا کہ وہ اسلام سے اعراض کرتے ہیں۔(۳۵۔۳۲)

یہ سورت بتاتی ہے کہ ہر شخص انفرادی طور پر اپنے اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، کسی کے گناہوں کا بوجھ دوسرے پر نہیں لادا جائے گا اور انسان جو اپنی تعریف خود کرتا ہے اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔(۴۲۔۳۸)

قدرت ووحدانیت کے بعض دلائل مذکور ہے، مثلاً یہ کہ اللہ ہی ہنساتا اور وہی رلاتا ہے، وہی مارتا اور زندہ کرتا ہے، اس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا ہے، اس کے ذمے دوبارہ پیدا کرنا ہے کہ وہی مالدار بناتا اور سرمایہ دیتا ہے، اس نے نافرمان قوموں کو ہلاک کیا۔(۵۵۔۴۳)

سورت کے اختتام پر قرآن کے بارے میں مشرکین کا جو رویہ تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ''پس کیا تم

اس کلام سے تعجب کرتے ہو، ہنس رہے ہو، روتے نہیں ہو؟ بلکہ تم کھیل رہے ہو، اب اللہ کے سامنے سجدے کرو اور اس کی عبادت کرو۔" (۶۲-۵۹) (خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:......رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وحی الٰہی ہیں، اور تمہارے معتقدات ظن وتخمین پر مبنی ہے۔

خلاصہ رکوع ۱:...... ارشادات نبوی وحی الٰہی ہیں۔ اور تمہارے معتقدات ظنیات محضیہ ہے۔ ماخذ: آیت: ۴، ۲، ۱۰، ۵، ۲۳، ۱۱۔

خلاصہ رکوع: ۲......ان کے معتقدات ظنی ہیں، آپ ان کی پرواہ نہ کریں۔ ماخذ: آیت: ۲۷، ۲۸، ۲۹۔

خلاصہ رکوع: ۳......(۱) کیا انہیں علم نہیں ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کی جزا پائے گا۔ (۲) اور جزا اللہ تعالیٰ ہی عطا فرمائے گا، چنانچہ اس نے عاد، ثمود، قوم نوح وغیرہ کو (۳) شامت اعمال کے باعث تباہ کیا۔ ماخذ: (۱) آیت: ۴۱۔ (۲) آیت: ۴۲۔ (۳) آیت: ۵۰ تا ۵۴۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ القمر

یہ سورت مکہ مکرمہ میں اس وقت نازل ہوئی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کے دو ٹکڑے کرنے کا معجزہ دکھلایا، اسی لئے اس کا نام سورۂ قمر ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی، اس وقت میں بچی تھی، اور کھیلا کرتی تھی، سورت کا موضوع دوسری مکی سورتوں کی طرح کفار عرب کو توحید، رسالت اور آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دینا ہے، اور اسی ضمن میں عاد وثمود، حضرت نوح اور حضرت لوط علیہم السلام کی قوموں اور فرعون کے دردناک انجام کا مختصر لیکن بہت بلیغ انداز میں تذکرہ فرمایا گیا ہے، اور بار بار یہ جملہ دہرایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نصیحت حاصل کرنے کے لئے قرآن کریم کو بہت آسان بنادیا ہے، تو کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے۔ (توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی ۵۴ ویں نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۳۷ نمبر پر ہے۔ اس سورۃ میں ۳ رکوع، ۵۵ آیات، ۳۴۸ کلمات اور ۱۴۸۲ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی پہلی ہی آیت میں "وانشق القمر" کا جملہ آیا ہے یعنی چاند پھٹ گیا، جس میں اشارہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ شق القمر کی طرف، اس لئے علامت کے طور پر اس سورۃ کا نام قمر مقرر ہوا۔

فائدہ:

اس سورۃ میں معجزہ شق القمر کا ذکر آیا ہے جس سے اس کا زمانہ نزول متعین ہوجاتا ہے، اکثر محدثین ومفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے ۵ سال پہلے مکہ معظّمہ میں منیٰ کے مقام پر پیش آیا تھا۔

ربط:

سورۂ قمر کا سورہ نجم کے ساتھ رابطہ یہ ہے کہ سورۂ سابقہ کے ختم پر" ازفة الآزفة" میں ڈرانے کے واسطے قیامت کے قریب ہونے کا مضمون تھا اور اس مضمون سے اس غرض انزجار کے لئے اس سورۃ کا اختتام ہوا ہے، اس کے بعد اس سورۃ میں واقعہ شق القمر کو ذکر فرمایا چونکہ قرب قیامت کے زاجر ہونے کا مثبت ومؤکد ہے اور اس کے ساتھ مکذبین کا عدم انزجار اور عدم انزجار پر آپ کی تسلی اور ان کی تہدید احوال قیامت سے مذکور ہے۔

معجزہ شق القمر کے متعلق کسی نے کہا ہے:

معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں۔

خلاصہ سورۃ:

سورۃ کی ابتداء قیامت کے ذکر سے فرمائی گئی کہ قیامت برحق ہے، ضرور آکر رہے گی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے سے چاند کا پھٹ کر دو ٹکڑے ہو جانا قیامت کی قطعی نشانی ہے، پھر بتلایا گیا کہ ان منکرین پر تعجب ہے کہ ان کو نشانیوں پر نشانیاں دکھلائی جاتی ہیں لیکن یہ ان کو جادو کہہ کر ٹال دیتے ہیں اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں۔ منکرین کو سمجھایا گیا کہ نادانو! ہر کام کا وقت مقرر ہے، ہر بات اپنے وقت مقرر پر ہو کر رہے گی۔ پھر قیامت کا کچھ حال بیان کیا جاتا ہے کہ جب قیامت آئے گی سب مردے اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوں گے اور ٹڈی دل کی طرح پھیل جائیں گے اور اللہ کے سامنے حاضر ہونے کے لئے پکارنے والے کی طرف دوڑیں گے اور کہتے جائیں گے کہ آج کا دن بڑا سخت اور کٹھن ہے، لیکن آج کی دنیا میں یہ اس دن سے غافل ہیں اور کسی کی نہیں سنتے اور مانتے لیکن اس تکذیب و انکار کا نتیجہ اچھا نہیں، پہلی امتوں نے بھی رسولوں کو جھٹلایا اور اس کی سزا پائی، یہ بھی اگر خدا کے رسول کو جھٹلاتے رہے تو سزا پائیں گے، دیکھو نوح علیہ السلام کی قوم نے نوح کا کہنا نہیں مانا، حضرت نوح علیہ السلام کو سمجھاتے سمجھاتے ۹۵۰ سال گزر گئے لیکن وہ لوگ ٹس سے مس نہیں ہوئے، آخر کار پانی کا زبردست طوفان آیا اور سب منکرین پانی میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے، جن کو اللہ نے بچانا تھا وہ سب نوح کی کشتی میں بیٹھ کر بچ گئے تو موجودہ منکرین کو چاہئے کہ ان کے حال سے عبرت حاصل کریں، پھر قوم نوح کے بعد عاد، ثمود و قوم لوط اور قوم فرعون کے مختصر احوال بیان کر کے بتلایا گیا کہ خدا کے رسولوں کی بات نہ ماننے اور ان کو جھٹلانے سے یہ قومیں کس دردناک عذاب سے دوچار ہوئیں اور ہر قوم کا انجام بیان کرنے کے بعد بار بار یہ بات دہرائی گئی کہ قرآن کریم نصیحت کا آسان ذریعہ ہے، جس سے اگر کوئی قوم سبق لے کر راہ راست پر آجائے تو ان عذابوں کی نوبت نہیں آسکتی جو ان قوموں پر نازل ہوئے۔ قرآن میں صاف صاف سب کچھ سمجھا دیا گیا ہے قیامت آکر رہے گی اور ہر ایک کو اس کے کئے کا پھل ملے گا، آج جو گمراہ اپنی بدی سے باز نہیں آتے قیامت میں جب آگ میں منہ کے بل ڈال کر گھسیٹا جائے گا اس دن ان کی آنکھیں کھلیں گی اور ان کے برخلاف متقی پرہیزگار خدا سے ڈرنے والوں کا انجام یہ ہوگا کہ وہ

باغوں اور شہروں کے درمیان خوش وخرم رہیں گے، اس جزاء وسزا جنت وجہنم کے ذکر پر سورۃ کو ختم فرمایا گیا۔ واللہ اعلم!

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

پہلی قوموں کے مختصراً حالات بیان کیے، اسے اپنے سامنے رکھ کر اپنا روز کا معمول بنالیں، ورنہ جیسے قوم نوح علیہ السلام نے نوح (علیہ السلام) کی تکذیب کی تو پانی ان پر غضب اور تباہی بن گیا۔ (۱۲) قوم عاد نے اپنے رسول کو غلط ثابت کیا تو ان پر ایک تیز آندھی چلی اور وہ ہلاک ہوگئے۔ (۱۸-۱۹) جب قوم ثمود نے اپنے پیغمبر کی بات نہیں مانی تو ایک چیخ کے ذریعہ برباد ہوگئے۔ (۳۱) قوم لوط نے اپنے نبی کی نافرمانی کی تو انہیں پتھروں کی بارش کا سامنا کرنا پڑا۔ (۳۴) فرعونیوں نے اپنے رسول کی تکذیب کی تو اللہ نے انہیں دنیا سے مٹا دیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ قوموں نے اپنے نبی کی نافرمانی کر کے تباہی مول لی۔ اہل مکہ کو تنبیہ کی کہ اگر تم نے بھی ان جیسا رویہ اختیار کیا تو اللہ کا غضب اور عذاب نازل ہوگا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اہل مکہ نے نبی سے ان کے معجزات کا مطالبہ کیا تھا، اس میں سے ایک چاند کے دو ٹکڑے کرنے کا مطالبہ بھی تھا کہ یہ معجزہ دکھاؤ تو ایمان لے آئیں گے؛ لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالی کے حکم سے چاند کے دو ٹکڑے کر دکھائے تو وہ اپنے وعدے سے مکر گئے اور جادوگر کہنے لگے۔

قرآن ہدایت کا ایک آسان ذریعہ ہے۔ (۲۱-۲۲)

اللہ پاک کا منصوبہ سب کے لیے ایک ہے۔ جو لوگ اس کے پیغام کو رد کرتے ہیں، اور تکبر کے ساتھ اعراض کرتے ہیں، انہیں اس طرح سزا دی جاتی ہے جو دوسروں کے لیے سبق آموز ہے۔ (۴۳-۵۱)) اس کے باوجود اہل مکہ نے ہٹ دھرمی کی، اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے مطابق انہیں میدان بدر میں گھسیٹ کر لے آیا جو ان کے گھمنڈ اور غرور کو توڑنے لیے تھا۔ اور ڈرایا کہ اصل سزا کی جگہ تو قیامت ہے، اور وہ بہت خوفناک ہے۔ (۴۶) (خواطر قرآنیہ)

اس سورت میں وعدے بھی ہیں، وعیدیں بھی ہیں۔ مومنوں کے لیے بشارتیں بھی ہیں اور کفار کے لیے ڈراوے بھی ہیں۔ مواعظ اور عبرتیں بھی ہیں اور نبوت ورسالت، بعث ونشور اور قضاء وقدر جیسے بنیادی عقائد بھی ہیں۔

قرب قیامت اور شق قمر کا ذکر:

اس سورت کی پہلی آیت میں قرب قیامت اور شق قمر کا ذکر ہے۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ①

قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا معجزہ بھی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ظاہر ہوا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک چاندنی رات میں مکہ مکرمہ کے کافروں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی معجزہ دکھانے کا مطالبہ کیا، اس پر اللہ تعالی نے یہ کھلا معجزہ دکھایا کہ چاند کے دو ٹکڑے ہوئے، جن میں سے ایک ٹکڑا پہاڑ کی مشرقی جانب چلا گیا اور دوسرا مغربی جانب، اور پہاڑ ان کے درمیان آ گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں

سے فرمایا کہ لو دیکھ لو! جب سارے لوگوں نے جو وہاں موجود تھے یہ حیرت انگیز نظارہ کرلیا تو یہ دونوں ٹکڑے دوبارہ آپس میں مل گئے، جو کافر لوگ اس وقت موجود تھے وہ اس مشاہدے کا تو انکار نہیں کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے یہ کہا کہ یہ کوئی جادو ہے، بعد میں مکہ مکرمہ کے باہر سے آنے والے قافلوں نے بھی اس کی تصدیق کی کہ انہوں نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا تھا، ہندوستان کی تاریخ فرشتہ میں بھی مذکور ہے کہ گوالیار کے راجہ نے یہ واقعہ دیکھا تھا۔

شق قمر کے معجزہ کو دیکھ کر جن کے مقدر میں ہدایت نہ تھی وہ کہاں ماننے والے تھے؟ اس لیے فرمایا گیا: اگر یہ کوئی بھی معجزہ دیکھ لیں تو منہ پھیر لیں گے اور کہہ دیں گے کہ یہ پہلے سے چلا آتا ہوا جادو ہے۔ (۳)

قیامت کے قریب آجانے کا مطلب یہ ہے کہ نبوت محمدیہ کے بعد کا زمانہ اس زمانے کے مقابلے میں بہت کم ہے جو آپ سے پہلے گزر چکا ہے۔

بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انگشت شہادت اور درمیان والی انگلی اٹھاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ مجھے اور قیامت کو یوں بھیجا گیا ہے۔

منکرین قیامت کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم:

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ⑥............الیٰ.........مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ۭ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ⑧

اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا ہے کہ آپ ان سے اعراض فرمائیں اور اس دن کا انتظار کریں جب یہ قبروں سے اس حال میں کھڑے ہوں گے کہ ان کی آنکھیں جھکی ہوں گی، چہروں پر ذلت کی سیاہی چھائی ہوگی، پکارنے والے کی طرف دوڑتے ہوئے جائیں گے اور وہ خود کہیں گے کہ یہ دن تو ہمارے لیے بڑا سخت ثابت ہوا ہے۔ (۶-۸)

آیت ۱۹ سے یہ سورت چند انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کا تذکرہ کرتی ہے اور اس کے ذریعے کفار مکہ کو ڈراتی ہے کہ کہیں تم پر بھی ویسا ہی عذاب نہ آجائے جیسا عذاب تم سے پہلی اقوام پر آیا، کیونکہ تم بھی انہی جرائم کا ارتکاب کر رہے ہو جن جرائم کا ارتکاب وہ کرتی تھیں۔ یہاں جن تباہ شدہ اقوام کا اللہ نے ذکر فرمایا ہے ان کی تباہی کا قصہ بیان کرنے کے بعد عام طور پر یہ سوال بار بار کیا ہے کہ "بتاؤ میرا عذاب اور میری ڈرانے والی باتیں کیسی رہیں؟" اور اس سوال کے متصل بعد یہ اطلاع دی ہے کہ "اور بے شک ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لئے آسان کر دیا ہے، پس کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟"

قرآن کریم کے آسان ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر کس و ناکس اس کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کی آیات سے مسائل استنباط کرنے لگے اور مجتہد بن کر بیٹھ جائے، بلکہ قرآن کے آسان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے پڑھنا، حفظ کرنا، اس سے نصیحت حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا بہت آسان ہے۔ اس کے آسان ہونے ہی کا نتیجہ ہے کہ ایسے دیہاتی بھی قرآن کریم کی تلاوت بسہولت کر لیتے ہیں جو اپنی مادری زبان میں چھوٹا سا کتابچہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ چھوٹے چھوٹے

معصوم بچے اپنے سینوں میں ساری نزاکتوں اور قواعد کو ملحوظ رکھتے ہوئے محفوظ کر لیتے ہیں، جب صاف دل والے اسے پڑھتے اور سنتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں اور دلوں میں عمل کا جذبہ بیدار ہوجاتا ہے۔

سورت کا اختتام:

سورت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّا كُلَّ شَيۡءٍ خَلَقۡنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾

اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے خواہ وہ خیر ہو یا شر، سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہے، جو کچھ ہونے والا ہے، سب لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے؟ موجود ہونے سے پہلے ہی اللہ کو معلوم ہے، اس آیت کریمہ سے اہل سنت والجماعت نے عقیدہ تقدیر کے اثبات پر استدلال کیا ہے۔ ان آیات میں یہ وضاحت بھی کردی گئی ہے کہ انسانوں کے بارے میں چھوٹی بڑی باتیں سب لوح محفوظ میں بھی درج ہیں اور کراماً کاتبین بھی لکھ رہے ہیں، لہٰذا کسی بھی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر اس کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے اور کسی بھی نیکی کو حقیر سمجھ کر چھوڑنا نہیں چاہیے۔ آخر میں متقین کو اچھے انجام، اللہ کی رضا اور عزت کے مسکن کی بشارت سنائی گئی ہے۔ (۵۲۔۵۵)

موضوع سورۃ:......رفع استبعاد قیامت (قیامت نظام عالم کی برہمی کا نام ہے: نظام عالم میں سے ایک بڑے رکن کی شکست اس امر پر دال ہے کہ بقیہ ارکان میں بھی یونہی اختلال واقع ہوسکتا ہے)۔

خلاصہ رکوع: ۱......(۱) رفع استبعاد قیامت (۲) وتذکیر بایام اللہ۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۔ (۲) آیت: ۹ تا ۱۶، ۱۸۔

خلاصہ رکوع: ۲......تذکیر بایام اللہ۔ ماخذ: آیت: ۲۳ تا ۳۳، ۳۱ تا ۳۷۔

خلاصہ رکوع: ۳......تذکیر بایام اللہ- ماخذ: آیت: ۴۱۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الرحمٰن

یہ سورت وہ واحد سورت ہے جس میں بیک وقت انسانوں اور جنات دونوں کو صراحت کے ساتھ مخاطب فرمایا گیا ہے، دونوں کو اللہ تعالیٰ کی وہ بیشمار نعمتیں یاد دلائی گئی ہیں جو اس کائنات میں پھیلی پڑی ہیں، اور بار بار یہ فقرہ دہرایا گیا ہے کہ اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ اپنے اسلوب اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی یہ ایک منفرد سورت ہے، جس کی تاثیر کو کسی اور زبان میں ترجمہ کر کے منتقل نہیں کیا جاسکتا، اس بارے میں روایات مختلف ہیں کہ یہ سورت مکی ہے یا مدنی، عام طور سے قرآن کریم کے نسخوں میں اس کو مدنی قرار دیا گیا ہے، لیکن علامہ قرطبی نے کئی روایتوں کی بنا پر یہ رجحان ظاہر کیا ہے کہ یہ مکی سورت ہے، واللہ اعلم۔ (توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی ۵۵ ویں سورۃ ہے اور نزول کے اعتبار سے ۹۷ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۳ رکوع، ۷۸ آیات،

۱۵۱۳ کلمات اور ۶۸۳ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے پہلے ہی لفظ الرحمن کو جو اللہ جل شانہ کا ایک نام ہے سورۃ کا نام قرار دیا گیا اور اس نام کو سورۃ کے مضامین سے بھی گہری مناسبت ہے، کیونکہ اس سورۃ میں اللہ تعالی کی بہت سی دنیوی و اخروی نعمتوں کا ذکر ہے جو اللہ کی صفت رحمت کے مظاہر اور ثمرات ہیں۔

ربط:

سورۂ سابقہ میں زیادہ مضمون نقم (عذاب) کا تھا اور کچھ اول و آخر میں مضمون نعم (نعمتوں) کا بھی تھا اور اس سورۃ میں زیادہ مضمون نعم کا ہے کچھ دنیویہ اور کچھ اخرویت اور کچھ درمیان میں مضمون نقم کا بھی ہے، گرچہ بحیثیت اسباب ہدایت ہونے کے وہ بھی نعم اخرویہ میں داخل ہیں، اسی بناء پر مثل نعم کے ان نقم کے بعد بھی ''فبای آلاء ربکما تکذبان'' کو تقریر مضمون کے لئے متفرع فرمایا ہے۔

فائدہ:

یہ آیت تفریحیہ اس سورۃ میں اکتیس جگہ آئی ہے اور چونکہ ہر جگہ آلاء کا مصداق جدا ہے، اس لئے یہ تکرار محض نہیں ہے محض لفظی مشارکت ہے اور تکرار ظاہری کی وجہ سے اس میں افادۂ تاکید بھی ہے اور اس قسم کا تکرار جو کہ قند مکرر سے شیریں تر ہے عرب وغیر عرب کے کلام میں بکثرت بلانکیر مستعمل ہے۔

شان نزول:

بیان کیا گیا ہے کہ جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم خدائے رحمان کا ذکر فرماتے تو کافر کہتے کہ ہم رحمان کو نہیں جانتے، ہم تمہارے کہنے سے رحمن کو کیسے سجدہ کرنے لگیں؟ اس وقت اللہ تبارک وتعالی نے یہ سورۃ نازل فرمائی اور فرمایا کہ سنو رحمٰن ہی ہے جس نے اپنی رحمت سے یہ قرآن نازل فرمایا وغیرہ وغیرہ۔

خلاصہ سورۃ:

سورۃ کے شروع میں فرمایا گیا کہ سنو یہ رحمٰن ہی ہے جس نے اپنی رحمت سے یہ قرآن نازل فرمایا، انسان کو بنایا اور اس کو بولنا سکھایا، چاند سورج ایک مقررہ طریقہ سے بنائے، چھوٹے بڑے پودے اور درخت اگائے، دنیا کا نظام عدل و انصاف پر قائم کیا، تراز و کو عدل کی علامت بنائی تا کہ لین دین میں کمی زیادتی نہ ہو، زمین میں بہت سے مزہ دار پھول، خوشبودار پھول اور غلہ و اناج جانوروں کا چارہ اگایا ہے، انسانو اور جنات تم ان میں سے کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ پھر انسانوں کی پیدائش پر غور کرو، جنات کی خلقت کو دیکھو نظام عالم پر غور کرو، سمندروں اور دریاؤں کو دیکھو، ہر ایک کے پانی کا علیحدہ مزہ ہے، ان سمندروں اور دریاؤں میں سے موتی مونگے نکلتے ہیں، بڑے بڑے جہاز اور کشتیاں ان پر چلتی ہیں،

پھر دنیا میں ہر چیز کے لئے اللہ نے فنا رکھی ہے، جتنے روئے زمین پر ہیں سب فنا ہو جائیں گے اور صرف پروردگار عالم کی ذات جو عظمت اور بزرگی والی ہے باقی رہ جائے گی، زمین و آسمان میں جتنی مخلوق ہیں ان سب کی ضرورت کی چیزیں اللہ دیتا ہے، ہر وقت ہر لحہ وہ کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے، کسی کو مارنا کسی کو جلانا کسی کو بیمار کرنا کسی کو تندرست کرنا کسی کو بڑھانا کسی کو گھٹانا کسی سے لینا کسی کو دینا کسی کو عزت دینا کسی کو ذلت دینا یہ سب اللہ ہی کی شان ہے، زمین و آسمان میں ہر جگہ اللہ ہی کی حکومت ہے، کسی میں یہ طاقت نہیں کہ اللہ کی حکومت کی سرحد سے باہر چلا جائے پھر آخرت میں تمام انسان اور جنات کو اپنے اپنے کاموں کا بدلہ ملے گا۔ اللہ نے دوزخ اور جنت دونوں بنا رکھی ہیں، اچھے لوگ جنت میں اور برے لوگ دوزخ میں جائیں گے، جنت میں دائمی راحت اور عیش وعشرت کا سلسلہ ہوگا اور جہنم میں آگ دہک رہی ہوگی تو اے انسانو و جنات بتاؤ تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کا انکار کرو گے۔ دنیا و آخرت کی تمام نعمتیں ایک اللہ کی شان رحمانی کا ظہور ہیں تو کیا ان نعمتوں کے ہوتے ہوئے بھی اللہ کا انکار کر سکتے ہو اور اس کے رحمٰن ہونے میں شک کرتے ہو، بڑا بابرکت نام ہے پروردگار عالم کا جو بڑی عظمت والا اور احسان والا ہے۔ واللہ اعلم!

فائدہ:

تیرہویں پارہ سورۂ ابراہیم میں حق تعالی نے فرمایا ''**وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها**'' کہ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو شمار نہ کر سکو گے مگر انسان و جنات کو یاد دلانے کے لئے اس سورۃ میں اللہ رب العزت نے دنیا و آخرت کی متعدد نعمتوں کو ذکر فرمایا ہے اور ۳۱ مرتبہ جنات وانسان سے خطاب کر کے یہ پوچھا کہ تم اللہ کی کون کون سی نعمتوں سے منکر ہو جاؤ گے۔

فائدہ:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے سامنے یہ سورۃ تلاوت فرمائی، صحابہ خاموشی کے ساتھ سنتے رہے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے تو جنات ہی جواب دینے میں اچھے رہے، وہ ہر مرتبہ ''**فبای آلاء ربکما تکذبان**'' کے جواب میں کہتے تھے ''**لا بشیء من نعمک ربنا نکذب فلک الحمد**' اے ہمارے رب، ہم تیری نعمتوں میں سے کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے، تیرے ہی لئے تمام تعریفیں ہیں۔ اس لئے اس آیت کے جواب میں یہی جملہ کہنا چاہئے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مضامین:

توحید کا اثبات اس سورہ کا مرکزی مضمون ہے، اس کے لئے اسلوب یہ اختیار کیا ہے کہ:

◇ بندوں پر خدا کی بے پایاں رحمتوں کا بیان کہ اس نے انسان کی پرورش اور تربیت کے لئے اس کائنات میں کیسے کیسے سروسامان پیدا کئے ہیں۔

◇ انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ نہ صرف اس کی جسمانی تربیت کے سامان فراہم کئے بلکہ اخلاقی وروحانی تربیت کے لئے بھی سامان کیا۔

◇ کائنات اور اس کا یہ نظام خدائے واحد کی شہادت کے لئے کافی ہے، آثار کائنات میں سے انسان آخر کس کس چیز کا انکار کرسکتا ہے؟

◇ کائنات کی ہر مخلوق، انسان اور جن سمیت فانی ہے، خدا کی زبردست قوت کے سامنے بے بس اور لاچار ہے۔

◇ اب اگر انسان میں عقل وہوش ہے تو اس کے لئے یہ بات ناممکن ہونی چاہئے کہ وہ خدائے واحد کا اقرار نہ کرے۔

◇ لیکن دل ودماغ، آنکھیں اور فہم وہوش کے باوجود انسان خدا کی ان بے شمار نشانیوں کی تکذیب کرے گا اور خدا کی نعمتوں کی ناشکری کرے گا، تو پھر اسے اس کا وبال بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

◇ اللہ کی اطاعت کرنے والوں کے لئے خاص طور پر جنت میں جو نعمتیں ہیں ان کی بھی تھوڑی بہت تفصیل ہے۔

◇ جس طرح اس دنیا میں انسان خدا کی نشانیوں کو نہیں جھٹلا سکتا، اسی طرح مجرم اور گناہگار قیامت میں متقین کے لئے جو نعمتیں ہیں، وہاں ان کو نہیں جھٹلا سکیں گے لیکن سرکشوں کو وہاں کی ایک نعمت بھی میسر نہ ہوگی۔ (خلاصہ مضامین قرآنی)

اس سورت کا دوسرا نام ''عروس القرآن'' بھی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مرفوع روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر چیز کی عروس (دلہن، زینت) ہوتی ہے، قرآن کی عروس سورۂ رحمٰن ہے۔

نعمت کبریٰ:

اس سورت میں باری تعالی نے اپنی نعمتیں بیان فرمائی ہیں جن میں سے سب سے پہلی نعمت قرآن کا اتارا جانا اور بندوں کو اس کی تعلیم دینا ہے، یقیناً یہ نعمت کبری ہے، کوئی مادی نعمت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، ہر نعمت کا کوئی نہ کوئی بدل ہوسکتا ہے۔ لیکن قرآن کا بدل کوئی چیز بھی نہیں بن سکتی، اس کی ایک ایک آیت اور ایک ایک حروف دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، قرآن ساری آسمانی کتابوں کے مضامین کا محافظ، جامع اور ناسخ ہے، رب تعالی نے اس سورت کا آغاز اپنی صفت ''الرحمٰن'' سے فرمایا ہے، گویا متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ کی ساری نعمتیں خصوصاً قرآن کی نعمت، اس کے رحمن ہونے کے آثار اور فیوضات ہیں، وہ رحمن ہونے کی وجہ سے بندوں پر رحم کرتا ہے، انہیں ہر طرح کی نعمتیں عطا فرماتا ہے، ان کی تعلیم اور ہدایت کے لیے اس نے قرآن نازل کیا ہے۔ قرآن کے شرف اور عظمت کو بتانے کے لیے تعلیم قرآن کو تخلیق انسان سے بھی پہلے ذکر کیا گیا۔

اس قرآن پاک سے من حیث القوم انحراف، اس کے احکام سے لاپرواہی، اس کی ہدایات سے غفلت، اللہ تبارک کی سب سے بڑی نعمت کی ناقدری اور ناشکری ہے اور اللہ تعالی کا یہ اٹل قانون ہے کہ جس نعمت کی ناقدری اور ناشکری کی جاتی ہے اللہ تعالی اس نعمت کی برکتوں کو چھین لیتے ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب میری امت دینار ودرہم کو بڑی چیز سمجھنے لگے گی، اسلام کی وقعت وہیبت

اس سے جاتی رہے گی اور جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دے گی تو برکت وحی یعنی فہم قرآن سے محروم ہو جائے گی۔ آج اس حدیث کی صداقت کو آپ کھلی آنکھوں دیکھ لیجئے۔ اللہ تعالی تبارک وتعالی اپنی اس نعمت عظمی کی قدردانی کے لئے ہماری دل کی آنکھیں کھول دیں۔ آمین

صحیفہ کائنات پر پھیلی نعمتیں:

آیت: ۵ سے سورہ رحمن صحیفہ کائنات پر پھیلی ہوئی اللہ کی مختلف نعمتوں کا ذکر کرتی ہے۔ مثلا: سورج اور چاند جو اللہ کے ٹھہرائے ہوئے حساب سے اپنی اپنی منزلوں پر رواں دواں ہیں، ستارے اور درخت جو اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہیں، زمین جسے مخلوق کے لئے کسی فرش کی طرح بچھا دیا گیا ہے، مختلف میوے، اناج اور پھل پھول جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے، میٹھے اور کھارے پانی کے دریا جو اپنی جگہ جاری ہیں، وہ موتی اور مونگے جو ان دریاؤں سے نکالے جاتے ہیں، پہاڑوں جیسی بلندی اور پھیلاؤ رکھنے والے وہ جہاز جو سمندروں میں چلتے ہیں اور نقل وحمل کے ذرائع میں سے کل بھی سب سے بہتر ذریعہ تھے اور آج بھی بہترین ذریعہ ہیں۔ (۵-۲۴)

ان دنیاوی نعمتوں کے علاوہ اخروی نعمتوں اور عذابوں کا بھی سورۂ رحمن میں ذکر ہے۔

اخروی عذاب:

آگ کے وہ شعلے اور دھواں جن میں سانس لینا دوبھر ہو جائے گا، وہ جہنم جس کی ایک چنگاری بھی انسان کو جلانے کے لیے کافی ہوگی، وہ کھولتا ہوا پانی جسے دوزخی مجبوراً پئیں گے اور وہ ان کی انتڑیوں کو کاٹ کر رکھ دے گا۔ (۳۵-۴۴)

اخروی نعمتیں:

دوسری طرف اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے گنجان ٹہنیوں اور شاخوں والے دو سرسبز باغات، ان میں بہتے ہوئے چشمے، ہر قسم کے میوؤں کی دو دو قسمیں اور بچھے ہوئے قالین ہوں گے، دبیز ریشم کے تکیوں کے ساتھ جنتی ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے، مذکورہ دو باغات کے علاوہ دو باغ اور بھی ہوں گے جو پہلے دو باغوں سے کم تر ہوں گے، ان میں دو چشمے ابل رہے ہوں گے، متنوع میوہ جات ہوں گے، شرم وحیا اور حسن وجمال کا پیکر حوریں ہوں گی۔ (۵۰-۵۶)

۳۱ بار سوال:

اللہ تعالی نے اس سورت میں ۳۱ / بار سوال کیا ہے: ''فبای آلاء ربکما تکذبن'' (پھر تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟) اگر دو چار یا دس بیس نعمتیں ہوں تو ان کو جھٹلایا جا سکتا ہے مگر جہاں یہ حال ہو کہ نعمتیں حد وحساب سے بھی باہر ہوں تو انہیں جھٹلانا ناممکنات میں سے ہے۔

اگر اس سورت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے ابتداء میں اپنی تخلیق کے عجائب اور مظاہر ذکر کئے ہیں اور ان کے ضمن میں یہ آیت ''فبای الآء ربکما تکذبن'' آٹھ بار آئی ہے، اس کے بعد جہنم اور اس کے عذابوں کا

ذکر کرتے ہوئے سات بار یہ آیت ذکر کی ہے۔قرآن پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ جہنم کے دروازے بھی سات ہیں، پھر جنت کے باغات اور اہل جنت کا تذکرہ کرتے ہوئے آٹھ بار یہ آیت آئی ہے اور جنت کے دروازے بھی آٹھ ہیں، آخر میں ایسے باغات کا ذکر ہے جو درجہ کے اعتبار سے پہلے باغات سے کم ہیں، ان باغات کے ضمن میں بھی یہ آیت آٹھ بار آئی ہے۔اس ترتیب اور تقسیم سے اہل علم نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جو شخص پہلی آٹھ پر اعتقاد رکھے گا اور ان کے تقاضوں پر عمل رکھے گا اسے باری تعالیٰ جہنم کے سارے دروازوں سے بچالے گا اور دونوں قسم کی جنتوں کا حق دار بنادے گا۔

کج فہموں کا اعتراض و جواب:

کج فہموں نے اعتراض اٹھایا ہے: کہ جہنم اور جہنم کے عذاب کون سی نعمت ہیں کہ ان کا ذکر کرتے ہوئے بھی بار بار سوال کیا گیا ہے۔''بتاؤ اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟''

اس کا جواب دو طرح سے دیا گیا ہے۔

◇ پہلا یہ کہ ظالموں، سرکشوں اور نافرمانوں کو عذاب دینا اللہ کے عدل کا تقاضا اور مظلوموں کے حق میں رحمت اور نعمت ہے۔

◇ دوسرا یہ کہ کفر وشرک اور فسق و فجور کا انجام ظہور سے پہلے ہی بندوں کو بتادینا کریم ورحیم ذات کا بہت بڑا احسان ہے۔

خطرہ اور مصیبت کی پیشگی اطلاع:

کیا یہ امر باعث تعجب نہیں کہ دنیا کے کسی خطرہ اور مصیبت کی پیشگی اطلاع دینے والے کو تو ہم اپنا محسن سمجھیں لیکن اس مالک کو محسن نہ سمجھیں جس نے ہمیں آخرت کے خطرات کے بارے میں دنیا ہی میں مطلع فرمادیا جبکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں اور دنیا کے خطرات آخرت کے مقابلے میں کچھ حیثیت بھی نہیں رکھتے۔

سورت کا اختتام:

سورت کے اختتام پر فرمایا:

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٧٨﴾

تیرے پروردگار کا نام بابرکت ہے جو عزت وجلال والا ہے۔

اہل علم کہتے ہیں کہ اس''نام'' سے مراد وہی نام ہے جس سے سورت کا آغاز ہوا تھا، گویا آخر میں دوبارہ اس طرف اشارہ کردیا گیا کہ ارض وسماء کی تخلیق ہو یا جنت دوزخ کا وجود، اس سورت میں جو کچھ بھی بیان ہوا ہے یہ سب اس''رحمٰن'' کی رحمت کا نتیجہ ہے۔(خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:......کفار نے کہا تھا:''ماالرحمن''اس اعتراض کا جواب، واللہ اعلم!

خلاصہ رکوع:۱......تذکیر بآلاء اللہ۔ماخذ: آیت: ۴، ۳، ۲، ۷، ۱۱۔

خلاصہ رکوع : ۲......(۱) ہر چیز پر فنا طاری ہونے والی ہے، (۲) جس منعم نے تم پر یہ احسان کیئے ہیں وہ حساب لے گا، (۳) نعمتوں کو بیجا صرف کرنے والوں سے یہ سلوک ہوگا۔ ماخذ: (۱) آیت: ۲۶۔ (۲) آیت: ۳۱۔ (۳) آیت: ۴۱۔

خلاصہ رکوع : ۳......خدا تعالی کی نعمتوں کو برمحل صرف کرنے والوں سے سلوک الٰہی ۔ ماخذ: آیت: ۴۶، ۴۸۔

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

＊＊＊

سورۃ الواقعہ

یہ سورت مکی زندگی کے ابتدائی دور کی سورتوں میں سے ہے، اور اس میں معجزانہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ پہلے تو قیامت کے حالات بیان فرمائے گئے ہیں، اور بتایا گیا ہے کہ آخرت میں تمام انسان اپنے انجام کے لحاظ سے تین مختلف گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے، ایک گروہ اللہ تعالی کے مقرب بندوں کا ہوگا جو ایمان اور عمل صالح کے لحاظ سے اعلی ترین مرتبے کے حامل ہیں، دوسرا گروہ ان عام مسلمانوں کا ہوگا جنہیں ان کے اعمال نامے ان کے دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے، اور تیسرا گروہ ان کافروں کا ہوگا جن کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے، پھر ان تینوں گروہوں کو جن حالات سے سابقہ پیش آئے گا اس کی ایک جھلک بڑے مؤثر انداز میں دکھائی گئی ہے، اس کے بعد انسان کو خود اس کے اپنے وجود اور ان نعمتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالی کی عطا ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اسی کا شکر بجالا کر اس کی وحدانیت کا اعتراف کرے، اور توحید پر ایمان لائے، پھر آخری رکوع میں قرآن کریم کی حقانیت کا بیان فرماتے ہوئے انسان کو اس کی موت کا وقت یاد دلایا گیا ہے کہ اس وقت وہ کتنا ہی بڑا آدمی سمجھا جاتا ہو، نہ تو خود اپنی موت سے چھٹکارا پا سکتا ہے نہ اپنے کسی محبوب کو موت سے بچا سکتا ہے، لہٰذا جو پروردگار موت اور زندگی کا مالک ہے وہی مرنے کے بعد بھی انسان کے انجام کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہے، اور انسان کا کام یہ ہے کہ اس کی عظمت کے آگے سر بسجود ہو۔

سورت کی پہلی ہی آیت میں واقعہ کا لفظ آیا ہے جس سے مراد قیامت کا واقعہ ہے اور اسی کے نام پر اس سورت کو سورۂ واقعہ کہا جاتا ہے۔ (توضیح القرآن)

یہ قرآن کریم کی ۵۶ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۴۶ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۳ رکوع، ۹۶ آیات، ۳۸۴ کلمات اور ۱۶۸۷ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کا نام پہلی ہی آیت "اذا وقعت الواقعة" سے ماخوذ ہے، واقعہ بمعنی واقع ہونے والی، اس سے مراد یہاں قیامت ہے، یہ پوری سورۃ قیامت کے واقع ہونے کی خبر اور قیامت کے لرزہ خیز حالات و کیفیات پر مشتمل ہے، اس

لئے بطور علامت اس کا نام واقعہ مقرر ہوا۔

روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں مجھے سورہ ہود نے اور سورۃ واقعہ اور والمرسلات وعم یتسائلون نے اوراذا الشّمس کورت نے بوڑھا کر دیا چونکہ ان سورتوں میں قیامت کے احوال مذکور ہیں۔

ربط:

یہ سورۃ باعتبار مضامین کے سورۂ سابقہ کے ساتھ تقریبا متماثل ہے اور باعتبار ترتیب کے تقریبا متقابل ہے، چنانچہ پہلی سورۃ میں قرآن کا ذکر اول میں ہے اور اس سورۃ کے آخر میں وہاں نعم دنیویہ کا ذکر جو دلائل قدرت بھی ہیں۔ بعد قرآن کے آیا ہے اور یہاں ایسے امور کا ذکر قبل قرآن کے آیا ہے، وہاں دنیوی نعمتوں کے ذکر کے بعد قیامت و نار و جنت کا ذکر آیا ہے، یہاں ان کا ذکر نعم دنیویہ سے پہلے آیا ہے اور بالکل ختم کے قریب معاد کی تفصیل کو اجمالا لایا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اجمال و تفصیل میں تغایر نہیں، یہی دونوں سورتوں میں تناسب ہے۔

فضائل سورۃ:

ایک روایت میں ہے کہ جو شخص سورۂ حدید اور سورۂ واقعہ اور سورۂ رحمن پڑھتا ہے وہ جنت الفردوس کے رہنے والوں میں پکارا جاتا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ سورۂ واقعہ سورۃ الغنیٰ ہے یعنی اس سے غنا (مالداری) حاصل ہوئی ہے، اس کو پڑھو اور اپنی اولاد کو پڑھاؤ۔ ایک روایت میں ہے کہ اس سورۃ کو اپنی بیٹیوں کو سکھلاؤ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اس کے پڑھنے کی تاکید منقول ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو حضرت عثمان ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، پوچھا کہ آپ کو کیا شکایت ہے؟ فرمایا اپنے گناہوں کی شکایت ہے۔ پھر پوچھا کہ آپ کو کیا خواہش ہے؟ فرمایا کہ اپنے رب کی رحمت کی خواہش ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کسی طبیب کو بھیج دوں؟ فرمایا کہ طبیب ہی نے تو بیمار کر ڈالا ہے۔ پوچھا: کچھ مال بھیج دوں؟ فرمایا مجھے مال کی کوئی حاجت نہیں۔ حضرت عثمان نے فرمایا کہ آپ کے بعد آپ کی بچیوں کے کام آئے گا، فرمایا کہ کیا میری بچیوں کی نسبت آپ کو افلاس کا ڈر ہے؟ سنئے میں نے اپنی بچیوں کو کہہ دیا ہے کہ وہ رات کو سورۂ واقعہ پڑھا کریں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ جو شخص سورۂ واقعہ کو ہر رات پڑھ لیا کرے اسے ہرگز فاقہ نہیں پہنچے گا۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کی ابتداء قیامت کے ذکر سے اس طرح فرمائی گئی ہے کہ قیامت میں زمین کپکپانے لگے گی، پہاڑ ریزہ

ریزہ ہو جائیں گے اور غبار بن کر اڑنے لگیں گے، پھر بتلایا گیا کہ اس دن انسانوں کے تین گروہ ہو جائیں گے، ایک سابقین یعنی خاص بڑے مرتبہ والے لوگ، دوسرے عام صالحین، تیسرے وہ مجرمین جو آخرت کے منکر رہے۔ پھر ان تینوں گروہوں کے ساتھ جو معاملہ آخرت میں کیا جائے گا اسے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا۔ سابقین جو مقربین الٰہی میں سے ہوں گے ان کا وہ اعزاز و اکرام ہوگا کہ وہ سونے اور جواہرات کے جڑاؤ تختوں پر بیٹھے ہوں گے اور شاہانہ طرز سے آمنے سامنے تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے، ان کے سامنے کمسن خدمت گزار جو ہمیشہ ایک ہی عمر کے رہیں گے کھانے پینے کا سامان لئے حاضر رہیں گے، خوبصورت حوریں انہیں عطاء کی جائیں گی، ہر طرف سے انہیں سلام ہی سلام کی آوازیں اور دل خوش کرنے والی باتیں سنائی دیں گی۔ دوسرا گروہ اصحاب الیمین یعنی عام جنتیوں کا ہوگا جو میوے سے لدے ہوئے سایہ دار درختوں کے نیچے اونچے اونچے مسندوں پر بیٹھے ہوں گے، ان کے پاس چشمے بہہ رہے ہوں گے، پاکیزہ ہم عمر بیویاں ان کے ساتھ ہوں گی اور ہر طرح راحت و آرام کا سامان ہوگا۔ تیسرا گروہ اصحاب الشمال یعنی منکرین آخرت و کفار و مشرکین کا ہوگا جن کا حال نہایت خستہ و خراب ہوگا، گرم جھلسنے والی ہوا کھولتا ہوا پانی دھویں کی تہیں کھانے کے لئے زقوم (سیہنڈ) پینے کے لئے حمیم (گرم پانی) اور طرح طرح کے جہنم کے عذاب اور سزائیں ان کے لئے ہوں گی۔ ان تینوں گروہوں کے انجام کو بیان فرما کر اصل مضمون توحید اور معرفت الٰہی کو بیان فرمایا گیا کہ اے انسانو! تم اپنے پیدا کرنے والے کو کیوں نہیں مانتے اور اس پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ اس نے تمہیں ایک قطرہ ناپاک یعنی نطفہ سے پیدا کیا اور پھر تمہارے لئے موت مقرر کی اور مرنے کے بعد پھر دوبارہ زندہ کرے گا، اس کی قدرت کی نشانیاں دیکھ کر اسے پہچانو کھیتی سے غلہ پیدا کرنے والا وہی ہے، میٹھا پانی دینے والا وہی ہے، آگ اس نے پیدا کی جس سے تم فائدہ اٹھاتے ہو، اس کی حرارت اور تیزی دیکھ کر کبھی جہنم کی آگ کو بھی یاد کر لیا کرو۔ پھر انسانوں کو قسم کھا کر خطاب فرمایا گیا کہ یہ قرآن بڑے مرتبہ والی کتاب ہے جس سے نیک دل اور پاک وصاف لوگ ہی فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ اللہ نے نازل کی ہے اسے مانو، اس پر ایمان لاؤ، اس کے مطابق زندگی بسر کرو، ورنہ بڑی خرابی ہونے والی ہے، بس اللہ ہی کی حمد وثنا و فرمانبرداری میں لگے رہو۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے جو شخص ہر رات سورۃ الواقعہ پڑھے گا اسے کبھی بھی فاقہ کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

ایک روایت میں آیا ہے کہ جو شخص سورۂ حدید، سورۂ واقعہ اور سورۂ رحمن پڑھتا ہے، وہ جنت الفردوس میں رہنے والوں میں پکارا جاتا ہے (یہ تینوں سورتیں یعنی سورہ رحمن، سورۂ واقعہ، سورۂ حدید لگاتار یکے بعد دیگرے ہیں)

بلحاظ اپنے انجام وثمرات عمل کے آخرت میں تمام نسل انسانی شروع دنیا سے جو قیامت تک پیدا ہوں گے تین طبقوں میں تقسیم کردی جائے گی۔ ایک عام مومنین اہل جنت، دوسرے خواص مقربین جو جنت کے اعلی درجات پر فائز ہوں گے۔

تیسرے کفار منکرین جو اہل جہنم ہوں گے۔ اس سورت کی آیات ۷ سے یہ تقسیم کی گئی ہے اور اس سورت میں خواص اہل جنت کو مقربین اور سابقین کہا گیا ہے اور عوام مومنین اہل جنت کو **أصحاب الیمین** یا **أصحاب المیمنة** اور کفار و منکرین کو **اصحاب المشئمة** یا **اصحاب الشمال** کہا گیا ہے۔

سابقین کا انعام:

آیت ۱۵/ سے بتلایا جا رہا ہے کہ یہ سابقین جو بہشت کے باغات میں ہوں گے ان کے بیٹھنے کے لئے سونے کے تاروں سے بنے ہوئے تخت ہوں گے، جن پر یہ تکیہ لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یعنی نشست ایسی ہوگی کہ کسی ایک کی پیٹھ دوسرے کی طرف نہ رہے گی۔ ان کی خدمت کے لئے لڑکے ہوں گے جن کی عمر ہمیشہ ایک حالت میں رہے گی۔

حضرت شاہ رفیع الدین صاحب محدث ومفسر دہلوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اہل جنت کے خدام تین قسم کے ہوں گے:

(۱) ملائکہ جو اللہ تعالی اور اہل جنت کے مابین بطور قاصد ہوں گے۔

(۲) غلمان جو حوروں کی طرح جنت میں ایک جدا مخلوق ہے جو جنت ہی میں پیدا ہوئے ہوں گے اور وہ ہمیشہ ایک عمر کے رہیں گے اور مثل بکھرے ہوئے موتیوں کے چاروں طرف خدمت کرتے پھریں گے۔ روایات حدیث سے ثابت ہے کہ ایک ایک جنتی کے پاس ہزاروں خادم ہوں گے۔

(۳) اولاد مشرکین جو بچپن میں قبل از بلوغ انتقال کر چکی ہوگی، یہ بچے اہل جنت کے خادم ہوں گے۔

آیت ۱۸ اور ۱۹ میں ارشاد فرمایا: ''ایسی شراب کے پیالے، جگ اور جام لے کر جس سے نہ ان کے سر میں درد ہوگا اور نہ ان کے ہوش اڑیں گے۔

قرآن پاک کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت کے لئے مشروب یعنی پینے کی چیزیں چار قسم کی ہوں گی اور ان کی نہریں جاری ہوں گی۔

(۱) وہ نہریں جن کا پانی نہایت شیریں وٹھنڈا ہے۔

(۲) وہ نہریں جو ایسے قدرتی دودھ سے لبریز ہیں جس کا مزہ بھی نہیں بگڑتا۔

(۳) وہ نہریں جو ایسی شراب کی ہیں جو نہایت فرحت افزا اور خوش رنگ اور خوش مزہ ہیں۔

(۴) وہ نہریں جو نہایت صاف وشفاف شہد کی ہیں۔

ان نہروں کے علاوہ تین قسم کے چشمہ بھی ہیں:

(۱) ایک کا نام کافور ہے جس کی خاصیت خنکی ہے۔

(۲) دوسرے کا نام زنجبیل ہے جس کو سلسبیل بھی کہتے ہیں، اس کی خاصیت گرم ہے مثل چائے وقہوہ۔

(۳) تیسرے کا نام تسنیم ہے جو نہایت لطافت کے ساتھ ہوا میں معلق جاری ہے۔

ان تینوں چشموں کا پانی مقربین کے لئے مخصوص ہے لیکن اصحاب یمین کو بھی جو مقربین سے کم درجہ کے جنتی ہیں ان چشموں میں سے سربمہر گلاس مرحمت ہوں گے جو پانی پینے کے وقت گلاب اور کیوڑہ کی طرح سے اس میں تھوڑا تھوڑا ملا کر پیا کریں گے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

کمال قدرت:

اس کے بعد یہ سورت اللہ تعالی کے وجود اور وحدانیت اور کمال قدرت پر دلائل قائم کرتی ہے اور بعث اور حساب کو ثابت کرتی ہے، وہ اللہ جو پانی کے قطرے سے انسان بنا سکتا ہے، مٹی میں ڈالے جانے والے بیج کو پودا اور درخت بنا سکتا ہے، بادلوں سے پانی برسا سکتا ہے اور درخت سے آگ پیدا کر سکتا ہے، وہ مردہ انسان کو بھی دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔

(خلاصۃ القرآن)

ستاروں کی قسم کو عظیم قسم قرار دیا:

آیت ۷۵ میں اللہ نے ستاروں کے گرنے کی قسم کھائی ہے، اس قسم کے بارے میں اللہ خود فرماتا ہے کہ اگر تمہیں علم ہو تو یہ بہت بڑی قسم ہے۔ آیت ۷۶ میں یہ قسم کھا کر فرمایا:

وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿٧٦﴾

”بے شک یہ قرآن بہت بڑی عزت والا ہے، جو ایک محفوظ کتاب میں درج ہے، جسے صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں، یہ رب العالمین کی طرف سے اترا ہوا ہے۔“

اللہ تعالی نے ستاروں کی قسم کو عظیم قرار دیا تھا۔ آج سائنس، کروڑوں ستاروں پر مشتمل دنیا کے بارے میں جن تحقیقات اور عجائبات کا اظہار کر رہی ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ واقعی یہ بہت بڑی قسم ہے، سائنسدان بتاتے ہیں کہ کائنات پانچ سو ملین کہکشاؤں پر مشتمل ہے اور ہر کہکشاں میں ایک لاکھ ملین یا اس سے کم و بیش ستارے پائے جاتے ہیں اور یہ ساری کہکشائیں مسلسل گردش کر رہی ہیں، چاند مسلسل گھوم رہا ہے، زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہی ہے، سورج چھ لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کر رہا ہے، پھر ستاروں میں سے کسی کی گردش کی رفتار آٹھ میل فی سیکنڈ ہے، کسی کی ۳۳ میل فی سیکنڈ کسی کی ۸۴ میل فی سیکنڈ۔ اگر یہ سیارے آپس میں ٹکرا جائیں تو تمام نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔ اگر ان سیاروں کی رفتار میں فرق آ جائے تو ہمارے دن اور رات اور موسم تک بدل جائیں۔ ان جیسی تفصیلات کو سامنے رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے کتنی بڑی قسم کھائی ہے۔

ستاروں اور قرآن میں مناسبت:

ستاروں اور قرآن کریم کی قسمیں کھانے کے درمیان مناسبت یہ ہے کہ جیسے ستاروں کے ذریعے بر و بحر کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کی جاتی ہے یونہی قرآنی آیات سے جہالت اور ضلالت کی ظلمات میں سامان ہدایت حاصل کیا جاتا ہے۔

جیسے ستاروں کی دنیا کے سارے عجائب ابھی تک انسان پر آشکار نہیں ہوئے یونہی قرآن کریم کی آیات اور سورتوں میں پوشیدہ سارے علوم ومعارف سے بھی انسان آگاہ نہیں ہوسکا۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن)

سورت کا اختتام:

سورت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسانوں کے تینوں گروہوں کے لیے جس جزا اور سزا کی میں نے خبر دی ہے:

''یہ خبر سراسر حق اور قطعا یقینی ہے پس تو اپنے عظیم الشان پروردگار کی تسبیح بیان کر۔'' (۹۵-۹۶)

موضوع سورۃ......قیامت میں انسانوں کی تین قسمیں ہوں گی۔ دو ناجی، ایک ہالک۔

خلاصہ رکوع :۱......(۱) اجمال اقسام ثلاثہ۔ (۲) ناجی قسموں کی نعمتوں کا ذکر۔ ماخذ: (۱) آیت:۷ تا۱۱۔ (۲) آیت:۱۲ تا ۳۷۔

خلاصہ رکوع :۲......(۱) اصحاب الشمال کے سلوک کا ذکر۔ (۲) اور رفع استبعاد بعثت ثانیہ۔ ماخذ: (۱) آیت :۴۱، ۴۲ (۲) آیت: ۶۲۔

خلاصہ رکوع: ۳......اقسام ثلاثہ کے سلوک کا اعادہ بطور نتیجہ۔ ماخذ: آیت: ۸۸ تا ۹۴ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

＊＊＊

سورۃ الحدید

یہ قرآن کریم کی ۵۷ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا شمار ۹۴ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۴ رکوع، ۲۹ آیت، ۵۸۶ کلمات اور ۲۵۹۹ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے تیسرے رکوع میں ''**وانزلنا الحدید**'' کے الفاظ آئے ہیں کہ ہم نے لوہے کو پیدا کیا، حدید کے معنی لوہے کے ہیں۔ اس لئے علامت کے طور پر اس سورۃ کا نام حدید قرار پایا۔

ربط:

سورۂ سابقہ کا خاتمہ اور اس سورۃ کا شروع دونوں تسبیح پر مشتمل ہیں، وہاں امر تھا یہاں پر خبر ہے اور اس خبر سے مقصود دوسرے افعال وصفات کی خبر کے ساتھ اثبات توحید ہے۔ فرمایا گیا ''**ھو الاول والاخر والظاھر والباطن**'' اس کے متعلق کسی نے کیا خوب کہا ہے:

یہ عجب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں　　صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

ایسے ہی کسی نے کہا ہے۔

بے حجابی یہ کہ ہر شئ میں جلوہ آشکار　　اس پر گھونگٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

فائدہ:

یہ سورۂ حدید اور چار آگے آنے والی سورتیں سورۂ حشر، سورۂ تغابن، سورۂ صف، سورۂ جمعہ جن کے شروع میں لفظ سبّح یا یسبّح آیا ہے ان سورتوں کو حدیث میں مسبحات فرمایا گیا ہے۔

فضائل:

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ان مسبحات میں ایک آیت ایسی ہے جو ہزار آیتوں سے افضل ہے۔ علامہ ابن کثیر نے حدیث نقل کرنے کے بعد اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ افضل آیت سورہ حدید کی یہ آیت ہے۔ ’’**ھو الاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شئی علیم**‘‘ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کبھی تمہارے دل میں اللہ تعالی اور دین حق کے بارے میں شیطان کوئی وسوسہ ڈالے تو یہ آیت آہستہ سے پڑھ لیا کرو۔ وہ وسوسہ دور ہو جائے گا۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کا نزول صلح حدیبیہ ۶ ھ اور فتح مکہ ۸ ھ کے درمیان ہوا ہے، اس سورۃ میں اولا اللہ تبارک وتعالی کی صفات ذکر فرمائی گئی ہیں تا کہ سامعین کو یہ احساس ہو جائے کہ کس عظیم ہستی کی طرف سے ان کو مخاطب بنایا جارہا ہے۔ اور تا کہ جو اسلام میں داخل ہو چکے وہ خدا کو اچھی طرح پہچان لیں اور جو اسلام میں داخل نہیں ہو سکے وہ اس کی بزرگی، بڑائی اور عظمت شان سن کر اس کا مقرر کیا ہوا دین یعنی اسلام اختیار کر لیں، اس سورۃ میں بتلایا گیا کہ اللہ کی پاکی اور اس کی تسبیح ہر چیز بیان کر رہی ہے خواہ آسمانوں میں ہو یا زمین میں اور ہر جگہ اس کی حکومت وسلطنت ہے وہی مارتا ہے جلاتا ہے اسے ہی ہر چیز پر قدرت حاصل ہے، اسے ہر چیز کا علم ہے، اس نے ساری کائنات کو پیدا فرمایا اور ہر وقت تمہارے ساتھ ہے، وہی آسمان و زمین کا مالک ہے، دن رات کا ظہور اس کی قدرت کی نشانی ہے۔ اس لئے حکم ہوا کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مانو، پھر انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کی ترغیب اور تلقین فرمائی گئی کہ جو مال اللہ نے تم کو دے رکھا ہے اس کو اس کی راہ میں خرچ کرو اور سمجھایا گیا کہ دیکھو مال آنی جانی چیز ہے۔ پہلے دوسروں کے پاس تھا اور اب تمہارے پاس ہے، جیسے پہلے چھوڑ کر چلے گئے ویسے ہی تم بھی چھوڑ کر چلے جاؤ گے، اس مال کو اللہ کی راہ میں لگانا اگر چہ ہر حال میں قابل قدر ہے۔ مگر جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے اپنا مال خرچ کیا ان کے لئے بعد میں خرچ کرنے والوں سے زیادہ اجر ہے، کیونکہ پہلے ضرورت زیادہ تھی، یہ اللہ کا انسانوں پر احسان ہے کہ اس نے اپنا رسول تمہارے پاس بھیجا تا کہ تمہیں وہ جہالت کی اندھیریوں میں سے نکال کر علم ویقین کی روشنی میں لائے، پھر بتلایا گیا کہ جو کچھ بھی تم اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے وہ گویا ایسا ہے جیسا کہ تم اللہ کو قرض دے رہے ہو اور یقین رکھو کہ وہ تمہارا قرض پورا چکا دے گا اور اپنے فضل سے بہت کچھ دے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور جو لوگ دنیا میں اللہ کو نہیں مانتے اور اس کے رسول کی تعلیم و ہدایت پر نہیں چلتے ان کا قیامت میں برا حال ہوگا، وہ مدد کے لئے چلائیں گے اور فریاد کریں گے لیکن ان کو صاف جواب

دے دیا جائے گا۔ پھر فرمایا گیا کہ دیکھو دنیا میں کچھ نہیں رکھا ہے ایک عارضی بہار اور تھوڑے دن کا کھیل تماشہ ہے، جو کچھ ہے وہ اصل میں آخرت کی زندگی ہے، دنیا کا انتظام عارضی انتظام ہے اور اس میں ساری ضرورت و سہولت کی چیزیں رکھ دی گئی ہیں تاکہ اطمینان سے فارغ البال ہوکر اللہ کی عبادت میں لگو اور جو مال تمہارے پاس ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرو، مال و دولت کے جمع ہونے پر مت اتراؤ بلکہ اس سے خود نفع اٹھاؤ اور دوسروں کو نفع پہنچاؤ، عدل و انصاف قائم رکھو، سارے رسول یہی سکھاتے چلے آئے ہیں اس لئے تم اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر یقین کرو اور رسول کی اتباع کر کے بلند درجات حاصل کرو، یہ اللہ کا فضل ہے وہ جس پر چاہے اپنا فضل کرے، وہی بڑے فضل والا ہے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

نصیحت:

انسان مادیت اور رہبانیت کو چھوڑ کر درمیانی راہ اختیار کرے؛ کیونکہ دنیا میں آنے والے کچھ لوگ مادیت پرستی میں اس قدر مگن ہو گئے کہ وہ اپنے رب سے زیادہ چیزوں اور اسباب پر اعتماد اور یقین رکھنے لگے، جس کی وجہ سے قساوت قلبی پیدا ہوگئی اور گمراہی کی راہ اپنالی۔ (۱۶) اگلی آیت میں ارشاد ہے کہ بنجر زمین پانی سے ہریالی ہو جاتی ہے، اسی طرح میرے نام کے ورد سے دل نرم ہوجاتا ہے۔ (۱۷)

دوسرے طبقے کے لوگ وہ تھے جنہوں نے سنیاسی (رہبانیت) کا راستہ اختیار کیا جس کی تعلیم نہ اللہ نے دی اور نہ ان کے رسول نے۔ سنیاس میں اللہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی ذمہ داریاں انسان پر آتی ہیں جو کہ وہ پوری نہیں کر پاتا جس کی وجہ سے وہ ظالم ٹھہرتا ہے۔ (۲۷)

مندرجہ بالا دونوں طریقے خدائی تعلیم کے تابع نہیں ہیں اس لیے وہ ان کے تزکیہ نفس کا ذریعہ نہ بنیں۔

مسلمانوں کی ایک اہم ذمہ داری انصاف کا قیام ہے۔ عدل قائم کرنے کے لیے دو چیزیں لازم ہیں: (۱) صحیح حقوق کا تعین کرنا۔ (۱) مقررہ حقوق کو پورا کرنا، ان تمام حقوق سے بیدار ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کتابیں نازل فرمائیں۔ ہاں جو لوگ کتاب میں بیان کی گئی تعلیم کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اللہ ان کو روشنی دے گا؛ تاکہ ٹیڑھی میڑھی سڑک سے آسانی سے گزر جائے، اور رحمت کے دروازے ان کے کھل جائیں۔ (خواطر قرآنیہ)

مضامین:

اس سورہ کے مشتملات یہ ہیں:

◇ اللہ تعالی کے علم وقدرت کی وسعتوں کا تذکرہ۔

◇ انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب وتاکید۔

◇ رسالت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کا اعلان۔

◇ فتح مکہ سے قبل اسلام کے لئے جان ومال سے جہاد کرنے والے مسلمانوں کی فضیلت کا بیان۔

◇ نفاق اور منافقین کی مذمت۔

◇ دنیوی زندگی اور اس کے ساز وسامان کی بے ثباتی کا بیان ہے، اور یہ کہ جب دنیا آخرت فراموشی کا سبب ہوتا ہے۔

◇ نیکیوں کے لئے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہنے کی ترغیب۔

◇ خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت لوہا (مراد تلوار) ہے۔

اس کا صحیح مصرف کیا ہونا چاہئے، نیز اس تذکرہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب لوگ حق کو مٹا ڈالنے پر تل جاتے ہیں تو پھر انبیاء کو بھی تلوار اٹھانی پڑتی ہے اور یہ ان کے آنے کی اصل غرض نہیں ہوتی۔

◇ انسان کی اخلاقی وروحانی تربیت کی خاطر سلسلہ رسالت کا جاری کیا جانا، یہاں تک کہ حضرت عیسی علیہ السلام تشریف لائے اور اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی۔

◇ اللہ اور رسول پر ایمان اور تقوی اختیار کرنے کا حکم اور اس کے نتیجے میں آخرت میں ملنے والے انعامات کی بشارت۔ (خلاصہ مضامین قرآنی)

بنیادی تین مضامین:

◇ پہلا یہ کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کا ہے، وہی ہر چیز کا خالق اور مالک ہے۔ کائنات کی ہر چیز کا خالق اور مالک ہے، کائنات کی ہر چیز اس کی حمد اور تسبیح بیان کرتی ہے۔ انسان اور حیوان، شجر اور حجر، جن اور فرشتے، جمادات اور نباتات سب کے سب زبان حال اور زبان قال سے اس کی عظمت وکبریائی کا اقرار کرتے ہیں۔ جب کچھ نہیں تھا، وہ تھا، جب کچھ بھی نہیں رہے گا وہ تب بھی ہوگا، وہ ہر چیز پر غالب ہے، اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ وہ ظاہر اتنا ہے کہ ہر چیز میں اس کی شان ہویدا ہے اور باطن اور خفی ایسا ہے کہ کوئی عقل اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی اور حواس اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔

◇ دوسرا مضمون جو اس سورت میں بیان ہوا ہے وہ یہ کہ اللہ اور رسول پر ایمان لانے اور دین کی سربلندی کے لئے مال اور جان قربان کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا گیا ”تمہیں کیا ہو گیا ہے جو تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے“ حقیقت میں تو آسمانوں اور زمینوں کی میراث کا مالک اللہ ہی ہے۔ تمہاری موت کے بعد تمہارے مال ومتاع اور سیم وزر کا وہ اکیلا ہی وارث ہوگا، پھر فرمایا: ”کون ہے جو اللہ تعالی کو اچھی طرح قرض دے پھر اللہ تعالی اسے اس کے لیے بڑھاتا چلا جائے اور اس کے لیے پسندیدہ اجر ثابت ہو جائے“ انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب کے ساتھ ساتھ مخلص اہل ایمان اور منافقوں کا جو حال ہوگا اسے بیان کیا گیا ہے۔ پھر ایمان والوں کو جھنجھوڑنے والے انداز میں خبردار کیا ہے کہ وہ منافقوں اور یہود ونصاری کی طرح دنیا کی زندگی اور اس کی ظاہری کشش سے دھوکہ نہ کھائیں۔ ارشاد ہوتا ہے ”کیا اب تک ایمان والوں کے لیے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل ذکر الہی سے اور جو حق اتر چکا ہے اس سے

نرم ہوجائیں اوران کی طرح نہ ہوجائیں جنہیں ان سے پہلے کتاب دی گئی تھی پھر جب ان پر ایک زمانہ دراز گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے اوران میں سے بہت سے فاسق ہیں۔

◇ تیسرا مضمون جواس سورت میں بیان ہوا ہے وہ یہ کہ اللہ نے انسان کے سامنے دنیا کی زندگی کی حقیقت بیان کی ہے تا کہ وہ اس کی ظاہری زیب وزینت سے دھوکہ نہ کھاجائے۔سمجھایا گیا کہ دیکھو! یہ دنیا سراب ہے، دھوکہ ہے، لہو ولعب ہے، کم عقل لوگ مال واولاد کی کثرت پر فخر کرتے ہیں، حسب نسب پر اکڑتے ہیں، اپنی پوری زندگی اور ساری صلاحیتیں دنیا کا سامان جمع کرنے میں لگا دیتے ہیں، اس دنیا کی مثال اس کھیتی کی سی ہے جس کی سرسبزی اور تر وتازگی دیکھ کر کاشتکار خوش ہوتا ہے، دیکھنے والے رشک کرتے ہیں، پھر ایک وقت آتا ہے کہ کوڑا کرکٹ بن کر سب کچھ ہوا میں اڑ جاتا ہے۔یہی دنیا کی زندگی کا حال ہے، یہ فانی ہے اور یہاں کی ہر چیز زوال پذیر ہے لیکن آخرت کی زندگی دائمی ہے اور وہاں کی نعمتیں ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں۔اس لئے مسلمانوں کو حکم دیا جارہا ہے کہ اللہ کی مغفرت اور جنت کے حصول کے لئے دوڑ لگاؤ، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔سورت کے اختتام پر اللہ سے ڈرنے والوں اور رسول پر ایمان لانے والوں کے لئے دہرے اجر کا اور نور عطا کرنے کا وعدہ ہے جس کی روشنی میں وہ چلیں پھریں گے۔ اللہ تعالی ہم سب کو وہ نور عطا فرمائے۔آمین۔(خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن)

موضوع سورۃ......طریق حصول سلطنت۔

خلاصہ رکوع:۱......(۱) اگر عزت اور غلبہ پانا چاہتے ہو تو فنا فی ارادۃ اللہ ہونا (۲) اور انفاق فی سبیل اللہ کرنا سیکھو۔ ماخذ:(۱) آیت:۱ تا ۳۔(۲) آیت:۱۰۔

خلاصہ رکوع:۲......(۱) انفاق سے دنیا میں ترقی ایمان اور آخرت میں نور حاصل ہوگا۔(۲) اور ترک انفاق سے دنیا میں نفاق اور آخرت میں نور سلب ہوگا۔ماخذ:(۱) آیت:۱۲۔(۲) آیت:۱۳۔

خلاصہ رکوع:۳......ترک انفاق فی سبیل اللہ سے تفاخر وتکاثر فی الاموال والاولاد وغیرہ امراض پیدا ہوں گے۔ ماخذ: آیت:۲۰۔

خلاصہ رکوع:۴......خلق اللہ پر رافت ورحمت پیش نظر رہے، اور منزل من اللہ قانون میں اختلاط بدعت نہ ہونے پائے۔ماخذ: آیت:۲۷۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

✻ ✻ ✻

ستائیسویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) جنت میں داخلے کی کرنسی صرف اعمال صالحہ ہیں۔اس لئے کہ جنت کو انسان کے اعمال سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔

(۲) قیامت کے دن اللہ ایمان اور اعمال صالحہ کا ایسا اکرام فرمائیں گے کہ نیک لوگوں کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ ہی جنت میں جگہ عطا فرمادیں گے، اگرچہ اولاد کے اعمال باپ کی طرح نہ ہوں۔

(۳) اللہ کا اس امت پر فضل ہے کہ اس نے اس امت کے لئے قرآن کو یاد کرنا اور نصیحت حاصل کرنا آسان کردیا۔

(۴) دعوت اور مہمان کا اکرام یہ انبیاء کی سنت ہے۔حدیث شریف میں ہے ”جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھے اسے چاہئے کہ وہ مہمان کا اکرام کرے۔

(۵) الرحمٰن اللہ کا صفاتی نام ہے اور جس طرح کسی بندے کو ”اللہ“ کہہ کر پکارنا جائز نہیں اسی طرح صرف رحمٰن یا رحمٰن صاحب کہنا بھی جائز نہیں۔

(۶) رحمن کا شکر واجب ہے ان انعامات کی وجہ سے جو اس نے انسانوں اور جنات پر کئے ہیں۔

(۷) قیامت کے دن جب لوگ اپنی قبور سے اٹھیں گے تو ان کے لئے ایسی علامات ہوں گی کہ ان کے ذریعہ سعید اور شقی کی پہچان ہوجائے گی۔

(۸) جو شخص دنیا میں بوڑھا ہوگا اللہ تعالی اسے جنت میں داخلے کے وقت جوان اور خوبصورت کردیں گے۔

(۹) قرآن کی عزت وتکریم واجب ہے، اس لئے بغیر طہارت کے اسے چھونا حرام ہے۔

(۱۰) اہل ایمان کے لئے یہ بشارت عظمی ہے کہ جنت میں داخلے سے پہلے (۱) فرشتے ان سے ملاقات کریں گے (۲) ان کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا (۳) ان کے ساتھ ایک نور ہوگا جو ان کے دائیں طرف اور آگے کی طرف چلے گا اور ان کی جنت تک رہنمائی کرے گا۔

***

پارہ:۲۸

سورۃ المجادلۃ

یہ قرآن کریم کی ۵۸ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۱۰۵ پر ہے، اس سورۃ میں ۳ رکوع، ۲۲ آیات، ۴۷۹ کلمات اور ۲۱۰۳ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی پہلی آیت میں ''قدسمع اللہ قول التي تجادلک فی زوجھا'' آیا ہے، لفظ مجادلہ تجادل سے ماخوذ ہے۔

مجادلہ کے معنی ہیں بحث وتکرار، چونکہ اس روایت میں ان صحابیہ کا ذکر ہے جنہوں نے اپنے شوہر کے ظہار کا قصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر کے بار بار اصرار کیا تھا کہ آپ ایسی کوئی صورت بتائیں جس سے ان کی اور ان کے بچوں کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے اور یہ ظہار کی صورت جو عربوں میں ایام جاہلیت میں طلاق کی صورت سمجھی جاتی تھی اس کے باعث میاں بیوی میں علیحدگی واقع نہ ہو، اللہ نے ان صحابیہ عورت کے اصرار کو لفظ مجادلہ سے تعبیر فرمایا اور اس لئے یہی اس سورۃ کا نام قرار پایا۔ مدینہ میں ۵ھ یا اس سے قریب زمانہ میں اس سورۃ کا نزول ہوا۔

ربط:

سورۂ سابقہ کا خاتمہ مضمون رسالت پر تھا اور اس سورۃ کا مفتح یعنی ابتداء مسائل توحید سے ہے، نیز پہلی سورۃ کے ختم پر اہل ایمان پر فضل اخروی کا بیان تھا اور اس سورۃ کے شروع میں فضل دنیوی کا بیان ہے۔ بایں طور کہ مسئلہ ظہار میں جو پہلے شدت تھی اس کو رفع فرمادیا، پس توجہ فضل دونوں سورتوں میں مشترک ہے۔ لہذا تناسب ظاہر ہے۔

شان نزول:

ابتدائی آیات کا شان نزول یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اوس بن صامت رضی اللہ عنہ نے غصہ میں ایک بار اپنی بیوی کو یوں کہہ دیا کہ تو میرے حق میں ایسی ہے جیسے میری ماں کی پشت مجھ پر حرام ہے اور زمانہ جاہلیت میں اس لفظ سے طلاق سے بڑھ کر تحریم ابدی سمجھی جاتی تھی کہ عورت ہمیشہ کے لئے حرام ہوجاتی۔ خولہؓ تحقیق حکم کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قدیم دستور کے مطابق فرمادیا کہ میری رائے میں تو اپنے شوہر پر حرام ہوگئی، وہ یہ سن کر واویلا کرنے لگی کہ میرا اور میرے بچوں کا گزر کیسے ہوگا، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں اور فرمایا گیا کہ ظہار سے حقیقی حرمت نہیں ہوجاتی البتہ ظہار کرنے سے گنہگار رہوگا اور بغیر کفارہ ادا کئے ہوئے صحبت اور دواعی صحبت حرام ہے اور اگر کفارہ کے درمیان مثلاً روزے رکھتے ہوئے درمیان میں صحبت کر لی تو از سر نو کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ اور کفارہ ادا کرنے کے بعد وہ عورت شوہر کے لئے حلال ہوجائے گی۔

فائدہ:

کفارہ ظہار تین چیزوں میں سے ایک ہے(۱)غلام آزاد کرنا۔(۲)اگر غلام کے آزاد کرنے پر قدرت نہ ہوتو دو مہینے کے پے در پے روزے رکھنا۔(۳)اگر اس کی طاقت نہ ہوتو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں مسلمانوں کو مختلف مسائل کے متعلق ہدایات دی گئی ہیں،شروع سورۃ میں ظہار کے شرعی احکام بیان کئے گئے ہیں،اسلام سے پہلے ایام جاہلیت میں عرب میں یہ قاعدہ تھا کہ اگر کوئی شخص غصہ یا لڑائی میں اپنی بیوی سے کہہ دے کہ تو میری ماں ہے تو وہ ساری عمر کیلئے اس پر حرام ہو جاتی،اسی طرح اگر ماں نہ کہے مگر ماں کے کسی حصہ بدن سے-جس کا دیکھنا اس کے لئے منع ہے-اپنی بیوی کو تشبیہ دے مثلاً بیوی کو یوں کہہ دے کہ تو مجھ پر ایسی ہے جیسی میری ماں کی پیٹھ، تو زمانہ جاہلیت میں ایسا کہنا طلاق سے بھی زیادہ سخت اور قطع تعلق کا اعلان سمجھا جاتا تھا،طلاق کے بعد تو رجوع کی گنجائش ہو سکتی تھی مگر ان کلمات کے بعد رجوع کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔اس سورۃ میں اس جاہلیت کی رسم کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ فرما دیا اور بتلا دیا گیا کہ بیوی کو ماں کہنے یا ماں کے ساتھ تشبیہ دینے سے بیوی کو طلاق نہیں ہو جاتی،البتہ خاوند اس کے پاس نہیں جا سکتا جب تک کہ اپنے اس قول کا کفارہ نہ دے دے،اس کے بعد کفارہ ادا کرنے کی صورتیں بیان فرمائی ہیں اور مسلمانوں کو بڑی تاکید کے ساتھ متنبہ کیا گیا کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کو توڑنا یا اپنی مرضی سے کچھ اور قوانین بنا لینا ایمان واسلام کے منافی حرکتیں ہیں جس کی سزا دنیا میں بھی ذلت اور رسوائی ہے اور آخرت میں بھی اس پر سخت باز پرس ہوگی۔اس ذیل میں بتلایا گیا کہ اللہ کو انسانوں کے ہر ایک کام کا علم ہے اور وہ ہر وقت ہر جگہ آدمی کے ساتھ ہے،قیامت کے دن ہر ایک کا عمل اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور اس کی جزاء وسزا ملے گی پھر مسلمانوں کو مجلسی تہذیب اور اس کے آداب سکھائے گئے پھر مدینہ میں مسلم معاشرہ میں منافقین کا گروہ ملا ہوا تھا اس لئے منافقوں کو ان کی ناشائستہ حرکات سے روکا گیا اور مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ تم خفیہ بات چیت فقط نیک کاموں کے واسطے کرو،گناہ اور رسول کی نافرمانی کے منصوبے گھڑنے کے لئے خفیہ مشورہ ہرگز مت کرو،جھوٹی قسمیں کھانے والے منافقین کو تادیب وتنبیہ فرمائی گئی اور آدمیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا،ایک اللہ والے دوسرے شیطان والے،پھر ان دونوں گروہوں کی صفات بیان فرمائی گئیں کہ شیطان والے وہ ہیں جو اللہ اور رسول کی نافرمانی کرتے ہیں،اللہ کے مقرر کئے ہوئے راستے سے بھاگتے ہیں،یہ لوگ سراسر گھاٹے میں ہیں اور آخرت میں ناکام ہوں گے اور اللہ والے وہ ہیں جو اللہ کے مقرر کئے ہوئے طریقہ کی پابندی کرتے ہیں اور خدا کے مخالفوں سے دوستی نہیں کرتے اور دین کے معاملے میں کسی اور کا تو در کنار خود اپنے باپ بھائی اولاد کنبہ برادری تک کی پرواہ نہیں کرتے،یہی سچے مومن ہیں،انہیں سے اللہ راضی ہے اور آخرت میں یہی کامیاب اور فلاح پانے والے ہیں،اس پر سورۃ کو ختم فرمایا،واللہ اعلم۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مضامین :

اس سورہ میں مندرجہ ذیل مضامین ہیں :

◇ خانگی زندگی ہی سے متعلق ایک معاملہ (طلاق ظہار) کا حکم ہے۔

◇ منافقین کے منصوبے اور ان کی ریشہ دوانیوں اور ان کے کردار وروش کی برائیوں کا تذکرہ اور ان کے لئے آخرت کی رسوائیوں کا بیان۔

◇ آپس کی مشاورت کے حدود وشرائط۔

◇ آداب مجلس سے متعلق چند ہدایات، خصوصیت سے رسول اللہ ﷺ کی مجلس سے متعلق۔

◇ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور نماز اور زکوۃ ادا کرتے رہنے کی تاکید وحکم۔

◇ آپس کے تعلقات اور دوستی اور محبت کے حدود۔

اس سورت میں بنیادی طور پر چار اہم موضوعات کا بیان ہے۔

◇ پہلا موضوع ''ظہار'' ہے۔ اہل عرب میں یہ طریقہ تھا کہ کوئی شوہر اپنی بیوی سے یہ کہہ دیتا تھا کہ **انت علی كظهر أمي** یعنی تم میرے لئے میری ماں کی پشت کی طرح ہو۔ جاہلیت کے زمانہ میں اس کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ ایسا کہنے سے بیوی ہمیشہ کے لئے حرام ہوجاتی ہے۔ سورت کی ابتداء میں اس کے احکام کا بیان ہے۔ جس کا خلاصہ گذر چکا۔

◇ دوسرا موضوع یہ ہے کہ بعض یہودی اور منافقین آپس میں اس طرح سرگوشیاں کیا کرتے تھے جس سے مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ وہ ان کے خلاف کوئی سازش کررہے ہیں۔ آیت ۷ / سے ان ہی سرگوشیوں کے احکامات بیان کئے گئے ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد وہاں کے یہودیوں سے امن وامان کے ساتھ رہنے کا معاہدہ فرمایا تھا۔ دوسری طرف یہودیوں کو مسلمانوں سے جو دلی بغض تھا، اس کی بناء پر وہ مختلف ایسی شرارتیں کرتے رہتے تھے جو مسلمانوں کے لئے تکلیف کا باعث ہوں، چنانچہ ایک شرارت یہ تھی کہ بعض اوقات جب وہ مسلمانوں کو دیکھتے تو آپس میں اس طرح کانا پھوسی اور ایسے اشارے شروع کردیتے تھے جیسے وہ ان کے خلاف کوئی سازش کررہے ہوں۔ بعض منافقین بھی ایسا ہی کرتے تھے، اس طرز عمل سے مسلمانوں کو تکلیف ہوتی تھی، اس لئے انہیں اس طرح کی سرگوشیاں کرنے سے منع کردیا گیا تھا، اس کے باوجود وہ اس سے باز نہیں آئے۔

اسی طرح یہودیوں کی ایک اور شرارت یہ تھی کہ جب وہ مسلمانوں سے ملتے تو ''السلام علیکم'' کہنے کے بجائے ''السام علیکم'' کہتے تھے۔ السلام علیکم کے معنی ہیں ''تم پر سلامتی ہو'' اور السام علیکم کے معنی ہیں کہ ''تم پر ہلاکت ہو'' چونکہ دونوں لفظوں میں صرف ایک لام کا فرق ہے اس لئے بولتے وقت سننے والے خیال بھی نہیں کرتے تھے لیکن وہ لوگ اس طرح اپنے بغض کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ان آیات میں ان قبیح حرکات پر ان کی مذمت کی گئی ہے البتہ ایسی سرگوشیوں اور خفیہ مشوروں کی اجازت دی گئی ہے جو نیکی اور تقوی کے بارے میں ہوں۔

◇ تیسرا موضوع ان آداب کا بیان ہے جو مسلمانوں کو اپنی اجتماعی مجلسوں میں ملحوظ رکھنا چاہئے۔اس کے احکام آیت نمبر ۱۱ میں ارشاد فرمائے گئے ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِیْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَ اِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۱۱﴾

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور نبی کریم ﷺ مسجد نبوی کے ساتھ اس چبوترے پر تشریف فرما تھے جسے صفہ کہا جاتا ہے۔آپ کے ارد گرد بہت سے صحابہ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔اتنے میں کچھ ایسے بزرگ صحابہ جو غزوہ بدر میں شریک تھے اور ان کا درجہ اونچا سمجھا جاتا تھا،ان کو مجلس میں بیٹھنے کی جگہ نہ ملی تو وہ کھڑے رہے۔آنحضرت ﷺ نے شرکائے مجلس سے فرمایا کہ وہ ذرا سمٹ سمٹ کر آنے والوں کے لئے جگہ پیدا کریں،اس کے باوجود ان کے لئے جگہ کافی نہ ہوئی تو آپ نے بعض شرکائے مجلس سے فرمایا کہ وہ اٹھ جائیں اور آنے والوں کے لئے جگہ خالی کر دیں۔اس پر کچھ منافقین نے برا منایا کہ لوگوں کو مجلس سے اٹھایا جا رہا ہے۔عام طور پر آنحضرت ﷺ کا یہ معمول نہیں تھا لیکن شاید کچھ منافقین نے آنے والوں کو جگہ دینے میں تردد کیا ہو،اس لئے آپ نے انہیں اٹھا دیا ہو۔اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں ایک تو مجلس کا عام حکم بیان فرمایا گیا کہ آنے والوں کے لئے گنجائش پیدا کرنی چاہئے اور دوسرے یہ حکم بھی واضح کر دیا گیا کہ اگر مجلس کا سربراہ کسی وقت محسوس کرے کہ آنے والوں کے لئے جگہ خالی کرنی چاہئے تو وہ مجلس میں پہلے سے بیٹھے ہوئے لوگوں کو یہ حکم دے سکتا ہے کہ وہ اٹھ کر نئے آنے والوں کو بیٹھنے کی جگہ دیں۔البتہ کوئی نیا آنے والا خود کسی کو اٹھنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔جیسا کہ ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ کی یہی تعلیم مذکور ہے۔

◇ چوتھا اور آخری موضوع ان منافقوں کا تذکرہ ہے جو ظاہر میں ایمان کا اور مسلمانوں سے دوستی کا دعوی کرتے تھے لیکن درحقیقت وہ ایمان نہیں لائے تھے اور در پردہ وہ مسلمانوں کے دشمنوں یعنی یہودیوں سے دوستی بھی رکھتے اور ان کی مدد بھی کرتے رہتے تھے۔

ایک عورت جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس اپنے خاندان کے اجڑ جانے کی درخواست لے کر آئی تھی۔جس میں اس کے شوہر نے اسے اپنی ماں کی پیٹھ سے تشبیہ دی تھی۔جسے اس وقت کے رسم و رواج کے مطابق طلاق سمجھا جاتا تھا۔اس ایک جملے کی وجہ سے جاہلیت میں بہت مظالم ڈھائے۔جس کا انصاف خالق ارضی نے اپنی عدالت سے دیا،تا کہ اسلام میں عورت کی عزت کا احساس ہو۔دوسری طرف جو لوگ اسلام پر عورتوں کو غلام بنانے اور انہیں مناسب حقوق سے محروم کرنے کا الزام لگاتے ہیں ان کے منہ پر طمانچہ ہے۔عورت کو انصاف بھی ملا اور مقدس کتاب (قرآن) میں بھی جگہ ملی۔

یہ ایک ایسے خاندان کے تحفظ کے ساتھ شروع ہوا جس کے برباد ہونے کا امکان تھا۔ اس نے اپنی شادی کی رازداری کے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور غلط استعمال کا انصاف کیا۔

مندرجہ بالا تفصیل سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں: (۱) معاشرے کے افراد کو قرآن و حدیث کے مطابق تعلیم دی جائے۔(۲) عورتوں کو ان کے جائز حقوق دیں تاکہ عورت پر ظلم نہ ہو اور خاندان مضبوط ہو۔

مزید برآں وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے بعد بھی وراثتی رواج کو عمل میں لاتے ہیں ان کے لیے سخت الفاظ میں کہا گیا کہ وہ قابل مذمت ہیں اور شیطان کی جماعت ہیں۔ وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچائیں گے اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی پیروی کریں گے وہ اللہ کی جماعت ہیں اور وہ کامیابی کے معراج پر پہنچیں گے۔ (۵،۱۹،۲۰،۲۲)

جو لوگ اپنے اسلام کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں، وہ مسلمانوں کے اتحاد کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ اور مذہبی سرگرمیوں کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں کیونکہ منافقین کی اللہ پاک کے دشمنوں سے دوستی ہے اور وہ اللہ پاک کے نام پر جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ تاکہ لوگ اس پر اعتماد کریں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے منافقوں کو خبردار کیا کہ میں نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (۱۵)

اکیلے میں چپکے چپکے بات کرنے پر روک لگا کر کہا کہ یہ منافقوں کا کام ہے۔ اور مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ فتنہ پردازوں کے منصوبے تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم اپنا کام اعتماد کے ساتھ کرتے جاؤ۔

سچے مومن کا تعارف کرایا کہ جو لوگ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اللہ کے دشمنوں سے دوستی نہیں کرتے۔ خواہ وہ رشتہ دار ہو یا خاندان کا فرد۔ اگر وہ اللہ کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ دے تو اللہ اسے جنت میں جگہ دے گا۔

سورت کے ابتداء میں اسلام پر خواتین کو بولنے کا حق نہ دینے کا الزام لگانے والے اور ''اسلام میں عورت خوف کی زندگی گزارتی ہے'' کہنے والوں کی تردید پہلی ہی آیت میں ہے جس کی وجہ سے یہ آیت اتری کہ ایک عورت (خولہ) جو اپنے خاوند کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے تنازعہ کے تخمینہ میں پیش کرتی ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں شائستگی سے جواب دیا۔ اور ظہار کے احکام پر عمل کرنے میں اس کے شوہر کی مدد بھی کرتے رہے۔ اگر عورت کو بولنے کے حق سے محروم رکھا جاتا تو وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بات نہ رکھ پاتی۔ اس سے مزید تو یہ ہے کہ ایک دفعہ اس عورت نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو راستے میں روک کر اللہ سے ڈرنے کی نصیحت کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کردار سے کون بے خبر ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی بات سنی اور لوگوں سے بتلایا کہ اگر یہ عورت جتنی دیر کھڑی رہ کر مجھ سے بات کرتی تو میں اس کی بات سنتا کیونکہ یہ وہ محترم عورت ہے، جس کی بات اللہ نے آسمان پر سنی ہے۔

جب یہودیوں اور منافقین نے مسلمانوں کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں تو زمین وآسمان کے رب نے ان کے کرتوت کو عام کرنے کے لیے ایسا حکم دیا کہ ان کی چال کامیاب نہ ہو (نبی سے اکیلے بات کرنا ہو تو عطیہ دے کر ملاقات کرنا) لیکن یہ ایک ایسی آیت ہے جس پر صرف ایک صحابی (حضرت علی رضی اللہ عنہ) عمل کر سکے۔ جلد ہی اللہ پاک نے یہ حکم اٹھالیا۔

قرآن کریم میں دو لشکروں کا ذکر ہے: (۱) ایک لشکر شیطان کا ہے۔ وہ منافق جو یہودیوں سے دوستی کرتے ہیں اور مسلمانوں کے سامنے اسلام کی قسمیں کھاتے ہیں۔ انہیں شیطان کا لشکر قرار دیتے ہوئے اشارہ دیا کہ جو لوگ منہ کا ٹھوک اڑاتے ہیں، ان کے لیے کوئی عزت نہیں۔ (۲) حزب اللہ، یہ وہ سچے لوگ ہیں، جو کسی بھی وقت اللہ پاک اور اس کے رسول کے دشمن سے دوستی نہیں کرتے ہیں۔ چاہے ان کے والدین، پوتے، نواسے، خاندان کے افراد نہ ہوں۔ تو ایسے لوگوں کے لیے چار انعام ہیں: (۱) دل میں ایمان کی پختگی۔ (۲) غیبی مدد۔ (۳) جنت میں داخلہ۔ (۴) اللہ پاک ان سے راضی ہے اور وہ لوگ اللہ کی نعمتوں سے خوش۔ (خواطر قرآنیہ)

ان کے بڑے بڑے دعووں کے باوجود اللہ تعالی نے انہیں "حزب الشیطن" (شیطان کی جماعت) قرار دیا ہے۔

آیت ۲۲ میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جو کسی صورت بھی اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں کے ساتھ دوستی نہیں رکھتے، خواہ وہ ان کے ماں باپ، بیٹے، بھائی اور قبیلے والے ہی کیوں نہ ہوں۔ ان سعادت مندوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے چار نعمتوں کا اعلان فرمایا ہے۔ پہلی یہ کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان کو جمادیا ہے۔ دوسری یہ کہ ان کی غیبی مدد کی جائے گی۔ تیسری یہ کہ انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا۔ چوتھی یہ کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا ہے اور وہ بھی اللہ کی نعمتوں اور عطاء پر راضی ہو گئے۔ (خلاصۃ القرآن، خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:...... (۱) مسلمانوں کی سیاسی جماعت کے فرائض (۲) اور ان کا دائرہ اختیارات (۳) اور جماعت سیاسی کا انتخاب صدر (۴) اور تعمیل احکام صدارت (۵) اور ان نااہل لوگوں کا ذکر جو سیاسی جماعت میں داخل ہونے کے قابل نہیں۔

خلاصہ رکوع: ۱...... اہل حل وعقد کو شکایات سننے کے لئے علیحدہ بیٹھنا جائز ہے۔ ماخذ: آیت: ۱۔

خلاصہ رکوع: ۲...... (۱) اہل حل وعقد، اللہ تعالی کو حاضر وناظر خیال کریں (۲) اور ان کا دائرہ اختیارات (۳) اس جماعت کا صدر اہل علم ہونا چاہیئے۔ (۴) اطاعت صدر۔ ماخذ: (۱) آیت: ۷۔ (۲) آیت: ۹۔ (۳) آیت: ۱۱۔ (۴) آیت: ۱۱۔

خلاصہ رکوع: ۳...... اعدائے اسلام سے دوستی کرنے والے جماعت شوریٰ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ ماخذ: آیت: ۱۴، ۱۹۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الحشر

یہ قرآن کریم کی ۵۹ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۱۰۱ نمبر پر ہے، اس سورہ میں ۳ رکوع، ۲۴ آیات، ۴۵۵ کلمات اور ۲۰۱۶ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی دوسری آیت میں حشر کا لفظ آیا ہے، حشر کے لفظی معنی ہیں لوگوں کو اکھٹا کرنا اور ان کو گھیرنا، اس سورۃ میں یہود کے اکھٹا کرنے اور ان کو گھیرنے اور گھروں سے نکالنے کا ذکر ہے، اس لئے اس سورہ کا علامتی نام سورۂ حشر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس سورۃ کا نام سورہ بنی نضیر بیان فرمایا ہے کیونکہ یہ پوری سورۃ غزوہ بنی نضیر ہی کے متعلق نازل ہوئی۔

ربط:

پہلی سورۃ کے اکثر حصہ اخیرہ میں منافقین کی مذمت اور کفار و یہود سے دوستی رکھنا مذکور تھا، اس سورۃ کے اکثر حصہ اولیہ میں یہود کی بعض عقوبت اور منافقین کی دوستی کا ان کے کام نہ آنا مذکور ہے اور یہ مناسبت خصوصیت عقوبت مذکورہ کہ جلا وطنی ہے، درمیان میں فیئ کے بعض احکام بیان فرمائے گئے اور اخیر حصہ میں مسلمانوں کو کفار مذکورین جیسے اعمال سے نفرت دلائی گئی ہے اور اسی غرض سے آخرت کی تیاری اور احکام الہیہ کی مخالفت سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے، جس کی تاکید و تقویت کے لئے اپنے صفات جلال و جمال کو ذکر فرمایا ہے اور مضامین آپس میں ایک دوسرے کے مناسب ہیں، جس سے دونوں سورتوں کا ربط ظاہر ہے۔

فائدہ:

اکثر مفسرین ومحدثین کا اتفاق ہے کہ اس سورۃ میں جن اہل کتاب کا واقعہ مذکور ہے وہ بنونضیر ہیں جو یہود کا ایک بڑا قبیلہ تھا اور مدینہ سے جانب مشرق دومیل پر واقع تھا، بڑی بڑی جائدادوں، باغات اور سرسبز زمینوں اور مضبوط قلعوں کا مالک تھا، ہجرت کے چوتھے سال ان پر مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ماتحت حملہ کیا جو غزوہ بنونضیر کے نام سے مشہور ہے۔ واقعہ اس طرح ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بستی میں ان کو خون بہا میں شریک کرنے کی غرض سے تشریف لے گئے، واقعہ یہ ہوا تھا کہ عمر بن امیہ ضمری کے ہاتھ سے دو خون ہو گئے تھے، آپ نے سوچا کہ اگر بنونضیر بھی خون بہا کے چندہ دینے میں شریک ہو گئے تو بہتر ہے، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک جگہ بٹھلایا کہ بہتر ہے، ہم انتظام کئے دیتے ہیں اور باہم مشورہ کیا کہ کوئی شخص اوپر چڑھ کر چکی کا پتھر آپ پر چھوڑ دے کہ آپ کا کام تمام ہو جائے، فوراً وحی سے آپ کو معلوم ہو گیا، آپ وہاں سے اٹھ آئے اور کہلا بھیجا کہ تم نے نقض عہد کیا ہے، دس روز کی تم کو مہلت ہے اس مدت کے اندر جہاں چاہو چلے جاؤ، ورنہ جو شخص اس مدت کے بعد نظر آئے گا اس کی گردن ماردی جائے گی، انہوں نے

چلے جانے کا ارادہ کیا، تو عبداللہ ابن ابی منافق نے ان کو کہلا بھیجا کہ تم کہیں نہ جانا، میرے ساتھ دو ہزار آدمی ہیں، وہ اپنی جان دے دیں گے، مگر تم کو آنچ نہ آنے دیں گے۔ چنانچہ ان لوگوں نے وہاں سے نکلنے سے انکار کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو لے کر ان کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا، وہ لوگ قلعہ بند ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درخت کٹوا دیئے اور جلا دیئے، آخر تنگ ہو کر انہوں نے نکل جانا منظور کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جتنا اسباب لے جا سکتے ہو لے جاؤ مگر ہتھیار نہیں لے جا سکتے۔ منافقین یہ سب کچھ دیکھتے رہے اور خاموش بیٹھے رہے، وہ لوگ کچھ شام کو کچھ خیبر کو نکل گئے اور بوجہ حسد کے اپنے مکانات کے کڑی تختے سب نکال لے گئے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ان کو دیگر یہود کے ساتھ خیبر سے ملک شام کی طرف نکال دیا، یہ دونوں جلاوطنی حشر اول اور حشر ثانی کہلاتی ہیں، واللہ اعلم۔

خلاصہ سورۃ:

سورۃ کی ابتداء اللہ کے پاک ذکر سے فرمائی گئی اور بتلایا گیا کہ آسمان و زمین میں جو بھی مخلوقات ہیں سب خواہ قالاً یا حالاً اپنی زبان اور اپنے طریقہ سے اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اللہ زبردست اور حکمت والا ہے۔ چنانچہ اس غلبہ اور حکمت کے آثار میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ اس نے اہل کتاب یعنی یہود بنی نضیر کو پہلی بار ان کے قلعوں سے نکال دیا، یعنی وہ پہلے ہی حملہ میں اپنے مکانات اور قلعے چھوڑ کر بھاگ نکلے، پھر فرمایا گیا کہ اے مسلمانو تم کو یہ اندازہ نہ تھا کہ اتنی جلدی اور آسانی سے وہ ہتھیار ڈال دیں گے اور نہ انہیں کو خیال تھا کہ مٹھی بھر بے سروسامان لوگ اس طرح ان کا قافیہ تنگ کر دیں گے، وہ اس وہم و گمان میں تھے کہ مسلمان ہمارے قلعوں تک پہنچنے کا حوصلہ نہیں کر سکیں گے، مگر انہوں نے دیکھ لیا کہ کوئی طاقت اللہ کے حکم کو نہ روک سکی، ان کے اوپر اللہ کا حکم وہاں سے پہنچا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا، یعنی خدا تعالی نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور ان کی یہ حالت حرص و حسد کی بنا پر ہوئی کہ اپنے مکانوں کے کڑی تختے کو اڑ کو اکھاڑ نے لگے تا کہ کوئی چیز مسلمانوں کے ہاتھ نہ لگے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے کہ جو تباہی ان کو مسلمانوں کے ہاتھوں پہنچی وہ انہیں کی بدعہدیوں اور شرارتوں کا نتیجہ تھی۔ آگے فرمایا کہ اہل بصیرت کے لئے اس واقعہ میں بڑی عبرت ہے، اللہ نے دکھلا دیا کہ کفر و ظلم و شرارت و بدعہدی کا انجام کیسا ہوتا ہے اور یہ کہ محض ظاہری اسباب پر تکیہ کر کے اللہ کی قدرت سے غافل ہو جانا کسی عقلمند کا کام نہیں ہے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

ابتداء میں بتایا گیا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالی کی تسبیح و تقدیس اور حمد و ثنا بیان کرتی ہے اور اس کی وحدانیت اور قدرت و جلال کی گواہی دیتی ہے۔

زندہ دلائل کا تذکرہ:

پھر یہ سورت قدرت الہیہ کے بعض آثار اور زندہ دلائل کا تذکرہ کرتی ہے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہود جو کہ عرصہ دراز سے یثرب میں قیام پذیر تھے انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے بڑے مضبوط قلعہ تعمیر کر رکھے تھے، معاشی

وسائل پوری طرح ان کے قبضے میں تھے، یثرب والوں کو انہوں نے سودی قرضوں کی سنہری زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا اور ان کا خیال یہ تھا کہ کوئی بھی ہمیں یہاں سے نہیں نکال سکتا۔ لیکن ان کی اپنے ہی کرتوتوں کی وجہ سے ان پر اللہ کا عذاب آکر رہا اور انہیں دوبارہ حشر کا سامنا کرنا پڑا (حشر جمع اور اخراج کے معنی میں ہے) حشر اول میں انہیں مدینہ منورہ سے شام کی طرف دھکیل دیا گیا اور حشر ثانی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں خیبر سے شام کی طرف چلے جانے پر مجبور کر دیا۔

غیر متوقع واقعہ:

یہود کا مدینہ اور خیبر سے نکل جانا ایک ایسا واقعہ تھا کہ یہود کا تو کیا خود مسلمانوں کے لیے قطعی طور پر غیر متوقع تھا، ان کی معاشی خوشحالی، دفاعی انتظامات اور مضبوط جماعتی نظم کی وجہ سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انہیں بصد ذلت وخواری مدینہ منورہ اور خیبر سے نکلنا پڑے گا۔

ظاہری اسباب کچھ کام نہ آئے:

لیکن اللہ نے جب انہیں ان کی عہد شکنی، تکذیب وانکار، تکبر اور سرکشی کی وجہ سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا تو ظاہری اسباب ان کے کسی کام نہ آئے اور اللہ کا فیصلہ وقوع پذیر ہو کر رہا۔ (۲-۵)

مال غنیمت:

جب یہود کے قبیلہ بنونضیر کو مدینہ منورہ سے نکال دیا گیا تو بہت سارا مال غنیمت مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا، جو مال غنیمت قتل وقتال کے بغیر ہاتھ آ جائے اسے اصطلاح میں ''مال فیئ'' کہتے ہیں، اس مال فیئ کے بارے میں حکم دیا گیا کہ اس میں مجاہدین میں سے کسی کا حق نہیں، بلکہ اس کی تقسیم کا اختیار اللہ کے نبی کو ہے۔ وہ اسے فقراء، ضعفاء، مساکین، حاجتمندوں اور قرابتداروں میں تقسیم کریں گے۔

اسلامی اقتصادیت کا فلسفہ:

یہاں اگرچہ مسئلہ تو مال فیئ کی تقسیم کا بیان ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے ضمن میں اسلامی اقتصادیات کا ایک اہم فلسفہ بھی بیان کر دیا گیا ہے وہ یہ کہ اسلام نہیں چاہتا کہ دولت چند اغنیاء کے ہاتھوں میں گردش کرتی رہے، بلکہ اسلام اس کا ایک طریقے سے پھیلاؤ چاہتا ہے کہ سوسائٹی کا کوئی فرد اور کوئی طبقہ بھی محروم نہ رہے۔ زکوۃ، صدقات، میراث اور خمس وغیرہ کی تقسیم میں یہی فکر کارفرما ہے، اقتصادیات کے اس عظیم فلسفہ کے علاوہ قانون سازی کے منبع اور مصدر کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے، وہ یہ کہ

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَیْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

''جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اس سے باز رہو۔ (۷)

اتباع واجب ہے:

وہ تمام قوانین اور مسائل واحکام جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے لے کر آئے ان کی اتباع واجب ہے، خواہ وہ قرآن کی صورت میں ہوں یا سنت صحیحہ کی صورت میں، کتاب وسنت کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی قسم کی قانون سازی جائز نہیں۔

مہاجرین اور انصار:

سورہ حشر جہاں ایک طرف اللہ کی رضا کو ہر چیز پر ترجیح دینے والے مہاجرین اور انصار اور ان کی اتباع کرنے والے قیامت تک کے مسلمانوں کی تعریف کرتی ہے، وہیں ان منافقوں کی مذمت بھی کرتی ہے، جو یہود کو برے وقت میں اپنے تعاون کا یقین دلاتے رہتے تھے، اللہ فرماتے ہیں:

"ان دونوں گروہوں (یہود اور منافقوں) کا انجام یہ ہوگا کہ دونوں دوزخ میں داخل ہوں گے، اس میں ہمیشہ رہیں گے اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔(۱۱-۱۷)

یہود ونصاریٰ کی طرح نہ ہوجانا:

سورۂ حشر کے آخری رکوع میں ایمان والوں کو اللہ سے ڈرنے کا حکم ہے، انہیں سمجھایا گیا ہے کہ تم ان یہود ونصاری کی طرح نہ ہوجانا، جنہوں نے حقوق اللہ کو بھلا دیا، جس کی پاداش میں اللہ نے انہیں خود ان کی ذات کے حقوق بھی بھلا دیے۔ وہ آخرت کو بھول کر حیوانوں کی طرح نفسانی خواہشات کی تکمیل ہی میں لگے رہے۔(۱۹)

افسوس ہے انسان پر:

علاوہ ازیں اہل ایمان کو کتاب اللہ کی عظمت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے فرمایا گیا کہ اگر اللہ پہاڑوں کو عقل وشعور عطا فرما دیتا اور پھر ان پر قرآن نازل کر دیتا تو وہ اللہ کے خوف سے ریزہ ریزہ ہوجاتے۔(۲۱)

افسوس ہے انسان پر کہ وہ اس بے مثال کلام کی عظمت سے ناواقف ہے اور اس کے حقوق ادا نہیں کرتا۔

اسمائے حسنیٰ کے ضمن میں:

سورت کے اختتام پر اسماء حسنیٰ کے ضمن میں اللہ کی عظمت اور کبریائی کا بیان ہے اور آخر میں وہی الفاظ ہیں، جن سے اس سورت کا آغاز ہوا تھا یعنی یہ کہ جتنی چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب اس کی تسبیح کرتی ہیں اور وہ غالب حکمت والا ہے۔" (۲۲-۲۴) (خلاصۃ القرآن)

موضوع سورۃ:......اس میں پانچ چیزیں آئیں گی۔(۱) مسلمانوں کی سلطنت کی ابتداء۔(۲) اسباب بقاء۔(۳) اسباب فنا۔(۴) قرآن پر عامل ہونا اور دنیا میں ذلیل ہوکر رہنا ناممکن ہے۔(۵) شرائط استفادہ من القرآن۔ جو اس سورت میں دیا جائے گا، اللہ تعالی کو اس کی ضرورت نہیں، مسلمانوں کو ضرورت ہے، اللہ تعالی ہر ضرورت سے پاک ہے۔

خلاصہ رکوع :۱......(۱) مسلمانوں کی سلطنت کی ابتداء کس طرح ہوئی۔(۲) اور اسباب بقا کیا ہیں۔ ماخذ: (۱) آیت: ۲۔(۲) آیت: ۷ تا ۱۰۔

خلاصہ رکوع: ۲......فنائے سلطنت کے اسباب آیت:۱۱۔(۱) تفصیل یہ ہے کہ جس وقت کسی قوم میں منافق پیدا ہوجائیں جو بظاہر اپنی قوم میں ملے رہیں، اور در پردہ اپنی قوم کے دشمنوں سے ساز باز رکھیں، اور بجائے اپنی قوم کے دشمنوں کی خیر خواہی میں منہمک رہیں، ایسے وقت میں اس قوم کی سلطنت کو زوال آتا ہے، لہذا اس رکوع میں مسلمانوں کو اس نالائق طبقے کے حالات سے مطلع کیا گیا ہے، تاکہ ان سے بچیں۔

خلاصہ رکوع: ۳......(۱) قرآن حکیم پر عامل ہونا اور دنیا میں ذلت اٹھانا ناممکن ہے۔(۲) شرائط استفادہ عن القرآن، جب تک اللہ کے متعلق ایک خاص حسن عقیدت دل میں نہ ہو اور اس کی طاقت اور زور کا اندازہ معلوم نہ ہو، اس وقت تک انسان اس کے قانون اور فرامین سے پورا استفادہ حاصل نہیں کرسکتا۔ ماخذ: (۱) آیت: ۲۰۔(۲) آیت: ۲۱ تا ۲۴۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الممتحنہ

یہ قرآن کریم کی ۶۰ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا شمار ۹۱ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۱۳ آیات، ۳۴۰ کلمات، ۱۵۲۳ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے دوسرے رکوع میں ایمان والوں کو خطاب کر کے حکم دیا گیا ہے کہ جب مسلمان عورتیں تمہارے پاس ہجرت کر کے آئیں "فامتحنوھن" تو ان کا امتحان کرلیا کرو، اسی نسبت سے اس سورۃ کا نام ممتحنہ مقرر ہوا، جس کے معنی ہیں امتحان لینے والی سورۃ، یہ سورۃ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیانی زمانہ میں نازل ہوئی۔

ربط:

سورۂ سابقہ میں منافقین کی یہود سے دوستی کرنے کی مذمت تھی، اس سورۃ کے اول و آخر میں مسلمانوں کو کفار سے تعلقات، دوستی اور بالخصوص مشرکات عورتوں سے تعلق نکاح رکھنے کی ممانعت ہے اور مشرکات و مؤمنات میں تمایز کے لئے صرف اظہار ایمان پر اکتفا کرنے کا اشارہ ہے۔

شان نزول:

اکابرین مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس سورۃ کا نزول اس وقت ہوا جب مشرکین مکہ کے نام حضرت حاطب کا ایک خط پکڑا گیا تھا، واقعہ یہ کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے لئے جہاد کا ارادہ کیا تو حاطب بن ابی بلتعہ نے

جو کہ اہل بدر سے ہیں اور رہنے والے یمن کے ہیں، مکہ میں آ کر رہنے لگے تھے، ان کے بھائی اور والدہ، اولاد اور اہل وعیال واموال سب مکہ میں تھے، انہوں نے اہل مکہ کے نام ایک خط لکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم پر چڑھائی کرنے والے ہیں اور یہ خط ایک عورت کو دے دیا کہ مکہ والوں کو پہنچادے، آپ کو وحی سے یہ بات معلوم ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور چند صحابہ کو حکم دیا کہ فلاں جگہ وہ عورت ملے گی، اس سے وہ خط لے آؤ، یہ گئے اور وہ عورت ملی اور ان کے دھمکانے ڈرانے سے وہ خط اس نے دے دیا، یہ حضرات اس سے لے کر آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب سے پوچھا انہوں نے کہا: واقعی یہ خط میرا ہی لکھا ہوا ہے، لیکن خدا نہ کرے میں نے مخالفت اسلام کے سبب یہ خط نہیں لکھا، بلکہ میں جانتا تھا کہ اسلام کو تو اس سے کوئی ضرر نہیں کیونکہ اللہ تعالی اس کو ضرور غالب کرنے والا ہے، آپ کو ضرور فتح ہوگی اور میرا نفع ہو جائے گا کہ اہل مکہ اس خط کا احسان مان کر میرے اہل وعیال واموال کی حفاظت کریں گے اور ان کو ایذا وضرر نہ پہنچائیں گے، کیونکہ میری ان سے اور کوئی قرابت ہے نہیں جس کی وجہ سے وہ میری رعایت کرتے بلکہ میں محض اجنبی پردیسی مسافر تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا اور آپ نے ان کی گردن مارنے کی اجازت چاہی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اہل بدر میں سے ہیں اور اللہ نے اہل بدر کے گناہ معاف فرما دیئے ہیں، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں مسلمانوں کو کفار کے ساتھ تعلقات سے متعلق اصولی طور پر یہ ہدایت کی گئی کہ وہ کفار جو مسلمانوں سے برسرپیکار ہیں ان سے ہر طرح پر ترک موالات ضروری ہے، لیکن جو غیر مسلم جنگ نہیں کر رہے ہیں ان سے احسان کرنے اور انصاف کرنے کا حکم ہے، انہیں باہمی تعلقات میں سے ایک اہم معاشرتی مسئلہ کا فیصلہ بھی اس سورۃ میں فرمایا گیا۔ مکہ میں بعض مسلمان عورتیں ایسی تھیں جن کے شوہر کافر تھے، مسلمان عورتیں کسی نہ کسی طرح ہجرت کر کے مدینہ پہنچ جاتی تھیں اسی طرح مدینہ میں بہت سے مسلمان مرد ایسے تھے جن کی بیویاں کافرہ تھیں، اس سلسلہ میں یہ حکم نازل ہوا کہ جب ایسی عورتیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں اپنے خاوندوں سے الگ ہو کر مدینہ آویں تو اس کا امتحان لے کر پورا اطمینان کر لینا چاہئے، اگر وہ مخلصانہ طور پر مسلمان معلوم ہوں تو ان کے نکاح پہلے کافر خاوندوں سے باقی نہیں رہ سکتے۔ البتہ ان کے کافر خاوندوں نے جو ان پر خرچ کیا ہے وہ ان کو دے دینا چاہئے، پھر کافر عورتوں سے مسلمان مردوں کے نکاح کو سختی سے روکا گیا۔ اخیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کی گئی کہ جو مؤمن عورتیں آپ سے بیعت کرنا چاہیں تو ان سے اس بات پر بیعت لیجئے کہ وہ شرک نہ کریں گی۔ چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی اور نہ کوئی بہتان کی اولاد لاویں گی اور مشروع باتوں میں وہ آپ کے خلاف نہ کریں گی، گویا جو برائیاں جاہلیت میں عرب معاشرہ میں عورتوں کے اندر پھیلی ہوئی تھیں، ان بڑی بڑی برائیوں سے بچنے کا عہد لیا جائے اور اس بات کا اقرار کرایا جائے کہ آئندہ وہ شریعت اسلامیہ کے احکام کے موافق زندگی گزاریں گی۔ اخیر سورۃ میں پھر ایمان والوں کو تاکید فرمائی گئی کہ وہ ان لوگوں

سے دوستی نہ کریں جن پر اللہ نے غضب کیا ہے۔ واللہ اعلم ! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مسلمانوں سے متعلق چار امتحانات ہیں: (۱) حضرت حاطب بن بلتعہ (رضی اللہ عنہ) کا امتحان۔ (۲) مؤمن مہاجر خواتین کا امتحان۔ (۳) دوستی اور دشمنی کا معیار۔ (۴) عورتوں سے نذر قرار کا معاملہ۔

پہلا امتحان ایک مخلص صحابی کا تھا جس نے نظریاتی غلطی کے ساتھ دشمنوں کو ایک پُراسرار خط لکھا، لیکن یہ کام ناکام رہا۔ کیونکہ اللہ پاک نے نہیں چاہا لیکن اللہ پاک نے بڑے پیار بھرے انداز میں تردید کی اور فرمایا کہ جنہوں نے حق کو خود نہیں مانا اور جنہوں نے قبول کیا، انہیں ستایا گیا۔ اپنا آبائی شہر چھوڑنے پر مجبور کیا، تو ان کا یہ شہر چھوڑنا اور میدان میں آنے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ راضی ہوجائے۔ پھر جو لوگ اللہ کے دشمن ہیں ان سے چھپ کر دوستی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ عسکری منطق کی بات ہے اور آیت کے شروع میں ایمان والا کہہ کر اپنی محبت کا اظہار کیا کہ وہ پاک دل اور صاف ہیں۔ محض ایک نظریاتی خرابی کی وجہ سے ان پر کوئی پکڑ کا حکم نہیں آیا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا جو عملی نمونہ ہے۔ جب انہوں نے قوم کو توحید کا درس دیا تو پرائے تو پرائے لیکن گھر کے لوگ بھی دشمن بن گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے واضح کردیا کہ میری اور آپ کی جوڑی نہیں ملتی۔ اور ہم ایک دوسرے کے دوست نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ ایک اللہ کو نہ مان لو۔ ہاں میں اپنے بس کے مطابق اللہ سے دعا کرتا رہوں گا۔ یہ اسلام سے خود وابستگی کا اصل امتحان ہے کہ اللہ کی راہ آڑے آنے والے سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں۔

پھر ان خواتین کا امتحان لینے کے متعلق بیان ہے جو مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے آئے۔ امتحان اس بات کو یقینی بنانا تھا کہ مجرم اور بدعنوان لوگ ہمارے معاشرے میں داخل نہ ہوں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ خواتین سماجی تحفظ میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ گھر کے افراد کے دین کو بچاتی ہے۔ اور اتحاد و اتفاق کو برقرار رکھتی ہیں۔

غیر مسلموں کے ساتھ انصاف:

اسلام انصاف کا سبق دیتا ہے۔ دشمنوں سے خفیہ گفتگو اور دوستی سے روکا۔ یہ وہ دشمن ہیں جو مذہب کی مخالفت کرتے ہیں اور مذہب کے نام پر اسے ستاتے ہیں۔ لیکن وہ غیر مسلم جو مذہب کے نام پر قتل نہیں کرتے۔ اور نہ مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالتے ہیں تو ان کے ساتھ انسانیت کا برتاؤ کرنے کی اجازت ہے۔ (یعنی دوستی دشمنی کا معیار دکھایا۔)

(خواطر قرآنیہ)

یہ وہ سنگ دل لوگ ہیں:

ایمان والوں کو اللہ نے حکم دیا کہ کفار جو کہ میرے دشمن بھی ہیں اور تمہارے دشمن بھی ہیں انہیں دوست نہ بناؤ، یہ وہ سنگدل لوگ ہیں، جنہوں نے مکہ کی سرزمین ایمان والوں پر تنگ کردی اور انہیں وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور کردیا، آج بھی ان کے دلوں میں آتش غضب بھڑک رہی ہے اور انہیں مسلمانوں کو دکھ دینے اور نقصان پہنچانے کا جو بھی موقع ہاتھ آتا

ہے اسے ضائع نہیں جانے دیتے، خواہ وہ موقع ہاتھ چلانے کا ہو یا زبان چلانے کا۔(۲)

یہ رشتے ناتے:

یہ رشتے ناتے جنہیں تم بڑی چیز سمجھتے ہو اور قبول ایمان کے باوجود ان کے مفادات کا خیال رکھتے ہو، یہ قیامت کے دن تمہیں کچھ بھی فائدہ نہیں دیں گے، وہاں باپ بیٹے اور بھائی بھائی کے درمیان جدائی کر دی جائے گی، جب ان رشتوں کا یہ حال ہے تو ان کی خاطر اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت کرنا اور جماعت اسلامیہ کے رازوں کا افشاء کہاں کی دانش مندی ہے۔(۳)

اس سوچ کی تائید اور تقویت کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے جنہوں نے اللہ کے لیے اپنی مشرک قوم سے براءت کا اعلان کر دیا تھا۔

ان کے نام لیواؤں پر بھی لازم ہے کہ وہ کسی سے محبت کریں تو صرف اللہ کے لیے اور دوری اختیار کریں تو صرف اللہ کے لیے۔(۴)

کفار سے مقاطعہ کا حکم:

جب اللہ تعالی نے مسلمانوں کو کفار سے مقاطعہ کا حکم دیا تو انہوں نے اس کی تعمیل میں دیر نہ کی۔

باپ نے بیٹے سے اور بھائی نے بھائی سے تعلق ختم کر دیا، یوں ان کے ایمانی دعوؤں کی سچائی بالکل واضح ہو کر سامنے آ گئی، لیکن خونی رشتے اور وطن ایسی چیزیں ہیں کہ ان کی طرف میلان اور ان کی محبت اللہ تعالی نے انسان کی فطرت میں رکھی ہے۔

فطری جذبات کا لحاظ:

اس لیے قرآن ان فطری جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کو ایک بشارت سناتا ہے اور ایک معاملہ کی اجازت دیتا ہے۔ بشارت تو یہ سنائی گئی کہ کیا عجب کہ عنقریب ہی اللہ تعالی تم میں اور تمہارے دشمنوں میں محبت پیدا کر دے، اللہ قدرت والا ہے اور اللہ بڑا غفور رحیم ہے۔(۷)

یعنی ہوسکتا ہے کہ تمہارے رشتہ داروں کو بھی ایمان قبول کرنے کی توفیق دے دی جائے، یوں آج کے دشمن کل کے دوست بن جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بے شمار مشرکوں کو اسلام کی حقانیت کے سامنے گردن جھکانے کی توفیق ارزانی ہوئی۔(۷)

جس معاملہ کی اجازت دی گئی وہ یہ تھا کہ جن لوگوں نے نہ تو قبول ایمان کی وجہ سے تمہارے ساتھ قتال کیا اور نہ ہی تمہیں گھروں سے نکالا، تم ان سے حسن سلوک کر سکتے ہو۔(۸)

اسلام محبت اور سلامتی کا دین ہے:

اصل میں اسلام، محبت اور سلامتی کا دین ہے، وہ محض دھونس جمانے اور کسی اعلی مقصد کے بغیر ملک اور زمین ہتھیانے کے لیے جنگ کی اجازت نہیں دیتا، وہ ان غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن سلوک اور تعاون کی تلقین کرتا ہے جو جنگ کو ناپسند

کرتے ہوں اور امن کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہوں۔

مہاجرات خواتین کا امتحان:

سورہ ممتحنہ ان خواتین کے بارے میں بھی رہنمائی کرتی ہے جو ایمان قبول کرنے کے بعد ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ گئی تھیں، ان کے بارے میں حکم دیا گیا کہ ان کا امتحان لے لو اور انہیں اچھی طرح جانچ لو کہ آیا واقعی انہوں نے ایمان کی خاطر ہجرت کی ہے۔ اگر تمہیں ان کے ایمان پر اطمینان ہو جائے تو پھر انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو۔

ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیطؓ:

مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ حکم اس وقت نازل ہوا جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین دشمن ''عقبہ بن ابی معیط'' کی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا ہجرت فرما کر مدینہ منورہ آ گئیں اور ان کا والد معاہدہ حدیبیہ کے پیش نظر انہیں واپس لانے کے لیے مدینہ پہنچا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے یہ کہہ کر خالی ہاتھ واپس لوٹا دیا کہ ہمارا معاہدہ صرف ایمان لانے والے مردوں کے بارے میں تھا، خواتین کے بارے میں نہیں تھا۔

اس قوم سے دوستی نہ کرو:

اس سورت کی آخری آیت میں دوبارہ تاکید کی گئی ہے: اے مسلمانو! تم اس قوم سے دوستی نہ رکھو جن پر اللہ کا غضب نازل ہو چکا ہے جو آخرت سے اس طرح مایوس ہیں، جیسے کہ قبر والوں سے کافر مایوس ہیں۔ (۱۳)

موضوع سورۃ......مقاطعہ عن الکفار۔

خلاصہ رکوع: ۱......اسباب مقاطعہ۔ ماخذ: آیت: ۱۔

خلاصہ رکوع: ۲......اقسام الکفار (کفار کی دو قسمیں ہیں) (۱) ایک کے ساتھ صلح ناجائز، اور (۲) دوسری کے ساتھ لڑنا جائز نہیں۔ ماخذ: (۱) آیت: ۸۔ (۲) آیت: ۹۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الصف

یہ قرآن کریم کی ۶۱ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۱۰۹ ہے، اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۱۴ آیات، ۲۲۳ کلمات اور ۹۹۱ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی تیسری آیت میں جہاد کرنے والوں کی صفت ان الفاظ میں بیان فرمائی گئی ''الذین یقاتلون في سبیله صفاً کانهم بنیان مرصوص'' کہ اللہ کو یہ بات بہت محبوب ہے کہ لوگ راہ حق میں اللہ کے دشمنوں سے جہاد کے لئے اس

طرح ڈٹ کر کھڑے ہو جاتے ہیں جیسے کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار۔ اس کی مناسبت سے اس سورۃ کا نام سورۃ الصّف مقرر ہوا۔

ربط:

سابقہ سورۃ میں کفار سے دوستی نہ رکھنے کا ذکر تھا، اس سورۃ میں کفار سے مقابلہ (جنگ) کا ذکر ہے اور کچھ مضمون تبعیت میں مذکور ہے۔

شانِ نزول:

روایت میں ہے کہ ایک جگہ صحابہ کرام جمع تھے، آپس میں کہنے لگے کہ ہم کو اگر معلوم ہو جائے کہ کونسا کام اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے تو ہم وہی کام اختیار کریں گے۔ مسند احمد کی روایت میں ہے: عبداللہ بن سلام فرماتے ہیں کہ ہم صحابہ آپس میں بیٹھے یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ کوئی جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کرے کہ خدا کو سب سے زیادہ محبوب عمل کونسا ہے، مگر ابھی کوئی کھڑا نہ ہوا تھا کہ ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد پہنچا اور ہم میں سے ایک ایک کو بلا کر حضور کے پاس لے گیا، جب ہم سب جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پوری سورۃ کی تلاوت کی جس میں بتلایا گیا کہ جہاد کا عمل اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔

خلاصہ سورۃ:

سورۃ کی ابتداء میں تمام ایمان لانے والوں کو خبردار کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات نہایت ناپسند ہے کہ لوگ زبان سے کہیں کچھ اور کریں کچھ اور یہ بات نہایت محبوب ہے کہ لوگ راہ حق میں اللہ کے دشمنوں سے جہاد کے لئے اس طرح صف بنا کر کھڑے ہو جائیں جیسا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار، پھر بتلایا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں یہی عادت تھی کہ زبان سے بڑے بڑے دعوے کرتے اور کہتے کہ ہم بڑے بڑے کام کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں جب آپ حکم دیں تو ہم جان پر کھیل جائیں، لیکن موقع آتا تو صاف جواب دے دیتے جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اذیت پہنچتی، ایسا ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کیا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ دیکھو میں اللہ کا رسول ہوں، مجھ سے پہلے جو رسول آئے ان کو سچا کہتا ہوں اور اپنے بعد خاتم النبیین کے آنے کی بشارت دیتا ہوں، تم ان کی فرمانبرداری کرنا تو انہوں نے زبانی تو بڑے بڑے دعوے کئے کہ ہم اس آخری رسول کی نصرت و حمایت کریں گے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور نشانیوں سے صاف معلوم ہو گیا کہ آپ وہی رسول ہیں جن کی تشریف آوری کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خبر دی تھی تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ معاذ اللہ یہ تو بڑے جادوگر ہیں اور صاف انکار کر دیا، ان کی اس بدعملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گمراہی میں بڑھتے گئے اور ظالموں میں ان کا شمار ہوا۔ یہ سنا کر مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا کہ اپنے رسول اور اپنے دین کے ساتھ تمہاری روش وہ نہ ہونی چاہیئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام وعیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کی رہی۔ مسلمانو! تمہارا رسول اور دین سچا ہے، یہ یہود و نصاریٰ دشمنان دین اور مشرکین دین حق کے نور کو بجھانے کی کتنی ہی کوشش کریں لیکن

یہ دین پوری شان کے ساتھ دنیا میں پھیل کر رہے گا اور دوسرے دینوں پر غالب آ کر رہے گا۔ پھر مسلمانوں کو بتایا گیا کہ دنیا و آخرت کی کامیابی کا راستہ صرف ایک ہے، وہ یہ کہ اللہ اور اس کے رسول پر سچے دل سے ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں جان مال سے جہاد کرو، اس کا ثمرہ آخرت میں یہ ملے گا کہ خدا کے عذاب سے نجات ملے گی گناہوں سے مغفرت ہوگی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت حاصل ہوگی۔ اخیر میں اہل ایمان کو تلقین کی گئی کہ جس طرح حضرت عیسی علیہ السلام کے حواریوں نے اللہ کی راہ میں ساتھ دیا اور محنت و تکلیف اٹھا کر دین عیسوی کو پھیلایا ایسے ہی تم بھی اللہ کے دین اسلام کے مددگار بنو، تمہیں بھی ان کی طرح اللہ کی مدد حاصل ہوگی۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مضامین:

اس سورہ میں یہ امور بیان کئے گئے ہیں کہ:

◇ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ دین حق کا سارے باطل ادیان پر غلبہ ہو جائے۔

◇ اس کے لئے مسلمانوں کو بڑی بڑی قربانیاں کرنی پڑیں گی۔ دلی جذبات اور خواہشات نفس کی قربانی، مال کی قربانی، جان کی قربانی۔

◇ اس طرح دنیا میں فتح و کامرانی تو حاصل ہی ہوگی، اس سے بڑھ کر عظیم سعادت مغفرت الٰہی اور آخرت کی کامرانیاں ہیں جو حاصل ہوں گی۔

◇ ساتھ ہی حضرت عیسی علیہ السلام کے حواریوں کی طرح دین اسلام کو لے کر دنیا میں نکل جانا چاہئے اور دعوت و تبلیغ کے ذریعہ راہ ہدایت سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو راہ نجات بتانی چاہئے۔ (خلاصہ مضامین قرآنی)

آیت ۲ / سے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالی کو یہ بات نہایت ناپسند ہے کہ لوگ زبان سے کہیں کچھ اور کریں کچھ، اور یہ بات نہایت محبوب ہے کہ لوگ راہ حق میں اللہ کے دشمنوں سے جہاد کے لئے اس طرح ڈٹ کر کھڑے ہو جائیں جیسے کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار۔

آیت: ۵ میں بتایا جا رہا ہے کہ شروع سے حضرت موسی علیہ السلام کی قوم میں یہی عادت تھی کہ زبان سے بڑے بڑے دعوے کرتے تھے اور کہتے کہ ہم بڑے بڑے کام کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں، جس وقت آپ حکم دیں گے ہم جان پر کھیل جائیں گے، لیکن موقع آتا تو ایسے ایسے صاف جواب دیتے کہ موسی علیہ السلام کو بڑی اذیت پہنچتی۔ ایسا ہی حال حضرت عیسی علیہ السلام کی قوم نے کیا کہ جب حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا کہ دیکھو میں اللہ کا رسول ہوں، مجھ سے پہلے جو رسول آئے ان کو سچا کہتا ہوں اور اپنے بعد خاتم النبیین کے آنے کی بشارت دیتا ہوں، تم ان کی فرمانبرداری کرنا، تو انہوں نے زبانی تو بڑے بڑے دعوے کئے کہ ہم اس آخری رسول کے طرفدار ہوں گے اور ان کے حکم سے ذرا منہ نہ پھیریں گے لیکن جب آپ تشریف لائے اور نشانیوں سے صاف معلوم ہو گیا کہ آپ وہی رسول ہیں جن کی تشریف آوری

کی حضرت عیسی علیہ السلام نے خوشخبری دی تھی تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ معاذ اللہ یہ تو کوئی بڑے جادوگر ہیں اور صاف مکر گئے۔ ان کی اس بداعمالی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گمراہی میں بڑھتے گئے اور ظالموں کی فہرست میں ان کا شمار ہونے لگا۔ یہ سنا کر آیت:۹ میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا کہ اپنے رسول اور اپنے دین کے ساتھ تمہاری روش وہ نہ ہونی چاہئے جو موسی علیہ السلام اور عیسی علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل نے اختیار کی اور کیونکہ تمہارا دین سچا ہے اور تمہارے رسول سچے ہیں۔اس لئے یہود ونصاری دشمنان دین اور مشرکین اس دین حق کے نور کو بجھانے کی کتنی ہی کوشش کریں لیکن یہ دین پوری شان کے ساتھ دنیا میں پھیل کر رہے گا اور دوسرے دینوں پر غالب آ کر رہے گا۔

ایسی تجارت جس میں خسارہ کا کوئی امکان نہیں:

آیت ۱۰ سے سورۂ صف مسلمانوں کو ایک ایسی تجارت کی دعوت دیتی ہے جس میں خسارے کا کوئی امکان نہیں، کیونکہ اس تجارت کا دوسرا فریق وہ اللہ ہے جس کے ساتھ معاملہ کرنے والا کبھی نقصان میں نہیں رہتا، وہ تجارت ہے اللہ اور رسول پر ایمان اور اللہ کی رضا کے لئے مال وجان کے ساتھ جہاد، اور اس کا متوقع نفع ہے گناہوں کی مغفرت، جنت میں داخلہ، اللہ کی مدد اور دنیائے کفر پر غلبہ۔

کاش مسلمان یہ تجارت بھی کر کے دیکھ لیں:

کاش! مادی تجارت اور دنیاوی نفع ونقصان میں ڈوبے ہوئے مسلمان یہ تجارت بھی کر کے دیکھ لیں تاکہ ان کی ذلت عزت میں اور مغلوبیت غلبے میں تبدیل ہو جائے۔

آخر میں اہل ایمان کو تلقین کی گئی کہ جس طرح حضرت عیسی علیہ السلام کے حواریوں نے اللہ کی راہ میں ساتھ دیا اور محنت اور تکلیف اٹھا کر دین عیسوی کو پھیلایا ایسے ہی تم بھی اللہ کے دین اسلام کے مددگار بنو۔جس طرح اللہ نے ان کی مدد کی تھی اسی طرح تم کو بھی اللہ کی تائید حاصل ہوگی۔

ابتداء اور انتہاء میں پوری مناسبت:

آپ دیکھ رہے ہیں کہ سورت کی ابتدا میں خالی خولی باتیں کرنے اور کھوکھلے نعرے لگانے سے منع کیا گیا تھا اور اختتام پر دین الہی کی نصرت کے لیے کمربستہ ہونے اور کچھ کر کے دکھانے کا حکم دیا گیا ہے، یوں اس کی ابتدا اور انتہا میں پوری مناسبت پائی جاتی ہے۔(خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن)

موضوع سورۃ:......(فرائض سرفروشان) ہر قوم میں تین جماعتیں کارآمد ہوتی ہیں: اہل علم، اہل دولت، سرفروش۔ اگر تینوں اپنے فرائض ادا کریں تو وہ قوم زندہ ہو جاتی ہے، اگر ایک بھی اپنا فرض ادا کرنا چھوڑ دے تو قوم مٹ جاتی ہے، لہذا سورۃ الصّف میں فرائض سرفروشان ہیں، اور سورۃ الجمعہ میں فرائض اہل علم اور سورۃ المنافقین میں فرائض اہل دولت آئیں گے۔

خلاصہ رکوع:ا......(ا) عند اللہ سرفروشی کا درجہ۔(۲) ادا نہ کرنے کی حالت میں سزا۔(۳) اس فرض کے ادا کرنے

کا میدان۔ ماخذ: (۱) آیت: ۴۔ (۲) آیت: ۵۔ (۳) آیت: ۷۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورة الجمعه

یہ قرآن کریم کی ۶۲ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۱۱۰ ہے، اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۱۱ آیات، ۱۷۶ کلمات اور ۷۸۷ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

سابقہ سورۃ الصّف میں توحید ورسالت کا اثبات تھا اور قوم موسیٰ کا ذکر تھا کہ وہ کس طرح مذمت اور قتل وعید کے مستحق ہوئے اور اس سورۃ کے اول میں توحید ورسالت کا اثبات اور مکذبین میں سے یہود کا جو بعنوان قوم موسیٰ اوپر کی سورۃ میں مذکور ہے مستحق مذمت ووعید ہونا مذکور ہے اور چونکہ ان یہود کا اصل مرض حب دنیا تھا اس لئے مسلمان کو اس سے بچانے کے لئے دوسرے رکوع میں احکام جمعہ کے ضمن میں آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کا امر اور عکس سے نہی کا حکم ہے۔ بس دونوں سورتوں کے اخیر میں تجارت کا ذکر ہے، اول میں تجارت دینیہ کا اور دوسری میں تجارت دنیویہ کا، جس سے دونوں سورتوں کا باہمی ارتباط ظاہر ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں اولاً اس احسان کو یاد دلایا گیا جو رسالت محمدی کی شکل میں دنیا پر کیا گیا، اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی سمجھایا گیا کہ اب راہ نجات اور تزکیہ نفس کی واحد راہ تعلیمات نبوی اور طریق نبوی ہے، اللہ نے اس کو اپنا بڑا فضل واحسان بتلایا کہ رہتی دنیا تک تمام انسانوں کی ہدایت کا سامان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پورا فرما دیا۔ اب اگر لوگوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو وہ یقینا اس گدھے کی طرح ہیں جو کتابوں کا انبار پیٹھ پر لادے پھرتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ ان میں کیا ہے، پھر یہود اہل کتاب کی حالت بتلائی گئی کہ انہوں نے یہی کیا کہ ان پر تورات کی پابندی کی ذمہ داری ڈالی گئی مگر انہوں نے اس کے احکام کی پرواہ نہ کی اور من مانی تحریفیں کرتے رہے اور باوجود اس کے دعوی کرتے ہیں کہ ہمارے سوا کوئی اللہ کا دوست نہیں، جنت ہمارے ہی لئے ہے، اس پر ان یہود سے کہا گیا کہ اگر یہی بات ہے تو پھر تم مرنے کی تمنا کیوں نہیں کرتے، دنیا کی دولت سمیٹنے میں کیوں لگے رہتے ہو لیکن جس موت سے یہ بھاگتے ہیں وہ آ کر رہے گی اور ان کو مر کر اللہ کے سامنے پیش ہونا ہوگا۔ آگے اہل ایمان کو خطاب کیا گیا کہ وہ اپنے جمعہ کے ساتھ وہ معاملہ نہ کریں جو انہوں نے اپنے یوم السبت کے ساتھ کیا تھا، مسلمانوں کے لئے جمعہ کا دن اکٹھے ہو کر نماز پڑھنے کا ہے لہذا جب جمعہ کی نماز کے لئے اذان دی جائے تو کاروبار اور دوسرے دھندے چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوں اور مسجد میں حاضر ہو کر خطبہ سنو، ہاں جب نماز پوری

کر چکو تو اپنے کاروبار مشاغل اور کمائی میں لگو لیکن اللہ کی یاد ہر وقت رہے اس میں تمہاری نجات وکامیابی ہے۔ واللہ اعلم!

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت میں یہود پر تین طرح زجر وتوبیخ کی گئی تھی (۱) اول جب انہوں نے اپنے علم وفضل پر فخر کیا، عرب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قوم جاہل کہا تو اس کے بالمقابل یہ ثابت کیا گیا کہ خود یہ لوگ گدھے ہیں اور جس علم وفضل پر یہ اترا رہے ہیں اس کا بوجھ ان پر بالکل ایسا ہی ہے جیسے گدھے پر کتابوں کا انبار لدا ہوا ہو۔ (۲) جب انہوں نے یہ فخر کیا کہ ہم ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد ہیں اس وجہ سے ہم خدا تعالیٰ سے زیادہ قریب ہیں، بلکہ اس کے دوست اور محبوب ہیں اور یہ کہ دار آخرت کی ساری نعمتیں بس ہمارے واسطے مخصوص ہیں، تو ان کے اس لغو اور خلاف حقیقت دعوے کا رد اس طرح کیا گیا کہ اچھا اگر تم اللہ کے دوست ہو اور آخرت کی نعمتیں بس تمہارے ہی واسطے مخصوص ہیں تو موت کی تمنا کر کے دکھاؤ، اگر سچے ہوں گے تو بلا جھجک موت کی تمنا کرو گے، مگر ایسا نہ ہوا۔ (۳) تیسری بات یہ تھی کہ وہ فخر کرتے تھے کہ ہمارے دین میں یوم السبت (ہفتہ کا دن) ہے، جس کی تعظیم وحرمت ہم پر واجب ہے اور اس میں بڑی برکات ہیں، مسلمانوں کے پاس یہ نعمت نہیں تو اس تفاخر کے مقابلہ میں یوم جمعہ کی فضیلت اور اس کی عظمت واہمیت کے لیے یہ آیات واحکام نازل فرمائے گئے اور یہ بتایا کہ جمعہ کا دن اہل کتاب کے سنیچر اور اتوار کے دن سے زیادہ عظمت وبرکت والا ہے، تو ارشاد فرمایا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَوٰةِ مِن يَوۡمِ ٱلۡجُمُعَةِ فَٱسۡعَوۡاْ إِلَىٰ ذِكۡرِ ٱللَّهِ وَذَرُواْ ٱلۡبَيۡعَۚ ذَٰلِكُمۡ خَيۡرٞ لَّكُمۡ إِن كُنتُمۡ تَعۡلَمُونَ ۝٩

اے ایمان والو، جب اذان دی جائے نماز کے لیے جمعہ کے روز تو دوڑو اللہ کے ذکر کی طرف اور چھوڑ دو خرید وفروخت، یہی بہتر ہے تمہارے واسطے اگر تم اس بات کو سمجھو، کیونکہ دنیوی منافع کی آخرت کے اجر وثواب کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں تو اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور پھر اس کے بعد عملاً اس امر کی ضرورت ہے کہ ادنی کے مقابلہ میں اعلی کو اختیار کرے، پھر جب نماز پوری کر لی جائے تو پھیل پڑو زمین میں اپنے کاروبار میں مصروف ہوتے ہوئے اور اس کے واسطے چلو پھرو، اور تلاش کرو اللہ کا فضل اور اس کا رزق اور یاد کرو اللہ کو کثرت سے، امید ہے تم کامیاب ہو گے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اس کے برعکس اگر دنیا کی محبت اور کاروبار کی منفعت کی امید میں تم اللہ کے ذکر اور جمعہ کے خطبہ وحاضری کو چھوڑو گے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں دنیا وآخرت کا خسارہ ہے، ابتداء جن افراد سے اس طرح کی چوک اور غلطی ہوئی کہ جب انہوں نے دیکھا تجارت کو کہ ایک تجارتی قافلہ غلہ لے کر آیا ہے یا کچھ تماشا تو اس کی طرف دوڑ پڑے اور آپ کو چھوڑ دیا کھڑا ہوا خطبہ کی حالت میں، اس وقت میں غلہ کی کمی تھی اور یہ حکم معلوم نہ تھا یا نازل نہیں ہوا تھا کہ خطبہ سننا لازم ہے، لوگ نقارہ کی آواز سن کر دوڑ پڑے اور آپ کو خطبہ کی حالت میں کھڑا چھوڑ گئے، تو یہ ایک قسم کی چوک اور غلطی تھی، تو آپ کہہ دیجئے جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر ہے تماشے سے اور تجارت سے اور اللہ تو بہت ہی بہتر ہے روزی دینے

والا، جب رزق اسی کے ہاتھ میں ہے تو تلاش رزق کے ظاہری اسباب میں اس طرح مشغول ہوجانا کہ خدا سے اور اس کی یاد سے اور اس کی عبادت و بندگی سے انسان غافل ہوجائے کوئی اچھی بات نہیں ہے۔(تفسیر ادریسی:۸/۱۱۰)

سورت کا محور:

اس سورت کا محور جس پر پوری سورت گھومتی ہے، اس بار امانت کو بیان کرنا ہے، جسے پہلے بنی اسرائیل کے کندھوں پر رکھا گیا لیکن وہ اس کا حق ادا نہ کرسکے اور ان کی مثال اس گدھے کی سی ہوگئی جس پر بڑی متبرک اور علمی کتابوں کا بوجھ لادا گیا ہو، اس بوجھ سے اس کی کمر جھکی جارہی ہو۔ لیکن ان کتابوں میں جو علوم و معارف اور جواہر و اسرار ہیں، ان سے وہ قطعاً بے خبر ہو اور نہ ہی ان سے اسے فائدہ حاصل ہورہا ہو، سورۂ جمعہ کا آغاز ہوتا ہے اللہ کی تسبیح و تحمید کے بیان سے، اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف اور بعثت کے مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔ یعنی تلاوت کتاب، تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت۔(۲)

اس سورت کے پہلے رکوع میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور آپ کی بعثت کے مقاصد بیان فرما کر پوری انسانیت کو آپ پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور خاص طور پر یہودیوں کی مذمت کی گئی ہے کہ وہ جس کتاب یعنی تورات پر ایمان رکھنے کا دعوی کرتے ہیں اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارت موجود ہے۔ اس کے باوجود وہ آپ پر ایمان نہ لاکر خود اپنی کتاب کی خلاف ورزی کررہے ہیں۔

دوسرے رکوع میں مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ان کی تجارتی سرگرمیاں اللہ تعالی کی عبادت کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننی چاہئیں، چنانچہ حکم دیا گیا ہے کہ جمعہ کی اذان کے بعد ہر قسم کی خرید و فروخت بالکل ناجائز ہے۔ نیز جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ دے رہے ہوں، اس وقت کسی تجارتی کام کے لئے آپ کو چھوڑ کر چلے جانا جائز نہیں ہے، اور اگر دنیوی مصروفیات کا شوق کسی دینی فریضے میں رکاوٹ بننے لگے تو اس بات کا دھیان کرنا چاہئے کہ اللہ تعالی نے مؤمنوں کے لئے آخرت میں جو کچھ تیار کر رکھا ہے، وہ دنیا کی ان دلفریبیوں سے کہیں زیادہ بہتر ہے اور دینی فرائض کو رزق کی خاطر چھوڑنا سراسر نادانی ہے، کیونکہ رزق دینے والا اللہ تعالی ہی ہے لہذا رزق اس کی نافرمانی کرکے نہیں بلکہ اس کی اطاعت کرکے طلب کرنا چاہئے۔

موضوع سورۃ:......فرائض علماء کرام۔

خلاصہ رکوع:۱......(۱) فرائض علمائے کرام۔(۲) نہ ادا کرنے کی حالت میں سزا۔(۳) صحیح ادا کرنے کا معیار۔ ماخذ:(۱) آیت:۲۔(۲) آیت:۵۔(۳) آیت:۶۔

خلاصہ رکوع:۲......تبلیغ قرآن کا دن جمعہ ہے، لہذا ہر مسلم کا فرض ہے کہ اس میں شریک ہو۔ ماخذ: آیت:۹۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورة المنافقون

قرآن کریم کی ۶۳ ویں سورۃ ہے اور نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۱۰۴ پر ہے۔ اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۱۱ آیات، ۱۸۳ کلمات اور ۸۲۱ حروف ہیں۔ یہ سورۃ مدنی ہے۔

اس سورۃ کی پہلی ہی آیت میں ''اذا جاءك المنافقون'' آیا ہے ''یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب آپ کے پاس منافقین آتے ہیں'' چونکہ اس سورۃ میں منافقین کے اقوال اور طرز عمل پر تبصرہ فرمایا گیا ہے، اس لئے اس سورہ کا نام ہی منافقون مقرر ہوا۔

ربط:

پہلی سورۃ میں یہود کا ذکر تھا، اس سورۃ میں منافقین کا ذکر ہے اور اکثر منافق یہودی تھے۔ نیز سورۃ کے اخیر میں آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کا ذکر تھا وہی اس سورۃ کے اخیر میں ہے، اس سے دونوں سورتوں کے درمیان ربط ظاہر ہے۔

شان نزول:

غزوہ بنی المصطلق میں انصار ومہاجرین میں تکرار ہو گیا تھا، اس پر عبداللہ ابن ابی بن سلول بگڑا کہ تم نے ان پردیسیوں کو روٹیاں کھلا کھلا کر بگاڑ دیا ہے۔ اب مدینہ پہنچ کر ان لوگوں کو خرچ دینا بند کر دو، یہ خود ہی مدینہ سے چلے جاویں گے اور یہ بھی کہا کہ ہم عزت دار ہیں، ہم مدینہ سے ان ذلت والوں کو نکال دیں گے۔ یہ بات حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ صحابی نے سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر کہہ دی، آپ نے ابی بن سلول اور اس کے رفقاء کو بلا کر پوچھا وہ صاف مکر گیا اور قسمیں کھانے لگا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بڑا رنج ہوا، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں اور چونکہ ابی ابن سلول کے اس قول کو سب منافقین پسند کرتے تھے لہذا سب کی طرف اس کی نسبت کی گئی۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں اللہ نے منافقین کا جھوٹ بولنا ظاہر فرمایا۔ ان کے متعلق بتلایا کہ یہ منافقین منہ پر تو یہ کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں لیکن دل میں اس کا انکار کرتے ہیں اور یہ لوگ پرلے درجہ کے جھوٹے ہیں، جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ان سے کام چل جائے گا اور مسلمان انہیں سچا سمجھ کر ان کی بات مان لیں گے، ان کی زبان پر ایمان اور دل میں کفر ہے، ان کا ڈیل ڈول تو خاصا ہے مگر دل بڑا بودا اور کمزور ہے، یہ بزدل اور ڈرپوک لوگ ہیں اور اس پر شیخیاں مارتے پھرتے ہیں کہ ہمارے برابر کوئی نہیں یہی کہتے پھرتے ہیں، ان مہاجرین کو مالی امداد مت دو، یہ تنگ آ کر خود ہی بھاگ جائیں گے اور ایک سفر میں ان کے سردار (ابی بن سلول) نے یہ بھی کہا کہ مدینہ پہنچتے ہی ہم سارے معزز لوگ ان ذلیل اور پست مہاجر مسلمانوں کو نکال باہر کریں گے، اس کے اس قول پر اللہ تبارک وتعالی نے فرمایا کہ یہ ان منافقین کا جہل محض ہے، عزت وذلت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، عزت والے اللہ اور اس کے رسول اور مؤمنین ہی ہیں۔ اخیر میں

اہل ایمان کو تلقین فرمائی گئی کہ ان بے وقوفوں کی طرح تم دنیا کے مال اور اولاد ہی میں جی لگا کر مت بیٹھ جانا، ایسا نہ ہو کہ مال اور اولاد کی محبت میں پھنس کر اللہ کی یاد کو چھوڑ بیٹھو اور اس مال کو اللہ کی خوشنودی میں خرچ کرو ورنہ مرتے وقت پچھتاؤ گے اور اس وقت خرچ کرنے کی تمنا غیر مفید ہوگی، کیونکہ اللہ میعاد آنے کے بعد پھر کسی کو مہلت نہیں دیتے اور اللہ تمہارے سب کاموں سے خوب واقف ہے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت میں منافقوں کے اخلاق، ان کے جھوٹ، ان کی دسیسہ کاریاں، مسلمانوں کے لیے ان کے بغض وعناد اور ان کے ظاہر و باطن کے تضاد کو بیان کیا گیا ہے۔

مذمت کے لیے مخصوص:

یوں تو منافقوں کا مکروہ چہرہ اور قابل نفرت اوصاف کئی دوسری سورتوں میں بھی دکھائے گئے ہیں لیکن یہ سورت تو گویا صرف ان کی مذمت کے لیے مخصوص ہے، سورت کی ابتدا ہوتی ہے منافقین کی صفات کے بیان سے، جن میں نمایاں ترین صفات جھوٹ، مکر، دھوکا اور ظاہر و باطن کا تضاد تھا، ان کے دلوں میں کچھ تھا اور زبانوں پر کچھ تھا۔ (۱۔۳)

اپنے لیڈروں اور پوری امت کا محاسبہ:

اے اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے مخلص دوستو!

منافقوں کی نمایاں صفات کا مطالعہ کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے ٹھہر جایئے اور آنکھیں کھلی رکھنے کی بجائے بند کر لیجئے، دل کی آنکھیں کھو لیے اور اپنا، اپنے لیڈروں کا اور پوری امت کا محاسبہ کیجئے کہ کہیں ”یہ نمایاں صفات“ ہمارے اندر بھی تو نہیں پائی جاتیں، کیا ہر طرف جھوٹ کی غلاظت اور مکر وفریب کی نجاست کے انبار دکھائی نہیں دیتے؟ کیا آج کا سب سے بڑا مسئلہ ظاہر و باطن اور قول و عمل کا تضاد نہیں ہے؟ تقریر میں لچھے دار، تحریر میں مزیدار، باتیں پروقار مگر عمل کچھ بھی نہیں۔

منافقت گٹر کی نجاست کی طرح:

خالی ڈھول ہیں جو پیٹ رہے ہیں اور جن کی ہیبت ناک آواز دور دور تک پہنچ رہی ہے، مگر انہیں پھاڑ کر دیکھیں تو اندر سے کھوکھلے! نہ ایمان نہ یقین، نہ توکل نہ اعتماد، نہ محبت نہ معرفت، نہ ایثار نہ احسان، نہ خوف نہ خشیت۔

ایمان والی صفت کوئی نہیں جبکہ منافقت گٹر کی نجاست کی طرح ابل ابل پڑتی ہے۔ آگے بتایا گیا ہے کہ منافق ظاہر کے اعتبار سے بڑے پرکشش محسوس ہوتے ہیں، جسمانی اعتبار سے بڑے باوقار، زبان میں فصاحت اور حلاوت، انہیں بات کرنے کا ڈھنگ خوب آتا ہے، لیکن اندر سے کھوکھلے ہیں، ڈرپوک اور بزدل اتنے ہیں کہ کہیں سے کوئی اونچی آواز کان میں پڑ جائے تو پریشان ہو جاتے ہیں کہ ہماری موت آگئی۔ (۴)

سامنے آتے ہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی تعریف کرتے نہیں تھکتے لیکن پیٹھ پیچھے ایسی بدبودار باتیں کرتے ہیں کہ اللہ کی پناہ! (۷۔۸)

غافل نہ ہو جائیں:

سورت کے اختتام پر مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے کہ کہیں وہ بھی منافقوں کی طرح مال و اولاد میں مشغول ہو کر اللہ کے ذکر اور طاعت سے غافل نہ ہو جائیں اور انہیں ترغیب دی گئی ہے کہ وہ موت کے آنے سے پہلے خرچ کرلیں۔ ورنہ موت آجانے کے بعد سوائے حسرت کے کچھ باقی نہیں رہے گا۔

نصیحت کو پس پشت ڈال دیا:

افسوس کہ مسلمانوں نے اس نصیحت کو پس پشت ڈال دیا ہے اور وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے ہیں کہ یہ ہمارا تذکرہ اور ہماری مذمت نہیں ہے بلکہ یہ تو چودہ سو سال پہلے عبداللہ بن ابی جیسے کچھ لوگ گزرے ہیں ان کا تذکرہ اور ان کی مذمت ہے، گویا قرآن کی بعض سورتیں اور بعض آیات ایسی ہیں جن کا تعلق آج کے زمانے سے بالکل نہیں ہے۔ (خلاصۃ القرآن)

موضوع سورۃ:......فرائض اہل دولت۔

خلاصہ رکوع:۱......اہل دولت اگر باوجود وسعت ہونے کے انفاق فی سبیل اللہ نہ کریں تو ان پر نفاق کا حکم لگتا ہے۔ ماخذ: آیت:۷۔

خلاصہ رکوع:۲......مسلمانوں کو بیداری کی تلقین تاکہ ان کے اندر مرض نفاق کے اسباب پیدا نہ ہوں۔ ماخذ: آیت:۹،۱۰۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ التغابن

یہ قرآن کریم کی ۶۴ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۱۰۸ ہے۔ اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۱۸ آیات، ۲۴۷ کلمات اور ۱۱۳۲ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے پہلے رکوع میں قیامت کو یوم التغابن کہا گیا ہے جس کے معنی ہیں ہار جیت کا دن، زندگی کی بازی کی ہار جیت کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔ اس مناسبت سے قیامت کے دن کو یوم التغابن کہا گیا اور اسی مناسبت سے اس سورۃ کا نام تغابن ہوا۔

ربط:

سورۂ سابقہ کے اخیر میں تحصیل آخرت کی ترغیب اور تعطیل آخرت سے ترہیب ہے۔ اس سورۃ میں اہل تحصیل آخرت کی مجازرۃ کی تفصیل ہے اور مضمون ترغیب و ترہیب کی تکمیل ہے، جس سے دونوں سورتوں کا ربط ظاہر ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورہ کا خاص موضوع ایمان واطاعت کی دعوت ہے اور اخلاق حسنہ کی تعلیم ہے،سورۃ کی ابتداء اللہ رب العزت کی تقدیس سے فرمائی گئی ہے اور ارشاد ہوا کہ زمین وآسمان کی ہر چیز اللہ کی پاکی بیان کررہی ہے۔حقیقت میں تمام کائنات پر بادشاہی اسی کی ہے اور اس کا حکم چلتا ہے اور ساری خوبیاں اور کمالات اس کے اندر جمع ہیں،اس نے انسان کو پیدا کیا پھر انسانوں میں سے بعض نے تو اللہ کو مانا اور اس پر ایمان لائے اور بعض انکار کر بیٹھے۔ان منکرین کی عبرت کے لئے بتلایا گیا کہ ان کو ان لوگوں کا حال معلوم نہیں جو ان سے پہلے ہو چکے ہیں،ان پر اللہ کی نافرمانیاں کرنے سے اس دنیا ہی میں بڑی بڑی مصیبتیں پڑیں اور ابھی آخرت کا عذاب ان کو مزید بھگتنا ہے،ان کے پاس سمجھانے کے لئے اللہ کے رسول آئے جنہوں نے اپنے رسول ہونے کی صاف صاف نشانیاں پیش کیں لیکن ان منکرین نے یہ ہی کہا: کیا ہم اپنے ہی جیسے ایک انسان کو اپنا ہادی اور پیشوا بنالیں؟ جس کے نتیجہ میں وہ چشم زدن میں غارت کردیئے۔پھر منکرین جو یہ کہتے تھے کہ قیامت کوئی چیز نہیں نہ اب تک آئی،نہ آئے گی،اس کی تردید میں قسمیہ کلام کے ساتھ کہا گیا کہ قیامت تو ضرور آئے گی اور اے منکرین تمہیں اس وقت اپنے اعمال کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔اس لئے اللہ کو اور اس کے رسول کو مانو،کلام الٰہی کی روشن آیات کو مانو،ورنہ قیامت کے دن سخت خسارہ میں رہو گے اس دن ایمان والے جنت میں جائیں گے اور بدکار کافر جہنم میں دھکیل دیئے جائیں گے،پھر اس سورۃ کے نزول کے زمانہ میں چونکہ مسلمان سخت مصائب وشدائد میں گرفتار تھے،اس لئے اہل ایمان کو بتلایا گیا کہ جو مصیبت آتی ہے وہ اللہ کے حکم سے آتی ہے،ایمان والے اس کی غرض وغایت کو سمجھ لیتے ہیں اور منکر وکافر مارے مارے پھرتے ہیں۔آگے فرمایا گیا کہ تمہارے مال واولاد تمہارے دشمن ہو سکتے ہیں،ان کی وجہ سے کوئی نیک کام مت چھوڑو،ان کے ذریعہ تمہاری آزمائش مقصود ہے،اپنا مال اللہ کے واسطے دوسروں کے لئے خرچ کرو اور یہ سمجھو کہ گویا تم اللہ کو قرض دے رہے ہو،وہ بڑا فیاض ہے تمہارا سارا قرض چکا دے گا اور اپنے فضل سے اور بھی زیادہ دے گا۔واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت کا خاص موضوع ایمان واطاعت کی دعوت اور اخلاق حسنہ کی تعلیم ہے۔سورت کی ابتداء اللہ رب العزت کی تقدیس سے فرمائی گئی ہے،چنانچہ ارشاد فرمایا کہ زمین وآسمان کی ہر چیز اللہ کی پاکی بیان کررہی ہے،حقیقت میں تمام کائنات پر بادشاہی اسی کی ہے اور اس کا حکم چلتا ہے اور ساری خوبیاں وکمالات اس کے اندر جمع ہیں۔اسی نے انسان کو پیدا کیا پھر ان انسانوں میں سے بعض نے تو اللہ تعالیٰ کو مانا اور اس پر ایمان لائے اور بعض انکار کر بیٹھے۔

ان منکرین کی عبرت کے لئے آیت:۵ سے بتلایا گیا ہے کہ کیا ان کو ان لوگوں کا حال معلوم نہیں ہوا جو ان سے پہلے ہو چکے ہیں ان پر اللہ کا انکار کرنے سے اور اس کی نافرمانیاں کرنے سے اس دنیا ہی میں بڑی بڑی مصیبتیں پڑیں اور ابھی آخرت کا عذاب ان کو مزید بھگتنا ہے۔ان کے پاس سمجھانے کے لئے اللہ کے رسول آئے جنہوں نے اپنے رسول ہونے

کی صاف صاف کھلی نشانیاں پیش کیں لیکن ان منکرین نے یہی کہا کہ ہم اپنے ہی جیسے ایک انسان کو اپنا ہادی اور پیشوا کیسے بنالیں ۔تو انہوں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی اور اللہ کو ماننے سے انکار کیا۔نتیجہ میں انہوں نے اس کا خمیازہ بھگتا اور چشم زدن میں غارت کردیئے گئے۔

منکرین ومکذبین جو یہ کہتے تھے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کی کوئی حقیقت نہیں ۔اس کی تردید میں قسمیہ کلام کے ساتھ کہا گیا کہ تمہیں دوبارہ زندہ تو لازمی کیا جائے گا اور اے منکر تمہیں اس وقت اپنے اعمال کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو اللہ کو مانو، اس کے رسول کو مانو ۔کلام الٰہی کی روشن آیات کو مانو ورنہ قیامت کے دن سخت ٹوٹے اور خسارہ میں رہو گے ۔اس دن ایمان والے جنت میں جائیں گے اور بدکار کافر جہنم میں دھکیل دیئے جائیں گے۔

یوم التغابن:

اس سورت میں قیامت کے دن کو ''یوم التغابن'' قرار دیا گیا ہے،یعنی نقصان اور خسارہ کا دن،قیامت کے دن کافر تو اپنے خسارہ کو محسوس کرے گا ہی،مسلمان اور عابد انسان بھی حسرت کرے گا کہ اے کاش!میں نے جتنی عبادت وطاعت کی تھی،اس سے زیادہ کی ہوتی (۹)

اموال،اولاد اور ازواج کا فتنہ:

یہ سورت اہل ایمان کو اموال،اولاد اور ازواج کے فتنہ سے ڈراتی ہے اور ان کے بارے میں محتاط ہوکر رہنے کی تلقین کرتی ہے، بسا اوقات انسان ان کی خاطر اپنی آخرت تباہ کرلیتا ہے، نہ حلال اور حرام کی پرواہ کرتا ہے اور نہ ہی دینی حقوق وفرائض کی ادائیگی کا اہتمام کرتا ہے،ان کی محبت ہی کی وجہ سے ہجرت اور جہاد سے بھی محروم رہتا ہے۔سورت کے اختتام پر اہل ایمان کو اللہ سے ڈرنے،اس کی راہ میں خرچ کرنے اور بخل سے بچ کر رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔(۱۶)

موضوع سورۃ:......(۱) آیات انفس وآفاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے لئے مجبور کرتی ہیں۔(۲)اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے قیامت کے دن فوز عظیم حاصل ہوگا۔(۳)اور رفع موانع۔

خلاصہ رکوع:۱......آیات انفس وآفاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے لئے مجبور کرتی ہیں،اور آپ کے اتباع سے قیامت کے دن فوز عظیم حاصل ہوگا۔ ماخذ : آیات انفس: آیت :۲۔آیات آفاق: آیت :۵ ۔فوز قیامت: آیت:۹۔

خلاصہ رکوع:۲......اتباع نور کے سبب مصائب پیش آئیں گے،ایسے وقت میں اتباع سے جی نہ چرایا جائے،رفع موانع یعنی جو موانع ایمان اور عمل صالح میں پیش آسکتے ہیں۔ماخذ: آیت:۱۴،۱۱،۱۵۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الطلاق

یہ قرآن کریم کی ۶۵ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۹۹ ہے، اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۱۲، آیات، ۲۹۸ کلمات اور ۱۲۳۷ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

چونکہ اس سورۃ میں طلاق کے متعلق چند خاص احکام بیان فرمائے گئے ہیں، اس مناسبت سے اس سورۃ کا نام سورۂ طلاق مقرر ہوا۔ اس سورۃ کا زمانہ نزول سورہ بقرہ کے بعد ۶ ھ کے قریب ہے، چونکہ بعض احکام طلاق سورۂ بقرہ میں بیان ہوئے تھے، اس سورۃ میں مزید احکام طلاق کے متعلق بیان فرمائے گئے۔

ربط:

سورۂ سابقہ کے اخیر میں بیوی اور اولاد کا دشمن ہونا مذکور تھا۔ چونکہ بعض وقت خیال عداوت مانع ہو جاتا ہے ان کے حقوق واجبہ ادا کرنے کا بالخصوص جب کہ ظاہری مفارقت بھی ہو جائے، اس سورۃ میں مطلقہ ازواج کے متعلق احکام اور اولاد رضیع کے احکام کے بیان سے اس کی اصلاح ہوگئی کہ جب مفارقت (جدائی) پر بھی حقوق کی رعایت واجب ہے، تو موافقت کی صورت میں بطریق اولی اس کا وجوب ہوگا۔ اور چونکہ ان احکام کے ضمن میں چار جگہ تقوی کا حکم اور ترغیب ہے۔ اس لئے دوسرے رکوع کا مضمون اس کی تائید میں ہے، نیز اس سے اس بات پر بھی دلالت ہے کہ معاملات دنیویہ میں بھی احکام شرعیہ کی رعایت واجب ہے۔ برخلاف زعم بعض جہلاء کے۔ واللہ اعلم!

شان نزول:

روایت میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''**مر ابنک فلیراجعها**'' کہ اپنے بیٹے کو رجعت کا حکم فرما دیں اور جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تو اگر چاہیں طلاق دے دیں۔

خلاصہ سورۃ:

نکاح وطلاق کی شرعی حیثیت اسلام میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، نکاح کو اسلام نے صرف ایک معاملہ اور معاہدہ ہی نہیں رکھا ہے بلکہ اس کو ایک گونہ عبادت قرار دیا ہے اور چونکہ معاملہ ازدواج کی درستگی پر عام نسل انسانی کی درستگی موقوف ہے اس لئے قرآن کریم میں عائلی مسائل کو تمام دوسرے دنیوی مسائل ومعاملات سے زیادہ اہمیت دی ہے، اس سورۃ کا اصل مضمون عائلی زندگی سے متعلق طلاق کی بابت چند احکام ومسائل کی تعلیم ہے، اس کے بعد عمومی طور پر ہر قسم کے احکام اور شریعت کے حدود سے سرکشی و نافرمانی پر برے نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے۔ یا یوں کہئے کہ پہلے رکوع میں طلاق کے متعلق احکامات کا بیان ہے اور دوسرے رکوع میں عام احکام کی نافرمانی سے ڈرایا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کا انجام گزشتہ

نافرمان اقوام کی طرح ہوتا ہے، اس کے بعد تقوی اختیار کرنے کی تلقین فرمائی گئی اور فرمایا گیا کہ شریعت کے قوانین قرآن حکیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف سمجھا دیئے تاکہ تم جہالت کے اندھیرے سے نکل کر علم و ہدایت کے اجالے میں آجاؤ اور فرمایا گیا کہ اس فرمانبرداری کے بدلہ میں تمہیں آخرت میں بہشت کے باغات میں جگہ دی جائے گی جہاں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

نکاح کو اسلام نے صرف ایک معاملہ اور معاہدہ ہی نہیں رکھا:

حضرت مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ قرآن کریم کو بغور پڑھنے والا یہ عجیب مشاہدہ کرے گا کہ دنیا کے تمام معاشی مسائل میں سب سے اہم تجارت، شرکت اجارہ وغیرہ ہیں۔ قرآن حکیم نے ان کے توصرف اصول بتلانے پر اکتفا فرمایا ہے۔ ان کے فروعی مسائل قرآن کریم میں شاذونادر ہیں۔ بخلاف نکاح وطلاق کے کہ ان میں صرف اصول بتلانے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ان کے بیشتر فروع اور جزئیات کو بھی براہ راست حق تعالی نے قرآن کریم میں نازل فرمایا ہے۔ یہ مسائل قرآن کی اکثر سورتوں میں متفرق اور سورہ نساء میں کچھ زیادہ تفصیل سے آئے ہیں۔ یہ سورت جو سورہ طلاق کے نام سے موسوم ہے اس میں بھی خصوصیت سے طلاق وعدت وغیرہ کے احکام کا ذکر ہے۔ (معارف القرآن)

سورت کی ابتداء میں طلاق کا شرعی طریقہ بتایا گیا ہے، مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر ازدواجی زندگی کو برقرار رکھنا مشکل ہو جائے اور طلاق کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ باقی نہ رہے تو بیوی کو ایک طلاق رجعی دے کر چھوڑ دے۔ یہ طلاق ایسے طہر میں ہونی چاہئے جس میں بیوی کے ساتھ جماع نہ کیا ہو، طلاق دینے کے بعد اسے عدت ختم ہونے تک چھوڑ دیں، اسے ''طلاق سنی'' کہا جاتا ہے۔ یہ قیود وشرائط اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اللہ کی نظر میں طلاق انتہائی قابل نفرت عمل ہے اور اگر بعض استثنائی صورتوں کا معاملہ درپیش نہ ہوتا تو شریعت میں طلاق کی اجازت بھی نہ دی جاتی، کیونکہ طلاق کی وجہ سے خاندان کی بنیادوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں جبکہ اسلام خاندانی نظام کے استحکام پر زور دیتا ہے۔

ان شرعی احکام کو بیان کرتے ہوئے درمیان میں چار بار تقوی کا ذکر فرمایا گیا ہے، کیونکہ تقوی اختیار کرنے والے ہی ازدواجی زندگی کو صحیح انداز سے گزار سکتے ہیں۔

پہلے فرمایا: اللہ سے ڈرو جو کہ تمہارا رب ہے۔'' (آیت:۱) دوسری بار فرمایا: ''اور جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے لئے (مشکلات سے نکلنے کا راستہ پیدا کردے گا۔'' (آیت:۲) تیسری بار فرمایا: ''اور جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے کام میں سہولت پیدا کردے گا۔'' (آیت:۴) چوتھی بار فرمایا: ''اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس سے گناہ کو دور کردے گا اور اسے اجر عظیم عطا کرے گا۔'' (آیت:۵) (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

تقویٰ کی اہمیت:

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کی نظر میں تقوی کی کیا اہمیت ہے اور یہ کہ قرآن کا اسلوب دوسری کتابوں سے کس قدر

مختلف ہے۔

ترغیب وترہیبات:

یہ قانون کی کوئی خشک کتاب نہیں بلکہ اس میں قانون پر آمادۂ عمل کرنے والی ترغیبات اور ترہیبات بھی کثرت کے ساتھ ہیں۔

سورت کے اختتام پر اللہ کے مقرر کردہ اور نازل کردہ احکام کی پامالی اور مخالفت سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے اور عبرت کے لیے ان امتوں کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے سرکشی اختیار کی تو وہ عبرتناک عذاب اور سزاؤں کی مستحق ہوگئیں (۸۔۱۰) آخری آیت میں ارض وسماء کی تخلیق میں قدرت الٰہیہ کی طرف اشارہ ہے۔(۱۲) (خلاصۃ القرآن)

موضوع سورت:......حقوق العباد میں ترمیم وتنسیخ جائز نہیں۔

خلاصہ رکوع:۱......مسائل طلاق۔ماخذ: آیت:۱۔

خلاصہ رکوع: ۲......حقوق العباد میں ترمیم وتنسیخ کرنے سے بھی عذاب الٰہی آتا ہے۔ ماخذ: آیت: ۸۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ التحریم

یہ قرآن کریم کی ۶۶ ویں سورۃ ہے اور اس کا شمار ترتیب نزولی کے اعتبار سے نمبر ۱۰۷ ہے، اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۱۲ آیات، ۲۵۳ کلمات اور ۱۱۲۴ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورہ کی ابتداء میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حلال چیز کے کھانے سے قسم کھا کر اس کو اپنے اوپر حرام فرمالیا تھا، اسی مناسبت سے اس سورۃ کا نام سورۃ التحریم متعین ہوا، چونکہ تحریم کے لفظی معنی ہیں حرام کردینا۔

ربط:

پہلی سورۃ میں طلاق پر مرتب ہونے والے احکام کا بیان تھا، اس سورۃ میں ازواج مطہرات کو تخویف بالطلاق ہے یعنی طلاق سے ڈرایا گیا ہے اور جس سابقہ سورۃ کے خاتمہ پر اطاعت کی عام تاکید تھی، اسی طرح اس سورۃ میں ازواج کو خطاب کے بعد رجوع الی اللہ کی تاکید ہے اس سے ربط وتناسب ظاہر ہے۔

شان نزول:

روایت میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ عصر کے بعد سب ازواج مطہرات کے

یہاں کچھ دیر کے لئے تشریف لے جاتے ۔ ایک روز حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے یہاں کچھ دیر لگی تو معلوم ہوا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہد پیش کیا تھا، اس کے نوش فرمانے میں وقفہ ہوا پھر کئی روز یہ معمول رہا، ازواج مطہرات کو چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی محبت تھی اور ہر ایک چاہتی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جتنا زیادہ ہو سکے اس کے یہاں قیام فرمائیں، اس لئے حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے مل کر تدبیر کی کہ آپ وہاں شہد کھانا چھوڑ دیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے حضرت حفصہ سے کہا کہ حضور ہم میں سے جس کے پاس تشریف لائیں وہ یوں کہے کہ آپ نے مغافیر نوش فرمایا ہے، مغافیر ایک گوند کی قسم ہے جس میں کچھ بد بو ہوتی ہے، چنانچہ ایسا ہی کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے شہد کھایا ہے۔ اس پر کہا گیا کہ شاید کوئی شہد کی مکھی مغافیر کے درخت پر بیٹھی ہو اور اس کا عرق اس نے چوس لیا ہو جس سے شہد میں بھی اس کی بو آ گئی ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھائی کہ میں اب شہد نہیں کھاؤں گا نیز یہ خیال فرمایا کہ زینب کو اس کی اطلاع ہو گی تو خواہ مخواہ رنجیدہ خاطر ہوں گی، اس لئے حضرت حفصہ کو منع فرمایا کہ اس کی اطلاع کسی کو نہ کرنا، مگر حضرت حفصہ نے چپکے سے حضرت عائشہ کو اطلاع کر دی، یہ بھی کہہ دیا کہ اور کسی سے نہ کہنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے بذریعہ وحی مطلع فرما دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ سے فرمایا کہ تم نے عائشہ کو اطلاع کی حالانکہ تم کو منع کر دیا گیا تھا، وہ تعجب سے کہنے لگیں کہ آپ سے کس نے کہا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ نے مجھے مطلع کر دیا ہے۔

فائدہ:

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ قرآن پاک میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر کس چیز کو حرام کیا تھا اور کیوں حرام کیا تھا اور نہ ہی ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس زوجہ سے کیا خفیہ بات کہی تھی اور انہوں نے اس کو کس سے بیان کر دیا تھا اور نہ ہی ان واقعات کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے بیان فرمایا اور نہ خود ازواج مطہرات نے اس قصہ کو کسی سے ذکر کیا سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے۔ لہٰذا ان آیات پر مجمل طور پر ایمان رکھنا کافی ہے۔ واللہ اعلم!

خلاصہ سورۃ:

سورۃ کی ابتداء اس واقعہ کے ذکر سے فرمائی گئی اور رسول کو خطاب فرمایا گیا کہ اللہ نے آپ کے اوپر جس چیز کو حلال کیا ہے آپ اس کو اپنے اوپر حرام نہ فرمائیں، پھر فرمایا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کسی زوجہ مطہرہ سے کوئی بات راز میں رکھنے کے لئے کہی تھی مگر انہوں نے کسی دوسری زوجہ سے وہ بات کہہ دی، جس کی خبر اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو دی اور ازواج مطہرات کو نصیحت فرمائی گئی کہ وہ توبہ واستغفار کریں ورنہ اللہ کے رسول کو تم سے بہتر ازواج مل سکتی ہیں، اس کے ساتھ عام مسلمانوں کو نصیحت فرمائی گئی کہ وہ اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچائیں اور کوئی گناہ نادانستہ ہو جائے تو فوراً توبہ

کرنی چاہئے۔ اہل وعیال سے متعلق چونکہ اس سورۃ میں خاص احکام وہدایات ہیں اس لئے یہ بھی سمجھایا گیا کہ محض خاندانی وجاہت نجات کے معاملہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، آخرت کی کامیابی وکامرانی کے لئے ایمان واطاعت ضروری ہے اس امر کو ذہن نشین کرانے کے لئے ثبوت کے طور پر حضرت لوط کی بیوی کا قصہ بیان فرمایا گیا اور اس کے مقابلہ میں فرعون کی بیوی حضرت آسیہ ایسے ہی حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مضامین:

◇ مسلمانوں کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کی سیرت وکردار کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کی فکر وسعی کریں۔

◇ کوئی گناہ نادانستہ سرزد ہوجائے تو فوراً توبہ کرلینی چاہئے۔

◇ اہل وعیال سے متعلق چونکہ اس سورہ میں خاص طور پر احکام وہدایات ہیں، اس لئے یہ سمجھایا گیا ہے کہ محض خاندانی وجاہت نجات کے معاملہ میں کوئی قدر وقیمت نہیں رکھتی، آخرت کی کامرانی اور برے اعمال کے دنیا وآخرت میں برے نتائج سے محفوظ ومامون ہونے کے لئے ایمان واطاعت الٰہی ضروری ہے۔ محض خاندانی شرافت اللہ کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

اس تعلیم کو مزید ذہن نشین کرانے اور ثبوت کے طور پر دو طرح کے کردار کا تذکرہ کیا ہے:

(۱) حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیویاں، رسولوں کی بیویاں تھیں مگر ان عورتوں کی بدعملیوں کے برے نتائج کو رسولوں کے ساتھ ان کا تعلق نہ روک سکا...... وہ عورتیں اللہ کے اولوالعزم رسولوں کی بیویاں ہونے کے باوجود عذاب الٰہی کی گرفت میں آئیں۔

(۲) فرعون کی بیوی کہ وہ اگرچہ فرعون جیسے سرکش کی بیوی تھیں لیکن چونکہ اللہ اور رسول (حضرت موسیٰ علیہ السلام) پر ایمان لائی ہوئی تھیں، اس لئے فرعون کی بداعمالیوں کے برے نتیجہ کا اثر ان پر نہ پڑا اور وہ فرعون کی طرح عذاب میں مبتلا نہ کی گئیں۔ پھر حضرت مریم کا تذکرہ کیا گیا ہے جس میں ایک طرف تو ان پر یہودیوں کے لگائے ہوئے اتہامات کی تردید کرنی مقصود ہے اور دوسری طرف یہ بتانا کہ یہ خود بھی مومنہ اور اللہ کی اطاعت گزار تھیں اور ان کے والدین بھی مومن تھے اور ان کے والدین کے خلوص کا یہ انعام ملا کہ حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر رسول پیدا ہوئے۔ (خلاصہ مضامین قرآنی)

سورت کا اختتام:

سورت کے اختتام پر دو مثالیں بیان کی گئی ہیں، پہلی مثال کافرہ بیوی کی ہے جو مومن صالح کے نکاح میں تھی اور دوسری مثال مومنہ بیوی کی ہے جو ایک بدترین کافر کے نکاح میں تھی۔ مومن صالح سے مراد حضرت نوح علیہ السلام اور کافر سے مراد فرعون ہے۔ ان دو مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر انسان خود مومن اور صالح نہ ہو تو اسے کسی مومن کی قرابت اور

حسب نسب کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتا۔(۱۰-۱۱) (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن)

موضوع سورۃ:......انسان کے فرض منصبی میں کوئی چیز حارج نہیں ہونی چاہئے۔

خلاصہ رکوع:۱......(۱) اگر ازواج مطہرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرض منصبی میں حارج ہوں گی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں طلاق دے دیں گے، (۲) علی ہذا القیاس مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ساتھ اہل وعیال کو بھی جہنم سے بچائیں کہ انہیں فرض منصبی اسلام میں حارج نہ ہونے دیں۔ ماخذ: (۱) آیت: ۴، ۵۔ (۲) آیت: ۶۔

خلاصہ رکوع:......(۱) صحیح رجوع الی اللہ کی جزائے خیر (۲) مقربین الٰہی کے ساتھ نسبت دنیاوی بغیر اتباع کوئی چیز نہیں ہے۔ ماخذ: (۱) آیت: ۸۔ (۲) آیت: ۱۰۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

اٹھائیسویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) اللہ کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور وہ بندوں کے تمام اعمال کا بھی احاطہ کئے ہوئے ہے، اس لئے واجب ہے کہ ہر وقت اللہ کا استحضار رہے۔

(۲) شیطان کے انسان پر قبضہ کی علامت یہ ہے کہ اس سے اللہ کا ذکر، دل، زبان، وعدہ وعید، اعمال واقوال سب میں چھوٹ جاتا ہے۔

(۳) شیطان کے راستے سے بچنا چاہئے، وہ معاصی کو مزین اور خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے اور اس سے دھوکہ دیتا ہے اور جب بندہ اس میں مبتلا ہوجاتا ہے تو شیطان اس سے براءت کا اظہار کردیتا ہے اور وہ گمراہی کے راستے پر بھٹکتا رہ جاتا ہے۔

(۴) ضروری ہے کہ ہر روز اس پر نظر رکھے کہ اس نے آخرت اور اس کے مابعد کے لئے آج کیا بھیجا۔

(۵) مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر طرح کے اسباب قوت کو حاصل کریں؛ تاکہ اس کی وجہ سے کافران پر غالب نہ آسکیں۔ مسلمانوں کو کمزور دیکھ کر کافر یہ نہ سمجھیں کہ ہم حق پر ہیں۔

(۶) جھوٹ بولنا اور وعدہ خلافی کرنا حرام ہے، جس شخص نے یہ کہا کہ میں ایسا کروں گا اور پھر نہ کیا تو اس نے جھوٹ بھی بولا اور وعدہ خلافی بھی کی۔

(۷) جمعہ کی اذان کے ساتھ ہی تمام خرید وفروخت حرام ہوجاتی ہے، اس وقت صرف جمعہ کی نماز کے لئے نکلنا چاہئے۔

(۸) رزق کے حصول کی تمام جگہیں اللہ کے قبضہ میں ہیں، اس لئے رزق اللہ کی اطاعت کے ذریعے طلب کیا جائے نا کہ نافرمانی کے ذریعے۔

(۹) قرآن کریم نور ہے اور زندگی میں ہدایت صرف اس کے ذریعے مل سکتی ہے، اس کے علاوہ کسی اور ذریعے سے نہیں مل سکتی۔

(۱۰) مصائب کے نزول کے وقت اللہ کے فیصلے اور حکمت پر راضی رہنے سے اللہ تعالی اس کے دل میں ہدایت ڈال دیتے ہیں، اس کو صبر کی طاقت عطا فرماتے ہیں اور اس مصیبت کو اس کے لئے آسان کردیتے ہیں اور اگر وہ انا للہ وانا الیہ راجعون بھی پڑھ لے تو اللہ اس کا اچھا بدل بھی عطا فرماتے ہیں اور اجر عظیم بھی۔

****

پارہ:۲۹

سورۃ الملک

یہ قرآن کریم کی ۶۷ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۷۷ ہے، اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۳۰ آیات ۳۳۵ کلمات اور ۱۳۵۹ حروف ہیں، یہ سورہ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء میں ''تبارك الذي بيده الملک'' کا جملہ آیا ہے، یعنی بڑا عالی شان ہے وہ جس کے قبضہ میں تمام بادشاہت ہے، اس سورۃ کا نام ملک اسی جملہ سے ماخوذ ہے، حدیث پاک میں اس سورہ کا نام منجیہ اور وافیہ بھی آیا ہے، اس واسطے کہ یہ سورۃ اپنے پڑھنے والے کو قبر کے عذاب سے بچاتی ہے اور نجات بخشتی ہے اور قیامت کے ہول اور صعوبتوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

ربط:

سورۂ سابقہ میں حقوق رسالت کا بیان تھا، اس سورۃ میں حقوق توحید اور ان کے ایفاء و اخلال پر جزا و سزا کا بیان ہے، نیز سورۂ سابقہ کے اخیر میں بعض اہل سعادت و شقاوت کا ذکر تھا اور اس سورۃ میں مطلقاً سعداء اور اشقیاء کا ذکر ہے، جس سے دونوں سورتوں میں ربط ظاہر ہے۔

فضائل سورۃ:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر شب کو سونے سے پہلے اس سورۃ کو ضرور پڑھتے تھے۔

مسند احمد میں ایک روایت ہے جو حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن کریم میں ۳۰ آیتوں کی ایک سورۃ ہے جو اپنے پڑھنے والوں کی سفارش کرتی ہے یہاں تک کہ اسے بخش دیا جائے اور وہ سورۃ **تبارک الذي بيده الملک** ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ یہ سورۃ ہر مسلمان کے دل میں ہو یعنی یہ سورۃ ہر مسلمان حفظ کر لے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مردہ کو جب قبر میں رکھتے ہیں اور عذاب کے فرشتے آتے ہیں، یہ سورۃ اپنے پڑھنے والے کی مدد کرتی ہے اور ان فرشتوں کو منع کرتی ہے، اگر وہ عذاب کے فرشتے مردہ کے پاس پیروں کی طرف سے آنے کا ارادہ کرتے ہیں تو یہ سورۃ ان کو ادھر سے منع کرتی ہے اور کہتی ہے کہ میں ادھر سے تم کو نہ آنے

دوں گی، اس واسطے کہ اس شخص نے کھڑے ہوکر مجھ کو نماز میں پڑھا ہے اور اگر وہ فرشتے سر کی جانب سے آنے کا ارادہ کرتے ہیں تو یہ سورۃ ادھر سے بھی منع کرتی ہے اور کہتی ہے کہ اس شخص نے مجھ کو اپنے منہ سے پڑھا ہے سو میں تم کو اس طرف سے بھی آنے نہ دوں گی۔ اسی طرح دائیں اور بائیں جانب سے آنے سے بھی روکتی ہے اور کہتی ہے کہ میں تم کو ادھر سے بھی نہ آنے دوں گی اس واسطے کہ اس شخص نے مجھے اپنے سینہ میں محفوظ کیا ہے۔

ترمذی شریف میں حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ بعض صحابہ نے ایک جگہ خیمہ لگایا، ان کو علم نہ تھا کہ اس جگہ قبر ہے، اچانک خیمہ لگانے والوں نے اس جگہ سورۂ تبارک الذی پڑھتے ہوئے سنا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر عرض کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ سورۃ اللہ کے عذاب سے روکنے والی ہے۔

خلاصہ سورۃ:

سورۃ کی ابتداء اللہ تعالی کی توحید وصفات سے کی گئی ہے اور بتلایا گیا کہ سارے جہان کی بادشاہی اللہ کے دست قدرت میں ہے، اسی نے تم کو زندگی بخشی اور وہی تم کو موت دے گا اور اس مرنے جینے کا مقصد امتحان ہے کہ اس عارضی زندگی میں کون اچھے کام کرتا ہے اور کون برے کام کرتا ہے۔ پھر بتلایا گیا کہ یقین کرو کہ سارے جہاں میں حکم اللہ ہی کا چلتا ہے ہر طرف اس کی قدرت کا ظہور ہے، ساتوں آسمان اس نے پیدا کئے جو ایک دوسرے کے اوپر چھائے ہوئے ہیں اور ان میں ہر بات ایک مضبوط نظام اور قاعدے کے موافق چل رہی ہے، جس میں کوئی خلل یا خلاء نہیں ہے ہر چیز کو اس نے قاعدے اور طریقہ سے بنایا ہے اور ہر چیز اپنی اپنی مناسب جگہ موجود ہے اور اپنا کام پورا کر رہی ہے۔ پھر بتلایا گیا کہ جتنا اس کی مخلوقات کو غور سے دیکھو گے حیرت بڑھتی جائے گی تم دیکھتے دیکھتے تھک جاؤ گے لیکن اس کے عجائبات ختم نہ ہوں گے، دیکھو تمہارے قریب کے آسمان میں ستارے روشن چراغوں کی طرح روشن ہیں، ان کو اللہ نے شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بھی بنایا ہے جو اوپر چڑھ کر غیب کی باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں، یہ شیاطین انسانوں کو سوائے غلط اور گمراہی کے اور کچھ نہیں بتاتے، اب جو لوگ ان کی پیروی کریں گے وہ انہیں کے ساتھ جہنم رسید ہوں گے اور جب یہ منکرین گروہ در گروہ جہنم میں داخل کئے جائیں گے تو جہنم کا جوش وخروش دیکھ کر ان کے ہوش اڑ جائیں گے، جہنم کے نگہبان فرشتے ان سے کہیں گے کہ کیا دنیا میں تمہیں ڈرانے والے نہیں آئے تھے؟ اس کا جواب وہ حسرت وندامت سے دیں گے کہ ڈرانے والے تو ضرور آئے تھے مگر ہم نے ان کا کہنا نہیں مانا ان کو جھوٹا سمجھا، اگر ہم سمجھ لیتے اور رسولوں کی بات مان لیتے تو آج جہنمیوں کے ساتھ جہنم میں نہ جھونکے جاتے، ان کے برخلاف اللہ سے ڈرنے والے بندے اس دن چین وآرام سے ہوں گے اور ان کو بڑا اجر ملے گا کیونکہ وہ دنیا میں اپنے رب کو دیکھے بغیر اس پر ایمان لائے اور اس سے ڈرتے رہے۔ آگے انسانوں کو نصیحت کی گئی کہ ہر حال میں اللہ کی رحمت کے امیدوار رہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہیں، اللہ تعالی نے اپنے نہ ماننے والوں کو دنیا میں بڑی بڑی سزائیں دی ہیں پھر تمام انسانوں کو خطاب کرکے بتلایا جاتا ہے کہ تم خود ہی سوچو ایک شخص

منہ اٹھائے ہوئے سیدھے راستہ پر چل رہا ہے، دوسرے منہ اوندھا اٹھائے گرتا پڑتا ادھر ادھر بھٹکتا پھر رہا ہے تو کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔

اس لئے اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو، قیامت پر یقین کرو، وہ ضرور آئے گی۔ رہا اس کا وقت تو وہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کب آئے گی لیکن جب آئے گی تو پھر منکروں کی خیر نہ ہوگی، ہول کے مارے ان کے چہرے بگڑ جائیں گے، آخر میں منکروں کو سمجھایا جاتا ہے کہ تم مسلمانوں کی فکر چھوڑ دو، اپنی فکر کرو کہ اللہ کے عذاب سے کیسے بچو گے، مسلمانوں کا تو والی اللہ ہے وہی ان کے سارے کام بنائے گا، تم سوچو کہ تمہیں اس کے عذاب سے کون بچائے گا۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

موضوع سورۃ:...... مخالفین سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالی کو اس نظام عالم کا بادشاہ مان کر وفاداری کا ثبوت دو۔

خلاصہ رکوع ۱:...... (۱) اللہ تعالی اس سارے جہان کا بادشاہ ہے۔ (۲) کیونکہ اس نے بنایا ہے۔ (۳) جو اس بادشاہ سے بغاوت کرے گا، جیل خانہ میں بھیجا جائے گا اور وہ جہنم ہے۔ (۴) اور جو وفاداری کا ثبوت دیں گے وہ مغفرت اور اجر کبیر پائیں گے۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۔ (۲) آیت: ۳ تا ۵۔ (۳) آیت: ۲ تا ۱۱۔ (۴) آیت: ۱۲۔

خلاصہ رکوع: ۲...... (۱) وہ زمین (۲) وآسمان سے گونا گوں عذاب لانے پر قادر ہے (۳) تمہارے لشکر اس کے لشکروں کے مقابلہ میں کام نہیں آسکتے۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۶۔ (۲) آیت: ۱۷۔ (۳) آیت: ۲۰۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ القلم

یہ قرآن کریم کی ۶۸ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۲ پر ہے، اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۵۲ آیات، ۳۰۶ کلمات اور ۱۲۹۵ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

اس سورۃ کی ابتداء ہی میں ”ن والقلم وما یسطرون“ فرمایا گیا یعنی قسم ہے قلم کی اور اس کی جو وہ فرشتے لکھتے ہیں، یہاں قلم سے مراد وہ قلم ہے جس سے تمام مخلوق کی تقدیریں لوح محفوظ میں لکھ دی گئی ہیں، اسی مناسبت سے اس سورۃ کا نام سورہ قلم ہوا۔ اس سورۃ کا دوسرا نام سورۂ نون بھی ہے۔

ربط:

سورۃ سابقہ میں زیادہ تر روئے سخن منکرین توحید کی طرف تھا اور اس سورۃ میں زیادہ روئے سخن طاعنین فی النبوت کی طرف ہے اور چونکہ انکار نبوت کفر ہے اس لئے کفار کی عقوبت دنیوی واخرویہ کا مضمون بھی بعض آیات میں آیا ہے۔

شان نزول:

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خلعت نبوت سے سرفراز ہوئے

اور آپ پر وحی آنا شروع ہوئی اور وضو ونماز کا طریقہ آپ کو غیب سے سکھلایا گیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین حق کا ظاہر کرنا شروع کیا، تو اہل بیت اور ایمان لانے والے مسلمانوں میں نماز پڑھنا رائج ہوا اور یہ باتیں نئی نئی جو مکہ والوں نے بھی نہ دیکھی تھیں ان کا چرچہ ہونے لگا اور اکثر کفار نے کہنا شروع کیا کہ نعوذ باللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو دیوانے ہو گئے اور اپنے گھر والوں کو بھی دیوانہ کر ڈالا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی باتوں سے رنج ہوتا تھا، تب اللہ تعالی نے آپ کی تسلی کے لئے یہ سورۃ نازل فرمائی اور دو مرتبہ قسم کھا کر فرمایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہرگز دیوانہ نہیں ہیں بلکہ آپ کی عقل تمام مخلوقات کی عقل پر ترجیح رکھتی ہے اور ان لوگوں کو آگے چل کر معلوم ہو جائے گا اور آپ خود بھی دیکھ لیں گے کہ پاگل اور دیوانے خود یہی لوگ تھے جو معاذ اللہ آپ کو دیوانہ کہتے ہیں۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت، صداقت وعظمت کا بیان ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی رسالت پر مخالفین کے جو شکوک واعتراضات تھے ان کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ اخلاق وکردار کے لحاظ سے برے لوگ کون ہیں ان سے کنارہ کشی کی تعلیم، تقوی وصبر وثبات کے ساتھ صراط مستقیم پر ثابت قدم رہنے اور اللہ کی طرف ہر حال میں رجوع کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، منکرین حق اور رسالت محمدیہ کی تکذیب کرنے والوں کو عذاب آخرت کی وعید سنائی گئی ہے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

قلم کی عظمت:

یہ سورت قلم کی عظمت اور اس کے عظیم نعمت ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ حدیث میں بھی قلم کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سب سے پہلے چیز جو اللہ نے پیدا فرمائی وہ قلم تھا۔ اسے پیدا کرنے کے بعد فرمایا: "لکھو! اس نے پوچھا: کیا لکھوں؟'' فرمایا'' تقدیر لکھو۔'' چنانچہ اس دن سے قیامت تک جو کچھ ہونے والا تھا وہ قلم نے لکھ دیا۔ پھر اللہ نے نون یعنی دوات کو پیدا فرمایا۔''

یہ قلم ہی ہے جس نے اسلاف کے علوم ہماری طرف منتقل کئے ہیں اور پوری دنیا میں معلومات کی اشاعت کا ذریعہ بنتا ہے۔ قرآن نے قلم اور تعلیم وتعلم کی اہمیت اس ماحول میں بیان کی جو ماحول قلم اور کتاب سے بیگانگی اور دوری کا ماحول تھا لیکن چونکہ قرآن اللہ تعالی کی آخری آسمانی کتاب ہے اور اسے نازل کرنے والا جانتا تھا کہ آنے والا دور قلم، علم، معلومات اور تحقیقات کا ہے۔ اس لئے اس نے مسلمانوں کو قلم کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا۔ دیکھا جائے تو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ وغیرہ بھی قلم ہی کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔

سورۂ قلم میں تین مضامین کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قدر و منزلت :

پہلا مضمون حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قدر و منزلت اور آپ کے اخلاق و مناقب کا بیان ہے۔سب سے پہلے تو قسم کھا کر فرمایا کہ آپ اپنے رب کے فضل سے دیوانے نہیں ہیں، جیسا کہ آپ کے مخالفین کہتے ہیں۔ ''اور آپ کے لئے بے انتہا اجر ہے اور آپ کے اخلاق عظیم ہیں۔'' مسلم، ابوداؤد اور نسائی میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ کا خلق قرآن ہے۔قرآن میں جو کچھ قال تھا وہ آپ کی زندگی کا حال تھا، آپ کی حیات طیبہ قرآن کریم کی عملی تفسیر تھی اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ آپ کو مکارم اخلاق کی تکمیل ہی کے لئے بھیجا گیا تھا۔آپ کے اخلاق و مناقب بیان کرنے، آپ کے ساتھ ساتھ آپ کے مخالفین کی اخلاقی پستی، کمینگی اور کج فکری بھی بیان کی گئی ہے۔فرمایا گیا کہ آپ کسی ایسے شخص کا کہنا نہ ماننا جو زیادہ قسمیں کھانے والا ہے، بے وقار، کمینہ، عیب گو، چغل خور، بھلائی سے روکنے والا، حد سے بڑھ جانے والا، گناہ گار، گردن کش پھر ساتھ ہی بے نسب بھی ہو۔اس کی سرکشی صرف اس لئے ہے کہ وہ مال والا اور بیٹوں والا ہے۔'' مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ آیات سردارانِ قریش میں سے ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئیں۔

''اصحاب الجنہ'' (باغ والوں) کا قصہ:

دوسرا مضمون جسے اس سورت میں خصوصی اہمیت حاصل ہے وہ 'اصحاب الجنہ'' (باغ والوں) کا قصہ ہے۔ یہ قصہ عربوں میں مشہور تھا، یہ باغ یمن کے قریب ہی تھا، اس کا مالک اس کی پیداوار میں سے غرباء پر خرچ کیا کرتا تھا لیکن اس کے مرنے کے بعد جب اس کی اولاد اس باغ کی وارث بنی تو انہوں نے اپنے اخراجات اور مجبوریوں کا بہانہ بنا کر مساکین کو محروم رکھنے اور ساری پیداوار سمیٹ کر گھر لے جانے کی منصوبہ بندی کی۔اللہ نے اس باغ کو ہی تباہ کر دیا۔اس قصہ میں ان لوگوں کے لئے عبرت کا بڑا سامان ہے جو اپنی ثروت اور غناء سے اکیلے ہی مستفید ہونا چاہتے ہیں اور ان کا بخل یہ برداشت نہیں کرتا کہ ان کے مال و متاع سے کسی اور کو بھی فائدہ پہنچے۔کفار کے لئے عبرت آموز مثال بیان کرنے کے بعد یہ سورت متقین کا انجام بھی بتاتی ہے اور سوال کرتی ہے کہ محسن اور مجرم، فرمانبردار اور نافرمان، باغی اور وفادار دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟

آخرت:

تیسرا اہم مضمون جو سورۂ قلم بیان کرتی ہے وہ آخرت کے بارے میں ہے، فرمایا گیا کہ جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی اور سجدے کے لئے بلائے جائیں گے تو سجدہ نہ کر سکیں گے۔دنیا میں انہیں سجدہ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا مگر یہ سجدہ نہیں کرتے تھے، آخرت میں وہ سجدہ کرنا چاہیں گے مگر ان سے طاقت اور اختیار سلب کر لیا جائے گا۔'' کشف ساق'' یعنی پنڈلی کھولے جانے سے علماء نے قیامت کے شدائد اور ہولناکیاں مراد لی ہیں۔ویسے یہ ان متشابہات میں سے ہے

جن کی اصل حقیقت اور یقینی مراد اللہ تعالی کے سوا کسی کو بھی معلوم نہیں۔ آخر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشرکین کی ایذاؤں پر صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن)

موضوع سورۃ:...... اگر اس دین کو خود ساختہ سمجھتے ہو تو تمہارے ہاتھ میں قلم ہے، ایسا قرآن لکھ کر لا دو۔

خلاصہ رکوع:۱...... (۱) آپ پر یہ لوگ الزامات لگاتے ہیں۔ (۲) آپ کو صبر کا بے انتہا اجر ملے گا۔ (۳) آپ ان کی کوئی بات نہ مانیں۔ (۴) یہ لوگ باغ والوں کی طرح بالآخر نقصان اٹھائیں گے۔ ماخذ: (۱) آیت:۲۔ (۲) آیت:۳۔ (۳) آیت:۸۔ (۴) آیت:۱۷۔

خلاصہ رکوع:۲...... ہاں (۱) موافق اور مخالف برابر نہیں ہو سکتے (۲) قرآن پر ایمان لانے میں کیا مندرجہ ذیل رکاوٹیں انہیں پیش آرہی ہیں۔ ماخذ: (۱) آیت:۳۵، ۳۴۔ (۲) آیت:۳۹، ۳۷، ۴۲، ۴۱، ۴۷۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الحاقۃ

یہ قرآن کریم کی ۶۹ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۷۸ نمبر پر ہے۔ اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۵۲ آیات، ۲۶۰ کلمات اور ۱۱۳۴ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء ہی لفظ الحاقہ سے ہوئی ہے، جس کے لفظی معنی ہیں وہ چیز جو ہو کر رہے۔ ایسے ہی حاقہ کے معنی حق اور ثابت کے بھی ہیں، یہاں اس سے مراد قیامت کا دن ہے جس میں جزاء وسزاء واقع ہو کر رہے گی، اس لئے اس سورۃ کا نام سورۃ الحاقہ ہوا۔

ربط:

پہلی سورۃ میں اثبات رسالت کے ساتھ کفار کی مجازاۃ کا بیان تھا، اس سورۃ میں مجازاۃ کی تحقیق اور اس کا وقت اور مواقعات مذکور ہیں اور ختم سورۃ میں حقانیت قرآن کا بیان ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں قیامت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور دنیا والوں کو صاف طور پر بتایا گیا کہ دنیا ایک روز ختم ہو کر رہے گی اور اس کے بعد ایک دوسرے جہاں سے پالا پڑے گا، اس لئے دنیوی زندگی اس حقیقت کو مدنظر رکھ کر بسر کرنی چاہیے، جن لوگوں نے قیامت اور آخرت کو نہیں مانا اور بے فکری کے ساتھ جو دل میں آیا دنیا میں کرتے رہے، ان کو ان کے بداعمال کی سزا اول تو دنیا ہی میں مل گئی اور مرنے کے بعد جب انہیں دوسرے جہاں سے واسطہ ہوگا تو ان کی بہت ہی بری گت بنے

گی اور ایک وقت ایسا یقینی آئے گا جب صور پھونکا جائے گا اور ایک ہولناک آواز پیدا ہوگی جس سے آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور زمین کا چپہ چپہ زلزلہ سے لرز جائے گا، پہاڑ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور تمام انسان دوبارہ زندہ کر کے خدا کے حضور میں پیش کئے جائیں گے، وہاں ان کی ساری چھپی اور کھلی باتیں ظاہر ہو جائیں گی، بدی اور نیکی سب آنکھوں کے سامنے آجائیں گی اور ہر ایک کو اس کا اعمال نامہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا جائے گا، کسی کے دائیں ہاتھ میں اور کسی کے بائیں ہاتھ میں، جس کے داہنے ہاتھ میں اس کا اعمال نامہ آئے گا وہ اسے خوشی خوشی دوسروں کو دکھائے گا اور کہے گا کہ مجھ کو معلوم تھا کہ مجھ سے میرے اعمال کا حساب لیا جائے گا اور میں دنیا میں ایسے کاموں سے بچتا تھا جن سے پکڑ کا اندیشہ تھا، ایسا شخص جنت میں داخل ہوگا اور جہاں پھلوں سے لدے ہوئے باغات ہوں گے اور وہ ان کے اندر ہمیشہ ناز و نعمت اور چین و آسائش میں رہے گا اور جس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں آئے گا وہ کہے گا کہ کاش مجھے نہ ملا ہوتا تا کہ اپنے کرتوتوں کا حساب نہ دینا پڑتا، کاش میں ہمیشہ مرا ہی پڑا رہتا، آج نہ دنیا کی دولت میرے کام آئے گی اور نہ میری حکومت و سلطنت مجھے بچا سکے گی۔ فرشتوں کو حکم ہوگا اس مردود کو پکڑو، گلے میں طوق ڈالو اور کھینچتے ہوئے لے جاؤ اور جہنم میں ڈال دو اور زنجیروں میں جکڑ دو، یہ وہی تو ہے جو دنیا میں اللہ کا انکار کرتا تھا اور محتاجوں و مسکینوں کی خبر نہ لیتا تھا کہ آج اس کی مدد اور خبر گیری کرنے والا کوئی نہ ہوگا اور اس کو کھانے پینے کو غسلین (زخموں کا دھوون) ملے گا۔ اخیر میں سمجھایا گیا کہ اے انسانو! میں (اللہ) قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ قرآن میری بھیجی ہوئی سچی کتاب ہے اور اسے کسی نے خود نہیں گھڑ لیا اور یہ پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے لیکن اللہ کو علم ہے کہ تم میں سے بہت سے انسان اس کی قدر نہ کریں گے وہ آخر کار پچھتائیں گے کہ افسوس ہم نے پہلے ہی قرآن کو کیوں نہ مان لیا۔ بہر حال سمجھداروں کے لئے یہ قرآن بالکل یقینی حقیقت ہے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

موضوع سورۃ:...... جزائے اعمال دنیا اور آخرت دونوں جگہ ملتی ہے۔

خلاصہ رکوع: ۱...... (۱) ثمود (۲) عاد اور (۳) فرعون وغیرہ کو (۴) دنیا میں بھی سزا ملی اور (۵) آخرت میں بھی ملے گی۔ ماخذ: (۱) آیت: ۵۔ (۲) آیت: ۶۔ (۳) آیت: ۹۔ (۴) آیت: ۱۹ تا ۲۴ - (۵) آیت: ۲۵ تا ۳۷۔

خلاصہ رکوع: ۲...... (۱) یہ قرآن معزز رسول (جبرائیل علیہ السلام) لایا ہے، (۲) اور رب العالمین نے نازل فرمایا ہے۔ (۳) البتہ فائدہ فقط متقین اس سے اٹھا سکتے ہیں۔ ماخذ: (۱) آیت: ۴۰۔ (۲) آیت: ۴۳ - (۳) آیت: ۴۸۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ المعارج

یہ قرآن کریم کی ۷۰ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا شمار ۷۹ ہے۔ اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۴۴ آیات، ۲۳۰ کلمات اور ۷۷۹ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورہ کی تیسری آیت میں معارج کا لفظ آیا ہے، معارج معراج کی جمع ہے، جس کے لفظی معنی ہیں درجات، زینہ، سیڑھیاں، مگر یہاں مراد ہے آسمان جو ایک کے اوپر ایک ہے اور اس پر فرشتے چڑھتے اترتے ہیں۔ اس لفظ معارج کو سورۃ کا نام قرار دیا گیا۔

ربط:

سورۃ سابقہ کی طرح اس سورۃ میں بھی مجازات کا اور بعض اعمال موجبہ مجازات کا بیان ہے، جس سے دونوں سورتوں میں ارتباط ظاہر ہے۔

شان نزول:

مفسرین نے اس سلسلہ میں ایک روایت لکھی ہے کہ ایک کافر نضر بن حارث نے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہوکر کہا: خدایا اگر محمد برحق ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے وہ تیرے پاس سے ہے، تو تو ایک پتھر مجھ پر برسایا مجھ کو دردناک عذاب میں مبتلا کر، اس پر یہ سورہ مبارکہ نازل ہوئی۔

خلاصہ سورۃ:

جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہوا کہ نضر بن حارث نے جو قرآن کے حق ہونے کی صورت میں عذاب کی درخواست کی تھی، اولا اس کا جواب ارشاد فرمایا گیا کہ یہاں کی سزا کیا ہے؟ اصل سزا کا انتظار کرو جو ایسے دن میں واقع ہوگی جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی، مراد یوم قیامت ہے۔ اس سلسلہ میں بتلایا گیا کہ ان کفار کی نگاہ قیامت تک نہیں پہنچتی اور اس کے آنے کو محال کہتے ہیں لیکن اللہ کے نزدیک وہ قریب ہی آگئی ہے اور جب قیامت آئے گی تو بڑا ہولناکی کا سماں ہوگا کہ آسمان پگھل جائے گا اور پہاڑ اون کی طرح اڑنے لگیں گے اور ایسا نفسی نفسی کا سماں ہوگا کہ لوگ اپنے قریبی رشتہ داروں تک کو نہ پوچھیں گے، ہر ایک کو اپنی جان کی پڑی ہوگی اور مجرم اس روز چاہے گا کہ میری اولاد، بیوی، بھائی کنبہ قبیلہ بلکہ ساری دنیا مجھ سے لے لیں مگر کسی طرح میری جان چھوڑ دیں لیکن یہ ہرگز نہ ہوگا، وہاں تو مجرموں کو دہکتی ہوئی آگ سے پالا پڑے گا اور جہنم ان لوگوں کو پکارے گی جو دنیا میں اللہ اور رسول کی بات نہ سنتے تھے، کوئی سمجھاتا تو پیٹھ موڑ کر چل دیتے تھے اور دنیا کے ساز وسامان جمع کرنے میں لگے رہتے تھے، روپیہ پیسہ بخل کے باعث گن گن کے رکھتے تھے اور دنیا ہی میں پھنسے رہتے تھے، ذرا سی تکلیف ہوئی تو بے صبری سے چلا اٹھتے اور جب فارغ البالی ہوئی تو کنجوسی اور بخل سے کام لیتے

،ایسے لوگوں کو نارِ جہنم سے واسطہ پڑے گا اور قیامت میں نجات انہیں کو نصیب ہوگی جو ہمیشہ نماز کے پابند رہیں گے، مسکین محتاج اور نادار کی مالی امداد کرتے رہے ہوں گے، قیامت پر ایمان رکھتے ہوں گے اور اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہوں گے اور اپنی شرمگاہوں کی ناجائز امور سے حفاظت کرتے رہے ہوں گے، امانت دار ہوں گے اور اپنے قول وقرار کا خیال رکھا ہوگا، ایسے لوگ اکرام کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے، انسان کی نجات کی یہی صورت ہے اور کفار کا یہ خیال کہ بغیر ایمان اور عمل صالح کے انہیں آرام وآسائش والے باغ مل جائیں گے ایسا کبھی نہیں ہوسکتا اور عنقریب وہ دن آنے والا ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے جب آجائے گا تو سب اپنی قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے اور ان کو بتلادیا جائے گا کہ یہ ہے وہ دن جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا اور جس کو تم جھٹلاتے تھے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مضامین:

خدا کی تدبیر وانتظام کے اتار چڑھاؤ کے بے شمار درجوں کو بتانے کے لئے کہا گیا ہے کہ فرشتے اپنی ذمہ داریوں سے ایک دن میں فارغ ہوتے ہیں، اور میرا ایک دن انسانوں کے پچاس ہزار سال کے برابر ہے، پھر وہ احکام حاصل کرنے کے لئے اوپر چڑھتے ہیں، اس کے علاوہ اس سورہ میں یہ مضامین بیان ہوئے ہیں:

◇ قیامت جب آئے گی تو اس کائنات کی کیفیت کیا ہوگی؟

◇ اس دن مجرمین کا کیا حال ہوگا؟

◇ قیامت کے دن کی نامرادیوں سے بچنے کے لئے کونسے اوصاف مطلوب ہیں۔ نیز یہ کہ ان صفات کو اختیار کرکے مومنین تزکیہ نفس کرتے ہیں اور درجہ بدرجہ بلند مرتبوں تک پہنچتے ہیں۔

◇ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس سے استفادہ کیلئے خلوص اور صحت نیت شرط ہے منافقت نامرادی کی مستوجب ہے۔

(خلاصہ مضامین قرآنی)

موضوع سورۃ:...... تشریح یوم المجازات۔

خلاصہ رکوع:۱...... (۱) تشریح یوم المجازات (۲) اور بہشتیوں کے اوصاف حمیدہ۔ ماخذ: (۱) آیت: ۸ تا ۱۴۔ (۲) آیت: ۲۲ تا ۳۴۔

خلاصہ رکوع: ۲...... منکرین قیامت کو اپنے خوض ولعب میں چھوڑ دیں، قیامت میں حاضر ہوکر سب کچھ خود دیکھ لیں گے۔ ماخذ: آیت: ۴۲ تا ۴۴۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورة النوح

یہ قرآن کریم کی ۷۱ ویں سورة ہے اور اس کا شمار ترتیب نزولی کے اعتبار سے بھی نمبر ۷۱ پر ہے، اس سورة میں ۲ رکوع، ۲۸ آیات، ۲۳۱ کلمات اور ۹۷۴ حروف ہیں، یہ سورہ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

چونکہ اس پوری سورة میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر ہے اس لئے اس سورة کا نام ہی نوح مقرر ہوا۔

فائدہ:

قرآن کریم میں صرف دو سورتیں ایسی ہیں جن میں مسلسل ایک خاص ذکر کے علاوہ دوسرا ذکر نہیں۔ ایک سورۂ یوسف کہ اس میں صرف حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے اور ایک یہ سورہ نوح کہ اس میں قصہ نوح کے سوا اور کچھ مذکور نہیں ہے۔

ربط:

سورۂ سابقہ میں موجبات عقوبت کا بیان تھا، ان میں سے ایک رسول کی تکذیب بھی ہے۔ اس سورة نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ کے ضمن میں اس کا بیان ہے، نیز مذکورہ سورة سابقہ کے ساتھ اس سورة میں کفر پر استحقاق عقوبت دنیویہ کا بھی اثبات ہے۔

نیز آپ کو تسلی دینا ہے کہ مشرکین مکہ کی طرح قوم نوح نے بھی اپنے پیغمبر کی تکذیب کی تھی لہذا آپ تنگ دل نہ ہوں۔

خلاصہ سورة:

کفار مکہ کی سرکشی اور نبی آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات پر تمسخر اور آپ کے فرمائے ہوئے وعدوں کی تکذیب و تکفیر حد کو پہنچ گئی تھی، اس لئے کفار مکہ کو ان کے سرکش اور نافرمان قوم کا عبرتناک واقعہ سنایا گیا جو نوح علیہ السلام کی نبوت کے زمانہ میں گزرا۔ چنانچہ اس سورة میں بتایا جاتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ہر طریقہ سے سمجھایا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو، دین حق کی دعوت دی اور خدا کے احکام پر چلنے اور اس کی عبادت کرنے کی نصیحت کی، لیکن قوم نے آپ کی نصیحتوں کو نہ مانا بلکہ الٹا حضرت نوح کو طرح طرح سے ستایا، آپ پر آوازے کسے اور آپ کا مذاق اڑایا، آپ کو ملک بدر کرنے کی دھمکی دی، آخر کار ۹۵۰ سال کی طویل مدت تک برابر قوم کو دعوت دین دیتے رہنے اور تبلیغ حق کرتے رہنے کے بعد سوائے معدودے چند افراد کے جو ایمان لائے پوری قوم سرکشی پر اصرار کرتی رہی، تو حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے حق میں بددعا فرمائی اور اللہ تعالی سے التجا کی کہ دنیا میں یہ لوگ اس طرح رہتے چلے گئے تو سوائے شر و فساد اور کفر و شرک، ظلمت و گمراہی اور فسق و فجور کے کچھ باقی نہ رہے گا، اس لئے ان کافروں میں سے

ایک بھی زندہ مت چھوڑ، چنانچہ نوح علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی اور ایسا عالمگیر طوفان آیا کہ تمام کافر ڈوب کر مر گئے اور صرف وہی مؤمن بچے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے تھے اور دنیا کی آئندہ نسل انہیں سے چلی۔

فائدہ (۱):

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان مؤرخین نے ۱۲۰۰ سال کا فاصلہ لکھا ہے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد نبی تو ہوئے مگر پہلے نبی جن کو رسالت سے نوازا گیا حضرت نوح علیہ السلام ہی تھے۔

فائدہ (۲):

نبی اور رسول میں یہی فرق ہے کہ نبی ہر صاحب وحی کو کہتے ہیں لیکن رسول کے لئے صاحب وحی ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب شریعت ہونا بھی ضروری ہے، چنانچہ انبیاء اولوالعزم کا سلسلہ بھی حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا اور وحی الٰہی سے سرتابی کرنے والوں پر اول عذاب حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے شروع ہوا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت سے پہلے تمام قوم خدا کی توحید اور صحیح مذہبی روشنی سے ناآشنا ہو چکی تھی اور حقیقی خدا کی جگہ خود ساختہ بتوں کی پرستش ان کا شعار ہو گیا تھا۔

فائدہ (۳):

دنیا میں بت پرستی کی ابتداء کب اور کس طرح ہوئی؟ اس کے متعلق لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی آٹھویں پشت تک کوئی کافر نہ تھا، سب خدا پرست اور شرک سے پاک تھے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے سلسلۂ نسب میں جب حضرت ادریس علیہ السلام کی وفات ہوئی تو اس کے بعد بنی آدم میں بت پرستی شروع ہوئی اور سبب اس کا یہ ہوا کہ حضرت ادریس کے سب بیٹے اولیاء اللہ اور نیک بخت تھے اور ہر ایک نے اپنی عبادت کے واسطے ایک عبادت خانہ بنایا تھا، اس میں خود بھی عبادت کرتے تھے اور لوگوں کو بھی عبادت خانہ میں حاضر ہونے اور حق تعالیٰ کے ذکر و بندگی میں مشغول رہنے کی نصیحت کیا کرتے تھے، چنانچہ بہت لوگ وہاں حاضر رہتے اور ان کی تعلیم کے بموجب نہایت ذوق وشوق سے عبادت کرتے اور ان کی صحبت اور حضوری کی برکت سے عبادت میں ان کو لذت اور شوق حاصل ہوتا، جب ان کا انتقال ہوا تو لوگوں کو نہایت رنج و ملال ہوا اور ان میں آپس میں اکثر اس بات کا ذکر رہتا کہ جو مزہ عبادت کا ہم کو ان بزرگوں کی صحبت میں حاصل ہوتا تھا اب وہ بات میسر نہیں آتی، ابلیس لعین جو کہ انسان کا جانی دشمن ہے موقع کو غنیمت جان کر ایک بوڑھے بزرگ کی شکل میں ان کے پاس پہنچا اور کہا کہ تمہارے رنج کے دفع ہونے کی ایک تدبیر میں تم کو بتلاتا ہوں، وہی عبادت میں لذت تم کو پھر حاصل ہونے لگے گی۔ اور وہ تدبیر یہ ہے کہ ان بزرگوں کی شکلیں پھر سے تراشو اور ان بزرگوں کے کپڑے ان تصویروں کو پہنا کر عبادت خانہ کی محراب میں اپنے سامنے کھڑا کر لو اور یہ سمجھ لو کہ یہ ہم کو دیکھتے ہیں۔ اس قول کے بموجب کہ اللہ کے ولی مرتے نہیں ان لوگوں کو یہ تدبیر بہت پسند آئی اور تصویروں کو بنا کر عبادت خانہ میں رکھا اور یہ

دستور بنالیا کہ عبادت کے بعد جو شخص عبادت خانہ سے باہر جائے تو ان تصویروں کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دے کر جائے تاکہ اس شخص کی حاضری عبادت نماز میں ان بزرگوں کی روحوں کے نزدیک ثابت ہو جائے اور وہ اس بات کی گواہی دیں اور ہماری سفارش کریں۔ ہوتے ہوتے اس امر نے ایسا رواج پایا کہ عبادت اور ذکر تو بالکل موقوف ہو گیا، بس ان تصویروں کا فقط ہاتھ پاؤں چومنا باقی رہ گیا۔ پھر تھوڑے دنوں کے بعد قدم بوسی کے عوض زمین بوسی اور سجدہ شروع ہو گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے والد لوگوں کو برے کام سے منع کرتے لیکن کوئی ان کی بات کو نہ سنتا، یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کو حق تعالی نے پیغمبر بنا کر ان لوگوں کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سب سے پہلے رسول:

حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے، انہیں شیخ الانبیاء بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کی عمر تمام انبیاء سے زیادہ طویل تھی اور حضرت آدم علیہ السلام کے بعد دنیا والوں کی طرف وہ سب سے پہلے رسول تھے، انہوں نے اپنی قوم کو اللہ کی عبادت اور اپنی اطاعت کی دعوت دی اور اس دعوت کے سلسلے میں مبالغہ کی حد تک کوشش کی۔ رات کو بھی دعوت دی اور دن کو بھی، خفیہ خفیہ بھی سمجھایا اور علانیہ بھی، لیکن وہ جتنی زیادہ دعوت دیتے قوم اتنی ہی ان سے دور بھاگتی۔ (۶۔۱)

استغفار کی تلقین:

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو استغفار کی تلقین کی اور فرمایا کہ اگر تم استغفار کرو گے اور گناہوں سے باز آجاؤ گے تو اللہ تم پر موسلا دھار بارش برسائے گا، تمہیں مال اور اولاد عطا کرے گا، تمہیں باغات دے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کر دے گا، پھر انہیں اللہ کی نعمتیں یاد دلائیں کہ اس نے سات آسمان پیدا کیے ہیں، چاند کو جگمگاتا بنایا ہے اور سورج کو روشن چراغ بنایا ہے لیکن اس فہمائش اور تذکیر و دعوت کا قوم پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اپنے بتوں ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو چھوڑنے کے لیے آمادہ نہ ہوئے تو آپ نے ان کے لیے اللہ سے ہلاکت کی دعا کی، جس میں عرض کیا کہ اے میرے رب! تو زمین پر کسی کافر کو بھی نہ چھوڑنا، آپ کی دعا قبول ہوئی اور ان کفار فجار کو طوفان میں ہلاک کر دیا گیا۔ (خلاصہ القرآن)

مضامین:

پوری سورہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ حق اور منکرین کے انکار و سرکشی وغیرہ کا تفصیلی تذکرہ ہے، جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ:

◇ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمہ داری دعوت حق پہنچا دینا ہے، کسی کو زبردستی راہ حق پر لگا دینا نہیں۔

◇ داعی حق کی فریضہ تبلیغ کی ادائیگی میں ساری زندگی ختم ہو جائے اور کوئی شخص اس کی دعوت پر لبیک نہ کہے، تو بھی داعی حق ناکام نہیں ہے۔ وہ کامیاب ہے، کیونکہ اس نے اپنی ذمہ داری میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

◇ اتمام حجت کے بعد نتیجہ عمل ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

◇ اعتبار تعداد کی قلت و کثرت کا نہیں ہے اور نہ اللہ کی میزان میں اس کا کوئی وزن ہے۔

◇ خدا کے فیصلہ عذاب میں کوئی بدکردار مستثنیٰ نہیں ہوسکتا۔ چاہے اس کا خونی رشتہ خدا کے مقرب ترین بندے ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو۔

◇ اللہ کے فیصلہ کو ٹالنے والی دنیا کی کوئی طاقت نہیں۔

◇ اللہ تعالی اپنے ان متقی بندوں کو جو آزمائشوں میں پورا اتریں، دنیا اور آخرت ہر جگہ اپنے عذاب سے محفوظ رکھتا ہے۔

◇ حق کے انکار اور اس کی مخالفت میں پیش پیش وہی لوگ رہتے ہیں جو دنیوی آسائشوں میں عزت اور مال و دولت کے حریص اور خواہشات نفس کے غلام ہوتے ہیں۔

◇ داعی حق انسانیت کی فلاح کے لئے ہمدردی و دل سوزی سے سرشار رہتا ہے، اور اگر کسی کے لئے بددعا کرتا بھی ہے تو اتمام حجت کے بعد اور وہ بھی کسی جذبہ انتقام کے ماتحت نہیں اور نہ اپنے کسی ذاتی نفع و آرام کے جذبہ سے بلکہ دوسرے بندگان خدا ہی کی بھلائی و ہمدردی کی خاطر۔

موضوع سورۃ:......طریقہ تبلیغ انبیاء علیہم السلام۔

خلاصہ رکوع:۱......(۱) مقصد تبلیغ۔(۲) مشغلہ مبلغ در روز و شب۔(۳) قبولیت احکام پر نتائج حسنہ کا ترتب۔ ماخذ: (۱) آیت:۳۔(۲) آیت:۵۔

خلاصہ رکوع:۲......مخاطبین اگر داعی الی اللہ کے اخلاص کی قدر نہ کریں تو پھر اس مظلوم کے دل کی آہ خرمن قوم کو جلا دیتی ہے۔ ماخذ: آیت:۲۵، ۲۶۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الجن

یہ قرآن کریم کی ۷۲ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۴۰ پر ہے، اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۲۸ آیات، ۲۸۷ کلمات اور ۱۱۲۶ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء ہی میں جنات کی ایک جماعت کے متعلق بتلایا گیا کہ انہوں نے قرآن سنا اور اس پر ایمان لائے اور پھر اپنی قوم میں جا کر ایمان و اسلام کی تبلیغ کی، اس واقعہ کے ذکر کی بناء پر اس سورۃ کا نام سورۃ الجن متعین ہوا۔

ربط:

سورہ سابقہ میں قصہ کفر سے ترہیب تھی کفار کے ایمان نہ لانے پر، اس سورۃ میں جنات کے ایمان لانے سے ترغیب

ہے کفار معاصرین کو ان امور پر ایمان لانے کی، اس طور پر کہ ناری الاصل باوجود علو وغلو کے ایمان لائے تو تُرابی الاصل باوجود انخفاض کے کیوں ایمان نہیں لائے؟ ترغیب وترہیب کے اس تقابل سے دونوں سورتوں کا ربط ظاہر ہے۔

شانِ نزول:

اس سورۃ کے شان نزول میں امام احمد، ترمذی، بخاری، مسلم وغیرہ کبار محدثین نے مختلف احادیث نقل کی ہیں، جن کا خلاصہ ومطلب بمعہ اس تشریح کے جو کتب سیر میں ہے یوں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے برسوں قریش مکہ کو سمجھایا اور دین حق کی دعوت دی اور ان کی سختیوں اور ایذاؤں کو بڑے استقلال سے برداشت کیا، مگر من حیث القوم ان کا کفر پر اصرار رہا۔ آپ نے یہ خیال کر کے کہ چلو قریش مکہ ایمان نہیں لائے تو باہر کے لوگوں کو ہی نصیحت کی جائے، اس غرض سے پہلے طائف تشریف لے گئے، وہاں کے بااثر سرداروں سے ملاقات کی اور اسلام کی اعانت ونصرت کے سلسلہ میں گفتگو فرمائی، مگر یہ طائف کے سردار انتہائی بدسلوکی کے ساتھ پیش آئے اور آپ کو شہر سے نکال دیا اور اوباشوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا، اس طائف کے سفر میں دردناک اور انتہائی غمناک واقعات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئے۔ الغرض ان طائف کے ظالموں نے طائف سے باہر جانے پر مجبور کیا، تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عکاظ کا قصد فرمایا جہاں ایک بڑا بازار یا منڈی لگا کرتی تھی، جہاں مختلف جگہوں اور قبیلوں کے لوگ باہم خرید وفروخت کیا کرتے تھے، آپ راستہ میں مقام نخلہ میں ٹھہرے اور صبح کی نماز ادا فرمائی، نماز میں جو قرآن پاک کی تلاوت فرمائی تو اس کو جنات کی ایک جماعت نے سنا جو اس تلاش اور جستجو میں گھومتے پھر رہے تھے کہ ان پر آسمانی خبریں بند ہونے کا سبب کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے سرفراز ہونے سے جنات آسمان پر جاتے تھے اور آسمان والوں کی باتیں جو دنیا کی تدابیر سے متعلق ہوتیں ان کو چوری چھپے سن آتے اور لوگوں سے بتلاتے، تاکہ لوگ ان جنات کی غیب دانی کے معتقد ہو جائیں اور ان کی پرستش کریں اور کاہنوں کو جو عرب میں ان جنات کے خادم اور پجاری تھے نذرونیاز لا کر دیویں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی بنا کر مبعوث فرمائے گئے تو جنات کا یہ نظام درہم برہم ہو گیا اور آسمان پر جانے سے جنات کو ممانعت ہو گئی اور فرشتے نگہبانی کو مقرر ہو گئے کہ جو جنات چوری چھپکے آسمان پر جانے کا قصد کریں ان پر آگ کے انگاروں سے مار پڑے، تو جنات حیرت میں تھے کہ یہ کیا نظام الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ اس کے لئے جنات کی ٹولیاں مختلف ملکوں اور مقامات میں چکر لگاتی پھرتی تھی کہ ایک جماعت نو جنات کی مقام نخلہ میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز میں تلاوت قرآن فرما رہے تھے پہونچ گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سن کر ششدر رہ گئے اور بڑے غور سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت سنتے رہے، جب سن چکے تو کہنے لگے کہ واللہ یہ چیز ہے جس سے ہم کو اوپر رسائی نہیں ہوتی، یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کی حفاظت کے لئے جنات کو اوپر سے باتیں لا کر کاہنوں سے کہہ دینے سے بند کر دیا گیا ہے کہ کہیں جنات کوئی آیت سن کر اور اس میں کچھ ملا کر کاہنوں سے نہ کہہ دیں اور وہ لوگ قرآن کے برابر کلام بنانے کا دعوی نہ کر بیٹھیں، الغرض وہ

جنات خود بھی ایمان لے آئے اور اپنی قوم کو بھی جا کر ہدایت کی، اس واقعہ کی خبر اللہ نے بذریعۂ وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی اور یہ سورۃ نازل ہوئی۔

فائدہ:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جنات کے متعلق ضروری چیزیں بیان کر دی جائیں۔ لفظ جن کے معنی لغت میں پوشیدہ کے ہیں، یہ بھی اور مخلوقات کی طرح اللہ کی ایک مخلوق ہے، ان کی پیدائش آگ سے ہوئی جیسا کہ اول انسان حضرت آدم کی پیدائش مٹی سے ہوئی، حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے زمین پر جنات موجود تھے، انسانوں کی طرح اب یہ بھی احکام شرعیہ کے مکلف ہیں چونکہ یہ عام طور پر انسانوں کی نظروں سے غائب رہتے ہیں اس لئے اکثر فلسفیوں اور نیچریوں دہریوں نے ان کے وجود کا انکار کیا ہے، لیکن کسی چیز کا نظر نہ آنا یا اس کی کیفیت کا ہمیں معلوم نہ ہونا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے، تمام ارباب مذاہب کے نزدیک جو کسی آسمانی مذہب کے قائل ہیں جنات کا وجود مسلم ہے اور قرآن کریم و احادیث متواترہ کے نصوص جب صراحت کے ساتھ جنات کے وجود کو ثابت کر رہے ہیں اور بہت سی حدیثوں میں رویت جن کا ذکر بھی موجود ہے، تو پھر کسی مسلمان کو ان کا وجود ماننے سے انکار کرنا ہرگز زیبا نہیں ہے۔ قادیانیوں نے جہاں قرآن میں جن کا لفظ آیا ہے اس سے انسان ہی مراد لئے ہیں، جس کی وجہ سے ان کو جگہ جگہ گمراہ کن اور مضحکہ خیز تاویلات کرنی پڑیں۔ الغرض انسانوں کی طرح جنات میں بھی پیدائش اور موت اور مذکر و مؤنث اور نیک و بد اور کافر و مسلم کا سلسلہ جاری ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا گیا کہ جنات کی ایک جماعت نے قرآن سنا اور کہنے لگے کہ یہ عجیب کلام ہے جو نیک راہ دکھاتا ہے۔ پھر وہ جماعت اس قرآن پر ایمان لے آئی اور شرک سے توبہ کر لی اور پھر اپنی قوم میں جا کر ایمان و اسلام کی دعوت دی، پھر بتلایا گیا کہ انسانوں کی طرح جنات کا بھی یہی خیال تھا کہ اللہ کسی کو دوبارہ زندہ نہیں کرے گا۔ پھر مساجد کی حرمت کا بیان فرمایا گیا کہ مساجد اللہ کی عبادت کی جگہیں ہیں، یہاں شرک کرنا بڑا گناہ ہے، یہ غالباً خانہ کعبہ کی طرف اشارہ ہے کہ مشرکین نے اس میں بت رکھ کر اس کے احترام کو ٹھیس پہنچائی تھی، پھر بتلایا گیا کہ رسول کا کام تبلیغ و دعوت دینا ہے، ماننا نہ ماننا انسان کا اپنا کام ہے لیکن جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، پھر بتلایا گیا کہ عالم الغیب صرف خدا کی ذات ہے اس بناء پر قیامت کا علم صرف اللہ کو ہے۔ ہاں اللہ تعالیٰ اپنے علم غیب میں سے جس رسول کو جس قدر مناسب سمجھتا ہے عطا فرماتا ہے، یعنی رسالت کی تبلیغ کے لئے جتنی ضرورت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو اس قدر علم عطا فرماتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مضامین:

اس سورہ میں یہ باتیں سمجھائی گئی ہیں:

◇ اہل مکہ رسالت محمدیہ جیسی عظیم نعمت ورحمت کی قدر نہیں کر رہے، شکوک وشبہات اور ایذاؤں کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ حالانکہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان ہی میں سے ہیں، بشر ہیں اور انسانی نوع کے ایک فرد۔ اس کے برخلاف وہ مخلوق جو انسانوں کی نوع میں سے نہیں ہے۔ وہ قرآن سے فائدہ اٹھاتی ہے، یہ کتنی افسوسناک بات ہے۔

◇ مسجدیں اللہ کی عبادت کے لئے ہوتی ہیں، نہ کہ ان کو بتوں کا مسکن بنا کر نجس کرنے کے لئے، پھر یہ کیا ہے کہ خانہ کعبہ میں سینکڑوں بت رکھ کر اس کے احترام کو ٹھیس بھی پہنچائی جارہی ہے اور اس کے بانی ومعمار (حضرت ابراہیم علیہ السلام) نے جس مقصد وغرض کے لئے اس کی تعمیر کی تھی، وہ مقصد اگر کوئی خدا کا بندہ پورا کرنا چاہتا ہے تو اس کے خلاف محاذ قائم کرلیا گیا ہے۔

◇ داعی حق کا فریضہ تبلیغ ودعوت ہے، اب یہ انسان کا اپنا کام اور اس کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرتا ہے یا نہیں، قبول کرے گا تو اپنا بھلا کرے گا، انکار کرے گا تو اپنے پیروں پر کلہاڑی مارے گا۔

◇ انسان کی کوئی حرکت اور اس کا کوئی عمل، جس جگہ، جس وقت اور جس عالم میں ہوا ہو، اللہ سے پوشیدہ نہیں، کیونکہ وہ عالم الغیب ہے۔ (خلاصہ مضامین قرآنی)

جنات کا اقرار:

ان لوگوں کو احمق قرار دیا جو اللہ کے لیے اولاد ثابت کرتے ہیں اور اس بات کا اقرار کیا کہ ہم سب ایک عقیدے پر نہیں ہیں، کوئی مومن ہے کوئی کافر، کوئی مطیع ہے اور کوئی عاصی، کوئی عقلمند ہے اور کوئی بے وقوف، کوئی جہنم میں جائے گا اور کوئی جنت میں۔ (۱۴۔۱۷)

جنات کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ سورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا ذکر کرتی ہے کہ آپ نے اللہ کے حکم کے مطابق انسانوں کو ایمان اور توحید کی دعوت دی اور اپنے بارے میں فرمایا کہ میں صرف اللہ کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا، میرے ہاتھ میں نفع ہے نہ نقصان، میرا کام تو صرف اللہ کے پیغام کو تم تک پہنچا دینا ہے اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے اس کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچا دیا۔ (۲۰-۳۲)

موضوع سورۃ:......جس طرح فطرت سلیمہ والے انسان قرآن کے آب حیات کے لئے تشنہ لب ہیں، اسی طرح سلیم الطبع جن بھی قرآن کریم کے لئے چشم براہ ہیں۔

خلاصہ رکوع :۱......(۱) جنوں کا قرآن مجید سن کر فوراً متأثر ہونا۔ (۲) اور اپنی قوم کو جا کر تبلیغ کرنا۔ ماخذ: (۱) آیت:۱۔ (۲) آیت: ۲ تا ۱۴۔

خلاصہ رکوع: ۲......(۱) مقصد تبلیغ دعوت الی اللہ ہے۔ (۲) انبیاء علیہم السلام کسی کے نفع ونقصان کے مالک نہیں ہوتے۔ (۳) ان کا کام تبلیغ احکام الٰہی ہے۔ ماخذ: (۱) آیت: ۲۰۔ (۲) آیت: ۲۱۔ (۳) آیت: ۲۳۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورة المزمل

یہ قرآن کریم کی ۷۳ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے نمبر ۳ پر ہے۔اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۲۰ آیات، ۲۰۰ کلمات اور ۸۲۴ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتدا ہی "یا ایھا المزمل" کے خطاب سے ہوئی ہے، اس لئے سورۃ کا نام مزمل قرار پایا، مزمل لغت عرب میں اس شخص کو کہتے ہیں جو بڑے کشادہ کپڑے مثلاً چادر و کمبل وغیرہ کو اپنے اوپر لپیٹ لے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ نماز تہجد اور قرآن کریم کی تلاوت کے لئے جتنا اس وقت نازل ہوا تھا رات کو اٹھتے تو ایک دراز کمبل اوڑھ لیتے تھے، تاکہ سردی سے حفاظت رہے اور نماز کی حرکات میں کسی طرح کا حرج واقع نہ ہو۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سورۃ میں مزمل کے خطاب سے مخاطب فرمایا گیا کہ اے کمبل یا چادر اوڑھنے والے۔اسی مناسبت سے اس سورۃ کا نام مزمل مقرر ہوا۔

فائدہ:

علماء نے لکھا ہے کہ کمبل پوشی حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے، خصوصاً حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسی علیہم السلام کا اور ہمیشہ صلحاء کا یہ لباس رہا ہے اور اسی لئے اہل اللہ فقراء میں خرقہ پوشی کی ایک سنت جاری ہے اور یہ لباس اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اوڑھنے والے نے اپنے مولیٰ کی عبادت کا التزام کیا ہے۔حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ اس سورۃ کا نام مزمل اس واسطے رکھا گیا کہ اس سورۃ میں خرقہ پوشی کے لوازمات اور اس کی شرطیں بیان فرمائی گئی ہیں۔(۱) رات کے جاگنے میں بڑی کوشش کرنا اور قرآن کریم کو تہجد کی نماز میں پڑھنا کہ اپنے نفس کے ساتھ بڑا اجتہاد ہے رات کے وقت عبادت میں مشقت ہوتی ہے اور نفس پامال ہوتا ہے لیکن دل جمعی خوب ہوتی ہے۔(۲) دن کو بھی ہر وقت اپنے مالک کی بندگی میں مشغول رہنا۔(۳) حق تعالی کے ذکر پر مداومت کرنا اور اس کے نام سے ہمیشہ اپنی زبان کو شاد کام رکھنا۔(۴) اللہ کے سوا سب علاقوں کو کاٹنا اور ترک کرنا (۵) ہر امر میں بھروسہ اور اعتماد اللہ پر کرنا۔(۶) اللہ کی مخلوق کی ایذا اور ظلم کو سہنا۔(۷) اہل دنیا کی صحبت سے احتراز کرنا لیکن ان کی خیر خواہی میں کمی نہ کرنا۔گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کمبل اوڑھنے والے ہیں اور آپ کے متعلق یہ سب کام فرمائے گئے۔

ربط:

سورۂ سابقہ میں کفار کو امور ثلٰثہ توحید، رسالت و مجازاۃ پر ایمان لانے کی ترغیب تھی۔اس سورۃ میں کفار کے ایمان نہ لانے پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تسلیہ ہے اور تقویت تسلیہ کے لئے آیت "**فاصبر علی ما یقولون و سبح**

بحمد ربک " نازل ہوئی، اس کے ساتھ آپ کو کثرت ذکر اور قیام لیل کا امر فرمایا گیا اور اس مجموعہ کے ضمن میں امور ثلثہ مذکورہ کا اثبات بھی ہے، جس سے دونوں سورتوں کا ربط ظاہر ہے۔

شان نزول:

روایت میں آتا ہے کہ ابتدائے نبوت میں قریش مکہ نے دار الندوہ میں جمع ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مشورہ کیا کہ آپ کی حالت کے مناسب کوئی لقب آپ کے لئے تجویز کرنا چاہئے کہ سب اس پر متفق رہیں اور اس نام کو لے کر مکہ سے باہر نکلیں اور وہ نام اطراف ملک میں مشہور ہو جائے۔ کسی نے کہا آپ کاہن ہیں، پھر رائے قرار پائی کہ آپ کاہن نہیں ہے، کسی نے مجنون کہا پھر اس کو بھی آپس میں غلط قرار دے دیا، پھر ساحر کہا اس کو بھی رد کر دیا اور بعض کہنے لگے کہ ساحر اس لئے درست ہے کہ آپ دوست کو دوست سے جدا کر دیتے ہیں۔ معاذ اللہ۔

آپ کو جب یہ خبر پہنچی تو رنج ہوا اور آپ رنج کی حالت میں کپڑا اوڑھ کر لیٹ گئے، جیسا کہ اکثر سوچ و غم میں آدمی ایسا کر لیتا ہے، اس پر حق تعالیٰ نے آپ کو "**یا ایھا المزمل**" سے خطاب فرمایا۔ اور آپ کی تسلی فرمائی کہ آپ ان کفار کی باتوں پر رنج نہ کریں۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں آپ کو کفار کی باتوں پر صبر کرنے کا حکم دیا گیا اور فرمایا گیا کہ آپ رات میں اٹھ کر اللہ کی یاد کیجئے اور تقریباً آدھی رات یا اس سے کچھ کم و بیش نماز پڑھئے اور جتنا قرآن پاک نازل ہو چکا ہے نماز میں خوب ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک حرف الگ الگ کر کے پڑھئے اور اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ سب سے یکسو ہو کر اللہ کی طرف متوجہ رہا کریں کیونکہ اس کے سوا آپ کا اور اس سارے جہاں کا کوئی پالنے والا نہیں، اس لئے اپنے سب کام اس کے سپرد کیجئے اور یہ کفار و مشرکین جو باتیں آپ کی نسبت کہتے ہیں ان پر آپ صبر و تحمل کریں۔ پھر بتلایا گیا کہ یہ دنیا میں مگن رہنے والے اگر آپ کی بات نہیں سنتے اور الٹا ایذا پہنچاتے ہیں ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیجئے، وہ ان سے خود نمٹ لے گا اور اس نے ان کی سزا کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے، بس وقت آنے کی دیر ہے اور وہ قیامت کا دن قریب ہے جب کہ زمین اور پہاڑ زلزلہ سے لرز کر پاش پاش ہو جائیں گے، اس کے بعد عام انسانوں سے خطاب کر کے فرمایا گیا کہ اللہ نے تمہارے پاس اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہاری ہدایت کے لئے بھیجا ہے، جیسا کہ فرعون کے پاس اس کی ہدایت کے لئے رسول کو بھیجا تھا، فرعون نے اللہ کے رسول کی بات نہ مانی اور وہ بری طرح تباہ ہوا، اگر تمہیں دنیا و آخرت کی مصیبتوں سے بچنا ہے تو اس کی ایک صورت ہے کہ اللہ کے رسول کو مانو اور قرآن کی ہدایت کے موافق چلو، ورنہ قیامت کا دن بڑا ہولناک ہے وہ ضرور آ کر رہے گا۔ بہر حال یہ قرآن اللہ نے تمہارے سمجھانے اور یاد دلانے کے لئے بھیج دیا ہے اور اس میں بھلائی کی ساری باتیں سمجھا دی گئی ہیں، اب جو چاہے اس راستہ کو اختیار کرے اور اپنے رب کی رضامندی حاصل کرے۔ آگے پھر آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا گیا کہ اے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے دیکھ لیا کہ آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے ہمارے حکم کی تعمیل کی اور راتوں کی عبادت میں لگے رہے، کبھی دو تہائی رات کے قریب کبھی آدھی رات اور کبھی ایک تہائی نماز میں کھڑے کھڑے گزار دی، سو اللہ تعالیٰ اب اس شب بیداری کے حکم میں تخفیف فرماتے ہیں۔ اب جتنا جس سے آسانی سے ہو سکے نماز و قرآن رات میں پڑھ لیا کرے اور اس تخفیف کی وجہ یہ ہے کہ اللہ جانتے ہیں کہ تم میں سے بعض کمزور بھی ہوں گے، بعض روزی اور کمائی و فکر میں یا علم دین سیکھنے میں سفر کرتے ہوں گے۔ پھر کچھ لوگ خدا کی راہ میں جہاد کریں گے، ان حالات میں پہلے حکم کی پابندی دشوار ہوگی، اس لئے اس قیام لیل کے حکم میں تخفیف کی گئی مگر فرض نمازوں کا پابندی کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے اور جو کچھ کماؤ اس میں سے مفلسوں اور ناداروں کے لئے کچھ حصہ نکال دو اور حاجتمندوں پر حسب مقدور خرچ کرتے رہو اور یہ سمجھ لو کہ جو کچھ تم دوسروں کی مدد کے لئے خرچ کرو گے یہ گویا اللہ کو قرض دے رہے ہو جسے اللہ تعالیٰ بہت بڑھا چڑھا کر ادا کرے گا اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے رہا کرو، وہ تمہارے قصور معاف کر دے گا کیونکہ وہ غفور الرحیم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

پیار بھرا خطاب:

اس سورت میں یہ پیار بھرا خطاب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے۔ جب آپ پر پہلی پہلی بار غار حراء میں جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آئے تھے تو آپ پر نبوت کی ذمہ داری کا اتنا بوجھ ہوا کہ آپ کو جاڑا لگنے لگا، اور جب آپ اپنی اہلیہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے تو یہ فرما رہے تھے کہ مجھے چادر میں لپیٹ دو، مجھے چادر میں لپیٹ دو۔ اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں محبوبانہ انداز میں آپ کو ''اے چادر میں لپٹنے والے'' کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ دن کو دین کی دعوت دیتے تھے، رات کو نماز میں طویل قیام فرماتے تھے اور اس میں قرآن کی تلاوت فرماتے تھے، بعض اوقات پوری رات کھڑے رہتے، جس سے قدم مبارک میں ورم آجاتا۔ اللہ نے آپ کو اختیار دیا کہ آپ چاہیں تو آدھی رات قیام کریں یا آدھی سے کم یا کچھ زیادہ۔ راتوں کا یہ قیام روحانی تربیت میں بڑا مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

جمہور مفسرین کا قول ہے کہ اس سورت کی ان ابتدائی آیات کے حکم کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ابتدائے اسلام میں پنجگانہ نماز فرض ہونے سے پہلے رات کی عبادت فرض تھی اور یہ حکم قریب ایک برس کے رہا۔ چنانچہ احادیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے اول میں قیام اللیل فرض کر دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم ایک برس تک تہجد کی نماز بطور فرضیت کے ادا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے پیروں پر ورم آ گیا۔ پھر ایک برس کے بعد اس سورت کا آخری حصہ ''**فاقرء وا ماتیسر من القران**'' نازل ہوا، اس سے تخفیف کی گئی اور امت کے لئے یہ حکم فرض نہ رہا، نفل رہ گیا۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:......دستور العمل برائے مبلغ۔

خلاصہ رکوع:۱......(۱) قبل از تبلیغ مبلغ کی تیاری۔(۲) تقسیم اوقات مبلغ۔(۳) مبلغ کا تعلق باللہ۔(۴) تبلیغ کے بعد مخالفین کی بربادی۔ماخذ:(۱) آیت:۲ تا ۴۔(۲) آیت:۶، ۷۔(۳) آیت:۸۔(۴) آیت:۱۱ تا ۱۳۔

خلاصہ رکوع:۲...... چونکہ آپ کی امت کا دائرہ زیادہ وسیع ہونے والا تھا، اس لئے عبادت میں تخفیف کر دی گئی۔ ماخذ: آیت:۲۰۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ المدثر

یہ قرآن کریم کی ۷۴ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے نمبر ۴ پر ہے، اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۵۶ آیات، ۲۵۶ کلمات اور ۱۰۱۴۵ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء ہی ''یا ایھا المدثر'' سے ہوئی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مدثر کہہ کر خطاب فرمایا گیا، مدثر عرب میں اس شخص کو کہتے ہیں جو ایک لمبا چوڑا کپڑا اپنے پہنے ہوئے کپڑوں کے اوپر اوڑھ لے جیسے چادر کمبل، رضائی لحاف وغیرہ جس سے سردی دور ہو سکے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ گھر آ کر حضرت خدیجہ سے فرمایا کہ مجھے گرم کپڑا کمبل وغیرہ اوڑھا دو اور آپ کپڑا اوڑھ کر لیٹ گئے، اس لئے آپ کو ''یا ایھا المدثر'' سے خطاب فرمایا اور اسی مناسبت سے اس سورۃ کا نام سورۂ مدثر قرار پایا۔

ربط:

سورۂ سابقہ میں آپ کا تسلیہ مقصود تھا اور انذار کفار تبعاً مذکور تھا، اس سورۃ میں انذار کفار مقصوداً اور تسلیہ تبعاً ارشاد ہے، یہی وجہ ہے کہ سورۃ سابقہ میں آیات تسلیہ زیادہ اور آیات انذار کم تھیں اور اس سورۃ میں آیات انذار زیادہ اور آیات تسلیہ کم ہیں، اس تقریر سے ربط واضح ہے۔

شان نزول:

احادیث میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو غار حرا میں جہاں آپ خلوت میں عبادت کے لئے کئی کئی دن رات قیام فرماتے۔ سب سے پہلے ۳۰ویں پارہ کی سورۂ علق کی ابتداء کی آیات نازل ہوئیں، اس کے بعد کسی مصلحت وحکمت خداوندی سے کچھ عرصہ تک کوئی وحی نازل نہ ہوئی، اس عرصہ کے بعد ایک مرتبہ دفعتہً ایک میدان میں ایک زور کی آواز آسمان کی طرف سے سنائی دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا تو جبرئیل علیہ السلام اپنی اصل شکل وہیئت میں ایک نورانی تخت پر آسمان وزمین کے درمیان بیٹھے ہیں، یہ پہلی مرتبہ تجلی ملکوت

جب آپ پر ظاہر ہوئی تو آپ کو ہیبت محسوس ہوئی اور آپ گھبرا کر گھر تشریف لے آئے اور حضرت خدیجہ سے فرمایا کہ مجھے گرم کپڑا کمبل وغیرہ اوڑھا دو، چنانچہ آپ کپڑا اوڑھ کر لیٹ گئے اسی حالت میں سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں اور بقیہ سورۃ کا بعد میں نزول ہوا۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کا خاص مضمون کفار و مشرکین کو قیامت و آخرت میں عذاب الٰہی سے ڈرانا ہے، جس میں بتایا گیا کہ جو آیات الٰہی کی مخالفت وانکار کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تکبر اور عناد برتتے ہیں اور قرآن کی حقانیت سے منہ موڑتے ہیں ان کو آخرت میں جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ پھر جہنم کی حقیقت بتلائی گئی کہ وہ کیسی ہولناک ہے اور اس کے عذاب کتنے سخت ہیں اور جن فرشتوں کے ذمہ اس کا انتظام وانصرام ہے وہ کیسے سخت ہیں کہ وہ کسی کی رعایت نہ کریں گے اور نہ کسی پر رحم کریں گے۔ پھر بتلایا گیا کہ جہنم کوئی بے حقیقت یا معمولی چیز نہیں ہے بلکہ بڑے ڈر کی چیز ہے اور جب ان کفار سے جو جہنم میں داخل ہوں گے پوچھا جائے گا کہ تم کن وجوہ سے اس جہنم میں داخل ہوئے؟ تو وہ کہیں گے کہ افسوس ہم دنیا میں ایمان لا کر نہ نماز پڑھنے والوں میں تھے اور نہ غریبوں اور مسکینوں کو کھانا کھلا کر ان پر رحم کرنے والوں میں سے تھے اور ہم ان لوگوں کے ساتھ تھے جنہوں نے دین کا مذاق بنا رکھا تھا اور ہم اس قیامت وآخرت کو جھٹلایا کرتے تھے یہی ہمارے جہنم میں داخل ہونے کی وجوہات ہیں، یہ تمام آخرت میں ہونے والے واقعات بتلا کر اخیر میں نصیحت سے اعراض کرنے والوں کو سمجھایا گیا کہ انہیں کیا ہو گیا کہ وہ نصیحت کی باتوں سے اس طرح بھاگتے ہیں جیسا کہ شیر سے ڈر کر گدھے بھاگتے ہیں۔ بہر حال تمام باتیں صاف صاف سب کو بتلا دی گئیں اور سمجھا دی گئیں، اب خواہ کوئی مانے یا نہ مانے مگر یہ حقیقت ہے کہ جس کے عذاب سے ڈرنا چاہیئے وہ وہی خدا ہے جو لوگوں کے گناہوں اور خطاؤں کو معاف کر دیتا ہے اگر اس سے معافی طلب کی جائے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مضامین:

اس سورہ میں یہ تعلیمات دی گئی ہیں:

◇ رضائے الٰہی کے لئے دعوت حق کی راہ میں صبر وثبات۔

◇ طہارت و پاکیزگی۔

◇ آیات الٰہی کی مخالفت وانکار کرنے والوں میں کبر و نخوت کے کیسے کچھ جراثیم ہوتے ہیں۔ ان کی کس قسم کی سرگرمیاں ہوتی ہیں، اور ان کی سرگرمیوں کے سبب زمین کس طرح فتنہ وفساد کا گہوارہ بن جاتی ہے۔

◇ قیامت کے دن ذلت و نامرادی سے دو چار ہونے والے کیسے لوگ ہوں گے؟ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے معاملہ میں اس کی ذہنیت اور روش کیا ہوتی ہے؟ دین اور اہل دین کے ساتھ ان کا رویہ کیسا ہوتا ہے؟

موضوع سورۃ:......آپ خلق اللہ میں تبلیغ حق فرمائیں، اورمخالفین کی بربادی ہمارے سپرد کردیں (یہ مضمون سورۃ علق، مزمل اور مدثر میں مشترک ہے)۔

خلاصہ رکوع: (۱) آپ تبلیغ حق فرمائیں۔(۲) اور مکذبین کو میرے سپرد کردیں۔ ماخذ: (۱) آیت:۲۔ (۲) آیت:۱۱۔

خلاصہ رکوع:۲......اگر انکار دائمی رہا اور عبادت بدنیہ اور مالیہ سے تنفر رہا تو داخلہ دوزخ یقینی اور نجات ناممکن ہوگی۔ ماخذ: آیت:۴۲ تا ۴۸۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ القیامۃ

یہ قرآن کریم کی ۷۵ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۳۱ ہے، اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۴۰ آیات، ۱۶۴ کلمات اور ۶۸۲ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء ہی ''**لا اقسم بیوم القیامۃ**'' کے جملہ سے ہوئی یعنی قسم ہے قیامت کے دن کی، تو اس سورۃ کی ابتداء قیامت کی قسم سے فرمائی گئی اور بعد میں بھی قیامت کے حالات اور قیامت کے ثبوت میں مختلف دلائل دیئے گئے ہیں، اس مناسبت سے اس سورۃ کا نام سورۂ قیامہ ہوا۔

ربط:

سورۃ سابقہ کے ختم کے قریب ارشاد ہے ''**کلا بلایخافون الآخرۃ**'' اور اس سے پہلے کچھ احوال آخرت بھی مذکور ہیں۔ اس سورۃ میں بھی آخرت کے احوال کی تفصیل ہے اور تبعاً مقدمہ آخرت یعنی موت کے وقت کا بھی حال مذکور ہے، جس سے دونوں سورتوں کا ربط ظاہر ہے۔

شان نزول:

روایت میں ہے کہ ایک کافر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ تم جو ہم کو قیامت آنے سے ڈرایا کرتے ہو تو اس کا کچھ حال تو بیان کرو تا کہ میں سنوں اور دیکھوں کہ میری عقل میں قیامت کا وقوع آتا ہے یا نہیں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ قیامت کا حال اس سے بیان فرمایا کہ جتنے مردہ ہیں سب اس دن زندہ کئے جاویں گے اور جو کچھ دنیا میں کیا ہے اس کا حساب دینا پڑے گا۔ اس پر اس بدنصیب نے کہا کہ یہ ایسی بات ہے کہ اگر میں اپنی آنکھ سے بھی دیکھ لوں تو بھی یقین نہ کروں اور یوں کہوں کہ یہ سب نظر بندی اور خیالات ہیں۔ حقیقت کچھ نہیں، کیا ہزاروں سال کے مردوں کی ہڈیاں جو تمام جہاں میں پھیل چکی ہوں گی ان کو خدا جمع کر کے زندہ کرے گا۔ اس پر یہ سورۃ اس کافر

کے وقوع قیامت کو بعید اور محال جاننے کے رد میں نازل ہوئی۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کا خاص مضمون اثبات قیامت ہے اور ان لوگوں کو خبر دار اور متنبہ کرنا ہے جو قیامت کے قائل نہیں اور دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں، ان کو بتلایا گیا کہ قیامت کا دن بڑے معرکہ کا دن ہے، وہ ضرور آکر رہے گا، اس میں انسان کو ذرا شک وشبہ نہ کرنا چاہئے، انسان یہ گمان کرتا ہے کہ جو مر گیا اور اس کی ہڈیاں گل سڑ گئیں تو خدا ان کو دوبارہ جمع ہی نہیں کر سکتا، حالانکہ اللہ اس پر پوری طرح قادر ہے کہ وہ گلی سڑی ہڈیوں کو جوڑ کر پھر دوبارہ انسان کو جیتا جاگتا کھڑا کردے۔ پھر بتلایا گیا کہ جب قیامت آئے گی تو انسان مارے گھبراہٹ کے جائے پناہ تلاش کرے گا مگر منکرین قیامت کو کہیں جگہ نہیں ملے گی اور اس دن انسان اپنے اعمال کا پھل ونتیجہ دیکھے گا، لہذا منکرین کو چاہئے کہ وہ قیامت کے ماننے میں حیلہ وبہانہ نہ کریں بلکہ اس دن کی آفتوں سے بچنے کی تیاری کریں اور تیاری خدا کو ماننا اور اس کے احکام کو بجالانا ہے۔ اور یہ احکام سب قرآن میں بتلادیئے گئے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا ہے۔ آگے بتلایا گیا کہ منکرین قیامت کے انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ لوگ دنیا کے فائدوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور فوری فوائد کے خواہشمند ہیں، اس لئے آخرت سے غافل ہیں۔ انسان اتنا تو جانتا ہے کہ اسے ایک دن موت سے ضرور واسطہ پڑتا ہے نہ اس سے کوئی خود بچ سکتا ہے، نہ دوسرے کو بچا سکتا ہے بس یہی وہ وقت ہے جب آخرت کی طرف روانگی شروع ہو جائے گی اور آدمی اپنے رب سے ملنے کے لئے ہانک دیا جائے گا لہذا انکار آخرت کا خیال بالکل غلط ہے۔ انسان خود اپنی ہستی اور طریقہ پیدائش کو دیکھے کہ کس طرح ایک قطرہ ناپاک سے اللہ تعالی نے اسے ٹھیک ٹھاک انسان ماں کے پیٹ میں بنایا، پھر مذکر یا مؤنث بنا کر پیدا فرمایا تو جو قدرت والی ذات انسان کو پہلی بار پیدا کر سکتی ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو پھر دوبارہ قیامت میں زندہ کر کے کھڑا کردے اور یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت کی ابتداء میں حق تعالی نے دو چیزوں کی قسم کھائی۔ ایک تو قیامت کے دن کی یعنی جس کا وقوع یقینی ہے اور جس کے صدق پر دلائل قطعیہ قائم ہیں کہ تم مرنے کے بعد یقینا ایک دن زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے اور ضرور بھلے برے کا حساب ہوگا اور جزا وسزا ہوگی۔ دوسرے نفس لوامہ کی قسم کھا کر فرمایا گیا کہ اگر آدمی کی فطرت اور اندرونی ضمیر صحیح ہو تو خود انسان کا نفس دنیا ہی میں برائی اور تقصیر پر ملامت کرتا ہے۔

نفس کے اقسام:

نفس کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) نفس مطمئنہ: نفس اللہ کی عبادت اور فرمانبرداری کی طرف پوری طرح مائل ہو کہ اللہ کی اطاعت میں اس کو خوشی حاصل ہوتی ہو اور شریعت کی پیروی میں چین وسکون محسوس کرتا ہو۔

(۲) نفس امارہ: جو پہلی قسم یعنی نفس مطمئنہ کی بالکل ضد ہے کہ جو دنیا کی ناجائز لذات وخواہشات میں پھنس کر بدی

کی طرف راغب ہو اور شریعت کی پیروی اور پابندی سے بھاگے اور انسان کو برائی کا حکم دے۔

(۳) نفس لوامہ: جب غفلت، لغزش یا گناہ کا صدور ہو تو نفس فوراً اپنے کئے پر پچھتائے اور ملامت کرنا شروع کرے اور اپنی برائی یا کوتاہی پر شرمندہ ہو کر توبہ و استغفار کی طرف مائل ہو جائے۔ ایسا نفس مومنین صالحین کا ہوتا ہے۔

آیت ۴ میں فرمایا گیا ''بلى قادرين على أن نسوي بنانه'' ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی یعنی انسان کی انگلیوں کے پوروں کو درست کر دیں، اس آیت کے تحت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ اپنی تفسیر معارف القرآن میں راقم ہیں:

اگر غور کیا جائے تو شاید ''بنان'' یعنی انگلیوں کے پوروں کی تخصیص میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ حق تعالی نے ایک انسان کو دوسرے انسان سے ممتاز کرنے کے لئے اس کے سارے ہی بدن میں ایسی خصوصیات رکھی ہیں جن سے وہ پہچانا جاتا ہے اور ایک دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے۔ خصوصاً انسانی چہرہ جو چند انچ مربع سے زائد نہیں، اس کے اندر قدرت حق تعالی نے ایسے امتیازات رکھے ہیں کہ اربوں انسانوں میں سے ایک کا چہرہ بھی بالکل دوسرے کے ساتھ ایسا نہیں ملتا کہ امتیاز باقی نہ رہے۔ انسان کی زبان اور حلقوم بالکل ایک ہی طرح ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے ایسے ممتاز ہیں کہ بچے، بوڑھے، مرد، عورت کی آوازیں الگ الگ پہچانی جاتی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز اور تعجب خیز انسان کے انگوٹھے اور انگلیوں کے پورے ہیں کہ ان کے اوپر جو نقش و نگار خطوط کے جال کی صورت میں قدرت نے بنائے ہیں وہ بھی ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ نہیں ملتے۔ صرف ایک یا آدھ انچ کی جگہ میں ایسے امتیازات کہ اربوں انسانوں میں یہ انگلیوں کے پورے مشترک ہونے کے باوجود ایک کے خطوط و نقوش دوسرے سے نہیں ملتے اور قدیم و جدید ہر زمانہ میں نشان انگوٹھا کو ایک امتیازی چیز قرار دے کر عدالتی فیصلے تک اس پر ہوتے ہیں اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ بات صرف انگوٹھے ہی میں نہیں بلکہ ہر انگلی کے پوروں کے خطوط بھی اسی طرح ممتاز ہوتے ہیں۔ یہ سمجھ لینے کے بعد پوروں کے بیان کی تخصیص خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے انسان (جس سے مراد کافر انسان ہے کہ تجھے تو اس پر تعجب ہے کہ یہ انسان دوبارہ کیسے زندہ ہوگا۔ ذرا اس سے آگے سوچ اور غور کر کہ صرف زندہ ہی نہیں ہوگا بلکہ اپنی سابقہ شکل وصورت اور اس کے ہر امتیازی وصف کے ساتھ زندہ ہوگا، یہاں تک کہ انگوٹھے اور انگلیوں کے پوروں کے خطوط پہلی پیدائش میں جس طرح تھے اس نشأۃ ثانیہ میں بھی بالکل وہی ہوں گے۔ فتبارك الله احسن الخالقين۔''

حفظ قرآن کا بڑا اہتمام:

آیت ۱۶ رمیں یہ سورت بتلاتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ حفظ قرآن کا بڑا اہتمام فرماتے تھے اور جبرئیل علیہ السلام کی تلاوت کے وقت اس بات کی شدید کوشش کرتے تھے کہ آپ سے کوئی چیز فوت نہ ہو جائے، اس لئے آپ حضرت جبریل علیہ السلام کی اتباع میں جلدی جلدی پڑھنے اور یاد کرنے کی سعی فرماتے تھے۔ اللہ نے فرمایا کہ آپ اپنے آپ کو

تکلیف میں نہ ڈالیں ۔ میرا یہ وعدہ ہے کہ قرآن میں سے کوئی چیز ضائع نہیں ہوگی، اسے جمع کرنے ،محفوظ کرنے ، باقی رکھنے اور بیان کرنے کا میں خود ذمہ دار ہوں ۔

اس سورت کی آیت ۲۴ سے بتلایا گیا ہے کہ آخرت میں انسان دو فریقوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک طرف سعداء ہوں گے اور دوسری طرف اشقیاء، سعداء کے چہرے روشن ہوں گے اور وہ اللہ تعالی کی زیارت سے مشرف ہوں گے، اشقیاء کے چہرے سیاہ اور بدرونق ہوں گے اور وہ جان لیں گے کہ آج ہمیں جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

اللہ تعالی کا دیدار:

آیت: ۲۳ میں فرمایا ''اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔'' اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ آخرت میں اللہ تعالی کا دیدار ہوگا۔

بخاری و مسلم وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہ ؓ سے نقل کیا گیا ہے کہ لوگوں نے پوچھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہم قیامت میں اپنے رب کو دیکھیں گے؟ آپ نے فرمایا کیا تم آفتاب کو دیکھنے میں - جب کہ بادل نہ ہو- شک کرتے ہو یا کوئی مانع ہوتا ہے۔ عرض کیا کہ نہیں یارسول اللہ۔ پھر فرمایا: کیا چودھویں رات کے چاند دیکھنے میں - جب کہ کوئی حجاب اور بادل نہ ہو- کوئی مانع ہوتا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ۔ آپ نے فرمایا پھر تم اسی طرح قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھو گے۔

صحیح مسلم کی حدیث ہے جو حضرت صہیب رومی ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا کہ جب جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے تو اللہ تعالی ان سے ارشاد فرمائیں گے: کیا تم چاہتے ہو میں تم کو ایک چیز مزید عطا کروں۔ وہ بندے عرض کریں گے آپ نے ہمارے چہرے روشن کئے اور جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کیا، اب اس کے علاوہ کیا چیز ہوسکتی ہے جس کی ہم خواہش کریں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان بندوں کے اس جواب کے بعد اچانک حجاب اٹھ جائے گا پس وہ روئے حق اور جمال الہی کو بے پردہ دیکھیں گے۔ پس ان کا یہ حال ہوگا کہ جو کچھ اب تک انہیں ملا تھا ان سب سے زیادہ محبوب اور پیاری چیز ان کے لئے یہی دیدار کی نعمت ہوگی۔ یہ بیان فرما کر آپ نے سورہ یونس کی آیت ۲۷/ تلاوت فرمائی: للذين أحسنوا الحسنى و زيادة'' (یعنی جن لوگوں نے اس دنیا میں اچھی بندگی والی زندگی گزاری ان کے لئے اچھی جگہ ہے یعنی جنت و مافیہا اور اس پر مزید ایک نعمت ۔ اس مزید ایک نعمت سے مراد مفسرین نے دیدار حق لیا ہے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن)

موضوع سورۃ: ......اثبات قیامت۔

خلاصہ رکوع :۱......(۱) اثبات قیامت بآیات انفس۔ (۲) نقصان انکار قیامت۔ (۳) سبب انکار قیامت۔ (۴) اقسام الناس یوم القیامت۔ ماخذ: (۱) آیت:۱ تا ۴۔ (۲) آیت:۶،۵۔ (۳) آیت: ۲۰، ۲۱۔ (۴)

آیت: ۲۲، ۲۳، ۴۰۔

خلاصہ رکوع: ۲......رفع استبعاد قیامت۔ ماخذ: آیت: ۳۶ تا ۴۰۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الدھر

یہ قرآن کریم کی ۷۶ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۹۸ ہے۔ اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۳۱ آیات، ۲۴۶ کلمات اور ۱۰۹۹ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی پہلی آیت میں لفظ دہر آیا ہے جس کے معنی ہیں زمانہ دراز یا طویل مدت، اس سے سورۃ کا نام ماخوذ ہے۔ نیز اس سورۃ کا نام دہر اس واسطے بھی ہے کہ اس سورۃ کے شروع میں دہر کے باطل عقیدہ کا ذکر فرمایا گیا ہے، دہر کے باطل عقیدہ رکھنے والے جن کو دہریہ کہا جاتا ہے ان کے باطل عقیدہ کا حاصل یہ ہے کہ اس جہاں میں کچھ تجددات اور انقلابات ہو رہے ہیں، سب گردش زمانہ اور آسمان کے ستاروں کے تاثرات سے ہوتے ہیں، بعض وضع وحالت دن رات میں تبدیلی ہو جاتی ہے، بعض مہینہ میں بعض برس میں اور بعض زمانہ دراز میں انقلابات عظیمہ رونما ہو جاتے ہیں، آبادیاں جنگل سے اور جنگل آبادیوں سے، خشکی تری سے اور تری خشکی سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس طرح انسان وحیوان پیدا ہوتے ہیں اور جو پیدا تھے وہ مٹ جاتے ہیں اور ایک نوع بدل کر دوسری نوع بن جاتی ہے، تو اس سورۃ میں اس دہر کے باطل عقیدہ کا رد فرمایا گیا ہے اور توحید کا ثبوت کیا گیا ہے۔

فائدہ:

اس سورۃ کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث ومفسر دہلوی نے لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ اس سورہ کا دوسرا رکوع بلاشبہ مکی ہے، البتہ پہلے رکوع میں احتمال ہے کہ مدنی ہے۔

ربط:

سورۂ سابقہ میں زیادہ تر مجازات کا اثبات اور کچھ مجازات کی تفصیل تھی، اس سورۃ میں زیادہ تر مجازات کی تفصیل ہے، جس میں ترغیب کے لئے جزائے ایمان کا بیان ہے اور اول وآخر میں اس کا کچھ امکان واثبات ہے، اس کے ساتھ ساتھ انسان کا مکلف ہونا بھی ارشاد ہے اور چونکہ کفار کے انکار مجازات سے آپ کو رنج ہوتا تھا اس لئے آپ کی تسلی بھی فرمائی گئی۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں انسان کو بتایا گیا کہ ایک زمانہ اس پر ایسا بھی گزرا کہ جس میں اس کا نام ونشان بھی نہ تھا پھر اللہ نے اسے اپنی قدرت سے رحم مادر میں بنایا اور اسے سننے اور دیکھنے کی قوتیں عطاء فرمائی، ارادہ واختیار دے کر دنیا میں بھیجا تا کہ

اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ اپنی قوتوں سے کام لیتا ہے، پھر اللہ نے اپنی کتابوں اور رسولوں کے ذریعہ آگاہ کر دیا کہ اس دنیا میں کیا اس کے لئے مفید ہے اور کیا مضر ہے، اب جو انسان اپنے اختیار وارادہ سے اللہ کے بتلائے ہوئے مفید کاموں کو دنیا میں کرے گا اور اس کا شکر گزار بندہ بنے گا اسے آخرت میں چین وراحت کی دائمی زندگی نصیب ہوگی اور جو اللہ کی ہدایات کے موافق عمل نہیں کرے گا اسے آخرت میں نہایت تکلیف دہ اور دکھ بھری زندگی نصیب ہوگی اور طوق وزنجیروں میں جکڑ کر اسے جہنم کی آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ جنت کی دائمی نعمتیں انہیں نصیب ہوں گی جو دنیا میں اپنے فرائض کا ذمہ لیتے ہیں اور ان کو بحسن وخوبی ادا کرتے ہیں اور قیامت کی جواب دہی سے ڈرتے ہیں اور خوف کھاتے ہیں اور اللہ کی محبت میں محتاجوں یتیموں اور قید میں پھنسے ہوئے لوگوں کی مدد کرتے ہیں اور اپنے مال میں سے ان کو کھانا کھلاتے ہیں اور یہ کام محض اللہ کی رضا کے لئے کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو اللہ قیامت کی آفات و پریشانیوں سے بچالے گا اور ان کے چہرے خوشی ومسرت سے تر وتازہ ہوں گے۔ اور وہ شاہانہ لباس میں بادشاہوں کی طرح مسہریوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے اور وہاں جنت میں نہ گرمی کی تپش نہ سردی کی شدت ہوگی، سرسبز وشاداب پھلوں سے لدے ہوئے باغات ہوں گے اور خدام ان کی خدمت کے لئے موجود ہوں گے جو طرح طرح کی کھانے اور پینے کی لذیذ چیزیں ان کو پیش کریں گے، وہاں عجیب خوشگوار شربت کے چشمے ہوں گے، الغرض جنتی کو نعمت ہی نعمت اور حکومت کی بڑی شان ہوگی اور ان کو بلایا جائے گا کہ یہ سب بدلہ ہے دنیا میں تمہارے نیکوکار ہونے کا، آگے بتلایا گیا کہ لوگوں کے ایسی بہشت اور جنت میں جانے کا طریقہ یہ ہے کہ دنیاوی زندگی میں کتاب وسنت کی پیروی کریں اور اللہ کے احکام کے مطابق زندگی بسر کریں، اس کی حمد وثنا کرتے رہیں، مگر اکثر لوگ آخرت سے غافل ہوکر دنیا کے ساز وسامان سمیٹنے میں لگے ہوئے ہیں کیونکہ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں دنیا میں ابھی ابھی مل جاتا ہے اور آخرت کس نے دیکھی ہے؟ جب مرکھپ گئے اور مٹی میں مل گئے تو پھر کیسی دوبارہ زندگی۔ اس پر بتلایا گیا کہ انسان کو پہلے بھی اللہ ہی نے پیدا کیا اور جب وقت آئے گا تو پھر ان کو دوبارہ پیدا کر کے اٹھا دینا اس کو کیا دشوار ہے۔ بہرحال کسی پر زبردستی نہیں ہے، اللہ نے قرآن بھیج کر کامیابی کا راستہ دکھلا دیا۔ اب جو چاہے اپنے رب کے راضی کرنے کا راستہ اختیار کرے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کا چاہنا بھی جبھی ہوسکتا ہے جب اللہ چاہے اور وہ ہر ایک کے ظاہر وباطن سے خوب واقف ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ مصلحت کس کام میں ہے، اس کے علم اور حقیقت شناسی کی رو سے وہ جسے چاہتا ہے ہدایت بخش کر اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے اور جس کو چاہے کفر وظلم میں پڑا رہنے دیتا ہے جن کے لئے جہنم کا عذاب تیار ہے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مضامین:

اس سورہ میں یہ تعلیمات وہدایات اور احکام ہیں:

◇ اگر انسان اپنی بناوٹ اور پیدائش پر غور کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ توحید کا اقرار نہ کرے۔

◇ انسان کی فطرت اور وجدان میں حق وہدایت کی معرفت ودیعت کردی گئی۔

◇ آخرت میں انعامات الٰہی سے سرفراز ہونے کے لئے کس قسم کی صفات اپنے اندر پیدا کرنی ضروری ہیں، اور کیسے عمل کی راہ اختیار کرنا لازمی ہے۔

◇ مسلمانوں کو چاہئے کہ صراط مستقیم پر صبر وثبات سے قائم رہیں۔اس کے کسی نافرمان بندے کی پیروی نہ کریں، دن رات حمد وتسبیح کرتے رہیں، شب کے کسی نہ کسی حصہ میں درگاہ الٰہی پر سجدہ ریز ہوا کریں۔(خلاصہ مضامین قرآنی)

موضوع سورۃ:......نفی دہریت۔

خلاصہ رکوع :۱......(۱) اثبات صانع۔(۲)اقسام الانس۔(۳) قائلین صانع کے اوصاف۔(۴)اور ان کی جزائے اعمال۔ماخذ:(۱) آیت:۱۔(۲) آیت:۳۔(۳) آیت:۷ تا۱۰۔(۴) آیت:۱۱ تا ۱۲۔

خلاصہ رکوع :۲......(۱) مسلک مطیعین صانع۔(۲) بیان عجز المخلوقات۔ ماخذ: (۱) آیت: ۲۴ تا ۲۶۔(۲) آیت:۲۸۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ المرسلت

یہ قرآن کریم کی ۷۷ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۳۳ پر ہے، اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۵۰ آیات، ۱۸۱ کلمات اور ۸۴۶ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورہ کی ابتداء ہی ''والمرسلات عرفا'' سے ہوئی ہے اس سے سورۃ کا نام ماخوذ ہے۔

ربط:

سورۃ سابقہ میں قیامت کا وقوع اور تفصیل اسباب وکیفیات مجازات مذکور تھی، اس سورۃ میں بھی یہی مضمون ہے۔بس اتنا فرق ہے کہ وہاں ترغیب کا مضمون تھا اور یہاں ترہیب کا مضمون ہے، اس وجہ سے اس سورۃ میں دس جگہ ''ویل للمکذبین'' مذکور ہے اور چونکہ متعلق تکذیب متعدد ہے اس لئے معنیً تکرار نہیں ہے۔

فائدہ:

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم منیٰ کے غار میں تھے جب یہ سورہ اتری، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تلاوت فرمارہے تھے اور میں یہ سن کر یاد کررہا تھا، ناگہاں ایک سانپ ہم پر کودا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے مارو، ہم جھپٹے لیکن وہ نکل گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری سزا سے وہ بچ گیا جیسا کہ تم اس کی برائی سے محفوظ رہے۔روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہونے والی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کا مضمون بھی قیامت و آخرت ہے اور قسمیہ کلام کے ساتھ فرمایا گیا کہ قیامت ضرور واقع ہوکر رہے گی، جب کہ پہلے ساری دنیا فنا ونیست و نابود ہوجائے گی۔ آسمان پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، پہاڑ فضا میں اڑتے پھریں گے، پھر سب حساب و کتاب کے لئے دوبارہ زندہ کئے جاویں گے، تمام رسول مقررہ وقت پر اپنی اپنی امتوں کو لے کر دوبارہ اللہ رب العزت کے حضور حاضر ہوں گے، یہ سب باتیں قیامت کے دن کے لئے اٹھا کر رکھ دی گئی ہیں اور وہی فیصلہ کا دن ہے جس میں انسان کے اعمال کا فیصلہ ہوگا۔ اس لئے انسان کا کام یہی ہے کہ دنیا میں اللہ کو اس کی قدرت کاملہ کے نمونوں سے پہچانے، جس نے انسان کو پیدا کیا، زمین کو بنایا اور پہاڑوں سے اسے مضبوط کیا اور اس میں طرح طرح کی نعمتیں انسان کے لئے رکھ دی اور اگر انسان نے اللہ کی باتوں کو جھٹلایا اور اس کے رسولوں کی تکذیب کی تو ایسے منکر کو سخت سزا ملے گی، جہنم میں اسے داخل کیا جائے گا، یہاں آرام وراحت کی کوئی صورت نہ ہوگی بلکہ طرح طرح کے عذاب اور دکھ ہوں گے، آگ کے بڑے اونچے اونچے شعلے اس میں نکل رہے ہوں گے اور اس دن کوئی عذر یا بہانہ نہ سنایا جائے گا، اس لئے اس دن کے عذاب سے اگر بچنا چاہتے ہوتو اللہ کی فرمانبرداری اختیار کرو، اس دن فرمانبردار بندے سرسبز باغات، خوشگوار چشموں کے درمیان ہر طرح کی راحت ولطف اٹھا رہے ہوں گے، کھانے پینے کے لئے ہر قسم کے میوے و پھل موجود ہوں گے اور ان سے کہہ دیا جائے گا کہ خوب کھاؤ پیو، یہ اس کا بدلہ ہے کہ جو تم نے دنیا میں اللہ کی فرمانبرداری اختیار کی، لیکن اس دن ان لوگوں کی جنھوں نے اللہ کے احکام کو دنیا میں جھٹلایا تھا بری شامت آئے گی کہ ان کا یہ دنیوی عیش بس چندروزہ ہے۔ افسوس کہ ان لوگوں سے لاکھ کہا کہ اللہ کے آگے سر جھکاؤ، اس کے احکام کو بجالاؤ مگر ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی، اس قدر صاف صاف اور واضح باتوں کے بعد اب انہیں کن باتوں کا انتظار ہے جنہیں یہ مانیں گے۔

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

یوم الفصل:

قیامت کے دن کو اللہ نے ''یوم الفصل'' کہا کیونکہ اس دن مخلوق کے درمیان عدل وانصاف پر مبنی فیصلہ کیا جائے گا، قیامت کو یوم الفصل قرار دینے کے بعد اسے جھٹلانے کے بارے میں اللہ فرماتے ہیں: **''ویل یومئذ للمکذبین۔''** (اس دن جھٹلانے والوں کی تباہی ہے) یہ آیت اور یہ الفاظ اس سورت میں دس بار آئے ہیں، اس تکرار کا مقصد تخویف اور ترہیب ہے۔ علاوہ ازیں یہ سورت مجرمین سابقین کا ذکر کرتی ہے جنہیں اللہ نے تباہ وبرباد کردیا اور مخاطبین سے سوال کرتی ہے کہ کیا ہم نے تم کو حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟ پھر مختلف مراحل سے گزار کر خوبصورت انسان بنادیا، بعث بعد الموت کے بعض حسی دلائل بھی یہاں مذکور ہیں، جن سے ثابت کیا گیا ہے کہ وہ اللہ جو زمین کو مردوں اور زندوں کو سمیٹنے والی بنا سکتا ہے اور میٹھے پانی سے سیراب کرسکتا ہے وہ دوبارہ زندہ بھی کرسکتا ہے۔

اگلی آیات میں مکذبین اور متقین کے الگ الگ انجام کا بیان ہے۔ملزمین کو بھڑکتی ہوئی آگ کی طرف لے جایا جائے گا۔اور متقین کو ٹھنڈے سائے اور بہتے چشموں کے پاس جگہ دی جائے گی۔آخری آیات میں دوبارہ مجرموں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ کھا پی لو!اور تھوڑے سے مزے اڑالو!بالآخر تمہارے لیے ہلاکت اور تباہی کے سوا کچھ نہیں۔(خلاصۃ القرآن)

موضوع سورۃ:......مسئلہ مجازاۃ۔

خلاصہ رکوع:۱......(۱) اثبات مجازاۃ ۔(۲) تشریح یوم المجازاۃ۔(۳) نتائج قبیحہ منکرین یوم المجازاۃ۔ ماخذ: (۱) آیت:۱ تا ۷۔(۲) آیت:۸ تا ۱۵۔(۳) آیت:۲۹ تا ۴۰۔

خلاصہ رکوع:۲......(۱) یوم المجازاۃ کے ماننے والوں کی جزائے خیر۔(۲) اعادہ انذار۔ ماخذ: (۱) آیت:۴۱ تا ۴۴-(۲) آیت:۴۶ تا ۵۰۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

انتیسویں پارے کے چند اہم فوائد

(۱) رسولوں کی تکذیب کفر ہے اور موجب عذاب ہے، اسی طرح ان کے بعد علماء کی تکذیب بھی رسولوں کی تکذیب کی طرح ہے۔ اس لئے کہ عذاب کا سبب اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت نہ کرنا ہے۔

(۲) سننے، دیکھنے اور دل کی نعمت پر خاص طور پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ یہ ہی ایمان اور طاعات کی رغبت دلانے والے ہیں۔

(۳) بہت زیادہ قسمیں کھانا، طعنے دینا، چغلیاں لگانا، بھلائی سے روکنا، زیادتی کرنا۔ یہ نافرمانوں کی عادات ہیں، اہل ایمان کی نہیں۔

(۴) نعمتوں کی کثرت اور مصائب دونوں کے ذریعے بندے کو آزمایا جاتا ہے، خوش بخت انسان وہ ہے جو نعمتوں پر شکر اور مصائب پر صبر کرے۔

(۵) اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی دنیا وآخرت دونوں میں عذاب کا باعث بنتی ہے۔

(۶) دنیا آخرت کی کھیتی ہے جو شخص دنیا میں جیسا عمل کرے گا وہ آخرت میں اس کا ثمرہ خیر یا شر کی صورت میں پائے گا۔

(۷) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے اعراض اور مال کے جمع کرنے میں بہت زیادہ مشغولیت بعض اوقات سلب ایمان کا سبب بن جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ اللہ کے بارے میں، اس کی آیات میں اور اس کی ملاقات میں شک کرنے لگتا ہے۔

(۸) دعا میں پسندیدہ یہ ہے کہ پہلے اپنے لئے دعا مانگے اور پھر دوسروں کے لئے۔

(۹) اللہ کے راستے پر استقامت اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت دنیا وآخرت میں خیر کثیر اور سعادت کاملہ کا باعث ہے۔

(۱۰) گناہ کے ہو جانے پر استغفار کرنا واجب ہے اور پسندیدہ عمل یہ ہے کہ تمام اوقات میں ہی استغفار کی کثرت کرے۔

***

پارہ:۳۰
سورۃ النباء

یہ قرآن کریم کی ۷۸ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۸۰ ہے۔ اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۴۰ آیات، ۱۷۴ کلمات اور ۸۰۱ حروف ہیں۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء ''**عم یتسائلون عن النباء العظیم**'' سے ہوئی، نبا کے معنی خبر کے ہیں اور نبا عظیم کے معنی ہیں بڑی خبر چونکہ اس سورۃ میں قیامت کے وقوع کی خبر اور واقعات جزاوسزا کا بیان فرمایا گیا ہے جو کہ خبر عظیم ہے، اس مناسبت سے اس کا نام سورۃ النباء مقرر ہوا۔

ربط:

اس سورۃ میں سورۃ سابقہ کی طرح قیامت کا امکان وقوع اور واقعات جزاء وسزا مذکور ہیں، جس سے دونوں سورتوں کے درمیان ربط ظاہر ہے۔

شان نزول:

روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد کفار اہل مکہ کو قیامت کی خبر دی کہ ایک دن وہ آنے والا ہے جس میں یہ دنیا بالکل ختم اور فنا کر دی جائے گی اور پھر تمام انسان دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جاویں گے اور ان کو ان کے نیک و بد اعمال کی سزا ملے گی، نیک اعمال کی جزا میں لوگ جنت میں جائیں گے اور برے اعمال کی سزا میں جہنم میں ڈالے جاویں گے۔ جنت میں ہر طرح کا راحت وآرام ہوگا اور جہنم میں ہر طرح کے مصائب اور عذاب وتکالیف ہوں گے، ان باتوں کو کفار مکہ سن کر استہزاء وانکار کے طور پر آپس میں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ سے سوال کرتے کہ ہاں صاحب وہ قیامت کب آئے گی اور اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے، یہ کیونکر ہوگا کہ بوسیدہ ہڈیاں پھر زندہ ہوں گی، منکرین قیامت کے ان سوالات اور تعجب پر اس سورۃ کا نزول ہوا۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کا مرکزی مضمون قیامت، حشر ونشر اور جزاء وسزا کے متعلق ہے۔ کفار ومشرکین جو قیامت وآخرت کے منکر تھے ان کے شک وتردد وانکار کی تردید فرمائی گئی اور پھر اللہ کی چند قدرتوں کے بیان کرنے کے بعد قیامت کے واقع ہونے کی دلیل دی گئی کہ جب اللہ رب العزت اپنی قدرت سے پانی کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے تو انسانوں کو زندہ کرنا

اس کی قدرت کے لئے کیا مشکل ہے؟ پھر قیامت کے دن کے کچھ احوال بیان فرمائے گئے کہ اس دن آسمان پھٹ جائے گا اور پہاڑ روئی کی طرح ہوا میں اڑتے پھریں گے، تو جب ایسی سخت اور مستحکم چیزوں کا یہ حال ہوگا تو دوسری چیزیں کس شمار میں ہیں اور دنیا کی کوئی مضبوط سے مضبوط چیز کسی کو پناہ نہ دے سکے گی۔ پھر منکرین قیامت کے لئے جہنم کے سخت ترین عذابوں کا ذکر فرمایا گیا، ان کے برخلاف جو لوگ دنیا میں اللہ سے ڈرتے رہے اور اس کے احکام کی پیروی کرتے رہے، ان کے لئے جنت کی طرح طرح کی نعمتیں ہوں گی، پھر قیامت کے دن اللہ کی جلال و بزرگی اور بڑائی کا حال بیان فرمایا گیا کہ اس دن بلا اجازت کسی کو زبان کھولنے کی ہمت نہ ہوگی اور فرشتے بھی صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ اس دن انسان وہ سب کچھ دیکھ لے گا جو اس نے موت سے پہلے دنیا کی زندگی میں کیا ہوگا، اس دن کفار و منکرین قیامت میں اپنی بدحالی کو دیکھ کر تمنا کریں گے۔ کاش وہ مٹی ہوتے اور عذاب آخرت سے بچ جاتے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مشرکین مکہ استہزاء اور تمسخر کے طور پر مرنے کے بعد زندہ ہونے کو اور قرآن کریم کو ''**النبأ العظيم**'' یعنی ''بڑی خبر'' کہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعی بڑی اور عظیم الشان خبر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے منہ کی بات لے کر فرمایا کہ اس ''بڑی خبر'' پر تعجب یا انکار کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تمہیں عنقریب اس کی حقیقت کا علم ہو جائے گا۔ پھر اس پر کائناتی شواہد پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ آسمان و زمین اور ان میں موجودہ چیزیں جن کی تخلیق انسانی نقطہ نظر سے زیادہ مشکل اور عجیب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب کی تخلیق فرمائی ہے اور ایسی طاقت و قدرت رکھنے والے اللہ کے لئے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ چنانچہ اپنی عظیم الشان قدرت کے دلائل میں نو باتیں فرمائی ہیں:

(۱) ''**الم نجعل الأرض مهدا**'' یعنی اے انسانو! کیا ہم نے زمین کو تمہارے لئے فرش نہیں بنایا کہ جس پر سکون واطمینان سے رہ سکو۔

(۲) ''**والجبال اوتادا**'' یعنی کیا ہم نے پہاڑوں کو میخوں کے مانند نہیں بنایا کہ اپنے بوجھ اور بھاری پن سے زمین کو ملنے نہیں دیتے۔

(۳) ''**وخلقنكم أزواجا**'' یعنی اے بنی آدم ہم نے تم کو جوڑے جوڑے پیدا کیا، مرد کا جوڑا عورت اور عورت کا جوڑا مرد۔

(۴) ''**وجعلنا نومكم سباتا**'' اور ہم نے تمہاری نیند کو تمہارے لئے راحت بنا دیا۔ اگر انسان رات میں یا دن میں اچھی طرح نہ سوئے تو دیکھئے حضرت انسان کی کیا حالت ہوتی ہے۔

(۵) ''**وجعلنا الليل لباسا**'' اور رات کو ہم نے پردہ کی چیز بنایا، گو اس میں کوئی بھلائی کرتا ہے کوئی برائی۔ چور رات کو چوری کرتا ہے اور عابد و زاہد نماز تہجد اور مراقبہ ذکر میں بیٹھا رہتا ہے۔

(۶) ''**وجعلنا النهار معاشا**'' اور ہم نے دن کو تمہاری روزی کے لئے بنایا تا کہ تم دن کے اجالے میں کام دھندا

کرسکو، کہیں آ جا سکو۔

(۷)''و بنینا فوقکم سبعا شدادا'' اور ہم ہی نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے کہ جن میں آج تک باوجود اس مدت گزرنے کے کوئی رخنہ نہیں پڑا۔

(۸)''وجعلنا سراجا وھاجا'' اور ہم نے چمکتا ہوا چراغ بھی بنا دیا، یعنی سورج کو بنایا جو تمام جہان کو روشن کر دیتا ہے اور دنیا کو منور کر دیتا ہے اور ہر چیز کو جگمگا دیتا ہے۔

(۹)''وانزلنا من المعصرات ماء ثجاجا لنخرج به حبا ونباتا وجنت الفافا'' اور ہم نے پانی بھرے بادلوں سے کثرت سے پانی برسایا تاکہ ہم اس پانی کے ذریعہ سے غلہ وسبزی اور گنجان باغ پیدا کرلیں۔

پھر ان کے اعتراض کہ اگر یہ برحق بات ہے تو آج مردے زندہ کیوں نہیں ہوتے۔ جواب میں ارشاد فرمایا: ہر چیز کے ظہور پذیر ہونے کے لئے وقت متعین ہوتا ہے۔ وہ چیز اپنے موسم اور وقت متعین میں آموجود ہوتی ہے۔ مرنے کے بعد زندہ ہونے کا ''موسم'' اور وقت متعین یوم الفصل (فیصلہ کا دن ہے) لہذا یہ کام بھی اس وقت ظاہر ہو جائے گا۔ پھر جہنم کی عبرتناک سزاؤں اور جنت کی دل آویز نعمتوں کے تذکرہ کے بعد اللہ تعالی کے جاہ وجلال اور فرشتوں جیسی مقرب شخصیات کی قطار در قطار حاضری اور بغیر اجازت کسی قسم کی بات کرنے سے گریز کو بیان کر کے بتایا کہ آخرت کے عذاب کی ہولناکی اور خوف کافروں کو یہ تمنا کرنے پر مجبور کر دے گا کہ کاش ہم دوبارہ پیدا ہی نہ کئے جاتے اور جانوروں کی طرح پیوند خاک ہو کر عذاب آخرت سے نجات پا جاتے۔

کسی کو اللہ کے سامنے تاب گویائی نہ ہوگی:

سورت کے اختتام پر بتایا گیا ہے کہ قیامت کا دن برحق ہے، اس کے وقوع میں کوئی شک نہیں، باوجود اللہ کے بے حد مہربان اور رحمن ہونے کے کسی کو اللہ کے سامنے تاب گویائی نہ ہوگی، اس دن ہر شخص کا اعمال نامہ اس کے سامنے کر دیا جائے گا اور اس کے بارے میں قطعی فیصلہ سنا دیا جائے گا، اس فیصلہ کو سن کر کافر یہ تمنا کرے گا اے کاش! میں مٹی ہوتا۔ (۳۹۔۴۰)

مٹی ہونے کا مطلب:

مٹی ہونے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔

دوسرا یہ کہ میں تکبر نہ کرتا اور مٹی کی طرح مسکینی اور عاجزی اختیار کرتا۔

تیسرا مطلب یہ کہ میں انسان نہیں حیوان ہوتا اور مجھے بھی حیوانوں کی طرح دوبارہ زندہ کرنے کے بعد مٹی بنا دیا جاتا، یوں میں دوزخ کے عذاب سے بچ جاتا۔

یہ تمنا اس وقت کرے گا جب وہ دیکھے گا کہ ویسے تو انسانوں کی طرح حیوانوں کو بھی زندہ کیا گیا۔ لیکن انہیں زندہ

کرنے کے بعد اوران کے باہمی معاملات طے کرنے کے بعد انہیں مٹی بن جانے کا حکم دے دیا گیا۔(خلاصہ مضامین قرآن کریم،خلاصۃ القرآن)

موضوع سورۃ:...... یوم المجازات کی تشریح کا شتکاروں کے اصول پر۔

خلاصہ رکوع:۱......(۱) جس طرح کھیتی مقصود بالذات ہوتی ہے اور کاشتکاری کے آلات بالتبع مہیا کیے جاتے ہیں، اسی طرح اس نظام عالم میں فقط انسان مقصود ہے، اور بقیہ نظام اس کے تابع۔(۲) جس طرح کھیتی کے لیے ایک یوم الفصل ہوتا ہے جس میں اناج اور بھوسہ الگ کیا جاتا ہے، اسی طرح یہاں ایک یوم الفصل ہونا چاہیے، جس میں دونوں قسم کے انسانوں کو جدا جدا کیا جائے۔ ماخذ؛(۱) آیت:٦ تا١٦۔(۲) آیت:١٧۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ والنازعات

یہ قرآن کریم کی ۷۹ ویں سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۸۱ ہے۔اس سورۃ میں ۲ رکوع، ۴٦ آیات، ۱۸۱ کلمات اور ۷۹۱ حروف ہیں۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کا پہلا لفظ و النازعٰت ہے، جس کے معنی ہیں قسم ہے کھینچنے والوں کی، اکثر مفسرین نے وہ فرشتے مراد لئے ہیں جو کافروں کی جان سختی سے نکالتے ہیں۔اس ابتدائی لفظ کی مناسبت سے اس سورۃ کا نام نازعت ہے۔

ربط:

سورۃ سابقہ کی طرح اس سورۃ میں بھی واقعات اور ”انتم اشد خلقا“ میں اور ”ھل اتاک“ الآیہ میں مکذبین کی تخویف اوران کی تکذیب پر آپ کا تسلیہ مذکور ہے۔

شان نزول:

ہٹ دھرم معاند اور ضدی کفار اپنی عقل کے آگے فرمودۂ خلاق عالم کو کچھ بھی خیال میں نہ لاتے تھے۔ حالانکہ قیامت کا حادثہ بار باران کو قرآن سے سنایا جاتا تھا اور قدرت خداوندی سے ان کو آشنا کرایا جاتا تھا، مگر وہ معاند کفار جب بھی کہتے یہی کہتے کہ ہماری سمجھ میں تو قیامت کا آنا ٹھیک معلوم نہیں ہوتا، اس لئے اس سورۃ کو نازل فرما کر بتا کید اثبات قیامت فرمایا۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کا اصل مضمون آخرت و قیامت سے متعلق ہے، قرآن کریم کی نظر میں انسان کی تمام بڑی خرابیوں کی جڑ آخرت کا انکار یا اس سے غفلت ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کی دعوت کا ایک بڑا حصہ ثبوت آخرت، اس کے مناظر و حالات

اور وہاں پیش آنے والے واقعات سے متعلق ہے، یہ سورۃ اس مکی دور میں نازل ہوئی جب کفار مکہ کو دوبارہ زندہ ہونے اور آخرت کے قائم ہونے سے بڑا تعجب ہورہا تھا اور وہ اس حقیقت کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے، اس سورۃ میں قسمیہ کلام کے ساتھ فرمایا گیا کہ قیامت ضرور آئے گی اور جس روز آئے گی تو زمین پر لگا تار زلزلے آئیں گے اور دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہوجائے گا، اس دن دل لرز رہے ہوں گے، آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی، یہ منکرین آج یقین نہیں کرتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ میاں مرجانے اور ہڈیاں گل سڑ جانے کے بعد کیا کوئی زندہ ہوا ہے، یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے؟ ہم تو اس کو نہیں مانتے کہ اس زندگی کے بعد کوئی دوسری بھی زندگی ہے، چنانچہ ایسے لوگوں کے لئے فرعون کا ذکر کیا گیا کہ پچھلی تاریخ گواہ ہے کہ خدا کے باغیوں اور حق کے مخالفوں کو بڑی بڑی سزائیں بھگتنا پڑیں اور بتلایا گیا کہ فرعون باوجود اپنی انتہائی طاقت وقوت وحکومت وسلطنت کے اس کو کس طرح منہ کی کھانی پڑی اور وہ کس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ناکام رہا، اس کو انکارِ حق کی یہ سزا ملی کہ سمندر میں اپنے لاؤ لشکر سمیت ڈوب کر ہلاک ہوا اور آخرت میں عذاب جہنم علیحدہ اس کے لئے تیار ہے۔ اس واقعہ سے منکرین کو سمجھایا گیا کہ وہ فرعون کے انجام سے عبرت حاصل کریں اور آخرت و قیامت کے منکر نہ بنیں، جس قدرت والے خدا نے اتنا بڑا عظیم الشان آسمان بنا کر کھڑا کر دیا اور زمین و پہاڑ، میدان، چاند سورج پیدا کئے تو اس کے نزدیک دوبارہ انسانوں کو پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ اخیر میں بطور قطعی فیصلہ کے سنایا گیا کہ جس نے دنیا میں اللہ اور اس کے رسول کے فرمان واحکام کو نہ مانا اور سرکشی و بناوٹ کی اور دنیاوی زندگی کا متوالا بنا رہا تو اس کا ٹھکانا مرنے کے بعد جہنم ہے۔ اس کے برخلاف جو دنیا میں اللہ سے ڈرا اور ڈر کر گناہوں اور نافرمانیوں کو اس نے چھوڑ دیا، تو ایسے شخص کا ٹھکانہ مرنے کے بعد جنت ہے، لہذا یہ لوگ قیامت کو بعید نہ سمجھیں، جس روز میں اسے دیکھیں گے تو یہ خیال کریں گے کہ وہ دنیا میں صرف ایک صبح یا ایک شام رہے، یعنی اس وقت قیامت کو اتنا جلد آنے والا خیال کریں گے مگر پھر اس وقت کا سمجھنا کچھ کام نہ آئے گا۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

موضوع سورۃ:......مجازاۃ۔

خلاصہ رکوع:۱......رفع استبعاد قیامت۔ ماخذ: آیت:۱ تا ۶، ۱۵۔

ان دو مثالوں سے انقلاب فوری شخصی دکھایا گیا ہے، پہلی میں انسان کے دم نکلتے ہی ایک آن واحد میں سب چیز اس کے قبضہ سے نکلی جاتی ہے، یہ جسمانی انقلاب ہے، اور دوسری مثال میں ایک روحانی فوری انقلاب دکھایا گیا ہے، تو جس طرح انقلاب شخصی شب وروز دیکھتے ہو، انقلاب نوعی یا انقلاب عالم کو اسی پر قیاس کرلو۔

خلاصہ رکوع:۲......(۱) رفع استبعاد قیامت اور (۲) قیامت میں انسانوں کی دو قسمیں ہوں گی۔ ماخذ: (۱) آیت: ۲۷ تا ۳۳۔ (۲) آیت: ۳۷ تا ۴۱۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ عبس

قرآن کریم کی ۸۰ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزولی کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۲۴ ہے، اس سورۃ میں ایک رکوع، ۴۲ آیات، ۱۳۳ کلمات اور ۵۵۳ حروف ہیں۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء "عبس و تولی" سے ہوئی، عبس کے معنی ہیں اس نے تیوری چڑھائی، وہ ترش رو ہوا، وہ چیں بجبیں ہوا، چونکہ اس سورۃ کے نزول کا سبب ہی عبوس تھا جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہوگا۔ اس لئے اس سورۃ کا نام ہی عبس مقرر ہوا۔

ربط:

پہلی سورۃ کی طرح اس سورۃ میں بھی قیامت کا مضمون زیادہ ہے اگرچہ اور مضامین بھی مذکور ہے۔ مگر مضمون قیامت سے دونوں سورتوں میں ارتباط ظاہر ہے۔

فائدۃ:

اس سورۃ کا ایک نام سورۃ السفرۃ اور ایک نام سورۃ الاعمیٰ بھی ہے۔

شان نزول:

روایت میں ہے کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں تشریف رکھتے تھے اور آپ کے پاس سرداران قریش و روساء مشرکین جیسے عتبہ بن شیبہ اور ربیعہ بن شیبہ، ابوجہل بن ہشام، امیہ بن خلف وغیرہ بیٹھے تھے اور آپ ان کو دین اسلام کی خوبی اور شرک و بت پرستی کی برائی سمجھا رہے تھے اور کمال توجہ سے ان کے ساتھ باتوں میں مشغول تھے، اتنے میں ایک نابینا صحابی ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آئے اور قطع کلام کر کے اپنی طرف متوجہ کرنے لگے اور کہنے لگے یا رسول اللہ فلاں آیت کس طرح ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بے وقت و بے محل سوال سے ناگواری ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف التفات نہ فرمایا، اس حال میں اس سورۃ کی یہ ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ روایت میں آتا ہے کہ جوں جوں آپ حضرت جبرئیل کی زبان سے ان آیات کو سنتے جاتے تو آپ خوف زدہ ہوتے جاتے، یہاں تک کہ "کلا انھا تذکرہ" جب آپ نے سنا تو آپ سمجھ گئے کہ یہ خفگی محض نصیحت کے واسطے ہے۔ از راہ مہربانی و عنایت ہے، ان آیات کے نزول کے بعد آپ حضرت ابن ام مکتوم کے گھر تشریف لے گئے، ان سے اپنا عذر بیان فرمایا اور ان کو لے کر گھر تشریف لائے اور اپنی چادر مبارک بچھا کر اس پر ان کو بٹھایا اور ہمیشہ ان کا اکرام فرماتے رہے۔

خلاصہ سورۃ:

ابتداء میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کے واقعہ کا ذکر فرمایا گیا، اس کے بعد ہدایت فرمائی گئی کہ جو طالب صادق بن کر حاضر خدمت ہو اور دین کو اخلاص کے ساتھ حاصل کرنا چاہے، ایسا شخص التفات اور توجہ کا مستحق ہے بہ نسبت ان مغرور اور متکبر اشخاص کے جو اپنے غرور و شیخی کی وجہ سے حق کی پرواہ نہیں کرتے، ایسے لا پرواہ اور متکبروں کے اسلام قبول کر لینے کی فکر میں اس قدر انہماک کی ضرورت نہیں کہ سچے طالب آپ کی توجہ سے محروم رہ جائیں۔ اس کے بعد قرآن کریم کی بڑائی بیان فرمائی گئی کہ یہ نعمت عظمی اللہ نے محض اپنے فضل سے اپنے بندوں کے لئے اتاری ہے، تو چاہئے کہ اس کی طرف پوری توجہ کی جائے، پھر مغرور انسانوں کے غرور کو باطل کرنے کے لئے بتلایا گیا کہ انسان ایک نہایت ہی حقیر چیز یعنی قطرہ منی سے پیدا کیا گیا، پس جب انسان کی اصل قطرہ منی ہے تو اس کو کہاں زیب دیتا ہے اور یہ انسان کی نہایت درجہ کمینہ حرکت ہے کہ اس قدر محتاج و بے بس ہونے کے باوجود اپنے منعم حقیقی کا شکر ادا نہ کرے اور احسان فراموش ہو، اس کے بعد حق تعالی نے اپنی چند ظاہری نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے جن کے بغیر انسان کی زندگی ممکن نہیں تاکہ یہ نعمتیں حق شناسی اور ایمان کا باعث ہوں، اس کے بعد قیامت کا ذکر فرمایا جاتا ہے کہ اس وقت ان کفار کو ناشکری کا مزہ معلوم ہو جائے گا، اس دن نفسی نفسی کا عالم ہوگا، خواہ دنیا میں کسی کا کوئی کیا قریبی و عزیز ہوگا اس دن کوئی کسی کے کام نہ آئے گا، ماں باپ بیوی حتی کہ اولاد سب آنکھیں پھیر لیں گے، اس دن صرف اعمال رفیق ہوں گے، جن لوگوں کے پاس اعمال صالحہ ہوں گے، وہ اس دن ہشاش بشاش ہوں گے اور فاسق و فاجر اور کافر و منکر اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے ظلمت میں ڈوبے ہوئے ہوں گے اور ان کے چہروں پر کدورت اور سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ اس سورۃ میں انسان کی ابتدائی حالت حیات و ممات اور آخرت کی کیفیت اور جزا و سزا کا نقشہ مختصر اور دلکش پیرایہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

مدینہ کا والی:

مذکورہ واقعہ کے بعد جب بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو دیکھتے تو ان کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے، یہ ہیں وہ جن کی وجہ سے اللہ نے مجھے تنبیہ فرمائی تھی اور ان سے دریافت فرماتے کہ کوئی کام ہے تو بتاؤ۔ آپ نے نابینا ہونے کے باوجود دو غزوات کے موقع پر انہیں مدینہ پر والی مقرر فرمایا۔

قرآن کی صداقت اور حقانیت کی دلیل:

یہ واقعہ اس جیسے دوسرے واقعات جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہ فرمائی گئی ہے، ان کا قرآن کریم میں مذکور ہونا اس کی صداقت و حقانیت کی دلیل ہے۔ اگر معاذ اللہ! قرآن آپ کا خود تراشیدہ کلام ہوتا تو آپ ایسی آیات اس میں ہرگز ذکر نہ فرماتے جن میں خود آپ سے باز پرس کی گئی ہے، حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ ذکر کرنے کے بعد یہ سورت انسان کے ناشکرا ہونے کو بتاتی ہے جو اپنی اصل کو بھول کر اللہ کے سامنے سرکشی اختیار کرتا ہے۔ (۱۷۔۲۰)

اگلی آیات میں رب تعالی کی قدرت اور وحدانیت کے تکوینی دلائل ہیں۔(۲۴۔۳۲)

نفسا نفسی کا عالم:

اور اختتام پر قیامت کا وہ ہولناک منظر بیان کیا گیا ہے جب انسان خوفزدہ ہو کر قریب ترین رشتوں کو بھی بھول جائے گا،نفسا نفسی کا عالم ہوگا۔کسی کو کسی کی فکر نہیں ہوگی،ہر کسی کو اپنی ذات کا غم کھائے جارہا ہوگا،بہت سے چہروں پر کامیابی کی چمک ہوگی اور بے شمار چہروں پر ناکامی کی ذلت اور تاریکی چھائی ہوگی۔(۳۳-۴۲)(خلاصۃ القرآن)

موضوع سورۃ:......مساوات في التعليم۔

خلاصہ رکوع:۱......(۱)تعلیم دین میں دنیادار کی رعایت نہیں ہونی چاہئے۔(۲)صحف قرآن کا رتبہ۔(۳)ابتداء خلقت اور(۴)انتہائے زندگی اور معاشرت کی ضروریات جب ایک طریقہ سے پوری ہوتی ہیں،جن سے امیر وغریب یکساں نفع اٹھاتے ہیں،تو تعلیم میں کیوں مساوات نہ ہو۔ماخذ:(۱)آیت:۵۔(۲)آیت:۱۱تا۱۴۔(۳)آیت:۱۸۔(۴)آیت:۲۱۔(۵)آیت:۲۴تا۴۲۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورة التكوير

یہ قرآن کریم کی ۸۱ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۷ ہے۔اس سورۃ میں ایک رکوع، ۲۹ آیات، ۱۰۴ کلمات اور ۴۳۶ حروف ہیں،یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء''اذا الشمس كورت''سے ہوئی کہ جب سورج لپیٹ دیا جائے گا یعنی وہ بے نور ہو جائے گا۔اس جملہ سے سورۃ کا نام ماخوذ ہے۔

ربط:

اس سورۃ میں بھی قیامت کے واقعات کا بیان کرنا مقصود ہے اور آخر میں قرآن کریم کی حفاظت کا تذکرہ ہے،تاکہ لوگ قیامت کی تیاری کریں۔

فائدة:

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص چاہے کہ قیامت کے دن کو دنیا میں آنکھوں سے دیکھے تو اس کو چاہئے کہ وہ یہ تین سورتیں پڑھے اذا الشمس كورت، اذا السماء انفطرت، اذا السماء انشقت ایک روایت میں ہے کہ ایک روز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ آپ پر اس قدر جلد بڑھاپے کے آثار کیوں ظاہر ہو گئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے ان پانچ سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔سورہ ہود،

سورۂ واقعہ، سورہ والمرسلات، سورۂ عم یتسائلون اور سورۂ اذا الشمس کورت۔ ان سورتوں میں منکرین اور مخالفین پر عذاب الٰہی کا ذکر ہے، مجھ کو اس کے سننے سے اپنی امت کا غم ہوتا ہے اور غم کی خاصیت یہ ہے کہ آدمی کو بوڑھا کر دیتا ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کا مرکزی مضمون آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دینا ہے اور آخرت پر یقین یہ اسلام کی جان ہے، قرآن میں بار بار اس کا ذکر آتا ہے تاکہ مؤمن کے ذہن سے کسی وقت آخرت کا تصور اوجھل نہ ہونے پائے۔ اس سورہ میں قیامت و آخرت کے مناظر نہایت مؤثر انداز میں بیان فرمائے گئے۔ بتلایا گیا ہے کہ دنیوی زندگی ناپائیدار ہے اور یہ کارخانہ عالم ایک دن درہم برہم ہو کر فنا ہونے والا ہے، کائنات کا یہ سارا نظام الٹ پلٹ ہو جائے گا اور خدا کی عدالت میں سب کو حاضر ہونا ہے، جب کہ انسانوں کے تمام اعمال کی پوچھ گچھ ہوگی اور اس کے نتیجہ میں انسانوں کا گروہ دو حصوں میں بٹ جائے گا، ایک وہ جن کے لئے جنت ہوگی، دوسرے وہ جن کے لئے جہنم ہوگی۔ اب وہ کفار و منکرین جو قیامت اور آخرت کا مذاق اڑاتے ہیں ان کو قسمیہ کلام کے ساتھ بتلایا گیا کہ تم سے جو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کہہ رہے ہیں، یہ عین حقیقت کے مطابق ہے، ان باتوں میں نہ کسی جنون کو دخل ہے اور نہ شیطانی اثر کو، یہ سب باتیں دو جہاں کے مالک کی طرف سے ہیں اور بالکل سچ ہیں، جو اس کی ہدایت پر چلے گا اسے آخرت میں جنت ملے گی اور جو نہیں مانے گا اسے جہنم میں جانا پڑے گا۔ یہ قرآن سارے جہان والوں کے لئے نصیحت ہے جو سیدھی راہ چلنا چاہے اس سے فائدہ اٹھالے۔

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

قیام قیامت اور حقانیت قرآن اس کے مرکزی مضامین ہیں۔ قیامت کے دن کی شدت اور ہولنا کی ہر چیز پر اثر انداز ہوگی۔ سورج بے نور ہو جائے گا، ستارے دھندلا جائیں گے، پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے، پسندیدہ جانوروں کو نظر انداز کر دیا جائے گا، جنگی جانور جو علیحدہ علیحدہ رہنے کے عادی ہوتے ہیں یکجا جمع ہو جائیں گے، پانی اپنے اجزائے ترکیبی چھوڑ کر ہائیڈروجن اور آکسیجن میں تبدیل ہو جائے گا، جس کی وجہ سے سمندروں میں آگ بھڑک اٹھے گی۔ انسان کا سارا کیا دھرا اس کے سامنے آجائے گا۔

آیت ۱۵ / سے کائنات کی قابل تعجب حقیقتوں کی قسم کھا کر بتایا گیا ہے کہ جس طرح یہ چیزیں ناقابل انکار حقائق پر مبنی ہیں، اس طرح قرآنی حقیقت کو بھی تمہیں تسلیم کر لینا چاہئے۔

آیت ۱۹ سے قرآن کریم کے اللہ رب العزت سے چل کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچنے تک کے تمام مراحل کو انتہائی محفوظ اور قابل اعتماد ہونے کو بیان کرتے ہوئے واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ قرآن کریم دنیا جہاں کے لئے بلا کسی تفریق و امتیاز کے اپنے دامن میں نصیحت و ہدایت کا پیغام لئے ہوئے ہے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

موضوع سورۃ:...... (۱ تا ۹) بذریعہ قرآن منزل من اللہ علم الٰہی اس دن کام آئے گا جس دن یہ واقعات ظہور پذیر

ہوں گے۔

خلاصہ رکوع:۱...... نبی کے پاس علم کس طرح آتا ہے،اور کہاں سے آتا ہے۔ماخذ: آیت:۱۹، ۲۰۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃالانفطار

یہ قرآن کریم کی نمبر ۸۲ کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول اس کا ۸۲ ہے۔اس سورۃ میں ایک رکوع،۱۹ آیات،۸۰ کلمات،۳۳۴ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

اس سورۃ کی ابتداء''اذا السماء انفطرت" سے ہوئی ہے یعنی جب آسمان پھٹ جائے گا،انفطار کے معنی پھٹ جانے کے ہیں۔اس سورۃ میں قیامت کے دن آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر ہے،اس مناسبت سے سورۃ کا نام سورہ انفطار رہوا۔

ربط:

اس سورۃ میں سابقہ سورۃ کی طرح قیامت ومجازاۃ کا بیان ہے اور درمیان میں غفلت پر تنبیہ ہے،جس سے ماقبل سے اس کا ربط واضح ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کا بھی مرکزی مضمون قیامت وآخرت اور وہاں کی جزاوسزا سے متعلق ہے،اس دنیا میں انسان کی اصلاح کے لئے قیامت وآخرت پر ایمان لانے کی اسلام کی نظر میں بڑی اہمیت ہے، اس لئے قرآن کریم کثرت سے قیامت و آخرت کا ذکر کرتا ہے اور بار بار وہاں کے حالات کا نقشہ پیش کرتا ہے تا کہ انسان کو اس حقیقت کا پورا یقین ہوجائے اور یہ وہ اچھی طرح سمجھ لے کہ ایک دن ایسا آتا ہے جب کہ دنیا کا یہ سارا نظام درہم برہم ہوکر از سرنو ترتیب دیا جائے گا،اس دن انسان کے اچھے برے اعمال سب سامنے رکھ دیئے جاویں گے، اگر کسی کے ذہن میں اعمال کی جزاوسزا کا یقین نہ ہوتو انسان اس دنیا ہی کی لذت اور عیش وآرام کا فریفتہ ہوکر اپنے پیدا کرنے والے اور منعم حقیقی کو نہ صرف بھول جاتا ہے بلکہ اس کا نافرمان اور باغی ہوجاتا ہے۔چنانچہ اس سورۃ میں پہلے قیامت کے بعض حالات کی طرف اشارہ ہے، پھر فرمایا گیا کہ یہی وہ دن ہوگا جب ہر شخص کو یہ معلوم ہوجائے گا کہ دنیا میں اس نے جو کچھ کیا تھا اس کا انجام کیا ہوا۔پھر انسان کو غفلت پر تنبیہ کی گئی کہ یہ دنیا میں خود بخود نہیں آ گیا بلکہ اس کا پیدا کرنے والا ہے وہی اس کی پرورش کرتا ہے اور اس کے فرشتے ہر وقت اس کے پاس رہتے ہیں اور اس کے اقوال وافعال کا ایک تفصیلی ریکارڈ تیار کررہے ہیں جو قیامت کے دن جانچا جائے گا،اگر اس کے اعمال میں ایمان اور عمل صالح موجود ہے تو اس کا شمار نیک لوگوں میں ہوگا اور جنت میں داخل کرایا

جائے گا جہاں وہ ہمیشہ آرام میں رہے گا اور جس کے اعمال نامہ میں ایمان اور عمل صالح نہ ہوگا وہ بدکار شمار ہوگا اور جہنم میں اس کا ٹھکانہ ہوگا، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ طرح طرح کے عذاب بھگتتے رہیں گے، اس وقت ہر ایک کا فیصلہ اللہ عزوجل کے ہاتھ میں ہوگا اور وہاں صرف اللہ ہی کا حکم چلے گا۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

خلاصہ رکوع:......(۱) اپنے بنانے والے سے تمہیں تعلق بگاڑنا نہ چاہئے، ورنہ یوم المجازاۃ میں بھلائی کی کوئی امید نہیں۔ (۲) تعلق باللہ خراب ہونے کی حالت میں کوئی معین و ناصر نہیں ہوگا۔ ماخذ: (۱) آیت:۶۔ (۲) آیت:۱۹۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ التطفیف

یہ قرآن کریم کی ۸۳ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار ۸۶ ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۳۶ آیات، ۲۷ کلمات اور ۵۸۷ حروف ہیں۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

اس سورۃ کی ابتداء میں "ویل للمطففین" آیا ہے، جس کے معنی ہیں: بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے۔ اس مناسبت سے اس سورۃ کا نام المطففین یا سورۂ تطفیف ہوا۔

ربط:

اس سورۃ میں بھی سابقہ سورہ کی طرح اعمال کے بدلہ کا بیان ہے اور ان میں سے بعض حقوق العباد سے تعلق رکھنے والے اعمال کو بیان فرمایا ہے بالخصوص ناپ تول میں کمی کرنا۔ لہذا مضمون مجازاۃ اس سورۃ اور سابقہ سورۃ میں مشترک ہے، جس سے ربط ظاہر ہے۔

شان نزول:

مدینہ میں ایک شخص تھا جس کو ابوجہینہ کہتے تھے، وہ اپنے پاس دو صاع رکھتا تھا، ایک بڑا؛ جس سے وہ دوسروں سے مال لیتا تھا اور ایک چھوٹا؛ جس میں سے ناپ کر وہ بیچتا تھا، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں بعض اعمال و حقوق العباد جو فطرت کے مناسب تھے ان کو بیان کرنے کے بعد بتلایا گیا کہ جو لوگ حقوق العباد تلف کرتے ہیں ان کے لئے سخت سزا ہے، کیونکہ حقوق العباد کے متعلق فرمایا گیا کہ ان کو کیا معلوم نہیں کہ ایک روز زندہ ہو کر خدا کے دربار میں سب اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ انسان جو کچھ کر رہا ہے اسے فرشتے برابر لکھ رہے ہیں، جب وہ مر جائے گا تو اس کا اعمال نامہ ایک محفوظ جگہ رکھ دیا جائے گا، وہ جگہ بدکاروں کے لئے تحسین اور نیکوکاروں کے لئے علیین ہے پھر نیک و بد دونوں کے انجام کا مقابلہ کیا گیا اور تصویر کے دونوں رخ انسان کے سامنے رکھ دیئے گئے، اب یہ فیصلہ کرنا

اس کا کام ہے کہ وہ کس رخ پر اپنی زندگی کو ڈھالتا ہے۔ پھر تفصیل کے ساتھ نیک لوگوں کی ان نعمتوں کو ذکر فرمایا جوان کو آخرت میں دی جائیں گی تا کہ نیک اعمال کی رغبت ہو۔ اخیر میں منکرین کی اس روش کا ذکر ہے جو وہ مؤمنین کا مذاق اڑاتے ہیں، ان کو بتلایا گیا کہ وہ وقت بھی آنے والا ہے جب یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ کون احمق اور بے وقوف تھا اور کون اس قابل تھا کہ اس کی ہنسی و مذاق اڑایا جائے۔ اس طرح آخرت کے انجام کو نہایت مؤثر پیرایہ میں سامنے رکھا گیا۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

''تطفیف'' کا معنی ہے ناپ تول میں کمی کرنا، ارشاد ہوتا ہے: ''بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔''

بعض حضرات نے تطفیف کا دائرہ وسیع کر دیا ہے، امام قشیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تطفیف وزن اور کیل میں بھی ہوتی ہے۔ عیب کے ظاہر کرنے اور چھپانے میں بھی، انصاف کے لینے اور دینے میں بھی، جو شخص اپنے لیے تو پورا پورا انصاف چاہتا ہے مگر دوسروں کے ساتھ انصاف نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں ''مطفف'' ہے۔

وعید کے مستحق:

یونہی جو شخص اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہ چیز پسند نہیں کرتا جو اپنے لیے پسند کرتا ہے، اسی طرح جو شخص لوگوں کے عیب دیکھتا ہے مگر اپنے عیب نہیں دیکھتا۔ اسی طرح جو لوگوں سے اپنے حقوق مانگتا ہے لیکن ان کے حقوق ادا نہیں کرتا، تو یہ سب لوگ اس وعید کے مستحق ہیں جو وعید یہاں مطففین کے لیے بیان ہوئی ہے۔

ایک بدو اور عبدالملک بن مروان:

ایک بدو نے عبدالملک بن مروان سے کہا:

قرآن کریم میں مطففین کے لیے بڑی وعید ہے تو تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے کہ تم لوگوں کے اموال بلا ناپ تول کے ہتھیا لیتے ہو۔

اللہ کے نور کو بجھانے والے:

''مطففین'' کی مذمت کے بعد ان سیاہ دلوں اور بدکاروں کا انجام بتایا ہے جو اللہ کے نور کو بجھانے کے لیے سرتوڑ کوشش کرتے ہیں۔ (۷۔۱۷)

پھر ان کے مقابلے میں ان صلحاء اور ابرار کا تذکرہ ہے جنہیں آخرت میں دائمی نعمتیں میسر آئیں گی (۲۲۔۲۸)

دنیا میں مذاق:

سورت کے اختتام پر بتایا گیا ہے کہ یہ سیاہ دل، دنیا میں اللہ کے نیک بندوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے لیکن قیامت کے دن معاملہ الٹ ہو جائے گا اور نیک لوگ ان بدکاروں کا مذاق اڑائیں گے۔ (۲۹۔۳۶) (خلاصۃ القرآن)

خلاصہ رکوع:......وعید تطفیف ۔(تطفیف سے مراد اپنا حق پورا کر لینا اور دوسرے کا حق دیتے وقت نقصان پہنچانا ہے)۔ ماخذ: آیت: ۱ تا ۳۶۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الانشقاق

یہ قرآن کریم کی ۸۴ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار ۸۳ ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۲۵ آیات، ۱۰۸ کلمات اور ۴۴۸ حروف ہیں۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء میں لفظ **اذاالسماء انشقت** واقع ہوا ہے کہ انشقاق کے معنی ہیں پھٹ جانا، اس میں آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر ہے۔ اس لئے اس سورۃ کا نام انشقاق ہوا۔

ربط:

مجازات اعمال کا مضمون سورہ سابقہ اور اس سورۃ میں مشترک ہے جس سے تناسب ظاہر ہے۔

خلاصہ سورۃ:

دوسری مکی سورتوں کی طرح اس سورۃ میں بھی ابتداء قیامت کے بعض حالات کا نقشہ کھینچا گیا اور اس حقیقت کو یاد دلایا گیا کہ ہر انسان اس دنیا میں جو کچھ کر رہا ہے اس کا بدلہ اسے آخرت میں ضرور مل کر رہے گا۔ اور دنیوی اعمال کے نتائج میں آخرت میں کامیابی اور ناکامی کے اس نقشہ کو سامنے رکھ دیا گیا ہے جو قرآن کی دعوت کی اصل روح ہے کہ آخرت میں جس کا اعمال نامہ داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کامیاب و کامران ہوگا اور جس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو اس کو جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ انسان جس غفلت کی وجہ سے اس بربادی کا آخرت میں شکار ہوگا یعنی انکار آخرت اس پر اسے متنبہ کیا گیا۔ پھر بظاہر قدرت کی نیرنگیوں کو بطور دلیل کے پیش کر کے بتایا گیا کہ انسان کی حالت میں تبدیلیاں آتی ہیں اور یہ موجودہ حالات بھی لازماً بدلیں گے۔ دنیا کا موجودہ کارخانہ سب درہم برہم ہو جائے گا۔ قیامت ضرور آئے گی اور آج جو باتیں انسان کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں وہ سب سامنے آ جائیں گی، جب یہ حقیقت ہے تو کیا وجہ ہے کہ انسان اپنے حالات میں تبدیلی نہ کرے اور اپنے آپ کو اس حقیقی مالک کی اطاعت و فرمانبرداری میں نہ لگا دے۔ اخیر میں کافروں اور مؤمنوں کے انجام کو مختصر الفاظ میں دہرایا گیا ہے۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

آیت ۱۶ سے قسمیں کھا کر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ تم سب ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف چڑھتے جاؤ گے۔ یعنی کبھی بچپن، کبھی جوانی، کبھی بڑھاپا، اسی طرح سوچوں اور فکروں میں تبدیلیاں ہوتی رہیں گی۔ اس کے باوجود بھی یہ لوگ آخر ایمان کیوں نہیں لاتے اور قرآن سن کر سجدہ ریز کیوں نہیں ہو جاتے۔ درحقیقت ان تمام جرائم کے پیچھے عقیدۂ آخرت اور

یوم احتساب کا انکار کار فرما ہے۔ چنانچہ فرمایا ایسے افراد کو دردناک عذاب کی بشارت سنا دیجئے۔ اس سے وہی لوگ بچ سکیں گے جو ایمان اور اعمال صالحہ پر کاربند ہوں گے، ان کے لئے بھی منقطع نہ ہونے والا اجر وثواب ہے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

خلاصہ رکوع......یوم المجازاۃ میں اعطائے صحف کی تشریح۔ ماخذ: آیت: ۷ تا ۱۳۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورۃ البروج

یہ قرآن کریم کی ۸۵ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے نمبر ۲۷ پر ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۲۲ آیات، ۱۰۹ کلمات اور ۴۵۷ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کا نام سورہ بروج اس وجہ سے مقرر ہوا کہ اس میں آسمان کے برجوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ بروج برج کی جمع ہے، جس کے معنی قلعہ، مضبوط عمارت اور بلند عمارت کے ہیں۔ یہاں بروج سے مراد یا تو وہ بارہ بروج ہیں جن کو آفتاب ایک سال کی مدت میں طے کرتا ہے یا آسمانی قلعہ کے وہ حصہ ہیں جن میں فرشتے پہرہ دیتے ہیں یا بڑے بڑے ستارے مراد ہیں جو دیکھنے میں آسمان پر معلوم ہوتے ہیں۔

ربط:

اس سے قبل کی سورۃ میں کفار اور مؤمنین کی سزا و جزا کا ذکر تھا۔ اس سورۃ میں کفار کے مسلمانوں کے خلاف معاملات میں مسلمانوں کو تسلی دی جارہی ہے اور اس کے بعد کفار کو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔

شان نزول:

آفتاب نبوت طلوع ہونے کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی دعوت عام لوگوں کو دینا شروع کی تو قریش مکہ کو یہ بات سخت ناگوار ہوئی، چونکہ یہ ان کے قدیمی دین ودستور کے خلاف تھی، جس کی وجہ سے انہوں نے مسلمان ہونے والے حضرات کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنانا شروع کر دیا اور کوئی جبر وتشدد ایسا نہ چھوڑا جس کا مظاہرہ مسلمانوں پر نہ کیا ہو۔ غریب مسلمانوں نے آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی اور فرمایا کہ عنقریب کفار کا زور ٹوٹ جائے گا اور یہ تمہارے آگے ذلیل ومغلوب ہوں گے۔ اس پر کفار تمسخر کرنے لگے، چنانچہ اللہ رب العزت نے کفار کو ان کے ظلم وستم پر متنبہ کرنے اور مسلمانوں کو تسلی دینے کی خاطر یہ سورۃ نازل فرمائی۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں منکرین کے لئے سخت تنبیہ ہے اور ان کو برے انجام سے ڈرایا گیا ہے ساتھ ہی مسلمانوں کو تسلی دی گئی اور بتلایا گیا کہ جو لوگ ایمان والوں کو ظلم وستم کا نشانہ بناتے ہیں آخرکار وہ خود ہلاکت وبربادی سے دوچار ہوتے ہیں اور اس کے لئے تاریخی شہادت کے طور پر اصحاب الاخدود کا ذکر فرمایا اور فرعون اور اس کے لشکر اور قوم ثمود کا ذکر فرمایا جس سے

کفار مکہ کو یہ جتلانا مقصود ہے کہ اللہ پر ایمان رکھنے والے مرد اور عورتوں کو صرف ان کے ایمان کی وجہ سے ستانا یہ ستانے والوں کی تباہی کا باعث ہوتا ہے، وہ دنیا میں اگر بچ بھی گئے تو آخرت میں وہ جہنم میں جلیں گے اور جو ایمان والے صبر وتحمل کے ساتھ ایمان پر قائم رہتے ہیں وہ جنت میں داخل ہو کر ہمیشہ آرام کی زندگی گزاریں گے۔ منکرین کو بتلایا گیا کہ خدا کی گرفت بڑی سخت ہے، وہ بڑی قدرت والا ہے اور مالک ومختار ہے اس کی گرفت سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ اخیر میں بتلایا گیا کہ قرآن جو کچھ ہمیں پیش کر رہا ہے وہ بالکل حقیقت ہے۔ اس کے جھٹلانے سے قرآن کو کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا، اس کی شان بہت بڑی ہے، وہ لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے جہاں سے کسی کی مجال نہیں کہ اسے مٹا سکے۔

فائدہ:

اصحاب الاخدود یعنی خندق والے جنہوں نے بڑی بڑی خندقیں کھود کر آگ سے بھریں اور بہت سے ایندھن ڈال کر ان کو دہکایا اور ایمان والوں کو اس میں ڈالا وہ ملعون ومغلوب ہوئے۔

کون تھے، کس ملک اور کس زمانہ میں تھے، ان کا مذہب کیا تھا؟ اس سلسلہ میں مفسرین نے کئی واقعات ذکر کئے ہیں، ایک واقعہ نجران میں ہوا، ایک مرتبہ شام میں، ایک مرتبہ فارس میں، بعض نے ایک مرتبہ حبشہ میں بھی نقل کیا ہے۔ تمام قصوں کا حاصل ایک ہی نکلتا ہے کہ نزول قرآن سے قبل ایک مشرک اور یہودی بادشاہ نے ایک حق پرست اور توحید الٰہی سے سرشار جماعت کو بت پرستی یا باطل پرستی پر مجبور کیا اور جب انہوں نے اس کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا تو ظالم اور جابر بادشاہ نے ان کو آگ میں جھونک کر زندہ جلا دیا، مگر نتیجہ کے اعتبار سے حق پرست جماعت کے حصہ میں کامرانی اور ہمیشہ کی فلاح آئی اور ظالم وباطل کوش جماعت دنیا میں بھی خائب وخاسر ہوئی اور آخرت میں ابدی جہنم کی مستحق ہوئی۔ تو نزول قرآن کے وقت اہل عرب ان میں سے کسی واقعہ سے ضرور آگاہ ہوں گے اس لئے کفار مکہ کو یہ آیات سنائی گئیں۔

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سلطنت حمیر کا آخری بادشاہ:

صحیح مسلم میں ''خندقوں والے'' قصہ کی نسبت حمیر کے بادشاہوں میں سے آخری بادشاہ ''ذونواس'' یہودی کی طرف کی گئی ہے جو مشرک تھا اور اس نے ایسے بیس ہزار افراد کو خندقوں میں ڈال کر زندہ جلا دیا تھا جو عیسائی بن گئے تھے اور انہوں نے خدا پرستی چھوڑ کر بت پرستی کرنے سے انکار کر دیا تھا، اسی طرح صحیح مسلم وغیرہ میں ساحر، راہب اور غلام کا قصہ بھی منقول ہے، جب ایک نوجوان لڑکے کی استقامت دیکھ کر ہزاروں لوگوں نے ایمان قبول کر لیا اور بادشاہ وقت کی دھمکیوں کے باوجود وہ ایمان سے باز نہ آئے تو ان سب کو خندقوں میں دہکتی ہوئی آگ کے حوالے کر دیا گیا۔ (۱۔۹)

مذہبی اور نظریاتی اختلافات:

تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ایسے کئی واقعات کا پتہ چلتا ہے جب مذہبی اور نظریاتی اختلافات کی بنا پر مخالفین نے ایک

دوسرے کو زندہ جلا دیا، آج کی دنیا جسے اپنے مہذب، ماڈرن اور ترقی یافتہ ہونے پر بڑا ناز ہے، خطرناک بم مسلمانوں پر استعمال کر رہی ہے جو دیکھتے ہی دیکھتے پوری پوری بستی اور شہر کو جلا کر راکھ کر دیتے ہیں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی میں جو کچھ ہوا کیا یہ آگ کی خندقوں سے کم تھا؟ ہمارے سامنے افغانستان اور عراق میں جو آگ جلائی گئی کیا یہ آگ ذونواس کی آگ سے کم درجہ کی تھی؟ نہیں اس کی آگ سے کئی گنا زیادہ مہلک اور خطرناک آگ تھی، جس کا نشانہ کلمہ پڑھنے والے نوجوانوں، بوڑھوں، بچوں، مردوں اور عورتوں کو بنایا گیا، فلسطین میں کیا ہو رہا ہے؟ آگ ہی تو ہے جو مسلمانوں پر برسائی جا رہی ہے اور پورے پچاس سال سے مسلسل برسائی جا رہی ہے، عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ کیسے بیس ہزار افراد کو زندہ جلا دیا گیا۔ ایسے لوگوں کو وعید سنائی گئی ہے ''جن لوگوں نے مسلمان مردوں اور عورتوں کو ستایا پھر توبہ نہ کی تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور جلنے کا عذاب ہے۔'' (۱۰)

سورت کے اختتام پر اللہ کی عظمت اور انتقام کی قدرت کا بیان ہے، اس کی پکڑ بڑی سخت ہے، وہ جب کسی کو اپنے عذاب کی گرفت میں لے لے تو اسے کوئی نہیں چھڑا سکتا۔ فرعون کا انجام اس دعوی کی دلیل اور اس پر گواہ ہے۔ (۱۲۔۲۰) (خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورۃ: ...... خدا پرستوں کی دل آزاری کرنے والے گرفت الٰہی سے بچ نہیں سکتے۔ ماخذ: آیت: ۱۰۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الطارق

یہ قرآن کریم کی ۸۶ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار ۳۶ ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۱۷ آیات، ۶۱ کلمات اور ۲۵۴ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء والسماء والطارق سے فرمائی گئی، طارق کے معنی ہیں جو چیز رات کو نمودار ہو، اس سے مراد روشن ستارے ہیں، اس مناسبت سے اس سورۃ کا نام الطارق ہے۔

ربط:

سابقہ سورۃ میں مؤمنین کی تسلی کے ساتھ کفار کو وعید کی گئی تھی، اس سورۃ میں تحقیق وعید کے لئے اعمال کا محفوظ رہنا اور بعث کا امکان اور وقوع و بعث کی دلیل یعنی قرآن کریم کا حق ہونا مذکور ہے اور سورہ سابقہ کے اخیر میں بھی حقیقت قرآن کا مضمون تھا۔ جس سے دونوں سورتوں کے درمیان ربط و تناسب واضح ہے۔

شانِ نزول:

لکھا ہے کہ ایک رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابو طالب کے پاس بیٹھے تھے، اچانک ایک تارا ٹوٹا اور آگ کا ایک شعلہ اس سے ظاہر ہوا۔ ابو طالب ڈرے اور پوچھا: یہ کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ ستارہ ہے جو آسمانوں سے شیطانوں کو ہنکاتا ہے اور یہ قدرت الٰہی کی نشانی ہے، پس اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام یہ سورۃ لے کر نازل ہوئے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں بتلایا گیا کہ دنیا میں جو کچھ انسان کرتا ہے اور جب وہ وقت آئے گا کہ قیامت قائم ہوگی تو اس کے سامنے اس کا اعمال نامہ پیش کر دیا جائے گا اور اگر اس کو قیامت میں شبہ ہوا اور اس کی سمجھ میں نہ آئے کہ مرنے کے بعد انسان پھر دوبارہ زندہ کر کے کھڑا کر دیا جائے گا۔ تو انسان اپنی پہلی پیدائش پر غور کرے کہ جس نے اسے ایک ناچیز قطرہ منی سے انسان بنا کر پیدا کر دیا یقیناً اسی طرح وہ خالق اسے دوبارہ بھی زندہ کر سکتا ہے، پھر قیامت کے دن انسان کی وہ ساری باتیں جنہیں وہ چھپ کر کیا کرتا تھا اور چھپا کر رکھا کرتا تھا وہ سب ظاہر ہو جائیں گی اور اس دن مجرموں کو سزا سے بچانے کے لئے کوئی حمایتی اور مددگار نہ ملے گا اور قیامت کے منکرین اپنے اعمال کے نتائج سے غافل ہو کر دین حق کی مخالفت میں جو دن رات جوڑ توڑ کر رہے ہیں اور اس طرح کی تدابیر کر رہے ہیں تو وہ یہ یاد رکھیں کہ حق تعالیٰ کی تدبیریں بھی کام کر رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ اللہ کی تدبیروں کے آگے ان کے چھل پٹے اور تدبیریں نہ چل سکیں گی اور انہیں ان کے کئے کی سزا مل کر رہے گی۔ ہاں جو تھوڑے دنوں کی انہیں مہلت ملی ہوئی ہے وہ ملی ہوئی ہے۔ واللہ اعلم!

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت کا مرکزی مضمون مرنے کے بعد زندہ ہونے کا عقیدہ ہے۔ ستاروں کی قسم کھا کر بتایا گیا ہے کہ جس طرح نظام شمسی میں ستارے ایک محفوظ و منضبط نظام کے پابند ہیں اسی طرح انسانوں کی اور ان کے اعمال کی حفاظت کے لئے بھی فرشتے متعین ہیں۔ مرنے کے بعد کی زندگی پر دلیل کے طور پر انسان کو اپنی تخلیق اول میں غور کی دعوت دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ جب اللہ ایک نطفہ سے جیتا جاگتا انسان بنا سکتا ہے تو وہ اللہ اسے دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔

آیت ۱۱ سے اللہ تعالیٰ نے پانی بھرے آسمان کی اور پھوٹ پڑنے والی زمین کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ قرآن کریم حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے والی کتاب ہے۔ کافر سازشیں کر رہے ہیں اور اللہ ان کا توڑ کر رہے ہیں، لہٰذا انہیں مہلت دے دو اور یہ اللہ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکیں گے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

خلاصہ سورۃ:......رفع استبعاد قیامت۔ ماخذ: آیت: ۶ تا ۸۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

* * *

سورۂ اعلیٰ

یہ قرآن کریم کی ۸۷ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۸ ہے، اس سورۃ میں ایک رکوع، ۱۹ آیات، ۲۷ کلمات اور ۲۹۹ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورہ کی ابتداء ''سبح اسم ربک الاعلی'' سے ہوئی ہے، یعنی اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آپ اور جو مومن آپ کے ساتھ ہیں اپنے پروردگار عالی شان کے نام کی تسبیح کیجئے۔ لفظ اعلیٰ کے معنی ہیں سب سے برتر، غالب، سب سے اوپر۔ عالیشان یہ اللہ کی ایک صفت ہے۔ اسی مناسبت سے اس سورۃ کا نام اعلیٰ ہوا۔

ربط:

سورۂ سابقہ میں مجازات آخرت کا ذکر تھا اس سورۃ میں بھی اصل مقصود یعنی فلاح آخرت کا مقصود ہونا اور اس کا طریقہ تسبیح اور معرفت ذات وصفات وتزکیہ وذکر وصلوۃ بتلانا مقصود ہے اور مقصودیت آخرت کی تقریر کے لئے دنیا کا فانی ہونا اور اس کا اضمحلال اور طریقہ فلاح کی تعلیم کے لئے امر تذکیر بالقرآن کا ارشاد ہے اور اسی کے قریب قریب غرض سے سورۂ سابقہ میں بھی حقانیت قرآن بیان کی گئی تھی، جس سے دونوں سورتوں کا ربط ظاہر ہے۔

شان نزول:

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پے در پے قرآنی سورتیں نازل ہونا شروع ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ خیال گزرا کہ میں خود پڑھا لکھا نہیں ہوں، ایسا نہ ہو کہ ان میں سے کوئی چیز بھول جاؤں، اس لئے اس سورۃ میں حق تعالی سبحانہ نے آپ کی تسلی فرمائی کہ آپ نہیں بھولیں گے، اس واسطے حدیث شریف میں ہے کہ آپ اس سورۃ کو بہت محبوب رکھتے اور وتر کی پہلی رکعت اور عیدین و جمعہ میں اکثر پہلی رکعت میں یہ سورۃ اور دوسری رکعت میں سورہ غاشیہ تلاوت فرماتے تھے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں پہلے اللہ تعالی کی تسبیح کا حکم دیتے ہوئے رب قدیر کی بعض قدرتوں اور ان انعامات کا بیان ہے جو انسان کی جسمانی اور روحانی تربیت کے لئے اللہ نے فراہم کئے ہیں۔ جس سے یہ تعلیم مقصود ہے کہ انسان اپنی پرورش اور تربیت کا احساس کر کے اپنے خالق اور رب کا شکر گزار بندہ بنے، توحید ربانی کا اقرار کرے اور قرآنی ہدایت کے مطابق دنیوی زندگی بسر کرے، اپنا تزکیہ نفس کرے اور اللہ کی مقرر کی ہوئی عبادات کو بجالائے، ایسے ہی لوگ آخرت میں کامیاب و بامراد ہوں گے لیکن جو دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور دنیا ہی کی زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہیں وہ ہرگز آخرت

میں فلاح نہیں پا سکتے، نتیجہ میں ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ یہی وہ پیغام ہے جو قرآن انسان کو پہنچاتا ہے اور یہی پیغام حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں موجود تھا اور سارے نبی اس کی تبلیغ کرتے چلے آئے ہیں۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

تسبیح وتقدیس کا حکم:

ابتدائی آیات میں اللہ کی ذات وصفات کے اعتبار سے اس کی تسبیح وتقدیس بیان کرنے کا حکم دیا گیا، اس نے انسان کو پیدا کیا، اسے پر کشش صورت سے نوازا اور سعادت وایمان کا راستہ دکھایا۔ (١۔٣)

حفظ کے آسان ہونے کی بشارت:

یہ سورت قرآن کریم کا ذکر کرتی ہے اور اس کے حفظ کے آسان ہونے کی بشارت سناتی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتی ہے کہ آپ نفوس کی اصلاح اور اخلاق کی درستگی کے لیے قرآن کے ذریعے نصیحت کیجئے، جس کے دل میں خوف خدا ہوگا وہ ضرور نصیحت قبول کرلیں گے۔ (٦-١٠)

تمام صحیفوں میں مشترک اصول:

سورت کے اختتام پر بتایا گیا ہے کہ جو شخص اپنے نفس کو گناہوں کی آلائش سے پاک کرلے گا، اسے اچھے جذبات و خیالات سے سنوار لے گا، اپنے دل میں اللہ کی عظمت اور جلال پیدا کرلے گا اور دنیا کو آخرت پر ترجیح نہیں دے گا وہ کامیاب ہوگا، یہ وہ اصول ہے جو تمام صحیفوں اور شریعتوں میں بیان ہو چکا ہے۔ (١۴۔١٩) (خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورۃ:...... (١) ضرورت نبوت۔ (٢) اور طریقہ تعلیم نبوت۔ ماخذ: (١) آیت: ۴ تا ٦۔ (٢) آیت: ٩۔

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورة الغاشيه

یہ قرآن کریم کی ٨٨ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار ٦٨ نمبر ہے، اس سورۃ میں ایک رکوع، ٢٦ آیات، ٩٢ کلمات اور ٣٨۴ حروف ہیں۔ یہ سورہ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء ایک سوالیہ جملہ ''**هل اتاك حديث الغاشية**'' سے ہوئی ہے کہ کیا آپ کو غاشیہ کی کچھ خبر پہنچی ہے۔ غاشیہ قیامت کو کہتے ہیں، کیونکہ غاشیہ کا مفہوم ہے چھپا جانے والی، سب کو ڈھانپ لینے والی ایک ایسی چیز جس کی پکڑ سے نہ بچ سکے، تو اس لفظ غاشیہ کی مناسبت سے اس سورۃ کا نام سورۃ الغاشیہ مقرر ہوا۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کا مرکزی مضمون بھی یہی ہے کہ قیامت وآخرت ضرور ہوگی اور اس دنیا میں انسان نے جو کچھ کمایا ہوگا اچھا یا برا اس کی جزا و سزا اس کو وہاں ضرور ملنی ہے اس سورۃ میں اولا قیامت کی ہولنا کی کا ایک خاص منظر ایک خاص انداز میں پیش کیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ جب قیامت کی ہولنا کی اچانک پیش آجائے گی کسی کو اتنی مہلت نہ ملے گی کہ وہ کسی بھی طرح اس کا مقابلہ کر سکے، اس وقت انجام کے اعتبار سے تمام انسان دو گروہوں میں بٹ جائیں گے، ایک گروہ کے حصہ میں ذلت ورسوائی کے سوا کچھ نہ ہوگا، اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا جہاں کی مصیبتوں اور عذابوں کا تصور نہیں کیا جا سکتا، ان اہل جہنم کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا اور کانٹے دار گھاس کھلائی جائے گی۔ جس سے نہ بھوک دور ہوگی نہ جسم کو کوئی فائدہ حاصل ہوگا، دوسرا گروہ وہ ہوگا جو اس دن خوش وخرم ہوگا، ان کے چہرے بشاشت اور خوشی سے چمک رہے ہوں گے، انہوں نے دنیا میں جو کچھ اللہ کی خوشی کے لئے کیا تھا اس کے نتائج دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے اور انہیں وہاں جنت کا وہ عیش وآرام نصیب ہوگا جس کا اس وقت تصور نہیں کیا جا سکتا، اس کے بعد انسانوں کو توجہ دلائی گئی کہ وہ اللہ کی مخلوقات کو دیکھ کر اس کی قدرت وحکمت کا اندازہ کریں اور اس کی معرفت وبندگی حاصل کریں۔ اخیر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ آپ ان منکرین کے انکار پر غم نہ کریں آپ کا کام تو سیدھی راہ کی طرف دعوت دینا ہے، وہ آپ کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، وہ اپنے انجام کے خود ذمہ دار ہوں گے اور اپنے کئے کی سزا بھگتیں گے، ہر شخص کو آخر لوٹ کر اللہ کی طرف جانا ہے اور اللہ تعالی اس سے اس کا حساب لیں گے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت میں دو اہم مضمون بیان ہوئے ہیں۔

پہلا مضمون یہ ہے کہ یہ سورت بتاتی ہے کہ قیامت کے دن کچھ چہرے ذلیل ہوں گے، انہوں نے بڑی محنت کی ہوگی، جس کی وجہ سے تھکے تھکے محسوس ہوں گے۔ علماء کرام فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں بڑی عبادتیں وریاضتیں کی ہوں گی لیکن چونکہ ان کے عقائد صحیح نہیں تھے اس لئے یہ عبادات ان کے کسی کام نہیں آئیں گی، یہ چہرے دہکتی ہوئی آگ کا ایندھن بنیں گے، ان کے برخلاف بعض چہرے تر وتازہ اور پر رونق ہوں گے، یہ وہ چہرے ہوں گے جنہوں نے دنیا میں صحیح رخ پر محنت کی ہوگی اور ان کے عقائد میں بھی باطل کی آمیزش نہیں ہوگی، ان کا مسکن بلند وبالا جنتیں ہوں گی۔ اس لئے اس سورت سے معلوم ہوا کہ عموماً لوگوں کا جو نظریہ ہے کہ عبادت ہی کرنا ہے کہیں بھی کر لو، یہ صحیح نہیں بلکہ صحیح رخ پر صحیح عقیدے کے ساتھ عبادت ہی نجات کا ذریعہ ہے۔

دوسرا اہم مضمون جو اس سورت میں بیان ہوا ہے وہ رب العالمین کی وحدانیت کے تکوینی دلائل ہیں، ان میں سے ایک اونٹ ہے جسے صحرائی جہاز بھی کہا جاتا ہے، طویل قد وقامت کے باوجود ایک بچہ بھی اس کی نکیل پکڑ کر جہاں چاہے لے جاتا ہے۔ اس کے صبر کا یہ حال ہے کہ دس دس دن تک پیاس برداشت کر لیتا ہے، اس کی غذا بہت سادہ ہوتی ہے، ایسی

جھاڑیوں سے پیٹ بھر لیتا ہے جنہیں کوئی بھی چوپایہ کھانا گوارا نہیں کرتا۔

سورت کے آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انسانیت کے لئے یاددہانی اور نصیحت کرانے کا حکم ہے اور قیامت کے احتساب کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنے کی تلقین ہے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

خلاصہ سورۃ:...... عاملین کے اقسام مع نتائج۔ ماخذ: آیت: ۲ تا ۱۶۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الفجر

یہ قرآن کریم کی ۸۹ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۱۰ ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۳۰ آیات، ۱۳۷ کلمات اور ۵۸۴ حروف ہیں۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورہ کی ابتداء لفظ والفجر سے ہوئی ہے، فجر صبح کی روشنی پھوٹنے کو کہتے ہیں۔ اس میں باری تعالی نے اس وقت کی قسم کھائی ہے، اس مناسبت سے اس سورۃ کا یہی نام مقرر ہوا۔

ربط:

سورۂ سابقہ کا مضمون مؤمنین اور کفار کی سزا سے متعلق تھا، اس سورۃ میں مقصود اصلی فریقین کی جزا و سزا کو واجب کرنے والے اعمال کا بیان ہے۔ اور شروع میں تمہید کے طور پر بعض ہلاک کی ہوئی امتوں کا ذکر ہے اور آخر میں فریقین کی بعض سزا و جزا کا ذکر ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں قسمیہ کلام کے ساتھ بتلایا گیا کہ قیامت ضرور آنی ہے اور قیامت کے منکرین کو اس وقت ضرور سزا ملنی ہے۔ اس کی تائید میں فرمایا گیا کہ زمانہ گزشتہ میں جن امتوں نے اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ میں سرکشی کی، ان پر خدا کی مار کا کوڑا اس طرح برسا کہ ان کا نام تاریخ میں ایک عبرت کا نشان بن کر رہ گیا، پچھلی تاریخ کے واقعات میں سے قوم عاد، ثمود اور فرعون کے واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا اور بتلایا گیا کہ یہ سب قومیں اپنے زمانہ میں کمال عروج کو پہونچی ہوئی تھیں، اقتدار حکومت سلطنت سب کے مالک تھے، مادی ذرائع اور وسائل کی ان کے پاس کمی نہیں تھی، مگر نافرمانی کے بدولت جب اللہ کی پکڑ میں گرفتار ہوئے تو تباہ و برباد ہو کر ختم ہو گئے۔ اس کے بعد عام انسانوں کی آزمائش کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ جب اللہ کسی انسان کو عزت، مالی دولت عطاء کرتا ہے تو اتراتا ہے، بڑا خوش ہوتا ہے۔ حالانکہ اس سے مقصود اس کا شکر دیکھنا ہوتا ہے اور پھر جب انسان کی روزی تنگ کر دی جاتی ہے جس سے مقصود اس کا صبر و رضا کا دیکھنا ہوتا ہے تو وہ شکوہ شکایت کرنے لگتا ہے کہ باوجود استحقاق کے دنیوی نعمتیں مجھ سے کم ہو گئیں۔ پھر بتلایا گیا کہ دنیا میں انسان کو مال

اس لئے نہیں ملا کہ اس پر اترائے اور گھمنڈ کرے اور نہ مال اس لئے لیا گیا کہ بے صبری کا مظاہرہ کرے، بلکہ انسان کو چاہئے کہ اگر اس کو مال ملا ہے تو اس سے یتیموں کی پرورش کرے، مسکینوں کی خدمت کرے اور حق داروں کے ساتھ حسن سلوک کرے، نہ کہ مال جوڑ کر رکھے۔ پھر انسان کو آخری انجام کی طرف متوجہ کیا گیا کہ قیامت آنی ہے وہ آئے گی اور سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ پھر دربار الٰہی منعقد ہوگا اور سب کو حساب و کتاب کے لئے جمع کیا جائے گا، اس وقت انسان کی آنکھیں کھلیں گی لیکن اس وقت سمجھنے اور ہوش آنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور جس نے اللہ کی باتوں پر مطمئن ہو کر نیک اعمال کئے تھے اس کو مرنے کے وقت ہی بشارت ملے گی، اللہ کی رضا اور اللہ کی بہشت میں داخلے کی اور یہی ایک بندہ کی کامیابی و کامرانی ہے جس کی تمنا اور آرزو و کوشش ہونی چاہئے۔ **اللھم اجعلنا منھم۔** (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت کی ابتدا میں اس پر چار قسمیں کھائی گئیں ہیں کہ کفار پر اللہ کا عذاب واقع ہو کر رہے گا۔

قوم عاد، ثمود اور فرعون:

قوم عاد، ثمود اور فرعون جیسے متکبروں اور فسادیوں کے قصے اجمالی طور پر ذکر کیے گئے ہیں جو اپنی سرکشی اور جرائم کی وجہ سے اللہ کے عذاب کے مستحق ٹھہرے۔ (۶-۱۳)

اللہ کی سنت اور دستور:

اللہ کی سنت اور دستور یہ ہے کہ وہ دنیا کی زندگی میں انسان کو خیر و شر، فقر و غنی اور صحت و بیماری جیسی آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے۔ انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ وہ اپنے رب کے فضل و احسان کا شکر ادا نہیں کرتا اور اللہ کا دیا ہوا مال اس کی راہ میں خرچ نہیں کرتا، وہ مال کی محبت میں بڑا حریص ہے، اس کا پیٹ بھرتا ہی نہیں۔ (۱۴، ۲۰)

قیامت کے زلزلے:

قیامت کے دن جو زلزلے اور ہولناک حالات پیش آئیں گے ان کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ انسان دو قسموں میں تقسیم ہو جائیں گے شقی لوگ اللہ کے غضب کے حقدار ہوں گے اور نفس مومن، جسے نفس مطمئنہ کہا گیا ہے اسے اپنے رب کی طرف لوٹنے اور جنت میں داخل ہونے کے لیے کہا جائے گا۔ (۲۱-۳۰) (خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورۃ:...... (۱) اعمال کی جزا اور سزا دنیا میں شروع ہو جاتی ہے۔ (۲) اور مصائب دنیاوی عام طور پر بداعمالی سے پیش آتے ہیں۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱ تا ۱۳ (۲) آیت: ۱۷ تا ۲۰۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ البلد

یہ قرآن کریم کی ۹۰ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۳۵ ہے، اس سورۃ میں ایک رکوع، ۲۰ آیات، ۸۲ کلمات اور ۳۴۷ حروف ہیں۔ یہ سورۃ مکی ہے۔ اس سورۃ کی ابتداء لفظ ”**لا اقسم بھذا البلد**“ سے کی

گئی ہے اور بلد (شہر مکہ) کی باری تعالیٰ نے قسم کھائی ہے، اسی وجہ سے اس سورۃ کا نام بلد مقرر ہوا۔

ربط:

سورۂ سابقہ میں اعمال موجبہ مجازات کا بیان تھا، اس سورۃ میں بھی ایسے ہی اعمال کا بیان ہے، مگر وہاں کثرت اعمال شر کی تھی اور یہاں اعمال خیر کی ہے اور تمہید میں اعمال خیر کے بعض مقتضیات جو کہ مشقت وفتن کے قبیل سے ہیں مذکور ہیں اور ختم پر اعمال خیر وشر کی سزا وجزا مذکور ہے۔ واللہ اعلم!

شان نزول:

روایت کیا گیا ہے کہ قریش میں ایک کافر اسید بن کلدہ نہایت قوی ہیکل اور پہلوان تھا، اس کی طاقت کا یہ حال تھا کہ اپنے پاؤں کے نیچے گائے بیل کا چمڑہ دبالیتا اور لوگوں سے کہتا چمڑہ کھینچ کر میرے پاؤں کے نیچے سے باہر کرو، بہت سے لوگ مل کر زور آزمائی کرتے مگر چمڑا کھینچنے سے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا اور اس کے پاؤں کے نیچے سے نہ نکلتا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اسلام کی دعوت دی تو وہ کافر ایمان نہ لایا اور اس نے بہت سخت سست کلمات آپ کی شان میں کہے اور کہنے لگا کہ تم مجھے آتش دوزخ کے مؤکلوں سے کیا ڈراتے ہو، میرا بایاں ہاتھ ان سب کو سزا دینے کے لئے کافی ہے۔ میرے مقابلہ کی تاب کون لاسکتا ہے اور بہشت کی نعمتوں سے مجھے کیا پھسلاتے ہو، میں نے شادیوں اور خوشی کی تقریبات میں اتنا مال خرچ کیا ہے کہ تمہاری بہشت کی نعمتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں اور تمہاری جنت کی قیمت میرے اس خرچ کئے ہوئے مال کے برابر بھی نہیں پہنچتی، اس کی ان باتوں کے جواب میں اللہ رب العزت نے یہ سورۃ نازل فرمائی۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں بتلایا گیا کہ انسان کو اپنی قوت، زور اور مال ودولت کی کثرت اور بڑائی پر مغرور نہیں ہونا چاہئے اور اگر یہ انسان پیدائش سے لے کر موت تک کے واقعات پر غور کرے تو یہ خوب واضح ہوجاتا ہے کہ اسے کس قدر شدائد و تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پھر سمجھایا گیا کہ اس زندگی کے بعد جو ایک اور ہمیشہ رہنے والی زندگی آنے والی ہے اس میں انسان کے تمام اعمال کی جانچ ہوگی، ہر شخص کے ساتھ انصاف ہوگا اور جس نے دنیا میں جیسی زندگی گزاری ہوگی اس کے لحاظ سے اسے اچھا یا برا بدلہ ملے گا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

یہاں ہم ایسے رہے یا ویسے رہے! وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے؟ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورت کی ابتداء میں تین قسمیں کھائی گئی ہیں:

(۱) مکہ مکرمہ کی جس میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رہائش پذیر تھے۔

(۲) والد کی (۳) اولاد کی

دنیا کی زندگی میں انسان مشقت اور تکلیف کے مراحل سے گزرتا رہتا ہے۔ نیکی کا راستہ اختیار کرنے میں بھی

مشقت آتی ہے اور بدی کا راستہ اختیار کرنے میں بھی مشقت آتی ہے، مگر فرق یہ ہے کہ نیکی کی راہ میں مشقت اٹھانے والوں کے لئے اجر وثواب بھی ہے اور سکون واطمینان بھی، جبکہ بدی کی راہ میں مشقت اٹھانے والوں کے لئے صرف دنیاو آخرت کی تکلیف اور عذاب ہی ہے۔

انسان کی ہٹ دھرمی اور اللہ کے راستے سے روکنے کے جرم کے اعادہ پر فرمایا کہ جو کہتا ہے کہ میں نے بہت مال لگا دیا ہے، کیا اسے معلوم نہیں کہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے کہ اس نے یہ مال کس غرض سے خرچ کیا ہے۔

سورت کے آخر میں اللہ نے انسان پر اپنے انعامات کا ذکر فرما کر انسان کو خدمت خلق کی تلقین کی ہے اور نیک و بد کی تقسیم پر سورت کا اختتام کیا گیا ہے۔(خلاصہ مضامین قرآن کریم)

خلاصہ سورۃ:......انسان دنیا میں آرام پانے نہیں بلکہ کام کرنے آیا ہے۔ ماخذ: آیت: ۴۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ والشمس

یہ قرآن کریم کی ۹۱ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۲۶ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ایک رکوع، ۱۵ آیات، ۵۶ کلمات اور ۲۵۴ حروف ہیں۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کے شروع میں ''والشمس وضحھا'' آیا ہے۔ یعنی قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی۔ اس لئے بطور علامت اس کا نام سورۃ الشّمس مقرر ہوا۔

ربط:

سابقہ سورۃ میں اعمال ایمانیہ وکفریہ کی مجازات اخرویہ کا بیان تھا۔ اس سورۃ میں ''کذبت ثمود'' سے جو جواب قسم کے منزلہ میں ہے قصداً اعمال کفریہ پر مجازات دنیویہ کے احتمال کا بیان ہے اور ضمناً قسم کے ذیل میں کفر وایمان کی طرف اعمال کی تقسیم اور ان دونوں کی مجازاۃ اخرویہ کا ذکر ہے جو اجمالاً ہے اور غالباً مضمون اول کا مقصوداً اور مقصود ثانی کا ضمناً وتبعاً آنا اس لئے ہو کہ مقصود اصل کفار مکہ کو ڈرانا ہے۔ واللہ اعلم!

خلاصہ سورۃ:

یہ ایمان واسلام کے ابتدائی دور کی ایک سورۃ ہے، جب کہ قریش اور اہل مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کر رہے تھے، اللہ اور رسول کی باتوں کو جھٹلاتے تھے اور جن حقیقتوں کی خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے وہ انہیں سچا نہ جانتے تھے۔ اس سورۃ میں انہیں اہل مکہ کو متنبہ کیا گیا اور گزشتہ واقعات میں سے قوم ثمود کے ایک مشہور واقعہ کی طرف جو اہل عرب میں مشہور تھا انہیں متوجہ کیا گیا کہ دیکھو اللہ کے رسول کی تکذیب اور حق کے مقابلہ میں جرأت کی سزا اس

سے پہلے قوم ثمود کو مل چکی ہے، اگر تم اپنی روش سے باز نہ آئے تو پھر انہیں جیسا انجام تمہارا بھی ہوگا۔ یہ سورۃ اگر چہ مختصر ہے لیکن توحید و آخرت کی پوری دعوت اور اس کو نہ ماننے کے نتائج پوری طرح اس میں سمیٹ دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے سات قسمیں کھا کر جواب قسم میں دو باتیں ارشاد فرمائی، وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اپنے نفس کو سنوارا اور وہ نامراد ہوا جس نے اسے خاک میں ملایا۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورۃ الشّمس کے علاوہ بھی مختلف جگہوں پر قرآن کریم نے فلاح پانے والوں کی کچھ خصوصیات اور علامات بیان کی ہیں۔ مثلاً

(۱) ''تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔'' (سورہ آل عمران، آیت ۱۰۴)

(۲) ''اے ایمان والو! یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو۔ امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۰)

(۳) ''اے ایمان والو! خود صبر کرو اور مقابلہ میں صبر کرتے رہو اور مقابلہ کے لئے مستعد رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۲۰۰)

(۴) ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کا قرب تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد و جد و جہد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔'' (سورۂ مائدہ، آیت ۳۵)

(۵) ''اے ایمان والو! شراب اور جوا، بت اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو۔ امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔'' (سورہ مائدہ، آیت ۹۰)

(۶) ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کہہ دیجئے کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے، گو تجھے ناپاک چیزوں کی کثرت اچھی لگتی ہو، سوائے عقل والو اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔'' (سورہ مائدہ، آیت ۱۰۰)

(۷) لہٰذا جو لوگ ان پر یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائیں اور دین قائم کرنے اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے ان کی حمایت و نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی کریں جو ان کے ساتھ نازل کی گئی ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ (سورہ اعراف، آیت ۱۵۷)

(۸) اے ایمان والو! جب (حق و باطل کی کشمکش کے میدان میں) کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ (سورۃ الانفال، آیت ۴۵)

(۹) ''البتہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور جو لوگ ان کی ہمراہی میں ایمان لا چکے ہیں انہوں نے اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کیا اور انہی کے لئے ساری بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ پورے کامیاب ہیں یعنی فلاح پانے والے ہیں۔ اللہ نے ان

کے لئے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں ،جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں ۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔''(سورۂ توبہ،آیت۸۹،۸۸)

(۱۰)''اے ایمان والو! رکوع کیا کرو اور سجدہ کیا کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو اور بھلائی کے کام کرتے رہو۔امید ہے کہ اس طرح تم فلاح پاؤ گے۔''(سورۃ الحج،آیت ۷۷)

الحاصل قرآن کریم میں نہ صرف یہ صاف صاف ظاہر فرمایا گیا کہ کامیابی اور ناکامی کیا ہے، بلکہ اس کی کامیابی کو حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتایا گیا اور اس راستہ پر چلنے کے لئے ابھارا گیا جو کامیابی کی منزل تک لے جاتا ہے۔

اور جو''بدی'' کا راستہ اپنا کر گناہوں کی زندگی اپنالیتا ہے وہ ناکام ونامراد ہے۔پھر ایک ایسی ہی سرکش اور گناہگار قوم قوم ثمود کا تذکرہ ہے جنہوں نے اپنی قوم کے رئیس وشریف آدمی کو اللہ کی نافرمانی پر آمادہ کر کے اونٹنی کے قتل پر مجبور کیا، جس کی بناء پر یہ شخص قوم کا بدترین اور بدبخت شخص قرار پایا۔ چنانچہ پوری قوم کو ان کی سرکشی اور بغاوت کے نتیجہ میں ایسے عذاب کا سامنا کرنا پڑا جس سے کوئی ایک فرد بھی نہ بچ سکا اور اللہ تعالی جب کسی کو ہلاک کرتے ہیں تو نتائج سے نہیں ڈرا کرتے ۔(خلاصہ مضامین قرآن کریم)

خلاصہ سورۃ:......مظاہر قدرت نے ابتدائے عالم سے مشاہدہ کرادیا ہے کہ اخلاق حمیدہ والی قوموں نے نجات پائی اور بداخلاق قومیں ہمیشہ قعر مذلت میں گرتی ہیں،جن کی ایک مثال قوم ثمود ہے۔ماخذ: آیت:۹،۱۱۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ اللیل

یہ قرآن کریم کی ۹۲ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۹ ہے۔اس سورۃ میں ایک رکوع، ۲۱ آیات،۷۱ کلمات اور ۳۱۴ حروف ہیں ۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء میں اللہ عزوجل نے لیل کی قسم کھاتے ہوئے فرمایا: **والیل اذا یغشی** کہ قسم ہے رات کی جب کہ وہ چھا جائے یا آفتاب کی جب کہ نور کو چھپالے۔اس مناسبت سے اس سورۃ کا نام سورۃ اللیل مقرر ہوا۔

ربط:

سورۂ سابقہ میں اعمال اور ان کی جزاؤں کا اختلاف مذکور تھا،اس سورۃ میں یہی مضمون ہے،جس سے دونوں سورتوں کے درمیان ارتباط ظاہر ہے۔

شان نزول:

مکہ معظّمہ میں دو شخص رئیسوں میں بڑے مالدار تھے ،ایک حضرت ابوبکر صدیق اور دوسرا امیہ بن خلف اور ان

دونوں کا معاملہ مال کے خرچ کرنے میں مختلف تھا۔ امیہ باوجود مالدار کے فقیر کو کوڑی بھی نہیں دیتا تھا اور اگر کوئی اس کو بطور نصیحت کے سمجھاتا کہ غریبوں پر خرچ کرکے آخرت کا ذخیرہ کیوں نہیں کرتا؟ تو وہ جواب میں کہتا کہ آخرت ہے کہاں اور اگر بالفرض ہو بھی تو میرے پاس اس قدر مال ہے جو مجھے جنت کی نعمتوں سے کافی ہے۔ حضرت بلال بھی اس کے غلام تھے، خفیہ طور پر اسلام لے آئے تھے، جب اس کو معلوم ہوا تو وہ ان کو بہت تکلیف دیتا تھا، حضرت ابوبکر کو علم ہوا تو حضرت بلال کو خرید کر آزاد فرمادیا۔ الغرض حضرت ابوبکر نے مسلمانوں کے تعاون اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی ضروریات میں بے دریغ اپنا مال خرچ فرمایا۔ چنانچہ مکہ کی زندگی میں تیرہ سال کے عرصہ میں آپ نے اپنی تمام دولت صرف فرمادی، صرف چھ ہزار درہم بچے تھے جو سفر ہجرت اور مسجد نبوی کے لئے زمین کی خرید اور دوسرے نیک کاموں میں صرف فرمائے، اس سورۃ میں انہیں دونوں حالتوں کا ذکر ہے کہ ابوبکر ایمان، صدق اور اکرام میں انتہائی درجہ رکھتے تھے اور امیہ بن خلف کفر، کذب اور بخل میں انتہائی درجہ رکھتا تھا۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کا اصل مضمون انفاق فی سبیل اللہ ہے جس کا انجام یہ بتلایا گیا کہ جو شخص نیک راستہ میں مال خرچ کرتا ہے اور ساتھ ہی دل میں خدا سے ڈرتا ہو، اسلام اور قرآن کی باتوں کو سچا جانتا ہو، تو وہ راحت وآرام کی جگہ (جنت) میں پہنچایا جائے گا اور جس نے خدا کی راہ میں خرچ نہ کیا اور اللہ کی خوشنودی اور آخرت کے ثواب کی پرواہ نہ کی، اسلام کی باتوں اور اللہ کے وعدوں کو جھوٹا جانا تو وہ آخرکار عذاب الٰہی کی انتہائی سختی کی جگہ (جہنم) میں پہنچ جائے گا اور حکمت الٰہی اس کو مقتضی نہیں کہ کسی شخص کو زبردستی نیک یا بد بننے پر مجبور کرے، ہاں اللہ نے برائی و بھلائی کو خوب کھول کر بیان فرمادیا ہے۔ اب جو شخص جو راہ اختیار کرے گا آخرت میں اس کے موافق اس سے برتاؤ ہوگا۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت کی ابتداء تین حقائق کی قسمیں کھا کر فرمایا گیا ہے کہ جس طرح ان حقائق کو تسلیم کئے بغیر چارہ کار نہیں ہے، اسی طرح اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ خیر وشر اور نیکی و بدی کے حوالے سے انسانوں کے اعمال مختلف ہیں، جو شخص تقوی اختیار کرکے نیکی اور سخاوت کا راستہ اپناتا ہے اللہ تعالی اس کے راستہ کو آسان کردیتے ہیں اور جو شخص نیکی کا منکر ہو کر بخل اور گناہ کا راستہ اپناتا ہے اللہ اس کا راستہ بھی آسان کردیتے ہیں، لیکن جب یہ نافرمان جہنم کے گڑھے میں گرے گا تو بخل سے بچایا ہوا مال اسے بچا نہیں سکے گا، جبکہ اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرنے والے کو تین انعامات ملتے ہیں:

(۱) تزکیہ ہوجاتا ہے۔ (۲) جہنم سے حفاظت بھی ہوجاتی ہے۔ (۳) اور اللہ اسے اپنی عطاء وانعام کے ذریعہ راضی بھی کردیتے ہیں۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

(۱ تا ۳) ان چیزوں میں غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے (۴) کہ انسانوں کی کوشش میں اختلاف ہے۔ (۵،۶) جس کی سعی کا یہ طریقہ ہے (۷) اس کے یہ نتائج نکلیں گے۔ (۸،۹) اور جس کی سعی کا یہ مسلک ہے (۱۰) اس کے نتائج یہ نکلیں

گے۔(۱۱)اس مکذب کو مال کوئی نفع نہیں دے گا(۱۲)ہدایت کا واضح کرنا اللہ تعالی کا کام ہے(۱۳)علاوہ اس کے دنیا اور آخرت کی تمام امور کی باگ ڈور اللہ تعالی کے قبضہ میں ہے۔

خلاصہ رکوع :۱......(۱) قوائے طبعیہ کے اختلاف اور بعض اثرات خارجیہ کے اختلاف سے اعمال انسانی میں اختلاف لازمی ہے۔(۲)اخلاق حمیدہ والوں کے لئے دنیوی اوراخروی نجات لازمی ہے، اور بداخلاقوں کے لئے دنیوی اور اخروی ذلت لازمی ہے۔ ماخذ:(۱) آیت:۱، ۲، ۳، ۴۔(۲) آیت:۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الضحی

یہ قرآن کریم کی ۹۳ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۱۱ ہے۔اس سورۃ میں ایک رکوع، ۱۱ آیات، ۴۰ کلمات اور ۱۶۶ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء میں اللہ عزوجل نے ضحیٰ کے وقت کی قسم کھائی ہے۔ضحیٰ یعنی چاشت،آفتاب بلند ہونے سے لے کر نصف النہار تک پہونچنے کا زمانہ ہے،اس نسبت سے اس سورہ کا نام ضحیٰ مقرر ہوا۔

ربط:

سابقہ سورۃ واللیل کی آیت ''فامامن اعطی'' سے 'للعسری'' تک بعنوان کلی مہمات اصول وفروع کا بیان اور ان کی تصدیق اور امتثال یا تکذیب واخلال پر وعدہ ووعید مذکور ہے۔ چنانچہ مہمات مذکور میں سے ایک مسئلہ رسالت کا بھی ہے جس کا بیان مع دوسرے مضامین مناسبہ کے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض انعامات کا فیضان اور جیسے ان کے شکریہ میں آپ کو بعض اوامرونواہی کا مخاطب بنانا اس سورۃ میں آیا ہے۔اس طرح باقی تمام سورتوں میں ان مہمات کلیہ کے خاص جزئیات اوران کے مناسب مضامین مذکور ہیں، جیسا کہ ہر سورۃ کے شروع سے ان جزئیات ومناسبات کی تعیین بھی معلوم ہو جائے گی اوراس تقریر سے آئندہ تمام سورتوں کا باہمی ارتباط اور ماقبل سے ارتباط واضح ہوگیا۔اب جدا جدا ہر سورۃ کے لئے مستقل تقریر ربط کی ضرورت نہ ہوگی،صرف اسی تقریر کی طرف اشارہ کردینا کافی ہوگا۔گو باہم سورتوں میں مستقل رابطہ بھی ادنی تامل سے معلوم ہوسکتا ہے، چونکہ آگے چھوٹی چھوٹی پاس پاس سورتیں ہیں اس لئے سب کا تقریر واحد میں منسلک کردینا زیادہ مناسب معلوم ہوا ہے۔جیسا کہ رازی رحمہ اللہ نے بھی سورۂ کوثر کی تفسیر میں والضحی سے آخر تک کا ربط ایک ہی تقریر میں لکھا ہے۔ واللہ اعلم!

شان نزول:

ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بیماری کی وجہ سے دو تین شب نہیں اٹھے، ایک کافرہ نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ

تمہارے شیطان نے تم کو چھوڑ دیا اور اتفاق سے وحی آنے میں بھی دیر ہوگئی تھی جس پر دوسرے مشرکین نے بھی کہا کہ ان کے رب نے ان کو چھوڑ دیا ہے۔ اس پر اس سورۃ الضحیٰ کا نزول ہوا، جس میں ان اعتراضات وطعن کا جواب دیا گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے محامد بیان فرمائے گئے۔

فائدہ:

علماء نے لکھا ہے کہ ضحیٰ کے وقت کی قسم اللہ عزوجل نے اس لئے کھائی کہ یہ وقت متعدد خصوصیتیں لئے ہوئے ہے۔ (۱) روزی کی تلاش اور علم و ہنر حاصل کرنے کا اکثر یہی وقت ہے (۲) یہ وقت فرض نماز سے خالی ہے، اس میں نفل عبادات کے لئے فراغت ہے۔ (۳) اس ضحیٰ کے وقت میں خدا تعالی نے حضرت موسی علیہ السلام سے کلام کیا تھا۔ (۴) اسی وقت میں فرعون کے جادوگر حضرت موسی علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر ایمان لائے اور سجدہ کیا تھا، بس یہ وقت نور حق کا کمال ظاہر ہونے کا وقت ہے۔ (۵) ضحیٰ کی نماز جو چار یا بارہ رکعتیں ہیں اسی وقت مقرر ہے، جس کے بہت سے فضائل احادیث میں آئے ہیں۔

خلاصۂ سورۃ:

اللہ رب العزت نے قسمیہ کلام کے بعد فرمایا کہ نہ آپ کے پروردگار نے آپ کو چھوڑا، نہ آپ سے دشمنی کی اور آخرت آپ کے لئے بدرجہا بہتر ہے اور عنقریب آپ کا پروردگار آپ کو اتنا دے گا کہ آپ خوش ہوجائیں گے۔ اس کے بعد بعض نعمتوں کا ذکر فرمایا کہ کیا اللہ نے آپ کو یتیم نہیں پایا، پھر آپ کو ٹھکانا دیا اور اللہ نے آپ کو شریعت سے بے خبر پایا تو آپ کو شریعت کا راستہ بتلایا اور اللہ نے آپ کو نادار پایا سو مالدار کر دیا۔ آگے ان نعمتوں پر اداء شکر کا حکم ہے کہ آپ ان نعمتوں کے شکر میں یتیم پر سختی نہ کیجئے اور سائل کو مت جھڑکئے اور اپنے رب کے انعامات مذکور کا تذکرہ کرتے رہا کیجئے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیماری کی وجہ سے چند روز تہجد کے لئے نہ اٹھ سکے، تو آپ کی چچی ام جمیل کہنے لگی کہ آپ کے رب نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا ہے، اس پر اللہ تعالی نے قسم کھا کر فرمایا:

(۱) جس طرح دن کے ساتھ اجالا ایک حقیقت ہے، جدا نہیں ہوتا اور رات کے ساتھ اندھیرا ایک حقیقت ہے علیحدہ نہیں ہوتا، اسی طرح یہ بھی ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آپ کے رب نے نہ آپ کو چھوڑا ہے اور نہ ہی آپ سے بیزار ہوا ہے۔

(۲) دنیا وآخرت میں موازنہ کرنے کی تلقین کے ساتھ آخرت کے بہتر ہونے کا اعلان فرمایا گیا ہے۔

(۳) قیامت کے دن امت کے حوالہ سے آپ کو راضی کرنے کی خوشخبری ہے اور پھر ماضی کے تین انعامات و احسانات کی یاددہانی کروائی گئی ہے کہ (۱) آپ کی یتیمی میں سرپرستی کی (۲) فقر میں غناء عطا فرمائی (۳) شریعت سے بے خبری میں قرآنی شریعت عطاء فرمائی، لہٰذا ان انعامات کے شکر میں یتیموں اور حاجت مندوں کی کفالت وسرپرستی

کرتے رہیے اور اللہ کے احسانات وانعامات کا اعتراف کرتے رہئے اور لوگوں کے سامنے اسے بیان کرتے رہئے۔

(خلاصہ مضامین قرآن کریم)

خلاصہ سورۃ:......(۱، ۲) یہ چیزیں اس امر پر گواہ ہیں۔(۳) کہا: آپ کے رب نے نہ آپ کو چھوڑا ہے اور نہ بیزار ہی ہوا ہے۔(۴) وحی بند ہونے کے بعد دوبارہ جب وحی نازل ہوگی تو وہ حالت آپ کے لئے پہلی سے بہتر ہوگی۔(۵) آپ کو اللہ تعالی اجر عطا فرمائے گا، تب آپ بڑے خوش ہوں گے۔(۶ تا ۸) کیا ان مصائب میں اللہ تعالی نے پہلے بھی آپ کا ساتھ چھوڑا (ہرگز نہیں!) (۹، ۱۰) فترۃ الوحی کے وقت ان مساکین کی خدمت کیجئے، واللہ اعلم!

خلاصہ سورۃ:......زمانہ فترۃ الوحی قوائے ایمانیہ کے لئے موجب تکمیل ہے۔ ماخذ: آیت: ۱، ۲، ۳، ۴۔

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الانشراح

یہ قرآن کریم کی ۹۴ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول میں اس کا شمار نمبر ۱۲ ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۸ آیات، ۲۷ کلمات اور ۱۰۲ حروف ہیں۔ یہ سورہ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء ''الم نشرح لک صدرک'' سے ہوئی ہے کہ کیا ہم نے آپ کا سینہ آپ کے لئے نہیں کھولا، تو بطور علامت جن الفاظ سے یہ سورہ شروع ہوئی وہی اس کا نام مقرر ہوا۔

ربط:

یہ سورۃ دراصل سورہ والضحیٰ کے مضمون کا تتمہ ہے۔ یعنی سورہ سابقہ میں ان نعمتوں کا ذکر تھا جو حق تعالی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرمائیں، وہ نعمتیں دو قسم پر ہیں، ظاہری و باطنی، پہلی سورۃ میں پہلی قسم کی نعمتوں کا ذکر ہے اور اس سورۃ میں باطنی انعامات کا ذکر ہے۔

فائدہ:

سورۃ الم نشرح کی مناسبت سے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

اذا اشتدت بک البلوی ففکر فی الم نشرح فعسر بین یسرین اذا فکرتہ فافرح

شان نزول:

روایت میں ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درگاہ الہی میں عرض کیا کہ اے پروردگار آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلت کا مرتبہ بخشا اور حضرت موسی علیہ السلام کو کلیم کی خلعت سے نوازا۔ حضرت داؤد کو لوہا اور پہاڑوں کو

تابع بنا کر ممتاز فرمایا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو جنات وانسانوں پر سلطنت عطا فرما کر سرفراز فرمایا۔ اے الہ العالمین میرے لئے کیا چیز خاص فرمائی؟ اس سوال کے جواب میں حق تعالی نے یہ سورۃ نازل فرمائی۔

خلاصہ سورۃ:

جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا گیا کہ اس سورہ کا خاص مضمون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باطنی خصوصیات کا اظہار ہے کہ حق تعالی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا کیا باطنی انعامات فرمائے۔

فضائل:

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث ومفسر رحمہ اللہ نے اس سورۃ کے خواص میں لکھا ہے کہ جو شخص اس سورۃ کو سوتے وقت ۱۷ مرتبہ پڑھے اور اپنے سینہ پر دم کرے، تو اس کو وساوس شیطان بھی حیران و پریشان نہ کریں گے اور معاملات کی تدابیر میں بھول چوک سے محفوظ رہے گا۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اسی سورت میں حضور ﷺ کے اعلیٰ مرتبہ ومقام کو بیان کرتے ہوئے تین احسانات بیان فرمائے گئے ہیں:

(۱) آپ کا سینہ کھول دیا یعنی نور نبوت سے بھر دیا۔

(۲) نبوت کی ذمہ داریوں کے بوجھ سے آپ کی کمر ٹوٹی جا رہی تھی، ان سے عہدہ برآ ہونے میں آپ کو سہولت بہم پہنچائی۔

(۳) آپ کے نام کو اپنے نام کے ساتھ ملا کر آپ کا ذکر بلند کر دیا۔ حدیث قدسی ہے: **اینما ذکرت ذکرت معی** جہاں میرا تذکرہ ہوگا وہیں آپ کا تذکرہ بھی ہوگا۔

اس کے بعد مکہ مکرمہ کی مشقت وتکالیف سے بھرپور زندگی کے بارے میں تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ مصائب و تکالیف دیرپا نہیں ہیں۔ تنگی کے بعد عنقریب سہولتوں اور آسانیوں کا دور شروع ہونے والا ہے اور ساتھ ہی فرمایا: اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے بعد اپنے رب سے راز ونیاز کے لئے خاص طور پر وقت نکالا کریں۔

ذکر بلند کر دیا:

آپ کے ذکر کو بلند کر دیا کہ جہاں جہاں اللہ کا ذکر وہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر، چاہے اذان ہو یا اقامت، تشہد ہو یا خطبہ۔ (۴)

اللہ کا وعدہ:

اللہ نے مشکلات کو آسان کرنے اور پریشانیوں کو دور کرنے کا وعدہ فرمایا۔ (۵،۶)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ تبلیغ ودعوت کی ذمہ داری ادا کرنے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے اس کی عبادت میں لگ جائیں اور اس میں اپنے آپ کو تھکا دیں۔ سب کچھ کرنے کے بعد اللہ پر توکل کریں اور تمام معاملات میں

اسی کی طرف رغبت کریں۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن)

خلاصہ:......تتمہ سورۃ الضحیٰ ۔ ماخذ: آیت: ا۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ التین

یہ قرآن کریم کی ۹۵ نمبر کی سورۃ ہے جو ترتیب نزولی کے اعتبار سے ۲۸ نمبر پر ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۸ آیات، ۳۴ کلمات اور ۱۶۵ حروف ہیں، یہ سورہ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء لفظ والتین سے ہوئی، تین کے معنی انجیر کے ہیں، باری تعالی نے انجیر کے قسم کھا کر مضمون کو بیان فرمایا ہے، اس لئے بطور علامت اس سورۃ کا نام التین مقرر ہوا۔

ربط:

سورۃ الضحیٰ کی تمہید میں جن مہمات کا ذکر ہے منجملہ ان کے انسان کا مبداء ومعاد ہے۔ اس سورۃ میں اس کا بیان ہے۔

فائدہ:

علماء نے لکھا ہے کہ سورۃ کے ختم کی آیت ''الیس اللہ باحکم الحاکمین'' کے بعد ''بلی وانا علی ذالک من الشاھدین'' کہنا چاہئے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں بتلایا گیا کہ اللہ نے انسان کو بہترین سانچہ میں ڈھالا ہے اور اس میں ظاہری و باطنی قوتیں نہایت مناسب طور پر رکھی گئی ہیں، اسے بہترین صلاحیتوں سے آراستہ کر کے ارادے اور عمل کی آزادی دی گئی۔ چنانچہ اس آزادی کے نتیجہ میں انسان مختلف راہیں اختیار کرتے ہیں، کچھ نیک عمل ہوتے ہیں، کچھ بدکار، کچھ خدا کے فرمانبردار ہوتے ہیں، کچھ اس کے باغی، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ انجام کے اعتبار سے دونوں یکساں رہیں، جب دنیا کی چھوٹی حکومتیں اپنے وفاداروں کو انعام اور مجرموں کو سزا دیتی ہیں تو اس احکم الحاکمین کی صفت حاکمیت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ایک دن صحیح صحیح فیصلہ کر کے اپنے وفاداروں کو اپنی عنایتوں سے نوازے اور مجرموں کو ان کے قصوروں کی سزا دے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس میں تین امور بیان ہوئے ہیں، جن کا انسان سے اور اس کے عقیدے سے تعلق ہے۔

نوع انسانی کی تکریم:

اس کی تکریم کے مختلف پہلو ہیں، یہاں ان میں سے ایک پہلو کا بیان ہے، وہ یہ کہ انسان کو بہت خوبصورت پیدا کیا گیا ہے، یہ خوبصورتی جسمانی اور ظاہری شکل کے اعتبار سے بھی ہے اور عقلی وروحانی کمالات کے اعتبار سے بھی۔

انسانیت کے تقاضے:

جب انسان انسانیت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا اور ناشکرا پن کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اسے نیچوں سے بھی نیچے گرادیا جاتا ہے، حیوانی اور شہوانی زندگی کو اپنا مقصد بنا کر وہ حیوانوں سے بھی زیادہ پستی میں جا گرتا ہے۔ البتہ ایمان و عمل صالح والے اس پستی سے بچے رہتے ہیں۔

حاکم و عادل ہونے کا تقاضا:

وہ اللہ جو پانی کے ایک قطرے سے ایسا خوبصورت انسان پیدا کرسکتا ہے وہ انسان کو دوبارہ بھی پیدا کرسکتا ہے، ویسے بھی دوبارہ پیدا کرنا اور حساب وجزا اس کے حاکم اور عادل ہونے کا تقاضا ہے۔ (خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورۃ:...... انسان اگر فرض منصبی ادا کرے تو بہترین مخلوقات اور اگر فرض منصبی ادا نہ کرے تو بدترین مخلوقات۔

ماخذ: آیت:۶،۵۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ العلق

یہ قرآن کریم کی ۹۶ نمبر کی سورۃ ہے جو ترتیب نزول میں پہلی سورۃ ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۱۹ آیات، ۷۲ کلمات اور ۲۹۰ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

علق کے معنی ہیں جمے ہوئے خون کے۔ اس سورۃ کی دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے **"خلق الانسان من علق"** کہ اللہ نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا فرمایا۔ اس سے اس سورۃ کا نام علق ماخوذ ہے۔ اس سورہ کو سورۂ اقراء بھی کہتے ہیں۔

فائدہ:

اس سورۃ کی ابتدائی پانچ آیات اکثر مفسرین کے نزدیک سب آیتوں اور سورتوں سے پہلے نازل ہوئیں، گویا وحی کی ابتداء انہیں آیات سے ہوئی۔

ربط:

سورۂ والضحیٰ کی تمہید میں جن مہمات کا ذکر ہے ان میں سے عطاء نبوت اور تعلیم وحی بھی ہے جو توحید کے بعد تمام مہمات کا مبنیٰ ہے اور اس کے مناسب صاحب وحی کی مخالفت پر مذمت اور جھڑکی ہے، جس کا اس سورۃ میں بیان ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں اللہ رب العزت نے ربوبیت کے لئے بطور دلیل کے انسان اور اس کی پیدائش اور انسان پر بعض دیگر

انعامات خداوندی کا تذکرہ کرتے ہوئے توحید کی دعوت دی گئی اور بتلایا گیا کہ اتنے احسانات الٰہی کے باوجود انسان سرکشی کرتا ہے اور وہ اپنے آپ کو تمام قیود وحدود سے آزاد سمجھتا ہے، حالانکہ سب کو ایک دن اپنے رب کے حضور حاضر ہونا ہے، پھر ایسے سرکشوں کو تنبیہ کی گئی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ دین اور وحدہ لاشریک لہ کی عبادت سے روکنا چاہتے تھے۔ ایسے منکرین ومخالفین کو قیامت کی پکڑ سے ڈرایا گیا اور اخیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہونے اور قرب خداوندی حاصل کرنے کی اجازت دی گئی۔ واللہ اعلم !(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی میں سے پہلی وحی میں نازل ہونے والی پانچ آیتیں اس سورت کی ابتداء میں شامل ہیں، جن میں قرآنی نصاب تعلیم کے خدوخال واضح کر کے انسان کی سرکشی کے اسباب سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

(۱) اللہ رب العزت کو اور اپنی حقیقت کو فراموش نہ کرنا قرآنی نصاب تعلیم کی بنیاد ہے۔ انسان اس کو بھول کر تکبر اور سرکشی میں مبتلا ہوتا ہے۔

(۲) مال ودولت اللہ کا انعام ہے اس کی وجہ سے اللہ کے حکموں کو توڑنا اور اعراض کرنا اس کی نعمتوں کا انکار اور سرکشی ہے۔

''**فرعون ھذہ الامۃ**'' ابوجہل کی سرکشی اور تکبر کی انتہاء کو اس سورت میں بیان کیا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نماز جیسے عظیم الشان عمل کی ادائیگی سے روکنے اور آپ کا مبارک سر اپنے ناپاک قدموں کے نیچے کچلنے کی پلاننگ کرتا رہتا تھا۔ سورۂ علق میں اس کو اس نازیبا حرکت سے باز نہ آنے کی صورت میں جہنمی فوج کے ہاتھوں گرفتار کرا کے اس کی جھوٹی اور گناہوں سے آلودہ پیشانی کو بالوں سے گھسیٹ کر جہنم رسید کرنے کی دھمکی دی گئی ہے اور ساتھ ہی نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسے سرکش و نافرمانوں کی اطاعت کے بجائے اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اس کا تقرب حاصل کرتے رہنے کی تلقین ہے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورۃ :......(۱) آپ تبلیغ کے لئے کمر بستہ رہیں، اور (۲) اعدائے اسلام کی سرکوبی ہمارے سپرد کیجئے۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱ تا ۵۔ (۲) آیت: ۱۵۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورة القدر

یہ قرآن کریم کی ۹۷ نمبر کی سورۃ ہے جو ترتیب نزول کے اعتبار سے ۲۵ نمبر پر ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۵ آیات، ۳۰ کلمات اور ۱۱۵ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

چونکہ اس سورۃ میں شب قدر کا ذکر فرمایا گیا ہے، اس بنا پر اس کا نام سورۃ القدر ہوا۔ قدر کے معنی تعظیم کے ہیں، چونکہ اس شب میں عظمت وشرف ہے اس لئے اس کو شب قدر کہتے ہیں۔

ربط:

سورہ والضحی کی تمہید میں جن مہمات کا ذکر ہے ان میں سے قرآن کی حقانیت اور عظمت ہے، اس سورۃ میں اس کا بیان ہے۔

شان نزول:

روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض عابدین بنی اسرائیل کا ذکر فرمایا جنہوں نے ہزار مہینے اور ایک روایت میں ہے کہ اسی (۸۰) برس عبادت کی تھی، صحابہ کو تعجب ہوا، اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی اور اسی برس کے تقریباً ہزار مہینے ہوتے ہیں جبکہ کسر کو چھوڑ دیا جائے۔

ایک روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ شب قدر حق تعالی شانہ نے میری امت کو مرحمت فرمائی، اس سے پہلی امتوں کو نہیں ملی۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں اللہ رب العزت نے اپنے بے انتہا عنایت کا ذکر فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کی فلاح وسعادت دارین کے لئے قرآن حکیم نازل کیا اور اس کو شب قدر میں نازل کیا، جس کی یہ فضیلت ہے کہ ایک لیلۃ القدر اجر وثواب میں ہزار مہینوں کی عبادت کے اجر وثواب سے بہتر ہے، اس شب میں حضرت جبرئیل اور گروہ ملائکہ کا دنیا میں نزول ہوتا ہے اور صبح تک یہ شب سراپا سلامتی اور امن ہوتی ہے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

عظیم احسان:

اس سورت کی ابتدا میں انسانوں پر اللہ کے عظیم احسان کا ذکر ہے جو کہ کتاب مبین کو نازل کرنے کی صورت میں ہوا، اسی طرح اس سورت میں لیلۃ القدر کی فضیلت بیان ہوئی ہے، اس میں پہلی فضیلت یہ ہے کہ اس ایک رات کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت کے برابر ہے۔ دوسری فضیلت یہ ہے کہ اس رات میں غروب آفتاب سے لیکر طلوع فجر تک فرشتے امن وسلامتی اور رحمت وبرکت کا پیغام لے کر نازل ہوتے رہتے ہیں۔ واضح رہے کہ لیلۃ القدر میں نزول قرآن کا معنی یہ ہے کہ اس رات میں اس کے نزول کی ابتداء ہوئی۔

خلاصہ سورۃ...... لیلۃ القدر میں قرآن مجید کا نزول لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر ہوا اور پھر تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت نازل ہوتا رہا۔ ماخذ: آیت: ۱ تا ۵۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ البینہ

یہ قرآن کریم کی ۹۸ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۱۰۰ ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۸ آیات، ۹۵ کلمات اور ۴۱۳ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی پہلی آیت میں ’’حتی تأتیھم البینۃ‘‘ آیا ہے، بینہ کے معنی ہیں کھلی ہوئی دلیل، روشن دلیل، جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے جو بجائے خود رسالت کی ایک روشن اور واضح دلیل ہے۔ اس لفظ البینہ کو سورۃ کا علامتی نام قرار دیا۔

فائدہ:

اس سورۃ کا نام سورہ لم یکن اور سورۂ منفکین اور سورۂ قیامت اور سورۃ البریہ بھی ہے۔

ربط:

سورۂ والضحیٰ کی تمہید میں جن مہمات کا ذکر ہوا ہے، منجملہ ان کے مسئلہ رسالت اور اس کے مصدقین و مکذبین کی مجازات ہے، اس سورۃ میں اس کا بیان ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں بتلایا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بجائے خود رسالت کی ایک روشن دلیل ہے، کیوں کہ آپ نہایت پاکیزہ اخلاق واعمال وعقائد کی طرف دعوت دینے والی آیات لوگوں کو سناتے ہیں اور اللہ کی توحید اور اس کی عبادت کی تعلیم وہدایت فرماتے ہیں، پھر بتلایا گیا کہ کفر وشرک کرنے والوں کا انجام جہنم کی آگ ہے اور یہ بدترین مخلوق ہیں اور ان کے برخلاف اللہ سے ڈرنے اور عمل صالح سے وابستہ رہنے والوں کے لئے آخرت میں جنت ہے، جہاں کی زندگی دائمی ہوگی، گویا اس طرح کفر وشرک کے انجام بد کو سنا کر ایمان اور عمل صالح پر بشارت سنا کر دنیا میں ایمان اور عمل صالح والی زندگی گزارنے کی ترغیب دی گئی۔ **اللھم اجعلنا منھم!** (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت میں تین امور سے بحث کی گئی ہے:

(۱) آخری نبی بنی اسرائیل میں سے:

اہل کتاب کا خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارے میں موقف، یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا انتظار کررہے تھے لیکن ان کا خیال یہ تھا کہ آخری نبی بنی اسرائیل میں سے ہوگا۔ لیکن جب ایسا نہ ہوا تو انہوں نے آپ کی نبوت کو جھٹلا دیا، اس سورت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بینہ اور واضح حجت اور دلیل قرار دیا گیا ہے۔ اس میں شک ہی کیا ہے کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی خود ایک بہت بڑا معجزہ اور حق وصداقت کی واضح دلیل تھی۔

گندے ماحول میں چالیس سال:

زنا، شراب نوشی، قتل وغارت گری، بت پرستی اور ڈاکہ زنی کے ماحول میں چالیس سال گزارے، کسی جنگل اور خلوت خانہ میں نہیں۔

گلی کوچوں اور سوسائٹی میں فعال کردار ادا کرتے ہوئے گزارے؛ لیکن سیرت کے دامن پر نجاست کا کوئی خفیف ترین دھبہ بھی نہ تھا، کسی بدترین دشمن کو بھی جرأت نہ ہوئی کہ آپ کے کردار پر انگلی اٹھا سکتا۔

(۲) اخلاص:

یہ سورت دین وایمان کی بنیادی نشاندہی کرتی ہے اور وہ ہے اخلاص، کوئی عمل بغیر ایمان کے اور ایمان بغیر اخلاص کے معتبر نہیں، ہر نبی نے اپنی امت کو اس بنیاد کی دعوت دی۔(۵)

(۳) اشقیاء اور سعداء کا انجام:

یہ سورت اشقیاء اور سعداء یعنی کافروں اور مومنوں دونوں کا انجام بیان کرتی ہے۔(خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورۃ:......(۱) ضرورت بعثت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوۃ والسلام) آپ کا دین ادیان سابقہ سے اصولاً متفق ہے۔(۲) تعلیم اسلام کے موید خیر البریہ اور مخالف شر البریہ ہیں۔ ماخذ: (۱) آیت: ۱۔(۲) آیت: ۵۔(۳) آیت: ۶، ۷۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورة الزلزال

یہ قرآن کریم کی ۹۹ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۹۳ ہے، اس سورۃ میں ایک رکوع، ۸ آیات، ۳۷ کلمات اور ۵۸ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورہ کی ابتداء ''اذا زلزلت الارض زلزالھا'' سے ہوئی ہے یعنی جب زمین اپنی سخت جنبش سے ہلائی جاوے گی، اس سے سورہ کا نام سورۂ زلزال ماخوذ ہے۔ جس میں قیامت کے دن زلزلہ عظیم واقع ہونے کی خبر ہے۔

ربط:

سورۂ والضحیٰ کی تمہید میں جن مہمات کا ذکر ہے، ان میں سے قیامت کے دن بدلہ کے واقع ہونے کا اعتقاد ہے، جس کا اس سورۃ میں بیان ہے۔

فضائل:

ترمذی کی ایک روایت میں حضرت انس اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا کہ سورۂ اذا زلزلت نصف قرآن کے برابر ہے۔ اور قل ھو اللہ احد ایک تہائی قرآن کے برابر ہے اور ''قل یا ایھا الکافرون'' ایک چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔

امام جزری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ چوتھائی قرآن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں چار چیزوں کا بیان ہے۔ زندگی، موت، حشر، حساب اور اس سورۃ میں حساب قیامت کا بیان ہے اور نصف قرآن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن میں احوال دنیا اور احوال آخرت کا بیان ہے۔ اور اس سورۃ میں صرف احوال آخرت کا بیان ہے، اس لئے یہ نصف قرآن کے برابر ہے۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

یہ سورت دو مقاصد پر مشتمل ہے۔

(۱) زلزلے کی خبر:

اس میں اس زلزلے کی خبر دی گئی ہے جو قیامت سے پہلے واقع ہوگا اور سارے انسان اپنی قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے اور زمین انسان کے اعمال پر گواہی دے گی۔

(۲) اللہ کے سامنے پیشی:

لوگ حساب و کتاب کے لیے اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، پھر ان کے اعمال کے مطابق انہیں دو قسموں میں تقسیم کیا جائے گا، بعض شقی ہوں گے اور بعض سعید اور ان میں سے ہر ایک اپنے چھوٹے بڑے اعمال کی جزا دیکھ لے گا۔ (خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورۃ...... ابتداء وقائع قیامت۔ ماخذ: آیت: ۴، ۳، ۲، ۱۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ العادیات

یہ قرآن کریم کی ۱۰۰ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۱۴ ہے، اس سورۃ میں ایک رکوع، ۱۱ آیات، ۴۰ کلمات اور ۱۷۰ احروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

یہ سورۃ **والعدیت ضبحا** سے شروع ہوئی ہے، عادیات یہ عادیہ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں تیز دوڑنے والا گھوڑا، چونکہ اس میں تیز رو گھوڑوں کی قسم کھائی گئی ہے اور ان کی وفاداری و جاں نثاری کا ذکر ہے، اس لئے لفظ عادیات کو سورۃ کا نام قرار دیا گیا۔

ربط:

سورۂ والضحیٰ کی تمہید میں جن مہمات کا ذکر ہوا ہے منجملہ ان کے اعمال قبیحہ سے بچنا ہے، اس سورۃ میں اعمال قبیحہ کی مذمت اور اس پر جزا کا ترتب مذکور ہے۔

شان نزول:

روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منذر ابن عمر رضی اللہ عنہ کو صحابہ کے لشکر کے ساتھ قبیلہ بنی کنانہ میں بھیجا اور حکم دیا کہ تم لوگ فلاں روز صبح کے وقت ان پر پہنچ کر غارت کر واور فلاں روز واپس آ جاؤ، مگر اس لشکر کو واپس آنے میں تاخیر ہوگئی، منافقین نے زبان طعن دراز کی اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ وہ تمام لشکر ہلاک ہو گیا اور کوئی باقی نہیں رہا کہ ان کی خبر پہنچائے، یہ بات مؤمنین نے سنی تو غمگین ہوئے، حق تعالی نے یہ سورۃ نازل فرما کر اس فوج کے حال سے مسلمانوں کو خوش دل فرمایا۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ کا مرکزی مضمون اللہ کی نعمتوں کا احساس اور ان نعمتوں کے تقاضے اور نتیجہ کے طور پر آخرت پر ایمان و یقین ہے، اس سورۃ میں انسان کے اندر اللہ کی نعمتوں کا شعور پیدا کر کے جذبۂ شکر کو ابھارا گیا ہے اور اس بات کو سمجھانے کے لئے گھوڑوں کی مثال پیش کی گئی کہ وہ اپنے آقا اور مالک کے اشاروں پر کس طرح بے تحاشا دوڑتا ہے اور میدان جنگ میں اپنے آقا کی خاطر اپنی جان پر کھیل جاتا ہے، لیکن ناشناس انسان اپنے مالک حقیقی کی اتنی بھی حق شناسی نہیں کرتا جتنا گھوڑا جانور ہو کر اپنے مالک کی کرتا ہے، آخر میں اس بنیادی حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا جو قرآنی دعوت کا مرکزی نقطہ ہے، یعنی اس دنیوی زندگی کے بعد آخرت کی زندگی آنی ہے جہاں اس آقا و مالک کے سامنے جوابدہی ہوگی، جس سے کوئی بات چھپائی نہیں جاسکتی اور اس دن بندہ کی ہر بات کھل کر اس کے آقا و مالک کے سامنے آجائے گی جس پر جزاء وسزا کا مدار ہوگا۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت میں تین اہم مضامین بیان ہوئے ہیں:

(۱) گھوڑوں کی قسم:

مجاہدین کے گھوڑوں کی قسم کھا کر فرمایا گیا کہ انسان بڑا ناشکرا ہے اور اس کے ناشکرا ہونے پر خود اس کے اعمال گواہ ہیں۔ (۷۔۱) گھوڑا اپنے مالک کا وفادار ثابت ہوتا ہے، اسے خوش کرنے کے لیے تیروں کی بارش اور کوندتی تلواروں میں گھس جاتا ہے۔ مگر ہائے رے انسان کہ یہ اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود اپنے مالک حقیقی سے بے وفائی کرتا ہے۔

(۲) انسان کی فطرت:

انسان کی فطرت اور طبیعت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ مال کی محبت میں بڑا سخت ہے، اس کے پاس سونے کی ایک وادی ہو تو دوسری تلاش کرتا ہے اور دوسری ہو تو تیسری تلاش کرتا ہے اور اس کے منہ کو مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔

(۳) بندوں کے سینوں کے راز:

انسان کو ان اعمال صالحہ پر برانگیختہ کیا گیا ہے جو اسے اس وقت فائدہ دیں گے جب اسے حساب و جزا کے لیے پیش

کیا جائے گا اور بندوں کے سینوں میں جو راز ہیں، آشکارا کردیئے جائیں گے۔ (خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورۃ......(۱) بیان مرض۔ (۲) سبب مرض۔ (۳) علاج مرض۔ آیت:۶۔ (۲) آیت:۸۔ (۳) آیت:۹۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ القارعۃ

یہ قرآن کریم کی ۱۰۱ نمبر کی سورہ ہے جو ترتیب نزول کے اعتبار سے نمبر ۳۰ پر ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۱۱ آیات، ۳۵ کلمات اور ۱۶۰ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء لفظ القارعۃ سے ہوئی، جس کے معنی ہیں اچانک آجانے والی مصیبت، کھڑکھڑانے والا حادثہ، یہاں القارعہ سے مراد حادثۂ قیامت ہے، چونکہ قیامت بھی اچانک اور ناگہاں آجانے والی مصیبت ہے اور حادثہ عظیم ہے، اس لئے اس کو القارعہ کہا اور اسی لفظ سے سورہ کو موسوم کیا گیا۔

ربط:

سورۂ والضحیٰ کی تمہید میں جن مہمات کا ذکر ہے ان میں سے ایک امر اعتقاد و مجازات ہے۔ اس سورہ میں اس کا بیان ہے۔

خلاصہ سورۃ:

قیامت و آخرت پر ایمان اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور اس عقیدہ کو دل میں راسخ کرنے کے لئے قرآن پاک میں جگہ جگہ اس کا ذکر ہے۔ اس سورۃ میں بھی انسانوں کو قیامت کی ہولناکیوں سے ڈرایا گیا ہے اور آخرت کی کامیابی و ناکامی کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ اس دن جس کی نیکیاں زیادہ ہوں گی وہ خاطر خواہ آرام اور ہر طرح راحت میں ہوگا اور جس کا ایمان کا پلہ ہلکا ہوگا اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ دہکتی ہوئی آگ ہوگی۔ **اعاذنا اللہ منہ**۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت میں قیامت کی ہولناکیوں سے ڈرایا گیا ہے کہ جب قیامت قائم ہوگی تو نظام کائنات میں بڑی بڑی تبدیلیاں واقع ہوں گی جو انسان کو حیران اور ششدر کردیں گی۔ سورت کے اختتام پر بتلایا گیا کہ قیامت کے دن انسان کے اعمال کا وزن ہوگا، کسی کی حسنات زیادہ ہوں گی اور کسی کی سیئات اور انہی کے اعتبار سے انسان کے انجام کا تعین ہوگا۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورۃ......انتہائے واقعہ قیامت۔ ماخذ: آیت:۶ تا ۹۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ التکاثر

یہ قرآن کریم کی ۱۰۲ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۱۶ ہے۔اس سورۃ میں ایک رکوع،۸ آیات،۲۸ کلمات اور ۱۲۳ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورہ کا پہلا جملہ" الھکم التکاثر " ہے،اس سے اس سورۃ کا نام ماخوذ ہے۔تکاثر زیادتی اور کثرت میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے اور فخر کرنے کو کہتے ہیں،خواہ وہ زیادتی وکثرت مال کی ہو یا خاندان کی،اس سورۃ میں اس تفاخر کی مذمت بیان فرمائی گئی ہے۔

شان نزول:

قریش کے قبائل بنی عبد مناف اور بنی سہم میں سے ہر قبیلہ نے کہا کہ ہم میں باعزت اور سردار تم سے زیادہ ہیں لہذا سرداری ہمارا حق ہے،شمار کیا گیا تو بنی عبد مناف زیادہ نکلے، پھر کہنے لگے کہ اب ہم اپنے مردوں کو شمار کریں گے، چنانچہ مردوں کو شمار کیا تو بنی سہم کی تعداد بڑھ گئی۔اس بے ہودہ تفاخر کی برائی اور مذمت میں اس سورۃ کا نزول ہوا۔

ربط:

سورۂ والضحی کی تمہید میں جو امور مذکور ہیں ان میں سے ایک امر غفلت عن الآخرۃ کا ترک کرنا ہے،اس سورۃ میں اس کا بیان ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں متنبہ کیا گیا کہ کثرت مال و دولت، جاہ و حشمت،عزت و مرتبت فخر کی چیزیں نہیں ہیں،ان چیزوں پر فخر کرنا انسان کو آخرت سے غافل کر دیتا ہے اور یہ غفلت موت تک چلی جاتی ہے،لیکن موت کے بعد اصلیت معلوم ہو جائے گی اور اس دنیا پرستی اور آخرت فراموشی کا نتیجہ جہنم کے معائنہ کے وقت معلوم ہو جائے گا۔آخرت کا اس وقت یقین آجائے گا،اس وقت خدا کی نعمتوں کے متعلق پوچھ گچھ ہوگی اور کچھ جواب نہ بن پڑے گا،اس وقت انسان پچھتائے گا مگر وہ تلافی مافات کا وقت نہ ہوگا۔واللہ اعلم!(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

فضائل:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا کہ تم میں سے کسی میں یہ طاقت نہیں کہ ہزار آیات روز پڑھ لیا کرے،صحابہ نے عرض کیا کہ ہزار آیات روز کون پڑھ سکتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم میں سے کوئی الھکم التکاثر بھی نہیں پڑھ سکتا؟ معلوم ہوا کہ اس سورۃ کی تلاوت ہزار آیات کے برابر

ہے۔(خلاصہ ازمولانا اصغر صاحب)

قصر (محل) سے قبر کی طرف:

اس سورت میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو صرف دنیا کی زندگی کو اپنا مقصد بنا لیتے ہیں اور دنیا کا ایندھن جمع کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ان کے انہماک کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ انہیں دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے،لیکن جب اچانک موت آجاتی ہے تو ان کے سارے کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور انہیں قصر (محل) سے قبر کی طرف منتقل ہونا پڑتا ہے، ایسے لوگوں کو اس سورت میں ڈرایا گیا ہے کہ قیامت کے دن تمام اعمال کے بارے میں سوال ہوگا اور تم سے اللہ کی نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ امن،صحت،فراغت، اکل وشرب، مسکن،علم اور مال ودولت جیسی نعمتوں کو کہاں استعمال کیا؟ (خلاصہ مضامین قرآن کریم،خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورۃ:......فرض منصبی سے غافل کرنے والا مرض تکاثر اموال ہے۔ماخذ: آیت:۱۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ العصر

یہ قرآن کریم کی ۱۰۳ نمبر کی سورۃ ہے مگر ترتیب نزول کے اعتبار سے یہ تیرہویں نمبر پر ہے،اس سورۃ میں ایک رکوع، ۳ آیات، ۱۴ کلمات اور ۷۴ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتدا لفظ والعصر سے ہوئی یعنی قسم ہے زمانہ کی،اس سے سورۃ کا نام العصر ماخوذ ہے۔

شان نزول:

لکھا ہے کہ ابو الاسد ایک کافر تھا جو زمانہ جاہلیت میں حضرت ابوبکر صدیق کا دوست تھا، جب حضرت ابوبکر ایمان لے آئے تو یہ کہنے لگا کہ اے ابوبکر تمہاری عقل کو کیا ہوا،تم نے تجارت میں تو کبھی نقصان نہیں اٹھایا، اب یک لخت ایسے نقصان میں پڑے کہ آبائی دین کو چھوڑ کر لات وعزی کی شفاعت سے محروم ہو گئے۔حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ بے وقوف دین حق کو قبول کرنے والا کبھی نقصان میں نہیں رہتا۔ چنانچہ اس سورۃ میں اللہ نے حضرت ابوبکر کے اس کلام کی توثیق فرمائی۔

ربط:

سورۂ والضحی کی تمہید میں جن مہمات کا ذکر ہے ان میں سے ایک امر اعمال وطاعت کا بجالانا ہے۔اس سورۃ میں اس کا بیان ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اللہ رب العزت نے اس سورہ میں حضرت ابوبکر کے کلام کا حسن ظاہر فرمایا اور اس کافر کے خیال باطل کی تردید فرمائی

اور قسمیہ کلام کے بعد فرمایا گیا کہ ہر انسان خسارہ اور ٹوٹے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کئے اور جنہوں نے ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی اور ایک دوسرے کو صبر پر ثابت قدم رہنے کی فہمائش کرتے رہے۔

فائدہ:

اس سورۃ کے متعلق حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا مشہور قول ہے کہ اگر قرآن میں صرف یہی ایک سورۃ نازل کر دی جاتی تو سمجھدار بندوں کی ہدایت کے لئے کافی تھی، فی الحقیقت یہ ایک چھوٹی سی سورۃ ہے، مگر سارے دین وحکمت کا خلاصہ ہے۔ صحابہ کرام اور سلف صالحین کا دستور تھا کہ جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو یہ سورۃ سناتے، پھر سلام کر کے رخصت ہو جاتے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورت کی ابتداء میں زمانہ کی قسم کھا کر دراصل ماضی کی تاریخ سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین کی ہے کہ چار صفات: (۱) ایمان (۲) اعمال صالحہ (۳) حق کی تلقین کرنے (۴) اور حق کے راستہ کی مشکلات پر صبر کرنے والے ہر دور میں کامیاب رہتے ہیں اور ان صفات سے محروم ہر دور میں ناکام رہے ہیں۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

خلاصہ سورۃ...... اقوام عالم کی کامیابی کے اصول اربعہ۔ ماخذ: آیت: ۳۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الھمزہ

یہ قرآن کریم کی ۱۰۴ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول میں اس کا شمار نمبر ۳۲ ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۹ آیات، ۳۳ کلمات اور ۱۳۵ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی پہلی آیت میں ہمزہ کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی ہیں لوگوں کے عیب ڈھونڈنے والا۔ پس پشت عیب نکالنے والا، چونکہ اس سورۃ میں اس مرض کی سخت سزا کا بیان ہے، اس لئے بطور علامت اس سورۃ کا نام یہی مقرر ہوا۔

ربط:

سورۃ والضحیٰ کی تمہید میں مہمات امور میں سے ایک امر اپنے آپ کو عذاب کے موجبات سے بچانا ہے، جس کا اس سورۃ میں بیان ہے اور ربط ظاہر ہے۔

شان نزول:

لکھا ہے کہ بعض کفار مکہ مثلاً اخنس بن شریق، امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ یہ لوگ اپنی مجالس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بدگوئی اور غیبت کیا کرتے تھے، طعنے دیتے اور عیوب نکالتے۔ یہ سورۃ ان کو متنبہ کرنے کے لئے نازل ہوئی اور ایسے لوگوں کا انجام ذکر کیا گیا۔

خلاصہ سورۃ:

جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہوا کہ سورۃ کا نزول ان لوگوں کے حق میں ہوا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عیب لگاتے، بد گوئی کرتے، طعنہ زنی کرتے، یہ لوگ مالدار بھی تھے اور دولت کے نشہ نے ان میں غرور پیدا کر دیا تھا کہ اہل ایمان کو جن کے پاس مال و دولت نہیں تھا ان کی تحقیر کرتے تھے، ان کو اس فعل شنیع سے سختی کے ساتھ روکا گیا اور ایسے افعال کرنے والوں کے لئے المناک عذاب تجویز فرمایا گیا ان لوگوں کے متعلق فرمایا گیا کہ ایسے لوگ نار جہنم کی خوراک بنیں گے، وہ آگ دلوں تک پہونچ جائے گی۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت میں انسان کی تین بیماریوں کی نشاندہی کی گئی ہے:

◇ پہلی بیماری ہے پس پشت کسی کے عیب بیان کرنا، اسے غیبت کہتے ہیں اور غیبت بدترین گناہ ہے۔ قرآن کریم نے اس کو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا ہے۔

◇ دوسری بیماری ہے کسی کو اس کے سامنے اس کے حسب ونسب، دین و مذہب اور شکل وصورت کا طعنہ دینا، اس کا مذاق اڑانا، یہ منافقین کی عادت تھی۔ وہ غریب مسلمانوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے، یوں ہی یہود ونصاری دین حق کا مذاق اڑاتے ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ مؤمن نہ طعنہ مارنے والا ہوتا ہے، نہ لعنت کرنے والا، نہ فحش بکنے والا اور نہ بے حیائی کرنے والا۔ (ترمذی)

◇ تیسری بیماری ہے حب دنیا، جس میں مبتلا ہوکر انسان حقوق اللہ کو بھی بھول جاتا ہے اور حقوق العباد کو بھی بھول جاتا ہے اور اس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم، خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورۃ:......زر پرستوں سے سلوک الٰہی۔ ماخذ: آیت: ۲۱۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الفیل

یہ قرآن کریم کی ۱۰۵ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۱۹ نمبر پر ہے، اس سورۃ میں ایک رکوع، ۵ آیات، ۲۳ کلمات اور ۹۴ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ میں اصحاب فیل یعنی ہاتھی والوں کا ذکر فرمایا گیا ہے، اس لئے اس کا نام الفیل مقرر ہوا۔ فیل کے معنی عربی میں ہاتھی کے ہیں۔

ربط :

سورہ والضحیٰ کی تمہید میں جن مہمات کا ذکر ہے منجملہ ان کے عقاب الٰہی سے ڈرانا ہے۔اس کے احکام کے ترک پر اس سورۃ میں ترک احترام بیت اللہ کے وبال سے اس پر استدلال ہے،لہذا ربط ظاہر ہے۔

قصہ اصحاب فیل :

بادشاہ حبشہ کی طرف سے یمن میں ایک حاکم تھا ابرہہ،اس نے ایک کنیسہ بنایا تھا چونکہ یہ سب لوگ نصرانی تھے اور اس نے یہ چاہا کہ کعبہ کے حج کرنے والے لوگ یہاں آیا کریں اور اس کا اعلان کر دیا،یہ بات عرب بالخصوص قریش کو بہت ناگوار ہوئی اور کسی شخص نے رات کو جا کر اس میں پاخانہ کر دیا۔اور مقاتل نے کہا ہے کہ بعض عرب نے وہاں آگ جلائی تھی ہوا سے اس میں آگ جا لگی اور وہ کنیسہ جل گیا،ابرہہ کو غصہ آیا اور لشکر عظیم لے کر جس میں ہاتھی بھی تھے خانہ کعبہ کو منہدم کرنے چلا،جب مخمص میں جو کہ طائف کے راستہ میں ہے وہاں پہنچا اور عبدالمطلب کے پاس آدمی بھیجا،وہ اس وقت رئیس مکہ تھے اور یہ کہلایا کہ میں لڑنے نہیں آیا ہوں صرف کعبہ کو منہدم کرنے آیا ہوں،اگر کوئی مخالفت کرے گا تو البتہ میں اس سے لڑوں گا،عبدالمطلب نے جواب دیا کہ جس کا یہ گھر ہے وہ خود حفاظت کرے گا۔عبدالمطلب اس کے پاس گئے اور وہاں بھی زبانی یہی گفتگو ہوئی اور وہاں سے واپس آ کر تمام قریش کو لے کر پہاڑوں میں جا چھپے تا کہ لشکر کے شر سے محفوظ رہیں اور ابرہہ وہاں سے مکہ کی طرف چلا اور جب وادی محصر میں- جو کہ مزدلفہ کے قریب ہے- پہنچا،تو اس نے دیکھا کہ سمندر کی طرف سے کچھ سبز اور زرد رنگ کے کبوتر سے کچھ چھوٹے پرندے آئے،ان کے پنجوں اور چونچوں میں مسور اور چنے کی برابر کنکریاں تھیں اور انہوں نے لشکر پر چھوڑنا شروع کیں،وہ اللہ کی قدرت سے گولی کا کام کرتی تھی اور ہلاک کر دیتی تھی،بعض تو اس عذاب سے ہلاک ہوئے اور بعض بھاگ گئے اور دوسری بڑی تکلیفیں اٹھا کر مرے،یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے ۵۰ روز پہلے پیش آیا یعنی محرم کے اخیر میں ہوا۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ انہوں نے بڑے ہاتھی کے فیلبان کو اندھے بھیک مانگتے ہوئے دیکھا ہے اور نوفل بن ابی معاویہ سے منقول ہے کہ انہوں نے وہ کنکریاں دیکھی ہیں،درمنثور میں ہے کہ بعض کو ان کنکریوں کے لگنے سے خارش اور چیچک نکل آئی تھیں اور جس سے ہلاک ہو گئے !

خلاصہ سورۃ :

اس سورۃ میں اس بات کی تعلیم ہے کہ قدرت کے منشاء کو کوئی طاقت نہیں روک سکتی،نیز احکام خداوندی اور شعائر کی بے حرمتی کرنے والوں کو اس کے عذاب سے ڈرتے رہنا چاہیے،باطل پرستوں اور مادی طاقت پر غرور کرنے والوں کے لئے یہ سورۃ مقام عبرت ہے کہ اللہ کی غیبی طاقت کے مقابلہ میں مادی اور دنیوی اسباب بے بس ہیں،حقیقی متصرف حق تعالیٰ ہیں،پھر اس میں کعبہ کی عظمت شان کا بھی اظہار ہے اور یہ کہ اس کے محافظ خود حق تعالیٰ ہیں۔واللہ اعلم ! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورۃ:......توہین شعائر اللہ سے دائمی ذلت کا لزوم۔ماخذ: آیت:۱۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۂ قریش

یہ قرآن کریم کی ۱۰۶ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۲۹ نمبر پر ہے۔اس سورۃ میں ایک رکوع، ۴ آیات، ۱۷ کلمات اور ۷۹ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ میں قبیلہ قریش کا ذکر فرمایا گیا جو کہ مکہ معظّمہ میں آباد تھے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے، حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی قبیلہ سے ہیں۔ بیت اللہ اور چاہ زمزم کی خدمت ہمیشہ اسی قبیلہ سے متعلق رہی۔اس لئے اس سورۃ کا نام سورۂ قریش ہوا۔

ربط:

سورۂ والضحیٰ کی تمہید میں جن مہمات کا ذکر ہوا ہے ان میں سے نعمت الٰہی کے شکریہ میں عبادت کرنا ہے، اس سورۃ میں اس کا بیان ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں قریش مکہ کو سمجھایا گیا کہ تم کو بیت اللہ کی وجہ سے دنیوی وجاہت اور امن وسکون حاصل رہا ہے، دوسرے اہل عرب قریش کی خانہ کعبہ کے متولی ہونے کی وجہ سے عزت واحترام کرتے اور ان کے قافلے لوٹ مار سے محفوظ رہتے۔پھر حرم میں قتال جدال بھی نہیں ہوتا تھا، اس اعزاز اور سکون کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ خانہ کعبہ میں توحید کے تقاضوں کے مطابق رب کعبہ کی عبادت کرتے، کفر وشرک سے کنارہ کش ہوتے اور بیت اللہ کو بتوں کی نجاست سے پاک رکھتے، نہ یہ کہ انہوں نے توحید کا بھی انکار کیا اور رب کعبہ کے رسول کی مخالفت کی اور نافرمانی کی، انہیں اللہ کے احسانات کو یاد کرکے اللہ کا فرمانبردار بننا چاہئے تھا، نہ کہ سرکشی اختیار کرتے، اس سورۃ میں ان کو یہی تعلیم دی گئی ہے۔واللہ علم۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

موضوع سورۃ:......فرائض علماء کرام وصوفیاء عظام۔ماخذ: آیت: ۳، ۴۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الماعون

یہ قرآن کریم کی ۱۰۷ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۱۷ ہے۔اس سورۃ میں ایک رکوع ، ۷ آیات، ۲۵ کلمات ۱۱۵ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی آخری آیت ''ویمنعون الماعون'' ہے یعنی وہ لوگ ماعون کو روکتے ہیں۔ ماعون کے معنی ہیں زکوۃ، خیرات یا روزمرہ کے استعمال کی چیزیں جیسے ڈول رسی، پیالہ، نمک، پانی، آگ، ہانڈی، کلہاڑی، سوئی، دھاگہ، وغیرہ۔ اس سورۃ میں ماعون کے روکنے یا منع کرنے کی مذمت کی گئی ہے، اس سے سورۃ کا نام مقرر ہوا۔

ربط:

سورۂ والضحیٰ کے شروع میں جن مہمات کا ذکر ہوا ہے منجملہ ان کے کفر و نفاق سے بچنا ہے۔ اس سورۃ میں اس کا بیان ہے، جس سے ربط ظاہر ہے۔

شان نزول:

مفسرین رحمہم اللہ نے بیان فرمایا ہے کہ اس سورۃ میں نصف اول کافروں کے بارے میں ہے اور نصف آخر منافقین کے بارے میں، لکھا ہے کہ ابوجہل ملعون قیامت کی تکذیب کرتا اور جب کسی یتیم کا وصی اور نگراں بنتا اور یتیم اپنے مال میں سے کھانا، کپڑا مانگتا تو یہ ظالم اس یتیم کو مار نکالتا اور ہمیشہ لوگوں کو خرچ کرنے سے روکتا، اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ سے مقصود یتیموں، محتاجوں، بے کس و بے سہارا لوگوں کی مدد پر ابھارنا ہے۔ انسانیت کی ہمدردی و غمخواری کا صحیح جذبہ پیدا کرنا اور ارکان دین میں سے نماز، زکوۃ و صدقات وغیرہ کی ادائیگی کی تاکید ہے۔ مختصر یہ کہ اس سورۃ میں حقوق اللہ و حقوق العباد کی پاسداری کی تعلیم ہے اور یہ کہ جس راہ کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلا رہے ہیں وہی انسان کی فلاح اور دین و دنیا کی اصلاح کی راہ ہے، نیز بتلایا گیا کہ جو یتیم کی ہمدردی و غم خواری تو درکنار اس کے ساتھ سنگدلی و بداخلاقی کا برتاؤ کرتے ہیں وہ بھی کوئی انسان ہے؟ ایسے شخص کو کیا پتہ کہ نماز یعنی اللہ کی بندگی کس سے مناجات ہے اور اس سے مقصود کیا ہے اور نماز ہی کیا، ایسے شخص کے دوسرے اعمال بھی ریاکاری کے ساتھ ہوتے ہیں، ایسا شخص زکوۃ و صدقات تو کیا دیتا وہ تو روزمرہ کے استعمال کی چیز بھی کسی کو نہیں دے سکتا، درحقیقت ایسا شخص روز جزا کا اعتقاد نہیں رکھتا۔ الغرض کفار و منافقین کے ان خصائل خبیثہ اور اعمال پر عذاب جہنم کی وعید سنائی گئی۔ واللہ اعلم! (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت میں منافقین کی تین صفات قبیحہ بیان کی گئی ہیں:

(۱) پہلی یہ کہ وہ نماز سے غفلت برتتے ہیں۔

(۲) دوسری صفت یہ کہ وہ دکھاوے کے لئے اعمال کرتے ہیں۔

(۳) تیسری صفت یہ کہ وہ ایسے بخیل ہیں کہ عام ضرورت کی چیز دینے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

خلاصہ سورۃ:......اوصاف مکذبین قیامت۔ ماخذ: آیت: ۱ تا ۳۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورۃ الکوثر

یہ قرآن کریم کی ۱۰۸ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے نمبر ۱۵ پر ہے۔ اور اس سورۃ میں ایک رکوع، ۳ آیات، ۱۰ کلمات اور ۴۳ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

سورۃ کی ابتداء "انا اعطینک الکوثر" سے فرمائی گئی یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے بیشک آپ کو کوثر عطاء فرمایا، کوثر کے لفظی معنی خیر کثیر کے ہیں، یعنی بہت زیادہ بہتری اور بھلائی، اس لفظ کے تحت ہر قسم کی دینی، دنیوی، ظاہری باطنی دولتوں، حسی و معنوی نعمتیں داخل ہیں، ان میں سے ایک بڑی نعمت حوض کوثر بھی ہے، چونکہ اس سورۃ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوثر دیئے جانے کا ذکر ہے، اس لفظ کی مناسبت سے اس سورۃ کا نام کوثر مقرر ہوا۔

ربط:

سورۂ والضحی کی تمہید میں جن مہمات کا ذکر ہے منجملہ ان کے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت و محبت اور آپ کے مخالفین کے ساتھ بغض و عداوت ہے، اس سورۃ کے اول و آخر کی آیتوں میں اس کے موجبات کا بیان ہے اور درمیان آیت میں پہلی آیت کے تابع بنا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا حکم ہے۔

شان نزول:

آپ کے بڑے بیٹے حضرت قاسم تھے، ان کا مکہ مکرمہ میں انتقال ہو گیا تو عاص ابن وائل سہمی نے اور اس کے ساتھ دوسرے مشرکین نے یہ کہا کہ آپ کی نسل منقطع ہو گئی۔ پس آپ نعوذ باللہ ابتر یعنی بے نام و نشان ہیں، مطلب یہ تھا کہ آپ کے دین کا چرچا چند روزہ ہے پھر یہ سب بکھیڑے پاک ہو جائیں گے، اس پر آپ کی تسلی کے لئے یہ سورۃ نازل ہوئی۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں اولاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت سنائی گئی کہ اللہ نے اپنے رسول کو کوثر عطاء فرمائی ہے، جس میں ہر خیر داخل ہے، خیر دنیا میں بقاء دین، ترقی اسلام، اعداء پر فتح و غلبہ اور قیامت تک آپ کے نام کی شہرت و عزت سب داخل ہے اور خیر آخرت میں مراتب و قرب درجات عالیہ، حوض کوثر کی عطا و شفاعت کا مرتبہ، مقام محمود کی عطا سب داخل ہیں، اس طرح آپ کو تسلی دی گئی کہ اگر اولاد نرینہ فوت ہونے پر مخالفین طعن و تشنیع کر رہے ہیں تو آپ اس پر غمگین نہ ہوں۔ کہ آپ کے رب نے آپ کو دین و دنیا کی تمام بھلائیوں سے نوازا ہے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان نعمتوں کے شکریہ میں آپ اپنی جان و مال سے اللہ کی عبادت میں لگ جائیں۔ اور پھر مزید تسلی کے لئے ایک پیشین گوئی فرمائی کہ بفضل اللہ تعالی آپ ابتر نہیں ہیں، بلاشبہ آپ کا دشمن ہی ابتر یعنی بے نشان ہے، کوئی اس کا نام لیوا نہیں ہے۔

فائدہ:

بعض روایات سے کوثر کا نہر جنت ہونا معلوم ہوتا ہے اور بعض سے میدان حشر میں ہونا معلوم ہوتا ہے، تطبیق یہ ہے کہ اصل نہر جنت میں ہے اور اس کی ایک شاخ باذن الٰہی میدان حشر میں آجاوے گی دونوں کو کوثر کہہ دیا گیا۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورۃ:......اصول ہزیمت اعدائے اسلام۔ ماخذ: آیت: ۳، ۲۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الکافرون

یہ قرآن کریم کی ۱۰۹ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے نمبر ۱۸ پر ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۶ آیات، ۲۶ کلمات اور ۹۹ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء ''قل یا ایھا الکافرون'' سے ہوئی، اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کافروں سے کہہ دیجئے، اس سے سورۃ کا نام کافرون ماخوذ ہے۔

ربط:

سورۂ والضحیٰ کی تمہید میں جن مہمات کا ذکر ہوا ان میں سے مسئلہ توحید اور تبری عن الشرک ہے، اس سورۃ میں اس کا بیان ہے۔

فائدہ:

اس سورۃ کو سورۃ المعابد، سورۃ الاخلاص اور سورۃ المقشقشہ بھی کہتے ہیں، مقشقشہ کے معنی ہیں بری کرنے والی، چونکہ اس سورۃ میں شرک سے براءت ہے۔

شان نزول:

ایک مرتبہ چند روسائے کفار نے آپ سے کہا کہ آیئے ایک سال آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کیا کیجئے اور ایک سال ہم آپ کے معبودوں کی عبادت کیا کریں، جس میں ہم اور آپ دین کے طریقہ میں شریک رہیں، جونسا طریقہ ٹھیک ہوگا اس سے سب کو کچھ کچھ مل جاوے گا، اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔

فضائل:

یہ حدیث میں آتا ہے کہ اس سورۃ کے پڑھنے کا ثواب چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔ ایک حدیث میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نماز فجر کی سنتوں میں پڑھنے کے لئے دو سورتیں بہتر ہیں، سورۂ کافرون اور سورہ اخلاص یعنی قل ہو اللہ

احد، متعدد صحابہ سے منقول ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صبح کی سنتوں اور نماز مغرب کی سنتوں میں انہیں دو سورتوں کو پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ حضرت فروہ ابن نوفل کا بیان ہے کہ میرے والد نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی چیز بتلا دیجئے میں جس کو سونے سے پہلے پڑھ لیا کروں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**قل یا ایھا الکافرون**'' پڑھ لیا کرو، یہ شرک سے بیزاری کا اظہار ہے۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں مسلمانوں کے لئے ہر دور میں اور بالخصوص موجودہ حالات میں نصیحت کا بڑا سامان موجود ہے اور اس سورۃ کی خاص تعلیم یہی ہے کہ مسلمان کے لئے سخت سے سخت حالات میں بھی باطل کی طرف سے چاہے معاملہ ڈرانے دھمکانے کا ہو یا لالچ کا ہو یا دین کے معاملہ میں مصالحت کی پیش کش ہو؛ یہ جائز نہیں کہ وہ دین کے معاملہ میں کسی کمی بیشی پر راضی ہو یا دوسروں کی خاطر مصنوعی یگانگت اور یکتائی پیدا کرنے پر راضی ہو، وہ جس دین الٰہی پر ایمان لایا ہے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ کسی وجہ سے بھی اس میں کتر بیونت پر راضی ہو جائے، الغرض اس سورۃ میں دین پر صبر و استقامت کا خزانہ موجود ہے۔ واللہ اعلم!

خلاصہ سورۃ:......مقاطعہ عن الکفار۔ ماخذ: آیت: ۶۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ النصر

یہ قرآن کریم کی ۱۱۰ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے ۱۱۴ نمبر پر ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۳ آیات، ۱۹ کلمات اور ۸۱ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی ابتداء ''**اذا جاء نصر اللہ**'' سے فرمائی گئی ہے یعنی جب خدا کی مدد آ پہنچے۔ اس سے سورۃ کا نام النصر مقرر ہوا۔

ربط:

سورۂ والضحیٰ کی تمہید میں جن مہمات کا ذکر ہے، منجملہ ان میں سے تکمیل فیوض کی نعمت کا شکر ہے، اس سورۃ میں اس کا بیان ہے، جس کا خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا ہے، اس کے ضمن میں آپ کی نبوت کی تقریر بھی ہو گئی۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ اے پیغمبر جب خدا کی مدد اور مکہ کی فتح معہ اپنے آثار کے آ پہنچے یعنی واقع ہو جائے اور آثار جو اس پر متفرع ہونے والے ہیں کہ آپ لوگوں کو اللہ کے دین یعنی اسلام میں جوق در

جوق داخل ہوتا ہوا دیکھیں، تو اس وقت سمجھ لیجئے کہ دنیا میں رہنے کا مقصود اور بعثت کا مقصود جو کہ تکمیل دین ہے، ختم ہوا اور اس وجہ سے سفر آخرت قریب ہے، بس اس کے لئے تیاری کیجئے اور اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیجئے، وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

فائدہ:

اس سورۃ میں آپ کی وفات کے قریب ہونے کی خبر ہے اور فتح سے مراد فتح مکہ ہے۔ فتح مکہ سے پہلے ایک ایک دو دو مسلمان ہوتا تھا، فتح مکہ کے بعد قبائل کے قبائل اسلام میں داخل ہونے لگے۔ یہ سورۃ فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی، جیسا کہ نقل کیا گیا ہے کہ خیبر سے لوٹتے ہوئے نازل ہوئی جو فتح مکہ سے پہلے ہے اور مکہ معظّمہ رمضان ۸ ھ میں فتح ہوا۔ اور آپ کی وفات ربیع الاول ۱۰ ھ میں ہوئی۔ روایت میں آتا ہے کہ آپ اس سورۃ کے نازل ہونے کے بعد **سبحان اللہ و بحمدہ استغفر اللہ و اتوب** بہت زیادہ پڑھا کرتے تھے۔ بعض مفسرین نے اس کا نزول فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت سے چھ ماہ قبل لکھا ہے، بعض نے ایام تشریق ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذی الحجہ بمقام منی حجۃ الوداع ماہ لکھا ہے کہ پہلے آیت "**الیوم اکملت لکم دینکم**" نازل ہوئی اور ذی الحجہ یوم عرفہ جمعہ کو بعد خطبہ یہ سورۃ وہیں منیٰ میں ایام تشریق میں نازل ہوئی۔

بعض روایات میں ہے کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع میں اس کی تلاوت فرمائی، تو سب اس کو سن کر خوش ہوئے کہ اس میں فتح مکہ کی خوشخبری ہے مگر حضرت عباس رونے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ رونے کا سبب کیا ہے۔ تو حضرت عباس نے فرمایا کہ اس میں آپ کی وفات کی خبر مضمر ہے۔ آنحضرت نے اس کی تصدیق فرمائی، معلوم ہوا کہ جب موت قریب ہو تو تسبیح و استغفار کی کثرت کرنی چاہیئے۔

فضائل:

امام ترمذی نے حضرت انس کی حدیث نقل کی ہے کہ **اذا جاء نصر اللہ** ثواب میں چوتھائی قرآن کے برابر ہے۔

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورۃ:......رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامیاب زندگی کی حد اور انتقال پر ملال کی پیش گوئی۔ ماخذ: آیت: ۱ تا ۳۔

(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ اللھب

قرآن کریم کی ۱۱۱ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے نمبر ۶ پر ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۵ آیات، ۲۴ کلمات اور ۸۱ حروف ہیں، یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی پہلی آیت ’’تبت یدا ابی لھب و تب ‘‘ ہے، جس کے معنی ہیں ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ برباد ہوجائے، اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوتیلے چچا ابولہب اور اس کی بیوی کی اسلام دشمنی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عداوت کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے ہلاک ہونے اور قیامت کے دن نار جہنم میں ڈالے جانے کی خبر دی گئی ہے۔ اس لئے بطور علامت اس کا نام سورۃ اللھب مقرر ہوا۔

ربط:

سورۂ والضحی کی تمہید میں جو امور مذکور تھے منجملہ ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے بچنا ہے، اس سورۃ میں اس مخالفت کا وبال مذکور ہے۔

شان نزول:

روایت میں آیا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیت کریمہ ’’وانذر عشیرتک الاقربین ‘‘ نازل ہوئی کہ آپ اپنے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایئے اور آپ نے کوہ صفا پر چڑھ کر تمام قبیلوں کو آواز دی اور جمع کر کے سب کو دعوت اسلام دی، تو ابولہب بن عبدالمطلب نے گستاخانہ کلمات کہے: ’’تبالک سائر الیوم! الھذا جمعتنا ؟‘‘ اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔ چنانچہ غزوہ بدر کے بعد ساتویں روز اس کو طاعون کا ایک دانہ -جس کو عدسہ کہتے ہیں- نکلا اور مرض لگ جانے کے خوف سے گھر والوں نے اس کو الگ ڈال دیا یہاں تک کہ ابولہب اسی حال میں مر گیا اور تین روز تک لاش یونہی پڑی رہی، جب سڑنے لگا تو مزدوروں سے اٹھا کر ڈلوا دیا، انہوں نے ایک گڑھا کھود کر اس میں لکڑی سے دھکا دے کر اوپر سے پتھر بھر دیئے۔

طارق سے روایت ہے کہ میں نے ایک بار دیکھا کہ سوق المجاز میں آپ آگے آگے دعوت اسلام کرتے ہوئے چلے جارہے ہیں اور پیچھے پیچھے ابولہب پتھر مارتا ہوا آرہا ہے، جس سے آپ کی پنڈلی اور قدم لہولہان ہو گئے ہیں۔ ابولہب کی بیوی -جس کا نام ام جمیل تھا- آپ کے راستہ میں کانٹے بچھایا کرتی تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ اپنے واسطے لکڑیاں ڈھونڈتی تھی، ایک دن لکڑیوں کا گٹھا پیٹھ پر رکھے ہوئے تھی، تھک گئی، لکڑیوں کی رسی اس کی گردن میں پڑی تھی، لکڑیوں کا گٹھا تو ایک پتھر پر رکھ دیا اور سستانے لگی۔ اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ کو حکم ہوا، اس نے اس گٹھے کو پیٹھ کے پیچھے سے پتھر کے نیچے گرادیا، رسی اس کے گلے میں رہی اور پھانسی ہوگئی، وہ ہلاک ہوگئی۔

فائدہ:

ابولہب کا نام عبدالعزی تھا اور ابولہب کنیت تھی، چونکہ اس کے چہرہ کا رنگ سرخ تھا، مگر قرآن میں کنیت کا اختیار کرنا اس کے شعلہ والی آگ میں پہنچنے کی وجہ سے ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ’’حمالۃ الحطب ‘‘ سے مراد چغل خور ہے، چونکہ وہ چغل خور تھی۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں ابولہب اوراس کی بیوی دونوں کا انجام ذکر فرمایا ہے، جس سے مخالفین رسول کو متنبہ کیا گیا کہ مرد ہو یا عورت، اپنا ہو یا بیگانہ، بڑا ہو یا چھوٹا جو حق کی عداوت پر کمر باندھے گا وہ آخر کار ذلیل وتباہ وبرباد ہوگا۔ واللہ اعلم!

خلاصہ سورۃ:...... تبلیغ حق میں حارج نوع ابی لہب میں داخل ہے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

سورۃ الاخلاص

یہ قرآن کریم کی ۱۱۲ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۲۲ ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع، ۴ آیات ۱۷ کلمات اور ۴۹ حروف ہیں۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

وجہ تسمیہ:

چونکہ اس سورۃ میں توحید باری تعالیٰ کو ہر قسم کے شرک سے خالص کر کے بیان کیا گیا ہے، اس وجہ سے اس سورۃ کا نام اخلاص رکھا گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنا سب کچھ اللہ کے لئے خالص کر دے۔

ربط:

سورۂ والضحیٰ کی تمہید میں جن مہمات کا ذکر ہوا منجملہ ان کے توحید ہے۔ اس سورۃ میں اس کا بیان ہے۔

شان نزول:

روایت میں آتا ہے کہ مشرکین مکہ نے ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ ہمارے معبودوں کی تو برائی کرتے ہیں، آپ اپنے رب کے تو اوصاف بیان کریں، اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔

خلاصہ سورۃ:

اس سورۃ میں حق تعالیٰ نے اپنی صفات بیان فرمائی ہیں اور ہر طرح کے شرک یعنی بت پرستی، عیسائیت، یہودیت، مجوسیت وغیرہ سب کی تردید کر کے خالص توحید کا سبق دیا گیا ہے کہ اللہ ایک ہے، وہ بے نیاز ہے، وہ اولاد، ماں باپ اور شریکوں سے پاک ہے اور اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔

فضائل:

روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہ سورۃ تہائی قرآن کے برابر ہے۔ علماء نے اس کی وجہ لکھی ہے کہ مضامین قرآن تین قسم کے ہیں۔ (۱) توحید وصفات باری تعالیٰ (۲) بندوں کے اعمال وافعال کی کیفیت (۳) قیامت وآخرت اور وہاں کے حالات، اس سورۃ میں ان تین میں سے ایک مضمون توحید ہے۔ حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک صاحب نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اس سورۃ

''قل ھواللہ احد'' سے محبت ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی محبت تجھے جنت میں لے جائے گی،مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جوشخص اس سورۃ کو دس مرتبہ پڑھے گا اللہ تعالی اس کے لئے جنت میں ایک محل تعمیر کریں گے حضرت عمر نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر تو ہم بہت سے محل بنوالیں گے،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ اس سے بھی زیادہ اوراس سے بھی اچھا دینے والے ہیں۔اور بھی بہت سی روایات میں اس سورۃ کے فضائل مذکور ہیں۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

یہ سورت اسلام کے بنیادی عقیدہ یعنی توحید سے بحث کرتی ہے۔توحید کی تین قسمیں ہیں:

(۱)توحید ربوبیت یعنی ہر چیز کا خالق،مالک اوررازق اللہ ہے۔

(۲)توحید الوہیت یعنی ہر عبادت صرف اللہ کے لئے ہو۔

(۳)توحید ذات واسماء وصفات،یہی وہ قسم ہے جس میں انسان دھوکہ کھاتا ہے،کیونکہ وہ غیر اللہ کے لئے بھی وہ ہی صفت ثابت کرنے لگتا ہے جو اللہ کی صفات ہیں۔(خلاصہ مضامین قرآن کریم،خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورۃ:......ممتاز توحید اسلام کا ذکر۔ماخذ:آیت:۱تا۴۔(مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

سورۃ الفلق

قرآن کریم کی ۱۱۳ نمبر کی سورۃ ہے اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۲۰ ہے،اس سورۃ میں ایک رکوع، ۵ آیات، ۲۳ کلمات اور ۷۳ حروف ہیں،یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

اس سورۃ کی پہلی آیت ''قل اعوذ برب الفلق'' ہے،جس میں لفظ فلق آیا ہے،فلق سے مراد صبح ہے،کیونکہ رات کی ظلمت پھاڑ کر صبح کی روشنی نمودار ہوتی ہے۔اس لئے اس سورۃ کا نام سورۂ فلق ہے۔

ربط:

سورۂ والضحی کی تمہید میں جن مہمات کا ذکر ہے،ان میں سے حق تعالی پر توکل اوراس کے ساتھ استعاذہ ہے۔اس میں اوراس کے بعد والی سورۃ میں اس کا بیان ہے۔

شان نزول:

سورۂ فلق اور سورۃ ناس چونکہ ایک ساتھ نازل ہوئیں اس لئے ان کا سبب نزول ایک ہی ہے،وہ یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر لبید یہودی اوراس کی بیٹیوں نے سحر کردیا تھا،جس سے آپ کو مرض کی سی حالت عارض ہوگئی،آپ نے حق تعالی سے دعا کی اس پر یہ دونوں سورتیں نازل ہوئیں۔جن میں سے ایک سورۃ میں پانچ اور ایک میں چھ آیتیں ہیں مجموعہ گیارہ آیات ہیں اور آپ کو وحی سے اس سحر کا موقع بھی معلوم کرادیا گیا تھا چنانچہ وہاں سے مختلف چیزیں نکلیں جن میں سحر

کیا گیا تھا اور اس میں ایک تانت کا ٹکڑا بھی تھا جس میں گیارہ گرہیں لگی ہوئی تھیں ۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام یہ سورتیں پڑھنے لگے، ایک ایک آیت پر ایک ایک گرہ کھل گئی۔ چنانچہ آپ کو بالکل شفاء ہوگئی۔

خلاصہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس:

ان دو آخری سورتوں میں یعنی خاتمہ قرآن پر اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے ذریعہ تمام امت مسلمہ کو استعاذہ کی تعلیم دی ہے، یعنی ہر قسم کے شر سے جو توحید اور عقائد حقہ میں فرق یا رخنہ ڈالنے والے شر ہیں، ان سے استعاذہ اور تمام معاملات اور سب امور میں حق سبحانہ وتعالی پر توکل و بھروسہ کرنے کا اور اس کی حفاظت و پناہ میں آجانے کا حکم ہوا ہے سورۂ فلق میں مضرات اور شرور دنیویہ سے اور سورۃ الناس میں مضرات اور شرور دینیہ سے استعاذہ ہے۔ واللہ اعلم۔

فضائل:

حضرت عقبہ بن عامر کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ جحفہ اور ابواء کے درمیان ہم کو تیز ہوا اور تاریکی نے گھیر لیا، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ''**قل اعوذ برب الفلق**'' اور ''**قل اعوذ برب الناس**'' پڑھ پڑھ کر پناہ مانگنی شروع کی اور مجھ سے فرمایا اے عقبہ پناہ مانگو ان دونوں سورتوں کے ذریعہ سے کہ پناہ مانگنے کے سلسلہ میں یہ دونوں سورتیں سب سے بہتر ہیں۔

حضرت عقبہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا میں پناہ حاصل کرنے کے لئے سورہ ہود اور سورۂ یوسف پڑھا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''**قل اعوذ برب الفلق**'' سے بہتر خدا کے نزدیک اس معاملہ میں کوئی چیز نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو سونے کے لئے اپنے بستر پر جاتے تو دونوں ہاتھوں کو ملاتے اور ان پر ''**قل ھو اللہ احد، قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس**'' پڑھ کر پھونکتے اور پھر دونوں ہاتھوں کو جسم پر جہاں تک ہاتھ پہونچتا پھیرتے اور سر اور چہرہ سے ہاتھوں کو پھیرنا شروع فرماتے اور پھر بدن کے اگلے حصہ پر پھیرتے ہوئے سارے جسم پر پھیرتے اور تین مرتبہ ایسا کرتے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

اس سورت میں اللہ نے اپنی ایک صفت بیان فرما کر چار چیزوں کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا ہے۔ (۱) مخلوق کے شر سے (۲) اندھیرے کے شر سے (عام طور پر چور، شیاطین، جنات، حشرات اور ساحر اندھیرے ہی میں اپنا کام دکھاتے ہیں۔ (۳) پھونکیں مارنے والیوں کے شر سے جو کہ جادو اور ٹونے کرتی ہیں۔ یہ کام اگرچہ مرد بھی کرتے ہیں لیکن عورتیں تعویذ گنڈے میں ہمیشہ پیش پیش دکھائی دیتی ہیں اس لئے قرآن نے عورتوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ (۴) حاسد کے شر سے۔ (خلاصہ مضامین قرآن کریم)

خلاصہ سورۃ:...... مضرات جسمانی سے بچ کر اللہ تعالی کی پناہ میں آنے کی تلقین۔ ماخذ: آیت: ۱ تا ۵۔ (مخزن المرجان

فی خلاصۃ القرآن)

سورۃ الناس

قرآن کریم کی ۱۱۴ نمبر کی سورۃ ہے، اور ترتیب نزول کے اعتبار سے اس کا شمار نمبر ۲۱ ہے۔ اس سورۃ میں ایک رکوع،۶ آیات ۲۰ کلمات اور ۸۱ حروف ہیں، یہ سورۃ مدنی ہے۔

وجہ تسمیہ:

چونکہ اس سورۃ میں لفظ الناس کئی جگہ آیا ہے۔ اس لئے بطور علامت اس سورۃ کا نام سورۃ الناس ہوا۔

ربط وخلاصہ سورۃ:

ماقبل کی سورۃ کے ذیل میں ذکر کیا جا چکا ہے، نیز اس سورۃ کا ماقبل کی سورۃ کے ساتھ ربط یہ ہے کہ سورۂ سابقہ میں مضرات اور شرور دنیویہ سے استعاذہ کا ذکر ہے اور اس سورۃ میں مضرات اور شرور دینیہ سے استعاذہ کا حکم ہے یا یہ کہ سورۂ سابقہ میں جن چیزوں کے شرور سے اللہ کی پناہ کی تعلیم دی گئی تھی وہ سب خارج میں پائی جاتی تھیں، مثلاً کسی دوسرے کا ظلم کسی چیز سے پہونچنے والی تکلیف جادو یا حسد وغیرہ اور اس سورۃ میں ان شرور سے پناہ چاہنے کا حکم ہے۔ جو خاص انسان کے قلب پر پہنچتے ہیں، یعنی شیطانی خیالات اور وساوس جو قلب پر اثر کر کے ایمان کو زائل یا ناقص کر دیتے ہیں اور جب قوت ایمانی جاتی رہی تو پھر آدمی نہ دین کا رہا اور نہ دنیا کا، اس لئے اس سورۃ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطے سے تمام مؤمنین کو حکم ہے کہ شیطانی خیالات اور وساوس سے ہر وقت اللہ کی پناہ مانگتے رہیں۔ واللہ اعلم!

فائدہ:

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے سورۂ فلق اور سورہ ناس کی تفسیر کے سلسلہ میں ایک نہایت لطیف نکتہ لکھا ہے کہ سورۂ فلق میں اللہ کی ایک ہی صفت (رب الفلق) سے تین چیزوں کی برائی سے پناہ مانگنے کا حکم ہے۔ (۱) تاریکی کے شر سے (۲) سحر کے شر سے (۳) حاسد کے حسد کے شر سے اور سورۃ الناس میں باری تعالیٰ کی تین صفات کے ذریعہ ایک ہی چیز کے شر سے یعنی شیطان کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم ہے، باری تعالیٰ کی وہ تین صفات یہ ہیں۔ (۱) رب الناس (۲) ملک الناس (۳) الہ الناس۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دین کی حفاظت مقدم اور زیادہ ضروری ہے جان اور بدن کی حفاظت سے، اس واسطے کہ وسواس شیطان دین کو خراب کرنے والا ہے اور تین شر یعنی تاریکی، سحر اور حسد یہ جسم اور بدن کو ضرر پہنچانے والے ہیں۔ واللہ اعلم!

فائدہ:

حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس سورۃ میں ایک عجیب لطیفہ ذکر فرمایا ہے، جس سے قرآن کا حسن آغاز وانجام ظاہر ہوتا ہے، وہ یہ کہ اس آخری سورۃ اور سورۂ فاتحہ جو کہ سب سے پہلی سورۃ ہے دونوں سورتوں کے مضامین میں غایت درجہ کا

تقارب ہے یعنی حکم میں اتحاد ہے، چنانچہ ''رب الناس'' کے مناسب سورۂ فاتحہ میں ''رب العالمین'' ہے اور ''ملک الناس'' کے مناسب ''مالک یوم الدین'' ہے اور ''اله الناس'' کے مناسب ''ایاک نعبد'' ہے اور استعاذہ کے مناسب ''ایاک نستعین''، ''الوسواس الخناس'' کے مناسب ''اھدنا'' ہے۔ واللہ اعلم!

فائدہ:

مفسرین نے ایک نکتہ ابتداء واختتام قرآن کی مناسبت میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ قرآن کی ابتداء اللہ کے وصف ربوبیت سے تھی اور ''الحمد للہ رب العالمین'' فرمایا تھا اور اختتام وصف الوہیت پر ہوا اور ''الہ الناس'' فرمایا؛ تاکہ معلوم ہوجائے کہ ربوبیت کی حق شناس یہی ہے کہ اس کی الوہیت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے اور اس کی شکرگزاری کے ساتھ عبادت واطاعت میں عمر گزاردی جائے۔

فائدہ:

بعض نے ایک اور نہایت عمدہ نکتہ اس مقام پر لکھا ہے کہ کلام الٰہی کی ابتداء بسم اللہ کی ب سے ہے اور انتہا ناس کی سین پر ہے، ان دونوں حرفوں کو ملایئے تو لفظ بس بنتا ہے اور اہل عرب بولتے ہیں کہ ''بسک ای حسبک''، تو معنی ہوئے حسبك الكونين ما اعطيناك بين الحرفين'' کافی ہے تجھ کو دونوں جہاں میں وہ جو ہم نے آپ کو دو حرفوں کے درمیان عطا کیا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہم سب کو قرآن کے ساتھ صحیح تعلق نصیب فرمائے اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

نکتہ:

یہاں یہ نکتہ بھی سمجھ لیا جائے کہ سورۂ فلق میں ایک صفت ذکر فرما کر چار آفات سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا تھا اور یہاں چار صفات ذکر فرما کر ایک آفت کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے کہ پہلی سورت میں نفس اور بدن کی سلامتی مطلوب ہے جبکہ دوسری سورت میں دین کے ضرر سے بچنا اور اس کی سلامتی مطلوب ہے اور دین کا چھوٹے سے چھوٹا نقصان دنیا کے بڑے سے بڑے نقصان سے زیادہ خطرناک ہے۔ اگر ہم نے قرآن سے سچا تعلق قائم کیے رکھا اور اسے پڑھنے سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور اس کے سارے حقوق کی ادائیگی کی کوشش کرتے رہے تو ان شاء اللہ! ہمارا اور ہماری آنے والی نسلوں کا دین وایمان محفوظ رہے گا۔ (خلاصۃ القرآن)

خلاصہ سورۃ:......مضرات روحانی سے بچ کر اللہ تعالی کی پناہ میں آنے کی تلقین۔ ماخذ: آیت: ۱ تا ۶۔ (مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن)

***

۳۰ ویں پارہ کے چند اہم فوائد

(۱) عنقریب موت کے وقت ان باتوں کا علم حاصل ہو جائے گا جس کے بارے میں لوگ اختلاف کرتے ہیں، مگر اس وقت اس علم کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

(۲) مومن اور کافر سب کے اعمال کو جمع کیا جارہا ہے اور ان کو ان اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔

(۳) اللہ تعالی اپنی مخلوقات میں سے جس کی چاہے قسم کھا سکتا ہے، مگر بندے کے لئے یہ جائز نہیں کہ اللہ کے سوا کسی کی قسم کھائے۔

(۴) موت کے وقت مؤمن کی روح بہت تیزی سے نکلتی ہے اور اس کو اس کے نکلنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی مگر کافر کو ہوتی ہے۔

(۵) انسان کے اوپر اللہ کی نعمتیں اتنی ہیں کہ اگر وہ ہمیشہ روزہ رکھے اور ہر وقت نماز بھی ادا کرتا رہے تو بھی اس کے شکر سے قاصر ہے۔

(۶) ایمان اور تقوی کا ثمرہ قیامت کے دن ظاہر ہوگا جب ان کی وجہ سے اہل ایمان کے چہرے چمکیں گے اور کفر اور نافرمانی کا ثمرہ بھی اس وقت ظاہر ہوگا جب اہل کفر کے چہرے سیاہ اور پریشان حال ہوں گے۔

(۷) قیامت کی ہولنا کی کو یاد رکھنے کے لئے سورہ تکویر، سورہ انفطار اور سورہ انشقاق کی تلاوت کرتے رہنا چاہئے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں بھی ہے کہ جو چاہے کہ قیامت کے مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے تو وہ ان سورتوں کی تلاوت کرے۔

(۸) یتیموں کا اکرام نہ کرنا، غرباء ومساکین کا خیال نہ رکھنا، میراث کو مستحقین میں تقسیم نہ کرنا اور مال کی زیادہ محبت رزق کی تنگی کا باعث بن جاتی ہے۔

(۹) جہنم کی آگ سے بچاؤ اور جنت میں دخول یہ موقوف ہے اس بات پر کہ انسان اپنے نفس کی پاکیزگی کا اہتمام کرے گناہ اور معاصی سے بچنے کے ذریعے۔

(۱۰) اہل ایمان پر واجب ہے کہ وہ شیاطین جن وانس کی شرارتوں سے اللہ کی پناہ طلب کرتے رہیں۔

***

تمت

مراجع ومصادر

نمبر	کتاب	مصنف
۱	معارف القرآن	مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
۲	معارف القرآن	مولانا ادریس صاحب کاندھلوی
۳	معالم العرفان	مولانا صوفی عبدالحمید سواتی
۴	تفسیر ماجدی	مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی
۵	انوار البیان	مولانا عاشق الٰہی بلندشہری
۶	کشف الرحمٰن	مولانا احمد سعید دہلوی
۷	تفسیر عثمانی	علامہ شبیر احمد عثمانی
۸	توضیح القرآن	مولانا مفتی محمد تقی عثمانی
۹	آسان تفسیر	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
۱۰	قرآن ایک نظر میں	محمد میاں صدیقی
۱۱	خلاصۃ القرآن	مولانا اسلم شیخوپوری
۱۲	خلاصہ مضامین قرآن کریم	مفتی ثناء الرحمٰن
۱۳	خلاصہ مضامین قرآن	مولانا منظور یوسف
۱۴	خلاصہ قرآن	مفتی عتیق الرحمٰن
۱۵	مستند خلاصہ مضامین قرآنی	مولانا سلیم الدین شمسی
۱۶	مخزن المرجان فی خلاصۃ القرآن	مولانا عبدالقیوم قاسمی صاحب
۱۷	ہدایات الاجزاء	ڈاکٹر عمر بن عبداللہ بن محمد المقبل
۱۸	خواطر قرآنیہ	عمرو خالد
۱۹	ارکان اربعہ	مولانا علی میاں ندوی
۲۰	قرآن سارانس گجراتی	مولانا مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی
۲۱	جدید فلسفہ اور علم الکلام	// //